بہادر شاہ ظفر

اور

اُن کا عہد

M. Jamil Ahmad

۱۸۵۷ء کی تحریکِ انقلاب کی
مفصّل، مکمّل اور مُستند تاریخ

تالیف

(سیّد) رئیس احمد جعفری (ندوی)

کتاب منزل لاہور

بہادر شاہ ظفر

اور

اُن کا عہد

۱۸۵۷ء کی عالم آشوب تحریکِ انقلاب کی
مستند اور مکمل و مفصّل تاریخ

از

رئیس احمد جعفری (ندوی)

کتاب منزل
کشمیری بازار، لاہور

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

•

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زنداں پہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جبتک ہے، تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

کیا کیا جہاں میں ہوئے شاہان ذی کرم
کس کس طرح سے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں؛ کہاں ہے سکندر؛ کہاں ہے جم؛

کوئی یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

•

بہادر شاہ ظفر

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا
نہ بجھا سوزِ دل جب آنکھوں سے
ہم نے دریا بہا کے کیا پایا

کشتۂ تیغِ غم سے پوچھ اپنے
تو نے جی سے گزر کے کیا پایا
حاسدوں نے ظفرؔ مرے سر پہ
پوچھ بہتان دھر کے کیا پایا

بہادر شاہ ظفرؔ

•

"جب تک دہلی میں بخت خاں نہیں آیا تھا، جہاد کے فتوے کا چرچا شہر میں بہت کم تھا، مساجد میں ممبران پر جہاد کا وعظ کمتر ہوتا تھا، بخت خاں نے یہ فتویٰ لکھایا کہ مسلمانوں پر جہاد فرض ہے۔

فتوے کا اثر یہ تھا کہ مسلمانوں میں جوش مذہبی زیادہ ہو گیا۔"

(ذکاء اللہ)

•

"جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملک میں ایک مکان نہ تھا، غدر کے بعد وہاں بہت سے ہندو مالک مکانات ہو گئے، مسلمانوں نے اپنا زیور بہت سستا ہندوؤں کے ہاتھ بیچا، بارہ آنے تولہ چاندی، چودہ روپے تولہ سونا بہت سے ہندوؤں کے گھروں میں غدر کیا آیا، لکشمی آئی، انھوں نے سپاہیوں سے لوٹ یا چوری کا مال بہت ارزاں خرید لیا۔"

(تاریخ عہدِ انگلشیہ، ذکاء اللہ، ص ۱۵)

•

"نواب شبیر جنگ خاں کے بیٹے محمد علی خاں نے ایک (انگریز) سپاہی کو اس لیے زخمی کیا تھا کہ وہ اُن کے زنانہ میں بدنیتی سے جانا چاہتا تھا، اس قصور میں (انگریز) حاکموں نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے سارے مردوں کو مار ڈالو۔ ان بے گناہ مقتولوں میں ایک صاحبِ کمال مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے کنبہ کے اکیس[۲۱] افراد بھی تھے۔"

•

(تاریخ عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص۶۰۷)

تقدیم

الحمد اللہ کہ آج، یہ کتاب اتمام تک پہنچی .. .. !

بظاہر یہ کتاب میں نے چند ماہ میں لکھی ہے لیکن اس کی تسوید ایک عرصہ دراز سے پیش نظر تھی اور غیر ارادی طور پر اس سلسلہ میں جو ماخذ سامنے آجاتا تھا اس سے کام کی باتیں لے کر اپنی یادداشت میں منتقل کرلیتا تھا یہ مواد اس موقع پر بہت قیمتی ثابت ہوا۔

اس موضوع پر اردو زبان میں بھی اب تک کوئی مفصل اور مکمل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، پھر دوسری باتوں کا کیا ذکر، غدر کے دوران میں اور غدر کے بعد انگریزوں نے ایسی دہشت انگیز سختیاں کی تھیں کہ لوگ سچی بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے، کلمۂ حق زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاتے تھے انگریزی میں اور خود اردو میں غدر سے متعلق جو مواد ملتا ہے اس کا بہت بڑا حصہ انگریزوں کی تائید، تعریف اور غیر جانبداری پر مشتمل ہے، کچھ اس لیے کہ لکھنے والے زیادہ تر انگریزوں کے دوست، ملازم، مخبر، جاسوس، خیرخواہ اور جاں نثار تھے۔ اور کچھ اس لیے کہ اس زمانہ کی فضا ہی یہ ہوتی کہ انگریزی حکومت کو نعمت خداوندی سمجھا اور کہا جائے، اور عہد ماضی سے یکسر قطع نظر کرلی جائے، ذکاء اللہ سے بڑھ کر دیانتدار مؤرخ کون ہوگا، لیکن انگریزوں کے سلسلہ میں ان کی لکھی ہوئی تاریخیں خوشامد سے اتنی بھری ہوئی ہیں کہ درکورٹ سرکلر معلوم ہوتی ہیں سرکار۔ اور سادر کر وغیرہ نے غدر پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی زیادہ تر اس قسم کے سفینوں کی خوشہ چینی اور اخذ و التقاط پر مشتمل ہے، جن حضرات نے شاہد عینی کی حیثیت سے ماقبل و مابعد غدر کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں انھوں نے بھی اپنے حالات اور ماحول کے ماتحت واقعات کو بیان کرنے سے زیادہ چھپانے کی علت و معلول کا صحیح سلسلہ قائم کرنے کے بجائے

توڑ مروڑ سے کام لینے کی کوشش کی ہے، ایسے مواد کو پیش نظر رکھ کر ایک بالکل نئے نقطۂ نظر حق و صداقت کا نقطۂ نظر —— سے کتاب لکھنے کی کوشش بڑی جرأت کا کام تھا میں نے اگرچہ یہ بیڑا اٹھالیا تھا لیکن حیران تھا کہ یہ کشتی ساحلِ کامرانی تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔

بہر حال موافق اور ناموافق ہر قسم کا لٹریچر ہے خواہ وہ اُردو میں ہو یا انگریزی میں یا فارسی میں میں نے اپنے پیش نظر رکھا، مطالعہ شروع کیا تو یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مداحانہ قصیدوں کے بین السطور سے حقیقت اس طرح جھلکتی ہے جس طرح تیرہ و تار بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے، میں نے اس بجلی کی روشنی سے حقیقت، صداقت اور واقعیت کے موتی چنے ہیں۔

سب سے بڑی مشکل میرے راستہ میں یہ تھی کہ گو کافی کتابیں میں نے وقتاً فوقتاً خرید لی تھیں لیکن ابھی بہت سی کتابیں جن کی مجھے ضرورت تھی وہ بالکل نایاب تھیں لاہور میں "پنجاب لائبریری" اور "یونیورسٹی" دو کتاب خانے ایسے ہیں جن کی بہت دھوم ہے میں نے ان دونوں کتاب خانوں کو کھنگال ڈالا، خود ممبر بنا اور بعض ممبر دوستوں کے کارڈ مستقل طور پر اپنے قبضہ میں رکھے اور زیادہ سے زیادہ کتابیں جمع کرلیں، پڑھیں اور پھر یہ عجیب انکشاف ہوا، اولاً تو کام کی کتابیں کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی ناقص، کئی کتابیں ایسی تھیں جو بظاہر مکمل تھیں، مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا اندر سے اوراق غائب، بہر حال میں ان کتاب خانوں کے منتظم حضرات کا سپاس گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے ہر ممکن سہولت دی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے میں نے خاص طور پر بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ؛

شخصی طور پر اس سلسلہ میں میں جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی، جناب خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی، جناب مبین احمد صاحب معتمد کسٹم، کا بہت زیادہ ممنون ہوں ان حضرات نے اپنے پرائیویٹ کتاب خانوں کی اُردو۔ انگریزی کی نادر اور نایاب کتابیں مجھے استعمال کے لیے دیں اور حق یہ ہے کہ میں نے ان سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اگر ان حضرات کی کتابیں مجھے نہ ملتیں تو یہ کتاب ہرگز اس طرح لکھی نہ جاتی جس طرح میں چاہتا تھا ؛

مَیں نے بلامبالغہ اس کتاب کی تکمیل کے سلسلہ میں سینکڑوں کتابیں اور ہزارہا ہزار صفحات کا مطالعہ کیا ہے، پھر یہ کتاب لکھی گئی ہے، لیکن میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ ہر جہت سے یہ کتاب مکمل ہے، یقیناً اس میں خامیاں ہوں گی اور بہت زیادہ ہوں گی، مَیں اُن حضرات کا ممنون ہوں گا جو خامیوں سے مطلع کریں تاکہ آیندہ ایڈیشن میں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر سکوں۔

مَیں اپنی ناشر فرم "میسرز شیخ غلام علی اینڈ سنز" کے مالک شیخ نیاز احمد صاحب اور شیخ بشیر احمد صاحب کا بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ایسی ضخیم کتاب ایک ایسے موضوع پر چھاپی جو عوامی حلقوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

اس کتاب کی تصحیح فرم نے اپنے طور پر کرائی لیکن تصحیح ثانی کے سلسلے میں اپنے دوست حسین الزماں صاحب اور عزیز تجمل حسین کا بہت ممنون ہوں۔

رئیس احمد جعفری (ندوی)

۸۹ - ٹیگور پارک لاہور

۲۴ر دسمبر ۱۹۵۵ء

باب ۲

افتتاحیہ

انگریزوں نے تقریباً دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی، تاریخ کی تقویم میں دوسو سال مُدت، کوئی طویل مدت نہیں ہے لیکن ہندوستان پر یہ مدت، ایک قیامت کی طرح گزری، یہ مدت مشتمل ہے، غداری، فریب کاری، استحصال بالجبر، خیانت، بے وفائی، خودغرضی اور ہوس جوع الارض کے واقعات پر۔

مسلمان بھی، ایک غیر ملک سے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور کم و بیش ایک ہزار سال تک جاہ وجلال اور شان وتمکنت کے ساتھ وہ تخت حکومت پر متمکن رہے تھے، مسلمانوں کے دَورِ اقبال وعروج میں معاشی حالات اتنے بہتر تھے کہ معلوم ہوتا تھا اس دیس میں سَن برستا تھا، عدل و انصاف کی یہ کیفیت تھی کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، سیاسی حالات کا یہ رنگ تھا کہ فاتح اور مفتوح، غالب اور مغلوب راعی اور رعایا آپس میں اس طرح گھل مِل گئے تھے کہ من وتو کا فرق مٹ گیا تھا، مسلمانوں کے دَورِ حکمرانی کی یادگاریں مٹائے نہیں مِٹ سکیں، نہ گردشِ دوران انھیں مٹا سکی، نہ تلوار کی نوک اور توپ کے گولے سے ان کے نشانات مٹے، فاتح اور مفتوح کے مخلصانہ ارتباط واختلاط کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک نئی زبان عالم وجود میں آگئی، ایک نیا کلچر پیدا ہوگیا، ایک نئی تہذیب بن گئی، ایک نئی معاشرت عالم وجود میں آگئی، یہی نہیں، ایک نئی سوسائٹی پیدا ہوگئی، مسلم دَورِ حکومت کے ماتم داروں اور نوحہ خوانوں میں، ہندو بھی اسی طرح نظر آئیں گے، جس طرح مسلمان۔

اس کے برعکس انگریزوں کے دَورِ حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایک ہزار

سال کی مشترک تاریخ کو بدلنے کی جرآت کی، انھوں نے اُردو زبان کو مٹانے کی کوشش کی،
انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی تفریق پیدا کردی، جو بالآخر تقسیم ہند پر ختم ہوئی انھوں
نے اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے جھوٹ فریب اور افتراق انگیزی سے
کام لیا، انھوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے ماتحت ہندوستان کو ریل دی، ٹیلیفون دیا، ٹیلیگراف
دیئے اور اپنے سامراج کی مضبوطی اور استحکام کے لیے قحط دیا، بلوے دیئے تخریبی عناصر پیدا
کئے اور جب ان مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو دنیا میں اپنی ساکھ بڑھائی، اپنی تجارت کو فروغ
دیا اپنی دولت میں اضافہ کیا۔

مغل باہر سے آئے اور یہیں رہ پڑے، یہیں کے ہو گئے، یہیں جیئے، یہیں کے انھوں
نے قلعے بنائے، حویلیاں تعمیر کیں، محلات کی بنیاد ڈالی، مقبروں کی مساجد اور خانقاہوں کی طرح ڈالی
جو کچھ ایک ہاتھ سے لیا، دوسرے ہاتھ سے دیدیا، یہاں کی دولت یہیں رہی یہاں کے وسائل و
ذرائع، کسی غیر ملک کسی اجنبی حکومت کے فروغ و استحکام میں صرف نہیں ہوئے، وہ غیر ملکی بن کر آئے
لیکن ملکی بن کر رہے اور انگریز پہلے دن سے آخری دن تک غیر ملکی ہی رہے اور اپنے لیے اندرون ملک
میں زیادہ سے زیادہ تحفظات حقوق اور مراعات حاصل کرتے رہے آخر جب ان کا استحصال
حد سے بڑھ گیا، تو ایک دن انھیں بوریہ بستر باندھ کر اس دیس سے رخصت ہونا پڑا —— !

اس کتاب میں فرنگی سامراج کی فریب کاریوں اور دغا بازیوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔
بتایا گیا ہے کہ انگریز کس طرح آئے ؟ کس طرح رہے ؟ کیونکر مسلمانوں کی حکومت ختم کرکے وہ یہاں
کے مالک و مختار بن گئے ؟

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انگریزوں کے تسلط اور اقتدار، مسلم حکومت کے زوال و انحطاط ہندو
مسلم سیاست کی آویزش اور اختلال کے زمانہ میں بھی اس اُجڑے دیار کے رہنے والوں کی
ذہنی اور دماغی کیفیت کیا تھی ؟ اس ویران حویلی —— لال قلعہ —— کا کیا رنگ
ڈھنگ تھا ؟ جس ماحول میں آخری فرمانروا بہادر شاہ نے زندگی کا آغاز کیا، اور زندگی کو الوداع

کہا، وہ کیا تھا ؟

انگریز کیسے آئے ؟

قبل اس کے کہ ہم اٹھارویں صدی کے سیاسی عوامل و موثرات کا ذکر کریں، ضروری ہے کہ یہ معلوم کرلیں کہ انگریز اس دیس میں کیسے پہنچے ؟ بہتر ہو، اگر یہ کہانی ہم " انگریزی زبان ہی سے سنیں ۔ " یہ لوگ ۱۶۰۱ء میں سند سے کر ہندوستان آئے اور بعد انقضائے مدت کے پھر سند حاصل کی، غرضیکہ اسی طرح ان کا کام جاری تھا کہ ۱۶۹۳ء میں چند اور شخص بھی متفق ہوکر بادشاہ انگلستان سے ملتجی ہوئے کہ ہم کو بھی ہندوستان کی سوداگری کی مرحمت ہو، چنانچہ انھوں نے بھی سند پائی، دوسرے لوگ جب وارد ہند ہوئے تو ان دونوں میں رشک و نا اتفاقی ایسی بڑھی کہ ایک کمپنی دوسری کی تخریب کے در پے ہوئی، پھر بعد غور اور فکر کے ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ متفق رہنے سے اس کام کی رونق زیادہ ہوگی اور دشمن زور نہیں پا سکے گا، اس لیے ۱۷۰۲ء میں دونوں کمپنیاں مل کر متفق ہوگئیں، چنانچہ اس واسطے ان کا لقب یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی متحد کمپنی ہند مقرر ہوا) ۱۶۱۲ء میں با اجازت نور الدین جہانگیر بادشاہ کے اس کمپنی تجاران نے سورت، احمد آباد بمبئی میں چند کارخانہ جات سوداگری کے تعمیر کئے اور با اجازت راجہ مدراس کے ایک قلعہ درمیان مدراس کے تعمیر کرکے اس کا نام قلعہ سنیٹ جارج رکھا، جب چارلس دوم بادشاہ انگلستان کی شادی ۱۶۶۲ء میں شاہ پرتگال کی بیٹی کیتھرائن سے ہوئی تو بادشاہ پرتگال نے اپنی بیٹی کے جہیز میں چارلس دوم کو جزیرہ عنایت کیا تھا، کمپنی تجاران ہند نے باامید اس کے کہ کچھ زمینداری اور ریاست اس ملک کی پیدا کرنی ضرور ہے اور اس خیال سے کہ ڈچ لوگوں نے بہ نسبت سوداگری کے ملکیت زمین زیادہ حاصل کر کے ولایت میں ناموری اور تعریف حاصل کی تھی، شاہزادہ عظیم الشان ابن عالمگیر سے جو کہ بادشاہ فرخ سیر کا باپ تھا اور ان ایام میں بنگالہ کا صوبہ دار اور روپیہ کا ضرورتمند تھا، کلکتہ اور اس کی مضافات کی زمینداری خریدی اس وقت انگریزوں کی کوٹھی کلکتہ میں اور فرانسیسیوں کی چندر نگر میں اور ڈچ کی جزیرہ میں واقع تھی یہ تینوں کوٹھیاں دریائے ہوگلی کے کنارے واقع تھیں، پھر ۱۷۱۵ء میں کمپنی تجاران ہند نے بہ ارادہ حصول مراحم سلطانی ایک ایلچی معہ تحائف

اور نذر بحضور شاہ فرخ سیر بادشاہ دہلی کے روانہ کیا اس ایلچی کے ہمراہ ایک ڈاکٹر مسمی ہملٹن صاحب جو فن طبابت میں بڑی مہارت رکھتا تھا وارد دارالسلطنت شاہ ہند ہوا یہاں آکر اس کو یہ خبر لگی کہ بادشاہ سخت بیمار ہے اور اسی بیماری ہی کے باعث بادشاہ کی شادی جو راجہ جودھ پور کی لڑکی سے قرار پائی تھی جس کا بادشاہ نہایت شائق اور عاشق تھا ملتوی ہو گئی اور ہندوستانی حکیم بادشاہ کی بیماری سے ناچار رہیں ہملٹن صاحب نے علاج کی درخواست کی اور باشتیاق تمام منظور ہوئی آخر کار صحت کے بعد بادشاہ بہت خوش ہوئے اور ارشاد کیا کہ اس علاج کے عوض جو تم مانگو میں دوں، صاحب نے اپنی غرض نفسانی پر توجہ نہ کر کے اپنی قوم کی بھلائی اور خوش اقبالی مقدم سمجھ کر عرض کی کہ حضور یہ جو کمپنی تجاران انگلینڈ بادشاہ کی قلمرو میں سوداگری کرتے ہیں بندہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ان کی اجناس کا محصول معاف ہو جائے اور کچھ زمین سرکار سے مرحمت ہو تاکہ اپنی حفاظت کے واسطے مکانات تعمیر کر کے سپاہ اور پہرہ رکھیں چنانچہ یہ درخواست فوراً منظور ہوئی اس لیے انگریزوں نے ایک قلعہ کلکتہ میں تعمیر کر کے اس کا نام فورٹ ولیم رکھا اور زمینداری اپنی بہت بڑھائی۔ فرانسیسی لوگ پانڈی چری پر قابض تھے ان کے گورنر ایم ڈوپلے نے چاہا کہ نظام الملک پوتے مظفر جنگ کو صوبہ دکھن کا اور اس کے رشتہ دار حیدر علی کو نواب کرناٹک کا بناؤں انگریزوں نے ناصر جنگ ابن نظام الملک کو اپنے سے ملا کر اس کو کمپنی کا نواب بنانا چاہا چنانچہ اس باعث سے کئی لڑائیاں فرانسیسوں اور انگریزوں میں ہوئیں جن کا انجام یہ ہوا کہ فرانسیسیوں نے شکست پائی اور ان کے کارخانہ جات تباہ و برباد ہو گئے ۔(۱)

غدر سے پہلے کے تمدنی، تہذیبی اور معاشی حالات

قبل اس کے کہ ہم غدر سے پہلے کے سیاسی حالات اور ماحول پر ایک نظر ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے تمدنی، ثقافتی اور تہذیبی حالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں کہ حالات واضح اور واشگاف طور پر پیش نظر

---

(۱) واقعاتِ ہند، ص ۱۳۹ مطبوعہ ۱۸۷۵ء

رہیں، ایک محقق نے ان حالات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے، ہم اس کی تحقیق پر اکتفا کرتے ہیں:

در کفے جام شریعت در کفے سنداں عشق

دہلی اسلامی ہند کی ابتداء سے تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز رہی ہے، دجلہ و فرات سے علم و عرفان کی جو موجیں اُٹھی ہیں وہ جمنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں وہ یہیں آکر ٹھیرے ہیں۔ کبھی اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں قدم قدم پر مدرسے تھے[1] کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں، تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لیے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے ہندوستان کا یہ دارالسلطنت رشک بغداد و غیرتِ مصر بنا ہوا تھا (۲)

دکن سے جو طوفان اُٹھتا لال قلعہ سے آکر ٹکراتا، پنجاب سے جو آندھی اُٹھتی اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے، جاٹوں کا جو ہنگامہ برپا ہوتا اس کی جولان گاہ یہ ہی بدبخت شہر بنتا، لیکن ان تمام مصیبتوں کے باوجود بھی دہلی انتہائی بارونق تھی ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے کارواں رفتہ کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا، ان نفوس قدسیہ کی موجودگی نے دہلی کو، تمام ممالک اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں شام۔ مصر، چین اور حبش[3] کے لوگوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے تو دوسری طرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی بارگاہ کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے[4] سلطنت دم توڑ رہی تھی سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں لیکن ذہنی شعور ابھی مُردہ نہ ہوا تھا کچھ بیدار

---

(۱) ملاحظہ ہو مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ) ص ۲۹

(۲) تاریخ فیروز شاہی۔ برنی ص ۲۴۱

(۳) آثار الصنادید۔ ص ۱۰۱ (باب چہارم)

(۴) شاگردان وے دراقالیم دُور و دراز رسیدہ باب علوم دینی بروئے خلق کشادند" خزینۃ الاصفیا جلد دوم ص ۳۸۸

معززِ انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے۔

دھوپ چھاؤں کا شہر

ان تمام کوششوں کے باوجود دہلی دھوپ چھاؤں کا شہر تھی یہاں خانقاہیں بھی تھیں شراب خانے بھی، مدرسے بھی تھے، اور قمار بازی کے اڈے بھی دہلی کی متضاد خصوصیت اس زمانے کے بہت سے لوگوں کی زندگی میں بھی پائی جاتی تھیں لوگ بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے پھر اسی جوش اور ولولہ کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی اور رندی مذہبیت پر غالب آتی نہ مذہب رندی پر شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا اگر حالات نہ بدلتے تو مسلمان

"اندکے از زمان تنگ زاد کہ قومے شوند کہ نہ اسلام را دانند نہ کفر را (۱)

اس زمانے کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ نہ رندی سے واقف تھے نہ مذہبیت سے دو متضاد چیزوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ نہ رندی ہاتھ سے نہ جائے نہ مذہبیت کا دامن چھوٹے لیکن یہ ایک خود فریبی تھی سے

نیک و بد در آدمی پنہاں نمی ماند چناں
نافہ در جیبِ ملوک و بادہ در جامِ بلور (خسروؒ)

معاشی اور مالی حالات

اورنگ زیب نے تقریباً ۲۶ سال تک اپنی سلطنت کے سب ذرائع کا رُخ دکن کی جانب کر دیا تھا ان لڑائیوں میں کروڑوں روپیہ صرف ہُوا تھا لیکن عالمگیر کے تدبر معاملہ فہمی انتظامی قابلیت اور سیاسی بصیرت نے ملک کی اقتصادی حالت کو بگڑنے سے بچا لیا تھا اس نے ان تمام اخراجات کے باوجود ۲۴ کروڑ روپیہ آگرہ کے قلعہ میں چھوڑا تھا (۲) اس کے نااہل جانشینوں نے یہ روپیہ آنکھ بند کر کے بہا دیا،

---

(۱) سیاسی مکتوبات ص ۵۲

(۲) IRVINE : LATER MUGHALS VOL. I. P. 21.

اُدھر مُلک کے ذرائع محدود ہوتے چلے گئے اور رفتہ رفتہ سارا اقتصادی نظام متزلزل ہوگیا اور یہ سیاسی اور سماجی نظام کے گر جانے کا پیش خیمہ تھا۔

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ حد سے زیادہ فیاض تھا اس کی فیاضی نے سلطنت کی مالی حالت کو تباہ کر دیا پھر جہاں دار شاہ نے اپنی عیاشی میں بے دریغ دولت کو لٹایا اس کی محبوبہ لعل کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا، دربار میں عیش و طرب کی جو محفلیں جمتی تھیں ان میں کثرت سے چراغاں کیا جاتا تھا کہ دہلی میں تیل کی قلت ہوگئی تھی اور اس وجہ سے تیل کا نرخ بڑھ گیا تھا گیہوں روپیہ کا ۲ سیر بکنے لگا، فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو حالات اور خراب ہوگئے اس کو گھوڑوں کا شوق تھا ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اس کے اصطبل میں بندھے رہتے تھے اور ہزاروں روپیہ ان پر خرچ ہوتا تھا، اس گرتے ہوئے نظام پر نادر شاہ کے حملہ نے ضرب آخر کا کام کیا۔ وہ ۷۰ کروڑ سے زائد روپیہ باہر لے گیا۔ اس کے بعد شاہی خزانہ اور امراء کے محلات بالکل خالی نظر آنے لگے۔

احمد شاہ کے زمانہ میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو ڈھائی سال تک محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، اس زمانے میں شہزادیوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے ہیں۔(۱)

ہندو مسلم تعلقات

ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی برطانوی عہد سے شروع ہوتی ہے "لڑاؤ اور حکومت کرو" برطانوی سامراج کا تقاضہ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے نفاق اور اختلافات عمداً پیدا کیے گئے تھے، سر ہنری ایلیٹ نے اس زہر کو تاریخ ہند کی رگوں میں پہنچا کر اس طرح تاریخی مطمح نظر کو خراب کیا کہ اس کے خلاف آج جو بات کہی جاتی ہے وہ شک آمیز تعجب سے سُنی جاتی ہے۔

برطانوی عہد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ تھے زندگی کے

---

(۱) تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی) صفحہ ۱۹۰ نمبر FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL II. P. 36 - 37.

ہر شعبہ میں خلوص و محبت، اتحاد و یگانگی کے اثرات کارفرما نظر آتے تھے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ علمی اور ادبی ذوق پیدا کر لیا تھا ہندی اور فارسی کا مطالعہ ہندو اور مسلمان دونوں کرتے تھے اور ان دونوں زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی تشکیل کا سامان بہم پہنچا رہے تھے۔

اردو ہندو اور مسلمانوں دونوں کی محبوب زبان تھی، گلشن بے خار[1] میں شیفتہ نے ۱۶ ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے "نغمۂ عندلیب[2]" میں حکیم میر قطب الدین باطن نے ۸۰ ہندو شعراء اردو کا تذکرہ لکھا ہے۔

(۲) مغلیہ دور کا ایک مشترکہ کلچر تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر رنگے ہوئے تھے کنور پریم کشور فراقی، اپنا نجی روزنامچہ اس طرح شروع کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا فتاح

"حمد و ثنا بادشاہ ہے را سزا کہ سلطنت کونین بوجود اد دست و شاہاں روئے زمین و خداوندان چتر و نگیں وافتخار بہ فضل او . . . درود تحیات و سلام زاکیات برآں سرور کہ در شان او" لولاک لما خلقت الافلاک ـــــــــ" نازل شدہ و صلوات بیغایات و نیاز بے نہایات برابن عم و وصی اعظم او کہ مظہر العجائب و اسد اللہ الغالب و صاحب ذوالفقار قسیم الجنت والنار است صلوٰۃ اللہ علیہا و علیٰ آلہ اجمعین۔" (۳)

---

(۱) مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۹۱۰ء

(۲) مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۸۷۵ء

(۳) وقائع عالم شاہی (امتیاز علی عرشی) ص۲

(۳) اٹھارویں صدی کے مسلمانوں کے ہندو مذہب کے متعلق خیالات معلوم کرنے ہوں تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا مکتوب چہاردہم[1] غور سے مطالعہ کرنا چاہیئے انھوں نے ہندوؤں کو مشرکان عرب کے مشابہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا ہے اور وید کو الہامی کتاب مانتے ہوئے ہندوؤں کو اہل کتاب کا مرتبہ دیا ہے۔

(۴) ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے، مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ خود شاہان مغلیہ ہولی اور دسہرہ کا تہوار مناتے تھے۔

(۵) ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ ہندو مسلمان امیروں کے یہاں اور مسلمان ہندو امیروں کے یہاں ملازمت کرتے تھے، میر تقی میر جب عسرت و تنگی کے دن گذارتے تھے تو ہندوؤں ہی نے ان کی مدد کی، خان آرزو سودا مصحفی غالب وغیرہ کے محسنوں کی فہرست میں ہندوؤں کے نام بھی ملیں گے۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ لالہ برج لال کی پرزور سفارش ایک امیر سے کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

ذکر کسے بایں اہتمام باشما نکردہ	کسی کا ذکر میں نے اس انداز میں نہیں کیا ہے
ایم وعادت بمبالغہ ندا ریم (۲)	میری مبالغہ کی عادت نہیں ہے

سرسیّد احمد خاں کے نانا نواب دبیر الدولہ فریدالدین خاں نے اپنے انتقال سے قبل جو جائداد تقسیم کی تو اپنے ایک قدیم ہندو دیوان لالہ تلوک چند کو برابر کا

(۱) کلمات طیبات، ص۳۷ تا ۴۰

(۲) کلمات طیبات، ص۶۵ ۔ ۶۴

حصّہ دیا (۱)

(۶) پھر ہندو اور مسلمان کھیلوں میں شریک ہوتے تھے ساتھ رہتے تھے اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے غدر سے پہلے کا ذکر ہے کہ دہلی میں تیراندازی کا ایک کلب تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ سرسیّد نے ایک ذی عزت ہندو کا قصّہ لکھا ہے کہ وہ تیر لگاتے وقت اللہ غنی کہتا تھا اور اس لیے اس کا نام ہی اللہ غنی[۲] پڑ گیا تھا۔(۳)

سیاسی حالات

اب ہم اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی حالات کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال و انحطاط میں کون کون سے موثرات اور عوامل کارفرما تھے، اور یہ عظیم الشان سلطنت کس طرح نذر اغیار ہوگئی؟

داستان طویل بھی ہے، اور دردناک بھی، لیکن اسے سنے بغیر چارہ بھی نہیں، اس عنوان کے ماتحت، جو واقعات و معلومات درج ہیں، ان کا ماخذ، تاریخ مشائخ چشت ہے، اس بحث کو فاضل مولف نے بڑی دقت نظر اور تفصیل سے بیان کیا تھا، ہم نے اسے مختصر کرکے پیش کیا ہے:

" اٹھارویں صدی عیسوی، صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا میں بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کامیاب طور پر لڑی جا چکی تھی۔ انقلاب فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو ابھار دیا تھا

(۱) سیرت فریدیہ صہ ۳۶

(۲) سیرت فریدیہ صہ ۴۲

(۳) تاریخ مشائخ چشت صہ ۳۵۲

پرانا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو رہا تھا اور انگلستان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کو فرانس میں ایک نئی دنیا جنم لیتی دکھائی دے رہی تھی

لیکن عالمِ اسلامی کی حالت بالکل مختلف تھی۔ وہاں عام رُجحان پستی اور تنزّل کی جانب تھا ایک طرف دولتِ عثمانیہ کا آفتاب اقبال تیزی کے ساتھ گہن میں آ رہا تھا۔

دوسری طرف ایران میں انتشار و ابتری کا دَور دورہ تھا۔ اِدھر سلطنتِ مغلیہ دم توڑ رہی تھی۔ نئی نئی قومیں ابھر کر سیاسی فضا کو مکدر کر رہی تھیں اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست اور سماج کی ساری بنیادیں ہمیشہ کے لیے ہل جائیں گی۔

۳ مارچ ۱۷۰۷ئ کو اورنگ زیب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ تقریباً نصف صدی تک وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں اس نے اپنے بیٹوں کو وصیّت کی کہ وہ صلح اور خوش دلی کے ساتھ سلطنت کو تین حصّوں میں تقسیم کر لیں یہ وصیّت حالات کے گہرے مطالعہ اور اپنے بیٹوں کی صلاحیتوں کے صحیح جائزے پر بنی تھی۔ عالمگیر کی دُور بیں نگاہوں نے ان طاقتوں کو اُبھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جن کا اِستیصال ایک مرکز سے قطعاً ناممکن تھا۔ لیکن اس کے تنگ نظر اور خود غرض جانشینوں نے اس وصیّت کی طرف توجّہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہو کر مخالف قوّتوں کو دبانے میں صرف کی جا سکتی تھی، آپس میں لڑ کر ختم ہو گئی۔

اور وہ سلطنتِ مغلیہ جس کا اقتدار کبھی کشمیر سے دکن اور بنگال سے کابل و قندھار تک تسلیم کیا جاتا تھا وہ سمٹ کر قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں آ گئی (۱)

مرکز کو کمزور پا کر صوبائی حکومتوں کا اعلانِ خود مختاری کر دینا بالکل فطری بات تھی، چنانچہ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خان نے بنگال میں اور نظام الملک نے دکن میں اپنا

---

(1) FALL OE THE MUGHAL EMPIRE VOL I. P. 439.

اقتدار قائم کرلیا اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی ذرائع ختم ہو گئے۔
ان حالات میں ناگزیر تھا کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کر سکتے ہوں قسمت آزمائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ سکھ۔ مرہٹے۔ روہیلے۔ جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامہ آرائی کی، اور حالات کو اس درجہ خراب کر دیا کہ امن و سکون ملک سے مستقل طور پر رخصت ہو گیا۔ فتنہ و فساد منافرت و عداوت لوٹ مار اور غارت گری نے سماجی زندگی کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔

سکھ پندرھویں صدی میں اسلام کے اثر سے ہندوؤں میں جو مذہبی رہنما پیدا ہوئے تھے ان میں گرو نانک (۱۴۶۹-۱۵۳۸) کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہے وہ بڑے وسیع مشرب کے انسان تھے۔ وحدانیت، اخلاقی زندگی اور سماجی مساوات پر ان کا ایمان تھا مسلمان بزرگوں اور صوفیہ کی صحبت سے وہ کافی مستفیض ہوئے تھے۔ پاک پٹن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے سجادہ نشینوں کی صحبت سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ (۱)

جب تک سکھوں کی تحریک خالصتاً مذہبی رہی۔ مسلمان بادشاہوں نے اس کے رہنماؤں کے ساتھ بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ لیکن جب اس نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا تو مغل بادشاہوں کے تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ مشہور ہے کہ جب بابر ہندوستان آیا تو گرو نانک کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضر ہوا۔ (۲) جب اکبر چتوڑ پر حملہ آور ہوا تو بھگوان داس کو گرو امر داس کے پاس دعا کے لیے روانہ کیا (۵) کہتے ہیں کہ اکبر نے خود حاضر ہو کر ان سے بارہ دیہات قبول کرنے کی درخواست کی تھی (۳) گرنتھ پر ۵۱ اشرفیاں چڑھائی تھیں گرو ارجن کی سفارش پر پنجاب کا ایک سال کا لگان معاف کر دیا تھا (۴)، امرتسر جس کا قدیم نام گرو چاک ہے، اکبر ہی نے سکھوں

---

(۱) MACAULIFFE III. P. 28.

(۲) تاریخ ہند، مولوی ذکاء اللہ مرحوم، جلد ۹ صفحہ ۴۹

(۳) تاریخ ہند صفحہ ۴۹

(۴) تاریخ ہند جلد ۹ صفحہ ۵۲

(۵) چاک ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ گرو چاک کے معنی ہوئے وہ ٹکڑا جو گرو کو پیش کیا جائے۔

کو دیا تھا۔ مغل بادشاہوں کے یہ تعلقات اس وقت تک رہے جب تک سکھوں کے رہنماؤں نے سیاست میں مداخلت نہیں کی، جونہی اس تحریک نے رنگ بدلا، شاہانِ مغلیہ کے رویہ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ مسلمان بادشاہوں کی مخالفت کا سبب کوئی مذہبی عناد نہ تھا۔ بلکہ اس کی وجہ کلیتاً سیاسی تھی۔(۱) گرو ارجن نے ایک سیاسی نظام تیار کیا اور امرتسر کو عسکری مرکز بنا کر کابل سے ڈھاکے تک جہاں جہاں سکھ بستے تھے ان سے محصول لینا شروع کیا۔ اس طرح بقول تاراچند ایک مذہبی برادری "ایک حکمران طبقہ میں منتقل ہوگئی"(۲)۔ دولت کی ہوس اس قدر بڑھ گئی کہ خود سکھوں میں مشہور ہوگیا کہ دنیا کی دولت گرونانک سے بارہ کوس کے فاصلہ پر تھی۔ گرو وانگد سے ۶ کوس پر گرو امرداس کے دروازہ پر اور گرو ارجن کے گھر میں(۳)

سکھوں کا سب سے پہلا جھگڑا جہانگیر سے ہوا۔ گرو ارجن (۱۶۰۹ - ۱۵۸۱) نے شہزادہ خسرو کو جس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی، پناہ دی۔ جہانگیر نے اس بات پر گرو کو دربار میں بلایا اور جرمانہ کیا۔ جب انھوں نے جرمانے کی ادائیگی سے انکار کیا تو ان کو سزا دی گئی۔ ڈاکٹر بینی پرشاد نے صحیح لکھا ہے کہ سزا صرف سیاسی اسباب کی بنا پر دی گئی۔ اگر گرو ارجن ایک باغی شہزادے کی مدد نہ کرتے تو وہ بلا ضرر اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دن گذار سکتے تھے(۴)۔ سر جادو ناتھ سرکار کا بھی یہی خیال ہے کہ اس قتل میں کوئی مذہبی جذبہ شامل نہ تھا یہ سزا وہی تھی جو معمولاً سیاسی مجرموں کو دی جاتی تھی (۵)۔

---

(۱) SARKAR : HISTORY OF AURANG-ZEB VOL III. P. 305.

(۲) HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE P. 269.

(۳) تاریخ ہند۔ مولوی ذکاء اللہ مرحوم۔ جلد ۹ صفحہ

(۴) HISTORY OF JAHANGIR P. 130.

(۵) تاریخ اورنگ زیب جلد سوم صفحہ ۳۰۵ (انگریزی)

گرو ھر رائے (۱۶۶۱-۱۶۴۵) نے جنگ تخت نشینی کے دوران میں دارا شکوہ کو مدد دی (۱) اور اورنگ زیب سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ پھر تیغ بہادر (۱۶۷۵-۱۶۶۴) نے کشمیر کے ہندوؤں میں بغاوت پھیلانا شروع کی، تو اورنگ زیب نے اُن کو قتل کر دیا۔ (۲) گرو گوبند سنگھ (۱۷۰۸-۱۶۷۵) سے بھی اِس کے تعلقات خراب رہے۔ ۱۶۷۶ء میں جب بادشاہ جامع مسجد سے نکل رہا تھا تو ایک سکھ نے بادشاہ پر اینٹیں پھینکیں (۳) اب سکھوں کی دشمنی صرف بادشاہوں ہی تک محدود نہ رہی، عام مسلمانوں سے بھی مخالفت شروع ہوگئی۔ سکھ رہنماؤں نے حکم دیا کہ کوئی سکھ مسلمان بزرگ کی قبر پر نہ جائے، اگر جائے گا تو ۱۲۵ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ (۴)

اورنگ زیب نے جب اس کے سیاسی اقتدار کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور سلطنتِ مغلیہ سے اُن کی دشمنی کا یقین ہوگیا تو ان کے استیصال کی کوشش شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اجتماعی وحدت کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ ان کا ایک مرکز رہا نہ ایک رہنما، اورنگ زیب کے کمزور جانشینوں نے ان کی لالچ کو اور بڑھایا اور ان کی چیرہ دستیاں اور مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ

"زنہائے حاملہ را شکم دریدہ و جنین را کشیدہ می کشتند" (۵)

بندہ کے مظالم سے تمام شمالی ہندوستان گھبرا اٹھا۔ ۱۷۱۰ء میں جب سرہند پر سکھوں کا حملہ ہوا تو بہت سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھروں میں بھیس بدل کر پناہ لی (۶) ان کے مظالم

---

(۱) اروِن جلد اول ص ۷۷ (انگریزی)

(۲) تاریخ اورنگ زیب۔ سر جادو ناتھ سرکار۔ جلد سوم ص ۳۱۶

(۳) مآثر عالمگیر ص ۱۵۴

(۴) تاریخ اورنگ زیب جلد سوم ص ۳۱۶

(۵) سیر المتاخرین ص ۴۰۲

(۶) اروِن جلد اول ص ۹۲

زندوں تک محدود نہ رہے، شاہ قمیص قادریؒ کا مزار خود ان کی اولاد سے جبراً کھدوایا گیا (۱)
سہارنپور میں عورتیں سکھوں کے ڈر سے کنوؤں میں ڈوب کر مر گئیں (۲) بعض لوگوں نے قتل و
غارت گری کے اس ہنگامہ میں اپنے نام بدل دیئے (۳)
۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور اہمیت میں اضافہ ہو گیا
۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور سکھوں کو ہنگامہ
آرائی کا موقع ملا۔ انھوں نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے جمنا تک اپنا تسلط قائم
کر لیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان ان کا اقتدار اور بڑھا۔ اٹک سے کرنال تک اور
ملتان سے جموں تک ان کے قبضہ میں آ گیا۔

اب انھوں نے دوآب اور روہیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیئے۔ انیسویں صدی
کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا اور سکھوں کی طاقت پورے
عروج پر پہنچ گئی۔

مرہٹے

اورنگ زیب کے مرنے کے بعد مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔
دکن اور گجرات کی صوبہ داری پر امراء آپس میں جھگڑتے تھے اور مرہٹوں کی طاقت
بڑھتی تھی (۴) جب مرہٹوں کا طوفان شمال کی جانب امنڈتا تھا تو اس کا مقابلہ کرنے کی بجائے
حکومت کی طرف سے مرہٹوں کو مراعات دی جاتی تھیں، تاکہ وقتی طور پر وہ طوفان رک جائے۔
ان مراعات نے مرہٹوں کی ہمت میں اضافہ کر دیا۔ جب فرخ سیر اور سید برادران میں کشمکش

---

(۱) ارون جلد اول ص ۹۷

(۲) ارون جلد اول ص ۱۰۱۔ تاریخ ہند (مولوی ذکاء اللہ) جلد ۹ ص ۶

(۳) دستور الانشاء۔ یار محمد ص ۸

(۴) سر جادو ناتھ سرکار: زوال سلطنت مغلیہ، جلد اول ص ۶۷

ہو رہی تھی۔ تو سید حسین علی نے دکن میں مرہٹوں کو اپنا ساتھی اور مددگار بنانے کی نیت سے بالاجی وشوا ناتھ کو تمام دکن سے ۔ چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق دے دیا۔(۱) بادشاہ نے اِس حق کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو حسین علی فروری ۱۷۱۹ء کو مرہٹوں کی فوج کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہُوا ——— !! یہ واقعہ گو اس ماحول میں جو عالم گیر کے بعد پیدا ہوگیا تھا، کچھ غیر معمولی نہ تھا لیکن جس دن حسین علی مرہٹوں کو اپنا مددگار بنا کر مغلوں کے دارالسلطنت میں لایا تھا، اس دن مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا جنازہ اُٹھ گیا تھا! ڈاکٹر سہنا نے لکھا ہے کہ مرہٹوں کا اس وقت دہلی آنا اُن کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا۔ وہ اس وقت ملازمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ مددگار کی حیثیت سے آئے تھے ۔ بالاجی وشوا ناتھ کے بعد اس کے بیٹے باجی راؤ (۱۷۲۰-۴۰) نے مالوہ اور گجرات سے خراج وصول کیا اور بندھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۳۲ء-۴۳ء میں مرہٹوں کا یہ حال تھا کہ گوالیا سے بنگال پہنچ گئے بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے لکھا ہے ۔

"برگیون (مرہٹوں) نے دیہاتوں کو لوٹنا شروع کر دیا ——— کچھ لوگوں کے انھوں نے ہاتھ، ناک اور کان کاٹ لیے۔ خوب صورت عورتوں کو وہ رسّیوں میں باندھ کر لے گئے۔ جب ایک زنا کر چکتا تھا تو دوسرا کرتا تھا۔ عورتیں چیخیں مارتی تھیں ——— انھوں نے گھروں کو آگ لگا دی اور ہر طرف لوٹ مار کرتے ہوئے گھومے" (۲)

وینشور روپالنکر نے لکھا ہے کہ شاہو راجہ کے فوجی سپاہی، حاملہ عورتوں اور بچوں کو برہمنوں اور غریبوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ قتل کرتے تھے۔ وہ ہر طرح کے گناہ کا ارتکاب کرتے تھے اور جدھر سے گذر جاتے ایک قیامت برپا کرتے ۔ (۳)

(۱و۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: H. N. SINHA : RISE OF THE PESHWAS.

SARKAR : FALL OF THE MUGHAL EMPIRE VOL I. P. 86-88.

ان حالات میں لوگوں کو اپنی زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے مجبور ہو کر احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان آکر مرہٹوں کے تسلط سے خلاصی دلائے(۱) احمد شاہ ابدالی ہندوستان آیا اور پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کی طاقت سے ٹکرایا۔ اس جنگ نے مرہٹوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا اور بقول سرکار مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ رہا جہاں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ دس سال تک مرہٹوں نے شمال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کے بعد دو تین بار انھوں نے اپنی طاقت کو مجتمع کر کے شمالی ہندوستان پر تسلط جمانے کی کوشش کی اور اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی مگر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے مقابلہ میں ان کو کوئی مستقل کامیابی حاصل ہونا ممکن نہ تھا۔

جاٹ اورنگ زیب کے آخری عہد میں جاٹوں کو عروج حاصل ہوا۔ انھوں نے دہلی اور آگرہ کے گرد و نواح میں اپنی گڑھیاں بنائیں اور تمام علاقہ میں لوٹ مار شروع کر دی۔ حد یہ ہے کہ اکبر کے مقبرے میں سے اس کی ہڈیوں کو نکال کر جلایا۔ (۲)

یہ برتاؤ اُس اکبر کے ساتھ تھا جس نے بندرابن اور متھرا میں جگل کشور گوپی ناتھ گوبند دیو وغیرہ مندر اپنے صرفہ سے جاٹوں کے لیے بنوائے تھے۔ (۳)

---

(۱) آنند رام مخلص نے شاعرانہ انداز میں بات کہی ہے۔

بر دل ما تیرہ روزاں زان صیف مژگان گذشت
آنچہ از فوج دکن بر ملک ہندوستان گذشت
در چمن بر برگ گلہا نگذرد صبح از نسیم
بر گریبان آنچہ از دستم شب ہجران گذشت

(تصانیف آنند رام مخلص، قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ)

(۲) وقائع عالمگیری۔ چودھری نبی احمد سندیلوی ص ۹۵-۴۹

(۳)

جاٹوں کے مظالم سے دہلی اور اردگرد کے باشندے سخت پریشان ہو گئے تھے۔ ہرچنداس مصنف چہار گلشن شجاعی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ "جب جاٹوں نے لوٹ مار شروع کی تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ میں اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے وہ دربدر گلی بہ گلی مارے مارے پھرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔" (۱)

روہیلے

سترھویں صدی میں افغانوں کے کچھ جتھے ہندوستان آکر مختلف مقامات پر بس گئے، بریلی، شاہجہان پور، فرخ آباد میں خاص طور سے ان کی نوآبادیات قائم ہوئیں فرخ آباد کے افغانوں نے محمد خاں بنگش کی قیادت میں بڑا عروج حاصل کیا۔

بریلی کے افغان قبائل۔ روہیلوں کے نام سے مشہور ہوئے اور انھوں نے اتنی تیزی کے ساتھ تنظیم کی کہ اٹھارویں صدی کی سیاسی دنیا میں اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرلی۔

اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی طبقہ اگر عیش و عشرت کی زندگی سے محفوظ تھا تو وہ صرف روہیلے تھے۔ حکمران کی حیثیت سے بھی اُن کی شان امتیازی تھی جادوناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ وہ اِس معاملہ میں مرہٹوں کے بالکل برعکس تھے۔ مرہٹے چوتھ وصول کرنے کے بعد کبھی یہ نہ سوچتے تھے کہ ان علاقوں کی نگہداشت کی اخلاقی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے یا نہیں (۲)۔ روہیلوں نے جن علاقوں پر حکومت کی ان کے باشندوں کو اپنی انصاف پسندی سے فتح کرلیا۔ جارج فارسٹر کہتا ہے کہ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں فارغ البالی اور خوشحالی پھیلا دی ہے گاؤں سرسبز و شاداب ہیں اور ہر طرف بحالی ہی بحالی ہے (۳)

---

(۱) قلمی نسخہ ص ۲۱۰

(۲) FALL OF THE MUGHAL EMPIRE I P. 56.

(۳) GEORGE FORSTER : A JOURNEY FROM BENGAL TO ENGLAND (LONDON 1793) VOL I. P. 98 - 99.

روہیلوں میں مذہبی جذبہ بدرجہ اتم تھا(۱) لیکن مذہبی تعصب نام کو نہ تھا۔ اکثر روہیلے مرزا مظہر جانِ جاناں کے مُرید تھے اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے(۲)۔ روہیلوں نے ہندو دیوان کثرت سے ملازم رکھے تھے۔ نجیب الدولہ خاص طور پر ہندوؤں کے تہواروں کے موقعوں پر ان کا خیال رکھتا تھا۔

بیرُونی حملے

اٹھارویں صدی میں ہندوستان پر متعدد بیرونی حملے ہوئے۔ ان حملوں نے ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات کو بد سے بدتر کر دیا اور باغیانہ قوتوں کو ابھار کر ہر طرف انتشار و ابتری کا ماحول پیدا کر دیا۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہُوا۔ شمالی ہند کے باشندوں کو عموماً اور دہلی کے باشندوں کو خصوصاً جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا اندازہ اس زمانہ کے لٹریچر سے کیا جا سکتا ہے لوگوں میں خوف و ہراس، قنوطیت۔ پست ہمتی کا یہ حال ہو گیا کہ وہ خودکشی پر آمادہ ہو گئے مغلوں کے خلاف ملک میں جتنی طاقتیں تھیں۔ ان کو اپنی قوت اور ذرائع بڑھانے کا موقع مل گیا سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ شاہ جہان اور اورنگ زیب کی دہلی پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ شاہانِ مغلیہ کا اقتدار ختم ہو گیا۔ بے حساب دولت ہندوستان سے باہر چلی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ اقتصادی اطمینان بھی ختم ہو گیا۔

مجموعی طور پر اگر اٹھارویں صدی کے ان حملوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے ملک کی سیاسی اور سماجی فضا کو اِس درجہ خراب اور ہندوستانیوں کو اِس قدر پست ہمّت کر دیا کہ جب یہاں برطانوی سامراج کا سیلاب آیا تو ملک کے کسی گوشے میں بھی مضبوط بند نہ باندھے جا سکے!

---

(۱) ملاحظہ ہوں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات بنام نجیب الدولہ۔

(۲) ملاحظہ ہو کلمات طیبات صفحہ ۶۶، ۶۸ وغیرہ

انگریزوں کا تسلّط

انگریزوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے اس حصّے پر قدم جمائے تھے۔ جو اس ملک کا سب سے زیادہ خوش حال علاقہ تھا اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا اقتصادی مرکز ثقل (ر) بنگال کی طرف منتقل ہو گیا تھا اورنگ زیب تک کے اخراجات آخری زمانہ میں بنگال کے محاصل سے چلتے تھے۔ انگریزوں کے بنگال پر مسلّط ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی شہ رگ اُن کے قبضہ میں چلی گئی۔

بادشاہوں اور امراء کی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے باعث انگریزوں کو اپنا اقتدار بڑھانے کا موقعہ ملا۔ ۱۷۱۴ء میں فرخ سیر نے کمپنی کو بغیر محاصل اور چنگی کے ملک میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جعفر اور صادق جیسے ننگِ وطن لوگوں نے ان کو اپنی طاقت بڑھانے میں مدد دی اور برطانوی سامراج کے مضبوط پنجے اس مُلک میں جم گئے۔

پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) کے بعد، کچھ بیدار مغز لوگوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ اپنے اختلاف کو دور کرکے اس پر آمادہ ہو گئے کہ سب متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ حد یہ ہے کہ حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ جن کی تحریک عموماً صرف سکھوں کی مخالفت کے پس منظر میں دیکھی جاتی ہے، غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے ہندوؤں سے تعاون اور اشتراکِ عمل کے کوشاں تھے۔ ملاحظہ ہو راجہ ہندو رائے کے نام خط (۱)

نادر شاہ کا نادری حملہ

مسلمانوں کے مصائب کی انتہا نہ تھی، ابتدا تھی ابھی موج خون سر سے گزری نہ تھی۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد تو ملک میں وہ ابتری اور انتشار پیدا ہو گیا کہ بقول ہر چرنداس، لوگوں پر دیوانگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مرہٹے جاٹ سکھ ـــــ تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا۔ میر تقی میر نے اسی زمانہ میں

---

(۱) مسلمانوں کے تنزّل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا؟ (ابوالحسن علی ندوی) صـ ۲۷۴

لکھا تھا ؎

جس جا کہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں
واں ہم نے ان ہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا (۱)

مرہٹے رخصت ہوتے ہیں انگریز آتے ہیں

مرہٹوں نے پَر پرزے نکالے وہ دلّی آ گئے، لال قلعہ کے محافظ بن گئے، بادشاہ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، نام بادشاہ کا تھا حکومت مرہٹے کرتے تھے :

"۱۷۷۱ء میں شاہ عالم عالمگیر ثانی کا بیٹا مرہٹوں کا پنشن خوار بن کر لال قلعے میں زندگی بسر کرنے لگا اور قریب قریب تمام ہندوستان کی سلطنت مرہٹوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ۱۷۸۸ء میں شاہ عالم نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ مرہٹوں کے پنجوں سے آزاد ہو جائیں۔ مگر بیچارے کامیاب نہ ہو سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹوں کی ایک مستقل فوج دلی میں رہنے لگی۔ (۲)

لیکن حالات نے پھر پلٹا کھایا، قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، ایک غیر ملکی طاقت اُبھر رہی تھی، وہ آگے بڑھی اور رفتہ رفتہ اس نے، نہ صرف مرہٹوں کو، سکھوں کو، جاٹوں کو، بلکہ مسلمانوں کو بھی ختم کر دیا، :

بڑا عظیم الشان معرکہ جنرل لیک کا ہے جو بھاگم بھاگ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء شہر دلی کے محاذی جمنا کے مشرقی کنارے کے وسیع میدان میں جو اُس زمانہ میں پانی سے بھرا اٹا پڑا تھا ایکدم نمودار ہو گئے

---

(۱) تاریخ مشائخ چشت ص ۳۲۲

(۲) چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۵۱

مرہٹوں کا پندرہ ہزار کا لشکر قلعہ سے ان کے مقابلہ پر اُترا۔ انگریزوں کی فوج میں جملہ چار ہزار نو سو نفری تھے گویہ تعداد فوج کی مرہٹوں کے لشکر کے مقابلے میں کم تھی مگر اس کمی کی تلافی اُن کی آراستگی اور جنرل کی قابلیت سے بخوبی ہوتی تھی تین بجے صبح سے ۷ بجے شام تک ایسی گھمسان لڑائی رہی کہ مرہٹوں کے چھکے چھوٹے بکھیر دیئے۔ ۱۴ ر ستمبر کو انگریزی ظفر یاب فوج شہر میں داخل ہو گئی، دو دن بعد جنرل لیک دیوان خاص میں نابینا بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے اور ڈگمگاتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی طرف سے بڑے بڑے لمبے خطابات "صمصام الدولہ اشجع الملک خان دوران جنرل لیک بہادر فتح جنگ" اور خلعت فاخرہ سے سرفرازی ہوئی۔ کرنل اکٹر لونی کمپنی کے ڈپٹی ایڈجوٹنٹ (اجیٹن) جنرل دلی کے رزیڈنٹ مقرر ہوئے بطور امتیاز خاص نواب گورنر جنرل بہادر کشور ہند نے ہر رجمنٹ کو جو اس جنگ میں شریک تھی اعزازی نشان مرحمت فرمائے اس لڑائی نے سندھیا کے لشکر کا قلع قمع کر دیا۔ (۱)

مرہٹے صرف یہی نہیں کہ دہلی سے بھاگے بلکہ :

سرجی ارجن کے گاؤں کے صلح نامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ معہ آگرہ دہلی کے انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شانِ عجم اور شوکتِ روم حقیر معلوم ہوتی تھیں۔ نیست و نابود ہو گیا، اور مغلوں کی حکومت سمٹ کر قلعہ کی چار دیواری تک رہ گئی۔

شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی مسند حکومت پر متمکن ہوا ۱۸۲۷ء میں اس کے مرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر جو دودمان، تیموریہ کا آخری چشم و چراغ تھا تخت نشین ہوا اس کی حکومت کی بساط ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں درہم برہم ہو گئی (۲)

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اوّل (بشیر الدین احمد) صفحہ ۶۸۴

(۲) کلاسکی ادب

انگریز کھیل کھیلے

انگریز اقتدار اور تسلّط حاصل کرنے کے بعد، کھیل کھیلے، جیسے جیسے طاقت بڑھتی گئی من مانی باتیں اور حرکتیں کرنے لگے، والسرائے نے بادشاہ کی توہین کی، پادریوں نے رعایا پر ڈورے ڈالے، فرنگی سامراج نے اپنا سکّہ چلایا، انگریزی عدالتوں میں شہزادے مدعی علیہ بن کر پہونچے، مسلمانوں سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا گیا:

(۱)

ناگپور سے خبر آئی ہے کہ شہر کامٹی میں پادریوں نے ایک اسکول بنا لیا تھا وہاں ایک ہندو لڑکا اپنے سرپرستوں (والدین ؟) کی مرضی کے خلاف عیسائی ہونے کے لیے پادریوں کے پاس آ گیا تھا، لڑکے کے سرپرستوں نے دربار ناگپور سے فریاد کی، راجہ ناگپور نے اپنے ریزیڈنٹ کو شکایات لکھی، ریزیڈنٹ نے پادریوں سے لے کر، سرپرستوں کے حوالے کر دیا (۱)

(۲)

دہلی کے صرّافوں نے درخواست گزاری ہے کہ یہاں ابھی تک لکھنؤ کے سکّہ کے روپوں کا لین دین جاری ہے اور کمپنی کے سکّے چہرۂ شاہی پر فیصدی ایک روپیہ صرّافہ (بٹّہ) لیا جاتا ہے حالانکہ کمپنی بہادر کا منشا ہے کہ کمپنی کا روپیہ رواج پذیر ہو شہر کے لوگوں کو عام طور پر اس بات کی شکایت ہے ضرور کیا ہے کہ مناسب انتظام کیا جائے۔ (۲)

(۳)

ایمہرسٹ نے ۱۷ فروری ۱۸۲۷ء کو شہنشاہ سے ملاقات کی، گورنر جنرل کی اس ملاقات سے شہنشاہ نے دل برداشتہ ہو کر راجہ موہن رائے کو انگلستان بھیجا، مغل شہنشاہ کی تذلیل کے بعد ایمہرسٹ شملہ روانہ ہوا۔ (۳)

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صد ۱۰۲

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صد ۹ ۱۸ اپریل ۱۸۳۰ء

(۳) کمپنی کی حکومت صد ۲۹۹

(۴)

۸ر مئی ۱۸۴۶ء آغا حید ناظر کے نام ایک شقہ جاری کیا گیا کہ سلاطین کو سمجھا دیا جائے کہ قرض لینے سے ہاتھ روکیں کیونکہ جب قرض خواہ عدالت انگریزی میں دعویٰ کرتے ہیں اور انھیں کچہری میں گھسٹنا پڑتا ہے تو خاندان تیموریہ کی بڑی بدنامی ہوتی ہے" (۱)

(۵)

مسلمان شہنشاہ کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حاکموں کو برطرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اسی برائے نام عظمت کے برائے نام تماشہ بن جانے کے بعد بہت کافی عرصے تک حتیٰ کہ ۱۸۳۵ء تک ہمارے سکّے اس کے نام سے جاری رہتے۔ پھر جب ہمیں یہ جرأت ہوئی کہ سکوں پر انگریزی بادشاہ کی شکل دے دی جائے۔ تب بھی ہم نے اسلامی دستور العمل اور عدالتوں میں اسلامی زبان کو برقرار رکھا۔ گو یہ باتیں بھی اپنی اپنی باری پر بتدریج مٹ گئیں" (۲)

راس کماری سے درّہ خیبر تک

پنجاب فتح ہونے سے ہندوستان کی لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہوا جو لارڈ آوک لینڈ کے زمانہ سے ۱۸۳۸ء میں جنگ افغانستان سے شروع ہوا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جو ہندوستان کے نقشہ میں سرکار کمپنی کی عملداری کے سرخ رنگ کو دیکھ کر پیشین گوئی کی تھی کہ نقشہ کا رنگ سارا سُرخ ہو جائے گا۔ وہ اس کے مرنے کے دس برس بعد پوری ہوئی۔ جنگ پلاسی سے ننانوے سال کے اندر سارا ہندوستان راس کماری سے لیکر درہ خیبر تک سرخ رنگ ہو گیا (۳)

بہادر شاہ کی درگت

اب صورت حالات یہ تھی کہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ "وہ انتظام سلطنت کے لیے بار تھے مگر اس وقت صحیح طور سے یہ بات

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۵۴

(۲) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص۳۲۵

(۳) تاریخ عروج انگلشیہ، (ذکاء اللہ) ص۶۰

نامناسب خیال کی گئی کہ انھیں دہلی سے ہٹا کر تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے کسی ترغیب پر وہ محل چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے اِس امر کا اندیشہ نہ تھا کہ اسلامی طاقت دوبارہ زندہ ہو جائے گی بلکہ یہ خیال تھا کہ بادشاہ کہیں ہندوستانی ریاستوں کے اتحاد کا مرکز نہ بن جائے وقتاً فوقتاً انگریزی اخبارات بادشاہ کو ہٹا دینے کا مشورہ دیتے تھے، ۱۳ار جنوری ۱۸۴۹ء کی اشاعت میں دہلی گزٹ نے جو صوبجات شمالی مغربی کا سب سے مشہور اخبار تھا حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا :- جمعرات کی صبح کو ولیعہد سلطنت شاہزادہ دارا بخت کا انتقال ہو گیا اور اُن کے بعد شاہزادہ فخرالدین ولیعہد قرار پائیں گے ہمارے پاس اس امر کے یقین کرنے کے وجوہ ہیں کہ شاہی خاندان کا حق جانشینی اس کے بعد ختم ہو جائے گا اس لیے کہ انفرادی طور پر ان سے اس کی ذمہ داری کر لی گئی ہے اور ایسی ذمہ داری اور کسی فرد خاندان سے نہیں کی گئی ہم صدق دل سے اعتماد کرتے ہیں کہ صورت حالات درحقیقت ایسی ہی ہے اور یہ کہ ہماری حکومت بادشاہ کے انتقال پر خاندان کو منتشر کرنے کا معقول انتظام کرے گی اور گذارے کے لیے مناسب پنشن کا بندوبست کرے گی،(۱)

فاقہ مست شہزادوں کی شورش

اور آخر نوبت یہاں تک پہونچ گئی ! ۲۴ر اگست ۱۸۴۲ء حضور انور کو اطلاع دی گئی کہ بعض سلاطین کا ارادہ ہے کہ جس وقت روپیہ خزانہ انگریزی سے خزانہ شاہی میں آئے تو جبراً روپیہ پر قبضہ کر لیں حضور انور نے یہ خبر سُنی تو صاحبکلاں بہادر کے نام ایک شقہ جاری فرمایا کہ روپیہ قلعہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ ہاتھی سواروں کا ایک دستہ خزانہ کے ساتھ تعین کر کے حضرت قطب الاقطاب قدس سرہ کے مزار کے متصل جو حویلی ہے وہاں روانہ کر دیا جائے تمام تنخواہ داروں کو روپیہ وہیں سے تقسیم کیا جائیگا۔ (۲)

---

(۱) غدر کی صبح و شام ص۲۸

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۴۳

یہ تھا وہ ماحول، جب ہندوستان کی مسلم حکومت ختم ہوئی، اور، انگریزی حکومت قائم ہوئی اس پس منظر کو پیش نظر رکھنے کے بعد، عہد بہادر شاہ کی سیاسیات کے سمجھنے، اور انحطاط و زوال کے اسباب و محرکات کی تہ تک پہنچنے میں بہت آسانی ہوگی،

مباحث کے بیان میں، عبارت آرائی، اور قافیہ پیمائی سے گریز کیا گیا ہے، زیادہ سے زیادہ اختصار، کے ساتھ، مستند ترین واقعات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ؛

باب ۳

بہادر شاہ

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

سراج الدین بہادر شاہ ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے، ۱۸۳۷ء میں تختِ شاہی پر متمکن ہوئے اور ۱۸۶۲ء میں بہ حالتِ غربت و جلاوطنی، قیدِ جسم سے آزاد ہو کر رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔ ان کی زندگی ایک مستقل المیہ تھی، سکونِ خاطر، فراغِ طبع اور اطمینانِ قلب کا ایک لمحہ بھی اس طویل زندگی میں انھیں میسر نہ آیا۔ جب تک وہ شہزادے رہے دوسرے بڑے بھائیوں کے سامنے ہیچ میرزی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے، جب ولی عہد کے انتقال کے بعد وہ ولی عہد مقرر ہوئے تو بوجود باپ —— معین الدین اکبر شاہ ثانی —— کے معتوب رہے، جب تختِ حکومت پر متمکن ہوئے تو آفات و مصائب نے استقبال کیا، بدبختی اور بدنصیبی نے سلامی دی، تباہی اور بربادی نے آغوشِ شفقت وا کیا، غربت اور جلاوطنی کی موت نے مبارک باد دی، غرض ولادت سے لے کر موت تک ان کی ساری زندگی، اگر مختصر کہیے تو ایک آہ ہے، طول دیجئے تو ایک مرثیہ!

وہ شخصاً اور طبعاً سراپا نیکی اور شرافت تھے، فطرت کی طرف سے دل دردمند لے کر آئے تھے، بے بضاعتی کے باوجود دوسروں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے، وہ کسی کے بدخواہ نہ تھے انگریزوں نے ان کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن ان کے ساتھ بھی انھوں نے بہت اچھا برتاؤ رکھا، مفسدوں اور سازشیوں کو بھی ان کے دربار سے اماں ملی، دشمنوں اور بدخواہوں کو بھی انھوں نے کبھی کوئی تکلیف نہ دی۔

بہادر شاہ مجموعہ محاسن تھے وہ ہنرور تھے، فن کار تھے، شاعر تھے، مصنف تھے، خطاط اور خوش نویس تھے، تیر پھینکنے، تلوار چلانے اور بندوق بازی میں مشاق تھے۔ ان کا دربار ہنروروں سے

دہلی کے آخری مغل تاجدار بادشاہ بہادر شاہ ظفر جنھوں نے حریت پسندوں
کے ساتھ شامل ہوکر اعلان کیا کہ وہ سارے ہندوستان کے بادشاہ ہیں

بھرا رہتا تھا۔ ان کی مجلس میں وہی بار پاتا تھا جو کچھ صلاحیتیں رکھتا ہو، زمانہ انہیں ادبار و انحطاط کے بھنور میں دھکیل رہا تھا، ان کی بادشاہت برائے نام رہ گئی تھی ان کا دبدبہ اور طنطنہ ختم ہو گیا تھا، ان کا جاہ و جلال رخصت ہو چکا تھا، ان کا دم خم جواب دے چکا تھا، لیکن باایں ہمہ وہ زندگی سے لڑتے رہے آفات و حوادث کا مقابلہ کرتے رہے ہر ناگواری میں خوشگواری کا پہلو ڈھونڈتے رہے، ہر دکھ اور تکلیف کو مردانہ وار جھیلتے رہے ؛

یہ ظلم ہوگا اگر ہم بہادر شاہ کی ذاتی اور صفاتی زندگی کا جائزہ نہ لیں گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہو :-

بہادر شاہ کا حلیہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے سراج الدین ظفر کا حلیہ اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے پہلے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ پھر بہادر شاہ کے احوال و سوانح پر ایک نظر ڈالیے :-

مرزا صاحب بہادر شاہ کی تصویر یوں کھینچتے ہیں :-

"دہلی میں وہ کون ہے جس نے ظل اللہ کو نہ دیکھا۔ میانہ قد بہت نحیف جسم کسی قدر لمبا چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں آنکھوں کے نیچے ہڈیاں بہت ابھری ہوئیں، لمبی گردن چوکا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، چھدری داڑھی، کلوں پر کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ لبیں کتری ہوئیں، ستر برس سے اونچی عمر، بال سفید بھک۔ لیکن پھر بھی داڑھی میں اکا دکا سیاہ بال چہرے پر جھریاں لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں بڑی کرارا پن، سبز کمخواب کا ایک برکا پائجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ زیب بدن سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی"[۱]

ہمہ صفت موصوف راقم الدولہ ظہیر دہلوی جو بہادر شاہ کے تشریف درباریوں میں تھے۔ اور ان کی شرافت کا ثبوت یہ ہے کہ بادشاہ کی جلاوطنی

---

[۱]: دلّی کی آخری شمع (صفحہ ۲۲-۲۳) ؛

کے بعد بھی وفادار ہے۔ اپنے آقائے ولی نعمت کے کمالات فن کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں :۔

فنِ سپاہ گری

بندوق ایسی لگاتے تھے۔ کہ بادونما یدٗ بال بندھا نشانہ اڑاتے کبھی نشانہ خطا نہ کرتا تھا بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ جانور اڑتا ہوا جاتا ہے ہوا اوپر بندوق دھری ہے اٹھائی اور جھونک دی، چھتیانے کی حاجت نہیں، لوٹ پوٹ ہوا اور ہوا دار میں آرہا ۔ دریا میں مچھلی یا مگر نے منھ نکالا اور گولی منخرین پر پڑی اور چت ہوگیا ۔

فنِ تیر اندازی

فن تیر اندازی میں بادشاہ آپا سنگھ سکھ کے شاگرد تھے بادشاہ کی کثرت تیر اندازی کا حال میں نے اپنے والد کی زبانی سنا ہے کہ بادشاہ زمانہ ولیعہدی میں جوان تھے، تیر اندازی کی مشق بڑھانے کو دیوان خاص میں ایک جرثقیل لگا رکھی تھی، تین من چنوں کی پوٹ نیچے لٹکتی تھی، جرثقیل کے ذریعہ اس کو چٹکی سے کھینچا کرتے تھے تیس ٹانک کمان کھینچنے پر قادر تھے، اچھی کمان کو کبادہ بنا کر پھینک دیتے تھے ، ایک دن سواری مبارک سلیم گڈھ سے قلعہ کو آتی تھی راستہ میں مرزا فتح الملک بہادر ولی عہد ثانی کا باغ تھا وہاں سے کچھ شور و غل کی آواز آتی تھی ، فرمایا غل کیسا ہے ؛ عرض ہوئی مرشد زادے تیر لگا رہے ہیں حکم ہوا سواری اُدھر سے چلو غرض کہ وہاں پہنچے، سب آداب بجالائے فرمایا تیر لگاؤ، سب تیر لگا رہے تھے، فرمایا تیر کمان ادھر لاؤ، کمانوں کی کشتی پیش کی گئی ،ان میں سے ایک کمان اٹھائی اور تین تیر کھینچ لیے۔ اور باقاعدہ کھڑے ہو کر ایک تیر لگایا۔ تیر تودہ میں پیوست ہوا ایک بالشت باہر رہا سب نے تحسین آفریں کی دوسرا تیر اور لگایا اس سے زیادہ تودے میں داخل ہوا، تیسرا وہ بالکل مغروق تھا، فقط لب سوفار ہی باہر باقی رہے اور تمام تیر غرق تھا نعرۂ تحسین آفریں بلند ہو گیا یہ میری چشم دیدہ بات ہے ؛

سپر شمشیر

پھیکتی کے فن میں بادشاہ میر حامد علی صاحب کے شاگرد تھے، میر حامد علی و میر اشرف علی دونوں بھائی استاد کامل تھے، ہندوستان کے بڑے بڑے رئیس ان کے شاگرد تھے علی مدد کی کثرت جو حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کی ایجاد سے ہے وہ ان کے گھرانے کی میراث تھی ۔

میں نے اپنے والد کی زبانی یہ سنا ہے کہ بادشاہ تنہا آٹھ آدمیوں کے مقابل یکدم کثرت کیا کرتے تھے اور آٹھ آدمی برابر ان پر چوٹ آتے تھے اور بادشاہ سب کے وار روکتے تھے اور اپنی چوٹ چھوڑتے جاتے تھے اس قدر مشق بہم پہنچائی تھی۔

فنِ شہسواری

مشہور روزگار ہے کہ ہندوستان میں ڈھائی سوار تھے، ایک بہادر شاہ، دوسرے آپ کے بھائی مرزا جہانگیر جنھوں نے انگریزوں سے شرط بدکر الہ آباد کی خندق گھوڑے سے کدوائی تھی اور نصف سوار کوئی مرہٹہ مشہور تھا۔ لیکن اب بھی جس گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے اپنی شہسواری دکھا دیتے تھے، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے پر ایک ستون قائم کر دیا ہے۔

خطاط اور خوش نویس

بہادر شاہ اپنے وقت کے بہت بڑے خطاط اور خوش نویس بھی تھے، ان کے تمام جاننے والے اور ان کی خدمت میں رسائی رکھنے والے اس پر متفق ہیں کہ ان کی نوک قلم سے جو حرف نکلتے تھے وہ موتی بن کر نکلتے تھے اور لعل یمن کی طرح آب و تاب دکھاتے تھے۔

حکیم ناصر نذیر فراق لال قلعہ کی ایک خادمہ کا بیان نقل کرتے ہیں :-

بادشاہزادوں اور ان کے باپ دادوں کو تین شوق ضرور ہوتے تھے، ایک نجوم کا، ایک مصوری کا، ایک خوشنویسی کا اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے۔ بابر بادشاہ اور ان کے بڑوں کے ہاتھ کے مرقعے میں نے عمدہ عمدہ دیکھے ہیں جن کے آگے مانی اور بہزاد کی کارگیری ہیچ ہے اور داراشکوہ اور عالمگیر اور نگ زیب اور ان کے بھائیوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں اور قطعے بادشاہ سلامت کے پاس بہت سے تھے، انھیں دیکھ کر مشق کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ وصلیاں نہیں تبرک ہیں[۲]

---

[۱] : داستانِ غدر۔ (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) ص ۲۰۔

[۲] لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص ۲۶۔

مولانا راشد الخیری کی تحقیق بھی یہی ہے۔

دلّی والوں کو تو اب نہیں مگر دلّی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بہادر شاہ کا خط اپنے وقت میں جواب نہ رکھتا تھا۔ میر پنجہ کش شہر کے مشہور خوشنویس بادشاہ کے ہمعصر تھے، برسوں دونوں نے ساتھ ریاضت کی اور اس محنت کے فن کو کمال درجہ پر پہنچا دیا۔ میر صاحب کا خط ہندوستان میں بے نظیر تھا مگر بادشاہ کی خوشخطی کے وہ بھی مداح تھے[1]۔

خطِ نسخ میں مہارت تامہ

راقم الدولہ ظہیرؔ دہلوی بھی اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔
خطِ نسخ میں حضرت بادشاہ ظل اللہ میرے جد بزرگوار میر امام علی شاہ صاحب کے شاگرد رشید تھے، میرے دادا نے مجھے والد اور بادشاہ کو برابر بتایا تھا۔ دونوں بزرگوار خوش نویس لاثانی تھے، دہلی میں جتنے اس فن کے خوش نویس تھے، میرے والد کے یا بادشاہ کے شاگرد تھے۔ ایکبار ایک قصیدہ عربی سلطان روم کی مدح میں خدیو مصر کی جانب سے ولایت کو بھیجا گیا اور ولایت سے دہلی میں آیا، طامس صاحب ایجنٹ دہلی نے میرے والد سے کہا کہ آپ اسے لکھ دیجئے، والد نے جواب دیا: میں بغیر اجازت حضور کے نہیں لکھ سکتا، آپ اجازت حاصل کیجئے، میں لکھ دوں گا۔ طامس قصیدے کو لے کر حضور میں گئے اور تمام کیفیت عرض کی، حضور نے والد کو بلوا کر حکم دیا خلیفہ تم لکھ دو، میرے والد نے اس کی صحت کرا کے لکھ دیا اور طامس صاحب نے بہت سا سونا چڑھوا کر اسے تیار کرایا اور پھر وہ ولایت کو بھیجا گیا[2]۔

اُستادی شاگردی

حافظ امیر الدین صاحب بادشاہ ہی کے شاگرد ہیں جنھوں نے ایسا قرآن شریف لکھا جس کی دھوم لندن اور روم تک ہو رہی ہے[3]۔

ص[1]: نوبت پنج روزہ (راشد الخیری کا) ص۱۶۴۔

ص[2]: داستان غدر ص۱۹۔

ص[3]: لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراقؔ) ص۲۰۔

خادم الدین ابو المظفر سراج الدین محمد
بہادر شاہ بادشاہ غازی

[illegible]

بہادر شاہ ظفر کا عکس تحریر

نازک مزاجی

"میری ساس بڑی تنگ مزاج چڑچڑی بڑبولی تھیں اور شاہی محلوں میں ہر وقت رہنے سہنے سے ستھرائی ان کے اندر حد سے بے حد آگئی تھی۔ ہر ہفتہ سفید جوڑا بدل کر موسم کے موافق عطر مل لیتی تھیں کیونکہ جہاں پناہ کسی کام کے لیے یاد فرماتے تھے تو بالکل پاس جا کر کھڑا ہونا پڑتا تھا اور اندیشہ تھا کہ باورچی خانہ کی دھوئیں کی بدبو کپڑوں میں نہ بس جائے اور جہاں پناہ کا دماغ پریشان ہو۔"[1]

تفریح اور دلچسپی کے سامان

بہادر شاہ نے اپنی تفریح اور دلچسپی کے بہت سے سامان اکٹھا کر لئے تھے جن سے وہ دل بہلایا کرتے تھے لیکن ان میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو خدمت، افادیت یا پرورش کا ضرور ملحوظ رہتا تھا۔

۲۰ رجون ۱۸۴۹ء جمعہ دہلی :-

مرغوں کی لڑائی

اعلیٰ حضرت قلعہ میں رونق افروز ہیں حضور والا نے مرغوں کی لڑائی ملاحظہ فرمائی اور ایک طمنچہ اسی روپیہ کو خریدا۔[2]

بلبل ہزار داستان

حکیم ناصر نذیر فراق کی ایک روایت خاص طور پر دلچسپ بھی ہے اور پُرلطف بھی اس سے عہد ظفر کے رجحان عام پر بھی روشنی پڑتی ہے

"جہاں پناہ کے چڑیا خانہ میں ایک بلبل ہزار داستان پلی ہوئی تھی، سونے کے تار کے پنجرے میں رہتی تھی، اُستاد میرن چڑیا خانہ اور کبوتر خانہ کے داروغہ تھے اس کی رکھیا کرتے تھے۔ جب بہار کا موسم آجاتا تو بلبل کو چہکنے کا شوق ہوتا اُستاد میرن اس کا پنجرہ سے کر بیگم کے باغ میں آتے تھے اور کھٹے کے درخت کی ٹہنی میں اسے لٹکا دیتے۔ شہر میں ایک روز پہلے سے دھوم مچ جاتی تھی کہ کل مغرب کے وقت اُستاد میرن بادشاہی بلبل کا پنجرہ سے کر بیگم کے باغ میں آئیں گے شوقین لوگ

---

[1] : لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص۵

[2] : سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۱۷۵ ؎

اپنی اپنی اگن چنڈول، طوطے، مینا، بیٹر، شاما وغیرہ بولنے والے جانوروں کے پنجرے لے کر بیگم باغ میں پہنچتے۔ گھاس کے تختوں پر جو مخمل کو مات کرتی تھی جھسکڑا مار کر بیٹھ جاتے اور اپنے اپنے پرندوں کے پنجرے آگے رکھ لیتے۔ بادشاہی بلبل ہزار بولیاں بولتی جنھیں سُن سُن کر سننے والے سبحان اللہ کہتے بلبل کے دم کو سن کر کوئی پرند چہکنے لگتا تو اس کا مالک پنجرے کو تھپک دیتا، جس سے یہ مراد تھی کہ بلبل ہزار داستان کی بولی کان لگا کر سن اور چُپ رہ تاکہ تجھے بھی یہ مانک آ جائے اور فی الواقع بلبل کی بولیاں سن سُن کر شاہجہان آباد کے شوقین لوگوں کے اگن چنڈول خوب بولنے لگتے تھے اور شوقین لوگ فخر یہ کہتے تھے کہ جناب ہمارے اگن چنڈول نے بادشاہی ہزار داستان کی مار کھائی ہے کبھی کبھی بلبل کا پنجرہ رات کے وقت محل میں بھی آ جاتا تھا اور جہاں پناہ کے چھپر کھٹ کے پاس لٹکا دیا جاتا تھا، جب تک حضور کا جی چاہے اُس کا چہکنا سنتے تھے جب جی چاہتا پنجرہ باہر بھجوا دیا جاتا[1]۔

ناکہ کا شکار
جمنا دریا سے چند ملاح ایک ناکہ پکڑ کر لائے تھے اور جھروکے کے نیچے جہاں پناہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضور والا نے پہلے اپنے ہاتھ سے اس زندہ ناکہ پر بندوق سے فائر کیا پھر شاہی حکم سے دوسرے آدمیوں نے فائر کئے، حکم ہوا یہ ناکہ تیل نکالنے کے لیئے الت خانہ میں بھجوا دیا جائے اور ملاحوں کو پانچ روپیہ انعام دیا جائے[2]۔

نت نئی ایجادیں
جہاں پناہ جس طرح شعر و سخن میں نئی نئی باتیں نکالتے تھے اس طرح کھانوں اور مٹھائیوں میں بھی نت نئے ایجاد کرتے تھے مثلاً مرچوں کا دولمہ کریلے کا حلوا اور جس طور سے جہاں پناہ ہم لوگوں کو تعلیم دیتے تھے ہم بھی اسی طرح کرتے تھے اور انعام پاتے تھے[3]۔

---

[1] : لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص ۲۵

[2] : سرطاس ٹرکاف کی ڈائری ص ۹۲

[3] : لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص ۔

رعایا کا خیال

یکم اگست ۱۸۴۵ء دوسری عرضی کا مضمون یہ تھا کہ منشی شیر علی خاں نے باغ چاندی چوک کے ٹھیکہ کا تمام وکمال روپیہ ادا کر دیا اور اس کے ٹھیکہ کی مدت بھی ختم ہو گئی اب وہ دوبارہ پھر ٹھیکہ لینا چاہتے ہیں یہ بات حضور کو منظور ہے یا نہیں رائے عالی سے مطلع فرمایئے اس عرضی کے جواب میں حضور نے شقہ روانہ فرمایا کہ شیر علی خان کو ہرگز باغ کا ٹھیکہ نہ دیا جائے کیونکہ اس نے رعیت پر بہت ظلم و ستم کیا ہے ہمارے پاس اس کی بہت سی شکائتیں موصول ہوئی ہیں[1]۔

بادشاہ کے خطابات

بہادر شاہ اگرچہ شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے القاب و خطابات کی فہرست بہت طویل تھی:

۸ اگست ۱۸۴۵ء، آفتاب عالمتاب نے اپنی نورانی شعاعوں کو جب فضائے آسمانی میں پھیلایا تو فروغ خاندان عالی شان گورگانی چراغ دودمان نشان صاحبقرانی حضرت قدر قدرت قضا رایت خورشید رآیت آسمان رفعت، بہرام صولت کسریٰ حشمت فریدوں سطوت جمشید جاہ کاؤس دستگاہ، سکندر شان دارا دربان، سلیمان نگیں سلطنت نگین مہر پرچم کواکب حشم کوہ دتما۔ سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ دہلی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ڈیوڑھی خاص سے باہر تشریف لا کر جھروکہ پر جلوہ افروز ہوئے، جھروکہ ایک حوض ہے نہایت صاف شفاف جس کے نظارہ سے روح میں تازگی پیدا ہوتی ہے حضور معلی سیر تفریح کے بعد محل معلی میں تشریف لے گئے، دربار فرمایا ارکین سلطنت نے شرف حضوری حاصل کیا اور ادب کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھ گئے، مرتبہ و حیثیت کے موافق سب کو عزت دی گئی[2]۔

ص۱: بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۲۲۔

ص۲ بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۲۲۔

غریب پرور بادشاہ

اگرچہ بہادر شاہ آمدنی کی کمی کے باعث پریشان رہتے تھے لیکن ضرورت مندوں، محتاجوں اور ملازموں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔

منشی ذکاء اللہ، بہادر شاہ کا ذکر اچھے الفاظ میں نہیں کرتے لیکن مانتے ہیں :۔

"غریب پروری کی کیفیت اس کی قابل یاد رکھنے کی ہے، لنگڑے، لولے، اندھے، بہرے، اپاہج جتنے اوس کے ملازم تھے، سب کی تنخواہ گھر بیٹھے پہنچتی تھی، فقط ان کی مہر قلعہ میں جاتی تھی وہی تنخواہ لے آتی تھی، ساری عمر میں شاید کسی نوکر کو موقوف کیا ہو، ہمیشہ نوکروں سے محبت کی باتیں کرتا، اور کبھی سخت کلامی نہ کرتا سوائے ایک دفعہ کے کہ اس نے دو ایک بدکار لونڈیوں کا سر منڈوا دیا۔"[1]

بہادر شاہ کے معمولات

صبح سے شام تک بہادر شاہ کے معمولات کیا تھے اور ان کی نوعیت و کیفیت کیا تھی؛ یہ بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

توپ کی آواز نے مخلوق خدا کو صبح کی آمد کا پیام پہنچا دیا، موتی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی، چپی ملنے والیاں شاہی مسہری پر حاضر ہوئیں اور آہستہ آہستہ پاؤں دبانے شروع کئے، بادشاہ بیدار ہوئے حوائج ضروری سے فراغت پائی اور مسجد میں تشریف لا کر شریک نماز ہوئے۔

غسل خانہ میں تشریف لے گئے، جو نیوڑی کھلی خوشبو کا بیسن، چنبیلی، شبو، موتیا، بیلا، جوہی۔ گلاب کے تیل بوتلوں میں بھرے ہوئے قرینہ سے رکھے ہیں، سقاوہ میں ایک طرف ٹھنڈا پانی، ایک طرف گرم پانی ہے۔ چاندی کے لوٹے سونے کی لٹیاں جگمگا رہی ہیں، غسل سے فراغت پائی اندر ہی اندر لباسی محل میں تشریف لائے جہاں رستم بیگ سردار کے سوا کسی کو داخلہ کی اجازت نہیں، بقچے بقچیاں دست بقچے گٹھڑیوں کی قطاریں چنی ہوئی ہیں، سردار نے لکھنؤ کی چکن کا کرتہ، دونوں طرف تکے گھنڈیاں، لٹھے کا ایک بڑا پاجامہ دلی کا کمر بند پڑا ہوا جھک کر پیش کیا، بادشاہ نے کپڑے بدلے مخملی کفش

---

[1] : تاریخ ہند جلد دہم (ذکاء اللہ) ص ۲۴۶

پایاں پہنیں، شمیم خانہ کا داروغہ حاضر ہوا۔ سر میں تیل ڈالا، بالوں میں کنگھی کی اور جہاں پناہ گلگشت کو باہر تشریف لائے۔

سات بج چکے ہیں اور جاڑوں کے نہیں گرمیوں کے اور یہ وہ وقت ہے کہ رعیت کے ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں آدمی حلوہ پوری کچوریاں، بھوڑیاں دودھ جلیبیاں نہاری روٹی کھا چکے ہیں مگر یاد رکھنا کہ اس وقت تک رعیت کا بادشاہ نہار منھ ہے، سب جگہ سے پھرتے پھراتے تسبیح خانہ میں آئے، دو نفل ادا کئے اور کچھ اور پڑھ کر باپ دادا کی پاک روحوں کو ثواب پہنچایا اور ایوان خلوت میں داخل ہوئے مہتمم ادویات نے مجرا کیا اور سربمہر شیشیاں جس پر احسن اللہ حکیم کے دستخط ہیں نکالیں مہر توڑی اور یاقوتی کی پیالی تیار کی، خواص نے طلائی طشتری میں چھلکوں سمیت دو تولہ چنے پیش کئے بادشاہ سلامت نے پہلے یاقوتی کی پیالی پی اس کے بعد چنوں سے منھ صاف کیا اور پان کی ایک گلوری کھا کر مٹی کے کاغذی حقہ کو منھ لگایا، شہر کے مختلف حالات سنائے گئے۔

توشہ خانہ کے گھڑیال سے دس کی آواز آئی اور افسران محکمہ نے اپنے بستے کھولے قلمدان سنبھالے اور حکم احکام لے کر کاغذات پر دستخط کرائے۔

ایک گھنٹہ تک یہی سلسلہ رہا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے یاقوتی اور چنے کے سوا کوئی چیز پیٹ میں نہیں پہنچی گیارہ گھنٹے بجتے ہی بادشاہ تخت سے اٹھے، اہلکاروں نے مجرا کیا، چوبداروں نے بآواز بلند درازی عمر کے نعرے لگائے اور جہاں پناہ زنانہ محل میں تشریف لے چلے دروازے پر پہنچتے ہی جسولنی جو خاص وردی پہنے ہوئے عصا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی آگے بڑھی اور زور سے کہا:

"پیر و مرشد حضور عالی بادشاہ سلامت عمر دراز"

تین دفعہ یہ نعرہ بلند ہوا، محل کے تمام متعلقین کو تشریف آوری کی خبر ہو گئی، یہاں تک کہ جہاں پناہ محل میں پہنچے، بڑی بیگم صاحبہ نے کھڑے ہو کر تعظیم دی اور ان کے کھڑے ہوتے ہی امراء و رؤساء کی بیگمیں، شہزادیاں کھڑی ہوئیں، جہاں پناہ نے سب کی طرف دیکھا، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی، تخت پر بیٹھے اور سب کو بیٹھنے کا حکم دیا ادھر یہ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھیں ادھر ندیمنیں، کمخواب کے دو گنبد

کی مہر داروغہ کشمیرن نے جس کا نام مہتاب تھا، تو ڑی بیگم نے اپنے ہاتھ سے بھنڈہ تیار کیا، چاندی کی صراحی سے پانی لیا، سونے کی کٹوری میں ڈالا اور لکھنؤ کی سنہری طشتری میں جو چاندی سونے سے لپی ہوئی ہے اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے پیش کیا، جہاں پناہ نے بھنڈہ نوش فرمایا جس قدر بیگمیں اور شہزادیاں تھیں، دوسرے کمرے میں پہنچی۔ بیگم نے خود تازہ پان کی گلوری بنائی، بادشاہ سلامت منہ میں لے کر ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوئے کہ مہتاب سامنے آئی جھک کر مجرا کیا اور عرض کیا :-

"دسترخوان تیار ہے؟"

حکم ہوا "اچھا"

اسی وقت مہتاب الٹے پاؤں لوٹی اور ایک لمبا چوڑا دسترخوان اس طرح بچھایا کہ نیچے چمڑا چمڑے پر سیتل پاٹیاں، سیتل پاٹیوں پر وسط میں چار گز طویل آدھ گز بلند تخت اور چاروں طرف دسترخوان، جہاں پناہ آکر تخت پر تشریف فرما ہوئے، دائیں طرف بیگمیں بائیں طرف شہزادیاں مقابل میں مرد اور لڑکے سیلابچی بادشاہ سلامت کے روبرو آئی، ان کے بعد داہنی طرف سے سلسلہ شروع ہوا، تین سیلابچیوں کے دور ہوئے یعنی شاہی سیلابچی سے صرف بیگموں کے ہاتھ دھلے دوسری سے شہزادیوں کے تیسری سے مردوں کے، حضور نے کھانوں پر نظر ڈالی تو باعتبار موسم یہ چیزیں تھیں۔

پتیلی کے کباب : ہرن، مُرغ، تیتر، بیٹر اور خرگوش، چپے، مرغابی، سرخاب؛
شامی کباب ؛ بکرا، مُرغ، ہرن، قاز، کلنگ، ہریل، جنگلی کبوتر، مچھلی (روہو، سول — ملی۔ مہاشیر)

سادہ سالن : مرغ بکرا، ہرن، کبوتر، مچھلی، بھنڈی، آلو، اروی، کچالو، نیڈالو، رتالو، کھیرا، ککڑی، زمین قند، پرول، شلجم، چقندر، گوبھی، مٹر، بیگن، کریلے، ساگ، کچنال، سیم کے بیج۔

چاول نمکین : بریانی، قبولی، پلاؤ، مُرغ پلاؤ، ہریل پلاؤ، چنا پلاؤ، صندلی پلاؤ، نرگسی پلاؤ

فالسائی پلاؤ، شاہی پلاؤ، کوفتہ پلاؤ، بیضہ پلاؤ، شاہجہانی پلاؤ، نورجہانی پلاؤ، بونٹ پلاؤ۔

چاول میٹھے: زردہ، متنجن، کشمشی متنجن، بادامی متنجن، آبی متنجن، ہریالی متنجن، فالسائی متنجن، مالمی متنجن، اسرائیلی متنجن، مزعفر۔

روٹی: چپاتیاں سادہ، پراٹھے ساٹھے بل دار، روسے کئے میدے کے شیرمال باقرخانی خمیری، گاؤدیدہ، گاؤزبان، نان گلزار، نان بہار، ہمایوں روٹی، روغنی روٹی، کلچے، بیسنی روٹی برمی روٹی، اصفعی روٹی، گل گھی کی روٹی، نیلوفری روٹی، مصری روٹی۔

کھیر: فرنی، سادہ کھیر، آلو کی کھیر، بادام کی کھیر، پستہ کی کھیر، آموں کی کھیر، گاجر کی کھیر، جموں کی کھیر، رس کی کھیر، نقری کھیر، طلائی کھیر۔

دلیہ اور رائتہ: دودھ، ٹنڈے، بیگن، وراز گھیا، تری، کریلے، گوشت۔

بورانی: سادہ ککڑی، مونگ، بیسن، کھیرا، بیگن۔

قیمہ: مرچ، سادہ، ہری مرچ، لال مرچ، سیاہ مرچ، میتھی، سویا، کریلے، خاگینہ، انڈے سموسے، آلو قیمہ، تیتر، بٹیر، مرغ، مچھلی، ادوی کے انڈے کے، زعفرانی، نرگسی، میمانی، سادہ ٹکڑے، خمیری، نان پاؤ، گاؤدیدہ، گاؤزبان، میٹھے، سلوتے، آبی، ترنجی، ہندوستانی، ایرانی۔

دالیں، بادشاہ پسند، سرخابی، بحری، ترکاری، سادہ، بھنی ہوئی، تلی، بھیگی ہوئی، خشک، ارہر، مونگ، ماش، پنچ میل، مسور، ملکہ مسور۔

کھنڈویاں: بیسن، دہی کی، سادہ، ٹکی، لمبی، گول، چوکور، بھنی ہوئی، تلی ہوئی۔

میٹھی چٹنیاں: اناناس، آم، گکروندہ، راحت جان، پودینہ، سرکہ، ادرک، سیم کے بیج پسے ہوئے، تلے ہوئے۔

سلونی چٹنی: پودینہ، ہری مرچ، کیری، آم، پیاز، لحمی، عرق نانی، سرکہ، ادرک، سیم کے بیج پسے ہوئے، تلے ہوئے۔

مربے: آم، اناناس، ادرک، امرود، بہی، سیب، گرہل، بڑہل، کٹھل، گاجر، مولی۔

حلوے: گاجر، روا، مولی، چنا، موتی چور، مونگ، نور جہانی، اکبری فرخی آسمانی زعفرانی، خشک نما عزیزی، ایرانی، سوہانی، غربی تاشقندی، مصری۔

مٹھائیاں: حلواسوہن، گلاب جامن، قلاقند موسوتی پاک کھجور، امرتی، لڈو، پیڑے، بالوشاہی، اندرسے، اندرسے کی گولیاں پیٹھے کی مٹھائی، پھینیاں، ربڑی، بالائی۔

پھل: آم، خربوزہ، کیلے احمد آبادی، بنگالی، کولی، رنگترے، شریفے، لیچیاں۔

پانچ برتنوں میں کھلی بیسن اُبٹنہ، صابن اٹار رکھا ہوا ہے پچاس رومال ہاتھ صاف کرنے کے لیے موجود ہیں۔ جہاں پناہ نے سب طرف ایک نظر ڈالی اور سیدھے ہاتھ دیکھا، شمیم خواص نے گلاب پاش کھولا پہلے چاروں طرف گلاب چھڑکا گیا اس کے بعد کیوڑہ، اور اس کے بعد عطر خس جہاں پناہ نے سب سے پہلے فرنی میں چمچہ ڈالا۔

آج یہ غریب قلاش مفلس کنگلے جن کو دہلی نے نکال کر باہر پھینک دیا جمنا کے کنارے بھوکے مر رہے ہیں یہ اس وقت قلعہ میں موجود ہوتے تھے، سات من روٹیاں خمیری اور پانچ دیگ سالن ان کے واسطے تیار ہوتا تھا ادھر جہاں پناہ نے فرنی میں چمچہ ڈالا ادھر چوبداروں نے چیخ کر آواز دی: —

"طعام مبارک"

اب کیا تھا کنگلے کھانے پر ٹوٹ پڑے اور پیٹ بھر دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوئے اللہ اللہ کیا سماں تھا اور کیا لوگ تھے، جہاں پناہ طعام تناول فرما چکے مگر ابھی ہاتھ نہیں کھینچا صرف اس لیے کہ کھانے والے بھوکے نہ رہ جائیں، جب اطمینان ہو گیا کہ سب کھا چکے تو ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا، شاہی ہاتھ اٹھتے ہی تمام ہاتھ بارگاہ حقیقی میں اٹھ گئے ایک خواص سیلاپچی دوسری آفتابہ تیسری بیسن، چوتھی کھلی پانچویں ابٹنہ لئے حاضر ہوئی ادھر باقی سب ہاتھ دھو کر کلی کر فارغ ہوئے خواص خاص نے بادشاہ کے روبرو سونے کا خلال پیش کیا، دوسروں نے نیم کے تنکے لیے بڑی بیگم صاحبہ نے پٹاری سنبھالی اور اپنے ہاتھ سے گلوری تیار کی جہاں پناہ گلوری منہ میں

رکھے ہوئے اُٹھے بارہ دری کے چاروں طرف پہرے لگ گئے، اب مجال نہیں کہ چڑیا کا بچہ بھی بارہ دری میں داخل ہو سکے، امیر غریب نوکر چاکر سب خاموش اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ جو نہی جو بارہ دری کے خاص کمرہ میں پہرہ دے رہی تھی، دوڑی ہوئی آئی اور کہا کہ آبدار خانہ کے داروغہ سے کہو آبحیات جلد حاضر کرے، داروغہ تیار تھا اسی وقت ایک صراحی گنگا کے اور ایک جمنا کے پانی کی جو چار پہر تک نتھار کر سربمہر برف میں دبائی تھی لے کر آگے بڑھا، جو نہی کو دی، جو نہی نے خواص خاص کو دی اس نے جا کر ملکہ عالیہ کے سامنے مہر توڑی اور طلائی کٹورے میں ان کے سامنے پانی الٹا ملکہ دوراں اپنے ہاتھ سے پانی پلانے چلیں اور کٹورا پیش کیا، بادشاہ نے پانی پیا اور الحمد للہ کہہ کر بستر پر استراحت فرمائی

خسخانے ہر چہار طرف لگے ہوئے ہیں چھڑکاؤ ہو رہا ہے، پنکھے جھلے جا رہے ہیں اور ایک عالم سناٹا ہے جہاں سانس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

دو بجے اُدھر ظہر کی اذان ہوئی، ادھر توبتی نے نقارہ بجایا، جہاں پناہ بیدار ہوئے پہرہ اُٹھ گیا، صرف ایک برقنداز وہی عورت ہوشیار رہی، اناناس کے خمیرہ کا تمباکو حقہ میں بھر آگیا دو چار گھونٹ لے کر جہاں پناہ کھڑے ہوئے جو لنی نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "کرامات پانی تیار ہے" وضو خانے کی طرف تشریف لے گئے، وضو کیا کیکر کی مسواک کی باہر تشریف لائے نماز پڑھی محل کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے آکر مجرا کیا، جہاں پناہ نے آب حیات طلب کیا صراحی کی مہر توڑ دی گئی، بادشاہ سلامت نے پانی نوش فرما بچوں نے

"حیات مزید"

کے نعرے لگائے خواصوں نے آمین کہی

یہ بسم اللہ بسم اللہ کی صدائیں کیسی بلند ہو رہی ہیں نقیب چوبداروں کیوں آراستہ ہوئے یہ نوبت کاہے کی ہے، ذرا سامنے دیکھنا سرخ سبز پگڑیاں زرد، اچکن گول پنجہ کی جوتیاں اکا دکا نہیں قطار در قطار کھڑے وہ سب ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوئے اور یہ متفقہ صدا جس سے قلعہ گونج گیا سنائی دی

"قدم ہوشیار نگاہ روبرو"

جہاں پناہ تشریف لائے اردبیگنیاں سرخ سبز کپڑے پہنے مردانہ لباس میں کندھے پر ہوادار لیئے کھڑی ہیں۔ ہوادار تو صرف آٹھ ہی کے کندھوں پر ہوتا ہے مگر انکے ساتھ کندھا بدلنے کو ایک پورا غول کا غول موجود ہے، جہاں پناہ ہوادار میں تشریف لائے۔ کیکری کٹاؤ کا گاؤ تکیہ مقیش گوکھرو کے پڑے زرلبفت کمخواب کے گل تکیئے ہوادار میں قدم رکھتے ہی داروغہ نے عرض کیا

کرات پردہ باندھ دیا جائے

حکم ہوا" ہوں" جھلاجھلی کے پردے اٹھے خواجہ سراؤں نے مورچھل سنبھالے جیبنوں کا دستہ تان جہان کے ساتھ ساتھ ہے، افغانیوں نے جریب لیئے اور آگے بڑھے " قدم ہوشیار نگاہ روبرو کے نعرے لگ رہے ہیں کچھ اور بھی دیکھا یہ ہوادار کے آگے کیا ہو رہا ہے؟ تعجب نہ کیجیئے، بھوکی خلقت اپنا پیٹ بھر رہی ہے، ننگے اپنا بدن ڈھانک رہے ہیں دیکھئے چاندی کے پھول نچھاور ہو رہے ہیں۔ خیرات خانہ کا منیب بھر بھر مٹھیاں ہوادار پر نثار رہا ہے۔ یہ چاندی آج کی چاندی نہ تھی کہ ایک روپیہ کا آٹا رومال میں لے آؤ، سستا سماں اچھے لوگ پاک نیتیں، صاف دل، تین تین ماشہ کا ایک پھول ایک بھی ہاتھ لگ گیا تو تین دن کے لیئے بے فکر ہو گئے۔ تان جہان کے چاروں طرف آٹھ جگادری حبشی بلم ہاتھ میں لیئے چل رہے ہیں دفعتہً جامع مسجد سے مغرب کی اذان کا غلغلہ بلند ہوا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل ہے اللہ اکبر کے ختم ہونے سے پہلے کہاروں نے جس جگہ تھے وہیں تان جہان رکھدیا اور سب سمت لبستہ کھڑے ہو گئے، جہاں پناہ اذان کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے کفش برادر نے فوراً زیر پائی سامنے رکھی جہاں پناہ نے جوتی پہنی اور مسجد کی طرف روانہ ہوئے، مغرب کی نماز کو جا رہے ہیں مسجد میں داخلہ ہوا، یہاں تعظیم و آداب سب معاف ہیں اور سوا اسلام علیک کے کسی دوسرے لفظ کی اجازت نہیں جہاں پناہ نے خود ہی "سلام علیک" فرمایا، حوض پر تشریف لائے، کلی کی اور نمازیوں کے ساتھ آ شامل ہو گئے، نماز ختم ہوئی سلام پھیرا دعا مانگی گئی، جہاں پناہ اٹھ کھڑے ہوئے تو "اللہ اکبر" کی متفقہ صدا سے مسجد گونج اٹھی۔ قلعہ کی سڑک لپ روشنی سے جگمگا رہی ہے سونے چاندی کے عصا اور برتن چمک رہے ہیں بادشاہ تان جہان میں

بیٹھے پیش خواص نے آواز دی

اقبال زیادہ : بڑھو آ گے بڑھو "

سواری ہوئی تخت رواں کے پردے اٹھا دیئے گئے، سواروں نے گھوڑے تیز کئے اور تان جہان سے پہلے قصر میں پہنچ کر سواری کی اطلاع دی، حبشی رسالہ استقبال کو دروازہ پر آ کھڑا ہوا، عشاء سے قبل سواری واپس آئی، دو گھڑی رات تک جہاں پناہ شاہجہانی باغ میں ٹہلتے رہے، عشاء کی نماز موتی مسجد میں پڑھی اور محل میں تشریف لے گئے[1]

مرغان صحرائی کا شکار

جب آفتاب نے اُفقِ مشرق سے اپنا نورانی چہرہ نکالا، بادشاہ سلامت ڈیوڑھی خاص سے باہر جلوہ افروز ہوئے، اراکین سلطنت نے آداب سلام کے مراسم ادب اخلاص کے ساتھ ادا کئے حضور ظل اللہ مرغان صحرائی کے شکار کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے، چھ گھڑی دن چڑھے بہت سے پرندوں کا شکار کر کے دولت سرا میں قدم رنجہ فرمایا۔[2]

سلونو

سلونو ہندوؤں کا تہوار ہے، مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں مگر ذرا بہادر شاہ کا دربار اور سلونو کا جشن دیکھیے کہ دونوں قومیں اس تہوار میں برابر کی شریک ہیں پہلے اس کی حقیقت پر نظر ڈالیے اور پھر ان لوگوں کی فراخ حوصلگی اور وضعداری و انصاف کی داد دیجیے۔

شاہ عالم کا باپ عزیز الدین عالمگیر ثانی اپنے سیدھے سادھے معاملات اور بھولی بھالی باتوں کی وجہ سے ہندو آئم میں ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ اس کا نمک حرام وزیر غازی الدین خان جس کی دلی خواہش یہ تھی کہ بادشاہ کو اپنی مٹھی میں رکھے۔ وہ اس فکر میں ہوا کہ کسی طرح بادشاہ کو قتل کر کے اپنے بھتیجے کو تخت پر بٹھائے اس منصوبہ کی تکمیل میں اس نے بعض اراکین حکومت کو شامل کیا اور ایک روز جب بادشاہ عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو عرض کیا۔ جہاں پناہ ایک فقیر روشن ضمیر کوٹلہ میں تشریف فرما ہیں۔

۱؎ : تربت پنج روزہ (علامہ راشد الخیری) ص ۳۴

۲؎ : بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱

"بادشاہ چونکہ فقیروں کے عاشق تھے تعریف سنتے ہی بے تاب ہو گئے اور فرمایا "فوراً بلاؤ" چنانچہ دو آدمی روانہ کئے گئے جنھوں نے آکر عرض کیا: عالی جاہ شاہ صاحب کی تیوری پر بلبی کا نام سنتے ہی بل آگیا حضور وہ تو دنیا کی ہر دولت سے بے فکر ہیں اندیشہ ہے وہ شاید یہاں قیام بھی نہ کریں اور رات ہی رات کوچ کر جائیں، عزیز الدین بادشاہ یہ سنتے ہی کانپ گیا اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا کہ ایسا نہ ہو، فقیر کی بد دعا برباد نہ کر دے کوٹلہ پہنچا تو یہاں فقیر کے بدلے اللہ کا نام تھا، پانچ آدمی پہلے ہی سے تیار تھے مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک شخص نے پیٹھ میں خنجر بھونکا، دوسرے نے پشت میں چند لمحہ میں بادشاہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہو گئے تو ان کی لاش دریا کی طرف پھینک دی گئی، یہ واقعہ رات کو ابتدائی حصہ میں ہوا اتفاق سے رات چاندنی تھی اور بادشاہ کی خون آلودہ لاش جنگل میں پڑی تھی، جہانگیر کے عہد میں جس طرح ایک زنجیر لٹکی تھی کہ ہر فریادی قلعہ شاہی پر حاضر ہو کر بادشاہ کو اپنی کہانی سنا سکے، اس طرح اکبر کے تتبع میں عزیز الدین نے بھی یہ انتظام کیا تھا کہ وہ علی الصباح باہر آ بیٹھتا اور لوگ اس کی زیارت کر لیتے، ایک برہمن عورت رام کور جمنا کے اشنان سے واپس آ رہی تھی، پہلے تو ایک آدمی کو سوتا دیکھ کر جھجکی، مگر غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ لاش بادشاہ کی ہے اور خون بہہ رہا ہے، وہیں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

رات کا بڑا حصہ اسی طرح بسر ہوا جب بادشاہ کی واپسی میں دیر ہوئی تو بقیہ ارکین وزراء و اقارب پریشان ہوئے اور کوٹلے پہنچے اندر جا کر چپہ چپہ اور کونہ کونہ چھان مارا، فقیر کا پتہ چلا نہ بادشاہ کا، چاروں طرف ڈھونڈتے پھرے، نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک لاش اور ایک عورت دکھائی دی۔ پاس پہنچے تو مفصل کیفیت معلوم ہوئی، شہر میں کہرام مچ گیا، صبح ہوئی تو نہلا دھلا کر بادشاہ کی لاش کو ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا۔ شاہ عالم باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے، رام کور کو اس کی خدمات کا صلہ کہ اس نے رات کو بادشاہ کی لاش کی حفاظت کی، سر دربار خلعت فاخرہ ملا آج سے رام کور شاہ عالم کی بہن بنی، سلونو کے روز وہ بہن کی حیثیت سے سچے موتیوں کی راکھی جس میں سونے کی گھنڈیاں ہوتی ہیں بادشاہ کے ہاتھ میں باندھتی اور بادشاہ حقیقی بہن کی طرح اس کو زر و جواہر دے کر گھر سے رخصت کرتے، شاہ عالم کے بعد اکبر ثانی نے یہ تعلق بدستور نبھایا اور رام کور کی بڑی لڑکی ان کے ہاتھ پر راکھی باندھتی رہی، اکبر شاہ کے بعد بہادر شاہ نے

بھی سلونو کو اس طرح منایا اور رام کور کے خاندان کو نہال کیا، برسات کا موسم کچھ ایسا دلکش موسم ہے کہ گرمی کی شدت سے پریشان و پژمردہ چھوٹے بڑے سبز ہیں آسمان پر گھٹا آتے ہی امنگیں پیدا ہو جاتی ہیں، سلونو ساون میں ہوتا ہے جوویوں بھی دلچسپ مہینہ ہے پندرہ پندرہ اور بیس بیس روز موسلا دھار بارش برستی تھی۔ یوں تو ساون بھر ہی قلعہ معلّیٰ اور شہر بھر میں رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں مگر سلونو کا انتظام و اہتمام قلعہ میں آٹھ آٹھ دس دس روز پہلے سے ہوتا تھا، جھولے پڑتے تھے اور کس تکلف کے کھمبوں پر سنہری روپہلی پٹیاں جمی ہوئی ہیں، ریشمی رسیاں ڈالی ہوئی گنگا جمنی پڑیاں پڑی ہوئی ایک طرف بچھے، ایک طرف چوکے کڑھائیاں چڑھی ہوئی سامان بھرے ہوئے، ہندوؤں کا انتظام الگ، مسلمانوں کا الگ، ادھر بادشاہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آکر بیٹھے، ادھر برہمنی نے راکھی باندھی برہمنوں نے اسیس دی، دربار نے دعاؤں کے نعرے بلند کئے اور قلعہ اس صدا سے گونج اٹھا۔

"مہابلی بادشاہ سلامت"

آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے لکھی باغ میں آموں کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جامنوں کے گچھے ہوا میں جھول رہے ہیں، زمین پر گکروندوں کی بہار آسمان پر بگلوں کی قطاریں دل کے پار ہوتی ہے پپیہا الاپ رہا ہے کوئل کوک رہی ہے نقارے پر چوٹ پڑی نفیری کی بجی اور جھولے والیاں جھولے میں گئیں، بیگمیں بڑھ رہی ہیں، جھوٹے مل رہے ہیں، دوپہر تک جھولے اور پکوان ہوتے رہے کھانا کھایا اور بادشاہ سلامت نے اپنے ہاتھ سے نُرمردیں چوڑیاں ایک ہاتھ میں پانچ، ایک ہاتھ میں تین اپنی منہ بولی بہن کے باندھیں اور ساتھ والیوں کو جوڑے عطا ہوئے، نقد روپے دیئے گئے مٹھائیوں کھجوریوں پوریوں کی تھال عطا ہوئے اور اس طرح یہ بہن بھائی کے انعام واکرام سے مالا مال شاہی جوڑا پہن کر سسرال رخصت ہوئی جا۔

خاندانی پریشانی

یکم ماہ اگست ۱۸۴۵ء کنور جگت سنگھ کی عرضی حضور عالی کی نظر سے گذری، مضمون یہ تھا کہ میرا مبلغ چھ ہزار روپیہ پیشکار مرزا تیمور شاہ بہادر

جا: نوبت پنج روزہ (راشد الخیری) ص۹۵۔

کے ذمہ نکلتا ہے ان سے جلدی ادا کرنے کی تاکید فرمادی جائے، حضور نے اسی عرضی پر اپنے دستخط فرمائے اور تحریر کیا کہ تمسک کا کاغذ ہمارے پاس بھیج دو اور ایک رقعہ مرزا صاحب کے نام علیحدہ لکھا کہ تمہارے قرض خواہ ہم کو بہت تکلیف پہنچاتے ہیں تم کو چاہیئے کہ اپنا قرضہ خود ادا کرو ورنہ تمہاری تنخواہ بند کرکے قرض خواہوں میں تقسیم کر دی جائے گی [1]۔

بہادر شاہ کا نشانہ

"حضور اپنی دولت سرائے واقع قطب صاحب میں رونق افروز تھے ایک دن شاہزادہ شاہ رخ بہادر نے عرض کیا کہ یہاں ایک مقام میں ایسا موذی سانپ سنا گیا ہے کہ جس سے لوگوں کو سخت تکلیف اور نقصانِ جان کا اندیشہ ہے، حضور نے یہ بات سنتے ہی فرمایا، چلو مجھے بتاؤ وہ سانپ کہاں ہے، شہزادہ نے سانپ کے بل کے پاس جا کر ارشاد کیا کہ یہاں ہے، حضور نے سانپ کو دیکھ کر ایک ایسا تیر مارا کہ اس کو دم لینے کی مہلت نہ ملی اور فوراً مر گیا [2]۔

عید بقر عید کا تہوار

ذرا دیکھیے، عید اور عید الاضحیٰ کا قلعہ میں کیا رنگ ہوتا تھا۔

"حضرت بادشاہ غازی ہفتہ کے دن شوال کی پہلی تاریخ کو قلعہ مبارک سے باہر تشریف لائے اور عید کی نماز پڑھنے کو عیدگاہ تشریف لے گئے، نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور حسبِ معمول نیاز کے لیے درگاہ آثار شریف میں حاضر ہو گئے، درگاہ شریف کے متولی جہاندار شاہ کو خلعت شش پارچہ اور امام جماعت کو خلعت و شمشیر عنایت ہوئے اور واپس قلعہ معلیٰ میں آئے، آتے جاتے وقت حسبِ ضابطہ شاہی اور انگریزی توپ خانوں سے سلامی کی توپیں سر ہوئیں، شام کے وقت تخت ہوادار پر سوار ہو کر ناظر کے باغ میں رونق افروز ہوئے، محفل رقص و سرود منعقد ہوئی، محفل کے ختم ہونے کے بعد محل خاص میں تشریف لے جا کر آرام فرمایا، ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آئیں۔ اور توپ خانہ سے سلامی کے توپیں چھٹیں [3]۔

---

[1]: بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۲۱۔

[2]: احسن الاخبار: ۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء۔

[3]: احسن الاخبار ۸ر اکتوبر ۱۸۴۸ء۔

تیموری دربار کی آخری جھلک

بروز عید اضحیٰ بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرما کر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر عیدگاہ تشریف لے گئے، نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شش پارچہ دو رقم جواہر ایک قبضہ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب کی قبا سہ رقم جواہر، ایک دستار سربستہ اور گوشوارہ معیش ایک دستالہ متولی مصلیٰ کو اور خلعت شش پارچہ، سہ رقم جواہر اور قبضہ شمشیر وقار الدولہ ناظم امور خانسامانی کو مرحمت فرمائے، اس کے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی اور حاضرین مجلس نے نان و کباب کا شغل فرمایا، اس وقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا، ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں مصروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارک باد، مبارک باد کی صدائیں آرہی ہیں جس راستہ سے بادشاہ سلامت کی سواری گذری امراء و رؤسا، اور اراکین سلطنت نے عید کی مبارک بادیں پیش کیں اور نذریں بھی گذرانیں۔ آتے جاتے وقت شاہی اور انگریزی توپخانہ سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں ؎۱۔

رسم تاجپوشی "جس بادشاہ کا یہ جاہ و جلال ہے، اس کی رسم تاج پوشی کس طرح عمل میں آئی یہ بھی ملاحظہ فرماتے چلیے :-

"دیوان خاص کے فردوس میں آخری بہار آئی، ۲۰ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو ہفتہ کے دن مرزا ابوظفر "بہادر شاہ ثانی" ساعت معینہ میں محل سے برآمد ہوئے۔ جامع مسجد دہلی کے امام میر احمد علی نے رسم تاجپوشی کا افتتاح کیا، جھنڈیاں ہلیں، نوبتیں چلیں، فوج نے سلامی اتاری، شادیانے بجے، ریزیڈنٹ نے نذر پیش کی اور سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے تخت نشینی کی مبارک باد دی، ولی عہد خلافت مرزا دارا بخت اور دیگر شہزادگان والا تبار نے یکے بعد دیگرے آداب گاہ سے مجرا کیا، بادشاہ کے قریب جا کر نذر دی، خلعت پایا، دوسرے امراء کی نوبت آئی، آداب مجرے ہوئے، نذریں گذریں، خطابات و مناصب تقسیم ہوئے۔

؎۱ : احسن الاخبار ۲۵ دسمبر ۱۸۴۶ء

از نشہ دولت بہادر شاہی — شد پر ز مئے طرب ایاغ دہلی
بنشست بہ تخت دولت روز افزوں — نزہت بفزود از وہ داغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر — آمد بہ لب خرد "چراغ دہلی"
۱۲۵۳ھ

داروغگی نذر و نیاز اور کتیب الاولیا کے عہد سے اس وقت بہت معزز تھے، پہلے پر خلیفۃ الملک ندیم الدولہ حافظ محمد داؤد خاں مستقیم جنگ کا تقرر ہوا اور دوسرے پر جس کے سپرد تمام فقیروں اور گوشہ نشینوں کی خبرگیری تھی حاجی غلام علی مامور ہوئے۔ مولانا فخر الدین چشتی کے پوتے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو جو اپنے والد غلام قطب الدین کی وفات کے وقت خورد سال تھے اور حضرت محمد سلیمان تونسوی سے خرقۂ خلافت حاصل کرکے سجادہ آبائی پر رونق افروز ہوئے تھے، زمانہ ولیعہدی میں مرزا ابو ظفر کو اذکار اشغال صوفیہ کی تعلیم دینے کا شرف نصیب ہوا تھا، اب بادشاہ کے پیر و مرشد مشہور ہوئے[1]

ہندو تہوار

جس اہتمام سے بہادر شاہ مسلمان تہوار مناتے تھے، اسی انہماک اور جوش کے ساتھ وہ ہندو تہوار بھی مناتے تھے اس لئے کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح غیر متعصب اور روادار تھے۔

آئیے ایک جھلک ان ہندو تہواروں کی دیکھ لیں :-

دسہرہ

" دسہرہ کے دن بادشاہ نے دربار کیا دیکھو! پہلے نیل کنٹھ بادشاہ کے سامنے اڑایا الیوہ باز خانے کا داروغہ باز اور شکرا لے کر آیا بادشاہ نے باز کو لے کر ہاتھ پر بٹھایا تو دربار برخاست ہوا تیسرے پہر کو اصطبل خاص کا داروغہ خاص گھوڑوں کو مہندی سے رنگ رنگا رنگ کی ان پر نقاشی کر سونے روپے کے ساز لگا کر جھروکوں کے نیچے لایا، بادشاہ نے گھوڑوں کا لاحظہ کیا داروغہ کو انعام دے کر رخصت کیا"[2]

---

[1] : بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

[2] : بزم آخر ص ۲۶

دیوالی

"آج پیلا دیا ہے" دیکھو محل میں سب کی آمد و رفت بند ہو گئی، سقنیاں، دھوبنیں، مالنیں کہاریاں، حلال خوریاں تین دن تک محل سے باہر نہ نکلنے پائیں گی اور نہ کوئی ثابت ترکاریاں محل میں آنے پائیں گی، بیگن مولی، کدو گاجر وغیرہ اگر کسی نے منگائی بھی تو باہر سے ترشی ہوئی، اس لئے کہ کوئی جادو نہ کرے میرے دیئے کو دیکھو آج بادشاہ سونے چاندی میں تلیں گے ایک بڑی سی ترازو کھڑی ہوئی، ایک طرف پلڑے میں بادشاہ بیٹھے دوسری طرف چاندی سونا وغیرہ کے برابر تول کے محتاجوں کو بانٹ دیا ایک بھینسا کالا کمبل کڑوا تیل ست انجا سونا چاندی نقد وغیرہ بادشاہ پر سے تصدق ہوا، قلعہ کے برجوں کی روشنی کا حکم ہوا، کھیلیں، پتاشے کھانڈ اور مٹی کے کھلونے کہاروں نے سر پر رکھے جو لنیاں ان کے ساتھ گھر بہ گھر بانٹتی پھرتی ہیں، نوبت روشن چوکی اور باجہ بجنے لگا، چاروں کونوں میں ایک ایک گنا کھڑا کیا نیوؤں میں ڈور سے ڈال کر ان میں لٹکا دیئے صبح کو وہ گنے حلال خوری کو دے دیئے، رتھ بان بیلوں کو بنا سنوار پاؤں میں مہندی لگا رنگ برنگ کی ان پر نقاشی کر سینگوں پر قلعی اور سنگوٹیاں ہاتھوں پہ کارچوبی پٹے اور سنکھ گلوں میں گھنگرو اور پہ کارچوبی بانات جھولیں پڑی ہوئیں چھم چھم کرتے چلے آتے ہیں بیلوں کو دکھا انعام اکرام لے اپنے کارخانوں میں آئے دیوالی ہو چکی

ہولی

دیکھو ہولی میں جتنے سانگ شہر میں بنے سب بادشاہ کے جھروکوں کے نیچے آئے انعام لے کر رخصت ہوئے [ط۱]

ہندو مسلمانوں کی دُعا

بادشاہ کا یہی برتاؤ اور سلوک تھا جس سے ہندو اور مسلمان گن گاتے تھے اور جب غدر شروع ہوا تو دل سے چاہتے کہ اس کا تخت اسے ملے :۔

مسلمان اپنی مسجدوں میں ہندو اپنی مندروں میں یہ دعا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں سلاطین گورگانیہ

ط۱: بزم آخر ص۲۹

کی اولاد میں سے کسی کا راج ہو۔ ہندوستان کے تمام ہندو مسلمانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں سو سال سے زیادہ نہ رہے گی۔ بس چونکہ ابتدا اس کی ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی اب ۱۸۵۷ء میں ایک صدی بعد اس کا استیصال ہو جانا چاہیئے اور دہلی کے سلاطین قدیم کی اولاد میں سے کسی کو سلطنت کا مالک بنانا چاہیئے[۱]۔

انگریزوں کی شرارت اور سازش

"بہادر شاہ امن کی زندگی بسر کر رہا تھا، قناعت کو اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا، لال حویلی میں چپ چاپ بیٹھا من کی بادشاہت پر اکتفا کر رہا تھا، لیکن انگریزوں کو یہ بات بھی نہ بھائی، انھوں نے اس کانٹے کو راستہ سے ہٹانے کے لیے شرارتیں شروع کر دیں"۔

بادشاہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا، اپنی زندگی آسائش اور آرام سے بسر کر رہا تھا سرکار کمپنی کی پنشن پاتا تھا اپنی بلند ہمتی کا وہ زعم رکھتا تھا کہ اپنے آگے گورنر جنرل کو کمتر گنتا تھا ۱۸۴۹ء میں اس کا ولیعہد مرزا دارا بخت اس دنیا سے رخصت ہوا، لارڈ ڈلہوزی کو یہ موقع ہاتھ آیا کہ بادشاہی کی اس چھوٹی نقل کو بھی مٹا دے گو بادشاہی برائے نام تھی۔

۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے ریذیڈنٹ دہلی کو لکھا کہ اگر یہ بڈھا بادشاہ مر جائے تو اس کا جانشین بغیر خاص اجازت کے متعین نہ کیا جائے، لارڈ ڈلہوزی نے جو اس زمانے کے مدبر اعظم تھے اس پردہ کو اٹھایا اور سب لوگوں پر ظاہر کر دیا کہ خاندان بابر اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں مشترک خداوند ہندوستان کے نہیں ہیں۔ لارڈ ڈلہوزی نے جو اول یہ ارادہ کیا تھا کہ بہادر شاہ کو ہدایت کرے کہ وہ قطب میں جا رہے۔ قلعہ خالی کر دے، اس لیے ملتوی کر دیا تھا کہ وہ اس حکم سے برخلاف تھا، بادشاہ کی عمر ستر برس کی تھی، اس سے زیادہ جینے کی توقع نہ تھی۔ اس سے اس کے وارث جانشین مرزا فخرالدین سے ایک عہد نامہ لکھایا گیا کہ وہ باپ کے مرنے کے بعد قلعہ سرکار کے حوالے کر دے، اس شرط کے ماننے میں مرزا نے کوئی چون چرا

---

[۱]: نصرت نامہ گورنمنٹ

نہ کی، مگر وہ باپ سے پہلے ہی ہیضہ سے مر گیا۔ بعض نے کہا کہ زہر دینے سے اس کا جام عمر لبریز ہوا۔

جس خاندان کو لارڈ ڈلہوزی مٹانا چاہتے تھے، آیندہ سال کے غدر نے نیست و نابود کر دیا[1]۔

شفیق باپ

بہادر شاہ کو اپنے بیٹوں سے، اپنی اولاد سے سکھ نہ ملا، یہ اس کے مرنے کی دعائیں مانگتے رہے، انگریزوں سے اس کی شکائتیں کرتے رہے، قلعہ میں اس کے خلاف سازشیں کرتے رہے، لیکن وہ ایک شفیق باپ کی طرح ہر حال میں ان سے محبت کرتا رہا، دیکھنا اس کا پہلا ولی عہد دارا بخت اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے:۔

"مشہور شہزادی محمدی بیگم کی والدہ کہتی تھیں کہ جب ولی عہد کی حالت غیر ہوئی اور بادشاہ کو موت کا پورا یقین ہو گیا تو وہ سرہانے کھڑے ہوئے، مریض کی صورت ٹکٹکی باندھ کر دیکھی، جھکے اور بے تابانہ اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا، آنکھ سے آنسو جاری ہوئے، اُٹھے تو چکر آیا، بیٹھے اور چکرا کر گرے، سنبھلے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں، حکیم احسن اللہ خاں کی آمد ہوئی، انھوں نے نبض اور سانس دیکھ کر کہا شہد دینا چاہیے" یہ بھی عجیب وقت تھا، بہادر شاہ کا جوان پسر جس کی جوانی دیکھنے دکھلانے کے لائق تھی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اور بدنصیب باپ جانکنی میں تھپکا رہا تھا، چار گھنٹے اسی طرح بسر ہوئے ہر شخص پتھر بنا ہوا تھا، بدبخت باپ ایک ایک کا منہ حسرت سے دیکھتا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اس مصیبت میں کام آ جائے اور جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے کوئی بجھا دے مگر یہ وہ پہاڑ تھا جو کسی کے سرکائے نہ سرک سکتا تھا، دوپہر کی توپ چلتے ہی بہادر شاہ اٹھے، بچہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور وضو کیا آنکھ سے آنسو جاری تھے اور ایک دیوانگی کا عالم طاری تھا، وضو ٹھیک تھا۔ نماز جا نماز پر بیٹھے دعا مانگ رہے ہیں۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا کہ دارا بہادر شاہ سے ہمیشہ کو جدا ہو گیا، وہ باپ کے کرب، اضطراب اور عزیزوں کی گریہ و زاری سے قطعاً ناآشنا اور بے خبر تھا اور اب اس جسم میں زندگی کا نام تھا صرف

---

[1]: تاریخ عہد انگلشیہ صـ ۱۵۱؂

سانس کی آمد و رفت کا نظام جب یہ بھی بگڑا تو وہ تھوڑی بہت آس جو سانس کے ساتھ جوشِ پدری نے لگا رکھی تھی، ختم ہوئی اور ستم رسیدہ باپ بچہ کے سرہانے آکر کھڑا ہوا اور جب دل نے یقین کر لیا کہ دارا کی صورت کچھ دیر بعد آنکھ سے ایسی اوجھل ہوگی کہ پھر نظر نہ آئے گی اور جس کی زندگی کے ساتھ جان لگی ہوئی ہے قلعہ میں تھوڑی دیر کا مہمان ہے تو بے تاب ہو کر اس کے سر کو بوسہ دیا اور چمٹ گیا، روتی ہوئی آنکھوں سے دو دفعہ آواز دی مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ باپ پکارتا رہا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کلیجہ کے ٹکڑے کو ہچکی آئی، پچھاڑ کھا کر گرا اور ہوش آیا تو باقی کی دونوں ہچکیاں اور پرواز رُوح کے تمام مراحل طے ہو چکے تھے [1]۔

اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

بہادر شاہ مجبور تھا، معذور تھا، کچھ نہ تھا —— پھر بھی اس کا دل حوصلوں سے اور اس کا سینہ اُمنگوں سے خالی نہ تھا، وہ کچھ نہ ہونے پر بھی جو کچھ ہو سکتا تھا کرتا رہتا تھا۔ ایک محرم اسرار کا بیان ملاحظہ ہو :-

" فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار تو سرکار انگریزی سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات و مواضع جات بازاری و کرایہ دکاکین و آمدنی باغات وطیول و نزول خالصہ وغیرہ کی آمدنی تھی من کل الوجوہ سوا لاکھ روپیہ تصور کر لینا چاہیے، مگر عظمت جلال و شان و شوکت و تزک احتشام و ادب و آداب دربار و انتظام جلوس سواری کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یاں کسی زمانے میں یہ خاندان عالی شان سزاوار فرمان روائی ہندوستان جنت نشان ہوگا، جلّ جلالہٗ، مگر باوجود انحطاط و کسر تموّل و قلت معاش دو امر حیرت خیز و تعجب انگیز ایسے نظر سے گزرے ہیں کہ مجھے آج تک ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے، اوّل تو خدائے عالم نے اس لاکھ روپے میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی، کہ وہ خیر و برکت و وسعت و استطاعت کروڑوں روپے کی ریاستوں میں بھی نہ دیکھی۔

کارخانہ جات بادشاہی

خاصہ کلاں۔ خاصہ خرد، آبدار خانہ۔ دوا خانہ، توشہ خانہ جواہر خانہ۔ سلح خانہ، خانساماں، فیلخانہ، اصطبل

---

[1]: نوبت پنج روزہ (راشد الخیری) صفحہ ۹۱۔

بگھی خانہ، توپ خانہ، شتر خانہ، رتھ خانہ، کارخانہ جلوس، ماہی مراتب (چتر و علم) بخشی خانہ فوج
کتب خانہ، کبوتر خانہ، داروغہ نذر نثار، داروغہ فراش خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاروں، داروغہ
خاص، برداران جمعدار، حبشیان، نواب ناظر، خواجہ سرایان، کارخانہ داران، کے نام بہ نظر
طوالت قلم انداز کیے گئے۔

تفصیلِ فوج: سیاہ پلٹن، اگنی پلٹن، بچھیرہ پلٹن، خاص برداران، رسالہ سواران۔

معززین دربارِ معلّی: وزراء، پیر و مرشد، استادان، علماء و حکماء، شاہزادگان، نواب ناظر،
بخشی فوج برداران، کبیران کاملین پُر فن، مہتممان کارخانہ جات، عرض بیگمیان۔

صیغہ ہائے تقسیمِ تنخواہ: تنخواہ تقسیم محلات، شاہزادگان، صیغہ سرکار قدیم، صیغہ
علاقہ عسکری، صیغہ روزینہ داران، متعلقہ اطلاعات، معززین دربار، ملازمانِ فوج۔

فرائض ارب و آداب ہائے بادشاہی: دستور نشست دربار سلاطین دہلی کے تھے، سوائے سلطنت
ایران کسی سلطنت یورپ میں مروج نہیں۔ دیوان خاص کے وسط میں تخت طاؤس نصب ہوتا تھا اور
بالائے تخت شامیانہ زریں چوبہائے نقرہ ملمع طلائی پر نصب کیا جاتا تھا۔ تخت طاؤس کے برابر
چار کونوں پر طاؤس طلائی مینار نصب ہوتے تھے اور ان کی منقاروں میں بڑے بڑے موتیوں کی
مالائیں جن میں زمرد کے گچھے ہوتے تھے آویزاں ہوتی تھیں۔ تخت طاؤس میں سنہرے تکیے لگائے جاتے
تھے۔ جب بادشاہ دربار فرماتے تو تخت طاؤس کے دونوں جانب دو طرفہ صفیں درباریوں
کی دست بستہ ایستادہ ہوتی تھیں۔ سب نیچی نگاہیں کیے کھڑے رہتے تھے۔ نامرتی مجال کیا
ہے کہ کوئی کسی طرف دیکھے یا کھانسے یا کسی سے بات کرے۔ دربار کے کونوں پر دو قطار ...ی
بردار دو لکڑیاں سرخ لیے کھڑے رہتے تھے۔ ذرا سی کسی سے بے اعتدالی ہوئی اور گردن میں
لکڑی ڈال کر دربار سے باہر کیا گیا اور روساء ہند کا سا دربار نہ ہوتا تھا۔ دیوان خاص کے مقابل لال
پردے کا دروازہ تھا۔ وہاں سرخ بانات کا پردہ لٹکا رہتا تھا۔ جو شخص دروازے میں سے داخل دیوان
خاص ہوتا تھا پہلے لال پردے کے پاس آکر سلام کیا کرتا تھا، وہ ہوتا تھا آداب تسلیمات بجا لاتا تھا اور

تین سلام بہت مؤدب جھک کر بجالاتا تھا اور نقیب لال پردے کے برابر سے آواز لگاتا، "ملاحظہ آداب ہے، آداب بجالاؤ، جہاں پناہ بادشاہ سلامت" اور اس کے شخص سلامی پہلو میں ہو کر عقب حمام کی جانب کے زینہ سے دیوان خاص کے چبوترے پر چڑھتا اور نعلین خالی کرتا اور دیوان خاص میں جاکر دوبارہ دوسری سلام گاہ پر آداب بجالاتا اور نقیب دوبار بطور اول آواز لگاتا اور سلام کراتا۔ اگر نذر گزرانی ہے تو سیدھا تخت کی جانب جاکر نذر پیش کرے گا اور بادشاہ نذر اٹھاکر نذر نثار کے داروغہ کو دیتے۔ نذر نثار کا داروغہ تخت کے پہلو میں ایستادہ رہتا تھا اور ایک متصدی لکھتا جاتا تھا مگر نذر دے کر پھر پچھلے قدموں ہٹ کر سلام گاہ تک جاتا اور باقاعدہ اول پھر اسی طرح آداب بجالاتا اور جہاں جا طی صف دربار میں شامل ہو جاتا تھا، تخت کے عقب میں خاص لوگ عہدے سے کھڑے رہتے تھے، وہاں ہما سے مگس رانی کرتے تھے، اگر کچھ عرض معروض کرنی ہے تو عرض بیگی دونوں صفوں کے سرے پر کھڑے رہتے تھے، عرضی ان کو دے دی جاتی تھی، اور وہ عرضی لے جاتے تھے، بادشاہ کے سامنے عرضی کو کھول کر ملاحظہ کرا دیتے تھے، پشت عرض بیگی کی جانب ہوتی تھی، بعد ملاحظہ عرضی خواص پیش کرتا تھا اور وہ لبصورت آئینہ گھر کے مجوف تھے، اس میں قلم سر کے رکھے رہتے تھے، عرضی کو اس پر رکھا گیا اور بادشاہ نے پنسل سے دستخط فرما دیئے جس محکمہ کے نام حکم ہوا فوراً تعمیل ہو گئی، یہ قاعدے دربار شاہی کے تھے[1]

یہ بہادر شاہ بیدار مغز بھی تھا

غدر کے زمانے میں چند روز کے لیے بہادر شاہ کو اختیارات حکومت ملے، اس نے ان اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھایا نہ حتی الامکان کسی کو حتی کہ شہزادوں تک کو اٹھانے دیا۔

ایک مخالف شہادت دیتا ہے کہ :۔

"ہم نے بادشاہ کے جنگی انتظامات اور احکامات کا اوپر بیان کیا، اب ملکی انتظامات کا

---

[1] : داستانِ غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

بیان کرتے ہیں، بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ سلطنت کے عدالت کے کام میں شہزادے اور سپاہ مداخلت نہ کریں، عدالت کے سارے کام صرف مفتی اور صدرالصدور کیا کریں نہ سپاہ نہ مال کے حکام اس عدالت میں دخل دیں۔[1]

بادشاہ کی حیثیت

اور اس بادشاہ کی حیثیت کیا تھی؟ صرف یہ!!

۲۶ جون ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی :-

حضور بادشاہ سلامت ۷۰ برس کے ہو گئے، حضور بادشاہ سلامت قلعہ میں رونق افروز ہیں اس ہفتہ میں حضور کی سالگرہ ہوئی، رت جگا ہوا، گانے والوں کا رات بھر گانا ہوا، بیگمات اور مرشد زادوں نے نذریں دیں نذر میں کل بارہ اشرفیاں اور ایک سو تیس[۱۳۰] روپے آئے۔ حضور کی عمر ۷۶ سال ہو گئی۔ ۷۷ واں سال لگا۔ حضور والا نے صاحب ایجنٹ کو تیرا ل اور پنیر بھجوایا۔ بیگمات اور نوکروں کو مٹھائی تقسیم کرائی اور خیر خواہوں کو انعام دیا۔[2]

حسن سلوک

خاندان کے نوجوان بیٹوں کے بیٹے تخت اور صاحب تخت کے خلاف علانیہ اور خفیہ سرگرم کار رہتے تھے لیکن وہ انھیں نواز تا تھا۔ مالامال کرتا تھا، القاب خطابات دیتا تھا، جائداد اور جاگیر دیتا تھا حوصلہ افزائی کرتا تھا تاکہ ان کے دل صاف ہوں لیکن یہ اپنے رنگ پر استقلال کے ساتھ قائم تھے۔

"۳۰ اپریل ۱۸۴۰ء مرزا محمد شاہ فرخ بہادر مرحوم کے بڑے صاحبزادے کو بادشاہ سلامت نے طلب فرما کر سواروں کی بخشی گری کا منصب اور علاقہ بدی اور کمخواب کی قبا اور سہ رقم جواہر دوشالہ دستار سربستہ سپر شمشیر گھوڑا اور ہاتھی مرحمت فرمایا اور فرہ باصرہ خلافت غرہ ناصیہ دولت شیر بیشہ شہامت شہسوار میدان شجاعت غضنفر الدولہ شمس الملک مغیث الزمان مرزا محمد عبداللہ شاہ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور منجھلے صاحبزادے کو تمام کارخانوں کا دیوان مقرر فرما کر تو دعدیقہ شہر

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۵۳۶

[2]: سرٹامس مٹکاف کی ڈائری ص۱۶۹

یاری نور دیدہ کام گاری مہر سپہر رفعت ماہ منیر دولت رفیع الدولہ قطب الممالک فخر الزماں مرزا محمد بخت کے خطاب سے معزز و ممتاز فرمایا اور کمخواب کی قبا دوشالہ سہ رقم جواہر دستار گھوڑا ہاتھی پالکی وغیرہ سامان مرحمت ہوا (یہی مرزا عبداللہ غدر کے بعد جیل خانہ دہلی کے سامنے مسٹر ہڈسن کے ہاتھ سے مارے گئے) اور سب سے چھوٹے صاحبزادے کو سپاہیوں کی پلٹن کی بخشی گری کے عہدہ پر مقرر کیا اور ایک کمخواب کی قبا دوشالہ سہ رقم جواہر دستار سپر تلوار ہاتھی گھوڑا پالکی مرحمت فرمائی، اور گوہر درج خلافت اختر برج سلطنت یکہ تاز میدان شجاعت نہنگ دریائے شہامت مغیث الدولہ فخر الممالک محی الزمان مرزا محمد خرم بخت بہادر کے خطاب سے سربلند و سرفراز فرمایا۔[1]

مقرب بارگاہ دشمن

حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے جاسوس اور بہادر شاہ کے وزیر اعظم اور طبیب خاص تھے بہادر شاہ اپنے اس فدا ئیر خوش تقاریر کے حالات سے واقف تھے پھر بھی مورد لطف و کرم بناتے رہتے تھے:۔

حکیم احسن اللہ خاں کو اعظم الحکماء حاذق الزماں انتخاب الملک حترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خان بہادر ثاقب جنگ کے خطابات مرحمت فرمائے حکیم صاحب نے شکریہ ادا کیا، آداب شاہی بجالائے اور پانچ روپے پیش کش کئے۔[2]

بہادر شاہ خوش طبع تھے

اپنی رنجوریوں، اور محرومیوں کے باوجود بہادر شاہ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے، کلکتہ سے ایک چھٹی بذریعہ ڈاک نواب فیض علی خاں مرحوم رئیس جھجر کے نام آئی۔ حضور نے جھجر کے نمائندہ سے فرمایا، اب نواب فیض علی خاں کو کہاں تلاش کیا جائے، نمائندہ نے عرض کی حضور کو سب کچھ اختیار ہے، حضور نے مسکرا کر چھٹی اس کے سپرد کر دی۔[3]

ص[1] : بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۳۲ ؛

ص[2] : سر طاس منٹکاف کی ڈائری ص ۱۳۳ ؛

ص[3] : سر طاس منٹکاف کی ڈائری ص

تصرفات باطنی

بعض لوگ بہادر شاہ کے تصرفات باطنی کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ راقم الدولہ ظہیر فرماتے ہیں: بادشاہ کی سواری کی گاڑی میں سولہ[16] گھوڑے لگائے جاتے تھے۔ حضرت بادشاہ کیوان بارگاہ حق معرفت دستگاہ جامع الکمال و مورد افضال حضرت ذوالجلال تھے۔ سوائے رتبہ اعلائے سلطنت دنیوی تصفیہ باطنی سے بھی موصوف تھے اکثر تصرفات حضرت کے سننے میں آئے ہیں، چنانچہ ازاں جملہ ایک یہ بھی تکیہ کلام کا تھا کہ میری اولاد ناحق آرزو سلطنت کی رکھتی ہے، یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں ہے، مجھ پر ہی خاتمہ ہے از تیمور تا ظفر چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا، حضرت کو بیعت میاں کالے خاں صاحب نبیرۂ مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ سے ہے اور مریدان حضرت بھی بسیار از بسیار تھے، اس کے علاوہ جمیع علوم و فنون عجیبہ و غریبہ میں دستگاہ تام رکھتے تھے[1]۔

رحم دل بادشاہ

"۱۲ فروری ۱۸۴۷ء، حضور انور کو یہ معلوم ہوا کہ خواجہ احسن اللہ ناظر عدالت دیوانی کو زبردستی ان کے عہدہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور ایک معمولی پنشن ان کے لیے مقرر کی گئی ہے تو حضور نے نواب حامد علی خان کو طلب فرما کر حکم دیا کہ ان کے معاش کے لیے شاہی خزانہ سے کچھ مقرر ہونا چاہیے، پھر حضور نے انھیں خلعت سہ پارچہ اور ایک رقم جواہر عطا فرمایا[2]۔

عوام کی گرویدگی

بہادر شاہ کے یہی وہ اطوار تھے جن کے باعث عوام ان کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، ایک انگریز اعتراف کرتا ہے:

"اپنی جسمانی کمزوری اور ذہنی بے مقدوری کے باوجود شہر دہلی کے تمام طبقے باشندوں کی جانب سے بہادر شاہ کا نہایت احترام کیا جاتا۔ ایک شخص نے جس نے انھیں اپنی آنکھوں سے

---

[1]: داستان غدر ص ۴۔

[2]: بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۔

دربار کرتے دیکھا تھا، مجھ سے بیان کیا کہ ان سے ہندو مسلمان دونوں ہی ان کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے بے حد محبت کرتے تھے، شہنشاہ کی حیثیت سے ان کی کمزوریاں اور خامیاں بھی عوام کے لیے مزید گرویدگی کا باعث بن گئی تھیں وہ بہت پرامن تھے اور جنگ جوئی پن اُن میں نام کو نہ تھا، ان کی رعایا ان کی سادگی پر ہنستی تھی وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ کس قدر بے بس ہیں لیکن پھر بھی وہ ان سے محبت کرتی تھی۔

بہادر شاہ —— ان فنون لطیفہ میں جن کے لیے دہلی اس زمانہ میں مشہور تھی، اچھے خاصے ماہر تھے، ان میں سے چار موسیقی، خوش نویسی، ہاتھی دانت کی نقاشی اور شاعری تھے، شاہی دربار ان سب فنون کا سرپرست تھا[1]۔

داد و دہش بذل و العطا بادشاہ اپنی مالی پریشانیوں کے باوجود سخاوت اور دریا دلی اور سیر چشمی کے مظاہرے نتائج سے بے پروا ہو کر کیا کرتے تھے:۔

"۹ / اکتوبر ۱۸۴۶ء، بادشاہ سلامت عیدالفطر کی نماز کے لیے مرشد زادہ آفاق مرزا ولی عہد بہادر کے ساتھ عیدگاہ تشریف لے گئے اور نماز پڑھنے کے بعد شاہانہ جاہ و حشم اور ملوکانہ شان و شوکت کے ساتھ ملازمین اور سرداروں کے جھرمٹ میں عیدگاہ سے واپس تشریف لائے جو شان و شوکت بادشاہوں کے شایان شان ہوتی ہے اس کا اہتمام و انتظام کیا گیا تھا، لوگ راستہ میں ہر جگہ بادشاہ سلامت کی خدمت میں تحفہ دعا اور ہدیہ مبارک باد پیش کرتے تھے آمد و رفت کے سلامی کی توپیں اس قدر بلند آواز کے ساتھ چھوڑی گئیں کہ ان کی آواز فلک الافلاک تک پہنچی، ہر غریب امیر کو انعامات خلعت ہائے فاخرہ اور زر نقد تقسیم کیا گیا، بادشاہ کے اس انعام و اکرام سے اراکین سلطنت بھی بہرہ اندوز ہوئے اور غریب غربا بھی شاہی داد و دہش اور بذل و سخا سے مالا مال ہو گئے[2]؛

---

[1]: ذکاءاللہ دہلوی (سی الیف اینڈریوز) ص ۱۴۱ ؛

[2]: بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۵ ؛

مہربانیوں کا دریا

۹ نومبر ۱۸۴۴ء ، اسد بیگ خان جو اسباب فراش خانہ (خیمہ وغیرہ) کے گم ہونے کی وجہ سے بارگاہ سلطانی میں معتوب اور قلعہ معلیٰ کی آمد و رفت سے محروم تھے۔ خدمت عالی میں حاضر ہوئے احترام الدولہ بہادر نے سفارش فرمائی بادشاہ سلامت کی مہربانیوں کا دریا جوش میں آیا اور ان کا قصور معاف کیا گیا۔[1]

فکر مند بادشاہ

بہادر شاہ تخت حکومت پر متمکن تھے لیکن امروز و فردا کے نقشے بھی ان کی آنکھوں کے سامنے رہتے تھے ایک روز کیا ہوا کہ :-

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے جو میں پہنچا ، افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا ، میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے ، وہیں بلایا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے استاد آج مجھے دیر تک اس بات کا افسوس رہا ، میں نے حال پوچھا کہا کہ وہ ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا اس کے وہ اشعار آج مجھے یاد آگئے ، ان کے خیالات سے طبیعت کو عجیب لطف حاصل ہوا ، مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدہ ہمارے لیے کہتے ہو ، ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا ، اس کے لیے کہو گے ، میں نے عرض کی حضور کچھ تردد نہ فرمائیں ، خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اکھڑ جاتی ہیں ، ہم حضور سے پہلے اٹھ جائیں گے ، حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے ؟ فردوس منزل کے امراء ان کے عہد میں کہاں تھے ؟ عرش منزل کے ، فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے ، عرش آرامگاہ کے امراء آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں بس یہی خیال فرما لیجئے جو جس کے ہوتے ہیں وہ اسی کے ساتھ جاتے ہیں نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامان مجلس میں ساتھ لاتا ہے یہ سن کر حضور بھی آبدیدہ ہو گئے۔[2]

---

[1] : بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۴۲

[2] : آب حیات (محمد حسین آزاد) ص ۵۳۴ ۔

بادشاہ کی سواری

۲۵ دسمبر ۱۸۴۶ء بروز عید اضحی بادشاہ سلامت زرق برق لباس زیب تن فرما کر بہت عمدہ گھوڑے پر سوار ہو کر عید گاہ تشریف لے گئے نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خلعت شش پارچہ و دو رقم جواہر ایک قبضہ شمشیر مع پرتلہ خطیب صاحب کو اور کمخواب سہ رقم جواہر ایک دستار سربستہ اور گوشوارہ مقیش ایک دوشالہ مرزا حضرت سلطان بہادر متولی مصلی کو اور خلعت شش پارچہ سہ رقم جواہر اور قبضہ شمشیر و نار الدولہ ناظم امور خانسامانی کو مرحمت فرمائے اس کے بعد اونٹ کی قربانی کی گئی اور حاضرین مجلس نے نان وکباب کا شغل کیا اس وقت نہایت شادمانی اور فرحت کا ساز و سامان تھا۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے میں مصروف نظر آتا تھا۔ چاروں طرف سے مبارکباد مبارکباد کی صدائیں آرہی تھیں جس راستہ سے بادشاہ سلامت کی سواری گذری امراء و روساء و اراکین سلطنت نے عید کی مبارکباد پیش کی اور نذریں بھی گذاریں جس وقت بادشاہ سلامت محل معلی میں تشریف لے گئے تو تمام خاندان کی بیگمات جس میں خاندان تیمور کی خواتین بھی شامل تھیں۔ بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور حسب حیثیت نذرانہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ آتے جاتے وقت شاہی و انگریزی توپ خانہ سے نہایت بلند آواز کے ساتھ سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں۔

بقرعید کے دن حضرت میر مہدی صاحب مرحوم کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت عرس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے ختم میں شریک ہوئے اور تبرک لے کر واپس تشریف لائے۔[1]

مینا بازار

بہادر شاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ لیکن حوصلہ مندی اور اولوالعزمی میں وہ اپنے اسلاف سے کسی طرح کم نہ تھے۔

"۲۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء حضرت بادشاہ سلامت نے پھول والوں کی سیر کے دن زبان گوہر فشاں سے فرمایا کہ بارگاہ شاہی سے مہابت تک عمدہ قناتیں اور قیمتی خیمے نصب کئے جائیں اور صرافوں جوہریوں میوہ فروشوں اور ہر قسم کے دوکانداروں کو اطلاع دے دی جائے کہ دکانداری کا مال دے کر وہ اپنی

---

[1] : بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۹۵۔

بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کی لڑکیوں کو خیمہ گاہ میں بھیج دیں اور یہ تاکید کر دیں کہ عمدہ عمدہ قسم کا مال لے کر آئیں اور دکان کو اچھی طرح سے سجائیں، شاہی بیگمات میلہ میں سیر و تفریح کی غرض سے تشریف لائیں گی اور عمدہ اور نفیس چیزیں خریدیں گی[1]

بہادر شاہ کا دسترخوان

بہادر شاہ کا دسترخوان اتنا ہی وسیع تھا، جتنا کہ اُن کا دل "میں نے دیکھا، جہاں پناہ جب کھانے کے کرہ میں دسترخوان پر تشریف فرما ہوتے تو خاصہ کھانے کے لیے ملکہ زمانی حضور کے پہلو میں اور جن جن بادشاہزادوں اور شہزادیوں کو آپ یاد کرتے وہ بھی دسترخوان پر ادھر اُدھر حاضر ہوتیں، دنیا کی نعمتیں دسترخوان پر چنی جاتی تھیں، مگر جہاں پناہ سوائے بٹیر کے شوربہ کے کچھ نہ نوش فرماتے، اپنی اولاد کو کھاتا دیکھ کر فرماتے، ان سب کے منھ میرے ہی منھ ہیں اور ان سب کے پیٹ میرے ہی پیٹ ہیں، یہ کھاتے ہیں اور میں خوش ہوتا ہوں کسی بادشاہزادے یا شہزادی کی تاب نہ تھی کہ دسترخوان پر بات کیا' یوں بھی کرے' کمروں کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہوتی تھیں چلمن کے باہر میری ساس اور باورچنیں ہاتھ باندھے کھڑی ہوتی تھیں اگر جہاں پناہ کو کسی کھانے کے متعلق کچھ کہنا سننا ہوتا تو ارشاد فرماتے " داروغہ کو بلاؤ " میری ساس چلمن ہٹا کر کمرے میں داخل ہوتیں اور آداب بجالاتیں " فرماتے " ہاں ایک خوان خاصہ کا فلاں کے ہاں، ایک خوان خاصہ کا ڈھمک کے یہاں، آٹھ خوان خاصہ کے حضرت میاں کالے صاحب کے یہاں جائیں گے' میری ساس ہاتھ جوڑ کر عرض کرتیں "کرامات حضور کے اقبال سے خوان تیار ہے، بگمیوں میں رکھوا کر ابھی بھجوائے دیتی ہوں"[2]

بہادر شاہ کی صحت

حالات و حوادث نے بہادر شاہ کو بیمار اور رنجور بنا دیا تھا، پھر سب پر مستزاد بڑھاپا، "پیری و صد عیب چناں گفتہ اند" وہ مجموعہ

---

[1] : بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۰۷ ؎

[2] : لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق دہلوی) ص۳۳ ؎

امراض وہموم بن کر رہ گئے تھے۔

بہادر شاہ کی صحت اب بگڑ گئی تھی، درد گردہ کا دورہ وقتاً فوقتاً ہوتا، نزلہ کی شکایت اکثر رہتی، ڈاڑھوں اور دانتوں میں سخت درد رہتا غرض سو بیماریوں کی بیماری ایک بڑھاپا تھا۔[1]

غدر شروع ہوگیا غدر کے حالات و حوادث ایک مستقل باب کے طالب ہیں اور وہ باب اپنی پوری تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہے لیکن غدر کے سلسلہ میں بہادر شاہ نے کیا کیا؟ اور ان پر کیا گزری؟ ان حالات کا تعلق اس باب سے ہے۔

پس منظر "بظاہر کوئی صورت باقی نہ رہی، فتنوں کے بند یکے بعد دیگرے ٹوٹتے گئے تباہی خیز طوفانوں کا تلاطم بڑھتا گیا، شاہ عالم ثانی کے عہد میں بادشاہ کے اضطرار و بیچارگی کی یہ کیفیت ہوگئی تھی، جیسے کوئی خزاں زدہ پتا جسے ہوا کا یہ جھونکا کسی طرف اڑا کرلے جاسکتا ہے، جس سلطنت کے حدود کسی زمانے میں کابل و قندھار سے برما اور راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے، وہ سمٹ کر لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہوگئی تھی تاہم اس کا نام باقی تھا اور ہندوستان کے بڑے بڑے اقطاع کے فرمانروا اپنی حکمرانی کی دستاویزوں پر لال قلعہ کے مجبور و بے دست و پا سلاطین سے مہریں لگوانے کے آرزو مند تھے اس لیے کہ ان مہروں کے بغیر کسی کی فرمانروائی کا سکہ نہیں چل سکتا تھا تخت طاؤس افسانہ بن چکا تھا لیکن جس دیوان خاص نے دو سو برس تک اس تخت کے جلال و شکوہ کی بہاریں دیکھی تھیں وہ موجود تھا، بابر اکبر کا ایک جھلملاتا ہوا چراغ لے کر اس غربت کدہ میں آیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنی اس قدر پھیلی کہ سارا ہندوستان بقعہ نور بن گیا، تین سو سال بعد حوادث کی آندھیاں اس شدت سے پے در پے چلیں کہ سب چراغ بجھ گئے، سب شمعیں گل ہوگئیں، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، صرف دہلی کے لال قلعہ میں ایک ٹمٹماتا سا دیا باقی تھا، جس کی جھلک دیکھنے والوں کے دلوں میں عہد رفتہ کی ضو افشانیاں

---

[1] : نوبت پنج روزہ (راشد الخیری) ص۱۱۷ ؛

تازہ کردیتی تھیں [1]۔

اور اب انگریزوں نے طے کر لیا تھا کہ اس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو بھی بجھا دیں، غدر شروع ہوا اور بہادر شاہ کو پہلے ارادہ نہ رکھنے کے باوجود اس میں حصہ لینا پڑا۔ کچھ ترک سوار کلکتہ کے دروازہ کو بند دیکھ کر قلعہ کے ثمن برج کے نیچے گئے کہا بادشاہی ہمارے کے گستیاں ہیں بادشاہ نے یہ سن کر انکو کچھ جواب نہیں دیا اور انکے سامنے آیا۔ بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خاں اور غلام عباس شمشیر الدولہ کو بلایا اور غلام عباس کو حکم دیا کہ وہ کپتان ڈگلس کے پاس جاکر خبر دے اور ان سے درخواست کرے کہ اس معاملہ میں جو کاروائی ضروری ہو وہ کریں۔ بادشاہ اپنی بیٹھک میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں غلام عباس کپتان ڈگلس کو ہمراہ لے آگیا، کپتان صاحب فورا برآمدہ میں آئے اور زیر جھروکہ جو سوار کھڑے تھے، ان سے کہا کہ یہ بادشاہ کی خواب گاہ ہے تم اپنی داد فریاد سے بادشاہ کو تکلیف نہ دو، کوٹلہ کی طرف جاؤ، وہاں جو عرض کرنا ہے وہ کرو شنوائی ہوگی، سوار راج گھاٹ کی طرف چلے گئے۔ بادشاہ کپتان صاحب کے آنے کی خبر سن کر بیٹھک در دیوان خاص کے کھلے صحن میں آگئے تو کپتان صاحب نے کہا کہ حضور گھبرائیں نہیں۔ یہ شور و شر فوراً رفع کر دیا جانے گا، میں جاکر سپاہیوں کو فہمائش کردوں گا اور وجہ فساد پوچھوں گا۔ بادشاہ نے کہا کہ نہ آپ کے پاس بندوق ہے نہ سپاہ ہمراہ ہے۔ آپ کا مسلح سواروں میں جانا دانائی سے بعید ہے، جان جانے کا خوف ہے، تو کپتان ڈگلس اپنے مکان کو چلے گئے، سوار راج گھاٹ کی طرف چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد کپتان ڈگلس نے غلام عباس اور حکیم احسن خاں کو بلایا اور دونوں کپتان صاحب کے پاس حاضر ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ دو پالکیاں مع کہار وہاں کے بھیج دو کہ ان میں لیڈیاں سوار ہو کر بادشاہ کے محل میں جاکر پناہ گزیں ہوں۔ غلام عباس اور حکیم احسن اللہ خاں دونوں بادشاہ کے پاس پیغام مذکور پہنچانے گئے۔ بادشاہ کے حکم سے فوراً دو پالکیاں بھیجی گئیں اور توپوں کے بھیجے جانے کا حکم دیا گیا [2]۔

---

[1] : غالب (غلام رسول مہر) صفحہ ۲۴۔

[2] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ، صفحہ ۴۱۔

بہادر شاہ نے کوئی ظلم نہیں کیا

بہادر شاہ کا دل اگرچہ انگریزوں نے خون کر دیا تھا اور اب وہ پورا انتقام لے سکتا تھا لیکن اس نے حتی الامکان انگریزوں پر کوئی ظلم نہ ہونے دیا۔

ذیل کا بیان اس شخص کا ہے جو انگریزوں کا جاسوس تھا اور اپنے اس شرف پر شرماتا نہیں فخر کرتا ہے پھر بھی وہ کہتا ہے :۔

" کورنش بجا لانے کے بعد میں نے ظل سبحانی کے سوالات کے جواب میں عرض کیا کہ باریابی حاصل کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میں اس قتل و غارت گری کی اطلاع دوں جو اس وقت برپا ہو رہی ہے اور یہ کہ شہر کے تمام بدمعاش یورپیوں اور کرسچنوں کی تلاش میں ہیں تاکہ انھیں اور ان کے بال بچوں کو تباہ کر دیں میں نے ظل سبحانی سے عرض کی کہ خدارا خونریزی کو رد کیئے اور شہر میں امن و اماں قائم کر دیجئے، بادشاہ نے جواب دیا کہ میں بالکل عاجز ہوں میرے تمام ملازمین کا دماغ یا تو الٹ گیا ہے یا بھاگ گئے ہیں میں تن تنہا رہ گیا ہوں میرے پاس فوج نہیں ہے جو میرا حکم مانے ایسی حالت میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ اگر حضور مجھ پر اپنی خواہشات کا اظہار فرما دیں گے تو ممکن ہے کہ میں حضور کے احکام بجا لانے کے بارے میں کوئی کاروائی کر سکوں پھر میں نے اپنے طریق کار کو پیش کیا ظل سبحانی نے فرمایا کہ میرے بیٹے! میں تم سے یہی توقع رکھتا تھا۔ تم میرے پاس بڑی مصیبت اور خطرے کے وقت آئے ہو جو کام اچھا سمجھو کر ڈالو میں تمہیں اس کا اختیار دیتا ہوں "

اس کے بعد میں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "اگر کبھی کوئی شخص حضور کے روبرو میری برائی کرے اور شورش دبانے کا مجھ پر الزام دھرے تو حضور فرما دیں کہ وہ میرے احکام کے مطابق کام کر رہا ہے مگر حضور اپنے چوبداروں میں سے ایک یا دو کی خدمات عطا فرما دیں اور انھیں میرے ساتھ قتل و خونریزی کے مقام پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں اور انھیں میری ہدایات پر چلنے کا حکم صادر فرما دیں تو بہت ممکن ہے کہ بے کس لوگوں کا قتل رک جائے وہ حضور کے روبرو کر دیئے جائیں گے اگر ان کی جان بخشی ہوگی تو یہ کاروائی حضور کے شایان شان ہوگی بشرطیکہ احقر کی تجویز پر عمل درآمد

ہو، مَیں نے یہ بھی عرض کیا کہ کسی شاہزادے کو حکم دیا جائے تاکہ وہ شہر کے بازاروں میں گشت لگائیں اور دوکانداروں کو اپنی دوکان کھولنے پر مجبور کریں، بادشاہ سلامت نے میری تجاویز کو پسند فرمایا اور حکیم احسن اللہ خاں کو طلب فرمایا، جب وہ آ گئے انھیں میری تجاویز سننے کا حکم دیا گیا، حکیم صاحب نے کہا کہ چوبداروں کو تمھاری معیت میں جانے کی کیا ضرورت ہے ؟

"باغی لوگ" عیسائیوں کے قتل عام سے کبھی باز نہیں آئیں گے اور اگر ان کی مزاحمت کی گئی زیادہ خراب نتائج رونما ہوں گے، جب عیسائیوں کے خون سے جی بھر جائے گا تو ہماری طرف متوجہ ہوں گے اور ہمارے مال و اسباب کو لوٹ لیں گے، ہمیں صرف اپنی ہی خبرگیری کرنا چاہیئے: مَیں نے جواب دیا حکیم جی! آپ کی رائے صائب نہیں ہے، خداوند تعالیٰ کی نظر میں بے گناہ بچوں اور عورتوں کا قتل بہت خراب چیز ہے جب یہ بغاوت دب جائے گی اور انگریزی طاقت از سر نو قائم ہو جائے گی تو جانیں بچانے میں جو کوشش آپ نے کی ہوں گی وہ نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی، اگر آپ کی رائے یہ بھی ہو کہ انگریزی راج کا خاتمہ ہو گیا ہے، تب بھی جن جانوں کو آپ بچائیں گے اس کی وجہ سے آپ کی عزت، احترام اور شان و شوکت میں بے حد اضافہ ہوگا، مَیں نے اُن پر اپنی رائے ظاہر کر دی کہ یہ شورش زیادہ دن نہ رہے گی اور ان سے عاجزانہ درخواست کی کہ وہ میرے مشورے پر کاربند ہوں، حکیم احسن اللہ خاں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ چپ سادھ لی گویا وہ گہرے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ بادشاہ سلامت میری رائے کی تائید میں تھے، اور اس لئے انھوں نے چوبداروں کو میرے ہمراہ چلنے کا حکم دیا، مَیں انھیں لے کر دریا گنج پہنچا۔ جہاں زیادہ تر یورپین آباد تھے۔ یہاں آکر وہ بھیانک نظارہ دیکھا کہ ظالم جلاد بنگلوں میں آگ لگا رہے ہیں اور عورتوں اور بچوں کا قتل کر رہے ہیں، اللہ رحم کرے کہیں ایسا نہ ہو کہ ان تمام خوفناک واقعات کا الزام مجھ پر عائد ہو جائے! مَیں نے اور چوبداروں نے بادشاہ سلامت کے احکام کو چلا چلا کر سنانا شروع کیا، ہماری مداخلت کا اتنا تو اثر ہوا کہ تقریباً چند جن آدمیوں کی جانیں بچ گئیں، محل میں بھیج دیا گیا اور انھیں باقاعدہ کھانا کھلانے کے احکام نافذ کر دیئے گئے۔¹

---

¹ : خدنگ غدر ص۵۵ ۔

کیا بہادر شاہ کے اس صاف اور بے داغ کردار کے بعد کوئی انصاف پسند ان پر الزام لگا سکتا ہے؟

بہادر شاہ کا دربار

اور یہ بادشاہ جس کی حالت یہ تھی کہ قرآن نویسی کر کے دنیا کو بھلا بیٹھا تھا۔
"۴ اگست ۱۹۴۵ء حضور ظلِ سبحانی نماز صبح ادا کرنے کے بعد محل معلّٰی میں کلام اللہ شریف کی تحریر میں مصروف ہوئے[1]"۔

اب اورنگ شاہی پر متمکن تھا

صبح کو بادشاہ دیوانِ خاص میں چاندی کی کرسی پر جلوہ فرما ہوئے۔ درباری اہل کار اور مرشد زادے اور امرائے نامدار اور عمائدین شہر اپنے اپنے قرینے سے کھڑے ہوئے، مرزا ظہیر الدین عرف مرزا مغل خلعت فاخرہ اور خطاب سپہ سالاری سے سرفراز کئے گئے اور مرزا ابوبکر اور مرزا فخرو مرحوم کے بیٹے کو باغیوں کے کل سواروں کی افسری دی گئی۔

مرزا خضر سلطان کو پلٹن یا بہت کی کرنیلی دی گئی، اور محمد بخا در شاہ الگزنڈرا پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے، مرزا عبداللہ کو پلٹن ہیلی کی افسری ملی اور مرزا قویش پلٹن کے کرنیل مقرر ہوئے اور مرزا شاہرخ مرحوم کو پلٹن جالیسہ کی کرنیلی مرحمت ہوئی اور زینت محل صاحبہ نے بلدم شیر پلٹن کو اپنی ماتحتی میں لیا اور مرزا مینڈھو پلٹن کی افسری پر مقرر ہوئے۔

نواب ولی داد خاں رئیس مالاگڑھ تعلقہ دار ضلع بلند شہر جو بادشاہ دہلی کے قریبی رشتہ دار تھے خلعت اور نظامت دوآبہ سے مشرف ہوئے اور راؤ صاحب پرگنہ دادری اور دھوم کو بادشاہ کی جانب سے خلعت اور خطابات اور نقارہ و نشان مرحمت ہوا[2]۔

نئے وفاداروں کا ہجوم

اور جس سے وسیلہ پیدا کرنے اور جس کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے کے لیے وہ لوگ جو اسے بھول چکے تھے ٹوٹے

---

[1] : بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۲۴

[2] : نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۲۳

پڑ رہے تھے :

" ۱۸۵۷ء میں مئی کا مہینہ آیا اور ہنگامۂ بغاوت بنگالے کی انگریزی سپاہ کا برپا ہوا کیا قدرت الٰہی اور شان کبریائی ہے کہ آن کی آن میں کیا سے کیا ہو گیا۔ کہ اس بادشاہ پاس جس کے خزانہ میں پھوٹا بادام نہ ہو، پندرہ بیس روز کے عرصہ میں بے طلب لاکھوں روپیہ جمع کرا دیئے بادشاہ نے جس کے چار سپاہی ایسے نہ ہوں کہ بندوق کو بھر سکیں، ہزاروں سپاہ بلے بلائے، اکٹھی کر دی کہ جس کے ہاتھوں پر سارا ہندوستان فتح ہوا ہو۔ اور جس کے گلے میں لڑائیوں کے فتح کرنے کے تمغوں کے ہار پڑے ہوئے ہوں اُس بادشاہ کے پاس جس کے ہاں ٹوٹی پھوٹی ایک توپ نہ ہو۔ گھوڑوں کے توپ خانے اور ہزارہا قلعہ شکن توپیں بہم پہنچا دیں اس بادشاہ کے پاس جس کے میگزین میں سیر بھر بارود اور ایک پٹاخہ نہ ہو اس کے قبضہ میں دلی جیسے میگزین کا لال پٹارہ آگیا ہو۔ جس فقیر بادشاہ کی نذر میں کوئی پھوٹی کوڑی پیش کش نہ کرتا ہو اس کے سامنے آج شاہ اودھ کی اور کل والی رامپور کی پیش کش رکھی گئی ہو۔ جس سا فقط الاختیار اور بے اعتبار بادشاہ کو کوئی رئیس خط بھی نہ لکھتا ہو۔ اُس پاس چاروں طرف سے عمائد ملک کی عرضیاں آتی ہوں۔ ہندوستان میں کوئی بڑا راجہ یا نواب نہ ہوگا، جس کا وکیل یا کوئی آدمی شہر کے گلی کوچوں میں چھپا ہوا نہ پڑا ہوگا۔ اور اس نے اگلی پچھلی کتابوں کو دیکھ بھال کر خاندان تیموریہ سے اپنے پرانے ناتے رشتے اور واسطوں کا مسودہ نہ گھڑا ہو، اور وقت کا منتظر نہ بیٹھا ہو۔ اس وقت دہلی کے دیکھنے سے یہ حقیقت کھلتی تھی کہ اس مردہ سلطنت تیموریہ کے نام کے بادشاہ کو کتنے ہندوستانی دل میں مانتے ہوئے اور اس شہر کو اپنے ملک کا دارالسلطنت جانتے ہوئے بیٹھے تھے[۱] "

حرف برائے بیت

اور جس کا حال ، اقتدار حکومت سنبھالنے سے پہلے یہ تھا کہ اس کے درباری داستان گو چوٹی کے داستان گو مانے جاتے تھے"۔ خان صاحب نے فرمایا کہ نواب اعظم علی خاں کے یہاں ایک قصہ خوان نوکر تھا ، اور

---

[۱] : تاریخ ہندوستان جلد نہم (ذکاء اللہ) ص ۳۴۷ ؂

یہ قصہ گو بہادر شاہ کا قصہ خوان تھا اور اس سے بڑھ کر دہلی میں کوئی قصہ خوان نہ تھا، نواب صاحب کے یہاں اسے تیس[۲] روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی اس کے اندر یہ کمال تھا کہ کیسا ہی ہکلایا، توتلایا اور کسی قسم کا آدمی ہو، اسی طرح نقل کر دیتا تھا، کہ اصل میں اور نقل میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا[۱]۔

اب بادشاہ کی اندرونی حالت یہ تھی

بادشاہ کو سرکار کمپنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار دیتی تھی، بادشاہ اس لاکھ روپیہ میں سے اپنی اولاد کو اور شاہزادوں کو اور اپنے نوکروں کو مشاہرہ دیتا تھا جس سے ان کی گذر اوقات ہوتی تھی، اب نہ بادشاہ کو تنخواہ ملتی تھی نہ وہ شاہزادوں میں تقسیم ہوتی تھی، اس لئے ان کے گھروں میں فاقے ہونے لگے، جب لوگ شہزادوں کو مبارک باد دیتے تھے کہ شاہی بیٹھے بٹھائے، ان کے گھر آئی تو وہ کہتے تھے کہ شاہی نہیں گدائی آئی ہے، فاقہ مرتے ہیں، بھیک بھی کہیں سے نہیں ملتی اس شاہی سے تو انگریزی عملداری اچھی تھی، جس میں عیش و آرام سے گذرتی تھی[۲]۔

مجبور بادشاہ

اس بادشاہ کا اب حال یہ تھا کہ اس سے زبردستی کام لیا جاتا تھا۔ بادشاہ سے روزانہ برطانوی ہندوستانی فوج کی مختلف پلٹنوں کے نام پروانے زبردستی لکھوائے جاتے تھے اور ان سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ پیدل فوج کی صورت میں تیس[۲] روپیہ ماہوار اور سواروں کی فوج کی صورت میں پچاس[۵] روپیہ فی کس تنخواہ دی جائے گی، بشرطیکہ وہ بادشاہ کی فوج سے آملیں، ہر جگہ بادشاہ کے پروانے کا یہ اثر ہوتا تھا کہ فوج بغاوت کر دیتی تھی اور براہ راست دہلی کا رخ کرتی تھی۔ اسی طرح سے شہر رفتہ رفتہ بغاوت کا مرکز بن گیا۔

بادشاہ کا سکہ یہ تھا

بزر زد سکہ نصرت طرازی ۔۔۔ سراج الدین بہادر شاہ غازی[۳]

---

[۱] : امین الروایات ص۹۹۔

[۲] : تاریخ عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۹۔

[۳] : خدنگ غدر ص۵۶۔

بے بسی کا نقشہ

فائز الاقتدار ہونے کے بعد بھی بہادر شاہ کو سکھ نہ ملا، نام اس کا تھا، فائدہ دوسرے اٹھا رہے تھے، اس کے احکام نظر انداز کر دیئے جاتے تھے اس کی بات سنی ان سنی کر دی جاتی تھی، وہ کتنا بے بس تھا، اس کا نقشہ خود اس نے کھینچا ہے۔

" مرزا مغل کے نام بادشاہ نے یہ حکم لکھا ہے: ہمارے فرزند کو معلوم ہو کہ جب سپاہ پیدل اور سوار میرے پاس آئے ہیں، تو میں نے خود ہی اپنی زبان سے کہہ دیا تھا کہ میرے پاس خزانہ اور مال اسباب نہیں ہے جس سے میں مدد کر سکوں، لیکن اگر میری جان ان کے کام آئے تو اس میں مجھے دریغ نہیں میرے اس کہنے پر سب خوش اور راضی ہو گئے " اور انھوں نے اقرار کیا کہ وہ میری فرماں برداری اور اطاعت میں اپنی جانیں مجھ پر قربان کر دیں گے، میں نے ان کو ہدایت کی کہ ان کا اول کام یہ ہے کہ میگزین اور خزانہ کا انتظام ایسا کریں کہ وہ آیندہ ان کے اور میرے کام آئے۔ اس کے بعد انھوں نے دیوان خاص و دیوان عام اور مہتاب باغ میں اور اور مقامات میں جہاں ان کی خوشی میں آیا قیام کیا میں نے ان کی آسائش و آرام کی خاطر سے اپنے نوکروں کو منع کر دیا کہ وہ اس کام میں ان کے مزاحم نہ ہوں اگرچہ میں نے کوئی ان سے اقرار نہیں کیا تھا، مگر روپیہ قرض لیا گیا کہ ہر پیادہ و سوار کو روزینہ دیا جائے میں نے بار بار یہ حکم دیا کہ شہر میں جبر و تعدی و غارت گری نہ کریں، مگر اس سے کچھ کام نہ نکلا۔ آج دس روز گزرے ہیں مگر اب تک وہی خرابیاں چلی آتی ہیں، دیوان خاص و عام میں سے رجمنٹیں چلی گئی ہیں، مگر میں نے ان کو حکم نہ دیا تھا کہ وہ شہر سے باہر جا کر مقیم ہوں اور کوئی پیدل یا سوار شہر میں ہتھیار باندھ کر پھرے اور شہر کے باشندوں پر زیادتی کرے، مگر ایک رجمنٹ دہلی دروازہ میں اور دوسرے اجمیری دروازے میں اور تیسری لاہوری دروازہ میں شہر کی فصیل کے اندر رہتی ہیں اور بعض بازاروں کو انھوں نے بالکل لوٹ لیا ہے نہ رات کا خیال کریں نہ دن کا، وہ لوگوں کے گھروں میں یہ بہانہ بنا کر گھر میں کوئی فرنگی ہے گھس کر لوٹ لیتے ہیں۔ دکانوں کے قفل توڑ ڈالتے ہیں کواڑ نکال لیتے ہیں اور ان کے اندر اسباب بے حجاب لوٹتے ہیں وہ سواروں کے گھوڑے کھول لیتے ہیں باوجودیکہ یہ دستور چلا آتا ہے کہ جو شہر حملے و تیغ زنی سے نہیں لیئے جاتے ہیں وہ لوٹ مار سے برباد کئے جاتے مگر یہ لوگ کچھ خیال نہ

کرتے چنگیز خاں و نادر شاہ بھی جو بڑے ظالم مشہور ہیں، وہ شہروں کو پناہ و امن دیتے تھے جو اپنے تئیں بلا تغیر مقابلہ کے ان کو سپرد کر دیتے تھے، اس کے علاوہ میرے سپاہی میرے ملازموں کو اور اہل شہر کو دھمکاتے و ستاتے ہیں، باوجودیکہ میں نے پیدلوں کو فراش خانہ کے اور سواروں کو مہتاب باغ کے خالی کرنے کا بار بار حکم دیا ہے مگر وہ خالی نہیں کرتے، یہ وہ مقامات ہیں جن میں نہ نادر شاہ اور نہ احمد شاہ اور نہ کوئی گورنر جنرل ہند گھوڑے پر سوار ہو کر اب تک آیا تھا، سپاہ نے اوّل درخواست کی کہ شاہزادے ان کے اعلیٰ افسر مقرر ہوں، ہم سب ان کی فرمانبرداری و اطاعت کریں گے، یہ کام ان کی مرضی کے مطابق کیا گیا، پھر انھوں نے اس بات پر زور ڈالا کہ اس میں ہمارا اعتبار بڑھ جائے گا، اگر ان شاہزادوں کو ان کے عہدوں کے لیے خلعت مرحمت ہوں جس سے وہ وہ مستقل ہمارے حاکم معلوم ہوں اور تمام قیدی فرنگی ایک ہی دفعہ مارے جائیں، یہ کام بھی ان کی مرضی کے موافق کیا گیا اور اس دن اشتہار عام دیا گیا، جس پر مُہر شاہی لگی ہوئی تھی کہ شہر میں عدالت کچہریاں مقرر کی گیئں لیکن اہل شہر پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ان باتوں سے قطع نظر کر کے یہ لکھا جاتا ہے کہ جب برٹش گورنمنٹ کا کوئی اعلیٰ افسر قلعہ میں آتا تو وہ دیوان عام کے دروازہ پر گھوڑے سے اُتر آتا تھا، اور پیدل پھرتا تھا۔ لیکن یہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیوان خاص اور جلو خانہ تک آتے ہیں، جن کا لباس نامناسب ہوتا ہے سر پر دستار نہیں ہوتی وہ شاہی آداب و تعظیم کو بجا لانا جانتے نہیں۔ دربار میں سپاہ کے افسر اپنے لباس کی کچھ پروا نہیں کرتے، سروں پر ٹوپیاں بجائے پگڑی کے ہوتی ہیں اور تلوار ساتھ ہوتی ہے، انگریزی عملداری میں کسی افسر نے ایسا نہ کیا، انھوں نے بے فائدہ میگزین کے کل اسباب کو خرچ کیا اور خزانہ کے روپیہ کو اڑایا؛ اب بڑا غل مچا مچا کے اپنا روزینہ اتنے آدمیوں کا جتنے وہ ہیں، مانگتے ہیں، پھر دکانداروں پر طرح طرح کے ظلم و ستم کرتے ہیں، ان سے اجناس لے لیتے ہیں اور قیمت دیتے نہیں۔ اب شہر کے باہر کا حال یہ ہے کہ سپاہی انتظام کرنے کے لیے شہر سے تو باہر جاتے نہیں، اس لیے سینکڑوں آدمی مارے جاتے ہیں اور ہزاروں آدمی لوٹے جاتے ہیں، ملک

کے نظم و نسق کی صورت یہ ہے کہ شاہی سپاہ کافی نہیں کہ وہ کل اضلاع کے بندوبست کو سنبھالے تحصیلدار اور پولیس افسر مقرر نہیں ہو سکتے، قلعہ و شہر سے باہر نہ کوئی پیدل نہ کوئی سوار باہر قدم رکھتا ہے کہ انتظام ہو، ایسی حالتوں میں ملک سے رسد کا آنا اور زرمال گذاری کا وصول ہونا سخت مصیبت ہے، ان سب حالتوں کا لازمی نتیجہ ہے کہ شہر اور ملک بالکل تباہ اور برباد و غارت ہونے کے سوا کچھ نہ ہو سکے گا، ان باتوں پر یہ اور طرہ ہے کہ وہ بادشاہ کے ملازموں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ ہمارے مخالف ہیں اور اپنا روزینہ ان سے بڑی حکومت سے گستاخانہ مانگتے ہیں میرے حکم کے موافق میرے یہ ملازم ان سے بلجاجت و خوشامد بہ منت پیش آتے ہیں مگر اس پر بھی وہ راضی نہیں ہوتے۔

اس صورتوں میں کب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ یہ سپاہی اس ملک کی صلاح و فلاح چاہتے ہیں یا حکومت شاہی کی اطاعت کے خواستگار ہیں ؛ اب ایک اور بات خیال کرنے کی ہے کہ خزانہ میں تو روپیہ نہیں۔ شہر کے مہاجن و سوداگروں میں لٹ جانے اور تباہ ہو جانے کی سبب سے استطاعت نہیں کہ وہ روپیہ قرض دیں۔ پس کسطرح سے ان کو روزینہ تقسیم ہو سکتا ہے ؛ جب ان کا یہ روزینہ بند ہو جائے گا اور ملک سے جو رسد آتی ہے بند ہو جائے گی تو کیا حالت ہوگی ؛ پھر تماشہ یہ ہے کہ سپاہی خود یہ کرتوت کرتے ہیں جس سے ساری خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اور اس کا الزام ملازمان شاہی پر لگاتے ہیں (الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے) خلاصہ یہ ہے کہ جب سپاہ کا یہ حال ہو تو ظاہر ہے میری بادشاہی بالکل غارت و تباہ ہو جائے گی ؛

میری بے کسی و بے چارگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنی باقی زندگی یاد الٰہی میں بسر کروں اور بادشاہی کو سلام کروں جس میں سراسر تکالیف اور مصائب ہیں اوّل خواجہ صاحب کی درگاہ میں جاؤں اور وہاں سے اپنا انتظام کر کے مکہ چلا جاؤں[۱] ؛

---

[۱] : تاریخ عروج انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۹۴ ؛

بہادرشاہ کے اِن الفاظ میں کتنا درد ہے کتنی بے باک صداقت ہے:

بہادرشاہ کی نیت کتنی نیک تھی۔ اِن کے عزائم کتنے بلند تھے، اِن کے خیالات کتنے پاکیزہ تھے، وہ اصُول جہاں بانی پر کیسی نظر رکھتے تھے اِن سب اُمور پر اِس تحریر سے روشنی پڑتی ہے، بہادرشاہ کے حسن نیت کا اِس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ:-

"بادشاہ سے بخت خاں نے کہا تھا کہ اگر کوئی شہزادہ شہر کو لوٹے گا تو میں اس کی ناک کٹوا دوں گا، بادشاہ نے کہا یہ تم کو اختیار ہے"[1]

حالات کا قدرتی نتیجہ

آخر وہی ہُوا جو ہونا چاہیئے تھا، جو حالات کا قدرتی نتیجہ تھا، بہادرشاہ کے حامیوں میں سے اکثر نے اِن کا ساتھ نہ دیا، شکست ہوگئی، انگریز فاتحانہ شان سے دلی میں داخل ہوئے اور پھر اُنھوں نے انسانیت سوز مظالم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔

منشی ذکاءاللہ تحریر فرماتے ہیں "جب ۱۹ ستمبر کی رات کو انگریزوں کا قبضہ شہر کے بڑے حصے پر ہو گیا۔ شکست کے بعد باغیوں کے سپہ سالار بخت خاں نے بادشاہ کو سمجھایا کہ انگریزوں نے حضور سے دلّی لے لی تو کیا ابھی تو سارا ملک حضور کے ہاتھ میں ہے اگر حضور ہمارے ہمراہ چلیں تو حضور کے نام اور ذات کی برکت سے ظن غالب ہے کہ ہم کو لڑائیوں میں فتوح حاصل ہو سکتی ہیں، بادشاہ نے بخت خاں کو رخصت کیا اور کہا کہ ہمایوں کے مقبرہ میں تم کل ملنا:

مرزا الٰہی بخش اور بہادرشاہ

جو انگریزی ایجنٹ مخبری کے لیے آتے تھے الٰہی بخش اِن کا رازدار تھا، ۱۲، ۱۴ ستمبر کو جب مرزا نے باغیوں کی شکستیں دیکھیں تو اس کو یقین ہُوا کہ اب انگریز دو چار روز میں دہلی پر مسلط ہو جائیں گے اس نے اپنی اور اپنے کُنبہ کی جان بچانے کی تدابیر کیں اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ آپ ہمایوں کے مقبرہ میں تشریف لے چلیئے۔ ان نے رات کو بادشاہ کو شیشہ میں اتارا، اس کو بتلایا کہ اگر آپ سپاہ کے ساتھ چلے جائیں گے تو بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں آپ کو جھیلنی پڑیں گی اور یقینی آپ کو شکست ہوگی اور اگر

---

[1]: تاریخ عہدِ انگلشیہ (ذکاءاللہ) صفحہ ۶۹۵

آپ باغی سپاہیوں سے بالکل جُدا ہو جائیں گے تو فتح مند انگریزوں کو بہ یقین ہو گا کہ آپ کو سپاہ نے اپنے ساتھ رکھنے میں مجبور کر رکھا تھا، اور آپ کو جب موقع ملا تو آپ ان دغاباز نمک حراموں سے جُدا ہو گئے۔ آپ کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔

مرزا کی دلائل نے اس پیر ضعیف العقل کے دماغ پہ پورا اثر کیا۔ دُوسرے دن بادشاہ اس کا زنانہ اس کے بیٹے اس کے امراء ہمایوں کے مقبرہ میں باغیوں کے سپہ سالار بخت خان سے ملے تو ان سب نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا، انھوں نے ساتھ جانے میں یہ سوچا کہ معلوم نہیں کہ کیا کیا سختیاں اٹھانی پڑیں گی۔ معلوم نہیں کہ یہ جھگڑا کتنی مدت تک جاری رہے گا اور اس کا انجام معلوم نہیں کہ کیا ہو؛ اس لیے فتح مندوں کے رحم و کرم پر بھروسہ کر کے اپنے تئیں ان کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

رجب علی مخبروں کا سربراہ

اب مشکل کام یہ باقی رہ گیا تھا کہ کسی طرح سے بادشاہ کو الٰہی بخش انگریزوں کے ہاتھ میں گرفتار کرادیں۔ یہ کام ایسا مشکل نہ تھا کہ آسان نہ ہو سکتا، سرکار انگریزوں کے جو ایجنٹ مخبری کے لیے دہلی میں رہتے تھے، ان کے سردار منشی رجب علی خان تھے، جاسوسی کے لیے جو اعلیٰ درجہ کی لیاقتیں چاہئیں وہ ان میں تھیں۔ منتظم انگریزوں کو ان کا پورا اعتبار تھا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے کار فرماؤں کے ساتھ راست باز تھے۔

مرزا الٰہی بخش نے ان سے خط و کتابت کی۔ منشی رجب علی نے مرزا سے یہ درخواست کی کہ آپ فقط یہ کام کیجیے کہ باغیوں کے چلے جانے کے بعد بادشاہ کو چوبیس گھنٹہ تک ہمایوں کے مقبرہ سے کہیں جانے نہ دیجیے، باقی کام مجھ پہ چھوڑ دیجیے، میں اس کو کر لوں گا۔

ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کرنے جاتا ہے

منشی رجب علی نے مراسلت کا حال ہڈسن صاحب سے کہا وہ یہ سنتے ہی ہیڈ کوارٹر میں گیا اور اس خبر کو سنایا اور اجازت مانگی کہ وہ اپنے سواروں کو ساتھ لے کر دلی کے بادشاہ کو لے آئے۔ جنرل کو بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر یہ ان سے اجازت دلائی کہ وہ بادشاہ سے اس کی جان بخشی کا معاہدہ کرے، ہڈسن صاحب اپنے پچاس سواروں کو لے کر مقبرہ پہ سرپٹ دوڑ گیا۔

بعض آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی عمر میں پہلے ترقی کرتے ہیں بعض ایسے ہوتے ہیں کہ بڑی عمر میں ترقی کرتے ہیں سو ہڈسن صاحب دوسری قسم کے آدمیوں میں تھا، میدانِ جنگ ہی اس کا بالِ رودم عشرت کدہ تھا اس کی نفیریوں کی آواز ہی اس کی موسیقی تھی، انسان کی مصیبت اس کے دل پر اثر نہیں کرتی تھی، نہ کسی کی خونریزی سے اس کو رنج ہوتا، نہ کسی کے مار ڈالنے کا افسوس۔

ہڈسن صاحب مقبرہ کے پاس جا کر ایک شکستہ عمارت میں سوار کھڑے رہے۔ اور اپنے سواروں کو اس کے سایہ میں آرام دیا اور بادشاہ کو خبر دی کہ ہڈسن آگیا ہے، آپ اپنے تئیں حوالہ کیجئے۔

مقبرہ میں بادشاہ کے دل میں یاس اور توکل آپس میں لڑ رہے تھے، آخر وہ اپنے تئیں حوالہ کرنے پر مجبور کیا گیا، اس نے ہڈسن صاحب کے پاس پیغام بھیجا، صاحب نے جان بخشی کا وعدہ کیا، چار دن بعد ہڈسن نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ میں دہلی کے بادشاہ کو مردہ لانا بہ نسبت زندہ لانے کے زیادہ پسند کرتا تھا پھر اسی یادداشت میں لکھ دیا کہ وہ بغاوت میں عملی حصہ لینے سے بری تھا[1]

شہزادوں کو گولی مار دی گئی

بادشاہ کے ساتھ چار شہزادے تھے مرزا مغل، مرزا ابوبکر مرزا خضر سلطان، مرزا مدّو، قلعہ سے رخصت ہونے کے بعد انگریز محافظ دستہ نے ان کو گھیر لیا۔ بادشاہ کو پالکی میں بٹھایا گیا اور شہزادے بیل گاڑی میں بیٹھے اور وہاں سے انھیں قلعہ لے گئے، جب شہزادگان دیوانِ عام کے سامنے پہنچے، جہاں انگریز عورتوں اور بچوں کا قتل کیا گیا تھا تو انھیں نشانہ بندوق بنا دیا گیا۔ شہر میں کشمیری دروازے سے لے کر لاہوری دروازے تک لوٹ مار جاری رہی۔ مرزا بختیار شاہ بھی جنھیں بعد میں گرفتار کیا گیا قتل کر دیئے گئے، بادشاہ پر پہرہ بٹھا دیا گیا، شاہ سمند خان جو شاہی باڈی گارڈ کے کمانڈر تھے، کشمیری دروازے سے نکلتے ہوئے گرفتار ہوئے، ان کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ راجہ جھجر کی افواج کے جنرل ہیں اور اسی وقت انھیں گولی مار دی گئی، شہر میں کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی، تمام صحیح الجثہ اشخاص جو دکھائی دیئے باغی قرار دیئے گئے اور

---

[1]: تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۴۹۔

انھیں گولی مار دی گئی ؎۱

بہادر شاہ قید کر لیے گئے

وہ شخص جو بابر اور اکبر، شاہجہان اور عالمگیر کا جانشین تھا ایک بے حقیقت مجرم کی طرح قید کر لیا گیا، غلاموں نے اپنے آقا کو گرفتار کر لیا، جو تجارت کرنے آئے تھے وہ بادشاہ بن بیٹھے، جس نے تجارت کا پروانہ دیا تھا وہ مجرم قرار پایا ع

"انقلابات ہیں زمانہ کے"

بادشاہ کو ایک پالکی میں اور مرزا مغل، مرزا خضر سلطان و مرزا ابوبکر کو رتھ میں سوار کر کے قلعہ میں لے آئے۔ بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا اور تینوں شہزادوں کو کوتوالی کے سامنے کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا۔ اور نواب زینت محل اور مرزا جوان بخت کو بادشاہ کے نزدیک ایک الگ مکان میں قید کر دیا اور حکیم احسن اللہ خان کو حالات اہل قلعہ دریافت کرنے کے لیے اور نیز مجرموں اور مفسدوں کی شناخت کرنے کے لیے ایک دوسرے مکان میں نظر بند کر دیا ؎۲۔

شہزادے کس طرح گرفتار ہوئے

صفر ۱۲۷۴ھ ہجری کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ زینت محل کے مکان میں جو لال کنوآں کے قریب تھا قید کیے گئے، دوسرے دن مرزا الٰہی بخش نے مخبری کی کہ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہم مقبرہ ہمایوں میں پوشیدہ ہیں میجر ہڈسن اپنے سپہ سالار سے اجازت لے کر سو سپاہیوں کے ساتھ ان کو گرفتار کرنے روانہ ہوا، تینوں شہزادے مقبرہ کے اندر تھے اور ان کے ہمراہ لفٹیننٹ میکڈاول ؎۳ کے قول کے مطابق تین ہزار مسلمان تھے، اور ان کے علاوہ تین ہزار مسلح سپاہی قریب ہی جھاڑیوں میں موجود تھے، ہڈسن اور میکڈاول نصف میل کے فاصلہ پر ٹھیرے کیونکہ اپنی قلیل جمعیت لے کر

؎۱ : خدنگ غدر ص ۹۰ ۔

؎۲ : نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۴ ۔

؎۳ : ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۲ صفحہ ۱۸۷ ۔

مقبرہ پر دھاوا کرنے کی ہمت نہ تھی، شہزادوں کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ گرفتاری منظور کریں یا انجام مزاحمت کے لیے تیار ہوں۔ آدھ گھنٹہ کے بعد شہزادوں کی طرف سے جواب آیا کہ ہماری جانوں کی ذمہ داری کی جائے، تو ہم اپنے تئیں حوالے کر سکتے ہیں، میجر نے کہا کہ میں وعدہ نہیں کر سکتا شہزادوں کو بغیر کسی شرط کے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیئے، اب مقبرہ میں باہم گفت و شنید شروع ہوئی شہزادوں نے کہا کہ تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے۔ تلوار اٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں مارتے ہیں یا مر جاتے ہیں، داراشکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرنا چاہا اور قاتل قید خانہ میں آئے تو داراترکاری چھیلنے کی چھری لے کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر جلادوں سے مقابلہ کرتا رہا، ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے، مرنا تو ہر حال میں ہے پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔

لیکن یہ بہادری کی موت نہ مر سکے، انھیں بزدلوں کی موت مرنا پڑا، اس لیے نہیں کہ یہ بزدل تھے، اس لیئے کہ انھیں الٰہی بخش نے دھوکا دیا تھا۔

جلاوطنی کی سزا

۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ فوجی کمیشن کے روبرو لائے گئے، جس میں تین سردار ملکہ معظمہ کی طرف سے تھے اور دو کمپنی بہادر کی طرف سے، ایک دن نہ دو دن پورے اکتیس دن مغلیہ تاجدار کمیشن کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے کشاں کشاں پھرتا رہا، ہُوا بگڑی شرط ہے گواہوں کی کیا کمی تھی، خود حکیم احسن اللہ خاں وزیر، بادشاہ کے دو بدو کھڑے تھے، یوں سمجھیئے کہ زمین و آسمان اور اپنے دست و پا تک دشمن تھے، بہادر شاہ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے لفٹیننٹ گورنر کو آگرے میں سب سے پہلے غدر پھوٹنے کی خبر دی تھی، لیکن آگے چل کر وہ بھی ہوا کے ساتھ ہو لیے، کیونکہ اصلی بات یہ ہے کہ باغیوں کی روک تھام ان کے بس کی بات نہ تھی ممکن نہ تھا وہ ان اشرار کے پھندے سے بے داغ نکل جاتے، کہن سال بادشاہ پر جتنے الزام لگے تھے، سب ثابت ہوئے،

بادشاہ کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا ان کے ساتھ نواب زینت محل اور ان کے ساتھ بیٹے جوان بخت بھی گئے۔ پانچ برس خدا جانے کس رنج و محن میں کاٹے آخر ۱۲۷۹ھ ہجری

۱۸۶۲ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا وہ کیا مرے مغلیہ بادشاہت کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے گئے

دن زیست کے کیا جانئے کیسے کاٹے
یہ بھی نہ کھلا زندہ ہیں کیسے کاٹے
مر مر کے بسر ہوئی ہے یوں ساری عمر
کچھ دیر نزع میں جیسے کوئی کاٹے[1]

"یاد آئے گی تمھیں میری وفا میرے بعد"

منشی ذکاءاللہ جیسے حامی انگریز مؤرخ نے بہادر شاہ کی جلا وطنی کی داستان بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

" ایڈوکیٹ نے جرائم کے ثبوت میں دلائل تحریر کیں جن کا آخری فقرہ یہ تھا کہ عدالت کے روبرو جو شہادت پیش ہے اس کے موافق میری رائے یہ ہے کہ قیدی دہلی کے معزول بادشاہ محمد بہادر شاہ پر جو الزام لگائے گئے، بعض ان میں بالکل ثابت ہیں اس لیے وہ مجرم ہے ان جرموں کے ثبوت کے سبب سے بہادر شاہ جلا وطن کیا گیا۔ وہ اپنے دو بیٹوں جوان بخت و عباس شاہ اور دو بیبیوں زینت محل اور تاج محل کے ساتھ برہما کو روانہ کیا گیا۔

تاج محل کلکتہ سے واپس چلی آئی جب بادشاہ دہلی سے ایک ڈولی میں سوار ہو کر گوروں کے پہرہ میں منزل بہ منزل روانہ ہوا تو راہ میں ان لوگوں کے گھر میں ماتم تھا جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی اراضی سے اب تک روٹی کھاتے چلے آئے تھے، بہادر شاہ کا ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو نواسی سال کی عمر میں پیغام اجل آیا۔

اس کی ایام غدر کی ان باتوں کا ذکر بھی بہت دنوں تک دہلی میں ہوتا رہا کہ جب ہندو اس کے پاس فریادی جاتے کہ مسلمان ہم کو ستاتے ہیں تو وہ مسلمانوں کو ہدایت کرتا کہ تم ہندوؤں کو ستاؤ نہیں۔ جیسے تم میری ایک آنکھ ہو، ویسے ہی ہندو میری دوسری آنکھ ہیں جب سپاہ

---

[1] : واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول (بشیر الدین احمد) ص۵۸

نے مٹی کسھا جنوں اور مسلمان مدلت مندوں کو بہت تنگ کیا تو اس نے تین دفع سپاہ سے کہا کہ میرا اور میری بیبیوں کا تمام زیور لے کر اپنے کام میں لاؤ اور میرے شہریوں کو مت ستاؤ[۱]

چیف کمشنر بہادر شاہ کو سزا دیتا ہے

چیف کمشنر پنجاب کا اس کی نسبت یہ حکم صادر ہوا کہ بہادر شاہ معزول دہلی سمندر کے پار سخت مجرموں کی طرح جلا وطن کیا جائے وہ کسی ایسے جزیرہ یا مقام میں رکھا جائے جہاں وہ سب مسلمانوں سے علیحدہ رہے اس کی بیوی زینت محل اور اس کے بیٹے جواں بخت کی نسبت کوئی جرم نہیں ثابت ہوا، جواں بخت کی عمر تو سترہ برس کی ہے لیکن یہ دونوں دہلی میں موجود تھے، چیف کمشنر ان کو اجازت دیتا ہے خواہ وہ قیدی کے ساتھ جلا وطنی کے مقام میں رہیں اور اگر ان کو یہ منظور نہ ہو تو وہ بنگال کے پریسیڈنسی کے اضلاع زیرین میں کسی ضلع میں شاہی قیدیوں کی طرح مقیدہ رہیں[۲]

کلکتہ کی طرف روانگی

۱۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو غدر کے ایک سال بعد انگریزوں نے جمعہ کے دن بادشاہ کو بال بچوں سمیت کلکتہ بھیج دیا[۳]

انگریز ڈرتے تھے

فتح کے بعد انگریز مسلمانوں سے اور بہادر شاہ سے خائف تھے۔ سارے کا سارا مقبرہ بادشاہ کے ہمراہیوں اور مسلح آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لیکن انگریزوں کی دھاک بندھ گئی تھی اور اقبال یاور تھا کل پچاس سواروں سے جا کر بادشاہ کو گھیر لیا۔ ان سے سپردگی کا اصرار کیا وہ پہلے ہی آدھ موئے تھے، جھٹ اپنے آپ کو حوالہ کر دیا، جان بڑی پیاری ہوتی ہے، خدا کسی پر برا وقت نہ لائے، بادشاہ کی عظمت اور مرتبے کو دیکھو آج خدا نے یہ دن دکھایا کہ اپنی جان بخشی کا سوال زبان پر لانا پڑا، اللہ اکبر! بادشاہ کو چپ چپا

ص۱ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۴۳۵؛

ص۲ : تاریخ ہندوستان البغاوت ہند (ذکاء اللہ) ص۱۹۳؛

ص۳ : نصرت نامہ گورنمنٹ ص۴۴؛

قلعے میں پہنچا دیا۔ گو ہڈسن صاحب بادشاہ کی گرفتاری کا بیڑا اٹھا کر اُن سے اجازت لے کر گئے تھے مگر جنرل صاحب کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ امر اہم اس آسانی سے طے ہو جائے گا۔[۱]

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو

بہادر شاہ کی دلّی سے رخصت کا منظر ایک شیوا بیاں ادیب نے یوں کھینچا ہے :-

"جب وہ ساعت آئی کہ بدنصیب بادشاہ جنگی پہرے میں دلّی سے وداع ہوا، تو خلقت اندھیرے منہ سڑکوں پہ آ بیٹھی، یہ وہ صبح تھی جس میں ماؤں نے اپنے معصوم بچوں پہ کھانا پینا حرام کیا اور جب تک اپنے بادشاہ کو آنسوؤں کے حلقہ میں خدا کے سپرد نہ کر لیا چولھوں میں آگ نہ سلگائی۔

رونے والوں میں ہزاروں اس کے اپنے نمک خوار اور سینکڑوں وہ تھے جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی جاگیروں سے روٹیاں کھا رہے تھے! باوجود سخت اہتمام کے راستہ مخلوق سے پٹا پڑا تھا، کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسوؤں کی لڑیاں نہ بہہ رہی ہوں۔ بادشاہ ڈولی میں سوار تھا۔ دو بیبیاں زینت محل اور تاج محل اور دو لڑکے جواں بخت اور عباس شاہ ساتھ تھے، گوروں کا پہرہ تھا اور گو لوگوں کے دلوں میں یہ کیفیت تھی کہ سپاہی کی صورت سے ڈر لگتا تھا۔ مگر خلقت اپنے بادشاہ کی اس قدر مشتاق تھی کہ خوف و ہراس بھول گئی اور پروانوں کی طرح اس شمع پر گری بادشاہ نے ڈولی کے پردے اٹھا دیئے آنکھیں سفید داڑھی پر آنسو گرا رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے اور اس طرح جلا وطن بادشاہ دلّی والوں کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔ المختصر یہ دنیا کی وہ ہولناک ساعت جب جہاں آباد نے اپنے ناشاد و نامراد بادشاہ کو وداع کیا ختم ہوئی تاج محل کلکتہ سے واپس ہوئی اور شاہ بخت رنگون روانہ ہوا۔"[۲]

---

[۱] واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول از بشیر الدین احمد ص ۳۲۵ :

[۲] : نوبت پنج روزہ از راشد الخیری ، ص ۱۵۶

واجد علی شاہ سے ملاقات

اسی سلسلے میں ایک داستان عبرت اور سن لیجیے اور وہ یہ ہے کہ جب شاہ ظفر کو بہ جرم بغاوت دہلی سے رنگون جانے کا حکم ہوا تو واجد علی شاہ نے وائسرائے کے ذریعے سے شاہ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا ظفر نے دعوت تو نامنظور کی لیکن یہ لکھا کہ "چند منٹ کے لیے جہاز سے اتر کر مٹیا برج میں تم سے ملوں گا" چنانچہ تاریخ مقررہ پر وائسرائے اور جملہ عہدہ داران برطانیہ مٹیا برج میں جمع ہوئے تاکہ ملاقات کا منظر دیکھیں جب ظفر شاہ جہاز سے اتر کر حدود مٹیا برج میں تشریف لائے تو واجد علی شاہ نے باوجود بھاری بھرکم ہونے کے ادب سے سر نیاز جھکا کر اکیس سلام کیے، شاہنشاہ دہلی نے سلام لیا اور اس وقت دونوں اشکبار ہو گئے اور دیر تک رقت قائم رہی، برٹش حکام نے اس طریقہ سلام کو حیرت کی نظروں سے دیکھا۔ کیونکہ اس وقت شاہ اور وزیر دونوں دولت برطانیہ کے قیدی تھے، حقیقت یہ ہے کہ انگریز مورخین ظفر شاہ کو "یکے از رعایائے سرکار لکھتے ہیں" لیکن یہ ایک ایسا غلط دعویٰ ہے جس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کون کہہ سکتا ہے کہ ظفر میں اکبر اور بابر کا نسلی خون شامل نہیں ہے، ظفر بلاشبہ سلطنت مغلیہ کا آخری شاہنشاہ تھا، واجد علی شاہ ظفر کے بزرگوں کے پروردہ تھے، لہٰذا شاہ نے اپنے آقا کا جس حیثیت سے استقبال کیا اور کورنش بجا لائے وہ اس کا مستحق تھا۔

واجد علی شاہ وائسرائے کو "یکے از ملازمان کوئن وکٹوریہ" سمجھتے تھے اور رسمی طریقے سے ملتے تھے چنانچہ وائسرائے کا ظفر سے مصافحہ تک نہ ہوا[1]

قید فرنگ اور وفات

۱۸۵۸ء ختم ہونے سے پہلے اکبر کا آخری وارث رنگون پہنچا، جہاز سے اترتے ہی گوروں کی حراست میں بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلہ میں گیا جو پرانی گھوڑ دوڑ کے میدان کے قریب موجودہ "سڑک وائل روڈ" پر واقع تھا، اس بنگلہ کے گرد گوروں کا پہرہ ظفر کی زندگی تک رہا اور خرچ آب

---

[1] : یادایام (عبدالرزاق مصنف البرامکہ) صـ ۲۲۱

نمک کے لیے صرف چند سو روپیہ ماہوار ملتے رہے، انھوں نے سرکار انگریزی سے کبھی امداد کی استدعا نہیں کی، فاقہ کشی اور غربت کی زندگی گوارا کی لیکن حمیّت و غیرت ترک نہ کی۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات باقی تھے، انھیں کو معاش کا ذریعہ بنایا اور بدنصیب زندگی کی آخری سانسیں افلاس و تنگدستی میں گذار دیں شاعری کا شوق رنگون میں بھی باقی رہا، ان کی بعض دردناک نظمیں قیدخانہ کی چہار دیواری سے نکل کر دلی تک پہنچیں اور اب بھی سخن فہموں کے پاس محفوظ ہیں لیکن وہ نہ تو خود اُن کو شائع کرتے ہیں نہ دوسروں کو ان کی زیارت سے بہرہ مند ہونے دیتے ہیں۔ مرحوم ایڈیٹر "ملائے عام دہلی" کے پاس ایک نفیس نظم اسی دورِ مصیبت کی تصنیف کسی ذریعے سے پہنچ گئی تھی اور اس کے کئی اشعار دلی والوں کی زبان پر آگئے تھے، وہ نظم نعت میں بطور مناجات کے تھی اور مدینہ میں موت نصیب ہونے کی تمنا کا اظہار تھا ؎

غربت کدہ رنگون کے اشعار

کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل غزل رنگون کی بے کسی اور کس مپرسی کی یادگار ہے، بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ زبان ظفر کی نہیں ہے لیکن ان کے دیوان اوّل میں بھی ایک غزل اسی طرز کی موجود ہے ؎

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں — جائیں گے اب کون نگر کون میں اب ہم باسے ہیں

دیس بنا ہے بھیس بنا ہے رنگ بنا ہے ڈھنگ بنا ہے — کون انکار کرے ہے واں اور رہتے کون اداسے ہیں

کیا کیا پھیلو دیکھے ہیں ہم نے اس پھلواری میں — اب جو چھوئے ہیں پھول کچھ دن ہی اس میں باسے ہیں

دنیا ہے یہ رین بسیرا بیت گئی رہی تھوڑی سی — اُن سے کہدو سو رہا دیں نیندیں جو کہ نندے ماسے ہیں

حسب ذیل اشعار بھی قید رنگون کی یادگار ہیں اور جذبات کی صحیح ترجمانی ہے :۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں — جو کسی کے کام نہ آسکوں میں وہ ایک مشت غبار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا میرا حسن مجھ سے بچھڑ گیا — جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں — کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں

یہ شعر بھی اسی عہد کی حسرت و مصیبت کی تصویر ہے۔

نہ ہُوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشان مزار ہے　　　نہ دیا یا زیر زمیں انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں

غرض قید خانہ کے تنگ و تاریک کمرے میں وہ موت کا انتظار کرتے تھے، چہل قدمی یا ہوا خوری کے لیے بھی کم باہر نکلتے اور بیشتر وقت یاد خدا، تسبیح و استغفار میں صرف کرتے تھے آخر کار ان کی دعا قبول ہوئی اور ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور

سکرات موت کے وقت سوائے زینت محل جواں بخت ان کی بیوی اور ایک خورد سال بچی کے اور کوئی موجود نہ تھا، حکام کی اجازت سے تجہیز و تکفین کر کے اسی بنگلہ کے احاطہ میں دفن کر دیا، کچی قبر تھی ایک بیری کا درخت سرہانے لگا تھا اور اسی سے عرصہ تک مرقد کا نشان رہا۔

وفادار بیوی

زینت محل کچھ مدت تک اوسی بنگلہ میں فروکش رہیں، بعد ازاں دوسرے مکان میں حکماً منتقل کی گئیں، پابند وضع شوہر کی وفات سے پانچ سال تک انھوں نے بھی انگریزی حکومت سے کوئی امداد قبول نہ کی ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

مجبور ہو کر ۱۸۶۷ء پانچ سو روپیہ کی پنشن منظور کر لی اور اسی قدر وظیفہ مرزا جواں بخت کا بھی مقرر ہو گیا شہزادے نے غربت و بے کسی میں بمقام مولمین (ملک برہما) ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا، آج تک قبر کا پتہ نہیں چلا ہے۔

غم نصیب زینت محل ملاقی عیش و عشرت کا غم اندوہ سے کفارہ ادا کرنے کے بعد ۱۷ر جولائی ۱۸۸۶ء کو دنیا سے رخصت ہوئیں اور پرانے بنگلہ کے احاطہ میں مظلوم شوہر کی قبر کے پاس دفن کی گئیں[۱]۔

وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

وہ احاطہ ایک یورپین مسٹر ڈامن کو جن کا برہما کی مشہور ڈامن بنک کمپنی سے تعلق تھا ٹھیکے پر دیدیا گیا۔ صاحب بہادر کو مزار پر فاتحہ پڑھنے والوں اور چراغ بتی کے لیے

---

[۱]: بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

خادموں کی آمد و رفت ناگوار ہوئی، مقبرے کا راستہ بند کر دیا، مرقد مبارک کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا میدان تھا، اور دوسری طرف گھوڑے سدھارنے کا چکر، چند روز میں قبروں کا نشان بھی ناپید ہو گیا اور روشن ضمیر ظفر کی پیشین گوئی پوری ہوئی ؎

پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اوسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک عقیدت مند پرستار ملک و ملت عبد السلام نامی مرحوم آخری تاجدار کا مزار تلاش کرتے ہوئے بہ ہزار مشکل اس احاطہ میں داخل ہوئے، بیری کا درخت موجود تھا۔ واقف کاروں نے نشان دیا کہ اسی درخت کے قریب بادشاہ اور اس کی بیگم کی قبریں فرض کر لینا چاہیئے، غیرت مند وفا کیش نے حکومت برما سے خط و کتابت کی، اخباروں میں مضامین لکھے، ہندوستان سے لے کر لندن تک دردمندوں کے قلوب زخمی کر دیئے، تب اُس مقام پہ ایک کتبہ انگریزی زبان میں نصب کیا گیا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"دلّی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں مرا اور اس جگہ کے قریب دفن ہوا"

چند ماہ کی مزید کوشش کے بعد اسی پتھر پہ زینت محل کی تاریخ وفات بھی کندہ کر دی گئی، سال کی مسلسل سعی بلیغ سے یہ حاصل ہوا کہ گورنمنٹ نے مسلمانانِ برہما کو قبر کا نشان دوبارہ بنانے کی اجازت دی۔ اب دونوں قبروں کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا گیا ہے لوہے کا کٹہرہ اور ٹین کا سائبان ہے بہادر شاہ کے پوتے سکندر بخت قبر کی مجاوری کرتے ہیں اور مسلمانوں کو فاتحہ خوانی کے لیے آمد و رفت کی اجازت ہے اس غریب شہزادہ کا ذریعہ معاش سوائے نذر و نیاز کے کچھ نہیں ہے ؎

ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

ملہ : بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

تاریخ وفات

کئی لڑائیاں ہوئیں انجام کار سپاہ مفسد کچھ ماری گئی، کچھ بھاگ گئی، اس لیے اس بادشاہ کو انگریزوں نے ملک برہما میں لے جاکر مقید رکھا، اس کی بیوی زینت محل اور مرزا جوان بخت اس کا چھوٹا بیٹا بھی اس کے ہمراہ تھا یہ بادشاہ ۱۲۷۹ھ ہجری مطابق ۱۱ نومبر ۱۸۵۸ء میں بعارضہ فالج فوت ہوا۔ اس پر خاندان تیموریہ تمام ہوا، یہ تاریخ کسی شاعر نے اس بادشاہ کے جلوس اور وفات کی کہی ہے۔

تاریخ جلوس و وفات سراج الدین ابوظفر

سراج الدین بوظفر مسافروہ سوئے جنت ہوا روانہ
کہ جس کے باعث سے خوشی سے جھلک رہا تھا ایاغ دہلی
چراغ دہلی جلوس کا ہے۔ سو اب بھی دیکھو مطابق اس کے
سروش غیبی نے سال رحلت کہا بجھا ہے چراغ دہلی ۱۲۷۹ھ

رنگون کے حالات

خان بہادر میر ناصر علی نے بہادر شاہ کی رنگون کی زندگی کے کچھ مشاہدات شائع کئے تھے، رنگون کی زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے کچھ نہیں معلوم کیسی گزری لیکن ان چند سطروں سے ایک جھلک سی نظر آجاتی ہے اور وہ بھی بسا غنیمت ہے

رنگون میں ظفر کی صحت

جلاوطنی میں ایک شخص ان کو رنگون دیکھنے گیا، اس کی زبانی ہے کہ تندرستی بڑھ گئی تھی، دلی میں مشکل سے دو ایک کباب خوراک تھی سو وہ بھی چوس لیتے تھے، رنگون میں معمولی مقدار گوشت کی ہضم ہو جاتی تھی۔

تیموری خصائل

خاندان تیموریہ کے خصائل حمیدہ میں بڑی تعریف اس صفت کی ہے کہ جو لازم ہو گیا پھر وہ برخواست نہیں ہوتا تھا، مولوی بشیر الدین صاحب خلف مولوی نذیر احمد صاحب رئیس دہلی اپنی تصنیف فرامین سلاطین میں مولوی مظہر الدین صاحب شیر کوٹی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ: بہادر شاہ کے انتقال کے بہت عرصہ کے بعد جب مولوی صاحب کا رنگون جانا ہوا تو انھوں نے تیموری نسل کے پسماندہ افراد سے ملنے کا ارادہ کیا ان کے بیان کا اقتباس ہے کہ:-

---

۱؎: واقعات ہند صفحہ ۱۳۴ مطبوعہ ۱۸۷۵ء

ہ لکڑی کے ایک معمولی مکان میں ستر برس کی ایک ضعیفہ رہتی ہیں جن کا نام رونق زمانی بیگم صاحبہ ہے، یہ جوان بخت کی بیٹی اور بہادر شاہ کی پوتی ہیں، دادا کا تخت تاراج ہونے کے غم میں انھوں نے شادی نہیں کی، سکندر بخت ان کے بھانجے اپنی پھوپھی رونق زمانی بیگم کے ساتھ رہتے ہیں۔ رونق زمانی بیگم کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ سرکار سے ملتا ہے، دونوں اس میں گذر کرتے ہیں۔ خرچ کی طرف سے تنگی سے گذر ہوتی ہے **وضع داری** کا یہ حال ہے کہ:

دادا بہادر شاہ کے زمانہ کے بعض ملازمین کو اب تک علیحدہ نہیں کیا۔

تبرک اس صفت میں بہادر شاہ کی بہت تعریف تھی کہ سرکار انگریزی سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ زیادہ شہر والوں کی تنخواہوں میں صرف ہوتا تھا تنخواہیں اس کثرت سے تھیں کہ دو چار آنے ماہوار کی نوبت تھی جس کے وصول ہونے میں تنخواہ والوں کے دو دو چار چار روپیہ خرچ ہو جاتے تھے مگر اس قلیل تنخواہ کی عزت جاگیر کے برابر سمجھی جاتی تھی کہ نسلاً بعد نسلاً چلی جائے گی[۱]۔

ط۱ : صدائے عام دہلی - مئی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۵۔

باب ۷

بہادر شاہ کی مذہبیت، دینداری اور خوش عقیدگی

بہادر شاہ ایک درویش صفت، صوفی منش، اور قلندرانہ خصائل کے انسان تھے، انھوں نے دنیا دیکھی، دنیا کا رنگ دیکھا، دنیا والوں کو دیکھا اور ان سب سے ان کا جی سیر ہو گیا ہے

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

وہ بادشاہ تھے، ان کا خاندان صدیوں سے اس دیس پر حکومت کرتا چلا آرہا تھا، لیکن اب یہ بادشاہت دم توڑ رہی تھی، وہ اب بھی بادشاہ تھے اور لال قلعہ ان کا دارالحکومت بھی تھا اور حکومت بھی ۔۔۔ لیکن یہ شاندار الفاظ درحقیقت کتنے تلخ تھے اسے ان کا دل ہی جانتا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی ان کے دل پر نقش ہو گئی تھی، دنیا والوں سے ان کا دل بیزار ہو گیا تھا۔ جب انسان مایوس ہوتا ہے تو خدا سے لو لگاتا ہے۔ جب کوئی سہارا باقی نہیں رہتا، تو انسان اس کے آستانہ پر پہنچتا ہے جو دنیا کا خالق ہے۔

بہادر شاہ کی یہی کیفیت تھی، وہ اورنگ شہی پر متمکن ہونے کے باوجود، ایک فقیر اور درویش بن گئے تھے، ان کے اوقات کا بڑا حصہ اوراد و وظائف میں صرف ہوتا تھا، وہ خود بھی مرید تھے، اور اب دوسروں کو بھی مرید کرنے لگے تھے وہ تخت شاہی پر بیٹھتے تھے، لیکن تھوڑی دیر، اور بے دلی کے ساتھ البتہ سجادہ، مصلّٰی ان کی پسندیدہ جگہ تھی، یہاں وہ دن کی روشنی میں، رات کی تاریکی میں، بیٹھتے تھے اور بیٹھے رہتے تھے، وہ روتے تھے، گڑگڑاتے تھے، اور اپنے خالق سے، اپنے رب سے، دل کی بپتا بیان کرتے تھے اس سے دل رنجور تسکین پاتا تھا، تن کی دنیا مٹ گئی تو مٹ گئی لیکن من کی دنیا ناقابل تسخیر تھی، یہاں نہ ملکہ وکٹوریہ کا گزر تھا، نہ لارڈ کیننگ کا، نہ "صاحب کلاں" ریذیڈنٹ بہادر کا، ۔۔۔۔۔

اسی دنیا میں سکون تھا، عافیت تھی، دل جمعی تھی، اور انسان کو اگر یہ نعمت حاصل ہے تو پھر اور چاہیے بھی کیا؟

بہادر شاہ کی صوفیانہ زندگی مختلف پہلوؤں کی حامل تھی، اب ہم اختصار کے ساتھ ان پہلوؤں میں سے چند پر روشنی ڈالیں گے۔

آخری چہار شنبہ کے مراسم

مذہبی معاملات میں بہادر شاہ اتنے خوش عقیدہ تھے کہ وہ جن مراسم، اور تقریبوں میں حصہ لیتے تھے۔ یہ غور نہیں کرتے تھے کہ حقیقتاً ان کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟ آیا از روئے شرع بھی ان کو بجالانا جائز ہے یا نہیں؟ ان کی خوش عقیدگی ان چیزوں پر غور کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتی تھی، وہ جو کچھ کرتے تھے یہ سوچ کر کرتے تھے کہ یہ کار ثواب ہے، عافیت کو سنوارنے کا سبب ہے، وہ اس وقت کے چکر میں نہیں پڑتے تھے چنانچہ ملاحظہ ہو:-

"بادشاہ سلامت لال قلعہ میں رونق افروز ہیں، ماہ صفر کے آخری چہار شنبے کے دن باغ حیات بخش میں تشریف لے گئے۔ مٹی کی ایک ہانڈی میں خود بدولت نے اشرفی ڈالی۔ ہانڈی کو پاؤں سے توڑ کر زمین کی گھاس کو پاؤں سے روندا۔ پھر دیوان خانے میں آ کر مسند آرا ہو کر دربار کیا۔ مرشد زادے اور ملازم آداب بجالائے منصرم جواہر خانہ نے کشتی میں چاندی سونے کے چھلے پیش کیے۔ حضور نے پانچ چھلے اٹھا کر اپنی انگلی میں پہن لیے۔ پندرہ چھلے زینت محل بیگم کو اور پانچ دوسری بیگمات کو دیئے۔ [illegible] کے نام کے سات چھلے اپنے پاس رکھ لیے۔ اور پانچ پانچ مرزا فخر الدین اور دوسرے مرشد زادوں کو عنایت فرمائے۔ سات چھلے گورنر جنرل بہادر کو، پانچ چھلے ان کی میم صاحب کو اور چھ چھلے لفٹننٹ گورنر بہادر آگرہ کو بھجوائے۔ معظم الدولہ صاحب ایجنٹ بہادر کو دس چھلے اور پانچ [illegible] خطاب فرزندی کے روانہ کیے اور کپتان قلعہ کو آٹھ چھلے دیئے۔ چار کپتان قلعہ کے [illegible] اور چار سیکرٹری شپ کے۔ ایک ایک چھلا سورج نرائن مختار کار اور حکیم احسن اللہ خاں کو مرحمت فرمایا۔ پھر ہوادار پر سوار ہو کر دریا پار درگاہ سید محمود بخاری کی زیارت کر کے نذر نیاز پیش کرنے کے بعد واپس تشریف لے آئے[1]

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۹

حضرت علیؓ کا دسترخوان

"آج کے دن جہاں پناہ کے محل میں حضرت علیؓ کے دسترخوان کی نیاز ہوتی ہے۔ جَو کے ستّو بڑے بڑے خوانوں میں چوٹی دار بھر کر۔ دسترخوان پہ رکھ دیئے جاتے ہیں اور پردے چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور باہر بیٹھ کر نیاز دی جاتی ہے۔ پھر پردے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اور شمع کی روشنی سے ستّوؤں کو دیکھا جاتا ہے آج ایک خوان کے ستّوؤں پر حضرت علیؓ کی تسبیح کے ایک دانے کا نشان نظر آیا اور حضور جہاں پناہ نے اس خوان کے ستّو خود بطور تبرک کے نوش فرمائے۔ اور پھر اپنے دست مبارک سے وہ ستّو شہزادوں اور بیگمات کو تقسیم کیے اور اس کے بعد سب نے بارگاہ جہاں پناہ میں نذریں پیش کیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر دسترخوان پر یا کھانوں پر کوئی خاص نشان نظر آتا ہے تو سمجھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے یہ نیاز قبول کی اور اس پر اپنی انگلی کا نشان لگا دیا۔ دسترخوان پہ ہر ہر قسم کے کھانے تھے اور جَو کے ستّو بھی تھے۔ حضرت علیؓ کی تسبیح کا نشان صرف جَو کے ستّوؤں پر ظاہر ہُوا تھا۔

یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ ان ستّوؤں کو اس طرح چوٹی دار چنا گیا تھا کہ کہیں کسی چھوٹے بڑے نشان کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ مگر جب تسبیح کا نشان اس میں نظر آیا تو سب کو بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت علیؓ نے یہ ستّو قبول فرمائے (۱)

حضرت علیؓ اور امام حسینؑ سے عقیدت

بہادر شاہ کو حضرت امام حسینؑ سے بڑی عقیدت تھی، کیف و اثر سے بھرے ہُوئے شعر کہتے تھے، محرم کی رسمیں بجالاتے تھے، غرض ہر طرح اپنے جذبہ کا اظہار کرتے تھے، چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

جو اُس امام کا ہے دوست ہے خدا کا دوست | قبول ہوتی ہے اُس کی علی الدوام نماز
جو ہو حسینؑ کا دُشمن اُسے کہاں ایمان | اگرچہ پڑھتا بھی ہو وہ برائے نام نماز

---

(۱) سرٹامس مٹکاف کی ڈائری ص ۱۰۹

نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ　　وظیفہ چاہیے ذکر غمِ امام کے ساتھ

نہیں در دولت سے ہوتے بہرہ ور شاہ و گدا　　پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجیے التجا
آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پہ ظفر ہے آپ کا　　آیئے اب تو مدد کے واسطے بہرِ خدا
یا حسینؑ ابن علیؑ بندہ بہت ناچار ہے

مستغنیٔ کونین ہی رکھا اپنے ظفر کو　　محتاج نہ کر حیدرِ کرّار کسی کا

محرم میں بادشاہ فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لیے سدّ ہاتھوں میں لے کر اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کی مہندی بڑی دھوم دھام سے اٹھتی تھی اور بادشاہ بہ نفس نفیس اس کی مشایعت کرتے تھے آٹھویں کو حضرت سقائے حرم کی یادگار میں لال کھاردے کی لنگی باندھ کر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورہ کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے تھے۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی ہوتی تھیں اور شیرمالوں پر کباب۔ پنیر۔ پودینہ۔ ادرک۔ مولیاں کتر کے رکھی جاتی تھیں۔[1]

عاشورہ "حضور انور عاشورہ کے دن درگاہ شریف کے آثار کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ مرزا جہاندار شاہ متولّی کو خلعت قبائے خاص۔ سہ رقم جواہر۔ دستار سربستہ، گوشوارہ مرصّع اور حافظ قطب الدین کو خلعت شش پارچہ۔ سہ رقم جواہر اور اُن کے لڑکے کو خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر اور سادات عالی درجات کو پہننے کے کپڑے اور زرِ نقد اور فقرا و مساکین کو نیاز کا کھانا مرحمت فرمایا۔

---

(۱) بزم آخر (منشی فیض الدین مرحوم)

(۲۳) جنوری ۱۸۴۷ء) (۱)

غوث پاک کی نیاز

راجہ بھولا ناتھ کی معرفت دیوان خانے میں حضرت غوث الاعظم کی نیاز کی مہندی تیار کرائی، حضورانور نے خود شمع روشن کی ملیدہ کے خوانوں پر فاتحہ پڑھی، اور ملیدہ کے خوان تقسیم کرکے آتش بازی اور روشنی کا تماشہ دیکھا(۲)

حافظ محمد علی خیرآبادی سے ارادت

بہادر شاہ وقت کے مشہور صاحب طریقت بزرگوں سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت حافظ محمد علی صاحب خیرآبادی سے بھی انھیں عقیدت تھی، ذیل کا واقعہ خالی از دلچسپی نہیں:-

" بہادر شاہ ظفر نے چند مرتبہ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی اور ملاقات کا شوق ظاہر کیا لیکن حافظ صاحب نے ہمیشہ یہ فرمایا کہ ملاقات کی حاجت نہیں ہے شوق کا دل ہی میں رہنا اچھا ہے بہادر شاہ نے اصرار کیا لیکن حافظ صاحب راضی نہ ہوئے بالآخر بہادر شاہ نے کالے صاحب کی وساطت سے ملنے کی کوشش کی کالے صاحب وقت کے منتظر رہے قطب صاحب کے عرس کے دنوں میں حافظ صاحب آستانہ شریف کی مسجد میں رونق افروز تھے کالے صاحب نے فرمایا حافظ صاحب ایک ضرورت سے جاتا ہوں آپ یہیں تشریف رکھیں یہ کہہ کر بادشاہ کے پاس گئے اور اس کو لے کر آئے حاضرین نے شور کیا بادشاہ مسجد کی طرف آتے ہیں جب یہ آواز حافظ صاحب کے کانوں میں پہنچی تو فوراً دیوار پھاند کر چلے گئے (۳)

اس واقعہ سے بہادر شاہ کی خاکساری، اور عقیدت مندی پر گہری روشنی پڑتی ہے۔

درگاہوں سے ارادت وعقیدت

ہندوستان میں زیادہ تر اسلام صوفیوں کے ذریعہ پھیلا، ان کی پاک اوسیلے ریا

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ

(۲) سر ٹامس مٹکاف کی ڈائری ص۱۵۱

(۳) مناقب حافظیہ ص۱۳۵ ۔ تاریخ مشائخ چشت

زندگی نے یہاں کے باشندوں پر اثر ڈالا، اور وہ جوق در جوق حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، دلّی اور اطراف دلّی کے علاقے خاص طور پر تصوّف کے مرکز، اور صوفیا کے زادئے رہ چکے ہیں بہادر شاہ طبعاً صوفی تھے، اور صوفیوں سے عقیدت رکھتے تھے، انھیں مشائخ کی درگاہوں سے والہانہ وابستگی تھی، وہ جس طرح زندہ صوفیوں کی خانقاہوں اور زاویوں میں حاضر ہوتے تھے اسی طرح مرحوم و مغفور مشائخ کے مزاروں، اور درگاہوں پر، جوش ارادت سے سرشار ہو کر پہنچتے تھے زرپاشی کرتے تھے، فاتحہ پڑھتے تھے، نیاز دیتے تھے، نذر پیش کرتے تھے۔ اس طرح کے چند واقعات آپ بھی دیکھیے :۔

"۵ر جون ۱۸۴۸ء حضرت بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب کے قریب والے مکان میں رونق افروز ہیں ایک درویش نے حاضر ہو کر تسبیح اجمیر شریف کی نذر کے طور پر پیش کی اور ایک اشرفی انعام میں لی (۱)

"۷ر نومبر ۱۸۴۵ء چار گھڑی دن باقی تھا کہ جہاں پناہ سوار ہو کر سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں حاضر ہوئے شاہی اور انگریزی توپخانہ سے سلامی کی توپیں چھوڑی گئیں درگاہ میں پہنچ کر نذر و نیاز کی، پھر وہاں سے درگاہ قطب صاحب میں تشریف لے گئے، مزارات کی زیارت کی فقرا و مساکین میں روپیہ خیرات فرمایا۔ (۲)

"۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء محمد علی درویش حاضر ہوئے اور مکّہ معظّمہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا بادشاہ سلامت نے ۲۵ روپیہ عنایت فرمائے۔

شہنشاہ اولیاء خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار شریف کے نیاز کے لیے ایک چاندی کا چراغ ایک نقّارہ کا جوڑا ایک اشرفی اور پانچ روپے میذنی لے جانے والے فقراء کو دیئے گئے

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صہ ۶۱

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صہ ۳۱

یہ فقراء ہر سال مینڈنی لے کر دہلی سے اجمیر شریف تک پا پیادہ جاتے ہیں ایک ہزار تین سو روپیہ کی ہنڈی اُن شہزادہ بہادر کے خرچ کے لیے بھی روانہ کی گئی جو حج کے لیے تشریف لے گئے۔ (۱)

مینڈنی کی مشایعت

۲۵ رماہ جولائی ۱۸۴۵ء۔ حضرت سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ دہلی خلد اللہ سلطنتہ حضرت قطب الاقطاب کے مزار کرامت آثار پر رونق افروز ہوئے حضور غریب نواز خواجہ اجمیر کی مینڈنی روانگی کے لیے تیار تھی بادشاہ سلامت نے مبلغ ایک سو روپیہ مرزا بہادر بخش کو مینڈنی کے لیے مرحمت کیے اور ساتھ جانے کا حکم دیا اور ایک دو چوبہ دو عدد اونٹ، فراشوں اور سائبانوں کے ساتھ مینڈنی کے ہمراہ روانہ کر دیئے اور خود اولیاء مسجد تک مینڈنی کی مشایعت کے لیے تشریف لائے۔ پھر اس کو رخصت کر کے مراجعت فرمائی (مینڈنی اُس قافلہ کو کہتے ہیں جو پیدل اجمیر شریف کے عُرس میں جاتا تھا) چند خواجہ سراؤں نے سفر حج کا ارادہ ظاہر کیا بادشاہ سلامت نے ہر ایک کو خرچہ راہ کے لیے سو سو روپے عطا فرمائے۔ (۲)

۱۳ رجون ۱۸۴۵ء۔ حضرت بادشاہ سلامت حضور قطب کے مزار پر رونق افروز ہوئے درگاہ کے قریب جو محل بنوایا ہے اُس کے خس خانہ کو ملاحظہ فرما کر چھپر بند کے افسر کو ایک جوڑا دوشالہ مرحمت فرمایا۔ (۳)

عرسوں کا اہتمام، درگاہوں کے متوسّلین کی خبر گیری

بہادر شاہ کو عرسوں سے بھی بہت شغف تھا، اور مختلف درگاہوں کے متوسّلین کو بھی وہ قدر و عزت، اور احترام و عقیدت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کی خدمت کرتے تھے، اور ان کی ضروریات پورے کرتے تھے۔ ذیل میں اس طرح کے چند واقعات

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ ۶۳

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ ۱۹

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ ۱۱

اختصار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں:-

(۱)

درگاہ شاہ بوعلی قلندر واقع پانی پت کے خدام نے تبرک پیش کیا۔ حضور والا نے دس روپیہ انعام دیئے۔ جن فقیروں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے عرس شریف کی یادگار کے طور پر ڈیوڑھی خاص پر خواجہ صاحب کا جھنڈا لگایا تھا۔ بادشاہ سلامت نے ان کو ایک سو روپیہ نقد اور نقرئی چراغ درگاہ میں نذر کے لیے مرحمت فرمایا اور کھانے کے خوان بھیجے اور زرِ نقد دستور کے موافق حضرت قطب صاحب کی چھڑیوں کے لیے بھی تقسیم فرمایا۔ میزان شاہ درویش کو جو مکّہ معظمہ کی زیارت کے لیے گئے تھے بادشاہ سلامت نے پچیس روپیہ عطا فرمائے (۱۸ر جولائی ۱۸۴۵ء)

(۲)

"زور آور چند کو حکم ہوا کہ پانسو روپیہ حضرت عرش آرام گاہ (اکبر ثانی) کے عرس میں خود جا کر صرف کرو۔ حکم کی تعمیل میں زور آور چند نے خوانہائے طعام محل میں بھجوا دیئے جسے سرداروں اور دیگر اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا۔ حضور والا نے فاتحہ پڑھی اور فی کس پانچ روپیہ اور درویشوں کو ایک ایک فرد کمبل مرحمت فرمائے اور پھر آتش بازی کے نظارہ اور قوالی کے سننے میں مصروف ہوئے" (اگست ۱۸۴۵ء)

(۳)

"حضرت جہاں پناہ حضور قطب صاحب اور حضرت مولانا فخر صاحب اور حضرت عرش آرام گاہ کے مزارات پر تشریف لے گئے۔ گیارہ گیارہ روپیہ اور گلاب کا شیشہ ہر ایک مزار پر نذر دیا۔ اسی طرح دوسرے اولیائے کرام کے مزارات پر بھی حاضری دی اور ہر مزار پر پانچ روپیہ نیاز کے لیے دیئے" (۱۴ر نومبر ۱۸۴۵ء)

(۴)

"حضرت عرش آرامگاہ (اکبر ثانی) کے عرس کی تقریب میں ایک ہزار توسے محلات شاہی میں اور پانچ سو توسے امرا میں تقسیم کیے گئے" (۱۰ر جولائی ۱۸۴۶ء)

(۵)

" فرقہ مداریہ ملنگ کے سرگروہ ایرانی شاہ کو بادشاہ سلامت نے خلعت سہ پارچہ اور دو اشرفیاں عطا فرمائیں اور اُن کے مریدوں میں سے ہر ایک کی دعوت فرما کر سب کو دل شاد کیا اور اس کے ساتھ نقدی بھی مرحمت فرمائی" (۱۹ / مارچ ۱۸۴۷ء)

(۶)

"حسب دستور قدیم بادشاہ کے جسم مبارک کے وزن سے ترازو نے بلند پلہ ہونے کا شرف حاصل کیا اور وزن کے موافق غربا اور مستحقین میں خیرات تقسیم کی گئی۔

ارشاد ہوا کہ ہماری دادی قدسیہ بیگم صاحبہ کے عرس کے مصارف کے لیے مرزا عبداللہ شاہ کو ایک سو پچاس روپیہ دے دیئے جائیں تاکہ انتظام میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو" (۲ / اپریل ۱۸۴۷ء)

(۷)

" چونکہ بادشاہ سلامت کی طبیعت کسی قدر ناساز تھی اس لیے منجّموں کے کہنے کے موافق غلّہ۔ گڑ۔ سونا۔ چاندی حضور انور کے جسم کے برابر تول کر فقرا و غربا میں تقسیم کر دیا گیا اور کالے کمبل بھی ضرورت مندوں میں بانٹے گئے" (۳۰ / اپریل ۱۸۴۷ء)

(۸)

" ربیع الاوّل کی بارہویں تاریخ کو مداری مشرب فقیروں کی ایک جماعت حاضر دربار ہوئی۔ صوفی قادر شاہ کو خلعت سہ پارچہ مرحمت فرمایا گیا اور حکم ہوا کہ ان سب کو ان کی مرضی کے موافق کھانا کھلایا جائے" (۱۰ / مارچ ۱۸۴۸ء) (۱)

حضرت کالے صاحب

حضرت شاہ فخرالدین صاحب کے خاندان سے بہادر شاہ کے خاندان کو بڑی عقیدت تھی۔ لال قلعہ کے اکثر لوگ ان کے مرید تھے، ان کا وصال ۱۱۹۹ھ میں ہوا تھا، بہادر شاہ کا سال ولادت ۱۱۸۹ھ تھا، انھوں نے شاہ صاحب

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ۔

کو بچپن میں دیکھا ہوگا۔ لیکن عقیدت کا نقش اتنا گہرا تھا کہ زندگی بھر ان کا دم بھرتے رہے۔ انہی شاہ فخر الدین کے سجادہ نشین شاہ غلام قطب الدین تھے، ان سے بھی بہادر شاہ دلی ارادت رکھتے تھے۔

شاہ فخر الدین کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

اے ظفر میں کیا بتاؤں تجھ سے جو کچھ ہوں سو ہوں
لیکن ایسے فخر دین کے کفش برداروں میں ہوں

کوچۂ فخر جہاں کی اے ظفر
خاک کی چٹکی بھی بس اکسیر ہے

جو سمجھے کفش پائے فخر دین کو تاج سر اپنا
پسند اس کو ظفر کب افسر شاہانہ آتا ہے

جس کو حضرت نے کہا الفقر فخری اے ظفر
فخر دیں فخر جہاں پر وہ فقیری ختم ہے

کیا خطر اس کو راہ دیں میں ظفر
رہنما جس کا فخر دیں ہو جائے

ایک جہاں فخر جہاں کہتا ہے پر ہے فخر دو جہاں فخر الدین
میں گدا ہوں تیرے دروازہ کا جاؤں اس در سے کہاں فخر الدین
کیا کروں عرض عیاں ہے تم پر میرا سب رازِ نہاں فخر الدین

رکھ ظفر ہر نفس و ہر ساعت
شغلِ دل وِردِ زبان فخر الدین

شاہ فخر الدینؒ کے سجادہ نشین شاہ غلام قطب الدینؒ کے بارے میں فرماتے ہیں :-

مریدِ قطب دیں ہوں خاکپائے فخر دیں ہوں میں
اگرچہ شاہ ہوں ان کا غلام کمتریں ہوں میں
مجھے تو خانقاہ وے کدہ دونوں برابر ہیں
ولیکن یہ تمنا ہے کہ ان کا ہوں کہیں ہوں میں
یہی عقدہ کشا میرے، یہی ہیں رہنما میرے
سمجھتا اُن کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں
ولیکن اُن کا بے شبہ گدائے رہ نشیں ہوں میں

کالے صاحب سے عقیدت

حضرت شاہ غلام نصیر الدین صاحبؒ عرف میاں کالے صاحب شاہ فخر الدینؒ کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ انکے مرید باصفا تھے۔ اور اتنی دلی ارادت رکھتے تھے کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی، حضرت میاں کالے صاحب سے وہ والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی بارگاہ میں ایک خادم کی طرح حاضر ہوتے تھے، انکی خدمت کرتے تھے، ان کی خدمت میں گراں مایہ تحائف پیش کرتے تھے۔ اشعار میں ان کا ذکر۔ مجلس میں ان کا تذکرہ، خلوت میں وہ موجود۔ جلوت میں وہ جلوہ گر، بہادر شاہ، کبھی اور کسی حالت میں ان کے خیال اور تصور سے غافل نہیں رہتے تھے۔ ان کی زندگی سے اگر کالے صاحب کی ہستی منفی کردی جائے، تو اتنا بڑا خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کا پر ہونا ناممکن ہے،

ذیل میں ہم چند واقعات پیش کرتے ہیں :۔

کالے صاحب کی شادی

"خانقاہ میں دولت ظاہری کا اتنا انبار لگا کہ فقیری پر امیری۔ گدائی پر شاہی کا اطلاق ہونے لگا۔ پیر پرست بادشاہ ساہوکاروں سے قرض لیتا۔ سودی دستاویزیں تحریر کرتا۔ املاک شاہی کفالت میں دیتا۔ مگر خدمت بجالاتا تھا۔ پیر صاحب نے ملکہ بیگم نام ایک شاہزادی سے نکاح بھی کرلیا تھا اور صاحب جائداد ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے خزانہ سے لاکھوں روپیہ نذر و نیاز کے لیے مختلف اوقات پر ملا۔ اس کا کیا حساب۔ احسن الاخبار بمبئی کے نامہ نگار کی شہادت ہے کہ ۱۸۴۶ء میں صرف نو ماہ کے اندر اٹھارہ ہزار روپیہ سے زائد ان کو عنایت کیا گیا :۔ (۱)

عرس کے مصارف

"یکم ماہ اگست ۱۸۴۵ء۔ مبلغ دو سو روپیہ حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے عرس کے لیے پیرزادہ میاں کالے صاحب کو عنایت کئے گئے زور آور چند کو حکم ہوا کہ پانچسو روپیہ حضرت عرش آرامگاہ کے عرس میں خود جا کر صرف کرو۔ حکم کی تعمیل میں زور آور چند نے تو انہا ئے طعام محل میں بھجوا دیئے جسے سرداران اور دیگر اشخاص میں تقسیم کر دیا گیا، حضور والا نے فاتحہ پڑھی فی کس پانچ روپیہ اور درویشوں کو فرد کمبل مرحمت فرمائی"(۲)

درویش کی خدمت

"رجولائی ۱۸۴۶ء جو درویش حضرت میاں کالے صاحب کے ذریعہ سے بادشاہ سلامت تک پہنچا اور عرصہ تک توحید و عرفان کی باتیں کرتا رہا تھا حضرت بادشاہ سلامت نے اسے دو اشرفیاں عنایت کیں اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔ (۳)

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۱

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۹

پیر کی خدمت میں نذرانہ

"۳۰ ستمبر ۱۸۴۶ء۔ موضع شمع پور بادلی کی آمدنی میں سے مبلغ پانچسو روپیہ حضرت شاہ غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب کو مرحمت فرمائے اور ارشاد کیا کہ اس آمدنی میں سے ہمیشہ پانچ سو روپیہ انشاءاللہ قبل از طلب حاضر خدمت ہو جایا کریں گے۔

عرض کیا گیا کہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایک ہزار پانچسو روپیہ منجملہ چار ہزار روپیہ سالانہ کے بھیجے گئے تھے، حضرت شاہ صاحب نے یہ روپیہ واپس کرکے فرمایا کہ تمام روپیہ یکمشت آنا چاہیے۔ اس طرح ٹکڑے کرکر نہیں آنا چاہیے (۱)

فقیر بادشاہ

"۴ جون ۱۸۴۷ء محبوب علی خاں خواجہ سرائے سے فرمایا کہ ہمیں فی الحال پیرزادہ میاں کالے صاحب کے صاحبزادے کی شادی کے لیے چار ہزار روپیہ کی اور مرشد زادہ مرزا سلطان حیدر بہادر کی شادی کے لیے چار ہزار روپیہ کی اور اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی کے لیے نواب ننھی بیگم صاحبہ کے پاس بھیجنے کے واسطے ایک ہزار روپیہ کی ضرورت ہے اس روپیہ کا بہت جلد انتظام ہونا چاہیے۔ عرض کیا بسرو چشم (۲)

حقائق و معرفت کے دفتر

"اہل دربار رخصت ہوئے تو زبدۃ الواصلین قدوۃ السالکین حضرت شاہ غلام نصیر الدین (عرف میاں کالے صاحب) ملاقات کے لیے تشریف لائے، معرفت و حقائق کے دفتر کھلے اس مبارک صحبت کے آخر میں علاقہ بخشی گری کے متعلق ہدایت علی خاں کے مقدمہ کے کاغذات پیش کیے گئے بادشاہ سلامت نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کو طلب کرکے یہ تمام کام سپرد کر دیا۔ (۳)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۷۹

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۳۸

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۵ ۔ یکم فروری ۱۸۴۵ء

مرشد کی خدمت

(۱)

(۴ر دسمبر ۱۸۴۶ء) "حکیم احسن اللہ خاں بہادر سے ارشاد ہوا کہ پیرزادہ حضرت غلام نصیر الدین صاحب کو نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی معرفت چار ہزار روپیہ ماہوار بھیج دیا جائے"

(۲ر اپریل ۱۸۴۷ء) "کارپردازان خلافت کو حکم دیا گیا کہ حضرت میاں کالے صاحب نبیرہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کی شادی ہے دس ہزار روپیہ ان کے خرچ کے لیے عطا کیا جائے۔"

(۲)

(۲۵ر جنوری ۱۸۴۷ء) "صاحب کلاں بہادر کے نام شقّہ جاری فرمایا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے محبوب علی خاں خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار روپیہ قرض لیا ہے یہ قرضہ دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے قسط وار ادا کیا جائے۔ اس میں سے چار ہزار روپیہ میاں کالے صاحب پیرزادہ کے صاحبزادہ کی شادی کے خرچ کے لیے ہے۔ (۱)

(۳)

علاوہ پیرو مُرشد کے اور بھی معززین دربار تھے جن کی بوقت ضرورت اعانت ہوتی تھی، اور تنخواہ بھی مقرّر تھی مثلاً وزرا۔ استادان۔ علما۔ حکما۔ شہزادگان۔ نواب ناظر۔ بخشی فوج۔ مہتممان کارخانہ جات۔ غرض بیگیاں وغیرہ وغیرہ (۲)

پیرو مرشد

حضرت میاں کالے خاں صاحبؒ سے بہادر شاہ کی عقیدت و ارادت کا کیا رنگ تھا، اس کا ایک دلچسپ مرقع، قلعہ شاہی کی ایک خاتون کی زبان سے سنیئے:۔

---

(۱) بہادر شاہ، کا روز نامچہ

(۲) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

"حضور کو حضرت میاں کالے صاحب سے بیعت تھی اور ایسا اعتقاد تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی بس پیر پرستی کرتے تھے۔ قاسم جان کی گلی میں جو حویلی حضرت کو نذر کی تھی وہ لاکھوں روپے تھی جس میں باغ تھا نہر تھی۔ سیکڑوں مکان شاہانہ اس میں تھے حضرت میاں کالے صاحب کبھی لال قلعہ میں جایا کرتے تھے اور بادشاہ سلامت بھی حضرت کے دولت خانہ پر حاضر ہُوا کرتے تھے۔

ایک دفعہ بادشاہ سلامت حضرت سے کچھ رنجیدہ ہو گئے حضرت کو کیا غرض پڑی تھی جو لال قلعہ جاتے مگر بادشاہ سلامت بھی اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں سلام کے لئے حضرت کی حویلی میں کئی دن تک حاضر نہ ہُوئے آخر بادشاہ سلامت کو خدا نے سمجھ دی اور یہ سمجھے مجھ سے غلطی ہوئی جو میں مرشد کی خدمت میں حاضر نہ ہُوا مگر اب چلنا چاہیئے، خود بدولت ہاتھی پر سوار ہوئے حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر کو ساتھ لیا جب حضرت کے دروازے پر پہنچے تو ہاتھی سے اُترے حکیم صاحب سے کہا کہ رومال سے میرے ہاتھ باندھ دیجیے۔ اتنے میں حضرت کے صاحبزادے میاں غلام نظام الدین صاحب آ گئے ان کی عمر اس وقت پانچ چھ برس سے زیادہ نہ تھی بادشاہ سلامت کو دیکھکر بھولے مُنہ سے فرمانے لگے ہمارے ابّا کے پاس اُلٹے بالوں والے سکھ آئے تھے نری اشرفیاں دے گئے ہیں۔ کوٹھری میں ڈھیر لگ رہا ہے بادشاہ سلامت اس بات کو سُن کر سُن ہو گئے اور اطلاع کرائی، بہادر حاضر ہے حکم ہو تو رُوبرُو حاضر ہو۔

جواب ملا شوق سے حاضر ہوں۔ جب بادشاہ میاں صاحب کے سامنے رومال سے ہاتھ باندھے پہنچے تو کہا۔

بردر آمد بندۂ بگریختہ

آبروئے خود بعصیاں ریختہ

اور دھاڑیں مار کر رونے لگے میاں کالے صاحب نے اُٹھ کر بادشاہ سلامت کے ہاتھ کھول دیئے اور گلے سے لگا لیا۔

پھر دونوں میں باتیں شروع ہوئیں :-

بادشاہ سلامت :- حضور اپنے بڑوں کا صدقہ اس غلام کی خطا معاف کیجیے۔

میاں کالے صاحب :- میں نے تمھاری خطا معاف کی اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ میرے اور تمھارے گناہوں کو بخش دے، ابوظفر تم نے جو خیال پکایا تھا کہ غلام نصیرالدین (کالے صاحب کا نام ہے) کے بال بچے لال قلعہ سے پلتے ہیں۔ یہ تمھارے دماغ کا قصور تھا۔ تمھیں یہ بھید نہیں معلوم کہ جب میں نے تونسہ شریف حاضر ہو کر شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو حضرت نے فرمایا۔ دیکھو تم ضرورت سے زیادہ بات نہ کرنا میں نے عرض کی بہت خوب اس دن سے میں برائے نام بولتا ہوں، بلکہ اشاروں سے ہی کام لیتا ہوں پھر ارشاد کیا کہ آنکھیں بند کرو۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو دیکھا میں ایسی زمین پر ہوں جو سونے کی بنی ہوئی ہے۔ اور شاہ سلیمان صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا کھرپا ہے وہ کھرپا اپنے ہاتھ میں دیکر فرمایا سونے کی جس قدر ضرورت ہو اس زمین سے کھود لینا اور خرچ کرنا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا وہ دن ہے اور آج کا دن اس زمین سے سونا کھودتا ہوں اور گلچھرے اڑاتا ہوں اس اٹھوارے میں جو تم نہیں آئے کسی نے مجھے چاندی کا روپیہ نہیں دیا بلکہ جس نے دی سونے کی اشرفی دی ایک فوج کی فوج سکھوں کی آئی اور ڈھیر ساری اشرفیاں دے گئی، یہ فرما کر میاں نے نوکر کو اشارہ کیا، اس نے کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھول دیا اور بادشاہ سلامت نے دیکھا کہ کوٹھری اشرفیوں سے پڑی جگمگا رہی ہے۔

بادشاہ سلامت نے یہ تماشا دیکھا اپنے جی میں کہا چھوٹے میاں نے ڈیوڑھی پر فرما دیا تھا۔ بادشاہ کی وجہ سے سارا شہر میاں کا ادب کرتا تھا جب میاں غلام نظام الدین کا بیاہ ہونے لگا تو مرزا نوشہ نے ایسا سہرا لکھا جو ولیعہد کے سہرے سے اچھا تھا مگر میں بھول گئی دو ایک شعر یاد رہ گئے وہ سنا دیتی ہوں۔

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا

چاند کا دائرہ لے زہرہ نے گایا سہرا

رشک سے لڑتی ہیں آپس میں الجھ کر لڑیاں

باندھنے کے لیے جب میں نے جو اٹھایا سہرا

میاں کالے صاحب اور بادشاہ سلامت کے آپس کے حالات اتنے بہت سے ہیں اگر انھیں کہے جاؤں تو کتاب بن جائے، جب میاں صاحب کا انتقال ہوا تو سارے شاہجہان آباد میں تہلکہ تھا۔ مومن خاں نے فوراً تاریخ وفات کہی جو شہر کے بچے بچے کی زبان پر پہنچ گئی وہ یہ ہے۔

ہوئی جس دم وفات حضرت کی مجھ کو تاریخ کا خیال آیا
ہاتف غیب نے کہا ناگاہ کالے صاحب کو سر خرد پایا

غدر میں جب میاں کالے صاحب کی حویلی لٹی ہے تو لوٹنے والوں نے چودہ چھکڑے سونے چاندی کے پائے پٹیوں والے پلنگوں سے بھرے تھے (۱)

خوفِ خدا

صفحات بالا میں جو واقعات ہم نے پیش کیے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ بادۂ مذہبیت سے سرشار تھے، اور اس خمار میں وہ سُنّت اور بدعت کو نہیں دیکھتے تھے، لیکن ان کا دِل خوفِ خدا سے لبریز تھا، اس پر ٹھیس لگی، اور بھر آیا،

عظیم آباد کے مشہور "متبع سنت" واعظ مولوی ولایت علی جو حضرت سید احمد اور مولانا شہید کے اصحاب و رفقا میں سے تھے لیکن نعمت شہادت سے محروم رہ گئے تھے اسی زمانہ کے قریب دہلی تشریف لائے۔ نواب زینت محل کے استاد مولوی امام علی، ان کے مرید ہوئے،

بادشاہ نے مولوی صاحب کو قلعہ میں طلب فرمایا، دیوان خاص میں اجلاس ہوا، تخت شاہی کے نیچے فرش مکلف بچھایا گیا۔ بادشاہ نے لب فرش تک استقبال کیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد مسند پر ایک طرف حضرت کو بٹھایا اور دُوسری جانب خود بیٹھے۔ عطر و پان کی تواضع ہوئی۔ امراء دربار اپنے اپنے مقامات پر استادہ تھے۔ فرنگی قلعہ دار بھی شریک مجلس تھے اور (صاحب تواریخ عجیبہ معروف بہ سوانح احمدی کی روایات کے مطابق) بادشاہ کے سر پر مورچھل ہلاتے تھے۔ مولوی صاحب نے دنیا کی بے ثباتی پر وعظ شروع کیا۔ وزیر اعظم نے جھک کی عرض کی کہ دوزخ اور عذاب

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) صہ ۳۱

کا بیان بادشاہ کے سامنے نہ کیجیے۔ لیکن مولانا نے نہ مانا اور ایسی پُر اثر تقریر کی کہ بادشاہ، بیگمات اور شہزادے زار زار رونے لگے، بعد ختم مجلس مولانا کو محلات شاہی کی سیر کرائی گئی اور پچاس خوان الوان نعمت کے بھرے ہوئے نذر کیئے گئے۔ یہ بھی گزارش کی گئی کہ مولانا ماہ رمضان قلعہ میں بسر کریں تا کہ بادشاہ اور شہزادوں کو مواعظ میں شرکت کا موقع ملے۔ لیکن مولوی صاحب نے وہاں کا قیام خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ حکام انگریز مختلف اشخاص سے دریافت کرتے تھے کہ یہ مولوی صاحب کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

مولوی صاحب نے محرم سنہ ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ اُن کی بابت ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں وہ دلی تشریف لائے ہیں۔ دار السلطنت میں اُلّو کی حلّت و حرمت کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک فریق اُلّو کو حلال کہتا تھا اور دوسرا حرام۔ بعض حضرات نے آپ سے استفتا کیا تو بولے کہ "بھائیو میں اُلوؤں کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ (۱)

خرقۂ پیری و تاج خسروی

پھر اگر ان برگزیدہ خصائل و ملکات کے حامل بادشاہ فقیر منش کے لیے غالبؔ نے یہ کہا تو کیا غلط کہا۔

شبلی از منبر دہد آوازِ عشق
شاہِ ما بر تخت گوید رازِ عشق
شاہِ ما دارد بہم در رہروی
خرقۂ پیری و تاجِ خسروی

شاہی و درویشی ایں جا باہم است
بادشاہِ عہد قطبِ عالم است (۲)

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

(۲) دیباچہ "مہر نیم روز"

باب

بادشاہ کے مصارف اور مالی حالت

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے، جب مرہٹوں کو دلی سے نکال کر اپنا تسلط جمایا، اور شاہ عالم کو عملاً لال قلعہ میں گوشہ نشین کر کے عنان اختیارات اپنے ہاتھ میں لی تو کسی دل جلے نے کہا تھا،

"بادشاہی شاہ عالم۔ از دلی تا پالم!"

لیکن اب بہادر شاہ کے زمانہ میں، یہ چند میل کا ٹکڑا بھی بہادر شاہ کی ملکیت میں نہیں رہا تھا، اب صرف لال حویلی، یا لال قلعہ کے اندر ان کی نوبت بجتی تھی، ان کا پرچم لہراتا تھا، ان کا سکہ چلتا تھا، لال قلعہ سے باہر عملاً ان کی وہی حیثیت تھی، جو ایک معزز اور سربرآوردہ شہری کی ہوتی ہے۔

انگریزوں کی طرف سے بہادر شاہ کو جو پنشن ملتی تھی، وہ ایک لاکھ روپیہ ماہوار تھی۔ یہ رقم بھی صرف بادشاہ کے لیے نہیں تھی، اس میں قلعہ کے تمام مصارف شامل تھے، مرشد زادوں، سلاطین اور متوسلین شاہی کی تنخواہیں بھی اسی سے ادا ہوتی تھیں، ولی عہد کا مشاہرہ بھی اسی رقم سے دیا جاتا تھا، شاہی مصارف، ذاتی ٹھاٹھ، انعام واکرام، داد و دہش، بذل و عطا کے مظاہرے بھی اسی آمدنی سے ہوتے تھے۔

یہ آمدنی مشکل سے ایک ہفتہ چلتی ہو گی، باقی، وہ اندوختہ جو از قسم زر و جواہر قلعہ میں موجود تھا، بکتا اور صرف ہوتا رہتا تھا، بار بار کے مطالبے، اور بار ہا کے وعدوں کے باوجود، انگریزوں نے پنشن کی رقم میں اضافہ نہیں، لیکن بہادر شاہ کا کھلا ہوا ہاتھ بند نہیں ہوا، بقول ریاض

رند قانع متوکل ہے، خدا دیتا ہے

جب وہ پاتا ہے، تو پیالے پلا دیتا ہے

اب ذیل میں ہم بادشاہ کے شاہانہ مصارف کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے،

ہر طرح کی جکڑ بندیوں، اور پریشانیوں کے باوجود وہ کیسے لکھ لٹ تھے !

مقروض لیکن لکھ لٹ

ایک طرف تو بہادر شاہ کی یہ کیفیت تھی کہ :-

" حضور جہاں پناہ نے ایجنٹ بہادر کو شقہ لکھا کہ روز مرہ کے شاہی اخراجات قرض لیئے بغیر پورے نہیں ہو سکتے، لہٰذا بابو سورج نرائن کو شاہی جاگیرات کی آمدنی کے حوالہ سے تمسک پر قرضہ لینے کی اجازت دی جائے۔(۱)

بے بسی کا یہ عالم تھا کہ " ایجنٹ بہادر " کی اجازت کے بغیر قرض بھی نہیں لے سکتے تھے اور دوسری طرف یہ عالم تھا کہ جب روپیہ آجاتا تھا، تو حوصلہ مندی روکے نہیں رکتی تھی،

" بادشاہ سلامت نے حکیم احسن اللہ خاں کی معرفت بارہ سو روپے کو موتیوں کی ایک مالا خریدی، (۲)

مفلسی اور دریا دلی

بادشاہ سلامت " ایجنٹ بہادر " کو لکھتے ہیں :-

" صاحب ایجنٹ نے شاہی مصارف پر اعتراض کیا تھا حضور نے جواب میں شقہ بھجوایا کہ شاہی امور کی سرانجام دہی میں اہل کاروں کا کچھ قصور نہیں ہے، ہزاروں روپیہ کے صرف کے بجائے، دس روپے خرچ کرنے کی نوبت آگئی ہے، اس قدر کمی کے باوجود عرس وغیرہ کے مصارف قرض لے کر کیے جاتے ہیں، اگر گورنمنٹ کی طرف سے شاہی قرض ادا کرنے کا انتظام کر دیا جائے گا تو آپ کی نیکنامی کا سبب ہوگا (۳)

ایجنٹ کے اعتراض میں جتنی بے دردی، اور شقاوت تھی شاہی جواب میں اسی مناسبت سے،

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۵

(۲) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۴۲

(۳) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۶

کتنی بے بسی ہے، گھٹی گھٹی سی آہ، اور کراہ، فریاد، اور فغاں، نالہ، اور شیون، سب ہی کچھ، لیکن ان معذوریوں اور مجبوریوں کے باوجود جب خواجہ بلند بخت کو حج کا عزم سفر کرتے دیکھتے ہیں تو دست جنوں جیب تک پھر پہنچ جاتا ہے

"بادشاہ سلامت قلعہ میں تشریف فرما ہیں خواجہ بلند بخت حج کو جا رہے ہیں، مدینہ منورہ کی زیارت کو بھی جائیں گے، حضور والا نے کمخاب کا ایک چغہ اور ایک دوشالہ منقش جواہری خواجہ بلند بخت کو مرحمت فرمایا، اور ایک ایک خلعت پارچہ، خواجہ کے دونوں لڑکوں کو عنایت کیا۔(۱)

سورج گرہن اور خیرات

مصارف ہیں کہ امڈے چلے آتے ہیں،

"سورج گرہن کے سبب بادشاہ سلامت ترازو کے ایک پلہ میں بیٹھے، دوسرے پلہ میں ست رنگا غلہ، اور کچھ سونا چاندی رکھ کر وزن کیا گیا، پھر یہ ساری چیزیں، ایک بھینسا، ایک گھوڑا، اور دس روپے خیرات کیے گئے۔(۲)

زرپاش بادشاہ

اب ایک مختصر فہرست، بہادر شاہ کی زرپاشیوں کی ذیل میں درج کی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ قرض دار ہونے کے باوجود، بادشاہ سلامت خرچ کرنے کے کیسے کیسے بہانے ڈھونڈا کرتے تھے۔

(۱)

"مولوی تیغ علی کیدانی کے عہدہ پر مقرر ہوئے۔ بادشاہ سلامت نے ان کو ازراہ عنایت خسروانہ خلعت پنج پارچہ و سہ رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا۔" (۲۳ر اپریل ۱۸۴۷ء)

(۲)

"حضرت بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب کے مزار پر رونق افروز ہوئے۔ درگاہ کے

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۶۶

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۷۱

قریب جو محل بنوایا ہے اُس کے خسخانہ کو ملاحظہ فرما کر چھپر بندوں کے افسر کو ایک جوڑا دوشالہ مرحمت فرمایا۔"
(۱۳-جون ۱۸۴۵ء)

(۳)

"بادشاہ سلامت نے سید ابوالقاسم خان کے بڑے صاحب زادے سید محمد رضا خان کو خلعت ششش پارچہ اور سہ رقم جواہر سے سرفراز فرمایا۔ ابن الرحمن خان کے لڑکے کریم الرحمن کو بادشاہ نے ایک جوڑا دوشالہ اور مکرم الدولہ بہادر تہور جنگ کے خطاب سے معزز فرمایا (۲۹ جنوری ۱۸۴۷ء)

(۴)

"قلعہ کی کوتوالی پر نواب یار خاں کا تقرر عمل میں آیا۔ بادشاہ سلامت کی طرف سے خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت کیے گئے۔" (۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء)

(۵)

"بادشاہ سلامت نے خلیفہ محمد اسماعیل (خلف شیخ ابراہیم ذوق) کو خلعت ششش پارچہ وسہ رقم جواہر عنایت کیے۔" (۵ جون ۱۸۴۶ء)

(۶)

"مرزا غلام فخر الدین کو عہدۂ نظارت کے حصول کی تقریب میں خلعت ششش پارچہ وسہ رقم جواہر مرحمت فرمایا اور بیگم صاحب کے داماد حسین مرزا کو خلعت پنج پارچہ اور دو رقم جواہر مرحمت فرمایا۔"
(۱۴ اگست ۱۸۴۶ء)

(۷)

"بادشاہ سلامت کی طرف سے بھگوانداس کو خلعت پنج پارچہ و دو رقم جواہر اور خلعت سہ پارچہ و یک رقم جواہر ان کے گماشتہ کو مرحمت کیا گیا۔" (۴ دسمبر ۱۸۴۶ء)

(۸)

"مرزا محمد تقی بہادر کو جو لکھنؤ سے آئے ہیں بادشاہ سلامت نے ایک کمخواب کی قبا، دوشالہ،

گوشوارہ، دستار، سہ رقم جواہر مرحمت کر کے معزز فرمایا، مختار الدولہ، وحید الدین خان بہادر کو خلعت پنج پارچہ اور رقم جواہر عطا فرمایا۔" (۱۹ مارچ ۱۸۴۷ء) (۱)

پھر قرض

"ایک شقہ ایجنٹ بہادر کے نام بھیجا کہ ہم نے پندرہ ہزار روپیہ بابو سورج نرائن سے قرض لیے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس کے تمسک کی تصدیق کر دیں، اور شاہی جاگیر کی آمدنی بھی اس کو دیتے رہیں۔ (۲)

قرض لے کر مدد کی

(۲۶ مارچ) پیرزادے میاں کالے صاحب کے لڑکے کی شادی کے مصارف کے لیے چار ہزار روپیہ سرکاری تمسک کے ذریعہ ساہوکار سے دلوانے کا حکم ہوا یہ تمسک شاہی جاگیر کے دیہات کی آمدنی پر لکھا گیا۔ (۳)

بادشاہ کی مالی حالت

"حضور والا نے ایک شقہ بھیجا کہ محبوب علی خواجہ سرا قرض خواری کی نسبت بیان دینے کچہری میں جائے تو اس کو بیٹھنے کے لیے کرسی دی جائے۔

محبوب علی خواجہ سرا نے بیان دیا کہ میں نے بادشاہ سلامت کی طرف سے سترہ ہزار روپیہ طامس صاحب سفیر لندن کو بھیجے، اور چھ ہزار روپیہ حکیم احسن اللہ خان کو دیئے اور بارہ ہزار روپیہ تخت طاؤس کی تیاری کے لیے دیئے۔ جو سنلا سے بنوائے گئے تھے، اور مرزا بلاقی مرحوم کے جنازے کا خرچ اٹھایا۔ کل رقم ایک لاکھ انتیس ہزار سات سو تیئس روپے میرے حضور والا کے ذمہ ہیں۔

کنور دھنی سنگھ اور سالک رام نے اڑتیس ہزار روپیہ قرضہ کا کاغذ پیش کیا۔ حافظ داؤد صاحب نے بیس ہزار روپیہ قرضے کا کاغذ پیش کیا۔

اور اصغر علی خان نے انیس ہزار روپیہ کا اور مبارک النساء زوجہ لونی اکٹر صاحب مرحوم نے بیس ہزار

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۶۹

(۳) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۹۲

روپیہ قرضے کے کاغذات پیش کیے۔

اور نرد ستا در چند اور دولت رام اور راجو دھیا پرشاد اور گوکل سنگھ اور چرنجی لال اور غلام علی وغیرہ نے بھی اپنے کچے کاغذات اپنے قرض کے پیش کیے۔ حامد علی خاں کے وکیل نے عرض کی کہ میرا موکل لکھنؤ میں ہے اس لیے حامد علی خاں کے نام خط لکھا گیا کہ اپنے حساب کے کچے کاغذ بھیجدو ورنہ اس کے بعد سماعت نہ ہو سکیگی۔

صاحب بہادر قرضے کے ان کاغذات کے مطالعہ میں دیر تک مصروف رہے۔ (۱)

بخشش، عطا، کرم

"ہوا دار میں سوار ہو کر میاں کلے صاحب کے لڑکے کی شادی میں تشریف لے گئے۔ کپڑوں کی گیارہ کشتیاں اور پان چھالیا مصالح وغیرہ سات خوان عنایت فرمائے۔ برات کے جلوس کے لیے سارے لوازم (پیدل، سوار، یا ہاتھی وغیرہ) کے فراہم ہونے کا حکم صادر فرمایا اور رقص کا ملاحظہ کیا۔ (۲)

ہائے یہ حوصلے!

"اعلیٰحضرت قطب صاحب میں رونق افروز ہیں۔ حضور والا کا ارادہ تھا کہ جتنی پبلک میلے کی سیر کو آئے سب کو کھانا بادشاہ کی طرف سے دیا جائے اور عمومی دعوت ہو مگر مصارف کا ٹوٹل اتنا زائد ہوتا تھا کہ اس رائے کو بدلنا پڑا اور شاہی نسبت رکھنے والوں کے علاوہ دوسری پبلک کی دعوت نہ کی گئی۔ (۳)

مفلس بادشاہ

"امید سنگھ اور رام دیال ملازمان نظارت کو حکم بھیجا کہ مابدولت کے صرف کے لیے دو ہزار روپے بھیجدو۔ دو تین مہینے میں قرض مع سود کے ادا کر دیا جائے گا۔ (۴)

ذوق پر انعامات کی بھرمار

"مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو ذوق نے پھر

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صـ ۱۲۲

(۲) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صـ ۱۳۲

(۳) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صـ ۲۲۵

(۴) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صـ ۲۵۱

یہ قصیدہ گزارتا۔

رو کش ترے رخ سے ہوا نور سحر رنگ شفق
ہے ذرّہ تیرا پرتو نور سحر رنگ شفق

ولی عہدی میں۔ للعہ مہینہ سے ھمر ہو گئے ھمر سے معہ ہو گئے، جب بادشاہ ہوئے تو سو مہینہ جب نواب حامد علی خاں مرحوم مختار (شاہی) ہوئے، تب استاد شاہ کا سو روپے مہینہ ہوا ہمیشہ عید اور نوروز کے جشنوں میں قصیدے مبارکباد کے پڑھتے تھے، اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے۔

اور آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے، جب شفا پائی، اور انھوں نے ایک قصیدہ کہہ کر گزارتا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقرئی انعام ہوا پھر ایک بڑا سا زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزارنا، جس کا مطلع ہے،

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت

اس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔(۱)

بادشاہ کی فریاد

"جناب مستطاب معظم الدولہ صاحب کلاں بہادر فرزند ارجمند سلطانی یعنی ریذیڈنٹ دہلی دام اقبالہ، شہر دہلی میں آئے اور حضرت جہاں پناہ کی باریابی سے بہرہ افروز ہوئے حضرت جہاں پناہ نے مزاج کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اضافہ تنخواہ سلاطین (سلاطین اُن شہزادوں کو کہتے تھے جو بادشاہ کے بھائیوں اور چچاؤں کی اولاد ہوتے تھے) کے متعلق دو شقّے لکھ کر عنایت فرمائے ایک کا مضمون یہ تھا کہ آن فرزند ارجمند نے اپنی حسن تدبیر سے میرے دل کے رنج کو دُور کر دیا جو تھوڑی بہت شکایت باقی ہے وہ بھی بہت جلد جاتی رہے گی، دوسرے شقّہ میں فرمایا تھا کہ ۹ لاکھ روپیہ کی قرضداری ہے اس کی ادائیگی کے لیے صدر دفتر میں رپورٹ کی جائے صاحبکلاں بہادر نے عرض کیا کہ ان دونوں شقّوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہونا چاہیے۔(۲)

(۱) آب حیات (محمد حسین آزاد)

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۲

بخشش و عطا "ایک درویش مکہ معظمہ جانے والا تھا حضور نے اس کو مبلغ ۲۶ روپیہ مرحمت فرمائے قطب بخش گویئے نے عرض کیا کہ میں الور جانا چاہتا ہوں حکم دیا کہ اس کی تنخواہ ادا کر دی جائے اور ایک ہاتھی اور دو سوار اور ہرکارے اُس کے ساتھ جانے کے لیے مقرر کیے گئے" (۱)

درویش بادشاہ "درگاہ شاہ بو علی قلندر واقع پانی پت کے خدام نے تبرک پیش کیا حضور والا نے دس روپے نذر دیئے جن فقیروں نے حضرت خواجہ شہنشاہ اولیائے ہند معین الدین چشتی کے عُرس شریف کی یادگار کے طور پر ڈیوڑھی خاص پر خواجہ کا جھنڈا لگایا تھا بادشاہ سلامت نے اُن کو ایک سو روپیہ نقد اور نقرئی چراغ درگاہ میں نذر کے لیے مرحمت فرمایا اور کھانے کے خوان لگا کر بھیجے اور زر نقد دستور کے موافق حضرت قطب الدین صاحبؒ کی چھڑیوں کے لیے بھی تقسیم فرمایا۔ میراں شاہ درویش کو جو مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے بادشاہ سلامت نے ۲۵ روپیہ عطا فرمائے۔ (۲)

تنخواہوں کی فکر بہادر شاہ کو یہ گوارہ نہ تھا کہ متوسلین و ملازمین شاہی کو تنخواہیں وقت پر نہ ملیں ہر طرح سے فکر کر کے ادائی فوراً کرتے تھے۔ (۲، جنوری ۱۸۴۶ء)

"خزانچیوں کو حکم ہوا کہ تنخواہ کی تقسیم میں چار سو روپے کم ہیں جس طرح ممکن ہو انتظام کر کے تقسیم کر دو۔ انشاءاللہ جلد ادا کر دیئے جائیں گے۔ (۳)

عوام کی تکلیف کا خیال ۲۵ ستمبر ۱۸۴۶ء حضور بادشاہ سلامت نے صاحب کلاں بہادر کے نام اس مضمون کا ایک شقہ تحریر فرمایا کہ مجاہد پور کے ناکر پہ ایک مضبوط پل بہت جلد تیار کیا جائے تاکہ حضور قطب الاقطاب قدس سرہ کے مزار مبارک پر آنے جانے والوں کو برسات میں تکلیف نہ ہوا کرے جو کچھ خرچ ہوگا شاہی آمدنی میں سے فیصدی ایک روپیہ کے حساب سے

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۱

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۸

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۹

وضع کر لیجیے گا۔ (۱)

مالی حالت

"۲۹ مئی ۱۸۴۶ء دستار سربستہ گوشوارہ دوشالہ سہ رقم جواہر مبلیہ ہر دوار کی رخصت کی بابت شاہزادہ محمد شاہ رخ بہادر کو عطا فرمائے شہزادہ نے دو اشرفیوں کا نذرانہ حضور انور کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن خرچ راہ کے لیے کہیں سے روپیہ قرض نہ مل سکا اس لیے سفر کا ارادہ ملتوی کیا گیا۔ (۲)

بھولا بادشاہ

"۲۹ مئی ۱۸۴۶ء حضور بادشاہ سلامت حضور قطب صاحب قدس سرہ کے مزار پر انوار پر حاضر تھے کہ حضرت سلطان مشائخ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ شریف کے خدام حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ ہمیں درگاہ شریف میں رات کو بشارت ہوئی ہے کہ عنقریب حضور انور کو کوئی بہت بڑی مسرت حاصل ہونے والی ہے حضور نے ان کو ۱۰۰ روپیہ بطور نذر مرحمت فرمائے۔ (۳)

خوشنویس کو صلہ

"۱۳ فروری ۱۸۴۷ء۔ سید محمد امیر صاحب خوشنویس کے لڑکے کی شادی کے موقع پر بادشاہ سلامت نے ایک پورا جوڑا اور سہرہ مقیشی مرحمت فرمایا۔ (۴)

خرچ، خرچ، خرچ

"۲۵ جون ۱۸۴۷ء۔ بادشاہ سلامت نے صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ بدر الدین مہرکن آپ کے پاس آتے ہیں ان کو پرگنہ کوٹ قاسم کی آمدنی میں سے ایک ہزار روپیہ دیدیا جائے کیونکہ ان سے مہریں بنوائی تھیں اُن کی اجرت باقی ہے۔ (۵)

مصارف ہی مصارف

"آمدنی کی کمی کے باوجود بہادر شاہ کا دست عطا ہمیشہ بلند رہتا تھا۔ کوئی موقع ہو داد و دہش سے باز نہیں آتے تھے۔ ایک مختصر سی فہرست ملاحظہ فرمائیے۔

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۴۰

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۵۹

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۵۸

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۰۳

(۵) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۵۲

(۱)

"نواب حسام الدین حیدر خان بہادر کے فرزند ارجمند کی تقریب شادی میں خلعت سہ پارچہ اور سہرہ مقیشی اور تفضل حسین خان وکیل عدالت دیوانی کے فرزند کی شادی میں خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت نے مرحمت فرمایا" (۱۶ر جنوری ۱۸۴۶ء)

(۲)

"نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی دادی نواب نوازش علی خاں کی زوجہ محترمہ فوت ہوگئیں حکم ہوا کہ ۱۵۰ روپیہ تجہیز و تکفین کے لیے اور خلعت ماتمی کے طور پر تین دوشالے ان کے وارثوں کے پاس بھیجد یئے جائیں" (۲۵۔ ستمبر ۱۸۴۶ء)

(۳)

"مرزا الف خان کو ان کی والدہ مرحومہ کی تعزیت کے طور پر خلعت شش پارچہ مرحمت ہوا" (۲۔ اکتوبر ۱۸۴۶ء)

(۴)

نواب غلام محی الدین خان بہادر کی تقریب ماتم میں ان کے صاحبزادے مفخر الاسلام نواب قطب الدین خان بہادر کو خلعت شش پارچہ اور ان کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کی طرف سے عطا کیا گیا" (۶۔ نومبر ۱۸۴۶ء)

(۵)

نواب حسام الدین حیدر خان مرحوم کے بڑے صاحبزادہ معین الدولہ نظارت خاں وغیرہ حاضر دربار ہوئے۔ بادشاہ سلامت نے مرحوم کی خدمت جلیلہ کا ذکر فرما کر ان کی وفات حسرت آیات پر بہت رنج و غم کا اظہار کیا اور صبر کی تلقین فرمائی۔ پھر خلعت شش پارچہ اور نیم آستیں نقرئی خلف ثانی مظفر الدولہ بہادر خان کو خلعت پنج پارچہ آغا مرزا کو ایک ایک دوشالہ ان کی صاحبزادی اور زوجہ کو مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ مرحوم کے پسماندگان نے منجموں کی رائے کے موافق زر و جواہر اور دوسری چیزیں مرحوم کے نام سے فقیروں

اور غریبوں کو بطور خیرات تقسیم کیں" (۱۲- نومبر ۱۸۴۶ء)

(۶)

"خبر آئی کہ علیم اللہ کا بدار جو حرمین شریفین کی زیارت کے لیے گیا ہوا تھا راستہ میں فوت ہو گیا۔ مرحوم کے لڑکے پاس تعزیت کے طور پر خلعت سہ پارچہ روانہ کیا گیا" (۲۹ر جنوری ۱۸۴۷ء)

(۷)

"بادشاہ سلامت نے محمد حسین بیگ کے بھائی کو ان کی والدہ کی وفات کے موقع پر خلعت سہ پارچہ اور خواجہ بابر اور میر ہدایت علی سرجو کی خواصان کو خلعت دو پارچہ مرحمت فرمایا" (۲-اپریل ۱۸۴۷ء)

(۸)

"ظفر علی خان نے اپنے لڑکے کی شادی کی تقریب میں نذرانہ پیش کیا اور حضور انور نے ان کو خلعت فرخ سیری بالا بند اور سہرۂ مروارید کے عطیّہ سے سرفراز فرمایا" (۲۲راپریل ۱۸۴۷ء) (۱)

حجّام کی عزّت افزائی

"بہادر شاہ، امیروں، رئیسوں، دولت مندوں اور صاحبان جاہ و اعزاز کو تو نوازتے ہی رہتے تھے۔ لیکن انھیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا، وہ سب سے زیادہ نوازتے تھے، ان کی قدر فرمائی، دل جوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے، وہ اس خلوص، اور سچائی کے ساتھ، داد و دہش سے کام لیتے تھے کہ نہ داب شاہی رکاوٹ بنتا تھا، نہ وقار خسروی آڑے آتا تھا،

"نتھو خاص تراش (حجام) کو خلعت سہ پارچہ، ایک رقم جواہر اور اللہ رکھا کو خلعت سہ پارچہ اپنے دست مبارک سے مرحمت فرمایا۔" (۲)

شاہی ٹھاٹھ

بہادر شاہ کی جیب خالی تھی، لیکن دل غنی تھا، آمدنی محدود تھی، لیکن مصارف دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادشاہ ہفت اقلیم یہی ہیں، ایک بادشاہ جس رکھ

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ،

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ،

رکھاؤ سے رہتا ہے، اس رکھ رکھاؤ میں انھوں نے کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ بے دریغ روپیہ صرف کیا، دربار کی رونق کے لیے تھوڑی سی فوج بھی رہتی تھی جس کی پچھیری پلٹن اور اگیری پلٹن نے غدر میں شہرت پائی۔ ایک رسالہ سواروں کا ملازم تھا اور حسب ذیل کارخانہ جات شاہی تھے ۔

خاصہ کلاں۔ خاصہ خورد۔ آبدار خانہ دواخانہ، توشہ خانہ، جواہر خانہ، سلح خانہ، فیل خانہ۔ اصطبل بگھی خانہ۔ توپ خانہ۔ شتر خانہ۔ رتھ خانہ۔ کارخانہ جلوس ماہی مراتب، بخشی خانہ فوج، کتب خانہ، کبوتر خانہ۔ داروغہ نذر دنیار، داروغہ فراش خانہ، پالکی خانہ، داروغہ کہاران، داروغہ خاص برداران، افسر خواجہ سرایان وغیرہ وغیرہ مصیبت کے وقت بدباطن کمینوں نے فوجی عدالت کے سامنے ظاہر کیا کہ بادشاہ لالچ کے بندے تھے اور روپیہ کی پرستش کرتے تھے۔ کسی کے منہ سے نہ نکلا کہ ان کے شاہانہ اخراجات اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ خزانہ ہمیشہ خالی رہتا تھا اور فیاضی سخاوت کی حد سے گذر کر اسراف تک جا پہنچی تھی۔ وہ صرف پیرزادہ ہی کی خدمت نہیں کرتے تھے بلکہ تمام متوسلین شاہی کی شادی وغمی کے موقع پر امداد کرتے تھے (۱)

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

باب ۶

بہادر شاہ کا برتاؤ ہندوؤں کیساتھ

مغل فرمانرواؤں نے، اپنے طویل دورِ حکومت میں، اقلیتوں کے ساتھ، اور محکوموں کے ساتھ، بے انتہا شفقت اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ اکبر نے تو اس حد تک رواداری برتی کہ بدنام ہوگیا۔ عالمگیر بھی جس کا مذہبی تشقف بڑھا ہوا تھا، ہندوؤں کے ساتھ، روادارانہ، اور فراخ دلانہ برتاؤ کرتا تھا۔ بنارس کے اور دوسرے متعدد مندروں کے نام اس نے جاگیریں وقف کردیں، ان اوقاف کی آمدنی اب تک ان مندروں کو مل رہی ہے ہندوستان کے مورخوں میں سرجادوناتھ سرکار، عہدِ مغلیہ کے عموماً اور عہدِ عالمگیر کے خصوصاً "اسپشلسٹ" ہیں، انھوں نے اپنی طویل و ضخیم تاریخ میں ان حقائق کا اعتراف کیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے بعد بھی، سے

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا

ستی کی رسم

ہندوستان میں مغلوں کے لیے سب سے زیادہ تلخ اور صبر آزما چیز ہندوؤں کی ستی کی رسم تھی، وہ بے انتہا روادار تھے، اور ہرگز ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ستی کی انسانیت سوز رسم کا برداشت کرنا بھی ان کے لیے ناممکن تھا، انھوں نے اس سلسلہ میں براہ راست کسی طرح کا امتناعی حکم تو نہیں دیا، لیکن اس رسم کے انجام دینے میں، اتنے پیچ ایسے لگائے کہ یہ بہت کم ہوگئی،

ڈاکٹر، برنیر جو عہد شاہجہان و عالمگیر میں کئی سال تک دلی میں شاہی ملازم کی حیثیت سے مقیم رہا، اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

آج کل پہلے کی نسبت ستی کی تعداد کم ہو گئی ہے کیونکہ مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں اس وحشیانہ رسم کو نیست و نابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں اگرچہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی قانون مقرر نہیں ہے کیونکہ ان کی پالسی (تدبیر مملکت) کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کے معاملات میں دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ مذہبی رسوم کے بجالانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں تاہم ستی کی رسم کو بعض ایچ پیچ کے طریقوں سے روکتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کوئی عورت بغیر اجازت اپنے صوبہ کے حاکم کے ستی نہیں ہو سکتی اور صوبہ دار ہرگز اجازت نہیں دیتا جب تک واقعی طور پر اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اپنے ارادہ سے ہرگز باز نہ آئے گی۔ صوبہ دار بیوہ کو بحث مباحثہ سے سمجھاتا ہے اور بہت سے وعدے وغیرہ کرتا ہے اگر اس کی فہمائش اور تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں تو کبھی ایسا بھی کرتا ہے کہ اپنے محلسرا میں بھیج دیتا ہے تاکہ بیگمات بھی اس کو اپنے طور پر سمجھائیں۔ مگر باوجود ان سب امور کے ستی کی تعداد اب بھی بہت ہے خصوصاً ان راجاؤں کے علاقوں اور عملداریوں میں جہاں کوئی مسلمان صوبہ دار نہیں ہے۔ (۱)

برنیر کا مشاہدہ

اس سلسلہ میں برنیر اپنا ایک مشاہدہ بھی بیان کرتا ہے:۔

چندی داس میرا ایک دوست تھا جو دانشمند خان کا میر منشی تھا۔ وہ تپ دق کی بیماری سے جس کا معالجہ میں نے دو برس سے کچھ زیادہ عرصے تک کیا تھا، مر گیا۔ اس کی زوجہ نے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے رشتہ دار میرے آقا دانشمند خاں کے نوکر تھے اور ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اسے اس دیوانگی کی حرکت سے باز رکھیں چنانچہ انھوں نے سمجھایا کہ گو تمھارا یہ قصد پسندیدہ اور باعث عزت اور خوشنودی خاندان اور سراسر لائق تحسین اور ہمت کا کام ہے لیکن تم کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ تمھارے بچے کم عمر ہیں اور ان کو چھوڑنا بڑی بے رحمی ہے۔ اس بیوقوف اور دیوانی عورت نے اس فہمائش کو کسی طرح نہ مانا تو ان لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ چل کر سمجھا دیں۔

چونکہ ہمارے آقا دانشمند خاں کی بھی یہی مرضی تھی اور اس خاندان سے میری دیر سے دوستی تھی اس لیے میں

---

(۱) تاریخ سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر جلد ۲ صفحہ ۱۶۲

اس کے پاس گیا جب مکان میں گیا تو دیکھتا ہوں کہ ۷-۸ بدصورت بڑھیا عورتیں اور ۴-۵ مسن اور ضعیف العقل برہمن لاش کے ارد گرد جمع ہیں اور یہ سب عورتیں باری باری روتی اور بڑے زور سے اپنے ہاتھوں سے سینہ پیٹتی ہیں یہ عورت لاش کی پائنتی بیٹھی تھی بال کھلے ہوئے تھے چہرہ زرد ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ میں اس کمبخت گروہ کے قریب گیا اور آہستگی اور نرمی کے ساتھ اس بیوہ سے کہا کہ میں دانشمند خاں کے حکم سے تمہیں اطلاع دینے آیا ہوں کہ اب تمھارے دونوں بیٹوں کے واسطے وظیفہ جاری رکھیگا بشرطیکہ تم اپنی جان تلف نہ کرو کیونکہ تمھارا جیتا رہنا بچوں کی خبرگیری اور تربیت کے واسطے از بس ضرور ہے اور تم کو خوب معلوم ہے کہ ہم طرح سے تمھارا چتا پر بیٹھنا اور ستی ہونا روک سکتے ہیں اور ان لوگوں کو جو تمھیں اس نامعقول بات کی جرأت دلاتے ہیں۔ سزا دے سکتے ہیں۔

میں نے کئی بار اس تقریر کو دہرایا لیکن اس نے مطلق جواب نہ دیا آخر کار آنکھ ملا کر یوں بولی کہ میں ستی ہونے نہ پاؤں گی تو دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاؤنگی یہ سن کر میں نے نہایت غصہ سے پکار کر کہا کہ کیا تیرے سر پر کوئی بھوت چڑھا ہے! بہت اچھا ستی ہو جاؤ لیکن پہلے اپنے بچوں کے گلے کاٹ کر ان کو اسی چتا پر جلاؤ کیونکہ ہم کو یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ تو تو ستی ہو کر اس دنیا سے چل دے اور ان کو بھوکا مرنے کیلئے پیچھے چھوڑ جائے اور میں ابھی دانشمند خاں کے پاس جاتا ہوں اور تیرے لڑکوں کا وظیفہ منسوخ کراتا ہوں۔

میرے اس کہنے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چپ ہو گئی اور فوراً سر جھکا کر گھٹنوں پر رکھ لیا پھر تو وہ بڑھیا عورتیں اور برہمن بھی دروازے کی طرف کھسک گئے اور یہ دیکھ کر مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اب اس کو اسکے رشتہ داروں کے سپرد کر کے جو میرے ساتھ آئے تھے وہاں سے چل دوں۔ چنانچہ میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر چلا آیا شام کے وقت جب میں دانشمند خاں کے پاس اس حال کی اطلاع کرنے جاتا تھا راستہ میں اس کا ایک رشتہ دار ملا اور بعد ادائے شکر بولا کہ اُس کے شوہر کی لاش بغیر اس کے جلائی گئی اور اس نے اپنی جان نہیں گنوائی۔ (۱)

---

(۱) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر جلد ۲ صفحہ ۱۱۷

ہندو مسلم تعلّقات

مسلمان حکمرانوں کی رواداریوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہندو مسلمان، بہت جلد شیر و شکر ہو گئے، انگریزوں کی فتنہ سامانیوں کے باوجود عام طور پر ہندو اور مسلمان، کھلے دِل سے ایک دوسرے سے ملتے تھے، اس لیے کہ ہندو یہ دیکھتے تھے کہ مسلمان بادشاہ، مسلمان ہونے کے باوجود، ان کے دُکھ سُکھ کا شریک ہے، ان کی چارہ سازی کرتا ہے۔ ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔ مسلمان یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندو اگرچہ ہمارے محکوم ہیں لیکن انسانیت کا رشتہ حاکم اور محکوم کے امتیاز سے بالا ہے، ان حقائق نے بعض شوریدہ سروں کی فتنہ انگیزی کے باوجود، عام طور پر ہندو مسلم تعلّقات خوشگوار رکھے، بہادر شاہ کے دور تک یعنی مغل سلطنت کے اختتام تک یہی کیفیت طاری رہی،

اس سلسلہ میں ذیل کا واقعہ خاص طور پر لائق توجہ اور قابل مطالعہ ہے:۔

(گوجرانوالہ میں) ایک تھے کرنل دھن راج وہ دیوان مول راج کے کچھ عزیز بھی تھے اور دیوان مول راج وہ جن کا پنجاب کی لڑائیوں میں نام آتا ہے کرنل دھن راج کشمیر میں کسی بڑے عہدہ پر تھے اُن کی رانی کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت تھی رانی صاحبہ نے مولانا نذیر احمد سے کہا کہ میرے بچّوں کو بھی پڑھا دیا کرو مولانا نے کہلا بھیجا کہ بچّوں کو مدرسہ میں بھیج دیا کرو رانی نے کہا کہ یہ ہماری عزت کے خلاف ہے مولانا نے کہا تو پھر ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ کر مدرسہ کا مدرسہ ہاں اٹھوا منگوایئے چنانچہ ایسا ہی ہُوا مولانا اس موقع پر فرماتے ہیں کہ اب میں مدرسہ میں بڑا خوشحال ہو چلا تھا بستر سے بہتر مسکن رہنے کو ملا کرنل صاحب کے خدمت گار ٹہل کو گھوڑے ٹٹو سواری کو دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر۔ (۱)

بہادر شاہ کا روّیہ

بہادر شاہ اگرچہ برائے نام بادشاہ تھے، اختیارات انگریزوں نے لے لیے تھے، دولت داغ مفارقت دے چکی تھی، لیکن ہندوؤں کے ساتھ، خواہ وہ امراء و رؤسا ہوں، یا غریب اور مفلوک الحال، ان کا برتاؤ وہی تھا جو ایک باپ کا اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، قلعہ کے ملازمین

---

(۱) حیات النذیر (افتخار عالم مارہروی)

میں ہندوؤں کی کافی تعداد شامل تھی مرحوم دلی کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر ٹیلر اپنی رپورٹ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

قلعہ معلیٰ میں عجیب ماجرا یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی ہیں (ایسی خدمات پر جہاں رات دن فارسی اردو کی ضرورت پڑتی تھی) سب کے سب ہندو ہیں۔ (۱)

مسٹر ٹیلر کا تعجب بجا تھا اس لیے کہ انھوں نے مسلم رواداری کا یہ منظر پہلی مرتبہ دیکھا تھا، اب ہم جستہ جستہ واقعات اس سلسلہ میں پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ بہادر شاہ کا برتاؤ ہندوؤں کے ساتھ کیسا ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا،

ہندو کی عقیدت

"حضور والا ہوادار پر سوار ہو کر پل کے راستے سے جمنا کے پار شکار کے لیے تشریف لے گئے۔ بابو سورج نرائن مختار سابق بنارس سے واپس آرہا تھا حضور کی سواری دیکھ کر سواری سے اتر پڑا اور حاضر خدمت ہو کر آداب شاہی بجالانے کے بعد پانچ روپیہ نذر کے پیش کیے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس نے نذر میں چار روپیہ پیش کیے۔ سورج نرائن نے عرض کی حضور کی قدمبوسی کو بہت دل چاہتا تھا۔ اس لیے فدوی بنارس سے حاضر ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا دربار میں حاضر ہونا۔ اس کے بعد حضور والا مراجعت فرما کر محل میں تشریف لے گئے۔ (۲)

ہندو کو خلعت دیا

"حکیم احسن اللہ خاں کے ہمراہ پنڈت نند کشور نے حاضر ہو کر نذر پیش کی حضور انور نے پانچ پارچے کا خلعت عطا فرمایا۔ (۳)

بسنت سے دلچسپی

"۲۹ تاریخ کو تمام روئے زمین پر بسنت ہوگی۔ علاقہ ذیل میں سب سے پہلے قطب صاحب میں میلہ ہوگا۔ حضور والا تخت (ہوادار) پر سوار ہو کر جھروکے

---

(۱) مرحوم دلی کالج (ڈاکٹر عبدالحق)

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری مٹ ۵ رجنوری ۱۸۴۹ء

(۳) سر طامس مٹکاف کی ڈائری مٹ

کے نیچے والی سڑک سے ہو کر قطب صاحب پہنچ گئے۔ مینا بازار کے مکان اور سڑک کا ملاحظہ کیا۔ بسنت کی سیر کی۔ اپنے بزرگوں کے مزارات پر جا کر نذر نیاز پیش کر کے ایک ایک غلاف سرش آرامگاہ۔ فردوس منزل ممتاز محل، مولوی فخر الدین اور قطب الدین وغیرہ کے مزارات پر چڑھا کر شبرکت لے کر واپس تشریف لے آئے۔ (۱)

بہادر شاہ اور ہولی

"تقریب ہولی کے سلسلہ میں حضور والا نے اہل کاروں کی نذریں قبول فرمائیں تخت کے کہاروں کو ایک اشرفی انعام میں عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا آج تمھاری چھٹی ہے۔ جاؤ گاؤ بجاؤ پیو پلاؤ پھر شکار کا ایک ہرن ایجنٹ کو بھیجا۔ (۲)

بھولا ناتھ کو خلعت

"جہاں پناہ بادشاہ سلامت نے راجہ بھولا ناتھ کو حضرت غوث الاعظمؓ کی نیاز کا انتظام کرنے کے سلسلے میں چھ پارچے کا خلعت عنایت فرمایا۔ (۳)

ہندو کا سجع

بلّب گڑھ کے راجہ کا سابق مختار عام سنپت رائے محبوب علی خواجہ سرا کی معرفت بارگاہ جہاں پناہ میں باریاب ہوا اور حضور میں چار روپے نذر کے پیش کیے۔ حضور والا نے اس کو اپنی نوکری عطا فرمائی، اور یہ سجع بھی موزوں کر کے اس کو عطا کیا۔

سری گنگا جیو سس سہائے (۴)

ہندو کے لیے سہرا

"دیوی دیال ولد کیدار ناتھ نے اپنی شادی کے سلسلہ میں چھ روپے نذر میں پیش کیے، حضور نے خلعت سہ پارچہ اور مقیشی سہرا مرحمت فرمایا۔ (۵)

دیوالی کی روشنی

"حضور نے ناظر قلعہ کو حکم بھیجا کہ دیوالی کے سلسلہ میں جمعہ سے بدھ تک زنانہ ڈیوڑھیات کی آمد و رفت بند رکھی جائے۔ حسب معمول روشنی کی جائے اور

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۳۴

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۸۱ ۱۳ مارچ ۱۸۴۹ء

(۳) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۸۹

(۴) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۹۷

(۵) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۱۵۷

پیر بخش خواجہ سرا کو قلعہ میں آنے سے نہ روکا جائے۔ (۱)

لالہ ٹھاکرداس لالہ ٹھاکرداس سابق ناظر عدالت فوجداری دارالخلافہ شاہجہان آباد کے نام شقّہ (حکم) جاری کیا گیا کہ تمہیں دو روپیہ روزانہ پر نواب یعقوب علی خاں اور زبردست خاں بہادر کے تنازع کے فیصلے کے واسطے بعہدۂ امینی مقرر کیا جاتا ہے دونوں رئیسوں کے نام خطوط لکھے گئے کہ اپنے اپنے قابل اعتماد آدمیوں کو ہمارے مقرر کیے ہوئے امین کے پاس روانہ کردو۔ (۲)

دیبی سنگھ پر اعتماد "تاج محمد خاں کے لئے فرمان صادر ہوا کہ چونکہ راجہ دیبی سنگھ سلطنت کے قدیم متوسلین میں سے ہیں، اور مفتی امداد حسین خاں کے والد کے نذر دینے کے حالات اور ان کے تقرری کے واقعات سے بخوبی واقف ہیں اس لیے ان کو اطلاع دی جائے کہ وہ بہت جلد دربار خلافت میں تمام و کمال حالات پیش کریں فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ (۳)

دفتر خاص کا ہندو محرّر دفتر خاص کا محرّر، یعنی سررشتہ دار بھی ہندو تھا، جو بادشاہ کی خدمت میں تمام کاغذات پیش کیا کرتا تھا، حتیٰ کہ حکیم احسن اللہ خاں جیسے بلند مرتبت شخص کی عرضی بھی اسی کے وسیلہ سے آتی تھی:

"لالہ شیولال محرر دفتر خاص نے حکیم احسن اللہ خاں کی عرضی پیش کی (۱)

ہندو بیوہ کی ماتم پرسی بادشاہ کا کوئی ہندو ملازم اگر مرجاتا تھا تو بہادر شاہ اس کے متوسلین کا پورا پورا لحاظ کرتے تھے، اور جو کچھ بن پڑتا تھا سلوک بھی کرتے تھے۔

"شاہی ملازم جگ جیون داس متوفی کی زوجہ کے پاس ایک دوشالہ بطور ماتم پرسی

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صـ۲۷

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۲ بکم اگست ۱۸۴۵ء

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۳ ۹ نومبر ۱۸۲۲ء

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۴

روانہ کیا گیا۔" (۱)

انتہائی اعتماد
ہندوؤں پر بہادر شاہ ہر معاملہ میں انتہائی اعتماد کرتے تھے حتیٰ کہ مذہبی معاملات کا انصرام و اہتمام بھی انہی کے سپرد کیا جاتا تھا،

"شش پارچہ و سہ رقم جواہر حضرت شاہ مرداں (حضرت علیؑ) کی نیاز کے دستر خوان اور مہندی کی تیاری کے لیے راجہ بھولا ناتھ کو مرحمت فرمائے" (۲)

نتھومل کے بیٹے
جن ہندوؤں کو، بادشاہ سے کسی طرح کا بھی تعلق تھا، جہاں پناہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے، اور خوشی و غمی کے موقع پر، ان تمام روایات کی وضعداری کے ساتھ پابندی کرتے تھے، جو ان کے معمولات میں داخل تھے،

"نتھومل تحویلدار، علاقہ حویلی سرسہ کے لڑکوں کو خلعت مرحمت فرمایا، کیونکہ یہ لڑکے اپنے باپ کے مرنے کی وجہ سے، عزاداری میں تھے، اور اب عزاداری کا زمانہ ختم ہو گیا، (۳)

گینڈامل متصدی
گینڈامل متصدی کو حکم ہوا کہ جو امرائے شاہی روزمرہ مجرے کے لیے حاضر ہوتے ہیں ان کی حاضری و غیر حاضری روزانہ ایک رجسٹر میں درج کی جایا کرے تاکہ غیر حاضر ہونے والے لوگوں کی تنخواہ بقدر غیر حاضری وضع کی جائے۔ (۴)

ہیرالال وکیل
شقہ سلطانی جاری ہوا کہ روشن آرا بیگم کے باغ اور مسر مندی کے باغ اور چاندنی محل کو نواب حسینی بیگم صاحبہ بیگم مرزا محمد سلیم شاہ بہادر مرحوم کے قبضہ سے الگ

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۲۴۔ ۱۲۔ دسمبر ۱۸۴۵ء

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۴۳۔ یکم مئی ۱۸۴۶ء

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۴۲۔ یکم فروری ۱۸۴۶ء

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۹ جنوری ۱۸۴۶ء

کرلیا جائے۔ پہلے ان سے خالی کرنے کی نسبت کہا جائے اگر وہ نہ مانیں اور خالی نہ کریں تو ہیرالال وکیل سے کہا جائے کہ عدالت عالیہ میں نالش کرنے کے لیے کارروائی شروع کردیں چنانچہ انھوں نے خالی نہیں کیا اور ہیرالال وکیل نے مقدمہ کی کارروائی شروع کردی۔ (۱)

ٹھاکرداس امین

ٹھاکرداس امین کے نام پروانہ جاری ہوا کہ شاہ پور اُونچاپور کے زمینداروں کے درمیان اپنی اپنی حدوں کے مقرر کرنے میں کچھ جھگڑا ہوگیا ہے لہٰذا فریقین کی زمینوں کی حدیں مقرر کرنی چاہئیں۔ (۲)

کنور کا لقب

کنور سالگ رام کے لڑکے کنور گوپال سنگھ کی شادی میں بادشاہ سلامت نے خلعت فرخ سیری جامہ، کمربند سہرا مقیشی روانہ فرمایا اور کنور کا لقب دیا اور حکم دیا کہ شاہی خرچ سے کنور گوپال سنگھ کی شادی کا جلوس شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ نکالا جائے بادشاہ سلامت کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ رعایا کے ساتھ ہر موقعہ پر انعام و اکرام کا سلوک فرماتے رہتے ہیں۔ (۳)

ہندو شادی کے انتظامات

ہندو، خواہ وہ قلعہ کے متوسلین میں ہوں، یا نہ ہوں، ضرورت کے وقت بہادرشاہ کے پاس آتے تھے، اور گل آرزو سے دامن مراد بھر کر واپس جاتے تھے،

"کنور دیبی سنگھ نے اطلاع دی کہ حضور مجھے اپنے بھتیجے کی شادی کے لیے کچھ ضروری سامان، نیز چند چپراسیوں، اور چوبداروں کی ضرورت ہے،

حکم ہوا درخواست کے مطابق انتظام کیا جائے۔ (۴)

---

(۱) بہادرشاہ کا روزنامچہ صفحہ ۴۸

(۲) بہادرشاہ کا روزنامچہ صفحہ ۵۳۔ یکم مئی ۱۸۴۷ء

(۳) بہادرشاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۰۶۔ ۱۲ مارچ ۱۸۴۷ء

(۴) بہادرشاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۲۱۔ ۲۔ فروری ۱۸۴۷ء

بھولا ناتھ کو انعام چونکہ راجہ بھولا ناتھ نے حضور پیران پیر غوث الاعظم دستگیر کے عرس کے فرائض کو بخوبی کے ساتھ انجام دیا تھا اس لیے بادشاہ نیک خیال و نیک پسند نے انھیں خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر مرحمت فرمائے۔ (۱)

دیبی سنگھ کی دل دہی کنور دیبی سنگھ سے ارشاد ہوا کہ تم جس طرح سے مرزا محمد شاہ رخ بہادر مرحوم کی حین حیات میں ہمدردی اور وفاداری کے ساتھ ان کے کاروبار کا انتظام کرتے تھے اب بھی اسی طرح اپنے فرائض کو انجام دیتے رہو اور اپنے معمول میں دستور قدیم کی نسبت کوئی فرق نہ آنے دینا۔ (۲)

سلوک شاہانہ بہادر شاہ کے حسن سلوک کی کوئی انتہا نہ تھی، ان کا برتاؤ، پست و بلند سب کے ساتھ یکساں تھا،

"رام دیال گوجر کے مرنے کے بعد اس کی زوجہ کو ماتم پرسی کے طور پر جہاں پناہ نے ایک دوشالہ عطا فرمایا۔ (۳)

ہندوؤں پر نظر عنایت "کنور سالگرام کو امین بخشی گری کا عہدہ اور خلعت شش پارچہ اور سہ رقم جواہر ان کے لڑکے کنور گوپال سنگھ کو خلعت پنج پارچہ و سہ رقم جواہر اور فخر الملک بہادر کے پیش کار راجمید اس کو خلعت چہار پارچہ سہ رقم جواہر اور مرزا قطب الملک کا عہدہ عطا فرمایا اور گوبند پرشاد کو مرزا شمس الملک کی پیشکاری کے عہدہ کی تقریب میں خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر سے معزز فرمایا۔ (۴)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۲۸ ۲۲ اپریل ۱۸۴۷ء

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۳۰ ۲۳ اپریل ۱۸۴۷ء

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۴۳ ۱۳ مئی ۱۸۴۷ء

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۲۲ ۱۳ اپریل ۱۸۴۷ء

ہندو کی وجہ سے جرمانہ اور عتاب

اگر کسی ہندو سے ، ناروا ، رود کد یا پوچھ گچھ ہوتی تھی ، تو جہاں پناہ متعلقہ عہدے داروں کو سزا دیتے تھے اور وہ عتاب شاہی کے ہدف بنتے تھے ،

"کنور ہیش داس خلف راجہ سوہن داس کے نذرانہ کو شرف قبولیت عطا کیا گیا ، اور ان کے بھائی درگا پرشاد کو قلعہ معلیٰ میں حاضر ہونے کی اجازت دی گئی ، جس سپاہی نے انھیں آنے سے روکا تھا اس پر جرمانہ اور عتاب ہوا ، (۱)

مدن گوپال

"مرزا محمد شاہرخ بہادر مرحوم کے پیشکار مدن گوپال متصدی کو عہدہ دیوانی اور گنگا داس کو عہدہ پیشکاری پر ترقی دی گئی ، اور خلعت عطا فرمایا - (۲)

راکھی کا میلہ

"حضور انور نے راکھی سلونوں کے میلہ کے تقریب میں راجہ بھولا ناتھ کو ۱۵۰ روپیہ اور تخت خاص کے کہاروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی - (۳)

دیوالی کی تعطیل

"دیوالی کے دن ہندوؤں نے مٹی کے کھلونے اور مٹھائی حضور انور کی خدمت اقدس میں پیش کی جسے حضور نے شرف قبولیت مرحمت فرما کر دیوالی کی تعطیل کا حکم سنا دیا - (۴)

خلعت سوگواری

"کالکا داس فوت ہو گیا اس کے لڑکوں کو خلعت سوگواری مرحمت کیا گیا اور ان کے چار تانے ایک سو روپیہ میں خرید فرمائے - (۵)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ، صفحہ ۱۴۲ ، ۱۸ ، جون ۱۸۴۷ء

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۴۰ ، ۱۸ ، جون ۱۸۴۷ء

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۵۶ ، ۲۴ ستمبر ۱۸۴۷ء

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۸۴ ، ۳۰ دسمبر ۱۸۴۷ء

(۵) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۸۶ ، ۳۰ ، مارچ ۱۸۴۸ء

لالہ شوقی رام وکیل کی قدر افزائی

لالہ شوقی رام وکیل کو خلعت شش پارچہ سہ رقم جواہر اور دو سو روپیہ خرچ راہ کے لیے عنایت کیے گئے اور انکے محرر کو بھی خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا اور وکیل صاحب کو چار ہاتھی چار اونٹ چار سوار چار بہرہ دار سپاہی اور آٹھ کہار اور ایک ایک چوبدار فراش۔ سقہ خاکروب ہرکارہ وغیرہ معین کر کے صاحب عالی بہادر کے لشکر میں جانے کے لیے رخصت کر دیا۔(۱)

ہندو مسلم ملاپ

بہادر شاہ، اور ان کے پیش رو سلاطین کے اس روادارانہ طرز عمل نے: ہندوؤں اور مسلمانوں میں، دوستی، اور خلوص کے روابط پیدا کر دیئے تھے، پادری سی الیف اینڈ ریوز نے، بالکل صحیح اور درست تحریر فرمایا ہے کہ:-

" ان دنوں میں یہ عام بات تھی کہ دونوں فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں شرکت کیا کرتے تھے، ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں شامل ہوتے تھے اور مسلمان ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ قدرتی طور پر ایک مقامی رسم ہو گئی تھی اور کوئی شخص بھی سوائے سخت محتاط اور متشدد عقیدہ رکھنے والوں کے ایسے دوستانہ مراسم پر حرف گیری نہیں کرتا۔

مسلمان بعض ہندو جوگیوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مغلیہ زمانہ کے بعض مشہور تصاویر میں بادشاہ اور اس کے دربار کے امرا بعض ایسے مقدس آدمیوں کی زیارت کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ہندو بھی اپنے طور پر ایک مشہور و معروف مسلمان بزرگ کے مزار پر جو دہلی کے قریب واقع ہے۔ دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے دعا مانگنے کی غرض سے باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر سلطان نظام الدین اولیا کے مزار پر بھی ہندو برکات حاصل کرنے کی غرض سے حاضری دیا کرتے تھے۔

اسی طرح ہندو مصنفین جو اردو علم و ادب میں بہت مشہور ہو گزرے ہیں اور جو اپنے فارسی کے علم پر فخر کیا کرتے تھے۔ اپنی ادبی تحریرات کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سے کیا کرتے تھے اور یہ ایک اعتبار سے نئی بات تھی۔ ہندوؤں کے بچے مساجد سے ملحقہ مکاتب میں کثیر تعداد میں جایا کرتے تھے اور وہ وہاں عربی اور

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ سنہ ۳ - ۱۲ نومبر ۱۸۴۵ء۔

فارسی دونوں پڑھتے تھے، فارسی زبان شاعری کی زبان کی حیثیت سے انھیں خصوصیت کے ساتھ محبوب تھی اور فارسی کی یہ روائت آج بھی دہلی کے بہت سے ممتاز ہندو گھرانوں میں اسی طرح سے چلی آرہی ہے، ہندو اپنی تحریرات کو حافظ وغیرہ کے کلام سے مزین کیا کرتے ہیں، اور اپنی گفتگوؤں میں بھی فارسی شعرا کا کلام پڑھا کرتے تھے۔ غالباً اسی فارسی زبان کے وسیلہ سے دہلی کے ہندو اسلامی تصوف سے واقف ہوئے جو رد حانی مطمح نظر کے اعتبار سے خود ان کے فلسفۂ ویدانت سے ملتی جلتی چیز تھا۔

ہندوؤں کے تہواروں کے موقع پر ہندو گھرانوں کے بچے مساجد کے مکتبوں کے اساتذہ کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لایا کرتے تھے۔ وہ اپنے استادوں کو اپنے گھروں میں دعوت دے کر بلاتے تھے تاکہ وہ بھی ان کی مسرتوں میں شریک ہوں اور ایسے دعوت نامے بڑی خوشی اور باقاعدگی سے قبول کیے جاتے تھے اسی طرح مسلمان بھی ہندوؤں کے مذہبی تہواروں کا ذکر بڑے احترام سے کرتے تھے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ وہ ہندو رسوم کے خلاف کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے ان کی دل آزاری ہو۔

معاشرتی تقریبات کے مواقع پر مثلاً شادی بیاہ میں وہ لازمی طور پر اپنے ہندو دستوں کو تحفے تحائف بھیجتے تھے اور ان سے درخواست کرتے تھے کہ وہ آئیں اور شادیوں میں شرکت کر کے انھیں عزت بخشیں وہ دولہا دلھن کو مبارک باد دیتے اور انھیں اپنی طرف سے تحفے تحائف نذر کرتے۔ عام خوشی کے موقع پر بھی مثلاً عید رمضان کے موقع پر ہندو اپنے مسلمان دوستوں کو مبارک باد کے خط بھیجا کرتے تھے اور مسلمان نہایت محبت بھرے انداز میں ان کا جواب دیا کرتے تھے مختلف مذہب کے پڑوسیوں کے ساتھ پرامن طریقہ سے رہنے کا فن بہت بلند سطح پر پہنچ گیا تھا،

بوڑھے شہنشاہ بہادر شاہ ان امور میں اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک تکالیف رسمی کے نہایت پابند رہے وہ اپنے شاہی ہاتھیوں پر سوار ہو کر جن پر زر بفت کی جھولیں پڑی رہتی تھیں۔ جلوس کی شکل میں گزرتے اور بعد میں قلعہ کے مثمن برج میں بیٹھ جاتے، ہندوؤں کے بڑے تہواروں اور مسلمانوں کی بڑی تقریبوں کے موقعوں پر نیچے کے مجمع کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ مجمع انھیں دیکھ کر آداب بجا لاتا اور اس طرح سے خیر سگالی کے جذبات بہت کچھ ترقی پاتے ان موقعوں پر بادشاہ اپنی طبع زاد غزلیں سنایا کرتے تھے اور پبلک زور شور سے ان کی

دادد یتی تھی،

مغل شاہزادے بھی ان تہواروں پر جبکہ سارا شہر تعطیل مناتا ۔اعلیٰ درجے کے سجے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر کے بازاروں کا گشت کرتے تھے ۔ (۱)

اس فضا اور ماحول کا قدرتی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ رعایا کے دونوں بڑے طبقے —— ہندو اور مسلمان —— یہ باور کر لیں کہ اس ملک میں دونوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد، ساتھی، اور غمگسار بن کر رہنا ہے، اور جب تک بہادر شاہ کا سایہ قائم رہا، یہ احساس شدت کے ساتھ دونوں قوموں میں پرورش پاتا رہا، چنانچہ، پادری سی الیف اینڈ ریوز فرماتے ہیں :۔

" دہلی کے قدیم باشندوں میں سے جو لوگ ہندو تھے ۔ جب میں ان کے پاس اطلاع حاصل کرنے کی غرض سے گیا، انھوں نے خود بغیر کسی پس و پیش کے مجھ سے یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاؤ ان کے فرقہ کے ساتھ بہت اچھا تھا اور اس سلسلہ میں انھیں کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی مابعد کے ایام کی یہ تمام آسودہ خاطری صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور دوسرے امور میں مغل شہنشاہوں کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے ۔لیکن وہ بجا طور پر اس نیک نامی کے حقدار ہیں کہ وہ مذہبی تعصب پر غالب آ گئے تھے ۔ اور اس بنا پر اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک کریں اور غیر جانب دارانہ انصاف کریں نیز انھوں نے شاہی دربار کے مسلمان امراء پر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے احساسات و جذبات کا انکی ہی طرح خیال رکھیں ۔اگرچہ جاہل اور ان پڑھ عوام میں مذہب کی کسی توہین کے سلسلہ میں کبھی کبھی فسادات ہو جاتے تھے ۔تاہم یہ تنازعات سوسائٹی کے اس مخصوص طبقہ سے کبھی آگے نہیں بڑھتے تھے اور جو دشمنی اس طرح سے پیدا ہو جاتی تھی ۔وہ آسانی کے ساتھ دبا دی جاتی تھی مغل شہنشاہ جانتے تھے کہ صلح و آشتی کس طرح سے قائم رکھیں ۔ (۲)

---

(۱) ذکا اللہ دہلوی (سی الیف اینڈ ریوز) ص۴۲

(۲) ذکا اللہ دہلوی (از سی الیف اینڈ ریوز) ص۴۶

باب

بہادر شاہ اور انگریز

توہین، بے رخی، شرارت اور بے مروتی

شروع شروع میں یہ کیفیت تھی کہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کرتے تھے، لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی ان کا فدوی خاص ہونے پر نازاں رہتا تھا، انگریز ریذیڈنٹ، مکاتیب میں اپنے آپ کو بادشاہ کا "فرزند" لکھتا تھا، اور اس اعزاز پر خوشی سے جامہ میں پھولا نہیں سماتا تھا،

پھر یہ نوبت پہونچی کہ نذر بند ہوگئی، اعزاز والقاب نظر انداز کیے جانے لگے، فرزند دلبند نے، فرزندی سے اور فدوی خاص نے، فدوی ہونے سے باقاعدہ انکار کر دیا۔ بادشاہ کے شقے اور رقعے جاتے تو انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا، بادشاہ کے مطالبات نظر انداز کر دیئے جاتے، بادشاہ کی شاہزادوں کی شاہی ملازموں کی اشتعال انگیزی کی حد تک توہین کی جاتی کوئی بات نہ مانی جاتی، ہر بات پر اپنی بات بالا رکھی جاتی ۔

ان واقعات کو دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا ہے، جیسے انگریز خود یہ چاہتے تھے کہ بادشاہ کو "بغاوت" پر مجبور کر دیں، اور جب وہ بغاوت کرے، تو اس کی گردن قلم کر دیں، انگریز اپنے اصول، تہذیب اور رکھ رکھاؤ پر فخر کرتے ہیں، لیکن بہادر شاہ کے معاملہ میں انہوں نے ہر چیز بالائے طاق رکھ دی تھی، بہادر شاہ کو وہ اپنے لیے مستقل درد سر سمجھنے لگے تھے۔ اور اس درد سر سے چھٹکارا پانے کے لیے وہ کسی رکیک، مبتذل اور چھچھوری حرکت سے دریغ نہیں کرتے

تھے۔

ذیل میں اس داستان کے کچھ ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں ؎
انہیں افسانۂ غم ڈرتے ڈرتے
سنایا کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

ذاتی معاملات میں فرنگی مداخلت "ایجنٹ بہادر کی تحریر آئی۔ کہ حضور نے بابو سورج نرائن کو مختار کار بنایا ہے۔ اس کی فضول خرچی سے حضور قرضدار ہو جائیں گے۔ حضور قرض کیوں لیتے ہیں۔ آمدنی کے موافق خرچ رکھیں۔"(۱)

بہادر شاہ اور انگریز "۲۷ مارچ حضرت ابوظفر بہادر شاہ قلعہ دہلی میں رونق افروز ہیں معظم الدولہ صاحب کلاں ایجنٹ بہادر کا معروضہ بارگاہ جہاں پناہ میں پیش کیا گیا۔ جس میں لکھا تھا کہ شاہجہاں کے بھائی مرزا سلیم جہانگیر مرحوم کی بیوہ حسینی بیگم نے ایک عرضی ولایت لندھن (لندن) کو بھیجی تھی۔ کہ باغ روشن آرا و سرہندی میرے شوہر کی طرف سے میرے گذارے کے لیے واگذاشت تھا۔ مگر دہلی کے بادشاہ اور انگریزی کے ایجنٹ نے مل کر میرے مذکورہ باغ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس عرضی کی نسبت پیشگاہ عدالت العالیہ صاحبان کورٹ آف ورکنز (غالباً وارڈز) انگلستان سے حکم آیا ہے کہ باغ مذکور حسب حال فنا ہی قبضہ میں رہے۔ مگر بیگم مذکور کے گذارے کے لیے بادشاہ دہلی تنخواہ مقرر کر دیں۔

حضور جہاں پناہ نے یہ معروضہ سننے کے بعد ارشاد فرمایا۔ بیگم مرزا سلیم کی تنخواہ مقرر کر دی جائے اس کے بعد حضور پُر نور نے حکم دیا کہ ایجنٹ بہادر کے نام ہ بدولت کی طرف سے ایک شقہ لکھا جائے کہ لفٹنٹ گورنر آگرہ نے ما بدولت اور ہمارے خاندان کی تنخواہوں

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲

کے اضافے کی نسبت اور ہمارے قرضے کی ادائیگی کے بابت جو مراسلہ بھیجا ہے۔ اس کی انگریزی اور فارسی نقل لکھ کر ہمارے ملاحظہ میں پیش کی جاتے۔

معظم الدولہ صاحب کلاں ایجنٹ کمشنر بہادر دہلی۔ دام ظلہ، ہر روز کار سرکار کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ ایک شقہ حضور جہاں پناہ کا صادر ہوا تھا۔ اور مرزا سلیم مرحوم کی بیوہ حسینی بیگم کے چند خطوط بھی آئے تھے۔ جن میں لکھا تھا کہ میری عرضی کے جواب میں لندن سے حکم آیا تھا کہ باغ روشن آرا، سرہندی چونکہ شاہ دہلی نے مجھ سے لے لیا ہے اس لیے بادشاہ دہلی میرے روٹی کپڑے کے لیے حین حیات تنخواہ مقرر کر دیں۔ مگر بادشاہ سلامت کہتے ہیں کہ حسینی بیگم کے پاس بہت سا چاندی سونا ہے۔ میں ان کی تنخواہ مقرر نہیں کروں گا۔

حسینی بیگم نے لکھا ہے کہ مذکورہ باغ میرے قبضہ میں دیا گیا تھا۔ اگر بادشاہ نے میری تنخواہ مقرر نہ کی تو میں بادشاہ پر اپنے مہر کا دعوی کر دوں گی۔ (۱)

بہادر شاہ سے کیفیت طلب کی گئی

"مرزا ولی عہد مرحوم کے لڑکوں اور لواحقین کی تنخواہ کی نسبت جو آگرے کو لکھا گیا تھا اس کا جواب آگرے سے آیا ہے کہ ایک ہزار پانچ سو روپیہ ماہوار ولی عہد مرحوم کے لڑکوں اور لواحقین کے مقرر کیے گئے ہیں۔ لہذا بادشاہ کی تنخواہ سے ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار ان لوگوں کو دلاتا ہیں۔

آگرے سے یہ بھی دریافت کیا گیا ہے کہ بادشاہ سلامت نے کن اختیارات کے بموجب ولی عہد مرحوم کا اسباب نیلام کرایا۔ اسکی کیفیت بھی بادشاہ سے دریافت کر کے لکھی جائے۔ (۲)

ایجنٹ کا اعتراض

" صاحب ایجنٹ نے مرزا تیمور شاہ کے لکھنؤ جانے پر اعتراض کیا۔ (۱) پر اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا: کہ جب شاہزادوں کا اطراف ہند میں

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۱۱۱

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۱۱۳

جانا اور مختلف رئیسوں سے بغیر اجازت کے ملنا پسندیدہ عمل نہیں ہے تو مرزا تیمور شاہ لکھنؤ کیوں گئے۔ ان کو فوراً واپس آ جانا چاہیئے ۔ (۱)

ہاتھی کے دانت

صاحبان کورٹ آف ڈائرکٹرس کا نصب العین یہ امر ہے کہ تمام خاندان تیموریہ کے ساتھ اور بالخصوص حضور والا کی ذات ستودہ صفات کے ساتھ بدرجہ غایت مراعات و آرام رسانی کا برتاؤ اختیار کیا جائے ۔ (۲)

بہادر شاہ اور فرنگی

لارڈ ڈل ہوزی گورنر جنرل تھے۔ جس کا عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے یادگار ہے بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے سالگرہ مبارک اور نوروز وغیرہ جشنوں کے موقع پر پیش کی جاتی تھی ۱۸۴۳ء سے لارڈ ایلنبرا نے بند کر دی تھی وہ انگریز آخری مرتبہ یہ نذرانہ پیش کرنے گیا تھا اس کا بیان ہے کہ جس وقت میں نے دربار میں قدم رکھا تو مجھ پر عجیب قسم کی ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ نئے گورنر جنرل کو اس رسم کی اطلاع نہ تھی۔ جب خبر ملی تو بہت متعجب ہوئے۔ اور ہمیشہ کے لیے اس دستور کو موقوف کر دیا۔ فرمانروائے دہلی کا نام سکہ پر نقش ہوتا تھا۔ وہ ۱۸۳۵ء سے بند ہوا۔ گورنر جنرل کی مہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ خارج کیے گئے۔ اور ہندوستانی رئیسوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ بھی اپنی اپنی مہروں سے بادشاہ کی نسبت اس قسم کے بے معنی الفاظ خارج کر دیں ۔ (۳)

شکوہ و شکایت

یکم جنوری ۱۸۴۹ء حضور بادشاہ سلامت قلعہ میں رونق افروز ہیں۔ مزاج مبارک بخیر ہے ۔

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۰۰

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ

(۳) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

حضور بادشاہ سلامت نے لفٹنٹ گورنر آگرہ کو اپنا ادب و احترام نہ ہونے کی شکایت لکھی تھی۔ جواب آیا سب انگریزوں کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ کہ شاہی محل کے نیچے قدیمی سڑک پر جس کا آمنا سامنا حضور سے ہو جائے گا۔ وہ شاہی آداب بجا لاتے گا۔ اس تحریر سے حضور خوش ہو گئے۔ (۱)

انگریز تعظیم شاہی سے مستثنیٰ تھے

۱۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء معظم الدولہ بہادر کی اس مضمون کی عرضی پیش ہوئی کہ لاجپورہ کے چھاؤنی کے افسروں سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ جب بادشاہ سلامت کی سواری درگاہ قطب صاحب کی طرف جا رہی تھی تو کپتان سالاک صاحب بھی کہیں اُس راستہ سے گذر رہے تھے شاہی چوبداروں اور سپاہیوں نے زبردستی ان کو گھوڑے سے اتار دیا اور پیادہ کر کے کہا شاہی آداب ملحوظ رکھو اور سلام مجرا بجا لاؤ اُنہوں نے ہر چند کہا کہ جب سے راس صاحب بہادر کا مقدمہ ہوا ہے صدر دفتر سے فیصلہ ہو گیا ہے کہ انگریزوں کو اثنائے راہ میں بادشاہ سلامت کی تعظیم و تکریم کے لیے مجبور کرنا نہایت نا زیبا ہے کیونکہ اس سے بادشاہ سلامت کی کسرشان ہوتی ہے مگر کسی نے ایک نہ سنی ایسے لوگوں کو سزا دینی چاہیئے کہ پھر کبھی اس قسم کی نامناسب حرکت کے مرتکب نہ ہوں یہ سنکر بادشاہ سلامت نے اسد علی خان کپتان اور آغا حیدر ناظر کو طلب فرما کر حکم دیا کہ تحقیقات کر کے رپورٹ کرو تاکہ زیادتی و ظلم کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ (۲)

ہدایات کی ایجنٹ کو اطلاع

بادشاہ سلامت دہلی کے قلعہ میں رونق افروز ہیں۔ لالہ زور آور چند مختار کار کو سبکدوش کر کے اس

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص ۳

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۸

کی جگہ بابو سورج نرائن کو مقرر فرما کر ۵ مختار کاروں کا خلعت مرحمت فرمایا۔ چوبدار اور ہرکارے اور پہرے کے سپاہی معزول شدہ مختار کے گھر سے اٹھوا کے جدید مکان پر تعینات فرمائے گئے۔ اس موقوفی اور اس بحالی کی اطلاعی تحریر ایجنٹ کو بھیج دی گئی ۔ (۱)

آپ بادشاہ نہیں ہیں

بھرت پور کی فتح کے ایک برس بعد گورنر جنرل نے ممالک مغربی میں دورہ کیا اور دلی میں آیا اس نے یہاں کے بادشاہ کو لکھ دیا کہ آپ بادشاہ نہیں ہیں سرکار کمپنی ہندوستان کی بادشاہ ہے اور تمام فرمان اس کے فرمان پر ہیں ایک بڑا دربار کیا جس میں تمام راجا بابو اکٹھے ہوئے اور نذریں اس کو دیں ۱۸۲۷ء میں وہ اول ہی دفعہ شملہ پر گیا اور اس کی تقلید میں یہ پہاڑ موسم گرما میں برٹش گورنمنٹ کے لیے ارم بن گیا اس گورنر کے عہد میں دولت سرکار میں بڑا گھاٹا آیا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے جو خزانوں میں روپیہ چھوڑا تھا وہ سب خرچ ہو گیا بجائے توفیر آمدنی میں نقصان آگیا قرض کا دس کروڑ روپیہ بڑھ گیا اس قرض کی چوتھائی شاہ اودھ کے خزانے سے حاصل ہوئی تھی اور بہت سے ہندوستانی رئیسوں نے یہ روپیہ قرض دیا تھا ۔ (۲)

سوال و جواب

۲ فروری ایجنٹ بہادر کو تحریر بھیجی کہ ولی عہد کی تنخواہ پانچ ہزار پانچ سو روپیہ ماہوار بدستور شاہی تنخواہ میں شامل کر کے بھیجی جایا کرے جواب آیا کہ جب تک صدر عالی یعنی لفٹنٹ گورنر بہادر کا حکم نہیں آئے گا اس وقت تک ولی عہد کی تنخواہ بطور امانت رہے گی ۔ (۳)

ایجنٹ کی بات پوری ہوئی

صاحب ایجنٹ نے ایک چٹھی مجسٹریٹ کلکٹر کے نام بھیجی کہ ساڑھے پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ ولیعہدی

---

(۱) سرطاس مشکات کی ڈائری صلا

(۲) تاریخ ہند (عہد انگلشیہ) از ذکاء اللہ صفحہ ۶۴

(۳) سرطاس مشکات کی ڈائری صفحہ ۲

خزانے میں امانت رکھے۔ اور باقی زر تنخواہ بادشاہ کو بھیج دے ۔ (۱)

اطمینان سے مرنے کی اجازت بھی نہیں

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ شہنشاہ بہادر بیمار ہو گئے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔ برطانوی ایڈمنسٹریٹر نے صرف اس خیال سے کہ کہیں شہنشاہ کا انتقال ہوتے ہی حصول تخت کے لیے شہزادوں میں باہمی تنازعات شروع نہ ہو جائیں قلعہ کے دروازوں پر سپاہیوں کی ایک پلٹن بٹھا دی۔ جنہیں یہ احکام دیئے گئے تھے۔ کہ وہ ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ اور نہ کسی اور طرح سے مداخلت ہی کریں۔ قاصر کے ملازمین نے بوڑھے بیمار بادشاہ کو اس واقع کی اطلاع دے دی جب انہوں نے یہ خبر سُنی تو برطانوی کمشنر کے نام جو شہر کے باہر رہا کرتا تھا۔ یہ پروقار درخواست لکھ کر بھیجی۔ جناب عالی کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ میری لاش انگریزوں سے جنگ کرے گی۔ کیا مجھے اطمینان و سکون کے ساتھ مرنے کی بھی اجازت نہیں ہے ؟

جب کمشنر کو یہ پیغام ملا۔ اس نے معذرت کے ساتھ سپاہیوں کی پلٹن کو فوراً واپس بلا لیا۔ اور بوڑھا شہنشاہ تن تنہا چھوڑ دیا گیا ۔ (۲)

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے ؟

رستم علی خواص اور غربا وغیرہ ملازمان ولی عہد مرحوم نے تنخواہ نہ ملنے کی نالش ایجنٹ بہادر سے کی حضور والا کو اطلاع ملی تو نالش کرنے والوں کو حوالات میں بھیج دیا اور ایجنٹ بہادر کے نام تحریر بھیجی کہ ان لوگوں نے ہمارے خلاف جو عرضی آپ کو دی ہے وہ ہمارے ملاحظے کے لیے بھیج دیجئے۔ ایجنٹ بہادر کی جوابی تحریر آئی کہ حضور بالا نے جو عرضی دینے والوں کو عرضی دینے

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ

(۲) ذکاء اللہ دہلوی دسی ایف اینڈریوز) صفحہ ۵۹

کے جرم میں قید کر دیا ہے۔ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ تحریر پڑھ کر حضور نے ان کو چھوڑ دیا۔(۱)

بادشاہ کی بے وقری

یکم اگست ۱۸۴۵ء دوا خانہ کے داروغہ نے آکر عرض کیا کہ شاہی ملازم جب قند اور شکر لینے کے لیے شہر میں جاتے ہیں تو چنگی کے ملازم باز پرس کر کے پریشان کرتے ہیں۔ قلعہ دار کو حکم دیا گیا کہ چنگی کے افسر کو چھٹی لکھ دو کہ معافی کے پروانے موجود ہیں پھر یہ مزاحمت خواہ مخواہ کیوں کی جاتی ہے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ (۲)

ایجنٹ کی باز پرس بادشاہ سے

۶ مارچ بادشاہ سلامت لال قلعے میں تشریف فرما ہیں۔ ایجنٹ بہادر کا چپراسی حاضر ہوا۔ یہ عرض کیا صاحب ایجنٹ بہادر نے دریافت کیا ہے کہ ایجنٹ اور کپتان قلعہ کی اجازت کے بغیر مسمیٰ کٹی عیسائی قلعے کے اندر آیا تھا وہ کس طرح حضور میں باریاب ہو سکا۔ ایجنٹ کا پیام سنکر حضور والا نے بابو سورج نرائن سے کٹی عیسائی کا حال معلوم کیا۔ اور ایجنٹ کے چپراسی کی زبانی جواب بھیجا کہ کٹی عیسائی بابو سورج نرائن کا ملازم ہے۔ بابو نے قلعہ کے مکانوں کی سیر کرانے کے لیے اسے بلایا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت نے اپنے نمائندے کی زبانی ایجنٹ کو کہلا بھیجا۔ اور بابو سورج نرائن نے خود ایجنٹ کی کوٹھی پر جاکر کٹی کا حال کہہ دیا۔ اور یہ بھی عرض کر دیا کہ اب عیسائی مذکور حضور والا کی ملازمت کا امیدوار ہے۔ ایجنٹ بہادر نے کہا آئندہ کٹی قلعہ کے اندر آمدورفت نہ رکھنے پائے۔ بات یہ تھی کہ ولی عہد کے متعلق جو انگریزی میں نوشت خواند ہوئی تھی۔ کٹی اس کو طول میں ڈالنا چاہتا تھا۔ (۳)

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صلا
(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۲۱
(۳) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۶

بادشاہ غالب کو رہا نہ کرا سکے

۲ جولائی ۱۸۴۷ء مرزا اسداللہ خان غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اُس کا فیصلہ سنا دیا گیا مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی اور اگر وہ دو سو روپیہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر ۵۰ روپیہ زیادہ ادا کر دیں تو مشقت معاف ہو سکتی ہے جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل ہیں سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کوکھنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت و مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے امید کی جاتی ہے کہ سشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے معمولی سے جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے ۔ (۱)

انگریز ایجنٹ کے شرائط

کچھ عرصہ ہوا حضور بادشاہ سلامت نے انگریزی سرکار سے دو درخواستیں کیں تھیں تنخواہ بڑھا دی جائے ۔ کیونکہ بادشاہ کی تنخواہ کم ہے خرچ پورا نہیں ہوتا ۔ اور دوسری یہ کہ بادشاہ کے ذمہ جو قرضہ ہے وہ ادا کر دیا جائے ۔

آج لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ نے ان درخواستوں کا حسب ذیل جواب بھیجا ہے ۔ جس میں سات شرطیں لکھی ہیں ۔ کہ اگر یہ شرطیں منظور کر لی جائیں تو حضور کی تنخواہ میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا ۔ اور قرض بھی ادا کر دیا جائے گا ۔

---

(۱) بہادر شاہ کا روز ناچہ ص ۱۵۴

پہلی شرط یہ ہے کہ حضور والا کے اور شاہزادوں کے اور بیگمات کے اور تمام تیموری خاندان کے جس قدر دیہات اور جاگیریں، باغ اور کنویں اور مکانات ہیں سب انگریزی سرکار کے حوالے کر دیے جائیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جو جائداد مذکورہ اشخاص انگریزی سرکار کے حوالہ کریں گے۔ تو وہ اگر کبھی حضور والا واپس مانگیں گے تو وہ واپس نہ کی جائے گی۔ ایسی صورت میں حضور کے ذمّے تخمیناً چار لاکھ کا جو قرضہ ہے وہ انگریزی سرکار کی طرف سے ادا کر دیا جائے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حضور والا نے اپنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار کی تنخواہ میں سے اپنے شہزادوں اور بیگمات اور خاندان والوں کی جو تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں اور جن میں حضور والا اضافہ کرانا چاہتے ہیں۔ یہ اس شرط سے منظور کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ شخص مر جائے گا۔ جس کی کوئی تنخواہ تھی۔ اور جس پر اضافہ ہوا تھا۔ تو وہ تنخواہ اور اضافہ دونوں بحق سرکار انگریزی ضبط ہو جائیں گے۔ مرنے والے کے وارثوں کو کچھ نہیں دیا جائے گا۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ ہر مہینے تیموریہ خاندان کی حیات و ممات یعنی پیدا ہونے والوں اور مرنے والوں کا ایک نقشہ انگریزی سرکار میں بھیجنا ہوگا۔ تاکہ ہر شخص کی موت کے بعد اس کی تنخواہ ضبط کی جا سکے۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ حضور والا نے لکھا ہے کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ اور بہادر شاہ کی اولاد کے علاوہ دوسرے ستر شہزادے قلعے کے اندر رہتے ہیں، اضافہ تنخواہ کے بعد ۷۰ شہزادوں کو قلعے سے باہر کر دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان سب لوگوں کو بھی قلعے سے نکال کر دیا جائے گا جو مذکورہ ستر آدمیوں کے علاوہ شاہ عالم سے پہلے بادشاہوں کی اولاد میں ہیں اور بکثرت قلعے کے اندر آباد ہیں۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ شاہی خرچ سے قلعہ کے اندر ایک انگریزی تعلیم کا اسکول جاری کرنا ہوگا۔

ساتویں شرط یہ ہے کہ قلعہ کی عمارتوں کی مرمت اور تنخواہوں کی تقسیم آئندہ ایجنٹ بہادر

کی معرفت ہوا کرے گی ۔

ایجنٹ بہادر نے گورنر بہادر کے اس شرائط نامہ کی نقل اپنے آفس میں رکھ لی ۔ اور اصل خط کا لفافہ اپنی تحریر کے ساتھ حضور والا کی خدمت میں بھیج دیا ۔ روز نامچہ نویس لکھتا ہے کہ افواہ ہے کہ حضور والا کو شرائط مذکور منظور نہیں ہیں ۔ دیکھئے آئندہ کیا جواب دیا جاتا ہے۔ (۱)

بادشاہ سے گستاخی

۲۰ اکتوبر ۱۸۴۶ء بادشاہ سلامت سیر و تفریح اور شکار کی غرض سے دریائے جمنا کی طرف تشریف لے گئے تھے ۔ آتے جاتے وقت ملازمان شاہی کے ساتھ پل کے پہریداروں نے روک ٹوک کی اس لیے بادشاہ سلامت نے قلعہ کے پہریدار کے نام یہ حکم جاری کیا کہ ملازمین شاہی کے ساتھ یہ طرز عمل بالکل نامناسب ہے، متعلقہ افسر کو لکھ دیا جائے کہ وہ عملہ کے ماتحت لوگوں کو ہدایت کر دے کہ آئندہ بادشاہ سلامت کے آدمیوں کے ساتھ پل پر آتے جاتے وقت مزاحمت نہ کی جائے ۔ (۲)

بہادر شاہ اور انگریز

حضور بادشاہ سلامت لال قلعہ میں رونق افروز ہیں ۔ بارگاہ جہاں پناہ میں ایجنٹ بہادر کا ایک عریضہ اس مضمون کا پیش ہوا کہ فیروز پور پنجاب سے گورنر جنرل بہادر کا مراسلہ آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ ۱۴ مارچ کو راجہ شیر سنگھ اور سردار چتر سنگھ اور ۲۷ اور سرداروں اور سولہ ہزار سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے ۔ اور اپنا توپ خانہ اور میگزین بھی سرکار کے حوالے کر دیا ۔ اور خود بھی انگریزی سرکار کے پاس حاضر ہو گئے اور جتنے انگریز عورت مرد سکھوں کی قید میں تھے وہ بھی سب رہا ہو کر سرکاری کیمپ میں آ گئے ۔

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص ۹۵

(۲) بہادر شاہ کا روز نامچہ ص ۸۴

لہذا اس فتح کی خوشی میں اکیس اکیس توپوں کی سلامی ہر چھاؤنی میں ہونی چاہیے۔
حضور جہاں پناہ نے گورنر جنرل کا مذکورہ مراسلہ سننے کے بعد حکم دیا ہمارے توپ خانہ سے
بھی اکیس توپوں کی سلامی ہونی چاہیے۔ چنانچہ فوراً حکم شاہی کی تعمیل کی گئی۔(۱)

بناوٹ اور تصنع

صاحب کلاں بہادر سلامی کے لیے حاضر ہوئے اور علاقہ ضلع جنوبی کے دورہ کی اجازت طلب کی اجازت مرحمت کی گئی۔(۲)

(دکیا ناٹک کے تماشے ہوتے تھے ریذیڈینٹ صاحب بہادر گویا ایسے تابعدار تھے کہ دورہ بھی بادشاہ کی اجازت لے کر کرتے تھے یہ سب بادشاہ کے دل خوش کرنے اور اندر ہی اندر اپنا اقتدار بڑھاتے رہنے کی حکمتیں تھیں۔)

شاہی گزٹ

حضرت محمد ابو ظفر بہادر شاہ نے جن شرائط پر انگریزوں سے اپنے قرضے کی ادائیگی اور تنخواہوں کے اضافے منظور کیے ہیں۔ وہ اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ اس لیے آج حکم ہوا ہے کہ عوام رعایا کی اطلاع کے لیے سرکاری اخبار (سراج الاخبار) میں یہ اعلان شائع کر دیا جائے۔

۱۔ حضور بادشاہ سلامت نے اپنی جیب خاص کے خرچ کے لیے پانچ ہزار روپیہ ماہوار منظور فرماتے ہیں۔

۲۔ جو کچھ بادشاہ سلامت اور ان کے خاص ملازمین کے ذمے قرض ہے۔ اس قرض کو ایجنٹ بہادر کے ذریعہ انگریزی سرکار تمام و کمال ادا کر دے گی۔

۳۔ سابقہ تجویز اہالیان بورڈ کے مطابق انگریزی سرکار نے شاہی تنخواہ میں جس کی مقدار ایک لاکھ ماہوار ہے۔ منظور کیا ہے کہ پچاس ہزار پانچ سو ستر روپیہ ماہوار اس تنخواہ میں

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۰۶

(۲) بہادر شاہ کا روز نامچہ صفحہ ۳۱

اضافہ کیا جائے۔ مگر اس اضافے سے پہلے قلعہ کی مرمت کی جائے گی۔

۴۔ جو شاہزادے موجودہ بادشاہ کی اولاد نہیں ہیں۔ سلاطین سابق کی اولاد ہیں۔ اور موجودہ بادشاہ کے قریبی قرابت دار بھی ہیں۔ اور قلعہ کے اندر آباد ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی تنخواہوں میں بھی سرکار انگریزی اضافہ کرے گی اور ان کو قلعہ کے اندر آباد ہونے کی اجازت دے گی۔ اور جو شہزادے قلعہ کے باہر رہتے ہیں اور موجودہ بادشاہ سے دور کی قرابت رکھتے ہیں۔ ان کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا جائے گا۔

۵۔ موجودہ بادشاہ کی اولاد اور ان کے والد اکبر شاہ کی اولاد اور ان کے دادا شاہ عالم کی اولاد قریبی قرابت دار مانے جائیں گے۔ اور ان تین بادشاہوں سے اوپر کے بادشاہوں کی اولاد کو دور کا قرابتدار تصور کیا جائے گا۔

۶۔ جو دیہات شاہی ملکیت مانے جاتے ہیں۔ وہ سب انگریزی سرکار کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

۷۔ ایسے سب دیہات کا نقشہ اور بادشاہ کے قریبی قرابت داروں کا نقشہ حکومت انگریزی کو بھیجا جائے گا۔

بادشاہ کی منظوری کے بعد مسٹر الیٹ نے چند بار قلعہ کے اندر آکر مرمت طلب مکانوں کو دیکھا۔ اور تجویز ہوئی کہ شاہجہانی عمارتیں تو رکھی جائیں گی۔ باقی پبلک اور شہزادوں کے جو مکان قلعہ کے اندر ہیں ان کو بالکل گرا دیا جائے گا۔ اور از سر نو پارک، میدان۔ بازار، حوض نہر اور کوٹھیوں وغیرہ کی تعمیر اس طرح کی جائے گی کہ قلعہ کا ہر باشندہ قلعہ کے اندر ہی تجارت وغیرہ سے ہزاروں روپیہ پیدا کر سکے گا۔

اس وقت انگریزی خزانے سے قلعہ کے اندر تنخواہ کے ایک لاکھ روپے آتے ہیں۔ آئندہ سوا لاکھ آیا کریں گے۔ (۱)

---

(۱) سرلماس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۲۷

خلاف قانون

۲۶ مارچ ۱۸۴۷ء ماہ مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں بادشاہ سلامت نے تاج محمد دربان کو بلا کر حکم دیا کہ ریذیڈنٹ بہادر کے پاس جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ آج ظہر کے وقت حضور انور قطب صاحب کی درگاہ میں تشریف لے جائیں گے اور تین گھڑی رات گذرنے پر قلعہ معلیٰ میں واپس تشریف لائیں گے ہمارے آتے جاتے وقت سپاہیوں کی کمپنی اور توپ خانہ کا انتظام ہونا چاہیئے۔ تاج محمد نے حضور انور کی طرف سے یہ پیغام ریذیڈنٹ بہادر کے پاس پہنچا دیا اُنہوں نے جواب دیا کہ یہ بات خلاف قانون ہے۔ کہ تین گھڑی رات گذرنے کے بعد سپاہیوں کو کمربستہ حاضر ہونے کا حکم دیا جائے تاج محمد نے جب یہ خبر پیشگاہ خسروی میں بیان کی تو حکم ہوا کہ جاؤ ریذیڈنٹ سے جا کر کہو کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو خلاف قانون ہو حضرت والد مرحوم کے وقت میں ہمیشہ کمپنی کے سپاہی رات کو کمربامدھ کر حاضر ہوا کرتے تھے اور دربان نے پھر ریذیڈنٹ بہادر کے پاس جا کر فرمان شاہی پہنچایا ریذیڈنٹ نے کہا اچھا فرمان شاہی کی تعمیل کی جائے گی (۱)

خودداری

سررشتے کے ذریعہ شاہی قرض کے متعلق شاہی ملازموں سے اور قرض خواہوں سے تحقیقات ہو رہی ہے کہ کس کا کتنا روپیہ ہے کب لیا گیا؟ کس کام کے لیے لیا گیا؟ کس کی معرفت لیا گیا؟ تمسک اور رسیدیں کہاں ہیں؟

بادشاہ کو اس قسم کی خوردہ گیری اور موشگافی پسند نہیں ہے۔ اس لیے حضور والا نے صاحب ایجنٹ کو سورج نرائن کے ہاتھ خط بھیجا ہے کہ بادولت نے بخوبی قرضے کی تحقیقات کر لی ہے۔ اور تنقیح کے بعد تمسک دیتے ہیں۔ تمسک کے مطابق زر قرض ادا کر دیا جائے۔ جس طرح موشگافیاں ہو رہی ہیں ایسی خوردہ گیریوں سے ملازمان شاہی کی بدنامی ہے۔ اور بدنامی کے ساتھ ہم کو نہ اضافہ لینا منظور ہے اور نہ قرض ادا کرنا۔ (۲)

---

(۱) بہادر شاہ کا روز نامچہ صہ ۱۱۲

(۲) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۱۳۴

انگریزوں سے پیمانِ وفا

۷ جولائی ۱۸۴۳ء مدراس سے جو شخص آیا تھا اس نے مرزا الٰہی بخش بہادر سلاطین کی معرفت ایک عرضی اور دو اشرفی کا نذرانہ پیش کیا ارشاد ہوا کہ سائل کو صاحب کلاں بہادر کی معرفت درخواست پیش کرنی چاہیے تھی۔ باہر کے رہنے والوں میں سے کسی کی درخواست بغیر صاحب کلاں بہادر کی وساطت کے مقبول و مسموع نہیں ہو سکتی ہے ہمارا یہ مقررہ قاعدہ ہے اور اس کی خلاف ورزی بغیر کسی اشد ضرورت کے دشوار ہے۔ (۱)

بادشاہ کی نیکی

صاحب ایجنٹ کی تحریر آئی کہ حافظ داؤد نے اپنے بیان میں کہا شاہی حکم کے مطابق میں نے چھاپے خانے کے پتھر خریدنے کے لیے پانسو روپے حکیم احسن اللہ خان کو دیئے تھے۔ مرزا جلال الدین نے لکھا کہ شہزادے فخرالدین کی سرکار کی مختار کاری کے زمانے کے میرے پانچ ہزار کچھ سو روپے باقی ہیں۔ اس لیے حکیم احسن اللہ خاں اور حافظ داؤد اور محبوب علی وغیرہ کو یہاں بھیج دیا جائے۔ اس پر سورج نرائن نے کہا کہ شاہی اہلکاروں کے آنے میں بادشاہ کی بدنامی ہے۔ اور حضور والا کو اپنی بدنامی منظور نہیں ہے۔ صاحب ایجنٹ نے کہا چھ حکم حضور والا کے آچکے ہیں کہ گورمنٹ کو جس طرح منظور ہو شاہی قرضے کو معلوم کرکے بیباق کر دیا جائے۔ اور لفٹنٹ گورنر کے حکم کا بھی یہی منشا ہے۔ جس وقت تک قرضے کی کیفیت واضح نہ ہو جائے گی رقم قرضہ ادا نہیں کی جا سکتی۔ اب لفٹنٹ گورنر کو دوبارہ رپورٹ کی جائے گی۔ اور جواب آنے تک ساری تحقیقات ملتوی رہے گی۔ اگر شاہی اہلکار یہاں بیان دینے آتے ہیں۔ تو ان کو بیٹھنے کے لیے چوکی دی جاتی ہے۔ اس میں بدنامی کون سی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ملازموں نے بادشاہ کو ورغلایا ہے۔ جس مضمون کی تحریر میرے پاس بھیجی گئی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لفٹنٹ گورنر کے نام اسی مضمون کی تحریر لکھ دی

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ

جاتے۔ میں اپنی رپورٹ کے ساتھ شاہی تحریر بھی بھیج دوں گا۔ (۱)

"فرزند ارجمند" ۲۹ جون ۱۸۴۶ء اب سے پہلے جہاں پناہ بادشاہ دہلی رزیڈنٹ دہلی کو اس خطاب سے یاد کرتے تھے۔

"فرزند ارجمند سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان طامس تھیا فلس مٹکاف بہادر فیروز جنگ" آج ارشاد عالی ہوا چونکہ انہوں نے قلعہ کی مرمت و درستی کا انتظام کردیا ہے شاہی دیہات کے انتظام و انصرام اور بعض دوسرے کاموں کے سرانجام دینے میں ابید سے زیادہ کوشش کی ہے اس لیے ان سے بہت زیادہ خوشنود ہوا اس کے بعد حکیم احسن اللہ خان کی طرف خطاب کرکے فرمایا مجھے صاحب کلاں معظم الدولہ کی خیرخواہی اور ہمدردی سے بہت خوشی حاصل ہوئی اس لیے دفتر خانہ میں حکم دے دیا جائے کہ ان کے پورے القاب کے ساتھ "فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی" بھی ضرور لکھا جائے اب سارے القاب کی صورت یہ ہوئی ۔

"فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خان تھامس تھیا فلس مٹکاف بہادر فیروز جنگ" لیکن خاکسار ایڈیٹر احسن الاخبار اپنے ناظرین کی خدمت میں عرض گذار ہے کہ اتنا لمبا چوڑا القاب لکھنے سے طوالت ہوتی ہے اور بعض لوگ پڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں اور شکایت لکھ کر بھیجتے ہیں اس لیے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ان کا نام نامی صرف نواب معظم الدولہ بہادر دام اقبالہٗ تحریر کیا جائے گا ناظرین نوٹ کرلیں اس اختصار میں کام نکل جائے گا اور ناظرین کا فضول وقت ضائع نہ ہوگا۔ (۲)

"خلاف شان" اعلیٰ حضرت قلعے میں تشریف فرما ہیں۔ قطب صاحب میں قیام کے وقت حضور والا نے دربان کی زبانی ایجنٹ کو اطلاع کردی

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۳۴

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۹۲

تھی۔ کہ ماہدولت دو گھڑی دن رہے قلعہ معلّٰی پہنچ جائیں گے۔ سلامی کے لیے توپ خانہ اور انگریزی کمپنی بھیج دی جائے۔ حسب الحکم مقررہ وقت پر کمپنی اور توپ خانہ قلعے کے باہر پہنچ گیا۔ مگر حضور والا کی سواری دو پہر رات گئے سے قلعہ میں آئی۔ سخت گرمی اور تاریکی تھی سپاہیوں کو غیر معمولی انتظار کے سبب بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ چھاؤنی کے کمان افسر نے سپاہیوں کی تکلیف کی اطلاع صاحب ایجنٹ کو دی۔ اور ایجنٹ نے شاہی خدمت میں عریضہ بھیجا کہ فوج کو اتنی تکلیف دینا حضور کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ حضور والا نے جواب میں فرمایا۔ بہتر ہے۔ (۱)

اختصاص یار خاں

۱۳ مارچ ۱۸۴۳ء نواب جنع الالقاب امین الملک اختصاص یار خاں طامس تھیا فلس مٹکاف صاحب بہادر فیروز جنگ فرزند ارجمند سلطانی کی عرضی حضور انور کی نظر سے گذری کہ جو کاغذ حضور نے عنایت فرمایا تھا وہ صدر دفتر میں روانہ کر دیا گیا۔ (۲)

انگریز ایجنٹ کی آمد قلعہ میں

۲ جولائی ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی :۔
ہم نے قطب صاحب میں پھول والوں کے میلے کی بیس تاریخ مقرر کر دی ہے۔ ۲۰ جولائی سے گل فروشوں کا میلہ ہوگا۔ ہمارا ارادہ خود بھی قطب صاحب جانے کا بلکہ چند ماہ قیام کرنے کا ہے۔ آپ کے دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ کسی وقت تشریف لے آئیے تو مناسب ہے۔ اور حسب معمول سلامی کا بھی انتظام کر دیجئے۔

شاہی وکیل نے واپس آکر عرض کیا۔ صاحب ایجنٹ دوپہر کو حاضر خدمت ہوں گے بادشاہ سلامت نے حکم دیا ولی عہد مرحوم کے زمانے کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں۔ ایسا

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۱۴۹

(۲) بہادر شاہ کا روز نامچہ ص ۳۳

نہ ہو کر ایجنٹ کے آنے کے وقت ولی عہد کے متعلقین کچھ واویلا مچائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد صاحب ایجنٹ کپتان قلعہ کے ساتھ آ گئے۔ بابو سورج نرائن نے استقبال کیا۔ چوبداروں نے بلند آواز سے کہا۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت دونوں طرف سے مزاج پرسی ہوئی۔ شاہی وکیل نے بادشاہ کی طرف سے کہا، ولی عہد مرحوم کے لواحقین اپنی پرورش کے لیے کچھ واویلا مچائی چاہتے تھے اس لیے ہم نے تمام بیگمات کی ڈیوڑھیاں بند کرا دیں۔ صاحب ایجنٹ نے جواب دیا۔ اس کے متعلق میں نے گورنر آفس کو لکھا ہے۔ حضور والا نے فرمایا ولی عہدی کے متعلق کیا جواب آیا۔ ایجنٹ نے کہا ابھی کوئی حکم نہیں آیا۔ جس وقت آئے گا فوراً خدمت عالی میں عرض کروں گا۔ اس کے بعد ملاقات ختم ہوئی۔ ایجنٹ سلام کر کے واپس چلے گئے۔ (۱)

ہر کام ایجنٹ کے مشورے سے

۷ جولائی ۱۸۴۶ء دفتر میں شاہی حکم نافذ ہوا کہ ہر کام نواب معظم الدولہ بہادر کے مشورہ اور رائے سے کیا جائے اور کسی صورت میں کسی دفتر کے آدمی سے ایسا فعل سرزد نہ ہو جو نواب معظم الدولہ کی ناخوشی کا باعث ہو اور تمام معاملات کو اس خوبی و عمدگی سے انجام دیا جائے کہ رعایا میں سے بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے اور اراکین سلطنت اور سلطنت کا مفاد بھی مد نظر رہے۔ (۲)

انگریز کا ادب

۱۴ اگست ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی :۔
اعلیٰ حضرت قطب صاحب میں تشریف فرما ہیں۔

تالکٹورہ باغ کے مقدمہ کے مصارف کے چار سو سات روپے ایجنٹ کی استدعا کے موافق اعلیٰ حضرت نے ایجنٹ آفس کو بھیج دیے۔ صاحب ایجنٹ نے ہیرا لال دلیں کو محنتانہ کے دو سو تیس روپے دے دیے۔

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۰۹

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۲۶

صاحب مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ شاہی ہاتھی اگر کسی غمی، یا میلے، یا شادی وغیرہ میں جائیں تو فیل بان نہایت ہوشیاری سے ان کو لے جائیں۔ پبلک کو نقصان نہ پہنچے۔ صاحب ایجنٹ نے اپنے عریضہ کے ساتھ مجسٹریٹ کی تحریر کی نقل شاہی خدمت میں بھیج دی۔ اعلیٰحضرت نے مجسٹریٹ کی تحریر کے موافق فیل خانے کے داروغہ کو تاکید کر دی اور حکم دے دیا کہ اگر کسی ہاتھی کے سامنے راستے میں کسی انگریز کی سواری آ جائے۔ تو فیل بان ہاتھی کو علیحدہ کر لے۔ (۱)

انگریزی انتظام کی تعریف

حضور والا نے اخبار حکومتِ انگریزی کا اعلان ملاحظہ فرمایا کہ ٹیکس دینے میں گوناگوں فائدے ہیں راستوں میں کوڑا کرکٹ نہ رہے گا۔ سڑکوں اور گلی کوچوں کی صفائی ہو جائے گی۔ تالابوں میں پانی اور کوڑا نہ سڑے گا۔ شہر میں روشنی ہو گی۔ بازار کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ شہر میں بیماری نہیں پھیلے گی سب تندرست ہوں گے۔ کلکتے سے دہلی تک اور دہلی سے کلکتے تک ہر قسم کی درآمد برآمد چھاپس گھنٹے میں ہوتی رہے گی اس لیے پبلک کو آپس میں چندہ کر کے گورنمنٹ سے پی۔ ڈبلیو ڈی کے لیے درخواست کرنی چاہیے۔ سرکار پبلک کی خواہش پوری کرے گی۔ گورمنٹ کے پیش نظر رفاہِ عام ہے اعلےٰ حضرت نے خبر پڑھ کر فرمایا یہ تمام باتیں پبلک کے آرام کی ہیں۔ انگریزی سرکار نے سڑکوں کی تیاری۔ گلی کوچوں کی صفائی۔ فصیل کی درستی۔ اور فیض نہر کا پانی لانے کی بہت کوشش کی ہے۔ مخلوق خدا کو بہت آسائش ہو گی۔ (۲)

ملکہ کو چھوٹی بہن نہ لکھیے

صاحب ایجنٹ نے شاہی نمائندے سے فرمایا حضور والا نے اپنے خط میں ملکہ معظمہ کو چھوٹی بہن کا القاب

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص ۲۱۱

(۲) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص ۲۵۴

لکھا ہے آپ حضور سے عرض کر دیں کہ ملکہ معظمہ کو بڑی بہن کا القاب لکھیں ہیں انگلستان کو خط بھیج دو نگا شاہی نمائندہ نے خدمت والا میں حاضر ہو کر صاحب ایجنٹ کا پیام عرض کر دیا اور لوٹ کر صاحب ایجنٹ سے بادشاہ کی طرف سے کہا سابق ملکہ انگلستان نے بادشاہ جلال الدین اکبر کو بڑے بھائی کا القاب لکھا تھا اس لیے میں نے موجودہ ملکہ کو چھوٹی بہن کا القاب لکھا صاحب ایجنٹ نے فرمایا حضور والا نے خط کے ساتھ مرزا جواں بخت کے پنجے کا نشان بھی بھیجا ہے۔ درحقیقت اس سے کوئی فائدہ نہیں مرزا جواں بخت ولی عہد نہیں ہو سکتے۔ ولی عہد ہونے کا حق مرزا فخرالدین کا ہے ۔ (۱)

حسرت دیرینہ "اعلیٰ حضرت نے انگریزی اور فارسی میں ایک خط گورنر جنرل کو بھیجا کہ عید اور نوروز اور خوشی کی تقریبات پر بادشاہ کا نذریں لینا ہمیشہ کا دستور تھا۔ لارڈ ایلنبرا نے اس کی ممانعت کر دی۔ اس وقت سے نذریں لینا بند کر دی گئیں۔ آپ اگر دستور قدیم کے مطابق بند شدہ سلسلہ پھر جاری کر دیں گے تو بہتر ہوگا"۔ (۲)

رتی رتی کی خبر انگریز کو "حضور والا نے ساڑھے تین تولہ روپے کا ایک دوپٹہ تاج محل بیگم کو عطا فرمایا ۔ (۳)

بادشاہ لاجواب ہو گئے "۲۳ اکتوبر ۱۸۴۹ء سہ شنبہ دہلی :۔ بادشاہ روشن آرا باغ میں :۔ اعلیٰ حضرت مع بیگمات کے روشن آرا باغ میں تشریف فرما ہیں ۔

حضور والا نے ایجنٹ کو روبکار بھیجا کہ مابدولت مع بیگمات کے باغ میں فروکش ہیں

---

۱ ۔ سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۴۱

۲ ۔ سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۴۶

۳ ۔ سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۶۴

اس لیے باغ کے داروغہ کو حکم دے دیا جائے کہ باغ کی حفاظت اور درستگی کے لیے مالیوں کی جگہ ان کی عورتوں کو تعینات کر دے۔ صاحب ایجنٹ نے جواب بھیجا۔ کہ حکم کے مطابق میں نے داروغہ کو لکھا تھا مگر اس نے جواب دیا کہ باغ کا ٹھیکیدار ملک دھومی اس بات کو منظور نہیں کرتا۔ حضور والا نے ایجنٹ کی عرضداشت ملاحظہ فرمائی۔ اور خاموش ہو گئے باغبانوں نے ڈالی پیش کی۔ (۱)

گورنر جنرل خفا ہو گئے

بادشاہ دہلی گورنمنٹ پر اپنے اضافہ تنخواہ کا سخت تقاضہ کرتا تھا آخر کو یہاں تک تنگ ہوا کہ بغیر گورنر جنرل کے حکم راجہ رام موہن رائے کو اپنا وکیل مختار بنا کر ولایت بھیجا گورنر جنرل کا حکم ان کی وکالت کے لیے تھا اس لیے وہ مختار شاہی انگلستان میں سمجھا گیا گورنر جنرل ایسا ناراض بادشاہ سے ہوا کہ جب اضلاع بالا میں دورہ کرتا ہوا دہلی میں آیا تو بادشاہ سے بغیر ملاقات کئے پہاڑ پر چلا گیا بادشاہ کی پنشن کا کچھ اضافہ اس شرط سے منظور ہوا تھا کہ وہ اس ملک سے دست بردار ہو جواب تک اس کے نام سے چلا جاتا تھا مگر اس شرط کے منظور کرنے میں اس کو تامل ہوا اس لیے اضافہ ہی نہ ہوا رام موہن رائے کا نام ہم نے اوپر لیا ہے اگر اس حق پرور اور حقیقت گو کا تھوڑا سا بھی حال نہ لکھیں تو ہم اپنی تاریخ کا حق تلف کریں گے اس لیے مختصر ان کا تذکرہ لکھتے ہیں۔

یہ متعدد صفات قوم کا برہمن تھا اور ایک شریف خاندان میں ۱۷۷۴ء میں بردوان میں پیدا ہوا تھا اس کے باپ دادا نواب بنگال کی عمدہ خدمتیں رکھتے تھے اس لیے انہوں نے فارسی عربی زبانوں کی تعلیم پائی اور بہت غور و خوض سے قرآن شریف سے استفادہ کیا۔ جس سے اس کے دل میں توحید الٰہی کا جوش اٹھا بت پرستی سے نفرت پیدا ہو تی وہ انگریزی

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۸۲

سرکار کے نوکر ہوئے اور بتدریج ترقی پاتے گئے سنسکرت اور انگریزی زبان میں استعداد بہم پہنچائی پھر ۱۸۱۴ء میں ترک ملازمت کرکے کلکتہ میں سکونت اختیار کی خدا پرست اور موحد کامل ہوکر اپنے مذہب کے عاقلوں کو آخرت کے نفع کا رستہ یوں بتانا شروع کیا کہ وید اور ویدانت کو سنسکرت اور بنگالی اور انگریزی میں چھپایا اور اس میں یہ بتلایا کہ ہندوستان کے عقیدے کی بنیاد توحید پر ہوئی ہے اور ایسے خاطر پسند کلام شروع کیے کہ اعلیٰ درجہ کے ہندو دولت مند تعلیم یافتہ اُس کے چیلے بن گئے غرض اس خدا پرست نے اپنی صفائی قلب سے ہزاروں دلوں سے زنگ بت پرستی کو مٹایا اور فقط دریوزہ گری علم اور آموزش و دانش کے واسطے انگلستان کی سیر کا ارادہ کیا اور بادشاہ کی مختاری کا عہدہ قبول کیا ۱۸۳۰ء میں ولایت پہنچا یہاں کے جوہر شناسوں کو اپنے جوہر لیاقت ایسے دکھائے کہ بڑے بڑے آدمی وہاں اس غریب الوطن کے دوست ہوگئے افسوس یہ ہے کہ یہ حقیقت شناس وہاں سے زندہ نہ آسکا برسٹول میں ۱۸۳۳ء میں روح مقدس ان کی جنت کو رخصت ہوئی اگر وہ یہاں زندہ آتا تو اپنے ہم وطنوں کے واسطے ارمغان دانش ایسا لاتا کہ صفائی باطن اور پاکی ظاہر کے خزانوں کا منہ کھل جاتا۔ (۱)

بہادر شاہ کی تذلیل

"گوروں نے اپنے دل بہلانے کے لیے لاہوری دروازہ پر بہادر شاہ کی ایک تصویر بنائی تھی جس کے گلے میں پھانسی ڈالی تھی۔ غرض بادشاہ کی تذلیل کی کوئی حد باقی نہ تھی۔ مگر زندگی باقی تھی۔ ایک سرکاری افسر نے بادشاہ کی تعظیم کے لیے اپنے سر پر سے ٹوپی اتاری تو اس پر انگریزی اخباروں نے لعن طعن کا تار باندھ دیا۔ (۲)

---

(۱) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ) از ذکاء اللہ صفحہ ۴۸۲

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ صفحہ ۴۲۳

باب

ولیعہدی کی کشمکش

بہادر شاہ اور انگریزوں کے تعلقات کی تلخی میں سب سے زیادہ جو چیز ممد و معاون ہوئی وہ یہی ولی عہدی کی کشمکش تھی، انگریزوں نے پوری رغبت اور کبر و نخوت کے ساتھ، بادشاہ کا نامزد ولی عہد ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بہادر شاہ کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، وہ کسی معاملہ میں، حتیٰ کہ اپنا ولی عہد، اور جانشین منتخب کرنے کا حق بھی نہیں رکھتے۔ اور کوئی شبہ نہیں بہادر شاہ نے یہ حقیقت محسوس کر لی، یہ باور کر لیا کہ وہ برائے نام بادشاہ بھی نہیں ہیں، انگریز نہ صرف، ملک کے مالک بن چکے ہیں بلکہ لال قلعہ کی چھوٹی سی دنیا بھی ان کے تصرّف میں ہے، اور اس چھوٹی سی دنیا کا سلطان بھی ان کے زیرِ نگیں ہے، اور اس سلطان کی ہر آرزو اور تمنّا پر بھی، فرنگی استبداد اور قہرمانیت کا کوڑا چل رہا ہے۔

اس کشمکش کی داستان بہت طویل ہے، لیکن اس طویل داستان کو مختصر کر کے ہم بیان کرتے ہیں:۔

نئے ولی عہد کا جلوس

"ولی عہد مرحوم کے اصطبل کے گھوڑوں کا ملاحظہ فرمایا۔ ولی عہد مرحوم کے چودہ لڑکوں یعنی مرزا کالے۔ مرزا الّو مرزا جھبو، اور احمد وغیرہ کو ایک ایک گھوڑا سواری کے لیے عنایت فرمایا۔

عرض کیا گیا شاہزادہ مرزا جواں بخت درگاہ قدم شریف کو جائیں گے۔ زینت محل کے کہنے کے بموجب ولی عہدی کے جلوس کا سامان پچاس سوار اور چار شاہی نشان مقرر فرما دیے۔

اور احمد قلی خاں کو طلب فرما کر کچھ سمجھا کر ایجنٹ بہادر کے پاس بھیج دیا۔ (۱)

خاندانی چپقلش کسی نے حضور سے عرض کیا۔ ولی عہد مرحوم کا جو سامان کمرے کے اندر مقفل تھا۔ ولی عہد مرحوم کے لڑکوں نے دوسری کنجی سے قفل کھول کر سب سامان نکال لیا۔ حضور والا نے یہ خبر سن کر آدمی بھیج کر لڑکوں کے مکان سے سب سامان منگوالیا۔ لڑکوں نے عرضی دی کہ سامان ہمارے والد کا تھا۔ حضور نے کیوں اٹھوا کر منگوا لیا؟ (۲)

خاندانی کشمکش بادشاہ سلامت نے اپنے مرحوم ولی عہد کے لڑکوں سے شکوہ فرمایا کہ تم نے اپنی تنخواہ کے لیے ایجنٹ سے ہماری شکایت کی۔ حالانکہ ہم خود تمہاری تنخواہیں مقرر کرانے کے لیے کوشش کر رہے تھے اور ہم نے ایجنٹ کو لکھ دیا تھا اور بدولت ہمیشہ تمہاری پرورش کرتے رہیں۔ (۳)

ایجنٹ کی شرارت صاحب ایجنٹ شہزادے فخر الدین کے مکان پر گئے تھے۔ ولی عہد کی تنخواہ کا تذکرہ آیا۔ تو ایجنٹ نے کہا ولی عہد کے تقرر تک ایک ہزار پانسو بلیس روپیہ ولی عہد کی تنخواہ ولی عہد مرحوم کے لواحقین کو ملتی رہے گی۔ ولی عہد بننے کا آپ کو حق ہے مگر بادشاہ سلامت آپ کو ولی عہد بنانا نہیں چاہتے۔ تاہم اگر آئندہ کسی کو ولی عہدی ملے گی تو انگلستان سے آپ کو ملے گی۔ (۴)

نیا ولی عہد اطلاع ملی ہے کہ اعلیٰ حضرت نے انگریزی گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر اپنی طرف سے مرزا جواں بخت کو ولی عہد مقرر فرما دیا ہے اور احکام بھی جاری

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۴۲

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۶۰

(۳) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۹۰

(۴) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۱۲۳

کر دیئے ہیں۔ ولی عہد کو ٹوپی اور جلوس بھی عنایت فرما دیا ہے۔ (۱)

سازش "اعلیٰ حضرت کو اطلاع ملی کہ کپتان قلعہ شاہزادہ مرزا فخرالدین کے پاس گئے تھے اور شہزادے صاحب نے ولی عہد کے متعلق ان سے کچھ تذکرہ کیا تھا۔ یہ خبر سن کر حضور والا بہت ناخوش ہوئے۔ شاہزادے کو سخت سست کہا۔ اور کہا نالائق انگریزوں سے ولی عہدی کی بابت خفیہ ساز باز کرتا ہے۔ شاہزادہ مرزا فخرالدین کو بادشاہ کی طرف سے خطوط میں قرۃ العین، لکھا جاتا تھا۔ حضور نے ناراض ہو کر خطاب مذکور موقوف کر دیا۔ اور حکم دے دیا کہ آئندہ دوسرے شہزادوں کی طرح مرزا فخرالدین کو بھی، برخوردار کامگار لکھا جائے۔ اور نظارت کے عملے کو فرمان بھیج دیا، کہ مرزا فخرالدین کے پاس آمد و رفت نہ رکھیں۔ صرف دفتر کی ڈیوٹی انجام دیتے رہیں۔ (۲)

ملکہ وکٹوریہ کے نام خط "بادشاہ نے مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کے متعلق فارسی اور انگریزی میں ایک خط ملکۂ معظمہ کو انگلستان بھیجا، اور مرزا جواں بخت کے پنجہ کا نشان بھی روانہ کر دیا اور لکھ دیا یہ ہاتھ میں ملکہ کے ہاتھ میں دیتا ہوں، اور دستگیری کی امید رکھتا ہوں۔ (۳)

جواں بخت کا جلوس "اعلیٰ حضرت قطب صاحب کے محل میں رونق افروز ہیں اطلاع ملی کہ شاہزادہ جواں بخت بڑی شان و شوکت اور شاہانہ جلوس کے ساتھ جامع مسجد کو جمعۃ الوداع کی نماز پڑھنے گئے۔ یہ کم سنی اور شاہانہ جلوس۔ اور بزرگانہ وقار راستے میں جو دیکھتا تھا خوش ہوتا تھا۔ (۴)

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۱
(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۵
(۳) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۳
(۴) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۲

شرطِ ولی عہدی

۱۸۵۶ء میں لارڈ صاحب نے مرزا محمد قریش کی جانشینی تو تسلیم کرلی لیکن ساتھ ہی یہ قید لگا دی کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد وہ بادشاہ متصور نہ ہوں گے بلکہ نرے شہزادے ہی شہزادے مانے جائیں گے یعنی اس نام کی بادشاہت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور اس پر یہ طرہ ہوا کہ درپنشن گھٹ گھٹا کر صرف پندرہ[15] ہزار روپیہ ماہانہ پر آن لگا زینت محل کی اس دفعہ بھی کچھ نہ چلی وہ ہاتھ ملتی کی ملتی رہ گئیں ؎

قسمت تو دیکھنا کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند ‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

غرض یہ کہ برٹش گورنمنٹ نے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ سلسلہ سلاطین مغلیہ یہیں سے از خود القط ہوگیا تھا لیکن تقدیر میں ابھی ایک اور گردش لکھی تھی جس سے بادشاہان تیموریہ کے طویل سلسلہ کا خاتمہ ایک ایسے غیر متوقع طریقہ پر ہوا جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا اس غیبی گولہ نے سلطنت مغلیہ کے چیتھڑے بکھیر دیئے تھے اور رہے سہے نام کو ملیا میٹ کردیا''

کشمکش ولی عہدی کی تاریخ اور پس منظر

اب ہم ذیل میں کشمکش ولی عہدی کی تاریخ اور پس منظر ذرا تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں جس سے بہادر شاہ کی بے بسی اور انگریزوں کی پالیسی اچھی طرح واضح ہو جائے گی، اور معلوم ہو جائے کہ انگریزوں کی پالیسی نے کیسے کیسے تدریجی مراحل طے کیے۔

اب بڑا معرکہ لارڈ کیننگ کے سامنے یہ پیش آیا کہ دہلی سے انگریز نکالے گئے اور کچھ دنوں کے لیے اس شہر میں جو مسلمانوں کا مرکز تھا، مغلوں کا خاندان شاہی پھر بحال ہوا مدتوں سے شہنشاہ دہلی کی اصلی حکومت ان آدمیوں پر ذرا سی بھی باقی نہیں رہی تھی، جن پر وہ پہلے حکمرانی کرتا تھا۔ پچاس برس سے دہلی کی لال حویلی کا مالک انگریزوں کے تخمینہ میں ایک چھوٹی نقل اور خالی نمائشی سانگ باقی تھا۔ لیکن اس چھوٹی نقل اور خالی نمائشی سانگ اور نام نے اپنا زندہ اثر

---

[15] واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول (بشیرالدین)، صفحہ ۶۸۲

سلاطین اور رعایا ہند پر کبھی موقوف نہیں کیا تھا۔ زمانہ حال تک ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے نام کے سکے چلتے رہے۔ اور ہندوستان کے سلاطین خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو ہوں اپنے جانشینوں کے لیے۔ برائے نام شاہی فرمان مانگتے تھے۔ اور اُن کو سرکار کمپنی کے فرمان سے زیادہ باوقعت و مستحکم جانتے تھے۔ گو دہلی کے بادشاہ کا افسانہ ہی باقی تھا۔ مگر یہ افسانہ عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما ہیچ رعایا کے دلوں میں اور زبانوں پر بڑا معزز وظیفہ تھا جس کو وہ جپا کرتی تھی۔

پونٹروں کا بادشاہ بہادر شاہ شاہ عالم شہنشاہ دہلی کا پوتا تھا۔ شاہ عالم اندھا بے کس اور معیبت زدہ تھا۔ جس کو انگریزوں نے مرہٹوں کے پنجہ سے اس وقت چھٹایا تھا کہ انیسویں صدی کے شروع میں ۱۸۰۳ء میں لیک صاحب اور ولزلی کے سپاہیوں نے مرہٹوں کے زور کو توڑا تھا۔ اور فرانسیسیوں کی آرزوں کو کشتہ کیا تھا۔ شاہ عالم باوجودیکہ نہایت مصیبت زدگی اور فرومانگی کی حالت میں تھا لیکن بڑے بڑے عالیشان گورنر جنرل اس کو بڑا طاقتور شہنشاہ سمجھتے تھے۔ اس کی حمایت کرنے کو اپنے حق میں مفید جانتے تھے۔ اور اس کی بیخ کنی کو گناہ سمجھتے تھے۔

بادشاہ مگر بادشاہ نہیں

وہ بادشاہ تھا مگر بادشاہ نہ تھا۔ وہ کچھ چیز تھا مگر کچھ چیز نہ تھا۔ وہ ایک وقت میں اصلی اور مصنوعی تھا۔ انگریزوں کو اپنی بازی میں یہ بڑی خاطر جمع تھی کہ بادشاہ ان کے پاس تھا۔ لیکن وہ ششدر اس میں تھے کہ بازی کیوں کر کھیلیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملکی حکومت سے جو عزت حاصل ہے اس کی خاص مقدار بادشاہ کی ذات کے لیے مقرر کی جائے۔ یعنی خاص حدود کے اندر اب بھی چشمہ عدالت وہ سمجھا جائے اور اس کے ہاتھ زندگی یا موت کا اختیار فیاضانہ رکھا جائے اور ان اضلاع کے سوا جو تخت کے لیے جدا رکھے جائیں۔ بادشاہ اور اس کے کنبے کو بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے اس طرح سے وہ شہنشاہ جو دنیا میں سب سے بڑا تھا، تاجروں کی کمپنی کا ایک پنشن خوار ہو گیا۔ انگریزوں نے خوب سوچ لیا تھا۔ کہ اگر یہ آبائی سلطنت۔ اس طرح دوامی رہے گی اور

بادشاہ شاہجہاں آباد کے قلعہ میں رہے گا اور اس کے مصاحب اپنے شہر میں اس کے ساتھ رہیں گے جہاں مسلمانوں کی آبادی اس کے ساتھ جاں نثاری و وفاداری کرے گی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اس غارت شدہ سلطنت کو شاہ عالم کے جانشینوں میں سے کوئی شخص دوبارہ حاصل کرے گا۔ جس کے سبب سے ہم کو بڑی گزند پہنچے گی یہ تجویز پیش ہوئی۔ کہ بادشاہی خاندان منگیر میں مقیم ہو۔ لیکن بادشاہ اس انتقال مکانی کے خیال سے لرزاں ہوا اور یہ لرزہ اس کے خاندان و ملتزمین کے عورت مرد پر بچے سے بوڑھے تک چڑھا اس واسطے لارڈ ولزلی نے اس خیال سے کہ بادشاہ کو اس مصیبت میں اور زیادہ ملال نہ دیا جائے مرے پر سو درے نہ ہوں دہلی ہی میں اس کو قلعہ کے اندر بالفعل رہنے دیا۔ آئندہ کسی زمانہ کے لیے انتقال مکانی موقوف رہا۔

رفتہ رفتہ بادشاہ کی وقعت گھٹتی ہے

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم مرگیا۔ اور اکبر شاہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ وقت ایسا تھا۔ کہ انگریز قدیمی ہندوستانی درباروں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ سٹین صاحب دہلی کے ریذیڈنٹ تھے، وہ خاندان شاہی کی تعظیم و تکریم پر مرتے تھے بادشاہ کے آگے تسلیم و کورنش و مجرا بجا لاتے تھے۔ نوجوان چارلیس مٹکاف صاحب سٹین صاحب کے نائب مقرر ہوئے اگرچہ وہ ابھی حالت طفلی سے نکلے تھے مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ بادشاہ کے احترام کو جو گورنمنٹ نہیں گھٹاتی وہ آئندہ کے لیے اپنے حق میں کانٹے بوتی ہے۔ انہوں نے لکھا کہ میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا۔ جو اسٹین صاحب نے خاندان شاہی کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے۔ جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دہلی میں حکمرانی کے لیے مقرر ہو۔ وہ بادشاہ کی تعظیم کس طرح کرے۔ کیونکہ ہمارا مقصود یہ نہیں ہے، کہ بادشاہ کو بادشاہی کے اختیار و اقتدار حاصل ہوں۔ اس لیے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ جن سے اس کے دل میں اپنی بادشاہی کے حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو۔ اس کا ادب اس کی شان کے موافق کرنا چاہیئے۔ اس کو خوش و خرم آسائش و آرام سے رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس کی حکومت کو دوبارہ قائم کریں۔ تو ہم کو چاہیئے

کہ بادشاہی کا خواب اس کے خواب میں بھی نہ آنے دیں۔ پھر چند سال گذرنے کے بعد خود دہلی کے ریذیڈنٹ مٹکاف صاحب مقرر ہو گئے تو کل معاملات کی عنان ان کے اختیار میں آئی۔

فرنگی استیلا اور استعلا زمانہ گذرا انڈیا میں بڑے بڑے ملک انگلش کے قبضہ میں آگئے کہ ان کو کسی بیرونی حملے کا خوف نہ رہا اُن کو قوت ایسی حاصل ہو گئی کہ ہندوستان میں خواہ کیسے ہی خوف و خطرا پیدا ہو وہ خاک میں ملا سکتے تھے۔ تو انہوں نے بہادرانہ قدم آگے بڑھانے شروع کیے۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اس انتظام کے نتائج دیکھے جس کا فیصلہ کچھ نہ ہوا تھا۔ انہوں نے یہ مستقل ارادہ کیا کہ برٹش گورنمنٹ کے والا اقتدار ہونے کا اعلان کریں کہ وہ ہندوستان کے کل والیان ملک پر استیلا و استعلا رکھتی ہے۔ زمانہ بدلتا گیا اس کے ساتھ انگریزوں کے خیالات بدلتے گئے کمپنی اس بات کو بالکل بھولی نہیں تھی کہ اس کی بنیاد خالص تجارت تھی۔ لیکن یورپ میں جو انگریزوں کو فتوح حاصل ہوئیں اس سے یقین ہوا کہ ہم بڑی میلٹری قوم ہیں۔ انگلینڈ تمام سلاطین ہند کا سرتاج ہو گیا۔ اور پھر اُس کو اپنے والا اقتدار اور سب سے برتر ہونے کے اعلان میں کچھ تامل نہ ہوا۔ اس اعلان میں یہ بھی ضرور تھا کہ دہلی کی سلطنت کا قصہ چکایا جائے۔ مشرق میں اب ایمپائر (سلطنت) کا لفظ صرف برٹش عملداری کے ساتھ مخصوص ہو گیا اور دہلی کی بادشاہی کا برائے نام قائم رکھنا جو پہلے انگریزوں کے لیے مفید تھا۔ اب وہ ان کو گراں خاطر معلوم ہونے لگا حتی الامکان جلد اس کے دور کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں۔ یہ بیان کرنا چاہیئے کہ تیس برس کے عرصہ میں بادشاہی کی عزت کم ہوتی چلی گئی۔ ایک گورنر جنرل کے بعد دوسرا گورنر جنرل گیا وہ بادشاہ کے گھمنڈ کو ڈھاتا گیا اور خاندان تیموری کی تعظیم و تکریم کے مراسم کو گھٹاتا گیا۔ یہ تمام باتیں اہل قلعہ کے دلوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔ لیکن وہ برٹش گورنمنٹ کی علو مرتبت اور والا اقتدار ہونے کے لیے لازمی تھیں۔

بہادر شاہ کی ولی عہدی اور بادشاہت ۲۸ ستمبر کی شام کو اکبر شاہ بیاسی برس کی

عمر میں اس جہان سے رخصت ہوا اس نے اول یہ کوشش کی کہ مرزا جہانگیر کو اپنا ولیعہد بنائے۔ جنہوں نے سیٹن صاحب رزیڈنٹ پر گولی چلائی اور اُن کو لولو کہا۔ وہ تو دہلی سے الہ آباد میں جلا وطن ہوتے پھر بادشاہ نے مرزا نیلی کے لیے کوشش کی اس میں بھی ناکامیابی ہوئی شہزادہ ابوظفر (تاریخی نام ہے جس کے عدد ۱۱۸۹ھ ہیں) تخت نشین ہوا اور ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خطاب ہوا اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی عیش و عشرت میں بسر ہوئی تھی۔ وہ مسکین مزاج نہایت کاہل تھا۔ شاعری کا بڑا شوق تھا خود بڑا شاعر تھا۔ اس میں کسی قسم کی سازش کرنے کی لیاقت قدرت ہی نے نہیں دی تھی۔

نذر بند کردی گئی

اس وقت چارلس مٹکف لفٹنٹ گورنر تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے اضافہ تنخواہ کی سفارش نہیں کی وہ یہ جانتے تھے کہ اضافہ کا کرنا سرکاری روپیہ کا برباد کرنا ہے۔ ایسا ہی لارڈ آک لینڈ گورنر جنرل نے اس کو جانا انہوں نے کہا کہ اگرچہ اس کا اقرار کیا گیا ہے جو پورا ہونا چاہیئے مگر اس کے ساتھ پہلے یہ شرائط بھی پوری ہونی چاہیں کہ بادشاہ اپنے تمام دعووں سے جو برٹش گورنمنٹ پر ہیں ضابطہ کے طور پر دست بردار ہو لیکن بہادر شاہ نے وہ کام کیا جو اس کے باپ نے کیا تھا۔ کہ شرائط مذکور کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور یہ سمجھا کہ انگلینڈ میں اپیل کرنے سے مطلب برآری ہو جائے گی۔ اکبر شاہ نے رام موہن رائے کو راجہ کا خطاب دیا۔ اور اپنا سفیر بنا کے انگلینڈ بھیجا۔ راجہ صاحب کی انگلش سوسائٹی میں ان کے علم اور لیاقت کی بڑی قدر شناسی ہوئی۔ مگر ان کی سفارت کی رتی برابر بھی قدر و حرمت نہیں ہوئی۔ وہ اپنے کام میں بے نیل درم رہا۔

مگر بہادر شاہ کو اپنے مقصد حاصل کرنے کا خیال چلا جاتا تھا اس نے جارج ٹامس کی تحریر و تقریر کی بڑی تعریف سن کر بلایا اور اپنا ملازم کیا اس کے سامنے بہت سی قباحتیں بیان کیں کہ وہ ان کی اصلاح کرائے۔ لارڈ ایلن برا نے بادشاہ کی نذر بند کر دی جو رزیڈنٹ کی معرفت عیدین و نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ کے دن گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف

سے بادشاہ کے روبرو پیش کی جاتی تھیں ۱۸۳۷ء کو بہادر شاہ کو بھی کمانڈر انچیف نے نذر پیش کی تھی ان نذروں کے موقوف ہونے سے بادشاہ کو ہمیشہ انگریزوں سے کینہ و ملال رہا متعلقین قلعہ کو بھی اپنے آقا کی اس خفت پر بڑا افسوس ہوا۔ غرض اس نذر کے بند ہونے سے یہ ثابت ہوا کہ برٹش گورنمنٹ اب خاندان تیمور کی بادشاہی کو کسی طرح سے نہیں مانتی کمپنی نے خاندان کے وظیفہ کے اضافہ سے بھی انکار کیا جب تک کہ وہ شرائط مذکورہ بالا کو منظور نہ کرے کورٹ آف ڈائرکٹرز کی چھٹی مورخہ ۱۱ فروری ۱۸۴۳ء آئی ۔ کہ یہ ناممکن ہے کہ ہم اس شرط سے ہٹیں کہ آئندہ تمام دعووں سے بادشاہ ضابطہ کے طور پر دست بردار ہو۔ اس فیصلہ کو مسٹر جارج طامس بھی راجہ رام موہن رائے کی طرح منسوخ نہیں کرا سکے کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ وظیفہ شاہی کا اضافہ ہوتا۔ ایک لاکھ روپیہ اس کثیر العیال بادشاہ کی خوش گذرانی کے لیے کافی تھا۔ اس ایک لاکھ روپیہ ماہانہ میں سے ایک ہزار روپیہ ماہوار لکھنؤ میں بادشاہ کے بیٹیوں کی تنخواہ کا جاتا تھا ۔

دارابخت کا انتقال

۱۸۴۹ء میں ولی عہد دارابخت نے انتقال کیا۔ اس وقت بہادر شاہ کی عمر ستر برس سے کچھ زائد تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب عمر طبعی ختم ہونے کو ہے۔ بہادر شاہ کے بعد جانشین بنانے میں گورنمنٹ متفکر ہوئی۔ لارڈ ڈلہوزی یہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ اس بادشاہی کی جھوٹی دکھاوٹ بھی باقی رہے ۔ پہلے ان سے جو گورنر جنرل تھے۔ وہ اس قدیم خاندان کی باتوں پر نہایت رحم دلی سے غمزدہ ہوتے تھے۔ پہلی اگست ۱۸۴۴ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کے حکم کے موافق گورنر جنرل نے اپنے ایجنٹ دہلی کو یہ ہدایتیں کیں کہ جب دہلی کا بادشاہ (بہادر شاہ) مرجاتے تو اس کے جانشین بنانے کے باب میں ہر معاملہ کی خاص منظوری گورنر جنرل سے لینی چاہیے اگرچہ ان ہدایتوں میں بادشاہ کے لقب کی موقوفی کی نسبت خیال ظاہر کیا گیا تھا۔ لیکن ہم اس کی موقوفی کا حکم جب تک نہیں دے سکتے کہ اس باب میں زیادہ اور مفصّل حال تم سے نہ سنیں اور جن باتوں

کی تم سفارش کرو اس کے مقصد اور وجوہ پر ہم فرصت میں غور نہ کریں ۔

مرزا فخرو جب ولی عہد مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا تو گورنر جنرل لارڈ ڈیل ہوزی کو موقع ہاتھ لگا کہ اس جانشینی کے باب میں فیصلہ کریں مرزا فخرالدین فتح الملک وارث شرعی بادشاہ کے جانشینی کے لیے ہے۔ اس کی عمر تیس سال کی تھی۔ انگریزوں کی سوسائٹی کو پسند کرتا تھا۔ گورنر جنرل نے دیکھا کہ اس شہزادہ کی خصائل اور عالیت اس کے منصب کے لیے ایسی ہیں جس کے سبب سے جو تبدیلیاں وہ کرنی چاہتے ہیں۔ ان کو وہ دانشمندانہ سرانجام دے گا ۔

قلعہ خالی کرانے کی تجویز بے شک یہ ایک دانائی کی بات تھی کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد پادشاہی خاندان قلعہ سے باہر چلا جائے سلاطین کے سب حقوق موقوف ہو جائیں۔ یہ کام کچھ مشکل نہ تھا۔ لارڈ ڈیل ہوزی اس کام کو بغیر تاخیر کے کرنا چاہتے تھے۔ اپنے نزدیک بادشاہ کے مرنے کا انتظار دیکھنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ غالباً بادشاہ کو اگر کافی ترغیب دی جائے گی وہ قلعہ خالی کر دیں گے وہ یہ سمجھتے تھے۔ کہ قطب ایسا مقدس مقام ہے۔ جہاں ایک ولی اور باپ دادا کی قبریں ہیں۔ بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے آدمی آباد ہونے میں کوئی اعتراض نہیں کریں گے اور اگر اعتراض کریں گے تو اس بات پر غور کیا جائے گا کہ آیا ان پر دباؤ زیادہ نہ ڈالنا چاہئے۔ یا یہ تدبیر اختیار کی جائے کہ اگر وہ قطب میں جا کر آباد ہوں تو ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے ۔

مخالفت اور التوا ۱۸۵۰ء کے موسم بہار میں لارڈ ڈیل ہوزی کے پاس سے مراسلہ آیا جس میں اس باب میں ہدایتیں لکھی ہوئی تھیں بعض ممبروں نے لارڈ ڈیل ہوزی کی درخواست کے برخلاف اپنی رائے کو بڑے زور سے ظاہر کیا تھا۔ مسٹر ٹکر صاحب نے جن کی عمر اسی برس کی تھی رائے دی۔ میں اس بات کو ایک لمحہ کے لیے بھی یقین نہیں کر سکتا کہ خاندان شاہی ترغیب دینے سے قلعہ کو خود خالی کر دے گا۔ ہندوستان کے

آدمیوں کا خواہ وہ کیسے ہی غریب و مفلس ہوں باپ دادا کے سکونت کے مکان سے بڑی محبت رکھنا مشہور ہے وہ سب لوگ خوب جانتے ہیں جو ہندوستانیوں کی باتوں کو کچھ بھی سمجھتے ہیں۔ قلعہ سے اس خستہ حال خاندانِ شاہی کو الفت ہے۔ وہ ان کی گذشتہ شان و شکوہ کی نشانی ہے۔ یہ مطلب کہ قلعہ کو خاندان شاہی خالی کر دے صرف جنگی زور یا دھمکیوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جس میں گورنمنٹ کی ہتک ہوگی۔ اور اس سے برٹش گورنمنٹ کے خلاف کینہ و نفرت پیدا ہوگی۔" انہوں نے کہا میں لارڈ ڈیل ہوزی کی ذہانت اور فطانت اور پبلک سپرٹ کا ادب کرتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ خیال کرنا چاہیئے کہ یہ قلعہ کوئی بڑی حفاظت نہیں رکھتا اس کو تو بہت دفعہ اناڑی مجمعوں نے فتح کیا تھا۔ جو قواعد جنگ سے ناآشنا تھے۔" لارڈ ڈیل ہوزی مع کونسل کو کورٹ نے اختیار دیا تھا کہ وہ تجاویز مذکورہ کو عمل میں لائیں لیکن انہوں نے یہ سوچ کر کہ ان تجاویز کے برخلاف انگلینڈ میں بہت کچھ کیا گیا ہے گو اس سے میری اپنی رائے سابقہ میں تفاوت نہیں آیا۔ لیکن یہ کوئی کام ایسا اہم و ضروری نہیں کہ اس میں جلدی کی جائے اس لیے اس معاملہ کو ملتوی کر دیا۔

بہادر شاہ کی ناراضی یہ مباحثات ہو رہے تھے۔ کہ بادشاہی محل میں ایک شگوفہ کھلا کہ بہادر شاہ نے اپنی ناراضی ظاہر کی کہ مرزا فخرالدین اس کا جانشین ہو۔ بادشاہ کی بیوی زینت محل نے اس کو بھڑکایا تھا۔ اور یہ چاہا کہ اس کا بیٹا جس کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ بادشاہ کا جانشین ہو۔ مرزا فخرالدین کی جانشینی پر ایک یہ بھی اعتراض تھا کہ مرزا کا ختنہ ہوا ہے۔ اور یہ دستور ہے کہ جو شخص ساقط الاعضاء ہو وہ تخت نشین نہیں ہو سکتا مگر اس بیان میں مبالغہ تھا ہمایوں بادشاہ تک خاندانِ مغلیہ کے بادشاہ کا ختنہ ہوا تھا۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ سے وہ موقوف ہوا اس کا یہ قول تھا کہ بچوں کو ان کی معصومی کی حالت میں تکلیف زخم کی نہ دی جائے۔ جب وہ بارہ سال سے بڑے ہوں تو ان کو اختیار ہے کہ وہ اس تکلیف کو اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔ اس وقت

سے خاندان تیموریہ میں ختنہ کی رسم موقوف ہوئی عام خیال یہ تھا کہ شاہزادے ختنہ اس لیے
نہیں کراتے کہ وہ ساقط الاعضاء ہو جائیں گے جس کے سبب سے پادشاہی سے محروم ہو جائیں
گے اس خاندان کے ہر شہزادہ کو یہ خبط تھا کہ وہ پادشاہ ہو سکتا ہے شہزادے معاملات میں
یہ قسم کھایا کرتے تھے کہ خدا مجھے تخت نصیب نہ کرے غرض جہاں قلعہ کی حماقت و خرافت
کی اور باتیں تھیں ان میں سے یہ ختنہ کرانا بھی تھا۔ مگر جن شہزادوں کو اپنے مذہب کا پاس ہوتا
وہ اپنا ختنہ کراتے تھے۔ مرزا فخرالدین اپنے مذہب کا بڑا پابند تھا۔ اس نے اپنا ختنہ کرایا تھا۔
شہزادے اس کو تشرع ہونے کے سبب سے وہابی کہتے تھے۔ ان باتوں کے سبب سے لارڈ
ڈیل ہوزی نے حسب سررشتہ اس جانشینی کا معاملہ طے کرنے میں ایک مدت توقف کیا۔ اور
منتظر رہا کہ آگے اور کیا معاملات پیش آتے ہیں۔

صلاح و مشورہ اس عرصہ میں گورنر جنرل نے اپنی کونسل کے ممبروں سے اس جانشینی کے باب میں رائے طلب کی اس وقت ان کی کونسل کے ممبر مسٹر فریڈرک کری۔ مسٹر جان
ٹیلر اور جان لوئس تھے۔ اول ممبر نے یہ رائے دی کہ بادشاہ کے مرنے میں کچھ زیادہ دن کا
نہیں ہے۔ اس کے مرنے کے بعد ہم کو اس جانشینی کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اُس وقت ہم جس
امیدوار کو جانشینی کے لیے مقرر کریں گے۔ قلعہ کے خالی کرنے کی شرط بآسانی ٹھہرائیں گے۔
مسٹر جان ٹیلر کو یہ یقین تھا۔ کہ مسلمانوں کی آبادی قدیمی خاندان مغلیہ کو بڑے ادب اور محبت
کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ اس حرکت سے آزردہ اور خفا ہوگی۔ اس لیے اُنہوں نے یہ مشورہ
دیا کہ جو کام کیا جائے حزم و احتیاط اور ترغیب سے کیا جائے۔ جبر سے نہ کیا جائے۔ جان
لوئس ان سب باتوں کا مضحکہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ میں یہ یقین نہیں کرتا کہ ہندوستان کے
مسلمانوں کو ذرا سی بھی دہلی کی یا اس کے بادشاہ کی پروا ہو حزم و احتیاط یہ ہے کہ بغیر کسی
تاخیر کے بادشاہ کا خطاب موقوف کیا جائے۔ اور قلعہ خالی کرایا جائے۔

تدبیریں اور سازشیں ان تمام باتوں کا ماحصل یہ تھا کہ ایک مراسلہ انگلینڈ کو بھیجا گیا

جس میں یہ سفارش کی گئی کہ بادشاہ موجودہ کے مرنے تک تمام حالات سابقہ بدستور رہیں مرزا فخرالدین بادشاہ کے لقب کے ساتھ جانشین کے لیے تسلیم کیا جائے مگر اُسے خالی خطابی بادشاہ ہونے کی سبب سے قلعہ دینے کا حق نہ دیا جائے اور ترغیب جاری رہے کہ وہ قلعہ کو خالی کر کے قطب میں بود و باش اختیار کریں۔ اگر ضرورت پڑے تو اس کا حق قلعہ میں رہنے کا اضافہ مشاہرہ کے عوض میں خریدا جائے ۔

اہل شہر پر اسیمگی کی کیفیت

گورنر جنرل کی تمام سفارشوں کو ہوم گورنمنٹ نے منظور کیا۔ دہلی کے ایجنٹ کو اجازت دی گئی کہ مرزا فخرالدین سے ملاقات کر کے برٹش گورنمنٹ کی خواہشوں سے اُس کو اطلاع دے دے۔ مرزا الد سرطامس کی ملاقات ہوئی مرزا نے گورنمنٹ کی خواہشوں کو بخوشی قبول کیا۔ بشرطیکہ اس کو خطاب بادشاہ کا عطا کیا جائے۔ اور اسے اپنی عمارت شاہی قائم رکھنے کی اجازت دی جائے گورنمنٹ کو اس کی منظوری سے خوشی ہوئی۔ جب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی دہلی میں آئے قطب میں ان کی مرزا فخرالدین سے ملاقات ہوئی اور اس میں کچھ معاہدات ہوئے۔ جن کے اصل حال تو نہیں معلوم ہوتے۔ مگر قلعہ کے خالی کرنے کی راور اس کے اندر میگزین جانے کی شہرت ہو گئی جس سے اہل قلعہ اور اہل دہلی کو بڑی سراسیگی اور پریشانی اور خوف طاری ہوا۔ زینت محل اور بادشاہ دونوں جواں بخت کے ولی عہد نہ ہونے سے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ برٹش گورنمنٹ کو وہ کسی طرح نہ سمجھا سکے کہ جواں بخت ولی عہد ہو۔

جواں بخت کے خلاف درانداز یاں

۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرالدین کا ہیضہ سے انتقال ہوا۔ یہ شبہہ بھی ہوا کہ ان کو زہر دیا گیا۔ بادشاہی روزنامچہ میں لکھا گیا۔ مرزا کو اشتہا معلوم ہوئی اس نے جانا کہ خالی معدہ میں صفرا کے زور سے یہ اشتہا ہوتی ہے۔ کچھ روٹی کھائی یخنی پی تو استفراغ کی زیادتی ہوئی کسی دوا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ نزع کی حالت طاری ہوئی۔

مرزا الٰہی بخش (خسر ولیعہد) نے حکیم احسان اللہ خان کو بلایا انہوں نے حقنہ دلوایا جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ چھ بجے شام کو ولیعہد کا انتقال ہوا۔ گھر میں کہرام ہوا۔ بادشاہ کو بیٹے کے مرنے کی خبر ہوئی بہت رنج و ملال ہوا زینت محل نے اس کی تسکین و تشفی کی۔ ولیعہد کے معالج حکیم محمد نقی خان تھے۔ ان کی نسبت یہ مشہور ہوا کہ زینت محل سے مل کر دوا میں زہر ملا کر دے دیا۔ لیکن یہ سب بازاری گپیں ہیں۔ اس زمانہ میں شہر میں ہیضہ تھا۔ ولیعہد ہیضہ ہی میں مرا تھا۔ دوسرے دن سر طامس مٹکاف ایجنٹ دہلی بادشاہ کی خدمت میں آئے جہاں پناہ نے ایک کاغذ ایجنٹ کے ہاتھ میں دیا۔ اور اس میں اپنی پہلی درخواست کا اعادہ کیا کہ مرزا جواں بخت کو برٹش گورنمنٹ ولی عہد مقرر کر دے۔ اس کے ساتھ ایک محضر تھا۔ جس میں بادشاہ کے آٹھ بیٹوں کے دستخط لکھے ہوئے اور مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس محضر میں لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں۔ زینت محل کا لڑکا جس میں خاندانی لیاقت علم و خوش اخلاقی کے صفات موجود ہیں۔ ولی عہد مقرر ہو۔ لیکن دوسرے دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قریش دعوت۔ مرزا قویش نے اپنی عرضداشت میں ایجنٹ کو لکھا کہ بادشاہ نے شہزادوں سے اضافہ تنخواہ کا اور روپیہ دینے کا وعدہ کر کے محضر پر دستخط اور مہریں کرا لی ہیں۔ مجھے بھی پوشیدہ یہ رشوت پیش ہوئی تھی۔ کہ اگر دستخط و مہر کر دے گا تو اضافہ تنخواہ ہو جائے گا۔ اور اگر انکار کروں گا تو تنخواہ بند ہو جائے گی۔ میں اپنے باپ کے حکم سے سرتابی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ زینت محل کے اغوا سے بادشاہ مجھے ولی عہدی سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو میں نے برٹش گورنمنٹ کی طرف رجوع کی ہے میں اس طرح تباہ ہوتا ہوں اور میرا حق مارا جاتا ہے اس لیے میں نے اپنے کو ایجنٹ کے روبرو پیش کیا ہے وہ سب حالات پر نظر کر کے حق رسی کرے۔ عمدہ اس لیے کہ میں بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوں۔ حافظ قرآن اور حاجی بھی ہوں۔ ہمدردی یا قتول کا حال ملاقات میں آپ پر کھل جائے گا۔ لارڈ کیننگ کا خیال تھا کہ بادشاہی نقل کے جلال بہت سے زرد جواہر اتر چکے ہیں۔ جن سے اس کی پہلی سی چمک دمک نہیں رہی ہے لہٰذا اس کے وہ حقوق جن پر خاندان تیمور کو گھمنڈ تھا ایک دوسرے کے بعد تلف ہو چکے

ہیں اس لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ کہ قسم کے ایک ڈوبے ہیں بہادر شاہ کے مرنے کے بعد بادشاہ کا لقب موقوف کر دیا جائے۔" انہوں نے کہا" کہ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف دیتے تھے موقوف ہوئی۔ بادشاہ کا جو سکہ بنایا جاتا ہے ۔۔ وہ آئندہ موقوف کیا گیا۔ د بہادر شاہ کے سکے پہلے بنا کرتے تھے میں نے اس کے سکے کے روپیہ کو دیکھا ہے۔ ا گورنر جنرل کی مہر میں سے بادشاہ کے فدوی خاص کے الفاظ ساقط ہوتے۔ اور ہندوستانی رئیسوں کو ممانعت کی گئی کہ وہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ یہ امر فیصلہ ہو گیا ہے۔ کہ یہ ظاہری یا ئمں جن سے کہ کمپنی کی ماتحتی معلوم ہوتی ہے۔ برٹش گورنمنٹ کی اصلی اور مستحکم اقتدار کی شان کے خلاف ہے۔ اور ایسا ہی لفظ شاہ دہلی کا ہے۔ جس سے ایک جھوٹی بادشاہی کا اعلان ہوتا ہے کسی نئے شخص کے لیے بادشاہ کا لقب دینا اور اس کی شاہی علامات کا قائم رکھنا گورنمنٹ ہند کی خود اپنی مرضی کا کام ہے۔ اس پر کوئی اس کا تقاضا نہیں ہے۔ گورنر جنرل نے یہ اور اضافہ کیا کہ خواہ صرف مرتبہ ہی ہو اس کا مستحق وارث گورنمنٹ مرزا قریش کو سمجھتی ہے۔ وہ بادشاہ کا سب سے بڑا زندہ بیٹا ہے۔ جو ایک اور نسل ملک اصل شان اپنے خاندان کی باقی رکھے گا جس کی یاد کو وہ اپنے حافظہ میں لانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔ گورنر جنرل نے باتفاق اپنی کونسل کی رائے کے جس پالیسی کا فیصلہ کیا اس کو مع ہدایتوں کے دہلی کے ایجنٹ کے پاس بھیجا جن کا خلاصہ یہ تھا :

لارڈ کیننگ کی ہدایتیں

اوّل اگر ایجنٹ کو بادشاہ کے خط کا جواب بھیجنا ضروری معلوم ہو تو وہ اس کو لکھے کہ گورنر جنرل مرزا جواں بخت کا ولی عہد ہونا منظور نہیں کر سکتا ہے۔

دوئم مرزا قریش کو یہ امید نہ دلائی جائے کہ اس کی ولی عہدی کے لیے وہی شرائط منظور ہوں گی جو مرزا فخرالدین کے لیے منظور ہوئی تھیں اور بہادر شاہ کی زندگی میں بادشاہ سے یا کسی اور رکن خاندان شاہی سے جانشینی کے باب میں کوئی مراسلت نہ کی جائے۔

سوم پادشاہ کی وفات کے بعد مرزا قریش کو اطلاع دی جائے کہ گورنمنٹ خاندان تیمور کا سرپرست اس کو ان ہی شرائط کے ساتھ مقرر کرتی ہے۔ جو مرزا فخرالدین کے ساتھ ہوئی تھیں سوا اس کے کہ اس کا لقب بجائے پادشاہ کے شہزادہ ہوگا اور اس کی دستاویز کوئی اس کو تحریر نہ دی جائے۔ گورنر جنرل مع کونسل کا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ عہدو پیمان کرنے کو قبول کرے بلکہ وہ گورنمنٹ انڈیا کے پختہ اور مستحکم فیصلہ کا اظہار کرے ۔

چہارم - ایجنٹ اس امر کی رپورٹ بھیجے کہ قلعہ میں جن لوگوں کے رہنے کا استحقاق ہے ان کی تعداد کتنی ہے اور کتنے شہزادوں کو استحقاق حاصل ہے۔ جو نہ پادشاہ کے بیٹے اور پوتے ہیں اور نہ پادشاہوں کے زیادہ دور کے رشتہ دار ہیں ۔

پنجم - خاندان تیمور کا جو وظیفہ ہے۔ ان میں سے پندرہ ہزار روپیہ ماہوار مرزا قریش کو ملا کریں گے۔ بہادر شاہ کو اپنے حفظ صحت اور تفریح طبع کے لیے قطب میں رہنا بہت پسند تھا۔ وہ سال بھر میں دو چار مہینہ وہاں رہتا تھا۔ اور نئے نئے مکانات وہاں قلعہ کے مکانات کے ناموں پر مثل دیوان عام و خاص وغیرہ کے بنواتا تھا وہ خاندان چشتیہ کا مرید تھا۔ قطب صاحب کی زیارت سے مسرور ہوتا تھا۔ وہیں اس نے اپنی قبر سنگ مرمر کی بنوائی تھی۔ اس کے وہاں رہنے سے اس کے غریب ملازموں کو اپنی گھر کی دوری رہنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ زینت محل قلعہ میں نہیں رہتی تھی۔ وہ لال کنوئیں پر اپنی ایک بڑی حویلی میں رہتی تھی۔ دن کے آٹھ نو بجے قلعہ میں جاتی اور سہ پہر کو اپنی حویلی میں واپس آتی اس کی سواری کے ساتھ آنے جانے میں گھوڑے پر ڈنکا بجتا ہوا جاتا تھا۔ اس لیے اہل شہر نے اس کا نام ڈنکا بیگم رکھ دیا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بھی اس کی حویلی میں جاکر آٹھ سات روز تک رہا تھا۔ غرض بہادر شاہ اور بیگم صاحب نے قلعہ سے باہر رہنے کی بدشگونی خود ہی شروع کردی دونوں کو قلعہ کے چھن جانے کی پروا نہ تھی۔ بادشاہ خوش تھا کہ اس کے مرنے کے

بعد مرزا فتح الملک کو جو اس کی مرضی کے خلاف ولی عہد ہوا تھا۔ قلعہ نہ دیا جاتے ان کو سخت رنج یہ تھا کہ اس کا لخت جگر جواں بخت ولی عہد نہیں ہوا تھا۔ پہلے ہی ان کے دلوں پر مرزا فخرالدین کی ولی عہدی کا زخم لگا تھا۔ ابھی وہ بھرنے نہ پایا تھا کہ اس پر مرزا قریش کی ولی عہدی نے اور چرکا لگایا۔ جس سے وہ دونوں بے تاب ہو گئے۔ رات دن اسی اُدھیڑ بن میں رہتے تھے۔ کہ کسی طرح سے گورنمنٹ کو مرزا جواں بخت کی ولی عہدی پر راضی کریں۔[1]

---

[1] تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۲۸۴

باب ۹

امرائے ہند کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ

انگریز اس ملک میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، پھر اپنی فریب کاریوں، نفاق انگیزیوں، چالاکیوں، اور موقع پرستیوں سے فائدہ اٹھا کر، یہاں کے حکمران بن گئے، برطانیہ عظمیٰ کے طرۂ افتخار کا سارا دبدبہ، ہندوستان پر منحصر تھا، یہاں کے عوام، یہاں کے خواص، امراؤ رؤسا، والیانِ ریاست نواب اور راجہ، سب اپنی خود غرضیوں اور مصلحتوں اور مجبوری کے پیش نظر انگریزوں کا ساتھ دیتے تھے، اپنی جڑ کاٹتے تھے، اور انگریزوں کو فائدہ پہونچاتے تھے، خود غلامی پر قناعت کرتے تھے، انگریزوں کے سر پر تاج شہریاری رکھ دیتے تھے، اپنے حدود میں یہ راجہ رایان تھے، اشرف الممالک تھے، وزیر باتدبیر تھے، شاہ ذی جاہ تھے، ان کے منہ سے نکلا ہوا، ایک ایک لفظ حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن انگریز کے دربار میں یہ صرف فدوی خاص اور خادم باختصاص تھے، وہاں ان کی نیاز مندیاں، نمک خواریاں، تابعداریاں، اور ان کے مقابلہ میں انگریز کی رعونت اور نخوت قابل دید تھی، اپنے حدود میں ان کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ کسی کی مجال نہیں چوں کر سکے، اور انگریز کے ایوان اقتدار میں ان کی مجال نہیں تھی کہ چوں کر سکیں۔

ان نیاز مندیوں اور فرماں برداریوں کا صلہ انگریز نے ہمیشہ تحقیر و تذلیل اور توہین کی صورت میں دیا، کبھی ان کی بات نہ مانی، کبھی ان کی شخصیت کا پاس و لحاظ نہ کیا، اپنا کام ہمیشہ ان سے نکالا ان کا کوئی کام نہیں کیا، خود جب چاہا، سندھیا اور ہلکر کی شان سے ان کے ہاں پہونچ گیا، شکار کھیلا، دعوتیں اڑائیں، قیمتی تحفے لیے، خراج وصول کیا، جتنی زمین چاہی قبضہ میں کر لی، جو شہر چاہا فوجی معاونت کے لیے حاصل کر لیا، اور جب کبھی یہ اس کے ہاں پہنچے، تو ان کی بات بھی نہ پوچھی، اور پھر بھی

ان کی وفاداری اور نیاز مندی میں فرق نہیں آیا ؎

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

امرائے ہند کے ساتھ انگریزوں کے برتاؤ کی داستان اگرچہ دل خراش اور تکلیف دہ ہے، لیکن موضوع کا تقاضہ یہ ہے کہ اس پر بھی ہم ایک نظر ڈالتے چلیں، خواہ وہ کتنی ہی سرسری کیوں نہ ہو :-

(۱)

ملاقات کی فرصت نہیں

انگریز، والیانِ ریاست، امراؤ روٴسا، اور ناموران ہند کی توہین و تذلیل کے عادی ہو چکے تھے، یہ لوگ، محض نیاز مندی، اور وفاداری کے اظہار کے لیے، طالب دیدار ہوکر، آتے تھے، مگر محروم وناواپس کر دیئے جاتے تھے۔ ذرا بھی پاس خاطر ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ گو

از دربار چہ گویم بہ چہ عنواں رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

یا اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ ہیں،

نصیب ہو نہ سکی دولت قدم بوسی
ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے

نمونۃً ذیل کے چند واقعات ملاحظہ ہوں :۔

" راؤ رتلام رئیس ریواڑی کے وکیل نے ایجنٹ بہادر سے عرض کی کہ راؤ رتلام صاحب ملاقات کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں جواب دیا ملاقات کی فرصت نہیں ہے۔ "(۱)

بیچارے نے یہ جواب سنا، مایوس و محروم واپس چلے گئے ؎

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے تا کل خفا نہ ہو
ٹکڑے تو ڈھونڈ لیں دلِ صد پاش پاش کے

(۲)

ایجنٹ بہادر کی فرعونیت

امین الدین خان جاگیردار لاھو ہارو نے ایجنٹ بہادر کو لکھا تھا چونکہ میں اپنی جاگیر کو واپس جانے والا ہوں۔ اس لیے رخصتی ملاقات کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ ایجنٹ بہادر نے جواب دیا " ہمیں ملاقات کے لیے فرصت نہیں ہے" (۲)

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۲۳

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صـ۵۸

(۳)

صاحب کی عدیم الفرصتی

مصطفےٰ خاں جاگیردار کے نمائندے نے اپنے آقا کی طرف سے ملاقات کی خواہش کی۔ صاحب نے فرمایا فرصت نہیں ہے۔

نیز خبر آئی ہے کہ شاہی نمائندہ نے اپنے بادشاہ (بہادر شاہ) کے خسر احمد قلی خاں کی طرف سے ملاقات کی خواہش کی صاحب نے فرمایا اس وقت فرصت نہیں ہے کوٹھی پر بہت انگریز جمع ہیں۔ (۱)

(۴)

قمار باز کی سفارش

انگریزوں کے متعلق مشہور ہے، کہ نہ وہ کسی کی سفارش کرتے ہیں، نہ کسی کی سفارش قبول کرتے ہیں، ان کے ہاں مدار کار، صرف عدل و انصاف ہوتا ہے، نہ کہ سعی و سفارش، لیکن اپنے ابتدائی دور حکومت میں جس چیز پر بہت زیادہ سختی سے وہ کاربند رہے، وہ یہ تھی کہ سفارش مانتے نہیں تھے، کرتے تھے، چنانچہ ذیل کا دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو:۔

"مستی سوہن نے ایجنٹ آفس کو عرضی دی۔ کہ نواب صاحب فرخ نگر نے مجھے فرخ نگر سے نکال

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری ص ۲۳

دیا ہے۔ حدود فرخ نگر میں داخل ہونے کی ممانعت کردی ہے۔ کیفیت پر نواب صاحب نے لکھا سوہن کو قماربازی کی وجہ سے شہر بدر کیا گیا ہے۔ صاحب ایجنٹ نے نواب صاحب کو لکھا۔ نامبردہ کو فرخ نگر میں رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ اگر قصور کرے گا سزا پائے گا۔ (۱)

(۵)

مجسٹریٹ کے اختیارات

انگریزوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ اپنے نظام مملکت میں اس پر سختی سے عامل تھے کہ کوئی حاکم، دوسرے حاکم کے اختیارات میں مداخلت نہ کرے، ہر شخص اپنی حد کے اندر رہے، حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کرے، لیکن جب وہ حکمران بن رہے تھے، تو اس معمول کی بھی انہوں نے پروا نہیں کی:۔

"مجسٹریٹ کا روبکار آیا کہ تمام جاگیرداروں اور رئیسوں نے مجسٹریٹ کی ہدایت کے موافق اپنے اپنے ہاتھیوں کو احتیاط سے چلانے کا اقرار نامہ لکھ دیا ہے مگر امین الدین خان جاگیردار لوہارو اقرار نامہ لکھنے سے انکار کرتے ہیں۔ صاحب ایجنٹ نے لوہارو کے نمائندے سے فرمایا آپ کے نواب صاحب عدالت کے حکم کے خلاف کرتے ہیں یہ بات اچھی نہیں سب جاگیرداروں نے اقرارنامہ لکھ دیا ہے آپ بھی لکھ دیجئے لوہارو کے نمائندے نے عرض کی ریاست لوہارو کے معاملہ کا تعلق ایجنٹ آفس سے ہے مجسٹریٹ سے نہیں ہے۔ نہ مجسٹریٹ کو اقرار لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

---

(۱) سرمامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۵۲

امین الدین خان اقرار نامہ نہیں لکھیں گے اگر جناب عالی زیادہ تاکید فرمائیں گے تو ہاتھیوں کو فروخت کر دیں گے یا لوہارو کو بھیج دیں گے دہلی میں نہیں رکھیں گے صاحب ایجنٹ نے فرمایا آپ کا عذر بے جا ہے ۔ (۱)

(۶)

زبردست مارے اور رونے نہ دے

انگریزوں کی اس خصوصیت پر بھی بڑا زور دیا جاتا ہے کہ اصول اور نظم کے معاملہ میں، وہ کسی کی پروا نہیں کرتے، نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن صرف ہندوستانیوں کی حد تک ۔ ورنہ جہاں اپنے کسی ہم قوم یعنی انگریز کا معاملہ پیش آجاتا تھا وہ اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے، اور علانیہ طور پر دھاندلی اور سینہ زوری کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے ۔

یہ واقعہ ملاحظہ ہو :۔۔۔

۔ کپتان گرانٹ آگرے کو جا رہے تھے، راستے میں بلب گڈھ کے علاقہ میں پڑاؤ کیا، وہاں کے آدمیوں نے مزاحمت کی اس پر لڑائی ہوئی بلب گڈھ کے نمائندے نے حاضر ہو کر عرض کیا کپتان گرانٹ بلب گڑھ کے مندر میں گئے تھے ۔ مندر کے پجاریوں نے روکا، کپتان نے پجاری کو اتنا مارا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا، اور پجاری کے دو ساتھیوں کو بھی زدو کوب کیا، صاحب ایجنٹ نے فوراً راجہ بلب گڑھ کو لکھا، آپ کے لیے مناسب یہی ہے خود پلول ہوڈل پہنچ کر کپتان سے

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صہ ۲۳۲

معافی مانگیں اور راضی نامہ کر کے ہم کو بھیج دیں۔ کپتان گراٹ گورنر جنرل کے آدمی ہیں استغاثہ گورنر جنرل تک جائے گا، تو نتیجہ آپ کے لیے اچھا نہیں نکلے گا، کپتان صاحب کو راضی کر لینا ہی مناسب ہے۔ (۱)

(۷)

مسلمانوں سے میل جول کی سزا

"لڑاؤ اور حکومت کرو" انگریزوں کی پالیسی تھی، اس پالیسی پر وہ سختی سے قائم رہے۔ کبھی اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔

غدر سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات وہ نہیں تھے جو آج ہیں اس کے برعکس ان میں وضعداری تھی، شرافت تھی، رکھ رکھاؤ تھا، آن تھی، انگریز جب اس طرح کے واقعات دیکھتے تھے، تو گوشت سے ناخن کو جدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ ذیل کا واقعہ خاص طور پر غور طلب ہے:-

مہاراجہ راؤ بلونت سنگھ (مہاراجہ الور) نے پانچ برس فالج میں مبتلا رہ کر ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ بعد ان کا کمسن بیٹا مہاراجہ شیودھان سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس کے ابتدائی دور میں امین اللہ صاحب دیوان تھے۔ بعدا سفندیار بیگ نائب۔ لیکن بعد میں کشمکش شروع ہو گئی۔

امین اللہ خاں عرف امو خاں ایک معمولی آدمی تھے۔ ترقی کرتے کرتے وہ الور میں مختاری کے

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۰

عہدے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے منجھلے بھائی افضل اللہ خاں کو نائب دیوان اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا۔ یعنی ریاست کے تمام امور پر حاوی ہو گئے۔ تینوں بھائی بڑے ذکی اور زیرک و ہوشیار تھے۔

اسفندیار پہلے فیروز پور جھرکہ میں ملازم تھا۔ پھر الور پہنچ گیا۔ شروع میں وہ اور امین اللہ خاں ایک دوسرے کے بہی خواہ تھے۔ پھر کسی بات پر ناچاقی ہو گئی۔ اور اسفندیار نے ان بھائیوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

امین اللہ خاں نے شیو دھان سنگھ کی والدہ کو بہن بنا لیا تھا اسی وجہ سے راجہ اسے ماموں کہہ کے پکارتا تھا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایک وقت میں وہ تینوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی بیٹی سے شادی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس کا میلان مسلمانوں کی طرف بہت زیادہ تھا۔ اسفندیار نے اسی بات کو مخالفانہ سازباز کی بنا بنا لیا۔ اور راجپوت ٹھاکروں سے کہنا شروع کیا۔ کہ مسلمان سارے کاروبار پر حاوی ہو گئے ہیں۔ اگر یہی صورت قائم رہی تو راجہ مسلمان ہو جائے گا۔

ایک ٹھاکر نے جوش میں آکر رات کے وقت امین اللہ خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ جس میں دیوان کا ایک بیٹا اور ایک خدمت گار مارے گئے۔ اور تینوں بھائیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ راجہ نے ان کو رہا کر کے دہلی بھجوا دیا۔ پھر ایک ریجنسی کونسل بنی جس کے صدر کپتان "نپلے" تھے۔ انہوں نے اصلاح کی ہرچند کوشش کی۔ لیکن راجہ کے صرف تین مطالبے تھے۔ جو آخر وقت تک قائم رہے

۱ - مجھے اختیارات دیئے جائیں۔

۲ - دیوان بھائیوں کو واپس بلایا جائے۔

۳ - ٹھاکروں کو سزا دی جائے۔

۱۸۶۳ء میں راجہ کو اختیارات ملے۔ کچھ مدت تک کام بڑی اچھی طرح جاری رہا۔ لیکن پھر بدنظمیاں پیدا ہو گئیں۔ اور راجپوت موقوف ہونے لگے۔ جن سے راجہ کو سخت نفرت تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں سے گہرا میل جول تھا۔ ۱۸۷۰ء میں پھر راجہ صاحب بے اختیار کر دیئے گئے۔

۹ اکتوبر ۱۸۴۲ء کو وفات پائی ۔ (۱)

(۸)

الور اور تجارہ

وہ انگریز گورنمنٹ جو دوسرا دھڑ ریاستیں ضبط کر رہی تھی، جب اپنے مصالح دیکھتی تھی تو یہ بھی کرتی تھی کہ حقدار سے حق چھین کر اسے دے دیتی تھی جس کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ذیل کے واقعہ سے معلوم ہوگا ۔

" آج رات بارش ہوئی تجارہ کے راجہ بلونت سنگھ نے دنیا سے رحلت کی ان کی عمر تقریباً ۴۵ برس کی تھی ان کے ورثاء میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو ان کا جانشین قرار پا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ریاست اور تمام متروکہ مال و اسباب مہاراجہ الور کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ مہاراجہ عرصے سے اس بات کے خواہشمند تھے ایجنٹ نے بھی مہاراجہ کے موافق ہی فیصلہ کیا ہے۔ تمام ریاست پر عمل دخل کے لیے راجہ صاحب نے اکرام اللہ خان اور اسفندیار خان کو پیادوں کی ایک پلٹن اور سواروں کے ایک رسالہ کے ساتھ تجارہ روانہ کر دیا ان اصحاب نے تجارہ پہنچ کر اہل فوج اور تنخواہ داروں سے ان کی مطلوبہ رقوم کی ادائیگی کا وعدہ کر کے بیس لاکھ روپیہ نقد پر قبضہ کر لیا۔ اس میں چھ ہزار اشرفیاں بھی شامل ہیں ۔ (۲)

---

(۱) غالب (غلام رسول مہر) صفحہ ۲۳۹

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۵، ۷ فروری ۱۸۴۵ء

(۹)
شمس الامرا کی موقوفی

گو اور مقامات سے وحشت ناک خبریں شہر میں شہرت پائیں اور فساد کرنے پر آمادگی پیدا کرتی تھیں جس سے سالار جنگ اور نظام کے لیے دشواریاں زیادہ ہوتی تھیں مگر گورنمنٹ نظام اور برٹش ریذیڈنٹ میں آپس میں حسن ظن اور اعتماد ایسا تھا کہ فقط اس سبب سے امن و امان رہا نظام سب قسم کی حکمتیں کام میں لاتا تھا جو ہندوستانی صاحب قدرت گورنمنٹ کام میں لاسکتی تھی کہ بدخواہوں کے جوش مذہبی کو رد کرے۔

راجہ (شولاپور) چند سواروں کو ہمراہ لے کر حیدر آباد کی طرف مفرور ہوا۔ بازار میں پھرتا تھا کہ سر سالار جنگ نے اس کو گرفتار کر کے رزیڈنٹ کے حوالہ کیا۔

جب راجہ بھاگ گیا تو شولاپور کو سپاہ نے خالی کر دیا کپتان روس کیمپل نے اس ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا بس اس طرح قلمرو حیدر آباد میں جو فساد اٹھا تھا وہ ختم ہو گیا اگر خدا نخواستہ حیدر آباد کا نظام سرکشی کرتا تو ہندوستان میں بڑی ہل چل پڑتی سارے دکن میں زلزلہ آجاتا اور طوفان برپا ہوتا مگر یہ سالار جنگ ہی کی دانائی اور دور اندیشی تھی کہ انہوں نے اس ملک میں بغاوت کے ہنگامہ کو برپا نہیں ہونے دیا ۔ (۱)

لیکن اپنی سالار جنگ نے جب برار کا مطالبہ کیا، تو گرفتار ہوتے ہوتے بچے،

---

(۱) تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) صفحہ ۱۲۹
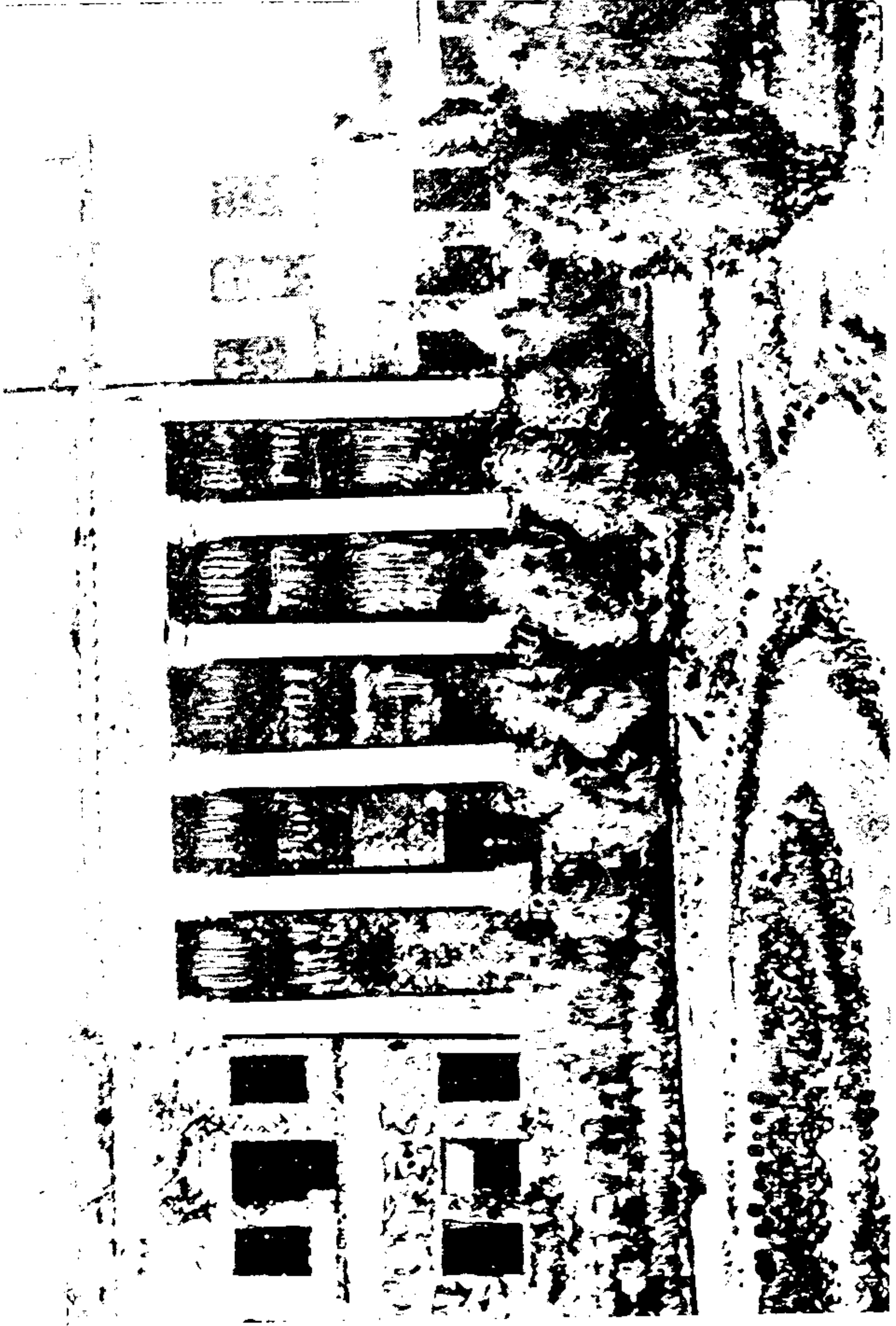
حیدر آباد دکن میں انگریز ریذیڈنٹ کی کوٹھی۔ جہاں آزادی ہند کے خلاف اور
برطانوی استحکام کی تائید میں سازشیں ہوتی تھیں

اور یہی نظام جس کے یہ کارنامے تھے، جسے اتنے شاندار الفاظ میں خراج تحسین انگریزوں نے پیش کیا، جس کے احسانات کا اعتراف کیا، اتنا حق اور اختیار بھی نہیں رکھتا تھا کہ اپنا وزیر اعظم اپنی مرضی سے رکھ سکے۔

جنرل فریزر رزیڈنٹ کے مشورے سے نظام حیدرآباد نے وزیر اعظم شمس الامراء کو موقوف کر دیا۔ (۱)

(۱۰)

نواب شمس الدین خاں کا قتل

انگریزوں کا عہد حکومت، اس اعتبار سے تو شرمناک تھا ہی کہ انہوں نے عوام پر اتنے مصائب توڑے کہ وہ زندگی سے تنگ آ گئے، نفرت کرنے لگے زندگی سے۔ لیکن اس اعتبار سے اور زیادہ شرمناک ہے کہ جن لوگوں نے، انگریزوں کی مدد کی، جنہوں نے ہر مرحلہ پر آنکھ بند کر کے ان کا ساتھ دیا، جنہوں نے، اپنے بادشاہ، اپنے ملک، اپنی قوم، اور اپنی ملت تک کا ساتھ انگریزوں کے مقابلہ میں نہیں دیا، انہیں بھی انگریزوں نے معاف نہیں کیا۔ ستایا، دکھ دیا، پریشان کیا، اور جب کسی نے، ذرا اکڑ دکھائی، اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا، غرض ———

ع ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں

اس سلسلہ میں، نواب شمس الدین خاں (دوبارہ) کو جس طرح، پھانسی دی گئی، وہ ایک

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲۳۲

اہم واقعہ ہے، اور اسے ذرا شرح اور بسط کے ساتھ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلے نواب شمس الدین خاں کا سراپا ملاحظہ ہو :-

ٹھوڑی تارا، ماتھے پر چاند سورج کی سی کرن، رنگ میدہ و شہاب سوالی ناک، غلافی آنکھ چہرہ کی چھب دل میں کھبی جاتی ہے، ہر عضو بدن سانچہ میں ڈھلا ہوا عجب سج دھج سے چلا آتا ہے یہ کون نوجوان ہے کہ اہل دربار اسے ٹکٹکی باندھ دیکھ رہے ہیں جس کی جہاں نظر پڑی جم کر رہ گئی ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ۔ بے ساختہ زبان پر آیا ؎

بسانِ شکل تو بت کمتر آفرید خدا

ترا کشیدہ دوات از قلم کشید خدا

یہ نیرّ تاباں شمس الدین خاں والی فیروز پور و لوہارو ہے، یہ آفتاب حسن ہے، تمام فنون سپہ گری کا مسلم الثبوت استاد، شاعر ہے، اور بڑے پایہ کا نقاد، اس کا دربار اہل کمال اور اہل علم کا ملجاو ماوے ہے ۔

مہر نیم روز نواب احمد بخش خاں صاحب والی فیروز پور لوہارو کے دو محل ہیں ایک کی اولاد میں مہر نیم روز شمس الدین خاں ہیں دوسری کے بطن سے نواب امین الدین خاں صاحب اور نواب ضیاء الدین خاں صاحب بڑے لڑکے کو فیروز پور کہ حاصل ریاست ہے عطا ہوتا ہے آخرالذکر دونوں کو لوہارو نواب احمد بخش خاں صاحب خلد آشیانی ہوئے ۔

ترکہ منقولہ و غیر منقولہ نواب امین الدین نے منشی کو طلب کیا دوات قلب سیاہ لے کر آئی صفحۂ قرطاس نقش محبت سے پاک قلم دو دریدہ روئے سیاہ لیے حاضر ہوئی صفحۂ ہستی سے حرف محبت اٹھ رہا ہے سرکار انگریزی میں درخواست گذاری کہ والد مرحوم کی وصیت متروکہ غیر منقولہ کی بابت ہے ترکہ منقولہ ہم میں تقسیم کر دیا جائے — بنائے مخاصمت پڑ گئی دو رئیسوں میں بگڑ گئی فیصلہ امین الدین خاں صاحب کے موافق ہوتا ہے شمس الدین

خان صاحب آگرہ میں اپیل کرتے ہیں ولایت کے قانون کے مطابق تو بارہ بھی بڑے لڑکے نواب شمس الدین خان صاحب کو مل جاتا ہے امین الدین خان صاحب اور ضیاء الدین خان صاحب کے حق میں ایک ایک ہزار روپیہ گذارہ کا حکم ہوتا ہے۔

فریزر کی شرارت نواب امین الدین خان صاحب کے پاس یہ کون انگریز بیٹھا ہے ؟ او ہو فریزر صاحب ہیں چپکے چپکے باتیں ہو رہی ہیں۔ افسردہ خاطر سے بیٹھے ہیں۔

فریزر کہتا ہے بھائی امین الدین پریشان نہ ہو اس وقت اچھا موقع ہے کلکتہ کا گورنر جنرل میرا دوست ہے تم وہاں اپیل کرو میں سفارشی چٹھی دیتا ہوں کام بن جائے گا۔ پردہ کے پاس یہ کون کن سوئیاں لے رہا ہے غضب ہو گیا۔ یہ تو مجبر بیگ شمس الدین کا آدمی ہے بھائی کے ہاں ٹوہ لینے کو چھوڑ رکھا ہے پتنگ چھڑی پل کی پل میں نواب شمس الدین خان صاحب کے ہاں جا پہنچا سارا معاملہ کہہ سنایا نواب صاحب کی خاطر عاطر مکدّر ہو گئی ٹہل رہے ہیں چہرہ غصہ سے تمتما رہا ہے مسادی عنادی یہاں بھی موجود ہیں ایک نے کہا فریزر نے بڑا غضب ڈھا رکھا ہے جب تک یہ ہے جمع خاطر معلوم دوسرا بولا قضا سر پر کھیل رہی ہے تیسرے نے کہا منٹوں میں چٹ پٹ کیا جا سکتا ہے نواب صاحب نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور کریم خاں کو طلب کیا سیاہ فام گرانڈیل جوان ہے آنکھوں سے تیوری ٹپک رہی ہے چپکے چپکے اُس کو کچھ ہدایتیں دیں اور کہا انیا اور واصل کو سانڈنیوں پر ساتھ لے جاؤ وہ آداب کر چلتا ہوا نواب صاحب ایک غوطہ میں خوش بیٹھے ہیں۔

فریزر کا قتل اندھیری رات ہے اور چاروں طرف سناٹا ایک شخص گھوڑے پر سوار اور دو سانڈنی سوار دلّی کے قریب باڑے پر درختوں کی آڑ میں کھڑے ہیں۔ ایک سنجے کا عمل ہے ایک انگریز تن تنہا گھوڑے پر سوار اس طرف چلا آ رہا ہے سانڈنی سواروں نے راستہ روکا گھوڑے پر جو شخص ہے اس نے ایک ہاتھ تلوار کا دیا۔ انگریز طپنچہ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتا تھا کہ ایک تلا ہوا ہاتھ اور مارا کام تمام کر دیا پچھاڑ کھا کر گرا۔ خون کے فرّاٹے بہ گئے تمام زمین لہو لہان ہو گئی۔ انگریز مارا گیا۔ یہ خون رنگ لائے گا۔ جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

قاتلوں نے اپنا اطمینان کیا کہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے یا ابھی کچھ جان باقی ہے سانڈنی سواروں نے اپنی راہ لی اصل قاتل نے دلی کا رُخ کیا۔ شہر کے دروازے بند ہیں یہ تمام رات باہر پھرتا رہا صبح دلی دروازے سے داخل ہوا دریا گنج میں نواب صاحب فیروز پور کی کوٹھی میں آیا اور یہ تو کریم خان ہے جس کو کچھ روز پہلے ہم نے نواب شمس الدین خان صاحب کے پاس دیکھا تھا۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ سستانے کو چار پائی پر لیٹ گیا ،

یہ کس کی نعش ہے جسے تمام افسران گھیرے کھڑے ہیں آپس میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ایک بولا فریزر صاحب رات کو مارے گئے دوسرے نے کہا راجہ صاحب بلب گڑھ کے ہاں سے دعوت کھا کر جا رہے تھے تیسرا بولا نعش باوٹے پر ملی قاتل مفرور ہے لارنس صاحب مجسٹریٹ قریب کھڑے زخموں کو دیکھ رہے ہیں کہ نواب فتح اللہ بیگ تشریف لائے یہ نواب امین الدین صاحب کے قریبی رشتہ دار ہیں نعش دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے کہنے لگے بھائی فریزر میں پہلے ہی کہتا تھا کہ کریم خان تجھے فیروز پور سے مارنے آیا ہوا ہے تو اکیلا دکیلا نہ پھر تو نے میری بات نہ مانی اور اپنی جان دی یہ بات لارنس صاحب نے سنی اور مجمع سے باہر آگئے سیدھے نواب صاحب فیروز پور کی کوٹھی پر پہنچے قضا عند اللہ دروازہ پر کریم خان کھڑا ہے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا سپاہی۔ کیا نام؟ جواب ملا کریم خان دریافت کیا کہ دہلی کب آیا؟ اس نے جواب دیا کہ کوئی دس روز ہوئے۔ کیوں آیا تھا؟۔ سرکاری کام کو۔ اصطبل دریافت کیا۔ اس نے اشارہ سے بتایا وہاں دیکھا تو ایک گھوڑا پسینہ میں شرابور کھڑا تھا کریم خان سے دریافت کیا تیرا گھوڑا کون سا ہے اس نے اسی کی طرف اشارہ کیا کریم خاں گرفتار ہوا ۔

دو سانڈنی سوار مارا مار منزلیں مارتے فیروز پور کی طرف چلے جا رہے ہیں سانڈنیاں پسینہ پسینہ ہو رہی ہیں پر یہ دبائے لیے چلے جاتے ہیں۔ صبح ہوتے فیروز پور آیا۔ محل کے دروازے پر پہنچے اطلاع کروائی کہ واصل حاضر ہے فوراً طلبی ہوئی نواب شمس الدین خان صاحب مع مصاحبوں کے بیٹھے تھے یہ آداب بجا لایا اور کہا۔ حضور مبارک ہو کام تمام کر دیے آپ کے اقبال سے

ارشاد ہوا۔ شاباش! جا آرام کر واصل باہر نکلا ہی تھا کہ ایک مصاحب نے کہا اس کو مروا دیجئے مبادا قبول وے نواب صاحب نے قدرے توقف کیا پھر آواز دی واصل کو بھیجو وہ یہ باتیں سن چکا تھا باہر ہی سے جواب دیا ابھی حاضر ہوا اونٹنی بادصبا آدمی بس اتنا کہتے ہی اونٹنی کی پیٹھ پر تھا۔ تھانہ کے علاقہ میں جاکر رپورٹ درج کرائی۔

یوسف زندان میں ہے۔ شمس الدین خان قید ہیں،

آج سنگار کیوں ہو رہا ہے؟ کیا رہائی کا حکم آگیا؟ نہیں آج قید ہستی سے رہائی ہے نہا دھو پوشاک پہن عطر مل باہر نکلا بسم اللہ کہہ کر پھانسی کے تختہ پر قدم رکھا بھنگی جو کھڑا تھا اس کو ہٹا دیا اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال جان بحق تسلیم ہوا۔ (۱)

لیکن یہ اتنی بڑی جراءت تھی کہ، انگریز بھی خوف نتائج سے کانپ رہے ہے۔ انہوں نے شمس الدین خاں کو پھانسی دینے سے پہلے، تمام احتیاطی مدارج طے کر لیتے۔

مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں۔

"نند کمار کے بعد یہ دوسری پھانسی تھی۔ جو ایک ہندوستانی رئیس کے لیے انگریزی قانون کو تلاش کرنی پڑی۔ چونکہ شمالی ہند میں اس وقت تک کوئی واقعہ ایسا نہ ہوا تھا۔ اس لیے حکومت کو غیر معمولی احتیاطوں سے کام لینا پڑا۔ کلکتہ سے ایجنٹ کو لکھا گیا کہ اس بارے میں شاہ دہلی سے ایک فرمان حاصل کرنا چاہیئے۔ نیز علماء و ثقات کا ایک محضر تیار کرانا چاہیے۔ کہ احکام شرع کی رو سے بھی فریزر صاحب کا قصاص ضروری ہے۔ اور اس بات میں انگریزی فیصلہ فیصلۂ شرع کے خلاف نہیں۔

مولوی رشید الدین کے مکاتیب کا جو قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں ہے۔ اس کی ایک تحریر سے ظاہر ہے کہ ایجنسی کے دفتر انشا نے ایک تحریر تیار کی تھی۔ جس میں کتب فقہ کی وہ تصریحات نقل

---

(۱) دلی کا سنبھالا (خواجہ محمد شفیع دہلوی) صفحہ ۱۰۲

کردی تھیں۔ جو ذمی کے قصاص کے بارے میں ہیں، اور صورت یہ تھی فریزر ذمیوں میں داخل تھے۔ اس کے مسلم قاتل اور محرک قتل سے قصاص لینا واجب ہے۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کر کے بعض علماء کو جو قلعہ سے وابستہ تھے اس پر آمادہ کیا۔ کہ اس تحریر پر دستخط کر دیں اور اس محضر کی بنا پر خود بھی ایک شقہ لکھ کر ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔ یہ شقہ اور محضر تمام ملک میں شائع کیا گیا تھا۔ اور ریذیڈنٹوں اور پولیٹکل ایجنٹوں کے ذریعہ تمام ریاستوں کے درباروں میں پہنچایا گیا تھا۔(۱)

---

(۱) غالب (غلام رسول مہر) ص ۵۲

زینت محل — ملکۂ ہند

باب ۱

ملکۂ زینت محل

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

زینت محل بہادر شاہ کی چہیتی ملکہ تھیں، بادشاہ ان سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔ اور اپنے کردار و سیرت، شخصیّت اور شوہر پرستی کی روایتی شان کے باعث اس قابل بھی تھیں کہ انہیں چاہا جاتے، اور انہیں وہی منزلت دی جائے، جس کی وہ مستحق تھیں،

بہادر شاہ اور زینت محل کی عمروں میں بہت زیادہ تفاوت تھا۔ لیکن نفسیاتی طور پر اس تفاوت سے انہوں نے کوئی برا اثر نہیں قبول کیا، زندگی کی آخری سانس تک وہ نہایت سچائی کے ساتھ اپنے شوہر کے دامن محبت سے وابستہ رہیں، بہادر شاہ کی دوسری بیویوں کی طرح ان کے لیے بھی یہ ممکن تھا کہ وہ رنگون جلا وطن نہ ہوتیں، لیکن ہمت، استقامت، عزم و ثبات، عورت کی سرشت ہے، اور یہی سرشت زینت محل کی بھی تھی۔ انہوں نے بہادر شاہ کے ساتھ دنیا کے مزے لوٹے تھے، شاہانہ زندگی بسر کی تھی، عیش و نعم میں دن کاٹے تھے سونے کے برتنوں میں کھانا کھایا تھا، زربفت اور کمخاب کے کپڑے پہنے تھے، موتیوں اور ہیروں اور جواہرات کے زیور استعمال کیے تھے، اور اب جب بہادر شاہ ایک فقیر بے نوا ایک ناقابل معافی مجرم، اور ایک بے کس اور بے سہارا شخص کی حیثیت سے، غربت اور فقر و فاقہ کے عالم میں، جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے رنگون جا رہے تھے، تو زینت محل کی غیرت شرافت، اور شوہر پرستی نے اسے گوارا نہ کیا کہ مظلوم، ضعیف، اور قابل رحم شوہر کو کس مپرسی

کے عالم میں چھوڑ دیں، انہوں نے ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ جس شوہر کے ساتھ انہوں نے عیش و تنعم کی زندگی بسر کی تھی اس کے ساتھ مصیبت کے یہ دن بھی کاٹ دینگی ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر اسے گذار کہ ہنس کر گذار دے

انہوں نے شمع کی طرح رو کر نہیں پھول کی طرح ہنس کر، زندگی کی یہ تلخیاں مردانہ استقامت کے ساتھ برداشت کیں،

رنگون پہنچنے کے بعد، زینت محل کی زندگی یکسر بدل گئی، یا وہ حال تھا کہ، خواصیں تھیں کنیزیں تھیں، باندیاں تھیں، دولت کی ریل پیل تھی، یا رنگون پہنچنے کے بعد، یہ حال ہوا کہ، رہنے کو تنگ و تاریک کوٹھری، پہننے کو میلے کچیلے، اور پھٹے پرانے کپڑے، کھانے کو روکھی سوکھی روٹی، غالب نے جو بات شاعرانہ طور پر کہی تھی، وہ ان کے بادشاہ، اور ملکہ پر لفظ بہ لفظ صادق آئی، ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

واقعی بہادر شاہ، اور زینت محل کا یہی حشر ہوا، زینت محل نے آنکھ سے ایک آنسو گرائے بغیر اور زبان پر حرف شکایت لائے بغیر، اپنی ساری زندگی قید، اور جلا وطنی کے عالم میں گذار دی، بہادر شاہ کے انتقال کے بعد بھی ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ دلّی واپس چلی جائیں جہاں اب وہ جا سکتی تھیں، اور جہاں خاندان شاہی کے بہت سے افراد موجود تھے،

زینت محل کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ ہے، لیکن نہایت شاندار، یہ المیہ اتنا ہی شاندار ہے۔ جتنی خود زینت محل تھیں، ہر ٹریجڈی۔ شاندار، اور باوقار نہیں ہوتی، لیکن زینت محل کی ٹریجڈی شاندار بھی تھی، اور باوقار بھی،

ذیل کے صفحات میں، زینت محل کی زندگی، رکھ رکھاؤ، وضع و انداز، اور، طور طریق کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے، اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زینت محل کیا تھیں، اور زمانہ کی تبدیلی نے اُنہیں کیا بنا دیا :—

زینت محل کا خاندان

" بادشاہ سلامت لال قلعہ میں رونق افروز ہیں۔ معظم الدولہ ایجنٹ بہادر کو زبانی پیام بھیجا کہ زینت محل بیگم احمد قلی خاں کی بیٹی ہیں۔ اور احمد قلی خاں۔ احمد شاہ درّانی شاہِ کابل کے خاندان میں سے ہیں۔ لہٰذا زینت محل بیگم کی اولاد کو بادشاہت کا استحقاق ہے۔ اس لیے بیگم مذکور کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ ایجنٹ کا جواب آیا کہ صدر آگرہ کو رپورٹ کر دی گئی ہے۔ جو حکم آئے گا ویسا ہی ہوگا۔ (۱)

شوہر سے عقیدت اور محبّت

تین روز سے بادشاہ سلامت شہر میں قاسم جان کی گلی میں زینت محل بیگم صاحبہ کے مکان میں تشریف رکھتے ہیں۔ بیگم مذکور نے طرح طرح کے فرش حضور والا کے قدموں کے نیچے بچھاتے تھے۔ اور ان کو بطور خیرات کے لٹوا دیا تھا۔ اور ایک سَو روپیہ حضور والا کے سر پر نچھاوَر کرکے خیرات کیے تھے۔ اور سات اشرفیاں اور ایک سَو ایک کشتیاں پوشاک کی کپڑوں کی اور شالوں کی نذر میں پیش کی تھیں۔ اور ہاتھی گھوڑے بھی نذر کیے تھے۔ (۲)

---

(۱) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۲

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۱

بہادر شاہ اور زینت محل "حضرت محمد ابوظفر بہادر شاہ پانچ روز سے ملکہ زینت محل بیگم کے مکان پر تشریف رکھتے ہیں۔ جب سواری لال قلعہ سے شہر کے اندر بیگم صاحبہ کے مکان پر گئی تو راستے میں حافظ داؤد اور شادی رام اور بابو سورج نرائن، اور کنور دیبی رنگھو۔ اور سالک رام اور حکیم احسن اللہ خان نے اپنے اپنے مکانوں کے سامنے آداب بجا لانے کی عزت حاصل کی اور پانچ پانچ چار چار روپیہ نذر کے پیش کیے۔

حضور پُر نور نے بیگم مذکور کے ہاں خاصہ تناول فرمایا اور نوکروں کو کھانے تقسیم کرائے اور طوائفوں کا ناچ دیکھا۔ (۱)

"بیوی کی تعلیم" "ایک دن جہاں پناہ خاصہ نوش فرما رہے تھے اور چلمن کے پیچھے میں اور میری ساس حاضر تھیں ملکہ زینت محل نے کہا " حضور یہ جو گرگ باراں دیدہ کہلاتا ہے تو کیا بھیڑیے کے بارہ آنکھیں ہوتی ہیں۔" اس بات کو سن کر بادشاہ سلامت خوب ہنسے اور فرمایا نہیں نہیں یہ بات غلط ہے بلکہ بڑوں سے ایسا سنا ہے کہ جب برسات بہت برستی ہے اور جل تھل بھر جاتے ہیں۔ جنگل اور میدانوں میں پانی ہی پانی ہوتا ہے تو گیدڑ، لومڑیاں، بھیڑیے اپنے اپنے بھٹوں میں اور اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ ایک کھوہ میں دس پندرہ بھیڑیے گھس کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور مینہ اور پانی کے مارے باہر نہیں نکل سکتے۔ بھوک کے مارے بولاتے ہیں ان میں جو نڈھال ہو جاتا ہے اور ناتوانی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو اور بھیڑیے اسے تکّہ بوٹی کر کے کھا لیتے ہیں اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز ایک بھیڑیا آدھ موا ہوتا رہتا ہے اور بھیڑیے اسے کھاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن میں سے بچ بچا کر ایک بھیڑیا رہ جاتا ہے اور اب

---

(۱) سرٹامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۲۰

مینڈ بھی کُھل جاتا ہے جو موقوف ہو جاتی ہے اپنے سایہ سے بھڑکتا ہے پتّہ سے پھڑکتا ہے۔ اور جب کوئی آدمی ایسی ہی ہوشیاری کر لیتا ہے تو کہتے ہیں گرگ باراں دیدہ ہے اسی طرح بھیڑیا اور اس کی مادہ اور پانچ بچے جنگل میں ان کے ساتھ پھرتے ہیں۔ اور شکار ڈھونڈتے ہیں تو ستا مار دہن کہلاتے ہیں یہ سب کے سب داؤں کرتے ہیں اور جا بجا چھپ جاتے ہیں اور ہرن بیچارے کو پکڑ لیتے ہیں اور مل جل کر کھا جاتے ہیں۔ کوئی آدمی بے بلائے اپنے جورو بچوں کو لے کر کسی کے ہاں مہمان آ جاتا ہے تو طعن سے کہا جاتا ہے لو ستار مار دہن آ پہنچا۔ (۱)

زینت محل کی مہربانی

جب ملکہ زینت محل کی مہربانی سے محبوب علی خان خواجہ سرا ابوظفر بادشاہ کے وزیر ہوئے تو انہیں دھیان آیا کہ میں ان پڑھ ہوں اور وزارت کے لیے علم درکار ہے کیونکر کام چلے گا ان کے ایک خیر خواہ نے خبر دی کہ تیلی واڑے میں ایک معلّم رہتے ہیں جو بادشاہ زادوں اور امیروں کو ٹھیکہ لے کر فارسی پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں۔ جس رنگ کی انشاء کہیے اس رنگ کی شاگرد لکھنے لگتا ہے ٹھیکے کی دستاویز قاعدہ کے ساتھ لکھوا لیتے ہیں۔ اور اگر میعاد مقررہ میں شاگرد نامراد رہے تو روپیہ جو پیشگی لیا ہے ہنسی خوشی واپس کر دیتے ہیں۔ مگر اس پچاس برس میں یہ شکایت ایک شاگرد نے بھی نہیں کی کہ میں تعلیم میں بیٹھا ہوں۔ اور استاد کو پیشگی رقم واپس کرنی پڑی ہو۔ اس کا نام مولوی امام علی صاحب ہے شاہجہاں آباد کی فصیل سے باہر تیلی واڑہ میں رہتے ہیں۔ محبوب علی خان یہ بات سن کر بہت خوش ہوئے اور بادشاہی سواری بھیج کر مولوی صاحب کو لال قلعہ میں بلوایا اور بہت تعظیم سے بٹھایا اور اپنا مدّعا سنایا مولوی صاحب نے کہا پانچ ہزار لوں گا ایک برس میں آپ اتنے قابل ہو جائیں گے کہ فارسی عبارت فلسفی عنایت اللہ کی بہار دانش جیسی لکھنے لگیں گے اور وزارت کے تحریری کام میں کسی طرح بند نہ ہوں گے۔

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) صـ۲۳

بعد رد و کد تمسک گواہی شاہدی سے لکھا گیا اور ڈھائی ہزار روپیہ نقد پیشگی وزیر صاحب نے مولوی صاحب کو دے دیا۔ مولانا کے واسطے وقت مقررہ پر سواری جاتی اور مولانا لال قلعے میں تشریف لے جاتے ایک گھنٹہ شاگرد کو پڑھواتے لکھواتے اور چلے جاتے مولانا نے محبوب علی خاں کو ایک قلمی انشا بھی اپنی تصنیف سے دے رکھی تھی جس سے بہت نکتے حل ہوتے تھے ایک سال میں چھ مہینے گذرے تھے جو محبوب علی خان قابل ہو گئے برس دن پورا ہوا تو مولوی صاحب نے اپنے باقی روپیہ کا تقاضا کیا شاگرد صاحب روپیہ کا نام سن کر بگڑ گئے انہوں نے کہا اُستاد مجھے فارسی وارسی کچھ نہیں آتی پیشگی جو ڈھائی ہزار روپے آپ نے لیے ہیں وہ بھی واپس دیجئے مولانا جانتے تھے کہ "اصل بد از خطا خطا نہ کند" سال بھر کے مسودے شاگرد کے ہاتھ کے ان کے پاس محفوظ تھے ان کے ذریعہ سے شاگرد پر انگریزی عدالت میں ڈھائی ہزار روپیہ کی نالش کر دی مقدمہ نے طول کھینچا شاگرد برابر انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ مولوی امام علی صاحب کی تعلیم سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عدالت نے مجبور ہو کر مرزا نوشہ۔ غالب۔ مفتی صدر الدین آزردہ۔ مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ منشی ماتن داس صاحب پٹواری کو جو فارسی کے خاقانی اور انوری تھے اپنی طرف سے پنچ بدا اور مدعی اور مدعا علیہ کو لاچار کیا کہ جو کچھ پنچ کہیں گے اُس فیصلہ کو تمہیں منظور کرنا ہوگا پنچوں نے غور اور چھان بین کے بعد لکھ دیا کہ مولوی امام علی صاحب کو مدعا علیہ سے ڈھائی ہزار روپیہ دلوایا جائے مدعا علیہ مزور منشی عنایت اللہ کے رنگ کی عبارت فارسی لکھتا ہے۔ یہ اُستاد کا کمال ہے کہ اس شاگرد میں اثر کر گیا ہے چنانچہ عدالت انگریزی نے ڈھائی ہزار روپیہ محبوب علی خان سے مولوی صاحب کو دلوائے مگر اُس نے دغا بازی سے مولوی صاحب کی انشاء مار لی کیونکہ نہ مولوی صاحب نے اپنے دعوے میں شامل کیا تھا اور نہ زبانی تذکرہ اس کا آیا تھا جب مولوی صاحب نے اس سے کتاب منگوائی تو شاگرد نے کہلا بھیجا کہ محض آپ کی دل آزاری کے لیے کتاب نہ دوں گا ورنہ وہ انشاء بے حقیقت ہے مولوی صاحب نے کہا کہ اس ناکس سے کہہ دینا ہے

کینہ خداوند ہستی مباد جوانمرد را تنگدستی مباد

تو کتاب نہ دے گا انشاء اللہ میری دل آزاری کر کے ایمان سلامت نہ لے جائے گا آخر وزیر صاحب
مرض استسقا میں مبتلا ہوئے اور سمجھے صاحب کتاب کی بددعا کا اثر ہے زچ ہو کر کتاب مولوی صاحب
کی خدمت میں بھیج دی اور معافی چاہی مولانا نے جواب میں کہلا بھیجا مردوں کا وار خالی نہیں جاتا میرا
تیر حدف پر پہنچ گیا ہے

تو مشو مغرور از علم خدا
دیر گیرد سخت گیرد مر ترا (۱)

زینت محل کا قرض

"صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ نے محبوب علی خان خواجہ سرا کی معرفت دس ہزار روپیہ قرض
لیا ہے یہ قرض دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے قسط وار ادا کیا جائے ۴ ہزار روپیہ میاں
کالے صاحب پیرزادہ کی صاحبزادی کی شادی کے خرچ کے لیے، ۱ ہزار روپیہ بادشاہ کی منہ بولی
بیٹی کی شادی کے لیے، ۱ ہزار روپیہ خضر سلطان کے لیے ۱ ہزار روپیہ مرزا احمدی بہادر کے لیے
اور ۱ ہزار ۴ سو ۵۰ روپیہ مرلی دھر اور رام پرشاد مہاجنوں کے قرض ادا کرنے کے لیے ضرورت
تھی بقیہ روپیہ بچا ہوا ہے وہ جیب خاص میں خرچ ہوگا۔" (۲)

زینت محل یا نور جہاں

"سلطنت کے تمام کارپردازوں کے نام حکم جاری کیا گیا کہ جس دستاویز پر نواب زینت محل بیگم کی مہر نہ ہوگی وہ غیر معتبر ہے
حضور عالی متعالی نے اپنے دستخط خاص سے ایک شقہ جناب زینت محل بیگم صاحبہ کے
نام جاری فرمایا کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ بخشی گری کی تنخواہ آپ کے روبرو تقسیم کی جائے۔" (۳)

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) صـ۵۲
(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۱۵۲ (۲۵ جون ۱۸۴۷ء)
(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۱۵۴ (۲ جولائی ۱۸۴۷ء)

پس پردہ

نواب صاحب کلاں نے اطلاع بھیجی کہ میں شرف ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہونا چاہتا ہوں اور امور سلطنت کے مختار المہام وکیل شاہی کو حکم ہوا کہ استقبال کے لیے جاؤ صاحب کلاں بہادر شرف حضوری سے مشرف ہوئے بہت دیر تک بعض نمک حرام ملازمین کی بابت گفتگو ہوتی رہی پس پردہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ تشریف رکھتی تھیں انہوں نے صاحب کلاں بہادر کے لیے ایک بٹوہ جس میں الائچیاں وغیرہ تھیں تواضع کے طور پر بھیجی - (۱)

زینت محل کے مصارف

" دیوان دھوکل سنگھ سے ارشاد ہوا کہ بعض شاہزادگان کی شادی کے لیے نواب زینت محل بیگم صاحبہ کو روپیہ قرض لینے کی ضرورت ہے قرضہ کی ادائیگی کی نسبت اسٹامپ کاغذ پر لکھ دیا جائے گا اور یہ قرضہ ۲ ہزار روپیہ سالانہ کی قسط کے حساب سے اُن دیہات کی آمدنی سے ادا کیا جائے گا جو شاہی تولیت اور اقتدار میں ہیں - (۲)

روزمرّہ کا خرچ

" نواب زینت محل بیگم نے فرمایا مجھے گھر کے روزمرہ کے خرچ کے لیے کچھ روپیہ ملنا چاہیے۔ محبوب علی خواجہ سرا کو ارشاد ہوا کہ ایک ہزار روپیہ کا بندوبست کرکے بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیج دو - (۳)

دادی کا انتقال

"۲۵ ستمبر ۱۸۵۱ء عرض کیا گیا کہ نواب زینت محل بیگم صاحبہ کی دادی نواب نوازش علی خاں کی زوجہ محترمہ مرفوت ہو گئیں حکم ہوا کہ ایک سو پچاس روپیہ تجہیز و تکفین کے لیے اور خلعت ماتمی کے طور پر تین دوشالے اُنکے وارثوں کے پاس بھیج دیئے جائیں " (۴)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۳۱ (۱۶ جون ۱۸۴۷ء)

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۴۷

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۹۱

(۴) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۶۶

زینت محل

"دلی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنویں کے پاس اب بھی موجود ہے۔ بادشاہ نے وہیں دربار کر کے یہ قصیدہ سنا تھا۔

(زہے نشاط کہ گر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر)

اس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دلی جانا ہوا اسی مکان میں برات بیٹھی تھی، فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ نے وہ مکان سرکار پٹیالہ کو دے دیا ہے، بند پڑا رہتا ہے اب اتنے ہی کام کا ہے کہ اگر محلہ میں کوئی برات یا شادی کا جلسہ ہوتا ہے، تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں بیٹھتے ہیں، واہ ؎

کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی تو خرابات ہووے گا

وہ زمانہ اور آج کی حالت دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ (۱)

بیگم کا پاس خاطر

"۸ مئی ۱۸۴۶ء صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ روانہ کیا گیا کہ حکیم امام الدین خان بہادر نواب زینت محل بیگم کے علاج معالجہ میں مصروف ہیں ان کو نواب صاحب فرخ آباد کے معالجہ کے واسطے روانہ نہیں کیا جا سکتا اگر ان کو رخصت کر دیا جائے گا تو بیگم صاحب کے علاج میں مشکل واقع ہو جائے گی۔ (۲)

گورنر جنرل اور زینت محل

"یکم مئی ۱۸۴۶ء نواب فرخ آباد نے گورنر جنرل کی ہدایت کے بموجب اپنے خاص طبیب حکیم امام الدین خان کو زینت محل

---

(۱) آب حیات (محمد حسین آزاد)

(۲) بہادر شاہ کا روز نامچہ ص۵

بیگم صاحبہ کے علاج کے لیے دہلی بھیجا ہے آج نواب فرخ آباد کا مختار امداد علی ملاحظہ شاہی میں پیش ہوا ۔ (۱)

زینت محل کے معالج کا حشر

حکیم امام الدین خاں ولد حکیم غلام رمضان خاں ۔ حکمت میں اپنے وقت کے شیخ مانے جاتے ہیں۔ اکبر شاہ کے زمانے میں شاہی طبیب تھے، پانسو روپے ملتے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں سَو روپیہ پاتے تھے۔ نواب زینت محل بیگم کے معالج تھے۔ غدر کے زمانے میں گھر میں بیٹھے رہے۔ جب سب لوگ شہر چھوڑ چھاڑ بھاگنے لگے۔ تو یہ بھی دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ چند روز بعد برٹن صاحب کے حکم سے اپنے مکان میں رہنے لگے۔ پھر جوتی پرشاد کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ کچھ دن بعد بنارس سے چلے گئے۔ پھر والئی ٹونک کی طلبی پر ستمبر ۱۸۵۸ء میں ٹونک چلے گئے ۔ (۲)

زینت محل کے والد کا حال زار

نواب احمد قلی خاں نواب عباس قلی خاں مرحوم کے بیٹے تھے۔ ان کی بیٹی نواب زینت محل بیگم بادشاہ کی بیگم تھیں بادشاہ کے خسر تھے اور بہت نامور لوگوں میں سے تھے۔ جس دن انگریز دلّی میں داخل ہوئے ہیں۔ تو یہ بھی بھاگے۔ لیکن جھجر سے پکڑے ہوئے آئے۔ اُن سے بڑھاپے کے سبب قید کی سختیاں برداشت نہ ہو سکیں۔ آخر جیل خانے ہی میں انتقال ہو گیا ۔ (۳)

وفادار بیوی

جس شخص کے ادنیٰ اشارے سے کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا وہ اُس وقت سپاہیوں کے پہرہ میں خاموش گھٹنوں میں منہ دیئے بیٹھا تھا جب زیادہ وحشت ہوتی تو ٹہل لیتا اور پھر اٹھتا کر جھک گئی تھی بیماریوں نے دم ناک میں کر رکھا تھا صبح کا سہانا

---

(۱) بہادر شاہ کا روز نامچہ صـ۲۷ــ

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ

(۳) نصرت نامہ گورنمنٹ صـ۵۷ــ

وقت تھا کہ دونوں لڑکوں اور تیسرے پوتے کی خبر موت سنی کلیجہ نکل گیا سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ زینت محل کی طرف دیکھ کر کہا

کچھ سنا ؟ بچے رخصت ہوئے

یہ کہہ کر چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار کی بے ہوشی میں بادشاہ بیگم کے پاس پانی کے چند قطروں کے سوا ہوش میں لانے کی کوئی چیز نہ تھی جواں بخت نے رو رو کر چھینٹے دیئے۔ زینت محل نے شوہر کا سر اپنی گود میں لے لیا ہوش آیا تو بچوں کو یاد کرکے بدنصیب بادشاہ نے دیواروں سے سر پھوڑا دن بھر یہی کیفیت رہی کوئی آشنا نہ تھا کہ دو باتوں سے بدبخت کا جی بہلاتا ۔ (۱)

---

(۱) نوبت پنج روزہ ۔ (راشد الخیری) صفحہ ۱۴۴

باب ۱۱

جواں بخت

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

جواں بخت خاندان شاہی کا گل سرسبد تھا، وہ بدقسمت تھا، لیکن اس میں تاجوری اور خسروی کی صلاحیت موجود تھی، یہ صلاحیت رائگاں گئی، قسمت کا لکھا پورا ہوا۔ اور وہ اورنگ نشین حکومت نہ ہو سکا۔

بہادر شاہ جواں بخت کو بہت چاہتے تھے، اور زینت محل کا یہ عالم تھا کہ اپنے گوشۂ جگر پر، پروانہ وار قربان ہوتی تھیں اور وہ اپنے اوضاع و اطوار کے لحاظ سے اس محبت اور چاؤ کا سزاوار بھی تھا ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی!!

یہ جواں بخت وہی ہے۔ جس کے سہرے غالب اور ذوق نے کہے تھے، جو عین عنفوان شباب میں باپ کے ساتھ رنگون جلا وطن ہوا، اور وہاں غربت و فلاکت کی زندگی سے تنگ آکر آخر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو گیا، جو محل میں رہتا، اور تخت ہند کا مدعی تھا۔ وہ ایک پرائے دیس میں، اس حالت میں دنیا سے سدھارا کہ نہ کفن کو کوڑی تھی، نہ فاتحہ پڑھنے والے لوگ، ؎

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم
مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

ولی عہد جواں بخت

جس کی قسمت میں تاج و تخت کے بجائے رنگون کی کالی کوٹھڑی تھی۔

یہ تصویر، دربار بہادر شاہ کے ایک گروپ فوٹو سے الگ کرکے بنوائی گئی ہے۔ جس کی صحت شک و شبہ سے بالا ہے۔

جواں بخت کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں، لیکن جتنی کچھ بھی ہے، ہے قابل مطالعہ :-

ولی عہد جواں بخت کی خوشامد کرتا تھا

"۹ جولائی ۱۸۴۷ء سرکار ولیعہد بہادر نے ایک شالی رومال محبت و خلوص کے تحفے کے طور پر مرزا جواں بخت بہادر کو عطا کیا۔ (۱)

جواں بخت کی روزہ کشائی

"۱۷ ستمبر ۱۸۴۷ء حافظ احمد علی کو مرزا جوان بخت بہادر کے روزہ رکھنے کی تقریب میں عطائے خلعت سے سرفرازی فرمائی گئی۔ (۲)

انگریزوں کی شرارت

" ۱۹ مارچ ۱۸۴۷ء محبوب خواجہ سرا کا عریضہ پہنچا کہ قدم شریف کے میلہ سے جب مرزا جوان بخت بہادر تشریف لا رہے تھے تو چند بدمعاشوں نے انگریزی سپاہیوں کی اعانت سے ان کو گھیر لیا گھوڑہ اور بٹوہ جس میں تین اشرفیاں تھیں اور ہیکل چھین کر لے گئے بادشاہ سلامت نے یہ خبر وحشت اثر سن کر صاحب کلاں بہادر کے نام اطلاع بھیجی کہ ایسے بدمعاشوں کو قرار واقعی سزا دینی چاہیئے بادشاہ سلامت سے عرض کیا گیا کہ اس کاروائی کی نقل انگریزی ایجنٹی کے محکمہ فوجداری میں بھی ضرور رساں ہونی چاہیئے تاکہ مناسب کاروائی عمل میں آسکے (۳) تعجب ہے کہ بادشاہ کا اس قدر لاڈلا بیٹا میلہ میں جائے اور بدمعاش لوگ اس کا گھوڑا تک چھین لیں یہ دلی کے باشندوں نے مدد نہ کی اور انگریزی سپاہیوں کی شرکت کا لفظ بھی حیرت میں ڈالنا ہے غالباً اس واقعہ کے اندر اور کوئی راز پوشیدہ ہے جو اخبار والے کو معلوم نہیں ہوا بہادر شاہ جواں بخت کی ولیعہدی چاہتے تھے اور انگریز اس کے خلاف تھے۔"

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۵۳

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۵۵

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۱۰۵

باپ اور بیٹا

"۱۳ نومبر ۱۸۴۳ء سواری دولت سرائے واقع مہرولی میں حاضر ہوئی بادشاہ سلامت اس پر سوار ہوکر قلعہ معلّٰی کی طرف روانہ ہوئے پہلے اس نئے باغ کے خیموں میں نزول اجلال فرمایا جو نواب مکرر دوران زینت محل بیگم صاحبہ نے حال میں خریدا ہے بیگم صاحبہ کے صاحبزادے شہزادہ جواں بخت بہادر نے کپڑوں کی ستّرہ کشتیاں دو شالہ شالی رومال کمخواب کا تھان زریں کمربند یہ تمام چیزیں تحفہ نذر کے طور پر پیش کیں تھوڑی دیر یہاں قیام فرمایا پھر بلند و بالا ہاتھی پر سوار ہوکر اور مرزا فتح الملک بہادر کو اپنے ساتھ بٹھاکر شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ قلعہ معلّٰی میں رونق افروز ہوئے انگریزی اور شاہی توپ خانہ سے بلند آواز توپیں چھوڑی گئیں اور قلعہ میں چاروں طرف شادمانی کا غلغلہ ہوا۔ (۱)

پانی پت کی زیارت

"۱۰ اکتوبر ۱۹۴۵ء مرزا جواں بخت بہادر شہزادہ خورد سال نے دستار زیب سر فرماکر اور طرہ مقیش دو شالہ شالی رومال۔ قبائے کمخواب سپر اور شمشیر سرقم جواہر خلعت حاصل کرکے اور چہار پہرہ ۲۰ سوار ۲ ہاتھی سواری کے واسطے لیکر مزار نور بار حضرت شاہ بو علی قلندر نور اللہ مرقدہ پر حاضر ہونے کی اجازت حاصل کی اجازت دی گئی اور شہزادہ پانی پت کی طرف روانہ ہوگئے۔ (۲)

جواں بخت کے لیے کھلونے

"۱۵ مئی ۱۸۴۶ء حضرت شاہ جہان دہلی اپنے دولت خانہ واقع درگاہ قطب صاحب میں تشریف لے گئے غلام علی خان نے جو نواب حامد علی خان کے ہمراہ لکھنؤ سے آتے تھے پانچ روپیہ نذرانہ پیش کیا اور نواب حامد علی خان نے ایک سو تانبے کے کھلونے اور کپڑے شہزادہ جواں بخت بہادر کے سامنے پیش کیے (۳)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۸۹

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۲۶

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۵۶

عہدۂ امانت "۸ اکتوبر ۱۸۴۷ء مرزا جواں بخت بہادر کو تمام کارخانوں کی امینی کا عہدہ اور خلعت کا اعزاز و امتیاز بخشا گیا ۔ (۱)

نذر کی تاکید ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۷ء آج ہر قسم کے کاروبار کی امینی کا عہدہ مرزا جواں بخت بہادر کے سپرد کرکے ارشاد ہوا کے حسب معمول سب اہلکار مرزا جواں بخت بہادر کو نذر دیں ۔ (۲)

انگریز اور جواں بخت "مرزا جواں بخت اپنی والدہ نواب زینت محل کے کہنے پر کودتے تھے، جن کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا بادشاہ کا زور چلتا تو جواں بخت کو اپنے جیتے جی ہی، تخت نشین کردیتے۔ مگر انگریزوں کی پکڑ بڑی زبردست تھی، مرزا جواں بخت کے ساتھ سارے برتاؤ ولی عہدی کے برتے جاتے تھے صرف دو باتوں کی کسر تھی، ایک تو ولی عہدی کی تنخواہ خزانۂ شاہی کی تحویل میں رہتی تھی، دوسرے انگریزوں نے ولی عہدی کا ادب قاعدہ ان کے ساتھ نہیں رکھا ۔ (۳)

تقریب شادی کتخدائی مرزا جواں بخت" ہر چند کہ تقریبات بسیار ریاست ہائے ہندوستان میں نظر سے گذری ہیں ۔ مگر جیسی شادی بازیب و تجمل شاہزادہ مرزا جواں بخت بہادر مرحوم کی ہوئی ایسی رنگین محفل و تقریب و تخریب باجاہ و حشم اس دریا دلی کے ساتھ کہیں نظر سے نہیں گذری۔ بیان تکلفات رسوم ساچق، و مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی و نقار خانہ بجت وغیرہ نظر بلا جان کر قلم انداز کیا جاتا ہے۔ البتہ دو امر قابل نگارش ہیں۔ ایک یہ کہ قرینۂ محفل سب سے

---

(۱) بہادر شاہ کا روز نامچہ صفحہ ۱۵۹

(۲) بہادر شاہ کا روز نامچہ صفحہ ۱۶۸

(۳) ابن الوقت (ڈپٹی نذیر احمد) صفحہ ۱۱

جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں۔ جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔

ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزدگان کی محفل جدا، ملازمین معززین کی محفل جدا فرقہ سپاہ کی بزم جدا، شاگرد پیشہ کے لیے جدا، اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہل شہر کے لیے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں۔ رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم نازو انداز تھیں و مہ جبینان ناہید نواز زمزمہ پرداز، دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔ کل ملازمان شاہی و روسائے دربار کے واسطے تورہ جات کا حکم تھا۔ کہ جس کا جی چاہے پچاس روپے نقد تورے کی قیمت لے خواہ تورہ لے، جتنے قلم کے نوکر تھے۔ نام بنام سب کو تورے تقسیم کیے جاتے تھے۔ مثلاً میرے باپ کا تورا جدا، میرے نام جدا، میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام بھیجا کیونکہ ان کے نام بھی ایک تنخواہ تھی۔ میں نے مہتان تورہ بندی سے کہلا بھیجا تھا کہ آٹھ روز کے بعد ایک تورہ بھجوا دیا کرو۔ اس دریا دلی سے تقسیم تورہ جات کی ہوئی تھی جس روز تورہ آتا تھا۔ تمام عزیز و اقارب دوست احباب کے گھر کا کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ ایک تورہ میں انعام اس قدر ہوتا تھا کہ ایک محفل شکم سیر ہو کر کھالے۔ میرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ رنگ برنگ کے میٹھے چاول، سرخ، سبز، اودے پانچ سیر کی باقرخانی، ایک شیریں ایک نمکین اور کئی قسم کے نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شے باقی نہ رکھی گئی تھی۔ مختصر یہ کہ کسی ریاست میں ایسی پر تکلف تقریب نظر سے نہیں گذری۔ جو اس گئی گذری سلطنت میں دیکھنے میں آئی بجز اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے۔ باوجود یہ کہ ملازم تھے۔ مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے۔ شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کیے گئے۔ (۱)

جواں بخت کے سہرے جواں بخت کی شادی کے موقع پر، اردو زبان کے دو بہت بڑے شاعروں، — ذوق اور غالب — نے، سہرے لکھ کر، اپنی جولانی طبع، زور بیان۔ اور حسن زبان کا ثبوت دیا تھا، جواں بخت کی ہڈیاں خاک میں

---

(۱) داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) ص ۱۷

مل گئیں، غالبؔ اور ذوقؔ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن یہ سہرے اب بھی اتنے ہی تروتازہ ہیں، جتنے، آج سے سو برس پہلے تھے۔ —

غالبؔ

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائے گا تاب گرانباریٔ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھکر سہرا

ذوقؔ

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
تابش حسن سے مانند شعاعِ خورشید
رخِ پر نور پہ ہے ترے منوّر سہرا
وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تا بنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا
روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں سے معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیب ہے تو منہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوشاب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

جواں بخت کا انجام

اور جس جواں بخت نے طمطراق سے زندگی بسر کی تھی اس کا انجام یہ ہوا کہ [illegible]

[illegible]

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

کہتے ہیں، وہ باپ کے ساتھ جلا وطن ہوکر رنگون پہنچا، اور وہاں عسرت وفلاکت اورغریب الوطنی کی زندگی بسر کرتا ہوا اس دُنیا سے رخصت ہوگیا،

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

باب ۱۲

عہدِ بہادر شاہ کے صوفیاء اور مشائخ

بہادر شاہ کا دور اس اعتبار سے بھی بہت ممتاز ہے کہ اس عہد میں بڑے بڑے صوفیا اور مشائخ مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ گر ہوئے۔ ان کے صفائے باطن، کردار بلند اور پاکیزگی قلب نے، لوگوں کی ہیئت اور فطرت بدل دی۔ جو سنگ دل تھے، خدا سے بے پروا تھے۔ دنیا میں مست تھے۔ فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ان کے فیضِ صحبت سے، کچھ سے کچھ ہو گئے۔ وہی دل جو پتھر کا ٹکڑا تھا سوز و گداز کا پیکر بن گیا۔ جو سب کچھ دنیا کو سمجھتے تھے، وہ دنیا سے ایسے بیزار ہوئے کہ بس آخرت کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ؎

> وہی ریاضؔ جو تھے بت پرست و بادہ پرست
> خدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

ان بزرگوں کے احوال و سوانح کے لیے، ایک ضخیم دفتر درکار ہے لیکن ہم ایجاز سے کام لیتے ہیں، اور چند کا ذکر، مختصر طور پر کرتے ہیں، کہ اس عہدِ گرامی کی کچھ تصویر، اور مبارک شخصیتوں کا مرقع آنکھوں کے سامنے آجائے۔

اس باب میں جن بزرگوں کا ذکر ہے۔ ان کے حالات کو زیادہ سے زیادہ مستند طور پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱)

شاہ غلام علی رح

"میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کے کمالات ظاہری اور مقامات باطنی کا حال لکھ سکوں کیونکہ حالات آپ کے اس سے سوا ہیں جو بیان ہو سکیں اور مقامات اس سے بہت ہیں جو لکھنے میں آویں سبحان اللہ علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید اور تجرّد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے۔ جو کچھ آیا اور جس قدر ہوا سب تمام اللہ صرف کیا اور کبھی کل کا غم نہ کیا دن رات اللہ اور اللہ کے رسول کے ذکر میں بسر کی اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ رکھی۔ علم ایسا تھا کہ کا ہے کو ہوتا ہے۔ زہد اور مجاہدہ ایسا کہ بیان اس کا نہیں ہو سکتا، تقویٰ اور ورع اس درجہ پر کہ سوا اس سے ممکن نہیں اور پھر اس پر عجز ویسا ہی تھا، انکسار ویسا ہی، اتباع سنت اس درجہ پر کہ اچھے اچھے لوگ وہاں قدم نہ رکھ سکیں، آپ کی صحبت سے اس قدر فیض حاصل کہ بیٹھ کر اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ وطن اصلی آپ کا موضع بٹالہ ہے جو پنجاب کے ملک میں امبرسر کے پاس واقع ہے۔ اور آپ سادات علوی سے ہیں۔ والد ماجد آپ کے بھی بڑے زاہد اور عابد تھے اور جنگلوں میں جا کر ذکر جہر کیا کرتے تھے، آپ کے پیدا ہونے سے پہلے ایک دفعہ آپ کے والد ماجد نے جناب امیر المومنین علی ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں کہ تمہارے ہاں عنقریب لڑکا پیدا ہونے والا ہے اُس کو میرے ہم نام کرنا اور آپ کی والدہ ماجدہ نے کسی بزرگ کو دیکھا کہ انہوں نے عبداللہ دار آپ کا نام رکھا اور آپ کے عم بزرگوار نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اشارت سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا اور اسی سبب سے آپ کا اصلی نام عبداللہ اور عرف غلام علی تھا۔ ۱۱۵۶ھ میں آپ نے اس عالم کو منور کیا۔ بعضے شعرا نے آپ کی ولادت

باسعادت کی تاریخیں بھی منظوم کیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

چو نجم چرخ ہدیٰ حضرت غلام علی　　شد مظہر فگن در جہاں، جہاں بشگفت

سن ولادت شریفش چو جست رافت دل　　مہر سپہر ہدایت شدہ طلوع بگفت

غرض کہ آپ نے سولہ برس کی عمر تک تو اسی نواح میں بسر کی۔ ۱۱۷۳ھ میں آپ کے والد ماجد نے اس ارادہ سے دہلی میں بلوایا کہ اپنے پیر شاہ ناصر الدین قادری سے جن کا مزار نبی کریم گاہ کے پیچھے ہے بیعت کرا دی جائے۔ آپ کے پہنچنے سے پہلے شاہ ناصر الدین صاحب نے انتقال کیا، اور چونکہ اللہ تعالے کو اور ہی کچھ پردہ غیب سے ظاہر کرنا تھا۔ یہ بات نقاب خفا و حیز التوا میں رہی۔ تب آپ کے والد ماجد نے اجازت و اختیار دیا کہ جس سے چاہو بیعت کرو ۱۱۸۰ھ میں بائیس برس کی عمر میں آپ نے جناب مرزا جان جاناں مظہر علیہ رحمۃ سے بیعت کی اور یہ شعر پڑھا۔

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم

سر زمینے بود منظور آسمانے یافتم

بعد بیعت کے سالہا سال آپ نے پیر مرشد کی خدمت میں اوقات بسر کی اور وہ زہد مجاہدہ اور ریاضت کی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ دن بدن عروج کمال اور مشاہدہ جمال شاہد بے زوال اور ملکہ شعر اور ترقیات وابستہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنے وقت کے شیخ [illegible] اور صاحب [illegible] ہوئے اور تلقین و ارشاد مسند رد بر دے اپنے پیر و مرشد کے جانشین فرمایا۔ گرچہ آپ نے بیعت سلسلہ قادریہ میں کی تھی لیکن ذکر و اذکار و شغل و اشغال طریقہ علیہ نقشبندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی۔ اور اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور حقیقت میں میرے اعتقاد بموجب اپنے پیر پر بھی فوق لے گئے۔ سبحان اللہ کیا آزادی تھی کہ مطلق دنیا کا لگاؤ نہ تھا۔ اللہ اللہ کیا اطاعت سنت تھی کہ سر مو بھی فرق نہ تھا۔ توکل تو اس درجہ پر تھا کہ کبھی کسی طرح کا خیال دل میں نہ آتا۔ امرا اور بادشاہ آرزو رکھتے تھے کہ ہم خانقاہ کے

فقرا کے لیے کچھ وظیفہ مقرر کریں، ہرگز آپ منظور نہ فرماتے۔ ایک دفعہ نواب امیر الدولہ امیر محمد خان والی ٹونک نے بہت التجا سے درخواست تقرر وظیفہ کی اس کے جواب میں آپ نے صرف یہ شعر لکھ بھیجا:

ما آبروئے فقر و قناعت نمی بریم
با میر خان بگوئے کہ روزی مقدر است

آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے ان کی بیعت اختیار کی میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمات خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے۔ اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے۔

حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا۔ اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ تھا، اور باوجودے کہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا اللہ تعالے غیب الغیب سے سب کام چلاتا تھا۔ اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا، جو اس نے مانگا وہی دیا جو چیز عمدہ اور تحفہ آپ کے پاس آئی اس کو بیچ کر فقرا پر صرف کرتے اور جیسا گزی گاڑھا موٹا تمام فقیروں کو میسر ہوتا ویسا ہی آپ بھی پہنتے۔ اور جو کھانا سب کو میسر ہوتا وہی آپ کھاتے۔ بھلا غور کرو کہ بشر کی طاقت ہے کہ ایسی بات کر سکے۔

اور اگر کبھی کچھ اسباب اور سامان دنیا کا ذکر آتا تو ارشاد فرماتے:۔

حرص مانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
ہرچہ ماداریم زان ہم اکثرے درکار نیست

آپ کی اوقات شریف نہایت منضبط تھی۔ کلام اللہ آپ کو حفظ تھا اور تحقیق قرأت بھی بہت خوب تھی۔ نماز صبح اول وقت ادا فرما کر دس سپارہ کلام اللہ کے ختم فرماتے اور بعد اس کے حلقہ مریدین جمع ہوتا اور تا نماز اشراق سلسلہ توجہ اور استغراق جاری رہتا۔ بعد ادا کرنے نماز اشراق

کے مجلس حدیث اور تفسیر کی شروع ہوتی۔ جو لوگ اس جلسہ کے بیٹھنے والے ہیں اُن سے پوچھا جائے کہ اس میں کیا کیفیت ہوتی تھی، اور پڑھنے پڑھانے اور سننے سنانے والوں کا کیا حال ہوتا تھا۔ جہاں نام رسول خدا آتا آپ بے تاب ہو جاتے، اور اس بے تابی میں حاضرین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی سبحان اللہ کیا شیخ تھے باقی باللہ اور عاشق رسول اللہ۔ علم حدیث اور تفسیر نہایت متبحر تھا۔ اگر باعتبار علوم نقلی خاتم المحدثین والمفسرین تعبیر کیا جاوے تو بھی زیبا ہے اور اگر باعتبار علوم عقلی سر آمد منطقیان متقدمین اور متاخرین لکھا جاوے تو بھی بجا ہے اللہ تعالے نے آپ کو کیا مجمع علوم پیدا کیا تھا ہر ایک علم ظاہری اور باطنی میں درجہ کمال بر انتہائے کمال حاصل تھا۔ بعد اس درس تدریس کے آپ کچھ تھوڑا سا کھانا کہ عبادت معبود کو کافی ہو، تناول فرما کر باتباع سنت نبوی قیلولہ استراحت میں آرام کرتے تھوڑی دیر بعد اول وقت نماز ظہر ادا فرما کر پھر درس و تدریس و تفسیر و فقہ اور کتب تصوف میں مشغول رہتے اور نماز عصر تا نماز مغرب حلقہ مریدین جمع ہوتا، اور ہر ایک آپ کی توجہ سے علو مدارج حاصل کرتا۔ ہمیشہ تمام رات آپ شب بیداری فرماتے تھے شاید کہ گھڑی دو گھڑی بمقتضائے بشریت غفلت آجاتی ہو سو وہ بھی جانماز پر۔ برسوں آپ نے چارپائی پر استراحت نہیں فرمائی۔ نیند کا بہت غلبہ ہوا یوں ہی اللہ اللہ کرتے پڑے رہے۔ آپ کی خانقاہ میں عجیب عالم ہوتا تھا۔ بوریا کا فرش رہتا تھا اور اسی کے سرے پر ایک مصلیٰ کبھی بوریا کا اور کبھی کسی اور چیز کا پڑا رہتا تھا۔ اور وہیں ایک تکیہ چمڑے کا رکھا تھا۔ آپ دن رات اسی مصلے پر بیٹھے رہتے اور عبادت معبود کیا کرتے۔ اور سب طالبین گرد اگرد آپ کے حلقہ باندھے بیٹھے رہتے اور ہر ایک کو جدا جدا فیض حاصل ہوتا۔

حق یہ ہے کہ ایسا برشتہ جان شیخ دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور میں تو اس بات پر عاشق ہوں کہ باوجود اس قدر آزادی اور خود رفتگی کے سر مو احکام شریعت سے تجاوز نہ تھا جو کام تھا وہ باتباع سنت تھا بلکہ مشتبہ سے نہایت پرہیز کرتے اور مشتبہ چیز ہرگز نہ لیتے جو شخص خلاف شرع اور سنت ہوتا اس سے نہایت خفا ہوتے اور اپنے پاس اس کا آنا گوارا نہ کرتے

غرض کہ سالہا سال تک آپ کی ذات فیض آیات سے یہ عالم منور رہا اور ہر ایک کو اس

دارالفنا سے دارالبقا کو چلنا ہے، آپ نے بھی ہفتہ کے دن صفر کی بائیسویں ۱۲۴۰ھ میں اس جہاں سے انتقال کیا، اور آپ کی خانقاہ ہی میں آپ کے پیر کے پہلو میں دفن کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون "نور اللہ مضجعہ" آپکے انتقال کی تاریخ ہے۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) ص ۱۷

(۲)

خواجہ حضرت محمد نصیرؒ

"آپ کے صفات حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ اُس سے سوا ہیں جو لکھنے میں آویں اور اُس سے بہت ہیں جو کہے جاویں آپ نواسہ ہیں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے جو بڑے نامی مشائخ تھے اور اُن کا نام تمام عالم میں مشہور ہے"

ولادت آپ کی ۱۱۹۰ھ میں ہوئی۔ اور ابتدا سے طالب خدا ہوئے۔ بچپن ہی میں حضرت خواجہ میر درد علیہ رحمۃ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اور توجہ لیتے، بلکہ اُسی زمانہ میں خواجہ میر درد علیہ رحمۃ سے بیعت کی تھی جب کہ آپ کا سن شریف دس برس کا ہوا۔ خواجہ میر درد علیہ رحمۃ نے وفات پائی اور درد جدائی آپ کے نصیب ہوا۔

آپ کو اکثر علوم میں خصوصاً ریاضیات میں بہت دخل تھا علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے۔ اور تال لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے استاد اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔ علم حساب کو اُس سے زائد جانتے تھے اور مسائل حساب میں وہ مہارت بہم پہنچائی تھی کہ مسائل لاینحل بآسانی حل فرماتے تھے۔ چنانچہ تال اور حساب میں اُن کی تصنیفات سے رسالے موجود ہیں۔ یہ تو صفات ظاہری تھیں۔ اور کمالات باطنی میں ان سب سے رتبہ بڑا تھا۔ اور وہ مقام ہی اور ہے۔ مجمع کمالات باطنی خواجہ میر اثر صاحب (۱) سے کہ خواجہ میر درد علیہ رحمۃ کے چھوٹے

---

(۱) مشہور صوفی بزرگ اور اردو کے شاعر، صاحب مثنوی خواب و خیال (مطبوعہ انجمن ترقی اردو) تذکرہ میر حسن (ص ۱۰) میں ان کے حالات ملتے ہیں۔

بھائی تھے، حاصل یہ ہے۔ جب کہ خواجہ میر اثر علیہ رحمۃ کا انتقال ہوا خواجہ صاحب میر علیہ الرحمۃ خواجہ میر درد علیہ رحمۃ کے فرزند ارجمند سجادہ نشین ہوتے۔ جب کہ اُن کا بھی انتقال ہوا تو آپ کی ذات فیض آیات سے اس مسند جانشینی کو رونق تازہ حاصل ہوئی۔ ہر مہینہ دوسری اور چوبیسویں کو مجلس بین نوازی کی آپ کے روبرو ہوا کرتی آپ کو صبر میں درجہ کمال حاصل تھا۔ اور دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا - والد ماجد آپ کے میر کلو صاحب اکبرآبادی بہت صحیح النسب سادات سے تھے اور نسبت دامادی کی خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ سے رکھتے تھے اور بیعت بھی انہیں سے کی تھی۔ اوصاف حمیدہ آپ کے لاتعد ولاتحصیٰ ہیں، میری طاقت اُن کے بیان کی نہیں - دوسری شوال ۱۲۴۱ھ کو آپ نے وفات پائی اور درد مفارقت مخلصان خاص کو دیا کبھی کبھی آپ شعر بھی کہا کرتے تھے اور رنج تخلص (۱) کیا کرتے چنانچہ یہ چند شعر آپ ہی کی طبعزاد ہیں۔

اشعار ہندی :-

خط دیکھ کر ادہر تو میرا دم الٹ گیا
قاصد اُدہر بدیدۂ پرنم الٹ گیا

دل یہ جس کے لیے پہلو میں تپاں رہتا ہے
یوں سنا ہے کہ اسے بھی خفقان رہتا ہے

دیکھی نہیں حالت یہ جدائی میں کسی کی
ہے طور جدا اپنا جدائی میں کسی کی (۲)

---

(۱) تذکرۂ مجموعہ نغز (ج ۱ ص ۲۷۷) اور گلشن بیخار (ص ۹۰) میں آپ کا تذکرہ ہے۔ آخر الذکر تذکرے میں آپ کے یہی چھ اشعار منقول ہیں۔

(۲) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صـ۲۹

(۱۳)

مولانا نصیر الدینؒ

شاگردان جناب مولانا محمد اسحاق مغفور مرحوم سے ہیں۔ کتب درسیہ خصوصاً دینیات میں بہت اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ باوصف کہ بسبب علوم دینی مرجع عوام و خواص ہیں، خصوصاً تقریب بادشاہی سے سرفراز ہیں لیکن امر حق کے اظہار میں کچھ پاس و لحاظ مطلقاً نہیں رکھتے بالغرض اگر اس کے اظہار میں اپنا ہی نقصان ہو، پروا نہ کرکے امر واجبی کو کبھی نہیں چھپاتے۔ اس امر میں گویا شمشیر برہنہ کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے زمانہ ناپرساں میں ایسا حق گو بس غنیمت ہے اور پھر قناعت اور استغنا اور متانت وضع اور سلامت روی ایسی ہے کہ کچھ بیان میں نہیں آسکتی۔ (۱)

---

(۱) تذکرۂ اہل دہلی (سرسید)، صـ۸۴

(۴)

میر محمدی صاحبؒ

"آپ کا سلسلہ جناب غفران مآب مولانا مولوی فخر الملت والدین قدس سرہ العزیز تک پہنچتا ہے۔ مقبولان بارگاہ کبریائے الٰہی سے تھے۔ قبول خاطر خاص و عام بھی یہاں تک حاصل تھا۔ کہ اُمرا و سلاطین آپ کے دیدار فیض انوار کو نعمت کبریٰ اور آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کو ایک موصبت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ از بسکہ جذب باطن کی تاثیر سے ساکنین تمام شہر کے، خصوصاً صنادنین قلعۂ مبارک کے، علی الخصوص شہزادگان جلیل القدر آپ سے بہت رجوع رکھتے تھے، عوام کالانعام عمل تسخیر کا گمان کرتے۔ ہر چند اعمال بھی آپ کے ایسے سریع الاثر تھے کہ آپ کا نفس دم عیسیٰ تھا اور آپ کے ہاتھ کی خاک کی چٹکی اکسیر کا کام رکھتی ایک مدت ہوئی کہ (۲) جہاں فانی سے عالم باقی کو راہی(۳) ہو کر اپنے ہی دیوان خانہ میں جو متصل چتلی قبر کے ہے مدفون ہوئے (۴)

---

(۱) آپ کا نام سید محمد عماد الدین اور "میر محمدی" عرف تھا۔ (تذکرۃ الفقرا ۶ ص ۱۳)

(۲) آپ کی وفات ۱۲۳۲ھ میں ہوئی (تذکرہ الفقرا ۶ ص ۴۶)

(۳) "مرزا سلیم آپ سے نہایت عقیدت کے ساتھ مرید تھے، جب میر صاحب موصوف کا انتقال ہوا تو مرزا سلیم نے اپنے مکان ہی میں آپ کا مزار بنوایا۔ اور وصیت کی کہ بعد انتقال کے میں بھی یہیں دفن کیا جاؤں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔"

(تاریخ دہلی از سید احمد خاں) ص ۵۷

(۴) تذکرہ اہل دہلی (سر سید) ص ۳۱

چند شاہزادے خصوصاً مرزا خجستہ بخت بہادر آپ کی خلافت کا دم بھرتے ہیں۔ (٢)

---

(١) مرزا احمد اختر خلف مرزا خجستہ بخت، اپنے رسالہ تذکرۃ الفقراء ص ١٢ تک لکھتے ہیں:-

" جد فقیر نے بھی حضرت سے اکتساب علم معرفت کیا، اور بہت سے شاہزادے اور اُمرائے سلطانی بیعت میں آئے تھے اور بعضوں نے عزت خلافت بھی حاصل کیا، جیسے میرے پیر و مرشد برحق حضرت مرزا روشن بخت قدس سرہ اور میرے والد اور مرزا خجستہ بخت عم شاہ و شاہزادہ سلیم برادر شاہ " (تذکرۃ الفقراء ص ١٢)

(٢) تذکرہ اہل دہلی (سر سید احمد خاں) صـ ٣١

(۵)

شاہ عبدالغنیؒ

"کملائے دہر سے تھے اوائل حال میں مکان سکونت معین نہ رکھتے تھے۔ کبھی کسی گوشہ میں اور کبھی کسی سایۂ دیوار میں پڑ رہتے جب تک کہ مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ قید حیات میں اور مسجد اکبرآبادی میں ساکن تھے، ان کے مادام الحیات لزوم اس امر کا تھا کہ شب کو کسی گوشہ میں بسر کیا اور صبح سے شام تک مسجد مذکور کے سامنے ایک منبع پر جو کہ نہر پر واقع ہے، بیٹھے رہتے سالہا سال اسی طرح سے کٹے اور اکثر اہل حاجت اپنی روائے حاجات کے واسطے وہیں آپ کی خدمت میں پہنچتے اور منتظر دعائے خیر رہتے۔ مولوی صاحب مرحوم بھی طالبان اخلاص کے سامنے اکثر آپ کی تعریف بیان فرماتے، حتیٰ کہ مولوی صاحب بیمار ہوتے اور صاحب فراش ہوئے، جب کہ نوبت نفس واپسیں کی پہنچی یہ بزرگ اپنا بستر کندھے پر ڈال کر کسی طرف کو روانہ ہوتے اور جو کہ یہ امر خلاف عادت تھا، لوگ اس حرکت سے بہت متعجب ہوئے۔ جب آپ کے قریب گئے تو کلمات تاسف آپ کی زبان پر جاری تھے اور یہ کہتے تھے کہ "اب قدرداں ہمارا دنیا سے چلا گیا ہم یہاں رہ کر کیا کریں گے" اور اس طرح سے چلے کہ کسی نے نہ جانا کہ کس طرف راہی ہوتے۔ بعد کتنی دیر کے حضرت مولانا جہاں گذران سے ملک بقا کی طرف راہی ہوئے، جو کہ وہ بزرگ کبھی مسجد کے اندر نہیں جاتے تھے اور باہر سر راہ بیٹھتے تھے، مولانا کے انتقال پر آگاہ ہو جانا صرف آپ کے کشف سے علاقہ رکھتا ہے۔ بعد چند روز کے یکایک پیدا ہوگئے اور مسجد جامع کے ایک حجرہ میں سکونت اختیار کی۔ کرامتیں آپ کی اکثر مشاہدہ اور معائنہ ہوئیں۔ باوجود غلبہ جذب کے نماز کی طرف بھی اکثر مصروف رہتے لیکن پابند اوقات معینہ کے نہ تھے اور اکثر ایک گوشہ میں

بیٹھے ہوئے قرآن مجید بخط نسخ لکھا کرتے اور کسی سے بات نہ کرتے۔ نفس واپسین تک یہی ایک حالت آپ سے مشاہدہ ہوئی۔ اکثر رؤسائے ذی مقدور آپ کی خبرگیری سے غافل نہ رہتے تھے خصوصاً بخشی بھوانی شنکر کہ ایک اُمرائے شاہجہان آباد سے تھا، شب و روز خدمت گذاری میں مصروف رہتا تھا۔ آپ کی خوراک دونوں وقت دہی اور پیڑے تھے اور تعجب یہ ہے کہ کبھی یہ خوراک آپ کو مضرت نہ پہنچاتی تھی اور کبھی بیمار نہ پڑتے تھے۔ باوجودیکہ عمر قریب ستر برس کے تھی لیکن رنگ ایسا سرخ سفید تھا کہ جیسا عالم جوانی میں ہوتا ہے۔ تمام عمر میں ایک دفعہ بیمار ہوئے۔ جو مرض الموت تھا۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سر سید) ص ۴۴

(۶)

شاہ فدا حسینؒ

آپ کا[1] اصل نام خواجہ نجیب الدین احمد ہے اور آپ اولاد حضرت خواجہ ہمدانی سے ہیں۔ اٹھارہ برس کی عمر سے فقیری اور خاکساری اختیار کی اور اپنے پیر کی خدمت میں فراغت تحصیل علوم سے کی۔ تصوّف میں بہت بڑا ملکہ تھا اور فصوص الحکم وغیرہ کتب مشکلہ تصوّف کو بہت آسانی سے پڑھاتے تھے۔ دنیا سے مطلق لگاؤ نہ تھا۔ اخلاص و خاکساری بدرجۂ کمال تھی۔ گوشہ نشینی اور زاویہ گزینی حد سے سوا تھی۔ صحبت عوام الناس کی بہت ناپسند فرماتے اور ہمیشہ تنہا بیٹھے رہتے۔ اور تمام عمر خاک بدن سے ملی اور اینٹ سرہانے رکھی اور زمین پر یا پتھر پر پڑ رہتے۔ اگرچہ آپ کے مزاج میں سلوک جذب پر غالب تھا، لیکن کبھی شان جذب بھی ظہور کرتی تھی۔ بیس برس تک الور میں اپنے پیر کی خدمت میں رہے۔ اور طرح طرح کی ریاضت کی اور اپنے پیر مولوی محمد حنیف صاحب کی وفات کے بعد اُن کی جگہ سجّادہ نشین ہوئے اور پھر بہ سبب بعض سوانح کے دلّی تشریف لائے اور چالیس برس ایک حجرہ میں بیٹھے رہے۔ بعد اس کے راجہ بنے سنگھ الور نے نہایت تمنّا کی کہ پھر اُسی تکیہ میں آن کر رہیں۔ اگرچہ آپ کو اُس زمانہ میں بہ سبب لحوق امراض متعددہ کے حواس ظاہری نہ تھے، لیکن آپ کے مرید اُسی حال میں وہاں لے گئے اور چند مدت بعد وہاں جاکر اٹھارویں محرم ۱۲۵۰ھ میں جمعرات کے دن انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کی ذات مغتنمات روزگار سے تھی۔ اور بہیسویں خرق عادات آپ سے ظہور میں آئی ہیں۔ حقیقت یہ

---

(۱) یہ سرسیدؒ کے نانا خواجہ فریدالدین کے سگے بھائی تھے (حیاتِ جاوید — حالی)

خاتم سلسلۂ رسول شاہیہ (۱) ہوئے اور آپ کی ذات فیض آیات سے اس سلسلہ کو رونق تازہ ہوگئی تھی۔ خلفا آپ کے بلاد دور دراز گئے ہیں۔ چنانچہ تبت اور سراندیب اور مشہد وغیرہ بلاد میں آپ کے فقیر موجود ہیں کبھی کبھی آپ اپنے پیر کی طرح عالم جذب میں شعر بھی فرماتے تھے اور مثنوی بن سو سر آپ کی طبع زاد سے موجود ہے کہ بعض معتقدین نے جمع کی ہے۔

اشعار فارسی

مرا جز دیدن دیدار وجہ اللہ کاری نیست در دنیا
شفاعت ما بجز ذات رسول اللہ یاری نیست در عقبیٰ

خویشتن را خود عیاں فرمودہ
صورتے از جسم و جاں بنمودہ
کل نفس واحد فرمودہ
واحدٌ فی کل نفس بودہ

نسبت طاعت بخود عصیاں بود
نسبت عصیاں بخود عرفاں بود
چوں بہر صورت بہ بینی یار را
خود بخود واقف شوی اسرار را (۲)

(۱) یہ طریقہ سید رسول شاہ صاحب الوری سے جاری ہوا۔ اس گروہ کے فقیر چہرہ پر خاک لگاتے ہیں اور چار ابرو کا صفایا رکھتے ہیں اور ایک رومال مثل کلاہ کے سر پر رکھتے ہیں اور رات کا سونا حرام جانتے ہیں۔ اکثر صاحب ورد وغیرہ عضو تحلیل کو اپنی زبان سے چاٹ کر اچھا کرتے ہیں سلسلۂ بیعت ان کا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک پہنچتا ہے (تذکرۃ الفقرا صفحہ ۲۲)

(۲) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) ص ۲۱

(۷)

مولانا محمد حیات

وطن اصلی آپ کا ملک پنجاب ہے۔ اُسی نواح میں تحصیل علوم ورسی سے فراغت حاصل کرکے چندے اطراف ہندوستان میں بہ لباس طالب علمی بسر کی اور پھر شہر شاہجہاں آباد میں وارد ہوکر اوائل حال میں شاہ سید صابر علی معروف بہ شاہ صابر بخش رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں فروکش ہوکر درس علوم معقول اور منقول میں مصروف رہے، چونکہ علم وفضل آپ کا رشک اقران وامثال تھا، طلبا اطراف وجوانب سے تحصیل علم کے واسطے حاضر خدمت ہوکر آپ کی تعلیم کے فیض سے مرتبۂ فضیلت کو پہنچے اور آپ کے یہاں کا ادنٰے طالب علم اور جاتے کے فضلا سے بہتر گنا جاتا تھا۔ چند تلمیذ آپ کے فیض خدمت سے یکتائے عصر اور یگانہ دہر ہوگئے۔ خصوصًا حافظ عبدالرحمٰن کہ آپ کی تعریف اور توصیف علم وفضل کی حیطۂ مقال اور حیطۂ گفتگو سے باہر ہے۔ باوجودیکہ یہ بزرگوار بصارت سے معذور ہیں کوئی علم عقلیہ اور نقلیہ سے ایسا نہیں کہ اس کو محققانہ نہ جانتے ہوں۔ اور طرفہ تو یہ ہے کہ ہیئت اور ہندسہ باوجود بینائی نہ ہونے کے اس طرح بے تکلّف پڑھاتے ہیں کہ اور ماہرین اس فن کے اگر ہزار چشم بمطالعہ شب وروز صرف کتاب کریں تو حیثیت خطوط ودوائر کی ویسی آپ نہ سمجھیں اور نہ دل نشین تلمیذ کے کرسکیں۔ ازبسکہ حضرت موصوف کے مزاج تقدس امتزاج پر قدیم الایّام سے ترک غالب تھا، جب ایسے تلامذہ باکمال کو فارغ التحصیل اور لائق درس وتدریس کے پایا اپنی طبیعت کو اس طرف سے اٹھاکر ذکر واشغال کی طرف مصروف کیا اور کمل فقرا اور عظمائے مشائخ سے فیض باطن کو کسب اور نعمائے معنوی کو حاصل کیا اور رنج سفر اپنی ذات موہبت آیات پر گوارا کرکے پاک پٹن میں جاکر حضرت شاہ

سلیمان صاحب کی خدمت سے مشرف ہوئے اور اُن کے فیض صحبت سے تصفیۂ قلب اور تزکیہ نفس کو بہ کمال پہنچایا اور رخصت انصراف حاصل کر کے پھر وارد شاہجہاں آباد ہوئے، ان دنوں میں شاہ ...بخش صاحب جہان فانی سے راہی عالم باقی ہو چکے تھے۔ اُن کی خانقاہ کی بود و باش کو ترک فرما کر ایک اور مسجد میں کہ قریب قلعۂ مبارک کے واقع ہے، سکونت اختیار کی اور آج تک وہیں تشریف رکھتے ہیں۔ آپ کی برکت قدوم سے اُس مسجد کی مرمت ہر سال ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسی آباد ہو گئی ہے کہ اب اس کو بہ اعتبار کثرت عبادات اور وفور طاعات خیر المساجد اور افضل المعابد کہنا چاہیے۔ اب سن شریف آپ کا قریب ستر کے پہنچا ہے۔ خدائے عزوجل آپ کی عمر کی ترقی کرے کہ طالبان صادق کو آپ کے فیض باطن سے فوائد کثیرہ اور ہدایت موفورہ حاصل ہوتی ہے۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صـ ۳۴

(۸)

حاجی علاؤ الدین

آپ شاہ آفاق صاحب کے خلیفہ اور سجادہ نشین ہیں اور حقیقت میں اپنے پیر کی نشانی ہیں اس زمانہ میں ایسے لوگوں کا ہونا مغتنمات سے ہے۔ ایسے لوگ کاہے کو پیدا ہوتے ہیں۔ تمام عمر فقیری میں صرف کی اور دنیا و مافیہا سے غرض نہ رکھی سچ ہے کہ السعید من سعد فی بطن امہ۔ چھٹ پن سے آپ کو فقیری کا شوق تھا۔ سولہ برس کی عمر میں بیعت کی اور طرح طرح کے زہد اور مجاہدہ کیے اور اپنے پیر کی خدمت میں ہمیشہ سفر اور حضر میں حاضر رہے۔ آپ کا نسب حضرت خواجہ یوسف ہمدانی سے ملتا ہے۔ توکل علی اللہ اور عشق رسول اللہ ہر وقت آپ کے برتاؤ میں ہے عالم جوانی میں حج خانہ کعبہ ادا کیا اور زیارت روضۂ منورہ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام حاصل کی اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو نصیب کرے۔ آمین یارب العالمین۔ اب سن شریف آپ کا نوے برس کے قریب ہے، آنکھوں سے معذور ہیں، اور پاؤں سے اٹھ نہیں سکتے۔ طاقت طاق ہے مگر ہر دم شغل جاری ہے، اور صوم و صلوٰۃ قائم۔ سبحان اللہ کیا لوگ ہیں کہ کسی حالت میں اپنے معبود کی یاد سے غافل نہیں۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی از سر سید، صد ۲۲

(۹)

حضرت سیّد احمد صاحب قدس سرہٗ

”جناب ہدایت انتساب زبدۂ واصلان درگاہ سید احمد صاحب ذی جناب شہزادہ جعل الجنۃ مثواہ، سادات عظام اور مشائخ کرام سے تھے موطن اصلی آپ کا بریلی۔ اوائل حال میں شوق طلب علمی میں وطن سے وارد شاہجہاں آباد ہو کر حضرت پر برکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمۃ کی خدمت سراسر افادت میں حاضر ہو کر مسجد اکبرآبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ از بسکہ ذوق دردمندی اور مسکینی طینت میں پڑی ہوئی تھی۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشان پاک طینت کی، جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر صاحب مغفور موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے، خاطرداری اور سرانجام مہام میں ایسے بدل سرگرم ہوتے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے اور اس زمانہ میں بھی اپنی اوقات کو طاعات و عبادت میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین و گوشہ نشین تھے اُن سے اس طرح خاطر مجموع اور حضور قلب سے خضوع میں زائد تھے۔ اکثر مولانائے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منش کا ترقی مدارج علیہ کے قابل نظر آتا ہے۔ اسی اثنا میں مرجع علمائے انام، اسوۂ بلغائے عظام، جامع کمالات صوری و معنوی، خادم حدیث شریف نبوی،

مولانا مولوی شاہ عبدالعزیز قدس سرہ علیہ الرحمۃ سے بیعت کا ارادہ کیا۔ بعد بیعت

آپ واپس تشریف لے گئے ایک عرصہ کے بعد وہیں آگئے۔ ان دنوں

آپ کے تشریف لانے سے مردم شہر میں ایک غلغلہ پڑ گیا اور طالب

فیض باطن کے کثرت سے ہجوم کرنے لگے۔ ایک بار مولوی صاحب موصوف نے بہ اتفاق مولوی عبدالحی (۱) رحمۃ اللہ علیہ کے آپ کی خدمت میں جاکر عرض کیا کہ ہم کو نماز حضور قلب سے کبھی میسر نہیں ہوتی، اگر آپ کی ہدایت سے یہ امر حاصل ہو جائے تو عین مدعا ہے۔ حضرت نے کشف باطن سے معلوم کیا کہ یہ بطریق امتحان اس طرح سے کہتے ہیں۔ تبسم کیا اور فرمایا کہ مولانا آج شب کو اس حجرہ میں تشریف لاؤ شاید یہ بات ظہور میں آجائے۔ اُن کو زیادہ استعجاب ہوا اور شب کو دونوں صاحب تشریف لے گئے اور آپ نے ساتھ ان کو نماز میں کھڑا کیا اور جب نماز پڑھوا چکے، فرمایا کہ اب جدا جدا نیت باندھ کر دو دو رکعت علیحدہ پڑھو۔ یہ جب کھڑے ہوئے تو اس طرح کا استغراق ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کو انہیں دو رکعت میں شب بسر ہو گئی۔ جب یہ فیض باطن مشاہدہ کیا، صبح کو دونوں صاحبوں نے بیعت کی اور یہاں تک آپ کی کفش برداری میں حاضر رہے کہ آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے تھے۔ چند روز کے بعد آپ نے فرمایا کہ مولانا مشیت الٰہی میں یوں ہے کہ تم کو تکمیل اس علم کی اور تتمیم ان مراتب کی سفر میں حاصل ہو، ان کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ کا سفر کیا اور راہ میں قریب ہزار آدمی کے اپنے ہمراہ لے کر اور ان کے نایحتاج کے کے متکفل ہو کر حج ادا کیا اور وہاں سے پھر ہندوستان کی طرف تشریف لائے۔ اور آپ جو ترویج رسوم شرعیہ اور امر بالمعروف بہت کرتے، منہیات کا رواج اُن کے قدوم کی برکت سے اکثر اطراف سے اٹھ گیا طرفہ یہ ہے کہ شہر کلکتہ میں جب تک آپ نے تشریف رکھی شراب مطلق نہ بکنے پائی اور کلال خانہ بند رہا اور اس نواح میں آپ کے مریدوں کی کثرت لکوک (۲) سے

---

(۱) مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کے شاگرد اور داماد۔ فقہ حنفیہ کے بڑے ماہر تھے۔ ان کی تصنیف سے فتاویٰ اور رسالہ نکاح ایامیٰ دو کتابیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی رح کے ساتھ جہاد میں شریک تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۱۱۴، ابجد العلوم ص ۹۱۶ - ۹۱۵)۔

(۲) "لکوک" لک کی جمع، یعنی لاکھوں۔

گذر گئی تھی بعد آپ کے اکثر خلفا کو قطب اور اوتاد کا مرتبہ حاصل ہوا۔ اور چونکہ از روئے کشف باطن
کے معلوم ہو گیا تھا کہ آپکو مع اکثر مومنین پاک اعتقاد کے سعادت شہادت حاصل ہونے والی ہے۔
مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحی کو اجازت حاصل ہوئی کہ اطراف ہندوستان میں وعظ کہو اور
بیش تر جہاد اور فضیلت شہادت بیان کرو۔ ہر چند یہ اس منشا کو نہ جانتے تھے اور پے ہوئے
گئے کہ اس ارشاد کا سبب کیا ہے۔ لیکن چونکہ مرید با اخلاص تھے سرمو تجاوز نہ کیا اور فرمان بجا
لائے۔ ان کے فرمان سے لکھو کھا مردم شاہراہ ہدایت پر آئے اور شوق نا محو لحوق دل میں جم گیا اور
جہاد کی افضیلت ذہنوں میں بیٹھ گئی اور خود بخود چاہنے لگے کہ اگر جان و مال راہ الٰہی میں صرف
ہو تو عین سعادت ہے۔ بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے
آؤ۔ یہ تو جان نثار تھے بہ مجرد حکم کے مثل تیر وعظ کو نیم جان چھوڑ کر خدمت بابرکت میں
راہی ہوئے اور حضرت ان کو ہمراہ لے کر کوہستان چلے گئے اور یہ ہنوز اس کے ملنے سے واقف
نہیں جب پنجتار میں وارد ہوئے قوم افغان باآں کہ دوش سے کم نہیں حضرت کے ایسے معتقد
ہوئے کہ آپ کے ہاتھ پر بیعت امامت کی اور عہد کیا کہ اگر حضرت جہاد کریں تو ہم سرفروشی کو
حاضر ہیں۔ آپ نے سکھوں کی قوم پر جہاد قائم کیا۔ مردم ہندوستان اس خبر کے سننے سے اطراف
جوانب سے راہی ہوئے اور سوائے قوم افاغنہ کے مردم ہندوستان لاکھ آدمی کے قریب جمع
ہوئے حق جل و علا نے اس صفات باطن کو اختیار طریقہ رشد و ہدایات کے باب میں واسطے کا محتاج
نہیں رکھا اور وسیلہ کا نیاز مند نہیں کیا۔ لیکن اہل ظاہر کے نزدیک ہر چیز کے لیے ایک سبب
ضرور ہے۔ رفع حجت عوام کے واسطے کچھ مضائقہ نہیں پھر آپ نے مولانائے موصوف سے
بیعت کے بعد چند مدت کے سفر اختیار کیا۔ در اطراف و جوانب میں خدا شناسان پاک باطن سے
فیض حاصل کرنے میں سرگرم رہے از بسکہ مقامات عالی روز بروز کھلتے جاتے تھے اور مراتب
علیا آناً فاناً ترقی میں تھے۔ اس دولت بے زوال سے اہل ظاہر کو آگاہی ہو چکی اور ہر طرف سے
لوگوں نے ہجوم کیا اور کسی نے بیعت اور کسی نے روائے حاجت سے سوال کرنا شروع کیا۔ چونکہ

اخفائے حال اور ستر احوال منظور تھا خیال میں یہ آیا کہ اگر اہل دنیا کے لباس سے ملبس ہو کر علم باطنی کی تحصیل اور تکمیل کی جاوے تو یہ ہجوم عوام کا جمعیت اوقات میں خلل انداز نہ ہوگا۔ اس خیال سے ٹونک کی جانب تشریف لے گئے اور نواب امیر خان کی رفاقت میں بسر کی۔ اور از بسکہ شجاعت اور جانبازی مردی سادات صحیح النسب کا جوہر ہے۔ اس اثنا میں زدوات عظیمہ آپ سے ظہور میں آئے اور بایں ہمہ تلاش اہل باطن کی روز و شب پیش نہاد تھی اور اکثروں کو ہدایت کی راہ بھی آپ سے حاصل ہوتی۔ جب اس عرصہ میں جمیع مراتب کی تکمیل ہوگئی آپ ترک دنیا کر کر پھر شاہجہان آباد میں تشریف لائے اور مسجد اکبر آبادی میں وارد ہوئے۔ اس اثناء میں مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور مولوی محمد اسماعیل (۱) رحمۃ اللہ علیہ قائم مقام علوم رسمی کے درس و تدریس میں مصروف اور خطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا، دور دور امام (۲) ہو گیا۔ چند منزل تک عشر جو طریقہ اسلام میں ایک نوع خراج کی ہے۔ آپ کے پاس آنے لگا۔ پشاور اور بعض مکان سکھ کی عملداری سے نکل کر غازیان اسلام کے تصرف میں آگئے۔ سکھوں کے باوجود اس شوکت و شان ظاہری کے آپ کا ایسا رعب دل میں بیٹھ گیا کہ کچھ ملک دینے پر راضی ہوئے، سچ ہے۔

ع
بیلبستہ حق است ایں از خلق نیست

لیکن حضرت کو جو کہ ترویج اسلام منظور تھی قبول نہ کیا۔ کئی سال تک یہی سلسلہ یوں ہی چلا گیا۔ اور مولانا مولوی عبدالحی علیہ الرحمۃ نے بیماری بدنی سے سفر آخرت اختیار کیا (۳) بعد اس

---

(۱) مولوی محمد اسماعیل ابن مولوی عبدالغنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے پوتے۔ مشہور عالم دین، کئی کتابوں کے مصنف۔ سید احمد بریلویؒ کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (پنجاب) شہید ہوئے۔ آپ کے حالات میں ایک کتاب "سیرت اسماعیل شہید" اردو میں لکھی گئی ہے۔

(۲) دور دورہ امام

(۳) شعبان ۱۲۴۳ھ میں بعارضہ بواسیر آپ نے وفات پائی (تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۱۴)

کے جو کہ قوم افغانہ بندۂ زر اور بہ نیت طامع ہیں، سکھوں کے اغوا سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغا کی۔ از بسکہ مشیت الٰہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی، قریب بالاکوٹ کے حضرت نے مع مولوی محمد اسماعیل اور اکثر مومنین صادق اعتقاد کے شہادت پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (۱)۔ حضرت کی شہادت کو چودہ پندرہ برس کا عرصہ گذرتا ہے۔ (۲)

---

(۱) ۲۴ ذی القعدہ ۱۲۴۶ھ میں بمقام بالاکوٹ (پنجاب) کی شہادت واقع ہوئی۔

(۲) تذکرہ اہل دہلی (سر سید) صفحہ ۳

(۱۰)

شاہ محمد اسحاق رح

یگانۂ آفاق مولانا مولوی محمد اسحاق[1] آپ نواسہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم قدس سرہ کے، علم حدیث کو شاہ صاحب مبرور و مغفور کی خدمت میں حاصل کیا اور بیس برس کامل تک یہ فن شریف اور علم منیف ان کے حضور میں بیٹھ کر طلبۂ جدید الفکر کو پڑھایا۔ اتباع سنت سے کوئی کام آپ سے سرزد نہ ہوتا۔ چونکہ حق جلّ و علا نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں، آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ سیّد الثقلین صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا ان کی یہی صورت و سیرت ہوگی۔

ع زہے امت خاتم المرسلین

بعد وفات شاہ صاحب موصوف ان کا فرق مبارک دستار خلافت سے مزیّن اور تمام معتقدین صافی اعتقاد کی رجوع آپ کی طرف ہوئی۔ ناز اور فخر کرنا چاہیے ایسی خدا جوئی پر کہ سب کچھ چھوڑ کر سفر سفر حجاز اختیار کیا اور وہاں مع قبائل و عشائر پہنچ کر فرض حج ادا کیا اور پھر تشریف لاکر مواعظ و نصائح سے خلق کو راہ ہدایت دکھاتے رہے۔ بعد ایک مدت کے از بسکہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر بدعات میں قوت آتی جاتی تھی، نیت ہجرت کو مصمم کرکے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر راہی مکہ معظمہ ہوئے[2]

---

(۱) ان کے حالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ کتاب الحیاۃ بعد الممات (سوانح میاں نذیر حسین، ص ۲۸ میں درج ہیں۔ نیز دیکھو حدائق الحنفیہ ص ۴۷۴۔

(۲) ۱۲۵۶ھ میں آپ نے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی (تاریخ دہلی از سید احمد ص ۱۰۶)۔

اور باوجود یکہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بر سماجت تمام مانع آئے، چونکہ شوق ما ہو الحق غالب تھا، آپ ممتنع نہ ہوئے اور مکہ معظمہ جاکر توطن اختیار کیا اور بہ سبب کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا، خصوصاً ان لوگوں کی مراعات کے سبب جو ہندوستان سے ادائے حج کو وارد مکہ شریف ہوتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے حضرت کے وجود مسعود کو از جملہ مغتنمات سمجھا اور اُن کا وہاں ہونا موجب برکت جانا۔ شاہجہاں آباد سے جدا ہو کر اُس دیار میں چھ برس کامل تشریف رکھی۔ اب ایک برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ اسی دیار میں جہانِ فانی کو وداع کیا(۱) اور عالم باقی کی طرف راہی ہوئے (۲)

محویت اور استغراق

شاہ عبدالعزیز صاحب جب مدرسے میں تشریف لے جاکے دریافت کرتے کہ اس وقت مدرسہ میں کون ہے۔ اگر خدام کہتے کہ حضور فلاں ہے۔ تو فرماتے۔ خیر اگر اور کہہ دیتے۔ کہ میاں اسحاق ہیں۔ تو فرماتے کہ مدرسہ کی حفاظت کا انتظام کر دو۔ اسحاق کے بھروسہ نہ رہو۔ اسباب تو اسباب اگر کوئی مدرسہ کی دیواریں اٹھا کر لے جائے گا۔ تب بھی اسے خبر نہ ہوگی۔ (۳)

گاؤں ضبط ہونے کی خوشی

خان صاحب نے فرمایا۔ کہ تحصیل سکندر آباد میں ایک گاؤں ہے رحمن پور جس کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ بہت بڑا گاؤں ہے یہ ایک وقت میں مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب کا تھا۔ مولوی مظفر حسین صاحب فرماتے تھے۔ کہ مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب بہت سخی تھے۔ اور اکثر تنگی کی وجہ سے کچھ ملول سے رہتے تھے۔ لیکن ایک روز میں نے دیکھا۔ کہ دونوں بھائی نہایت ہشاش بشاش ہیں۔ اور خوشی میں ادھر سے ادھر آتے جاتے۔ اور کتا ہیں یہاں سے وہاں اور وہاں

---

(۱) ۱۲۶۲ھ میں مکۂ معظمہ میں وفات پائی۔

(۲) تذکرۂ اہل دہلی (سرسید) صہ ۳

(۳) امیر الروایات صہ ۲۲۴

سے یہاں رکھتے اور خوشی کے بھر میں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر سمجھا کہ شاید آج
کوئی بڑی رقم ہندوستان سے آئی ہے جس سے یہ اس قدر خوش ہیں۔ یہ سمجھ کر میں نے چاہا کہ واقعہ
دریافت کروں۔ مگر بڑے میاں صاحب سے تو پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چھوٹے میاں سے پوچھا
کہ حضرت آپ آج بہت خوش نظر آتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے متعجبانہ لہجہ میں فرمایا
کہ تم نے نہیں سنا۔ میں نے کہا کہ نہیں فرمایا کہ ہمارا گاؤں حسن پور ضبط ہو گیا ہے۔ یہ خوشی اس
کی ہے۔ کیونکہ جب تک وہ تھا ہم کو خدا پر پورا توکل نہ تھا۔ لہذا اب صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا ہے
اور جب خان صاحب نے یہ واقعہ بیان فرمایا۔ تو احقر کو مومن خان کی خوشی یاد آگئی اور میں نے
یہ شعر پڑھا۔

؎ کیا یار کے آنے کی سنی یا کہ اجل کی ؎
؎ کاہے کی خوشی ہجر میں ہے جان حزیں یہ ؎ (۱)

حدیث و تفسیر میں یگانہ

آپ شاہ عبدالعزیز کے نواسے تھے علوم فقہ و حدیث و تفسیر میں طاق یگانہ آفاق صاحب تقویٰ تھے بڑے بڑے علماء و فضلا نے آپ سے علوم پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی چنانچہ مولانا نواب محمد قطب الدین محدث دہلوی مصنف مظاہر حق ترجمہ اردو مشکوٰۃ شریف آپ کے ہی شاگرد تھے آپ نے ایک رسالہ مسائل اربعین نام تصنیف کیا جس میں کسی ایک جگہ پر اپسے کچھ لغزشیں وقوع میں آئیں اور ان کے جواب میں علمائے وقت نے رسائل تصنیف کیے وفات آپ کی ۱۲۶۲ھ میں مکہ معظمہ میں ہوئی تاریخ وفات آپ کی اسحاق شیخ آفاق سے نکلتی ہے۔ (۲)

پادری سے مناظرہ

خان صاحب نے فرمایا کہ یہ قصہ میں نے مولوی محمود بہلتی اور نواب محمود علی خان سے سنا ہے۔ یہ حضرات فرماتے تھے کہ شاہ اسحٰق

---

(۱) امیر الروایات ص ۱۳ (۲) حدائق الحنفیہ ص ۴۷۴

صاحب کے زمانہ میں ایک انگریز پادری دلی میں آیا یہ بہت قابل اور لسان اور مشہور پادری تھا۔ اس نے دلی میں طور پر علماء کو مناظرہ کی دعوت دی اس وقت کے مولوی جو خاندان عزیزی کے مخالف تھے، ان کو شاہ اسحاق صاحب سے بہت کاوش تھی۔ انہوں نے اس پادری کو پٹی پڑھائی کہ تم شاہ اسحاق صاحب سے خاص طور پر مناظرہ کی درخواست کرو چونکہ شاہ صاحب بہت سیدھے اور بہت کم گو تھے۔ اور زبان میں لکنت تھی۔ اس لیے اُن کو خیال تھا کہ یہ لسان پادری شاہ صاحب کو ضرور مات دے گا۔ اور ان کو ذلت ہوگی۔ اس پادری نے شاہ صاحب کو دعوت مناظرہ دی شاہ صاحب نے بے تکلف منظور فرمالی۔ اس پر شاہ صاحب کے دوستوں کو بہت خیال ہوا۔ مولوی فریدالدین صاحب جو مراد آباد کے رہنے والے اور مولوی اسماعیل صاحب اور نواب رشیدالدین کے اچھے شاگردوں میں اور نہایت ذہین آدمی تھے۔ اور مولوی محمد یعقوب صاحب ان دونوں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ مناظرہ نہ فرمائیں۔ آپ ہم کو اپنا وکیل بنا دیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اس نے مجھی کو دعوت دی ہے۔ میں ہی مناظرہ کروں گا۔ وکیل بنانے کی ضرورت نہیں۔ بادشاہ بھی شاہ صاحب کا مخالف تھا۔ قلعہ میں مناظرہ کی ٹھیری جب مناظرہ کا وقت آیا۔ اس وقت سب لوگ قلعہ میں پہنچ گئے۔ اور مجلس مناظرہ منعقد ہوئی خدا کی قدرت جب وہ پادری شاہ صاحب کے سامنے آیا تو اس کے جسم پر لرزہ پڑ گیا۔ اور حواس باختہ ہو گئے۔ اور ایک حرف بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ جب کچھ دیر ہوگئی۔ تو شاہ صاحب نے اس پادری سے فرمایا: کہ آپ کچھ فرمائیں گے۔ یا میں ہی عرض کروں۔ اس نے کہا کہ آپ ہی فرمائیں۔ شاہ صاحب نے خوب زور و شور کے ساتھ اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کے بطلان کے دلائل بیان فرمائے وہ پادری ساکت محض تھا۔ نہ اس نے آپ کی تقریر پر کچھ خدشہ کیا اور نہ اپنی طرف سے کوئی سوال کیا۔ جب تمام لوگوں پر اس پادری کا عجز ظاہر ہو گیا۔ تب آپ نے ان مخالف مولویوں کی طرف جنہوں نے اس پادری کو ابھارا تھا۔ متوجہ ہو کر فرمایا: کہ ہمارے خاندان کا قاعدہ رہا ہے کہ وہ تفسیر سے پہلے تورات و انجیل و زبور پڑھا دیا کرتے تھے۔ کیونکہ بغیر ان کتابوں

پر عبور ہوئے۔ قرآن شریف کا لطف نہیں آتا۔ اسی قاعدے کے مطابق مجھے بھی یہ کتابیں پڑھائی گئی تھیں۔ اور اس لیے میں عیسائی مذہب سے ناواقف نہیں ہوں۔ اور یہ فرماکر فرمایا۔ کہ اگر اسحاق کو شکست اور ذلت ہوتی۔ تو کچھ بات نہ تھی۔ کیونکہ مجھے علم کا دعویٰ ہی کب ہے۔ لیکن اسلام تو تمہارا بھی تھا۔ اس سے تمام مخالفین پر پانی پڑ گیا۔ اور مناظرہ ختم ہو گیا۔ (۱)

---

(۱) امیر الروایات صـ۲۲۴

(۱۱)

حضرت کالے صاحبؒ

محمد شاہ کی دلّی ہے زوال و انحطاط کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں قتل و غارتگری کا دُور دورہ ہے۔ سکھ اور مرہٹے ہر طرف لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں نادر شاہ کا قتلِ عام اسی زمین پر ہو چکا ہے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ہچکیاں لے رہا ہے اور دم توڑا ہی چاہتا ہے جس دَور کی ابتدا ایبک و التمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی وہ آج محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے۔

اس سیاسی بدامنی اور اخلاقی پستی کے زمانے میں اللہ کے کچھ بندے درس و تدریس کے کام میں مشغول ہیں ہوا تیز و تند ہے لیکن وہ اپنا چراغ جلا رہے ہیں طوفان امنڈتا چلا آ رہا ہے لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور اپنے کام میں اسی طرح مشغول ہیں۔

دو مدرسے ایسے ہیں جو اس وقت کی دلّی کی جان ہیں ایک مدرسہ رحیمیہ جس میں دربار ولی اللہی سج رہا ہے اور ایک زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے اور دوسرا اجمیری دروازہ کا مدرسہ جس میں دکن کا ایک نوعمر عالم کسی روحانی اشارے پر آ کر اقامت گزین ہو رہا ہے تقریباً نصف صدی قبل اس نوجوان کے والد کو دہلی کے ایک مشہور بزرگ نے دکن میں تبلیغ و اصلاح کے کام کے لیے بھیجا تھا۔ آج اس کا یہ فرزند علم و عرفان کی شمع جلانے کے لیے دکن کو چھوڑ کر دہلی چلا آیا ہے دور دور سے لوگ پروانوں کی طرح کھنچ کر اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتا ہے وہ اسی کا ہو جاتا ہے جب حدیث کا درس دینا شروع کرتا ہے تو سننے والوں پر عجب

فنا در سامعہ در موج کوثر و تسنیم

کا عالم طاری ہو جاتا ہے یہ شاہ فخر الدین رح ہیں۔ اُن کے والد شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ حضرت شاہ کلیم الدین دہلوی کے عزیز ترین مُرید اور خلیفہ تھے۔

اگر کوئی شخص کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بغیر سند نہ فرماتے [۱]

نماز جماعت سے ادا فرماتے اور اسی کی تلقین فرماتے۔

"تقید جماعت بدرجہ اتم در خاطر مبارک است" [۲]

معمولی معمولی باتوں میں اتباعِ سنّت کا خیال رہتا تھا برتن "مکان ضرور" اور وضو کے لیے علیحدہ رکھتے تھے [۳] ایک مرتبہ کھانے کے لیے بیٹھے تو فرمانے لگے۔ میں جس طرح بیٹھا ہوں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اسی طرح بیٹھا کرتے تھے [۴] پھر لوگوں کو مسواک کی ہدایت فرمائی کہ اس پر حدیث شریف میں بہت اصرار کیا گیا ہے کہ جو شخص خواب سے بیدار ہو اس کو مسواک کرنی چاہیے [۵] ایک مرتبہ خوشبو کی تلقین فرماتے ہوئے نہایت محبّت آمیز لہجہ میں فرمایا۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کو خوشبو بہت پسند تھی [۶]

ملفوظات وحالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مُریدوں کو اتبّاعِ سنّت و شریعت پر مجبور کرتے تھے اور طرح طرح سے فوائد بیان فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنا قصّہ بیان فرمانے لگے کہ جنگ کے دوران میں بارود کے اثر سے آنکھوں کو نقصان پہنچ گیا تھا اور ڈر تھا کہ بصارت بہت کم ہو جائے گی لیکن سرمہ کے استعمال سے بصارت بحال ہو گئی

---

[۱] فخر الطالبین ص ۱۴
[۲] فخر الطالبین ص ۲۶
[۳] [۴] [۵] فخر الطالبین۔ ص ۱۰۰/۱۰۱
[۶] فخر الطالبین ص ۱۰۱

کمی نہیں ہوئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہ متابعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھی لے
ایک جگہ مریدوں کو ہدایت ہوتی ہے ۔۔۔

درد ے کہ در حدیث شریف	حدیث شریف میں جو وارد آیا ہے
آمدہ ہموں را بخوانند بطرف	اسی کو پڑھیں دوسری چیزوں کی
چیز ہائے دیگر رجوع نہ کنند بہ	طرف رجوع نہ کریں مذہب حنفی
مذہب حنفی تعصب می کنند	پر مضبوطی سے قائم رہیں حدیث کی
بطرف حدیث بسیار رجوع دارند[۲]	طرف کثرت سے رجوع کریں

وفات سے پہلے کا ذکر ہے کہ ریش مبارک بڑھ گئی تھی طول ہو کر فرمانے لگے ۔
"این ترک سنت از ما شد ۔"

سکھ اور شاہ صاحب :۔ شاہ فخر الدین صاحب کے زمانے میں سکھوں کی چیرہ دستیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں دہلی کا ہر خاندان ہراساں اور پریشان تھا۔ بڑے بڑے خاندانوں کی عزت خطرے میں تھی شاہ فخر الدین صاحب نے قتل و غارت گری کے یہ سب نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ خود جب وہ دہلی سے غیاث گڈھ گئے تھے تو سکھوں سے حفاظت کے لیے راستے میں بڑا اہتمام کیا گیا تھا سکھوں کی غارت گری سے ان کو سخت صدمہ تھا انسانی خون کی ارزانی دیکھ کر ان کو بادشاہ کی حالت پر غصہ آتا تھا کہ وہ ان فتنوں کے انسداد سے کیوں غافل ہے آخر کو نہ رہا گیا اور ایک دن دربار میں بادشاہ سے کہہ اٹھے ؛۔

"بہ تنبیہ انہا دفرقہ سکہان، باید پرداخت کہ فلاح دینی و دنیوی درضمن آں است "

تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کا وہی مسلک تھا جو حضرت شاہ کلیم اللہ اور دیگر بزرگان چشت کا تھا کہ ہندوؤں کو ذکر بتاؤ اس انتظار میں نہ رہو کہ وہ پہلے سے مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا

لہ فخر الطالبین ص ۱۰۰ ؎ فخر الطالبین ص ۱۴۴

جائے اس لیے کہ

؎ ذکر خود او را در حلقۂ اسلام خواہد کشید ؎[1]

اس زمانے میں بہت سے ہندو خاموش طریقہ سے مسلمان ہوتے تھے بعض کا ذکر شاہ کلیم اللہ صاحب کے سلسلہ میں کیا گیا ہے وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان صاف طور سے مخالفت کے ڈر سے نہیں کرتے تھے اور یہ ڈر ایک حد تک صحیح بھی تھا۔ شجرۃ الانوار میں ایک ہندو عورت کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ کھلم کھلا مسلمان ہوگئی تھی اور اس کے بعد دہلی میں بلوہ ہوگیا تھا بدامنی یہاں تک پھیلی تھی کہ حضرت شاہ فخرالدین صاحب نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کرلیا تھا[2] فخرالطالبین میں ایک ہندو کا ذکر ہے کہ جب وہ حضرت شاہ صاحب کے پاس آتا تھا تو وہ دروازے بند کرا دیا کرتے تھے[3] شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں بھی ایک ہندو اتم چند کا ذکر ہے کہ وہ مسلمان ہوگیا تھا لیکن اس کا ذکر نہ کرتا تھا[4] ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت تمام اُن بزرگوں نے جو تبلیغ و اصلاح کے کام میں مصروف تھے اسی طرح سے اپنے کام کو انجام دیا۔ نورالدین فخری نے کئی ایسے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے جو حضرت شاہ فخر صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے تھے ایک جگہ لکھا ہے :۔

؎ ہندوئے آمد کہ از مدتے در طریقہ شامل شدہ است و نماز ہم باخفا می گذارد گویا از یاران است ؎[5]

---

[1] مکتوبات کلیمی

[2] شجرۃ الانوار

[3] فخرالطالبین ص ۶۸

[4] ملفوظات شاہ عبدالعزیز ۲۶ ص ۱۱

[5] فخرالطالبین ص ۶۸

شاہ صاحب ہندوؤں سے بہت اچھی طرح ملتے تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے ایک مرتبہ سفر میں ایک ہندو سے ملاقات ہوئی عامل تھا وہ جس چیز کو چاہتا تھا منگا لیتا تھا شاہ صاحب سے کہنے لگا۔ اگر کرم فرمودہ بخانہ من تشریف فرمائید موکلاں ایں عمل بشما آشنا سازم "

شاہ صاحب نے فرمایا کہ ہر بات قرآن شریف میں موجود ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں
" جملہ امور در قرآن شریف موجود است حاجت ندارم " [1]

شاہ فخر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اس انتظار میں نہیں رہنا چاہیئے کہ اول مسلمان ہو جائیں پھر ذکر بتایا جائے۔

" مارا چناں معلوم است کہ از تعلیم نام خدائے عزوجل کوتاہی نباید کرد در بند آں نباید شد کہ اول مسلم شود من بعد چیزے شغل کند نام اثرہا است خود بطرف خدا خواہد کشید " [2]

یہی وہ طریقہ تھا جس کے اختیار کرنے کی تاکید کلیم اللہ صاحب نے فرمائی تھی اور جس کی تاثیر ان کے سلسلہ کے ہر بزرگ نے محسوس کی تھی اور اس پر عمل کیا تھا۔

وفات :۔ حضرت شاہ فخرالدین صاحب نے ۲۷ جمادی الثانی ۱۱۹۹ھ کو وصال فرمایا [3] اس وقت آپ کی عمر ۷۲ سال تھی [4]

اولاد حضرت شاہ فخرالدین صاحب کے ایک فرزند تھے ان کا نام غلام قطب الدین تھا وہ دکن میں پیدا ہوئے تھے اور شاہ صاحب دہلی تشریف لائے تو اپنی بہن

---

[1] مناقب ا ص ۹۲

[2] فخر الطالبین ص ۶۹

[3] شجرۃ الانوار

[4] تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۵

کے سپرد کر دیا —

کالے صاحب

غلام قطب الدین صاحب نے ۱۴ محرم ۱۲۳۲ھ کو وصال فرمایا، اور حضرت قطب صاحب رح کے جوار میں آسودہ ہوئے۔

غلام قطب الدین صاحب کے بھی ایک ہی فرزند تھے اُن کا نام میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب تھا۔ دلّی میں خواص و عوام سب اُن کا ادب و احترام کرتے تھے سرسید نے لکھا ہے

"اس زمانے میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے حضور والا اور تمام سلاطین و جمیع امراء عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں"[۱]

دہلی کا ہر شخص امیر و غریب چھوٹا اور بڑا ان سے ملتا تھا۔ غالب کو اُن سے خاص لگاؤ اور اُنس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :—

"میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرائے کو لے کر اس میں رہتا ہوں وہاں کا رہنا میرا تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا"[۲]

بہادر شاہ ظفر کو اُن سے بڑی عقیدت تھی لکھتا ہے ؎

نظام خانۂ فخر جہاں تمہیں تو ہو	قیام سلسلہ و خاندان تمہیں تو ہو
نہ کیونکہ تم سے ہوں ظاہر صفات قطب الدین	خدا رکھے تمہیں ان کا نشاں تمہیں تو ہو
تمہارے در پہ جھکا کر سر ارادت خلق	کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمہیں تو ہو
نثار تم پہ ہیں پروانہ ساں ہزاروں دل	کہ شمع محفل صاحب دلاں تمہیں تو ہو
تمہاری قوت باطن سے تقویت ہی مجھے	کہ میرے باعث تاب و تواں تمہیں تو ہو

---

[۱] آثار الصنادید

[۲] اردوئے معلی حصہ دوم ص ۱۷

بغیر آپ کے ہوں کیوں نہ جان و دل بے چین — کہ راحت دل و آرام جان تمہیں تو ہو

ظفر کو چاہئے نصرت تری نصیر الدین — کہ اس کے یار و مددگار ہاں تمہیں تو ہو

کالے صاحب خود بھی بادشاہ کے پاس اکثر جایا کرتے تھے بمبئی کے احسن الاخبار اور دلی کے سراج الاخبار کے اقتباسات سے جو خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہادر شاہ کے روز نامچہ کے نام شائع کئے ہیں۔ (۱) یہ ثابت ہے:

"بادشاہ کی طرف سے اُن کا وظیفہ بھی مقرر تھا تقریبات کے موقع پر بادشاہ اُن کے سارے اخراجات برداشت کرتا تھا[۲] حکیم میر قطب الدین باطن کالے صاحب کے مرید تھے اُنہوں نے "گلشن بے خار" کے جواب میں "نغمہ عندلیب[۳]" تذکرہ لکھا تھا

کالے صاحب کی حویلی گلی قاسم جان میں تھی جو اب احاطہ کالے صاحب کے نام سے مشہور ہے کالے صاحب نے ۱۵ صفر ۱۲۶۲ھ کو وصال فرمایا مہرولی میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا[۴]

کالے صاحب کے پانچ بیٹے تھے:

(۱) غلام نظام الدین

(۲) غلام معین الدین

(۳) وجیہہ الدین

(۴) امین الدین

(۵) کمال الدین

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۸

[۲] کالے صاحب کے بہادر شاہ سے تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون "۱۸۵۷ء سے پہلے کی دلی" مطبوعہ برہان دہلی جولائی ص ۵ تا ۸ نیز ملاحظہ ہو "بہادر شاہ کا روز نامچہ" ص ۷۹-۸۶-۹۲ وغیرہ

[۳] مطبوعہ نول کشور ۱۸۵۶ء [۴] مناقب فریدی ص ۳۹

پہلے دو صاحبزادے ایک سیّدزادی سے تھے بقیہ ایک شہزادی سے [1]

کالے صاحب کے فرزند اکبر غلام نظام الدین سجادہ مشیخت پر بیٹھے اُن کے مُریدوں کی تعداد بھی کافی تھی غدر میں کالے صاحب کی املاک منضبط ہو گئیں۔ نظام الدین صاحب حیدر آباد چلے گئے [2] بعد کو جب حالات درست ہوئے تو دہلی واپس آ گئے ۱۲۹۲ھ میں وصال فرمایا اور والد کے پہلو میں دفن ہوئے [3]

سرسیّد کا بیان

سرسید حضرت کالے صاحب کے بیان میں فرماتے ہیں :—

آپ جناب حضرت مولانا قطب الدین صاحب کے فرزند ارجمند ہیں محامد آپ کے حیّز تحریر اور حیطۂ تقریر سے باہر ہیں۔ اخلاق اس وسعت سے ہے کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ مسکینی اس درجہ پر ہے کہ اُس کا اظہار نہیں کر سکتا اوقات آپ کی بہت خوب اور حرکات آپ کے نہایت محبوب۔ ہر دم ہر لحظہ وظیفہ سے خالی نہیں رہتے۔ بات کرنی بھی آپ کو مشکل ہوتی ہے۔ جب کوئی کچھ پوچھے اُس کا جواب لاچار دیا جاتا ہے اگرچہ اُس وقت ظاہر میں زبان شغل سے باز رہتی ہے۔ لیکن دل اُسی طرح مشغول حق رہتا ہے۔ اس زمانہ میں ایسا نامی گرامی شیخ نہیں ہے۔ حضور والا (۵) اور تمام سلاطین اور جمیع امراد عظام آپ کے نہایت معتقد ہیں۔ جس مجلس میں آپ تشریف لاتے ہیں ہر شخص بے اختیار دوڑتا ہے۔ اور قدموں پر گرتا ہے اور اپنی سعادت ابدی سمجھتا ہے۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ آپ پر شوق الہیٰ غالب ہوا

---

[1] مناقب المحبوبین ص ۵۰ - ۵۱

[2] غالب کا خط بنام انوار الدولہ سعد الدین خان شفق (اردوئے معلیٰ حصہ اول ص ۲۳۱)

[3] مناقب فریدی ص ۳۹ -

[4] تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۹

[5] مراد از سراج الدین ابو ظفر بادشاہ دہلی -

اور اپنے دادا صاحب کے فیض حاصل کرنے کو دل چاہا۔ اگرچہ وہ فیض سینہ بہ سینہ اپنے جناب والد مرحوم سے پایا تھا لیکن یہ شوق ایسا ہے اور یہ نعمت وہ ہے کہ طالب اس کا بس نہیں کرتا، چندا دیتے جاؤ اتنا ہی اور مانگتا ہے۔ آپ نے سفر اختیار کیا اور زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوتے اور پاک پٹن میں تشریف لے گئے اور شاہ سلیمان (۱) کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں کہ شاہ سلیمان صاحب اس بات کو نہایت غنیمت سمجھے اور ان کے قدم میمنت لزوم سے ہزار با فخر کیے۔ چند کروہ (۲) استقبال کو آتے اور باعزاز و اکرام لے گئے۔ چند مدت آپ نے وہاں تشریف رکھی۔ اور جو کچھ فیض اور برکات اپنے دادا صاحب کے تھے اُن کو پھر تجدید کیا۔ اور رخصت ہو کر شاہجہاں آباد میں تشریف لاتے کہ اب یہیں رونق افروز رہیں۔ سن شریف آپ کا پچاس سے متجاوز ہے صحبت آپ کی غنیمت ہے۔ اللہ تعالےٰ ایسے بزرگان حق پرست کو سلامت رکھے۔ (۳)

---

(۱) حضرت خواجہ محمد سلیمان فخری نظامی مرید و خلیفہ حضرت مولانا فخرالدین قدس سرہ جنہوں نے تونسہ شریف میں قیام فرمایا اور ہدایت خلق اللہ مشغول ہوئے بہ مقام تونسہ شریف بتاریخ ۶ صفر ۱۲۶۷ھ میں بہ عمر یک صد سال سفر آخرت اختیار کیا (دیکھو تذکرۃ الفقرا ص ۱۳۱) لیکن برکات اولیا (ص ۱۹۹) میں سن وفات ۱۲۶۷ھ مرقوم ہے اور یہی سن صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ایک کوس یا دو میل کی مسافت۔

(۳) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) ص ۳۶

باب ۱۴

عہد بہادر شاہ کے علماء

اگرچہ بہادر شاہ کا عہد ہر اعتبار سے زوال پذیر تھا لیکن درس و تدریس، علم و فن، اور ذہانت و ذکاوت کے لحاظ سے اتنا ہی شاندار تھا، اس دور میں، مکتب و مدرسہ کی جو رونق نظر آرہی ہے وہ پھر کبھی نظر نہیں آتی، اس دور میں جتنے وسیع النظر، ہمہ داں اور سراپا تحقیق و تدقیق علما نظر آئیں گے، چشم فلک نے، اس کی مثال پھر کبھی نہیں دیکھی؛ فقہ و اصول کی مسند پر فقہا نظر آئیں گے، جن کی موشگافیاں اور دقیقہ سنجیاں، اپنا جواب نہیں رکھتیں، قرآن و تفسیر کی مسند پر وہ مفسر اور شارح نظر آئیں گے، جن کی دقت نظر، تحقیق، اور معنی آفرینی دفاتر کی زینت ہے، حدیث و روایت کی مسند پر جو محدث اور اصحاب خبر نظر آئیں گے، انہوں نے قول رسول ؐ کی تحقیق و تفتیش میں اپنی عمریں صرف کردیں، یہ علم و فضل میں یکتا تھے، وسعت نظر اور ہمہ دانی میں لاجواب تھے، امور و مسائل کی تفصیل و تشریح میں یگانہ تھے،

اس سلسلہ کا آغاز تبرکاً ہم حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ سے کرتے ہیں اگرچہ ان کا زمانہ کچھ مختلف ہے۔

---

(۱)

شاہ عبد العزیز دہلوی

شاہ عبد العزیز بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم عمری دہلوی خطہ ہند میں اُستاذ الاساتذہ اور امام بقیۃ السلف
حجۃ الخلف خاتم المفسرین والمحدثین تھے ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے آپ کا نام تاریخی غلام حلیم ہے علوم اپنے والد ماجد اور
ان کے خلفاء سے اخذ کیے اور اپنے وقت میں مرجع علماء و مشائخ ہوئے تمام علوم متداولہ اور فنون عقلیہ و
نقلیہ میں دستگاہ فوق البیان رکھتے تھے اور کثرت حفظ و علم تعبیر رؤیا و سلیقہ وعظ و انشاء و تحقیقات نفائس
علوم اور مذاکرہ و مباحثہ خصوم میں ممتاز تھے تمام عمر تدریس و افتاء و فصل خصومات و وعظ و تربیت مریداں اور تکمیل
تلمیذاں میں بسر کی اور جاہ و عزت ظاہری کو کمالات باطنی کے ساتھ جمع کیا ہندوستان میں ریاست علم و عمل کی
آپ اور آپ کے بھائیوں پر منتہی ہوئی ہندوستان کیا بلکہ دیگر ولایت میں ایسا کوئی فاضل کم ہوگا جس نے تلمذ یا
استفادہ باطنی کی نسبت اس خاندان کے ساتھ درست نہ کی ہوگی اور اس خاندان کی شاگردی کو فخر نہ سمجھا ہوگا۔
ہندوستان میں علوم حدیث و فقہ حنفی کی خدمت جیسی کہ اس خاندان سے ظہور میں آئی ایسی کسی اور خاندان سے
کم وقوع میں آئی ہے آپ کی تصنیفات سے تفسیر فتح العزیز سوا تین پارہ قرآن شریف دو جلد کلاں تحفہ اثنا عشریہ
رد مذہب شیعہ بستان المحدثین سر الشہادتین عجالہ نافعہ اور فتاویٰ کثیرہ یادگار اور مشہور ہیں۔ نواسی سال کی عمر میں ۱۲۳۹ھ
وفات پائی اور دہلی کے ترکمان دروازہ کے باہر اپنے پدر بزرگوار کے پہلو میں مدفون ہوئے علماء شعراء نے
آپ کی وفات میں بہت سی تاریخیں تصنیف کیں جن میں سے ایک شیخ پیشوا سے بھی ہے[۱] ۱۲۳۹ھ

خاندان کے خدمات جلیلہ

آخری آرام گاہ دہلی میں ہے پہلوئے پدر بزرگوارش آرام فرمایا ان کا خاندان
علوم حدیث و فقہ حنفی کا سب سے خدمت اس علم شریف جیسی اس اہل بیت

---

(۱) حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۰

سے وجود میں آئی ویسی اس ملک میں کسی اور خاندان سے معلوم و معہود نہیں ہے تخم عمل بالحدیث کا در حقیقت ان کے والد نے اس سرزمین میں بویا اور انہوں نے اس کو برگ و بار بخشا ورنہ بلاد ہند میں سوائے فقہ حنفی کے کوئی بھی علم حدیث شریف کا اور اس کے ساتھ علم و عمل میں تمسک کرنا نہیں جانتا تھا (۱)

" کاتب حروف عفا اللہ عنہ وقت ورود دہلی شریف مزارات بابرکات ان حضرات کی زیارت سے مشرف ہوا ہے اس خاندان عالیشان کا قبرستان دہلی دروازے کے باہر مہندیوں میں واقع ہے ایک چبوترہ مسطح پر ہے ان کے پائیں حضرت شاہ عبدالقادر رضی اللہ عنہ صاحب موضح قرآن کا مزار شریف ہے آپ کی وفات ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ کو ہوئی ہے اور حضرت شاہ عبدالرحیم کے برابر شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا مزار ہے اور اُس کے برابر حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی قبر شریف ہے رضی اللہ عنہم (۲)

---

(۱) اتحاف النبلا

(۲) الروض الممطور فی تراجم علماء شرح الصدر صفحہ ۱۹۰

(۲)

شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

عالم عامل فقیہ فاضل۔ زاہد عابد خصوصاً حدیث و تفسیر میں یگانہ روزگار صاحب ورع و اتقا و صادق تھے علوم اپنے بھائی شاہ عبدالعزیز سے حاصل کیے تمام عمر تدریس علوم میں رہ کر خاص و عوام کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا اور اپنے والد ماجد کی تفسیر فتح الرحمان جو فارسی میں ہے نہایت فصاحت و بلاغت سے اردو میں موضح القرآن نام سے ترجمہ کیا جو مطبوع انام ہوا۔ وفات آپ کی ۱۲۴۲ھ میں ہوئی اور منظور الٰہی تاریخ وفات ہے۔ (۱)

مولوی عبدالقادر دہلوی (۳)

شاہ صاحب کا قلعہ سے تعلق

"مولوی عبدالقادر صاحب کے حالات بہت دلچسپ ہیں یہ بادشاہ کی بہو مرزا فخرالملک ولی عہد کی بیوی محمدی بیگم کے استاد تھے اور مسجد اورنگ آبادی کے امام بھی تھے قلعہ بادشاہی میں باریاب تھے مولوی ذی علم اور صاحب اقبال تھے۔ حاجی حافظ اور حکیم تھے گو باقاعدہ مطب نہیں کرتے تھے لیکن فن طب میں عبور کامل تھا اور خاص خاص معرکۃ الآرا علاج کیا کرتے تھے تعویذ گنڈے بھی کیا کرتے تھے مگر بطور ذریعہ معاش نہیں نہ بالعموم بلکہ بطور خاص اپنی جان پہچان میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض عملیات مولوی صاحب کے اب تک مشہور ہیں ہمیشہ عاشورے کو وعظ بھی کیا کرتے تھے محمدی بیگم صاحبہ کی زندگی تک ان کو خاندان شاہی سے پنشن ملتی رہی گورنمنٹ انگریزی سے بر معاوضہ مسجد اورنگ آبادی ان کو معقول معاوضہ بطور انعام مل چکا تھا ایام غدر میں لیسن کی میم کو پناہ دی تھی جس کے صلے میں اعلیٰ درجے کے خیر خواہ گورنمنٹ خیال کیے جاتے تھے اور سرکاری دربار میں حاضر باش رہتے تھے دہلی کے اعلیٰ رؤسا میں آپ کا شمار کیا جاتا تھا آدمی بڑے ذی وجاہت تھے تمام شہر ان کو مانتا تھا

(۱) حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱

آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے تاہم سارا کاروبار ودبار شادی بیاہ کا بھی انتظام کرتے تھے کیونکہ ان کو اس کام میں خاص قسم کا سلیقہ تھا۔ ۳۰ برس ہوتے کہ انتقال ہو گیا مرتے وقت زبان پر کلمہ جاری تھا مولوی صاحب رمضان شریف میں بالالتزام تراویح سنایا کرتے تھے قرآن مجید خوب یاد تھا اور خوش الحان بھی تھے ان کے حقیقی چھوٹے بھائی حافظ عبدالرب صاحب نے وعظ گوئی میں بڑا ملکہ حاصل کیا تھا تمام ہندوستان میں ان کے وعظ کی بڑی دھوم تھی انہوں نے سہارنپور میں جامع مسجد دہلی کے نمونے پر شاندار مسجد چندے سے بنوائی ہے یہ صاحب بھی ۱۵ - ۱۶ برس ہوتے رخصت ہوئے دونوں بھائی حضرت باقی باللہ رحمۃ اللہ کی درگاہ میں مدفون ہیں۔ مولوی عبدالقادر صاحب کی آل و اولاد کا بڑا کنبہ ہے خان بہادر عبدالماجد صاحب انہیں کے صاحبزادے ہیں جو ڈپٹی کلکٹری کے عہدے سے پنشن لے کر اب دہلی کے آنریری مجسٹریٹ ہیں ان کے بڑے بھائی مولوی عبدالواحد صاحب کے بڑے لڑکے حیدرآباد میں مدرسہ کا مہتمم بندوبست تھے انہوں نے وہیں انتقال کیا مولوی عبدالقادر صاحب کی تین لڑکیاں تھیں ایک مولانا کی حرم محترم جنہوں نے ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا دو لڑکیاں اب بھی زندہ ہیں منجھلی صاحبزادی مولوی احمد حسین صاحب تحصیلدار پنشنر کی زوجہ ہیں اور چھوٹی صاحبزادی حاجی حافظ اور قاری بھی ہیں وہ جوانی میں بیوہ ہو گئیں لاولد ہیں اس لیے انہوں نے آخرت کا رستہ درست کیا گھر میں لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھاتی ہیں جمعہ کے جمعہ وعظ کہتی ہیں رمضان شریف میں محراب بھی سناتی ہیں مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کی حالت اس کے خلاف تھی ان کے ایک لڑکی تھی وہ شادی ہوتے ہی جوان مر گئی پھر ایک جوان لڑکا ہوا محمد ادریس وہ باپ کے قدم بر قدم تھا اور شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کا نواسہ داماد تھا مگر وہ بیچارہ جوان ہیضہ میں چٹ پٹ ہو گیا مولوی صاحب کی ایک بیوی حکیم شرف الدین خان صاحب کی بہن زندہ تھیں وہ بھی سال گذشتہ میں گذر گئیں اور اس طرح مولوی عبدالرب صاحب کے خاندان کا متنفس باقی نہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۱۲ - (۱)

غدر کے زمانہ میں شاہ صاحب بھی مخبروں کی سازش سے پھانسی کے میدان میں پہونچا دیے گئے۔

---

(۱) حیات النذیر (افتخار عالم مارہروی)

حالانکہ انگریزوں کی جان بچا چکے تھے، یہ داستان بڑی دلچسپ ہے :-

جب ان مولویوں کی باری آئی معلوم نہیں اُس کے دل میں کیا آیا اس نے کہا کہ یہ بیچارے بےگناہ لوگ ہیں اگر کہیں ان کے منہ سے نکل جاتا کہ یہ مولوی ہیں تو پھر یہ سب پھانسی پاتے لیکن زندگی باقی تھی بچ گئے طرفہ یہ کہ لیس کی میم نے ایک چٹھی مولویوں کو لکھ دی تھی اور لکھ دیا تھا کہ جب تم کو کام پڑے یہ دکھا دینا اور وہ چٹھی مولانا کی پگڑی میں تھی مگر اس کے دکھانے میں پس و پیش کیا انگریزی تو ان میں سے کوئی پڑھا نہ تھا گمان ہوا خدا جانے اس نے کیا لکھ دیا ہو کہیں ایسا نہ ہو کچھ شکایت لکھی ہو تو الٹے لینے کے دینے پڑ جائیں اس ڈر سے پیش نہ کی گئی اگر وہ چٹھی دکھلا دی جاتی تو اتنی زحمت نہ ہوتی اور صاف رہائی ہو جاتی اتفاق سے جس مکان میں یہ لوگ قید تھے اس کے کوٹھے پر مسٹر لوئس میگزین میں کوئی خدمت رکھتے تھے ٹھہرے ہوئے تھے مسٹر لوئس نے غدر سے پہلے ٹیلر صاحب پرنسپل کالج کی سفارش سے کچھ اردو پڑھی تھی غرض تعارف اچھا تھا زینے سے اترے تو انہوں نے مولوی کو پہچانا اور حالات معلوم کر کے ان سب کی حالت پر بہت افسوس کیا ہواخوری کو تو نہ گئے اور ان سب کو کوٹھے پر لے گئے وہاں چائے پلائی اور کمانڈنگ افسر کو لکھ کر راہ داری کا پروانہ دلوا دیا۔

اب یہ لوگ عورتوں کے جستجو میں پریشان پڑے پھرتے تھے بڑے تجسس کے بعد پتہ لگا کہ مولوی حفیظ اللہ خان صاحب واعظ جو مولوی شریف حسن صاحب کے خسر ہوتے تھے عورتوں کو برآمدے میں لے گئے یہاں ان کے کچھ مرید رہتے تھے غرض رہا شدہ مولوی بھی وہیں پہنچے اور وہاں مبتلائے تپ و لرزہ ہو گئے ان میں صرف مولوی عبدالقادر صاحب بچے ہوتے تھے آخر انہوں نے یہ مشورہ کیا کہ سرکاری فیل خانے میں کسی فیل بان کے پاس ٹھہریں اس شخص کا پتہ ان کو رہنے والوں سے ملا ہوگا کہ فلاں فیل بان یہاں کا بڑا زمیندار ہے اور مولویوں کا معتقد بھی ہے اس شخص نے مولوی عبدالقادر صاحب کی مردانہ بڑی مدد کی سرکاری ہاتھی ہدم مکانات کے لیے شہر میں بھیجے جاتے تھے مولوی عبدالقادر صاحب نے عورتوں کے زیورات ایک پٹاری میں بھر کر پنجابی کٹرے کی مسجد کے ایک حجرے میں زیر دفن کر دیئے تاکہ لوٹنے والوں کو سراغ نہ ملے اس زیور کے نکالنے کے لیے مولوی عبدالقادر صاحب فیل بانوں میں مل کر شہر میں آتے کھود کر

پٹاری نکالی اور نیل بالوں کے ساتھ شہر کے باہر ہو گئے مولوی لوگ اکثر بھولے بھی ہوتے ہیں اکثر اہل الجنۃ بلہٗ[1] نیل بالوں کی ارادۃ منڈی دیکھ کر مولوی عبدالقادر صاحب سب کے سامنے پٹاری کھول کر بیٹھ گئے انہوں نے دیکھا پٹاری میں بھرا سونا چاندی رات کو زیور نکال پٹاری میں پتھر بھر دیئے مولوی صاحب بند کے بند لے کر آئے اُس وقت ہمارے مولانا مسجد کے ایک حجرے میں بیمار پڑے تھے بچوں کو غل مچاتے سنا کہ مولوی صاحب زیورات کی پٹاری نکال لاتے ہیں تھوڑی دیر میں سنا مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبتے جا رہے ہیں اس لیے کہ اُن کو پروالے پہنچ کر معلوم ہوا کہ پٹاری میں پتھر بھرے پڑے ہیں غرض خود مولوی صاحب اور جن عورتوں کا زیور تھا رو دھو کر بیٹھ رہے اس پٹاری میں زیادہ مالیت ہمارے مولانا کی تھی مولانا کی بی بی کا کل زیور تھا مولانا کا چاندی کا حقہ چاندی کا سرپوش چاندی کی چلم چاندی کا تملان وغیرہ اس قسم کی چیزیں تھیں مولوی عبدالقادر صاحب ڈوبتے تو کیا اور اُن کو ڈوبنے بھی کون دیتا وہ بھی بیچارے رو دھو کر چپ ہو رہے۔ (۲)

۱۔ بھولے بھالے جنتی ہوں گے۔

۲۔ حیات النذیر (افتخار عالم مارہروی)

(۳)

مولانا فضل امام خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی، علم و فضل، اور فنون عالیہ میں اپنی مثال آپ تھے، اس خاندان نے، جو گراں مایہ خدمات علمی انجام دیے ہیں وہ تاریخ کا ایسا روشن باب ہیں، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید فرماتے ہیں:-

"مجال نہیں کہ آپ کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کی تقریر ہو سکے۔ اگر ہزار برس مشق سخن کیجے اور اسی ذکر میں زبان سخن سنجی سے معاف نہ رکھے لیکن ہے کہ ہزار سے ایک نہ ادا ہو سکے۔ علوم عقلیہ و فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان فالی سے افتخار، اگر ان کا ذہن۔ رسا دلائل تعلیمیہ بیان نہ کرتا۔ فلسفہ کو معقول نہ کہتے، اور اگر ان کا فکر صائب براہین ساطعہ قائم نہ کرتا، اشکل ہندسی تار عنکبوت سے سست تر نظر آتی۔ اس طرح میں ترویج علم حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی گویا اس دودہ والا تبار سے اس علم نے یک جہتی بہم پہنچائی ہے۔ باوجود ان کمالات کے خلق اور حلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ ہمیشہ سرکار حکام وقت میں مناصب بلند سے سرفراز اور ابناے عہد سے ممتاز رہے۔ پایۂ ہمت آپ کا بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند۔ بسبب کثرت ایثار کے تنگی دست خلائق دیکھ نہ سکتے تھے اور بسبب خلق وسیع کے ہر عاجز و زبوں کو عرض نیاز سے ممتنع نہ کرتے۔ اگرچہ وطن اصلی آپ کا خیرآباد ہے لیکن چند در چند اسباب سے حضرت نے شاہجہان آباد میں اس طرح سے توطن اختیار کیا کہ گویا یہیں کے رؤسا میں سے محسوب ہونے لگے۔ ایک مدت مدید ہوئی کہ ترک روزگار کرکے خود وطن مالوف کی طرف تشریف لے گئے اگرچہ سب اہل و عیال کی یہاں بدستور بود و باش رہی اور جب سے گئے پھر معاودت نہ فرمائی۔ عرصہ انیس بیس برس کا ہوتا ہے کہ عالم فانی سے ملک باقی کی طرف سفر ناگزیر اختیار کیا اور یہ واقعہ جانکاہ پانچویں ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ میں سانح ہوا۔" (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صفحہ ۸۶

ان کے کچھ حالات تذکرۂ علمائے ہند (ص ۱۶۲) میں درج ہیں۔ مرزا غالب نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا ہے جو حسب ذیل ہے :-

اے دریغا قبلۂ ارباب فضل — کرد سوئے جنت الماویٰ خرام

چوں ارادت از پئے کسب شرف — جست سال فوت آں عالی مقام

چہرۂ ہستی خراشیدم نخست — تا بناء تخرجہ گردد تمام

گفتم اندر "سایہ لطف نبیؐ" — باد آرامش گہ "فضل امام"

۱۲۴۴ = ۰ - ۱۲۴۹ = ۹۹۲

(کلیات غالب قطعہ ۵۱ ص ۴۳ - ۴۲ - ۱۹۲۰ء) -

---

(۴) مولانا شاہ اسماعیلؒ (۱)

علم برکش اے آفتاب بلند | خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
نبال اے دل رعد چوں کوس شاہ | بخند اے لب برق چوں صبح گاہ
بیار اے ہوا قطرۂ ناب را | بگیر اے صدف در کن ایں آب را
بر آ اے در از قعر دریائے خویش | تاج سر شاہ کن جائے خویش (۲)

آپ کو حضرات ثلاثہ یعنی مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر غفر اللہ لہم کے ساتھ نسبت برادر زادگی کی تھی اور بسبب اس کے کہ جناب جنت مآب مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے بعد انتقال والد ماجد ان کے، بجائے فرزندوں کے پرورش کیا تھا اور حضرت مبرور مغفور کی نواسی بھی ان کے ساتھ منسوب تھیں، ان کی تربیت اپنے ذمہ پر لے کر روز شب حضرت کی تکمیل میں ساعی تھے ازبسکہ جوہر قابل محتاج تربیت اور نیاز مند تعلیم نہیں ہوتا، آپ کے آئینہ خاطر نے معقلہ تائید الٰہی سے ایسی صفا اور جلا حاصل کی تھی کہ اسرار ازل نے حجاب آپ پر منکشف تھے۔ اسی واسطے اوائل حال میں مطالعہ کتب کی طرف چنداں التفات نہ فرماتے تھے، اور حال یہ تھا کہ حضرت مبرور کی خدمت میں زانوئے سبق خوانی تہ کر کر بیٹھتے ازبسکہ بسبب استغنا کے یہ محفوظ نہ رہتا تھا کہ سبق کس جائے سے شروع ہوگا کبھی اس کے مابعد کی عبادت سے شروع کر دیتے۔ جب حضرت مغفور وہاں سے

---

(۱) حالات کے لیے دیکھو اتحاف النبلاء ص ۴۱۶، ابجد العلوم ص ۹۱۶ تذکرۂ علمائے ہند ص ۷۹، الحیاۃ بعد المماۃ، ص ۱۰۴ تا ۱۱۵ —

(۲) اشعار نظامی در سکندر نامہ —

امتناع فرماتے تو آپ فرماتے کہ اس مطلب کو آسان سمجھ کر نہیں پڑھا اور فی الواقع اگرچہ مطلب عقدۂ لاینحل ہوتا۔ اس طرح اس کی تقریر کرتے کہ موجب حیرت اعالی و ادانی ہوتا اور کبھی اس کے ماقبل سے آغاز کرتے جب حضرت اس سے متنبہ فرماتے تو آپ اس میں کچھ شبہ کر دیتے، اور وہ شبہ ایسا کہ حضرت استاد کو اس کے دفع میں بہت متوجہ ہونے کی حاجت ہوتی۔ اس استعداد خدا داد کی اعانت سے پندرہ سولہ برس کی عمر میں تحصیل معقول و منقول سے فراغت حاصل ہو گئی۔ جو کہ آپ کی ذہانت کی دھوم تمام شہر میں تھی وہ فضلائے کمال کہ دعوے کتاب دانی و دقیقہ شناسی کا رکھتے تھے، وہ مقامات باریک کہ جن کے صاف کرنے میں روزگار دراز فکر کرنا چاہئے، آپ سے سر راہ ملاقی ہو کر باعتبار ظاہر کیے بطور مناظرہ کے استفسار کرتے، اس لحاظ سے اگر ان کے مکان پر جاویں گے تو شاید مطالعہ کتاب یا اعانت شروح اور حواشی سے اس کو بیان کریں۔ اور آپ بے تامل اس کو اس طرح سے تقریر فرماتے کہ ان کو اس جرأت سے کمال خجالت حاصل ہوتی۔ ذکر اس زبدۂ ارباب کمال کا داعی ہے کہ ہزار ہزار محامد پسندیدہ کو زبان پر لا کر اس کے آتش شوق کو تسکین دے۔ بیت

گہر نثار کند بر سر زباں چشمم
اگرچہ نام شریف تو بر زباں آید

لیکن کیا کرے کہ نہ زبان کو طاقت تقریر ہے اور نہ قلم کو یارائے تحریر معقولات میں آپ کا نتیجۂ وہم مثل یقینیات اور منقولات میں آپ کی تنہا نقل مانند متواترات۔ فقہ کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلہ کو آیات و حدیث کے ساتھ مستند فرماتے تھے۔ بیشتر کتب علم معقول پر حواشی تحریر کیے اور از بسکہ طبیعت وقاد حدیث و آثار کی طرف مائل تھی، ایک رسالہ منطق میں لکھا اور اس میں شکل اول کے بعد الطبائع اور شکل رابع کی ابدۂ البدیہات ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے دلائل اس قوت و استحکام کے ساتھ مذکور فرمائے کہ اگر معلم اول موجود ہوتا اپنی براہین کو تار عنکبوت سے سست تر سمجھتا۔ اور ایک رسالہ اثبات رفع یدین میں مسمیٰ "بقرۃ العینین فی اثبات رفع الیدین" تالیف کیا اور حدیثیں اشہر اور نہایت قوی سے اس کا استدلال کیا ہے اور دلائل فقہائے سالو سچھ اس کے مقابل میں ہیں، اپنے سوالات سے اس طرح پر اٹھایا ہے

کہ مصنّف غیر متعصب کو سوا تسلیم کے اور چارہ نظر نہیں آتا۔ اور رسائل کثیرہ فنون شتّیٰ میں آپ سے یادگار ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کے حال ہدایت اشتمال میں سے قدرے بدیۂ ارباب کمال کیا جاوے تاکہ خلق پر ایسے فردِ کامل کا نمونہ قدرت رب ذوالجلال سمجھا جاوے۔ اوائل حال میں از لبکہ کسب فیض باطن کا بہت اچھا تھا، جناب غفران مآب زبدۂ اولاد حضرت خیر الانام کی جدامجد علیہ السلام میر سید احمد قدس سرہ العزیز کی خدمت میں اعتقاد بہم پہنچایا اور ان سے فیض باطن کو کسب کیا بعد پیر کی رفاقت میں سفر حجاز اختیار کرکے مناسک حج کو ادا کیا اور وہاں سے ہندوستان کو مراجعت کرکے حضرت کی خدمت میں اطراف و جوانب میں بسر کی اور ہدایت و ارشاد سے عباداللہ کو راہ راست دکھائی۔ اس اثنا کے احوال تو اس قدر ہیں کہ زبان قلم اس کے تصوّر سے شق ہوتی ہے، مگر اواخر ایام بادشاہ سیّد الطائفہ پر طریقت کے احوال مزم شاہجہان آباد کی طرف ملتفت ہو کر راہ رشد و ہدایت کو وا کیا اور وعظ و نصائح سے اہل غفلت کے کان کھول دیے جو جو مسائل کہ ان پر مواظبت کرنی ضروریات دین سے تھی اور بسبب سستی اور کاہلی کوئی علمائے وقت کے عوام روزگار کیا بل خواص کے گوش وہم تک بھی نہ پہنچے تھے۔ آپ کی سعی و جد و جہد سے سب پر کھل گئے۔ اور آوازہ اعلام سنت اور ہدم بنیان شرک و بدعت کا وضیع و شریف کے کان تک پہنچ گیا۔ باوجود یکہ ارباب مشیخت اور صاحبان تخنیص کہ سلسلۂ اعتقاد و سررشتۂ ارادت خاص و عام کا ان کے ہاتھ مستحکم تھا اور کسی کو ان کی مداہنت کا گمان نہ ہوتا تھا۔ اس گمان سے کہ اگر مسائل حقہ گوش مردم روزگار تک پہنچے تو ہمارے حق میں موجب ضعف اعتقاد کا ہو جائے گا۔ علم منازعت اور اعلانہ مخالفت بلند کرکے درپے اذیت و اہانت ہوئے۔ لیکن چونکہ مؤیّد بتائید اللہ تھے، اس ہدایت و ارشاد سے باز نہ آئے اور خلق کو یہاں تک توفیق اختیار سنت نبوی اور ترک بدعات و احداث کے ہوئے کہ ایک اور ہی طرح کا نور ہر ایک کی پیشانی اعمال سے چمکنے لگا، لہذا ان مفسدان مضل کا بازار کاسد ہو گیا اور لوگوں نے جان لیا کہ یہ بزرگ طلیح اخذو جزکے امور حق کو آج تک چھپاتے رہے۔ لہذا پیشتر خود دیکھا گیا کہ وتمیع و شریعت کی توفیق نمازکی ایسی ہوئی کہ مسجد جامع میں نماز جمعہ کے واسطے ایسی کثرت ہونے لگی کہ، جیسے عیدگاہ میں

نماز عیدین کے واسطے ہوا کرتی ہے۔ اور تائید الٰہی اور اُن کی صدق نیت اور خلوص طریت کی برکت سے الی الآن
یہی حال چلا جاتا اور یہ ثواب انھیں حضرت کے جریدۂ اعمال میں لکھا گیا اور آج تک اس کا اجر اُن کی روح
پُرفتوح کو پہنچتا جاتا ہے۔ الحمد للہ ذلک فالحمد اللہ علی ذلک۔ آپ کی عادت یوں تھی کہ روز جمعہ اور روز سہ
شنبہ کو مسجد جامع میں مجلس وعظ کو مرتب فرماتے تھے، طرفہ تر یہ ہے کہ سامعین کو کہ ہزارہا سے متجاوز
ہوتے تھے، اس چار دن کے عرصہ میں بسبب اغوائے مغویان ضلالت نہاد کے یا بسبب انحراف نفس
امارہ کے اگر شبہ پیدا ہوتے اور ارادہ کرتے کہ اپنے وعظ میں آپ کی حسن تقریر سے اس کو دفع کریں گے،
جب درس کی مجلس میں آن کر حاضر ہوتے تو حضرت ابتداء وعظ میں کلمات چند بطریق تمہید کے ارشاد کرتے
اور ان کی تقریر کی جامعیت وہ چیزیں مذکور ہوتیں کہ ہر شخص اپنے شبہ کا جواب پالیتا اور کچھ خدشہ
باقی نہ رہتا، یہاں تک کہ بعد اختتام درس کے کسی کو یہ خلجان نہ رہتا کہ ان شبہات کو پھر اپنی زبان سے
بیان کرے دلیل کرے اور عمدہ مقاصد تردید شرک و بدعت اور احیائے سنت تھا کہ آپ کی حسن تقریر
سے وہ مسائل غامضہ کہ طالب علم کو بعد تدقیح کے ذہن نشین ہوں، جہلائے عامی کو بمجرد استماع
کے سمجھ میں آجاتے تھے اور اس طرح منقوش خاطر ہوتے تھے۔ کہ مخالفین سے بعضے اہل علم چاہتے کہ کچھ
دلائل علمی سے اس کو رد کرکے اس کے ذہن سے نکالیں ممکن نہ ہوتا۔ جب یہ مطالب خوب چھن گئے،
بموجب ارشاد سید الاصفیا یعنی پیر طریق ہدا کے اس طرح سے تقریر وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل
اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کی صیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفّا اور مجلّا ہو گیا
اور اس طرح سے راہ حق میں سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا کہ سر اس کا راہ خدا میں فدا ہو
اور جان اس کی اعلائے لوائے دین محمدی میں صرف ہو۔ بعد مدت کے پیر دستگیر نے طلب کیا اور
معتقدین کو تشنہ چھوڑ کر ان کی خدمت میں راہی ہوئے اور بالاتفاق حضرت ممدوح کے جہاد پر کمر باندھی
اور کوہستان میں لے جا کر اطراف ہندوستان میں خطوط طلب بھیجے۔ اس نواح سے جوق در جوق روانہ ہوئے
اور حضرت کی خدمت میں سوائے مردم کوہستان ہندوستانیوں میں سے لاکھ آدمی سے زیادہ مجتمع ہو گئے
اور کارہائے نمایاں راہ خدا میں ظہور میں آئے۔ تائید الٰہی سے ان حضرت کا رُعب کفار کے دل میں ایسا

متعین ہوا کہ جس جگہ گروہ قلیل غزات مسلمین سے متوجہ ہوتا اور اس کا سرگروہ یہ حضرت ہوتے، لشکر کفار اگرچہ مور و ملخ سے زیادہ ہوتا، بے سروپا فراری ہوتا۔ اور وہاں کے معاملات کی تفصیل حضرت بابرکت ذبدہ لولہ سید المرسلین کے احوال کے ضمن میں ہو چکی ہے۔ چونکہ مشیت الٰہی میں سلسلہ اس کام کا یہیں تک تھا اتفاق تقدیر سے لشکر کفار کو غلبہ ہوا اور یہ حضرت قلعہ بالاکوٹ کے نواح میں ہمراہ پیر طریقت اور اکثر مسلمین غزاۃ کے جنت اعلیٰ کی طرف راہی ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس واقعہ کو چودہ پندرہ برس گذرتے ہیں اور چونکہ یہ طریقہ غزوات میں بنیاد ڈالا ہوا ان حضرات کا ہے، اب تک اس سنت کی پیروی عبداللہ نے ہاتھ سے نہیں دی اور ہر سال مجاہدین اوطان مختلفہ سے بہ نیت جہاد اسی نواح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں اور اس امر نیک کا ثواب آپ کی روح مطہر پر ہمیشہ پہنچتا رہتا ہے“[1]

مولانا شاہ اسمٰعیلؒ کی کیفیت شہادت

”منظورہ“ میں ہے کہ ان کی پیشانی میں گولی لگی تھی[1] عبدالرحمٰن (خواہر زادہ سید صاحب) نے شیخ ولی محمد اور امان اللہ خان لکھنوی کی زبانی سنا کہ مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگ گئی پھر آپ ننگے سر امان اللہ خان کو ملے۔ بندوق بھری ہوئی تھی اور بتی چڑھی ہوئی تھی۔ پوچھا امیر المومنین کہاں ہیں؟ امان اللہ خان نے اشارہ کیا مٹی کوٹ کی طرف ادھر سے بکثرت گولیاں آرہی تھیں لیکن یہ بکتے ہوئے چلے گئے بھائی میں تو وہیں جاتا ہوں پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس حربہ سے شہادت پائی[2] میاں حفیظ اللہ دیوبندی نے انہیں دھانوں کے کھیتوں میں مٹی کوٹ کے نالے کے قریب بندوق چلاتے دیکھا تھا[3] میاں امام الدین بودھانوی کا بیان ہے کہ جب غازی حضرت امیر المومنین کی تلاش میں تھے تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا رفل کندھے پر رکھے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں پیشانی سے خون جاری ہے[4] لعل محمد جگدیش پوری مٹی کوٹ کے دامن کے حالات بیان

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی سرسید

[1] منظورہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹۲ [2] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۰۹ [3] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۲۵ [4] وقائع جلد سوم ۲۲۸

کرتے ہوتے کہتے ہیں کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسماعیل رفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے پیشانی سے خون بہہ رہا تھا پوچھا امیر المومنین کہاں ہیں میں نے بیری دائیں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں یہ سن کر وہ اس طرف جھپٹے ہوتے چلے گئے[1] کریم اللہ خان میواتی کا بیان بھی یہی ہے کہ مولانا اس ہجوم کی طرف چلے گئے جہاں تلوار چل رہی تھی وقائع میں ہے کہ سر سے خون جاری تھا یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی یا کنپٹی پر۔ ہجوم میں جا کر داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے[2] [3]

---

[1] وقائع جلد سوم ص ۲۵۲-۲۵۳

[2] تواریخ عجیبہ میں ہے کہ گھوڑے سے جدا ہونے سے پہلے آپ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا ص ۱۴۰

[3] سید احمد شہید د غلام رسول مہر ا ص ۴۲۱

(۵)

مولانا نواب قطب الدین خاں

یہ ایک طرف، دولت دنیا سے مالا مال تھے، دوسری طرف دولت علم بھی بافراط تمام ان کے کاشانہ میں موجود تھی۔ دین کے خادم تھے، دنیا کے سرگروہ، !

سرسیّد ان کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں: —

تحصیل علم و فضل خصوصاً فقہ و حدیث خدمت بابرکت مولانا اسحاق صاحب مرحوم مغفور مبرور سے کی۔ اتباع شریعت میں سب پیش روان مسلک دین سے آپ کا قدم آگے بڑھا ہوا ہے، وضع و لباس میں اپنے استاد عالی نہاد سے ایسے مشابہ ہیں کہ جس نے ان کو نہ دیکھا ہو ان کو دیکھے۔ اخلاق و حلم علاوہ فضل و کمال علمی کے ایسا آپ کی ذات میں جمع ہے کہ لوروں میں بہت کم پایا گیا۔ ان دونوں فنون میں توغل کمال بہم پہنچایا۔ تقویٰ اور ورع کا تو حساب نہیں۔ آپ کے اجداد والا تبار عالی خاندان والا دودمان سے ہمیشہ پیش گاہ سلطنت سے مناصب جلیلہ رکھتے تھے۔ اب اس جزو زمان میں بھی آپ کو تقرب حضرت سلطانی سے وہ عزت و جاہ حاصل ہے جو چاہتے۔ چونکہ دل اپنے استاد کی پیروی اور خلق کی رہنمائی کے لیے مجلس وعظ منعقد فرماتے ہیں۔ اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔ کتب حدیث سے مشکوٰۃ کا ترجمہ زبان اردو میں بہت صاف و شستہ و فائدہ مند کیا ہے اور اکثر فوائد کتب متداولہ و غیر متداولہ سے اس پر بڑھائے جب اس کتاب کا چھاپہ ہوا باوجود مبسوطاً ہونے کے خلق نے ہاتھوں ہاتھ خرید لیا اور ہر روز رواج دین اور تقویت شرع مبین میں مصروف رہتے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔ اب جو شخص راہ خدا پر چلے گا ثواب اس کا انہیں کے جریدۂ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صفحہ ۸۳

بادشاہ کی طرف سے خلعت "۱۴ نومبر ۱۸۴۶ء نواب غلام محی الدین خان بہادر کی تقریب ماتم میں ان کے صاحبزادے فخر الاسلام نواب محمد قطب الدین خان بہادر کو خلعت شش پارچہ اور ان کے چھوٹے بھائی کو خلعت سہ پارچہ بادشاہ سلامت کی طرف سے عطا کیا گیا حلقے دین کے ساتھ عزت و افتخار سے پیش آنا آپ کا خاص دستور العمل ہے"(۱)

جامع معقول و منقول ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے اپنے زمانہ کے عالم اجل فاضل اکمل فقیہ۔ محدث مفسر جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول۔ قامع شرک و بدعت و معتقدات عابد متورع مروج فرقہ وغیر مقلدہ صاحب تصانیف کثیرہ تھے علوم شرعیہ خصوصاً حدیث و اصول حدیث شاہ اسحاق دہلوی سے حاصل کیے ان سے اور نیز علمائے حرمین شریفین سے حدیث کی سندیں لیں اور کئی دفعہ حج کیا راقم نے بھی دہلی میں ۱۲۷۶ھ میں آپ کی زیارت کی بلکہ آپ صورت و سیرت میں آیاتِ ربانی میں سے ایک آیت تھے۔ مگر افسوس آپ سے استفادہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ آپ اکثر تیسرے چوتھے سال حج کو جاتے۔ چنانچہ آپ کی وفات بھی ۱۲۸۹ھ کو مکہ معظمہ میں ہوئی اور مروج احکام شریعت آپ کی تاریخ وفات ہے آپ کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

(۱) مظاہر حق اردو ترجمہ و شرح مشکوٰۃ (۲) جامع التفاسیر دو جلد (۳) ظفر جلیل ترجمہ شرح حصن حصین (۴) مظہر جمیل (۵) مجموع الخیر (۶) جامع الحسنات (۷) خلاصہ جامع صغیر (۸) ہادی الناظرین (۹) تحفہ سلطان (۱۰) معدن الجواہر (۱۱) وظیفہ مسنونہ (۱۲) تحفۃ الزوجین (۱۳) احکام لفظی (۱۴) فلاح دارین (۱۵) تنویر الحق (۱۶) توقیر الحق (۱۷) تحفۃ العرب والعجم (۱۸) احکام العیدین (۱۹) رسالہ مناسک (۲۰) خلاصۃ النصائح (۲۱) گلزار جنت (۲۲) شمس النساء (۲۳) حقیقۃ الایمان (۲۴) مراد المعاد (۲۵) تذکرۃ الصوم (۲۶) تذکرۃ الابرار وغیرہ ذلک (۲)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۸۹

(۲) حدائق الحنفیہ ص ۴۸۸

مولانا قطب الدین کا طرز انشا

ان کے والد کا نام محمد محی الدین اسحاری ہے دہلی کے بہت بڑے عالم و محدث تھے امارت و ثروت بھی رکھتے تھے۔

مولانا حاجی محمد اسحاق دہلوی (مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے) کے شاگرد رشید تھے ۱۸۷۲ء / ۱۲۸۹ھ میں انتقال کیا ان کی تصانیف میں سے ۲ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) ظفر جلیل اردو ترجمہ حصن حصین (مصنفہ قاضی القضاۃ شمس الدین محمد دمشقی متوفی ۱۴۳۰ء / ۸۳۳ھ) مولانا قطب الدین نے تاریخی نام رکھا ہے اس سے سال تالیف ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) نکلتا ہے اس کا نمونہ یہ ہے۔

"حمد بے شمار ہے اس پاک پروردگار کے لیے کہ ہم کو توفیق دی اپنے ذکر کی اور راہ بتائی اپنے نیکی کی یا الٰہی درود و سلام بے حد نازل کر خاتم النبیین اللذین رسول اپنے پر اور ان کے اصحاب ابرار اور آل اطہار پر اور سب پر۔"

(۲) مظاہر حق اردو ترجمہ و شرح "مشکوٰۃ المصابیح" اس ترجمہ کا نام بھی تاریخی ہے اس سے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) نکلتے ہیں۔ یہ مولانا قطب الدین کا نہایت عظیم الشان کارنامہ ہے یعنی چار جلدوں میں بہت بڑی تقطیع کے ۲ ہزار صفحوں سے زیادہ پر طبع ہوا ہے۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلی جامع و مکمل حدیث شریف ہے اس کا حال خود قطب الدین صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"بعد اس کے مسکین محمد قطب الدین شاہجہاں آبادی عرض کرتا ہے کہ کتاب مشکوٰۃ شریف علم حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیثیں اس میں مندرج ہیں۔ اس کا ترجمہ عدیم النظیر میرے استاد بزرگوار مولانا مخدومنا مکرم حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت شیخ عبدالعزیز۔ اللہ تعالیٰ کے نے بیچ زبان ہندی کے بیچ لمعہ مثل لکھا تھا لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا۔ مرضی جناب موصوف کی ایسی پائی کہ اگر یہ بطور شرح کے لکھا جائے بہتر ہے اس لیے اس ہیچمدان نے ترجمہ اس کا عبارت عربی سے علیحدہ کرکے لکھا اور فائدے مختصر مناسب مقام کے شروح مشکوٰۃ وغیرہ سے مثل مرقاۃ شرح ملا علی قاری اور ترجمہ حضرت شیخ عبدالحق

اور حاشیہ سید جمال الدین رحمہم اللہ کے اور سوائے ان کے سے زیادہ کرکے خدمت عالی میں عرض
کی اور بنا بے ممدوح نے بھی کچھ فائدے لکھے تھے تبرکاً اس میں درج کیے اور نام اس
کا مظاہر حق رکھا گیا کہ اس میں تاریخ اس کی نکلتی ہے۔

مولانا قطب الدین کے استاد بزرگوار کا ترجمہ اس سے بھی پہلے کا ہے لیکن اب نایاب ہے مولانا
نے مظاہر حق کے فائدوں میں ہر جگہ ان شروح و تراجم و حواشی کا حوالہ دے دیا ہے جن سے استفادہ کیا
ہے ان حوالہ جات میں کہیں کہیں لکھا ہے کہ "تحریر مولانا" معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبارت ان کے استاد
مولانا محمد اسحاق کی ہے لیکن ان میں اور مولانا کی تحریر میں طرز بیان کا کوئی فرق نہیں ہے لیکن فائدے
کہیں بالکل پرانی روشن بے قاعدہ کے ساتھ ہیں کہیں ترتیب الفاظ زیادہ صاف و باقاعدہ ہے ترجمہ و فائدہ
کا نمونہ عربی کی حدیث کو چھوڑ کر درج کیا جاتا ہے۔

اور روایت ہے کہ واثلہ بن اسقع سے کہا فرمایا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے جس
شخص نے کہ طلب کیا علم اور حاصل ہوا اس کو ہوگا واسطے اس کے دوہرا ثواب اور اگر نہ حاصل
ہوا تو ہوگا واسطے اس کے ایک حصہ ثواب سے روایت کی یہ دارمی نے ف دوہرا ثواب
ایک ثواب طلب کا اور مشقت کا تحصیل علم میں کھینچنے سے دوسرا ثواب حاصل ہونے علم کا
اور پڑھانے کا اوروں کو یا ثواب عمل کا علم پر کیا ہے اور دوسرے کو ایک ثواب مشقت ہی
کا ہوگا ہر تقدیر طلب علم میں رہنا چاہیے اگر حاصل ہوا نور علیٰ نور ورنہ طلب علم میں
مرنا بھی سعادت ہے بیت

گرچہ نتواں بدوست رہ بردن
شرط یاری ست در طلب مردن (۱)

---

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۲۰۷

(۶)

مولانا فضلِ حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی نے، غدر کے زمانہ میں بڑے گراں بہا خدمات انجام دیئے، اپنی زندگی اسی مقصد عظیم پر قربان کردی، ان کے حالات نسبتہً تفصیل سے، ایک دوسرے باب میں ملاحظہ ہوں، یہاں ہم نے صرف سلسلہ قائم رکھنے کے لیے، کہ اس مجلس علم میں بھی ان کی شرکت ضروری تھی، مختصر حالات بطور تعارف کے درج کر دیتے ہیں :۔

علامہ فضل حق خیرآبادی

"مولانا فضل حق خیرآبادی عمری ماتریدی چشتی در سال ۱۲ ہجری پیدائش یافتہ شاگرد پدر خود مولوی فضل امام است حدیث از مولانا عبدالقادر دہلوی (شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم) اخذ کردہ قرآن مجید در چہار ماہ یاد گرفتہ فراغ علمی بعمر ۱۳ سال حاصل نمودہ مرید شاہ دھومن دہلوی بود در علم منطق و حکمت و فلسفہ ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران استعفناً فوق البیان داشت لتلمش زائد بر چہار ہزار اشعار خواہد بود از بلاد بعیدہ طلبۂ علوم آمدہ از و مستفید مے شدند بسال ۱۲۶۴ ہجری مولف ہمراہ ان مقام لکھنؤ بخدمتش رسیدہ دید کہ در عین حقہ کشی و شطرنج بازی تمیذ را سبق افق المبین میلاً و مطالب الکتاب را بر متعلم باحسن بیانی دلنشین مے نمود تالیفات را لقد دارد انگریزاں بعد ابتر مانۂ فساد ہند قید کردہ بجزیرہ رنگون فرستادند آنجا بتاریخ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ وفات یافتہ (۱)"

---

(۱) تذکرہ علمائے ہند فارسی ص $\frac{164}{165}$

مولانا فضل حق کے دو واقعے

ایک روز ارشاد ہوا کہ جب ہم دوبارہ رام پور میں گئے۔ تو سرائے میں ٹھہرے اتفاقاً مولوی فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی نہایت محبت و عنایت سے پیش آئے۔ اور اپنے نوکر سے کہا کہ جاؤ آپ کا اسباب اٹھا لاؤ۔ میں نے کہا کہ حضرت برائے خدا مجھے وہیں رہنے دیجئے کہ بہت آرام سے ہوں۔ کہا اچھا جہاں آپ خوش رہیں۔ لیکن بھٹیاری کو کہلا بھیجا کہ ان کے خرچ کا حساب ہمارے ذمہ ہے۔ اگر پانچ روپیہ روز بھی اٹھیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہم دیں گے لیکن یہ شرط ہے کہ میاں صاحب بلا ہماری اجازت کہیں چلے نہ جائیں۔ ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آگیا۔ اپنے والد بزرگوار کو یاد کر کے روتے رہے۔ ہم نے کہا کہ مولوی صاحب آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستار فضیلت دور جا پڑی تھی۔ ہنسنے لگے۔ اور فرمایا خوب یاد ہے۔ وہ عجیب زمانہ تھا۔ اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولوی فضل امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا غریب آدمی بد صورت عمر زیادہ علم کم ذہن کند یہ نازک طبع ناز پروردہ جمال صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال، نئی فضیلت ذہن میں جودت، بھلا دال گلے تو کیسے گلے اور صحبت راس آتے تو کیونکر آتے تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے۔ جھٹ اس کی کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا حال بیان کیا۔ فرمایا بلاؤ اس خبیث کو مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا ایسے زور سے کہ انکی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعمت میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا۔ طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے اگر مسافرت کرتا بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی۔ ارے، طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھ۔

فضل حق کا طالب علم کو مارنا اور فضل امام کا ان کو مارنا

درازیٔ شب از مژگان من پرس
کہ یک دم خواب در چشمم نگشت است

خبردار تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا۔ یہ چپ کھڑے روتے رہے کچھ دم نہ مارا۔ خیر قصہ رفع دفع ہوا۔ لیکن پھر کبھی کسی طالب علم کو کچھ نہ کہا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مولانا فضل حق صاحب نے قصیدہ عربی زبان میں امراؤ القلیس کے قصیدہ پر کہا۔ اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں پیش کیا شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے۔ مولوی صاحب سے فضل امام صاحب نے فرمایا کہ بس حد ادب۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں۔ فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تو سچ کہتا ہے۔ مجھ کو سہو ہوا تھا غرض ہم رامپور میں مہینہ بھر مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ (۱)

زندگی کا انجام

مولانا فضل حق خیرآبادی علمی قابلیت میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتوئی جہاد کی پاداش اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔ وہاں بڑی بڑی ذلیل خدمتیں ان کے سپرد ہوئیں۔ آخر وہ ان مصائب کو برداشت نہ کر سکے اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ (۲)

مولانا امام بخش صہبائی

دلی کے دور آخر میں۔ جو یگانہ روزگار افراد رونق بزم دانش تھے، وہ محفل پھر کبھی نہ جمی۔ انہی فخر روزگار لوگوں میں ایک امام بخش صہبائی بھی تھے جن کی سیرت و شخصیت کے معترف اصاغر و اکابر سب تھے بڑا المیہ یہ ہے کہ بے خطا بے مقصد غدر کے سلسلہ میں، انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے

سرسید صہبائی کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:-

ساقی خمکدۂ سخن سرائی مولوی امام بخش متخلص بہ صہبائی۔ نسب آپ کا والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک اور والدۂ مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر

---

(۱) تذکرہ غوثیہ صفحہ ۱۲۷ - ۱۳۶

(۲) مولانا فضل حق دارالمصنفین اعظم گڑھ ہمارے علماء کا شاندار ماضی اور غدر کے علماء مکتبہ ادب۔ کلاسکی ادب صفحہ ۲۵

جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچا ہے کمالات ظاہری اور جلائل باطنی اور حسن خلق اور حمائد اطوار میں پسندیدہ عالم
مقبول خلائق ہیں۔ خلق نوش آپ کا آئینہ بہار اور اوضاع حمیدہ آپ کے محمود روزگار۔ اس حیز زماں میں
ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گذرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ سخنوری مثل تحقیق لغت
واصلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض وقافیہ استکمال فن معما وغیرہ میں ایسا کمال
پہنچایا ہے کہ ہر فن میں یک فنی کہنا چاہیے۔

شروح کتب اور قواعد زبان فارسی اور رسائل علم عروض وقافیہ اور معما جو جو آپ کے ریختۂ قلم
نزاکت رقم ہیں ایسے نفائس مقاصد اور جلائل مطالب پر مشتمل ہیں کہ متبعان فنون مذکور کو ان فوائد جلیلہ
کا حصول بعد ایک عمر دراز کے بھی متعسّر ہے، خصوصاً رسالۂ گنجینۂ رموز کہ صنعت معما میں آپ کے خامۂ
معنی طراز سے جلوہ پرداز ہوا ہے ہر چند رسائل متعددہ اس فن میں اساتذہ سلف سے یادگار ہیں
لیکن جو کہ ع ہر کار رہین روزگارے است۔ اس کمال کا اب تک گنجینۂ تقدیر میں سربمہر امانت تھا اور
ان پیشوایان فن دقیقہ یابی کو اس طرز و انداز سے سوائے آرائش سہل کے نصیب نہیں ہوا۔ تفصیل اس
اجمال کی یہ ہے کہ وہ رسالہ مشتمل ہے ایک معما کی شرح پر کہ شرح و متن دونوں آپ ہی کی نتائج طبع فیاض
سے ہیں۔ وہ بیت باعتبار ظاہر کے سوائے چند کلمات معدود جو ظرف بحر متقارب میں گنجائش پذیر ہو
سکتی ہیں اور کیا رکھتی ہیں، لیکن اگر چشم بصیرت سے دیکھا جاوے وہ بیت ایک عالم ہے کہ جلوہ ہائے
ہزار در ہزار سے دیدہ فریب اہل کمال ہے۔ اور ارباب دانش و اہل خرد پر ظاہر ہے کہ فن معما اگر اصول شانزدہ
گانہ سے زائد نہیں رکھتا، لیکن فروع منتشرہ اور شعب متوافرہ اس سے اس قدر متفرع اور منشعب ہیں کہ
ظرف حصر و شمار اس کی گنجائش سے عاجز و ذلیل ہے۔ اس بیت نے باوجود ایسی تنگ ظرفی کے اس دریائے
ذخار کو اپنے آغوش میں چھپایا ہے یعنی ذیل بیان اعمال میں یہ ہی ایک بیت مثال ہے۔
اور اس سے تین سو ساٹھ مختلف اسامی مستخرج ہوتے ہیں۔ اور طرفہ ہے کہ استخراج اس کا نہایت
سہولت و بے تکلفی کے ساتھ ہے اگر انصاف یاران سخن فہم کی طبیعت سے گوشہ گیر نہ ہو تو ارشاد کریں
کہ اس کیفیت کے ساتھ کوئی رسالہ عہد عدم سے اس دم تک کس صاحب استعداد کی پردۂ فکر سے جلوہ گر

ہوا ہے۔ اور ایک رسالہ جواہر منظوم نام مشتمل رباعیات پر کہ ہر رباعی سے ایک نام نامہائے باری عز شانہ
کا متخرج ہوتا ہے باوجود لطافت اعمال معما کے معنی شعری اس لطف کے ساتھ ہے کہ ناز و انداز خوبان
خلخ و نوشاد اس کے آگے طبائع عشاق سے ہزار کوس پرے رہتا ہے۔ سوائے اس کمال کے نزد نظم
زبان دری سے جزو گیر ہائے متعدد مملو ہیں۔ نثر ایسی کہ نثر ثریا اس پر نثار ہے۔ اور نظم ایسا کہ نظم جواہر
اس پر فدا۔ ایک نثر چار پانچ جزو کی مسمیٰ بریزۂ جواہر سلطان عہد والی عصر محمد سراج الدین بہادر شاہ خلد اللہ
ملکہ و سلطنتہ کی مدح میں اس آب و تاب کے ساتھ ریختۂ قلم نزاکت رقم کی ہے کہ اگر رشک و حاسد عہد کی
چشم پوش نہ ہو تو اس کی جلوہ گاہ میں سہ نثر ملا نور الدین ظہوری کو ہرگز پردۂ خفا سے جلوہ گر نہ کریں
اور ظہوری کو اس کے عہد میں جانے نہ دیں اور ایک انشائے مکاتیب نہایت متانت عبارت اور لطافت
معانی کے ساتھ ہے کہ اکثر اس کا بطرز نثر مرزا بیدل علیہ الرحمۃ ہے اور نظم میں غزلیات کثیرہ اور قصائد
متعددہ بعضے بطرز متقدمین اور بعض بطرز متاخرین نہایت لطف عبارت و کمال حسن معانی کے ساتھ موجود
ہیں۔ الغرض احاطہ آپ کے محاسن و محامد کا اندازۂ تقریر و احاطۂ تحریر سے افزوں ہے ان کے نظم و نثر کے
الفاظ لآلی شاہوار اور معانی یاقوت آبدار کی برابری کرتے ہیں۔ قلم کو انہیں کی عبارت سے خط نستعلیق
گلگل میسر اور صفحہ انہیں کے معنی رنگین کے فیض سے بساط گل کا ہمسر۔ ہر دائرہ طراوت معانی رنگین سے
ساغر مل اور ہر سطر رنگینی مضامین سے شاخ گل ان کمالات پر حلم ایسا ہی۔ خلق ویسا ہی۔ زبان ان کی ورق
لغۂ اخلاق اور سینہ ان کا صندوق خزائن وفاق۔ ہر چند اس گروہ ارباب وفاق اور اس ہیچمدان نکوہیدۂ
آفاق اور راقم میں سررشتۂ محبت و اخلاص ایسا مستحکم ہے کہ گویا دو قالب میں ایک جان جاری و ساری ہے
اور یہ امر دال ہے اس بات پر کہ ذکر اوصاف حمیدہ اس یگانۂ روزگار کا شاید نتیجہ افراط محبت کا ہو لیکن
راقم نے مراتب دوستی و مدارج اتحاد کو اس امر میں کچھ مدخل نہیں دیا اور جو کچھ بیان واقعی تھا اسی کو لکھا
ورنہ محبت کا اقتضا یہ تھا کہ ہر وقت ان کی محامد و اوصاف میں زبان کھولتا اور تحریر مناقب میں قلم کو ہاتھ
میں لیتا شاید سوالات محشر کے جواب کی تقریب ہی ایک دو لمحہ کے واسطے زبان کو اس ذکر سے باز رکھتی
اور صدمۂ زلزلۂ قیامت قلم کو ایک دو دفعہ ہاتھ سے گرا دیتا۔ چونکہ اوصاف نفس الامری بھی غیر متناہی تھا

اور ان کا حصہ ظرف اعداد نا متناہی میں بھی محال ہے، بالغرض اگر ہمت ان کے بیان سے عاجز نہ ہو، زبان کو کا درماندہ اور قلم چوبیں کا فرسودہ ہونا ممکن ہے۔ (۱)

صہبائی کی وضع قطع

راستے میں مولوی امام بخش صہبائی مل گئے، یہ کالج میں میرے استاد لمبے ہیں کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں سر پر پٹے ہیں بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی ایک برکا سفید پاجامہ سفید انگرکھا کشمیری کام کا جبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید صافہ باندھتے ہیں یہ بھی چیلوں کے کوچوں ہی میں رہتے ہیں۔ (۲)

صہبائی کا فضل و کمال

صہبائی قدیم دلی کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر بہت روشن خیال اور اخلاقی جرأت کے آدمی تھے۔ زبان فارسی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ اور اس زمانہ میں بھی جبکہ فارسی کا دور دورہ تھا۔ ایک خاص عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے سرسید کو آثار صنادید کی تصنیف میں بہت مدد دی تھی، طلبہ میں بہت ہر دلعزیز تھے اور ان کی قابلیت اور شہرت کا طلبہ کے دل پر بڑا اثر تھا۔ فن شعر میں استاد مشہور تھے اور قلعہ کے اکثر شہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ زمانہ غدر میں مارے گئے۔ اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ (۳)

ذکاء اللہ کے تاثرات

ذکاء اللہ صرف بارہ برس کے تھے۔ جب وہ قدیم دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ ان کے والد جن سے انہیں اعلیٰ ذہانت ورثہ میں ملی تھی۔ ہر سہ پہر کو ان کا سبق سنتے تھے۔ جب وہ پڑھ پڑھا کر گھر واپس آتے وہ اپنے ساتھ جدید سائنس کا کوئی نہ کوئی نیا تجربہ ضرور لاتے تھے۔ تاکہ بچپن کے جوش کے ساتھ اس کا اظہار کیا کریں۔ وہ مابعد کے سالوں

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صہ ۱۴۰

(۲) دلی کی آخری شمع صہ ۳۳

(۳) تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ صہ ۸

میں اپنے کالج کے پروفیسروں کا ذکر انتہائی احترام اور محبت سے کرتے تھے۔ بالخصوص اپنے فارسی اور عربی کے اتالیق مولوی امام بخش کا جن کا تخلص صہبائی تھا۔ یہ مولوی صاحب دہلی کے ممتاز شہری تھے۔ اعلیٰ اخلاقی سیرت کے مالک تھے۔ نیز نہایت روشن خیال اور مہذب انسان تھے۔ انہوں نے سر سید احمد کا ہاتھ بٹایا جب کہ وہ اپنی کتاب آثار الصنادید لکھ رہے تھے۔ شاگرد علمی محبت امام بخش سے کرتے تھے۔ اتنی مشکل سے کسی اور استاد سے کرتے ہوں گے۔ ان کی شخصیت کا نوعمر ذکاء اللہ پر اس قدر اثر پڑا۔ کہ تیس سال کے بعد جب وہ الہ آباد کے میور سینٹرل کالج میں فارسی علم ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے طلباء کے سامنے لکچر دیتے تھے۔ تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔ کہ لکچر دیتے وقت مولوی امام بخش کی تصویر ہر وقت ان کے سامنے رہتی ہے۔ اس زمانہ میں علم کے جتنے برگزیدہ علم بردار تھے۔ ان میں وہ سب سے بڑے تھے

اُن خوفناک ایام میں جو دو سال غدر میں دہلی کی تباہی کے بعد آئے۔ جب جذبات اشتعال کا ہر طرف دور دورہ تھا۔ شہر کے اس حصہ میں جہاں یہ بوڑھے پروفیسر رہا کرتے تھے۔ فوجی گولہ باری کے سبب ان کا مکان اور بہت سے دوسرے مکان زمین کے برابر کر دیئے گئے تھے۔ خود مولوی صاحب اور ان کے بہت سے رشتہ دار مارے گئے۔ اور اب ان کا خاندان تقریباً معدوم ہو گیا ہے۔ ذکاء اللہ ان کے لیے بہت زیادہ ماتم کناں رہتے تھے۔ غدر کی جہاں اور بہت سی تلخیاں ان کے دماغ میں محفوظ رہ گئیں تھیں ان میں سے ایک ان کی شہادت بھی تھی۔ وہ بعد سے فرمایا کرتے تھے۔ یہ خونی فعل ایسا ہے کہ اسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ (۱)

صہبائی کا پایۂ کمال

مولوی صہبائی دہلی کالج میں مدرس اول فارسی تھے۔ ہندوستان میں کوئی ان کی برابر فارسی زبان کا محقق نہ تھا۔ معمے وعروض وقوافی میں کمال تھا ان کے ہندو مسلمان صدہا شاگرد تھے۔ ان کے مفتی صدرالدین آزردہ بڑے دوست تھے۔ ان کے مرنے پر انہوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

---

(۱) ذکاء اللہ دہلوی دی ایف اینڈریوز صفحہ ۶۲

کیونکہ آزردہ نکل جاتے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح بے جرم جو صہبائی ہو [۱]

گارساں دتاسی اپنے خطبات اردو میں لکھتے ہیں۔

سب سے زیادہ فاضل

مولانا صہبائی شیخ کریم الدین کے ہمعصر ہیں اور فیلن صاحب اپنے تذکرہ شعراء میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قابل مصنف دہلی میں سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں اور اس وجہ سے دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر[۲] مقرر کیے گئے۔[۳]

صہبائی کی شہادت

اس المناک واقعہ کی تفصیل مصور غم علامہ راشد الخیری نے میر قادر علی مرحوم سے نقل کی ہے۔ مولانا قادر علی صاحب مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ان ہی کے گھر میں رہتے تھے، ایک موقع پر بیان کرتے تھے کہ میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹرہ مہرپرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے پہلی ہی رکعت تھی امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں، شہر کی حالت نہایت خطرناک تھی اور دلی حشر کا میدان بنی ہوئی تھی، ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دیدی تھیں اس لیے ہم سب گرفتار کرکے دریا کے کنارے پر لائے گئے .... ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں۔ میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں صاحب یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اس لیے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لیے میں دریا میں کود پڑا پچاس یا ساٹھ گز گیا ہونگا کہ

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ

(۲) خطبات گارساں دتاسی

(۳) قدیم دلی کالج

گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں، اور صف بستہ گر کر مر گئے[۱]

لیکن نواب صدیق حسن خاں صاحب نے صہبائی کے متعلق لکھا ہے کہ انہیں پھانسی[۲] دی گئی تھی[۳]

صہبائی کا مرثیہ

کسی شاعر نے، صہبائی کی بے بسی اور بے کسی کی شہادت پر کیا خوب کہا ہے :

ندانم کجا رفت آں نقش پاک — فلک برد یا ماند بر روئے خاک

ندانم کسے داد او را کفن — دیا ماند چوں سایہ بر خاک تن

ندانم چہ کرد است با او سپہر — زجامہ کفن کرد یا تاب مہر

بخاکش نمودند او را نہاں — دیا مرغ شد سوئے آسماں

کسے فاتحہ ہم برو خواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است

کدامی گل و بلبل و بادو دشت — بخاکش بحسن عقیدت گذشت

---

(۱) دلی کی آخری بہار

(۲) تذکرہ طور

(۳) مرحوم دلی کالج

(۸)

مولانا عبدالحیؒ

مولانا عبدالحیؒ بھی ان مجاہد پیشہ بزرگوں میں تھے جنہوں نے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی، اور زندگی کی آخری سانس تک راہ جہاد پر ثابت قدم رہے، کوئی حادثہ اور سانحہ انہیں جادۂ صواب سے منحرف نہ کر سکا،

سرسید فرماتے ہیں :—

مولانا عبدالحی صاحب غفر اللہ، مولانا عبدالعزیز قدس سرہٗ کی خدمت میں نسبت دامادی اور شاگردی کی رکھتے تھے۔ ہر فن کے ساتھ نسبت خداداد تھی کہ جس فن میں جس نے آپ سے بحث و مناظرہ چاہا اُسی فن کو جانا کہ شاید عمر بھر اُن کا نظیر نہیں پیدا ہوا۔ ایک مدت درس و تدریس علوم میں صرف ہمت کی۔ اواخر میں زبدۂ سادات کرام اسوۂ اولیائے عظام سید احمد مغفور مبرور کی خدمت میں، جن کا ذکر اس سے پہلے ذیل اولیاء و صلحا ہو چکا ہے، پہنچ کر بیعت کی اور تادم زیست اُن کے سایۂ عاطفت سے کبھی علیحدہ نہ ہوتے۔ سفر و حضر میں مثل سایہ کے ان کی بیعت میں حاضر رہتے، انہیں کی خدمت میں سفر بیت اللہ کو اختیار فرما کر فرض حج ادا کیا اور وہاں سے مراجعت فرما کر چندے بموجب ارشاد پیر طریقت کے وعظ گوئی میں اوقات شریف کو بسر کیا اور لوگوں کو نہایت ہدایت حاصل ہوئی اور باتفاق مولوی محمد اسماعیل صاحب کے جن کا ذکر بعد اس کے بتفصیل آتا ہے، ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم رہے۔ جب سید صاحب مغفور اس ارادہ پر کوہستان کی طرف تشریف فرما ہوتے۔ اسی نواح میں چند سال تک رفیق رہے اور پھر مرض بواسیر کی شدت سے سفر ناگزیر اختیار کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی از سرسید، ص ۹۔

مولانا کا علم و وقار

خاں صاحب نے فرمایا: کہ مولوی ذوالفقار علی صاحب بیان فرماتے تھے کہ مولوی رستم علی بریلی کے رہنے والے اور بہت پہلوان تھے۔ مولوی اسماعیل صاحب اور مولوی رستم علی صاحب چاندنی چوک کو جا رہے تھے۔ کہ ایک پہلوان نے مولانا کو گالیاں دینی شروع کیں۔ اس پر مولوی رستم صاحب کو غصہ آیا۔ اور وہ تلوار نکال کر اس کو مارنے کو دوڑے۔ مولانا نے جھپٹ کر مولوی رستم علی صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ میاں رستم علی کیا کرتے ہو۔ وہ گالیاں بیجا نہیں دیتا بلکہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ کیونکہ وہ یہی تو کہتا ہے۔ کہ بڑا بددین ہے۔ جو نئی نئی باتیں منہ نکالتا ہے۔ سو اس میں وہ کیا بے جا کہتا ہے۔ میری باتیں تو واقعی اس کے لیے نئی ہیں۔ علماء نے یہ باتیں ان بیچاروں کو کہاں سنائی ہیں۔ پھر اس کو نئی کیوں نہ معلوم ہوں۔ اور وہ گالیاں کیوں نہ دے۔ اس کا اس پہلوان پر بہت اثر ہوا۔ اور اس روز سے مولانا کا دوست ہو گیا۔ (۱)

شاہ عبدالحی کے خصائص

مولد بڈھانہ ضلع مظفر نگر والد کا نام ہبۃ اللہ بن نور اللہ صدیقی بعض حضرات کا خیال ہے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب کے حرم ثانی آپ کی پھوپھی تھیں بہرحال سن رشد کے ساتھ ہی بغرض تعلیم دہلی تشریف لائے اور انہی حضرات کے درس میں شامل ہوئے، شاہ عبدالقادر صاحب اور مولانا عبدالعزیز صاحب نے خلافت بھی عطا فرمائی اور جب دہلی میں شاہ محمد اسماعیل سے معترض نے کہا میاں صاحب آپ کی اپنی ہمشیرہ (مراد از حرم ثانی شاہ عبدالعزیز صاحب) تو گھر میں بیوہ بیٹھی ہیں اور آپ دوسروں کو نکاح ثانی کی ترغیب فرماتے ہیں، شاہ صاحب نے فوراً انکی شادی کرا دی ——— تصانیف میں رسالہ مذکور کے سوا کتاب "صراط المستقیم" فارسی مصنفہ حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دو باب (سلوک میں) آپ کے قلم سے ہیں، اس کتاب کو عربی لباس بھی آپ نے پہنایا ماسوائے ازیں شیخ رشید الدین کشمیری دہلوی (م ۱۲۴۹ھ) سے آپ کا جو تحریری مناظرہ ہوا اس کی روئداد بھی آپ نے مرتب فرما کر

---

(۱) میر الروایات ص ۱۱۷

کتابی شکل میں منضبط کر دی مختصر یہ کہ

"کان آیۃ من آیات اللہ بمانۃ فی التقویٰ والعمل وتاثیر الوعظ وھمۃ الاول وایثار القناعۃ فی الملبس والماکل کثیر الصمت شدید التوکل جلیل الوقار محباً للسنۃ السنیۃ متبعداً عن الرسوم والبدع قد غشیہ نور الایمان سیماء الصالحین یغضب اذا مدح ولیستبشر اذا نصح والقلم فی المدح لعدم امکان الا حاطۃ علیہ"

وہ اللہ کی نشانیوں میں سے تھے تقویٰ عمل تاثیر وعظ صبر لباس وغذا کی سادگی تنفر بدعت ومراسم میں بے مثل تھے نور ایمان ان پر چھایا جاتا تھا بشرے سے صلاحیت عیاں تھی، اپنی تعریف سے کبیدہ خاطر ہوتے اور نصیحت سے خوش الغرض وہ اتنے جامع الصفات تھے کہ قلم جن کے نام سے عاجز ہے۔ (۲)

مولانا عبدالحی کی وفات

"قیام خیبر کا ایک نہایت رنجدہ واقعہ مولانا عبدالحی کی وفات ہے۔ مولانا بہت بوڑھے تھے بواسیر کا مرض پہلے سے تھا، قیام خیبر کے زمانے میں شدید دورہ ہوا۔ علاج میں کوئی کوتاہی نہ ہوئی، لیکن جو دوا دی جاتی، مفید نہ پڑتی کمزوری روز بروز بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً بیہوشی طاری رہنے لگی سید صاحب روزانہ عیادت کے لیے مولانا کی قیام گاہ پر جاتے۔ ایک روز آپ گئے تو بیہوشی سے افاقہ ہوتے ہی مولانا نے آنکھیں کھول لیں اور سید صاحب کو پہچان لیا۔ آپ نے مزاج پوچھا تو بولے: نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں اور میرے سینے پر پاؤں رکھدیں۔ شاید آپ کی برکت سے میری مشکل آسان ہو جائے اور اس مصیبت سے نجات پاؤں سید صاحب نے فرمایا مولانا آپ کا سینہ علوم کتاب سنت کا گنجینہ ہے۔ میں اس پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔ پھر پاس بیٹھ گئے اور سینے پر ہاتھ رکھا، جس سے کسی قدر تسکین ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد چند بار اللہ رفیق الاعلیٰ اللہ رفیق الاعلیٰ کہا اور روح جسد عنصری کو چھوڑ کر مالک حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئی۔

---

(۱) ترجمہ السید الامام احمد بن عرفان ص ۲۰ مطبوعہ مصر

(۲) تراجم علمائے حدیث ہند حصہ اول صفحہ ۱۳۰

اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ میں پہنچے تھے اور چار باغ (سوات) میں سید صاحب سے ملے تھے۔ ۸ شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۲ فروری ۱۸۲۸ء) کو رحلت فرمائی۔ مولوی محمد یوسف پھلتی خطیب لشکر اسلام کی وفات کے بعد مولانا عبدالحی کا انتقال غازیان اسلام کے لیے دوسرا نہایت غم انگیز حادثہ تھا۔ مولانا کے اکلوتے فرزند مولوی عبدالقیوم ساتھ تھے سید صاحب نے فرط شفقت سے انہیں سینے سے لگایا اور بہت تسلی دی۔

تجہیز و تکفین

مولانا شاہ اسماعیل، مولوی محمد حسن، قاضی علاؤ الدین بگھروی، میاں جی چشتی اور میاں جی محی الدین میت کے غسل میں لگ گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل اور محاسن بیان فرماتے رہے، وقائع کے بیان کے مطابق اس قسم کے الفاظ فرماتے، مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں اٹھا لیا، جو مرضی مالک کی۔ آنکھوں سے برابر آنسو بہہ رہے تھے۔ (۱)

شہادت کی حسرت

خان صاحب نے فرمایا کہ مولوی عبدالحی صاحب جہاد میں شہید نہیں ہوئے بلکہ اپنی موت سے انتقال فرمایا ہے۔ جب ان کا انتقال ہونے لگا ہے، تو انہوں نے سید صاحب سے عرض کیا کہ سید صاحب شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی۔ اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدم مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجئے۔ کہ اسی حالت میں میری جان نکل جاوے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ آپ کے سینہ پر ہو۔ اور آپ نے ان کی تسلی کے لیے اپنا ہاتھ اُن کے سینہ پر رکھ دیا۔ اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۲)

---

(۱) سید احمد شہید حصہ دوم (غلام رسول مہر) صـ ۳۵

(۲) امیر الروایات صـ ۲۰۳

مولانا محمدؒ اکرم محدّث دہلوی

علوم ظاہری و باطنی فقہ و حدیث و تفسیر و قرات قران میں وحید العصر فرید الدہر تھے حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی نے تفسیر عزیزی محض آپ کی خاطر تصنیف کی آپ کے والد ہندو تھے جو شاہ عبد العزیز کے ہاتھ پر مشرّف باسلام ہوئے آپ نے بعد تحصیل علوم ظاہری حضرت شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہوکر علوم باطنی کی تکمیل کی اور خرقہ خلافت کا حاصل کیا اکثر اہل دہلی فن قرات میں آپ کے شاگرد تھے پہلے آپ نے حج کیا تھا تو جب وطن میں واپس آتے تو اپنی واپسی سے نہایت افسوس کیا پھر زیارت حرمین شریفین کو تشریف لے گئے لیکن راستہ ہی میں وفات پائی شمع تا دیلات تاریخ وفات ہے (۱)

---

(۱) حدائق الحنفیہ ص ۴۷۳

شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی

متوفی

سنہ ۱۲۶۲ ہجری سنہ ۱۸۴۶ عیسوی

نوید حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ یعنی

"آگاہی آمد ایں فرزنداں کہ لطف الٰہی ایشان بما عطا کردہ است ہمہ مستعد اند نوعی انداز ملکیت در ایشاں ظہور خواہد کرد لیکن تدبیر غیب تقاضا مے کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ احیائے علوم دین نمایند و ہماں جا وطن اختیار کنند از طرف مادر نسب ایشاں یا متمکن باشد زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی دارد انتقال بجماعت کہ وطن والدہ ایشاں متمکن باشند بسر زمینے بالطبع متحمل است"[1]

والد کا نام محمد افضل (فاروقی) سن ولادت ۱۱۹۲ھ کنیت ابو سلیمان حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے نواسے تھے نانا کی رحلت کے بعد مرحوم کی مسند علم و خلافت کے مالک ہوئے اساتذہ میں شاہ صاحب ممدوح شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین تھے جن سے جملہ منقول و معقولات سبقاً سبقاً پڑھے ۱۲۴۰ھ میں پہلی مرتبہ حج کے لیے گئے تو شیخ عمر بن عبد الکریم مکی (متوفی ۱۲۴۷ھ) سے سند و اجازہ حدیث حاصل ہوا شیخ عمر (ممدوح) سے مذاکرات ہوئے تو آپ نے شاہ صاحب سے متعلق فرمایا "قد حلت فیہ برکۃ جدہ الشیخ عبد العزیز دہلوی" (ان کے اندر ان کے بزرگوار شیخ عبد العزیز دہلوی کی برکت حلول ہوگئی ہے) اور آپ کے زہد پر شاہ عبد العزیز مرحوم فرمایا کرتے ہم

"تقریر اسماعیل (شہید) نے تحریر رشید الدین نے اور تقوی ... اسحاق نے لے لیا"

---

[1] قول جلی مصنفہ جناب حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ صاحب بحوالہ اتحاف النبلاء ص ۴۲۰ - ۴۲۱

یہاں تک کہ ممدوح نے اپنی زندگی میں اپنا پیش امام آپ کو مقرر کر رکھا تھا اتباعِ سنّت کے شوق و ترویج میں بغیر عمامہ نماز پڑھا دیتے تھے (صرف ٹوپی اوڑھ کر) جس کی شکایت غلاۃ حضرت صاحب (شاہ عبدالعزیز) کی خدمت میں کرتے رہے آخر ایک روز آپ نے جلال میں آکر فرمایا :۔

"ابھی تو اسحاق ٹوپی سر پر رکھ کر امامت کرتا ہے آئندہ میں اس سے کہہ دوں گا کہ ننگے سر نماز پڑھائے اور ساری دنیا کو اقتدا کرنی ہوگی" [1]

حضرت صاحب اپنے بھتیجے (سیدنا محمد اسماعیل شہید) اور اس کے نواسے کو دیکھ کر یہ آیت پڑھتے الحمد اللہ الذی وہب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحاق۔

اپنے نانا مرحوم کی زندگی ہی میں تدریس شروع کی برسوں حضرت کی موجودگی میں پڑھایا اور بعد میں تو زینت مسند ہی تھے درس کے اس اہتمام کی وجہ سے "الصدر الحمید" کے لقب سے مشہور ہوئے جیسا کہ "المسوی مکہ معظمہ" میں منقول ہے۔

"آخبرنا بکتاب المسوی من احادیث الموطا الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق بن محمد افضل العمری الدہلوی عن جدہ لامہ قیّم الطریقۃ (ولی اللّہیۃ) الامام عبدالعزیز بن ولی اللّٰہ الدہلوی عن ابیہ"

ہجرت کے بعد مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام ہوا تو وہاں بھی تدریس ہی کا مشغلہ تھا، ہزاروں پیاسے اس چشمہ سے سیراب ہوتے۔

سرسید احمد خان مرحوم فرمایا کرتے [2]

"میں شاہ (اسحاق) صاحب کے وعظ میں حاضر ہوتا باہر مردوں کا ہجوم ہے زنانہ میں عورتیں جمع ہیں ڈولیوں کا شمار نہ پالکیوں کی گنتی، محلات شاہی کی بیگمیں تک حاضر ہوتیں امراء کے یہاں سے مکلف

---

[1] الحیاۃ بعد المماۃ ص ۷۸

[2] بروایت نواب مصلح الدین احمد صاحب (بن خواجہ شرف الدین احمد مرحوم کوچہ چیلان دہلی یہ بزرگوار نواب السید راس مسعود صاحب خلف السید محمود ابن سرسید احمد خان کے حقیقی ماموں ہیں)۔

کھانوں کی دیگیں کہاروں کے کندھوں پر لدی چلی آ رہی ہیں صاحبزادی حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں، حضرت جی! کھانے آ گئے فرماتے تقسیم کر دو اور زنانہ حلقہ وعظ میں سے عورتیں اپنے اپنے برتن پیش کرتی ہیں۔ سب سے پہلے طلباء کے لیے کھانا بھیجا جاتا پھر عورتوں کو تب اُس پر بھی بچ رہتا تو صاحبزادی عرض کرتیں! حضرت جی! کھانا بچ گیا ہے فرماتے بیٹی ہمارے لیے نہیں بچا اسے رہنے دو "
" شاہ صاحب خود معمولی پیالی یخنی کا سا شوربہ گاڑھے کے دسترخوان پر رکھ کر تناول فرماتے میں نے اُن کا سا کھانا کسی کو کھاتے نہ دیکھا "
" گرد و نواح کی محتاج عورتیں آ جائیں اور اس بے فکری سے دولتکدہ پر ہفتوں رہی آتیں گویا باوا کے گھر میں آ گئی ہیں جب خود ہی جی چاہتا رخصت ہوتیں محتاج عورتوں کی اس طرح کی مہمان نوازی مکہ معظمہ میں بھی رہی آتی تھی "

۱۲۵۸ھ میں اپنے برخوردار شاہ محمد یعقوب کو ہمراہ لے کر بیعت اللہ الحرام کے قصد سے چلے ہجرت کی پہلی منزل نظام الدین اولیاء تھی جہاں تین روز قیام فرمایا، شہر کے اکثر علماء و روساء باریاب ہوئے ترک قصد کے لیے درخواستیں کیں، ریذیڈنٹ تک فسخ عزم کے ملتجی ہوتے مگر شاہ صاحب نے التواء نہ فرمایا، یہیں مفتی صدر الدین صاحب اور حضرت میاں صاحب کو سند حدیث مرحمت فرمائی۔ مکہ معظمہ میں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی غسل جنازہ پر شیخ عبداللہ سراج (مکی) متوفی ۱۲۶۴ھ نے فرمایا: واللہ لانہ عافظ وقرأت علیہ الحدیث طول عمری مانلت مانال (سوگند بخدا اگر یہ بزرگ کچھ مدت اور زندہ رہتے اور میں ان کو ابھی برسوں حدیث سناتا تب بھی ان کے مرتبہ کو نہ پہنچتا)۔

تصانیف میں مسائل اربعین، مائۃ مسائل، تذکرۃ الصیام ہیں۔

اسحاق شیخ آفاق مادہ تاریخ وفات ہے
۱۲۶۲ھ

دو صاحبزادیاں، ایک (۱) مولانا عبدالقیوم بھوپالی کے گھر کی زینت بنی دوسری حضرت محمد بن معظم ابن مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ صاحب (برادر حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ) کے حرم میں داخل ہوئیں اور ان سے مولانا عبدالرحمن کا ظہور ہوا اور اُس کے بعد سلسلہ اولاد کا کوئی علم نہیں ہو سکا (۱)۔

---

(۱) تراجم علمائے اہل حدیث ہند، حصہ اول، صفحہ ۱۲۱

مولانا مملوک العلی

مولوی مملوک العلی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرّس اول ہیں عجیب باکمال آدمی ہیں مدرسہ میں اُن کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانہ میں کسی استاد سے ہوا ہو بہت پابند شرع ہیں اس لیے خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دے دینا ہے کوئی ۴۰ سال سن ہے رہنے والے تو نانوتہ کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں اور دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔

تھوڑے ہی دن ہوتے بیچارے پابندی شرع اور تقویٰ کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے، ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسہ کے معائنہ کو آئے ان کے علم اور رتبہ کے خیال سے ہاتھ ملایا جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر اُن کی عزت افزائی کی انہوں نے اس طرح ہماری توہین کی غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔(۱)

---

(۱) "دلّی کی آخری شمع" : فرحت اللہ بیگ دہلوی، صفحہ [illegible]

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد، مرزا فرحت اللہ بیگ فرماتے ہیں : ـــــ

"اس واقعہ کا ذکر ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم نے ابن الوقت میں کیا ہے، مگر نام نہیں لکھا، مجھے یہ واقعہ انہی کی زبانی معلوم ہوا سن کر تعجب ہوا اب اپنے بہت سے لوگوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، ـــــ !"

مولانا کا مزار

حضرت عکدبار کے پائیں ذرا الگ کو مولانا مملوک العلی صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ کا مزار ہے۔ کچی قبر بنی ہے۔ کوئی کتبہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس لیے جب تک واقف کار آدمی سے پوچھا نہ جاتے ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ کس بزرگ کی خوابگاہ ہے۔ افسوس ہزار ہا شاگرد، موجود ہونے کے کوئی اتنا بھی نہیں کہ یادگاری کا نشان تو بنادے کہ وارد صادر فاتحہ ہی پڑھ جائیں آپ کا اصلی وطن نانوتہ ہے جو ضلع سہارنپور میں واقع ہے مگر جب سے دلی میں مدرس ہوئے تھے یہیں بودوباش اختیار کی تھی۔ آپ مولانا رشید الدین علیہ الرحمۃ ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تمام ہندوستان آپ کے فیض سے مملو ہے۔ آپ کے صاحبزادہ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی بھی فخر ہندوستان تھے۔ ایک مدت تک مدرسہ دیوبند کے مدرس اول رہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی صاحبزادی تھے جن میں سے اس وقت مولوی حکیم معین الدین صاحب سلمہ اللہ موجود ہیں۔ تشخیص امراض میں کمال رکھتے ہیں۔ اور نہایت متقی پرہیزگار و منکسر مزاج متوکل شخص ہیں اپنے اصلی وطن نانوتہ ہی میں قیام رکھتے ہیں۔ (۱)

عالم بے بدل اور متقی بے مثل

مدرس اول مدرسہ دہلی جناب مولوی مملوک العلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر ہونی چاہئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہیں اور واقع میں بناء مدرسہ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں، ہر ایک علم اور فن سے جو ان زبانوں میں ہیں مہارت ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہوتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے ہیں اور جس کام پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح تا حد الوسع ان سے قصور نہیں ہوا مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات

---

(۱) یادگار دلی، صد ۳۳

سے اتنا فیض ہوا کہ شاید کسی زمانہ میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہے بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا اگران کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے کیونکہ فاضل ایسا ہی ہے کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے اس لیے رات دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلباء پڑھتے رہتے ہیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے ہیں سب کو پڑھاتے ہیں تمام شب اور دن میں شاید دو پہر رات کو آرام کرنا ان کو نصیب ہوتا ہوگا ورنہ رات دن وہاں وہی طلبہ میں گذرتا ہے اور باوجود اس کثرت درس اور فیض رسانی کی پابند شرع شریعت کے ایسے ہیں کہ اس طرح کے آدمی کم دیکھنے میں آتے ہیں غرضیکہ جتنا ان کی تعریف میں لکھوں بجا ہے اگر کوئی امر بطور مبالغہ بھی لکھوں وہ بھی امر واقعی ان کی ذات میں پاتا ہوں بہت بے نظیر فاضل ہیں۔ ان کا ثانی کوئی فاضل ایسا نہیں ہے جس سے اس طرح کا فیض عام اور نفع خاص و عام حاصل ہو عمران کی ۱۸۴۷ء میں قریب ساٹھ برس کی ہوگی بہت خندہ پیشانی اور عقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں تحریر اقلیدس کا ترجمہ زبان اردو میں چار مقالہ اول کا اور دو مقالوں آخر گیارہویں بارہویں کا کیا ہے، حق یہ ہے کہ علم ہندسہ کو پانی کی طرح بہا دیا ہے اصل وطن ان کا نانوتہ ہے مدت سے شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں ۔ (۱)

---

(۱) قدیم دلی کالج، ص ۱۹۴

(۱۲)

مفتی صدرالدین خاں آزردہ

مفتی صدرالدین خاں آزردہ گوناگوں فضائل و کمالات اور محامد و محاسن کے بزرگ تھے، وہ بڑے اچھے شاعر تھے، بہت بڑے عالم تھے، اور بہت اچھے انسان تھے۔ ہر مکتب خیال کے لوگ ان کی سیرت و شخصیت سے متاثر نظر آتے ہیں، کوئی نہیں جو ان کے کردار بلند کا مداح و معترف نہ ہوا انہوں نے بڑے ٹھاٹھ اور شان کی زندگی بسر کی، زندگی کا آخری دور، غدر کی تباہ کاریوں کے باعث عسرت و فلاکت میں بسر ہوا، شروع میں وہ پیکر شکوہ و تجمّل تھے، آخر میں درس عبرت،

سرسید کس عقیدت اور والہانہ محبت کے ساتھ کہتے ہیں :-

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی نیست

قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے، قطع نظر اس سے کہ اس زبدۂ جہان و جہانیاں کی صفات کا احصا محالات سے اور کمالات کا حصر مرتبہ متعسرات سے ہے، جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت صفات میں سے لکھے، یا زبان ارادہ کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے جو کہ ہر صفت قابلیت اول لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے، مدت تک یہی عقدہ بند زبان تحریر اور گرہ لسان تقریر رہتا ہے کہ کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتدا کرے، شعر:-

---

۱؎ المتوفی ۱۲۸۵ھ ان کے حالات کے لیے دیکھو تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۳ و ۹۴، ابجد العلوم ص ۹۰۳ - ۹۰۵ نیز حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱ - ۴۸۴ میں ان کے حالات مرقوم ہیں۔

مجلس تمام گشت و بپایان رسید عمر
ماہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

بے شائبۂ تکلف و بے آمیزش مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو، اب سوا اس سرگروہ علمائے روزگار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں۔ ان حضرت کی طبع رسا شکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج ہے۔ ارباب فہم و ذکا اور ناخن فکر عقدہ لانیحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا۔ معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا، اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہو گیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کا حدس صائب معصیت گل پر تصنیف نہ لکھتا، بلبل امی محض رہتی، اور اگر ان کا فکر رسا سطر شمشاد کے معنی نہ بیان کرتا، قمری سجع خوان نہ ہوئی۔ ان کی دقت طبع اور حدت فہم کے سامنے لالہ کے داغ دل اور سنبل کی پریشانی اور ارغوان کی جگر خونی کی وجہ (سے) مضمون پیش پا افتادہ ہے۔ اگر ان کی رائے روشن معجزہ نہ ہو نقطۂ موہوم کو اشارہ رنگت سے تقسیم کرے، اور اور جزو لایتجزیٰ کو دو نیم۔ قلب المومن عرش اللہ گویا انہیں کے دل کی شان میں ہے کہ حامل ان انفاس فیض اقتباس کے واسطے گوش بر آواز رہتا ہے اور لی مع اللہ ان پر علی الدوام صادق ہے کیونکہ کوئی وقت ایسا نہیں ہے کہ جبرائیل بارگاہ قرب الٰہی پر دیر تک اجازت کا منتظر نہ رہے۔ راہ حق میں تیز رو اور مسلک دنیا میں کاہل کوش لیکن تونگری ظاہری درویشی معنوی کی پردہ پوش ہے :-

کسانیکہ راہ خدا داشتند
چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

اگر مولوی جامی زندہ ہوتے یہ بیت :

چو فقر اندر لباس شاہی آمد
بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

سوا اس برگزیدہ انفس وآفاق کے اور کسی کی شان میں نہ کہتے۔ جو کہ ارباب معنی پر یہ بات ظاہر ہے کہ لباس فقر میں مصروف اطاعت ہونا اور گوشۂ خلوت کو واسطے فراغ عبادت کے اختیار کرنا موجب شہرت ہے۔ اور صیت بلند بسبب کثرت اہل دنیا کے اس شغل کے اہم سے باز رکھتی ہے، لباس اہل ظاہر کو اختیار کیا اور بسکہ احقاق حق اور زیادہ اسی عباد اور عدل و انصاف افضل عبادت ہے، منصب صدارت کو اپنے ذمہ پر لیا سبحان اللہ کیا طریقہ داد ہے اور کیا سر رشتۂ انصاف ہے کہ نوشیرواں ان کے دیوان عدالت میں عہدۂ پیشکاری کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہا عدل عمر یہاں بسبب ادب کے کچھ نہیں کہا جاتا۔ شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گذار نہیں اور جلالت باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے کو بار نہیں باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضت مسائل دین کے وقت ہر ادنیٰ کو بھی رخصت سخن ہے۔[۱]

آزردہ اور ان کے خصوصیات

تمام علوم مروجہ نحو منطق حکمت ریاضیات معانی بیان ادب اصول فقہ حدیث تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے آباو اجداد آپ کے کشمیر کے اہل بیت علم و صلاح سے تھے۔ آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی علوم نقلیہ و فقہ و حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں اور فنون عقلیہ کو مولوی فضل امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ دی آپ بڑے صاحب دنیا جہت وسیاست اور اپنے زمانہ میں یگانۂ روزگار اور نادر عصر تھے ریاست درس و تدریس خصوصاً افتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ و شمالیہ دہلی اور امتحان مدارس و صدارت حکومت دیوانی کی آپ پر ہوئی۔ بجز شاہ دہلی کے تمام اعیان واکابر اور علماء و فضلائے شہر دہلی اور [illegible] آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے طلباء تو واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورت مہمات اور [illegible]

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی، سر سید، ص [illegible]

بغرض اصلاح انشاء اور شعرا واسطے مشاعرہ کے آتے تھے اس آخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوت حافظہ وحسن تحریر ومتانت تقریر اور فصاحت بیان اور بلاغت معانی کے صاحب مروت واخلاق اور احسان دیکھا نہیں گیا طلباء مدرسہ دارالبقا جو جامع مسجد کے نیچے تھا اکثر طعام ولباس اور بعضے ماہوار جناب سے پاتے اور آپ سے اور دیگر علماء سے تحصیل علم کرتے ۱۲۷۳ھ میں دہلی کے غدر میں آپ کو سخت زخم چشم پہنچا کہ تعلق روزگار بھی ہاتھ سے گیا اور تمام جائداد املاک بھی جو تیس سال کی ملازمت میں پیدا کی ہوئی تھی سرکار میں ضبط ہو گئی بلکہ جہاد کے فتویٰ کے اشتباہ میں چند ماہ تک نظر بند رہے چونکہ اصل میں بے قصور تھے آخر رہائی پاکر لاہور میں تشریف لاتے اور واسطے اپنے کتب خانہ مالیتی تین لاکھ روپیہ کہ دہلی کی لوٹ میں نیلام ہو گیا تھا حضور لارڈ لارنس صاحب کے پاس جو اس وقت پنجاب کے چیف کمشنر تھے اور مولانا ممدوح کے دہلی میں بڑے مہربان رہ چکے تھے مطالبہ کیا چونکہ جائداد منقولہ کے نیلام کا واپس ہونا متعذر تھا اس لیے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوئے لیکن اتنا ہو گیا کہ جائداد غیر منقولہ جو سرکار میں ضبط ہو گئی تھی واگذار ہو گئی اور مولانا موصوف دہلی میں واپس تشریف لے جاکر چندے بستی حضرت نظام الدین اولیا اور پھر اپنی حویلی خاص واقعہ دہلی میں خانہ نشین ہوتے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو وظائف وعبادت اور تدریس علوم دینیہ میں بسر کیا مولف حدائق ہذا بھی ۱۲۸۵ھ میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تیرہ ماہ تک ان کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی وعقلی کا استفادہ کرتا رہا اس وقت میں مولانا موصوف باوجودیکہ چوہتر سال کے تھے مگر ذوق شعر وسخن میں جواناں عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے عربی فارسی اردو نہایت عمدہ شعر کہتے تھے آزردہ تخلص تھا بمقتضائے اس کے ہمیشہ ذوق عشق اور ولولہ محبت سے آلودہ خاطر افسردہ طبع دیدہ گریاں سینہ بریاں رہتے تھے اور اشعار کے پڑھنے میں نہایت دلشگاف آواز اور لحن حزیں اور صورت دردانگیز رکھتے تھے جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کہ کیا انشاء شعر تھا یا ایجاد سحر غالب وصہبائی اور مومن وغیرہ شعراسے دہلی نے آپ کی مدح وتعریف میں بڑے بڑے قصائد واشعار تصنیف

کیے ہیں اور فضلائے زمانہ نے آپ کی تلمذ و شاگردی کو باعث تفاخر تصور کیا ہے بہت لوگ بلاد و امصار دور و دراز سے علوم متداولہ اور فنون مروجہ حاصل کرکے آپ کی خدمت میں آتے اور ایک دو سبق یا کوئی مختصر کتاب پڑھ کر فراغت حاصل کرتے اور محصلین اہل فضیلت میں شمار کیے جاتے تھے تصنیفات آپ نے بہت تھوڑی کی اور اکثر عمر اپنی تدریس و افتاء پر بسر کی رسالہ منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال اور دار المنضود فی حکم امرأۃ المفقود اور چند برگزیدہ تصنیفات آپ کی یادگار ہیں۔ آخر عمر میں ۱-۲ سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۸۱ سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے مولوی ظہور علی مخاطب بخمس الشعراء نے آپ کی تاریخ وفات حسب ذیل لکھی ہے۔

چو مولانائے صدر الدین کہ در عصر — امام اعظم آخر زماں بود
زہی صدر الصدور نیک محضر — بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت — کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست چہارم — وداع او سوئے دار الجنان بود
ظہیرا افسوس آں استاذ ذی قدر — پدر دارم ہمشہ مہرباں بود
چراغش ہست تاریخ ولادت — کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود

آپ نے رسالہ منتہی المقال میں ابن تیمیہ و ابن حزم پر جنہوں نے بحسب زعم خود بروئے حدیث لاتشد الرحال کے قبور انبیاء و اولیاء کی زیارت کے لیے سفر کو حرام لکھا ہے تقلید آیا۔ بہاعرت فقہائے و محدثین شافعیہ مثل ابن حجر مکی و تقی سبکی اور قسطلانی وغیرہ کے بڑی تشنیع کی ہے اور ان کے عقائد کی مذمت میں بعض تواریخ معتبرہ مثل بکری دلویری سے عمدہ عمدہ اقوال نقل کیے ہیں اور رسالہ مذکور کے دیباچہ میں اس کی تالیف کا سبب بھی منجملہ دیگر مطالب کے لکھا ہے۔[1]

بادشاہ سے عقیدت

صدر الصدور مفتی صدر الدین صاحب کو صدر الصدوری کی تنخواہ کے سرکار کمپنی کی سو روپیہ دیتی تھی اور بادشاہ سلامت کے خزانہ سے

---

(۱) حدائق الحنفیہ ص ۴۸۱

مفتی کے منصب کے ۵۰ روپیہ آٹھ آنے ملتے تھے وہ بھی محبوب علی خاں خواجہ نے وزیر ہو کر بند کر دیئے مفتی صاحب نے بادشاہ سلامت کے ہاں ڈھائی روپیہ کا مقدمہ دائر کیا اور باقاعدہ مقدمہ لڑ کر روپے جاری کرائے صاحب کمشنر دہلی نے مفتی صاحب سے کہا آپ کو ہماری سرکار ہزار روپیہ سے اوپر دیتی ہے۔ آپ نے ڈھائی روپیہ کے لیے اتنی کھیڈ کیوں اٹھائی مفتی صاحب نے کہا آپ کے ہزار بارہ سو روپے یہ ڈھائی بھاری ہیں یہ تبرک ہے اس پر ہمیں فخر ہے۔ (۱)

دیانت دار، انصاف پسند، نیک دل

۱۹ دسمبر ۱۸۵۵ء مولوی صدر الدین صاحب بہادر کے نذرانہ پیش کرتے وقت نواب گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے کہا آپ لوگوں کی دیانتداری انصاف پسندی۔ نیک نامی اور علم فراست سے بہت مسرور اور رضا مند ہیں۔ (۲)

زیارت رسول ﷺ

خان صاحب نے فرمایا۔ کہ میں اپنے بچپن کے زمانہ میں نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر اپنے پھوپھا کے ساتھ موجود تھا۔ اور وہاں مفتی صدر الدین خان اور مرزا غالب بھی موجود تھے مفتی صدر الدین خان صاحب نے مولوی محمد عمر جبات ابن جناب مولانا اسماعیل صاحب شہید کا ایک قصہ بیان فرمایا۔ اور فرمایا کہ یہ مشہور تھا کہ مولوی محمد عمر صاحب کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیارت ہوتی ہے۔ اس پر میں اور امام صاحب جامع مسجد اور دوسرے اشخاص نے اصرار کیا کہ ہم کو بھی زیارت کرا دیجئے مگر مولوی محمد عمر صاحب نے منظور نہ کیا۔ لیکن ہم نے اپنا اصرار برابر جاری رکھا ایک مرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع مسجد کے منبر پر تشریف فرما ہیں۔ اور مولوی محمد عمر صاحب آپ کو مور چھل جھل رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صدر الدین آؤ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لو۔ اور بعینہ یہ ہی خواب امام صاحب نے دیکھا۔ اور بعینہ اسی طرح ان دوسرے اشخاص

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص ۴۷

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۳۵

نے دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو میں امام صاحب کی طرف چلا۔ تاکہ اُن سے یہ خواب بیان کروں۔ اور وہ اپنا خواب بیان کرنے کے لیے میری طرف چلے اور وہ دوسرے اشخاص بھی ہماری طرف چلے۔ اتفاق سے راستہ میں ایک مقام پر ہم سب مل گئے۔ اور میں نے کہا میں تمہارے پاس جا رہا تھا۔ رات میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ ہم تمہارے پاس آ رہے تھے۔ ہم نے بھی بعینہٖ یہی خواب دیکھا ہے۔ اب ہم سب مل کر مولوی محمد عمر صاحب کے مکان پر آئے۔ تو اس وقت مولوی صاحب اپنے مکان کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ ہم نے ان سے یہ خواب بیان کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں ایسا نہیں ہوں۔ اور یہ کہتے ہوئے بھاگ گئے۔ (۱)

ذہانت و فراست

"جناب آزردہ۔ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک میں بھی اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھا دیا آپ اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے پیروی مقدمہ میں جواب دعویٰ یہ کیا۔ میں نے فتوے پر دستخط کیے مگر کچھ عبارت بھی لکھ دی ہے بالجبر لوگ پڑھتے ہیں۔ وہ یا لجبر میں نے لکھا ہے بے مفسدوں نے زبردستی مجھے لکھوایا تھا۔ کاغذات برآمد ہوئے تو پڑھا گیا۔ مفتی صاحب کے بیان کی تصدیق ہوئی اور چھوڑ دیئے گئے" (۲)

حکومت کے خیر خواہ

"مولانا مولوی صدرالدین خان ۳۵ سال سے انگریزوں کے ملازم تھے بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ اب ۲۱ سال سے دہلی کے صدرالصدور تھے۔ بڑے ایماندار حاکم تھے۔ اہلِ مقدمہ ہمیشہ ان کے انصاف سے خوش رہتے تھے۔ سرکار انگریزی کے بہت خیر خواہ تھے۔ جب غدر میں کچہریاں اور دفتر جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے۔ تو یہ بھی گھر میں بیٹھ رہے۔ پھر بادشاہ کے بلانے سے جبراً و قہراً قلعہ میں عدالت کا کام کرنے لگے۔ انگریزوں کے قتل

---

(۱) امیر آزردہ ارث ص ۱۱۱

(۲) گل رعنا ، حکیم عبدالحی

کے فتوے پر انہوں نے بھی باغیوں کے جبر سے مہر لگادی۔ جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو یہ بھی اسی جرم میں گرفتار ہوگئے۔ لیکن پہلے چونکہ بڑی نیک نامی اور دیانت داری سے حکومت کر چکے تھے۔ لہذا سابقہ کارگزاریوں کے باعث چند ماہ نظر بند رہ کر رہا ہوگئے۔ پھر درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ایک مختصر مکان دہیں لے کر رہنے لگے۔ (۱)

آزردہ کی عقیدت شاہ عبدالغنی سے

خان صاحب نے فرمایا۔ کہ یہ قصہ بھی مولانا گنگو ہی بیان فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں کئی دن کا فاقہ ہوا۔ اس کا تذکرہ ان کی ماں نے کہیں کر دیا۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدر الدین خاں صاحب کو بھی ہوگئی۔ مولوی صاحب نے تین سو روپیہ شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیئے۔ شاہ صاحب نے واپس کر دیئے۔ اس پر مفتی صاحب وہ روپیہ لے کر خود حاضر ہوئے۔ اور تخلیہ میں روپے پیش کیے۔ اور فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور رشوت لیتا ہوگا اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا۔ بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں آپ ان کو قبول فرمالیجیے۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ کہ مجھے تو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ تم رشوت لیتے ہوگے۔ میں تمہاری نوکری کو بھی اچھا نہیں سمجھتا اور اس لیے میں ان کے لینے سے معذور ہوں۔

خان صاحب نے فرمایا۔ کہ ایک مرتبہ مفتی صدر الدین خان صاحب نے شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں سے کچھ کتابیں مستعار منگائیں۔ شاہ صاحب نے بھیج دیں۔ جلدیں شکستہ تھیں۔ مفتی صاحب نے واپسی کے وقت نئی جلدیں بندھوا کر واپس فرمادیں۔ جب شاہ صاحب کے پاس کتابیں پہنچیں۔ شاہ صاحب نے جلدیں توڑ کر مفتی صاحب کے پاس واپس فرمادیں۔ اور کہلا بھیجا کہ ہمارے وہی پرانے پٹھے بھیج دو۔ (۲)

صدر الصدور کی شہادت

جناب مفتی محمد صدر الدین خاں بہادر صدر الصدور دہلی نے بوجہ ازراہ نیامنی و ترغیب طلبہ عرصہ چار سال سے ایک تمغہ مدرسہ عربی

---

(۱) نصرت نامۂ گورنمنٹ، صد ۵۶

(۲) امیر الروایات صد ۱۲۱

فارسی جواب مضمون پر مرحمت فرمایا اس پر دہلی اردو اخبار نے ان کی تعریف کی ہے کہتا ہے کہ ہم نہایت درست درست اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ حقیقت میں ہمارے صدر الصدور کی ذات جمع الصفات بھی نہایت ارفع ہے یکتائے روزگار ہے اس حکومت اور ریاست وعظمت وفضل اللہ ولی پر یہ حسن اخلاق اور پاس صفت و قدر علمیت جو کہ نتیجہ کمال علم کا ہے اس زمانہ میں بہت کم ہے ہمارے ہندوستانی صاحبوں میں ایسا جامع کمالات مفقود پایا جاتا ہے [1]۔

کمال علم و ذوق شعر

مولانا ابو الکلام کی روایت: —

والد مرحوم کے نانا مولانا رکن الدین رکن المدرسین اور مولانا رشید الدین مفتی صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ زمانہ دہلی کے محاصرہ اور انگریزوں اور مرہٹوں کی لڑائی کا تھا لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں سندھیا اور ہولکر کی فوج کو دہلی کے سامنے آخری شکست دی۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۰۱ء کا زمانہ ہوگا۔ تحصیل علم کے شوق اور شاہ عبدالعزیز کی شاگردی کے شوق نے مولانا منور الدین کو گھر سے نکالا۔ بزرگوں اور عزیزوں پر جدائی شاق تھی۔ اس لیے سفر کے روادار نہ تھے مجبوراً بغیر کسی کو خبر دیئے پوشیدہ طور پر نکل کھڑے ہوئے۔ اور قصور سے دہلی تک کا سفر پا پیادہ کیا۔ دہلی کے حوالی میں کئی جگہ گرفتار ہوتے ہوتے بچے۔ ایک مقام پر ایک گوجر کی خدمت کر کے اس کو اپنا حامی بنا لیا۔ دہلی پہنچے تو شاہ صاحب کے درس میں مفتی صدر الدین اور منشی رشید الدین شامل ہو چکے تھے۔ یہ بھی شامل ہو گئے۔ شاہ صاحب نے ایک عربی مکتوب میں۔ اس عہد کے معرکہ کا حال بیان کیا ہے۔ انگریزوں کی فوج کو مشرقی فوج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ پورب ان کا مرکز تھا۔ مشرقی فوج کے سردار کی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ اس کا نام ہندی میں تیر کا مفہوم رکھتا ہے۔ یعنی لیک بہرحال مفتی صاحب کیونکہ مولانا کے ہم درس رہے تھے۔ اس لیے دونوں میں برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے دہلی پہنچنے کے بعد انھوں نے دہلی میں شادی کر لی۔ اور مقیم ہو گئے۔ اس معاملہ میں بھی مفتی صاحب کے

---

(۱) دہلی اردو اخبار ۲۲ دسمبر ۱۸۵۲ء

ایما و مشورے کو دخل تھا۔ والد مرحوم نے مفتی صاحب سے بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے فضل و کمال و جامعیت کے بے حد معترف تھے۔ فرماتے تھے ان کا سلوک مجھ سے ایسا تھا جیسا اپنے خاص عزیزوں سے ہوتا ہے عید کے دن ہمارے ہاں آتے تو جس طرح اپنے عزیزوں کو بطور عیدی کے کچھ دیا کرتے تھے ایک اشرفی میرے لیے بھی ضرور لاتے۔ نانا مرحوم فرماتے یہ اشرفیاں بطور متبرک رکھو۔

فضل و کمال علمی کے ساتھ ادب و شعر کا ذوق بھی تینوں زبانوں میں تھا۔ عربی۔ فارسی اردو تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ ان کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے۔ مگر جتنا ہے انتخاب ہے اور پایہ بلند کے شایاں ہے۔ والد مرحوم ایک مشاعرہ کا حال سناتے تھے۔ جس میں ان کی غزل نے تمام اکابر کا رنگ پھیکا کر دیا تھا۔

دور نہیں، منظور نہیں مصرع طرح تھا۔

دامن اس کا تو بہت دور ہے اے دست جنوں	کیوں ہے بیکار گریباں میرا تو دور نہیں

یہ شعر بھی جو ہمیشہ میری زبان پر رہتا ہے۔ انہی کا ہے۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی	کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

والد مرحوم اپنے چچا کا جنہوں نے مدینہ منورہ میں انتقال کیا۔ جب کبھی ذکر کرتے تھے۔ مفتی صاحب کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

آزردہ مر کے کوچہ جاناں میں رہ گئے	دی تھی دعا کس نے کہ جنت میں گھر ملے

والد مرحوم فرماتے تھے کہ ادب عربی کا ذوق	ان سے بڑھ کر میں نے وقت کے کسی فاضل میں نہیں پایا۔ حماسہ کے سینکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ متنبی کا درس دہلی میں سب سے پہلے انہوں نے ہی دیا۔ ورنہ اس کا کلام درس کی چیزوں میں شامل نہ تھا۔ انہوں نے متنبی کی ایک شرح بھی لکھی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کی مصنفات غدر میں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک عربی رسالہ "لا تشد الرحال" کے متعلق میری نظر سے گذرا اور ایک تحریر مسئلہ امتناع نظیر پر ہے۔ (۱)

---

(۱) غالب، غلام رسول مہر، ص ۲۸۲

آزردہ کی نثر کا نمونہ

والد کا نام مولوی لطف اللہ کشمیری۔ مفتی صاحب دہلی میں ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۸۹ء پیدا ہوئے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبدالقادر، مولانا محمد اسحاق، مولانا فضل امام خیرآبادی، مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے مشاہیر علماء سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ غدر سے پہلے انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور اور مفتی تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کے فتوے کا الزام لگایا گیا۔ گرفتاری اور جائداد کی ضبطی عمل میں آئی۔ لیکن چند روز بعد رہا کر دیئے گئے۔ اور جائداد کا حصہ بھی واپس کر دیا گیا۔ تعلیم و تدریس کا اس قدر شوق تھا کہ "صدر الصدور" ہونے کی حالت میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کے شاگردوں میں نواب یوسف علی خاں والی ریاست رام پور، سر سید احمد خان، نواب صدیق حسن خان بھوپالی بھی شامل ہیں۔ عربی و فارسی کی چند تالیفات اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبان میں شعر کہتے۔ آزردہ تخلص تھا۔ اردو میں شاہ نصیر، میر ممنون اور میاں مجرم اکبرآبادی سے مشورہ کیا۔ اردو کے شاعروں کا تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا لیکن اب نایاب ہے۔ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔ مرزا غالب، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے خاص تعلقات تھے اور ان صاحبوں سے اردو میں خط و کتابت رکھتے تھے۔ اردو کی بھی تحریریں مفتی صاحب کی یادگار ہیں۔

"نامہ آزردہ بنام نواب مصطفیٰ خان شیفتہ"

"شکر ہے اس پروردگار عالم کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کہ ہمہ تن اس میں غرقاب تھا نکالا۔ کیسے علائق میں جگر بند تھا کہ نکلنا اس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدمات اصلی کا فیصل کرنا منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کہ وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتویٰ دینا، کیٹیوں میں حاضر ہونا، طلبۂ مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا کاغذوں پر دستخط کرنا، پھر گھر آکر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، ولا بیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے سے تنگ ہونا، مجالس

شادی و غمی اور اعراس میں جانا شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا

ترجمہ حدائق البلاغت کا مختصر نمونہ ہے۔

صنعت تلمیح۔ یہ اس طرح پر ہے کہ کلام شعر ہو کسی واقعہ مشہورہ پر یا ایسی چیز پر اشارہ کیا جائے کہ کتب متعمدہ میں مذکور ہو جیسے شعر سوداؔ کا

دکھلائیے جا کر جو تجھے مصر کا بازار
پر وان کوئی خواہاں نہیں اس جنس گراں کا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف قصہ حضرت یوسف کے کہ وہ مشہور ہے اور یہ شعر فقیر محمد خاں گویاؔ کا ہے

منہ دکھاتا تو کہاں بائیں تھیں اس کی مجھ تک
لن ترانی کی بھی آئی نہ صدا میرے بعد

اس شعر میں حضرت موسےٰ کے قصہ کی طرف اشارہ ہے حق یہ ہے کہ جو لوگ چاشنی الفاظ اور مذاق بہرہ رکھتے ہیں ان کے نزدیک یہ شعر جواب نہیں رکھتا جیسے یہ شعر

خزاں میں اس لیے لوٹے ہے خاک پر غنچہ
کہ یہ علاج ہے اس کا جسے ہو استسقا

اس شعر میں اشارہ ہے طرف مسئلہ طب کے۔

یہ ترجمہ پہلی مرتبہ حدائق البلاغت کے حاشیہ پر دسمبر ۱۸۷۸ء میں مطبع نولکشور واقع شہر کانپور سے شائع ہوا[1]

---

[1] مرزا غالبؔ کو یہ شعر بہت پسند تھا لیکن وہ اس طرح پڑھا کرتے تھے۔

دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

(۲) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۲۶۴

مفتی صاحب کا مکان

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان ہے۔ مکان کوٹھی کے نمونہ کا ہے انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے اس میں مختصر سی نہر ہے سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن چبوترا ہے چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے اُن پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوتے تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی ہوگی۔ گدانہ جسم، سانولا رنگ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی داڑھی، بہت سیدھی سادھی وضع کے آدمی ہیں ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ بدن میں سپید ایک بر کا پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی عمامہ[1]

آزردہ کی شاعری

آزردہ گنجینۂ علم و کانِ حلم و بحرِ سخا مخزنِ لطف وجود و عطا لبید دوراں، حسّان ہندوستان، عاملِ کامل، فاضلِ اجل، فقیہ بے مثل، عالم باعمل، مدح جس ان کی جو لکھوں سو کم ہے۔ کیونکہ وہ ایسا ہی عالم ہے۔ ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ان کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی ان کے کہ یہ کتاب رونق نہ پاوے گی۔ اور پسند احباب نہ ہوگی۔ کیونکہ اس زمانہ کے شعرائے اردو گویوں میں وہ مثل شہنشاہ کے ہیں۔[2] [3]

---

[1] پرانے زمانہ میں شرفاء گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گذرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا عالم ہوتے تو درس کا حلقہ، شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا رہتا تھا غرض کوئی وقت بیکار نہ گذرتا، خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر چپکے کو بہت لیے دیئے رہتے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دو زانو مؤدب بیٹھا ہے بے ضرورت نہ بات کی جاتی نہ جواب دیا جاتا ہے کوئی ہنسی کی بات ہوتی ذرا مسکرا دیئے کھل کھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔ ——— دلی کی آخری شمع صـ [2] تذکرہ کریم الدین ص ۴۲۴ اس کے علاوہ ملاحظہ ہو سخن شعراء (نولکشور) از نساخ صـ ۲۳ ۔ [3] کلاسکی ادب صـ

نمونہ غزلیات فارسی :

روز ہجران تو می سوخت مرا حسرت وصل
در شب وصل تو اندیشہ و ہجرانم سوخت
ہیچ گہ چرخ جفا پیشہ نمی ساخت بہ من
شکر ایزد کہ ز آہ شرر افشانم سوخت
زحمت از بہر عذابم مکش اے نار جحیم
کہ سراپاتے مرا خجلت عصیانم سوخت
برگ و جمعیت دیوان جزا برہم خورد
جنت از حسن تو و دوزخ از افغانم سوخت
دل پر درد مجوں ناب لے گشت مرا
آنکہ یک عمر بہ او ساختہ ام آنم سوخت
ہر نگہ کاں بت ترسا بچہ در کارم کرد
آتش بود کزو خرمن ایمانم سوخت
کو نسیمی کہ ز یثرب وزد و سبز کند
خارست از ہند سوے کہ گلستانم سوخت
گر ز آتش سخنی ہیچ کالم نہ فروز
لیکن آزردہ از د جان حسو داتم سوخت

نمونہ غزل ریختہ : اے بلبلاں شعلہ دم ایک نالہ اور بھی
گم کردہ راہ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
اٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا
طاعت قبول خاطر پیر مغاں نہیں

اُس بزم میں نہیں کوئی آگاہ ورنہ کب
یاں خندہ زیرِ لب او ہر اشک نہاں نہیں
افسردہ دل نہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
کیا کچھ نہ کر دکھاؤں پر اک دن کے واسطے
ملتا بھی ہم کو منصبِ ہفت آسماں نہیں
نازو نگہ روش سبھی لاگو ہیں جان کے
ہے کون ادا وہ تیری کہ جو جاں ستاں نہیں
وہ شاخِ نخلِ خشک ہوں میں کنجِ باغ میں
دیکھے ہے بھول کر بھی جسے باغباں نہیں
ملنا یہ تیرا غیر سے ہو بہرِ مصلحت
ہم کو تو سادگی سے تیری یہ گماں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف تر کہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

ولہ

ذکرِ وفا وہ سنتے ہی مجلس سے اُٹھ گئے
کچھ گفتگو ہی ٹھیک نہ تھی ایسے باب میں
کیا عقلِ محتسب کی ہے لایا ہے کھینچ کر
سودا زدوں کو محکمۂ احتساب میں
بے اعتدالیاں مری ظرفِ تنک سے ہیں
تھا نقص کچھ نہ جوہرِ صہبائے ناب میں

تحقیق ہو تو جانو کہ میں کیا ہوں قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں
میں اور ذوق بادہ کشی ؟ لے گئیں مجھے
یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں
یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم
حضرت یہ باتیں پھبتی ہیں عہد شباب میں

دور ابتلا جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دے دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ لاہور گئے فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں کرایہ پر معاش کا دار و مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گذارے کو کافی ہے۔ کس واسطے کہ ایک آپ ایک بی بی تیس چالیس روپیہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عزیز ہے۔ اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہٰذا فراغ بالی سے نہیں گذرتی۔ ضعف پیری نے گھیر لیا ہے۔ (۱)

آزردہ کا غیر مطبوعہ خط آزردہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کو ایک خط لکھا ہے۔ جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔

" شکر الطاف والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیہ عطا فرمائے۔ میں ایک عرصہ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ چنانچہ جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ

---

(۱) غالب کا روزنامچہ صفحہ ۲۸

اس شدت سے ہوتی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجۂ ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمٰن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے۔ اور نہایت لئیق وسعادتمند اور نیک چلن ہے۔ ان دونوں کو آپ کے سپرد کیے جاتا ہوں۔ اگر ناگوار خاطر عاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبرگیری فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسن سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والاکرام آپ کو عمر خضری اور دانش فلاطونی اور اقبال سکندری عطا فرماتے۔

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۸۶۸ء مطابق بست و سوم ربیع الاول ۱۲۸۵ھ نیاز نامۂ محمد صدرالدین خاں صدر الصدور سابق دہلی[1]۔ پتہ پر لکھا ہے۔

بسیار ضرورت زود تر برسد مہر محمد صدر الدین خاں[2]

غالب اور آزردہ کی دوستی

خواجہ حالی نے ان کی فراخ حوصلگی کے دو واقعہ لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد ان کو لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع ہمہ رقوم جواہر کے ملا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام کے لیے آئے غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا۔ چنانچہ چپراسیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھا دیا گیا۔ اور خلعت مع رقوم بغرض فروخت بازار بھیج دیا گیا۔ بازار سے قیمت آئی تو چپراسیوں کو انعام دے کر رخصت کیا۔

---

[1] لاڈو بیگم نام تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام لاڈو بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے۔ جس میں انھوں نے آزردہ کے کتب خانہ کی فہرست بھی فارسی میں بھیجی ہے۔

[2] دارالانشا سرکار دولتمدار رام پور مثل نمبر ۵۶ ، صیغہ دست آشنایان۔ اس کے بعد دو سو روپے لاڈو بیگم کے مقرر کر دیئے گئے۔   [3] کلاسکی ادب صفحہ ۸۲

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ایک امیر دوست، جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہوگئی تھی چھینٹ کا فرغل پہنے ملنے کے لیے آتے۔ غالب نے ان کو کبھی مالیدہ یا جامہ دار کے چغوں کے سوا نہ دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھر آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن دوست کی خودداری کا خیال ملحوظ رکھتے ہوئے سلوک ایسے طریق پر کرنا چاہتے تھے کہ اسے بیچارگی کا احساس نہ ہو۔ اور پیش کردہ ہدیہ کے قبول میں عار نہ آئے۔ غرض غالب نے چھینٹ کے فرغل کی بے حد تعریف کی۔ پوچھا کہ یہ کہاں سے لی ہے۔ اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی کا فرغل بنوا دیجئے۔ دوست نے بے تکلف کہا کہ اگر آپ کو یہ پسند ہے تو یہی فرغل لے لیجیے۔ غالب نے کہا جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ابھی چھین لوں۔ لیکن جاڑا شدت سے بڑھ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیے گا اس کے ساتھ ہی مالیدے کا اپنا نیا چغہ ان کو پہنا دیا۔ ایک نازک دل اور نازک احساسات والے شاعر کی شان دوست داری کا تقاضہ یہی تھا۔

حضرت مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں۔ کہ یہ مفتی صدرالدین آزردہ کا واقعہ ہے خواجہ حالی کہتے تھے۔ کہ میں نے نام لکھنا پسند نہ کیا۔ کہ شاید ان کے عزیزوں پر گراں گذرے (۱)

غالب نے آزردہ کی مخالفت کی

طرفہ لطیفہ ہے کہ غالب نے آزردہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھر ان سے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انہوں نے میرو مخدوم و مطاع اور والی و مولا سب ہی کچھ کہا تھا، نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے۔ جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کرکے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابل اعتراض ہی نہیں، عبرت انگیز بھی ہے۔ ہم وہ غیر مطبوعہ خط بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

"حضرت ولی نعمت آیہ رحمت، سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے

---

(۱) غالب د غلام رسول مہر) صفحہ ۳۴۵

کو حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدرالدین کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جلیا کہ مرزا جلال اسیر کہتا ہے ۔

ع   جرعۂ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گذرے یا نہ گذرے اس خط میں میں نے زوجہ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے۔ کہ وہ لاولد ہے۔ اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ ابن الرحمٰن اس کا بھانجہ ہے۔ مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماس ہیں آپ سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے۔ دوسری یہ کہ حسین علی خاں کی شادی آپ کی بخشش خاص سے ہو جائے۔ اور یہ سو روپیہ جو مہینہ جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار پائے۔ یہ دونوں خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔ ـــــــ

تم سلامت رہو قیامت تک ـ دولت و عز و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال عرض داشت دولت خواہ اسد اللہ (۱) لفافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے)

گلستان سخن میں لکھا ہے " ہر کمال کا مرجع آزردہ کی ذات ہے۔ اور ہر فضیلت کا منبع اسی کی طبیعت سرسیّد نے ان کا ذکر اس شعر سے شروع کیا ہے

ہزار بار بشوئم دہن زمشک و گلاب   ھنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست (۲)

---

(۱) دار انشا سرکار دولت مدار رام پور مثل نمبر ۲۲۳ صیغہ دوست آشنایاں کلاسکی ادب ص۸۵

(۲) کلاسکی ادب دخواجہ احمد فاروقی ص۱۹

آزردہ کا ایک اور خط

اگر خدام والا مقام از راہ سرداری و قدر شناسی ارباب کمال کچھ وظیفہ مقررہ برائے چندے کے جس سے گذارہ اوقات طلبہ علوم و عزیزاں ہووے مقرر فرمادیں تو باعث نیک نامی کا دنیا میں موجب اجر عظیم کا آخرت میں ہوگا۔

ع باکریماں کارہا دشوار نیست

و نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاکسار آفتاب لب بام ہے۔ غایت سے غایت اجرا اس وظیفے کا چھ مہینے سے زیادہ نہ کیجئے گا۔ یقین ہے کہ آپ جیسے سردار باہمت سے واسطے مجھ جیسے ترقی خواہ قدیم کے اور پھر ایسے امر خیر میں کہ وہ بھی برائے چند روز ہے۔ توجہ دریغ نہ ہوگی اور یہ بھی واضح ہووے کہ باوجودیکہ نواب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں بہادر مرحوم کو قدیم الایام سے ایک اخلاص اور اعتقاد خاکسار سے تھا۔ بار بار چاہا کہ کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ شاید مولوی مفتی محمد سعد اللہ صاحب بھی اس سے واقف ہوں۔ الا تکلیف وہ ان کا نہ ہوا۔ اب توقع ہے کہ اس مصرع پر عمل ہووے۔

ع اگر پدر نتواند پسر تمام کند

امید ہے کہ جواب بصواب سے بزودی مقرر فرمائے۔ اور اس ترقی خواہ کو مدام ترقی خواہ قدیمی اپنا جان کر ہمیشہ بہ ارسال مژدہ مزاج مبارک مسرور و خوش وقت فرماتے رہیے۔ ایام حشمت و دولت مدام رہے۔

الراقم آثم (مہر) محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی۔ مرقوم ۱۲ ماہ جنوری ۱۸۶۶ء مطابق ۲۹ ماہ شعبان ۱۲۸۲ھ مقدسہ[1] ۔[2]

---

[1] اس درخواست کا نتیجہ یہ ہوا کہ مبلغ ڈیڑھ سو روپے ماہوار مقرر کر دیئے گئے)

[2] کلاسکی ادب (خواجہ احمد فاروقی)

شاگرد نواب صدیق حسن خاں - نواب یوسف علی خاں رامپوری - سرسید احمد خاں - مولوی ذوالفقار علی دیوبندی - مولوی فیض الحسن[1] مولوی حکیم محمد الحسن امروہوی - مولوی احمد حسن مرادابادی مولانا سید نواب علی سے[2]

وفات اکیاسی برس کی عمر پاکر ۱۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کو فالج گرا کچھ عرصہ علیل رہ کر ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو راہی ملک بقا ہوئے - درگاہ حضرت چراغ دہلی میں دفن ہوئے -

---

(۱) داستان تاریخ اردو ص۴۳

(۲) نقش سلیمانی - تذکرۃ الکرام ص۳۸۹

(۱۴)

میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی

۱۲۲۰ - ۱۳۲۰ھ

۱۸۰۵ - ۱۹۰۲ء

آپ سورج گڑھ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے، اور ماں باپ دونوں کی طرف سے سید تھے، آپ کے والد کا نام سید جواد علی تھا، آپ کے بزرگ اورنگ زیب کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور تھے، جب مولانا سید احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل پٹنہ تشریف لے گئے، تو آپ وہاں موجود تھے، کچھ دنوں الہ آباد میں رہ کر علم حاصل کیا، بالآخر ۱۲۴۲ھ میں دہلی تشریف لائے، پنجابی کٹڑہ کی اورنگ آبادی مسجد میں رہا کرتے تھے، اور مولوی عبدالخالق سے، جو مولانا شاہ اسحاق کے ارشد تلامذہ سے تھے، چند کتب عربی کی پڑھیں، اس طرح مولانا شاہ عبدالقادر، اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحبان بن شاہ ولی اللہ صاحب سے پڑھا، جب آپ نے تحصیل علوم سے فراغ حاصل کیا، تو مولوی عبدالخالق صاحب کے اس قدر منظور نظر ٹھہرے، کہ انہوں نے ۱۲۴۶ھ میں اپنی صاحبزادی کا نکاح آپ سے کر دیا، اس کے بعد آپ نے، مولانا شاہ محمد اسحاق علیہ الرحمہ سے حدیث و تفسیر پڑھی، اور تیرہ برس آپ کی خدمت میں رہ کر بہت سے فیوض و برکات حاصل کیے، غرض آپ ایسے مرتبہ کمال کو پہنچ گئے، کہ اپنے استاد علام کے سامنے فتوے دیتے اور فیصلے کرتے تھے۔

ماہ شوال ۱۲۵۸ھ میں، حضرت شاہ محمد اسحاق نے آپ کو اجازت علوم حدیث وغیرہ سے مسند فرما کر مستند بالوقت کر دیا، اور ہجرت کے وقت آپ کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر فرمایا،

فقہ و حدیث میں مہارت "مولوی نذیر حسین بہت صاحب استعداد ہیں خصوصاً فقہ

عضاضۂ فقہ میں ایسی استعداد بہم پہنچائی ہے کہ اپنے نظائر و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں، روایت ... میں آج بے نظیر ہیں، باوجود اس کمال اور استعداد کے خاکساری اور حلم گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، بہ اعتبار سن کے جوان، اور باعتبار طبیعت علم اور وضع متین کے پیر ——! (۱)"

۱۲۵۱ھ تک آپ کو فقہ وغیرہ تمام علوم و فنون سے ایک خاص مذاق اور لگاؤ تھا، لیکن اس کے بعد قرآن اور حدیث کے درس و تدریس کی محبت آپ پر ایسی غالب ہوئی کہ آپ اس کے مصداق ہو گئے ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنم ! !

سارے ہندوستان، نیز ہندوستان کے باہر بھی یمن، نجد، تیونس، اندلس، افغانستان کشمیر، خراسان کا شتر، برما، چین، جاوا تک آپ کے شاگرد پھیلے پڑے ہیں۔

عرصے سے آپ کا یہ معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ قرآن شریف کے دو تین رکوع روزانہ سب کو پڑھایا کرتے تھے، اس کے بعد حدیث شریف کا درس ہوتا تھا، دس بجے آپ مسجد سے سید سے اپنی صاحبزادی کے گھر تشریف لاتے، اور تخت پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے۔ کثرت اشتغال علم حدیث، اور جواب استفتا وغیرہ سے آپ کو تالیف و تصنیف کی زیادہ فرصت نہ ملی۔ صرف ضرورت وقت کے لحاظ سے آپ نے چند رسالے لکھے ہیں۔

۱ ۔ معیار الحق
۲ ۔ واقعۃ الفتوی
۳ ۔ واقعہ
۴ ۔ ثبوت الحق الحقیق

۱؎ آثار الصنادید (سر سید احمد خاں)

۵ - فلاح الاولی باتباع النبی ؐ

۶ - ابطال عمل المولد

نیز ایک رسالہ عورتوں کے زلورات کے بیان میں، البتہ اگر آپ کے فتاوے جمع کئے جائیں، تو اس قدر ہیں کہ کئی جلدوں میں بھی نہ سمائیں،

بزرگان دین کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ ان پر کفر کا فتویٰ ہو جاتے، یہ سلوک بھی آپ کے ساتھ ہو چکا، سنہ ۱۳۰۰ھ میں جب آپ حج کو تشریف لے گئے، تو وہاں بہت کچھ اودھم مچی، مگر آپ اس آزمائش میں بھی پورے اترے،

سارے شہر میں " میاں صاحب " کے پیارے نام سے پکارے جاتے تھے، لباس بالکل سادہ تھا اکثر لنگی اوڑھے رہتے تھے شہر میں پا پیادہ پھرتے تھے، مگر سبحان اللہ کیا خداداد عزت تھی کہ جدھر سے گذر جاتے تھے، لوگ کھڑے ہو جاتے تھے،

آپ کے ایک ہی صاحبزادے تھے، مولوی سید شریف حسین، جو علم و فضل اور تقویٰ میں باپ کے قدم بر قدم تھے، اور درس و تدریس کا سارا بار خود اٹھاتے ہوتے تھے، وہ باپ کی حیات میں قضا کر گئے، دو صاحبزادے چھوٹے مولوی عبدالسلام اور مولوی ابوالحسن،

بجز کبر سنی کے کوئی خاص مرض نہ تھا، پلنگ پر لیٹے رہتے تھے اور ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی، ہر وقت بے خودی اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا، نماز کے وقت خود ہشیار ہو جاتے تھے، اٹھا کر سہارا دے کر بیٹھا دیا، نماز پڑھ لی، پھر سکون کی حالت ہو جاتی تھی، یہی حال تسبیح و تہلیل کا تھا، اگر تسبیح ہاتھ سے چھٹ گئی تو بس بے چین ہو گئے، پھر دے دی پڑھنے لگے،

۱۰ رجب (۱۳ اکتوبر) روز دوشنبہ، مطابق ۱۹۰۲ء/۱۳۲۰ھ کو انتقال فرمایا، اور شیدی پورے کے قبرستان میں دفن ہوئے - (۱)

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم از بشیر الدین احمد صفحہ ۲۶

سرسیّد کی تحریر سرسیّد میاں صاحب کے ذکر میں فرماتے ہیں :—

زبدۂ اہل کمال، اسوۂ ارباب فضل افضال، مولوی سیّد نذیر حسین صاحب بہت صاحب استعداد ہیں، خصوصاً فقہ میں ایسی استعداد کامل بہم پہنچائی ہے کہ اپنے لطائف و اقران سے گوئے سبقت لے گئے ہیں روایت کتب میں آج بے نظیر ہیں باوجود اس کمال اور اس استعداد کے مزاج میں خاکساری اور حلم گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، باعتبار سن کے جوان اور باعتبار طبیعت حلیم اور وضع متین کے پیر۔ (۱)

خدمات غدر " مولوی محمد نذیر حسین صاحب اور مولوی عبدالرب صاحب اور مولوی حفیظ اللہ خاں صاحب نے غدر میں ایک دو میموں اور بچوں کو اپنے گھر میں چھپایا تھا۔ اس صلے میں انگریزوں نے ان کو انعام دیا۔ اور ان کی خیر خواہی کی قدر کی۔ (۲)

لہ تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صہ ۸۳

لہ نصرت نامہ گورنمنٹ صہ ۶۵

(۱۵)

شاہ محمد مخصوص اللہ

(بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ)

متوفی ۱۲۷۳ھ = ۱۸۵۷ء

(بروایت نواب خواجہ مصلح الدین احمد بن خواجہ شرف الدین احمد (کوچہ پیلان دہلی)

مقدس بزرگ زاہد و عابد شب زندہ دار تدریس و تعلیم کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا اور یہ بزم روشن الدولہ کی مسجد (واقعہ قاضی واڑہ) میں منعقد تھی عامل آمین و رفع الیدین تھے، سرسید احمد خاں مرحوم آپ کے شاگردوں سے تھے، اور اسی وجہ سے وہ آخر تک ان سنتوں کے عامل رہے، خاندان مغلیہ کی شہزادیاں حویلی پر تشریف لانے کی زحمت دیتیں، مکلف کھانوں کے خوان خدمت عالی میں پیش ہوتے جن پر آپ دعا پڑھتے اور مساکین کو بانٹ دیتے طلباء اعتراض کرتے تو آپ فرماتے میں اس طعام کو متوفی کی تملیک کر دیتا ہوں پھر اعتراض ہوتا تو فرماتے میاں اس بہانے سے مساکین کو کھانا مل جاتا ہے مدرسہ میں بھی کھانوں کے خوان آتے اور اسی طرح لٹا دیئے جاتے اپنی بسر اوقات اس موضع کی آمدنی پر تھی جو غازی عالمگیر مرحوم نے آپ کے مورث اعلیٰ (شاہ عبدالرحیم علیہ الرحمۃ) کے نذر کیا تھا اور جو اب تک اہل اللہ (ابن شاہ عبدالرحیم) کے ورثہ کے قبضہ میں ہے۔

شاہ محمد مخصوص اللہ کی ایک صاحبزادی امۃ الغفار تھیں صحاح ستہ پڑھی ہوئی تھیں، بڑی زاہدہ اللّٰہم اغفرلہا ولابیہا۔ (۱)

اس کے بعد آپ کا وہ ترجمہ لکھا جاتا ہے جو صاحب "حیات ولی" نے قلمبند فرمایا۔

۱؎ تراجم علمائے اہل حدیث ہند ص ۱۱۴

"تمام علوم کی تحصیل اپنے عم بزرگوار جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں کی اور چند ہی دنوں میں اپنے ہمعصروں سے گوئے سبقت لے گئے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک زمانہ تک تدریس طلبہ میں مصروف رہے اور اوقات گرامی علوم دینی و فنون یقینی کی ترویج میں خرچ کرتے رہے چونکہ ۲۰ - ۲۵ سال تک برابر مولانا صاحب کی خدمت میں قرأت کلام الٰہی اور حدیث رسالت پناہی کرتے رہے اور آپ کی تقاریر سے گوش و ہوش کا ذخیرہ فرماتے رہے اس لیے آپ نے حدیث و تفسیر میں وہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ ان دونوں فنون کے جو بیش قیمت اور انمول جواہر آپ کے خزانہ سینہ میں تھے، وہ اور کہیں نہ پائے جاتے تھے، علاوہ حدیث و تفسیر کے فقہ و عقائد کلام اصول وغیرہ میں مجتہدانہ کمال رکھتے تھے اور ان علوم کو عروج کمال تک پہنچا دیا تھا اور چونکہ آپ کی طبیعت زیادہ تر عبادت دوست اور مزاج زہادت پرست واقع ہوئی تھی اس لیے آخر عمر میں سررشتہ تدریس ہاتھ سے دے کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور ہمیشہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے آپ کے اوقات اس درجہ مجموعہ تھے کہ شاید سلف صالحین کے زمرہ میں اولیائے کرام کے اوقات ایسے ہوں گے اور چونکہ آپ کی ساری ہمت عبادت الٰہی اور تقویٰ شعاری میں مصروف تھی لہٰذا نظم عربی اور انشا پردازی کی طرف میلان طبع نہ تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کا کوئی کلام باوجود تحقیقات کے مجھے دستیاب نہ ہوا [1]

امیرالمومنین سید احمد بریلوی سے بیعت تھے آخر عمر میں دماغ ماؤف ہوگیا تھا۔

تلامذہ مولوی عبدالرشید برادر شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی [2]

---

[1] حیاتِ ولی ص ۳۴۹

[2] تراجم علمائے اہل حدیث حصہ اول، ص ۱۱۵

(۱۹)

شاہ محمدؒ یعقوب مہاجر مکی

متوفی ۲۷ ذیقعد ۱۲۸۳ھ = ۲ اپریل ۱۸۶۷ء

شاہ محمدؒ اسحاق صاحب مہاجر کے چھوٹے بھائی ہیں علم و فضل میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے، اور خلق جمیل صفات جزیل قناعت استغنا میں آپ کی مثال ہزار تلاش کے بعد بھی نہیں ملتی اکثر لوگ آپ کے پاس ہدایا اور تحفے لے کر حاضر ہوتے لیکن آپ کسی چیز کو نگاہ قبول سے نہ دیکھتے تھے[۱] بلکہ جو سرمایہ آپ پاس رکھتے تھے اُس ہی قوت لبسری کرتے آپ نے بھی اپنے برادر عزیز کے ساتھ ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ میں توطن اختیار کر لیا اور انجام کار وہیں رحلت فرمائی[۲] السید احمد (امیرالمومنین) کی بیعت سے مشرف تھے جب تک دہلی مقیم رہے یہاں تدریس فرمائی مکہ معظمہ قیام کیا وہاں بھی اپنے برادر بزرگ الصدور الحمید مولانا حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے دوش بدوش یہ مشغلہ جاری رہا دہلی کے تلامذہ میں حکیم عبدالحمید خاں[۳] رام پوری اور مکہ کے اجازہ سے والاجاہ السید صدیق[۴] حسن خان والی بھوپال کے اسمائے گرامی معلوم ہو سکے ہیں سلسلہ اولاد کی آگہی سے اب تک محرومی ہے مکہ معظمہ ہی میں شاہ محمدؒ اسحاق صاحب کے بعد رحلت فرمائی۔

---

[۱] المسوی مطبوعہ مکہ معظمہ (حاشیہ) ص ۴۵

[۲] حیات ولی ص ۳۳۸

[۳] تذکرہ کاملان رام پور ص ۲۴۳

[۴] مآثر صدیقی ص ۱۷

(۱۷)

مولوی احمد علی محدث سہانپوری

عالم فاضل۔ فقیہ محدث جامع منقول و معقول حاوی فروع و اصول تھے حفظ قرآن کے بعد علوم عربیہ وغیرہ میں مشغول ہوئے اور اپنے ملک کے علماء و فضلاء سے علوم متداولہ حاصل کر کے دہلی میں مولانا محمد اسحاق محدث سے حدیث کو پڑھا اور اس کی سند ان سے لی پھر حج کیا اور حرمین شریف کے علماء و مشائخ سے استفادہ کیا اور اجازت حاصل کی اور پھر دہلی میں آکر مطبع احمدی نام جاری کیا جو غدر تک بڑے زور شور سے جاری رہا اور اس میں بڑی بڑی علمی کتابیں آپ کے اہتمام او بخشی سے چھپتی رہیں خصوصاً صحیح بخاری وغیرہ پر اپنے عمدہ حواشی چڑھوائی اور ان میں حنفی مذہب کی خوب تائید کی علاوہ تحشیہ و تعلیقات کے ایک رسالہ الدلیل القوی علی ترک القراۃ للمقتدی خوب تحقیق و تدقیق سے فارسی میں تصنیف فرمایا جس کا ترجمہ اردو میں اب چھپا ہوا موجود ہے مطبع شکست ہونے کے بعد آپ اپنے وطن مالوف سہارنپور میں آگئے جہاں مرض فالج سے ۶ جمادی اول ۱۲۹۷ھ کو وفات پائی حزانۂ خوبی آپ کی تاریخ وفات ہے آپ سے بذریعہ تدریس اور انطباع کتب علمیہ کے بڑی تنشیر علمی ہوئی۔ (۱)

---

(۱) حدائق الحنفیہ ص ۴۹۳

(۱۸)

شاہ ابو السعید صفی القدر بن عزیز القدر بن محمد عیسیٰ دہلوی مجددی

علوم ظاہری و باطنی فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ میں طاق یگانۂ آفاق تھے رام پور میں دوم ماہ ذیقعد ۱۱۹۶ھ میں پیدا ہوئے علوم ظاہری مفتی شرف الدین دہلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی سے حاصل کیے اور نیز مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور حضرت سراج احمد بن شیخ محمد مرشد سے علم فقہ و حدیث کی سند حاصل کی بعد تحصیل علوم ظاہری کے علوم باطنی کو پہلے اپنے والد ماجد سے حاصل کیا پھر اُن کی اجازت سے شاہ درگاہی کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقہ خلافت کا پایا چونکہ ابھی شوق خدا طلبی کا باقی تھا اس لیئے آپ رام پور سے دہلی آئے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے نام خدا طلبی کے باب میں خط لکھا اُنہوں نے جواب میں لکھا کہ اس وقت شاہ غلام علی سے بہتر کوئی شخص نہیں اس پر آپ شاہ غلام علی کی خدمت میں حاضر ہو کر مقام ٹونک میں پہنچے ۴۵ سال کی عمر میں عید الفطر کے روز ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی اور بعد غسل جنازہ کے آپ کے صاحبزادے شاہ عبد الغنی نے آپ کی نعش مُبارک کو صندوق میں ڈال کر چالیس روز کے بعد دہلی میں لا کر حضرت شاہ غلام علی اور میرزا مظہر جانجاناں کے پہلو میں دفن کیا۔ (۱)

---

(۱) حدائق الحنفیہ ص ۴۷۱

باب ۱۴

عہدِ بہادر شاہ کے شعراء

رات گزرتی جا رہی ہے شمع جھلا رہی ہے۔ یارانِ بزم ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے
ہیں۔ حاضرین جمائیاں لے رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے شعر و شاعری کی بساط الٹ جاتی
ہے۔ لیکن دفعتاً نو سنجانِ باغِ معنی کی خوش الحانی اور نغمہ سرائی پھر سے ایک سماں
پیدا کر دیتی ہے جو اٹھ رہے تھے وہ بیٹھ گئے جو اکتا چکے تھے وہ ہمہ تن شوق و توجہ بن
گئے اور جو بے دلی کے ساتھ چیں بہ جبیں پیشانی لئے محفل سے باہر جا چکے تھے یہ نغمہ رائیاں
سن کر ٹھٹکے، رکے، ٹھیرے اور جوشِ اشتیاق کے ساتھ پھر سے شریکِ بزم ہو گئے
اکھڑا ہوا رنگ جم گیا۔ جھلاتی ہوئی شمع کی لو بھڑکی اور قائم ہو گئی۔ سب پر سرور و کیف
کا عالم طاری ہو گیا، ہر کوئی بے خوف ہر کوئی مدہوش سخن طرازی یا تھی سحرِ حلال تھی۔ اِنّ
من البیان لسحرا ع

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

اس عہد ادبار انحطاط میں فنِ شعر اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ جس نے قصیدہ کی طرف توجہ
کی وہ بے ہمتا نظر آیا۔ جس نے غزل سرائی کو شعار بنایا، یکتا دکھائی دیا۔ الفاظ کی تراش
خراش میں جدت خیالات میں ندرت۔ تشبیہات و استعارات میں تازگی و رعنائی ترکیبوں
اور بندشوں میں شوخی اور بانکپن!
اس دور کے شعراء پر ایک نظر ڈالئے تو ہر طرح کے باکمال نظر آئیں گے کوئی خیالات
کی بلندی میں بے نظیر ہے کوئی زبان و محاورہ کا استاد، کسی کا انداز سے امتیاز حل

ممتنع کوئی ادق الفاظ اور پیچیدہ تراکیب کا باہر غرض جو ہے وہ بے مثل، لاجواب انتخاب ؛

عہد بہادر شاہ کے شعراء کی فہرست رنگا رنگ اور بوقلموں ہے نگاہ انتخاب حیران ہے کسے چھوڑے اور کسے توڑے ؛ ابن عقیدت ششدر ہے کس کی مدحت طرازی کرے اور کسے تنقید و تعریض کا ہدف بنائے فن کا محتسب درماندہ نظر آتا ہے کسے پرکھے اور کسے جانچے ؟ ایسے موقع پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس طبقے کے "خواص" پر نظر خوش گزرے "ڈال لی جائے۔ فن کی عظمت و جلالت کا ایک ہلکا سا اندازہ تو ہو ہی جائے گا۔

شعراء کا ذکر میں نے حروف تہجی کے اعتبار سے کیا ہے :-

(۱)

خواجہ غلام غوث بےخبر

خلف خواجہ ظہور اللہ کشمیری ان کے مورث اعلیٰ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کی اولاد سے تھے سلاطین مغلیہ کے تسلط کشمیر کے زمانے میں خواجہ بےخبر کے بعض بزرگ کشمیر میں قاضی رہے بےخبر کے والد کشمیر سے ترک وطن کر کے لاسہ (تبت) چلے گئے وہاں سے ریاست نیپال پہنچے۔ مہاراجہ نیپال نے بڑی عزت کی خواجہ غلام غوث نیپال میں ۱۸۲۴ء م ۱۲۴۰ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر تھی کہ ان کے والد ہندوستان آگئے اور بنارس میں قیام کیا۔ خواجہ صاحب نے یہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی ان کے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں لفٹننٹ گورنر صوبہ شمال مغرب کے میر منشی تھے بےخبر سولہ سال کی عمر میں ۱۸۴۰ء میں میر منشی کے نائب مقرر ہوئے صوبہ کا صدر مقام آگرہ تھا، بےخبر مدتوں آگرہ رہے جب لارڈ ایلن برا گورنر جنرل (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) نے گوالیار پر حملہ کیا (۱۸۴۳ء) تو گورنر کے منشی خزانہ کے ساتھ بےخبر بھی شریک مہم ہوئے اور خاتمہ جنگ پر کارگذاری کے صلہ میں خلعت پایا۔ اس وقت ان کی عمر انیس ۱۹ برس کی تھی۔ خالو کی پنشن کے بعد ان کی جگہ میر منشی ہوگئے غدر کے زمانے میں صدہا ہندوستانیوں کی جان بچائی اور گورنمنٹ کے بھی انتہا درجہ کے وفادار رہے اس کے صلہ میں سند اور خلعت ہفت پارچہ مع تین رقوم جواہر سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئے ملکہ وکٹوریہ کے خطاب شہنشاہی اختیار کرنے کے موقع پر لارڈ لٹن نے جو دربار کیا اس میں بھی خواجہ صاحب کو تمغۂ قیصری عطا ہوا۔ پینتالیس ۴۵ سال کی ملازمت کے بعد ۱۸۸۵ء میں پنشن لی گورنمنٹ نے "خان بہادر ذوالقدر" کا خطاب دیا اور مزید اعزاز بخشا کہ پنشن لینے کے لیے عدالت کی حاضری معاف کی پنشن کے بعد نواب خلد آشیان کلب علی خان بہادر والیٔ رامپور نے خواجہ صاحب کو ریاست کا مدار المہام بنانا چاہا لیکن انھوں نے شکریہ کے ساتھ معافی چاہی اور آخر عمر کو یاد الٰہی میں گزار کر ۱۹۰۰ء میں انتقال کیا۔

بےخبر عربی و فارسی کے عالم تھے فارسی کے ایسے بلند پایہ شاعر تھے کہ اہل زبان ایران جو

وارد ہندوستان ہوئے، انھوں نے ان کی زبان دانی و نکتہ سنجی کی داد دی۔ بے خبر مرزا غالب سے چھوٹے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے، غالب باوجود بڑے ہونے کے بے خبر کی نہایت عزت کرتے تھے اور خط میں "قبلہ" اور "مولانا" لکھتے تھے، بے خبر کی سخن گوئی کے ایسے مداح تھے کہ ان کو ایک خط میں لکھا تھا :-

"رامپور ہی میں تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے! ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گذرا تھا وہ تم بروئے کار لائے، خدا تم کو سلامت رکھے[1]۔"

رقعات غالب کا پہلا مجموعہ (عود ہندی) بے خبر کی اعانت و مشورہ سے طبع ہوا[2]۔

---

[1]: "عود ہندی" میں رقعۂ غالب کے ساتھ بے خبر کی وہ غزل بھی درج ہے جو مسلسل کہی ہے مطلع و مقطع اور ایک شعر نقل کیا جاتا ہے

چشم کہ باز شد ز خواب فتنہ از و بپا رسوست	پردہ رخ کہ بر کشاد ؛ مہر ز شرم زرد اوست
جام صبوحے کہ زد ؛ شیشہ بسجدہ می رود	مے ز لب کہ کام یافت ؛ جوش نشاط در سبوست
بخت کجاست بے خبر ؛ تا ہر کاب او دوم	بر سرِ رہ نشستہ ام نیم نگاہم آرزوست

[2]: داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۲۵۵۔

(٢)

شیخ محمد ابراہیم ذوق

بہادر شاہ کے اُستاد تھے، اقلیم زبان کے بادشاہ تھے، الفاظ ان کی ٹکسال میں ڈھلتے تھے محاورات ایجاد کرتے تھے۔ نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں کنیز کی طرح ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں، پُرگو تھے، زود گو تھے، ان کی زبان مستند تھی۔

مستند ہے میرا فرمایا ہُوا

سرسید ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں :-

" عمدۂ اوستادی سلطانِ عصر محمد سراج الدین بہادر شاہ سے ممتاز اور پیش گاہِ سلطنت سے خطابِ خاقانیٔ ہند سے سرفراز ہیں۔ مشقِ سخنوری اس درجہ کو پہنچی ہے کہ کوئی بات اس صاحب سخن کی قالب ہے، کہ پیرایۂ وزن سے متعرا نہ ہوگی، پُرگو اور خوش گو غزل ویسی ہی اور قصائد ویسے ہی غزل گوئی میں سعدی و حافظ و قصیدہ میں انوری و خاقانی۔ مثنوی میں نظامی تو اگر اس سخن گو کی شاگردی سے فخر ہو تو کچھ عجب نہیں، شمار ان کے اشعار گہر نثار کا بجز عالم الغیب کے اور کوئی نہیں کر سکتا، اس قدر جامعیت کہ فصاحتِ عبارت اور متانتِ تراکیب اور تازگیٔ طرز اور جدتِ معنی اور غرابتِ تشبیہ اور حسنِ استعارہ اور خوشیٔ اسلوبِ کنایہ اور لطفِ تلمیح اور رعایتِ الفاظ اور تنگیٔ وزن میں کلمات اور بستِ قافیہ اور نشستِ ردیف نظم و نسق کلام اور حسنِ آغاز و انجام ایک جا سے میں جمع ہیں، متقدین سے متاخرین تک کسی اور فرد بشر کو حاصل نہیں ہوئی"

---

١ : تذکرہ اہلِ دہلی (سرسید احمد خاں) صفحہ ١٩٠ ؎

محمد حسین آزاد کہتے ہیں :-

"ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے ، دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے ، شیخ ان کے اکلوتے بیٹے تھے ، سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے [1]

ذوق کا حلیہ اور وضع

اُستاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام رنگ اچھا سانولا ، چہرے پر چیچک کے بہت سے داغ ، آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ، چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ، سفید تنگ پائجامہ ، سفید کرتا اور سفید ہی انگرکھا سر پر ململ کی ٹوپی گول چندوے کی [2]

ذوق اور شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ

کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی اکبر ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ محمد ذوق کے اُستاد تھے ، جب شاہ نصیر صاحب اور ذوق کا دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبد العزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا :-

"اُستاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہو گئے ، شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ مولانا عبد العزیز صاحب اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں ہیں ان کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اُردو کے محاورہ سے روزمرہ یاد کرتا ہوں اس لئے کہ شاہ عبد العزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے مطابق اُردو زبان سیکھنے کے لئے خواجہ میر درد کی خدمت میں بچپن سے حاضر ہوئے تھے اور چُپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر کو سنا کرتے تھے ، اور

ص[1] : آبِ حیات (از محمد حسین آزاد)

ص[2] : دلی کی آخری شمع ص ۲۸

محاورات کو دل ہی دل میں چنا کرتے تھے مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ فن ہے اسی طرح اصولِ زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد اور مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ میر درد صاحب پکے اُستاد ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب خاص طور پر میر درد کے ہاں جاتے تھے۔ تو شاہ نصیر صاحب کا تذکرہ تھا شاہ صاحب جیسے باکمال تھے ویسے ہی کم رو تھے ایک دن پلٹن کے چار سپاہی دشن پورے میں جہاں شاہ نصیر صاحب رہتے تھے پوچھتے ہوئے آئے کہ ہمارے صوبیدار صاحب ہندوستانی کپڑے سلوائیں گے ایک درزی کی ضرورت ہے اگر اس محلے میں کوئی درزی رہتا ہو تو بتا دو کپڑے سی آئے منہ مانگی سلائی دے دیں گے۔ گلی کے نکڑ پر چند اوباش بیٹھے تھے انھوں نے کہا دیکھو یہ سامنے والا جو مکان ہے اس میں ایک درزی رہتا ہے جو بڑا کاریگر ہے اسے شاہ صاحب کہہ کر پکارو اور جب وہ دروازے پر آئے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر کہو سینے چلو۔ وہ کہے گا میں درزی نہیں ہوں مگر تم یقین نہ کرنا اور اپنے ساتھ پڑاؤ پر لے جانا اور جو کچھ سلوانا ہو سلوا لینا۔ چنانچہ شاہ نصیر صاحب حویلی سے باہر آئے تو ان کی صورت پر درزی پن برستا تھا کیونکہ ظاہری شان سے خدا نے حضرت کو محروم کر دیا تھا۔ بہتیرا انھوں نے کہا میں درزی نہیں ہوں لیکن سپاہیوں کو محلے کے بدمعاش پہلے سبق دے چکے تھے وہ بھلا کب ماننے تھے دو کوس پیدل چل کر پڑاؤ پر انھیں لے پہنچے صوبیدار صاحب نے انھیں اپنے ڈیرے میں بٹھایا اور نین سکھ کا ایک تھان منگا کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ شاہ صاحب نے نین سکھ کے تھان کو الٹ پلٹ کر کہا کفن تو سی ہی دوں گا مگر میت کا ڈیل ڈول اور قد و قامت تو بتا دیجیے جس کے اندازے پر کفنی اور لوٹ کی چادر پھاڑ دوں۔

صوبیدار نے کہا: ہم نے تمھیں انگرکھا سلوانے کے لیے بلایا ہے۔

شاہ صاحب: میں تو کفن دوز درزی ہوں۔

صوبیدار: آپ نے ہمارے آدمیوں کو بتایا نہیں تھا؟

شاہ صاحب: میں نے سب کچھ سمجھایا اور جتایا تھا مگر وہ ٹھیٹ پورب کے گنوار ہیں دلّی کی

بولی ان کے سمجھ میں نہیں آئی اور مجھے زبردستی پکڑ لائے۔

صوبیدار: توبہ الٰہی ان سپاہیوں نے صبح ہی صبح کیا بدشگونی نکوائی ہے۔ میاں صاحب خدا کے لئے آپ ہم سے سواری لیجئے اور گھڑی کے چوتھائی میں گھر سدھائیے اور کبھی خدا ایسا موقع نہ لائے کہ آپ ہماری پلٹن میں آئیں۔

جب شاہ صاحب نے یہ لطیفہ بادشاہ کو سنایا تو بادشاہ ہنسی کے مارے لوٹ ہوگئے اور فرمایا واہ اُستاد آپ نے یہاں بھی نازک خیالی کو نہ چھوڑا اور اپنے تئیں کفن دوز کہہ کر پیچھا چھڑا یا ورنہ سپاہی اور صوبیدار آپ کو بہت پریشان کرتے کیونکہ یہ لوگ نرے اجڈ ہوتے ہیں[1]۔

ذوق کی خدمت زبان

ذوق کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو خوب صاف کیا اور اس پر جلا دی، وہ ایک بڑے صناع تھے اور الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہ واقف تھے محاورات اور مثال کے استعمال میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے، الفاظ کا برمحل استعمال، فن عروض سے واقفیت، موسیقیت کلام، ندرت تخیل اور بلندی مضامین یہ سب چیزیں مل کر ان کے کلام کا جوہر اصلی بن گئی ہیں کسی دوسرے شاعر کے کلام میں لطف الفاظ کے ساتھ خوبی معنی اس قدر نہیں پائی جاتی۔

اندازِ کلام

ذوق کی شاعری میں تکلف اور تصنع بالکل نہیں ہے ان کے ہاں تشبیہات اور استعارات اور دیگر صنائع بدائع نہایت مناسبت سے کالملح فی الطعام استعمال ہوئے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ ان کے کلام سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر اپنی قابلیت اور علم وفضل کا زبردستی اظہار کرنا چاہتا ہے کلام میں روانی اور ترنم بہت ہے اعلیٰ تخیل اور بلندی مضامین کبھی الفاظ کی خوبصورتی اور صرف برمحل کے مزاحم نہیں ہوتے ہر شعر برمحل اور حشو و زوائد سے پاک ہوتا ہے سست اشعار ان کے دیوان میں نہیں ہیں قوت کلام اور تنوع مضامین کے اعتبار سے ان کا مقابلہ سودا سے کیا

---

[1] : لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) صفحہ ۶۱

جاسکتا ہے اور ان ہی کے متبع تھے بھی، مگر ان کے ہاں اور اُستادوں کا بھی رنگ موجود ہے، مثلاً خواجہ میر درد اور جرأت، مصحفی، قصیدہ میں وہ کامل اُستاد مانے گئے ہیں اور اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کے اکثر قصائد ضائع ہو گئے مگر جو کچھ ہمارے سامنے ہیں وہ ان کی قادر الکلامی اعلیٰ تخیل اور بلند پروازی اور روانی کلام کے بے مثل نمونے ہیں، اس صنف میں وہ آپ اپنی نظیر تھے۔ ان کی غزلیں تازگی مضامین خوبی محاورہ، سادگی اور صفائی کے لیے مشہور ہیں، ان کے کلام میں شاہ نصیر، سودا درد، مصحفی اور جرأت سب کا رنگ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے ان کے کلام کو گلدستہ کہا نے رنگا رنگ کہنا بے جا نہیں، ان کی وہ غزلیں جو جرأت کے رنگ میں ہیں، مگر جرأت کے عیوب سے پاک ہیں۔ نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں، ان کے کلام پر بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ معائب سے پاک نہیں ہے اور عام لوگوں کے لیے ہے۔[۱]

ذوق کی ظرافت

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا، بادشاہ قطب میں تھے یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے اس وقت قصیدہ کہہ رہے تھے، چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں اور تنکے جو گرتے تھے انھیں لینے کو بار بار ان کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے، ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی انھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا، تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی انھوں نے پھر اُڑا دیا، جب کئی دفعہ ایسا ہُوا تو ہنس کر کہا:۔

"اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنالیا ہے" ایک طرف میں بیٹھا تھا۔

ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے، وہ نابینا ہیں، انھوں نے پوچھا

"حضرت کیا"؟

میں نے حال بیان کیا، ویران بولے !

"ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھی"؟

۱؎ : تاریخ ادب اُردو ۔ رام بابو سکسینہ، ص ۳۱۰ ؛

اُستاد نے کہا

"بیٹھے کیونکر ؛ جانتی ہے کہ یہ تلا ہے، عالم ہے حافظ ہے ابھی آل لکم الصیبن کی آیت پڑھ کر کلوا واشربوا بسم اللہ ۔ اللہ اکبر کر دے گا، دیوانی ہے جو تمہارے سر پڑ جائے گی"[۱]

ذوق کی وفات

۴ رصفر ۱۲۷۱ھ ہجری جمعرات کا دن تھا، سترہ دن بیمار رہ کر وفات پائی، مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے[۲]

ذوق کا مزار

قدم شریف کے پاس کلو کا تکیہ دلی کا مشہور قبرستان ہے یہیں ایک جگہ املی اور پیپل اور نیم کے تین درخت برابر برابر واقع ہیں جن کے متصل ایک شکستہ چار دیواری کے اندر طوطیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق، ابوظفر سراج الدین بادشاہ کے اُستاد آرام فرماتے ہیں[۳]

نمونۂ کلام

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہ گاروں کا

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

---

۱ : آب حیات (از محمد حسین آزاد)

۲ : آب حیات (از محمد حسین آزاد)

۳ : واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۱۲۴

کے ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پٹے لہو میرا

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہُوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

وُہ جنازہ پہ مرے کس وقت آئے دیکھنا
جبکہ اذنِ عام میرے اقربا کہنے کو تھے

ہاں قاتل دم ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی میری تیروں سے چھپنی خوب نہیں

اُس حُور وش کا گھر مجھے جنت سے سوا ہے
پر واں رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

دیکھا دمِ نزع دلِ آرام کو
عید ہوئی ذوق وصلے شام کو

عبث تم اپنا لگاوٹ سے منہ بناتے ہو
وُہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائیے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائیے ہے

قطرہ قطرہ آنسو جس کی طوفاں طوفاں شدت ہے
پارہ پارہ دل ہے جس میں تودہ تودہ حسرت ہے

زخمی میں ہوا ہوں تیری دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

اُلفت کا نشاں جب کوئی مرجائے تو جانے
یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جانے

مسلسل کلام کا نمونہ اور اس کی روانی بھی دیکھ لیجئے

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر
کہ تھی اِک اِک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اِک اندھیر
مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے

تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پر پسینے

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے
کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب گر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے

سو اس ظُلمت کے پردے میں کیے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سُن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھل کے سو رہ
بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جان کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوع صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو
پڑھی یسیٓں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب خانہ میرے

اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھ کو صبح وصل نے دی

اذاں کے ساتھ یمن و فرخی سے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر

کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا

تری آواز مکے اور مدینے

---

(۳)

قربان علی بیگ سالک

"وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کون سا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرے میں گیا ہے، وہ اُن کو دُور سے پہچان لے گا، چھوٹا سا قد، دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں موٹی سی ناک چھوٹی چھوٹی آنکھیں موٹی جلد گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ چھدری چھوٹی سی، داڑھی گلوں پر کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ سر پر خشخاشی بال کوئی تیس۳۰ سال کی عمر بخارا کے تُرک معلوم ہوتے ہیں، ہاں لباس اُن لوگوں سے مختلف ہے، سر پر سفید گول ٹوپی ہاتھ میں سفید لٹھے کا رُومال نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ مہری کا پاجامہ[۱]"

نمونۂ کلام

انتہائے صبر آزمائی کی — ہے درازیِ شب جدائی کی
ہے برائی نصیب کی کہ مجھے — تم سے اُمید ہے بھلائی کی
نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے — داستان اپنی جبہ سائی کی
ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں — پھر شکایت ہے نارسائی کی
کیا نہ کرتا وصال شادیِ مرگ — تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی
راز کھلتے گئے مرے سب پہ — جس قدر اس نے خودنمائی کی
کہتے عاجز ہیں ہم کہ پلتے ہیں — بندے بندے میں بو خدائی کی
رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک — آ گئی عمر پارسائی کی

---

[۱]: دلی کی آخری شمع ص۴۳

سالک پر تبصرہ

مرزا قربان علی بیگ سالک نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے۔ حیدرآباد میں پیدا ہوئے مگر بعض کے نزدیک مسقط الراس دلی ہے، غرضیکہ دلی میں نشوونما پائی، پہلے قربان تخلص کرتے اور مومن سے اصلاح لیتے تھے، مگر جب ان کا انتقال ہوگیا تو غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص اختیار کیا، غدر کے زمانے میں دلی چھوڑ کر الور چلے گئے، جہاں کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے، اس کے بعد حیدرآباد گئے اور وہاں سررشتہ دار ہوگئے، حیدرآباد میں "مخزن الفوائد" کے نام سے ایک اردو رسالہ زیرِ سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکلتا تھا، سالک کچھ عرصہ تک اس کے مدیر رہے، ۱۲۹۱ھ ہجری میں حیدرآباد ہی میں انتقال کیا، ہنجارِ سالک دیوان کا نام ہے۔ یہ بھی غالب کے مشہور شاگردوں میں سے تھے، کلام خیال اور زبان دونوں کے اعتبار سے اچھا ہے، مگر جدت سے خالی ہے، ان کا شہر آشوب دہلی کی تباہی پر اور اپنے استاد غالب کا مرثیہ بہت پرزور اور دردانگیز ہے[1]۔

---

[1] : تاریخ ادبِ اردو (رام بابو سکسینہ ص ۲۴۱)

(۴)

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

نواب محمد مصطفیٰ خاں نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں صاحب بہادر مظفر جنگ کے فرزند تھے ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی میں انگریزی سلطنت کی بنیاد قائم کی اس وقت نواب مرتضیٰ خاں کو لارڈ صاحب موصوف نے دہلی کے قریب پلول کا علاقہ بطور جاگیر عطا کیا۔ اس دور میں جو سات رئیس با اختیار بنائے گئے تھے منجملہ ان کے نواب مرتضیٰ خاں بھی تھے، ۱۸۱۴ء میں نواب ممدوح نے جہانگیر آباد کا علاقہ جو پہلے راجہ کھودس رائے کی ملکیت تھا اور بعلت عدم ادائے مالگذاری نیلام ہوا تھا، خرید لیا۔ اور گورنمنٹ سے سند تعلقہ داری عطا ہوئی۔ نواب صاحب کی رحلت کے بعد پلول کے علاقہ کو گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اس کے عوض اراکین خاندان کی پنشن کر دی، جو غدر ۱۸۵۷ء تک جاری رہی۔

نواب مرتضیٰ خاں نے جہانگیر آباد کا علاقہ اپنی حیات میں صاحبزادے مصطفیٰ خاں کے نام منتقل کر دیا تھا، جو ان کے بعد ان کی اولاد کی ملکیت میں آیا اور اس وقت تک قائم برقرار ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی ہوئی، میاں جی مالامال سے فارسی، عربی کی تعلیم پائی مولانا محمد نور سے فن حدیث و تجوید میں استفادہ کیا۔ ۱۲۵۵ہجری میں آپ کو حرمین شریفین کی زیارت نصیب ہوئی تو مکہ معظمہ کے فاضل اجل و عالم باکمال حضرت شیخ عبداللہ سراج مکی سے آپ نے صحاح کے ابتدائی حصے تبرکاً پڑھے۔

آپ بے انتہا خلیق اور صاحب مروّت تھے، ہمیشہ رات کے تین بجے نماز تہجد کے واسطے بیدار ہوتے اور نماز تہجد اور صبح کے درمیان مسنون قیلولہ کے بعد صبح کی نماز سفر ہو یا حضر اول جماعت کے ساتھ ادا کرتے۔

ایام غدر میں ہندوستان کے عمائد اور شرفاء پر جو مصیبت گزری ہے خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے

نواب صاحب بھی لپیٹ میں آگئے اِن کا دار الریاست جہانگیر آباد خطرناک حالت میں تھا لہٰذا آپ نے اس کو چھوڑ کر بمقام خانپور اپنے عزیز دوست عبد اللطیف خاں کے ہاں اقامت گزیں ہوئے ٹھاکروں نے قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ کر لیا، اور نواب صاحب کے خوشنما اور عالی شان محلوں کو آگ لگا دی تمام قیمتی اور پر تکلف اثاث البیت جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اِن کا گراں بہا کتب خانہ اور ان کی اپنی تصانیف جس میں اُردو فارسی کا کلام بھی شامل تھا آگ کے شعلوں کی نذر ہو گیا، جس وقت بھیم سنگھ اور اس کے ساتھ ٹھاکروں نے جہانگیر آباد میں یہ ہنگامہ برپا کر رکھا تھا، حسنِ اتفاق سے ریاست رامپور کی فوج دہلی جانے کے لئے جہانگیر آباد سے گذری اس فوج کا افسر نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور، اور نواب مصطفیٰ خاں کے دوستانہ تعلقات سے واقف تھا اس لئے اس نے ٹھاکروں کے مقابلہ میں نواب صاحب کے تابعین کی مدد کی اور ان کو از سر نو قلعہ جہانگیر آباد پر قبضہ دلایا ۔

نواب صاحب پر بغاوت کا الزام بھی لگایا گیا تھا اور کچھ عرصہ تک یوسف زنداں بنائے گیے مگر آخر کار گلو خلاصی آئی اور نوابصاحب مامون و مصؤن رہے اور مدارج و مناسب بھی برقرار رہے مصائب غدر میں ایک دن نوابصاحب پیادہ پا محافظین کے ساتھ سڑک پر جاتے تھے، اس اثنا میں آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا :-

" تیری شان کریمی کے قربان کہ اتنی ہی سزا دی ورنہ میں تو اس سے بھی زیادہ سزا کا مستوجب ہوں "

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ ناقل تھے کہ دہلی میں نواب صاحب کو مرض سرطان عارض ہوا ڈاکٹر آپریشن کیا کرتا تھا اور ناقص گوشت کاٹا کرتا تھا جس سے سخت تکلیف ہوتی تھی اور اوپر والوں سے دیکھا نہ جاتا تھا، چنانچہ ایک روز صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے لیکن نوابصاحب کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آتا تھا۔ صاحبزادے سے کہا :-

" اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی کی بات ہے ..... "

ذکاء اللہ صاحب فرماتے تھے کہ ایسا ضبط و استقلال میں نے آج تک کسی انسان میں

نہیں دیکھا۔

آپ نظم و نثر دونوں پر قدرتِ کاملہ رکھتے تھے اور حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ دیوانِ فارسی و ریختہ کے علاوہ آپ کے رقعہ جات بھی پڑھنے کے قابل ہیں جن سے آپ کی اعلیٰ درجہ کی انشاء پردازی اور بلاغت کا اظہار ہوتا ہے۔ نواب صاحب کی ایک مبسوط کتاب گلشنِ بے خار شعراء کا تذکرہ ہے جو ۱۲۵۲ھ میں چھپا۔

۱۸۶۹ء میں ترسٹھ سال کی عمر میں آپ نے رحلت کی اور دہلی میں درگاہ سلطان المشائخ میں اپنے جدِ امجد کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ ذیابیطس کا عارضہ پہلے سے تھا وقت سفر ہاتھ میں ایک کالا دانہ نکلا وہی موت کا بہانہ ہُوا۔ اپنا کفن بیت اللہ سے ہمراہ لائے تھے اِس میں کفنائے گئے۔ آپ کی وفات کی تاریخ اِس آیت سے برآمد ہوتی ہے:۔

وجزاھم بما صبروا جنۃ وحریرا

یہ مادۂ تاریخ مولانا حالی کا ہے جو آپ کے مزار پر کندہ ہے[1]۔

سرسید، شیفتہ کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں:۔

"حاتم کرم عطارد رقم، رستم توان نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر ریختہ میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اگر اِن کے جاہ و جلال و حشمت و اقبال کی مدح لکھوں گر پاس بارگاہ کے اندیشہ کو مانع بار ہے اور اِن کی شجاعتِ ذاتی اور جرأت جبلی کے اوصاف ذکر کروں اس تہمتن توان کی ہیبت شیری فکر لرزہ وہشت میں بے اختیار اور اگر بالفرض اِن سب چیزوں سے ہاتھ اٹھا کر چاہوں کہ مناسبت مقام سے ذکر سخنوری و معنی پروری کا کروں تاکہ بسبب فی الجملہ ممارست کے خامۂ قاصر البیان کچھ بھی لسان کر سکے۔ جب اِس جگہ قدم رکھا ہر مضمون پست کو اس درجہ بلند پر دیکھا کہ کنگرۂ عرش با ایں ہمہ سربلندی اِس فدّہ ہزار پایہ کے نیچے تھا اور طائر بلند پرواز سدرہ سو برس کی پرواز کے بعد وہاں تک پہنچ نہ سکتا تھا

---

[1]: واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص۲۳۴۔

اندیشۂ کوتاہ اس ملبند پروازی سے عاجز اور اس بالا روی سے زبون ہو کر ایک سیدھے رستہ پر پڑ لیا یعنی کچھ احوال سعادت اشتمال اس حضرت کا لکھ کر چاہتا ہے کہ اپنے تئیں روشناس اہل سخن کرے۔ یہ زبدہ اراکین روزگار خلف الرشید ہیں اعظم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ مرحوم کے اور باعتبار کمالات ظاہری اور جلالت باطنی کے فخر خاندان اور شرف دودمان ہیں۔ خاک دروازہ کی معدن زر اور سنگ ان کے آستان کا کان گہر اگر ابر نیساں کو ان کے بحر کف سے ایک نم حاصل نہ ہوتی گوہر بار نہ ہوتا اور اگر آفتاب کو ان کے چہرہ شگفتہ کا فیض نہ ملتا، عالم اس کے اثر سے گلزار نہ ہوتا۔ بہار ان کے خلق سے نکہت آمیز اور موج گوہر ان کے بحر عطا سے طوفان خیز، رہے شجاعت کہ اگر صور طراحی کے وقت ان کا نام لے تصویر رستم میں لرزہ پڑ جائے اور عجب عدالت کہ اگر ان کی مدح کے وقت نوشیرواں کا نام لینے کا ارادہ کریں زبان کو اس حرف سے ننگ آوے۔ بلند پائگی حشمت و جاہ کا وہ عالم کہ عمائد روزگار ان کے خاک آستان کو برا ز تاج دارا جانتے ہیں اور ہزار سلام بے جواب کو بہتر خلعت دارائی سے سمجھتے ہیں اور خلق و حلم کا وہ حال کہ احوال ہر خاکسار جب نظر شفقت سے نہ گزرے نسخہ مراہم کو ناتمام اور دفتر تلطف کو ابتر تصور کرتے ہیں، سبحان اللہ انک لعلیٰ خلق عظیم کا مظہر اس سے زیادہ ہونا محال ہے و تخلق باخلاق اللہ اس سے بڑھ کر ہونا وہم و خیال، باوجود ناز و نعم مثروت کے مشق سخن کو اس مرتبہ پہنچایا ہے کہ قلم تردد سے نہیں آسودہ ہوتا اور فکر تلاش سے بلبل کی سجع خوانی اور قمری کی نصیح بیانی انھیں کی نستعلیق گوئی سے مستفاد ہے۔ الحق یہ پایۂ فصاحت کا اور یہ سرمایۂ بلاغت کا خداداد ہے۔ اگر رنگینی مضامین کے گل کو رنگ اور عبارت کی لطافت گوہر کو آب نہ دے، بلبل کا عشق کامل اور تاج سلاطین کی زیب تمام نہ ہو، مصرع غزل شعلۂ آہ عشاق، اور بیت مثنوی ابروئے خوبان آفاق[۱]:

---

[۱]: تذکرہ اہل دہلی (سر سید احمد) ص ۱۵۰۔

ولادت وخاندانی حالات

عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ جہانگیر آباد ضلع دہلی کے رئیس تھے اور والدہ مرزا اسمٰعیل خاں ہمدانی مشہور سپہ سالار کی بیٹی اور احتشام الدولہ محمد بیگ ہمدانی کی نواسی تھیں۔

اجداد بنگشات سے عہد فرخ سیر میں وارد ہوئے نواب مرتضیٰ خاں اور نواب محمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد یکجدی تھے، نواب مرتضیٰ خاں کا قیام بھی فرخ آباد میں تھا، یہ وہ وقت تھا کہ سلطنت دہلی کی بنا سر تنزل ہو چکی تھی؛

مرتضیٰ خاں نے مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مردم شناس راجہ نے انھیں سپاہ اندور کا افسر اعلیٰ مقرر کیا مگر اندور بھی اس وقت غیر مطمئن حالت میں تھا، نواب کے ملازم ہوتے ہی لارڈ لیک گورنر جنرل کی مدافعت کے لئے مامور کئے گئے جو حکومت کمپنی کی طرف سے مہاراجہ کے استیصال پر متعین ہوئے تھے۔ عرصہ تک مقابلہ رہا، بہت سے آدمی طرفین کے نذر جنگ ہوئے آخر نواب مرتضیٰ خاں کی اصابت رائے اور موقع شناسی کی بدولت باہم صلح ہو گئی؛

لارڈ لیک کو اس موقع پر نواب مرتضیٰ خان کے جوہر قابل ہونے کا پورا تجربہ ہو چکا تھا مضافات دہلی میں پرگنہ پلول علاقہ گڑگانواں، تین لاکھ روپیہ سالانہ محصول کا ان کو عنایت کیا مگر نواب صاحب نے اس جاگیر پر قناعت نہ کرتے ہوئے جہانگیر آباد کا علاقہ اپنے خلف رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام خریدا، نواب مرتضیٰ علی خاں کے انتقال کے بعد علاقہ پلول گورنمنٹ نے واپس لے لیا اور اراکین خاندان کی پنشن مقرر کر دی جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں بند ہو گئی؛

تعلیم و استعداد

نواب شیفتہ نے ماں باپ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی، فارسی عربی اور علوم مروجہ کی تعلیم میاں جی مالامال دہلوی سے پائی، حدیث و قرأت میں مولانا حاجی نور محمد دہلوی نقشبندی، شیخ عبد اللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی مقیم مدینہ منورہ سے استفادہ کیا علاوہ ان کے مولوی کرام اللہ محدث سے بھی بعض علوم پڑھے۔

فی الجملہ تمام علوم رسمی اور فنونِ متداولہ سے بخوبی واقف تھے۔

تصنیف وتالیف ترغیب السالک الی احسن المسالک اور تذکرہ گلشن بے خار اور دیوان ریختہ و فارسی رقعات شیفتہ ان کی علمی یادگاریں ہیں سفرِ حج کے حالات فارسی میں لکھے جو ۱۲۵۴ھ ہجری میں رہ آورد کے نام سے طبع ہوئے[1]۔

گلشن بے خار ان کا تذکرہ گلشن بے خار ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے اردو میں شیفتہ اپنے اُستاد مومن کے پیرو ہیں ان کا کلام اخلاق و تصوف کے مضامین سے لبریز ہے[2]۔

تذکرہ گلشن بے خار ۱۲۴۰ھ ہجری میں لکھا گیا۔ اس زمانہ کی رسم کے مطابق شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کا مختصر حال لکھنے کے لئے فارسی زبان اختیار کی گئی لیکن اپنی اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ شعراء کے کلام پر آزادانہ نکتہ چینی کی گئی ہے اور اردو شعراء کا یہ سب سے پہلا تذکرہ ہے جس میں تنقید کی طرف قدم بڑھایا گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے جو تذکرے اردو شعراء کے لکھے ہیں اس میں تعریف کے سوا تنقیدی پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

بعد تسلط ہر ایک باغی قرار دیا گیا کسی کو حبس دوام ہوا کوئی سات برس کیلئے قید ہوا۔ شیفتہ کو بھی سات برس قید فرنگ ہوئی، نواب صدیق حسن خاں بہادر شوہر نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والئی بھوپال نے بڑی کوشش کے بعد ان کو رہا کرایا۔

مورخہ یکم شعبان ۱۲۷۳ھ ہجری نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے میر مومن علی خاں صدر الصدور ساکن سندیلہ کو ایک سفارش نامہ لکھا اور بڑی جد وجہد کے بعد نعمت جاگیر واگذاشت ہوئی۔

---

[1]: غدر کے چند علماء ص۶۲۔

[2]: تاریخ ادب اُردو رام بابو سکسینہ ص۲۰۰۔

اخلاق وعادات نواب صاحب پابند وضع خوش اخلاق اور مذہب اتقا کے دلدادہ نہایت صابر و مستقل مزاج بزرگ تھے، تسلیم و رضا کی دولت خصوصیت سے عطا ہوئی تھی، ہرحال میں خوش رہنا ان کی زندگی کا نمایاں ترین وصف تھا طبیعت بے استغنا برت تھا مہمان نوازی اور فیاضی میں مشہور تھے، مجددی نقشبندی خاندان سے بیعت تھی، شریعت کے بڑے پابند تھے، بھول کر بھی کسی ناجائز یا غیر مشروع امر کا ارتکاب نہ کرتے تھے[۱]۔

شیفتہ کی جامہ زیبی جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں مومن کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا، اُن کا رنگ گہرا سانولا تھا، لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا اس پر گھنی سیاہ گول داڑھی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں تھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما چوگوشیہ ٹوپی پہنے ہوئے تھے تقریباً انتالیس[۳۹] چالیس[۴۰] سال کی عمر ہے[۲]۔

مرض الموت اور وفات تریسٹھ[۶۳] سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں بمقام دہلی وفات پائی۔ حضرت شاہ نظام الدین محبوبِ الٰہی کی خانقاہ میں دفن ہوئے[۳]

---

[۱] : غدر کے چند علماء ص ۶۳

[۲] : دلی کی آخری شمع ص ۳۹، ۴۰

[۳] : غدر کے چند علماء ص ۶۴

نمونۂ کلام

اے مرگ آ کہ میری بھی رہ جائے آبرو
رکھا ہے اُس نے سوگ عدو کی وفات کا

میری ناکامی سے ہے فلک کو حصول
کام ہے یہ اُسی ستم گر کا

خوبیٔ بخت کہ پیمانِ عدو
اس کو ہنگام قسم یاد آیا

اس سے میں شکوہ کی جا شکرِ ستم کر آیا
کیا کروں تھا میرے دل میں وہ زباں پر آیا
آپ مرتے تو ہیں پر جیتے ہی بن آئے گی [1]
شیفتہ ضد پہ جو اپنی وہ ستمگر آیا

کوئی بے جان جہاں میں نہیں جیتا لیکن
تیرے مہجور کو جیتے ہوئے بے جاں دیکھا

---

[1] : شوق مردن ہے تو پھر جینے سے بن آئے گی ؛

نہ لکھنا تھا غمِ ناکامیٔ عشق
جواب نامۂ سب بے مدعا کیا

کب طالعِ خفتہ نے دیا خواب میں آنے
وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

شبِ ہجراں نے کہا قصۂ گیسوئے دراز
شیفتہ کو بھی دلِ زار نے سونے نہ دیا

سودا زدہ کہتے ہیں ہوا شیفتہ افسوس
تھا دوست ہمارا بھی سنبھل جائے تو اچھا

نہ کیجو غل اے خوش نوایانِ صبح
یہ ہے وقت اُن کے شکرِ خواب کا
محبت نہ ہرگز جتائی گئی
رہا ذکر کل اور ہر باب کا
پڑے صبر آرام کی جان پر
مری جان بے صبر و بے تاب کا

کیا حال تمہارا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ
بے وجہ کوئی شیفتہ اُف اُف نہیں کرتا

تم لوگ بھی غضب ہو کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا سحر آہن بنا دیا
مشاطہ کا قصور سہی سب بناؤ میں
اُس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُر فن بنا دیا

شکایت کو اُس نے سنا بھی نہیں
کھلا غیر پر راز پنہاں عبث

ایک چھوٹی سی مسلسل غزل

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیئے صورت سے کیا حصول
کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیئے
جوں آفتاب روشنی آفتاب میں

وُہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہُوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہُوا آفتاب میں

بے باک شیوہ شوخ طبیعت زباں دراز
ملزم ہُوا ہے پر نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وُہ ہیں عتاب میں

---

(۵)

راقم الدولہ ظہیر

سید ظہیر الدین نام ظہیر تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے دہلی کے باشندے تھے، ان کے والد ابوالمظفر بہادر شاہ کے خوش نویسی میں استاد مرصع رقم خاں بہادر کے خطاب سے سرفراز تھے، خود ظہیر بھی کمسنی ہی میں شاہی ملازمت میں داخل ہو گئے تھے اور راقم الدولہ خطاب اور ایک مرصع دوات انعام میں پائی تھی شعر و سخن سے بچپنے ہی سے شوق تھا، چودہ برس کے سن میں استاد ذوق کے شاگرد ہو گئے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ناچار دہلی سے نکلنا پڑا، جھجر، سونی پت اور نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے اور یہاں سے لکھنؤ کے لیے ارادہ کیا مگر وہاں کے ابتر حالات سن کر کچھ دن وہاں رہ کر رامپور چلے گئے، وہاں چار برس رہے اس کے بعد دہلی آئے اور وہاں چنگی میں ملازمت مل گئی، اس کے تھوڑے عرصہ بعد اخبار "جلوۂ طور" کے ایڈیٹر ہو گئے، جو بلند شہر سے نکلتا تھا، ان کے مضامین کو مہاراجہ شیو دھان سنگھ والئی الور نے پڑھا اور بہت پسند کیا، ان کو الور بلا بھیجا جہاں وہ چار برس رہے وہاں کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو گئے، مجبور ہو کر پھر دہلی آئے اور وہاں نواب مرتضیٰ خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور کے محکمہ پولس میں ان کو ایک معقول جگہ مل گئی، جے پور میں کم و بیش انیس ۱۹ سال رہے والئی ریاست کے مرنے کے بعد ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہو گیا چند روز پریشانی میں بسر ہوئے تھے کہ نواب محمد علی خاں خلف نواب امیر خاں والی ٹونک نے بلا بھیجا اور جب تک نواب زندہ رہے یہ بہت عزت و آبرو سے ان کے ساتھ رہے نواب کے مرنے کے بعد ان کے صاحبزادے نواب ابراہیم علی خاں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، اس طریقہ سے تقریباً پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے آخر عمر میں حیدر آباد جانے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ ٹونک سے رخصت لے کر حیدر آباد گئے، جہاں آٹھ ماہ کے قیام کے بعد باریابی ہوئی مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری امیدوں اور آرزوؤں کا خاتمہ

کر دیا۔ بیکاری کے زمانے میں جب پریشان حال ہو گئے تھے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ان کی مدد کی تھی۔

ظہیر ایک پُرگو شاعر تھے۔ تصنیفات کا حال یہ ہے کہ ایک دیوان مسمّیٰ "گلستانِ سخن" آگرہ میں چھپ گیا، دیوان دوم و سوم کا حقِ تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی کے مالک نے خرید لیا تھا، اور یہ بھی چھپ گئے ہیں، چوتھا دیوان جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصائد اور مسدس شامل ہیں ان کے نواسے کے پاس ہے۔

ظہیر اپنے زمانہ کے مشہور شاعر تھے گو کہ ذوق کے شاگرد تھے مگر کلام میں مومن کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جس کا اعتراف بعض غزلوں کے مقطعوں میں خود انھوں نے کیا ہے ؎

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھا جب تک کہ ظہیر
سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

کیا بنا ہے طرزِ مومن اے ظہیر
طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

آخر دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اپنے زمانے میں زبان اور شاعری دونوں کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے مشہور شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی جو پہلوانِ سخن کے نام سے مشہور ہیں[1]

ظہیر کا رنگ کلام

"آہا! زبان کا لطف اُٹھاتا ہے تو اب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سنئے، ابھی ۲۰، ۲۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ، اُستاد ذوق کی اصلاح اور سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے، قد خاصہ اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت کشادہ دہن،

---

[1] : تاریخ ادب اردو: رام بابو سکسینہ، ص ۳۱۹ ؛

اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول داڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری سر پر پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا سفید پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ سمجھاتے جاتے ہیں[۱]

نمونہ کلام

جبیں اور شوق اُس کے آستاں کا | ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا

لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا | خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا

مری واماندگی منزل رساں ہے | سراغ نقش پا ہوں کارواں کا

رہے پابند دل کے دل میں ارماں | قدم منزل نے پکڑا کارواں کا

اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے | غضب ہے، بار منت پاسباں کا

ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں | مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دل بے تاب نے وہ بھی مٹایا | کبھی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیر آؤ چلو اب میکدہ کو

نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

---

[۱] : دلی کی آخری شمع صفحہ

(۶)

حکیم آغا جان عیشؔ

حکیم آغا جان عیشؔ، بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے، زیورِ علم اور لباسِ کمال سے آراستہ، صاحبِ اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ مزاج جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا مسکرا رہے ہیں ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا، طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں، غزل، صفائی کلام، شوخی مقالات اور حسنِ محاورہ سے پھولوں کی جھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور زبان گویا لطائف و ظرایف کی پھلجھڑی، میں نے دو دفعہ اُستاد کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا، ہائے افسوس اس وقت تصویر آنکھوں میں پھر گئی، میانہ قد خوش اندام سر پہ ایک ایک انگل بال سفید ایسی ہی داڑھی گوری اور سرخ و سفید رنگت پہ کیا بھلی معلوم ہوتی تھی گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے میں ان دنوں دہلی کالج میں پڑھتا تھا اُستاد مرحوم کے بعد ذوقِ سخن اور ان کے کمال کی کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں بھی پہنچایا۔ اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں اور نہیں پاتیں ۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز بعد دنیا سے انتقال کیا، خدا مغفرت کرے[1]۔

---

[1]: آبِ حیات (محمد حسین آزاد)

(۷)

مرزا غالب

مرزا پانچ برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ چچا کے زیر سایہ زندگی بسر کی پھر اپنے وطن آگرہ سے دلی آ گئے، خاندانی امیر تھے لیکن بدنصیبی نے سب کچھ چھین لیا، دلی میں شاعری نے رنگ دکھایا خواص میں زیادہ عوام میں کم مقبول ہوئے، ذوق کی وفات کے بعد بہادر شاہ نے اُستاد بنا لیا اور تنخواہ مقرر کر دی خاندانی پنشن انگریزوں کے دربار سے ملتی تھی۔ غدر میں دونوں پنشنیں بند ہو گئیں، عمر کا آخری حصہ بڑی مصیبت میں گزرا، نواب رامپور حق شاگردی ادا کر کے سو روپیہ ماہوار وظیفہ نہ مقرر کر دیتے تو شاید فاقہ تک نوبت پہنچ جاتی۔

تہتّر برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء، ۱۲۸۵ ہجری جہان فانی سے انتقال فرمایا[۱]۔

غالب بہ قلمِ خود

خود مرزا اپنے بارے میں فرماتے ہیں

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا، سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ کیلئے پایا بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا، اور چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کا نوکر ہوا تین سو

---

[۱]: آب حیات (محمد حسین آزاد)

سوار کی جمعیت سے نوکر رہا، کئی برس وہاں رہا، وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا، راجہ بختاور سنگھ کا نوکر رہا، وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈیر ہوا، ایک ہزار روپیہ ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگہاں مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا، ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا، میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا، ملازمت ہوئی، سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس بعد پنشن کھلا۔ اب خلعت معمولی ملا[1]۔

غالب کی تصویر

"میں نے چاہا، مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معانی سے کھینچوں مگر یاد آیا کہ انھوں نے ایک جگہ اپنی رنگ و روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے میں زیادہ کیا کروں گا۔ اس کی نقل کافی ہے مگر اوّل اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کی اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی۔ وہ ایک وجیہ اور طرحدار جوان تھے اِن سے اُن سے دید و شنید نہ ہوئی لیکن کسی زمانہ کی ہم وطنی شعر گوئی

---

[1] : غالب کا روزنامچہ ص ۶۔

ہم مذہبی اور اتحاد خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسہ میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنتا ہوں کہ طرحدار آدمی ہیں دیکھنے کو بھی جی چاہتا ہے' انھیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حلیہ بھی لکھا، اب اس کے جواب میں جو مرزا آپ ہی اپنی تصویر کھینچتے ہیں اسے دیکھنا چاہیئے "بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا جس زمانہ میں کہ وہ حامد علی خان کی نوکر تھی اور اس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا تو اکثر مغل جان سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے اس نے تمہارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھا دئے بہر حال تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے کا مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے، تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمھاری) ڈاڑھی خوب گھنی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آگئے کیا کہوں جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود زدم چاک گریبان

شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

(میرے) جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دو دانت ٹوٹ گئے ناچار (میں نے) مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی، مگر یاد رکھیئے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دہلی میں) ایک وردی ہے عام۔ ملا۔ حافظ بساطی، پیچہ بند۔ دھوبی۔ سقہ۔ جلاہا، کنجڑہ، منہ پر ڈاڑھی، سر پہ بال، میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔ [1]

شادی اور اہلی زندگی

نواب الہی بخش خان مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت تیرہ ۱۳ برس کی

---

[1] : آب حیات (از محمد حسین آزاد)

عمر تھی۔ باوجودیکہ اوضاع و اطوار آزادانہ رکھتے تھے لیکن آخر صاحب خاندان تھے، گھرانے کی لاج کا خیال کرکے بی بی کا پاسِ خاطر بہت مدنظر رکھتے تھے، پھر بھی اس قید سے کہ خلاف طبع تھی، جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سنیں اور ان کے خطوط سے بھی کثر جگہ پایا جاتا ہے۔ ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی اس نے امراؤ سنگھ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اب شادی نہ کرے تو کیا کرے؛ پھر بچے کون پالے، اس شخص کی ایک بیوی پہلے مر چکی تھی اور یہ دوسری بیوی مری تھی۔ اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے:

جب ان کی پنشن کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں: "تجھ کو میری جان کی قسم۔ اگر میں تنہا ہوتا تو اس قلیل آمد میں کب فارغ البال اور خوش حال رہتا۔" مرزا صاحب نے فرزندانِ روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین کا ایک انبوہ بے شمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا، مگر افسوس کہ جس قدر ادھر خوش نصیب ہوئے اسی قدر فرزندان ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں "سات بچے ہوئے مگر برس برس دن کے بیس و پیش میں سب ملکِ عدم کو چلے گئے"۔ ان کی بی بی کے بھانجے الہیٰ بخش مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے وہ بھی شعر کہا کرتے تھے اور عارف تخلص کرتے تھے، عارف جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں، اس لیے مرزا نے ان بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار کیے پھرتے رہے جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے، ان کے آرام کے لیے آپ بے آرام ہوتے تھے ان کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے کمال کی دولت ان سے لیتے تھے، دنیا کی خدمتوں میں انھیں آرام دیتے تھے

کئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ سرسید لکھتے ہیں میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جو ہر گراں مایہ آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر بھی جزو دان حافظہ میں محفوظ اور صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔[1]

موجودہ انتخاب دیوانِ غالب

مولانا فضل حق جس زمانہ میں دلی میں سررشتہ دار تھے اس وقت مرزا خانی کوتوال شہر تھے یہ تھے مرزا قتیل کے شاگرد، نثر و نظم میں کامل دستگاہ حاصل تھی، ان ہر دو باکمالوں سے مرزا غالب سے دلی دوستی تھی، ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے مولانا آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو، مرزا صاحب نے دیوان حوالے کیا، دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا وہی دیوان ہے جسے آج عینک کی طرح لگائے پھرتے ہیں۔[2]

مرزا خانقاہ تصوف میں

مرزا غالب رند لاابالی ہونے کے باوجود خوش عقیدہ شخص تھے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:
"ایک روز ارشاد ہوا کہ ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہایت حسن اخلاق سے ملے لب فرش تک آکر لے گئے، تمام حال دریافت کیا ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند

---

[1]: تذکرہ اہل دہلی (سرسید) ص۱۱۱۔

[2]: آب حیات ص۵۲۱۔

ہے علی الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو — تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب یہ شعر تو میرا نہیں کسی اُستاد کا ہے فی الحقیقت نہایت ہی اچھا ہے۔ مگر میرے اشعار یہ ہیں :-

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اُس دن سے مرزا صاحب نے یہ دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے مگر مانتے نہ تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے میں اس قابل نہیں ہوں میخوار روسیاہ، گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے شرم آتی ہے البتہ اُلش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔ اُن کے مزاج میں کمال کسرِ نفسی اور فروتنی تھی[1]۔

---

[1]: تذکرہ غوثیہ ص ۱۱۰-۱۱۱؛

غالب اور رجب علی بیگ سرور

ایک روز ارشاد ہوا کہ مرزا رجب علی سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے آئے مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اُردو زبان میں کس کی کتاب عمدہ ہے۔ کہا چہار درویش کی۔ میاں رجب علی بولے: "اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟" مرزا بے ساختہ کہہ اُٹھے اجی لاحول ولا قوۃ! اس میں لطفِ زبان کہاں، ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔ اس وقت تک، مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا کہ ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہو گیا۔ آیئے آج ان کے مکان پہ چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔ ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ: جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو جو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہوگی اور کیونکر ہو اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور اُن کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن اُن کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا: اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِہٖ وَلِسَانِہٖ ۔

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست[1]

غالب کا مکان

حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے گلی قاسم جان کی گلی کٹی ہے۔ بائیں طرف ہی مرزا نوشہ کا مکان تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے اس کے دو

---

[1] تذکرہ غوثیہ ص ۱۱۱ ۔

دروازے ہیں، ایک مردانہ دوسرا زنانہ محل سرا کا ایک راستہ مردانے مکان میں سے بھی ہے باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا ادھنسی سی ہے دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کھڑکیاں گرمی میں دوپہر کے وقت مرزا صاحب اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں۔ دروازے سے گذر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے تھے کچھ لکھ رہے تھے۔ مرزا نوشہ کی عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی حسین اور خوش رو آدمی ہیں۔ قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ سفید رنگ ہے لیکن اس میں کچھ زردی جھلکتی ہے ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا ہے آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ہیں داڑھی بھری ہوئی ہے مگر گھنی نہیں ہے سر منڈا ہوا۔ اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے ایک برکا سفید پائجامہ، سفید ململ کا انگرکھا اس پر ہلکی زرد زمین کا جامہ واری چغہ[۲]

غالب کے لطیفے

لطیفہ ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے، چاندنی رات تھی، تارے چھٹکے ہوئے تھے، آپ آسمان دیکھ کر فرمانے لگے جو کام بے صلاح مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے، خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے نہیں بنائے جبھی بکھرے ہوئے ہیں، نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیر نہ بیل نہ بوٹا ۔

لطیفہ ایک مولوی جن کا مذہب سُنّت والجماعت تھا، رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے عصر کی نماز ہو چکی تھی، مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا، مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب

۱۔ دلی کی آخری شمع صفحہ ۲۰-۲۱ ۔

۲۔ قلعہ دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے اس سے یہ لباس لیا گیا ہے ۔

کرتے ہیں رمضان میں روزے نہیں رکھتے، مرزا نے کہا سنی مسلمان ہوں چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں ؎

لطیفہ رمضان کا مہینہ تھا آپ نواب حسین مرزا کے یہاں بیٹھے تھے، پان منگا کر کھایا ایک صاحب فرشتہ سیرت نہایت متقی و پرہیزگار اس وقت حاضر تھے انھوں نے متعجب ہوکر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے۔

لطیفہ جاڑے کا موسم تھا ایک دن نواب مصطفیٰ خان صاحب مرزا کے گھر آئے آپ نے اُن کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا وہ اُن کا منھ دیکھنے لگے آپ نے فرمایا لیجیے، چونکہ وہ تائب ہوچکے تھے انھوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی ہے آپ متعجب ہوکر بولے کہ ہیں جاڑے میں بھی! ؎

لطیفہ ایک صاحب نے انھیں سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پیئے تو کیا ہوتا ہے انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دُعا نہیں قبول ہوتی، مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے، اوّل تو وہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی باآسانی سامنے حاضر ہو دوسرے بے فکری، تیسرے صحت آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور چاہیئے کیا جس کے لیے وہ دُعا کرے ؎۱

جواب لاجواب ایک دن ہم نے مرزا غالبؔ سے پوچھا: تم کو کسی سے محبت بھی ہے، کہا کہ ہاں! حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام سے پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو۔ ہم نے کہا واہ صاحب! آپ تو مغل بچہ ہوکر علی مرتضیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھریں اور ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں، کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے ؎۲

---

۱ : آبِ حیات (محمد حسین آزاد)

۲ : تذکرہ غوثیہ ص ۱۱۲-۱۱۱

آدھا مسلمان

بیان کیا جاتا ہے کہ کرنیل نے غالب سے پوچھا کہ تم مسلمان ہو ؟ کہا آدھا، شراب پیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا [1]

دلچسپ عیادت

ایک دن بہن کی عیادت کو گئے، دیکھا کہ بہن کی حالت اچھی نہیں ہے۔ بھائی کی صورت دیکھ کر بہن رونے لگیں، مرزا نوشہ نے بسور کر کہا کہ بہن روتی کیوں ہو ؟ بہن نے کہا کہ روتی تو یوں ہوں کہ موت کا پیغام تو آچکا ہے، اب بچنے کی امید نہیں، لیکن مجھ پر قرض بہت سا ہے، دیکھئے وہاں کیا بنتی ہے یہ سن کے اسی رونکھی آواز میں مرزا نوشہ نے کہا کہ بہن کچھ غم نہ کرو، مفتی صدرالدین آسمان پہ تمھارے نام سمن جاری نہیں کرا سکتے، نہ تم پر وہاں ڈگری دیں گے، تم ناحق اپنا جی کڑھاتی ہو [2]

مرزا کی پنشن

مرزا اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ صاحب، کے گھر میں کچھ گورے گھس گئے اور ان کو گرفتار کر کے لے گئے اور کرنیل برن کے سامنے ان کو پیش کیا، مرزا صاحب کی کچھ زندگی ابھی باقی تھی ان کے ایک دوست اتفاق سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے ان کی سفارش کر کے رہائی دلا دی، ان کا کمپنی کی طرف سے ساٹھ روپے ماہوار پنشن مقرر ہوا لیکن اس میں ان کی گزر بہ دقت ہوتی ہے، ہمیشہ تنگ دست رہتے ہیں [3]۔

ایک اور مذاق

کسبیوں کا ناچ ہو رہا تھا کہ مرزا نوشہ تشریف لانے، ان کے ایک بھائی نے جو ایک چھوٹی ریاست کے نواب تھے امیر خسرو کی خالق باری کا مرزا نوشہ کو دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا ”بیا برادر، آور سے بھائی“ مرزا نوشہ نے بے ساختہ یہ جواب

---

[1] : غالب (غلام رسول مہر) صفحہ ۲۵۲ ۔

[2] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) صفحہ ۳۲ ۔

[3] : نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۱۰ ۔

دیا کہ دوسرا مصرعہ بھائی تم نے کس لیے چھوڑ رکھا ہے یہ بی صاحبہ کی طرف خطاب کرکے پڑھ دو اس پر مجلس میں بڑا قہقہہ پڑا اور وہ مصرعہ یہ ہے "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی" یہ عام طور پر سنا جاتا ہے۔ کہ جب کوئی بڑا معرکہ کا مشاعرہ ہوتا تو مرزا نوشہ ذوق کے مقابلے میں نہ آتے تھے اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتے تھے۔ چنانچہ ہنگش کے کمرے میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا، مرزا نوشہ کو بلایا گیا مگر انھوں نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے ٹال دیا اور اس مشاعرے میں استاد ذوق نے وہ مشہور غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی ۔۔۔ دنیا میں گرانباری اولاد غضب ہے[1]

مرزا غالب اور سر سیّد

مرزا غالب کی تقریظ جو ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے وہ کلیات غالب میں موجود ہے مگر آئین اکبری میں سر سید نے اس کو قصداً نہیں چھپوایا اس تقریظ میں مرزا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ابوالفضل کی کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کی تصحیح میں اس قدر کوشش کی جائے چنانچہ کہتے ہیں۔

مژدہ یاراں را کہ ایں دیریں کتاب ۔۔۔ یافت از اقبال سید فتح باب

دیدہ بینا آمد و باز و قوی ۔۔۔ کہنگی پوشید تشریف نوی

دیں کہ در تصحیح آئین رای اوست ۔۔۔ ننگ و عار ہمت والائی اوست

اس کے بعد بہت سے اشعار اس مضمون کے لکھے ہیں کہ تعریف کے قابل انگریزوں کے آئین وایجاد و اختراع ہیں نہ کہ اکبر اور ابوالفضل کے اور تمثیلاً انگریزوں کے بہت سے ایجادات کے بیان کئے جب یہ تقریظ سر سید کو مرزا نے بھیجی انھوں نے اس کو مرزا کے پاس بھیج دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں[2]۔

---

[1] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۳۳ ؛

[2] : حیات جاوید (حالی) ص ۴۵ ؛

مرزا غالب کی شوخی اور بذلہ سنجی

مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میر مہدی تم میری عادات کو بھول گئے، ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینہ میں رام پور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے، برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں پہنچا، یکشنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا، اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو جامع مسجد میں جا کر تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں واہ وا! کیا عمر بسر ہوتی ہے اب اصل حقیقت سنو، لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا، وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے اس سبب سے ہمراہ چلا آیا، ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا، اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا۔ اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپیہ، بھائی سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ اور شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں ملاقات بھی دوستانہ رہی، معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے، لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی بس بہرحال غنیمت ہے، رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیئے کمی کا شکوہ کیا؛ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے اس میں سے مجھے ساڑھے سات سو روپیہ ملا اور ایک صاحب نے نہ دیئے، مگر تین ہزار روپیہ سال۔ عزت میں وہ پایہ جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔ خانصاحب بسیار مہربان دوست القاب خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید بادشاہ اپنے فرزندوں

کے بار بار پیار کرتے تھے بخشی ناظر حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل سویری جان یہاں بھی وہی نقشہ ہے، کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہے ہوا آرہی ہے، پانی کا جھجر ادھر اٹھا ہے حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا یہ باتیں کر لیں۔[1]

غالب کا مقابلہ اپنے معاصرین شعرائے سے

"علوئے خیال، فلسفۂ حیات، اور ذہانت وطباعی میں غالب اپنے معاصرین مومن و ذوق سے بڑھ کر ہیں مگر روزمرہ اور سادگی بیان اور محاورہ بندی کے اعتبار سے ذوق ان سے بڑھے ہوئے ہیں گو کہ مومن اس میں بھی ان سے کم ہیں۔ یورپ کے شاعروں میں جو ان کے ہمعصر یا قریب العہد تھے ان کے کلام کا توازن ذیل کے کلام سے کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ رابرٹ براؤننگ جو انگلستان کا اسی عہد کا ایک شاعر تھا پروفیسر سینٹسبری براؤننگ اسکی نسبت لکھتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ روح کا تجزیہ کرتا ہے۔ مرزا غالب تجزیہ اس قدر نہیں کرتے جتنا کہ رموز روحانی کے عمق کو دریافت کرتے ہیں، حقائق کی جھلکیاں وہ دیکھتے ہیں ان کا کلام مثل مولانا روم وغیرہ کے سراپا اسرار و تصوف نہیں ہے اور نہ من اولہ الیٰ آخرہ کوئی فلسفہ ہے، مگر حقائق و رموز کا ان کے کلام میں جابجا پرتو موجود ہے، ان کو صوفی براؤننگ کہنا بجا ہے، ہر چند کہ براؤننگ کے کھرے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔

۲۔ مضامین حزن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر "ہین" سے خوب ہو سکتا ہے

۳۔ مگر فی الحقیقت اگر کوئی شاعر یورپ میں ان کے مقابلہ کا گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف "گوئٹے" ہے، غالب میں ان تینوں چیزوں کا اجتماع ہو گیا ہے۔ یعنی فلسفی کی عقل و ادراک، صوفی کی نگاہ دوربین، چابک دست مصور کا نازک ہاتھ، ان کی صنعت پرکاری اور پرکاری صنعت ہے اور حسن حق ہے وہ ایک صوفی صاف دل تھے اور ان کا یہ

---

[1] : آب حیات (از محمد حسین آزاد)

قول بالکل صحیح ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس کا مضمون کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے، بلکہ وہ واقعات اور واردات سے لبریز ہے اور اسی وجہ سے اس کا شمار دنیا کی بہترین شاعری میں کیا جا سکتا ہے۔

غالبؔ کے شاگرد

غالبؔ کے بکثرت شاگرد تھے، جن میں اصحاب ذیل کے نام قابل ذکر ہیں۔ نواب ضیاء الدین خاں نیّرؔ درخشاں تخلص کہ ان کے عزیز بھی تھے، میر مہدی مجروحؔ۔ مرزا قربان علی بیگ سالکؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ مصنف یادگارِ غالبؔ، منشی ہرگوپال تفتہؔ، نواب علاؤ الدین خاں علوی، زکیؔ، عزیزؔ اور مشاقؔ وجوہر وغیرہ

شوقِ شراب

سرسید کہتے تھے کہ جب میں مرادآباد آیا تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خان مرحوم سے ملنے کو رام پور گئے تھے، ان کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مرادآباد میں سرائے میں آ کر ٹھیرے ہیں، میں فوراً سرائے پہنچا اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں کے اپنے مکان پر لے آیا، ظاہرا جب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامنگیر تھا اس لیے مرزا نے مرادآباد میں آنے کی اطلاع ان کو نہیں دی تھی الغرض جب مرزا سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اُترے تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی، اُنھوں نے اس کو مکان میں لا کر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا

ف۱: تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، صفحہ ۳۳۹ ۔

مرزا نے بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت گھبرائے، سر سید نے کہا، آپ جمع خاطر رکھیے، میں نے اس کو بہت احتیاط سے رکھ دیا ہے، مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو، تم نے کہاں رکھی ہے۔ انھوں نے کوٹھری میں سے جا کر بوتل دکھلا دی، اپنے ہاتھ سے بوتل اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے، سچ بتاؤ کس نے پی ہے، شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی، حافظ نے سچ کہا ہے سہ

واعظان کایں جلوہ در محراب و میکنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

سر سید ہنس کے چپ ہو رہے، اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی دُور ہوئی، مرزا دو دن ٹھہر کر دِلّی چلے آئے [۱]

نمونہ اشعارِ ریختہ

تھی نوآموز فنا ہمّت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہُوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

---

[۱] : حیاتِ جاوید (مولانا الطاف حسین حالی) ص ۲۵ :

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا؛

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مَیں اور خطِ وصل خُدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خون ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

ظالم میرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدانہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مرزا غالب کا مزار (۱۸۶۹ء)

چونسٹھ کھمبے سے ملا ہوا بجانب شمال ایک احاطہ ہیں اور قبروں کے ساتھ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب عرف مرزا نوشہ کی پختہ قبر ہے[1]۔

---

[1] : واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۸۵۴؛

(۷)

حکیم مومن خاں

طبیب حاذق، شاعر بے مثال، مردِ مومن، خود دار اتنا کہ زبان کسی تاجدار اور تاجور کی مدح و قصیدے سے آلودہ نہیں ہوئی، جو خود اقلیمِ شعر و سخن کا تاجدار ہوا ۔ کسی سلطان کی مدح کیا کرے گا؛ جذبہ مذہبیت کا یہ عالم کہ شوقِ شہادت سے سرشار، حضرت سیّد احمد شہید کی تحریک احیاءِ دین کے سلسلہ میں جو والہانہ اشعار کہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں تغزل کا رنگ دوسروں سے ممتاز بھی اور منفرد بھی مرزا غالب نے مومن کا جب یہ شعر سنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اپنا دیوان دینے پر تیار ہو گئے ۔

سرسیّد، مومن خاں کے بارے میں کس جوشِ عقیدت کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

" ان کے کمالات کا اندازہ ظرفِ شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیرون ہے ۔ معنیِ تازہ سے قالبِ الفاظ میں جان ڈالنا ایک شیوہ ہے، معانی پناہ کا اگر یہ کہا جاوے کہ شیرینیِ زبان حافظؔ اور نمکِ سخن سعدیؔ اور متانتِ تراکیبِ انوریؔ اور نشستِ الفاظ خاقانیؔ اور سوا اس کے جو خوبیٔ صنفِ شعرا سے کسی کے ساتھ مختص ہے سب ان کے کلامِ معجز نظام میں ہے حق شناسی اور مرتبہ سے بہت بعید اور نہایت دور از کار ہے حق یہ ہے کہ قسّامِ ازل نے سب کو انھیں کے خوانِ استعداد سے منصب ریزہ چینی اور انھیں کے دیگ کمال سے وظیفۂ چاشنی گیری عطا کیا ہے، زبانِ ریختہ میں وہ کمال مبدء فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سوداؔ کو اُن کے سخن کے رشک سے جنون اور میرؔ ان کے کلام کی خجالت سے مرقد میں سرنگوں سخن گوئی کو

یہ حدِ اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے مرتبہ حکمت کا پایا، نکاتِ سخن اور دقائقِ فن ان کی قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے بارانِ لطافت، ابیات ان کی مثل بیت ابرو سراپا انتخاب اور اشعار ان کے مانندِ مصرعِ زلف مجموعہ آب و تاب، سخن اُن کا باوصف پرگوئی کے رکاکت سے خالی اور فکر ان کا باوجود غور کے عالی[۱]

مومن کا خاندان

ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خان شہر کے شرفا میں سے تھے (جن کی اصل نجبائے کشمیر سے تھی) اوّل حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلاہرہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا، رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثۂ حکیم نامدار کے نام مقرر کر دی، پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصّہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکارِ انگریزی سے بھی ملتی تھی، اس میں سے ایک چوتھائی اُن کے والد کو اور اُن کے بعد اس میں سے ان کو حصّہ ملتا رہا ؛

ان کی ولادت ۱۲۱۵ھ ہجری میں واقع ہوئی، بزرگ جب دلّی آئے تو چیلوں کے کوچہ میں رہے تھے وہیں خاندان کی سکونت رہی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آکر کان میں اذان دی اور مومن خان نام رکھا، گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا ؛

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی

---

۱ : تذکرۂ اہل دلّی (سر سیّد) ص ۱۴۹ ؛

خدمت میں پہنچایا۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے، حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے، فوراً یاد کر لیتے تھے، اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہٖ اسی طرح ادا کر دیتے تھے، جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔

نیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی ایسا ملکہ بہم پہنچایا کہ احکام سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے پھر برس دن تک ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی، جب کوئی سوال پیش کرتا نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو جو میں کہتا جاؤں اس کا جواب دیتے جاؤ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا۔[1]

ایک نقاد کی رائے

"مومن کی آسودہ حالی اور مذہبیت نے ان کے اندر خودداری اور استغنا کی شان پیدا کر دی تھی۔ ان کے یہاں نہ ذوق کی سی لابہ گری ہے اور نہ غالب کا سا "ناخدا باشد بہادر شاہ باد" والا اندازِ بیاں۔ نہ انگریز حکام کی ثنا گستری نہ چاپلوسی اس کے برخلاف وہ مثنوی جہادیہ میں لکھتے ہیں ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا
فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا[2]

ح[1] : آبِ حیات ص۴۹۳ ؛

ح[2] : کلاسکی ادب (خواجہ احمد فاروقی) ص۱۰۳ ؛

مومن کی حیاتِ معاشقہ

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے :- صاحب ایک عورت مسماۃ امتہ الفاطمہ بیگم جس کو صاحب جی بھی کہتے ہیں درمیان شاہجہان آباد کے حکیم مومن خاں سے ملاقات اس کی بتقریب علاج کے ہوئی تھی، مدت تک آشنائی رہی کئی سال گزرے کہ لکھنؤ چلی گئی ہے وہ ایک خانگی تھی۔ مثنوی قولِ عمیق مومن خان کی اسی محبوبہ کے حق میں ہے۔ بسبب فیض صحبت مومن خاں صاحب کے وہ بھی شعر کہنے لگی تھی[1]

مومن خان کی سج دھج

حکیم آغا جان کے چھتے کے سامنے خان صاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے اور اندر وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے، دو طرف صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان ہیں پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے سامنے کے دالان کی چھت کو صحن کر دیا لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے[2]۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے، قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم مومن خاں بیٹھے ہیں سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مودب دوزانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔

حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی، کشیدہ قامت تھے، سرخ سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں لانبی لانبی پلکیں کھنچی ہوئی بھویں لمبی لمبی ستواں ناک پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں خشخشی داڑھی، بھرے بھرے بازو پتلی کمر، چوڑا سینہ لمبی لمبی انگلیاں سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں، کان کے قریب تھوڑے سے بالوں

ح[1] : تذکرہ کریم الدین ص ۳۷۲

ح[2] : اس منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خان نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اس کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ لکھی تھی: "دست و بازو بشکست"

کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا، بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا، لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا، گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ خاک ریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدن کا مہرنوں پاجامہ پر سے تنگ اوپر جاکر کسی قدر ڈھیلا کبھی کبھی ایک برکا پائجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو، ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی الٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی پڑی دوپلڑی ٹوپی اس کے کنارہ پر باریک لیس ٹوپی اتنی بڑی تھی۔ کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی، اندر سے جالگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے، غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔[1]

اختر شناس شاعر ایک روز مومن خاں اپنی حویلی میں تشریف فرما تھے، ان کے ہندو شاگرد سکھانند بھی بیٹھے تھے مومن خاں نے ان سے کہا: میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ دیوار سے نہ جائے گی، اس کا جوڑا آتے پر آئے گا۔

سکھانند حکیم تھے، رقم تخلص کرتے تھے، دھرم پورے میں رہتے تھے، کوئی چالیس سال کی عمر تھی، ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خان صاحب کے شاگرد تھے، بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے، استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا ادب کرتا ہے، حکیم صاحب کی باتیں سن کر بہت مناسب کہتے رہے، ان سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے: ارے بھائی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت سے تو ہو اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں، مولوی صہبائی نے کہا یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع

---

[1]: دلی کی آخری شمع صد ۲۴، ۲۵ ۔

کھول لیا، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس مجھے معاف ہی کیجئے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے ایک صاحب ہیں جو اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ وا، سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت منغص کر دیتے ہیں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا شہر میں جب کوئی آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا ریشمی کپڑوں سے اُن کو عشق تھا، کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے جو مانگتا دیتے، اس سوداگر نے آ کر گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری اس میں سے پٹ سے چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر بیٹھی تھی۔ وہ لپک کر اس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے[1]۔

مومن خاں کی قابلیت

خانصاحب نے فرمایا کہ مولوی سراج احمد صاحب خجسوی فرماتے تھے کہ مومن خاں اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیلا کرتے تھے اور مومن خاں کھیل میں غالب رہتے تھے ایک مرتبہ مرزا غالب نے مولوی فضل حق صاحب سے کہا کہ آپ اس قدر تیز طبع اور ذہین ہیں پھر کیا بات ہے کہ مومن خاں سے مات کھا جاتے ہیں مولوی فضل حق صاحب نے فرمایا کہ مومن خاں بھیڑیا ہے اسے اپنی قوت کی خبر نہیں ہے وہ عشق و عاشقی کے قصّوں میں پھنس گیا اگر علمی مشغلہ میں پڑتا، اس وقت اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔ فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے[2]۔

خانصاحب نے اپنی نجوم دانی کو ایک غزل کے شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس

آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

ص[1] : یہ واقعہ ہے اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا، ابھی کوئی بیس[2] برس ہوئے انتقال ہُوا، میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سنا ہے۔ (دلّی کی آخری شمع) صفحہ ۳۶ - ۳۷۔

ص[2] : امیر الروایات صفحہ ۱۶۱۔

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے دلی کے مشہور شاطر کرامت علیخان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے[1]

مومن کے استاد اور شاگرد

شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔

ان کے نامی شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرہ گلشن بیخار، خلف نواب عظم الدولہ سرفراز الملک مرتضیٰ خاں مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور ان کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کہ چار برس ہوئے راولپنڈی میں دنیا سے انتقال کیا۔ میر حسین تسکین کہ نہایت ذکی الطبع شاعر تھے۔ سید غلام علی خاں وحشت، غلام ضامن کرم، نواب اصغر علی خاں کہ پہلے اصغر تخلص کرتے تھے۔ پھر نسیم تخلص اختیار کیا اور مرزا خدا بخش قیصر شہزادے وغیرہ اشخاص تھے[2]

مومن ترنم سے پڑھتے تھے

"رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پر لمبے لمبے گھونگروالے بال اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائنچے اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا، میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا، اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے باتیں کہاں ہوگئیں باوجود اس کے نیک خیالوں سے بھی ان کا دل خالی نہ تھا، نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے

---

[1] : آب حیات ص ۴۹۹ ۔

[2] : آب حیات ص ۵۰۰ ۔

مُرید ہوئے جو مولوی اسمٰعیل صاحب کے پیر تھے۔ خانصاحب انھیں کے عقائد کے بھی قائل رہے[1]

خود دار شاعر

راجہ کپورتھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینہ کر کے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا وہ بھی تیار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویّے کی بھی یہی تنخواہ ہے، کہا کہ جہاں میری اور ایک گویّے کی برابر تنخواہ ہو میں وہاں نہیں جاتا ؛

جس طرح شاعری کے ذریعے سے انھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا اسی طرح نجوم۔ رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا جس طرح شطرنج ان کی ایک دل لگی کی چیز تھی اسی طرح نجوم، رمل اور شاعری کو بھی ایک اور بہلاوا دل کا سمجھتے تھے ؛

خانصاحب پانچ چار دفعہ دلی سے باہر گئے، رام پور جا کر کہا ؎

دلی سے رام پور چلا لایا جنوں کا شوق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسوان گئے[2]

اُستادانہ کمال

ان کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا :۔

ہجر میں کیونکہ پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہُوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہُوا

خانصاحب نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہُوا

---

[1]: آب حیات ص ۴۹۰ ؛

[2]: آب حیات ص ۴۹۵ ؛

اہل مذاق جانتے ہیں کہ اب شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا
ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا :-

"مجھ گنہ گار کو الٰہی بخش"

خانصاحب نے فرمایا :-

"میں گنہ گار ہوں الٰہی بخش"[1]

مومن کی تاریخیں

مومن کی تاریخیں بڑی برجستہ اور بے ساختہ ہوتی تھیں۔ چند ملاحظہ ہوں۔
خلیل خاں کے ختنہ کی تاریخ کی :-

سُنّت خلیل اللہ

اپنی عمہ کے مرنے کی تاریخ کہی

"لہا اجرٌ عظیم"

اپنے والد کی تاریخ کہی

"قد فاز فوزاً عظیما"

اپنی بیٹی کی تاریخ ولادت کہی

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ "دخترِ مومن"

شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی تاریخ

دستِ بے دادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم علم و عمل

---

[1] : آب حیات ص ۴۹۳ ؎

مصرع کے اوّل و آخر کے حرفوں کو گرادو، بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو ۱۲۲۹ھ رہتے ہیں۔ ان کے معمّے متعدد ہیں مگر ایک لاجواب ہے ایسا سنا نہیں گیا

ہے کیونکر کہ ہے سب کار الٹا

ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

یعنی "مہتاب رائے"[1]

سکسینہ کی رائے

"مومن شعرائے اردو میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دلفریب شاعری کی وجہ سے بلکہ اس لیے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی، منشی امیر اللہ تسلیم، حسرت موہانی وغیرہ ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں۔ مومن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرہ گلشن بے خار، میر حسین تسکین، میر غلام علی وحشت، اصغر علی خان نسیم وغیرہ

مومن کا انتقال ۱۲۶۸ھ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر کر ہوا۔ انھوں نے حکم لگایا تھا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ سال میں مر جاؤں گا، چنانچہ پانچ ماہ کے بعد مر گئے، گرنے کی تاریخ خود کہی تھی۔ "دست و بازو بشکست" چونکہ اسی سال انتقال ہو گیا تھا، لہٰذا یہی تاریخ ان کے مرنے کی سمجھنا چاہیئے"[2]

جذبہ جہاد

مومن جیسے رند غزل خواں کے انگریزوں کے خلاف یہ جہادیہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ میں ہوں تیرہ نصیب پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار

یا فرماتے ہیں:۔

---

[1]: آب حیات ص ۴۹۶

[2]: تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ ص ۳۰۰

الٰہی بیا مرز مظلوم را — کلاہ شہی دہ بہ ملک بقا[۱]
بفردوس اعلیٰ بود جائے او — بہشت بریں باد ماوائے او

نمونۂ کلام

خو ہو گئی ہجر میں تڑپنے کی شب وصل
گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہو گا

عشق کیوں درپئے جاں شوق ہے کیوں سینہ شگاف
دشمنی دل شکنی شیوۂ احباب نہیں
گلہ چرخ عبث شکوۂ جاناں بے جا
یاس و حرماں کو مری حاجت اسباب نہیں

گزرے ہیں میری خاک پہ غیروں کے ساتھ وہ
فتنہ اٹھائے گرد پس کارواں نہیں
لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں
اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنہ آخر زماں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

---

[۱] : داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری)

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اوس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گیا اضطراب میں

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کہا اوس بت سے مرتا ہوں تو مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

---

(۸)

میر مہدی مجروحؔ

میر مہدی مجروحؔ خلف میر حسین نگار مرزا غالبؔ کے محبوب اور سب سے عزیز شاگرد، دلی کے رہنے والے تھے۔ غدر کے زمانے میں وطن چھوڑ کر پانی پت چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی، کچھ عرصہ بعد جب غدر کا طوفان فرو ہوا اور دلی میں گونہ امن کی صورت پیدا ہوئی تو یہ پھر دلی آ گئے اور اپنے قدیم مشغلہ شعر و سخن سے دلچسپی لینے لگے اور مشاعروں میں شریک ہوتے، بعد چند روز کے بہ تلاش معاش الور گئے، جہاں مہاراجہ شیو دھان سنگھ نے ان کی قدر کی، آخر عمر میں نواب صاحب رام پور کی قدر دانی سے اس ریاست میں چلے آئے اور بفراغت زندگی بسر کی۔ ۱۳۱۶ھ ہجری میں اپنا ایک دیوان "مظہر معانی" کے نام سے چھپوایا، میر مہدی کی زبان نہایت سادہ، صاف اور شیریں ہے، چھوٹی بحروں میں ان کا کلام بوجہ احسن معلوم ہوتا ہے، خیالات میں ندرت اور مضامین میں جدت ان کے کلام میں نہیں ہے مگر طرز ادا استادانہ اور شعر عیوب سے پاک ہیں، مولانا حالیؔ ان کے بڑے معترف تھے، میر مہدی مجروحؔ ان لوگوں میں ہیں جن کو اردو شاعری کی آخری یادگار تصور کرنا چاہیئے، انھوں نے اردو شاعری کی روایات قدیمہ کو حتی الامکان خوب نباہا۔ مرزا غالبؔ کے اکثر دلچسپ خطوط عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں ان کے نام موجود ہیں[1]۔

---

[1]: تاریخ ادب اردو - رام بابو سکسینہ صفحہ ۳۴۰

(۹)

میر نظام الدین ممنونؔ[1]

میر نظام الدین متخلص بہ ممنونؔ خلف ملک الشعراء میر قمر الدین منتؔ پیش گاہ خلافت و بارگاہ سلطنت دارائے ہند سے مخاطب بخطاب فخر الشعراء سخن میں ایک طرز تازہ کو ایجاد اور ادبیات بلند کو معانی ارجمند سے آباد کیا۔ متانت کلام صفائی عبارت اور تازگی مضمون اور غرائب تشبیہ اور نوی استعارات جیسے اس گروہ اہل کمال کے سخن میں موجود ہے کسی اہل فن کے سخن میں متصور نہیں ہے الحق ریختہ کو فارسی اور اردو کو دری کر دیا، نہ ان کے قصیدہ کے سامنے قصائد قدما کو رتبہ ہے نہ ان کی غزل کے آگے غزلیات متاخرین کو رتبہ، ہر نقطہ ان کے سخن کا گوہر آبدار اور ہر لفظ اُن کے کلام کا لولائے شاہوار طبع بلند ان کی دریائے ذخار ہے اور خامہ معنی طراز ابر گوہر بار موہبت فیض حقیقی سے مرتبہ اس بیگانہ روزگار کا مستغنی ہے اس سے کہ قلم ان کی تعریف میں کچھ لکھے یا زبان ان کی توصیف میں کچھ کہے، بے تکلف تشریح بدن اشعار کے باب میں جالینوس اور نگہبانی چراغ معنی کے واسطے طبیعت اُن کی فانوس۔ عرصہ تین برس کا ہوتا ہے کہ اس جہانِ ناپائیدار سے رخت سفر کو باندھ کر راہی جنت ہوئے[2][3]؛

نمونۂ کلام

بُرا مانیئے مت مرے دیکھنے سے
تمھیں حق نے ایسا بنایا تو دیکھا

---

[1]: گلشن بے خار صفحہ ۱۰۷ اور سخن شعراء نساخ صفحہ ۴۵۵ میں ان کا تذکرہ اور انتخاب دیا گیا ہے؛

[2]: تاریخ وفات ۱۲۶۰ھ ہجری؛

[3]: تذکرہ اہل دہلی از سید، ص ۱۶۴؛

اور ملی سو شور محشر گرد ہو ہیاں ایک جنبش میں
کیا تو نے غبار اے چرخ ہم کو کس کے داماں کا

قرباں ناز نعش میری دیکھ کر کہا
گردن پہ کس کی خون ہے اس بے گناہ کا

ہاتھ میں جنبش محمل کے عناں ہے اپنی
ورنہ یہاں کس کو ہے سر آبلہ فرسائی کا

غموں کی گر یہی بالیدگی ہے تو آخر
دل گرفتہ نہیں سینہ میں سمانے کا

بے تابیٔ دل تیری شہیدوں کی کہاں جائے
کچھ کم رگ بسمل سے نہیں تارِ کفن کا

ممنون قضا نے ہم کو دیا کیا بغیر دل
سو وہ بھی نذر کاہش و تشویش ہو گیا

نہیں دیتی دکھائی صورت زیست
غضب صورت ہوں آیا دیکھ کر آج

یوں تو ہے وہ فرشتہ خو لیکن
ہے ذرا آدمی کشی کا شوق

بس جناب زور آزمائی ہو چکی
دلبروں سے ہاتھا پائی ہو چکی
رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت
صلح کیجئے بس لڑائی ہو چکی

تفاوت قامت یار اور قیامت میں ہے کیا ممنون
وہی فتنہ ہے لیکن یہاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

---

(۱۰)

ضیاء الدین خاں نیرؔ رخشاںؔ[1]

بلند پایہ شاعر اور بہت اچھے انسان تھے، محمد حسین آزادؔ، ان کا ذکر بڑے چاؤ سے کرتے ہیں بین السطور سے محبت اور عقیدت ٹپک رہی ہے :-

" فخر الدولہ مرحوم، نواب امین الدین خاں، نواب ضیاء الدین خاں کو جدا جاگیر دے گئے تھے کہ لوہارو مشہور ہے، نواب امین الدین خان مسند نشین ریاست رہے، ان کے بعد ان کے بیٹے نواب علاؤ الدین خاں مسند نشین ہوئے کہ علوم مشرقی کے ساتھ زبانِ انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہیں۔ علائیؔ تخلص کرتے ہیں اور غالبؔ مرحوم کے شاگرد ہیں، نواب ضیاء الدین خان بہادر کو علوم ضروریات سے فارغ ہو کر فن شعر اور مطالعہ کتب کا ایسا شوق ہوا کہ دنیا کی کوئی دولت اور لذت نظر میں نہ آئی اب تک اس میں محو ہیں، غالبؔ مرحوم کے شاگرد ہیں۔ فارسی میں نیرؔ تخلص کرتے ہیں احباب کی فرمائش سے کبھی اردو میں بھی کہہ دیتے ہیں اور اس میں رخشاںؔ تخلص کرتے ہیں فقیر آزاد اور اس کے حال پر شفقت بزرگانہ فرماتے ہیں، خدا دونوں کے دامنِ کمال کا سایہ اہل دلی کے سر پر رکھے۔ انہی لوگوں سے دلی دلی ہے ورنہ اینٹ پتھر میں کیا دھرا ہے ؎

هم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو"

نواب احمد بخش کے بارے میں آزادؔ کہتے ہیں :-

• نواب احمد بخش خاں، راؤ راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کی طرف سے معتمد اور وکیل ہو کر للارڈ لیک صاحب بہادر کے ساتھ ہندوستان کی مہمات میں شامل رہے اور اپنی ذات سے بھی رسالہ

---

[1]: آبِ حیات (محمد حسین آزاد)

رکھ کر گورنمنٹ کی خدمات بجالاتے رہے۔ اس کے صلہ میں فیروز پور جھرکہ وغیرہ جاگیر سرکار سے عنایت ہوئی اور دربار شاہی سے خطاب فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ بوسیلۂ ریزیڈنٹ دہلی عطا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین خان جانشین ہوئے۔ مگر زمانہ نے اس کا ورق اس طرح الٹا کہ نام ونشان تک نہ رہا۔[1]

سرسید ان کے بارے میں فرماتے ہیں :-

ان کی رفعت شان کے سامنے بلندی آسمان کی کمتر ہے پستی زمین سے اور ان کے حشمت و اقبال کے آگے جاہ سکندر اور دستگاہ دارا ادنیٰ سے مرتبہ بندہ کمیں سے۔ ان کی سخاوت کے دور میں حاتم کو سخی کہنا سخن استہزا ہے اور ان کی شجاعت کے سامنے رستم کو شجاع ٹھیرانا کلام ظرافت انتما صبح ان کے خندۂ لطف سے نمایاں اور آفتاب ان کے ضمیر سے درخشاں، سخاوت اور ان کی طبیعت جیسے موج اور دریا لطف اور ان کا مزاج جیسے خضر اور آب بقا۔ سبحان اللہ! ان کی رفعت مرتبہ آسمان سے ہم پہلو اور ان کی رسائی تدبیر تقدیر کے ساتھ ہم بازو لطف سخن سے نفس ان کا رشتۂ گوہر اور صفائی عبارت سے کلام ان کا موج کوثر۔ سخن کو اس صاحب قدرت کی زبان سے کلام کا وہ رتبہ حاصل ہوا ہے کہ اگر ہر حرف کو دعو سلے دو حرف کن کا ہو تو لائق ہے اور کلام کو اس والا فطرت کی طبیعت سے وہ پایۂ بہم پہنچا کہ ہر نکتہ اس کا الہام سے اور ہر دقیقہ اس کا کشف سے فائق ہے۔ مضامین غزل کی شوخی بعینہٖ خرام آہو، فکر ان کا مثل ملائک کے آسمان پیما اور اندیشہ ان کا مانند دعائے مستجاب کے تا عرش رسا، خلف الرشید ہیں نواب جناں مآب گردوں جناب معلیٰ القاب فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر مرحوم والیٔ فیروز پور جھرکہ کے، اور علاوہ قرابت قریبیہ نسبت تلمذ کی مرزا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں رکھتے ہیں کمال توجہ استاد سے کلام ان کا سخن قدما کے ہم پایہ ہے۔[2]

---

[1]: آبِ حیات (محمد حسین آزاد)۔

[2]: تذکرہ اہلِ دہلی (سرسید) صفحہ ۱۲۰۔

شبلی کا مرثیہ

نواب ضیاء الدین خان نے ۲۶ جون ۱۸۸۵ء کو انتقال کیا، شمس العلماء شبلی نعمانی نے یہ مرثیہ لکھا :-

آں طراز سخن آں یوسف کنعان سخن
آں کہ آراست ز نو زلف پریشان سخن
آں کہ صد پایہ فزود از بخشش شان سخن
آں کہ لعل و گہر افشاند بدامان سخن

ورنہ رندیست کہ از جام اجل مدہوش است
عالم زد بہ سخن ماندہ و او خاموش است

آں گراں پایہ کہ دوں مرتبۂ اوست سخن
شاعرے کز دم و گلشن ہمہ بادوست سخن
فیض او بیں کہ بایں رنگ بایں پوست سخن
خواجہ او بود و تواں گفت کہ ہندوست سخن

اینک از دست اجل جیب دو جوش چاک است
پایۂ فن بہ فلک بردہ و خود بر خاک است

علم و فن را بہ جہاں داد گرے بود نماند
نکتہ سنج دیدہ ورے بود نماند
در جہاں نخل بود مثمرے بود نماند
نظم را خامۂ او بال پرے بود نماند

مشکلیا دست نہ از دامن ادراک بزن
شیشۂ صبر ازیں حادثہ برخاک بزن
اے جنوں جیب وگریباں خود چاک بزن
تو ہم اے نالہ سرا نالہ بر افلاک بزن
گر نہ خوں گشتہ بہ مژگاں حرم می آئی
آخر اے دل بہ چہ کار دگرم می آئی[1]

نمونۂ کلام

جب اپنے شغل سے دل خونیں نہ باز آئے
پھر کیا گناہ دیدۂ خونناب بار کا

جب چاہو آؤ دل میں کہ ہے آپ کا مکاں
یاں خوف شحنہ و خطر پاسباں نہیں
گرانبہا نہیں ستم وجہ یار کی
شوق زیادہ جو کو مری بھی گراں نہیں

---

[1] : واقعات دار الحکومت دہلی (حصہ دوم) ص ۴۴۳

نکلے آنکھوں سے وہیں جذب ہوئے دامن میں
بجز اشکوں کے سوا، گوہر نایاب نہیں

پیری و مفلسی میں نہ لو نام مے کہ اب
لطف ارتکاب میں ہے نہ اجر اجتناب میں

آتی ہے بو تراب لحد سے عبیر کی
رخشاں ہوئے جو خاک غم بوتراب میں

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر
گذرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

کیا پہنچے تو فرشتہ کا جس جا گذر نہ ہو
بیت الصنم ہے شیخ خدا کا یہ گھر نہ ہو

چل کر خرام ناز سے برپا کرے وہ حشر
گر باز پرس کا اُسے خوف و خطر نہ ہو

آنسو اگرچہ رکھتے نہیں لیکن آہ گرم
ہے تجھ سے چشم داشت کہ یہ نامہ بر نہ ہو

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک
آنکھوں میں آگیا کوئی لخت جگر نہ ہو

رات سینہ سے سینہ کس کا ملا
کہ معطر مرا گریباں ہے

---

(۱۱)

پنڈت نرائن داس ضمیؔر

سخن شناس معنیٰ اساس، محو جلوہ شاہد نکتہ دانی نظر باز عرائس معانی، صاحب طبع روشن و افکار منیر، پنڈت نرائن داس متخلص بہ ضمیر، دقائق سخن سے کماحقہٗ آگاہ اور فنون شتی میں صاحب دستگاہ، لوازم سخنوری مثل بیان معنی بدیع عروض و قوافی سے ماہر اور خفایائے رموز ہنر بتمامہ اس صاحب کمال کے سامنے ظاہر، زبان فارسی میں ہم نظم متین و ہم نثر دل نشین ان کے خامۂ معنی طراز سے جلوہ گر ہے اگر نظم ہے مثل نظم جواہر کے مقبول طبائع اہل ہنر اور اگر نثر ہے مانند نثر نثرہ کے منظور اہل نظر ہر مصرع ان کا رشک مصرع زلف خوباں اور ہر بیت غیرت بیت ابروئے محبوباں رنگینی عبارت کی رنگینی گل سے بالاتر اور صفائی الفاظ صفائی گوہر سے والاتر[1]

نمونۂ کلام (فارسی)

تو و شوخی و تبسم بہزار ناز کردن
من و عجز و جانفشانی ز سر نیاز کردن
شب تیرہ فراقت چہ غم از بہر نیاید
بیک آہ می توانم از صبح باز کردن

---

۱ : تذکرۂ اہل دہلی (سرسید) ص ۱۶۲

(۱۲)

ہدہد الشعراء

بہادر شاہ کے زمانہ میں مزاح گو شاعر بھی تھے، ایک کا ذکر بطور نمونہ کے محمد حسین آزاد کی زبان سے سنیئے :-

"ایک شخص عبداللطیف نام پورب کی طرف سے دلّی میں آئے اور حکیم آغا جان کے پاس ایک مکان میں مکتب تھا اس میں لڑکے پڑھانے لگے، حکیم صاحب کے خویش و اقارب میں سے بھی لڑکے وہاں پڑھتے تھے، ان میں ایک لڑکا سکندر نامہ پڑھا کرتا تھا، حکیم صاحب کا معمول تھا کہ آٹھویں ساتویں دن کو ہر ایک لڑکے کا سبق سنا کرتے تھے، سکندر نامہ کا سبق جو سنا تو عجائب و غرائب معنی سننے میں آئے، فرمایا کہ اپنے مولوی صاحب کو کسی وقت ہمارے پاس بھیجنا۔ وہ دوسرے ہی دن تشریف لائے، حکیم صاحب آخر حکیم تھے، ملاقات ہوئی تو اوّل قیافہ سے پھر گفتگو سے نبض دیکھی معلوم ہوا کہ شُد بُد سے زیادہ مادہ نہیں مگر یہ طرفہ معجون انسان تھوڑی سی ترکیب میں رونق محفل ہو سکتا ہے، پوچھا :-

"آپ کچھ شعر کا بھی شوق رکھتے ہیں ؟"

مولوی صاحب نے کہا :-

"کیا مشکل بات ہے، ہو سکتا ہے ؟"

حکیم صاحب نے کہا :-

"ایک جگہ مشاعرہ ہونا ہے، آٹھ نو دن باقی ہیں یہ طرح مصرع ہے، آپ بھی غزل کہئے تو مشاعرہ میں لے چلیں۔"

وہ مشاعرہ کو بھی نہ جانتے تھے، اس کی صورت بیان کی تو مولوی صاحب نے کہا اس عرصہ میں بہت کچھ ہو سکتا ہے، غزل کہہ کر لائے تو سبحان اللہ ! مولوی ہی تخلص رکھا، حکیم صاحب کی طبع ظریف مشغلہ کو

ایسا اُتو خدا دے، بہت تعریف کی، غزل کو جا بجا اصلاحیں دے کر خوب نون مرچ چھڑکا، مولوی صاحب بہت خوش ہوئے یہ دیکھ کر حکیم صاحب کو اطمینان ہُوا، مولوی صاحب کی چگی داڑھی، اس پر لمبی اور نکیلی سر منڈا ہُوا اس پہ تکو عمامہ فقط کھٹ بڑھئی نظر آتے تھے، حکیم صاحب نے کہا شعراء کو تخلص ہی ایسا چاہیئے کہ ظریفانہ، لطیفانہ ہُو اور خوشنما ہو۔ اور شان و شکوہ کی عظمت سے تاجدار ہو بہتر ہے کہ آپ ہدہد تخلص کریں حضرت سلیمان علیہ السلام کا رازدار تھا۔ اور قاصد خجستہ کام تھا وغیرہ وغیرہ چنیں وچناں، مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمایا ؎

مشاعرہ کے دن جلسہ میں گئے، جب ان کے سامنے شمع آئی تو حکیم نے ان کی تعریف میں چند فقرے مناسب وقت فرمائے سب متوجہ ہوئے، جب انھوں نے غزل پڑھی تو مسخرے تالیاں بجائیں ظرافت نے ٹوپیاں اچھالیں اور قہقہوں نے اتنا شور و غل مچایا کہ کسی غزل پر اتنا شور نہ ہُوا تھا ؎

مولوی صاحب بہت خوش ہوتے، چند روز اسی طرح مشاعرہ کو اور بعض امراء کے جلسوں رونق دیتے رہے کہ مکتب کے کام سے جاتے رہے، حکیم صاحب نے سوچا ان کے گزارہ کے لیے کوئی نسخہ ضرور تجویز کرنا چاہیئے ان سے کہا :

" بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہو تو تمھیں ایک دن دربار میں لے چلیں، دیکھو رزاق مطلق کیا ساماں کرتا ہے۔

قصیدہ تیار ہُوا اور حکیم صاحب نے ہدہد کو اڑا کر دربار میں پہنچا دیا، افسوس کہ اب نہیں مل سکتا چار شعر یاد ہیں مشتے نمونہ از خروارے تحفہ احباب کرتا ہوں :-

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کردوں
تو رشک باغِ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

جو آکے ریز کرے میرے آگے موسیقار
تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں

جو سرکشی کرے آگے مرے ہما آکر
تو اس کے نوچ کے پر مشکل نیولا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لیے
فلک کیے ہے مقرر میں باجرہ کر دوں

بادشاہوں اور امیروں کو مسخرا پن بلکہ زمانہ کی طبیعت کو یہ غذا موافق ہے، ظفر تو خود شاعر تھے خطاب عطا فرمایا، طائرا لاراکین شہپر الملک، ہدہد الشعرا منقار جنگ بہادر اور سات روپے مہینہ مقرر کر دیا، اور انکی شاعری کی بنیاد قائم ہو گئی، پھر تو سر پر لمبے لمبے بال ہو گئے، ان میں چنبیلی کا تیل پڑنے لگا اور داڑھی دوشاخہ ہو کر کانوں سے باتیں کرنے لگی۔

ایک برسات نے ان کا مکان گرا دیا، گھونسلے کی تلاش میں بھٹکتے پھرے وہاں ہاتھ نہ آیا حکیم صاحب سے شکایت کی، فرمایا کہ بادشاہی مکانات شہر میں بہتیرے پڑے ہیں کیا ہدہد کے گھونسلے کو بھی ان میں جگہ نہ ملے گی؟ دیکھو بندوبست کرتے ہیں جھٹ عرضی منظور ہوئی، چند متفرق اشعار اس کے یاد ہیں:۔

جز ترے شاہنشا اب کس کے آگے رو دیئے
کس سے کہئے جا کے یہ غم کو ہمارے کھو دیئے

تجھ کو ہے حق نے کیا ملک سخن کا شہسوار
ہیں بجا گر نے سمند طبع کو یاں پو دیئے

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر
کاش کے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریئے

سنگلاخ ایسی زمین ہے سوچ لے دل تا کجا
فکر کیجئے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے

رشتۂ عمر شہنشاہ جہاں ہوئے دراز
یا خدا رکھتے رہیں، دنیا میں جب تک جیتے
دیدے اس ہیں بھی زمیں تھوڑی کہ بن گھر گھونسلے
مارتا پھرتا ترا ہدہد ہے ٹانک ٹوٹیے

ایک سال سرکار شاہی کو تنخواہ میں دیر لگی، ہدہد نے حکیم صاحب سے شکایت کی، یہاں جطرح امراض شکم کے نسخے علاج تھے، اس طرح بھوک کے تدارک کا بھی نسخہ تیار تھا، ایک قطعہ راجہ دیبی سنگھ کی مدح میں تیار ہوا کہ انہی دنوں میں خان سامانی کی تنخواہ انھیں سپرد ہوئی تھی۔ چار شعر اس وقت یاد ہیں وہی لکھتا ہوں :-

جہاں میں آج دیبی سنگھ توراجوں کا راجہ ہے
خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آبراجا ہے
سلیمان نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کنجی
تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجہ ہے
حکم اہل جہاں کے سب ہیں شکر اپنے بجالاتے
دمامہ تیرا جا کر گنبد گردوں پہ باجا ہے
کسی کو سے نہ نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا
مگر ہدہد کو دیدے کیوں : یہی ہدہد کا کھاجا ہے[1]

---

[1] : آب حیات (محمد حسین آزاد)

باب ۱۵

عہد بہادر شاہ کے اطباء

علمی، فنی اور ذہنی اعتبار سے بہادر شاہ کا دورِ حکومت عہد آفرین تھا۔ زندگی کے جس شعبہ پر نظر ڈالیے بہار ہی بہار نظر آئے گی ہر علم و فن کے یکتا اور بے ہمتا لوگ اس دور میں نظر آئیں گے چنانچہ عہد بہادر شاہ کے اطبّا پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا اس اعتبار سے بھی یہ عہد ممتاز اور یگانہ تھا۔ ایسے ایسے طبیب حاذق اس عہد میں ملیں گے کہ جس مطب کو دیکھئے بے ساختہ زبان سے نکل جائے گا کہ

"یہ دار الشفا ہے، یہ دار الشفا ہے"

اور یہ شاعرانہ جدت طرازی نہ ہوگی، حقیقت اور واقعہ کا بیان ہوگا۔

یوں تو عہد بہادر شاہ کے نامی گرامی اطبّا کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ہم اس سلسلہ میں صرف چند اطبّاء کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے وہ بھی نہایت درجہ اختصار کے ساتھ۔

(۱)

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں بہادر شاہ کے صرف وزیر باتدبیر ہی نہیں طبیب خاص بھی تھے بہادر شاہ کے والد اکبر شاہ ثانی نے ان کی حذاقت اور مہارتِ فن سے متاثر ہو کر طبیب شاہی کے منصب پر فائز کیا اور خطاب عمدۃ الملک حاذق الزماں کا دیا۔ بہادر شاہ کے عہد میں مرتبہ اور رسوخ اور بڑھا، اور احترام الدولہ عمدۃ الحکماء معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ کا خطاب ملا[1]۔

---

[1]: واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۲

حلیہ گورے چٹے آدمی ہیں، سفید بھری ہوئی داڑھی، گول چہرہ، اس میں کچھ چیچک کے داغ، آنکھوں سے فہانت ٹپکتی ہے سر سے پاؤں تک سفید لباس، فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں[1] ؛

بہادر شاہ کے عہد میں آپ کا وہ رسوخ اور اعتماد تھا کہ کوئی کام بدوں آپ کی صلاح و مشورت کے نہ ہوتا تھا[2]

خاندان، حالات، کوائف سرسید احمد خاں نے حکیم صاحب کے احوال و سوانح ذرا تفصیل سے بیان کئے ہیں،

حکیم محمد احسن اللہ سرگروہ ارباب کمال شیخ صدیقی اور ہراتی الاصل ہیں سلسلہ ان کے نسب کا حضرت خواجہ زبیر (؟) ہراتی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے کہ عرفائے دہر اور کملائے روزگار سے تھے۔ اور طریقہ پیری مُریدی کا ان کے خاندان میں جاری تھا اور مردم روزگار کا ان کی ذاتِ فیض سمات سے استفادۂ فیض باطنی اس کثرت سے تھا کہ ملتزمانِ صحبت پر غوث اور قطب کا احتمال ہوتا تھا ؛

آخر الامر والئی ہرات کے سوءِ مزاجی سے عزمِ غربت فرما کر کشمیر جنت نظیر میں تشریف لائے اور وہاں قیام اختیار کیا اور وہیں قضائے ربانی کے تقاضے سے گلگشت حدائق کشمیر سے سیر ہو کر سیر گلستان جناں کے واسطے راہی عالم باقی ہوئے، ان حضرت کا مزار برکت آثار چشمہ ڈل سے کنارہ پر واقع ہے اور بنام "زمیندار شاہ" موسوم ہے، وہاں کے رہنے والے ان کی روح مطہر سے بسببِ کمال اعتقاد کے امیدوار امداد باطنی اور اعانت معنوی کے رہتے ہیں ؛

حکیم صاحب موصوف کے اجداد ہمیشہ روزگار پیشہ رہے اور عمائد روزگار کی سرکار

---

[1] : دلی کی آخری شمع ص۲۰ ؛

[2] : واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم ؛

ہیں مناسب عہدہ سے سرفراز، والد ماجد ان کے حکیم محمد عزیز اللہ خاں مرحوم کہ کمالات ان کے حیز تحریر اور حیطۂ تقریر سے خارج ہیں اپنی ذات سے تحصیل علم طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن شریف کو احکم الحکماء حاذق الملک حکیم محمد ذکاء اللہ خاں مرحوم و مغفور سے حاصل کیا اور اطبار نامی شہر شاہجہان آباد سے اس فن میں سبقت لے گئے۔ انھوں نے فنون حکمت ہندو ہیئت فضلائے عصر سے حاصل کر کر فن طبابت کو اپنے والد ماجد سے حاصل کیا اور ازبس کہ حافظہ پارہ لوح محفوظ تھا۔ مدارج کمال سے کوئی باقی نہ رہا، کہ طے نہ کیا ہو، اور شفائے مرضا داد الہیٰ ہے جس کی زندگی سے مسیحا نے ہاتھ دھوئے، ان کے نسخہ سے جی گیا۔ اس واسطے ساکنین شہر اور قاطبین دھر سوائے اس زبدۂ اہل کمال کے اور کسی کی طرف رجوع نہ کرتے حب شہرۂ فضل کا گوش فلک تک پہنچا۔

ملازمت کا آغاز

اوائل حال میں خلاصۂ روسائے نامدار فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والیٔ فیروز پور جھرکہ کی ملازمت میں کمال عزت و توقیر کے ساتھ منصب طبابت پر مامور ہوئے اور ان کی رحلت کے بعد اسد الدولہ نواب فیض محمد خاں مرحوم والیٔ جھجر کے پاس اسی منصب پر مقرر ہوئے ازبس کہ مزاج دانی اس صاحب ذہن رسا کے حصے میں ہے اس سردار ذی الاقتدار کا اعتقاد ان کی طرف استوار ہو گیا کہ اپنی زیست انھیں کی توجہ سے جانتا تھا، ان رئیس کے انتقال کے بعد ترک روزگار کر کے چندے خانہ نشینی اختیار کی ؛

لال قلعہ سے تعلق

لیکن ازبس کہ ہر حرف ان کے نسخے کا ہو الشافی ہے اور ان کا نفس نفس عیسیٰ کا خواص رکھتا ہے، حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ عرش آرام گاہ نے نہ چھوڑا کہ فیض ملازمت سے بہرہ انداز نہ ہوں اور جس طرح سے ہو سکا۔ اپنے پاس بلا کر عطائے خلعت اور عنایت خطاب عمدۃ الملک حاذق الزمان سے مشرف فرما کر خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا اور تا دم زیست یہ سمجھے کہ اگر یہ سلالۂ کرام ایک دم الگ ہو، تو زندگی اس بادشاہ گردوں جاہ کی محال ہے ؛

بہادر شاہ کی بارگاہ میں

اور ان کے انتقال کے بعد حضرت ظل الٰہی فلک بارگاہ ہیچ الظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ، بادشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطانہ نے قدر دانی و ترتیب شناسی سے اپنے سنہ جلوس میں طلب کیا اور سعادت فیض گیری سے مستعد فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ خطاب سابق پر زیادہ کیا اور ازبس کہ حضور فیض گنجور حضرت ظل اللہ کے مزاج اقدس میں ان کے کمالات جائے گیر ہوئے، روز بروز ترقی مدارج اور ارتفاع مناسب ظہور میں آنے لگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہاں تک بادشاہ جم جاہ کی طبیعت پر تصرف ہوا کہ کوئی امر جزوی و کلی کے بے مشورہ وصلاح اس صاحب تدبیر صائب کے وقوع میں نہیں آسکتا وہ امر اگرچہ متعلق منصب وزارت ہی ہو[1]۔

عمارات کا شوق

حکیم احسن اللہ خان کو عمارات بنوانے کا بھی شوق، قدرت کی طرف سے ملا تھا، چنانچہ انھوں نے حویلی بدل بیگ خاں خرید کر ۱۲۷۰ ہجری م ۵۴-۱۸۵۳ء میں شاندار دروازہ بنوایا جس کی تاریخ غالب نے یہ کہی :-

نہادہ بنا احسن اللہ خاں
سرِ راہ بدنساں در دلکشا
کہ غالب پئے سال تاریخ او
رقم کرد " در دلکشا حبذا "
۱۲۷۰ ہجری

حکیم صاحب کا ایک مکان مہرولی میں ہے دتی والے مکان کے احاطے میں حکیم صاحب نے ایک حمام تیار کیا، حمام کے اندر ایک دیوار میں سنگِ مرمر کی تختی پر یہ کتبہ لگا ہوا ہے :-

---

[1] : تذکرہ اہل دہلی از سید احمد ۱۲۱ ؎

مرتّب گشت ایں جامِ دِل خواہ
بہ تعمیرِ فقیر احسن اللہؒ

(۲)

حکیم غلام نجف خاں

حکیم غلام نجف خاں ابن حافظ محمد مسیح الدین شیخو پوری ساکن شیخو پور؛ کہ بدایوں کے مضافات سے ہے؛ اصل میں شیخ فاروقی ہیں اور بسبب عنایت سرکار شاہی کے خطاب خانی سے سرفراز ہوئے۔ جد نشستمین ان کے شیخ فرید المخاطب بمحتشم خاں امرائے جلیل الشان عہد جہانگیری شاہجہان سے تھے کہ منصب پنج ہزاری ذات و پانچ ہزاری سوار سے سرفراز تھے۔ بموجب آپ کی استدعا کے حضرت جہانگیر بادشاہ سے چار بیگھہ اراضی موضع مولیا میں سے آبادی و سکونت کے واسطے مرحمت ہوئی اس سرزمین میں ایک قلعہ کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام جہانگیر کے نام پر شیخو پور رکھا۔ کس واسطے کہ حضرت جہانگیر کا نام ایام شہزادگی میں مرزا شیخو بہت مشہور تھا اور والد شیخ فرید کے نواب قطب الدین خاں نبیرۂ حضرت سلیم چشتی فتح پوری کے اولاً حضرت اکبر بادشاہ کے عہد میں صوبہ داری صوبۂ بہار اور حضرت جہانگیر کے عہد میں پنج ہزاری ذات و سوار و خلعت خاصہ و شمشیر و اسپ خاصہ بازین مرصع اور عنایات شاہانہ سے سرفراز ہو کر دار الملک بنگالہ اور اڑیسہ کی صوبہ داری سے کہ پچاس ہزار سوار کی جائے ہے مامور ہوئے۔

ملے: واقعات دار الحکومت دہلی حصّہ دوم؛

انگریزی ملازمت

جب ان کے سب اسلاف کا حال معلوم ہوچکا، اب ان کا حال سنا چاہیئے کہ شیخوپورہ سے ہمراہ اپنے خالو بزرگوار میر سید علی صاحب کے حکام عہد یعنی صاحبان انگریز بہادر کی خدمت میں عہدۂ جلیلہ تحصیلداری پر مامور رہے اور آخر کو نواب گورنر بہادر کی خدمت میں عہدۂ میر منشی سے سرفراز ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں شاہجہان آباد میں وارد ہوئے، جب سن تمیز کو پہنچے یہیں کی سکونت اختیار کی، اور ازبسکہ فن طب اشرف فنون اور اعزّۂ علوم ہے اس فن کی طرف متوجہ ہو کر کتب درسیہ اس فن کی حکیم صادق علی خان ولد حکیم حکیم الحکما حکیم شریف خاں سے تحصیل کی اور مشق نسخہ نویسی اور معالجہ مرضا کی حاذق الملک حکیم احسن اللہ خاں کی خدمت میں بہم پہنچائی، جو کہ ان کو حاذق الملک موصوف سے قرابت قریبہ بھی تھی، ان کی تعلیم میں کمال کوشش و سعی کو کار فرمایا، یہاں تک کہ یہ حضرت شہر شاہجہان آباد کے مشاہیر اطبا ہوتے۔

خطاب عضد الدولہ

حضور بادشاہ ظل اللہ سراج الدین بہادر شاہ سے خطاب عضد الدولہ حکیم غلام نجف خان بہادر پایا اور اب سرکار کمپنی بہادر سے عہدۂ طبابت پر واسطے معالجہ مرضا کے مامور ہیں، واقعی مروت جبلی اور لطف طبیعی ایک امر خداداد ہے جس کو دیا دیا اور جس کو عطا کیا، ہر کسی کے بانٹے نہیں آیا اور ان کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ حیز تحریر سے خارج ہیں۔ قدرت الٰہی ہے ایسا دست شفا نہیں دیکھا کہ وہ امراض جن کو لادوا اور لاعلاج کہتے ہیں اندک توجہ اور تھوڑے سے التفات میں اس طرح سے زائل ہوگئے کہ پھر تمام عمر اس بیماری کا نام و نشان باقی نہیں رہا، مردم روزگار مردہ پسند ہیں کہ ایسے طبیب حاذق اور حکیم دانا کے ہوتے بقراط اور سقراط کا نام لیتے ہیں، وہ بھی اگر اس زمانہ میں ہوتے تو اس حکیم بافرہنگ کے مجربات کو سرمایہ اپنے کمال کا ٹھہراتے اور ان کے قوانین علاج کو اپنا دستور العمل مقرر کرتے، ادنیٰ نسخہ نویس ان کے مطب کا علوی خان کے نسخے پر حرف رکھ سکتا ہے۔ ان کے ہاتھ سے خاک کی چٹکی حکم اکسیر کا رکھتی ہے اور ان کی زبان سے خاصیت نفس عیسیٰ کی [1]

---

۱ : تذکرہ اہل دہلی، سرسید، ص۴۴۔

(۳)

حکیم حسن بخش تمنا

سرگروہ کملائے شہر، زبدۂ افاضل دہر، اسوۂ دانش منداں، حکیم حسن بخش تمنا۔ وطن ان کے آبا و اجداد کا شہر تھانیسر اور مولد و مسکن ان کا شہر شاہجہان آباد۔ جمیع فنون و علوم میں مثل معقول و منقول و حکمت و ہندسہ و ہیئت مہارت تمام رکھتے تھے اور کتب طبیہ بسبب کمال حافظہ کے قانونچہ سے قانون شیخ الرئیس تک بلا تشبیہ مثل عبارت قرآن مجید ازبر یاد تھیں۔ علم عقلیہ کی معاونت سے کسی کو معاصرین سے ان کے ساتھ یارائے مناظرہ نہ تھا۔ بارہا مشاہدہ ہوا کہ جس مجلس میں اس زبدۂ ارباب کمال کا ہنگامہ گفتگو گرم ہوا، جمیع حضار مجلس مثل تصویر کے ساکت و صامت رہ گئے۔ اوائل حال میں نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر کی نوکری میں منسلک رہے اور اس رئیس کی وفات کے بعد چندے خانہ نشین رہے۔ بعد اس کے حضور سراج الدین بہادر شاہ میں صاحب عالم مرزا فخر الدین بہادر کی سرکار میں عہدہ وکالت پر مامور ہوئے۔ دو تین سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ جہان فانی کو وداع کہا۔[۱]

(۴)

حکیم آغا جان عیش

حکیم آغا جان عیش بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیور علم سے آراستہ و لباس کمال سے

۱؎ تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صـ۱۰

پیراستہ، صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ

میانہ قد خوش اندام، سر پہ ایک ایک انگل بال سفید ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سُرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے، گلے میں ململ کا کرتا جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔

شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے:

نمونہ کلام

صلح اُن سے رہیں کیسے ہی بنی   دل پہ جھگڑا اٹھا ول دیئے رہی بنی

زہد تقویٰ دھرے رہے سارے   ہاتھ سے اس کے مئے پیئے ہی بنی

لائے وہ ساتھ غیر کو ناچار   پاس اپنے بٹھا لیے رہی بنی

کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش
اُن جفاؤں پہ بھی جیئے رہی بنی

(۵)

حکیم رُستم علی خاں

تحصیل سے فارغ اور کتب ہیئت و ہندسہ کہ راقم کے نانا صاحب مرحوم نواب دبیر الدولہ

ٹ: دہلی کی آخری شمع ص۵۳

امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ سے اچھی طرح پڑھا اور حدیث و فقہ جناب مولوی اسحاق علیہ الرحمۃ سے اور طب میں مہارت معقول رکھتے ہیں اور مریض ان کے علاج سے شفا پاتے ہیں اور کتب فارسیہ کو بھی بہت تحقیق کے ساتھ پڑھاتے ہیں غرضیکہ عالم متقی اور فاضل اجل ہیں۔ بالفعل خدمت وقائع نگاری پر حضرت بادشاہ جم جاہ سراج الدین محمد بہادر شاہ خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ کی سرکار میں مامور ہیں اور خطاب مصلح الدولہ حکیم محمد رستم علی خان بہادر سے ممتاز۔ راقم سے بھی رابطہ محبت بکمال رکھتے ہیں۔ انشائے نظم و نثر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر اخبار سلطانی[1] ہر ہفتہ ان کی نثر طبع زاد کا نمونہ ہے۔

(۶)

حکیم نصر اللہ خاں

علوم متداولہ مثل منطق اور معانی و ہیئت و ہندسہ کے حضرات ثلاثہ یعنی مولوی عبد العزیز اور مولوی رفیع الدین اور مولوی عبد القادر صاحب قدس سرہم العزیز کی خدمت سراپا برکت سے حاصل کیئے اور علم طب کو احکم الحکما حکیم شریف مرحوم و مغفور سے تحصیل کیا۔ کتاب وافی و حدس صائب اور مرض شناسی میں بے مثل و مانند ہیں رسائل متعددہ بحران اور دریافت مزاج نسخہ مرکب وغیرہ میں تصنیف کیے ہیں۔ ان رسائل سے اُن کے تبحر کا حال معلوم ہوتا ہے اوائل حال میں نواب فیض محمد خان رئیس جھجر کی سرکار میں عمدہ طبابت پر مامور تھے بعد اس کے اور عہدہ ہائے

---

[1] : تذکرہ اہل دہلی (سر سید) صفحہ ۱۰۱

روزگار کی سرکار میں منسلک رہے، اب پھر بہ نظر قدامت کے نواب عبدالرحمٰن خان صاحب رئیس جھجر کی خدمت میں جو نواب مغفور کا نبیرہ اور مسند نشین ہے، اسی عہدہ سے سرفراز ہیں[1]

(۷)

خاندان شریفی

حکیم شریف خان اور اُن کی اولاد و احفاد

اب ہم دلی کے سب سے بڑے وقیع، اور باوقار طبی خاندان یعنی خاندان شریفی کا ذکر کرتے ہیں، اس خاندان نے کئی پشتوں تک بڑے دبدبہ کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کی جس سے تاریخ کے صفحات مزین ہیں :۔

خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ

اجمل خان اور خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ بابر کے ساتھ ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ ہندوستان آئے، اس حقیقت پر سب سے بڑی سند حکیم محمود خان اعظم کی ایک تحریر ہے جو اُن کے قلم سے ایک خاندانی کتاب کے مسودہ میں ہمیں ملی، اس تحریر کا عنوان "درحال بزرگان خاندانی و سرگزشت خود از ابنائے زمانہ" ہے وہ فرماتے ہیں کہ :۔

مکشوف خاطر باد کتاب کہ درآن سلسلہ خاندانی درج بود ہنگام تعلیم کتب خانۂ جدی (حکیم محمد شریف خان) کہ بہ شش پسران منقسم شدہ بود درحصہ عمومی صاحب کلاں حکیم محمد اشرف خان مرحوم رفتہ و از آنجا بغرض تلف در آمد، لہذا از ضبط تحریر حال ابتدائی

---

[1]: تذکرہ اہل دہلی (سرسید) صفحہ ۵

خاندانی معذور ماندم؟

یہ کتاب گم نہ ہوئی ہوتی تو بلاشبہ وہ ابتدائی عہد مغلیہ کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہوتی حقیقت یہ ہے کہ بابر کی بڑی فتح وہ نہ ہوتی جو پانی پت کے میدان میں اس نے حاصل کی بلکہ اصلی فاتح وہ لوگ تھے جو بابر کے لشکر کے ساتھ ساتھ ہندوستان آئے اور اپنی تہذیب اور اپنے علم و تمدن کا سرمایہ لائے ۔ ہندوستان کی ایک جدید اور مشترک تہذیب کا نقشہ مکمل ہوا۔ بقول حکیم محمود خان بابر کے ہمراہیوں ہی میں سے وہ دو بزرگ تھے جو ہرات سے آئے اور حیدر آباد (سندھ) پہنچے، ان کے نام خواجہ محمد قاسم و خواجہ محمد ہاشم تھے۔ گو کہ حکیم محمود خاں نے اپنے والد کے بیان کا حوالہ دے کر ان ہر دو بزرگوں کے حیدر آباد سندھ میں بود و باش اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن حکیم محمد احمد خاں مرحوم کو کسی تاریخی سلسلہ سے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ غالباً جس حیدر آباد کا ذکر آیا ہے وہ حیدر آباد سندھ نہیں بلکہ حیدر آباد دکن ہے مزید تحقیقات کرنے پر یہ بھی پتہ چلا ہے کہ موضع منمہ نواح اورنگ آباد (دکن) میں اس زمانہ کا ایک قدیم مزار موجود ہے جو خواجہ قاسم کے نام سے منسوب ہے، ایک اور سمت سے بھی اس گمان کو تقویت حاصل ہوتی ہے حکیم بدر الدین خان نے جو حکیم اجمل خان کے ایک جدی تھے "آسمان الاولیا" کے ترجمہ اردو بدر الدجیٰ میں اپنے جو خاندانی حالات لکھے ہیں اور جو شجرہ نسب نقل کیا ہے اس میں بھی خواجہ محمد قاسم اور خواجہ محمد ہاشم کا نام آتا ہے حکیم محمد احمد خان مرحوم نے اپنی ایک یادداشت میں یہ ثابت کیا ہے کہ جس زمانہ میں بابر آیا اور اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک سندھ میں کسی شہر حیدر آباد کا وجود نہ تھا مگر حیدر آباد دکن موجود تھا، اسی لیے ان بزرگوں کو حیدر آباد (سندھ) کا باشندہ بتانا غلط ہے خود حکیم اجمل خان بھی بہت کچھ تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان دونوں بزرگوں نے حیدر آباد سندھ میں نہیں، بلکہ اورنگ آباد کے قریب موضع منمہ میں سکونت اختیار کی تھی۔

ہندوستان میں سلسلۂ نسب

خواجہ محمد قاسم اور خواجہ محمد ہاشم سے خاندان شریفی کے ان بزرگوں کا سلسلہ ملتا ہے جو عہد مغلیہ میں موجود تھے۔

آسان نہیں ہے اس لیے کہ بعض درمیانی کڑیاں گم ہیں۔ تاہم یہ حقیقت تو مسلّم اور مستند ہے کہ مُلّا علی ، اور مُلّا علی داؤد کے والد سلطان محمد جوہرات کے رہنے والے تھے، بابر کے بعد اور غالباً ہمایوں کے زمانہ میں ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے اور بقول حکیم اجمل خاں آگرہ میں ان کا مکان ۱۲۸۵ھ کے بعد تک موجود تھا۔ حکیم اجمل خاں کے بیان کے بموجب مُلّا علی ہی اس دور میں خاندان شریفی کے مورثِ اعلیٰ تھے اور وہ اکبر اعظم کے عہد میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے تھے اکبر اعظم ہی کے عہد میں اس خاندان کا تعلق دربار شاہی سے قائم ہوا، چنانچہ اس کے بعد شاہ عالم کے زمانہ تک ہر دور میں اس خاندان کا ایک نہ ایک فرد دربارِ شاہی سے وابستہ رہا۔ مُلّا علی قاری کے علم و فضل نے ان کے خاندان میں طبِ یونانی کے فضل و کمال کی راہ اختیار کی۔

(۸)

حکیم واصل خاں اوّل

اس خاندان کے سب سے پہلے طبیب حکیم محمد فاضل خاں تھے جن کے بیٹے حکیم محمد واصل خاں اوّل عہد عالمگیری میں اکبر آباد (آگرہ) سے دہلی آئے۔ اور غالباً اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں دربار کے عہدِ طبابت پر فائز ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اقبال تیمور کا آفتاب نصف النہار سے گزر کر مائل بہ انحطاط ہونے لگا تھا۔ اورنگ زیب کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا اور ۱۷۴۸ء تک اکتالیس سال کی مدت میں اورنگ زیب کے بعد چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت شاہی پر آئے اور گزر گئے۔ ان میں سے دو قتل ہوئے اور تین کو بمشکل ایک ایک سال مسند تیموری پر سانس لینے کی مہلت نصیب ہوئی۔

اس دورِ انقلاب کو واصل خاں اوّل نے اپنی آنکھ سے دیکھا، اغلب یہ ہے کہ شروع عہد محمد شاہ میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کے بعد ان کے دونوں بیٹے اور اکمل خاں صاحب دربار شاہی سے وابستہ ہوئے[۱]۔

---

[۱]: حیات اجمل (قاضی عبدالغفار)

(۹)

حکیم اکمل خاں

حکیم محمد احمد خاں اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ "حکیم اکمل خاں کو جو اُن کے جدِ اعلیٰ تھے دربارِ شاہی سے عظیم آباد (پٹنہ) میں دو لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی تھی اور حاذق الملک کا خطاب ملا تھا، اس طرح خاندان شریفی میں اکمل خاں حاذق الملک اوّل تھے" ولادت و وفات کی صحیح تاریخ تو معلوم نہ ہو سکی لیکن چونکہ یہ ثابت ہے کہ اکمل خاں کی مشہور کتاب "علاج الامراض" ۱۱۷۷ھ ہجری میں لکھی گئی تھی، اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ وہ شاہ عالم ثانی کے ابتدائی زمانہ تک ضرور زندہ رہے اور انھوں نے نہ صرف عہد محمد شاہی کے انقلاب انگیز واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ ہندوستان میں خاندان تیموری کے مرض الموت کا آغاز بھی اُن ہی کی زندگی کے دوران میں ہو گیا تھا۔

(۱۰)

حکیم شریف خاں

مُغلیہ دورِ آخر کے اسی طوفانی سمندر میں ایک موتی کی طرح اکمل خاں کے بیٹے شریف خاں پیدا ہوئے ان کا سنِ ولادت ۱۷۱۴ء تھا۔ حکیم محمد احمد خاں اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں ان کے "جدِ امجد حکیم شریف خان کو پانی پت اور ڈاسنہ کے علاقوں میں پچیس ہزار کی جاگیر ملی تھی اور شاہ عالم کی وفات کے چار ماہ بعد انکا انتقال ہُوا۔ شریف خان کی زندگی کا یہ دور وہ تھا کہ اقبال تیموری کا آخری کنگرہ گر رہا تھا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ سے فرنگی اقتدار نے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے تھے، دہلی میں اس وقت مرہٹوں کا

اقتدار دربارِ شاہی پر مسلّط تھا۔ اس وقت کی حالت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ شریف خان کو جاگیر کی جو سند عطا ہوئی تھی اُس میں بادشاہ کی مہر کے اندر "مادھوراؤ سندھیا" کا نام "وکیل مطلق مختار الملک عمدۃ الامرا" اور "فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی" کے عنوان سے درج ہے اس سند کی تاریخ ستائیس[۲۷] سال جلوس یعنی ۱۷۸۶ء ہے ؛

اقبالِ تیموری اور طنطنۂ بابری کا دامِ واپسین غلام قادر روہیلہ کے خنجر سے بادشاہ کی آنکھیں نکالے جانے کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ۱۸۰۴ء میں سارا اثاثۂ شاہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں آیا۔ افسوس ہے کہ خاندانِ شریفی کے بہت سے قدیم کاغذات ضائع ہو چکے ہیں ورنہ ہم شاید حکیم شریف خان کی آنکھوں سے اس آخری دور کے بہت سے مناظر دیکھ سکتے، علاوہ فنی کمالات کے اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی طبِ یونانی کی بربادی کو بڑی حد تک روک لیا اور یہ سمجھ کر اب شاہی دربار کی سرپرستی سے اُن کا فن محروم ہو گیا ہے انھوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ بغیر اس سرپرستی کے بھی طبِ یونانی کو کس طرح باقی رکھا جائے ۔ ؛

حکیم شریف خان نے ۱۲۳۱ھ ہجری میں وفات پائی۔ قطب صاحب میں مجلس خانہ کے قریب باؤلی کی طرف جاتے ہوئے اُن کا مزار موجود ہے[۱] ؛

(۱۱)

حکیم صادق علی خان

جس وقت تیمور کی اولاد دِلّی کے قلعہ میں انگریزوں کی وظیفہ خوار تھی اور ابوالنصر محمد معین الدین اکبر شاہ

---

[۱] قاموس المشاہیر

ثانی لال قلعے میں بجھتے ہوئے چراغ کی طرح ٹمٹما رہے تھے، اُس زمانہ میں حکیم شریف خان کے فرزند اور اجمل خاں کے دادا حکیم صادق علی خان برائے نام اس دربار سے وابستہ تھے[۱] بقول حکیم محمود خان اُسی زمانہ میں انگریزوں نے اس خاندان کی جاگیریں ضبط کر لی اور اس کے بجائے حکیم صادق علی خان کے چھ بیٹوں کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی گئیں۔ چونکہ دربار میں کچھ دم باقی نہ تھا، اس لیے لال قلعے سے حکیم صادق خان کا تعلق محض برائے نام تھا البتہ وہ اپنے والد کی طرح اپنے فن کی خدمت میں بہت مصروف رہا کرتے ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے "زادِ غریب" "کلیاتِ خورد و کلاں" شرح معالجات "قانونچہ و شرح تشریح اعضاء مرکبہ" قانون، رسالہ در خواص ادویہ واغذیہ و نسخہ مرکب در طب وہ در رسالہ تقویتہ العقاید بہت مشہور ہیں۔

فن طب اور زبان عربی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت کا پتہ اُن کی تصانیف سے چلتا ہے اس وقت تک دودمان تیموری کی عظمت رفتہ کو جو زریں کفن پہنائے جا رہے تھے ان کی مثال بھی حکیم صادق علی خان کی تحریروں میں ملتی ہے جہاں وہ بادشاہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

"مہر سپہر گیتی ستانی مرکز دائرہ جہانبانی، سلالۂ خاندانی رفیع المکان گورگانی خلاصہ دودمان عظیم الشان صاحبقرانی،

خسرو سکندر نشان دارا دربان، خدیو جمشید شوکت کیوان رفعت برجیس مرتبت السلطان بن السلطان بن السلطان الخاقان ابن الخاقان اسد المعارک والمغازی معین الدین ابو النصر محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ و افاض علی العالمین برّہ و احسانہ...... "

درحقیقت القاب و آداب کا یہ ہجوم اس عہدِ زوال کی ماتم داری تھی، ۲۵ صفر ۱۲۶۴ھ ہجری کو اسی سال کی عمر میں صادق علی خاں نے وفات پائی، اُسی زمانہ میں اکبر شاہ ثانی کا بھی انتقال ہو گیا اس کے بعد خاندان شریفی کا کوئی تعلق دربارِ شاہی سے باقی نہ رہا۔

---

[۱]: حیات اجمل (قاضی عبد الغفار)

حکیم صادق علی خان اپنے علم، صداقت اور مہارت کے اعتبار سے اس خاندان کا مایۂ فخر تھے۔ سر سید احمد خان ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"آج اس کمالات ظاہری و باطنی کا جامع عرصۂ روزگار میں جلوہ گر نہیں علم عمل کے ساتھ اس بزرگ بلند فطرت کی ذات میں جمع ہے ان کے والد ماجد اپنے عصر میں سر آمد حکماء اور سر طبقہ اطباء تھے۔ آج تک ان کے کمالات کا شہرہ گنبد دوار میں ازبس بلند ہے جالینوس ارسطو کا غلغلہ اس کے سامنے ایسا ہے جیسا طوطی کی آواز نقار خانہ میں اور فی الحقیقت اس روزگار کے اکثر اطبائے نامی انہیں کی نسبت شاگردی سے سرمایہ اعتبار کا رکھتے ہیں جو کہ اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں حضرت ممدوح بھی اپنے زمانے میں یکتا اور بے مثل ہیں نہ ان کے علم کی صفت زبان قلم پر آسکتی ہے اور نہ ان کے عمل کی تعریف اندیشہ میں سما سکتی ہے، سارے زمانے کے کملا کو جس کے خاندان کی نسبت شاگردی سے فخر ہو اس کی تعریف اسی قدر کافی ہے[1]"۔

(۱۲)

حکیم محمود خان

اب حکیم محمود خان کا ذکر آتا ہے۔ یہ اپنے وقت کے جالینوس تھے کسی کے علاج پر ان کا مائل ہونا اس کی صحت کی ضمانت تھی گویا ع

"نبضِ مریض پنجۂ عیسےٰ میں آ گئی"

---

[1] : تذکرہ اہل دہلی (سر سید) ص ۴۹

اُن کے خاص خاص حالات درجِ ذیل ہیں :۔

حکیم محمود خاں اعظم

حکیم صادق علی خاں کے تین فرزند تھے، حکیم غلام محمد خاں، حکیم غلام محمود خاں اور حکیم غلام مرتضےٰ خاں حکیم غلام محمد خاں اپنے والد ماجد کی زندگی ہی میں بعمر ۴۴ سال وفات پا گئے تھے ـــــ حکیم غلام مرتضیٰ خاں نے ۱۲۹۲ھ ہجری میں بعمر ۴۵ سال انتقال فرمایا۔ حکیم محمود خاں کو اپنے خاندانی عظمت کا ورثہ سب سے زیادہ ملا۔ طریقہ علاج میں وہ بہت محتاط تھے اور اپنے علم و فضل پر مغرور نہ تھے، اپنے خاندان کے لیے موصوف نے جو کچھ بطورِ وصیت تحریر فرمایا ہے اُس کے بعض اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں :۔

(۱)

کسے را بہ بدی یاد نہ کنند غیبت مداہنہ دارند !

(۲)

مال بغیرِ وجہ حلال نگیرد و خصوص بہ مال یتیم خیال بد نہ کند !

(۳)

داز قمار بازی و دزدی و شراب خوری و دیگر مسکرات از قسم افیون و بھنگ و چرس وغیرہ ازبس احتراز جویند !

(۴)

در امور خیر کوشش و سعی موفورہ بکار برند .... علی الخصوص بکار محتاجان و درماندگان !

(۵)

و ہرگز بے تشخیص مرض معالجہ نہ کنند کہ غلطی در آں علاوہ از رسوائی دنیا بمواخذہ عقبیٰ گرفتار کند !

(۶)

پابندیٔ صحبت زنان شر بربادی دو جہان است بغیر ضرورت اختیار کردن لش دا بخود .... خصوص صحبت زنان ناحشہ بازاری !

۷

کثرت ازدواج روسیاہی دو جہاں می بخشد

علم وفضل

علم وفضل کا جب کوئی مرکز باقی نہ رہا تو خاندان شریفی کے افراد دیسی ریاستوں سے وابستہ ہونے لگے دلی کے ارباب کمال لکھنؤ، رام پور پٹنہ، کلکتہ، حیدرآباد میں پھیل گئے اور قدردانوں نے عہد مغلیہ کے ان جواہر ریزوں کو جہاں پایا چن لیا حکیم محمود خاں کے بھائی حکیم غلام محمد خان پٹیالہ سے پانچسو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے اور اکثر وہیں رہتے تھے اُن کے بعد ان کے لڑکے غلام اللہ خاں (حکیم اجمل خاں کے خسر) بھی پٹیالہ میں رہے حکیم مرتضیٰ خاں بھی عرصہ تک پٹیالہ سے وابستہ رہے خود حکیم محمود خاں ریاست جنید سے وظیفہ پاتے تھے، ان کے علم وفضل کی داستان ایک علیحدہ تالیف چاہتی ہے ہندوستان میں آج تک ان کے علم وفضل اور کمال فن کے افسانے زبان زد ہیں ان کی تشخیص اور معالجہ کے عجیب وغریب قصے بیان کئے جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا نے ان کو غیر معمولی شخصیت عطا کی ہوتی تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس خاندان اور اس کے ساتھ طب یونانی کی بقا ناممکن تھی۔

غیور اور دردمند طبیب

محمود خان اپنے خاندان میں ایک غیور مگر دردمند طبیعت لے کر آئے تھے غریبوں کے حال پر خاص التفات فرماتے تھے لیکن امیروں کے لیے بہت تند خو تھے مطب میں مجال نہ تھی کہ کوئی امیر کسی غریب سے آگے بڑھ کر نبض دکھا دے اہل دول سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے اور والیان ریاست اگر علاج کے لیے بلاتے تھے تو ہزار خوشامدوں اور التجاؤں کے بعد تشریف لے جاتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور بہادر شاہ کی نام نہاد تاجداری کا پورا زمانہ گزار کر ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا، اس طرح ۱۸۵۷ء کا غدر اُن کی جوانی کا زمانہ تھا خوش قسمتی سے خاندان شریفی ان تباہیوں کی زد میں نہیں آیا، اس کا ایک سبب خود محمود خاں کا شخصی اعزاز تھا جس وقت برطانوی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو نابھ، پٹیالہ اور جیند کی فوجیں اُن کے ساتھ تھیں اور ان مہاراجگان

نے برطانوی افسروں سے کہہ دیا تھا کہ شریف خانی خاندان کی حفاظت کی جائے، اس لیے کہ قلعہ سے اُس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ چنانچہ انگریزی فوجوں نے دہلی میں داخل ہوتے ہی اس گھر کی حفاظت کے لیے پہرہ بٹھادیا اور تمام خاندان اس دار و گیر سے محفوظ رہا۔ مرزا غالب نے بھی حالات غدر کے سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

دیانت و امانت

۸ر جون ۱۸۵۷ء کو دلی پر انقلابیوں کا انھیں اُس زمانہ میں باغی کہا جاتا تھا، قبضہ ہوا اور ۱۴ ستمبر کو انگریزوں نے فتح پائی اس کے بعد مہینوں تک ہنگامہ دار و گیر گرم رہا۔ باغیوں کی شکست کے وقت جب دلی والے بھاگے تو ہزار ہا اشخاص نے حکیم محمود خان کی حفاظت میں اثاثہ چھوڑ دیا، حالت یہ تھی کہ لوگ حکیم صاحب کے پاس اپنا قیمتی سامان، زیور اور جواہرات محفوظ کرنے کے لیے لاتے تھے اور حکیم صاحب ایک کوٹھری[1] بتا دیتے تھے کہ اس میں رکھ جاؤ، چنانچہ یہ کوٹھری چھت تک لوگوں کے پُلندوں گٹھڑیوں اور بکسوں سے بھر گئی۔ بقول حکیم محمد احمد خاں مرحوم اندازہ یہ تھا کہ اس وقت اس کوٹھری میں دو کروڑ روپیہ سے زیادہ کی امانت رکھی ہوئی تھی۔ یہ مرتبہ دلی میں محمود خاں ہی کا تھا کہ لوگ ان کی کوٹھریوں میں اس طرح اپنی دولت ڈال کر جاتے تھے۔ غدر کے بعد جب لوگ اپنے گھروں کو واپس آئے تو حکیم صاحب نے اُس کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور فرمایا "جس کا جو سامان ہو وہ پہچان کے لے جائے۔"

غدر کے زمانہ کے خدمات

دہلی میں اور خصوصاً بلی ماروں کے محلہ میں جو ہزار ہا جائدادیں ضبط ہوئیں ان کے لیے محمود خان حکام کے پاس جاتے تھے اور انھیں واگزاشت کرا دیتے تھے جو لوگ گرفتار تھے انھیں رہا کرانے کے لیے

---

[1] : اس زمانہ میں خاندانی دیوان خانہ کے سامنے یہ کوٹھری اُس مقام پر تھی جہاں اجمل خاں صاحب نے بعد کو اپنا ایک کمرہ تعمیر کیا۔ یعنی وہ کمرہ جس میں زیادہ تر مرحوم کی نشست تھی اور جو اب بھی موجود ہے۔

کوتوالی جایا کرتے تھے اور یہ کہہ کر کہ میرے عزیز ہیں انھیں رہا کرا لیتے حالانکہ عام طور پر کچہری اور عدالت میں جانے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ تاہم غدر کی مصیبت میں، دن رات مخلوق کی جو خدمت انجام دی اس کے قصے عرصہ تک دہلی میں زبان زد خاص و عام تھے۔ ایک طرف مزاج کی وہ سختی اور تمکنت کہ اہل دول کی صورت دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو جاتے تھے اور دوسری طرف طبیعت کی یہ نرمی اور گداز کہ غریبوں اور گرفتاران بلا کی خاطر کوتوالی کے چکر لگاتے تھے محمود خاں کی فطرت کی بلندی کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ تھا۔

حکیم محمود خاں بہتر سال زندہ رہے اور مسلسل اپنے فن سے متعلق تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ مزاج بہت آزاد اور بے پروا پایا تھا لالچ طمع غرور اور خود نمائی سے نفرت تھی لیکن خودداری کا جذبہ بہت قوی تھا۔ اُن کے فنی معجزے بہت ہیں اور اس قابل ہیں کہ کتاب کی صورت میں محفوظ کیے جائیں۔

معجزانہ علاج

مثلاً ایک واقعہ رسالہ "زبان" نے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا تھا:۔

• ایک دفعہ گرمی کے موسم میں ٹھیک دوپہر کے وقت جناب والدہ ماجدہ کو کسی مرض کا دورہ ہوا، یکایک ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے، گلے میں بلغم بولنے لگا منہ بند ہو گیا آنکھیں پھر گئیں اور وہ بے ہوش ہو گئیں، مکان کے برابر ہی منوہر نامی ایک تجربہ کار وید رہتے تھے، ان کو بلا کر دکھایا گیا، انھوں نے تجویز کیا کہ سردی اور ہوا کی خرابی ہے مگر مرض بہت بڑھ گیا ہے جانبری کی کوئی امید نہیں بہر حال اُنھوں نے گولی دی مگر وہ کسی طرح حلق سے نیچے نہ اُتری ناچار والد صاحب گھبرائے ہوئے حکیم محمود خاں کی خدمت میں پہنچے، حکیم صاحب مکان کی چھت پر ایک حجرہ میں تسبیح بدست بیٹھے تھے اور وظیفہ خوانی میں محو تھے والد صاحب چونکہ بے تکلف تھے وہیں پہنچ گئے، اور

عرض حال کیا۔ آپ نے جھڑک کر فرمایا کہ جا! شربت عناب پلا دے۔ اب سوچیے کہ شربت عناب اور کجا یہ مرض، زمین آسمان کا فرق ہے مگر خیر اس وقت تو چلے آئے پھر تھوڑی دیر میں پہنچے اور جا کر کہا کہ حضرت! شربت عناب دیتے ہی مریضہ کی حالت اور بھی دگرگوں ہو گئی، میں نے آپ کے کہنے سے شربت پلایا ہے اگر خدانخواستہ وہ مر گئی تو میں قیامت میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔ فرمایا میاں کیوں جھوٹ بولتا ہے تو مجھے خواہ مخواہ دھوپ میں پریشان کرنا چاہتا ہے اچھا چل یہ کہکر آپ پاپیادہ ساتھ ہو لیے گھر پہنچتے ہی ایک لوٹے کی ناں سے منھ کھول کر شربت عناب پلوایا اور اس کے پیتے ہی مریضہ کو آرام ہو گیا۔"

ایسی مثالوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو حکیم محمود خاں کے فن کمالات پر سند ہے محمود خاں کو خدا نے حسنِ ظاہر اور حسن باطن دونوں عطا فرمائے تھے، ترکمانی خون کی جھلک سے ان کا چہرہ روشن تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی مردانہ وجاہت اُن کے چہرہ پر نمایاں تھی۔ لانبا قد متناسب اعضا جسم کی رنگت سرخ وسفید بارہ مہینے گرمی اور جاڑے وہی شربتی کا انگرکھا اور سفید پگڑی یہ ان کی وضع تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو وضع قطع بالکل سپاہیانہ ہوتی تھی۔

۱۳۰۹ھ ہجری میں انھوں نے رحلت فرمائی تمام ملک میں ان کی رحلت کا ماتم ہوا۔[1]

ایک اور معرکہ آرا علاج

حکیم محمود خاں کے معرکہ آرا علاجوں کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے لیکن ذیل میں بطور مشتے نمونہ از خروارے ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے :-

ارسطوئے زماں حکیم محمود خاں صاحب نے ایک بیاض اپنے خاندان کے لیے ترتیب دی ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک شخص مدت سے شدید دردِ سر میں گرفتار تھا اور علاج سے

حاشیہ ۱ : حیات اجمل (قاضی عبدالغفار)

اسے کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا۔

آخر مزید سوالات کرنے سے معلوم ہوا کہ درد سر سے پہلے نکسیر پھوٹی تھی۔ اور رو کنے کے بعد ہی درد سر شروع ہوا۔ حکیم صاحب مرحوم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مریض کے سر کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا ہے، چنانچہ آپ نے رات کو بہدانہ بھگو کر صبح مصری ڈال کر پینے ارشاد فرمایا، دو تین روز مریض کی ناک سے خون کے جمے ہوئے ٹکڑے خارج ہوئے اور مرض جاتا رہا[1]۔

ہمدردی خلق حکیم محمود خاں میں ابنائے جنس کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی غدر کے زمانہ میں مصیبت زدہ لوگوں کی انھوں نے جی جان سے گزر کر خدمت کی مرزا غالب ایک واقعہ لکھتے ہیں:۔

۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینے میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں لوگ پھر شہر میں واپس آنے لگے اسی اثنا میں حاکم شہر کو چغلخوروں نے خبر دی کہ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے معالج یعنی حکیم محمود خاں صاحب کا مکان مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو باغی بھی ان لوگوں میں ہوں جو حکیم صاحب کے ہاں پناہ گزیں تھے چنانچہ ۲ فروری سہ شنبہ کے روز حاکم مذکور دوڑ کے آگیا اور مالک خانہ کو مع ساٹھ اور آدمیوں کے پکڑ کرلے گیا۔ اگرچہ چند روز تک سب کو حوالات رہی لیکن حکیم صاحب کی عزت و آبرو کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا بالآخر حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے چچا زاد بھائی حکیم عبدالحکیم خان کو واپسی کی اجازت ہو گئی۔ ۱۲ فروری کو کچھ لوگ اور چھوڑ دیئے گئے ۱۳ فروری کو تین آدمیوں نے اور رہائی پائی مگر نصف سے زائد آدمی حوالات ہی میں رہے[2]۔

---

[1]: حکایات الاطباء (حکیم محمد حسن قرشی) ص۱۳

[2]: غالب کی فارسی تاریخ غدر "دستنبو" ص۷۹ (روزنامچہ غالب)

حسنِ سلوک

حکیم صادق علی خاں کے بیٹے حکیم محمود خاں اور حکیم مرتضیٰ خاں جو بہت خاندانی آدمی ہیں اور حکیم مرتضیٰ خاں ریاست پٹیالہ میں بہت عرصہ سے اپنے بڑے بھائی کی جگہ مقرر ہیں اور محمود خاں اپنے والد کی جگہ مطب کرتے ہیں جب انگریزی فوج داخل ہوئی تو ان لوگوں نے ان کے ساتھ بڑی ہمدردی کی جن کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تمام اہل محلہ اقربا و احباب۔ بلا امتیاز امیر و غریب پانسو آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا، اور جب تک یہ ہنگامہ فرو نہیں ہو گیا برابر ان کی خبرگیری اور خاطر مدارات کرتے رہے۔ ایک دن کسی نے مخبری کی اور سب آدمی حکیم صاحب کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے گرفتار ہو کر کوتوالی چلے گئے۔ حکیم صاحب بھی ان کے ہمراہ تین دن مقید رہے۔ اور بڑی جانفشانی سے ان سب کو چھڑایا۔ اور چند دن بعد سب کو لے کر ریاست پٹیالہ چلے گئے[ف]۔

محمود خان اور نذیر احمد

حکیم محمود خاں مرحوم کی نازک مزاجی ہندوستان میں مشہور تھی۔ ان کا مطب ایک میلہ تھا۔ جہاں سینکڑوں مریض صحت یاب ہوتے تھے۔ استاد و مکرم مولوی نذیر احمد مرحوم کی تنک مزاجی سے کون پڑھا لکھا واقف نہیں۔ اتفاق سے سرسید نے ایک سب جج کو کسی شکایت کے سلسلے میں دہلی بھیجا اور مولوی نذیر احمد کو لکھا کہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس لے جائیں۔

نزاکت طبع کے اعتبار سے نذیر احمد اور محمود خاں ایک سے ایک بڑھتے ہوئے تھے۔ نازک مزاجی کا اکھاڑہ تیار ہو چکا تھا اور دونوں کامل الفن دماغی طاقتوں میں چونکہ دنگل میں اترنے کو تیار تھے مزاج اور نزاکت میں ڈوبا ہوا تھا جس کی تہ میں شگفتگی کے جواہرات چمک رہے تھے محمود خاں مرحوم حکیم و رئیس تھے۔ نذیر احمد مغفور ادیب عالم جہاں آباد کی سرزمین جس نے میر تقی کی خشکی اور پیشانی کو بوسے دیئے تھے اپنے دونوں سپوت گود میں لیے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ مولوی نذیر احمد مطب میں داخل ہوئے۔ ایک ایسی کڑک سے جو مطب میں گونج گئی کہا "السلام علیکم"

شریف خانی نفاست طبع اس کرختگی کا تحمل آسانی سے نہ ہو سکتی تھی۔ نہایت دھیمے سروں

ف۔ نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۹ ۔

میں وعلیکم السلام کی ایک آواز نکلی اور ختم ہو گئی[1]

تشخیص مرض اور قیافہ شناسی

حکیم محمود خاں صاحب کا دُور دُور کے اطباء لوہا مان گئے، تشخیص امراض کے ساتھ قیافہ کو اتنا دخل تھا کہ دُور سے مریض کی صورت دیکھ کر اس کا مرض بتا دیتے۔ ہر شخص کو اس کی حیثیت کے موافق نسخہ دیتے، نباضی میں وہ کمال حاصل تھا کہ علاوہ امراض کے بہت سی باتیں بتا دیتے تھے۔

چونکہ حکیم صاحب کا مزاج بڑھا ہوا تھا اکثر ایسی باتیں سرزد ہوتی تھیں کہ مریضوں کو ہنستے ہنستے کچھ دوا بتا دیتے اور لوگ مزاح سمجھتے اور درحقیقت وہ اُن کا علاج ہوتا تھا، غرض تمام ہندوستان میں آپکا سِکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ حکیم محمود خاں صاحب علاوہ علمی لیاقت اور ذاتی شرافت کے فقیر دوست درویش نواز تھے۔ امیروں کی مطلق پروا نہ کرتے، فقیروں کا دم بھرتے؛

ایک مجذوب سے عقیدت

دیوبند ضلع سہارنپور میں رگھیں شاہ صاحب ایک مجذوب صاحبِ خدمت تھے حکیم صاحب ہمیشہ دہلی سے دیوبند تشریف لے جاتے اور پیادہ پا کئی کئی روز تک ان کے ساتھ رہتے۔ حکیم صاحب حافظ عبدالرحمٰن صاحب نابینا جو اکمل فقیر اور عظام مشائخ سے تھے جن کا اب مزار حضرت سلطان نظام الدین علیہ الرحمتہ کی خانقاہ کے قریب ہے مرید تھے - ان کا فرمایا ہوا حکیم صاحب ہمیشہ بعد مغرب ورد رکھتے تھے ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خانصاحب مرحوم کا بھی یہی طریق رہا، غرضیکہ حکیم محمود خانصاحب نہایت آزاد مستغنی المزاج تھے یہ فقراء کی صحبت ہی کا اثر تھا دوا کا محض بہانہ تھا اور جو مریض آیا بہت جلد شفا پاتا۔ اس خاندان میں یہ بات بھی قابل تعریف ہے کہ شہر کے لوگوں سے مطلق فیس نہیں لیتے امیر غریب سب کا علاج برابر اسی طرح تسلی اور تشفی سے کرتے[2]؛

---

[1] : دہلی کی آخری بہار (علامہ راشد الخیری) صد ۱۰۴؛

[2] : یادگار دہلی (سید احمد ولی اللہی) صد ۱۴۸؛

حالی کی تقریر محمود خاں پر

حکیم محمود خاں کے انتقال پر مولانا حالی نے نہایت پُر اثر اور پُر درد مرثیہ لکھا، یہ مرثیہ صرف حکیم محمود خاں کا نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دہلی اور سلطنت اسلامیہ کا مرثیہ ہے دہلی کے روساء اور عمائدین اور حکیم صاحب مرحوم کے عقیدت مندوں نے پُر زور تحریک کی کہ ایک جلسہ عام حکیم صاحب کی تعزیت میں منعقد کیا جائے اور اس میں مصنف محترم کی زبان سے یہ مرثیہ سنا جائے لیکن اسی زمانہ میں مولانا بیمار ہوکر پہاڑ چلے گئے۔ دو تین مہینے کے بعد جب سفر سے واپس آئے تو ۲۰ محرم ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۲ء بروز یکشنبہ ایک جلسہ مفتی محمد صدر الدین خان صاحب مرحوم کی کوٹھی پر منعقد کیا گیا، اس میں مولانا نے یہ مرثیہ پڑھا جس سے اہل جلسہ بے انتہا متاثر ہوئے مندرجہ ذیل تقریر وہ ہے جو مرثیہ سے پہلے مرثیہ لکھنے کی ضرورت پر مولانا نے فرمائی تھی:

مسلمانوں میں مرثیہ لکھنے کا رواج ابتدائے اسلام سے پایا جاتا ہے اور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں بھی عزیزوں دوستوں اور مشہور لوگوں کے مرثیے اب تک موجود ہیں سچ یہ ہے کہ کسی شخص کی نیکی بزرگی اور مقبولیت کا ثبوت جیسا کہ مرثیہ کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے اور کسی ذریعہ سے نہیں ہو سکتا، جو تعریف کسی کے مرنے کے بعد کی جاتی ہے اس میں بناوٹ یا تصنع کا گمان ہرگز نہیں ہو سکتا عرب کے شعرا کو جب دل سے کسی کی سچی اور بے ریا تعریف کرنی ہوتی تو اس کے مرنے کے بعد مرثیہ لکھتے تھے معن بن زائدہ شیبانی جو کہ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ایک نہایت فیاض اور شجاع سپہ سالار گزرا ہے اس کے بیشمار مرثیے لکھے گئے ایک شاعر نے اس کے مرثیہ میں لکھدیا تھا کہ فیاضی اس کے ساتھ رخصت ہوگئی اب کس سے فیاضی کی امید رکھیں خلیفہ مہدی نے اس جرم میں اسکو دربار سے نکلوا دیا اور امراء نے اسکو صلہ دینا موقوف کر دیا مگر اس پر بھی شعرا معن کے مرثیہ برابر لکھتے رہے جعفر برمکی کو ہارون رشید نے قتل کر دیا تو اس کے مرثیہ لکھنے پر بہت سے شاعروں کو موت کی سزا دی گئی مگر پھر بھی لوگ مرثیہ لکھنے سے باز نہ آئے۔ فی الواقع کسی شخص کی شکر گذاری اور احسان مندی کے اظہار کا موقع اس سے بہتر نہیں ہو سکتا

کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وفات پر افسوس کیا جائے اور اس کا ذکر جمیل ملک میں پھیلایا جائے۔ اسلام میں بلکہ شاید تمام دنیا میں کوئی واقعہ کربلا سے زیادہ عالم آشوب اور دردناک وقوع میں نہیں آیا اور اسی لیے فی زمانہ مسلمانوں میں مرثیہ کا اطلاق صرف سید الشہدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرثیوں پر ہونے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ ان مرثیوں کے سننے سے ہر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے اور خاندان نبوت کی محبت جو کہ اسلام کی جڑ ہے دلوں میں موجزن ہوتی ہے اور شہدائے کربلا کے صبر و استقلال کی پیروی اور اتباع کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے قوم کے اکثر بزرگوں نے واقعہ کربلا کے بیان میں اپنی عمریں تمام کر دی ہیں اور قوم کے رونے اور رلانے کے لیے اس قدر ذخیرے چھوڑ گئے ہیں اب کسی شخص کو ان مضامین کے دہرانے کی ضرورت نہیں رہی لیکن اس زمانہ میں کہ مسلمانوں کی قومی بندش ڈھیلی ہو گئی ہے اور تمام جماعتوں میں تفرقے پڑے ہوئے ہیں ان میں ہمدردی کا بیج بونے اور قومیت کی روح پھونکنے کی از بس ضرورت ہے جہاں اس کی اور بھی بہت سی تدبیریں ہیں ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ قوم میں سے جب قوم کا کوئی محسن اور خدمت گزار گزر جائے تو اس کی زندگی کے حالات قلم بند کیے جائیں اور شعراء جو قوم کی زبان ہیں تمام قوم کی طرف سے ان کے مرثیے لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اس میں ہمدردی کا رمق باقی ہے۔

اگرچہ میں اپنے تئیں اس عزت کا مستحق نہیں سمجھتا کہ مجھ کو قوم کی زبان سمجھا جائے لیکن چونکہ میں نے دیکھا ہے کہ مرحوم حکیم محمود خاں کی وفات سے تمام ہندوستان میں عموماً اور دلی میں خصوصاً ایک غیر معمولی رنج و افسوس پیدا ہوا ہے اور میرے اکثر احباب کو اس حادثہ سے سخت صدمہ پہنچا ہے اس لیے میں نے چند بند بطور مرثیہ کے ترتیب دیے ہیں اور اس وقت میں ان کی پڑھنے کی آپ صاحبوں سے اجازت چاہتا ہوں[1]۔

---

[1] : مقالات حالی (شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند)

حالی کا مرثیہ محمود

علم والے علم کے دریا بہا کر چل دیے — واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیے — کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیے

ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیل فنا اس کو بھی اے دلی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی — ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی — اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

تجھ میں ہے دلی کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں — نازشِ دار الخلافت مرجعِ ہندوستاں
ہند سے تا عرب کشمیر سے تا انڈیماں — بچہ بچہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا کیا آئے نہاں — واقعات زندگی کر دیجیے گر اُن کے بیاں
سمجھیں لگ افسانہ ناواقف اسے اور داستاں — ہے تعجب خیز الحق سیرت محمود خاں

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہر انساں سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دار الشفا — خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا — فکر نذرانہ کا تھا اس کو نہ شکرانہ کا تھا

اُس کے استغناء سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا کھل مزدور کا

بے حقیقت اس نے سمجھا مال و دولت کو سدا — تھے برابر اس کے نزدیک اغنیا اور بے نوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا — کوئی مفلس کا نہ تھا پرسان حال اس کے سوا

کرتے ہیں جو دعوے ہمدردی نوع بشر
اس نے باطل کر دیئے تھے اُن کے دعوے سر بسر

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب — پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب — اُس کے بیماروں کو گو ہاویں ہوں یا جاں بلب

سُود تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر جھلاک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسہ جس قدر — کرتے ہیں معلوم جو جو اُن سے امراض بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر — اُس کی اک اُنگلی پہ تھے قربان سو تھرمامیٹر

نارسا تھیں دوربینیں اہل صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہ دوربیں اس کی وہاں

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں ایک محشر بپا — نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا — باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا

موجزن تھا جب کہ دریائے عتاب ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار — ساتھ دیتا تھا کسی کا موت سے رہنا دو چار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار — شہر میں تھی چار سُو گویا قیامت آشکار

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

بالیقین جن مجرموں کو اس نے سمجھا بے خطا
مارشل لا میں ثبوت اُن کی گواہی کا دیا

چین سے بیٹھا نہ جب تک ہو گیا اک اک رہا
جو کہ تھے نادار کی ان کی اعانت برملا

زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا

قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی جس کو خو نہ تھی
دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچی نہ تھی

جس نے صورت تک عدالت کی کبھی دیکھی نہ تھی
ہاتھ سے جس نے بڑوں کی آن اب تک دی نہ تھی

بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا
پاؤں اک اس کا عدالت میں تھا اور اک گھر میں تھا

کی تھی جو بچپن سے طرز زندگانی اختیار
اس میں فرق آیا نہ وقت واپسیں تک زینہار

کوہ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار
وضع اس کی جو کہ تھی وضع سلف کی یادگار

قوم کے از یاد رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہد عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

عہدِ بہادر شاہ کے ہنرور اور فن کار

خطّاط، خوش نویس، نغمہ ساز، نقّاش، مصوّر، داستان گو

آخری بادشاہ سراج الدین ظفر، یعنی بہادر شاہ کا عہد، ذہنی، دماغی، اور فنی و علمی اعتبار سے ہندوستان کا تابناک ترین اور، روشن ترین دور تھا، اس عہد میں، زندگی کے ہر گوشہ میں ہمیں ایسی ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جن کا پھر کوئی ثانی پیدا نہ ہو سکا، جنھوں نے اپنے فن اور ہنر کی ایسی نمائش کی، جو آج تک موضوعِ بزم و انجمن ہے۔

عہدِ بہادر شاہ کے ہنروروں اور فنکاروں کا تفصیلی تذکرہ اگر مرتب کیا جائے تو ایک ضخیم و طویل کتاب بن جائے، لیکن ان میں سے چند کا تذکرہ ضروری ہے، تاکہ اس دورِ گرامی کی ایک جھلک نظروں کے سامنے آسکے، اور وہ ماحول پیشِ نظر رہ سکے۔

اب مختصر طور پر چند ہنرور اور فن کاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے: ——————

خوشنویس

سید محمد امیر پنجہ کش

یہ جناب سادات کبار سے ہیں خط نستعلیق کو جنھوں نے زمانہ میں ان کی قلم کی صداقت سے مردہ مثل صورت ثانی کے دوبارہ زندہ کیا، ہر دائرہ حروف کا اُن کے اوصاف حمیدہ کے ذکر میں

سراپا دہاں اور مدات الفاظ کی اُن کی محامد حمید کے بیان میں سراسر زبان - ان کی خوشنویسی کے دور میں میر عباد کی خوش قلمی پر اعتماد نہیں رہا اور ان کی صانعی کے زمانہ میں آغا رشید بند ہوگیا باوجودے کہ ورزش پنجہ اور رکھی میں کوئی ان کا نظیر نہیں جس پر ہاتھ ان کا ایسا سبک ہے کہ قلم کو ایک آن میں ہزار حروف لکھنا اور پھر اُس خوبی کے ساتھ کچھ گراں نہیں - (۱)

ان میرپنجہ کش سے، صوفیا اور اکابر نے بھی مشق قلم کی تھی :-

" میر صاحب کا دستور تھا کہ جب کوئی لڑکا اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اوّل روز اُس کے ہاتھ سے ایک وصلی لکھواتے اور اپنے پاس رکھ لیتے جب کوئی شاگرد شکایت کرتا کہ حضرت اتنی مدت گذری لیکن میرا خط درست نہیں ہوا تو اس کی پہلی لکھی ہوئی وصلی نکال کر سامنے رکھ دیتے کہ اس سے مقابلہ کرو، کتنا فرق ہوا ہے جب وہ پہلی تحریر دیکھتا تو فرق بیّن معلوم ہوتا اور شاگرد کی تسکین ہو جاتی - ایسا ہی حال طالبانِ طریق کا ہے - کہ جب تعلیم بتدریج حاصل ہوتی ہے تو امتیاز حال نہیں ہوتا اور طالب کو تشنگی طلب بدستور رہتی ہے اور خیال کرتا ہے کہ ابھی کچھ حاصل نہیں ہوا حالانکہ مرد کامل کی صحبت اپنا کام کرتی رہتی ہے - اگر اس میں بھی وصلی لکھی جاتی تو ہم بھی لکھوا رکھتے - آج مقابلہ ہو جاتا - لیکن تبدیل خیالات میں کچھ فرق ہوا یا نہیں پہلے کی نسبت خود ہی کمی بیشی معلوم ہوتی تھی - ہاں انکشافات اگر اس کو منظور رہے تو وہ بھی ہو جائے گا " (۲)

محمد جان صاحب مرحوم مغفور

شاگرد میر کلن خوشنویس بے بدل اور خوش قلم بے نظیر تھے جب تک یہ قید حیات میں تھے ان کے سامنے کسی خوشنویس کو یارائے دم زدن نہ تھا عرصہ پندرہ بیس برس کا ہوتا ہے کہ روح پُر فتوح کو عالم فانی سے رہا کیا - اللہم اغفر لی و لہ (۳)

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید)

(۲) تذکرہ غوثیہ صـــ۲۱۳

(۳) تذکرہ اہل دہلی (سرسید)

حافظ کلو خاں صاحب مغفور

خط نسخ میں استاد یگانہ اور مشہور زمانہ۔ اس خط کو شان یاقوت پر لکھتے تھے۔ بلکہ یاقوت کو ان کے سامنے یاقوت جرم دار کی مانند کچھ قدر نہ رہی تھی۔ عرصہ چند سال سے عالم باقی کی طرف خرام کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میر امام الدین صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

خط نسخ میں استاد ہیں سلطان عصر حضرت ظل اللہ سراج الدین محمد بہادر شاہ کے استاد خط نسخ کو قاضی کی شان پر لکھتے ہیں اور باتفاق زبان خلائق پر ہے کہ اس شان پر ان سے بہتر بلکہ ان سے اُنیس بیس بھی لکھنا محال ہے۔

پنڈت شنکر ناتھ

خط شکستہ میں شاگرد رشید تھے مولوی صاحب ممدوح کے اور بعد اُن حضرت کے ان سے بہتر شہر شاہجہان آباد میں کوئی نہیں ہوا اور اب چھ سات برس کا عرصہ ہوا کہ جہان فانی سے راہی ہوئے۔

بدر الدین علی خان مہر کن

خط نستعلیق لکھنے میں شاگرد ہیں سید امیر صاحب ممدوح کے اور مہر کنی کے فن میں تمام ہندوستان میں اس سرگروہ اہل کمال کا نظیر نہیں۔ مہر حکام وقت کی علی الخصوص نواب گورنر جنرل بہادر کی اسی یگانۂ روزگار کے ہاتھ کھدا کرتی ہے۔ جو دائرہ کہ ان کی قلم سے نکلتا ہے ہزار حرف اُن کی یگانگی پر اپنے ذہن سے ادا کرتا ہے۔

مولوی حیات علی صاحب مغفور

خط شکستہ میں وہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ اُن کے ہر حرف کے خم و پیچ سے زلف خوباں شکستگی دام کرتی تھی اور خط نستعلیق میں ایک شان نئی اختراع کی تھی۔ اور طرفہ یہ ہے کہ اس شان کی صدہا کتابیں مختصر اور مطول اُن کی قلم سے نکلی ہوتی ہیں کہ ہر حرف اُن کتابوں کا ایک قطعہ شمار میں آتا ہے۔ بمدت خدا کی ہے کہ ایسے فرد کامل بھی صفحۂ روزگار پر بہم پہونچے۔ ان اللہ علی کل شیء قدیر۔ مدت دراز ہوئی کہ اس جہان فانی سے راہی ہوئے۔ (۱)

ارباب نغمہ و موسیقی

میر ناصر احمد

والدین اُنکے سادات عظام سے تھے اور اتفاق زمانہ سے ہمت خان مرحوم موصوف کی دختر بلند اختر سے منسوب ہوئے۔ چونکہ اس صاحب کمال نے اپنے نانا سے مرحوم کی صحبت میں رشد و بلوغ بہم پہونچایا اور اُس کی فیض تربیت سے فن موسیقی میں یکتائے عہد ہو گیا۔ وہ مغفور فن نغمہ سرائی میں مشہور روزگار تھا۔ یہ یکتائے زمانہ نغمہ سرائی اور بین نوازی دونوں میں معروف روزگار ہوا اور ان دونوں کاموں کو ایسا کیا کہ گوش اہل روزگار نے ترانہ ہائے کہنہ سابقین کو فراموش کیا۔ اور کملائے دہر کو یہ اعتقاد ہے کہ جب اُن چیزوں کو انہوں نے

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید)

برتا اساتذہ سلف کو مجال نہ تھی کہ اس کے عشر عشیر پر بھی قادر ہو سکتے۔ اپنے نانا کی وفات کے بعد بدستور قدیم حضرت خواجہ محمد نصیر صاحب مرحوم کے سامنے یہ بھی نغمہ سرائی بین نوازی انہیں دونوں تاریخوں میں کرتے رہے اور بعد اُن کی وفات کے حضرت سراسر افادت جانشین شاہ محمد نصیر غفر اللہ نثرت خلفت یادگار سلف مولانا و بالفضل مولانا مولوی یوسف علی کے سامنے جو لائق سجادہ نشینی خاندان موصوف بل اس امیر کے واسطے الیق ہیں۔ وہی مجلس اس کامل کے وجود سے مزین ہوتی رہی۔ اب گردش آسیائے گردوں سے بتقریب تلاش رزق نواح صوبہ اودھ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔

ہمّت خان

بارید اس کا شاگرد کہیں اور نکیا اس کا تلمیذ کمترین۔ یہ زبدۂ کملائے روزگار اس عنایت میں اپنے عہد میں کوس لمن الملکی مارتا تھا۔ سب ارباب نغمہ اس کے نام سے اپنا کان پکڑتے تھے۔ دھرپد کے گانے میں اس کا نظیر نہ تھا۔ اگر تان سین زندہ ہوتا زانوئے شاگردی تہ کرتا اور اگر بیجو باؤرا قید حیات میں ہوتا خط غلامی لکھ دیتا۔ ہرچند اطراف عالم سے رو سائے ذوی الاقتدار اور راجہ ہائے عالی تبار بہ نہایت آرزو بطمع زر خطیر خط لکھ کر تمنا کرتے تھے کہ یہ صاحب کمال قصد اونکی ملازمت کا کرے۔ باستانت استغنائے خداداد جو ارباب کمال کے لوازم ذاتیہ سے ہے۔ تمام عمر اُن کی طرف منہ نہ کیا اور دہلی سے قدم باہر نہ رکھا۔ جو نغمہ سرا کہ ممالک دور دست سے مدعی اس فن کا ہو کر وارد شاہجہان آباد ہوا اس کی ایک تان کے سنتے ہی نہ تال کی خبر رہی نہ سُر کی اور اُس کے قدم کی خاک کو اپنی آنکھ کا کحل الجواہر بنایا۔ حضرت بابرکت شاہ محمد نظیر صاحب مرحوم سجادہ نشین خلافت حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کے سامنے بنابر رسم مستمرہ کے دوسری اور چوبیسویں ہر مہینہ کی مجلس نغمہ گرم کیا کرتا تھا اور درد دل اس کی الحان داؤدی سے مست ہو جاتے تھے۔ راہ از بسکہ درد باطن اور لذت فقر کی چاشنی اس مستغنی

الاؤصاون کے گلوے حال میں یہ عجیب ہوتی تھی اُس نغمہ کو ایک اور ہی کیفیت بہم پہنچی تھی اور یہ کلام مولوی روم علیہ الرحمۃ

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سی ماہر کامل کے نامی گلو کی شان میں صادق آتا تھا۔ عرصہ چند سال کا ہوتا ہے کہ اس عالم عنصری سے انقطاع تام کیا اور بزم جنت میں خراماں ہوا۔

رحیم سین ستار زن

یہ صاحب کمال اشرف اولاد میاں تان سین سے ہے و صدائے تار اس کی ستار کی الحان داؤدی سے خبر دیتی ہے۔ چھ راگ اور چھتیس راگنی اس کے تار ساز کے بال باندھے غلام و کنیز ہیں۔ نواب فیض محمد خان والی جھجر نے کمال قدر دانی سے اپنی ملازمت میں رکھا تھا اور بعد ان کی وفات کے نواب فیض علی خان مرحوم نے کہ بذریعہ وراثت والی اُس ریاست کا ہوا بدستور قدر شناسی اس زبدۂ کملائے عصر کی کرتا رہا۔ اب جو وہ ریاست عبدالرحمٰن خان پسر نواب مرحوم تک منتقل ہوئی یہ رئیس بھی اُس صاحب کمال کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتا۔ واقع میں ایسے یکتائے روزگار عرصہ عالم میں کم جلوہ گر ہوتے ہیں۔

مکھو پکھاوجی

پکھاوج بجانے میں یکتائے عصر اور یگانۂ دہر۔ بالاتفاق کہتے ہیں کہ جو صحت اس کے

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی دو مرتبہ

ہاتھ میں ہے نہ ملنت کو میسر ہوئی اور نہ خلعت کو۔ (۱)

گلاب سنگھ پکھاوجی

جامع تھا فنون فنّی موسیقی کا۔ ہاتھ اس صاحب کمال کا پکھاوج کے بجانے میں ایسا طیار تھا کہ اُس کے ہاتھ کی ایک جنبش میں سو راگ آنکھوں کے سامنے پھر جاتے تھے۔ اور ستار نوازی کو گویا اسی نے از سرِ نو زندہ کیا تھا۔ سوا اس کے جلترنگ کے بجانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ عرصہ دراز ہوا کہ سفرِ آخرت اختیار کیا اور عین جوانی میں داغِ مرگ سینہ پر لے گیا۔

کار بسیار و اندک است حیات
عمر در خورد کار با پستی

نظام خاں

دھرپد سرائی میں بے مثل و مانند ادنیٰ شاگرد اُن کا تان سین و بیجو باورے کو خیال میں نہیں لاتا تھا۔ عرصہ قلیل ہوا کہ شبستانِ عالم بغیر اُس کے وجود عشرت آمود کے ماتم سرا ہو گیا۔

قائم خاں

دھرپد نوازی میں ایسا کامل تھا کہ مقامات دوازدہ گانہ راگ کو کہ کمال صعوبت سے ہفت خواں رستم کا حال رکھتے ہیں، اُس کے انفاس معجزہ اساس نے بہ آسانی سر کیا تھا۔ عہد آدم سے اس دم تک ایسا ماہر پیدا نہیں ہوا اور اس زمانہ سے لغخ صور تک اس کے نظیر کا پیدا ہونا متصوّر نہیں۔ عرصہ چند سال سے عالم فانی سے کوچ کیا۔

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی از سرسید ص ۱۳۵

بہادر خان ستار زن

فن ستار نوازی میں یگانۂ روزگار۔ اس کی صدا سے در و دیوار تصویر کا عالم بہم پہنچاتے تھے یہ فقرہ کہ "مرغ از طیران و آب از جریان باز دارد" اسی ماہر کامل کی ذات پر صادق آتا تھا۔ پانچ چھ برس کا عرصہ ہوا کہ عالم باقی کی طرف سفر آخرت اختیار کیا۔

راگ رس خان

فن بین نوازی میں یکتائے روزگار اور یگانۂ شہر و دیار۔ اس کی بین کا ہر تار شیرازۂ کتاب عزت تھا۔ جیسا ہمت خاں فن نغمہ میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا یہ صاحب کمال بین نوازی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ ہمت خاں کے ساتھ دوسری چوبیسویں حضرت موصوف مرحوم کے روبرو صحبت بین نوازی سے گوش شوق کو ممنون اور سامعہ تمنا کو مرہون کرتا تھا۔ چند سال گذرے کہ عالم فانی سے عالم باقی کو راہی ہوا۔

مصوّر اور نقاش

مرزا شاہرخ بیگ

فن تصویر میں نہایت کامل اور اقران و امثال سے اس کام میں گوئے سبقت لے گئے مژۂ چشم حور اگر اس کا قلم مو قلم بنے بجا ہے اور بیاض گردن پری اگر اس کا صفحہ ہو تو زیبا ہے۔ کل نقشے اس کتاب کے فیض علی خاں موصوف اور اُن کی استعانت سے مرتب ہوتے ہیں۔ کام ان نقشوں کا نمونہ ان کی صنعت کا ہے۔

فیض علی خان

کہین برادر حقیقی ہیں غلام علی خان موصوف کے۔ مانی ان کا قلم بند و صدقت وار اور بہزاد ان کی طرح کا چہرہ نگار۔ شمع ان کی تصویر کی بزم افروز اور آتش ان کے نقشہ کی عالم سوز۔ از بسکہ مزاج ملاح دلتقوی کی طرف بہت مائل ہے جاندار کی تصویر سے تائب ہو کر نقشہ مکانات پر قناعت کی۔ سبحان اللہ اس کام کو اس طرح سے انجام دیا اور اس امر کو ایسا انصرام پہونچایا کہ بیان اس کا احاطہ تحریر سے باہر ہے۔

محمد عالم

استاد فن ہے اور اس فن کے دقائق سے آگاہ۔ وضع قدیم کی تصویر جیسی اس سرگروہ اہل کمال کی قلم سے کھینچ سکتی ہے اور کی مجال نہیں (۱)

غلام علی خان

مصور بے مثل و مانند و پیکر آرائے بے شبہ و نظیر رنگینی از رنگ مانی ان کے نقش سادہ کے مقابل خجل اور آب و رنگ کار نامہ بہزاد ان کی سیاہی قلم کے سامنے منفعل۔ نقاش بہار نے ہر چند تصویر چمن کی وہی شقائق اور سفید آب نسترن سے بنائی ان کے کردہ بے نقش و نگار کے آگے رونق نہ پائی ایسا قادر اس فن میں صفحہ روزگار پر نہیں پیدا ہوا کہ دیدہ نرگس کی تصویر بینا اور زبان سوسن کا نقش گویا بنا سکتا ہے۔ غنچہ ان کی چمن تصویر کا بویا اور مردم چشم ان کے موقع نہر میں آشنا۔ دیدۂ مور کے پردہ پر کرۂ عالم کی تصویر اس طرح بنائی کہ میزان اصد بند گردش افلاک و اوضاع کواکب کو بتفصیل اس

---

(۱) تذکرہ اہل دہلی (سرسید)

میں مشاہدہ کر سکتے ہیں اور نقطۂ موہوم پر نقشۂ کون و فساد کا ایسا کھینچا ہے کہ فکر حکیم استحالۂ اجسام اور تکون موالید اور حصول ترکیب اور تغیر فصول کیفیت اُس سے دریافت کر سکتا ہے۔ گل کی نرمی اور خار کی درشتی اُن کی تصویر سے مشہود۔ حیوان کی حرکت اور نبات کا نمو اُن کے نقشے میں موجود۔

داستان گو

میر کاظم علی

فلک فتنہ ساز، عیار، چالباز۔ واقعات عیاری سن کر چشم رشک سے روئے زمین کو دیکھ رہا ہے۔ میر کاظم علی داستان گو تشریف لاتے ہیں طوطیٔ رنگین بیان بلبل ہزار داستان پر مقراض زبان گل کترتی ہے بزم آراستہ کرتے ہیں تو بزم پرویز کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے رزم کا اہتمام کرتے ہیں تو کمان رستم نقاب سحاب عنبریں نقاب منہ پر لیتی ہے شیروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں ابھی ابھی دستر خوان چنا خوان فرعون کو بے نمک کر دیا محفل رنگ و بو آراستہ کی صراحی و پیمانہ لا دھرا ساقی گل عذار کو لا کھڑا کیا دنیا کو بن پیے متوالا بنا دیا جادو کا ذکر چھیڑا اللہ رے جادو بیانی سامعین کو دم کے دم میں مسخر کر لیا اور پھر لطف یہ کہ دل گھبرانے نہیں پاتا طبیعت اکتاتی نہیں صاحب کمال تھے اہل دربار میں داخل ہوتے۔ (۱)

---

(۱) دلی کا سنبھالا۔ (خواجہ محمد شفیع) ص ۱۱۳

ہنرور

نرائن داس

منشی نرائن داس صاحب پنواڑی تشریف لاتے ہیں۔

برگ سبز است تحفہ درویش ع

بلّی ماروں میں پانوں کی دوکان ہے ۔ نثر پڑھاتے ہیں اس کتاب کے نکتے ان سے بہتر سمجھنے والا روئے زمین پر نہیں شاگرد دکان پر جمع رہتے ہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے پان بنائے جاتے ہیں علم کا دریا بہائے جاتے ہیں سرخ رو ہوئے اہل علم میں جگہ پائی (۱)

---

(۱) دلی کا سنبھالا (خواجہ محمد شفیع دہلوی) ص ۱۱

باب ۱۷

عہدِ بہادر شاہ کے اخبارات

بہادر شاہ کے زمانہ میں۔ صحافت کی داغ بیل پڑ چکی تھی، اردو زبان میں اگرچہ یہ صنف بالکل نئی تھی، لیکن اس کا رجحان اور اٹھان صاف بتا رہا تھا کہ، آگے چل کر صحافت ایک مستقل فن بننے والا ہے۔ بہادر شاہ بھی اخبارات سے دلچسپی رکھتے تھے، "سراج الاخبار" ان کے حکم اور ایما سے جاری ہوا تھا، جو مطبع سلطانی میں چھپتا تھا، اور لال قلعہ سے شائع ہوتا تھا۔

آج اُن اخبارات کا دستیاب ہونا قطعاً ناممکن ہے، جو بہادر شاہ کے عہد میں شائع ہوتے تھے، لیکن مختلف کتابوں اور مقالوں میں، ضمناً اور سرسری تذکرہ۔ جہاں کہیں اُن کے بارے میں نامکمل اور تشنہ معلومات ملتے ہیں، ان سے بھی ایک سرسری اندازہ اس عہد کی صحافت اور انداز صحافت کا ہو جاتا ہے، اس زمانہ میں نہ رائٹرز ایجنسی ملک میں پہونچی تھی، نہ نیوز سروس قائم ہوئی تھیں۔ صحافت زیادہ تر معلوماتی خبروں۔ اور مضمونوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن جب کبھی ملکی مسائل پر گفتگو کی نوبت آجاتی تھی، تو آزادی تحریر و رائے کا جلوہ بھی نظر آ جاتا تھا، اس عہد کے لیے یہ بات قطعاً نئی تھی، اور تعجب انگیز آج بھی ہے۔

تلاش و کاوش کے بعد، جن اخبارات کا کچھ تذکرہ یا نمونہ مل سکا، یا جن کے نام ہی معلوم ہو سکے، اب ہم ان کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں، یقیناً یہ تذکرہ ناکافی ہے، اور مزید "ریسرچ" کے بعد یہ فہرست بڑھائی جا سکتی ہے، لیکن جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی بہت کچھ ہے: ۔

---

(۱)

اردو کا پہلا اخبار۔ اور مطابع کی کثرت

۱۸۳۵ء میں دہلی میں سنگی مطبع قائم ہوا اور ۱۸۳۶ء میں دہلی سے مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کے والد) نے دہلی اردو اخبار جاری کیا۔ یہ اردو زبان کا دوسرا اخبار تھا پہلا اردو اخبار مولوی کرم علی نے کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں نکالا تھا۔ نواب نصیر الدین حیدر (سال جلوس ۱۸۲۷ء / ۱۲۴۳ھ) نے مسٹر آرچر کو کانپور سے بلا کر لکھنؤ میں سنگی مطبع قائم کیا جس میں سب سے پہلی کتاب شرح النبہ چھپی ۱۸۳۷ء میں دہلی میں ٹائپ کا مطبع بھی قائم ہو گیا۔ اس سال کے بعد تمام ہندوستان میں لیتھو کے چھاپے خانے کھلنے لگے اور اخبارات نکلنے لگے آگرہ میرٹھ، بنارس۔ بریلی، پنجاب، بمبئی، مدراس وغیرہ میں بڑی کثرت سے مطابع و اخبارات جاری ہو گئے۔

۱۸۴۹ء میں صرف ممالک مغربی و شمالی یعنی (موجودہ دہلی یوپی اور پنجاب) میں ۲۲ مطبع تھے۔ جن میں سے ۱۲ مطبع صرف لکھنؤ میں تھے اور ان مقامات پر ۲۳ اردو اخبار نکلتے تھے اس سال تمام ہندوستان کے اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پچاس کے قریب تھی اور صرف ممالک مغربی شمالی میں ۱۴۱ کتابیں طبع ہوئیں غدر کے اگلے سال ۱۸۵۸ء میں مطبع نولکشور قائم ہوا اور اسی سال اس مطبع سے اودھ اخبار جاری ہوا یہ اخبار آئندہ چل کر روزانہ ہو گیا اور ملک کے ممتاز اخباروں میں شمار ہونے لگا اور مطبع نولکشور کو اس قدر ترقی ہوئی کہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک مشرق میں اس سے بڑا مطبع نہ تھا۔ (۱)

---

(۱) داستانِ تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۴

(۲)

سیّد الاخبار

سرسیّد ابتدا سے نہایت فراخ حوصلہ اور کشادہ طبع تھے خرچ کی تنگی کے سبب اکثر منقبض رہتے تھے لہذا اُن کو یہ خیال ہوا کہ کسی تدبیر سے یہ تنگی رفع ہو سیّد الاخبار جو ان کے بھائی کا جاری کیا ہوا اخبار تھا کچھ تو اس کو ترقی دینی چاہی۔ اور کچھ عمارات دہلی کے حالات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔

سیّد الاخبار کا اہتمام اگرچہ برائے نام ایک اور شخص کے سپرد کر رکھا تھا مگر زیادہ تر سرسیّد خود اس میں مضامین لکھا کرتے تھے لیکن یہ اخبار ایک مدت جاری رہ کر بند ہوگیا۔ (۱)

(۳)

سراج الاخبار

سراج الاخبار جو ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ دہلی کا روزنامچہ تھا اور ہر ہفتہ مطبع سلطانی میں شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں جاری ہوا تھا تفصیل کے لیے دیکھو پنڈت کیفی دہلوی کا مضمون "اب سے آدھی صدی پہلے کے اردو اخبار" در رسالہ اردو جلد ۱ ۱۹۵۳ء ص ۲۰۱ تا ۲۰۹)

(۴)

خبر دہلی

یہ اخبار دہلی سے نکلتا تھا، اس کا انداز تحریر، خبریں پیش کرنے کا طریقہ۔ اور خبروں

---

(۱) حیات جاوید (حالی) صفحہ ۳۶

پر تبصرے کا اسلوب کیا تھا، اس کے لیے یہ چند سطریں بطور نمونہ کافی ہیں :—

"کل کے دن اکیسویں تاریخ ماہ نومبر کو گورنر جنرل بہادر لارڈ ڈال ہوسی صاحب دام اقبالہ قریب گیارہ بجے کے دہلی میں داخل ہوئے اور سلامی ہوئی اور کوٹھی سرطامس مٹکف صاحب بہادر میں اترے یہ لاٹ صاحب بہادر نہایت مدبّر اور عقلمند ہیں اور علم بہرہ کافی رکھتے ہیں کئی دفعہ سخت لڑائیوں میں لڑے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ یہاں بالکل امن رہے گا لیکن اب معلوم ہوا کہ سکھ لوگ خواہ مخواہ جنگ طلب کرتے ہیں خیر اگر وہ لڑائی چاہتے ہیں، انگریزی گورنمنٹ بھی مستعد ہے، خبر ہے کہ لاٹ صاحب موصوف بائیسویں (۲۲) تاریخ ماہ حال کو بوقت شام کے دہلی سے روانہ ہوں گے یقین ہے کہ بعد سزا دینے اور زیر کرنے سرکشان پنجاب کے واسطے امن اور بہتری خلقت ہندوستان بہت سی تجویزیں کریں گے۔"

(۵)

کریم الاخبار

اسے مولوی کریم الدین نے نکالا تھا، یکم فروری ۱۸۴۵ء کے روزنامچہ بہادر شاہ میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے :—

"دہلی میں آج کل ایک مطبع رفاہ عام نہایت شان و شوکت کے ساتھ جاری ہوا ہے کریم الاخبار جس کے مہتمم فضائل مآب مولوی کریم الدین صاحب ہیں اسی مطبع میں چھپتا ہے امید ہے کہ عنقریب یہ مطبع بہت زیادہ رونق و ترقی حاصل کرے گا۔ (۱)

کریم الاخبار، قلعہ کی اندرونی خبریں چھاپنے، اور ان پر تبصرہ کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا :—

"آج کل دہلی میں بنارس کی طرف کا ایک برہمن آیا ہوا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ میں استخراج

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۵

بھولات دچھپے ہوتے امور معلوم کرنے کا ایک قاعدہ اکے ذریعے سے چھپے ہوتے خزانے اور دفینے کا حال بتا سکتا ہوں مرزا عاشور بیگ صاحب کوجب برہمن کے اس کمال کی خبر ہوتی تو انہوں نے بلا کر کہا میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارے اس مکان میں دفینہ ہے لیکن یہ نہیں معلوم کس جگہ ہے اگر تم خزانہ کا ٹھیک پتہ بتا سکو اور وہاں سے کچھ نکل بھی آئے تو ہاں اس میں سے کچھ حصہ دوں گا برہمن نے کہا میں نشان بتاؤں گا اگر روپیہ نکل آئے تو آدھا تمہارا آدھا ہمارا حاصل کلام اسی شرط پر معاملہ طے ہوگیا برہمن نے حساب لگایا اور ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا کھدائی شروع ہوگئی برہمن اپنی طرف سے ایک آدمی کو نگرانی کے لیے چھوڑ کر خود چلا گیا چند گز زمین کھودی گئی ہوگی کہ بارہ ہزار روپیہ اور ایک ہزار اشرفی نکلی مرزا عاشور بیگ نے جب یہ رقم دیکھی تو اپنے اقرار سے پھر گئے۔ دل میں کہا اپنے بزرگوں کی جمع کی ہوئی دولت کو جو انہوں نے اپنی اولاد کے لیے اڑے کھڑے وقت کے لیے رکھی تھی۔ اس طرح آسانی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کردینا بے وقوفی کی علامت ہے۔ کوئی ایسی تدبیر سوچنی چاہیے کہ ہماری دولت کا آدھا حصہ بیکار نہ جائے اور حلال روپیہ حرام صورت میں برہمن کے صرف میں نہ آئے بہت غور و فکر کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ برہمن کے مقرر کیے ہوئے آدمی کو کسی طرح اپنی طرف کرلینا چاہیے تاکہ اصل حقیقت کا کسی کو علم نہ ہو اور تھوڑے سے خرچ میں کام بن جائے چنانچہ برہمن کے گماشتہ سے آٹھ سو روپے رشوت پر یہ معاملہ طے ہوگیا کہ برہمن سے یہ ظاہر کیا جائے کہ صرف دو ہزار روپیہ نکلا ہے۔ اس پر مرزا صاحب اور گماشتہ میں قسما قسمی بھی ہوگئی چنانچہ اس قرارداد کے موافق ایک ہزار روپیہ گماشتہ کے ذریعے برہمن کے پاس بھیج دیا گیا کچھ عرصے تک اس واقعہ کی کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوئی مگر بعد میں راز کھل گیا اور برہمن کو اصل واقعات کا علم ہوگیا اور اس نے اپنے گماشتہ کی رشوت ستانی اور مرزا عاشور بیگ کی وعدہ خلافی کا حال اخبار کریم الاخبار کے مہتمم صاحب سے بیان کیا اور استدعا کی کہ اس کو شائع کردیا جائے مہتمم صاحب نے یہ حالات اپنے اخبار میں درج کرا دیئے۔

ہمارے نزدیک یہ حکایت صداقت سے خالی ہے اور محض ایک نادر حکایت ہی ہے کیونکہ استخراج مجہولات کے قاعدہ کے ذریعہ سے نامعلوم اشیاء کی اعداد اور حساب کی پوری کیفیت معلوم ہو جاتی تھی، یہ نہیں کہ یہ تو معلوم کر لیا کہ خزانہ مدفون ہے اور یہ نہ معلوم کیا اس کی تعداد کیا ہے یہ بات اس فن کے جاننے والوں میں سے ہر ایک پر ظاہر ہے غالباً اس برہمن نے رمل و نجوم کے ذریعہ خزانہ کا پتہ چلا لیا ہوگا اور تعداد کا حال معلوم کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ (۱)

(۶)

دہلی گزٹ

یہ اخبار انگریزی میں نکلتا تھا، اور قلعہ کے حکام پر نکتہ چینی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا، ذیل کا دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو:—

دہلی گزٹ میں باغ روشن آرا و باغ سرہندی کے مقدمہ کی مسل چھپی ہے اور اس میں کچھ الفاظ ایسے بھی درج کیے گئے ہیں جو شان خسروی کے خلاف ہیں۔

"دہلی گزٹ کے ایڈیٹر صاحب کو طلب کر کے ارشاد ہوا کہ اراکین سلطنت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں تم ان کے جواب بھی اپنے اخبار میں شائع کرو گے یا نہیں؟ انہوں نے کہا ضرور شائع کروں گا اخبار نویس کا فرض ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تصویر کے دونوں رخ پیش کرے حضور والا نے یہ سنکر حکم دیا کہ اعتراضات کے جوابات لکھ کر ایڈیٹر صاحب کے پاس بھیج دیئے جائیں۔ (۲)

(۷)

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۵ — ۴ جولائی ۱۸۴۵ء —

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۷۹ — ۲۵ ستمبر ۱۸۴۶ء —

صدر الاخبار

* اخبارات کی غلط بیانیوں کی تردید بھی شائستہ انداز صحافت کے ساتھ ہو جایا کرتی تھی:۔

صدر الاخبار کے ایڈیٹر صاحب نے لکھا ہے کہ شاہجہان بادشاہ علیہ الرحمتہ کے زمانے کا ایک کتبہ جامع مسجد دہلی میں لگا ہوا ہے جس میں لکھا ہے کہ ۵ ہزار آدمیوں کے عمل نے چھ سال لگاتار جامع مسجد کی تعمیر میں گذارے ہیں اور دس لاکھ روپیہ اس پر صرف ہوا ہے مگر جب ہم ۱۰ لاکھ روپیہ کو پانچ ہزار مزدوروں سنگتراشوں وغیرہ پر تقسیم کرتے ہیں اور چھ سال کا حساب لگاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم بہت تھوڑی تھی بالکل غیر ممکن ۵ ہزار مزدوروں پر ۱۰ ہی لاکھ روپیہ صرف ہو معلوم ہوتا ہے حساب میں کوئی غلطی ہو گئی ہے یا کسی مصلحت کے تحت صحیح رقم نہیں لکھی گئی مزدوروں وغیرہ کی اجرت کے علاوہ پتھر بیں چونا ہے اور اسی قسم کی اور چیزیں ہیں آخر ان پر کچھ روپیہ صرف ہوا ہی ہو گا یہ چیزیں مفت آنے سے تو رہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا ۱۰ لاکھ روپیہ کیوں لکھے گئے ہم کے نزدیک صاحب صدر الاخبار کو کچھ غلط فہمی ہوئی اول تو یہ کہ اُس زمانہ کے مصارف بہت کم تھے۔ دوسرے یہ کہ بعض مزدوروں نے محض مذہبی خدمت کے شوق میں کام کیا ہو گا اور اجرت بہت کم لی ہو گی یا بالکل نہ لی ہو گی دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ سنگ سرخ سنگ مرمر وغیرہ پر کچھ خرچ نہ ہوا اور یہ سامان ریاستوں نے نذر بھیج دیا ہو اور یہ ۱۰ لاکھ روپیہ صرف مزدوروں پر خرچ ہوا ہو اور چونا وغیرہ ممکن ہے اپنے زیر اہتمام بھٹے قائم کرکے تیار کیا گیا ہو بس اس صورت میں خرچ معمولی سے کم رہ جاتا ہے اس لیے یہ یقینی ہے کہ جو کچھ جامع مسجد کے کتبہ میں لکھا گیا بالکل صحیح ہے اور اس میں کسی طرح غلطی کا امکان نہیں واللہ اعلم۔ (۱)

(۸)

---

(۱) بہادر شاہ کا روز نامچہ صفحہ ۔۔۔ ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۷ء

احسن الاخبار

غدر سے دس پندرہ سال پہلے احسن الاخبار نام ایک فارسی اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا اور اس میں دہلی کے متعلق بہت سی دلچسپ خبریں ہوا کرتی تھیں۔ اگر اس اخبار کا مکمل فائل دستیاب ہو جاتا تو بہادر شاہ مرحوم کی نہایت مفصل سوانح عمری مرتب ہو سکتی۔(۱)

محبوب ہند

"ماسٹر رام چندر کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس سال کے ماہ جولائی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی کہا جاتا ہے کہ دہلی کے یہ پہلے ہندو ہیں جنہوں نے یہ مذہب اختیار کیا اس پنڈت کی عمر اس وقت ۲۵ سال کی ہے یہ شخص دہلی کالج کا طالب علم تھا اور اس کالج میں اس نے انگریزی۔ ہندوستانی اور فارسی زبانوں کو حاصل کیا تھا لیکن علم ریاضی کی طرف اس کا خاص رجحان تھا وہ متعدد اور مفید کتابوں کا مصنف اور مترجم ہے جن میں سے ایک الجبرا ہے ایک کتاب علم مثلث پر ہے جس میں مخروطات بھی شامل ہیں۔ اور ایک کتاب علم ہندسہ پر ہے ایک کتاب علم الحساب پر لکھی ہے لہذا ان کے علاوہ کئی کتابیں ادب پر ہیں یہ پروفیسر دو رسالوں کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ ان میں سے ایک خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کا نام محبوب ہند ہے یہ ایک ماہانہ پرچہ ہے جس میں اہم مسائل و معلومات وقت پر اہل ہند کی تعلیمی حالت پر اور عام ادب[۳] یعنی ہندوستانی زبان کی ترقی پر مضامین لکھے جاتے ہیں(۲)

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

(۲) منقول از خطبات گارسن دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔

(۳) داستان تاریخ اردو (احمد حسن قادری) ص ۲۴۵

اخبارات کی فہرست

چند اخبارات کا مع ان کے خصائص کے ہم نے صفحات بالا میں تذکرہ کر دیا ہے، اب ہم اس عہد کے اخبارات کی ایک فہرست —— جس کے بارے میں ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے - کہ مکمل ہے —— پیش کرتے ہیں، جو مختلف کتابوں، مقالوں، نیز، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن جلد ۱۹ ص۱۲۸ سے نیز پروفیسر قاسم علی سجن لال پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے مضمون سے ماخوذ ہے، درج کرتے ہیں: ——

۱ - اخبار الحقائق	
۲ - دہلی اردو اخبار	ایڈیٹر مولوی محمد باقر
۳ - قران السعدین	
۴ - آئینۂ حکمت	
۵ - فوائد الناظرین	ایڈیٹر رام چندر
۶ - صدر الاخبار	
۷ - سلطان الاخبار	
۸ - آفتاب عالمتاب	ایڈیٹر محمد غوث
۹ - زبدۃ الاخبار	ایڈیٹر واجد علی
۱۰ - اسعد الاخبار	
۱۱ - مطلع الاخبار	
۱۲ - فوائد الشائقین	
۱۳ - عمدۃ الاخبار	
۱۴ - سید الاخبار	ایڈیٹر عبدالغفور

۱۵ - اسعد الاخبار

۱۶ - احسان الاخبار

۱۷ - خیر خواہ ہند

۱۸ - سراج الاخبار

۱۹ - احسن الاخبار

۲۰ - کریم الاخبار

بہادر شاہ کے عہد میں

تراجم، مصنفات، مؤلفات اور ادب و لٹریچر کی کیفیت

تصنیف و تالیف، اخذ و ترجمہ، انشا پردازی، نثر نگاری، اور لٹریری نشو و نما، بلکہ عروج و فروغ کے اعتبار سے بھی، ہمیں بہادر شاہ کا عہد، ممتاز، اور نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ وہ دور تھا، جب اُردو قلعہ معلیٰ میں پردہ نشین تھی، بزم و مجلس میں اب تک اس نے قدم نہیں رکھا تھا، علماء اسے مُنہ نہیں لگاتے تھے۔ صوفیا کی خانقاہوں میں اسے بار نہیں ملا تھا۔ سرکار انگریزی کے دربار، اور جہاں پناہ کے ایوان شہریاری میں، اس کی کوئی سرکاری حیثیت نہ تھی، فارسی ہی میں روزنامچے لکھے جاتے تھے۔ عدالتی کارروائیاں بھی فارسی ہی میں ہوتی تھیں، کاروبار سلطنت تمام تر، فارسی ہی میں انجام پاتا تھا، اہل ذکر و فکر اپنے واردات جس زبان میں قلمبند کرتے تھے، وہ فارسی تھی، حد یہ ہے کہ اردو شعرا کے تذکرے تک فارسی میں لکھے جاتے تھے، ایک شاعروں کی محفل تھی، جہاں وہ پھل پھول رہی تھی، لیکن شاعروں کا بھی حال یہ تھا کہ اپنے فارسی کلام پر فخر کرتے۔ اور اردو کلام کو باعث ننگ سمجھتے تھے۔ غالب کہتے ہیں

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن بہادر شاہ کے دور میں، ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ اردو، صرف شاعروں کی زبان نہ رہی، کتابوں کی زبان بھی بن گئی، علمی اور فکری مطالب بھی اس میں ادا ہونے لگے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جو کام ہُوا، وہ بہت کم مایہ اور حقیر نظر آتا ہے، جب ہم دلّی کی اُردو سوسائٹی، اور دلی کالج کے حلقۂ

مدرّسین و معلّمین کے ترجمے دیکھتے ہیں، یا ان کی تصنیفات و تالیفات پر غور کرتے ہیں،

اس دَور میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہیں، بلکہ آج بھی وہ سرِ فہرست نظر آسکتی ہیں، کیا ترجمہ کی سلاست اور روانی کے اعتبار سے، کیا مطالب کی دل نشینی اور فصاحتِ بیان کے لحاظ سے، دوسری خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ اس زمانہ میں علمی اور فنّی اصطلاحوں کے وضع کرنے کا نہ صرف کام شروع ہُوا بلکہ اس کے اُصول اور ضابطے بھی بنا لیے گئے۔ وہ اصول اور ضابطے آج بھی دلیلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کام بے سرو سامانی کے ساتھ شروع ہُوا، لیکن تنظیم اور ترتیب کی رُوح شروع ہی سے کارفرما رہی،

زمانہ کی ستم ظریفی نے، اس قابلِ قدر سرمایہ کو، باقی نہ رکھا، لیکن اس کے جو آثار و نقوش باقی ہیں، وہ بتا رہے ہیں کہ اگر رفتار کار یہی رہتی، اور غدر کی شہر آشوبی اس کا بے دردی کے ساتھ خاتمہ نہ کر دیتی، تو اُردو، آج سے سو برس پہلے۔ مُلک کی علمی، ادبی، اور عوامی زبان بن چکی ہوتی، عوامی کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا کہ غیر مسلم اہلِ قلم نے اس تشکیلِ جدید میں، مسلمان اہلِ قلم اصحاب سے زیادہ وزنی، باوقار اور ٹھوس حصّہ لیا ہے، جس کی تفصیل آگے چل کر ملاحظہ کریں گے۔

ایک نمونہ بہادر شاہ کے دَور سے پہلے فورٹ ولیم کالج میں اُردو کا جو کام ہو رہا تھا۔ وہ صرف افسانہ طرازی اور داستان سرائی تک محدود تھا، علمی اور فنّی کام کی طرف چنداں توجّہ نہ تھی، لیکن بہادر شاہ کے دور میں کایا پلٹ گئی، اور تراجم و تالیفات کا ڈھیر لگ گیا، دورِ بہادر شاہ سے پہلے اُردو کا تصنیفی ڈھنگ کیا تھا، اس کا نمونہ میر امّن کی انشا میں دیکھیے:۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجالاتے رہے جاگیر و منصب خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالا مال اور نہال کر دیا اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدر دانی جتنی چاہیے فرماتے رہے اور خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے عیاں راچہ بیان تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا، احمد شاہ درّانی نے گھر بار تاراج کیا ایسی ایسی تباہی کھا کر ایسے شہر

سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا اور جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا غارت ہوا میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہے کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا کچھ بنی کچھ بگڑی آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے روزگار نے موافقت نہ کی عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آپہنچا چندے بیکاری میں گذری اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خان کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا قریب دو سال وہاں رہنا ہوا لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا تب منشی میر بہادر علی کے وسیلے سے حضور جان گل گرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا ہاتھ لگا ہے، چاہیے کہ دن کچھ بھلے آویں نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پاکر دعا اس قدردان کو کرتے ہیں خدا قبول کرے۔

باغ وبہار کے قصہ کا ماخذ اور طرز تحریر بھی خود میر امن کی زبانی یہ ہے :-

"قصہ چہار درویش کا ابتداء میں امیر خسرو دہلوی نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جو اُن کے پیر تھے (اور درگاہ ان کے قلعہ سے تین کوس لال دروازے کے باہر لال بنگلے کے پاس ہے) انکی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کے دل بہلانے کیواسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے اللہ نے چند روز میں شفا دی تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہیگا جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا اب خداوند نعمت اور صاحب مروت نجیبوں کے قدردان جان گل گرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اس محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"!

باغ وبہار ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء ختم کیا، ۱۸۰۳ء میں پہلی بار طبع ہوا باغ وبہار تاریخی نام ہے ۱۲۱۷ء نکلتا ہے۔ (۱)

---

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) صـ ۹۰

علمی ترجمہ کے اصول اور ضوابط

کسی غیر زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرنا بہت مشکل کام ہے، اور ترجمہ جب علمی اور فنی ہو تو دشواری اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی غلطی کا احتمال رہ جاتا ہے، اس کار دشوار کو آسان بنانے کی کامیاب اور کارگر تدبیریں عہد بہادر شاہ میں شروع ہو گئی تھیں، ذیل میں ان کا ایک خاکہ ملاحظہ فرمائیے:۔

انجمن نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کے لیے چند قواعد بھی وضع کیے تھے جن کا یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱)

جب سائنس کا کوئی ایسا لفظ آئے جس کا مترادف اُردو میں نہیں مثلاً سوڈیم پوٹے سیم، کلورین وغیرہ تو ایسے لفظ کو بجنسہٖ اُردو میں لے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہی قاعدہ ایسے خطابات والقاب کے بارے میں بھی مدِنظر رکھا جائے جن کے مساوی خطابات والقاب ہندوستان کی کسی تاریخ میں نہیں پائے جاتے مثلاً بشپ۔ ڈیوک۔ ارل کلکٹر وغیرہ۔

(۲)

اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اُردو میں پایا جاتا ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کرنا چاہیئے جیسے آئرن کے لیے لوہا۔ سلفر کیلئے گندھک، منسٹر کیلئے وزیر، سمنز کیلئے طلب نامہ۔

(۳)

اگر لفظ مرکب ہے اور ہر دو لفظ انگریزی ہیں اور دونوں میں سے کسی کا مترادف اُردو میں نہیں تو وہ لفظ بجنسہٖ اُردو میں منتقل کر لیا جائے۔ جیسے ہائیڈرو کلورک۔ کیونکہ ہائیڈروجن اور کلورائن میں کسی کا مترادف اردو میں نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پورے انگریزی جملے کو بجنسہٖ اُردو میں لے لیا جائے بلکہ

(۱) دہلی کالج (عبدالحق)

اسے اُردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً جسٹس آف دی پیس کو اُردو میں جسٹس پیس کی اور ملٹری آرڈر آف دی باتھ کو لشکری جماعت باتھ کی اور ملٹری اینڈ ریلیجس آرڈر آف مالٹا کو لشکری و مذہبی جماعت مالٹا ترجمہ کیا جائے۔

(۴)

اگر لفظ مُرکب ہے اور اُردو میں اس کا کوئی مُترادف نہیں۔ مگر الگ الگ لفظ کے مترادف اُردو میں موجود ہیں تو یا تو ان دونوں لفظوں کو ملا کر یا کسی دُوسرے مساوی مفہوم کے الفاظ میں ترجمہ کر لیا جائے۔ مثلاً کرالوجی کا ترجمہ عام زبان۔ ہاؤس آف لارڈز کا کچہری امیروں کی۔ ہاؤس آف کامنز کا کچہری وکلائے رعایا کی یا صرف کچہری وکلا کی۔

(۵)

جب یہ قاعدہ آسانی سے مطابق نہ ہو تو پھر غیر زبان کا لفظ اُردو میں لے لیا جائے۔ جیسے ہائیڈروجن، نائٹروجن۔

(۶)

اگر مرکب لفظ ایسے دو مفرد الفاظ سے بنا ہوا ہے جن میں سے ایک کا مترادف اُردو میں موجود ہے مگر دوسرے کا مترادف نہیں تو ایک انگریزی اور دُوسرے اُردو سے مرکب بنا لیا جائے۔ جیسے کورٹ آف ڈائرکٹر کا ترجمہ ڈائرکٹروں کی کچہری آرچ بشپ کا بشپ اعلیٰ کر لیا جائے۔

(۷)

بعض لفظ ایسے ہیں۔ جیسے آرڈر ( ) کلاس ( ) جینس ( ) اسپیشیز ( ) جن کے مترادف اگرچہ کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اُردو میں منتقل کر لیے جائیں تو مناسب ہوگا۔ کیونکہ اُردو میں اس قسم کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف ہوتے ہیں اور اس سے ایک دُوسرے کے مفہوم کے سمجھنے میں مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ ان الفاظ کے معنی کا امتیاز نیچرل ہسٹری میں بہت اہم ہے۔

(۸)

درختوں کے انواع (خاندانوں) کے نام یا تو اس نوع خاندان کے کسی ممتاز فرد پر رکھے جاتے ہیں یا اس نوع کی مشترک خاصیتوں کی بنا پر نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس قاعدے کی پابندی اردو میں بھی کی جائے۔ اگر یہ زیادہ آسان اور مفید ثابت ہو کہ ہر نوع (خاندان) کے الگ الگ نام صرف اس کے خاص اور ممتاز افراد پر رکھے جائیں تو پھر یہی کیا جائے۔

اوپر کے قواعد میں اردو مترادف سے مطلب ایسا لفظ ہے جو ملک کے تعلیم یافتہ اور متوسط درجے کے طبقے میں معروف ہے۔ اگر ہماری مشرقی زبانوں کی ڈکشنریوں میں کوئی مترادف لفظ نہ ملے اور پنڈتوں اور مولویوں سے پوچھنے کی ضرورت پڑے تو اس سے تو یہ بہتر ہے کہ انگریزی لفظ ہی اختیار کر لیا جائے۔ سائنس کا ترجمہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا۔ ایسے انگریزی الفاظ سے زبان کو بچانا تقریباً ناممکن ہے۔

آسان اصول

ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انھیں مہیا کرے اور جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو انھیں الفاظ کے استعمال کرنے کی کوشش کرے جو ان کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں، جب کسی انگریزی جملے میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند واقف نہ ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیے میں یا مناسب ہو تو متن میں اس کی مختصر طور پر تشریح کر دے۔

مترجم کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کی کبھی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ ترجمے میں سب سے بڑی بات اصل مفہوم یعنی جملے کے معنی اور مطلب کو صحیح طور سے ادا کرنا ہے۔ خواہ اس کی ساخت یا طرز ادا کیسی ہی مختلف کیوں نہ ہو۔

کیمسٹری کی اصطلاحات

کیمسٹری کی اصطلاحات کے متعلق یہ رائے دی گئی تھی کہ تمام اصطلاحی الفاظ کو بجنسہٖ اردو میں لے لینا مناسب ہوگا۔ البتہ کیمیاوی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں وہ ویسے ہی رہنے چاہئیں۔ لیکن مرکبات میں

انگریزی نام ہی رہیں۔ جیسے ہائیڈرو۔ سلفرک وغیرہ۔ چونکہ اصطلاحی الفاظ کے مادے تعداد میں بہت زیادہ نہیں۔ اس لیے اُن کی تفہیم میں کوئی زیادہ مشکل نہ ہوگی۔

نباتیات کا ترجمہ بہت کٹھن ہے۔ یورپین مصطلحات کا لفظی ترجمہ بالکل مہمل ہوجائے گا۔ البتہ جو دوسرا طریقہ درختوں کے خاندانوں کے نام رکھنے کا بتایا گیا ہے وہ زیادہ بہتر ہے، اور عام طور پر مستعمل ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ یورپ کے کسی خاندان کے نہایت ممتاز افراد ہمیشہ وہی نہیں ہوتے جو ہندوستان میں ہیں، بہرحال یہ نہایت ضروری ہے کہ کوئی صاحب جو نباتیات کا علم رکھتے ہوں اور اُردو بھی خوب جانتے ہوں اس کام کو انجام دیں۔

اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اُردو کو علمی زبان بنانے کی یہ پہلی سعی تھی جو خاص اصول اور قاعدہ کے ساتھ عمل میں آئی اب میں ان کتابوں کی فہرست دیتا ہوں جو اس سوسائٹی نے لکھوائیں یا طبع کرائیں، اس سے اس کے قابلِ قدر کام کا صحیح اندازہ ہوگا۔

سوسائٹی کے ترجموں اور تالیفات کی فہرست

۱۔ تحریر اقلیدس — مقالہ ۱ تا ۶ و ۱۱، ۱۲

۲۔ اصول قانون

۳۔ تاریخ ہند — زمانہ قدیم سے تا زمانہ حال

۴۔ اصول حکومت

۵۔ اصول قوانین مالگذاری

۶۔ اصول قوانین اقوام

۷۔ تاریخ انگلستان — (خلاصہ تاریخ گولڈسمتھ کا ترجمہ)

۸۔ الجبرا — (ترجمہ برجز)

۹۔ علم مثلث و ترشہائے مخروطی

۱۰ - عملی علم ہندسہ (پریکٹیکل جیومیٹری)

۱۱ - اصُول علم ہیئت (ترجمہ علم ہیئت ہرشل ابتدائی آٹھ باب۔ علم ہیئت یونی کیسل بارھواں باب۔ تتمہ از انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا)

۱۲ - تاریخ اسلام

۱۳ - تاریخ یونان

۱۴ - تاریخ روما

۱۵ - رسالہ کیمسٹری (ترجمہ پارکر)

۱۶ - استعمال آلات ریاضی

۱۷ - اٹلس (جغرافیہ)

۱۸ - قواعد اردو

۱۹ - انتخاب شعرائے اردو

۲۰ - انتخاب الف لیلہ

۲۱ - شمیسہ (منطق میں)

۲۲ سراجیہ (اسلامی قانون وراثت پر)

۲۳ - ترجمہ گلستان

۲۴ - قانون محمدی فوجداری (ترجمہ کتاب میکناٹن)

۲۵ - اردو لغات (یہ کتاب تیار ہوئی مگر چھپنے نہ پائی)

۲۶ - قانون مال (ترجمہ مارشمین)

۲۷ - لیلا وتی (حساب)

۲۸ - رامائن

۲۹ - مہابھارت (انتخاب)

۳۰۔ نل دمن

۳۱۔ دیوان سودا

۳۲۔ دیوانِ درد

۳۳۔ دیوان میر تقی میر

۳۴۔ دیوان جرأت

۳۵۔ نیچرل فلاسفی

۳۶۔ پولٹیکل اکانومی (معاشیات ترجمہ دیلنڈ)

۳۷۔ تحلیلی علم ہندسہ

۳۸۔ خلاصہ شاہنامہ (اردو میں)

۳۹۔ مبادیات تفرقی احصاد تکمیلی احصا

۴۰۔ تاریخ ایران

۴۱۔ میکانیات (لارڈنر)

۴۲۔ نیچرل تھیالوجی (پیلے)

۴۳۔ تاریخ انکشاف بری و بحری

۴۴۔ محاورات اردو

۴۵۔ تزک تیموری

۴۶۔ ترجمہ

۴۷۔ یوسف خاں کی سیاحت یورپ

۴۸۔ جغرافیہ قدیم کے نقشے

۴۹۔ اصول جبر و مقابلہ

۵۰۔ مختصر خاکہ تاریخ عالم دو جلد (بریف سروے آف ہسٹری از مارشمین)

۵۱۔ انقلاب پلوٹارکس لالوز (مشاہیر یونان و روما)

۵۲۔ دھرم شاستر

۵۳۔ شرع اسلامی

۵۴۔ سکپ دتھ کا خلاصہ قانون فوجداری

۵۵۔ پرتسپیپ کا خلاصہ قانون دیوانی

۵۶۔ مارشمین کا سول گائیڈ مع خلاصہ شرع اسلامی و دھرم شاستر

۵۷۔ ضابطہ مالگزاری (مارشمین)

۵۸۔ زلیخا

۵۹۔ بدر منیر

۶۰۔ لیلیٰ مجنوں

۶۱۔ حدائق البلاغت

۶۲۔ شکنتلا

۶۳۔ سنسکرت اور انگریزی ڈرامے

۶۴۔ رگھو ونش (کالیداس کا ڈراما)

۶۵۔ تعلیم نامہ

۶۶۔ جامع الحکایات

۶۷۔ تاج الملوک و بکاولی

۶۸۔ اسسٹنٹ مجسٹریٹ گائیڈ

۶۹۔ تاریخ خاندان مغلیہ (تیمور کے زمانہ سے شاہ عالم تک)

۷۰۔ فلسفہ

۷۱۔ نگارستان (زیر ترجمہ)

۷۲۔ تاریخ چارلس دوازدھم (زیر ترجمہ)

۷۳۔ جغرافیۂ طبعی (ترجمہ ٹریل)

۷۴۔ علم و عمل طب (عربی سے) (زیر ترجمہ)

۷۵۔ طبعی نباتیات (زیر ترجمہ)

۷۶۔ حفظانِ صحت (زیر ترجمہ)

۷۷۔ عضویات (علم افعال عضویات) (زیر ترجمہ)

۷۸۔ علم معدنیات (علم افعال عضویات)

۷۹۔ تذکرہ حکما

۸۰۔ مساحت (ترجمہ ہتیو ڈولک)

۸۱۔ چشمۂ فیض (مختصر قواعد اردو)

۸۲۔ طبیعات (ترجمہ ارناٹ)

۸۳۔ صرف و نحو انگریزی (اردو میں)

۸۴۔ عملی مساحت زمین

۸۵۔ زمین

۸۶۔ ہندوستان کے پیداواری ذرائع (ترجمہ راٹل)

۸۷۔ سوانح عمری رنجیت سنگھ

۸۸۔ رسالۂ طب

۸۹۔ ترجمہ ابو الفدا (تین جلدوں میں)

۹۰۔ تاریخ کشمیر

۹۱۔ جغرافیہ ہند

۹۲ فرائد الدہر (تاریخ شعرائے عرب)

۹۳۔ تاریخ بنگال

۹۴۔ رسالہ مقناطیس (لائبریری آف یوسفل نالج کے رسالے کا ترجمہ)

۹۵۔ تذکرہ ہندوشعرا

۹۶۔ رسالہ جراحی (سرجری)

۹۷۔ حرکیات وسکونیات

۹۸۔

۹۹۔ علم الناظر (ترجمہ فلپ)

۱۰۰۔ حرارت (لائبریری آف یوسفل نالج کے رسالے کا ترجمہ)

۱۰۱۔

۱۰۲۔

۱۰۳۔ رسالۂ علم برق (ترجمہ راجٹ)

۱۰۴۔ گالون ازم (" ")

۱۰۵۔ حکمائے یونان

۱۰۶۔ حالات ہندوستان ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا آف جبر گرانی مرتبہ مرے

۱۰۷۔ ہدایت المبتدی

۱۰۸۔ مربد الاموال یا سلاح الاحوال (علم زراعت)

۱۰۹۔ رسالہ اصول حساب (ترجمہ ڈی مورگن)

۱۱۰۔ ترجمہ تاریخ الحکمائ (ترجمہ تذکرۃ المفسرین (جلال الدین سیوطی)

۱۱۱۔ تذکرۃ الفقہا خلاصہ وفیات اعیان ترجمہ تاریخ ابن خلکان

۱۱۲۔ تذکرہ شعرائے ہند۔

۱۱۳۔ رسالۂ طب (انگریزی سے)

۱۱۴۔ تذکرۃ الکلیلن

۱۱۵۔ سنن ترمذی (اردو ترجمہ) (۱)

تراجم اور مولفات کی یہ فہرست اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ بہادر شاہ کے دور میں، ترجمہ اور تصنیف کے کام نے کتنی منضبط حیثیت اختیار کر لی تھی، اور کیسی نادر، اور نافع کتابیں مختصر سی مدت میں ترجمہ ہو گئیں۔

چند اور تراجم علوم و فنون

دلی سوسائٹی کے علاوہ بھی، ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا کام اس عہد میں یکسوئی، محنت اور ذوق و شوق کے ساتھ ہو رہا تھا ضروری ہے کہ ایک طائرانہ نگاہ ہم اس پر بھی ڈال لیں، تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو جائے۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی حکومت میں یعنی غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں ہر قسم کے علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف ہو گئی تھیں اور ان میں سے اکثر طبع ہو گئی تھیں تاریخ و جغرافیہ۔ مذہب سائنس، نجوم ہیئت معاشیات (اکنامکس) منطق طبیعات (فزکس) فن زراعت تعلیمات درسیات وغیرہ موضوعات مضامین کی کتابیں لکھی گئیں ان میں سے چند کتابیں بعض پرائیویٹ کتب خانوں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ کلکتہ وغیرہ کی بڑی یا سرکاری لائبریریوں میں اور ریاستوں یا امیروں کے کتب خانوں میں بھی موجود ہوں گی لیکن لندن کے انڈیا آفس کی لائبریری میں سب کی سب موجود ہیں جن میں مطبوعات بھی ہیں اور قلمی بھی۔ ان کی تصنیف و تالیف میں ہندو اہل قلم برابر کے شریک ہیں۔ چند مطبوعہ کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں:۔

۱۔	کھیت کرم ۳ حصہ	مصنفہ کالی رائے	مطبوعہ دہلی ۱۸۴۲ء	(فن زراعت)
۲۔	اصول علم انتظام مدن	مترجمہ دھرم نارائن	" " "	(معاشیات)
۳۔	اصول علم طبعی	مترجمہ امجد سیا پرشاد رسبوا پرشاد	" ۱۸۴۹ء	(طبیعیات)

---

(۱) مرحوم دلی کالج (ڈاکٹر عبدالحق)

۴-	عجائب روزگار	مصنفہ ماسٹر رام چند	مطبوعہ دہلی ۱۸۴۷ء	(طبعیات)
۵-	مراۃ العلوم	مصنفہ ورمن لال	مطبوعہ بنارس ۱۸۴۹ء	(//)
۶-	اصول قواعد مائیات	مترجمہ اجودھیا پرشاد	مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء	(//)
۷-	قانون انطباع (چھاپہ کا فن)	مصنفہ سیتل پرشاد	// // ۱۸۴۸ء	(سائنس)
۸-	اصول علم ہیئت	مصنفہ ماسٹر رام چندر	// // //	(نجوم و ہیئت)
۹-	مختصر وفائق النجوم	مولفہ کھٹائے	مطبوعہ مدراس ۱۸۴۸ء	(//)
۱۰-	خلاصہ نظام آسمانی	مرتبہ پنڈت وامی دھیرا	مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء	(//)
۱۱-	جغرافیہ ہند	مترجمہ پنڈت سیاروپ نرائن	مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء	(جغرافیہ)
۱۲-	فتح گڈھ نامہ (جغرافیہ ضلع فتح گڈھ)	مرتبہ کالی رائے	// // ۱۸۴۹ء	(//)
۱۳-	پندنامہ کاشتکاری	مصنفہ موتی لال	مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۲ء	(زراعت)
۱۴-	ریشم کا کیڑا	مرتبہ موتی لال	مطبوعہ لاہور ۱۸۵۳ء	(صنعت و حرفت)
۱۵-	بخار کی کل (اسٹیم انجن)	مولفہ الیشوری لال	مطبوعہ بنارس ۱۸۵۵ء	(سائنس)
۱۶-	ہوا کا بیان	مرتبہ بدری لال	// // ۱۸۵۴ء	(علم طبعیات)
۱۷-	معدنیات	مولفہ جواہر لال	مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۵ء	(طبعیات)
۱۸-	خلاصۃ الصنائع	مترجمہ بھولا ناتھ	// // ۱۸۵۴ء	(سائنس)
۱۹-	تحصیل فی جر الثقیل	مصنفہ سرسید احمد خان (سرسید)	// // ۱۸۴۴ء	(طبعیات)
۲۰-	ترجمہ معاشیات مل	مترجمہ نذیر علی	مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء	(معاشیات)
۲۱-	ترجمہ شمیسہ	مترجمہ سید محمد	// // //	(منطق)
۲۲-	مقاصد العلوم	مترجمہ سید محمد میر	مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۱ء	(طبعیات)
۲۳-	علم حکمت (میکانکس)	مولفہ چارلس فنک	// // ۱۸۴۳ء	(سائنس)
۲۴-	بحر الحکمت (اسٹیم انجن)	مرتبہ ریورنڈ پارکن	مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۷ء	(//)

۲۵۔	توصیف زراعت	مرتبہ کلب حسین	مطبوعہ آگرہ ۱۸۴۸ء	(زراعت)
۲۶۔	علم جغرافیہ	مترجمہ میر غلام علی	مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۱ء	(جغرافیہ)
۲۷۔	رسالہ مقناطیس	مترجمہ سید کمال الدین	مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء	(طبعیات)
۲۸۔	بجلی کی ڈاک	مولفہ جے ڈبلیو سیل	مطبوعہ آگرہ ۱۸۵۴ء	(")
۲۹۔	اصول جر ثقیل	مرتبہ محمد احسن	مطبوعہ بنارس ۱۸۵۶ء	(")
۳۰۔	چائے لگانے کی کتاب		مطبوعہ لاہور ۱۸۵۴ء	(زراعت)(۱)

جہاں ان کتابوں کا فنی تنوع قابل دید ہے، وہاں یہ منظر بھی کتنا جاذب نظر ہے کہ اُردو تراجم میں، ہندو اور مسلمان دوش بدوش نظر آتے ہیں، کسی طرح کی مغائرت اور اجنبیت نہیں، دونوں اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں، اور جوش و خروش کے ساتھ اس کے لیے کام کر رہے ہیں۔

کچھ اور کتابیں

مولوی کریم الدین نے اپنا ایک مطبع قائم کر لیا تھا۔ دہلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ گھر پر کتابیں لکھتے تھے اور اپنے پریس میں چھاپتے تھے۔ انھوں نے بھی کافی کتابیں لکھ ڈالیں۔ چند کی کیفیت ملاحظہ ہو:۔

۱۔ تعلیم النسا۔ لڑکیوں کی تعلیم پر جس میں آٹھ باب ہیں۔

۲۔ گلستان ہند (جس میں کئی باب ہیں۔ قصے۔ نصائح۔ منتخب اشعار وغیرہ)

۳۔ تذکرہ شعرائے ہند جس کا دوسرا نام طبقات شعرائے ہند ہے۔ یہ گارساں دتاسی سے ماخوذ ہے۔ اس کی تالیف میں ڈاکٹر فیلن بھی شریک تھے علاوہ ترجمہ کے انھوں نے مختلف تذکروں سے بھی حالات جمع کر کے اضافہ کیے۔

۴۔ گلدستہ نازنیناں۔ یہ شعرائے ہند کے کلام کا انتخاب ہے۔

۵۔ تذکرۃ النسا۔ اس میں نامور عورتوں کے تذکرے ہیں۔

---

(۱) داستان تاریخ اُردو (حامد حسن قادری) صفحہ ۱۹۷

۶۔ ترجمہ ابوالفدا۔ اوّل ودوم چہارم وپنجم جلد کا ترجمہ اُردو میں ڈاکٹر سپرنگر کی فرمائش سے کیا۔

۷۔ تاریخ شعرائے عرب ـــــ سوسائٹی کے لیے لکھی، اور ۱۸۴۷ء میں طبع ہوئی،

ان کے علاوہ اور بھی کئی رسالے ان کی تالیف سے ہیں (۱)

غرض یہ اور ترجمہ اُردو تصنیف وتالیف کے لحاظ سے نمایاں اور ممتاز دور تھا جسے کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا،

---

(۱) مرحوم دلّی کالج (ڈاکٹر عبدالحق)

باب (   )

دِلّی کالج

ایک مشترک تہذیبی ادارہ جسے مسلمانوں نے بنایا، انگریزوں نے مٹا دیا

مسلمانوں کی عالی حوصلگی، وسیع النظری، اور رواداری نے ہمیشہ تخلیقی اور تہذیبی کاموں کو فروغ دیا۔ اور ہمارا دہ ایک فاتح کی حیثیت سے جب اس سرزمین پر آئے، تو یہاں کی زبان الگ تھی تہذیب جدا تھی، وضع وطریق میں فرق تھا، لیکن اپنے ساتھ ایسے گراں بہا تحفے لائے کہ انہیں قبول کرنے سے ہندو قوم انکار نہ کرسکی۔ اس طرح مسلمانوں نے ایک مشترکہ تہذیب وثقافت، زبان اور ادب معیشت، اور معاشرت۔ کو جنم دیا، یہاں آکر انھوں نے خود بھی "السلام علیکم" چھوڑا اور ہندوؤں سے بھی "نمستے" چھڑا دیا، اور "آداب عرض" "بندگی" "تسلیمات" کے الفاظ آئے، وہ فارسی یا عربی بولتے آئے تھے، ہندوؤں کو اپنی بھاشا، اور سنسکرت پر ناز تھا، لیکن انہوں نے فارسی اور عربی چھوڑ دی، ہندوؤں سے ان کی زبان چھڑائی، اور، اردو ایک نئی زبان بنالی۔ جو نہ مسلمانوں کی تھی، نہ ہندوؤں کی، بلکہ دونوں کی تھی، اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، اور دوسری کئی زبانوں کے الفاظ تھے،   اب وہ اپنے خاندان سے جدا ہوکر ایک نئے خاندان میں آگئے تھے، اور یہیں کے ہو رہے تھے، تعلیم اور ادب پر بھی اس مشترک تہذیب نے اثر ڈالا۔ اور اس میں بھی اشتراک د ختلاط کی جھلک نظر آنے لگی۔

دلّی کالج اسی طرح کا ایک تہذیبی ادارہ تھا، اس کے قیام کی داستان بڑی دلچسپ اور عبرت انگیز ہے ۱۷۹۲ء میں یہ مدرسہ غازی الدین کے نام سے قائم ہوا، جہاں عربی، اور فقہ و دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی، اسے نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی۔ خلف نظام الملک آصف جاہ

نے اپنے ذاتی سرمایہ سے قائم کیا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں مختلف قالب بدلنے کے بعد، یہ "دلی کالج" بن گیا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئی۔ یعنی اس نے پانچ سو روپیہ ماہوار کی گرانٹ منظور کی، کالج بننے میں بھی مسلمانوں ہی کا حصّہ تھا، یعنی انگریزوں نے، نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر، وزیر بادشاہ کا ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ بھی اس کی تشکیل و تعمیر میں شامل کر لیا، یہ واقعہ ۱۸۲۹ء کا ہے۔

اب کالج ایک مشترک، تہذیبی اور تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے پروان چڑھنے لگا، اس کے اساتذہ، طلبہ، ماحول ہر چیز میں انفرادیت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی، مرچارلس مٹکاف، برٹش ریزیڈنٹ کی سفارش پر ۱۸۲۸ء میں انگریزی جماعت کا اضافہ بھی ہو گیا، اور کمپنی نے ڈھائی سو روپیہ دینا شروع کر دیا۔

انگریز شروع ہی سے، اس کے بہترین کارناموں اور شاندار نتائج کے باوجود اس کے مخالف تھے۔ معین الدین شاہ اکبر ثانی اور بہادر شاہ کے عہد حکومت میں، وہ اسے پھلتے پھولتے دیکھتے رہے۔ مگر کچھ نہ کر سکے۔ غدر کے بعد جب وہ ہندوستان کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔ تو ۱۸۷۷ء میں، ایک حکم کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے احتجاج و التماس کے باوجود اسے ختم کر دیا گیا۔

اس کالج نے کیا کیا؟ اور اس نے مشترک تہذیب کو کس طرح سنوارا، اس نے کیا کیا خدمات انجام دیے، یہ داستان بڑی طولانی ہے۔ اتنی گنجائش نہیں کہ اسے بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ لہٰذا، اختصار پر قناعت کرنی پڑے گی۔

سنہ ۱۸۲۹ء کی رپورٹ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے ایک بات تو قابل ذکر یہ ہے کہ ایک اعزازی جماعت ایسی بنائی گئی جس نے طلبہ میں خاص جوش اور شوق پیدا کر دیا۔ دوسری چیز کتب خانے کی توسیع ہے اور ان کے علاوہ سب سے بڑھ کر قابل ذکر اور لائق ستائش بادشاہ اودھ کے وزیر کا فیاضانہ عطیہ اور وقف ہے۔ جس کا مختصر واقعہ یہ ہے۔

وزیر اودھ کا عطیہ

نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے دہلی کے رزیڈنٹ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم اس غرض سے گورنمنٹ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے دہلی میں مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کے واسطے ایک درس گاہ قائم کی جائے اس کی صورت وقف کی ہوگی۔ اور یہ رقم گورنمنٹ کے پانچ فیصدی والے قرضے میں لگائی جائے۔

گورنمنٹ نے اس فیاضانہ عطیہ کو نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا مگر جنرل کمیٹی تعلیمات کے مشورہ کے بعد نواب صاحب کو جو رائے دی وہ رزیڈنٹ دہلی کی حسب ذیل تحریر میں مندرج ہے۔

"اس خیال سے کہ پانسو روپے ماہوار مقصد پیش نظر کی تعمیل کے واسطے کافی نہیں ہیں لاٹ صاحب دوستانہ مشورہ دیتے ہیں کہ مذکورہ بالا مقصد کے لیے جو رقم آپ خرچ کرنا چاہتے ہیں اگر اسے اس رقم میں شامل کر دیا جائے جو گورنمنٹ نے شہر دہلی میں اپنے کالج کے واسطے مقرر کی ہے تو یہ دونوں رقمیں مل کر موجودہ کالج پر خرچ ہوں تو دونوں کو متوقع نفع حاصل ہوگا۔ اگر آپ اس تجویز کو منظور فرما لیں گے تو آپ گورنمنٹ کالج کے معاملات کے مہتمم یا افسر سمجھے جائیں گے۔ اور پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر آپ کے نام سے ہوگا۔"

وصیت نامہ

نواب صاحب نے اسے منظور فرمایا اور سنہ ۱۹۳۰ء میں جو وصیت نامہ نواب صاحب نے اس کے متعلق تحریر فرمایا اس میں یہ الفاظ درج ہیں۔

. . . . "میں ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم نیک نیتی سے اس کالج کی امداد کے واسطے برٹش گورنمنٹ کی تحویل میں چھوڑتا ہوں جو نواب غازی الدین خاں مرحوم نے میرے وطن دہلی میں عربی فارسی علوم کی ترقی و تعلیم کے واسطے قائم کیا تھا۔ چونکہ میرے نزدیک علوم دینی اور اخلاق کے سرچشمہ ہیں اس لیے وصیت کرتا ہوں کہ رقم موقوفہ کا منافع ان علوم کے طبقہ اساتذہ پر خرچ کیا جائے۔"

اس وصیت نامے میں انہوں نے اپنے داماد سید حامد علی خان کو ان کی رقم کا نگراں بنایا

تھا کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے بوجہ کثرتِ مشاغل یا دیگر غیر متوقع اسباب کی وجہ سے تساہل واقع ہو تو وہ گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائیں اور بصورت ناکامی گورنمنٹ سے ایک جداگانہ کالج قائم کرنے کی درخواست کریں۔

۱۸۳۷ء میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مگر افسوس کہ حسب وعدہ نہ پروفیسروں اور طلبہ کا تقرر ان کے نام سے ہوا نہ وظائف ان کے نام سے دیے گئے نہ کسی قسم کی کوئی یادگار کالج میں ان کی قائم کی گئی۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس رقم سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو گیا۔ نواب حامد علی خاں نے اس رقم کے بیجا صرف ہونے کی طرف بارہا توجہ دلائی اور اہل دہلی نے اس رقم سے علیحدہ کالج بنانے کی بھی درخواست کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ نواب حامد علی خاں بھی کالج کمیٹی کے ممبر بنا دیے گئے۔ آخر جہاں یہ جانبار کالج گیا وہیں یہ عطیہ بھی گیا اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔؟

اس زمانے کی دلی

یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریز ملک کے اندر دلی خرخشوں سے مطمئن ہو گئے تھے۔ بنگالہ مدت ہوئی ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔ جنوب میں مرہٹوں اور خاص کر ٹیپو سلطان کا کھٹکا تھا سو وہ کانٹا بھی نکل گیا تھا۔ ملک میں امن و امان تھا۔ یہ امن خاص کر دلی شہر میں جو ایک مدت سے ارضی وسماوی آفات کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اور بھی ابھاگر نظر آتا تھا۔ چیزیں سستی تھیں، روپے کی کمی نہ تھی، حرفت وصنعت فروغ پر تھیں، لوگ خوش حال اور زندہ دل تھے۔ شہر فصیل کے اندر کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ خاص کر چاندنی چوک میں جس کے بیچوں بیچ نہر بہتی تھی وہ رونق تھی کہ نظر لگتی تھی۔ ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایسی صلح و آشتی سے رہتے تھے کہ آج کل اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ ایک دوسرے کی شادی اور تیوہاروں میں بے تکلف شریک ہوتے اور کسی قسم کی غیریت نہیں برتتے تھے۔ بادشاہ اگرچہ نام کے بادشاہ تھے۔ لیکن کیا ہندو کیا مسلمان سب ان سے محبت کرتے اور ان پر جان فدا کرتے تھے۔ بادشاہ کا برتاؤ بھی دونوں سے یکساں تھا۔

چنانچہ مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ قلعہ معلّی میں عجیب ماجرا تھا کہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ قدرتاً ہمدردی تھی لیکن اس کے باوجود جتنے ملازمین شاہی تھے، (ایسی خدمات پر جہاں فارسی اردو کی ضرورت رات دن پڑتی تھی) سب کے سب ہندو تھے۔ اگرچہ تعلیم آج کل کی طرح عام نہ تھی لیکن تہذیب اور ذوق جو تعلیم کی غایت ہے وہ عام طور پر پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ان پڑھ بھی اہل ذوق کے فیض صحبت سے صاحب ذوق نظر آتے تھے۔ خوش اطواری اور سلیقہ دلّی کا جوہر تھا۔ زبان کی تو ٹکسال ہی تھی جس نے دلّی نہیں دیکھی یا ہو دلّی میں نہیں رہا وہ زبان دان ہی نہیں، گویا جامع مسجد کی سیڑھیاں ادبستان زبان تھیں۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ خود بادشاہ شاعر تھے، شعر و سخن کے قدر دان تھے۔ قلعہ معلّی کی زبان فصاحت کی جان تھی۔

اردو زبان کی ترقی

لیکن اس زمانے کی ایک یادگار نہایت قابل قدر ہے۔ وہ اردو زبان کی ترقی ہے۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد ایسے ایسے صاحب کمال گذرے ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کے نام خصوصیت کے ساتھ ذکر کیے جائیں گے۔ اور ان کا کلام ہمیشہ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ یہ زمانہ ابتدائی ترقی کا تھا۔ اور اس وقت سے ایسی بنیاد پڑی کہ یہ زبان آگے ہی بڑھتی گئی۔ یہ سب کچھ فارسی کا طفیل تھا۔ کئی صدی سے فارسی کی تعلیم کا رواج عام طور پر چلا آ رہا تھا۔ یہ کسی ایک مقام سے مخصوص نہ تھا۔ بلکہ بنگال، بہار، دوآبہ، پنجاب، گجرات، دکن، مدارس سب جگہ اس کا تسلط ہو گیا تھا۔ ہمارے اخلاق و آداب، طور طریقے نشست و برخاست طرز کلام وغیرہ پر فارسی کا اثر صاف نظر آتا تھا۔ اور یہ کچھ مسلمانوں پر ہی موقوف نہ تھا۔ ہندو مسلمان سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بات بات میں فارسی امثال اور جملے، سعدی و حافظ، رومی و جامی یا خسرو کے اشعار بے ساختہ زبان سے نکل جاتے تھے۔ گلستان بوستاں، دیوان حافظ، یوسف زلیخا، سکندر نامہ اور شاہنامے کا پڑھنا قومی شعار ہو گیا تھا۔ مدرسوں ہی میں نہیں ہر گھر میں یہ کتابیں نظر آتی تھیں۔ اس وقت کے کسی ہندو مصنّف کی کتاب اٹھا کر دیکھیے وہی طرز تحریر ہے۔ اور وہی اسلوب بیان ہے۔ ابتدا میں بسم اللہ لکھتا ہے۔

حمد و نعت و منقبت سے شروع کرتا ہے۔ شرعی اصطلاحات تو کیا حدیث و نص قرآن تک بے تکلف لکھ جاتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی نہیں قومی یگانگت میں تہذیب و فدوق کی یکسانی کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔

جب فارسی اس طرح چھا گئی تھی تو بول چال کی عام زبان اس سے کس طرح بچ سکتی تھی۔ اردو نے اس کا دودھ پیا تھا۔ اس کے سہارے پروان چڑھی اور وہ رنگ و روپ نکالا کہ سب میں مقبول ہو گئی۔ رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ اس کا چلن ہو گیا۔ یہ ایک قدرتی اصول تھا۔ جس طرح باپ کا جانشین بیٹا ہوتا ہے اسی طرح فارسی قائم مقام اردو ہو گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ دہلی کالج کو فروغ شروع ہوا۔

لارڈ بینٹنگ کی تجویز

بہرحال لارڈ بنٹنگ کے روزلیوشن مورخہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء نے ان سب کا خاتمہ کر دیا وہ روزلیوشن جسے اب تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے یہ ہے۔

"گورنر جنرل باجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے اور جس قدر رقوم مقاصد تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئیں ہز لارڈ شپ کا یہ منشا نہیں ہے کہ دیسی تعلیم کے کسی کالج یا مدرسے کو توڑ دیا جائے جس کے فوائد سے دیسی لوگوں میں تمتع حاصل کرنے کا شوق پایا جاتا ہو گورنر جنرل باجلاس کونسل طلبہ کو زمانہ تعلیم میں وظائف دینے کا عمل قطعاً قابل اعتراض خیال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں یہ ان علوم کی تشویق کی مصنوعی ترغیب ہے اور جب زیادہ مفید علوم کی تعلیم دی جائے گی تو یہ خود بخود ان پر سبقت لے جائیں گے۔ اس لیے وہ ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ کسی طالب علم کو کسی قسم کا کوئی وظیفہ نہ دیا جائے اور جب کبھی مشرقی تعلیم کے کسی پروفیسری کی جگہ خالی ہو تو اس کی رپورٹ گورنمنٹ کو کی جائے اور ساتھ ہی یہ بتایا جائے کہ جو جماعت اس کے زیر تعلیم تھی اس میں طلبہ کی کیا تعداد ہے اور اس جماعت کی کیا حالت

ہے تاکہ گورنمنٹ اس کے جانشین کے تقرر پر غور کر سکے۔

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل کو یہ اطلاع ملی ہے کہ کمیٹی نے رقم خطیر مشرقی کتب کے طبع میں صرف کی ہے۔ ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ ان رقوم کا کوئی جزو اس کام میں نہ لایا جائے۔

ہز لارڈ شپ باجلاس کونسل ہدایت فرماتے ہیں کہ وہ تمام رقوم جو ان اصلاحات کی رو سے کمیٹی کے قبضے میں آئیں وہ آئندہ دیسی لوگوں میں انگریزی زبان کے ذریعہ سے انگریزی علم و ادب اور سائنس کی اشاعت میں صرف کی جائیں۔

مسٹر کارگل کی رپورٹ

اس کی تصدیق مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج کے اس بیان سے ہوتی ہے جو ان کی سالانہ رپورٹ بابت [illegible] میں درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔"

اس کے بعد ہی وہ اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ نصاب کی مناسب کتابیں نہیں ورنہ اس کا علم اور بھی بہتر ہوتا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ:

"حال ہی میں کالج کا معائنہ بعض نہایت قابل فوجی افسروں اور مشنریوں نے کیا جو معاملات تعلیم سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے مشرقی شعبے کے طلبہ کا امتحان لیا اور ان سے علم ہیئت، جنرل سائنس، اخلاقی اور مذہبی مسائل میں گفتگو کی۔ ان سب کا یہ بیان ہے کہ اس شعبے میں قطعی طور پر بہت بڑی ترقی پائی جاتی ہے اور مختصر یہ کہ تمام ہندوستان میں کسی جگہ ترقی کے ایسے آثار نہیں نظر آتے۔"

کالج کا معیار تعلیم

اس رپورٹ پر لفٹنٹ گورنر بہادر نے اپنے تبصرے میں مشرقی شعبے کے متعلق جو یہ الفاظ تحریر کیے ہیں:

• طلبہ (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو یقین دلایا گیا ہے اُس سے بے حد مسرت ہوئی ۔"

۱۸۵۶ء کی رپورٹ میں درج ہے کہ عربی فارسی کی جماعتوں کے علاوہ سائنس کی جماعتیں بھی تھیں جن میں نہایت احتیاط سے مغربی سائنس زبان اردو کے ذریعہ کامل طور پر پڑھائی جاتی تھی ماسٹر رام چندر اور دیگر اساتذہ کی قابلانہ درس و تدریس سے طلبہ ایسے ہوشیار ہو گئے تھے کہ وہ ریاضی، نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ میں شعبۂ انگریزی کے طلبہ کو نیچا دکھانے لگے تھے اور مقابلہ کے امتحان میں بازی لے جاتے تھے ۔

رام سرن داس صاحب ڈپٹی کلکٹر اور ممبر لوکل کمیٹی دلی کالج نے اس سال طلبہ کا امتحان لیا اور اُنہوں نے اس بارے میں جو کیفیت درج کی ہے وہ طلبہ کی محنت و ذکاوت پر دلالت کرتی ہے ۔ طلبہ نے نہایت اطمینان بخش جوابات دیے اور ممتحن اس سے بہت خوش ہوئے ۔ طلبہ بالعموم تمام مضامین میں نہایت اچھے نکلے ۔ صرف ایک چیز کی یعنی بدخطی کی شکایت کی ہے اور یہ شکایت غالباً ہمارے کالجوں اور مدرسوں میں اب بھی پائی جاتی ہے ۔

مسٹر فریڈرک جان مورٹ ایم ڈی - ایل - ایل - بی فسٹ فزیشن میڈیکل کالج کلکتہ و سکریٹری کونسل آف ایجوکیشن بنگال نے اپنی رپورٹ میں دہلی کالج کے مشرقی شعبے کے طلبہ کی استعداد اور قابلیت اور خاص کر اُن کی سائنس کی واقفیت پر بہت قابل تحسین الفاظ میں تعریف کی تھی ۔ گورنمنٹ ممالک متحدہ مغربی شمالی نے جنرل کمیٹی تعلیم عامّہ کی رپورٹ بابت ۱۸۵۳-۵۴ء پر جو ریزولیوشن لکھا ہے اس میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ۔

" اردو کے ذریعے سے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی مسٹر مورٹ نے بہت تعریف کی ہے ۔ ہز آنر ایسی تعلیم کی جو اس ذریعے سے دی جاتی ہے اور خاص کر سائنس کی تعلیم کی بہت قدر کرتے ہیں ۔"

۱۸۴۸ء کا امتحان

۱۸۴۸ء کا امتحان ۲۴ نومبر سے ۱۲ دسمبر تک یعنی ۲۱ دن تک رہا ۔

(یا ستثنائے ایام تعطیلات) ریاضیات اور تاریخ کے پرچے گورنمنٹ نے مرتب کرا کر بھیجے باقی پرچے کالج کے مدرسین نے تیار کیے۔ باقی جماعتوں کا امتحان لارڈ کے مولوی مملوک علی اور انگریزی کا قائم مقام پرنسپل نے لیا۔

مسعودی۔ تاریخ یمینی۔ قلدری۔ میر قطبی۔ حماسہ۔ متنبی کے پرچے گورنمنٹ نے بھیجے اور سنّی اور شیعہ طلبہ کی اعلیٰ جماعتوں کو دیے گئے۔ ان کے تحریری جواب مفتی صدرالدین صاحب نے معائنہ کیے۔ عربی کی باقی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ہی نے لیا۔ عربی جماعتوں کے پرچے ڈاکٹر سپرنگر نے بھی دیکھے۔ فارسی جماعتوں کا امتحان بھی مفتی صاحب ہی نے لیا۔ ان کی رائے میں ان جماعتوں کے طلبہ کی قابلیت نہایت عمدہ تھی۔ تاریخ اور سائنس وغیرہ کا امتحان جن کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔ تحریری ہوا اور جوابات قائم مقام پرنسپل نے ماسٹر رام چندر اور ایودھیا پرشاد (مدرسین سائنس) کی معیت میں دیکھے۔

مضمون نویسی کے لیے عنوان مسٹر گوب نے دیا تھا اور یہ مضمون انگریزی کی دو اعلیٰ جماعتوں اور مشرقی شعبے کی چار جماعتوں کے طلبہ کو لکھنے کے لیے دیا گیا۔ انگریزی میں موتی لال کا مضمون بلحاظ زبان اور بلحاظ طریقۂ بیان سب سے بڑھ کر رہا۔ مشرقی شعبے کے طلبہ میں محمد میاں کا مضمون سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ بہت سی معلومات اس مضمون میں ایسی کتابوں سے حاصل کی گئی تھیں جو نصاب تعلیم میں شریک نہ تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طالب علم کا تعلق دہلی گزٹ یا دہلی اردو اخبار سے تھا اور اس لیے اُسے اردو اخبارات کے پڑھنے کی عادت تھی اور ان سے اس نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائی تھیں اس لیے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اردو اخبار ہندوستان میں صحیح اور مفید معلومات کی اشاعت میں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔

سنہ ۵۰-۱۸۴۹ء اس سال ۸۷ طلبہ فارغ التحصیل ہوئے جن میں سے پانچ رڑکی کالج کی جماعت سوم میں گئے اور ... نے ملازمت حاصل کی سالانہ مضمون نویسی کے لیے مسٹر گبنز نے ذیل کا مضمون تجویز کیا۔

"اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادی رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا"

اس مضمون کے جوابی پرچوں میں تاریخی اور عام معلومات اچھی خاصی پائی گئیں اور لکھنے والے قومی تعصبات سے بری تھے۔ موتی لال کا مضمون انگریزی میں اور محمد حسین کا اردو میں سب سے بہتر خیال کیا گیا۔ موتی لال نے اس کے علاوہ مضمون نویسی کے دو تمغے بھی حاصل کیے ایک نقرئی تمغہ انگریزی مضمون کا تاریخ ہند پر۔ یہ سرٹی مٹکاف کا عطا کردہ تھا۔ دوسرا طلائی تمغہ جو اردو مضمون کے لیے سر ہربرٹ میڈوک نے عطا کیا تھا۔ یہ مضمون دونوں شعبوں کے طلبہ کے لیے تھا۔ مضمون کا عنوان یہ تھا:۔

"مختلف آزاد پیشے اور مفید کاروبار جو ہندوستانی دیسی ریاستوں میں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک میں کامیابی کے بہترین طریقے خواہ ابتدائی تربیت کے لحاظ سے یا مابعد کسی مساعی کے اعتبار سے"

موتی لال اس کے بعد لاہور کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن میں ایک سو پچاس روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔

کالج کی حالت اب بہت درست ہو گئی تھی اور ہر طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا تھا اور زیادہ توجہ اب نصاب تعلیم کی اصلاح کی طرف ہو گئی تھی ۱۸۵۳ء میں طلبہ کی تعداد یہ تھی۔

انگریزی	۱۹۹	جملہ ۳۲۰
عربی	۳۹	
فارسی	۵۷	
سنسکرت	۲۵	

عیسائی	۱۰	۳۲۰
مسلمان	۹۳	
ہندو	۲۱۷	

انگریزی شعبہ کے سب کے سب یعنی ۱۹۹ طالب علم اور سنسکرت شعبے کے بھی کل طالب علم یعنی پچیس کے پچیس اردو پڑھتے تھے۔ فارسی عربی والوں کو تحصیل بھی پڑھنی ہی پڑتی تھی۔

فارسی شعبے میں سے ۷ انگریزی اور فارسی عربی کے ۲۷ ناگری اور انگریزی شعبے کے ۸ فارسی پڑھتے تھے۔

۱۸۵۳ء کی رپورٹ تعلیمی
تعداد طلبہ بحیثیت تعلیم زبان

صرف انگریزی پڑھنے والے	۱۹
انگریزی اور اردو پڑھنے والے	۱۹۲
انگریزی اور فارسی مل کر پڑھنے والے	۱
صرف اردو پڑھنے والے	x
اردو کے ساتھ فارسی اور عربی پڑھنے والے	۹۵
اردو کے ساتھ ہندی یا سنسکرت پڑھنے والے	۲۷
محض ہندی پڑھنے والے	x
ہندی اور سنسکرت پڑھنے والے	x
ہندی اور فارسی و عربی پڑھنے والے	۹۵
محض فارسی پڑھنے والے	۵۷
محض عربی پڑھنے والے	۳۸
محض سنسکرت پڑھنے والے	۲۷

عربی فارسی کے تمام متعلمین ہندی پڑھتے تھے اس میں مصلحت یہ تھی کہ ان زبانوں کے طلبہ عموماً اعلیٰ قابلیت کے ہوتے تھے۔ اور جب وہ دیہات میں جاتے تھے تو گاؤں والوں سے معاملہ کرنے میں یہ زبان کارآمد ثابت ہوتی تھی۔ سنسکرت پڑھنے والے بلا استثنا اردو پڑھتے تھے۔ ان کے لیے ہندی کا پڑھنا ضروری نہیں تھا اس لیے کہ سنسکرت اور اردو کا طالب علم ہندی زبان لازمی طور پر سمجھتا ہے۔

تعداد طلبہ بلحاظ مذہب

عیسائی	۱۵	
مسلمان	۱۱۲	جملہ ۳۳۳
ہندو	۲۰۶	

مفتی صدرالدین کا تمغہ اردو زبان میں بہترین مضمون لکھنے والے کو دیا گیا وہ خواجہ ضیاء الدین کو ملا۔

غدر کے بعد کالج ۱۸۶۴ء میں از سر نو جاری ہوتا ہے

غدر میں جو کالج بند ہوا تو بند کا بند ہی رہا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ حالات ہی کچھ ایسے رونما ہو گئے تھے کہ کوئی توجہ کرتا تو کیا کرتا۔ آخر مئی ۱۸۶۴ء میں اس کی قسمت جاگی اور از سر نو کھلا۔ شروع شروع میں سارا کام پروفیسر ہٹن ( ) کی نگرانی میں رہا۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۸۶۴ء کے آخر میں مسٹر اڈمنڈ ولسٹ ( ) بی۔ اے ٹرنٹی کالج کیمبرج نے انگلستان سے آکر پرنسپل کی خدمت کا چارج لیا اور جب پروفیسر ہٹن لفٹنٹ ہارڈ کی جگہ انبالہ سرکل کے انسپکٹر مقرر ہوتے تو ان کی جگہ مسٹر سی۔ ر۔ کوک بی۔ اے سن جان کالج کیمبرج کا تقرر انگریزی زبان کی پروفیسری پر ہوا۔

اینگلو سنسکرت اسکول

اس سال ہندوؤں نے اینگلو سنسکرت اسکول قائم کیا اس میں اردو کے ذریعے تعلیم ہوتی تھی۔ فارسی بھی اتنی پڑھائی جاتی تھی جتنی اردو کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس کا دہلی کالج سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ یہ معلوم ہو کہ ۱۸۶۵ء تک اردو زبان کس قدر مقبول تھی۔

۱۸۴۷ء میں علاوہ مذکورہ بالا صاحبوں کے مسٹر سی۔ گرفٹ۔ نواب حسام الدین (جو دہلی کے امرا میں سے تھے) اور مولوی صدرالدین صدر امین اعلیٰ بھی مجلس کے ارکان مقرر کیے گئے۔

۱۸۴۸ء میں ان اصحاب کا اضافہ ہوا۔

مسٹر جے۔ پی گبنز۔ سول سرجن۔ رائے رام سوان داس ڈپٹی کلکٹر۔ مسٹر ٹیلر جو اب پرنسپل تھے حسب معمول سکریٹری رہے۔

۱۸۵۰ء میں مسٹر ایچ۔ کیپ بھی رکن مجلس بنائے گئے۔ ۱۸۵۲ء میں کمیٹی کے ارکان یہ تھے۔

مسٹر جے۔ پی ہوڈر مجسٹریٹ و کلکٹر دہلی (سیکرٹری)۔ ٹی مٹکاف کا انتقال ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو ہوگیا ان کی جگہ یہ صدر تجویز ہوئے:-

سر جے تھیوفلس مٹکاف اسسٹنٹ مجسٹریٹ۔ کیپٹن آرچیبی ڈگلس۔ مولوی صدرالدین صدر امین اعلیٰ نواب حامد علی خاں۔ جے ٹیلر (پرنسپل) جنرل ممبر و سیکرٹری

۱۸۵۵ء میں ان ناموں کا اور اضافہ ہوا۔

مسٹر سائمن فریزر	کمشنر
مسٹر آر۔ بی [illegible]	سول سیشن جج
مسٹر بی۔ اے ایجرٹن	مجسٹریٹ و کلکٹر

مقامی مجلس کے ارکان سب کے سب وہی ہوتے جو دہلی کے رہنے والے تھے یا جن کا قیام دلی میں ہوتا۔ زیادہ تر تعداد سرکاری عہدہ داروں کی ہوتی تھی اور تبادلے پر ان کے جانشین ان کے قائم مقام ہو جاتے۔ دلی کا خاص باشندہ ایک آدھ ہی ہوتا۔ لیکن خاص خاص معاملات میں مجلس کے ارکان دلی کے معززین اور با اثر اصحاب سے مشورہ کر لیا کرتے۔

جنوری ۱۸۵۸ء میں جب کالج پنجاب گورنمنٹ میں منتقل ہوگیا تو یہ مجلس بھی ختم ہوگئی۔

کالج کی عمارت

ابتدا میں کالج غازی الدین کے مدرسہ میں تھا۔ چنانچہ مسٹر ٹامس اپنی یادداشت مورخہ ۲ اپریل ۱۸۴۵ء میں لکھتے ہیں کہ "غازی الدین خاں کا مدرسہ جہاں دہلی کالج اس وقت ہے ایک شاندار عمارت ہے اور مختلف درجوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ مگر افسوس کہ یہ پرانی اور دور ہے اور انگریزی انسٹی ٹیوشن کے موزوں بنانے کے لیے مرمت کی ضرورت ہوگی"۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد مشرقی اور انگریزی شعبے ایک جا کر دیے گئے تو یہ کتب خانہ دارالشکوہ میں اٹھ آیا یہ بھی ایک تاریخی عمارت ہے کبھی کسی زمانے میں دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا اس کے بعد [illegible] علی مردان خاں مغل حاکم پنجاب کا اقامت خانہ رہا۔ ۱۸۰۳ء میں سر ڈیوڈ اختر لونی بارش کی ریزیڈنسی ہوئی۔ اس کے بعد کالج آیا۔ کالج کے [illegible] مدرسہ اس

میں رہا اور اب میونسپل بورڈ اسکول ہے۔ اس کے دروازے کے ستون پر جو تختی لگی ہوئی ہے اس میں کالج کے قیام کی تاریخ ۱۸۰۱ء سے ۱۸۲۵ء لکھی ہوئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔

جب غدر ہوا تو کالج اس عمارت میں تھا۔ جب انگریزوں کی فتح ہوئی تو اس پر فوجی افسروں نے قبضہ کر لیا تھا اور ۱۸۶۲ء تک وہ اسی میں فروکش رہے۔ کالج یکم مئی ۱۸۶۴ء کو از سر نو قائم ہوا اور ۱۸۷۲ء میں اپنی قدیم عمارت میں چلا گیا۔ درمیانی عرصے میں دہلی انسٹیٹیوٹ یا موجودہ ٹاؤن ہال اور میونسپل کمیٹی کے اس حصے میں رہا جو گھنٹہ گھر کے بائیں جانب ہے۔ جہاں بعد میں ایک مدت تک لائبریری رہی۔

مسٹر ٹیلر کے خدمات

مسٹر ٹیلر نے دہلی کالج میں تئیس برس تک ہیڈ ماسٹری کی اور دو تین سال تک پرنسپل رہے۔ وہ طلبہ پر پدرانہ شفقت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ سب میری اولاد ہیں اور ان سے بہتر اولاد ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ سب صاحب لیاقت نیک سیرت اور نیک اطوار ہیں ان کے اخلاق حمیدہ کا طلبہ پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ ان سے بھی محبت کرتے تھے۔ بعض (ہندو) طلبہ نے تو ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر اپنا مذہب تک تبدیل کر دیا۔

دلی کالج کے مایۂ ناز اساتذہ

عربی کے صدر مدرس مولوی مملوک علی بڑے جید عالم تھے اور شہر ہی میں نہیں بلکہ دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ مولوی کریم الدین اپنی کتاب طبقات الشعرائے ہند میں لکھتے ہیں کہ "مدرس اول مدرسۂ دہلی عالم بے بدل اور متقی بے مثل اور فاضل کامل ہیں۔ عہدہ میر مولوی بمشاہرہ سو روپیہ ماہواری مدرسہ میں مقرر ہیں حق یہ ہے کہ اس فاضل کی جیسی قدر چاہیئے ویسی نہیں کیونکہ ایسے عمدہ فاضل بے بدل بہت کم ہوتے ہیں اور واقع میں بنائے مدرسۂ عربی ان کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم و فن پر جو ان زبانوں میں ہیں، مہارت تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوئی ہے۔ اس کے اصل اصول

سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے۔ اور جس کار پر معمور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حق الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کبھی کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو۔ بندہ کے زعم میں یہ ہے کہ کبھی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی ناصح سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو کان علم اور مخزن اسرار کہوں تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی فن کی مشکل ان کے پاس لے جاؤ حفظ پڑھا دیں گے گویا اس کو حفظ کر رکھی ہے۔ اس لیے رات دن سوائے مدرسہ کے ان کے گھر پر طلبا پڑے رہتے ہیں ہر وقت ان کو گھیرے رہتے ہیں۔ اور وہ خلیق اس طرح کے ہیں کہ کسی سے انکار نہیں کر سکتے۔ سب کو پڑھاتے ہیں عمر ان کی سنہ ۱۸۵۲ء میں ساٹھ برس کی ہوگی۔ بہت خندہ پیشانی درعقلمند اور ذکی اور ذہین اور تیز فہم اور محقق اور مدقق ہیں۔ تحریر اقلیدس کا ترجمہ اردو میں چار مقالہ اول اور دو مقالوں آخر گیارھویں اور بارھویں کا کیا ہے۔ حق یہ ہے کہ علم ہندسہ پانی کی طرح بہا دیا ہے اصل وطن ان کا نوتہ ہے مدت سے شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں۔ مولوی صاحب نے سنن ترمذی کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ہے۔

مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے ان کی کتابیں نصاب تعلیم میں درج تھیں۔ ان کی بعض تصانیف اب تک پڑھائی جاتی ہیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی علاوہ فارسی کی مشہور تالیفات کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک اچھی کتاب لکھی۔ جس کے آخر میں بہ ترتیب حروف تہجی اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں۔ حدائق البلاغت (تصنیف شمس الدین) کا ترجمہ اردو میں کیا۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی تیار کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع ہو کر شائع ہوا۔

ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامس لفٹنٹ گورنر مدرسہ کے معائنہ کے لیے آئے تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستعد فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ۔ دوسرے حکیم مومن خاں۔ تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا۔

مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے۔ انہوں نے تو انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا انہوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ کی قبول کر لی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔

(۱) مولوی ذکاء اللہ بھی یہیں کے طالب علم تھے اور اسکالر تھے۔ انہوں نے بھی ابتدا میں دہلی کالج ہی میں بیس روپے ماہانہ پر مہندس کی خدمت قبول کر لی تھی۔

(۲) مولوی احمد علی دہلی کے رہنے والے تھے مدرسہ دہلی میں مبتدیوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ قواعد اردو مسمیٰ بہ "چشمۂ فیض" انہی کی تالیف ہے۔

(۳) میر اشرف علی مدرسہ میں منشی تھے اور بہت قابل شخص تھے تاریخ کشمیر کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا رسالہ اصول حساب کی تالیف میں بابو ہردیو سنگھ کو مدد دی بریف سروے آف ہسٹری کے اردو ترجمے کی اصلاح کی۔ مولوی کریم الدین نے ان کے اخلاق اور لیاقت کی بہت تعریف لکھی ہے۔

(۴) پنڈت رام کشن دہلوی بھی اسی مدرسہ میں مدرس تھے۔ انگریزی اور فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی اور اردو بھی خوب لکھتے تھے۔ ایک رسالہ علم طب میں انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اور اصول قوانین دیوانی و فوجداری، اصول قانون دکلکرسی، اصول قوانین گورنمنٹ میر اسلام کے چوتھے باب اور میکناٹن کے اصول دھرم شاستر کا ترجمہ کیا۔ قواعد صرف نحو انگریزی ڈاکٹر اس پرنگر کی مدد سے اردو میں تالیف کی اور ایک کتاب فن زراعت پر "مزید الاموال باصلاح الاحوال" کے نام سے لکھی۔

(۵) ماسٹر حسینی مدرسہ میں بچوں کی تعلیم پر مقرر تھے۔ تاریخ مغلیہ کا ترجمہ اردو میں کیا۔ تاریخ ایران (مولفہ کرمادر) کا اردو ترجمہ بھی انہی کا ہے۔ علاوہ ان کے میکناٹن کی شرح شریف۔ قانون محمدی فوجداری (مولفہ میکناٹن) قانون وراثت اسلامی (مولفہ میکناٹن) سکیپ ویتھ کے خلاصہ، قانون دیوانی، قانون فوجداری کے ترجمے انہی کے قلم کے ممنون ہیں۔

(۶) ہردیو سنگھ منشی گری کی خدمت پر مامور تھے۔ بہت محنتی ہوشیار اور خلیق شخص تھے

رسالہ پیمائش (دو حصول میں)، انہی کی تالیف ہے جو بعد اصلاح مولوی قادر علی طبع ہوا پروفیسر ڈیمورگن کی کتاب اصول حساب کا ترجمہ اردو میں کیا جس کی اصلاح منشی اشرف علی نے کی اور سوسائٹی نے طبع کرایا۔

۷۔ ماسٹر لور محمد تقی جماعتوں کے مدرس تھے۔ انہوں نے تاریخ بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا تاریخ مغلیہ کے ترجمہ میں ماسٹر حسینی بھی شریک تھے۔

۸۔ مولوی حسن علی خاں فارسی کے مدرس تھے۔ بہت قابل اور ہوشیار شخص تھے۔ قانون مال، گلستان سعدی اور الف لیلہ (منتخب) کا ترجمہ اردو میں کیا اور پرنسپل صاحب کی فرمائش سے کرۂ ارضی کا ترجمہ کیا یہ سب کتابیں سوسائٹی نے طبع کرائیں۔ (۱)

ذکاء اللہ کا بیان

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ بھی اس کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے اپنی تاریخ ہند میں، جو اپنی جامعیت، تفصیل، اور داستان کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، دلی کالج کی تباہی، اور شکست و ریخت کا بیان اپنے مشاہدات کی بنا پر کیا ہے، کیونکہ جب غدر شروع ہوا، وہ دلی میں تھے، اور ان کی چشم تماشا نے وہ سب کچھ دیکھا جس کے غیر معمولی اثرات، زندگی کی آخری سانس تک ان کے دل و دماغ پر طاری رہے۔

وہ تحریر کرتے ہیں :-

"اس وقت کالج میں مسٹر ایف ٹیلر صاحب پرنسپل تھے، اور کشمیری دروازہ کالج کی کوٹھی میں رہتے تھے، مسٹر رابرٹ ہیڈ ماسٹر تھے، وہ بھی مسٹر ٹیلر کی طرح، کالج کے احاطہ ہی میں ایک کوٹھی میں مع اہل و عیال کے رہتے تھے۔ مسٹر سٹورٹ صاحب سکنڈ ہیڈ ماسٹر کالج کے قریب منصور خاں کی حویلی میں اور مسٹر سٹینز صاحب تھرڈ ماسٹر کشمیری دروازہ کی طرف رہتے تھے۔ یہ چار انگریز تھے اور ایک ہندوستانی عیسائی رامچندر پروفیسر ریاضی تھے۔ چاروں انگریز تو مقتول ہو گئے۔ پروفیسر صاحب

---

(۱) مرحوم دلی کالج (ڈاکٹر عبدالحق)

ہیں یہاں پن چکی کی سڑک پر قلعہ کے پیچھے آتے جب انہوں نے دیکھا آٹھ سات ترک سوار ننگی کرچیں
چمکاتے ہوئے لال ڈگی کی سڑک پر آتے ہیں تو وہ ۔ تو وہ خدا کو یاد کرتے ہوئے اپنے کوٹھے پر جو چاندنی
چوک میں تھا چلے گئے ۔ بارہ بجے کے بعد سے کالج کے کتب خانہ لٹنے شروع ہو گئے ۔ لڑکے ۔ عربی
فارسی ، اردو کتابوں کے گٹھڑ باندھ کر کتاب فروشوں اور مولویوں کو اور طالب علموں کے پاس بیچنے کے لیے
گئے ۔ اس میں سے کسی کتاب کو ضائع نہیں کیا ۔ بعض طلبہ کتابوں کے شوقین لوٹ میں خود بھی شامل ہو
گئے اور اچھی اچھی کتابیں لوٹ کر لے گئے ۔ لوگوں نے انگریزی کتابوں کے شیرازہ توڑ کر ان کے پٹھے اتار لیے
کہ جلد سازوں کے ہاتھ ان کو بیچیں گے ۔ ایسے پٹھے خوب صورت کب ہاتھ آئیں گے ۔ باقی کتابوں کے
ورقوں کو پھاڑ کر پراگندہ کر کے کالج کے باغ اور احاطہ میں کئی انچ موٹا فرش ردی کا بچھا دیا ۔
آلات طلبہ کو توڑ کر ان کا لوہا اور پیتل نکال کر لے گئے مکان کو آگ تو نہیں لگائی مگر اس کی چوکھٹیاں
کواڑ سب اتار کر لے گئے ۔ اور سارا اسباب الماریاں بنچ کرسیاں اور پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر کے گھر کا
اسباب سب لوٹ لیا ۔ غرض کالج میں سوائے کاغذی دیواروں کے اور دو چودہ پندرہ برس کی
لڑکیوں کے نیم برہنہ لاشوں کے کچھ اور نہ تھا ۔ جب میگزین اڑا تو مسٹر ایف ٹیلر صاحب اور مسٹر
سنیٹر صاحب اس سے باہر زندہ نکلے ۔ سینڈ صاحب تو فصیل کے دراز میں سے جو میگزین کے اڑنے
سے پڑی تھی نکل کر جمنا سے پار ہو کر میرٹھ زندہ پہنچ گئے ۔ ٹیلر صاحب میگزین سے نکل کر اول اپنے
کالج کے احاطہ میں آئے اور اپنے بوڑھے خانساماں کی کوٹھری میں گئے ۔ اس نے ان کو مولوی باقر
کے گھر پہنچا دیا ۔ جو ان کے بڑے قدیمی دوست تھے ۔ مولوی صاحب نے اپنے امام باڑے کے تہ خانہ
میں ایک رات ان کو رکھا ۔ مگر محلہ میں یہ مشہور ہو گیا ۔ کہ ٹیلر صاحب کو مولوی صاحب نے چھپایا
ہے ۔ اس لیے مولوی صاحب ان کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکے ہندوستانی صورت بنا کر ان کو گھر
سے باہر کیا ۔ وہ بہرام خان کی کھڑکی سے باہر نکلے تھے ۔ کہ ایلوں کی ڈنڈی پر اہل شہر نے ان کو پہچان
کر لاٹھیوں سے کچلا نکال دیا ۔ پروفیسر رام چندر کو ان کے کوٹھے پر سے ان کے بھائی رائے شنکر داس
صاحب لے کر جا کر ایک محلہ میں اپنے کسی عزیز کے یہاں چھپایا مگر ان کے رشتہ داروں نے

یہ جان کر کہ ان کے سبب سے ہم سب پر مصیبت آئے گی۔ ان کا یہاں چھپا رہنا گوارا نہ ہوا۔
ان کا ایک قدیمی وفادار نوکر جاٹ ان کو گنوار بنا کر اپنے گاؤں میں لے گیا۔ وہاں سے انگریزی
لشکر سے بادلی کوٹ میں جا ملے۔ سوا پروفیسر کے اور مسٹر سینٹ کے کوئی عیسائی ورنہ باغیوں کے قتل
سے نہ بچا۔ چھ لڑکے غریب انگریزوں کے کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کو بھی اجل نے زندہ گھر تک
نہ پہنچنے دیا۔ مسٹر الیف ٹیلر صاحب اس کالج میں تیئس برس سے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور دو تین برس
سے پرنسپل ہو گئے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں پر برادرانہ شفقت کیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے
تھے یہ سب میری اولاد ہیں۔ اور ان سے بہتر اولاد ہو نہیں سکتی کہ سب صاحب لیاقت ہیں۔
اللہ ان کے پالنے اور پرورش کرنے مجھ کو فکر نہیں۔ بیمار ہوں تو تیمارداری نہیں کرنی پڑتی۔ مجھے
ان کی خوش لیاقتی اور نیک خصلتی سے بہت خوشی ہوتی ہے۔ سچی نیکی کا معیار سب سے بڑا یہ ہے کہ
نیک آدمیوں کے پاس رہنے سے اور آدمی نیک خیال نیک دل پاک نفس ہو جاتے ہیں۔ سو اس نیک
سرشت میں یہ ایک خوبی تھی۔ کہ اس کے شاگردوں میں سے شاید ایک دو بھی بدکردار نہ ہوں گے ان
کے شاگردوں کو بھی استاد سے ایسی محبت تھی جیسی کہ باپ سے بلکہ بعض نے تو باپ سے زیادہ کہ [illegible]
چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار کر لیا۔ (۱)

مولانا حالی کے تاثرات

جو لوگ دلی میں رہے اور اس کالج سے دور رہے۔ وہ اپنی محرومی پر متاسف ہوتے تھے۔ مولانا حالی فرماتے ہیں۔

"اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی
تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر قصبہ پانی پت میں اول
کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری
نوکری کا ایک ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدارس

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ ص ۶۷۲

کو ہمارے علماء مجملے کہتے تھے۔ دہلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑتا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دہلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کالج کو جاکر آنکھ سے نہ دیکھا اور نہ اُن لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس کالج میں تعلیم پاتے تھے۔

اس کالج سے مستفید نہ ہو سکنے پر، مولانا حالی ہمیشہ ایک خلش سی محسوس کرتے رہے۔

نذیر احمد کا اعتراف

اس کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں میں شمس العلما نذیر احمد بھی تھے۔ جنہیں دنیا ترجمانِ قرآن کریم۔ مصنف توبۃ النصوح، اور موجد اصطلاحات عجیبہ اور مترجم تعزیرات ہند کی حیثیت سے جانتی ہے۔

کالج میں داخلہ سے پیشتر مولانا نذیر احمد مُلّائے مسجد تھے، لیکن یہاں پہنچ کر ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ کچھ سے کچھ ہو گئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:—

معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی۔ ٹالریشن (در گذر) گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی اجتہاد علی بصیرۃ یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سے سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں کالج نہ پڑھتا تو بتاؤں کیا ہوتا۔ مولوی ہوتا تنگ خیال، متعصب اکھل کھرا اپنے نقص کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا محتسب، برخود غلط ہے

ترک دنیا بمردم آموزند
خویشتن سیم و غلہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوست، مقتضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا۔ صمٌ بکمٌ عمیٌ فہم لایرجعون ما اجد من حسنۃ فی الدین و فی الدنیا من الکالج "(۱)

---

(۱) حیات، نذیر افتخار عالم مارہروی

یہ تھا وہ بہترین تہذیبی ادارہ، جسے انگریزوں کی ہٹ دھرمی، تعصب اور نارواداری نے موت کے گھاٹ اُتار دیا، کالج فنا ہوگیا، لیکن اس کے آثار و نقوش اب تک موجود ہیں۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیکن اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

عہدِ بہادر شاہ کے چند ہندو مصنف

بہادر شاہ کے عہد میں، ہندو اور مسلمان بغیر کسی تعصب اور تنگ نظری کے پورے خلوص اور یک نگی کے ساتھ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے اور اس کی خدمت کرتے تھے۔ دونوں کو یہ دھن سمائی ہوئی تھی کہ اردو، ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش پہنچ جائے۔

اس عہد کے مسلمان اہل قلم، انشا پرداز، مترجم، مصنف، اور مولف، عام طور پر معروف و مشہور ہیں لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس عہد کے ہندو، علمی و ادبی خدمات میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں سے پیچھے نہیں تھے، بلکہ ان سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، اور اس کوشش میں یہی نہیں ہوتا تھا کہ ناکام ہوتے ہوں، بلکہ کامیاب بھی ہوتے تھے، ان کے وسیع کارنامے تاریخ اردو کا جزو بن چکے ہیں جو حوادث دہر کے مٹانے سے بھی نہ مٹ سکے، نہ مٹ سکیں گے۔

(۱)

سدا سکھ لال

سنہ ۱۸۳۷ء میں اُردو عدالتی و سرکاری زبان مقرر کی گئی لیکن اس سے پہلے سے اہل ہند کی آسانی کے لیے دیوانی و مال گذاری کے قوانین کا اُردو ترجمہ شروع ہو گیا تھا چنانچہ سنہ ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں گورنمنٹ مغربی شمالی (جس میں موجودہ صوبجات متحدہ بھی شامل تھے) کی طرف سے ہدایت نامہ مال گزاری اُردو میں مرتب ہوا یہ قانون کی سب سے پہلی کتابوں میں سے ہے جو اُردو میں لکھی گئی اس کے بعد بھی سلسلہ جاری رہا۔

سنہ ۱۸۳۴ء/۱۲۴۹ھ میں منشی سدا سکھ لال نے مجموعہ قوانین لا ایکٹ ہائے سپریم گورنمنٹ، مرتب کیا جس میں سنہ ۱۷۹۳ء سے سنہ ۱۸۳۴ء تک جملہ ایکٹ ہائے مروجہ ممالک مغربی و شمالی تھے۔ سنہ ۱۷۹۳ء سے سنہ ۱۸۳۰ء میں مطبع نور الابصار آگرہ میں چھپی تھی بعد کی تین جلدیں بھی اسی مطبع میں سنہ ۱۸۶۶ء میں چھپیں اس کے دیباچہ کی چند سطریں یہ ہیں۔

"قاعدے اس تالیف کے ایسے نہیں ہیں کہ احتیاج بیان کی ہو فی الواقع یہ جلدیں منتظم جملہ سررشتہ ہائے سلطنت عظیم الشان سرکار دولت مدار انگلشیہ کی ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر باب میں کتنے قوانین بجاز یہ وقت ہیں اور کتنے منسوخ ہو گئے، واضح ہو کہ مصنف نے ترجمہ اُردو میں کہ وہ سنہ گورنمنٹ اور مندرجہ گزٹ سرکاری تھا کچھ تصرف نہیں کیا ہے۔"

اس کے علاوہ سدا سکھ لال نے فن زراعت کے متعلق ایک کتاب انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی اور اس کا نام گنگا کی رکھا یہ ۴۲ صفحے کا مختصر رسالہ ہے سنہ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں طبع ہوا۔ (۱)

---

(۱) واقعات تاریخ اردو [illegible] ص ۱۳

(۲)

ماسٹر رام چندر

ماسٹر رام چندر ۱۸۲۲ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے، ان کے باپ سندر لال دلی کے باشندے اور کائستھ تھے، دہلی میں نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کی خدمتوں پر رہے، پانی پت اس وقت مستقر ضلع تھا،

سندر لال دفعتاً بیمار ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں انتقال کر گئے ایک بیوہ اور چھ بیٹے چھوڑے جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، رام چندر کی عمر اس وقت نو سال کی تھی۔ ماں نے پالا پوسا اور ابتدائی تعلیم دلائی۔ شروع میں انھوں نے مکتب میں تعلیم پائی پھر ۱۸۳۳ء میں انگلش اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس وقت ہر طالب علم کو دو روپیہ مہینہ دیا جاتا تھا اور درجہ اوّل و دوم کے تمام طالب علموں کو پانچ روپے ماہانہ وظیفہ ملا کرتا تھا۔ رام چندر بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ اس مدرسہ میں چھ سال رہے اور خوب دل لگا کر پڑھا۔

ابھی ان کی عمر گیارہ ہی برس کی ہوگی کہ رواج کے مطابق شادی ہوگئی۔ شادی ایک خوشحال کائستھ خاندان میں ہوگئی تھی۔ لیکن لڑکی گونگی بہری تھی۔ شاید روپے کے لالچ میں (جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے) یہ عقد کر دیا گیا۔

فکر معاش کی خاطر تعلیم چھوڑ کر محرری کر لی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ دو تین سال نوکر رہے۔ ۱۸۴۱ء میں جب دلی کا مدرسہ کالج ہو گیا تو پھر اس میں داخل ہو گئے۔ دو تین سال جو تعلیم چھٹ گئی تھی تو انھیں بہت زیادہ محنت کرنی پڑی ساتھوں نے سنیئر وظیفے کے مقابلے کی کوشش کی، یہ وظیفہ تیس روپے ماہانہ کا تھا۔ مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بھائیوں کو بھی وظیفہ ملتا تھا اس سے خاندان کی گزر ہوتی چلی جاتی تھی اور انھیں اس طرف سے قدرے بے فکری ہوگئی تھی۔

رام چندر تین سال تک ہر امتحان میں کامیاب ہوتے رہے اٹھائیس (۲۸) فروری ۱۸۴۴ء میں کالج کے شعبہ

مشرقی میں پچاس روپے مشاہرہ پر لیوردبین سائنس کے مدرس ہو گئے اس زمانے میں ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی تھی۔ انھوں نے اس کے لیے اردو میں الجبرا اور علم مثلث (   ) یہ کتابیں لکھیں یہ کتابیں نصاب تعلیم کے کام آئیں۔ جن سے مشرقی شعبے کے طلبہ کو بہت فائدہ پہنچا۔

اس زمانے میں ماسٹر رام چندر نے ایک ماہانہ رسالہ فوائد الناظرین کے نام سے نکالا جو بعد میں مہینے میں دوبار نکلنے لگا۔ اس میں اکثر علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ ان نئے خیالات کو پڑھ کر لوگ ان کو بدمذہب اور ملحد کہتے تھے۔ اس رسالے کے علاوہ انھوں نے ایک اور رسالہ "محب ہند" کے نام سے شائع کیا لیکن اپنے شہر اور ملک والوں سے انھیں کچھ مدد نہ ملی۔ البتہ انگریز افسروں نے امداد کی مثلاً سر جان لارنس جو اس وقت دہلی میں مجسٹریٹ تھے، ڈاکٹر راس (سول سرجن) مسٹر گبن (جج دہلی) ان رسالوں کے متعدد نسخے خریدتے تھے جس سے طبع کا خرچ نکل آتا تھا۔ لیکن حالات کچھ ایسے بدل گئے کہ یہ رسالے بند کرنے پڑے اور پانچ سال چلانے کے بعد ۱۸۵۲ء میں ان دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بہت اچھے مدرس تھے اور اپنے شاگردوں پر بہت شفقت کرتے تھے اور بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ انھوں نے محنت کر کے اس زمانے میں مشرقی زبانوں اور خاص کر عربی میں معقول استعداد پیدا کر لی تھی۔

ماسٹر رام چندر کو ریاضی سے خاص لگاؤ تھا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے اس میں بہت کچھ ترقی کر لی تھی۔ شروع میں ریاضیات کی کتابوں کے ترجمے کیے اس سے ان کا ذوق اور بڑھ گیا۔ ان میں ایک ان کا جبر مقابلہ ہے جو اس فن کی انگریزی کتابوں کی مدد سے تالیف کیا اور سوسائٹی نے طبع کرایا۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ اصول علم مثلث بالجبر اور تراشہائے مخروطی میں اور علم ہندسہ بالجبر میں لکھا ۱۸۵۰ء میں جبکہ وہ مغربی سائنس کے مدرس تھے اور فوائد الناظرین نکالتے تھے انھوں نے اپنی کتاب کلیات وجزئیات تسر (   ) شائع کی۔

یہ کتاب کلکتہ میں چھپی۔ کلکتہ کے اخباروں اور رسالوں اور خاص کر کلکتہ ریویو نے اس پر مخالفانہ تنقید کی جس سے ماسٹر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی۔

۱۸۵۱ء کی تعطیلوں میں یہ کلکتہ گئے اور وہاں بعض دوستوں نے کلکتہ ریویو کی تنقید کا جواب لکھنے کا مشورہ

دیا۔ انھوں نے جواب لکھا جو انگلش میں چھپا۔

کلکتہ میں دہلی کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے انھیں آنریبل ڈی بلیتھون

ممبر سپریم کونسل و پریذیڈنٹ لا کونسل و کونسل آف ایجوکیشن سے ملایا۔ انھوں نے ماسٹر صاحب سے ان کی کتاب کا ایک نسخہ طلب کیا، اور دو سو روپے پیش کیے۔

ماسٹر صاحب نے یہ کتاب اپنے خرچ سے چھپوائی تھی جس کے لیے انھیں بہت تردد و فکر کرنا پڑا اور قرض لینا پڑا۔ مسٹر بلیتھون نے ان کی کتاب کے نسخے انگلستان میں متعدد اصحاب کے نام بھیجے جن میں سے ایک پروفیسر ڈی مارگن ( ) الیف۔ آر۔ ایس۔ الیف بی۔ سی۔ پی۔ اس ٹرنٹی کالج کیمبرج پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی تھے۔ پروفیسر مارگن نے اس کتاب کی بہت قدر کی اور کورٹ آف ڈائرکٹرز ایسٹ انڈیا کمپنی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور (۲۴ جولائی ۱۸۵۶ء کو) ان کے چیرمین کرنل سائیکس کو ایک خط اس بارے میں لکھا۔ جو لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کو بھیج دیا گیا۔ پروفیسر موصوف نے اس خط میں ماسٹر رام چندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ رام چندر کی کتاب کے انتخابات اس ملک (انگلستان) کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کیے جائیں غرض ایک مدت کی باہمی مراسلت کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کے معزز ممبروں نے ایک خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپیہ نقد بطور انعام ماسٹر رام چندر کے لیے منظور کیا۔ ۱۸۵۹ء میں مسٹر ولیم ڈی آر فلٹر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن نے دہلی میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا اور وہاں کے تمام امرا و شرفا اور عہدہ داروں کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ اس جلسے کا مقصد یہ تھا کہ "فضیلت پناہ" ماسٹر رام چندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات حسنہ پر سرکار کی طرف سے خلعت عطا کیا جائے۔ چنانچہ یہ خلعت اور رقم اس جلسے میں ماسٹر صاحب کو عطا کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ماسٹر صاحب نے ایک اور کتاب شائع کی جس میں تفرقی احصا کا ایک نیا طریقہ بیان کیا اس پر پروفیسر کلانڈ (اڈنبرا یونیورسٹی) اور پروفیسر سی اینڈ ریوز ( ) نے بہت اچھی رائے کا اظہار کیا ان کتابوں کے شائع ہونے سے ماسٹر رام چندر کی شہرت بڑھ گئی اور ان کے ایجاد کردہ طریقے یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں رائج ہو گئے۔

غدر کے زمانے میں بڑی مصیبت ان پر نازل ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں وہ نیٹو ہیڈ ماسٹر ٹامسن سول انجینئرنگ کالج کے مقرر ہوگئے۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں دہلی ڈسٹرکٹ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔

لیکن اس کے کچھ عرصہ کے بعد ان کی صحت میں فرق آگیا اور انھوں نے ۲۴ مئی ۱۸۶۲ء کو علمی پنشن کی درخواست کی۔ غرض ایک طویل مراسلت اور واقعات و قواعد کی چھان بین کے بعد ایک سو پچیس روپیہ ماہانہ کی پنشن منظور ہوئی۔ اس کے بعد وہ پٹیالہ میں ناظم تعلیمات ہوگئے۔ وہاں سے بھی اسی قدر پنشن ملی۔

عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد ان کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا تھا۔ اس جھمیلے میں پڑ کر انھوں نے مذہبی بحث مباحثے کی کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں جو ان کے شان کے شایاں نہیں تھیں۔ وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔

(۳)

پنڈت موتی لال بسمل دہلوی

موتی لال دہلوی (کشمیری پنڈت) کالج کے نہایت ممتاز طلبہ میں سے تھے۔ انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ انگریزی مضمون نویسی میں گینبز اور سر ٹی مٹکاف کے میڈل حاصل کیے (۱۸۴۹-۵۰ء) کالج میں سینیر اسکالرشپ پاتے تھے ان کے وظیفے کی توسیع کے لیے گورنمنٹ میں سفارش کی گئی تو منظوری دیتے وقت خصوصیت کے ساتھ ان کے متعلق یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ وہ اس رعایت کا خاص طور پر مستحق ہے کیونکہ انگریزی زبان کی تحصیل میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اپنی فرصت کا وقت ترجمہ کرنے اور اُردو رسالوں کو اڈٹ (مرتب) کرنے میں صرف کرتا ہے۔ ختم تعلیم پر ۱۸۵۰ء میں بورڈ آف اڈمنسٹریشن لاہور کے فارسی مترجم ہو گئے تھے۔ کئی سال پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی رہے۔ حکام بالادست اور گورنمنٹ کی نظروں میں بہت اعتبار تھا۔ پھر اکسٹرا جوڈیشل اسسٹنٹ اور ڈسٹرکٹ جج ہو گئے تھے۔ اس آخری عہدے سے پنشن پائی اور گجرات (پنجاب) میں قیام پذیر ہو گئے۔ لاہور میں باسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اگرچہ یہ ایسے محکمہ میں چلے گئے تھے جہاں تعلیم و تعلّم کا چرچا نہ تھا لیکن ان کا علمی شوق ہمیشہ قائم رہا۔ پلوٹارک کے تذکرہ سسرو کا ترجمہ اُردو میں کیا جو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی طرف سے شائع ہُوا۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک تذکرۂ شعرا لکھا تھا۔ تعلیم نسواں اور صغر سنی کی شادی پر انگریزی میں دو رسالے لکھے دو کتابیں مسمرزم کے موضوع پر انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کیں۔ اُردو فارسی میں بھی بڑی دستگاہ تھی۔ بسمل تخلص کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر دلی کالج کو فخر ہے ؎

(۴)

پنڈت من پھول

پنڈت من پھول ذات کے برہمن، دلّی کے رہنے والے، کالج کے قدیم طلبہ میں سے تھے غالباً مولوی ذکاءاللہ کے ہم جماعت اور ماسٹر رام چندر کے شاگرد تھے۔ کالج کی رپورٹوں میں ان کا ذکر تعریف کے ساتھ آیا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی ہو گئے تھے۔ انہی کی سعی سے مولانا محمد حسین آزاد سررشتہ تعلیم کے ڈائرکٹر کے دفتر میں اوّل اوّل پندرہ روپے کے ملازم ہو گئے تھے۔

(۵)

ماسٹر پیارے لال

ماسٹر پیارے لال دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی اور ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ بعد تکمیل تعلیم سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی۔ گوڑگانوں اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے بعد دہلی فارسی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر مامور ہو گئے۔ پھر ۱۸۶۴ء میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کے کیوریٹر ہوئے۔ بک ڈپو ٹوٹا مدارس کے انسپکٹر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔

دہلی سوسائٹی جو ایک علمی اور ادبی انجمن تھی ۱۸۶۵ء میں دہلی میں قائم ہوئی۔ یہ انجمن ماسٹر صاحب کی مساعی کی بہت کچھ ممنون ہے جب تک لاہور تشریف نہیں لے گئے وہی اس کے سکریٹری رہے۔ اس انجمن میں لکچر ہوتے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔ اور علم و فنون اور معاشرت و قانون وغیرہ پر مباحث ہوتے تھے، جب آپ دہلی سے بکڈپو کی خدمت پر جانے لگے تو سوسائٹی کی جانب سے آپ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ جس پر دہلی کے سربرآوردہ عمائد اور سوسائٹی کے ارکان کے دستخط تھے۔ مرزا غالب نے اپنے دستخط کے ساتھ یہ عبارت رقم فرمائی۔

" فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ہوا ہے وہ میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلی میں کوئی نہیں ہے۔"

اردو فارسی، انگریزی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ نہایت خلیق ملنسار معاملہ فہم اور سلیم الطبع شخص تھے رواداری اور بے تعصبی ان کا شعار تھا۔

ایک بار کسی کمیٹی کی شرکت کے سلسلے میں ماسٹر صاحب کو دہلی سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ میجر فلر اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے ماسٹر صاحب میجر صاحب سے ملنے گئے تو انھوں نے لفظ ایجاد کی تذکیر و تانیث کا سوال کیا۔ ماسٹر صاحب نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ کے دفتر میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو زبان کا پورا ماہر ہے اور ایسے مسائل پر رائے دینے کا اہل ہے۔ چنانچہ آزاد بلائے گئے اور ان سے وہی سوال

کیا گیا۔ جواب سے میجر صاحب کا اطمینان ہو گیا۔ اور مولانا آزاد کو بہت جلد ترقی مل گئی۔ خواجہ حالی مرحوم بھی لاہور بکڈپو میں ماسٹر صاحب ہی کی سعی اور توسط سے پہنچے۔ اس کے علاوہ مرزا اشرف بیگ خاں اشرف۔ مولوی احمد جان دلی منشی درگا پرشاد قادر۔ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ۔ مرزا ارشد گورگانی وغیرہ کو لاہور میں لانے کے ماسٹر صاحب ہی باعث ہوئے اور اس جماعت نے اردو کی خدمت بڑی سرگرمی اور تن دہی سے کی اور اس وقت سے پنجاب میں اردو کا چرچا اور ذوق پیدا ہوا۔

ماسٹر صاحب باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے علمی اور ادبی خدمت کرتے رہے چنانچہ ذیل کی چند کتابیں ان کی تصنیف و تالیف سے ہیں۔

۱۔ قصص ہند حصہ اول

۲۔ قصص ہند حصہ دوم

۳۔ قصص ہند حصہ سوم

۴۔ رسوم ہند کا ابتدائی نصف حصہ

۵۔ تاریخ انگلستان (کلاں)

۶۔ دربار قیصری ۱۸۷۷ء تالیف مسٹر ویلر کا ترجمہ

۷۔ رسالہ اتالیق کے اکثر مضامین

رسالہ اتالیق پنجاب کے بھی اڈیٹر رہے ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔ (۱)

---

(۱) مرحوم دلی کالج (ڈاکٹر عبدالحق)

باب ۲۱

عہد بہادر شاہ کی نئی پود

زمانہ بدل رہا ہے۔ حالات پلٹا کھا رہے ہیں، ایک عظیم و جلیل قوم۔ جو اس ملک میں فاتح اور کشور کشائی حیثیت سے نمودار ہوئی تھی، جس کی شمشیر آبدار نے دشمنوں کے سر کاٹے تھے، جس کی تیغ و سناں کے چرکے، اب تک مرئی اور محسوس طور پر، صاف اور واضح نظر آرہے ہیں، جس کی ہیبت و جلالت، شکوہ و عظمت رفعت و منزلت نے بڑے بڑے گردن کشوں کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیا تھا، جس کے دبدبہ اور طنطنہ سے، گاؤ زمین کانپتی تھی، اور ہفت افلاک میں تزلزل برپا تھا،

اب وہ قوم مٹ رہی ہے۔ تباہ ہو رہی ہے، اس کا جاہ و جلال افسانہ پارینہ بن رہا ہے، اس کی شوکت و عظمت کی بساط اُلٹ رہی ہے، اس کا دم خم ختم ہو رہا ہے پہلے وہ فرماں روا تھی، اب وہ غلامی کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی ہے، پہلے اس کا پرچم اقبال طول و عرض ہند میں لہراتا تھا، اب اس کی اڑان صرف لال قلعہ تک محدود ہے، پہلے وہ طوفانوں سے لڑتی تھی، پہاڑوں سے ٹکراتی تھی، دریاؤں کی بپھری ہوئی، تند و شوخ موجوں سے ٹکر لیتی تھی، اب وہ ہمت ہار چکی ہے، اس کا حوصلہ جواب دے چکا ہے، اس کی آن اور شان دم توڑ چکی ہے، حکومت اغیار کے تصرف میں چلی گئی، شان و شوکت دوسروں کے حصہ میں آئی، جاہ و جلال کے مالک، دشمن بن بیٹھے، دبدبہ اور طنطنہ محکوموں کے حصہ میں آگیا، لیکن تاریکی میں بھی روشنی کی کرن نظر آجاتی ہے، اسی دور میں ایک نئی نسل ابھر رہی تھی، ایک نیا گروہ جنم لے رہا تھا، ایک ایسی جماعت پیدا ہو رہی تھی، جو آگے چل کر، اس آشفتہ روزگار، برگشتہ بخت، اور تباہ حال قوم کی معمار بننے والی تھی، جس قوم کو فلک نے پیس ڈالا تھا، دشمن نے پامال کر دیا تھا، زمانہ نے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا یہ لوگ نہایت نامساعد حالات میں آگے بڑھے، اور تجدید و تعمیر نو کا کام ہمت اور حوصلہ کے ساتھ شروع کر دیا، ان میں سے کسی نے خیالات و عقائد کی اصلاح کی، کسی نے زبان و ادب میں جان ڈالی، کسی نے علم کے فروغ و اشاعت میں

حصہ لیا، کسی نے درسگاہیں قائم کیں، کسی نے مدارس اور مکاتب کھولے، کسی نے کتابیں لکھیں کسی نے اخبار، اور رسالے نکالے، کسی نے تقریریں کیں، خطبے دیئے، مقالات عالیہ سپرد قلم کیے، اور اپنی کوششوں کا پھل بڑی حد تک اپنی زندگی ہی میں دیکھ لیا،

اس داستان کو اگر طول دیں تو شب فراق اور زلف رسا کی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آئے گی۔ اور مختصر کیجئے، تو آرزوئے ناکام اور قلب مضمحل کی طرح سمیٹ لیجیے، میں نے یہی آخری صورت اختیار کی ہے۔ اور حتیٰ الامکان کسی اہم شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا ہے

(۱)

سرسیّد احمد خاں

"آپ کو کون نہیں جانتا، آپ کی لیاقت اور وجاہت کا کوئی مسلمان ہمارے دیکھتے نہیں ہوا، مسلمانوں کے فدائی تھے، قوم کی بہتری کے لیے تن من دھن سب وقف کر دیا، صاحب تصانیف بھی تھے، مسجد کے پاس ان کا دولت خانہ ہے، جو اب ان کے پوتے سید راس مسعود کے قبضہ میں ہے، آپ کی ولادت ۱۸۱۷ء کی ہے، اور تاریخ وفات

غفر لہ

$$\frac{1315}{1898}$$

ہے، آپ علی گڑھ کالج کی مسجد میں مدفون ہیں،

آپ کے آبا و اجداد ملک عرب سے ہرات میں آئے، اور بزمان سلطنت اکبر ہندوستان میں آکر مورد مراحم والطاف خسروانہ ہوئے، عالمگیر ثانی کے زمانہ میں سرسید کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب ہزار پیدل اور پانچسو سوار ملے، آپ کے والد ماجد سید محمد متقی خان بہادر کا بھی یہی منصب شاہ عالم ثانی کے عہد میں برقرار رہا، پھر سرسید پر خطاب اور منصب اترا،

مغلیہ سلطنت کے انتزاع کے بعد ۱۸۳۷ء میں آپ پہلے پہل دہلی کے صدر امین کے سررشتہ دار ہوئے، اور درجہ بدرجہ ترقی پاکر ۱۸۵۵ء میں بجنور کے سب جج مقرر ہوئے، انہی ایام میں غدر ہو گیا، سرسید نے پوری وفاداری گورنمنٹ کی کی، اور جتنے انگریز اور میمیں بجنور میں تھیں اپنی جان پر کھیل کر ان کی جانیں بچائیں، ایک باغی نواب جس کا نام محمود خان تھا، آٹھ سو آدمیوں کی جمعیت سے کر بجنور پر چڑھ آیا، یہ غلام قادر روہیلہ کا رشتہ دار تھا، سرسید اس باغی کے پاس تنہا جا پہنچے اور اپنی شیریں زبانی سے اسے شیشہ میں اتار لیا اور اجازت دلوا دی کہ انگریز میرٹھ چلے جائیں،

باغیوں نے یہ دیکھ کر کہ سرسید انگریزوں کا دم بھرتے ہیں کئی بار ان پر حملہ کیا، مگر زندگی تھی بچ گئے، دہلی

میں ان کا وہاں مکان اور اسباب لوٹ لیا، رشتہ داروں کو قتل کر ڈالا، بڑی جوکھوں سے سید کی جان بچی،

آخر غدر کا منہ کالا ہوا، گورنمنٹ نے سر سید کو خلعت کے علاوہ دو سو روپے ماہوار کی پنشن دو پشت تک کر دی، اور پھر حکومت سے خطابات ملے، وائسرائے کی کونسل کے آپ ممبر ہوئے، غرض دنیا کا کوئی اعزاز ایسا نہ تھا، جو آپ کو نہ ملا ہو،

سب سے بڑا اور بہتر کام علی گڑھ کا بے نظیر کالج ہے، جس کی نظیر سارے ہندوستان میں نہیں جو مسلمانوں کی سلف ہلپ کی دوامی یادگار ہے، سید احمد خاں اب نہیں رہے، لیکن کالج قائم ہے اور ان کا نام زندہ ہے اور زمانہ دراز تک مسلمان ان کے احسانات کو یاد کرتے رہیں گے، جن کوتاہ اندیشوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کے نیک کاموں میں روڑا اٹکایا اور ان کو کافر ٹھہرایا تھا اب وہی اس کافر کو علیہ الرحمۃ کہتے ہیں اور اس کی موت کو قوم کی موت سمجھتے ہیں ——! (۱)

سر سید کے والد اور نانا سید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو بمقام دہلی پیدا ہوئے ان کا خاندان سادات دہلی میں ہمیشہ سے ممتاز تھا ان کے ننہالی بزرگ بسلسلہ تجارت دہلی آئے تھے پھر یہیں سکونت اختیار کر لی ان کے حقیقی نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کے خطاب سے ممتاز اور سلطنت انگلشیہ کے معتمد اور بادشاہ دہلی کے وزیر رہ چکے تھے۔ علاوہ امور مہمہ متعلق انتظام سلطنت کے جن کو انھوں نے کمال لیاقت و خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ علم و فضل میں بھی خاص مرتبہ رکھتے تھے اور بالخصوص علوم ریاضی و ہندسہ کے عالم تھے،

سر سید کے والد میر متقی بھی قلعہ دہلی کے وظیفہ خوار اور درباریوں میں تھے خود سر سید بھی آخری تاج دار کے دربار میں اکثر اپنے والد کے ہمراہ حاضر ہوتے تھے۔ (۲)

شاہی دربار سے خطاب سید صاحب جب جوان ہوئے تو دربار دلی (عہد شاہ ظفر) سے ان کو خاندانی خطاب جواد الدولہ کے ساتھ عارف جنگ کا بھی خطاب ملا۔

---

(۱) واقعات دار الحکومت حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص ۷۸

(۲) حیات سر سید (نور الرحمان) ص ۲۶

جوان کے نام کا جزو تھا اور دولت برطانیہ نے بھی سی، ایس، آئی کے بعد آخر خطاب کے، سی، ایس، آئی کا تمغہ مرحمت فرمایا - (۱)

تیراکی اور تیر انداز

جب بڑے ہوئے تو والد سے تیراکی اور تیر اندازی کی مشق کی اور اس زمانے کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اسی زمانہ میں وہ دربار میں بھی جانے لگے ان کے والد نے اپنا خلعت ان کو دلوانا شروع کر دیا اور خود دربار کی حاضری کم کر دی - (۲)

حکیم احسن اللہ اور سر سید

اسی زمانہ میں وہ ایک مرتبہ دہلی آئے اور حکیم احسن اللہ خان نے بہادر شاہ سے ان کی تقریب اور سفارش کی چنانچہ ان کو خطاب جواد الدولہ عارف جنگ عنایت ہوا - (۳)

غدر میں سر سید کی خدمات

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء (۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ) کو دہلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ مئی کو یہ خبر بجنور پہنچ گئی وہاں اس وقت بیس (۲۰) یوروپین اور یوریشین عورتوں اور بچوں سمیت تھے مسٹر شکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ تھے جب بجنور میں بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو یہ لوگ بہت گھبرائے لیکن سر سید نے جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں" چنانچہ سر سید اور ہندوستانی افسروں کے تمام رات مسلح ہو کر کلکٹر کی کوٹھی پر پہرہ دیتے تھے ساری رات کرسیوں پر بیٹھے یا کوٹھی کے آگے ٹہلتے یا شہر میں گشت کرتے گزر جاتی تھی آخر باغیوں کو نشیب و فراز سمجھا کر انگریزوں کے قتل سے باز رکھا اور سب کو رڑکی روانہ کر دیا، انگریزوں کے جانے کے بعد بجنور میں باغیوں کی عملداری ہو گئی اور وہ لوگ سر سید کے اور اُن کے رفقاء میر تراب علی اور ڈپٹی رحمت خاں کے قتل کے درپے ہو گئے

---

(۱) یاد ایام (عبد الرزاق) ص ۱۳

(۲) حیات سر سید (نور الرحمان) ص ۲۷

(۳) حیات سر سید (نور الرحمان) ص ۲۳

سرسید نے ایک مہینے تک بجنور کا انتظام بخوبی قائم رکھا لیکن باغی دشمن ہو گئے تھے اسلیئے سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں میرٹھ کے ارادہ سے روانہ ہو گئے راستے میں مختلف مقامات پر چند بار باغیوں نے ان کے قتل و غارت کا ارادہ کیا لیکن ہر موقع پر بعض خیر خواہ زمینداروں نے بچالیا، اثنائے راہ میں چاندپور سے چل کر سرسید نے بچھراؤں پہنچ کر علالت اور راستے کی کوفت کے سبب سے چندروز مولوی محمود عالم صاحب کے مکان پر جوان کے دوست تھے مقام کیا اور اپنی مفصل سرگزشت حکام انگریزی کو لکھ بھیجی اور چند روز بعد خود بھی میرٹھ چلے گئے،

سرسید میرٹھ میں کئی مہینے رہے وہاں معلوم ہوا کہ دہلی میں انگریزی فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اسباب لوٹ لیا ان کی والدہ اور خالہ دہلی میں تھیں سرسید میرٹھ سے دہلی آئے گھر تباہ ہو چکا تھا، ماں اور خالہ کو میرٹھ لے گئے انگریزوں نے رڑکی میں اپنی فوج جمع کر لی، سرسید بھی مع تمام عملۂ بجنور کے ساتھ بحکم سرکار رڑکی بلا لیے گئے، تمام روہیلکھنڈ سخت باغی تھا بجنور، مراد آباد، بریلی کے ضلعے سرکشوں کے زیر اثر تھے ان اضلاع پر قبضہ کرنے کے لیے رڑکی سے فوج روانہ ہوئی سرسید بھی ساتھ تھے اس موقع پر سرسید نے کمال دلیری، دانشمندی سے کام لیا حکام سرکاری میں یہ بحث پیش آئی کہ اب ان اضلاع سرکش میں کون لوگ باغی تصور کیے جائیں سرسید نے اس باب میں افسران فوج سے گفتگو کی اور بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ طے کرالیا کہ سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو باب سرکار سے مقابلے کیلئے پیش آئیں باقی جو فسادات رعایا ہندو مسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں کیے ان کے سبب سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا اس وقت اگر سرسید یہ جرأت نہ کرتے اور یہ فیصلہ نہ کرا دیتے تو ضلع بجنور بالکل تباہ ہو جاتا خصوصاً کوئی مسلمان اس ضلع میں باقی نہ رہتا، سرسید کی اس دانشمندی کے سبب سے ضلع بجنور غدر کے نتائج میں سب سے کم مبتلا ہوا اور ضلع مراد آباد میں ضبط شدہ جاگیریں سب سے زیادہ واپس دی گئیں۔

خدماتِ غدر کا صلہ گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری جو سرسید سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام کی توقع پر مبنی نہ تھی لیکن گورنمنٹ نے ان کی خدمات کی قدر کی اور

اُن کے صلہ میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپیہ کا اور دو سو روپیہ ماہوار کی پولٹیکل پنشن دو نسلوں تک مقرر کی، میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسان چاند پور ضلع بجنور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا اور جس طرح دیگر ہواخواہان سرکار کو باغیوں کی ضبط شدہ جائدادیں دی گئیں تھیں یہ تعلقہ چاند پور سرکار نے سرسید کو دینا چاہا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

غدر کے بعد اپریل ۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور ہو کر مراد آباد گئے وہاں چند کتابیں لکھیں ۱۸۶۰ء میں وہاں سخت قحط پڑا قحط کا انتظام سرسید نے ایسی خوبی سے کیا کہ انسانی ہمدردی کا اس سے بہتر نمونہ ملنا مشکل ہے،

شاندار اور ناقابل فراموش خدمات قحط زدوں کی سرکاری امداد کے علاوہ خود سرسید کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں مراد آباد کے ایک عالم و رئیس مولوی عالم علی کو بغاوت کے الزام میں سزائے موت سے بچایا مولوی صاحب نے چند یورپین عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی باغیوں نے زبردستی گھر میں گھس کر ان سب کو قتل کر دیا اور مولوی صاحب کے گھر کا آدمی کوئی نہ مارا گیا ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ان کے اشارے سے یہ قتل عمل میں آیا سرسید نے مولوی صاحب کی بے گناہی ثابت کر کے بری کرا دیا چار برس بعد ۱۸۶۲ء میں سرسید کی تبدیلی مراد آباد سے غازی پور کو ہو گئی وہاں بھی عملی و تعلیمی کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور سے علی گڈھ کو تبدیل ہوئے ۱۸۶۷ء میں عہدہ جج خفیفہ پر ترقی پا کر علی گڑھ سے بنارس گئے یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے انگلستان روانہ ہوئے، دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود ساتھ تھے سفر کا مقصد سید محمود کی تعلیم کے علاوہ ولایت کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ و مشاہدہ تھا لندن میں اُن کو "سی. ایس. آئی" کا خطاب اور تمغہ ملا مشاہیر و عمائد ملک سے ملاقات کی، ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی لیوی (دربار عام) میں شریک ہوئے بعض کلب کے ممبر بنائے گئے وہاں کی یونیورسٹیوں، کتب خانوں عجائب خانوں کارخانوں کو غور سے دیکھا ان سب باتوں کے سوا سرسید کا سب سے ضروری اور اہم مقصد ولایت کے سفر سے ایک ایسی کتاب کا لکھنا اور انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع کرنا تھا جس سے اسلام کی اصلیت عیسائی قوموں پر ظاہر ہو اور جو غلطیاں اکثر عیسائی مصنفوں اور خاصکر سر ولیم میور (لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب)

نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اسلام کی حقیقت اور بانیٔ اسلام کی سیرت پاک کے متعلق کی ہیں۔ ان کو رفع کیا جائے چنانچہ سرسید نے لندن میں ایک مختصر رسالہ انگریزی میں شائع کیا اور ولایت سے آکر ایک کتاب مفصل اردو میں چھپوائی ولایت میں تقریباً ۱½ سال رہ کر سرسید مع بڑے بیٹے سید حامد کے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ہندوستان آ گئے اور بنارس میں اپنے عہدے کا چارج لے لیا اور بنارس ہی کے زمانہ قیام میں ۱۸۷۵ء میں ایک ابتدائی مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا اور پھر جولائی ۱۸۷۶ء سے پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنے لگے،

سرسید کی وفات

پنشن کے بعد ۲۲ برس ہمہ تن قومی خدمات میں مصروف رہ کر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو ۱۰ بجے رات علی گڑھ میں انتقال فرمایا اور کالج کی مسجد میں دفن ہوئے۔ (۱)

گورنر سے اختلاف

حیات جاوید کے پہلے حصہ میں سرسید کے حالات اور دوسرے میں ان کے قومی و ملکی کارنامے ہیں۔ سرسید کی راستبازی اور اخلاقی جرأت کے چند واقعات لکھے ہیں ایک واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سرسید نے کسی دیہاتی مدرسہ کا معائنہ کیا وہاں گائے بندھی ہوئی تھی اور مدرس اور طلبا کو غیر حاضر پایا رپورٹ میں یہ واقع لکھ دیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستان کے عام دیہاتی مدرسوں کی یہی حالت ہے سر ولیم میور لفٹنٹ گورنر نے سرسید کی رپورٹ پڑھ کر ان کی رائے سے اختلاف کیا سرسید کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور مسٹر بربیلی سشن جج علی گڑھ سے شکایت کی جج صاحب نے لفٹنٹ گورنر کو لکھ بھیجا انھوں نے جج صاحب کو جواب لکھا کہ ان کو سرسید کے معائنہ کی صداقت سے انکار نہیں بلکہ ان کے نتیجہ نکالنے سے اختلاف ہے اس کے بعد سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں ولایت چلے گئے اور چونکہ لفٹنٹ گورنر کی طرف سے دل صاف نہ تھا اس لیے ان سے مل کر نہ گئے جب اکتوبر ۱۸۷۰ء میں لندن سے واپس آئے اس وقت بھی سر ولیم سے جا کر نہ ملے کچھ عرصے کے بعد ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کا خط سرسید کے پاس آیا کہ

"نواب لفٹنٹ گورنر آپ کے مع الخیر ہندوستان میں پہنچنے سے خوش ہوئے اور آپ کی خیریت اور سید محمود کی تعلیم کا حال معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں اور اب تک انتظار کر رہے ہیں

---

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۲۸۱

باقی حال مولانا حالی کی زبانی سُنیے :۔

سرسید نے اس کے جواب میں نہایت صفائی سے تمام وجوہ اپنے خط نہ بھیجنے اور مل کر نہ آنے کی اور سید محمود کی تعلیم کی کیفیت مفصل لکھ بھیجی یہ چھٹی ۷ نومبر کی تھی سر ولیم نے ۹ نومبر کو اس کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے :۔

مائی ڈیئر سید احمد آپ کی ۷ نومبر کی چھٹی نے مجھ کو اس قدر حیران اور رنجیدہ کیا کہ میں بیان نہیں کر سکتا ہوں اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مَیں نے خواب میں بھی آپ پر کسی خلاف واقع بات کہنے کا الزام لگانے کا خیال نہ کیا ہو گا میں ان نتائج سے جو آپ نے نکالے ہیں اب بھی اختلاف رکھتا ہوں مگر اس سے آپ پر کوئی الزام لگانا ظاہر نہیں ہوتا مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ آپ نے مجھ کو فوراً براہ راست کیوں نہ لکھا آپ کے ایسا نہ کرنے سے مجھ کو اور بھی رنج ہوتا ہے گویا آپ نے اس قدر اعتبار و بھروسہ نہ کیا جس کی میں آپ سے اُمید کرتا تھا اور شاید امید کرنے کا حق بھی رکھتا تھا۔

مسٹر برملی نے اردو الفاظ کا مطلب مجھ پر ظاہر کیا تھا اور میں نے ایک نوٹ لکھا تھا جس میں ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے ایک لحہ بھی کسی ایسے مطلب کا خیال نہیں کیا تھا اور میں نے اپنی تحریر کو جس طرح پر ضرورت ہو استعمال کی اجازت دے دی تھی چونکہ اس معاملہ کا اس سے زیادہ کوئی تذکرہ نہیں ہوا میں نے خیال کیا کہ وہ اظہار کافی تھا اور گزٹ سرکاری میں اسکے شائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

کپتان ٹلنگسٹن آپ کو اس مضمون کے متعلق مندرجہ بالا خط و کتابت کے حوالہ سے آئندہ لکھینگے اس وقت میں صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپکے بیٹے کے ایسے عمدہ حالات سننے سے نہایت خوش ہوا ہوں اور آپ کو اس طرف یا جب کبھی میرا کیمپ بنارس میں پہونچے تو وہاں دیکھ کر خوش ہونگا۔

سرسید نے اس چھٹی کا فوراً شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ آپ کے عنایت نامہ سے تمام بوجھ دل سے

اُٹھ گیا۔ کرنل گراہم یہ تمام واقعہ اپنی کتاب میں نقل کر کے لکھتے ہیں کہ سر ولیم نے سر سید احمد خاں کو اجازت دے دی تھی میری چھٹی کو جس طرح چاہیں شائع کر دیں اگر کوئی اور دیسی جنٹلمین ہوتا تو فوراً ایسا کرتا مگر سید نے اُس کو پڑھ کر ڈال دیا اور مجھ کو بڑی تلاش سے وہ چھٹی ملی۔

سر سید کی جرأتِ اخلاق

کرنل موصوف کا یہ خیال ہندوستانیوں کے کیرکٹر کی ناواقفیت پر مبنی ہے بے شک ایسی طبیعت اور ایسے رتبے کے ہندوستانی جیسے کہ سید صاحب ہیں کم نکلیں گے کہ ایک موہوم شبہہ پر صوبہ کے گورنر سے ناراضی کا اظہار کر بیٹھے اور گورنر کی طرف سے ایسی مہربانی کے ساتھ اُن کی دلجوئی کی گئی مگر ہندوستانی شرفا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو محض اپنی نمود کے لیے حکّام کی ایسی تحریروں کا شائع کرنا جیسا کہ سر ولیم کی تحریر سر سید کے نام تھی نہایت سبک اور حقیر بلکہ ایک کمینہ حرکت سمجھتے ہیں۔

کمشنر میرٹھ اور سر سید

اسی طرح کا ایک معاملہ ولیم صاحب کمشنر میرٹھ کے ساتھ گزرا جب سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا مکان بن کر تیار ہوا تو صاحب ممدوح کو اُس کی افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے بلایا گیا ان کے دل میں عنایت اللہ خان مرحوم رئیس بھیکن پور ضلع علی گڑھ کی طرف سے ایام غدر کے متعلق کچھ شبہات تھے اس لیے وہ افتتاح کی رسم میں اُن کا شریک ہونا نہیں چاہتے تھے انھوں نے سر سید سے کہا کہ اس جلسہ میں اگر عنایت اللہ آئے تو ہم نہیں آنے کے" سر سید نے کہا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے نہایت فیاضی کے ساتھ سوسائٹی کی امداد کی ہو اور جو اس کا پریسیڈنٹ بھی ہے اُس کو شریک نہ کیا جائے انھوں نے ہرگز اس بات کو گوارا نہیں کیا عنایت اللہ خان کی عدم موجودگی میں افتتاح کی رسم کی ادا کی جائے آخر مسٹر بریلی نے جو علی گڑھ میں سشن جج تھے اور سوسائٹی کے بڑے معاون اور سر سید کے دوست تھے بڑی مشکل سے صاحب کمشنر کو تیار کیا اور ان کو عنایت اللہ خان کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرنا پڑی۔ سر سید کا اس بات پر اصرار زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ اُن کے نزدیک صاحب کمشنر کے شبہات محض بے اصل تھے اور وہ خود عنایت اللہ خان کو ہر ایک الزام سے پاک و صاف جانتے تھے۔(۱)

---

(۱) داستان تاریخ اُردو (حامد حسن قادری) صفحہ ۵۰۴

سرسید کا کردار

بجنور میں تھوڑے سے انگریز حاکم تھے اور غدر کی آگ اس نواح میں اس شدت سے بھڑک رہی تھی کہ ان لوگوں کو اپنی جانیں سلامت بچانا قطعاً ناممکن تھا نواب محمود خان اور ہلدور کے جاٹ دونوں طرف سے ضلع کو گھیرے ہوئے تھے دوسری جانب سے دہلی اور میرٹھ کی فوجیں بڑھ رہی تھیں اس موقع پر محض سرسید کی ہمت و دلیری نے ان لوگوں کی جانیں بچائیں اور جب انگریز وہاں سے بھاگ کر رڑکی چلے گئے تو نواب کی فوجوں نے بجنور پر قبضہ کر لیا خود سرسید اور تحصیل دار بجنور بھی وہاں سے بھاگ گئے لیکن نواب نے ان کو بلایا اور حکم دیا کہ وہ بجنور رہیں اس زمانے میں اور باغیوں کی فوجوں کی واپسی کے بعد جب انگریزی حکومت نے دوبارہ ضلع کا انتظام شروع کیا تو سرسید اور ڈپٹی رحمت خاں تنہا تمام علاقہ کے سیاہ و سفید کے مالک تھے، اس قدر ابتری کے بعد دوبارہ نظم و نسق قائم کرنے کے لیے نہایت دشوار گذار مراحل درپیش تھے ایسے نازک موقع پر اپنے اصول کو ہاتھ سے نہ دینا اور اپنے ہم وطنوں کی حفاظت سے غافل نہ ہونا بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور ان خدمات کی قدر ایسی حالت میں اور بھی زیادہ ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانے میں دوسرے لوگوں نے جن کو اس قدر منصب و اختیار بھی نہیں تھا ذاتی اغراض کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ (۱)

سرسید کی جرأت و صداقت

مراد آباد کی تبدیلی:۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں وہ بجنور سے مراد آباد تبدیل ہو کر آئے، جائداد منضبطہ ہنگامہ غدر کے ممبر مقرر کیے گئے سرسید تنہا ہندوستانی ممبر تھے اور جس تحقیقات میں کمیشن مصروف تھا اور اس کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر سرسید کی شرکت کی وجہ سے کمیشن تحقیقات میں احتیاط برتنے پر مجبور ہوا کہا جاتا ہے کہ اس ضلع میں جس قدر جائدادیں ضبطی سے محفوظ رہیں وہ زیادہ تر سرسید کی جرأت و صداقت کی رہین منت ہیں۔ (۱)

سرسید کا ایثار و استغنا اور بے لوثی

سرسید کہتے ہیں:۔

ایک عبرت خیز واقعہ ہے جس نے ایک شخص کے دل کو دین و دنیا دونوں سے مستغنی کر کے قوم کی محبت و ہمدردی میں محو کر لیا اور درحقیقت وہی واقع اس کالج کے فونڈیشن کا پہلا

---

(۱) حیات سرسید (نور الرحمان) صفحہ ۳۴

(۲) حیات سرسید (نور الرحمان) صفحہ ۳۵

پتھر ہے میں اپنے دل سے بھلا نہیں سکتا گو میں اس کو کبھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کمبخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے، اس زمانے میں میں بجنور میں تھا۔ غدر کے بعد مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج نہ تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گذرا اس کا رنج تھا جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا میں نے اپنے دل میں کہا مجھ سا نالائق دنیا میں کوئی نہ ہوگا قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور میں نے کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے، اور در حقیقت یہ سچی بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پاوے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا، چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے، جب میں مرادآباد کو آیا جو ایک غم کدہ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا میں نے پسند نہیں کیا مگر میں نہیں جانتا کہ کس نے پسند کیا اور کس نے آمادہ کیا،

ہنوز سیاست ہائے ایام غدر جاری تھیں کہ میں نے ایک رسالہ قوم کی بے گناہی کا لکھا جو کاز آف انڈین ریولٹ " (اسباب بغاوت ہند) کے نام سے موسوم ہے میں بیان کرنا نہیں چاہتا کہ وہ کیا وقت تھا اور میرے دوست کیا یقین کرتے تھے کہ اس جوش قومی ہمدردی سے جس کو میں خود دیوانہ پن کہہ سکتا ہوں مجھ پر کیا گذرنے والا تھا یہ میرا پہلا سبق قومی ہمدردی کا تھا میرے غمخوار مجھ کو اس سے مانع آتے تھے اور میرا دل اُن سے یہ کہتا تھا ؎

حریف کاوشِ مژگانِ خون ریزم نہ ناصح
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن (۱)

رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند

یہ رسالہ غالباً انھوں نے مراد آباد میں پہنچتے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اس کے ختم ہونے کے بعد بغیر اس کے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرائیں اردو ہی میں اس کو مطبع مفصلات گزٹ آگرہ میں چھپنے کو بھیج دیا اور ۱۸۵۹ء میں اس کی پانچسو جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں جب سرسید نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رام چند کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف اور سرسید کے نہایت دوست تھے انھوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرضِ خطر میں نہ ڈالو سرسید نے کہا،

"میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بہ درجہ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے سرسید نے اول دو رکعتیں بطور نفل کے ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانچسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا بھیجدی اور چند جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریرے نے جو کونسل میں ممبر تھے اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا۔ مگر مسٹر سیل بیڈن نے جو اس وقت فارن سیکرٹری تھے اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ بازپرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے" لیکن چونکہ کوئی ممبران کا ہم رائے

---

(۱) حیاتِ سرسید (نور الرحمان) ص ۱۵۔

نہ تھا اس لیے ان کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔ (۱)

ڈاکٹر ہنٹر کو جواب

ہنٹر کی کتاب پر سر سید کے ریویو نے تمام انگریزی حکام کے دل پر اور نیز انگلستان کے لوگوں پر نہایت عمدہ اثر کیا اس زمانہ میں حافظ احمد حسن مرحوم وکیل ٹونک لندن میں تھے جب انھوں نے دیکھا کہ ہنٹر کی کتاب سے لندن میں نہایت جوش اور برے خیالات مسلمانوں کی نسبت پیدا ہو گئے ہیں انھوں نے تمام ریویو پایونیر کے پرچوں سے نقل کرا کے جدا بطور پمفلٹ کے چھپوا دیا اور لندن میں جا بجا تقسیم کر دیا سنا ہے کہ جب وہ لندن سے آئے تو انھوں نے بیان کیا کہ اس ریویو کے شائع ہونے سے لندن میں لوگوں کی طبیعتوں کا ایسا حال ہو گیا تھا جیسے جلتی اور بھڑکتی آگ پر کوئی پانی ڈال دے جو شخص اس کو پڑھتا تھا ڈاکٹر ہنٹر کی تحریر پر تعجب کرتا تھا اور جو کچھ انھوں نے مسلمانوں یا وہابیوں کی نسبت لکھا تھا اس کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ (۲)

سر سید اور اردو زبان

یقیناً سید صاحب اردو جرائد نگاروں میں ایک بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کا قلم بہت زبردست اور ان کا تبحر اعلیٰ تھا۔ ان کا طرز تحریر زوردار اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں ہے کچھ غلطیاں بھی اسی میں نکلیں گی، مگر سید صاحب قواعد صرف و نحو کی قطعی پابندی نہیں کرتے تھے۔ وہ مقررہ قواعد انشاپردازی سے بالکل بے نیاز تھے۔ مگر یہی چیز ان کی شہرت اور قابلیت کو نقصان پہنچانے کے بجائے فائدہ پہنچاتی تھی، ان کے طرز جدید نے قدیم تصنع نگاری پر جو بیدل اور ظہوری کی تقلید میں اردو میں بھی برتی جاتی تھی، ایک ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کر دیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں تصنع سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ مضمون کو دیکھو اور عبارت سے غرض نہ رکھو یہ سید صاحب کا عمل تھا اور تقریباً یہی حال ان کی تحریروں کا ہے ان کی عبارت ان کی ادائے مطالب پر کبھی قاصر نہیں ہوتی، ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ نثر اردو لکھنے میں وہ ایسے ماہر تھے کہ اس

---

(۱) حیات جاوید (حالی) صـ ۶۲

(۲) حیات جاوید (حالی) صـ ۱۲۳

سے پہلے کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ مولانا حالی تو ان کو اردو کا مورثِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی سید صاحب کی یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مضمون اور دقیق سے دقیق عنوان خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، نہایت صاف اور بے تکلف زبان میں ادا کر سکتے تھے اور نیز اپنے مضامین کے حسن و قبح کو بھی نہایت زور دار الفاظ میں وضاحت سے بیان کر سکتے تھے، مگر سید صاحب اور غالب کے معاصرانہ تعلقات کو دیکھ کر کہ مرزا کی طرزِ خاص کا سید صاحب پر ایک خاص اثر پڑا اور جو سادگی اور بے تکلفی ان کی عبارت میں پائی جاتی ہے اس کا نقشِ اول غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہو چکا ہے۔

دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں میں بھی، اپنا ہی ایسا جوش و خروش اور راستبازی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کے حواریوں کا تھا۔ جن کی زبردست جماعت نے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ہندوستان میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا، خاص خاص لوگ جو اس جماعت میں شامل ہونے کا فخر رکھتے تھے یہ ہیں! نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین۔

حالی قومی شاعر تھے۔ مولانا نذیر احمد اپنے نصیحت آموز افسانوں اور ناولوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ شبلی اور ذکاء اللہ اپنے فن نقد اور تاریخ کے امام تھے، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے بیش بہا اور گرانقدر مضامین نے ادب اردو کو ہمیشہ کے لیے ممنون احسان کیا۔ ان تمام لوگوں کے مساعی جمیلہ جو مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے وقف تھیں نہایت بارآور اور کامیاب ثابت ہوئیں، اور ان کی تصانیف سے، زبان اردو میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ (۱)

---

(۱) تاریخ اردو ادب (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ ص۴۱

(۲)

سمیع اللہ خاں

مولوی سمیع اللہ خاں، سرسید کے دست راست تھے، بعد میں اختلافات کے باعث دونوں میں جدائی ہوگئی، سمیع اللہ خاں نے بھی غدر کے بعد، مسلمانوں کی ٹھوس اور تعمیری خدمت شاندار طور پر انجام دی، علی گڑھ کالج کے عروج و فروغ میں ان کی بے لوثی، ایثار، اور حب قومی کا بہت بڑا دخل ہے، الہ آباد یونیورسٹی کا مسلم ہوسٹل ان کے تعمیری خدمات کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، حقیقت یہ ہے کہ سمیع اللہ خاں کے خدمات بھلائے نہیں جا سکتے،

حالات و سوانح آپ افضل العلماء محمد حمید اللہ خاں، نواب سربلند جنگ بہادر، ایم اے بیرسٹر ایٹ لا، سابق چیف جسٹس حیدرآباد دکن کے والد ہیں مولوی سمیع اللہ خاں کا مکان بھوں کی منڈی میں ہے، آپ نے بڑے بڑے علما خصوصاً مولانا مملوک علی سے تعلیم پائی، ۱۸۵۶ء میں منصفی کا امتحان دیا، ۱۸۵۹ء میں منصف مقرر ہوئے، ۱۸۶۱ء میں علی گڑھ تبدیل ہوئے ۱۸۶۳ء میں تخفیف میں ہائیکورٹ کے وکیل مقرر ہوئے، ۱۸۷۳ء میں سب جج ہوئے، ۱۸۸۲ء میں لارڈ نارتھ بروک گورنر جنرل اپنے مشن کے ساتھ مصر لے گئے، اس خدمت کے صلہ میں، سی ایم جی کا خطاب ملا، مصر سے واپسی پر رائے بریلی کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج رہے، نومبر ۱۸۹۲ء میں پنشن لے لی، ۱۸۹۳ء میں بمقام شملہ ایک کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں دلی میں ایک عربی کا مدرسہ کھولا، پھر علی گڑھ میں سرسید احمد خاں، اور مولوی صاحب نے جو علی گڑھ میں سب جج تھے اسکول جاری کیا، جو موجودہ ایم اے او کالج مدرسۃ العلوم مسلمانان ہے[۱]۔ ۱۹۰۱ء میں فریضہ حج ادا کیا اور ۱۳۲۶ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے، آپ کی قبر پر یہ کتبہ ہے

به گلگشت جناں تشنه خراماں | سمیع اللہ خاں شاداں و مسرور
به تاریخ وفاتش فکر کردم ــــ! | سروش غیب ناگہ گفت "مغفور"
۱۳۲۶ھ

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص ۵۸۳

(۳)

مولانا ذکاءاللہ

اس نئی پود میں شمس العلماء ذکاءاللہ اپنی قابلیت، ذہانت، اور تعلیمی و تصنیفی خدمات کے اعتبار سے قابلِ رشک خصائص کے حامل ہیں،

مولوی ذکاءاللہ، حافظ ثناءاللہ کے صاحبزادے تھے، منشی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی ضیاءالدین خاں، یہ تینوں ہم جماعت تھے، فن تاریخ اور ریاضی میں علی الخصوص مسلمانوں میں آپ کا جواب نہ تھا، آپ کی تصانیف ایک نہیں، دو نہیں، سیکڑوں ہیں، جتنی ضخیم کتابیں آپ نے تصنیف کیں اور ترجمہ کیں، کسی اور نے نہیں کیں،

مزاج میں بالکل سادگی تھی، اور انکسار اس درجہ کا تھا کہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، پرانی وضع کے پابند تھے، شام کو ٹہلنے ضرور نکلتے تھے، بالکل عالمانہ اور فلسفیانہ طرز تھا، تعصب پاس نہ پھٹکا تھا، چھوٹے بڑے ہر کس و ناکس سے بکشادہ پیشانی ملتے تھے، منشی صاحب نے، نومبر ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا، گو شمس العلماء تھے، مگر کہلائے ہمیشہ منشی —! (۱)

خاندان اور ولادت

منشی ذکاءاللہ ۲۰ راپریل ۱۸۳۲ء کو ایک ایسے مکان میں پیدا ہوئے تھے جو جامع مسجد اور قلعہ معلّٰی کے عین بیچوں بیچ واقع تھا، جس خاندان میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ کئی نسلوں سے تیمور کے شاہی گھرانے کے لیے قابلِ اعتماد اساتذہ مہیا کرتا رہا ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکرؓ سے جا ملتا تھا، جو آنحضرت کے پہلے خلیفہ تھے۔ (۲)

ذکاءاللہ کی ابتدائی زندگی

ذکاءاللہ بچپن میں نہایت ہی حسین تھے اور قلعہ کے اندر مغلیہ دربار کی بیگمات ان سے بہت محبت سے پیش آتی تھیں۔

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیرالدین احمد)

(۲) ذکاءاللہ دہلوی (سی ایف اینڈریوز ص ۸۶)

جب ان کی عمر چھ یا سات برس کی ہوگئی تو ان کے والد جو محل میں شہزادوں اور شہزادیوں کے اتالیق تھے۔ تہواروں اور دوسرے مواقع پر انھیں زرق برق لباس پہنا کر آتش بازی کا تماشا دکھانے لے جاتے اور وہاں وہ بیگمات انھیں تحفے دیتیں۔ جن کی دعوت پر وہ بطور خاص بلائے جاتے۔ مابعد کے سالوں میں ان مواقع کی یاد ان کے دماغ میں پوری طرح محفوظ تھی اور وہ محل کی شاندار روشنیوں کا حال بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے دادا گاہ بہ گاہ اپنے پوتے کی حیرت انگیز ذہنی قابلیت کا اظہار کرتے۔ بیگمات ان کی تعریف کرتیں۔ اور ان کے اسباق کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتیں۔ چھوٹا بچہ نہایت جوش کے عالم میں اپنی ماں کے پاس گھر جاتا اور جو تحفے تحائف ملتے انھیں دکھاتا (۱)

ذہین اور قابل طالب علم

ذکاءاللہ کے بارے میں یہ تو ایک عام بات تھی کہ اپنی جماعت میں وہی اکیلے ہر کسی ایسے سوال کا صحیح حل بتا دیتے تھے۔ جو انھیں دیا جاتا۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے اور مشکل سے سترہ برس کے ہوں گے کہ انھوں نے ریاضی پر اردو میں اپنی پہلی کتاب شائع کر دی۔ دہلی کے لوگ بے حد متعجب تھے اور خوش بھی کہ ایک لڑکے نے ایسا مشکل کام انجام دے دیا، اور پہلا ایڈیشن چار دن میں فروخت ہوگیا، ذکاءاللہ کو کل منافع مل گیا جس کی تعداد تیئیس روپے تھے، جو انھیں اپنی تحریروں کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی اور اس سے انھوں نے اپنی بہن کے لیے سونے کی بالیاں خریدی تھیں۔ (۲)

خوش طبعی

منشی ذکاءاللہ کی ایک نمایاں خصوصیت جس میں ان کی اچھی صحت کو بے حد دخل تھا، یہ تھی کہ وہ ہر وقت خوش و خرم رہتے تھے اور مذاق کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے سرسید احمد نے ایک کتاب میں وفد کے ان مختلف ممبروں کا مزاح آمیز خاکہ کھینچا ہے، جو سرسید کے ساتھ علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے دورہ پر گئے تھے۔ اس خاکہ میں ذکاءاللہ کا نام جیغم (چہ جیغم) بتایا گیا ہے، وہ راستہ بھر ان قومی بھکاریوں کی پارٹی کیساتھ خوش گپیاں کرتے رہے تھے اور اس طریقہ سے چندہ جمع کرنے کے دشوار کام کو آسان بناتے رہتے۔ (۳)

---

(۱) ذکاءاللہ دہلوی (سی الف اینڈریوز) صہ ۹۲

(۲) ذکاءاللہ دہلوی (سی الف اینڈریوز) صہ ۱۰۴

(۳) ذکاءاللہ دہلوی (سی الف اینڈریوز) صہ ۱۹۰

غدر کے زمانہ میں مصیبتوں کا دور

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ذکاءُاللہ کے خاندان کا قدیم مکان اور جائداد اسی علاقہ میں تھی، اس لیے ہزارہا بے گناہ افراد کے ساتھ ان کے بوڑھے والدین اور تمام خاندان کو بے دردی سے باہر نکال دیا گیا انھوں نے ایسے زمانہ میں اپنے آپ کو بے گھر اور بے یار مددگار افلاس اور فاقہ کشی کی حالت میں پایا جب کہ دوسرے افراد کی کثیر تعداد بھی اسی حالت میں تھی، خود شہر کے اندر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں وہ پناہ لے سکتے، اس کے بعد انھیں ایک خوفناک سفر طے کرنا پڑا۔ یعنی بھاگ کر مضافات میں جانا پڑا۔ تاکہ وہاں کسی غیر معین پناہ گاہ کو ڈھونڈیں۔ تمام خاندان نظام الدین کے مقبرہ کی طرف چلا جو دہلی دروازہ کے باہر شہر سے کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ راتوں کو کھلے میدان میں سوتے تھے اور دن میں کسی ٹوٹے پھوٹے مقبرہ میں پناہ لینے کے لیے چلے جاتے تھے۔ ایسی حالت میں کہ انھیں ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ انجام قریب آگیا ہے۔ (۱)

اولاد سے محبت

ایک دن شام کے وقت جب کہ میں انھیں تقریبًا بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر آگیا تھا، مجھے میرے ایک مسلمان شاگرد کے ذریعہ بلایا گیا، جو ان کے مکان کے قریب رہا کرتا تھا اسے میرے پاس یہ اطلاع دینے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ ذکاءاللہ سکرات کی حالت میں ہیں میں فوراً انہیں دیکھنے کے لیے گیا اور جب میں اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ لیٹے ہوئے تھے میں نے انھیں مختصر سی دعائیں اور کلمے بار بار پڑھتے ہوئے سنا جو موت کے وقت بالعموم مسلمان پڑھا کرتے ہیں، اس کے بعد ان پر کامل بے ہوشی اور غفلت طاری ہوگئی اور وہ اس وقت تک رہی جب تک کہ ان کا انتقال نہ ہوگیا،

ان کے آخری الفاظ جو ہوش میں ادا کیے گئے تھے۔ دعاؤں پر مشتمل تھے اور ان کے ساتھ ساتھ الفت و محبت کا ایک لفظ "بیٹا، بیٹا" تھا۔ (۲)

---

(۱) ذکاءاللہ دہلوی (سی الیف اینڈریوز) ص ۱۱۴

(۲) ذکاءاللہ دہلوی (سی الیف اینڈریوز) ص ۱۸۳

(۴)

مولانا عبدالحق خیرآبادی

مولانا عبدالحق خیرآبادی، اپنے یگانہ علم وفضل اور منطق وفلسفہ میں بے نظیر قابلیت اور مہارت کے باعث، سارے ہندوستان میں بلند ترین منصب پر فائز تھے، انھوں نے، اپنی زندگی سے یہ بات ثابت کردی کہ، دولت علم کے مقابلہ میں دولت دنیا ہیچ ہے۔

مولانا عبدالحق مولانا فضل الحق کے فرزند اکبر تھے ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے والد سے تحصیل علوم کی ۱۶ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کرکے درس وتدریس مشغول ہوگئے کچھ دنوں ٹونک میں رہے پھر نواب کلب علی خان نے رام پور بلالیا اور اپنے پوتے حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۵ء سے ۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت رام پور میں رہے، نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کے افسر رہے شمس العلماء کا خطاب پایا وہاں سے ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء میں نواب حامد علی خاں نے رامپور بلالیا اور خود تلمذ اختیار کیا یہاں سے بیمار ہوکر وطن خیرآباد گئے اور ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے زمانہ میں امام فلسفہ تھے، آپ کے شاگردوں میں متعدد نامور علماء نکلے مولانا نے ۴۰ کے قریب کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے ایک کتاب زبدۃ الحکمۃ اردو میں لکھی یہ منطق کی قدیم کتابوں میں ہے اور ایک کامل فن کے قلم سے نکلی ہے اس سے پہلے منطق کی ایک اور کتاب کا پتہ چلتا ہے یعنی ترجمہ شمسیہ مرتبہ سید محمد مطبوعہ دہلی ۱۸۴۴ء لیکن وہ ترجمہ ہے اور اب نایاب ہے مولوی عبدالحق کی کتاب کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ مولوی نذیر احمد دہلوی نے بھی منطق میں ایک کتاب "مبادی الحکمۃ" کے نام سے لکھی ہے اسی زمانہ میں اور لوگوں نے بھی منطق کے رسالہ لکھے ہیں۔

زبدۃ الحکمۃ میں مولوی عبدالحق صاحب نے علمائے سابق کا اختلاف اور اس پر اپنا محاکمہ بھی لکھا ہے مختصر نمونہ یہ ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ علم دو قسم پر ہے ایک تصور دوسر اتصدیق اس واسطے کہ جو چیز جانی جاوے۔

بغیر حکم کے یعنی اثبات یا نفی اس کے ساتھ نہ ہو بلکہ صرف معنی اور مفہوم اس چیز کا ذہن میں حاصل ہو اس کو تصور کہتے ہیں جیسا کہ ادراک زید کا یا قائم کا بغیر اس کے کہ حکم کیا جائے زید پر ساتھ قائم کے اور اگر جانی جاوے اس طور پر کہ حکم ہو اس پر اثبات یا نفی کا اس کو تصدیق کہتے ہیں جیسے ماننا زید قائم کے معنی کا اور یقین کرنا اس کا، اور تصدیق کی حقیقت میں اختلاف ہے حکماء کے نزدیک تصدیق صرف حکم کا نام ہے اور تصور موضوع محمول کا اور ایسا تصور نسبت حکمیہ کا، اس کی تحقیق کی شرط ہے یہ تصورات اس کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں اس تقدیر پر تصدیق ادراک بسیط کا نام ہے۔ (۱)

کاشانۂ علم و فضل

مولانا عبدالحق کے لیے، مولانا فضل حق نے جو شاندار حویلی تیار کرائی تھی اس کے لیے :- "آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے تقریباً تیس۳۰ سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا دروازے پر ہاتھی جھوم رہے تھے وہ بھی لیلائے حریت پر نچھاور ہو گئے، مولانا حکیم احمد علی صاحب خیر آبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب مولانا عبدالحق خیر آبادی کی دلداری کے پیش نظر ۱۲ فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سند خطاب شمس العلماء بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا، مولانا فرمایا کرتے تھے باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی،

مولانا عبدالحق رامپور میں تھے خیر آباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لیے، اندھیر نگری چوپٹ راج کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی مولانا عبدالحق نے عذرداری وغیرہ کسر شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی بعد میں یار علی نے مصلحتاً یہ دیہات بیچ ڈالے۔ (۲)

---

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) صفحہ ۳۶۰

(۲) باغی ہندوستان صفحہ ۱۸۱

(۵)

ڈپٹی نذیر احمد

"کوچہ نواب مرزا میں جناب خان بہادر شمس العلما، ڈاکٹر مولوی نذیر احمد کا دولت خانہ ہے، جو دہلی کے مشاہیر میں سے تھے ۲۲ جمادی الاوّل ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۶ دسمبر ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے، اصلی وطن بجنور تھا، بچپن سے تحصیل علم کا شوق تھا، پہلے مولوی نصر اللہ خاں جو جوی سے عربی پڑھتے رہے، ۱۸۴۸ء میں دہلی آئے، اور پنجابی کٹرے کی مسجد میں مولوی عبدالخالق کے پاس پڑھتے رہے۔ پھر دلّی کالج میں داخل ہو کر تکمیل علوم کی،

گجرات میں مدرس ہوئے، پھر الٰہ آباد میں سب انسپکٹر مدارس اور کانپور میں تحصیلدار، پھر مدتوں ڈپٹی کلکٹر رہے، اور آخرکار ریاست حیدرآباد میں کمشنر اور بورڈ آف ریونیو کے عہدہ جلیلہ سے پنشن لیکر خانہ نشین ہوئے، اور تیس سال برابر پنشن سے مستفید ہوتے رہے، اور ۵ ا جمادی الاوّل مطابق ۳ مئی ۱۹۱۲ء بروز جمعہ کو اس جہان فانی سے سدھارے،

ملازمت کی حالت میں سب سے پہلے مجموعہ تعزیرات ہند کا ایسا بے نظیر ترجمہ کیا جو آج تک مسلّم و مستند، اور مروّج و معمول ہے، اس کے صلہ میں ایک طلائی گھڑی، اور ڈپٹی کلکٹری ملی، سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ اودھ کے عہد میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، مبادی الحکمت، وغیرہ کتب لکھ کر ہزارہا روپیہ اور ایک بیش قیمت ٹائم پیس گورنمنٹ سے انعام پایا،

خانہ نشینی کے بعد بھی کئی کتابیں مثلاً ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ، وغیرہ لکھیں، پھر اس کو چھوڑ کر دینیات کی طرف متوجہ ہوئے، سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد کلام مجید کا بے نظیر اردو ترجمہ کیا، الحقوق والفرائض کے تین حصے، اجتہاد، یہ سب مذہبی کتابیں لکھیں،

سرسید کے ساتھ لیکچرز دینا شروع کیے، انجمن حمایت اسلام لاہور، مدرسہ طبیہ دہلی، ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے جلسوں میں جاتے اور اپنے پرزور اور لاجواب بیان سے فیض عام پہنچاتے چنانچہ چوالیس (۴۴) لیکچروں کا ضخیم مجموعہ دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔(۱)

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی از بشیر الدین احمد حصہ دوم، ص ۲۶۹

دلّی کالج میں داخلہ

"مولانا مولوی نذیر احمد صاحب ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں آٹھ برس ختم کر کے کالج سے باہر آئے اور اس طرح عالم متعلمی سے نکل کر عالم کاروبار میں قدم رکھ کر کالج کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا۔ (۱)

کالج میں داخلہ کی روداد یوں بیان کرتے ہیں:۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا دلّی کالج میں داخلہ

"ایک روز جو کشمیری دروازہ کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دہلی کالج میں بڑا ہجوم ہے، کالج وہاں تھا جہاں اب گورنمنٹ اسکول ہے، میں بھی بھیڑ میں گھس گیا، معلوم ہوا کہ لڑکوں کا امتحان لینے منشی صدر الدین صاحب آئے ہیں ہم نے کہا چلو ہم بھی دیکھیں، برآمدے میں پہونچا، قد چھوٹا تھا، لوگوں کی ٹانگوں میں سے ہوتا ہوا گھس گھسا کر کمرے کے دروازہ تک پہنچ ہی گیا، دیکھا کہ کمرہ کے بیچ میں میز بچھی ہے اُس کے سامنے کرسی پر مفتی صاحب بیٹھے ہیں، ایک ایک لڑکا آتا ہے، اس سے سوال کرتے ہیں، اور سامنے کاغذ پر کچھ لکھتے جاتے ہیں میز کے دوسرے پہلو کی کرسی پر ایک انگریز بیٹھا ہے یہ مدرسہ کے پرنسپل صاحب تھے ہم تماشہ میں محو تھے کہ صاحب کسی کام کے لیے اُٹھے، چپراسیوں نے راستہ صاف کرنا شروع کیا جو لوگ دروازہ روکے کھڑے تھے کسی طرح پیچھے نہ ہٹتے تھے، چپراسی زبردستی دھکیل رہے تھے، غرض اس دھکا پیل میں میرا تو قلیہ ہوگیا، دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا فرش تھا، اس پر سے میرا پاؤں رپٹا اور میں دھم سے گرا اتنی دیر میں پرنسپل صاحب بھی دروازے تک آگئے تھے انھوں نے جو مجھ کو گرتے دیکھا تو دوڑ کر میری طرف بڑھے مجھے اُٹھا لیا پوچھتے رہے کہ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

ان کی شفقت آمیز باتیں اب تک میرے دل پر نقش فی الحجر ہیں ۔ باتوں ہی باتوں میں پوچھا "میاں صاحب زادے کیا پڑھتے ہو؟" میں نے کہا "معلقات" ان کو بڑا تعجب ہوا پھر پوچھا میں نے پھر وہی جواب دیا، میری عمر پوچھی میں نے کہا "مجھے کیا معلوم"؟ وہ میرا ہاتھ پکڑے بجائے اپنے کام کو

---

(۱) حیات النذیر ص۳۴

جانے کے سیدھا مجھ کو مفتی صاحب کے پاس لے گئے اور کہنے لگے مفتی صاحب! یہ لڑکا کہتا ہے میں "معلّقات" پڑھتا ہوں ذرا دیکھیے تو سہی سچ کہتا ہے یا باتیں بناتا ہے مفتی صاحب نے کہا تو کیا پڑھتا ہے میں نے کہا معلقات کہنے لگے کہاں پڑھتا ہے؟ میں نے کہا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں، پھر کہا معلقات دوں، پڑھے گا؟ میں نے کہا لائیے انھوں نے میز پر سے کتاب اٹھائی میرے ہاتھ میں دی اور کہا یہاں سے پڑھو جس شعر پر انھوں نے انگلی رکھی تھی وہ یہ شعر تھا

میں نے پڑھا، معنی بیان کیے ترکیب پوچھی وہ بیان کی، مفتی صاحب بہت چکرائے پوچھنے لگے تجھ کو کون پڑھاتا ہے؟ میں نے کہا مسجد کے مولوی صاحب، کہا مدرسہ میں پڑھے گا؟ میں نے جواب دیا ضرور پڑھوں گا مفتی صاحب نے قلم اٹھایا کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور پرنسپل کو دے کر کہا اس کو پرسیڈنٹ کے پاس پیش کر دینا، ہم وہاں سے نکل کر اپنے گھر آئے، مولوی صاحب سے کچھ نہ کہا سات آٹھ روز کے بعد کالج کا چپراسی مولوی صاحب کے پاس ایک کاغذ دے گیا اس میں لکھا تھا کہ نذیر احمد کو کالج میں داخل ہونے کی اجازت ہوگئی ہے کل سے آپ اسے کالج میں آنے کی ہدایت کر دیجیے اس کا وظیفہ بھی ہو گیا ہے، چپراسی تو یہ حکم دے کر چلتا بنا، مولوی صاحب نے مجھے بلایا خط دکھایا پوچھا کیا معاملہ ہے میں نے کچھ جواب نہ دیا ذرا سختی کی تو تمام واقعہ بیان کیا وہ بہت خوش ہوئے اور دوسرے روز سے جا کر ہاتھ پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں دے دیا، اس زمانہ میں سیّد احمد خاں فارسی کی جماعت میں، منشی ذکاءاللہ حساب کی جماعت میں اور پیارے لال انگریزی کی جماعت میں پڑھتے تھے۔ میں عربی کی جماعت میں شریک ہوا، ایک تو شوق، دوسرے پڑھانے والے ہوشیار، تیسرے ایک مضمون اور وہ بھی ایسا کہ جس کا بچپن سے شوق تھا، تھوڑے ہی دنوں میں اپنی جماعت والوں کو دبا لیا پرنسپل صاحب کے کمرے کے جو بازو میں جو چھوٹا سا کمرہ ہے اس میں ہماری جماعت تھی دوسرے پہلو میں جو کمرہ ہے اس میں فارسی کی جماعت تھی (۱)

---

(۱) نذیر احمد کی کہانی کچھ اپنی کچھ ان کی زبانی (مرزا فرحت اللہ بیگ)

شادی اور اہلی زندگی

"مولانا صاحب جب پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں رہتے تھے اور مولویوں کے زنان خانوں میں آتے جاتے تھے جب مولانا عبدالقادر کی لڑکی روتی تو مولانا کے حوالے کردی جاتی کہ اس کو گلی میں لے جاکر بہلا لاؤ، مولانا اس کے بہلانے کی کوشش کرتے جب یہ مچلے ہی جاتی تو مولانا جھنجلا کر اٹھی بیٹھا کرتے، نکاح کے بعد اس لڑکی کی خالہ زاد پھوپھی سے جو اس لڑکی کی ہم عمر تھیں معلوم ہوا کہ جب مولانا کا نکاح ہونے لگا تو پھوپی نے سہیلی کے رشتہ سے مولانا کی اہلیہ سے چپکے سے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کس سے تمھارا نکاح ہو رہا ہے؟ انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا مگر پھوپی نے مولانا کا پتہ دیا تو ان کو مولانا کا مارنا بھی یاد آیا اور اپنی پھوپی سے کہا کہ "کیا اب بھی مارا کریں گے" انھوں نے کہا نہیں وہ وقت اور تھا اب تو تمھارے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے۔ (۱)

شادی کی کیفیت

"تاریخ مقرر ہوئی اور مولوی صاحب کے مکان میں وقت مقررہ پر محفل عقد منعقد ہوئی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مولانا کا نکاح مفتی صدر الدین خان صاحب مرحوم نے پڑھایا کہ وہ عمر اور علم اور حکمت تمول عزت کی رو سے دلی بھر میں اول درجے کے شخص تھے گیارہ ہزار کا مہر باندھا گیا اور اس طرح عقد نکاح کی رسم پوری ہوئی۔ (۲)

ذکا اللہ کا ذکر

"مرکے ساری عمر کی تحصیل میں ایک تمغہ نصیب ہوا وہ بھی کورس کی کتاب پر نہیں بلکہ جواب مضمون پر تمغہ غدر میں لُٹ گیا اور اس کا ملنا یاد ہے، مضمون شاید شمس العلما خان بہادر ذکاء اللہ کو یاد ہو گا اول تو ان کا حافظہ ماشاء اللہ قوی ہے دوسرے ہم جماعت ہونے سے طالب علموں میں ایک طرح کا محاسدہ قائم ہو جاتا ہے اور وہ محاسدہ محمود ہے جو شوق کو مشتعل اور مشقت کو ہلکا کرتا ہے تمغہ ملتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے مجھ کو ضرور بری طرح گھورا ہو گا اور اب بھی باوجودیکہ ڈپٹی کمشنر بہادر موجود ہیں بری طرح گھور رہے ہیں۔" (۳)

---

(۱) حیات النذیر ص ۳۸

(۲) حیات النذیر ص ۳۱

(۳) حیات النذیر ص ۳۰

نذیر احمد خطیب کی حیثیت سے

یہ لطائف مطبوعہ لکچرز میں نہیں ملیں گے شمس العلما جو کچھ کہتے تھے وہ برجستہ کہتے تھے اور وہ ہمیشہ چھپا ہوا لکچر پڑھتے تھے اور برائے نام دیکھتے تھے کیونکہ ان کو لکچر حفظ ہوتا تھا اور لطف یہ ہے کہ جن موقعوں پر چیرز دیئے جاتے تھے، مطبوعہ لکچر میں چیرز بھی پہلے سے چھپ جاتے تھے۔ یہ بات دوسرے لکچرار کو نصیب نہیں ہوئی مسٹر مارلین پرنسپل مدرستہ العلوم کا قول تھا کہ نذیر احمد جیسا لکچرار آج یورپ میں بھی نہیں ہے۔(۱)

خودداری

"دہلی کا ایک یہ بھی دستور ہے نئے بیاہوں کو پہلی عید پر سسرال کے کنبے کے لوگ عیدی دیا کرتے ہیں، مولانا کے لیے اس رسم کے مطابق بیس۲۰ یا بائیس۲۲ روپیہ جمع ہوئے اتفاق سے ان دنوں مولانا کے روزمرہ کے کپڑے فرسودہ سے ہو گئے تھے اور عید کے لیے نئے کپڑے بنوانے کی گنجائش نہ تھی تو مولوی عبدالقادر صاحب نے مولانا کی عیدی کے روپے مولانا کی بی بی کے ہاتھ میں دیکر کہلا بھیجا کہ تم عید کے لیے اس روپے سے کپڑے بنوالو۔ مولانا نے کہا ہیں، تو میرے نام سے، لیکن درحقیقت یہ ہیں تمہارے میرے نہیں اس لیے کہ تمہارے تعلق کی وجہ سے مجھے دیئے گئے ہیں تم ان روپوں کو اپنی ضرورت پر خرچ کرو یا کوئی چھوٹا موٹا زیور بنوالو میں ان روپوں کو اپنے کام میں نہیں لا سکتا۔ بی بی نے یہ روپے اپنے والد کو بھی کہہ کر واپس کر دیئے۔ مولوی عبدالقادر صاحب بڑے غصیلے آدمی تھے ناخوش ہو کر کہا کہ "میں عید کے دن بچوں کو اپنے ساتھ عیدگاہ لے جاتا ہوں، نذیر احمد سے کہہ دینا کہ نئے کپڑے کے بدوں اس کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا ہمارے مولانا بھی مولوی عبدالقادر صاحب سے مزاج میں کم نہ تھے ذرا ملاحظہ فرمائیے کیا معقول بات کہلا بھیجی ہے۔

"میں سرے سے عید کی نماز ہی نہیں پڑھوں گا"(۲)

دیانت داری

"پنجابی کٹرہ جسے حکومت دلی نے ریلوے اسٹیشن پر اس طرح قربان کیا کہ آج اس کا نام و نشان تک نہیں میرے آبا و اجداد کا مسکن تھا اور پنجابی کٹرہ کی وہ مسجد جس میں

---

(۲) یادایام (عبدالرزاق) ص ۴۲

(۱) حیات النذیر ص ۴۳

میرے جد امجد مولوی عبدالخالق صاحب حدیث کا درس دیتے تھے، طلباء کا دارالقیام علامہ موصوف تحصیل علوم کی غرض سے اِس مسجد میں داخل ہوئے، اقبال کا ستارہ پیشانی پر چمک رہا تھا مگر افلاس کی مصیبت سر پر ٹوٹ رہی تھی تاہم شوق علم پائے ثبات اکھڑنے نہ دیتا تھا،

ان ہی دنوں میری بڑی پھوپھی کے عقد کی تجویز پیش ہوئی اگلے لوگوں کی باتیں ان ہی لوگوں کو سزاوار تھیں، بڑی بڑی درخواستیں موجود تھیں اور ارمان تھا کہ مولوی زادی کی پالکی دروازہ پر اترے والیں مولانائے مرحوم کی طرف کیا، عزیز و اقارب اور کیا دوست آشنا کسی کا وہم و گمان بھی نہ تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا، امیروں رئیسوں، عالموں، فاضلوں کے ہوتے ساتھی ایک پردیسی طالب علم کو کون پوچھتا، مختصر یہ کہ مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم کے سامنے سب نام پیش کیے گئے، اللہ غنی کس دل گردہ کے لوگ اور کیسے صابر و شاکر بندے تھے، مولوی صاحب مرحوم کیا فرماتے ہیں جس شخص میں یہ تین صفتیں ہوں اس سے نکاح کرو، نماز کا پابند، معاملہ کا اچھا، اور زبان کا سچا امیدواروں میں تو ایک بھی اس کسوٹی پر پورا نہ اترا تلاش کے دائرہ کو وسیع کیا تو نگاہ مولانائے مغفور پر جا کر ٹھٹکی آج مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم اور مولوی نذیر احمد صاحب دونوں اس دنیا میں نہیں مگر مولوی عبدالخالق صاحب مرحوم جیسے جید عالم کی پوتی کا بیاہ لینا جس کے عقد کی شرطیں سخت کٹری ہوں، استاد مرحوم ہی کا کام تھا خدا غریق رحمت کرے میری بڑی پھوپھی کو اس شادی کا ذکر اس طرح فرماتی تھیں کہ جب مسجد میں نکاح ہو چکا تو دولہا کو ہم سب نے بھی دیکھا کرتہ پاجامہ سفید تھا ٹوپی بھی خاصی تھی مگر جوتی کے کنے نکلے ہوئے تھے اماں نے ایک عورت کے ہاتھ چپکے سے ایک روپیہ بھیجا کہ جوتی پہن لو تھوڑی دیر بعد وہی عورت پونے چار آنے واپس لائی اور کہا؟ سوا بارہ آنے کی جوتی آئی ہے۔ (۱)

نذیر احمد کی ذہانت

اُردو زبان پر نذیر احمد کے بڑے احسانات ہیں، انھوں نے اس زبان کو نئے نئے محاورے دیئے، نئی نئی اصطلاحیں دیں، نئے نئے

---

(۱) بزم رفتگاں (علامہ راشد الخیری) صـ۵

نگینہ کی طرح ترشے ترشائے آبدار، اور شاندار الفاظ دیئے، نئی نئی خوشنما اور دل آویز ترکیبیں دیں،

وہ ترجمہ کے امام تھے، انگریزی کم جانتے تھے، لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ کر ڈالا، عربی بڑی اچھی جانتے تھے، ان کا ترجمہ قرآن اپنی مثال آپ ہے، خوش بیانی ہاتھ باندھے سامنے کھڑی رہتی تھی، انھوں نے جو اصلاحی ناول لکھے، وہ مقصدیت سے قطع نظر صرف زبان و بیان اور الفاظ و محاورے کی حیثیت سے بھی بے مثال ہیں،

قانون فوجداری کے ترجمہ میں انھوں نے عربی و فارسی الفاظ کو ترکیب دے کر انگریزی اصطلاحات کے مفہوم کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مترجمین کے الفاظ اور اصطلاحوں میں یہ بات نہ تھی قانونی اصطلاحوں کا ترجمہ اگر صحیح مفہوم کے ساتھ نہ ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ مولی کے چور کو سولی دے دی جائے ذرا سے گھٹاؤ بڑھاؤ میں بڑا فرق پڑجاتا ہے مولانا کی اصطلاحوں کو دیکھنا ہو تو تعزیرات ہند کے مضامین کو دیکھئے ترجمہ تعزیرات کے پہلے اردو ترجمہ میں یہ اصطلاحیں کہاں تھیں ان کو روشناس کرنے والا پہلا شخص فاضل مترجم مولوی نذیر احمد ہے ازالہ حیثیت عرفی۔ استحصال بالجبر استحصال بے جا آسودگی عامہ خلائق۔ آئین جنگی بھک سے اڑجانے والا مادہ۔ بے ٹھپّا کیے ہوئے ٹکڑے، تحقیر اختیار جائز تخویف مجرمانہ تصرف بیجائے مجرمانہ۔ ثبوت جرم سالق۔ جبر مجرمانہ۔ جبری محنت۔ جرائم خلاف ملازی بامسرکار جرائم خلاف وضع فطری۔ حبس دوام بہ عبور دریائے شور۔ حفاظت خود اختیاری خطرناک حربے، خلاف قانون ترک افعال۔ خلاف قانون مابہ الاحتفاظ۔ خیانت مجرمانہ درد جسمانی، سپاہیانہ لباس سیڈلیشن یعنی فساد انگریزی، سرقہ بالجبر کرنے والا۔ طبقہ خلائق عافیت ذاتی۔ عقوبت کرنا۔ غلط فہمی مخش افعال فریب آمیز وثائق۔ قانون مختص الامر قانون مختص المقام۔ قتل انسان مستلزم سزا۔ کاغذ سررشتہ کفالت المال۔ گرم کیا ہوا مادہ مادہ اکال مجرائے آب مجمع خلاف قانون، مرض ساری مزاحمت بے جا مستثنیات عامہ مشترکہ افعال معاہدہ کا نقص مجرمانہ، نشان حرفہ۔ وجہ ثبوت وغیرہ وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں قانونی ادب کا جزو لاینفک ہوگئی ہیں انھیں اصطلاحوں میں ایک اصلاح بھک سے اڑجانے والا مادہ ہے یہ ترجمہ ہے کمبسٹل میٹر کا اس کے ترجمہ میں جتنے بھی مترجمین تھے سب کے سب عاجز تھے اور

سب کے سب بغلیں جھانکتے تھے ہر چند کوشش کرتے تھے لیکن ترجمے کے لیے کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا تھا ہمارے مولانا کے سامنے جب یہ لفظ پیش کیا گیا تو ذرا تامل کر کے مولانا نے فرمایا کہ بھک سے اڑجانے والا مادہ یہ سن کر مترجمین دنگ ہو کر رہ گئے، اس لفظ کا یہی ترجمہ تعزیرات ہند میں رکھا گیا اور اس کو ایسی عام مقبولیت نصیب ہوئی کہ اب تمام اخباروں اور کتابوں میں یہ ترجمہ لکھا جاتا ہے اور جب کبھی کمبسٹبل میٹر خیال میں آتا ہے تو فوراً "بھک سے اڑجانے والا مادہ یاد آجاتا ہے"۔ (۱)

طرز تحریر مولانا کی عبارت بہت صاف اور سادہ ہوتی ہے۔ البتہ کبھی کبھی عربی اور فارسی کے بڑے بڑے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں۔ اور کہیں رنگین عبارت صنائع بدائع سے اور بعض مواقع پر انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتے ہیں۔ جن میں ہمارے نزدیک عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ آزاد کی سی لطافت اور شیرینی ان کے یہاں نہیں ہے، البتہ خاص چیز جو ان کی نثر کا جوہر اعلیٰ ہے۔ وہ ان کا ظریفانہ رنگ ہے جو ان کے ناول، لیکچر اور مضامین میں بدرجہ اتم موجود ہے، ان کی ظرافت بہت ہلکی اور لطیف ہوتی ہے۔ اور اس میں پھکڑ پن مطلق نہیں ہوتا۔ مولانا اپنے تمام معاصرین پر بلحاظ شہرت سبقت لے گئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ قوانین کے تراجم سے وہ پبلک اور گورنمنٹ سے روشناس ہوئے۔ قرآن شریف کے ترجمے سے مسلمانوں میں ان کی شہرت ہوئی، اور ناولوں کی وجہ سے ہر گھر میں ان کا نام پہنچ گیا۔ (۲)

وفات مئی ۱۹۱۲ء کو تیسری رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے، عم مغفور استاد شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب کا جنازہ وسط صحن میں رکھا ہوا ہے، غسل و کفن ہو چکا، صبح کا انتظار اور دفن کی دیر ہے کہ یہ نورانی صورت ہمیشہ ہمیشہ کو پیوند زمین ہو

---

(۱) حیات النذیر، صد ۶۲

(۲) تاریخ ادب اردو (حصہ سوم) رام بابو سکسینہ، صد ۶۱

جائے گی، رات اپنی منزل طے کر رہی ہے آسمان تاروں سے پٹا پڑا ہے اور وہ گھر جس میں ہر وقت شیر دھاڑتا تھا سنسان پڑا ہوا ہے، ہوا کے ٹھنڈے جھونکے کل مَن علیہا فان کے نعرے لگا رہے ہیں اور راشد بدنصیب اس منہ کو تک رہا ہے جس سے پھول جھڑتے تھے اور ان آنکھوں کو دیکھ رہا ہے جن کو ظالم موت ہمیشہ کو بند کر گئی۔ (۱)

---

(۱) بزم رفتگاں (علامہ راشد الخیری) صد۳

(۶)

محمد حسین آزاد

والد کا نام مولوی محمد باقر ہے شیعہ مجتہدین کے خاندان سے تھے غالباً ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے
آزاد کے والد نے ۱۸۳۷ء میں "اردو اخبار" دہلی سے نکالا تھا جو اردو کا پہلا اخبار نہیں تو دہلی کا پہلا اخبار ضرور
تھا ان کے والد کے استاد ذوق دہلوی سے بڑے تعلقات تھے اسی سبب سے آزاد ذوق کے شاگرد ہوئے
اور ان کے ساتھ دہلی کے مشاعروں میں بھی شرکت کی، آزاد کو اپنے استاد سے جیسی محبت تھی اس کی مثال دنیا میں
کم ملتی ہے آزاد نے قدیم دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی جہاں مولوی نذیر احمد مولوی ذکا اللہ ماسٹر پیارے لال
آشوب ان کے رفقائے تعلیم تھے استاد ذوق کے انتقال (۱۸۵۴ء) کے بعد آزاد نے حکیم آغا جان عیش
سے کچھ دنوں فیض سخن حاصل کیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آزاد کے والد بھی گرفتار کر لیے گئے اور دہلی دروازے کے باہر
ایک میدان میں باغیوں کے ساتھ محصور و نظر بند کر دیئے گئے یہ حادثہ آزاد کے لیے کیا کم المناک و جاں گداز
تھا کہ آزاد کو غایت محبت کے سبب سے اس حالت میں والد کی زیارت کا شوق ہوا۔ اس وقت دہلی کی ایسی فضا تھی
کہ باہر چلنا پھرنا بھی خطرناک تھا۔ آخر آزاد کو فوج کے ایک سکھ جرنیل کا خیال آیا جو انکا دوست تھا اسکے پاس گئے اور آرزو بیان کی
اس نے ارادہ سے باز رکھنا چاہا انھوں نے اپنے دل کی تڑپ کا اظہار کیا آخر اس نے کہا کہ تم میرے سائیں
کے حلیہ میں میرے ساتھ چل سکتے ہو اور کوئی تدبیر نہیں، چنانچہ سائیس کے حلیے میں سکھ جرنیل کے گھوڑے
کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس میدان محشر میں پہنچے، جہاں قیدی زندگی کی آخری ساعتیں گزار رہے تھے۔
انہی لوگوں میں ایک طرف ایک مرد خدا عبادت میں مصروف تھا، چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار تھے
یہی آزاد کے شفیق بڈھے باپ تھے جن کی عمر اس وقت ۷۰ سال سے زائد تھی بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی

---

(۱) جنوری ۱۹۱۰ء میں آزاد کا انتقال برس کی عمر میں ہوا اس سے سال ولادت نکالا گیا ہے اور کوئی ذریعہ اطلاع نہ تھا۔

تو تھوڑے فاصلہ پر اپنا پیارا لاڈوں کا پالا جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا یکدم چہرے پر
پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ادھر یہی حالت بیٹے پر گذری دُنیا
آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی جب نظر نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں کہ بس آخری
ملاقات ہوگئی، اب رخصت ہو اور دیرینہ کرد اس اشارے کے بعد انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے،
آزاد نے اس وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ ہوسکا وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے اور اس وقت تک
اُس وفادار جرنیل کی حفاظت میں رہے جب تک شاہجہان آباد کی یہ مظلوم روحیں قفس عنصری میں قید رہیں[1]
جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تو آزاد اسی سکھ جرنیل کی مدد سے باہر نکلے بغل
میں استاد ذوق کی نظموں کا بستہ تھا جس کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، جب غدر کی دار وگیر سے کچھ امن
کی صورت نظر آئی تو آزاد مع اہل وعیال لکھنؤ چلے گئے ۔

غدر

دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا، کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا، چنانچہ خلیفہ محمد اسماعیل شیخ (ذوق) کے
فرزند جسمانی بھی رحلت کر گئے، میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس آئے
اور بندوقیں اٹھا کر کہا جلد یہاں سے نکلو، دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی، بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا
تھا، کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں؟ ان کی غزلوں کی جُنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین اگر خدا نے
کرم کیا، اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے؟ جو یہ غزلیں پھر آکر
لکھیں گے؟ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پہ منحصر رہے، یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں، یہ
گئیں تو نام کبھی نہ رہے گا، وہی جُنگ اٹھا بغل میں مار، سجے سجائے گھر کو چھوڑ بائیس[22] نیم جانوں کے ساتھ
گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا۔ کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے، دلی بھی ایک

---

(۱) یہ کیفیت بلکہ آخری سطریں (جو علامات اقتباس سے محدود ہیں) تقریباً بجنسہٖ رسالہ کتابی دنیا (شائع کردہ کتاب گھر دہلی) کے ایک مضمون سے لی گئی ہیں اس رسالہ میں آزاد کے مکمل سوانح حیات شائع ہوئے ہیں جو کتاب ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ
شائع ہوئی ہے اب تک آزاد کے مفصل حالات کہیں نہ ملتے تھے ۔

بہشت سے ہے، انہی کا پوتا ہوں، دلّی سے کیوں نہ نکلوں؟ (۱)

ادبی خدمات

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد، کو جدید رنگ کا بانی اور ادب اردو کا مجدّد سمجھنا بالکل بجا ہے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب، بہت مشہور نثّار، نامی گرامی نقّادِ فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر، اور ایک مشہور معروف اخبار نویس تھے، ان کمالات کے علاوہ جدید فارسی کے استادِ کامل اور فلالوجی کے بھی بڑے ماہر تھے۔ ان کی خدمات اور احسانات زبان اردو پر بے حد ہیں، اردو شاعری میں اسی رنگ کا بانی اور اس میں ایک نئی روح پھونکنے والا، اگر کوئی فی الحقیقت کہا جا سکتا ہے۔ تو وہ مولانا کی ذات ہے، وہ صحیح معنوں میں ادیب تھے ان کے کچھ مختصر حالات آئندہ نثر میں بھی بیان کیے جائیں گے، جس سے ان کا حقیقی تعلق ہے، یہاں ان کی شعر و شاعری کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ (۲)

آزاد کی شاعری

آزاد فطری شاعر تھے۔ اور ازل سے شاعرانہ طبیعت لائے تھے۔ ان کی نثر بھی اس قدر دلچسپ اور شاعرانہ تخیل رکھتی ہے کہ کسی طرح شعر سے کم نہیں ہے۔ ان کے والد چونکہ استاد ذوق کے دوست تھے، اور ان کی صحبت میں بیٹھتے اٹھتے تھے لہٰذا آزاد بھی اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ استاد کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوتے تھے، ان ہی کی معیت میں دلّی کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ جہاں مشہور استادانِ فن سے شناسائی کے علاوہ ان کے کلام کے حسن و قبح سے بھی بخوبی واقف ہوتے جاتے تھے۔ استاد ذوق سے نوجوان آزاد کو بڑی عقیدت تھی اور ان ہی کے فیضِ صحبت اور حسن تربیت کا یہ اثر ہوا کہ آزاد کے دل میں جذبۂ شاعری پیدا ہو گیا۔ دلّی کی آخری عظمت اور شان کی یاد دلانے والی صحبتیں گرم تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا اور فلک تفرقہ پرداز نے ان مجلسوں کو منتشر کر دیا اب لوگ

---

(۱) آبِ حیات (محمد حسین آزاد)

(۲) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) ص ۱۷۴

ادھر ادھر تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے، چونکہ لاہور دہلی سے قریب تھا اس لیے اکثر وہاں کے تباہ حال لوگ لاہور چلے گئے۔ ان ہی میں آزاد، رائے بہادر پیارے لال، پنڈت من پھول، میر منشی، مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ۔ مولوی کریم الدین اور حالی تھے، جن کو تقدیر نے ایک جگہ جمع کر دیا تھا حسن اتفاق سے پنجاب میں اس وقت کرنیل ہالرائیڈ ڈائرکٹر تعلیمات تھے جو علاوہ زبان فارسی اور اردو پر عبور رکھنے کے زبان اردو کی توسیع و ترقی کا دل سے خیال رکھتے تھے، ان ہی کی ایما سے مولانا آزاد نے ایک ادبی انجمن انجمن پنجاب کے نام سے لاہور میں قائم کی جسکے جلسے اسی انجمن کے مکان میں ماہوار ہوا کرتے تھے، اس انجمن کے قیام کی خاص غرض یہ تھی کہ اردو شاعری میں جو مبالغہ کے طوفان اور تشبیہ و استعارہ کے انبار ہیں وہ سب نکال دیئے جائیں، نیز یہ کہ مشاعروں میں جو طریقہ مصرع طرح دینے کا مروّج ہے وہ موقوف کیا جائے اور بجائے اس کے شعرا خاص خاص مضامین وعنوان پر طبع آزمائی کیا کریں۔ قبل اس کے اس قسم کے مشاعرے شروع ہوں مولانا نے انجمن کے جلسوں میں اپنے فاضلانہ لیکچر اور دلچسپ نظموں سے لوگوں کو تیار و آمادہ کر دیا اور دکھا دیا کہ یہ جدید رنگ عنقریب مقبول ہو جائے گا، اور حقیقی شاعری کیا چیز ہے، اس کی ضروریات بتائیں اور وہ خرابیاں بھی بیان کیں، جو بالفعل پرانے رنگ کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مئی ۱۸۷۴ء میں جو اڈریس انجمن کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے پڑھا تھا، اس میں اردو شاعری کے عیوب تکرار مضامین، غلو و مبالغہ، فضول تشبیہات اور استعارات، اس کا تصنع اور خلاف فطرت رنگ، غرضیکہ جو جو عیوب موجودہ شاعری میں پائے جاتے ہیں، وہ سب بوضاحت بیان کر دیئے، اور صاف صاف کہدیا کہ اگر اردو شاعری کی بقا منظور ہے تو ہم کو چاہیے کہ عشق و عاشقی کے پرانے ڈھکوسلے ترک کریں، اور عروس شاعری کو تیرہ و تار حجروں سے نکال کر زمانہ موجودہ کی روشنی میں لائیں۔ شاعروں سے کہا گیا کہ پرانے مضامین ترک کرو، سادگی، اظہار اصلیت، درد و اثر بھاشا سے اور صاف بیانی فائدہ رسانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے سیکھو۔

تصانیف منظوم آزاد نے جو کچھ زبان سے کہا اس پر خود عمل بھی کیا، انھوں نے اسی نئے رنگ میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور نظمیں لکھیں، اور یہ بیان ہو چکا ہے کہ استاد ذوق کی محبت

نے ان کے دل میں شاعری کا شوق اور جذبہ پیدا کر دیا تھا، استاد کی وفات کے بعد وہ حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگے۔ اور اپنا کلام دلی کے مشاعروں میں سنانے لگے، کہا جاتا ہے کہ ان کا اس زمانے کا سارا کلام غدر میں ضائع ہو گیا، غدر کے بعد ان کو ریاست جیند میں ایک جگہ مل گئی تھی، جہاں وہ مشق نظم کرتے اور سلام، رباعیاں، مرثیے، غزلیں اور قصیدے وغیرہ سب کچھ کہتے رہے، اس زمانہ کا کچھ کلام ان کے بیٹے مولوی محمد ابراہیم نے ۱۸۹۹ء میں نظم آزاد کے نام سے شائع کیا تھا۔ لاہور میں ۱۸۷۴ء میں اس مشاعرے کی بنیاد پڑی تھی، جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اسی میں انھوں نے اپنی وہ دلچسپ نئے رنگ کی نظم پڑھی تھی، جو مثنوی شب قدر کے نام سے مشہور ہے، اور جس میں رات کی آمد اور شام کی کیفیت کا ذکر ہے، پرانے خیال کے لوگوں نے اس جدت کی بڑی مخالفت کی، جس سے نئی امنگوں پر تو کوئی اثر نہ پڑا مگر یہ ضرور ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ مشاعرے کے بند ہو جانے پر بھی مولانا اپنی کوششوں سے باز نہ آئے، اور کچھ نہ کچھ اس رنگ میں کہتے رہے، کبھی کبھی وہ اردو نظمیں انگریزی نظموں کے طرز پر کہتے تھے، جن میں سے کسی انگریزی چیز کا ترجمہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انگریزی خیالات کو اردو سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ مثلاً ان کی نظم اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں۔ انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظم "اکسلسیر" کے انداز پر ہے۔ مگر اس کا ترجمہ ہرگز نہیں ہے۔ اسی رنگ کی دوسری نظمیں حسب ذیل ہیں، مثنوی شرافت حقیقی، معرفت الٰہی، سلام علیک، محنت کرو۔ یہ سب نظمیں مجموعہ نظم آزاد میں موجود ہیں،

آزاد کا قدیم و جدید رنگ

قبل اس جدید رنگ اختیار کرنے کے آزاد اسی پرانے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجموعہ نظم آزاد کے آخر میں، ان کے پرانے رنگ کی غزلیں اور قصائد موجود ہیں۔ جن میں کچھ کچھ اشعار دلچسپ، صوفیانہ اور اچھے بھی نکل آتے ہیں۔ اسی کو ان کے آئندہ رنگ کا سنگ بنیاد تصور کرنا چاہیے۔ جدید طرز کی مثنویاں حسب ذیل ہیں۔

مثنوی شب قدر ان کا شاہکار ہے، اور اس میں مختلف لوگوں کے اشغال۔ شب کے وقت کے نہایت عمدگی اور رنگ آمیزی سے بیان کیے ہیں، طالبعلم، مہاجن، اور چور کی کیفیت علی الخصوص پڑھنے کے قابل ہیں۔ (۱)

(۱) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) صفحہ ۴۲۰

جنون اور وفات

وفات سے چند سال پہلے آزاد جنون کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی حالت میں ایک مرتبہ دلی کی طرف پیدل روانہ ہو گئے، دلّی پہنچے مگر عجیب شان سے پہنچے، سر سے پگڑی غائب، پیر میں جوتا ندارد، حال پریشان، آناً فاناً میں تمام دلی میں شور مچ گیا، رشتہ دار منت سماجت کرتے کہ برائے خدا گھر چلیے مگر یہاں کون سنتا تھا کبھی قدم شریف کبھی استاد ذوق کی قبر کبھی شہر کبھی جنگل جہاں مستوں کا من کہتا وہیں جاتے اور دن گزارتے آخر دلی سے خبر آئی تو والد ماجد مرحوم دہلی گئے ڈھونڈا بہت کچھ سمجھایا مگر ایک نہ مانی، اس عرصے میں وہ جذبہ سکون کی طرف مائل ہو چلا تھا ان کے بچپن کے دوست شمس العلماء ذکاء اللہ صاحب مرحوم منا پر جا کر اپنے دولت خانہ پر لے آئے تقریباً ایک سال تک مہمان رکھا اور وہ ناز برداریاں کیں کہ اس زمانہ کی دوستی اور محبت ان پر قربان ہے خود اور سارا گھر حکم کے پابند تھے اس عرصے میں طبیعت نے بہت کچھ قرار پکڑ لیا اور سید دصیان شاہ والی کیفیت ہو گئی کبھی سالک کبھی مجذوب،

پردہ رخسار صنم

خمخانہ جاوید (تذکرہ شعرا) میں علامہ آزاد کی اس کیفیت کے ذکر میں لکھا ہے :۔

رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب فرماتے ہیں کہ جنون کے شروع میں ایک دن آزاد مجھ سے ملنے آئے اور تقریباً دو ڈھائی گھنٹے باتیں کرتے رہے مگر ان الفاظ کے بجز اور کچھ زبان پر نہیں لائے کہ ماسٹر صاحب آپ اس شعر کو پڑھا کیجیے اور اس کے معنی جو آپ چاہیں سمجھیں،

پردہ در کعبہ سے اٹھا دینا ہے آسان
پر پردہ رخسار صنم اٹھ نہیں سکتا

آخر کچھ عرصہ بعد انتقال ہو گیا۔

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) صہ ۴۱۲

(۷)

خواجہ الطاف حسین حالی

اتفاق سے مولانا حالی کے حالات ان کے قلم کے لکھے ہوئے موجود ہیں، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے ۱۹۰۱ء میں خواجہ صاحب سے فرمائش کی تھی اس کی تعمیل میں یہ حالات لکھے گئے ہیں، اس تحریر کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر واقع ایک قدیم بستی ہے اس میں کم و بیش سات سو برس سے انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے چلی آتی ہے،

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا اور میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا انھوں نے قرآن حفظ کرایا اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا لیکن باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہ ملا ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے بوجہ تعلق زناشوی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ و طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی پھر عربی کا شوق ہوگیا انھیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لیکر آئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھی مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود تھے سب کی خواہش

تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکہ آسودہ حال تھا

دلی کا سفر

میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ قدیم دہلی کالج اس وقت خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں علم صرف عربی اور فارسی پر منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خیال کر بلکہ پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اس کی نسبت لوگوں کا خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ذریعہ ہے نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علماء مجہلے[1] کہتے تھے دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھے شب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا پڑا کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

شوق مطالعہ

میں نے دلی میں شرح سلم ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب رشتہ داروں اور بزرگوں کے جبر سے ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے دلی سے آ کر ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا یہاں بطور خود بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا

۱۸۵۶ء میں مجھے حصار میں قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذرے اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمن مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور

---

(۱) [illegible]

نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور ان میں سے جو کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا خاصکر علم و ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم اور نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اس قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

غالب سے تعلقات

جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کرتے تھے مگر میں نے ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھلائی تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے مگر اس زمانہ میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

فکر معاش

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفےٰ خان مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیرآباد ضلع بلند شہر جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو کے شاعر تھے اس کی نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھلایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا انھیں کے ساتھ میں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے

مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے، نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا،

"آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے"

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا ان کے خیالات کا اثر مجھ پہ کبھی پڑنے لگا، نواب شیفتہ کی وفات کے بعد "پنجاب گورنمنٹ بکڈپو" میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس پر مجھے یہ کام کرنا ہوتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

لاہور ہی میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادہ کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم کریں، میں نے اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر، دوسری امید پر، تیسری رحم و انصاف پر، اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

تصنیف و تالیف

نظم کے سوا نثر میں چند کتابیں لکھی ہیں سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب تریاق مسموم نیڈو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا، لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا چنانچہ ڈاکٹر

لائٹنر کے زمانہ میں یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیالوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے، لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرائے میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائیڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی جناب لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو، پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، پھر شاعری پر ایک مبسوط "ایسے" (مضمون) بطور مقدمہ کے دیوان کے ساتھ شائع ہوا اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے اور اب سر سید احمد مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے امید ہے کہ مارچ یا اپریل تک شائع ہو جائے گی اس کے علاوہ اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں۔ جو چنداں قابل ذکر نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب اخلاق علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم، میری نظم و نثر میں موجود ہیں جو ہنوز شائع نہیں ہوئے جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی میری سب سے آخیر فارسی نظم وہ ترکیب بندھے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا اور اردو میں سب سے آخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپریس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوئی۔

حیدر آباد سے امداد ۱۳۰۵ھ ہجری میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظہ کے لیے سر سید احمد خان مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ

۷۵ روپیہ ماہوار میرے لیے مقرر فرما دیا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا اس وظیفہ میں ۲۵ روپیہ ماہوار کا اضافہ کر کے ۱۰۰ روپیہ سکہ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے۔ اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔ (۱)

مولانا حالی کی ظرافت

ماسٹر شہاب الدین مرحوم کے مزاج میں جس قدر ظرافت تھی، مولانا حالی مغفور کے مزاج میں اسی قدر سنجیدگی تھی۔ شاید طور جماعت کا ذکر ہے، مولانا حالی کا گھنٹہ تھا اور غالباً شاہنامہ کا سبق ہر طالب علم ایک ایک سطر پڑھ رہا تھا۔ بے چارہ زنگ کا رہنے والا تھا، سیدھا سادہ غریب طالب علم جس کو ہنسنے کی تمیز نہ رونے کی جماعت میں شریک تھا اس کے حصے میں جو سطر آ رہی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا۔ سر تیغ بی داشت

سر کا س چھوٹا تھا اور نیچے کی سطر کا کوئی لفظ ایسا تھا جس کے نقطے سر کے نیچے تھے اور س پر پ کا شبہ تھا، قاری سرفراز حسین اس منگل طالب علم کے برابر بیٹھے تھے اس سے وہ فقرہ نہ چلا اور چپکے سے ان سے پوچھا، کہ کیا ہے۔ مرحوم قاری عجیب صفت کے آدمی تھے، بکو بتایا پیر تیج بمنہ اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ منہ کی "ی" نہیں بولتی "پیر تیج بمنہ"

وہ غریب اسی طرح پڑھ گیا، مولانا نے اس کی صورت دیکھی اور کہا کہ پھر تو فرمایئے، وہ منگل بچارے نے پھر پڑھا۔ پیر پیچ بمنہ۔ مسکراہٹ تو مولانا کو بھی آئی مگر ضبط فرمایا، اور حسب عادت کہنے لگے

"ہا کم بخت، پھٹے سے منہ، لعنت خدا کی۔"

"یہ ملحوظ رہے کہ بمنہ کبوتر کی ایک قسم ہے"

معاً مولانا کا ذہن قاری مرحوم کی طرف جو برابر تشریف فرما تھے منتقل ہوا اور فرمانے لگے یہ جناب کی عنایت ہے، یہ بدبخت کیا جانے کہ بمنہ کسے کہتے ہیں کھڑے ہو جایئے۔

---

(۱) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) ص ۵۶۵

(۸)

مولوی سیّد احمد دہلوی
مولف فرہنگ آصفیہ

۸ رجنوری ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۲ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے، والد کا نام حافظ سیّد عبدالرحمٰن ہے رسمی تعلیم مختلف مشہور اساتذہ سے اور پھر نارمل اسکول دہلی میں حاصل کی ابتداء سے تصنیف و تالیف کا شوق ہے طالب علمی کے زمانہ میں ایک طویل فارسی نظم "طفلی نامہ" لکھی تھی پھر خط و کتابت کی تعلیم کے لیے انشائے تقویۃ الصبیان لکھی جس میں اُردو تلازمہ و ضلع قائم رکھا گیا تھا یہ رسالہ ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا اسی زمانے میں ان کو ایسی عظیم الشان لغت فرہنگ آصفیہ کی تالیف کا خیال پیدا ہوا اور اس کی تیاری شروع کی ۱۸۶۹ء میں انھوں نے مناظرہ تقدیر و تدبیر "کنز الفوائد" کے نام سے شائع کی، اس پر سرکار نے ڈیڑھ سو روپیہ انعام دیا،

مہاراجہ الور کا سفر نامہ اس زمانے میں مسٹر فیلن (انسپکٹر مدارس صوبہ بہار) اپنی مشہور اردو لغت مرتب کر رہے تھے انھوں نے اس تالیف کی اعانت کے لیے مولوی سید احمد کو بلایا، یہ سات برس دانا پور رہے ان کی کتاب کو مکمل کیا اس کے ساتھ ہی اپنا کام بھی کرتے رہے یعنی وہاں سے انشائے ہادی النساء شائع کی اور فرہنگ آصفیہ کا کام بھی جاری رکھا، ۱۸۸۰ء میں فیلن صاحب کا کام تکمیل کو پہنچا تو اسی وقت مہاراجہ الور نے اپنا سفرنامہ مرتب کرنے کے لیے طلب کر لیا، چھ مہینے میں وہ کام پورا کیا اور معقول تنخواہ اور انعام لے کر واپس آ گئے، اس کے بعد گورنمنٹ بک ڈپو میں نائب مترجم ہو کر چلے گئے،

سرکار سے خطاب مولوی سید احمد نے دہلی و شملہ کے سکولوں میں سرکاری ملازمت کی اور پنشن پائی، گورنمنٹ نے خان صاحب کا خطاب دیا، پنجاب یونیورسٹی کے فیلو اور ممتحن بھی رہے، ۱۹۰۵ء میں جب پرنس آف ویلز دہلی تشریف لائے تو مولوی صاحب نے

ایک نظم خیر مقدم اور اپنی ایک تالیف "رسوم دہلی" پیش کی ۱۹۱۱ء کے دربار تاجپوشی کے زمانہ میں مولوی صاحب کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا نام دربار احمد رکھا ایک بار اُن کے مکان میں آگ لگی اور تمام کتب خانہ اور فرہنگ آصفیہ کی جلدیں نذر آتش ہوگئیں، دولت آصفیہ نے اس موقعہ پہ دست فیض بڑھایا اور اُسی شاہانہ امداد سے کتاب دوبارہ شائع ہوئی مولوی صاحب نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔

فرہنگ آصفیہ اس کا نام سب سے آخر میں لیا گیا ہے لیکن اہتمام و عزت میں سب پر مقدم ہے مولوی صاحب اپنے نام سے زیادہ اس کتاب کے نام سے "مولف فرہنگ آصفیہ" مشہور ہیں، ۱۸۶۸ء سے اس کی ترتیب شروع کی اور ۱۸۷۸ء میں ارمغان دہلی کے نام سے بطور نمونہ شائع کی لیکن تکمیل جاری رہی، ۲۴ سال کی محنت کے بعد ۱۸۹۲ء میں تکمیل کو پہنچی مولوی صاحب کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا کہ اس قدر ضخیم کتاب کو شائع کر سکیں، اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں جب وہ شملہ کے اسکول میں مدرّس تھے، سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدرآباد شملہ آئے مولوی صاحب نے حاضر ہو کر اپنی تالیف کا مسودہ پیش کیا وہ اس کو ساتھ لے گئے مولوی سید علی بلگرامی کو دکھلایا انھوں نے بہت پسند کیا اور منظوری کی سفارش کی چنانچہ دربار دکن سے انعام کا وعدہ کیا گیا ۱۸۹۲ء میں بعد تکمیل فرہنگ آصفیہ نام رکھا گیا دولت آصفیہ سے پانچ ہزار روپیہ انعام ملا اور پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا، گورنمنٹ پنجاب نے پانچسو روپیہ انعام دیا اور ایک ہزار روپیہ کی کتابیں خریدیں۔

فرہنگ آصفیہ کی قدر و قیمت لغات اردو کی آغاز تالیف سے تقریباً دو سو برس بعد فرہنگ آصفیہ مرتب ہوئی ہے لیکن اس سے پہلے اس سے زیادہ ضخیم، مکمل اور مستند فرہنگ اُردو میں موجود نہ تھی، مولوی سید احمد صاحب نے چار جلدوں میں ۵۵ ہزار الفاظ و محاورات تحقیق و تشریح سند و حوالہ کے ساتھ درج کیے ہیں۔ اب اگر اس میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی واقع ہوگئیں تو ایسی فرو گذاشتوں سے کوئی اور لغت بھی خالی نہیں ہے، نور اللغات فرہنگ سے ۲۵ سال بعد شائع ہوئی اس میں بھی صرفی و لسانی تحقیقی و استنادی غلطیاں بہت ہیں بہر حال تقدیم تکمیل کی فضیلت مولوی سید احمد صاحب کو حاصل ہے افسوس کہ یہ کتاب اب نایاب ہے صرف پہلی اور

دوسری جلد ملتی ہے،

نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ

مولوی سید احمد صاحب نے فرہنگ آصفیہ کے دیباچہ میں لکھا ہے "مولف نور اللغات نے بھی فرہنگ کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگ آصفیہ میں لفظ (بات) اور اس کے متعلقات کی ہوبہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی ہے۔"

یہ بڑا سخت اعتراض ہے حضرت امیر مینائی اور مولوی نور الحسن نیر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہوبہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں ہمارے سامنے فرہنگ آصفیہ۔ امیر اللغات۔ نور اللغات تینوں موجود ہیں اور ہم نے لفظ (آنکھ) اور (بات) کو پڑھا ہے بات یہ ہے کہ الفاظ محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا مولف کا کارنامہ ہوتا ہے لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مولف کی ملکیت ہوتے ہیں ان کی ہوبہو نقل بے شک سرقہ اور قابل الزام ہے،

مولوی سید احمد کی اس فضیلت میں شک نہیں کہ انھوں نے اردو کی سب سے بڑی اور مکمل لغت سب سے پہلے مرتب کی اور ۱۸۷۸ء میں ارمغان دہلی شائع کی منشی امیر احمد مینائی کو "امیر اللغات" کا خیال بعد کو آیا اور انھوں نے ۱۸۸۴ء میں لفظ (آنکھ) کا نمونہ مرتب کیا۔ امیر مینائی کے سامنے فرہنگ کا نمونہ موجود تھا یقیناً اس سے استفادہ کیا لیکن اس کی ہوبہو نقل نہیں کی بلکہ سید صاحب کی لغات کو خود جانچا، غیر ضروری اندراجات کو ترک کیا ضروری محاورے جو رہ گئے تھے ان کا اضافہ کیا سند کے اشعار الگ کر کے لکھے،

سید احمد کا طرز تحریر

مولوی صاحب نے دو درجن کتابیں مختلف عنوانوں اور موضوعوں پر لکھی ہیں ان میں دو چیزیں نہایت نمایاں ہیں۔ ایک عورتوں کی تعلیم و تربیت دوسرے زبان اردو اور محاورہ دہلی کی اشاعت اہل دہلی کو ایک تو اپنی زبان سے فطری گرویدگی تھی دوسرے ہر تصنیف میں اس کی اشاعت کا شوق تیسرے اس کے تحفظ و حمایت کی ضرورت لکھنؤ اور پنجاب

کی طرف سے دہلی کی مرکزیت پر حملے ہو رہے تھے اور دہلی والے لکھنؤ کی بولی کو بھی ٹکسال باہر سمجھتے تھے اس لیے دہلی کے ادبی مصنفین نے اپنی کتابوں اور مقالوں میں مقامی بول چال اور محاورے کثرت سے استعمال کیے جن لوگوں نے علوم فنون کی کتابیں لکھیں۔ انھوں نے موضوع و مضمون کے مطابق زبان اختیار کی،

ڈپٹی نذیر احمد کی زبان و اسلوب کا ذکر آ چکا ہے ان کے ہم عصروں میں میر ناصر علی خاں نے کم اور مولوی سید احمد اور میر ناصر نذیر فراق نے زیادہ دہلی کا روزمرّہ لکھا۔ پھر آغا شاعر اور راشد الخیری نے اسی پر اپنی تحریر کی بنیاد رکھی، راشد الخیری نے ایک اسلوب خاص ایجاد کر کے اپنا انفرادی رنگ پیدا کر لیا۔

ان کی تحریروں کے دو ایک نمونے پیش کیے جاتے ہیں فرہنگ آصفیہ کے مندرجہ لغات کے متعلق دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"تذکیر و تانیث کی تمیز اہل دہلی و لکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے زبانوں کا فرق اور ان کی اصلیت کا پتہ اس سے لگتا ہے عام محاورے اس میں درج ہیں۔ خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والوں کی آوازیں اس میں دیکھ لو، دل لگی اس میں ہے ظرافت اس میں ہے۔ بعض بعض موقعوں پر جواریوں ٹھگوں دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں مختلف پیشہ وروں کے وہ ملتے جلتے روزمرّہ جس کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکا کھاتا ہے بہ ترتیب حروف اس کتاب میں شامل ہیں۔ جو لفظ جس درجہ کے آدمی میں مروج ہے وہ انھیں کے نام سے لکھا گیا ہے۔ عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا ہاں اگر چھوڑا ہے تو معلّقات اور فحش چھوڑا ہے۔

قصّہ مختصر ہم نے نہ عیب چینیوں کا خوف کیا نہ خردہ بینوں کی پروا جیسی بری یا بھلی اپنی پیاری مادری زبان کی خدمت بن پڑی نذر کر دی آئندہ جو اس کام کے اہل اور سچے ہوا خواہ ہوں گے وہ ترقی دے لیں گے۔

قطعہ

اے اہلِ خیر کچھ تو ادھر بھی کرم کرو | کب سے دعائے خیر کے امیدوار ہم
جو کچھ سنا کسی سے وہی چھوڑا ابھر دیا | اپنی لغات چھوڑ چلے یادگار ہم (۱)

سیّد احمد پر تبصرہ مولوی سید احمد دہلوی اپنی مشہور و معروف لغت فرہنگ آصفیہ کے مصنّف ہونے کی حیثیت میں اُردو داں طبقے میں کافی شہرت رکھتے ہیں، دلّی میں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے، باپ کا نام حافظ عبدالرحمان تھا جو مستند سادات تھے اور ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مولوی صاحب کی ابتدائی تعلیم رواج کے مطابق دیسی مکتبوں میں ہوئی، جب کچھ حرف شناس ہوگئے تو سرکاری اسکول اور نارمل اسکول میں تحصیل علم کی، اس کے بعد اپنی فطری طباعی اور مشاہیر اہلِ علم کی صحبت سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا، چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک چھوٹی سی نظم طفلی نامہ کے نام سے اور ایک انشا کی کتاب تقویۃ الصبیان لکھ ڈالی، ۱۸۶۹ء میں ان کی کتاب کنز الفوائد نکلی جس پر سرکار سے دو سو روپیہ انعام ملا، ۱۸۶۸ء سے انھوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فرہنگ آصفیہ شروع کی، ۱۸۷۰ء میں ان کی دوسری کتاب وقائع درّوبیہ شائع ہوئی جس پر ان کو ڈیڑھ ہزار روپیہ انعام ملا۔ اس رقم سے ان کی فرہنگ آصفیہ کی تیاری میں کچھ آسانیاں ہوگئیں، اسی زمانہ میں ڈاکٹر فیلن صاحب نے جو صوبہ بہار میں انسپکٹر مدارس تھے، ان کو بلا بھیجا اور ان کو اپنی انگریزی کی لغت کی تیاری میں ان سے مدد لینا چاہی، مولوی صاحب راضی ہوگئے اور فیلن کی ڈکشنری سات برس میں ختم ہوئی، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا کام بھی کرتے رہے ۱۸۸۰ء میں انھوں نے مہاراجہ الور کا ایک سفرنامہ مرتب کیا، اس کے بعد وہ پنجاب گورنمنٹ کے سرکاری بک ڈپو میں نائب مترجم کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ فیلن صاحب کی ڈکشنری کی تیاری کے زمانے میں، اپنی کتاب ہادی النساء شائع کی، جو بہت مقبول ہوئی، اس کے بعد ان کی حسب ذیل تصنیفات شائع ہوتی رہیں،

---

(۱) داستان تاریخِ اردو (حامد حسن قادری) ص ۸۲۲

جو اپنے طرز میں سب نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ تکمیل الکلام پیشہ وروں کی اصطلاحات ہیں، تحقیق الکلام اردو زبان کے نکات کے متعلق، اسکہان جس میں کچھ ہندی دوہے، پہیلیاں اور گیت ہیں، ریت بکھیان کچھ ہنود کے مذہب کے متعلق، ناری کتھا ہندو عورتوں کی بولی، قواعد اردو، تعلیم نسواں اور عورتوں کے متعلق ان کی حسب ذیل کتابیں مشہور ہیں، لغات النساء، تحریر النساء، بچوں کی پرورش اور تربیت کے متعلق، علم النساء زبان اور اس کی ترقی کے متعلق؛ رسوم دہلی جس میں دہلی کے مروجہ رسوم کا ذکر ہے۔ غیر مطبوعہ کتابوں میں سیر شملہ، جس میں شملہ کی سیر بھی داخل ہے، اور ضرب الامثال، روزمرہ دہلی، رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی، ان میں سے بعض اب شائع ہو رہی ہیں۔ (۱)

---

(۱) تاریخ ادب اردو (حصہ نثر) رام بابو سکسینہ ص۲۶

(۹)

خواجہ امان دہلوی مُصنّف بوستان خیال

بدرالدین خاں امان دہلی کے رہنے والے مرزا غالب کے عزیز تھے یعنی بقول غالب "میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے" انھوں نے داستان "بوستان خیال" کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا "بوستان خیال" کا مُصنف میر تقی خیال گجرات کا رہنے والا محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دہلی آیا، اس زمانے میں "داستان امیر حمزہ" بہت مقبول تھی، میر تقی خیال نے اس کے جواب میں "بوستان خیال" لکھی چونکہ پہلی داستان میں تاریخ اسلام کے ایک بزرگ امیر حمزہ کے کارنامے تھے اس لیے خیال نے بھی ایک تاریخی ہستی تلاش کی اور شاہزادہ معزالدین ابو تمیم کو ہیرو بنایا جو حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل میں تھے میر تقی خیال نے مہاراجہ شیو دان سنگھ والی ریاست الور کی فرمائش سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا باقی کے لیے عمر فانی نے وفا نہ کی،

ترجمہ خواجہ امان کی پہلی جلد کا نام حدائق الانظار اور دوسری کا ریاض الابصار ہے، پہلی جلد کے لیے غالب نے دیباچہ لکھا تھا اس کتاب کا ذکر غالب نے کئی دوستوں کو لکھا ہے اور خریداری کی فرمائش کی ہے خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں،

"میرے ایک رشتہ دار کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اردو میں ترجمہ کیا ہے مَیں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے ... آپ کے پسند آئے یا اور اشخاص خرید کرنا چاہیں تو چھ روپیہ قیمت اور محصول بذمہ خریدار ہے،

خواجہ امان نے تمہید مقفّیٰ عبارت میں لکھی ہے اور عربی و فارسی سے کام لیا ہے لیکن اصل داستان بہت سادہ سلیس لکھی ہے ریاض الابصار کی تمہید کے چند فقرے یہ ہیں،

"امید کہ یہ ناظورہ تالیف جدید بھی مثل جلد جلد گزرانیدہ بحصول لقد سرخروئی پذیرائی اور خلعت سرسبزی احسنت حبیب و دامان مراد کو پُر کرے اور چاکر موروثی اسی وسیلہ جزئیہ کے سبب گاہ گاہ مذکورہ بارگاہ فلک کارگاہ و سرمایہ اعزاز و تفاخر ہووے، خدا کا شکر کہ ادائے شکر خداوند نعمت کے پردے میں ادائے شکر نعمت خدا ہُوا یعنی شکر نعمت خداوند کیا،

شکرِ خدا ادا ہوا،

داستان کا نمونہ یہ ہے اس قدر صاف با محاورہ زبان لکھی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

"اب عاقب حرّانی کا حال سنو، اوّل بیان ہوا ہے کہ عاقب حرانی حکومت کے علاوہ فن عیّاری میں بھی نہایت مستعد و چالاک ہے اس نے ایک شب قصد کیا کہ خبر و اخبار کے واسطے حریف کے لشکر میں چلیے اور دیکھئے کہ وہ حکیم صنار منکوس کس کام میں مشغول ہے آخر حرّانی ایک نقب کی راہ سے جس کا دہن بیرون شہر باغ میں تھا باہر نکلا اور بہت ہوشیاری سے جم قدر کے لشکر میں پہنچا قضارا اس وقت ایک خدمت گار خاص صنار منکوس کا کسی کام کے واسطے خیمے سے نکلا تھا عاقب نے اس خدمت گار کی گردن میں اس طرح کمند بند کی کہ حلق سے آواز تک نہ نکلی بعد ازاں اس کا پشتارہ باندھ کر ایک خرابے میں رکھ آیا اور اپنی صورت اس خدمتگار کی شکل سے تبدیل کی بلکہ اسی کا لباس پہنا اور خدمت گاروں کے صف میں وارد ہو گیا۔(۱)

(۱) داستانِ تاریخ اردو (حامد حسن قادری)، صفحہ ۲۵۲

(۱۰)

نسیم دہلوی

مرزا اصغر علی خاں تخلص نسیم نواب آقا علی خاں کے بیٹے تھے، دلی میں ۱۲۱۴ھ کو پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پایا، ضروریاتِ زمانہ کے مطابق تعلیم حاصل کی، باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناموافقت ہوگئی اور وہ اپنے بڑے بھائی مرزا اکبر علی خاں کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے، اور یہیں رہ پڑے بعد میں بھائیوں نے عفو تقصیر کرکے ملنا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ مانی۔ پھر دلی نہیں گئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر وفاقہ کی حالت میں رہے مگر کسی کے سامنے دستِ سوال نہیں دراز کیا، بڑے پابندِ مذہب اور احکامِ قرآنی کے عامل تھے۔ غدر کے بعد منشی نول کشور کے مطبع میں الف لیلہ کے منظوم ترجمہ کی خدمت پر مقرر ہوئے، ایک جلد تکمیل ہوئی تھی کہ مطبع کی طرف سے کتاب کی جلدی ہوئی جواں کو ناگوارِ خاطر ہوئی، اور وہ الگ ہوگئے ان کے بعد منشی طوطا رام شایاں نے وہ کتاب مکمل کی، تعجب ہے کہ جس وقت لکھنؤ کا طرز زوروں پر تھا، اسی وقت نسیم دہلوی کو اپنے طرز میں لکھنؤ میں بڑی کامیابی اور شہرت حاصل ہوئی، یہ بڑے زود گو تھے اور اسی کے ساتھ مزاج میں وارستگی اس قدر تھی، کہ جو کچھ لکھتے اس کی نقل اپنے پاس نہ رکھتے تھے، جس کی وجہ سے بہت کچھ کلام تلف ہوگیا، ان کا دیوان ان کے شاگرد حافظ عبدالواحد خاں مطبع مصطفائی نے چھپوایا تھا مگر اس کو وہ اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے، ان کی غزلوں کو مرزا غالب بھی پسند کرتے تھے۔ باوجود دہلوی ہونے اور اپنے شہر کی زبان پر فخر کرتے اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے اکثر اہل لکھنؤ نسیم کے شاگرد ہوئے، جن میں عبداللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرف، منشی امیر اللہ تسلیم مشہور ہیں۔

طرزِ کلام نسیم میں مومن کا رنگ بہت پایا جاتا ہے۔ ان کا نہایت ہی لطیف طرزِ بیان اور نازک خیالی کے ساتھ ملا ہوا ہے، جو مومن کا فیض تھا، نسیم کو تازگی کلام اور صحت محاورات

کا بہت خیال تھا، لکھنؤ کی صناعی اور لفاظی کو وہ نہ پسند کرتے تھے، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی بہت نمایاں ہے، اپنے استاد کی طرح وہ بھی فارسی ترکیبیں بہت استعمال کرتے تھے، اور نزاکتِ خیال اور طرزِ بندش اور روانی کلام میں بھی انھیں کی پیروی ہیں، تسیم کا مرتبہ شعرائے درجہ دوم میں بہت برتر ہے۔ (۱)

(۱) تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ، ص ۳۱۲

(۱۱)

نواب مرزا داغ

داغ دہلی میں ۳ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء میں چارشنبہ کے دن پیدا ہوئے اور ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء کو بمقام حیدرآباد دکن وفات پائی، یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپ کا نام مع تخلص "نواب مرزا داغ" تاریخ وفات ہے،

آپ کے والد کا نام نواب شمس الدین خاں تھا، ۱۸۳۷ء میں مرزا صاحب کے والد نے انتقال کیا، جب آپ بہت کم سن تھے، آپ کی والدہ آپ کو ساتھ لے قلعہ معلی میں چلی گئیں، اور اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ صاحب عالم مرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر ولی عہد شاہ دہلی کے سایۂ عاطفت میں گزارا، اور نواب شوکت محل بیگم خطاب پایا، فارسی کی ابتدائی کتابیں آپ نے مولوی غیاث الدین صاحب غیاث اللغات سے پڑھیں، سید امیر صاحب پنجہ کش اور مرزا عباد اللہ بیگ سے آپ نے فن خوش نویسی حاصل کیا، اس زمانہ میں چونکہ فن سپہ گری کی نہایت قدر تھی اس لیے آپ نے بانگ، اور علی کی پھینکیتی اور شہسواری سب ہنر حاصل کیے، قدر اندازی، چو رنگ، اور سینا کے فن صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے حاصل کیے آپ کی ہونہار طبیعت کا رجحان شروع ہی سے شاعری کی طرف تھا، بادشاہ اور ولی عہد دونوں ذوق کے شاگرد تھے، مرزا ولی عہد بہادر نے داغ کو بھی ذوق کا شاگرد کر دیا،

مرزا صاحب نے سب سے پہلے نواب مصطفٰی خاں شیفتہ کے مشاعرہ میں یہ مطلع پڑھا، جو ایک بارہ برس کے لڑکے کے لیے ایک فال نیک تھا،

شرر و برق نہیں، شعلہ و سیماب نہیں
کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دل بیتاب نہیں

غدر سے کچھ دنوں پہلے آپ کے مربی سرپرست صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر نے بعارضہ ہیضہ انتقال کیا، پھر غدر کی آفت آئی، جس نے لوگوں کو خانماں برباد کر دیا، داغ رام پور چلے

گئے، وہاں نواب یوسف علی خاں ناظم، والی رام پور اپنی حیات تک ہمیشہ بطور مہمان نوازی کے سلوک کرتے رہے نواب مرحوم کے بعد نواب کلب علی خان بہادر نے جو قدردانی فرمائی وہ محتاج بیان نہیں، آپ ریاست رام پور میں باقاعدہ ملازم ہوکر رئیس کی مصاحبت میں رہنے لگے، اصطبل، گاڑی خانہ فراش خانہ، کنول خانہ، شتر خانہ آپ کے سپرد ہوا، نواب صاحب آپ کی قدر فرماتے تھے مرزا صاحب ۲۴ برس رام پور میں رہے، نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد دل برداشت ہو گئے اور ۱۸۸۷ء میں رام پور سے رخصت ہوکر دلی آئے، ۱۳۰۵ھ میں حیدرآباد پہنچے، برابر ساڑھے تین برس تک امیدواری کی سختیوں کو برداشت کیا، آخر ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو ۹ بجے شب کے فرمان رحمت نشان مع غزل سربمہر لفافہ میں صادر ہوا جس کو چند چوبدار لے کر حاضر ہوئے تھے علاوہ فرمان کے زبانی پیغام بھی تھا کہ آٹھ بجے صبح کے دربار میں حاضر رہیں، آپ نے اس وقت غزل کو دیکھ کر بعد کا اصلاح دے دی اور حسب الطلب دوسرے دن حاضر ہوکر نذر گزرانی اسی تاریخ سے سلسلہ استادی شاگردی کا قائم ہوا، اس کے بعد، ۲۰ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ کو ایک مراسلہ محکمہ پولٹیکل فنانس سے صادر ہوا کہ سرکار نے آپ کے نام چارسو پچاس روپے کا وظیفہ ابتدائے ورود سے منظور فرمایا ہے، یہ وظیفہ تین سال تک ملتا رہا، ۶ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ کو آپ کا وظیفہ ہزار روپیہ ماہوار ہوا، پھر تو سرافرازی پر سرافرازی ہونے لگی، ایک گاؤں مع ایک باغ کے سرافراز ہوا، ایک دفعہ گھڑی، پھر زنجیر طلائی اور ایک مرتبہ دو تلواریں ملیں،

۲۷ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ کو پیش گاہ اعلیٰ حضرت سے "بلبل ہندوستان، جہاں استاد، دبیرالدولہ، فصیح الملک، نواب ناظم جنگ بہادر کا خطاب ملا، باوجود اس قدر اعزاز و احترام کے غرور، تکبر، یا نخوت آپ کو چھونک نہیں گئی تھی، آپ کی اہلیہ نے ۱۳۱۵ھ میں، حیدرآباد میں وفات پائی، اولاد میں صرف ایک صاحبزادی ہیں جو سائل صاحب کی اہلیہ ہیں ان کو حیدرآباد سے چارسو ماہانہ منصب ہے، ایک نواسہ بھی ہے وہ بھی منصب دار ہے،

داغ صاحب کو وجع مفاصل اور دوران سر کی شکایت تھی، آخر کار فالج میں وہ دنیا

سے رخصت ہوئے، (۱)

داغ کا حلیہ نواب مرزا خاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرہ پر غضب کی نرماہٹ ہے بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک کشادہ پیشانی سر پہ سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی جسم میں ساسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدن کا پائجامہ ہاتھ میں ریشمی رومال ہے، ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ شہر بھر میں ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ (۲)

داغ کا انداز حیات داغ ایک شاعر تھے، ایک رند مزاج شخص تھے، ان کی زندگی شاعروں اور رندوں کی زندگی تھی، وہ عشق کرتے تھے اور داد عیش دیتے تھے، ایک نقاد سخن کہتا ہے:۔

"داغ کی شاہد پرستی کے سلسلہ میں سب سے پہلے مثنوی فریاد داغ کا ذکر کرنا چاہیے، اس میں کلکتہ کی ایک طوائف حجاب بائی سے داغ نے اپنے معاشقے کا حال نظم کیا ہے۔ مثنوی رام پور میں لکھی گئی اور ۱۳۰۰ھ میں مکمل ہوئی،(۳) اس وقت داغ کی عمر ۵۴ سال کی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں جب طبیعت کا یہ رنگ تھا تو جوانی میں کیا کچھ نہ ہوا ہوگا۔ حجاب بائی کا ذکر مثنوی میں جا بجا کرتے ہیں،

کس قیامت نے پائمال کیا	سحر بنگال نے حلال کیا
شوخیاں ہیں حجاب میں کیسی	لن ترانی جواب میں کیسی
یاالٰہی نجات غم سے ملے	وہ سراپا حجاب ہم سے ملے

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۲۵۴

(۲) دلی کی آخری شمع صفحہ ۵۲

(۳) فریاد داغ، مطبع منشی محمد علی مالک اخبار نیر اعظم مراد آباد ۱۸۸۵ء پہلا اڈیشن

(۴) فریاد داغ صفحہ ۵۲۔

اُف رے عہد شباب کی مستی — بے پئے ہے شراب کی مستی
رقص طاؤس باغ سے اچھا — شعر کا لطف داغؔ سے اچھا

سراپا کی تفصیل کے بعد ابتدائی ملاقات کا حال ہے، قدرتی طور پر یہ منزل زیادہ دشوار نہیں تھی۔ داغؔ بہت جلد کامیاب و کامران نظر آتے ہیں۔

ایک اک دم میں سو مدارا تیں — لطف کے دن وہ عیش کی راتیں
رات کٹتی تھی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی ڈھکی کیا کیا
عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا — چار دن شادماں نہ دیکھ سکا

اور اس کے بعد

آ گئی ہجر کی گھڑی سر پر — یہ بلا جھیلنی پڑی سر پر
قصد ٹھہرا وطن کے جانے کا — رنگ بدلا نیا زمانے کا

چلتے وقت راز و نیاز کی باتیں اور عہد و پیمان ہوتا ہے۔ یہاں داغؔ کی ہوس پرستی اور رندی کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ قابل لحاظ ہے۔ داغؔ نے ۱۳۰۵ھ[1] میں دربار رامپور سے قطع تعلق کیا اور اسی سال حیدرآباد گئے۔ اس وقت ان کو عمر ساٹھ برس سے صرف ایک سال بلکہ چند مہینے کم تھی۔ اس عمر میں جوانی کی چڑھتی آندھی اُتر چکی ہوتی ہے اور بقول غالبؔ قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا۔ ان حالات میں یہ نتیجہ نکالنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ شاہد پرستی کے جو مضامین اس دور میں داغؔ کے کلام میں ملتے ہیں۔ وہ ان کے اس وقت کے ذاتی واردات اور واقعات کا بیان ہے۔ ان کی شوخی اور تیزی جو بلا شبہ بھر پور جوانی کے ساتھ ہی ہو سکتی تھی، یہ اشعار زیادہ سے زیادہ ان کی شوخیٔ طبع کا نتیجہ ہیں، یا پھر جوانی کی یاد ہے، جو دل میں گدگدی پیدا کرتی رہتی ہے ہمارے اکثر شعرا کی عمر کا آخری حصہ بڑی تنگ دستی عسرت اور معاشی بدحالی میں بسر ہوا ہے۔ میرؔ

---

(۱) جلوۂ داغ، احسن مارہروی، مطبع شمسی حیدرآباد صفحہ ۴۰،۵۰

مصحفی، انشا، جرأت سے لے کر غالب تک سب کا انجام کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے اس لیے ان لوگوں کے آخیر عمر کے کلام میں حزن و ملال زیادہ ہے، داغ کا یہ زمانہ نہایت فارغ البالی اور اطمینان سے بسر ہوا اور طبیعت کی وہ شوخی چلبلاپن اور رنگینی جو قلعہ معلّی میں پیدا ہوئی، دربار رامپور میں پروان چڑھی، حیدر آباد میں بھی قائم اور باقی نظر آتی ہے۔

جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا　　دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

اک نہ اک ہم لگائے رہتے ہیں　　تم نہ ملتے تو دوسرا ملتا (۱)

ایک یادگار مشاعرہ

مولانا راشد الخیری کے ایک چشم دید مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہیں جس سے داغ کی شوخی اور شرارت کا بڑا پُرلطف اندازہ ہوتا ہے:۔

"میں اس مشاعرہ میں موجود تھا، جہاں مرنے والا داغ، مولانا حالی پر چھا رہا تھا اور اس نے اپنے اس شعر سے مولانا کو رونکھا کر دیا تھا،

تم بھی اے ناصح کسی پر جان دو

ہاتھ لا استاد۔ کیوں، کیسی کہی،

میں نے اسی رات کے آخری حصہ میں وہ سماں بھی دیکھ لیا کہ دلی پرست داغ جو مولانا سے چخ مچا رہا تھا، اس شعر پر ڈاڑھیں مارتا ہوا ان کے قدموں پر آپڑا ؎

لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح

دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز (۲)

داغ کی شاعری

داغ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے، ان کی زبان میں فصاحت اور سادگی، اور بیان میں ایک خاص قسم کی شوخی اور بانکپن ہے، جس کی

---

(۱) غزل اور متغزلین صفحہ ۱۲۵

(۲) دلی کی آخری بہار (علامہ راشد الخیری) صفحہ ۱۱۰

وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر، جلال، تسلیم وغیرہ سے زیادہ مشہور ہوئے، ان کا طرز عام پسند اور بہت دلچسپ ہے، اسی وجہ سے ان کے متبعین کثرت سے ہیں، مشہور ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد پندرہ سو سے متجاوز ہے یہی شہرت و عزت اور شاگردوں کی کثرت ان کے جوہر ذاتی اور شاعرانہ قابلیت پر دال ہے، داغ نے ایک باضابطہ دفتر کھول دیا تھا، جس کے کارکن بعض ان کے شاگرد اور اکثر ان کے تنخواہ دار منشی بھی تھے، اس دفتر میں اصلاح کلام کا کام جاری تھا۔ (۱)

فصیح الملک نواب مرزا داغ کی صحبت میں تین گھنٹے

"میں نے اپنی زندگی کے ہر دور میں پچیس سال کے اندر ہندوستان کے مشاہیر شعرا کو دیکھا اور ان کی زبان سے ان کا کلام بھی سنا ہے، میرے والد منشی الٰہی بخش مضطر (منجم ہند) چونکہ خود شاعر تھے اور انھوں نے عالم شباب تک آگرہ اور لکھنؤ میں باکمال شعرا کو دیکھا تھا اور مشاعروں میں شریک ہو کر غزلیں پڑھتے تھے، اس لیے مجھے ہدایت تھی کہ ادبی مجالس سے استفادہ کروں، عجیب اتفاق ہے کہ تعلیم کے زمانے میں بھی ادب سے ہمیشہ دلچسپی رہی لیکن کبھی شاعری کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور تمام عمر سماعت میں گذری البتہ بھوپال میں چند فارسی نظمیں لکھیں جو مرثیوں اور تاریخی واقعات تک محدود تھیں،

ہندوستان میں شاعروں کے صرف دو اسکول تھے ایک دلی دوسرا لکھنؤ۔ دلی کے باکمال شعرا لکھنؤ میں آ گئے تھے لہٰذا ادبی حیثیت سے شعرائے لکھنؤ بھی دلی کی فصیح زبان میں شاعری کرتے تھے۔ البتہ جو محاورات و الفاظ لکھنؤ میں ٹکسالی ہو چکے تھے وہ بحال خود قائم ہے جس میں تذکیر و تانیث کی بحث بھی شامل ہے، لکھنؤ نے زبان اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی اور حکومت اودھ نے بھی شعرا کے ساتھ بڑی بڑی فیاضیاں کیں چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہر دور میں باکمال شاعر لکھنؤ میں پیدا ہوئے، متاخرین شعرائے دلی میں مرزا داغ خوب چمکے، اور دربار رامپور نے اپنی علمی قدردانی سے امیر احمد

---

(۱) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) ص ۳۶۹

مینائی اور داغ وغیرہ کو تمام ہند میں روشناس کرایا،

اب یہ سنیے کہ داغ کی ملاقات کیونکر ہوئی ؟

دلی میں حضور نظام کی کوٹھی شہر سے الگ تھی اور کئی ہزار گز افتادہ رقبہ کوٹھی کے متعلق تھا، جس میں امرائے دولت کے سیکڑوں خیمے اور بارہ گاہیں تھیں،

صدر پھاٹک پر ملٹری سپاہیوں کا پہرہ تھا اور ایک کمرے میں پولیس افسر جمع تھے، ملاقات کا انتظام جس افسر کے سپرد تھا وہ ایک عرب تھا، جب میں نے مرزا داغ سے ملاقات کی تحریک کی تو اس نے (ملاقات کا کارڈ) طلب کیا چنانچہ چند کارڈ پیش کیے گئے اور جواب کے انتظار میں ٹھہرے رہے، ایک گھنٹے کے بعد مرزا صاحب کا چوبدار آیا اور اُن کی ذاتی ذمہ داری پر کیمپ میں جانے کی اجازت ہوئی،

راستے میں صدہا خیمے نظر آئے جو ایک سے ایک بڑھ کر شاندار تھے، ہر خیمے کے دروازے پر سُرخ زرد رنگ کی تختی پر سیاہ گہرے حروف میں صاحب خیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔ ۲۵ منٹ کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کا نام نظر آیا۔ (۱)

نمونہ کلام

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں	ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن	لطف سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی	شیخ صاحب نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں	وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے مے کشوں سے لطف شراب	یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک	وہ میرے دل کا راز کیا جانیں
حضرت خضر جب شہید نہ ہوں	لطف عمر دراز کیا جانیں

(۱) یادِ ایام (عبدالرزاق) صہ ۳۰۸

باب ۲۳

غدر کے اسباب و محرکات

کوئی حادثہ بھی خود بخود واقع نہیں ہو جاتا، اس کے واقع ہونے سے پہلے کچھ اسباب ہوتے ہیں جو اس کے وقوع کو ناگزیر بنا دیتے ہیں کچھ محرکات ہوتے ہیں جو اسے پردۂ عدم سے عالم وجود میں لے آتے ہیں کچھ عوامل ہوتے ہیں جن کی کارفرمائی اسے ایک حقیقت بنا دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا غدر بھی یک بیک نمودار نہیں ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ سے اس کے محرکات اور عوامل اپنا کام کر رہے تھے اور جب ان کے تدریجی مرحلے ختم ہو گئے تو وہ قیامت رونما ہوئی جسے لوگ "غدر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

غدر کے اسباب و محرکات اور عوامل، اگر گنے جائیں تو بات زیادہ بڑھ جائے، ہم صرف چند موٹے موٹے اسباب و محرکات کا ذکر کریں گے جن سے اندازہ ہو سکے کہ یہ چند سر پھرے لوگوں کی شرارت نہیں تھی بلکہ مؤثرات و محرکات اور اسباب و عوامل کا ایک سلسلہ جو تدریجی طور پر بڑھتا پروان چڑھتا اور جڑ پکڑتا گیا، یہاں تک کہ ایک دن ایسا آ گیا جب وہ آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح بہ نکلا اور جو اس کی لپیٹ میں آیا وہ جل گیا، بھسم ہو گیا، خاکستر بن گیا۔

داستان کو طول دینا مقصود نہیں ہے پھر بھی ایجاز و اختصار کے تمام واجبات کو سامنے رکھ کر چند واقعات بہرحال بیان کرنا ہیں ان واقعات سے اندازہ ہو جائے گا کہ غدر ایک اٹل حادثہ تھا۔ حیرت اگر کی جا سکتی ہے تو اس پر کہ یہ پہلے ہی کیوں واقع نہ ہوا؟ اتنے دنوں تک کیوں رکا رہا، اور یہ پہلے ہی کیوں نہ ہوا؟

دیسی سپاہیوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ

دیسی سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ شروع سے سفاکانہ، ظالمانہ، بے رحمانہ اور اہانت آمیز رہا ہے ذرا سی غلطی پر مہیب سزا، معمولی سی بات پر عبرت انگیز انتقام،

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

اصول، ضابطہ، آئین، قانون ہر چیز بیکار، ایک دفعہ سپاہ نے اضافہ تنخواہ چاہا، ایک پلٹن نے اپنے انگریز افسروں کو قید کر لیا اور مفرور ہو گئی، منرو صاحب مع سپاہ اور توپوں کے ٹھیک وقت پر آ پہنچے۔ مفرورین کے افسروں کو حکم دیا کہ سرغنوں کو جو اس شرارت کے بانی ہوں منتخب کریں، جب پچاس سرغنہ وہ چھانٹ کر لائے تو کورٹ مارشل ہوا، چوبیس پر جرم ثابت ہوا اور توپوں سے ان کو اڑانے کا حکم صادر ہوا، ساری سپاہ گوروں اور ہندوستانیوں کی پریڈ پر جمع ہوئی، توپیں لگائی گئیں، منرو صاحب نے حکم دیا کہ چار سپاہی توپوں سے اڑانے کے لیے آگے آئیں۔۔۔ چار گرانڈیلوں نے کہا ہمیشہ ہم سب لڑائیوں میں معزز رہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت بھی عزت حاصل کریں اور سب سے پہلے اڑائے جائیں۔ ان کی درخواست منظور ہوئی وہ توپ سے اڑا دیئے گئے، یہ دیکھ کر ہندوستانی سپاہ کے تیور بدلے تو ان کے افسروں نے منرو صاحب سے کہا کہ "سپاہی کہتے ہیں کہ ہم کسی اور سپاہی کو اس طرح اڑانے کی اجازت نہیں دیں گے" اس پر میجر صاحب نے توپوں کے منہ ہندوستانی سپاہ کی طرف کر دیئے اور سارے گوروں کی بندوقیں ان کی طرف موڑ کر حکم دیا کہ ہتھیار زمین پر ڈال دو، اگر عدول حکمی کرو گے یا بھاگو گے تو سب کے سب اڑا دیئے جاؤ گے، ناچار سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر سولہ سپاہی توپوں سے اڑائے گئے اور چار سپاہی چھاؤنیوں میں اڑانے کے لیے بھیجے گئے۔[1]

دیسی سپاہیوں کی بددلی کی وجہ — فوجیوں کی بددلی کا سبب یہ تھا کہ ہندی سپاہی جس قدر

۱؎: تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۱۱۲۔

زیادہ دور لڑائی میں بھیجے جاتے اُسی قدر تنخواہ اور مواجب میں اضافے مانگتے تھے ہندوؤں کو بیرونی ممالک خصوصاً سمندر بلکہ سندھ ندی کے پار جانے میں مذہبی عذرات تھے کمپنی سرکار بھتے سے بھی ان کا منہ میٹھا کرنا نہ چاہتی تھی اسلیے وہ ادر کڑ واتے تھے چنانچہ مہم کابل کے بعد سے دُوسری جنگ برما تک ۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۲ء صرف دس برس کے عرصہ میں چار دفعہ اضافے کے معاملے جھگڑا بڑھا اور کئی دیسی پلٹنوں نے نہ صرف نوکری چھوڑی بلکہ علانیہ فتنہ و فساد اٹھانے پر آمادہ ہوگئی تھیں

سپاہیوں کے بھتہ میں واجب تخفیف

" گورے سپاہیوں پر تو پانی کی طرح روپیہ صرف کیا جاتا تھا لیکن دیسی سپاہیوں کے جائز مطالبات بھی پورے نہیں کئے جاتے تھے۔

" لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ سے پہلے ملک سندھ کا انگریزی عملداری میں الحاق ہوا اس گیتا لی ملک میں سپاہیوں کو اجنبی آدمیوں میں اپنے وطن سے بہت دور رہنا پڑتا شاق تھا یہ ملک اس قلمرو کی سرحد سے پرے تھا جس میں انھوں نے کام کرنے کا عہد و پیمان کیا تھا اس لئے یہ بھتہ موقوف کیا گیا کہ ملک فتح ہو کر سرکار کمپنی کے قبضہ میں آگیا اب وہاں سپاہ کا رہنا ایسا ہی ہوگیا جیسا کہ ملک کی اور چھاؤنیوں میں اس سخت منطق نے سپاہیوں کے دل میں کینہ پیدا کیا اور وہ اس تخفیف کے برخلاف سرکشی پہ آمادہ ہو گئے وہ سوچنے لگے کہ ہم نے سرکار کی رعایا میں ایک نئی رعایا کو زیادہ کر دیا یہ ملک کا فتح کرنا ہمارے ہی حق مضر ہوا۔ اور حسن خدمات کا صلہ یہ ملا کہ تنخواہ کا ایک حصہ کم ہوگیا پہلے زمانہ میں جب سرکار کمپنی کے لیے سپاہی ملک فتح کرتا تھا تو اس کو طرح طرح کے انعام دیئے جاتے تھے اب اس پر اُلٹی مصیبت ڈالی جاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا بہادری کرنا ایک جرم تھا۔ نتیجہ اس بھتے کی موقوفی کا یہ ہوا کہ فرودی ۱۸۴۴ء میں ۳۴ پلٹن بنگال نے جس کو سندھ جانے کا حکم ہوا تھا، انکار کیا، کہ جب تک بھتہ ان کو نہ دیا جائے گا وہ وہاں نہیں جائیں گے یہ تجویز ہوئی کہ

ملے : تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم سید ہاشمی ص ۲۷۵ ÷

نافرمان سپاہ میرٹھ اور اندھیالہ کی چھاؤنیوں میں جہاں گوروں کی سپاہ بہت سی ہے بھیج دی جائے وہاں ان سے ہتھیار لے لیے جائیں[1]۔

دیسی اور گورے سپاہیوں کیساتھ الگ الگ برتاؤ

دیسی سپاہیوں اور گورے سپاہیوں میں عملی طور پر کیا فرق تھا؛ یہ بھی دیکھ لیجئے!

" دیسی سپاہی برطانوی حکومت کے لیے کس قدر مفید تھے اس سوال کا جواب ایوانِ عام کے اس اجلاس سے واضح ہوتا ہے جو ۱۸۵۳ء میں منعقد ہوا، دیسی سپاہیوں میں بنگالی سپاہیوں کی حالت ناقابلِ بیان تھی، یہی وجہ ہے کہ بنگالی سپاہیوں کو برطانوی حکومت کے خلاف بہت سی شکایات تھیں۔ بنگالی سپاہیوں کو اپنی رہائش کیلئے ایک کٹیا تیار کرنا پڑتی تھی، لیکن اس کے برعکس یورپی سپاہی نہایت آسائش سے بارکوں میں رہتے تھے[2]۔

بندوق کی گولی یا پھانسی کا تختہ

" جنگ برما میں چونکہ مزید سپاہیوں کی ضرورت تھی اس لیے بارک پور کے دیسی سپاہیوں کو برما کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا گیا، جب سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ انھیں کلکتہ سے رنگون تک بحری سفر کرنا ہے تو انھوں نے اس حکم ماننے میں تامل کیا، وہ صرف ہندوستان ہی میں لڑنے کے لیے بھرتی ہوئے تھے اور برما کا حدود ہندوستان سے باہر ہونا ظاہر ہے جب انھیں کوچ کا حکم ملا تو وہ اپنے تھیلوں کے بغیر پیش ہوئے، اس سوال پر کہ ایسا کیوں کیا گیا؛ انھوں نے جواب دیا کہ تھیلے ناقابلِ استعمال ہو چکے ہیں، لہذا نئے تھیلے دیئے جائیں۔ نیز رنگون جانے کے لیے الاؤنس ملنا چاہیے کیونکہ بنگال کی بہ نسبت برما میں اشیا کا نرخ گراں ہے کمپنی کے فوجی افسروں نے ان شکایات پر

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۲۲۶۔
[2]: کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۹۷۔

غور کرنا اپنی توہین سمجھا، اسی اثنا میں کلکتہ سے انگریزی فوج بارک پور پہنچ گئی، انگریز سپاہیوں نے دیسی سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا، اس آتش باری سے جو زندہ بچے انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیا۔[1]

عیسائیت کی تبلیغ سپاہیوں میں

غدر کے اسباب و محرکات میں ایک بہت بڑا سبب اور بہت بڑا محرک انگریزوں کا مذہبی تعصب اور عام لوگوں میں نیز سپاہیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کا جذبہ بھی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایسے بھونڈے وسائل اور ذرائع استعمال کئے جو نہ ان کے شایان شان تھے نہ اصول حکمرانی کے مطابق تھے۔

ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کا جذبہ انگریزوں کے دل میں اس وقت سے تھا جب وہ صرف تاجر اور سیاح کی حیثیت سے اس سرزمین پر قدم رکھتے تھے۔

"مسلمان بادشاہوں اور ان کی مسلمان رعایا سے تو کسی طرح بھی تبدیل مذہب کی امید نہیں چونکہ ممالک ایشیا کے وہ مقامات میرے دیکھے ہوئے ہیں جہاں مشنری لوگ مقیم ہیں۔ اس لیے میں اپنے تجربہ کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ خیرات اور تلقین کا اثر مشرکوں ہی پر ہونا ممکن ہے اور یقین نہیں کہ دس برس میں بھی ایک مسلمان عیسائی ہو جائے یہ سچ ہے کہ مسلمان انجیل کو مانتے ہیں اور مسیح علیہ السلام کا ذکر نہایت ادب و تعظیم کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن ان سے یہ امید کرنا عبث ہے کہ وہ اپنا وہ دین جس میں پیدا ہوئے ہیں چھوڑ دیں اور اپنے پیغمبر کے برحق نہ ہونے کو مان لیں مگر باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی فرنگستان کے عیسائیوں کو چاہیئے کہ مشنری لوگوں کی ہر ایک طرح سے مدد کریں کیونکہ مشنری لوگوں پر اس کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔"[2]

سپاہیوں کا مذہب بدلنے کی کوشش

ہندوستان کا ایک مشہور مورخ، جو انگریزوں کا دل سے مداح اور ادا شناس ہے، ایک انگریز

---

[1] : کمپنی کی حکومت ص ۲۹۵

[2] : وقائع سیر و سیاحت، ڈاکٹر برنیر جلد دوم ص ۲۲۲

سپہ دار کے بارے میں لکھتا ہے کہ :۔

"ایک ہاتھ میں آرڈر بک (سپاہ کے حکموں کی کتاب) اور دوسرے ہاتھ میں بائبل لیے جاتے اس طرح سے انھوں نے اپنی گورنمنٹ کی بڑی خدمت کی جس کے وہ ملازم تھے انگریزی افسروں میں مشنریوں کی سرگرمی کتنی پھیلی تھی، اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا آسان نہیں لیکن اب اس میں شبہ نہیں کہ بعض افسر، سپاہیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کرتے تھے اور وہ اپنے اس کام پر فخر کرتے تھے لفٹنٹ کرنل ویلر نے جو ایک رجمنٹ کا کمانڈر تھا ۱۸۵۷ء میں بڑے فخر سے یہ بات کہی کہ بیس برس سے کچھ زیادہ دنوں سے میری یہ عادت ہے کہ ہر قسم کے آدمیوں کو بغیر کسی تمیز کے عیسائی مذہب کا وعظ سناتا ہوں مسیح کا سپاہی بن کر خدا کے احکام اور سرکار کمپنی کا سپاہی بن کر اس کے احکام سناتا ہوں غرض افسران فوج اور حکام اپنے ماتحتوں سے مذہبی باتیں بہت کرتے تھے، اور بعض حکام اپنے ماتحتوں کو حکم دیتے تھے کہ اتوار کو ہماری کوٹھی پر آن کر پادری صاحب کا یا ہمارا وعظ سنو"[1]

مداخلت فی الدین ہم عصر انگریزی تاریخوں میں اس عہد کے بعض فوجی فسادات کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ملتا ہے جن میں انگریز سپاہی اور سردار مارے گئے، ان کے فرو کرنے میں کچھ بہت دیر یا دقت نہیں ہوئی، البتہ یہ لوگوں کی ذہنیت اور انگریزوں سے عام مذہبی بدگمانی کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس کی پہلی مثال ویلور کا فساد ہے۔ جہاں دیسی فوج کی بڑی چھاؤنی تھی اور قلعہ میں سلطان میسور (شہید) کی اولاد، گورہ فوج نے وردی میں ایک نئی وضع کی پگڑی جاری کی داڑھی والوں کو حکم دیا کہ داڑھی اس طرح ترشوائیں کہ یکسانی کی خوشنمائی پیدا ہو جائے، مدراس کے ہندو ماتھے پر لمبی چوڑی لکیریں بناتے ہیں، مگر فرنگی کمیدان کی ممانعت تھی کہ سرکاری ملازم یہ لکیریں نہ بنائیں، ہندو

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ص ۳۰۱

سپاہی سخت مشتعل ہوئے، عام رائے یہی ٹھیری کہ فرنگی ہمیں کرسٹان بنانے کی تدبیر کرتے ہیں وہ یکایک قلعے میں جا گھسے اور سَو سے زیادہ گورے سپاہی اور فوجی افسروں کو انھیں ہتھیاروں سے مارا جن کا چلانا انگریزوں سے سیکھا تھا مگر اتنی دیر میں ارکاٹ سے انگریزی فوج آگئی جوش و خروش سرد ہوچکا تھا سرکشی کرنے والے بلا مزاحمت پکڑے گئے اور صدہا گولیوں کا نشانہ بنے سلطان میسور کے نظربند بیٹوں کو یہاں سے ہٹا کر کلکتہ بھیج دیا، اگرچہ اس ہنگامی بغاوت اور خون ریزی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا (۱۸۰۶ء)

دوسرے سال ایک ——— اور ہنگامہ ریاست ٹراونکور میں برپا ہوا اس کی وجہ دیوان اور انگریز ریزیڈنٹ کی ناچاقی بتائی گئی ہے، ہزاروں نائر دوڑ پڑے، ریزیڈنٹ تو بچ کر نکل گیا اُس کی مختصر فوجی جمعیت مفت میں ماری گئی۔ فساد جلد رفع دفع ہوگیا، اہل فساد کیفر کردار کو پہنچے تاہم زیادہ تر انھیں ہنگاموں کے اندیشہ سے برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی کو حکم دیا کہ دینِ مسیحی کی تبلیغ کا کام صرف اجازت یافتہ پادریوں تک محدود کر دیا جائے، انھیں کمپنی کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی[۱]

گورنر جنرل کے مذہبی جذبے

لارڈ ولزلی گورنر جنرل نے وہی کام کیا تھا جو اور گورنر جنرلوں نے کیا تھا انھوں نے اس بائبل سوسائٹی کو چندہ دیا تھا جو کتب مقدسہ کا ترجمہ مشرقی زبانوں میں کرتی تھی اور یہاں کے آدمیوں میں ان نئے ترجموں کی اشاعت کرتی تھی یہ ترجمہ فورٹ ولیم میں نصف صدی سے ہو رہے تھے جن کے مربی لارڈ ولزلی اور ان کے جانشین تھے جن کے عہدِ حکومت میں کلکتہ بائبل سوسائٹی

---

[۱] : تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی) ص ۲۶۲

قائم ہوئی تھی اور اس کی فہرست چندہ میں سب سے بڑی رقم لارڈ ولزلی نے لکھی تھی اس سوسائٹی کے فنڈ کی معاونت لارڈ ہسٹینگز لارڈ ولیم بنٹنک و سرچارلس مٹکف نے کی تھی، لیکن لارڈ کیننگ نے سری رام پور کے بیپٹسٹ کالج میں بھی چندہ دیا تھا یہ کالج ۱۸۱۸ء میں لارڈ ہسٹینگز کے زمانہ میں قائم ہوا تھا، وہی اس کے اول پیٹرن ہوئے تھے بعد ازاں گورنر جنرلوں نے اس کی امداد کی۔[1]

مذہب بدلنے کی سرکاری کوششیں

"فرنگیوں کے خلاف طرح طرح کی افواہیں ذرا سی دیر میں ملک بھر میں پھیل جاتی تھیں ان سب میں سب سے بڑھ کر یہ چیز لوگوں کو مشتعل کرتی رہتی تھی کہ انگریز ہندوستانیوں کا دین بگاڑنا اور انھیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ محض ہوائی اور بے بنیاد افواہ نہ تھی، زیر نظر عہد میں عیسائی پادری قریب قریب ہر بڑے شہر اور ضلع میں پھیل گئے تھے، جگہ جگہ گرجا، وعظ خانے مدرسے خانقاہیں تعمیر ہوئیں طرح طرح کی تدبیروں سے دین مسیحی کی تبلیغ ہونے لگی۔

کمپنی کی حکومت اہل ہند کے مذہبی عقائد و اعمال میں مداخلت کرنے سے تحاشی دیتی تھی۔ مگر عیسائیت کی علانیہ حامی تھی پادریوں کی تنخواہیں مقرر تھیں تبلیغی اداروں کی اعانت کی جاتی تھی انیسویں صدی کے اکثر تعلیم یافتہ فرنگی دین سے برگشتہ تھے مسیحیت کے بنیادی مطالبات کو عقل و تحقیق کی عدالت میں غلط ثابت کرتے تھے، ان کا پادریوں کی سرپرستی کرنا سیاسی مصلحت یا قومی عصبیت پر مبنی ہوگا مگر ان میں ایسے "روشن خیال" بھی پائے جاتے ہیں جو چاہتے تھے کہ پادری عیسائی مذہب کی صداقت ثابت کر سکیں یا نہ کر سکیں اہل ہند کے اوہام کا ضرور ابطال کریں، اور انھیں اپنے دین دھرم سے بیگانہ یا مشکوک بنا دیں۔[2]

لاوارث بچے مشنریوں کو دیدیئے گئے

ذیل کا واقعہ اپنے اندر عبرت و موعظت کے کیسے کیسے پہلو رکھتا ہے:۔

ص۱ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۶۹

ص۲ : تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی) صفحہ ۳۲۱

سرسید صاحب کو جب اسٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسید نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جتنے مسلمان ہوں گے مسلمانوں کو اور جتنے ہندو ہوں گے ہندوؤں کے سپرد کیے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندو مسلمانوں کے سوا کسی مشنیری کو نہیں دیے گئے۔ مگر حسب ہدایت اسٹریچی صاحب کے جو بچے جس کے سپرد کرتے تھے اُن سے ایک اقرارنامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنائیں گے ہوشیار ہو جانے کے بعد جہاں جی چاہے رہے جہاں جی چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم ہونے نہیں پایا تھا کہ جان اسٹریچی مرادآباد سے بدل گئے اور مسٹر پاور اُن کی جگہ آئے۔ مشنیریوں نے اسٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہ مارا۔ مگر ان کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسید کی شکایت کی اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو مسلمانوں کو دیے گئے ہیں وہ واپس مجبور کیے جائیں اس زمانہ میں مسٹر الگزنڈر شکسپیر جو سرسید کے نہایت دوست تھے مرادآباد میں جج تھے انھوں نے سرسید کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمھارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لی جائیں گی۔ مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے مگر سرسید نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ "میں نے اس شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمہ لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنیریوں کو نہیں دیے جائیں گے اور اسٹریچی صاحب گورنمنٹ میں رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے پس اس کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے۔ مجھے جس طرح یہ گوارا نہیں کہ ایک سید کا بچہ مشنیریوں کو دیا جائے اسی طرح یہ بھی گوارا نہیں کہ ایک چمار کا بچہ اُن کو دیا جائے۔

مسٹر پاور کو جب سرسید کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کے لیے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی چونکہ اس زمانہ میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے تھے اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

سرسید اور ایک دو اور ممبران کے سوا تمام کمیٹیوں کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندو مسلمانوں کے سپرد کیے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں کیونکہ اُن پر ہرگز اعتماد نہیں کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے خواہ

کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہوگئی، اور تمام لاوارث بچے ہندو مسلمانوں سے واپس لے کر مشنریوں کو دلوا دیئے گئے، سرسید کے ہاں بھی چار یا پانچ لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں اور ان کی بیوی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں، سرسید نے پہلے اس سے کہ کوئی ان سے مانگنے آئے فوراً کلکٹر کے پاس بھیج دیا، جاتے ہوئے وہ بچے زار و قطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً ان کو بھیجنا پڑا۔[1]

جج بھی اور عیسائی مبلغ بھی

مسٹر روبرٹ ٹیوڈر ٹکر صاحب جج تھے جو سچے عیسائی اور نیک مسیحی تھے انھوں نے فتح پور کے دروازے پر چار پتھر کے مینار کھڑے کئے تھے اور ان میں سے دو پر احکام عشرہ اور دو پر عقاید مسیحیہ کندہ کرائے تھے تاکہ ہندو مسلمانوں کو مذہب عیسائی کے عقایئد سے اطلاع ہو جائے، انھوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اور کسی نے ان کو ستایا نہیں۔[2]

ناانصافی اور بدسلوکی

غدر کا ایک سبب، ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافی اور بدسلوکی بھی تھی۔

(۱) دسمبر ۱۸۲۰ء میں الگزنڈر کو قتل کی سزا میں ایک سال قید اور بیس روپیہ جرمانہ کیا گیا

(۲) ایک انگریز فوجی کو اسی جرم قتل کی سزا فقط ایک ہفتہ اور ایک روپیہ جرمانہ کافی سمجھی گئی۔

(۳) لفٹننٹ رائٹ نے ایک فوجی افسر کو مار ڈالا تھا، عدالت عالیہ سے سو روپیہ اور ایک ماہ کی قید سزا ہوئی۔[3]

انگریز حاکمان عدالت کے یہ چند فیصلے نمونے کے طور پر یہاں اس لیے دہرائے گئے کہ ان دنوں کمپنی کے عہد سے وار بار بار زور دیتے تھے کہ ہندوستانی حاکم بالکل قابل اعتبار نہیں[4] تعزیری مقدمات

ف۱ : حیات جاوید (حالی) ص ۔

ف۲ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۳۴ ۔

ف۳ : انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ (شائع کردہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد) ص ۔

ف۴ : آکسفورڈ ہسٹری

میں صاحبان انگریز ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں[1]

"صاحب" اور "قلی"

انھوں نے حکم صادر کیا کہ گوروں کی ہر بارک میں پنکھے لگائے جائیں اور ان کے جھلنے کے لیے قلی نوکر رکھے جائیں اور انکا سارا خرچ سرکاری خزانے سے اٹھایا جائے گا[2]

کارتوس میں چربی کا استعمال

اب انگریزوں کی جرأت یہاں تک بڑھی کہ انہوں نے کارتوسوں تک میں چربی استعمال کرنا شروع کردی۔

"انفیلڈ رائفل کے لیے کارتوسوں میں چکنائی چربی سے دی جانے لگی، جس میں یہ تمیز نہ تھی کہ وہ چربی کس جانور کی ہے گائے۔ بھیڑ۔ سوئر اور بکری کی ہے۔ اگرچہ اس میں سوئر کی چربی نہ تھی مگر گائے کی چربی ضرور تھی۔[3]

الحاق کی پالیسی

جس چیز نے ہندوستان کے لوگوں کو انگریزوں سے متنفر کیا اور بغاوت پر اکسایا وہ الحاق کی پالیسی بھی تھی نہ جانے کتنی ریاستیں وہ ہضم کر چکے تھے لیکن ان کی جوع البقر کسی طرح کم نہیں ہوتی تھی، جب موقعہ ملتا تھا کسی نئی ریاست پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔

"تاریخی واقعہ کے طور پر یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ الحاق اودھ نے بدولی میں اضافہ کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے بغاوت جلدی رونما ہوگئی الحاق کا اثر ہندو، مسلمانوں دونوں پر پڑا اس لیے کہ اودھ میں ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے اور مثالیں لیجئے۔ سیگولی کے رسالہ کی بغاوت لکھنو

ص[1] : تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم اسید ہاشمی۔ ص ۲۷۱

ص[2] : تاریخ ہندوستان عہد عروج انگلشیہ (ذکاء اللہ)

ص[3] : تاریخ عروج عہد انگلیشہ (ذکاء اللہ) ص ۳۱۴ ۔

انگریز غاصب تھے

انگریزوں کا ایک روزنامچہ نویس بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے: میں اپنی روداد غدر کی ابتدا اس بیان سے کرنا چاہتا ہوں کہ خواہ انگریز اپنے متعلق کچھ ہی کیوں نہ خیال کریں، ہندوستانی انھیں غاصب سمجھتے تھے اور اس احساس میں صوبہ اودھ کے الحاق نے اور زیادہ شدت پیدا کر دی تھی۔[1]

بادشاہ سے بدسلوکی

بہادر شاہ کے ساتھ انگریزوں کا جو رویہ تھا، اس نے بھی غدر کو برپا کرنے میں مدد دی کیونکہ ہندو مسلمان دونوں اس حرکت سے بے حد نالاں تھے۔

"دہلی کے باشندے اس بات کے عادی تھے کہ جب کبھی ان کے عظیم الشان شہر پر قبضہ کیا جائے تو اسے لوٹ لیا جائے اور اس کے باشندوں کو تہ تیغ کر دیا جائے ۱۳۹۰ء ہجری میں اگرچہ تیمور نے دہلی کو لوٹا اور پانچ دن تک قتل عام جاری رکھا تاہم اپنی روانگی کی یادگار قائم کرنے کے لیے اس نے انسانی کھوپڑیوں کا ایک مینار بنوایا اور ناصر الدین کو تخت پر بٹھا کر رخصت ہو گیا اسی طرح جب ۱۷۲۹ء میں نادر شاہ نے شہر پر قبضہ کیا تو اس نے ہندوستانی مورخین کے قول کے مطابق ایک لاکھ باشندوں کا قتل عام کیا اور باوجود اس کے اس نے محمد شاہ کی جان نہیں لی بلکہ تخت پر بٹھا کر اپنے ملک کو چلا گیا، ہر ذلت کے بعد شہنشاہ تخت پر قائم رہا اور رفتہ رفتہ اپنی شہرت کو دوبارہ حاصل کر لیا اس لئے جہاں ہندوستانی باشندے ذلت خوردہ بادشاہ کو اپنا شہنشاہ قبول کر لیتے تھے وہاں اس امر کا ہمیشہ امکان رہتا تھا کہ وہ اپنی طاقت کو دوبارہ حاصل کرے گا وہ انتظار کرنے پر قانع و صابر تھے لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ انگریز جانشینی کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور خاندان مغلیہ کو منتشر کر دینا چاہتے ہیں تو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے جذبات کو ٹھیس لگی جب ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ، اکبر شاہ کے بعد جانشین ہوئے تو اس وقت گورنر جنرل کو ہدایات کے مطابق اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ ایسٹ انڈیا

---

[1] خدنگ غدر ص۴۴

کمپنی کے حق میں تمام رعایا کی سے دست برداری حاصل کر لی جائے مگر بادشاہ نے جو اس وقت سن رسیدہ تھے یہ درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح دوسری تجویز یعنی بادشاہ کو قطب صاحب بھیج دینے کی تجویز بھی نہایت غصہ کے ساتھ مسترد کر دی گئی۔[1]

انگریز بھی مانتے ہیں

حقیقت شناس انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں کہ غدر برپا کرانے میں خود ان کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ غدر اگرچہ بادی النظر میں بنگالی دستہ کی ایک فوجی بغاوت تھی جو چربی والے کارتوسوں کے استعمال سے بھڑکی لیکن آخر کار یہ صرف فوج تک محدود نہیں رہی سول رعایا میں بہت حد تک بے چینی اور بے اطمینانی کے جذبات موجود تھے چنانچہ بہت سے مقامات پر فوجی سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے وہاں کی سول آبادی نے بغاوت شروع کر دی۔"[2]

بنگالی مؤرخ بابو رمیش چندر لکھتے ہیں کہ:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں شمالی اور وسطی ہندوستان کی فوج میں بغاوت ہوئی لیکن بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے اس نے وہاں کی بڑی بڑی جماعتوں میں پھیل کر ایک عام سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کئے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی کا منشا در اصل تمام ہندوستان کو فتح کر لینا ہے اس لیے اس مقصد کے زیر اثر کمپنی نے تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں عام بے چینی تو تھی ہی جس سے بغاوت کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھا کر اشتہارات اور اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو غیر ملکیوں یعنی انگریزوں کی بدعہدی اور ہوس ملک گیری کی پالیسی کی طرف توجہ دلائی۔"[3]

---

(1): غدر کی صبح شام (مٹکاف صاحب کا مقدمہ) صفحہ ۳۲

(2) P. 722 BY ALOCORTHILL, LOST DOMINION.

(3) INDIAN IN THE VICTORIAN AGE. 223.

مسٹر ڈزرائلی (DISRARLI) وزیر اعظم انگلستان نے ۱۰ جولائی ۱۸۵۷ء کو اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا :-

"مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ بنگالی دستہ کے باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت نہیں کی بلکہ درپردہ وہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے دوسری قوموں کے جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا ہمیشہ سے اصول رہا ہے جس کو گورنمنٹ ہند نے گذشتہ چند سالوں سے بالکل خیرباد کہہ دیا ہے چنانچہ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ملک کی تقریباً تمام مقتدر جماعتیں اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر رہی ہیں"[1]

لارڈ رابرٹس (ROBERTS) مسٹر اینسن (ANSON) کی ایک چھٹی کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو اس نے غدر کے ایام میں بہ حیثیت سپہ سالار لارڈ کیننگ (CANNING) وائسرائے ہند کو لکھی تھی۔

"کارتوسوں کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر مطلقاً حیرت نہیں ہوئی، مجھے ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ کارتوسوں میں ایسی چکنی چیز کا استعمال کیا جائے جو بالکل چربی ہے اگولی کے دبانے کے بعد بندوق کے منھ کی جالی اسی چربی سے ڈھکی ہوئی تھی"[2]

گورنمنٹ کی مقدس پالیسی پر حرف گیری کرنا اور اُسے غدر کے پھوٹنے کی بنا قرار دینا درست نہیں بلکہ درحقیقت اس آگ کا محرک[3] وہ بیدردانہ سزا کا حکم ہے جو نہایت

(1) THE LIFE OF BENYOMIN, DISS-ROLLI BY G. R. BUEKEL VOL. IV P 88.

(2) FORTY ONE YEARS IN INDIA P 94.

(3) EARL CANNING SIR H. CUNNIG-HAM.

ہی ذلیل طریق سے میرٹھ کی چھاؤنی میں صادر کیا گیا۔[1]

اشتعال انگیز تعزیر | کارتوس کی چربی پر احتجاج کرنے والوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا گیا جس نے بالآخر غدر کی آگ بھڑکا دی اور سارا ہندوستان اس کی لپیٹ میں آگیا۔

تاریخ جنگ آزادی کا مصنف لکھتا ہے :-

" بندوقوں اور سنگینوں کے پہرے میں پچاسی جوانوں کو فوجی لباس میں سپاہیوں کی حیثیت میں فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا سزا کو بلند آواز سے سنایا گیا جس کا مقصد سپاہیوں کو بدکار مجرموں کی فہرست میں داخل کرنا تھا۔ ان سے فوجی نشانات چھین لیے گئے، پشت کی طرف سے ان کی وردیاں پھاڑ دی گئیں، لوہار زنجیریں اور آلات لے کر آگے بڑھے آناً فاناً پچاسی جوان اپنے ساتھیوں کے اس وسیع مجمع کے سامنے انتہائی بے عزتی کی تمام روشن اور ظاہری علامات یعنی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں نظر آئے یہ نہایت ہی دردناک اور ذلت آفرین نظارہ تھا۔ سپاہی بے حد متاثر ہوئے، جب انھوں نے اپنے بدقسمت ساتھیوں کی اس ناگفتہ بہ حالت اور مایوسانہ انداز کو دیکھا، ان میں سے بعض اپنی پلٹن میں ہردلعزیز تھے ان میں کئی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر برطانوی حکومت کی ترقی کے لیے اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے۔

وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اس بے عزتی کو خاموشی سے برداشت کرنے پر انھیں شرمندہ کیا اور غیرت دلائی۔ اس وقت ایک بھی سپاہی اس میدان میں ایسا نہ تھا جس نے اپنے سینہ میں اس واقعہ سے نفرت و رنج کے جذبات

---

[1] : انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۱۴۳ ۔

پیدا ہوتے ہوئے محسوس نہ کئے ہوئے ہوں، لیکن بعض کی ہی مسیدانی توپوں، بندوقوں اور سواروں کے چمکتے ہوئے خنجروں کی موجودگی میں حملہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ قیدیوں کو ان کی کوٹھڑیوں میں لے گئے پہرہ دینے کے لیے انہیں کے ساتھیوں کو مقرر کیا گیا۔[1]

---

[1]: تاریخ جنگ سپاہ ——— کمپنی کی حکومت ص ۳۶۲ ۔

باب

(۱)

تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے چھینے تخت و تاج

مداخلت • الحاق • بدعہدی • پیش قدمی

ہندوستان پر انگریزوں کا عہد حکومت، شکست و ریخت، تخریب و انہدام، بدعہدی اور خلاف ورزی، مکر و زور، دروغ و فریب اور حرص و ہوس کی ایک مسلسل تاریخ ہے جس میں کہیں خلا نظر نہیں آتا۔ انھوں نے معاہدے کیے اس لیے کہ توڑیں، انھوں نے عہد نامے لکھے لیکن جب چاہا، نوکِ خنجر سے پھاڑ دیا۔ انھوں نے دوست کا بھروپ بھرا، اور دشمن کا کردار ادا کیا، انھوں نے قول و قرار کیا، لیکن پابندی کی زحمت کبھی نہیں گوارا کی، ان کے منھ سے جو بول نکلے وہ سچے تھے لیکن عمل کی میزان میں پہنچ کر وہ جھوٹ بن گئے۔ انھوں نے اپنے مطلب اور مفاد کی خاطر، دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو دشمن بنایا، جسے طاقتور دیکھا، اس کے سامنے سرنگوں ہوگئے، جسے کمزور پایا، اس کے بے جا بن گئے جس کے دشمن بنے اس سے یاری کرلی جس کے دوست ہوئے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

تاجروں کا لباس پہن کر آئے لیکن تاجِ شہریاری سر پہ رکھ لیا اور جو پشت ہا پشت سے اورنگ شہی پہ تمکن چلے آرہے تھے انہیں فقیرِ بے نوا بنا دیا۔ ع

"تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے چھینے تخت و تاج"

انگریزوں کا دور تجارت، سیاست اور حکومت کا مجموعہ تھا وہ تاجر تھے لیکن سیاستدان اور مدبر بھی کہیں کا نہ رہا اور فرمانروا لیکن ان کی ہر چیز پہ تجارت غالب رہی یہ وہ خصوصیت ہے

جو ان کی فطرت بن چکی ہے، دنیا میں بڑے بڑے انقلابات آئے، خود انگریز قوم بھی طوفاں بدوش ادوارِ حیات سے دوچار ہوئی لیکن ان جبلت اور فطرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے محرکات و عوامل سمجھ میں نہیں آ سکتے ——— جب تک ان کے اقدام و ہجوم، پیش قدمی اور مداخلت کی پالیسی کا ایک خاکہ ہماری نظر کے سامنے نہ ہو، اس آئینہ میں ان کی فطرت کے خد و خال بہت واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں، ہندوستان کے والیان ریاست اور آزاد و مستقل مملکتوں کے ساتھ محکم اور مستحکم معاہدوں کے باوجود جو ظالمانہ، سفاکانہ اور سراسر غیر منصفانہ برتاؤ ملحوظ رکھا، وہ تاریخ شقاوت کا ایک اندوہ ناک باب ہے اور انگریزوں کی تاریخ بھی، خواہ آبِ زر سے لکھی جائے، لیکن اس کی سیاہی اپنی روسیاہی چھپا نہ سکے گی۔

قبل اس کے کہ قلم کا رہوار حقائق اور واقعات کے میدان میں آگے بڑھے، مشہور بنگالی مؤرخ بابو رمیش چندر دت کا یہ نتیجۂ فکر پیش نظر رہے تو اچھا ہے وہ فرماتے ہیں:-

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداءً شمالی اور وسطی ہندوستان کی فوج میں بغاوت شروع ہوئی لیکن بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے اس نے وہاں کی بڑی بڑی جماعتوں میں پھیل کر ایک عام سیاسی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں ہندوستان کے بڑے بڑے حصوں کو یکے بعد دیگرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل کیے جانے کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہوئے کہ کمپنی کا منشا در اصل تمام ہندوستان کی تسخیر ہے اس لیے اس مقصد کے زیر اثر کمپنی نے تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں عام بے چینی تو موجود ہی تھی جس سے بغاوت کے رہنماؤں نے فائدہ اٹھا کر اشتہارات اور اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو غیر ملکیوں یعنی انگریزوں کی بدعہدی اور ہوس ملک گیری کی پالیسی کی طرف توجہ دلائی[1]۔

---

(۱) کمپنی کی حکومت

پیشوا کا حشر

مرہٹوں اور انگریزوں کے مابین دُوسری جنگ ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ پیشوا باجی راؤ ہمت ہار گیا اس نے شکست قبول کر کے انگریزوں کو بہت بڑے دردِ سر سے نجات دی، خود پنشن پر قناعت کرنے پر آمادہ ہو گیا اور انگریزوں کو شہنشاہی کرنے کا موقع دے دیا۔ وہ سر مالکم کی سحر کاری سے اتنا متاثر ہُوا کہ اپنے خوش آیند مستقبل، دل پذیر تمناؤں، حوصلوں، اُمنگوں سب سے دستبردار ہو گیا۔ حالانکہ اس کی پوزیشن مضبوط تھی وہ لڑائی جاری رکھ سکتا تھا اور شاید کامیاب بھی ہو سکتا تھا۔

پیشوا باجی راؤ کو سر مالکم نے اپنی تدبیر اور دانش مندی سے اسیر گڑھ نہیں جانے دیا جہاں کامیابی کے روشن امکانات تھے اپنے الفاظ کے طلسم میں اسیر کر لیا۔ جہاں پنشن کے سوا کچھ نتیجہ نہ تھا۔

پنشن کا فیصلہ

جب ایسٹ انڈیا کے کورٹ آف ڈائرکٹرز میں پیشوا کا مسئلہ پیش ہُوا، تو اس ناکام حریف پر رحم کرنے یا مزید سختی کرنے کے سوال پر اختلاف رائے پیدا ہُوا۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی قسمت اب کمپنی بہادر کے ہاتھ میں تھی مخالف اور موافق اظہار رائے کے بعد سر ڈیوڈ اوکٹر لونی۔ سر طامس منرو۔ الفنسٹن صاحب۔ جیکنس صاحب کی رائے یہ تھی کہ اگر پیشوا اسیر گڑھ میں اپنی ۸ ہزار سپاہ کو لے کر چلا جاتا تو لڑائی کو بڑا طول ہوتا کیونکہ اس قلعہ کے حاکم کو سندھیا نے قطعی حکم بھیجا تھا کہ وہ پیشوا کی دل و جان سے امداد کرے اس لیے اس کو ایسی شرطوں پر راضی کر لینا کہ اس کے حق میں سخت نہ تھیں اور سرکار کے مفید مقصد تھیں نہایت دانش مندی کا کام سر مالکم کا تھا۔ اگر کوئی اور شخص اس کام پر مقرر ہوتا، کسی شرط پر پیشوا کو راضی نہ کر سکتا۔ یہ سر مالکم ہی کا افسوں پڑھ کر پھونکنا تھا کہ وہ اس قدر پنشن پر راضی ہو گیا۔

پیشوا کی جلاوطنی

اب پیشوا کو بٹھور میں گنگا کے کنارے پر کانپور سے سولہ میل بھیج دیا۔ ایسے ہی باجی راؤ کے بھائی امرت راؤ کی پنشن لارنڈ ولزلی نے سات لاکھ روپیہ سال مقرر کی اور بنارس ان کے رہنے کے لیے تجویز ہُوا۔ اس نے بھی اکیس برس پنشن پائی، ان دونوں بھائیوں نے

چار کروڑ روپیہ خزانہ سرکار سے پنشن میں لیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وفائے عہد کے لیے اتنا روپیہ اس طرح خرچ کرنا سرکار کمپنی ہی کا حصہ تھا۔ کسی اور فرمانروا سے ہونا مشکل تھا۔(۱)

لیکن یہی پیشوا جب اپنی وفاداری پر ثابت قدم رہ کر اس دنیا سے رخت سفر باندھنے لگا، اور اور اپنے متبنی کو اپنا وارث اور جانشین مقرر کرنا چاہا تو اس کی زندگی میں کمپنی نے آنکھیں بدل لیں اور اس کے مرنے کے بعد پھیر لیں، بہتر ہوگا یہ داستان ہم تاریخ کی زبان سے سنیں:-

"۱۸۱۸ء میں مرہٹوں کی دوسری لڑائی کے بعد پیشوا باجی راؤ نے اپنے تئیں سرجان مالکم کے حوالے کر دیا تھا اس نے ہزیمت پائی اب سو اس کے چارہ نہ تھا کہ بھگوڑوں کی طرح بھاگتا پھرے یا اپنے تئیں برٹش گورنمنٹ کے فضل و کرم و رحم کے سایہ میں لائے اس نے اپنے تئیں انگلش جرنیل کے حوالے کیا وہ جانتا تھا کہ یہ انگلش جرنل میری اس درماندگی اور بے چارگی کی حالت میں دستگیری اور فیاضانہ سلوک کریگا۔

وفادار پیشوا

مالکم صاحب نے گورنمنٹ سے اس کی آٹھ لاکھ روپیہ کی پنشن کرا دی کہ اس میں وہ اپنا اور اپنے خاندان کا گذارہ کرے معزول پیشوا بڑا وفادار اور خیر خواہ تھا اس کے آدمی نیک چلن تھے، نیک چلنی اور پیشوا کی خیر خواہی خالی خولی نہ تھی بلکہ جب سرکار کمپنی کا خزانہ جنگ افغانستان میں خالی ہو گیا تھا، تو پانچ لاکھ روپیہ اس نے قرض دیا اور جب پنجاب کی طرف سے حملہ کا اندیشہ ہوا اور تمام ملک میں مشہور ہو گیا کہ سکھوں اور مرہٹوں میں آپس میں اتحاد ہو گیا ہے، تو پیشوا نے اپنی خیر خواہی کا ثبوت اس طرح دیا کہ اس نے سرکار سے درخواست کی، میں اپنے خرچ سے ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیدل جمع کر کے برٹش گورنمنٹ کی خدمت کرنے کے لیے حاضر ہوں جیسی اس کی طبیعت میں برٹش گورنمنٹ کی خیر خواہی تھی ایسے ہی اس کے پاس خیر خواہی دکھانے کے اسباب بھی موجود تھے، اس کی پنشن ایسی بڑی تھی کہ سالانہ خرچ کے بعد بھی بہت روپیہ پس انداز ہوتا تھا، سوال یہ تھا کہ اس دولت کا مالک و وارث کون ہوگا سو اس نے اپنے ہی کنبہ میں سے اپنے مرنے سے چند سال پہلے ایک لڑکے کو متبنی کیا:"

---

(۱) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ) از ذکاء اللہ صفحہ ۴۱۵

پیشوا کا وصیت نامہ

اس نے وصیت نامہ میں لکھا کہ دوندو نیپت نانا میرا بڑا لڑکا ہے اور گنگا دھر راؤ میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے اور سدا شیو بھٹ دوسرا بیٹا ہے جس کا بیٹا بندو ونائک راؤ میرا پوتا ہے پس یہ میرے تین بیٹے اور ایک پوتا ہے اور یہ میرے بعد دوند نیپت نانا میرا بڑا بیٹا تھا پیشوا کی گدی کا وارث ہے اس نے برٹش گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ نانا کو میرا جانشین اور دولت و خزانوں کا مالک مانے اور اس کو خطاب و پنشن پیشوا کی عنایت کرے یہ درخواست منظور نہ ہوئی، مگر سرکار کمپنی نے بالکل اس سے انکار بھی نہیں کیا، وعدہ کیا کہ باجی راؤ کے مرنے کے بعد اس کے خاندان کے لیے کوئی مناسب تدبیر کی جائے گی غرض یہ معاملہ آئندہ کیلئے اٹھا رکھا گیا۔

پیشوا مفلوج اور اندھا ہو گیا تھا بظاہر معلوم ہوتا تھا محاصل ہند کی گردن پر اب زیادہ دنوں تک اس کی پنشن کا بوجھ نہیں رہے گا۔

۲۸ر جنوری ۱۸۵۱ء کو پیشوا نے ستتر برس کی عمر میں اس دنیا کے دیکھنے سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ۱۸۳۹ء کا لکھا ہوا اس کا وصیت نامہ موجود تھا جس میں لکھا تھا کہ میرے بعد دوندو نیپت نانا میرا متبنیٰ ہے پیشوا کی گدی کا مملکت و دولت کا اثاث البیت کا خزانہ کا غرض ہر طرح کے مال و اسباب کا مالک ہوگا۔

کمشنر کی سفارش مسترد

جب باجی راؤ مرا تو نانا کی عمر ستائیس برس کی تھی وہ ایک نوجوان شخص تھا بیہودہ عادت نہیں رکھتا تھا۔ فواحش میں مبتلا نہ تھا اور اپنے سالانہ کام صاحب کمشنر کی صلاح کے موافق کرنے کو تیار رہتا تھا۔ تیس لاکھ روپیہ کا وارث ہونے کو تھا جس میں سے زیادہ تر پرامیسری نوٹ تھے مگر اس کا کنبہ بڑا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سرکار معزول پیشوا کی پنشن کا ایک حصہ اس کے کنبے کو بٹھور میں عطا کرے گی۔ انتظام تمام معاملات کا سوبہ دار رامچند نیپت کے ہاتھ میں تھا جو سچا وفادار ہوا خواہ پیشوا باجی راؤ کا تھا وہی برٹش گورنمنٹ کے محکمہ میں نانا صاحب کے معاملات کی وکالت اور پیروی کرتا تھا۔ اس نے گورنمنٹ سے عرض کیا کہ آپ ہی نانا صاحب کے ماں باپ اور مالک و آقا ہیں بٹھور کے کمشنر نے پیشوا کے کنبے کے لیے سفارش

کی مگر اعلیٰ گورنمنٹ نے اسے منظور نہیں کیا ممالک مغربی و شمالی میں جس وقت طامسن صاحب لفٹینٹ گورنر تھے، وہ بڑے نیک ذات تھے مگر وہ ہندوستانی رئیسوں اور امیروں شہزادوں کی طرف التفات نہیں رکھتے تھے، انھوں نے کمشنر سے کہا کہ تم پیشوا کے کنبے کے دل میں ایسی امید کو بالکل نہ پیدا ہونے دو کہ سرکار کمپنی اس کی پنشن سے مدد و معاون ہوگی اور حتی الوسع تم پیشوا کے ملازمین کو یہ سمجھاؤ کہ بٹھور میں جمع نہ رہیں اور پھر دکن اپنے وطن چلے جائیں ۔

ڈلہوزی کا فیصلہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے، بھلا وہ اپنے لفٹینٹ کی ایسی رائے سے جو ان کے خیالات کے موافق تھی کیوں اختلاف کرتے ۔ انھوں نے اپنی رائے کو ظاہر کیا کہ کمشنر نے جو سفارش کی ہے وہ نامعقول ہے ہم اس کی نامنظوری میں لفٹینٹ گورنر کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں کہ کسی حالت میں پیشوا کا کنبہ گورنمنٹ پر کوئی استحقاق نہیں رکھتا کہ جس کے سبب سے وہ بھی اس امر کو قبول کریں کہ کوئی حصہ پبلک آمدنی کا اس خاندان کو عطا کیا جائے، گورنر جنرل یہ درخواست کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ فوراً خاندان پیشوا کو سنا دیا جائے مگر اس حکم کی سختی میں یہ نرمی برتی گئی کہ بٹھور کی جاگیر کو بدستور نانا صاحب کے قبضہ میں رکھا گیا، مگر حکومت کے اختیارات جو پیشوا کو دیئے گئے تھے، وہ اس جاگیردار کو نہیں دیئے گئے[1]

(۲)

بمبئی پریسیڈنسی کے "انعام دار"

انگریز اپنے عہد حکومت کے ابتدائی دور میں سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، مگر کسی قیمت پر

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۴۴

یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے قبضہ اور تسلط سے پیشتر لوگوں کو، جو مالی اور اقتصادی رعائتیں حاصل تھیں یا قبضہ اور تسلط اختیار کرتے وقت خود انھوں نے جن رعائیتوں کی توثیق اور تصدیق کر دی تھی، وہ قائم رہیں، انھیں چھیننے ضبط کرنے اور واپس لینے کے لیے انھوں نے بدعہدی اور خلاف ورزی کے جرائم کا ارتکاب کرنے میں ذرا تأمل نہیں کیا بلکہ

قصور ڈھونڈ کے پیدا کیے جفا کے لیے

انھوں نے نئے نئے طریقے وضع کرکے اور نئی نئی صورتیں پیدا کرکے ان سب چیزوں پر قبضہ کر لیا، جو ان کی نہیں تھیں اور جن کو وہ لے لینا چاہتے تھے۔ تاریخ کا ایک صفحہ پھر الٹیے ۔

کمیشن کا تقرر

پریسیڈنسی بمبئی کا بڑا حصہ ۱۸۱۸ء میں پیشوا سے سرکار کمپنی کے قبضہ میں آیا تھا، یہاں مرہٹوں کی حکومت میں ہر قسم کے عہدہ داروں اور زمینداروں کو لاخراجی زمینیں دی گئی تھیں، ان کا نام یہاں انعام تھا، گورنمنٹ کو انعام داروں کے انفصال حقوق میں مشکلات پیش آئیں تو یہاں کے لیے ایک انعام کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے ان انعاموں کو اس طرح ضبط کیا جس سے رعایا میں ایک عام نارضامندی پیدا ہوئی، مرہٹوں کے ملکوں میں جاگیرداروں نے کبھی یہ تکلیف گوارا نہیں کی کہ وہ اپنی زمینوں کے لیے اسناد رکھتے کہ تحریری شہادت اپنے ثبوت دعویٰ میں انعام کمیشن کے روبرو پیش کر سکتے وہ فقط اپنی زمین پر قابض ہونے کا ثبوت رکھتے تھے کہ مرہٹوں کے زمانہ میں زمینیں ہم کو ملی ہیں اور ان کے قبضہ پر سالہا سال گذر گئے ہیں اسی قبضہ کو وہ اپنی مہری اسناد جانتے تھے ؛

جب انعام کمیشن قائم ہوا تو مرہٹوں کے جنوبی ملک تک اس کی شہرت پہنچی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں یہ خبر جاتی تو لوگوں کے رنگ فق ہو جاتے کہ کمیشن اسناد طلب کرتا ہے جو کسی طرح بہم نہیں پہنچ سکتیں ہر روز ان معافی داروں کی قربانیوں ضبطیوں کی ایک فہرست شائع ہوتی جو خوش نصیب اس آفت سے بچ جاتے وہ اس گروہ کے رنج کو اور بڑھاتے تھے جو بھیڑوں کی طرح اپنی کھالوں پر سے اون کترواکر انعام کمیشن کے پاس سے واپس آتے وہ کسی پیشہ اور کام کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے بھیک مانگنے سے شرم آتی تھی، تنگدستی مٹی خوار کرتی تھی انعام کمیشن نے بتیس ہزار جاگیروں کی اسناد

طلب کیں اور پانچ برس میں اس نے بہت بڑا حصہ ان کا ضبط کر لیا[1]۔

(۳)

بھرت پور

دلی کے قریب بھرت پور، جاٹوں کی ایک قدیم اور مشہور ریاست تھی مغلوں کے دور حکومت میں یہ خوب پھلی پھولی احمد شاہ ابدالی نے جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں پر کاری ضرب لگائی اور مرہٹہ ایمپائر کے منصوبے خاک میں ملائے، تو بھرت پور کا راجہ سورج مل، اپنے گوشہ عافیت میں آرام سے بیٹھا رہا پھر جب انگریز دلی پر چھا گئے تو بھرت پور معاہدات کے باوجود ان کی زد سے نہ بچ سکا۔

بھرت پور کے داخلی معاملات میں کمپنی کو دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا لیکن ۱۸۲۵ء میں جب بھرت پور کے راجہ نے وفات پائی تو وراثت کے دو دعویداروں سے متوقع کشمکش ہوئی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمپنی نے بھرت پور کی تسخیر کا عزم کر لیا ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو پچیس ہزار سپاہیوں سے کومبر میئر نے بھرت پور کا ناقابل تسخیر قلعہ فتح کر لیا[2]۔

قبضہ کس طرح ہوا

بھرت پور پر قبضہ کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ انگریز دو دعویداروں میں سے ایک یعنی خورد سال امیدوار کی حمایت میں گئے تھے مخالف راجہ نے جس وقت بیس ہزار سپاہ، انگریزی اور دیسی توپیں دیکھیں تو آنکھیں کھل گئیں، سارے ہندوستان میں یہ مشہور تھا کہ فقط بھرت پور ہی کا قلعہ ایسا لوہا لاٹھ تھا کہ جس پر انگریزوں نے بہت کچھ زور مارا اس کو خبر بھی نہ

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۹۴
(۲) کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۹۹

ہوئی سب کی آنکھیں اس طرف روز و شب لگی ہوئی تھیں وہ سب دل سے دعا اپنے خدا سے مانگ
رہے تھے کہ جیسی انگریزوں کو پہلے ناکامی ہوئی ہے ایسی اب بھی نصیب ہو۔ لارڈ کمبرمیئر جو کمانڈر انچیف
تھے ان کا ہیڈ کوارٹر ۱۰ دسمبر کو بھرت پور کے سامنے قائم ہوا۔ چالیس توپیں رات دن گولے اس قلعہ کی
فصیل پر مارتی رہیں مگر کچھ اثر نہ ہوا آخر کو ایک بڑی سرنگ کھودی گئی اور دس ہزار پونڈ ۔ ۷۵۳ من بارود اس
میں بھری گئی ۱۸ جنوری ۱۸۱۶ء کو یہ سرنگ اڑائی گئی اور اس کے اڑتے ہی زلزلہ آگیا آسمان
کے نیچے ایک ابر آسمان اس کے دھوئیں سے بن گیا مٹی کے ڈھیلے اور لکڑی کے کندے اور ان
کے ساتھ آدمیوں کے سر و دھڑ ٹانگیں اوج ہوا پر پرندوں کی طرح اڑتے تھے ہزاروں کا مرغ روح اجل
کا صید ہوتا تھا غرض اس محاصرہ میں چھ ہزار سپاہی راجہ کے مارے گئے اور ایک ہزار انگریز
قتل ہوئے۔ راجہ درجن سال نے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر فرار نہ ہوسکا گرفتار ہوا پھر بنارس میں نظر بند
ہوا۔ ۵۰ سو روپیہ کی پنشن مرتے دم یعنی ۲۵ سال تک ملی چھوٹے سے راجہ کو پھر لارڈ کمبرمیئر
اور سر چارلس نے مسند پر بٹھایا یعنی ایک معصوم بچہ کو ریاست کی گدی پر بٹھانے گئے تھے۔ غاصب
پر غالب آکر خود غاصب کے بھی باوا بن گئے راج کے خزانہ میں پھوٹی کوڑی نہ چھوڑی جواہر خانہ میں لوچھ
بھی رہنے نہ دی ۴۸ لاکھ روپیہ کے قریب لوٹ کر سپاہ نے آپس میں تقسیم کیا اور لارڈ کمبرمیئر نے بھی
چھ لاکھ روپیہ اپنے حصہ کے لیے اور اس کی دلیل سو فیصدی بڑھ گئی کہ درجن سال بکل راج کا مالک
تھا اور سب خلقت اس کو بھرت پور کا مہاراجہ مانتی تھی اور بلونت سنگھ کے راج کو نہ کوئی ظاہر
میں مانتا تھا نہ دل میں[1] ؎

(۱) تاریخ ہند عہد سلطنت انگلشیہ (ذکاء اللہ)

(۴)

نیپال

نیپال ایک الگ تھلگ ریاست تھی وہ نہ انگریزوں کی حلیف تھی نہ حریف ع

"گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے"

لیکن انگریز اس اصول کے قائل تھے جو ہمارا نہیں وہ ہمارا دشمن ہے انھوں نے نیپال پر چڑھائی کی گورکھے مرنے مارنے میں طاق اور شہرہ آفاق وہ سر کٹانے اور سر کاٹنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے انگریز ایک ہی وقت میں تلوار اور تدبیر کی لڑائی لڑنے کا ہمیشہ سے عادی ہے۔

"جب فوج کی بہادری اور نئے اسلحہ سے کام نہ چلا تو سازش کے تیر چلے، غداروں کو کمک فراہم کی گئی کماؤں کے پہاڑی زمیندار گورکھا حکام سے توڑ لیے گئے، الموڑے کے قلعہ دار نے اطاعت قبول کر لی اور اس وسطی مرکز کے نکل جانے سے دشمن کا دفاعی خط دو ٹکڑے ہو گیا، اپنے مغربی اضلاع کی گورکھے حفاظت نہ کر سکے، کالی ندی کے جنوب کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا انھیں اس سے بھی زیادہ صلح کی یہ شرط ناگوار تھی کہ ایک انگریز قائم مقام کھٹمنڈو میں متعین رہے گا (عہدنامہ سگولی مارچ ۱۸۱۶ء م ۱۲۳۰ھ) انگریزوں نے وعدہ کیا کہ نیپال کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گے اور اس کی خود مختاری کا احترام کریں گے[1]۔"

---

(۱) تاریخ پاکستان و بھارت (سید ہاشمی) صفحہ ۲۴۰

(۵)

ستارہ

انگریزوں نے ستارہ (پونہ) کے مرہٹہ راجہ کو دوستی، رفاقت، سرپرستی اور معاہدے کے شکنجہ میں کسا، اس پر پابندی عائد کر دی کہ وہ دوسرے مرہٹہ سرداروں سے ربط ضبط نہ رکھے، ان کو اپنے پرچم سیادت کے نیچے لانے کی کوشش نہ کرے لیکن وہ سیواجی کی یادگار تھا، نہ خود اس پر رضامند ہو سکتا تھا کہ جو حق قدرت نے دیا ہے اس سے دستبردار ہو جائے نہ مرہٹہ سردار اس پر رضامند ہو سکتے تھے کہ اسے اپنا سردار نہ مانیں۔ یہ کشمکش بڑھی تو انگریزوں نے ایک مہرہ ہٹایا، دوسرا لڑھا دیا، ایک کو معزول کر دیا دوسرے کو سریر آرا بنا دیا، پھر جب دونوں لاولد مرے تو جنگل کی منطق، در شیر کی دلیل سے فائدہ اٹھا کر ستارہ پر قبضہ کر لیا ع

قصہ کوتہ گشت ورنہ درد سر بسیار بود

دیکھیں تاریخ اس ٹریجڈی کو کن الفاظ میں بیان کرتی ہے:۔

جلاوطنی کی سزا

کمپنی پرتاپ سنگھ کو ستارہ کا حکمران تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے سن بلوغت تک کپتان گرانٹ ڈف ریاست کا ناظم مقرر ہوا، شہزادہ جوان ہوا، بغاوت کے ساتھ ذہانت بھی آئی، کپتان ہندی تاجداروں کی ذہانت کو کمپنی کے لیے آفت خیال کرتا تھا، پرتاپ سنگھ کو جلاوطن کر کے بنارس بھیج دیا گیا۔ ستارہ کا جدید حکمران اس کا بھائی مقرر ہوا۔ دونوں بھائی [illegible] میں لاولد مر گئے۔ ان کے منہ بولے بیٹوں کو وراثت کا جائز حقدار تسلیم نہ کرتے ہوئے ڈلہوزی ستارہ پر قابض ہو گیا۔[1]

راجہ ستارہ کا جرم

"۱۰ فروری ۱۸۱۸ء کو جنرل اسمتھ نے ستارہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ شہر شیواجی کے خاندان کی راجدھانی تھا، اس کی فصیلوں پر پرانا نشان

---

(۱) باسو کی داستان ستارہ ــــ کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۵۵

شیواجی کا گھرانا تھا، تجربہ سے یہ ثابت ہوچکا تھا کہ پیشوا کے ساتھ خواہ کچھ ہی عہد وپیمان کیے جائیں یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسرے مرہٹہ سرداروں سے اطاعت کا طالب نہ ہو اور وہ بھی اس کو پیشوا نہ جانیں۔ بلیمن کے عہدنامہ ۱۸۱۳ء میں یہ شرط تھی کہ راجہ بغیر اطلاع اور مشورہ سرکار کمپنی کے کسی اور رئیس کے ساتھ عہد وپیمان نہ کرے گا مگر اس نے اپنی سرداری سے ہو اور رئیسوں پر بھی ہاتھ نہ اٹھایا اور ایک دفعہ سب کو سرکار کی مخالفت پر متفق کرلیا[1]۔

قبضہ کے بعد کیا ہوا؟ سرکار نے آٹھ ہزار روپیہ ماہوار مہارانی ستارہ کی تنخواہ مقرر کردی اور چھ ہزار روپیہ ماہوار مہارانی کے لواحقین کی تنخواہیں مقرر کی گئیں[2]۔

انگریزی دلیل اس قبضہ کی کچھ دلیل بھی ہونی چاہئے تھی، انگریز جب کوئی ناانصافی کا کام کرتا ہے تو دوسروں کو بے وقوف بناتے اور اپنے نفس کو فریب دینے سے نہیں چوکتا، دلیل نگینہ کی طرح تراشی تراشائی پہلے سے موجود تھی۔

"۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے لکھا کہ ستارہ کا راجہ لاولد مرگیا اس کا ملک ضبط ہوکر انگریزی عملداری میں ملایا گیا۔ برٹش گورنمنٹ کو یہ حق ہے کہ جب کسی والئ ملک کے صلبی پسر نہ ہو تو اس کے ملک کو ضبط کرکے اپنی عملداری میں داخل کرے، ستارہ کا راجہ شیواجی کی اولاد میں سے تھا اور شیواجی مرہٹوں کی سلطنت کا بانی اول تھا، گو اس کی سلطنت کی شان وشکوہ باقی نہیں رہی تھی لیکن پھر بھی اس کی بزرگی اور عظمت کی حکایت زبان زد خلائق تھی اور مرہٹے ستارہ کے راجہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اپریل ۱۸۴۸ء کے آخر میں ستارہ کا راجہ آپا صاحب مرگیا وہ اپنے بھائی کا جانشین ہوا تھا جو ۱۸۳۹ء میں اس سبب سے معزول کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف سیفہانہ سازشیں کرتا ہے[3]۔

---

(۱) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ) از ذکاء اللہ صفحہ ۱۱۴

(۲) سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۰۱

(۳) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (از ذکاء اللہ) صفحہ ۳۱

لیکن جن انگریزوں نے اس دلیل کو نہ مانا۔ انھیں جاہ و منصب سے ہاتھ دھونا پڑا :۔

"معلوم ہوا ہے کہ مسٹر بیسکرٹری اور ولیم صاحب نے گورنمنٹ بمبئی سے درخواست کی تھی کہ ستارہ پر انگریزی قبضہ کرایا جائے مگر گورنر بمبئی نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا اور جواب دیا تھا ستارہ پر قبضہ کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ یہ حق مہاراجہ ستارہ کے وارثوں کا ہے"

جب یہ خبر انگلستان میں پہنچی تو وہاں سے گورنر بمبئی کے خلاف ناراضگی کا حکم آیا اس لئے گورنر بمبئی نے گورنری چھوڑ دی اور ولایت چلے گئے[1]

(۶)

ریاست کچھ

جہاں تلوار کام نہیں دیتی، وہاں تدبیر کام دیتی ہے۔ سندھ کا علاقہ انگریزوں کی نظر میں تھا۔ یہاں اپنا جھنڈا گاڑنا چاہتے تھے لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ آخر انھوں نے شطرنج کی بساط بچھائی اور مہرے چلنا شروع کیے پیدل بڑھایا۔ گھوڑے سے تہ دی فرزیں کو بٹھایا۔ بادشاہ کے حصہ میں مات آگئی سارے سندھ پر بیک وقت قبضہ مشکل تھا لیکن سندھیوں کی نااتفاقی، غداری اور خود غرضی کا علم تھا۔ یہ علم کلید مراد بن گیا۔ پہلے ریاست کچھ کی باری آئی۔

برطانوی حکومت کا بھارت رزیڈنٹ اسمتھ لکھتا ہے۔ "سنہ ۱۸۳۹ء کو ریاست کچھ کا راؤ راجا انگریزی معاہدات کے مطابق کے وسیع جنگل میں شکار کر رہا تھا پھر کا تو ہیں نے ورتنگ پکڑا، راؤ کے

---

[1] سر طامس منٹگمری کی ڈائری صفحہ ۱۰۲

ارکانِ دولت پہلے ہی اپنے ولی نعمت کے خلاف تھے، کمپنی بہادر کے فوجی دستہ نے آسانی سے قابو پالیا، حسبِ معمول راؤ معزول ہوا اُسکا تین برس کا بچہ انگریز قائم مقام کی اتالیقی میں وارث قرار دیا گیا ہے۔

(۱۸۱۹ء) اس ریاست کو ایک پتلی آب نائے سندھ سے جدا کرتی ہے لیکن ہمسائیگی کے علاوہ ان میں قدیم روابط کا قوی رشتہ تھا، امیران سندھ راؤ کی مدد کے لیے لڑنے پر تیار ہو گئے تھے، انگریزوں نے فریب کی اشتمالت سے ملا، دوستی کے نامہ و پیام شروع کیے، کئی سال کی کشمکش و کاوش سے خود سندھ میں تجارت کے حقوق نے پاؤں ٹکانے کی جگہ لے لی (۱۸۳۲ء) یہ تالپور تین شاخوں میں بٹ گیے تھے۔ خیرپور، میرپور، حیدرآباد میں الگ الگ دربار لگاتے تھے، فرنگی سے بدگمانی میں تینوں متفق تھے، یہ ان کی سیاسی فراست کا ثبوت ہے مگر جنگی طاقت کا خانہ خالی تھا بادل ناخواستہ کمپنی سے تجارتی معاہدے کرنے پڑے البتہ یہ شرط لکھوائی کہ فریقین ایک دوسرے کے علاقہ پر کبھی لالچ کی نظر نہ ڈالیں گے[1]۔

(۷)

لنکا، سنگاپور، ملایا

انگریزوں کی طاقت بہت محدود تھی لیکن عزائم اتنے ہی بلند تھے وہ دشواریوں پر غالب آتے تھے اور توسیع مملکت کے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے رہتے تھے وہ ہندوستان پر ابھی پورے طور پر قابض نہیں ہوئے تھے لیکن ہندوستان کی ہر ریاست پر نظر رکھتے تھے، اطراف ہند کے وہ علاقے بھی جو ان کے استعماری مقاصد کے لیے مفید ہو سکتے تھے، ان کی نگاہ دوررس سے پوشیدہ نہیں تھے

---

(۱) تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی) صفحہ ۲۸۲

وہ ہر اس مقام پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے جو ہندوستان کو قابو میں رکھنے کے لیے مفید اور معین ثابت ہو سکے چنانچہ ان کی نگاہِ انتخاب لنکا، سنگاپور اور ملایا پر پڑی اور ایک پروگرام کے ماتحت تدریجی طور پر ان سب کو انھوں نے زیرِ نگین کر لیا۔

رفتہ رفتہ

انیسویں صدی عیسوی برطانیہ کے عروج اور اقتدار کا عہدِ شباب ثابت ہوئی جس میں کرۂ ارض کے وسیع و درخشاں ترین قطعات اس نیم تاریک جزیرے کے توابع بن گئے، ان میں ہندوستان اور آسٹریلیا بجائے خود برِ اعظم کی شان رکھتے تھے جزیرۂ سراندیپ (لنکا) کے سواحل سے پہلے ہی انگریزوں نے ولندیزوں کو کان پکڑ کر نکال دیا تھا (۱۷۹۵ء) کئی سال تک کمپنی کے مدراسی عمال یہاں کے بندروں کی دیکھ بھال کرتے رہے پھر اسے علیحدہ شاہی مقبوضہ قرار دیا گیا (۱۷۹۸ء) اور وہاں کے راجہ کو جس کا خاندان دو ہزار سال سے حکمرانی کرتا چلا آتا ہے اس طرح جڑ پیڑ سے اکھاڑا کہ وطن میں بسیرا لینے کی اجازت نہ دی۔ اسی کے قریبی سنین میں سنگاپور کو پہلے اس کے مالکوں سے خریدا (۱۸۱۹ء) کر رفتہ رفتہ برطانوی بیڑے کا بڑا مستقر بن گیا لیکن دارملایا کی اسلامی ریاستوں کی آزادی کوئی پچیس برس بعد پامالی میں آئی (۱۸۷۴ء)[2]

(۸)

برما - ملکِ زرنگار

اب برما کی باری آتی ہے۔

---

(۱) یہ ۱۸۱۵ء کا واقعہ ہے، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ج ص۸۴۲ عنوان "لنکا"۔

(۲) "تاریخ پاکستان و بھارت" جلد دوم (سید ہاشمی) ص۲۲۵۔

برما کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریز وہاں کی تجارت معیشت اور معاشرت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے اور برما کا راجہ، برما کے عوام، برما کے خواص اقدام کی اس پالیسی کو ناپسند کرتے تھے وہ اسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ ان کے دیس میں اجنبی لوگ آئیں اور اس کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کرلیں انگریز اسے گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ وسائل و ذرائع ہوں اور ان کی دسترس سے دور رہیں اسی کشمکش نے جنگ برما کی صورت اختیار کی اور انگریز وہاں کے بھی آقا اور مالک بن گئے۔

برما پر قبضہ کی عہد بہ عہد لیکن مختصر اور مجمل کہانی یہ ہے :۔

دھاندلی اور سینہ زوری

سلطنت برما کے لوگ بدھ مت کے پیرو بیشتر چینی نسل سے مخلوط ہیں قدیم سے ان کے سنہری مندر (پگوڈا) برما کی زرداری کے معین رہے کہ پالی اور لاطینی کتابوں میں اسی کا نام ہی "سونا پرانت" یعنی ملک زرنگار لکھا جاتا تھا شمالی مشرقی اور جنوبی ساحل تک عمل داری پھیلنے کے علاوہ ان دنوں صوبہ آسام برما میں بندھا ہوا تھا برمی کبھی کبھی جنگلوں کی حدیں چیر کر مشرقی بنگال پر بھی ہاتھ مار جاتے تھے راجہ کے دربار میں انگریز تاجروں کی کوئی وقعت نہ تھی اکثر انگریزی تاریخوں میں ان کی بے توقیری کے قصے ملتے ہیں جب سرحدی شکایات اور باضابطہ مراسلت پر توجہ نہ ہوئی تو کمپنی نے برما پر بری اور بحری فوج کشی کی (۱۸۲۴ء م ۱۲۳۹ھ) اور جگہ جگہ اتنے گولے برسائے کہ بدھی سپاہیوں کے ہوش اڑا دیئے، دو سال کی کش مکش اور صلح میں ہیر پھیر کے بعد راجا نے ارکان، آسام جنوبی ساحل (تناسرم) اور ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ دینا قبول کیا عہد نامہ ینڈبو سنہ ۱۸۲۶ م سنہ ۱۲۴۲ھ) مگر حقارت کے بجائے دلی نفرت کی آگ سلگتی رہی انگریز سفیر و سوداگر بالاتفاق بیان کرتے تھے کہ اہل برما کے ذلت آمیز سلوک میں کچھ فرق نہیں آیا، یہاں تک کہ دوسری جنگ کی نوبت آگئی (۱۸۵۲ء م ۱۲۶۸ھ) راجا اتنی مزاحمت بھی نہ کرسکا جتنی پچاس برس پیشتر اس کے پیش رو کرچکے تھے، جنوبی برما پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اس پر بھی کہتے ہیں کہ یہ مغرور حاکم دوستی کرنے یعنی فرنگیوں کے آگے سر جھکانے پر تیار نہ ہوئے چونتیس برس بعد برطانوی ملوکیت کا تیز سیلاب آیا اور برما کی رہی سہی آزادی کو بہا لے گیا (۱۸۸۶ء) راجا نے ہتھیار ڈال دیئے صلح کرلی مگر اُسے جلاوطن کردیا گیا۔[1]

---

[1] تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی) صفحہ ۲۹۴۔

جنگ برما کے تین دور ہیں، پہلی لڑائی ۱۸۲۴ء میں ہوئی، برمی بڑی بہادری سے لڑے،
لیکن توپ کے گولے نہ مار سکے نہ سہہ سکے، ہار گئے، پھر بھی حالت یہ تھی کہ اس
جنگ پر ایک لاکھ روپیہ روزصرف ہو رہا تھا، اس کے باوجود انگریز
کمانڈر کی رائے یہ تھی کہ "انگریزی فوج پرومیہ سے آگے نہ بڑھے، البتہ
یہاں جو لڑے اس سے لڑائی کرے" (۱)

گویا ہر طرح کے ساز و سامان جنگ کے باوجود بہادر انگریزوں کی بزدلی کا یہ عالم تھا کہ ایک
لاکھ یومیہ خرچ کرنا منظور تھا، مگر آگے بڑھنا منظور نہ تھا؛

ریزیڈنٹ کا تقرر

صرف بہادری کب تک کام دیتی؟ آخر برمی آتشین گولوں کا مقابلہ
نہ کر سکے، ہتھیار ڈال دیئے، آسام اراکان اور تناسرم کا علاقہ انگریزوں
کو دے دیا، ایک کروڑ تاوان جنگ
مع چار قسطوں میں ادا کرنے کا وعدہ کیا اور انگریز ریزیڈنٹ کو آوا میں رہنے
کی اجازت دی (۲)

اس طرح انگریزوں کو برما میں سرکاری طور پر رہنے اور وہاں کے معاملات میں براہ راست
مداخلت کرنے کا موقعہ ملا،

اس کے بعد لڑائی کا دوسرا دور (۱۸۵۱ء) شروع ہوتا ہے:-

انگریز تاجروں کی شکایت

"ستمبر ۱۸۵۱ء میں رنگون کے تاجروں نے ایک عرضداشت
لارڈ ڈلہوزی کے پاس بھیجی جس میں انھوں نے لکھا یہاں ہماری
جان و مال آبرو محفوظ نہیں ہے، بے شمار قزاقیاں و چوریاں ہوتی ہیں، چھوٹے چھوٹے بہتان اور الزام

---

(۱) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ) ذکاء اللہ صفحہ ۴۴۸؛

(۲) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ) ذکاء اللہ صفحہ ۴۵۱؛

لگائے جاتے ہیں بے قاعدہ محصولات زبردستی وصول کئے جاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے واسطے شکنجہ فرسائی بھی ہوتی ہے قصہ مختصر اب ہم ایسے تنگ ہو گئے ہیں کہ اگر گورنمنٹ ہماری محافظت کی ضامن نہیں ہوگی تو ہم اس ملک کو چھوڑ کر اور اپنے مال واسباب کا نقصان اٹھا کر یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس داد فریاد پر گورنر جنرل نے برہما کی گورنمنٹ کو لکھا کہ انگریزوں کا جو نقصان اس کی عمل داری میں ہوا ہے اس کے معاوضہ میں وہ دس ہزار روپیہ جرمانہ دے اور رنگون کے حاکم کو جس نے یہ قصور کیا ہے موقوف کرے اور انگلش ریذیڈنٹ کو رنگون یا آوا میں رہنے دے، ان درخواستوں کی منظوری کے لیے زور لگانے کے واسطے یہ بہتر معلوم ہوا کہ موڈور لیمبرٹ اپنے بیڑے کو ساتھ لے کر بندرگاہ رنگون میں سیر کرے اگر پانچ ہفتہ کے عرصہ میں دربار برما سے اس کے پاس جواب نہ آئے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے نزدیک جو بہتر اور مناسب سمجھے وہ کام کرے؛

جو برمی جنگ کے پہلے دور میں شکست کھا چکے تھے وہ بھلا اب اس انگریزی بیڑے کو دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کب بجا رکھ سکتے تھے؛ چار و ناچار سر اطاعت خم کرنا پڑا اور ہر وہ بات ماننی پڑی جسے ماننے پر آمادہ نہیں تھے

راجہ برما کی عرض والتجا اس موقع پر فاتح اور مفتوح غالب اور مغلوب کے مابین ناز دینا اور عجز و غرور کی جو نمائش ہوئی اسے تاریخ کے آئینہ نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے، راجہ نے مصالحت کرنے کے واسطے ارکین سلطنت سفیر بنا کر بھیجے، ۱۴ اپریل کو یہ سفر نہایت زرق برق پوشاک پہنے ہوئے اور تین تین زریں چھتریاں لگائے ہوئے انگریزی کمشنروں سر جان پیپ رکمو موڈور لیمبرٹ اور کپتان فائر کے پاس گئے ان کو سلامی توپوں کی اتاری گئی اور ایک کمرہ میں ملاقات ہوئی، دوسری دفعہ ملاقات ۵ تاریخ کو ہوئی انھوں نے عاجزانہ یہ درخواست کی کہ میادے ان سے نہ لیا جائے، پیگو میں بسین باکوئی اور بندرگاہ ان کے پاس رہنے دیا جائے۔

گورنر جنرل کی منظوری کے آنے تک اس مجلس کا اجلاس ملتوی کیا گیا اور تیس دن کے لیے اشتہار

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاءاللہ) ص ۶۱۱

دیا گیا کہ لڑائی نہ ہو۔ ۸ مئی کو یہ ایلچی گورنر جنرل کے حکم سننے کے لیے بلائے گئے اور ان کو حکم سنایا گیا کہ گورنر جنرل جہاز دینے کو راضی ہے مگر باقی ٹیگو پر قبضہ رکھنے پر اصرار کرتا ہے، ایلچیوں نے اپنے راجہ کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ اگر ٹیگو برمیوں کے حوالے کر دیا جائے تو اس کے عوض میں وہ بہت روپیہ نقد دینے کو موجود ہیں یہ درخواست اس کی نامنظور ہوئی، پھر ایلچیوں نے عرض کیا کہ راجہ اپنی مملکت کا کوئی حصہ نہیں دے سکتا۔

چوبیس[۲۴] گھنٹے کے اندر باہر نکل جاؤ

اگر ٹیگو اس کو واپس دیا جائے تو وہ روپیہ خاطر خواہ دے کر صلح کرنے کو موجود ہے انگریز لیبن یا مرتبان میں آزادانہ بندرگاہ رکھ سکتے ہیں مگر برما کا راجہ اپنا کل صوبہ انگریزوں کو نہیں دے سکتا، انگریزی کمشنر ان باتوں کو سنتے سنتے تھک گئے۔ ۸ مئی کو انھوں نے برما کے ایلچیوں کو اطلاع دی کہ وہ یہاں سے چوبیس[۲۴] گھنٹے کے اندر باہر نکل جائیں[۱]

برما کی لڑائی کیوں ہوئی؟ انگریزوں نے کن وجوہ سے اس پر قبضہ کیا، انگریز تاجروں کو کیا شکایات تھیں اور انگریزوں کا برتاؤ وہاں کے راجہ اور سفراء کے ساتھ کیا تھا؛ یہ ساری تفصیلات نظر سے گذر چکی ہیں۔

انگریز کیا کہتے ہیں

لیکن انگریزوں نے ہندوستان کے اسکولوں میں پڑھانے کے لیے ابھی زمانہ میں جو تاریخ مرتب کی وہ کچھ وہی کہتی ہے:۔

مداخلت برما

"لارڈ ایمہرسٹ صاحب ۱۸۲۲ء میں گورنر جنرل ہندوستان کے مقرر ہوئے ان کے وقت میں برما کی لڑائی ہوئی، وجہ اس کی یہ تھی کہ باشندگان اراکان بسبب ظلم اور تعدی راجہ برما کے اپنا دیس چھوڑ کر سرکار کمپنی بہادر کی عملداری میں آ بسے تھے اس لیے راجہ برما اور حاکم اراکان انگریزوں سے ناراض ہو گیے اور جزیرہ شاہ پوری پر جو کہ قبضہ اقتدار کمپنی بہادر میں تھا برما کی فوج نے حملہ کیا، انگریزوں نے ان کا مقابلہ کیا یہ لڑائی ۱۸۲۴ء میں واقع ہوئی سرکار کمپنی کی فوج رنگون کو فتح کر کے آوا تک جا پہنچی اس لیے والئی برما نے آسام اور اراکان اور تناسرم کے صوبے سرکار کمپنی بہادر کے حوالے کیے اور ایک کروڑ روپیہ نقد دیا تب صلح سرکار سے ہوئی[۲]"

---

(۱) تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۱۲۔

(۲) واقعات ہند صفحہ ۱۴۴

(۹)

میسور

میسور بھی ان کشتگان ستم میں ہے جسے بار بار زوال و انحطاط سے دوچار ہونا پڑا انگریزوں نے اسے مسلمانوں سے (ٹیپو سلطان) سے چھینا اور ہندو کے حوالے کر دیا پھر ہندو سے خفا ہوئے تو اسے اُتار اور اپنا چیف کمشنر بھیج دیا کہ وہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لے لے ؎

۱۸۳۱ء میں اس کی رعایا نے سرکشی اختیار کی اور میسور کو بدنظمی سے بچانے کے لیے راجہ کرشنا راج تخت سے اُتار اگیا اور چودہ لاکھ سالانہ اس کی پنشن مقرر کی گئی کہ وہ اپنے محل میں بیٹھا عیش اڑایا کرے اور سول گورنمنٹ کرنیل مارک کیلین صاحب کو عطا ہوئی وہ ریاست میں چیف کمشنر مقرر ہوئے[1]

(۱۰)

افغانستان

انگریزوں کی ہوس جوع الارض نے ہندوستان پر قناعت نہ کی ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیئے

انھوں نے اطراف ہند کے متعدد مقامات پر للچائی ہوئی نظر ڈالی، ان میں افغانستان بھی تھا، یہی ایک ایسا شکار تھا جس نے شکاری کے دانت توڑ دیئے (پہلے اس واقعہ کی مختصر تفصیل اپنے سامنے

---

(۱) تاریخ عروج ہند عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ ج صفحہ ۹۲

رکھتے ہیں پھر بعض دوسرے گوشوں پر نظر ڈالیں گے ؛

پس منظر

احمد شاہ دُرانی ملت اسلامیہ کا گوہر تابندہ تھا کہ انحطاط کی گہرائیوں سے اُبھرا اور پستیوں کے اندھیرے میں چمکا۔ وہ اقوام عالم کی تاریخ میں اس لیے ممتاز ہے کہ ایک نئی قوم کا بانی ہوا۔ افغانستان کی آزاد مملکت کا وجود اسی کی ہمت و شجاعت کا رہین منت ہے احمد شاہ نے کئی بیرونی ملک فتح کیے اور ایک بڑی سلطنت فراہم کی جو اس کے فرزند تیمور شاہ (۱۷۷۳ء تا ۱۷۹۳ء = ۱۲۰۷ھ ہجری) کے زمانے تک قائم رہی پنجاب، کشمیر، سندھ اور شمال میں بلخ و بدخشاں بلکہ مشرقی ایران کے اضلاع تک کابل کے زیر نگیں ہو گئے تھے لیکن شخصی سلطنتوں کی عمر بہت کوتاہ ہوتی ہے۔ تیمور شاہ نے مرتے وقت ایک بادشاہی کے لیے تیئس بادشاہزادے وارث چھوڑے! یہی کثرت حکومت کی وحدت کے حق میں آفت ثابت ہوئی، بھائیوں نے لڑنا شروع کیا، چند سال کے بعد زمان شاہ غالب آگیا اور دادا کا حق لینے کی غرض سے ہندوستان پر بھی حملہ کرنے کا داعیہ رکھتا تھا (۱۷۹۸ء) مگر وہ سال بعد ایک معزول پناہ گزیں کی حیثیت سے پنجاب آیا اور اسی انگریز کمپنی کے عنایت سے جسے حملہ کی دھمکی دی تھی، لدھیانہ میں اقامت اختیار کی (سنہ ۱۸۰۱) چند سال میں یہی بُرے دن اس کے بھائی شاہ شجاع کو دیکھنے نصیب ہوئے (۱۸۰۹) حتیٰ کہ کابل کی حکومت درانیوں کے ہاتھ سے نکل کر بارک زئی قبیلے کے وزیر پائندہ خاں اور اس کے اولاد کے قبضہ میں منتقل ہوئی، یہی خاندان ابھی تک تخت کابل کا وارث چلا آتا ہے ؛

مگر بیس پچیس برس کی خانہ جنگی اور سیاسی انتشار نے درّانی سلطنت کو خاصے لگایا اور خود افغانستان کو پارہ پارہ کر دیا تھا، پہلا بارک زئی جس نے دُرانیوں کو دھکایا اور علانیہ مسند شاہی پر قدم رکھا پائندہ خاں وزیر کا فرزند دوست محمد خاں تھا (۱۸۲۶ء م ۱۲۴۱ھ) پھر بھی شمال میں ہرات دُرانی شہزادوں کے ہاتھ میں دیا رہا اور جنوب میں شاہ شجاع سکھوں کی مدد سے حدود کابل پر لاتین چلاتا رہا اسے کامیابی نہیں ہوئی البتہ اسی تقریب سے رنجیت سنگھ کی فوجیں سندھ پار، خیبر تک چڑھ آئیں۔ پشاور میں اپنا عمل دخل کر لیا، دوست محمد نے انگریزوں کو دوست بنانے کی کوشش کی، کئی سال تک نامہ و پیام

کے کنکوے لڑتے رہے استنے میں ایک بڑا پیچ یہ پڑا کہ جب رُوس کو نپولین کی ترک تازسے نجات مل گئی تو خود ایشیا میں جولانی دکھانے لگا۔ ایران کی وساطت سے دوست محمد کے ساتھ دستانہ روابط قائم کیے (۱۸۳۰ء) ہر چند کمپنی کا علاقہ "شاہی مقبوضہ" نہ تھا اور کابل و ہند کے درمیان اُن دنوں سندھ اور پنجاب حائل تھے، مگر روس کے بھاری قدموں کی دھمک برطانوی وزارتِ خارجہ کو لندن میں سنائی دی اسی کی ہدایت کے مطابق گورنر جنرل (آک لینڈ) نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ دوست محمد کو کابل سے جبراً نکالا جائے، شاہ شجاع ہی اپنے باپ دادا کی گدی پر بٹھایا جائے تاکہ وہاں بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزوں کا تسلط جمنے کا راستہ نکل آئے۔

حقیقت میں اب کمپنی بہادر کو علانیہ مغل اعظم کی جانشینی کے دعوے تھے (اور کابل محمد شاہ کے زمانے تک سلطنت مغلیہ کا صوبہ رہا تھا) منصوبے میں رنجیت سنگھ کو برائے نام شریک کیا گیا تھا مگر اُس نے پنجاب کے راستہ فوج گزارنے کی اجازت نہیں دی نہ اس سے مالی یا فوجی مدد کی گئی دوسرے انہی دنوں خود اُس پر جسم و جاں کا پرانا دشمن فالج آگرا اور آخر جاں لے کر ٹلا۔ کابل کی جنگ تنہا کمپنی بہادر نے لڑی۔

جنگ، تباہی، پسپائی

اعلانِ جنگ (اکتوبر ۱۸۳۸ء م سنہ ۱۲۵۴ ہجری) کے ساتھ جنوبی پنجاب اور بمبئی کے مرکزوں سے دو زبردست فوجیں چڑھائی گئیں بمبئی کے قشون قاہرہ نے راہ میں معاہدے کے احترام میں سندھ کی آزادی کو روند ڈالا۔ اپریل ۱۸۳۹ء میں دونوں لشکروں کے سیلاب قندھار پر آ ملے راستے کی دشواری اور جاڑے کے حملوں کے سوا سفر میں کوئی غنیم نہ ملا، قلعہ غزنی کی مزاحمت کابلی دروازے کے سرنگ سے اڑتے ہی ہوا ہو گئی، دوست محمد خاں نے یہ دل شکن خبر اور اس لاؤ لشکر کی آمد آمد سن کر کابل خالی کر دیا اگست ۱۸۳۹ء (۱۲۵۵ھ) میں شاہ شجاع انگریزی فوج کے ساتھ اپنے جدی پایۂ تخت میں دوبارہ داخل ہو گیا۔ ایسی "سہل فتح" سے ملوکیت پسند انگریزوں کے دل کھل گئے حوصلے بڑھ گئے ایران کی رقابت رُوس کی شرارت کے بہانے بناتے رہے ملکی معاملات میں دخل بڑھاتے رہے فوج کی واپسی ملتوی کر دی اوّل اوّل قبائل کو دوستی کا معاوضہ دینا قبول کیا تھا۔ اب مستغنی ہو کر ادائی روک دی ان کا ناگوار طرزِ عمل بے جا

مداخلت شجاع کا شاہ شطرنج رہ جانا دیکھ کر افغانی مسلمانوں کو رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ یہ کافر فرنگی حمایت کے بجائے حکومت کی گھات لگا رہے ہیں جگہ جگہ چھاؤنیاں جما رہے ہیں غالباً شاہ شجاع کے حریف غیرت و غضب کی ان چنگاریوں کو ہوا دیتے تھے، یہی بڑھتے بڑھتے آتش قتال بن گئیں، مسلم افاغنہ کی شورش نے ایک ایسی قومی جنگ کی صورت اور وسعت اختیار کر لی جس سے ممالک ایشیا میں برطانوی بزور آزما پہلے کبھی دوچار نہ ہوئے تھے، یہ خالص اسلامی قوم تھی کہ اپنے اختلاط انتشار جہالت پس ماندگی کے باوجود حمیت کے ہتھیاروں سے لڑی اور یورپ کے توپ و تفنگ مکر و بال فرنگ کا منہ پھیر دیا، ایک ہی سال (۱۸۴۱ء = سنہ ۵۷ - ۱۲۵۶ ہجری) میں صاحب کے اتنی ٹھوکریں ماریں کہ مالکان کمپنی سراسیمہ ہو گئے۔ تجارتی حصہ دار خرچ کی زیادتی سے الگ گھبرا گئے تھے۔ آک لینڈ کو لکھا کہ ہمیں صاف صاف اپنی ناکامی تسلیم کر کے افغانستان کو چھوڑ دینا چاہیے" مگر یہی زمانہ تھا جب دوست محمد خاں نے ادھر ادھر حملے کرنے کے بعد اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا (نومبر ۱۸۴۰ء) اور صرف دو لاکھ سالانہ وظیفہ پر کلکتہ میں نظر بند رہنا گوارا کر لیا۔

حرص کشور کشائی

آک لینڈ کی حرص کشور کشائی نے نظامت کمپنی کی رائے! سننے سے انکار کر دیا اسی ہی ہندوستان کے انگریز ارباب سیاست یقین رکھتے تھے کہ افغانی شاہ و شہریار کے قابو میں آنے سے ان کی قوم کو اسی طرح دبوچ لیں گے جیسے کہ ہندوستان کے ہر خطہ میں کامیاب ہوئے تھے، کابل کے مسلمان عوام اپنے امیروں وزیروں سے زیادہ آزادی پسند اور باغیرت نکلے ہم عصر مؤرخ مارش مین گواہی دیتا ہے انگریزی فوجوں نے جس قدر سفاکی سے انھیں دبا

---

(۱) آکسفورڈ ہسٹری صفحہ ۶۰۰، مارش مین صفحہ ۲۱۴۔ جنگ کابل کے متعلق انگریزی میں بہت سی کتابیں مختلف عنوانوں سے تصنیف ہوئیں اور کافی تفصیل سے داستان سناتی ہیں مگر افغان مجاہدین کی جان بازی کے کارنامے صرف ضمناً آگئے ہیں خود وہاں کے کسی مؤرخ کی مستند اور مفصل کتاب تک ہماری رسائی نہ ہو سکی ہمارے بیانات کے بڑے انگریزی ماخذ تھے ان میں اسمتھ، مارش مین (صفحہ ۴۰۱ تا ۴۰۴) اور آکسفورڈ ہسٹری (صفحہ ۶۰۰ تا ۶۰۴) ہیں۔

چاہا۔ اُن میں اُسی قدر زیادہ سرفروشی کا جذبہ بلند ہُوا۔ اور بچہ بچہ انگریزوں کا دشمن بنتا چلا گیا (حاشیہ ۱) غزنی حیدر آباد سقندھار مضبوط قلعوں میں جو دستے متعین تھے ان کی رسد بلکہ آمدورفت تک بند ہو گئی، خود کابل کی زبردست چھاؤنی پر غیر منظم لشکروں نے چھاپے مارنے شروع کئے، ایک بڑے معرکہ میں انگریزی سپاہ کو سخت شکست دی۔ دربار کابل میں انگریزوں کے بدمعاش ایجنٹ (سر الگزینڈر برنس) کو مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا[۱] (نومبر ۱۸۴۱ء م سنہ ۱۲۵۷ ہجری)

انگریزوں نے عہدنامے پر کان دبا کے دستخط کر دیئے، چھ توپوں کے علاوہ پورا توپ خانہ گولہ بارود کا تمام ذخیرہ کئی فرنگی یرغمال، کثیر مال غنیمت اکبر خان کے حوالے کیا، ڈیرہ ڈنڈا اکھاڑ کر کابل کی چھاؤنی سے پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ باقاعدہ فوج کے سپاہی قریب پانچ ہزار اور گیارہ بارہ ہزار لشکری ہمراہ تھے، سالِ نو (۱۸۴۲ء) کے پہلے دن کوچ شروع ہُوا، ناکامی کے رنج نے میلادِ مسیح اور عیدِ نوروز کی خوشیاں پہلے ہی خاک میں ملا دی تھیں لیکن مصیبت کے پہاڑ سفر میں ٹوٹے کہ خورد کابل کے تنگ درے میں غلزئی قبائل نے گھیر لیا اور چیلوں کی طرح بوٹیاں نوچ نوچ کر خاتمہ کر دیا، مشہور ہے کہ پورے لشکر میں صرف ایک فرنگی ڈاکٹر برائے ڈن بیمار و نیم جان، جلال آباد پہنچ سکا اور وہاں اس ہولناک تباہی کی کیفیت بیان کرنے کو صرف وہ عورتیں بچے یرغمال اور زخمی انگریز جو اکبر خاں[۲] کی تحویل میں دیئے تھے محفوظ رہ گئے[۳]

---

(۱) برنس ہمارے زمانے کے جون لارنس کی طرح ان اسلامی ملکوں میں سالہا سال تک سیاحت و جاسوسی کر چکا تھا کابل کی بدمستی نے اسے اوباشوں کا بھی سرخیل بنا دیا تھا (دیکھو مارٹن ص ۴۰۱، او کس ص ۲۰۸)۔

(۲) مارٹن (ص ۴۰۰) کا بیان ہے "افغانیوں کے ساتھ انگریزوں نے بُرا سلوک کیا تھا جس کا انھوں نے بڑی بے رحمی سے انتقام لیا اور انگریزوں کو چُن چُن کر قتل کیا، یوں بھی سارا ملک دشمن ہو گیا تھا۔ اکبر خاں اور اس کے بارک زئی رفیق حتی الامکان انگریزوں کو بچاتے رہے، لیکن مجاہدین افاغنہ پر ان کی انگریز دوستی کا مطلق اثر نہ ہُوا۔

(۳) تاریخ پاکستان و بھارت (سید ہاشمی)

باسو کا تجزیہ — تسخیرِ کابل سے میک ناٹن کے حادثۂ قتل تک کے واقعات کو باسو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :-

• اہلِ افغانستان نے بیگمات پر حملہ ہوتے دیکھا ان کے ملک کو لوٹ لیا گیا ہر اُس چیز کو تباہ و برباد کر دیا گیا جو ان کے نزدیک مقدس اور متبرک تھی ان مناظر نے ان کی رگوں میں خونِ انتقام دوڑا دیا۔ افغانستان کے باشندے ان بداعمالیوں کو برداشت نہیں کر سکے، ان کے نزدیک انگریز کا وجود انسانیت شرافت اور اخلاق سے عاری ہو چکا تھا۔ افغانوں نے انگریزوں کی بدعہدیوں کے پیشِ نظر اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے وطن کو ان کے وجود سے پاک کر دیں گے ان کے طرزِ تفکر میں شاہ شجاع تمام مصائب کا سرچشمہ تھا، شاہ شجاع کو وہ اپنے وطن سے نکالنا چاہتے تھے، برطانوی سنگینوں کی مدد سے حاصل شدہ تختِ افغانستان شاہ شجاع کے لیے کانٹوں کا بچھونا تھا، شاہ شجاع کو اس تخت کے لیے جان سے ہاتھ دھونے پڑے، جب شاہ شجاع اپنے وطن کو خیرباد کہتے ہوئے کابل سے روانہ ہوا تو راستہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ برنز کے خلاف افغانستان میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے، ان کے نزدیک برنز ایک ذلیل اور ناشکر گزار انسان تھا وہ ایک غدار تھا جس نے افغانوں کے لیے مصائب کے دروازے کھول رکھے تھے، وہ غداری کی موت کا مستحق تھا ایسا ہی ہوا۔ دن کی روشنی میں وہ کابل میں قتل کیا گیا، میک ناٹن افغانستان میں کابل کا کھیل نہیں کھیل سکتا تھا چونکہ انگریزوں کی سلامتی افغانستان کو خیرباد کہنے میں تھی، اس لیے انہوں نے دوست محمد کو تخت نشین کرنے کا وعدہ کیا، اس سلسلہ میں دوست محمد کے فرزند اکبر خان سے ایک معاہدہ کیا گیا، لیکن اس معاہدہ کی خلاف ورزی

میں انگریزوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی میک ناٹن اپنے وحشیانہ اور غیر انسانی طرزِ عمل سے بہت نادم ہو چکا تھا میک ناٹن کا غدارانہ طرزِ عمل اس کی موت کا سبب بنا جب میک ناٹن اور اکبر خان معاہدہ سے متعلقہ گفت و شنید کر رہے تھے تو میک ناٹن قتل کر دیا گیا [۱] ؛

اب میک ناٹن کے قتل کا منظر بھی دیکھ لیجئے :-

میک ناٹن کا غدارانہ سلوک ماتحت ہیں ایسے افغان سرداروں سے گفت و شنید کے بعد آگے بڑھا۔ کابل اور برطانوی معسکر کے درمیانی مقام پر فریقین شرائط پر صلح کرنے کے لیے جمع ہوئے یہ امر متفقہ طور پر طے پایا کہ تین دن کے اندر برطانوی فوجیں کابل خالی کر دیں گی، مقررہ وقت گزر گیا برطانوی سپاہی اپنے معسکر میں قیام پذیر تھے، معاہدہ کی برخلاف ورزی افغانوں کو ناگوار خاطر ہو رہی تھی۔ میک ناٹن کو از سرِ نو گفت و شنید کی دعوت دی گئی ؛

میکناٹن کس طرح قتل ہوا میکناٹن اپنے تین ساتھیوں سمیت دو کابل کے کنارے اکبر خان سے ملنے کے لیے روانہ ہوا، مقررہ مقام پر یہ وفد رک گیا۔ اکبر خاں بھی پہنچ گیا، اسی گفت و شنید کے بعد اکبر خان "بگیر بگیر" پکار، برہنہ تلوار میکناٹن کی طرف بڑھ رہی تھیں، میکناٹن کی زبان سے "از برائے خدا" کے الفاظ نکلے [۱] ۔

اور یہ میکناٹن صاحب تھے کون بزرگ؟ سید فدا حسین اپنی ـــــ کتاب نیرنگ افغانستان میں لکھتا ہے :-

• میکناٹن نے اکبر خان کو اپنی دوستی کا یقین دلانے کے لیے ایک خط لکھا اس خط میں میکناٹن نے اکبر خان کو بعض افغان غداروں سے خبردار رہنے کا مشورہ دیا

---

(۱) ہندوستان میں فرنگی اقتدار کا عروج ـــــ کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۲۴

(۲) کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۲۲ ؛

تھا لیکن ساتھ ہی میک ناٹن نے ان سرداروں کو اکبر خان کے خلاف خط لکھے تھے
اکبر خان نے اپنے سرداروں کو ایک جرگہ میں بلا کر انھیں میکناٹن کا خط دکھایا۔ اس
پر سرداروں نے بھی وہ خطوط ظاہر کر دیئے جو میک ناٹن نے انھیں لکھے تھے۔
میکناٹن جب اکبر خاں سے ملنے گیا تو اس نے انگریز سپاہیوں کو آس پاس کے
مقامات پر چھپا دیا۔ اور اشارہ کا منتظر رہنے کا حکم دیا۔ اکبر خاں نے میک ناٹن
سے ان خطوط کا مقصد دریافت کیا۔ میک ناٹن جواب کے لیے اپنے ہونٹوں
کو جنبش دینا چاہتا تھا کہ ایک افغان سپاہی نے اکبر خاں کو برطانوی سپاہیوں
کی نقل و حرکت سے آگاہ کر دیا۔ اکبر خان اور میک ناٹن آمادہ پیکار تھے میکناٹن
نے اپنا پستول اکبر خان پر چلایا لیکن خود مارا گیا[1]۔

دلچسپ اور سبق آموز

میک ناٹن اور اکبر خاں کے حالات و کوائف اور انگریزی سپاہیوں اور افسروں کی بزدلی پر ایک انگریز دوست مؤرخ نے جو معلومات پیش کیے ہیں وہ مستند بھی ہیں دلچسپ اور سبق آموز بھی:۔

"جب افغان سرداروں نے انگریزوں کی یہ حالت زار و زبون دیکھی تو سمجھ لیا [illegible] خانہ
پر لوما کل سپاہ اپنے ہتھیار اور گولہ بارود دیدے تو اس وقت ہم صلح کی گفتگو کریں گے۔ ایک ہفتہ بعد اکبر خان کابل
آگیا اور سارے قوموں نے اس کو اپنا سردار بنا لیا وہ دوست محمد خاں کا بڑا لائق بیٹا تھا۔ جوانی کے زور میں
بھرا ہوا تھا۔ دلیر اور جوانمرد سپاہی تھا مگر مزاج اس کا خشمناک اور بہت تند تھا۔ اس نے آتے ہی یہ سوچا
کہ سپاہ انگریزی کی رسد کی راہ کو مسدود کرنا چاہیے۔ اس لیے حکم دے دیا کہ جو انگریزی لشکر میں اسباب رسد
لے جائے گا گردن سے مارا جائے گا۔ اب سر ولیم میکناٹن نے کہا کہ اب سب خوش ہوں تو بہتر ہے پاس کیا جائے
اس کے جواب میں علیل المزاج نوجوان جرنیل نے کہا کہ صرف علاج یہ ہے کہ اس ملک سے نکل

---

(۱) نیرنگ افغانستان —— باسو —— کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۲۴

جانے کی کوئی راہ نکالی جائے۔

اب سپاہ بھوکی مرنے لگی، فاقہ زدہ ہونا اس کے چہرہ سے نظر آنے لگا۔ ۱۱ دسمبر کو فقط ایک دن کی خوراک سپاہیوں میں باقی تھی، سفیر مجبور تھا کہ افغان سے ان شرائط پر صلح کرے جو وہ پیش کریں۔ خدا سنگ دلوں سے غرض نہ ڈالے، صلح ہوئی تو ان شرائط پر کہ جلال آباد، قندھار، کابل غزنین سے سپاہ انگریزی پشاور کو چلی جائے گی جو کچھ مال و اسباب سرکاری افسروں کا ہے افغانستان میں رہ جائے گا اور امانت رہے گا اور ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔

انگریزی تاریخ میں کوئی صلح نامہ ایسا نہیں ہے جس سے برٹش گورنمنٹ کی ایسی اہانت و ذلت ظاہر ہوتی ہو، گورنمنٹ کو ان شرائط کی اطلاع کے ساتھ میکناٹن صاحب نے یہ بھی لکھا کہ ہم چالیس دن تک برابر دشمنوں سے لڑتے رہے ہماری جانوں کا بہت نقصان ہوا اور قلت غلہ سے ہماری یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ بھوک کے مارے سارے لشکر کا ایک دو روز میں کام تمام ہو جاتا، پندرہ ہزار سپاہ کا خاتمہ ہونا ہمارے ملک کے لیے فائدہ مند نہ ہوتا جن شرائط پر میں نے صلح کی ہے اُن سے زیادہ عمدہ شرائط ہونا ممکن نہ تھی سارا الزام اس صلح کے منظور کرنے کا جرنیل الفنسٹن اور بریگیڈیر شیلٹن کے ذمہ ہے جرنیل صاحب کے عقل و جسم دونوں بیمار تھے بریگیڈیر صاحب خشمناک غصے کے تھے سب سے زیادہ خطا ان ہی کی تھی۔

افغانوں کی دراز دستی، انگریزوں کی بے بسی

اب سرداران افغان کا یہ حال تھا کہ میگزینوں میں جاتے اور جو اسباب چاہتے اٹھا لاتے انگریزی سپاہ اور افسر اس کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ کیا آناً فاناً میں سماں بدلا ہے زمین اور ہو گئی آسمان اور ہو گیا۔ اکبر خاں نے جو وعدہ کے موافق رسد بہم پہنچائی وہ اس قدر قلیل تھی کہ سپاہ کا پیٹ بھی مشکل سے بھرتا تھا۔ اکبر خاں نے سامان رسد باربرداری کے بہم پہنچانے میں کوتاہی کی اور اپنی درخواستوں میں فضولی اختیار کی اور کہا کہ تمام مخازن سپاہ اور گولہ بارود اور ہر قسم کا اسباب حرب ہم کو حوالے کر دو اور تمام میموں اور بال بچوں کو ہمیں دے دو، جب میکناٹن صاحب نے یہ رنگ دیکھا تو انھوں نے

بھی اپنا رنگ بدلا۔ پنڈت موہن لال کو ہدایت کی کہ وہ اور قوموں قبیلوں سے عہد و پیمان ٹھیرائے اور اُن سے کہے کہ وہ انگریزوں کو نہ جانے دیں۔ پھر وہ اکبر خاں سے عہد و پیمان کو شکست کر دے گا اس معاملہ میں دغا بازی کا الزام میکناٹن صاحب کے ذمہ عائد نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کہ وہ موعودہ سامان رسد اور اسباب بار برداری کے دینے پر تیار تھے۔ جب یہ نہ ہوا تو عہد و پیمان میں خود ہی شکستگی آگئی۔ مگر الزام یہ ہے کہ جس وقت اکبر خاں نے شرائط معاہدہ ایفا نہیں کیا تھا تو میکناٹن صاحب کو اعلان کرنا اس کا واجب تھا کہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہیں رہا نہ یہ کہ اس کا اظہار نہ کیا اور مخفی اور قوموں و قبیلوں سے معاہدہ کرنا شروع کیا۔ اس نازک وقت میں سر ولیم کے پاس اکبر خاں کا ایک خط آیا جس کی توقع ان کو ہرگز نہ تھی اس کا مضمون یہ تھا کہ موسم بہار تک انگریزی سپاہ کابل میں رہے اور شاہ شجاع اورنگ سلطنت پر رونق افروز رہے بشرطیکہ وہ اس کا وزیر مقرر ہو جائے اور برٹش گورنمنٹ اس کو تیس لاکھ روپیہ دے اور چار لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دے۔ سر ولیم میکناٹن کے جو بُرے دن آئے تو وہ اکبر خاں کے اس فریب میں آ گئے۔ انھوں نے اس کو لکھا کہ مجھے آپ کی سب شرائط منظور ہیں کل ملاقات ہو جائے اس میں تمام معاملات طے ہو جائیں گے۔

دوپہر ۲۳ دسمبر کو تین افسروں کپتان ٹریور میکنزی جارج لارنس اور سولہ سواروں کو اردلی میں لے کر اکبر خاں سے جو انگریزی لشکرگاہ سے چھ گز پر تھا ملنے گئے سچ ہے ؏

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

یہاں اکبر خاں برف پر گھوڑوں کے زین پوش بچھائے ایک پہاڑی کے ڈھلان پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں آدمی اشاروں پہ لگے ہوئے تھے۔ افغانوں نے تینوں افسروں کو پکڑ لیا اور اپنے گھوڑوں پر اُن کو پیچھے بٹھا کر شہر کی طرف ہوا ہو گئے۔ راہ میں کپتان ٹریور زین سے گر کر پیوند زمین ہو گئے۔ میکناٹن صاحب کو اکبر خاں نے پکڑنا چاہا تھا مگر وہ اس کے بس کے نہ تھے۔ اس نہایت مشکل میں سر ولیم نے فارسی زبان میں کہا تھا کہ "از برائے خدا" اس نوجوان نے غصہ میں آکر وہی پستول سے اُن پر فائر کیا جو انھوں نے کل اس کو ہدیۃً دیا تھا۔ پھر ان کے جسم پر افغان ایسے گرے جیسے مُردے پر گدھ اور تکے بوٹیاں کر ڈالا۔

قتل کے محرکات واسباب

اکبر خان کا یہ ارادہ نہ تھا کہ میں سرولیم کو مار ڈالوں بلکہ وہ اِن کو اپنے باپ کے عوض قید کرنا چاہتا تھا جب قید ذکر سرکا نفیہ پٹھان کی رگ چڑھی اور اسے مار ڈالا مشہور ہے پٹھان گھڑی میں بھوت گھڑی میں ولی۔"

میکناٹن کی نعش بے گور و کفن

یوں سفیر میکناٹن مارا گیا مگر سپاہ انگریزی نے اس کے انتقام کا ارادہ کیا۔ نعش بازاروں میں گھسیٹی گھسیٹی پڑی گلی سڑی گو حوصلہ نہ ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے چھینتے میجر پوٹنجر جن کی شہرت مہم ہرات میں دور دور ہوئی تھی، زخمی ہو کر کابل کی چھاؤنی میں پڑے تھے کوئی کام انھوں نے بیاں نہیں کیا تھا کہ جس سے شہرت ہوتی، مگر اب سب کی نگاہ اُن کی طرف تھی کہ وہی اِس ڈوبتے ہوئے بیڑے کے ناخدا بن کے تو پار ہوگا، سفیر کا قائم مقام اِن کو مقرر کیا، اُنھوں نے کونسل وار دکونسل جنگ) جمع کی اور اُن شرائط جدید کو جن کے موافق سرداران افغان نے انگریزی سپاہ کو بجمعیت تمام پشاور میں بھیجا دینا قبول کیا تھا پیش کیا تھا، اِس کونسل نے وہی عہد و پیمان سب منظور کرلیا، ایک نقطہ بھی نہ بدلا اور چار شرائط کا اس پر اضافہ ہوا جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بندوقیں جو زائد ہیں اور توپیں سوائے چھ کے سپرد کی جائیں اور تمام افسر جن کی بیویاں ہیں اور وہ تمام مسیم صاحب اور ان کے بال بچے اس ملک میں چھوڑ دیئے جائیں وہ بطور مہمان کے افغانوں کے پاس رہیں جبتک امیر دوست محمد خان کابل میں آئے۔

سولہ ہزار کا لشکر کیسے تباہ ہوا

"غرض ۶ جنوری ۱۸۴۲ء کو وہ ساعت کیا منحوس تھی جس میں سپاہ تھے جس کے اندر ۴۵۰۰ نہایت تنومند تھی اور گیارہ ہزار آدمی بھیر بنگاہ تھے، کابل سے مراجعت کے لئے قدم اٹھایا اگر یہ لشکر دو پہر سے پہلے دریائے کابل کو عبور کر جاتا تو بچ جاتا افغانوں نے اول تو چھاؤنی کو جاکر پھونکا اور رات بھر اپنے دل ٹھنڈا کئے صبح کو یہاں لشکر انگریزی پر یہ آفت آئی کہ وہ قواعد سپاہ کی پابند نہ رہی اور ایسی پراگندہ اور پریشان ہوئی کہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی سپاہ جاتی ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا کہ ایک بھیڑ خستہ حال پریشان خاطر متحیر و مضطر و حیران چلی جاتی ہے اور سردی ایسی آفت کی تھی کہ ساری سرگرمیوں کو ٹھنڈا کرتی تھی، راہوں میں اتنا برف چڑھا ہوا تھا

کہ شکستہ تنک پیر اُس میں غرق ہو جاتے تھے اگر اُس پر تیز روی سے سپاہ رواں ہوتی تو نوبت سے نکل جاتی مگر یہاں ہر گام میں سرگرمی کا فور تھی، سچ ہے خدا بُری گھڑی نہ دکھائے ایسی مری کیسی انسان کے اوسان باقی نہیں رہتے کم بختی سر پر کھیل رہی تھی، ہائے کیا مصیبت تھی کہ زمین پر سوائے برف کے اور کوئی فرش نہ تھا گھوڑوں کا تھان تھا تو برف پہ تھا آدمیوں کا مکان تھا تو یخ پہ کھانے کو خاک بھی نہ ملتی تھی جلاتے کو سوائے دل کے کچھ نہ تھا، درۂ خیبر کابل کا غضب کا ہیبت ناک تھا، پانچ میل طول میں مگر عرض میں تنگ کہ آفتاب کی کرنوں کو بھی مشکل سے اس میں جگہ ملتی تھی دونوں طرف اس کے پچاس پچاس گز اونچے پہاڑ پھر ان میں کہیں زیادہ سے زیادہ عرض پچاس گز سے زیادہ کا نہ تھا، پھر اس میں ایک ندی نہایت زور شور سے چلتی تھی. اس درہ کے پار اس کو اٹھائیس دفعہ اترنا پڑتا تھا بھلا اس راہ سے سلامت نکلنا ایسے حال میں دیوانگی کا خیال تھا، کہ غلزئی پہاڑوں کی بلندیوں پر ہتھیار چھپائے بیٹھے ہوں جو کبھی خطا کرنا جانتے ہی نہ تھے آٹھ سو گز کے فاصلہ تک کسی کو زندہ ہی نہیں چھوڑتے تھے، غرض ان کی آگ سے اور برف کی سردی سے تین ہزار آدمی جل کر خاک اور سرد ہو کر آب ہوئے اس ہنگامۂ رستخیز میں یہ قیامت تھی کہ انگریزی خواتین نازنین گلفام نیچے پھول کی سی پتیاں گودوں میں لیے ادھر اُدھر پڑی پھرتی تھیں،

زمین کا یخ ان کے پیروں کو شل کرتا تھا دشمنوں کی آتش بازی ان کے سروں سے شعلوں کو اٹھاتی تھی ؂

اکبر خان کا رعب و دہشت

اکبر خاں پھر صبح کو تشریف لائے اور سامان رسد بھی ساتھ لائے اور جنرل صاحب کو صلاح دی کہ ایک روز اور قیام کیجئے سپاہ نے جنرل کے سامنے دہائی مچائی کہ اس صلاح پر کان نہ دیجئے اور خدا کے واسطے قیام نہ فرمایئے، مگر جنرل صاحب تو عقلمندوں کی دور بلا تھی وہ کیوں نہ اس صلاح بلا انگیز کو مانتے ایک روز قیام کا حکم دے دیا، بے چاری سپاہ مصیبت کی ماری سارے دن یخ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی. پھر اکبر خان نے کہا کہ اب عورتوں اور بچوں کو حوالے کر دیجئے میں ان کو خیر و عافیت کے ساتھ پشاور پہنچا دوں گا، وہ سب کئی دن سے پہلے تھے کچھ کھایا پیا نہ تھا، ان کے پاس کپڑے ایسے نہ تھے کہ وہ برف

سے جسم کو محفوظ رکھتے۔ اس سبب سے میجر پوٹنیجر نے جو اکبر خان کا اسیر تھا، یہ سوچا کہ ان عورتوں اور بچوں کا بچنا ایسی بے سروبرگی کے ساتھ محال ہے، اس نے لیڈی میکناٹن اور لیڈی سیل اور نو[9] اور لیڈیوں کو اور پندرہ[15] بچوں اور کچھ افسروں کو اکبر خاں کے خیمہ گاہ پر بھیج کر ان کی جانوں کو بچا لیا:

۱۰ تاریخ کی صبح کو باقی سپاہ کا کوچ پھر شروع ہوا، تاہم کہ بہت سے سپاہی غائب ہو چکے تھے غرض یہ سپاہ خستہ حال جو سخت سردی کے مارے اکڑی جاتی تھی اس کو بھیڑوں کی طرح غلزیوں نے ذبح کر کے کباب بنایا۔ پنتالیس[45] گورے اور بہت سے افسر باقی تھے مگر دشمن پہاڑوں پر بیٹھے ہوئے بندوقیں چھتیا رہے تھے ان کی صفوں میں صفدری کر رہے تھے اکبر خاں بھی پیچھے پیچھے اس لشکر کے چلا آیا تھا جب سپاہ درہ جگدلک کے پاس پہنچی تو اس کے ساتھ افسران انگریزی نے مشورہ کیا، اس نے رسد غلہ وغیرہ دینے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ جنرل الفنسٹن اور بریگیڈیئر شیلٹن اور ایک اور افسر اس کفالت میں سپرد کئے جائیں کہ قلعہ جلال آباد کو خالی کر دیا جائے گا، یہ افسر اس کے حوالے گئے گئے، مگر اس سے بھی کام نہ چلا۔ غلزئی اب بھی اپنی حرکات سے باز نہ آئے اس وقت جوش انتقام میں ان کا خون ایسا جوش میں آیا کہ خونریزی میں انکو مزہ ملتا تھا، روپیہ کی محبت انھوں نے دل سے اٹھا دی تھی، ہر چند زر سیم ان کو دیا جاتا مگر اس سے خون کی پیاس نہ بجھتی۔ اکبر خاں نے صرف عورتوں، بچوں اور افسروں کو اپنے سایۂ حمایت میں لے کر باقی سپاہ کو غلزیوں کے آگے چھوڑ دیا کہ جس طرح وہ چاہیں اپنا کینہ اور بغض ان سے نکالیں، درہ جگدلک میں جوانمرد افسروں میں سے بارہ[12] کا اور خون ہوا، پس اس درہ پر سپاہ کابل کا خاتمہ ہوا۔ جب افغانوں کے سرداروں سے کہا جاتا کہ یہ تمہاری قومیں کیا کر رہی ہیں تو وہ اس کا معمولی جواب یہ دیتے کہ ان کے روکنے کی دستگاہ ہم کو نہیں ہے بیس[20] افسر اور چالیس گورے درہ گندمک تک پہنچے مگر وہ بھی دشمنوں سے زندہ بچ کر نہ نکل سکے صرف ایک افسر ڈاکٹر برائیڈن جان لے کر جلال آباد میں ایک ٹٹو پر سوار زخمی ہارے تھکے پہنچے، پندرہ[15] ہزار آدمیوں میں سے صرف ان ڈاکٹر صاحب ہی کا دم سلامت بچا۔ ایک سو بیس[120] آدمی جو دشمنوں کے پاس قید تھے وہ قید حیات میں رہے[1]:

---

(۱) تاریخ ہند (عہد سلطنت انگلشیہ جلد دوم از ذکاء اللہ) ص ۷۶

صرف ایک انگریز بچا

پندرہ ہزار کے انگریز لشکر کی مکمل تباہی (سوا ڈاکٹر برائڈن کے)(۱) بڑی لرزہ خیز ہے لیکن یہ جرم ہلکا ہوجاتا ہے، جب انگریزوں کی سیہ کاریاں، میکناٹن کی فریب کاریاں، انگریز سپاہیوں اور افسروں کی سفاکیاں انگریز قوم کی بدعہدیاں سامنے آتی ہیں ؛

افغانوں کا یہ کیریکٹر بھی قابل داد ہے، کہ انھوں نے عورتوں اور بچوں کی جان نہیں لی حالانکہ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد جب غدر ہوا تو انگریزوں نے یہ احتیاط بھی ملحوظ نہ رکھی اور غدر کا کیا ذکر، جب انگریزوں نے افغانستان سے "انتقام" لیا تو کون سی کسر اٹھا رکھی ظلم اور سفاکی اور شقاوت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ؛

ایلن برا کا انتقام

اسی اثنا میں آک لینڈ کی جگہ ایلن برا (۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۴ء) گورنر جنرل مقرر ہوچکا تھا، ایلن برا نے جنرل پالک کو گذشتہ ہزیمت کا انتقام لینے کے لیے کابل روانہ کیا، اپریل ۱۸۴۲ء میں پالک، علی مسجد کے قلعہ پر قابض ہوگیا، انہی ایام میں شاہ شجاع بھی قتل ہوچکا تھا، جنرل پالک جنرل سیل اور جنرل ناٹ تینوں کابل روانہ ہوئے کابل کے بازار کو آگ لگا کر انگریزی فوجوں نے افغانستان خالی کردیا

(۱۱)

گوالیار

انگریز ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت اپنا شعار بنا چکے تھے، ایک

---

(۱) کمپنی کی حکومت ص ۳۲۷

نتیجہ گوالیار کے ایک معزز سرکاری ملازم سے ریزیڈنٹ صاحب خفا ہو گئے، روٹھ کر اندور چلے گئے مہارانی نے خوشامد کر کے بلایا، آئے مگر گوالیار کو تقسیم کر کے چند انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ اس واقعہ کو ان الفاظ میں پیش کرتی ہے :-

"مہارانی نے ریزیڈنٹ صاحب کو جو بمقام دھول پور خفا ہو کر چلے گئے تھے کئی بار لکھا کہ تم یہاں آؤ، انھوں نے صرف یہ جواب دیا کہ جب تک دادا خاصگی والہ انگریزوں کے سپرد نہ کیا جائے گا یا جرمانہ وصول کر شہر سے بدنہ ہوگا میں ہرگز شہر میں قدم نہ رکھوں گا، اسی اثناء میں گورنر جنرل صاحب بہادر نے ارادہ کیا کہ گوالیار کی طرف کوچ کیجئے اور وہ فساد جو مدت سے درمیان سلطنت انگریزی اور مہارانی صاحبہ کے رہتا ہے دفع کیجئے، سندھیا کی فوج نے دادا خاصگی والہ کو قید کر کے انگریزوں کے سپرد کر دیا اور ماہ دسمبر میں گورنر جنرل صاحب بہادر بھی ملک سندھیا میں جا پہنچے، ایک لڑائی مقام مہاراج پور میں درمیان انگریزوں اور مرہٹوں کے واقع ہوئی۔ اگرچہ اس لڑائی میں مرہٹے بہت بہادری اور دلاوری سے جم کر لڑے اور انگریزوں کے آدمی بہت ضائع ہوئے مگر آخر کو شکست مرہٹوں نے کھائی۔ سوائے اس کے دو اور لڑائیاں ایک مقام چاندا پر اور دوسری موضع پنیر میں ہوئیں، ان میں بھی مرہٹوں نے شکست کھائی ان لڑائیوں کے بعد مہارانی صاحبہ نے صلح کی درخواست کی اور حسب مرضی انگریزوں کے شرائط عہد نامہ کی مقرر ہوئیں اس وقت سے خاندان سندھیا کی طاقت او حشمت بالکل جاتی رہی اگرچہ راجہ گوالیار کو جو بالفعل گدی پر ہیں اور خاندان سندھیا سے ہیں اور انھیں کے نام سے کاروبار سلطنت کے فیصلہ پاتے ہیں لیکن حقیقت میں ان مہاراج کو کچھ اختیار نہیں اور نہ کسی ایسے شخص کو جو خلاف مرضی انگریزوں کے ہو نوکر رکھ سکتے ہیں غرضیکہ اب سلطنت گوالیار کی برائے نام رہ گئی ہے"[1]

---

(۱) واقعات ہند صفحہ ۱۵۵ مطبوعہ ۱۸۷۵ء ؛

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ

سندھ سے انگریزوں کے بڑے گہرے دوستانہ اور تجارتی تعلقات تھے، دونوں اس کے پابند تھے کہ ایک دوسرے کے حدود میں جارحانہ اقدام نہیں کریں گے لیکن جب افغانستان پر انگریزوں نے یورش کی تو دوستی بالائے طاق رہ گئی، معاہدے روی کا کاغذ بن گئے۔ اور انگریزی فوجیں سندھ کی سرزمین کو پامال کرتی ہوئیں قندھار کی طرف بڑھ گئیں۔

سندھ کی داستانِ الم مختصر طور پہ یہ ہے :-

سندھ سے معاہدہ ۱۸۰۹ء میں امیران سندھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہُوا جس کی رو سے :-

(۱) سندھ اور برطانی حکومت میں ابدی رفاقت قائم رہے گی ؛

(۲) دونوں ملکوں کے درمیان کبھی بھی جذبہ عناد نہیں پیدا ہوگا ؛

(۳) دونوں حکومتوں کی سفارت بدستور جاری رہے گی ؛

(۴) حکومت سندھ فرانسیسیوں کو سندھ میں داخل نہیں ہونے دے گی[1]

تسخیرِ سندھ کا فیصلہ ستمبر ۱۸۴۲ء میں سر چارلس نیپیئر کو تسخیر سندھ کے لیے بھیجا گیا یہ ایک ضدی اور جنگ جو افسر تھا اس نے امیران سندھ کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسا معاہدہ قبول کریں جس کی رو سے :-

(۱) برطانوی فوج کے اخراجات امدادی کے لئے اپنی مملکت کا ایک حصہ کمپنی کے حوالے کر دیں ؛

(۲) برطانوی جہازوں کے لیے ایندھن فراہم کریں ؛

---

(۱) کمپنی کی حکومت صد ۲۳۲

(۳) امیران سندھ اپنے نام کا سکہ بند کریں ؛

امیران سندھ کا اشتعال

آخری شرط نے امیران سندھ کو مشتعل کر دیا چارلس نیپیئر اعلان جنگ کے بعد امام گڑھ کی جانب روانہ ہوا۔

امام گڑھ کے صحرائی قلعہ کو اس نے سطح زمین کے برابر کر دیا، برطانوی ریذیڈنٹ آؤٹ رم نے امیران سندھ کو جدید معاہدہ قبول کرنے کی ہدایت کی، امیران سندھ نے قبول کرتے ہوئے آؤٹ رم سے حیدر آباد خالی کرنے کو کہا کیونکہ وہ مشتعل رعایا کے افعال کے ذمہ دار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ تین دن کے بعد مشتعل ہجوم نے ریذیڈنسی پر حملہ کر دیا؛ آؤٹ رم بڑی مشکل سے جان بچاکر ایک برطانوی جہاز تک پہنچا، جنگ کا اعلان ہو چکا تھا، ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو نیپیئر نے میانی کے مقام پر سندھی فوجوں کو شکست دی، حیدر آباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، ایک ماہ بعد امیر خیر پور کو بھی شکست کھانی پڑی ؛

حیدر آباد کے شاہی محلات کو جس بے جگری سے لوٹا گیا، اس کی مثال چنگیزی کارناموں کو تازہ کرتی ہے، شاہی بیگمات کے جواہرات کا لوٹا جانا تو ایک لازمی امر تھا لیکن محض کپڑوں کے لیے ان بیگمات کو جنھیں رات کے ستاروں نے بھی بے نقاب نہیں دیکھا تھا، برہنہ کر دینا انسانی ذلت کی انتہا ہے، حیدر آباد کی طرف سے نیپیئر کو نو لاکھ روپے ملے، سر چارلس نیپیئر نے امیران سندھ پر محض اس لیے حملہ کیا کہ وہ کمزور تھے، اگست ۱۸۴۳ء میں پورے سندھ پر قبضہ کر لیا گیا، امیران سندھ جلاوطن ہو گئے ؛

"سر چارلس نیپیئر تسخیر سندھ پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھتا ہے :-

"ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم سندھ پر قابض ہوں، لیکن اس کے باوجود ہم ایسا ہی کریں گے[1] "

---

(۱) کمپنی کی حکومت ص ۳۲۳ ؛

تاریخی تفصیل

آک لینڈ (سنہ ۱۸۳۶ تا سنہ ۱۸۴۲) نے افغانستان پر پہلی بار فوج کشی کی (اکتوبر ۱۸۳۸ء) تو سب سے پہلا شکار سندھ کو بنایا نہ صرف یہ کہ بمبئی کا انگریزی لشکر سندھ سے جبراً گذرا بلکہ شکارپور بھکر وغیرہ کے شہروں پر زبردستی قبضہ ہو گیا اور میران سندھ کی فریاد کا جواب یہ ملا کہ پہلا عہد نامہ منسوخ کر کے ایک اور معاہدے کا مسودہ بھیجا گیا جس میں ان آزاد ریاستوں کو صریحاً انگریزوں کا باجگذار بنایا تھا، انگریز افسروں کے ماتحت امدادی فوج رکھنے اور تین لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کی شرط ہی اُن کی آزادی کی کامل بربادی کا اعلان کرتی تھی۔ معاہدے پر دہان توپ کی زور سے میران سندھ کے دستخط لیے گئے (فروری ۱۸۳۹ء م ۱۲۵۴ سنہ ہجری)

کابل پر انگریزوں کی آراستہ اور شان دار مہمات وہاں مزاحمت کے پہاڑوں سے ٹکرا کر چور چور ہو گئیں، نزلہ عضو ضعیف پر گرا، آک لینڈ کا جانشین ایلن برا (سنہ ۱۸۴۲ تا ۱۸۴۴ء) آتشی کا قاصد بن کر آیا تھا، سندھ کے حق میں موت کا ہرکارہ ثابت ہوا۔ اسی گورنر جنرل نے ایک تمغائے امن صلاح ضرب کرایا تھا جو ریاکاری کا داغ بن کر آج تک اس کی سیرت کی پیشانی پر چمکتا ہے کہتے ہیں لبے خبط ہو گیا تھا کہ دریائے سندھ کو جہازی آب راہ بنایا جائے کابل میں ہزیمت کی جھانج برطانیہ کے دفتر وزراعظم میں سنائی دیتی تھی، غالباً یہ ایک اور محرک بن گئی، غرض مقامی عمال ہاں ہاں کرتے رہ گئے ایلن برا نے کسی کی نہ سنی، نیپیر کو اپنا نائب اور جنگی امور کا مختار کار بنا کر سندھ بھیجا کہ یہاں کے امیروں کی رہی سہی آزادی کو توپوں کی پھونک مار کر اڑا دے، نیپیر برطانیہ کا شعلہ خو امیر زادہ اور مشہور سپاہی گزرا ہے

---

(۱) دیکھو مارشن میں ص۱۳۱۔ اسمتھ لکھتا ہے کہ ایلن برا کو اول سے سندھ کو ہتیانے کی دھن لگی تھی (ص۶۰۴)

ہم عصر تھارن ٹن لکھتا ہے کہ ایسے کمزور بہانوں سے کبھی (حلیف) ریاست کے حقوق پر حملہ نہ ہوا تھا (حالات ۱۸۴۲ء)

گرتوڑ چلاتے چلاتے اخلاق اور انسانیت کی دھار تک کند ہو گئی تھی۔ سندھ آتے ہی یہاں کے امیر وزیر کو اتنا دق کیا کہ وہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے، نیپیئر کی مراد بر آئی۔ میانی کے میدان میں گھیر کر دمادم توپوں سے خوب تختہ کار کھیلا (فروری ۱۸۴۲ء م ۱۲۵۸ھ ہجری) سندھی جان ہارون کے پاس بندوقیں تک ڈھنگ کی نہ تھیں لہذا یہ فخر کہ تین ہزار نے بائیس ہزار کو شکست دی نیپیئر کے بجائے یورپ کے اسلحہ سازوں کے نام لکھنا چاہیئے[1]۔

خیرپور بچ گیا

شکست کی باقی ساتی فوج کو اگلے مہینے ایک اور شکست دی گئی (معرکہ دبو۔ مارچ ۱۸۴۳ء) غریب میروں نے اطاعت قبول کر لی تھی، پھر بھی رئیس خیرپور کے سوا سب ملک سے نکال دیئے گئے، خیرپور کی شاخ بھائی بندوں سے کٹ کر فرنگیوں کی معاون رہی تھی وہ بچ تو گئی لیکن علاقے چھانٹ دیئے گئے، باقی سارا سندھ کمپنی کے انبار خانے میں داخل ہوا نیپیئر نئے مقبوضے کا پہلا حاکم بنایا گیا تھا مگر بدخوئی سے بمبئی اور ہندوستان کے عمال سے لڑ کر مستعفی ہو گیا پھر بھی تلاش سندھ کی لوٹ سے ستر ہزار اشرفی اپنی جیب میں ڈال لیں کراچی میں ایک بڑی سڑک، بازار اور بعض سرکاری عمارتیں آج بھی سندھ کے اسی بے درد شکاری کے نام سے موسوم ہیں[2]۔

(۱۳)

بہاولپور

ریاست بہاول پور نے نیازمندی کے حدود سے کبھی قدم آگے نہیں بڑھا۔

---

[1] ہم عصر انگریزی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس جنگ میں انگریز جرنیل تمک سپاہیوں کے ساتھ مل کر گولیاں چلاتے اور سندھ کے بلوچ سپاہیوں کی پیوستہ کمریوں کو نشانہ بناتے رہے۔

[2] تاریخ پاکستان وبھارت جلد دوم (سید ہاشمی) صفحہ ۲۶۔

مجھے تو خوُ ہے کہ جو کچھ کہو بجا کیئے

لیکن اس سے بھی جو کچھ ہو سکا ، فرنگی سامراج نے اینٹھ لیا (۲۶ ر دسمبر ۱۸۴۵ء)

" علاقہ بہاولپور کے تین سو دیہات صاحب کلاں بہادر دہلی کے انتظام میں دیئے گئے۔"[1]

(۱۴)

راجہ روپڑ

یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی ، لیکن فرنگی مصالح اس کا وجود بھی نہ برداشت کر سکے چنانچہ وہ بھی داخلِ دفتر ہو گئی - (۹ ر اپریل ۱۸۴۶ء)

" راجہ روپڑ اپنے افعال کی پاداش میں ریاست سے علیحدہ کر دیا گیا آج کل سہارن پور میں ہے ، سرکار انگریزی نے اس کے گزر اوقات کے لیے ۲۷ ہزار روپیہ سالانہ مقرر کیا ہے۔"[2]

(۱۵)

دارجیلنگ اور ریاست سکم کی بپتا

نیپال اور بھوٹان کے درمیان ایک چھوٹی سی ریاست سکم ہے ، انگریزی ڈاکٹر کیمبل اپنی

---

[1] بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۵

[2] بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ۲۳

تحقیقات علم نباتات کی پیروی اور دھن میں دارجیلنگ کے گرد بہت دور انگریزی قلمرو سے چلے گئے چینی پہرہ چوکی والوں نے ان کو روکا تو وہ اُلٹے واپس ہوئے کہ راجہ کے سپاہیوں نے لپک کر ان کو زمین پر گرا دیا اور رسیوں میں خوب جکڑ کر باندھ لیا کئی ہفتوں تک ان کو قید خانہ میں رکھا اور بہت تکلیف دی راجہ کی عملداری کے ہمسایہ میں ایک پہاڑی مقام دارجیلنگ تھا جس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اپنی خوشی سے چھ ہزار روپیہ سالانہ راجہ کو اس کے معاوضہ میں دیتے تھے اس سبب سے راجہ انگریزوں کا دشمن ہو گیا تھا، جب اس سے اوّل اوّل کہا گیا۔ انگریزوں کو قید سے رہا کرے تو اس نے انکار کر دیا، تو بنگال کے قریب کی چھاؤنی سے فوج بھیجی گئی لیکن جاڑے کا موسم تھا سخت برف پڑی تھی اس لیے سپاہ سکم تک نہ پہنچ سکی۔ ۷ دسمبر کو راجہ کو ترغیب دے دلا کر قیدیوں کو چھڑا لیا۔

اب یہ ضرور تھا کہ راجہ کو اس جرم کی سزا دی جائے جنوری کے آخر میں تھوڑی سی سپاہ بھیجی گئی جس میں سو بیر اور چند توپیں تھیں وہ رنجیت دریا کی طرف روانہ ہوئی، اس فوج کشی میں کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی، راجہ کسی دور کے قلعہ میں بھاگ گیا اور اس کی سپاہ کا بھی پتہ نہ لگا کہ کہاں گئی؟

راجہ کے باپ دادا کو برٹش گورنمنٹ نے نیپالیوں کے ہاتھ سے بچا لیا تھا، اس پر یہ احسان کیا تھا، جب اس احسان فراموش نے یہ جرم کیا تو اس کو یہ سزا دی گئی کہ اس سے وہ زمینیں لے لی گئیں جو کہ اس کو جنگ نیپال ختم ہونے پر دی گئیں تھیں اور پھر دارجیلنگ کا کرایہ چھ ہزار روپیہ سالانہ بھی نہیں دیا گیا۔ (۱۸۴۹ء) (۱)

۱؎ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) ص۳۰۳

(۱۶)

تھانیسر کا الحاق

۱۸۳۴ء میں جیند کا کچھ حصہ اور ۱۸۴۳ء میں کیتھل کا کل علاقہ وہاں کے جاگیرداروں کے لاولد فوت ہونے پر سرکار نے ضبط کر لیا، دوسرے سال سفیدوں اور اسانڈھ کے کچھ حصے بھی جیند کے تبادلے میں علاقہ انگریزی میں آگئے اور ۱۸۴۵ء میں ریاست لاڈوا جو اس علاقے کی سرحد پر واقع تھی سرکار انگریزی کے ہاتھوں میں آگئی کیونکہ رئیس لاڈو نے سکھوں کی لڑائی میں سرکار سے بغاوت کی تھی اور اسی سال روسائے تھانیسر کنجپورہ اور شام گڈھ کے شاہی اختیارات چھین گئے اور انھیں معمولی جاگیردار بنا دیا گیا ۱۸۵۰ء میں فتح سنگھ آخری حکمران تھانیسر کی بیوہ کی وفات پر کل علاقہ تھانیسر بھی سرکار کے قبضے میں آگیا[۱]۔

(۱۷)

ریاست سنبھل پور

سنبھل پور کی ریاست بنگال کے جنوب مغرب میں واقع ہے ۱۸۴۹ء تک حقوق فرمانروائی قائم رہے نرائن سنگھ یہاں کا راجہ تھا جس کا نہ کوئی وارث تھا نہ کوئی متبنٰی کیا گیا تھا۔ بس جب راجہ مرگیا، یہ ریاست الحاق کی گئی[۲]۔

---

[۱]: تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اوّل ص۲

[۲]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۱۴۱

(۱۸)

بھوٹان انگریزی قبضہ میں

سکّم کا پہاڑی راج لارڈ ڈلہوزی کی لاانتہائی ہوس کا شکار ہو چکا تھا (۱۸۵۰ء) اس کے مشرق میں بھوٹان کی کلاں تر ریاست تبت کے زیرِ سیادت مانی جاتی تھی، اس پر ۱۸۶۵ء میں چڑھائی کی ایک حصّہ چھین لیا، نسبتاً ویران پہاڑیاں راجہ کے پاس چھوڑ دیں اور اپنی اطاعت کا اقرار کرا لیا [۱]۔

(۱۹)

حیدرآباد کے تین ضلعے ضبط

ریاست حیدرآباد نے ہمیشہ ہر دَور میں انگریزوں کا ساتھ دیا، لیکن انگریزوں نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا، وہ ہمیشہ اسے لوٹتے اور نوچتے کھسوٹتے رہے خود ہی اس پر خرچ کر ڈالا خود کفالت میں اس کے تین ضلعے چھین لیے۔

۱۸۱۹ء میں لارڈ ہیسٹنگز نے ناگپور کی ریاست سے برار جدا کر کے برٹش گورنمنٹ کے دست نظام کو عطا کیا تھا، ۱۸۴۲ء میں نظام کو اطلاع دی گئی کہ اگر آئندہ وہ سرکار کمپنی کے قرض کو جو روز بروز کنٹنجنٹ کے نہ ادا کرنے کے سبب سے بڑھتا جاتا ہے، نہ ادا کرے گا تو اس کے عوض میں اس کے ملک کا ایک حصّہ بطورِ کفالت کے لیے لیا جائے گا، مگر نظام پر اس فہمائش کا کچھ اثر نہ

---

۱ : تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی)، ص ۴۴۔

ہوا۔ ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے جنرل فریزر ریذیڈنٹ کو ہدایت کی کہ وہ نظام کو تنبیہ کرے کہ سرکار کمپنی کا قرض چکا دے۔ نظام ناصر الدولہ ہمیشہ قرض کے ادا کرنے کا وعدہ کرتا رہا، مگر کبھی اس کا ایفا نہ کیا اپریل ۱۸۵۱ء کو اس قرض کو ادا کرنے کو چھ مہینہ کی مہلت دی گئی، پچاس لاکھ روپیہ کا قرض تھا اس میں سے نصف سے کچھ کم ادا کیا گیا۔ باقی قرض کے ادا کرنے کے واسطے چار ماہ کی مہلت اور دی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ اگر اس عرصہ میں قرض نہ ادا کیا جائے گا تو حیدرآباد کے بیرونی اضلاع اس قرض کی کفالت میں رکھ لیے جائیں گے میعاد گزر گئی، قرض نہ ادا ہوا۔

پچاس لاکھ کا قرض

نومبر ۱۸۵۲ء میں جرنیل فریزر کی جگہ کرنیل لو صاحب ریذیڈنٹ مقرر ہوئے، اس وقت نظام کو سرکار کمپنی کا پچاس لاکھ روپیہ قرض دینا تھا، سرکار نظام چوبیس روپیہ سینکڑہ پر ریاست کے ساہوکاروں سے روپیہ قرض لیتی تھی نظام کی رائے یہ تھی کہ اپنے سپاہ میں سے ایک آدمی کو بھی موقوف نہ کرے، اس لیے خرچ سپاہ میں تخفیف نہ ہو سکتی تھی، وہ کنٹجنٹ کی تخفیف کو اپنے ملک کی محافظت کے لیے خطرناک جانتا تھا۔ اب گورنر جنرل نے ارادہ مصمم کر لیا کہ نظام کے ایک عذر کو نہ سنے، انھوں نے چار برس تک نظام کو طرح طرح سے سمجھایا کہ وہ اپنے انتظام ریاست کی طرف متوجہ ہو، ہمیشہ اپنے وزیروں کو نہ بدلا کرے کوئی مستقل وزیر اور منتظم ریاست مقرر کرے، مگر جب اس نے یہ نہ سنا گورنر جنرل نے آخر کو یہ فیصلہ کیا کہ نظام کو بہ اصرار ہو کہ وہ کنٹجنٹ کو برقرار رکھے خواہ اس کا کچھ ہی خرچ ہو تو وہ ایسی کفالت دے کہ آیندہ وقت پر اس سپاہ کا خرچ اور قرض جو اس پر سرکار کا واجب الادا ہے ادا ہوا کرے۔

نظام کی ملاقات

غرض لو صاحب اور نظام کی بہت ملاقاتیں ہوئیں اور بڑی مشکل سے کراہیت کے ساتھ نظام نے اس عہد نامہ پر دستخط کئے کہ جس کے موافق تین ضلعے سرکار کے حوالے کیے، جن کی آمدنی قرض کے سود ادا کرنے کے واسطے اور سات ہزار سوار اور پیدل کنٹجنٹ اور چوبیس توپوں کے اور ان کے انگریزی افسروں کی تنخواہوں کے خرچوں

کے لیے کافی ہو، اس عہد نامہ ۱۸۵۳ء پر دستخط ہونے کے بعد اضلاع برار، رائے چور اور محلدارک جس میں کوئی حصہ اصلی نظامت میں سے نہیں تھا، نظام نے سرکار کمپنی کے حوالہ کیا جس میں نظام کے حقوق شاہی قائم رہیں' اور یہ بھی قرار پایا کہ آمدنی میں خرچ کے بعد جو فاضل رہے وہ نظام کو دیا جائے اور یہ اضلاع جو لیے گئے ہیں ان میں نظام کے دربار کے برٹش ریذیڈنٹ کی فرمانروائی رہے' اور سالانہ آمد و خرچ کا حساب نظام کے روبرو پیش ہوا کرے[1]۔

(۲۰)

ریاست ڈونگر پور

ایک چھوٹی سی ریاست ڈونگر پور تھی، جس کا راجہ نابالغ تھا، ریاست میں انتظام انگریزی ۱۸۵۲ء میں ہو گیا[2]۔

(۲۱)

جھانسی

۱۸۴۲ء میں کمپنی نے گنگا دھر راؤ سے ایک نیا معاہدہ کیا اس معاہدہ نے راجہ کے

۱: تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۵۰۔

۲: تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۰۱۔

اختیارات اور فوج کو کم کر دیا، راجہ کی وفات پر رانی لکشمی بائی نے کمپنی سے درخواست کی کہ وہ اس کے متبنیٰ کو جھانسی کا راجہ تسلیم کرے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔ جھانسی کو کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا گیا[1]۔

جھانسی کے آخری راجہ نے ۲۱ر نومبر ۱۸۵۳ء کو وفات پائی۔ ڈلہوزی نے مرحوم راجہ کے متبنیٰ کو وارث تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ رانی کو پنشن دے کر جھانسی کا الحاق کر لیا گیا۔ جھانسی کے الحاق نے ۱۸۵۷ء میں رانی کو انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کر دیا تھا[2]۔

(۲۲)

کرناٹک اور تنجور

۱۸۵۳ء میں کرناٹک کا نواب مر گیا جو برائے نام نواب تھا۔ اس خاندان کا بانی جس کا سو برس ہوئے کہ منور الدولہ بانی ہوا تھا۔ پچاس برس تک کرناٹک کے نوابوں کا شاہی لقب قائم رہا اور اچھی پنشن پاتے رہے جو ۱۸۰۱ء میں اعظم الدولہ کو لارڈ ولزلی نے عطا کی تھی۔ یہاں کے رئیس کو نواب کا خطاب تھا۔ اس کی سلامی کی توپیں اکیس تھیں۔ وہ سرکار کمپنی کے قانون کی پابندی سے آزاد تھا۔ ایک نواب ۱۸۱۹ء میں مرا اور دوسرا ۱۸۲۵ء میں۔ دونوں کے بیٹے تھے۔ ان کو سرکار نے باپ کے سارے حقوق دے دیئے۔ آخری نواب بے اولاد مرا۔

---

[1] کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۷۰

[2] کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۵۵

تھا۔ اس کے چچا اعظم شاہ نے نوابی کا دعویٰ کیا۔ اس پر لارڈ ہیرس گورنر مدراس نے ایک مراسلہ گورنر جنرل کو لکھا کہ گورنمنٹ پر سرے سے یہی فرض نہیں ہے کہ نواب ارکاٹ کی خاص اولاد کو اس کا جانشین اور وارث بنائے، چہ جائیکہ ایک جدی وارثوں کو نوابی کا وارث بنائے لارڈ ڈلہوزی نے ان کے ساتھ اتفاق رائے کیا، کورٹ ڈائرکٹرز نے حکم دیا کہ خطاب اور منصب نوابی کا مع ان تمام حقوق کے جو ۱۸۰۱ء کے عہد نامہ میں تحریر ہیں موقوف کیے جائیں ؛

ایسے ہی تنجور کا راجہ بھی بے اولاد مر گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کرناٹک کا سا سلوک کیا گیا کہ ان کے خطاب و جاہ و منصب و پنشن موقوف کر دیئے گئے۔ مگر ان دونوں خاندانوں کے وارثوں نے اپنے حقوق کے لیے بڑی فریاد و واویلا کی، مگر کہیں ان کی شنوائی نہیں ہوئی۔ دکن میں بہت سے انگریز تھے، جو ان بزرگ خاندانوں کا ادب کرتے تھے۔ اور ان کو افسوس تھا، کہ وہ اس طرح بالکل مٹ مٹا گئے، سرکار کے ان کاموں کا برا اثر ملک میں ہوا[1] ؛

(۲۲)

کورگ پر فرنگی کا تسلط

ولیم بنٹنگ کے عہدِ حکومت میں کورگ کا وسیع علاقہ کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ مدراس کی گورنری کے زمانہ میں اس کی آنکھ کورگ پر تھی وہ کورگ کو ایک انگلش نوآبادی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے کچھار کو بھی کمپنی کی مملکت میں شامل کر لیا۔ اس نے میسور کے الحاق کے بعد انتہائی

---

[1] : تاریخ عہد انگلشیہ ص ۱۵۱ ؛

کوشش کی لیکن یہ کام نظام دکن کو خوش کیے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ راجہ کو تمام اختیارات سے محروم کر کے میسور کو برطانوی افسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔
ولیم بنٹنگ مارچ ۱۸۳۵ء کو انگلستان روانہ ہوا[۱]۔

"۱۸۵۳ء میں جاڑا بڑی شدت سے پڑ رہا تھا، بڑے دن سے چند روز پہلے فورٹ ولیم کے توپ خانہ نے مرنے کی توپوں کے چھوٹنے سے مطلع کیا کہ راگھوجی بھونسلا راجہ ناگپور مر گیا۔ اس کو سنتالیس برس کی عمر میں موت کا پیغام آیا۔ اگرچہ وہ برانڈی اور رنڈی سے بہت شغل رکھتا تھا مگر رعایا پرور تھا اس کے خوش کرنے کا بہت خیال رکھتا تھا اور ان پر مہربانیاں و نوازشیں کرتا تھا۔
لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل نے حکم دیا کہ ریاست ناگپور ضبط کر لی جائے۔ انھوں نے لکھا کہ راجہ نے کوئی متبنیٰ نہیں کیا اور اگر وہ متبنیٰ کر بھی لیتا تو گورنمنٹ کا یہ فرض تھا کہ اس کے ماننے سے انکار کرتی[۲]۔

(۲۴)

ناگپور کی ضبطی

ناگپور مرہٹوں کی ریاست تھی، بھونسلا خاندان یہاں کا حکمران تھا۔ ڈلہوزی نے اس ریاست کا بھی خاتمہ کر دیا اور بہ شدت خاتمہ کیا۔ بلکہ راجہ کے خاندان اور خواتین کی بے عزتی کی گئی۔

۱: کمپنی کی حکومت ص۲۰۵
۲: تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۱۳۲

ریاست ضبط ہوئی تو ہوئی، لیکن انگریزوں کی زر پرستی نے اور گُل بھی کھلائے اور یہ حرکتیں ایسی تھیں جنھوں نے انگریزوں کی ذہنیت بے نقاب کردی۔ اور دنیا نے جان لیا کہ روپیہ پر یہ اس طرح گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھی۔

بیوہ رانیوں اور راجہ کے رشتہ داروں کی معقول پنشنیں مقرر ہوگئیں۔ راجہ کا کل مال صامت و ناطق نیلام ہوگیا۔ گھوڑا، بیل، ہاتھی، اونٹ کوڑیوں کے مول بک گئے، صرف بکھا بائی یا بانکا بائی نے غل مچایا کہ اگر میرے گھر کا اسباب نیلام ہوگا تو گھر میں آگ لگادوں گی، مگر اسباب نیلام ہوا، اہل بھوسلا کے جواہر کلکتہ کے بازار میں بکنے لگے، کچھ چھوڑ بھی دیئے گئے، ریاست کے ضبط ہونے سے زیادہ بد اثر اس اسباب کے نیلام ہونے سے ہوا۔

برٹش گورنمنٹ کی بدنامی

اس نیلام سے برٹش گورنمنٹ کی بدنامی ہوئی، روپیہ کا اتنا فائدہ نہ ہوا، جتنا عزت کا نقصان۔ رانیوں نے بہت کوشش کی کہ ریاست بحال ہو۔ لندن میں اپنے آدمی بھیجے، یہاں بہت روپیہ وکیلوں اور قانون دانوں کو دیا مگر کچھ نہیں ہوا۔

بڑی رانی نے جانوجی بھونسلا کو اس لیے متبنٰی کیا کہ اس کے مال و اسباب کا مرنے کے بعد مالک ہو اور خاندان کا نام باقی رہے بھونسلا کا ملک انگریزی میں شامل ہوگیا، اس میں افیون کا گودام پٹنے کی طرح مقرر ہوا اور توپوں کی فیکٹری، کاشی پور کی طرح مقرر ہوئی، پنجاب اور پیگو کے الحاق نے تو سرحدوں کے سروں پر کمپنی کی عمل داری کو بڑھایا تھا اور ستارہ و ناگپور کے دو نامور مرہٹوں کی ریاستوں کے الحاق نے اندرونی عملداری کو مستحکم کیا اور ہندوستان کے نقشے میں سرخ رنگ کو بڑھایا۔ اور کل ہندوستان میں گورنمنٹ کے اس استحقاق کا اعلان کیا کہ جو راجہ لاولد مرے گا اس کا ملک راج پاٹ ضبط کرنے کا حق گورنمنٹ کو حاصل ہے[1]۔

ناگ پور کا راج لینے کیلئے ایک شخص آپا صاحب اٹھا وہ گرفتار کرلیا گیا۔ یہ وہی شخص ہے تین

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۳۷۔

ہزار روپیے تھے، اور ناگپور کی حکومت کا خواستگار تھا۔ گویا انگریز حکومت نے یہ اصول بنا لیا تھا کہ ہندوستان کی جو ریاست کسی عذر کے ماتحت چھینی جا سکتی ہے چھین لی جائے[1]۔

۲۵

اودھ کا جبری الحاق

اودھ کا الحاق سیاسی اور اخلاقی طور پر ایک بہت بڑا گناہ تھا۔ مورخوں نے اس الحاق کو ۱۸۵۷ء کے حادثہ کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔ اودھ کا آزادانہ وجود مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط سے شروع ہوتا ہے۔ شاہانِ اودھ اگرچہ آزاد تھے لیکن انھیں مغل شہنشاہ کا وزیر خیال کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ نواب وزیر مغلیہ دربار کے اثرات سے آزاد ہوتے گئے۔ کمپنی نے انھیں دہلی کے حلقۂ اثر سے آزاد کرنے میں مدد دی۔

مارکوئیس آف ہسٹنگز نے اودھ کے نواب وزیر کو "شاہ" کا خطاب دیا۔ وزارت سے شاہیت زیادہ غلامانہ ثابت ہوئی۔ شاہانِ اودھ کمپنی کے زیر اثر آ گئے۔ کمپنی نے حسب منشاء شاہانِ اودھ کی طاقت کم کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ ۱۸۰۱ء کے معاہدہ نے کمپنی کو مملکت اودھ کا محافظ بنا دیا۔

اودھ کی تمام مصیبتوں کا سرچشمہ یہی معاہدہ ہے۔ کمپنی کی پنجاہ سالہ سرپرستی حالات اودھ کو بہتر نہ بنا سکی۔ لارڈ ڈلہوزی مداخلت چاہتا تھا۔ ڈلہوزی کی مداخلت کا مقصد اودھ کا خاتمہ کرنا

---

[1] سر طامس منٹگمری کی ڈائری صفحہ ۱۵۲۔

تھا، مدتوں سے انگریز اودھ پر آنکھ لگائے ہوئے تھے۔

اودھ کی برطانی آبادی بھی ڈلہوزی کو الحاق کا مشورہ دے رہی تھی، دربار ناصر الدین کے ایک برطانی مصوّر نے شاہانِ اودھ کو بدنام کرنے کے لیے مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی لکھی، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کلکتہ ریویو کے ایک مقالہ میں الحاق اودھ کا مشورہ دیا گیا الحاق اودھ کے بعد ڈلہوزی ۱۸۵۶ء میں انگلستان چلا گیا[۱]

(۲۶)

بوشہر پر قبضہ

افغانستان، برما، پنجاب اور بہت سی ہندوستانی ریاستوں پر غلبہ قبضہ اور تسلط حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے ایران پر قبضہ کرنا چاہا، یہ ایک اسلامی مملکت بھی کیوں انگریزوں کے یمن قدم سے محروم رہے، چنانچہ اس پر بھی یورش شروع ہوگئی:—

"خلیج فارس میں بوشہر پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہوئیں ۔ ۱۳ ر نومبر ۱۸۵۶ء کو بمبئی سے جہاز مسقط سے آگے چلے پنیتالیس[۴۵] جہاز ایک لشکرِ جرار ۵۷۰۰ سپاہیوں کا لشکر جس میں تہائی گورے تھے لے کر بیرجہاز چلے، سرہنری لیک اس بیڑے کے کمانڈر تھے اور بری سپاہ کے سپہ سالار:

جزیرہ کرک پر قبضہ

اس سپاہ نے ۴ ر دسمبر کو جزیرہ کرک پر قبضہ کر لیا، ۱۰ ر دسمبر کو الٹا کر سارا لشکر خشکی میں بوشہر سے بارہ[۱۲] میل پر اترا، اور پرانی شہر میں جو جون

ف۱: کمپنی کی حکومت ص ۲۵۷؛

کا ایک پرانا قلعہ تھا چلے گئے۔ اس قلعہ سے انگریزی سپاہ نے ایرانیوں کو حملہ کرکے نکال دیا۔ ایرانیوں کی طرف سے عرب کے سوار جو قواعد دان نہ تھے، خوب لڑے۔ انگریزی دو افسر مارے گئے۔ کپتان فلیکس ایک چھوٹی سی دخانی کشتی میں علم صلح لے کر بوشہر کی طرف گئے اور معمول درخواست کی کہ شہر حوالے کیا جائے۔ اہل شہر اور تاجروں کو سب طرح سے پناہ دی جائے گی۔ بجائے حوالے کرنے کے ایرانیوں نے جہازوں پر گولے چلائے۔ انگریزوں نے حملہ کرکے بوشہر فتح کر لیا اور ۶۵ توپیں اور بہت سے اسباب حرب و ضرب ان کے ہاتھ آیا۔ کئی ہفتوں تک پھر لڑائی نہیں ہوئی۔[1]

(۲۷)

پنجاب کا الحاق

پنجاب بھی آخر انگریزوں کی دستبرد سے نہ بچ سکا

"ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں"

"رنجیت سنگھ سے اور سکھوں سے انگریزوں نے کافی دوستانہ تعلقات معاہدہ کرکے پیدا کر لیے تھے لیکن جب ضرورت داعی ہوئی تو تعلقات کا رشتہ مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور ثابت ہوا۔ اور پنجاب کا الحاق کر لیا گیا۔

رنجیت سنگھ کو حکومت جمانے کا بہت اچھا موقع ملا۔ اس کے پشت کو ایک مذہبی گروہ بندی سہارا دیتی تھی لیکن جس طرح سکھ "قومیت" مختلف عناصر سے مجون مرکب بنی تھی ایسے ہی سکھ سرداروں کے

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۵۸

افکار و اعمال سے بے ربطی اور پریشانی برستی تھی۔ رنجیت سنگھ (وفات ۱۸۳۹ء) کا جانشین بیٹا کھڑک سنگھ مخبوط الحواس بنایا گیا ہے وہ اور اس کا فرزند نونہال سنگھ شیر سنگھ (اپنے بیٹے سمیت) ایک خونی سردار کا شکار ہوا، رنجیت سنگھ کا تیسرا نابالغ لڑکا دلیپ سنگھ گدی کا وارث اور اس کی ماں "رانی جنداں" راجا کی اتالیق بنی وہ ایک بازاری عورت تھی اور انگریزوں کی روایت ہے کہ اسے اور اس کے مشیروں کو اپنے اقتدار کی سلامتی اس میں نظر آئی کہ سرپھرے سکھ سرداروں کو کمپنی سے ٹکرا دیا جائے، مشہور کر دیا کہ انگریز پنجاب پر حملہ کرنے والے ہیں۔ دوسری افواہ یہ بار بار اڑائی گئی کہ سکھ سپاہی دلی پر ناگہانی حملہ کر کے اسے لوٹ لینا چاہتے ہیں[1] لیکن اگر واقعی وہ انگریزوں کو اس درجہ غافل و بے خبر سمجھتے تھے۔ تو ستلج اترتے ہی اپنی حماقت نظر آگئی ہوگی کہ کوئی بیس میل پر انگریزی فوج آمادہ جنگ ملی اور سکھوں کا حملہ روک لیا (معرکہ مڈکی، دسمبر ۱۸۴۵ء) پھر دو تین آویزشوں کے بعد خود انگریزی فوج نے حملہ کیا اور ستلج کے کنارے سب راؤں گانو (ضلع فیروزپور) پر سخت شکست دی (فروری ۱۸۴۶ء) دریا کا پل جس کے ذریعہ بھاگنے والے پار ہو رہے تھے انگریزی توپوں کی زد میں تھا اور عین اس وقت گولہ باری سے اڑا دیا گیا جب کہ سکھ توپ خانہ پیادوں اور سواروں

---

[1] سب حالات کے ماخذ انگریزی ہیں اور ان میں صریحاً تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا گیا ہے سکھوں سے پہلی جنگ لارڈ ہارڈنگ (۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۸ء) کے زمانے میں ہوئی اس کی سوانح خود اس کے بیٹے نے لکھی ہے اور فرماں روایان ہند "رولرز آف انڈیا" کے سلسلہ کتب میں چھپی ہے ۱۹۰۰ء دلچسپ ہونے میں شبہ نہیں مگر بیٹے کی شہادت ہی کیا، لیبل گریفن اور کننگ ہم دونوں ہم عصر مورخ انگریزوں کی جنگ اور سیاست کے باب میں سخت نامعتبر ہیں پہلے کی تالیف "رنجیت سنگھ" میں فحش نگاری تک کام لیا ہے کننگ ہم کی "ہسٹری آف سکھس" کی طبع اول (۱۸۴۹ء) کے نسخے خود مولف نے ضائع کیے ۱۸۵۳ء میں دوبارہ بہت کچھ بدل کر شائع کی۔

[2] (آکسفرڈ ہسٹری صفحہ ۶۹۳ بحوالہ کننگ ہم۔ مارش مین وغیرہ)

سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا پل گرنے سے ہزاروں مارے گئے اور ہزاروں ڈوب کر دریا کے پار لگے انگریز گورنر جنرل کے بیٹے نے یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھا اور باپ کی سوانح عمری میں مزے لے لے کر اس کا نقشہ دکھایا ہے۔

بیج اور فصل

ستلج کے پل کی شکست نے لاہور کا راستہ چوپٹ کھول دیا پھر انگریزوں کی کوئی مزاحمت نہیں ہوئی بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود غرض سازشی انھیں لاہور قبضہ دلانے پر شریک تھے۔ سیل گریفن اپنی کتاب "رنجیت سنگھ" میں لکھتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے جیسے بیج بوئے تھے ویسی ہی فصل اٹھی۔

"جو حکومت دغابازی اور ظلم و سفاکی پر قائم ہوئی تھی۔ اپنے بانی کے بعد چند روز بھی سلامت نہ رہی۔۔۔"

شاید یہ اس دغابازی کے جواز کی دلیل دی گئی ہے جس کا انگریزی فتوحات میں حصہ تھا۔ پہلے معاہدے میں لاہور کا قبضہ ختم سال تک حاصل کیا گیا۔ (مارچ ۱۸۴۶ء) پھر مہاراجہ کے بلوغ یعنی آٹھ سال تک بڑھا لیا گیا جالندھر اور ستلج بیاس کا دوآبہ کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہو گئے پندرہ لاکھ اشرفی تاوان لگایا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی اتالیقی انگریز قائم مقام (ہنری لارنس) کے تفویض ہوئی۔ آگے چل کر اس کی ماں جنداں تک کو پنجاب سے نکال دیا گیا۔ جموں کے حاکم گلاب سنگھ نے ان کارروائیوں پر بہت مدد دی۔ وہ قوم کا ڈوگرہ اور ادنیٰ درجے سے رنجیت سنگھ کا ساختہ پرداختہ آدمی تھا۔ اب اپنے ولی نعمت کی مملکت خراب کرنے میں حصہ دار ہو گیا۔ لاہور کے خزانے میں تاوان کی رقم یعنی پانچ لاکھ اشرفی سے زیادہ نہ تھی۔ دس لاکھ اشرفیاں گلاب سنگھ نے بھرنے کا اقرار کیا۔ اور معاوضے میں گلستان کشمیر کی ریاست حاصل کی۔ کہ رسماً آج بھی اس کی اولاد کی میراث ہے۔

انگریزوں کا عمل دخل

رنجیت سنگھ کی تقریباً نوے ہزار فوج توڑ کر یک قلم تباہ کر دی گئی تھی۔ دار الحکومت لاہور پر انگریزوں کا عمل دخل تھا صرف ایک

۱؎ وادی کشمیر وہاں کے مسلمان حاکم وقت سے چھین کر گلاب سنگھ کو دلوانے کے لیے ایک انگریزی فوج بھیجی گئی تھی اس میں سترہ ہزار سکھ بھی بھرتی ہو گئے تھے۔ (اکسفرڈ کی ہسٹری صفحہ ۶۹۶) ۔

بڑا شہر ملتان، بچار ہا اللہ سکھوں کی خاصی بڑی چھاؤنی بن گیا۔ بعید شمال میں ضلع ہزارہ بھی پوری طرح گرفت
میں نہیں آیا تھا لیکن یہاں کے سکھ سب بے سرے سردار تھے جن کے متفق ہونے اور کمپنی پر حملہ کرنے
کا خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ ہارڈنگ نے رخصت ہوتے وقت اپنے جانشین ڈلہوزی کو یقین دلایا کہ آئندہ
سات برس تک ہندوستان میں توپ چلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، مگر یہ نیا گورنر جنرل (۱۸۴۸ء تا
۱۸۵۶ء) ہارڈنگ سے زیادہ سخت دل اور برطانوی ملوکیت کا بدترین نمونہ نکلا۔ اکثر انگریز مورخ اسے
سلطنت کے معماروں میں گنتے اور صفت وثنا کے گیت گاتے ہیں۔ اہل ہند کے دلوں میں اس کے
طریق عمل نے دشمنی کی جو آگ لگائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ولایت والوں تک کو اس کی لو بھڑکتی
ہوئی نظر آئی۔ اور برطانوی قوم ایسٹ انڈیا کمپنی سے ناراض ہوئی۔ اقتدار کی باگ اسی ہٹلر مزاج انگریز
کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بڑے پیمانے پر سکھوں کا قلع قمع کرنے کی تیاریاں کیں۔

ختم سال (۱۸۴۸ء) سے قبل بیس ہزار سے زیادہ باقاعدہ فوج اور بھاری توپ خانے سے
ہزارہ میں فوج کشی کرائی۔ سپہ سالار اعلیٰ لارڈ گف خود قیادت کر رہا تھا۔ ملتان کا حاکم محصور کر لیا گیا تھا
میدانی مقابلہ ہزارہ کے مقامی سرداروں سے کرنا تھا جو انگریزوں کی دست درازی سے لڑنے پر مجبور
ہوئے۔ پہلی بڑی لڑائی جہلم کے کنارے لاہور سے کوئی سو میل شمال مغرب میں لڑی گئی اور انگریزی حملہ
بری طرح ناکام ہوا۔ زیادہ بدنامی کی بات یہ تھی کہ کئی توپیں اور گورا فوج کے جھنڈے غنیم نے چھین لیے
گوروں کو بھاگ کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ (معرکہ چلیان والہ۔ جنوری ۱۸۴۹ء م ۱۲۶۴ھ ہجری)[1]

اتفاقی کامیابی

لیکن یہ اتفاقی کامیابی تھی۔ سکھ ہر طرف سے گھرے ہوئے تھے
ان میں اتحاد اور کسی مذہبی یا قومی غیرت کا پتہ نہیں چلتا۔ ہزاروں
سکھ انگریزوں کی طرف سے ہم قوموں سے لڑنے آئے تھے بہت سے حلقہ بگوش بن

---

[1]: ڈلہوزی نے اس لڑائی کو بھی اپنی فتح قرار دیا تھا جس پہ مارش مین (ص ۴۶۵) اکین (۲، ص ۲۰) اور
ونسنٹ اسمتھ (ص ۶۹۹) تک تعریض کرتے ہیں۔

چکے تھے۔ اسی جنوری میں ملتان فتح ہو گیا۔ وہاں کی فوج اور تازہ دم کمک نے گف کے نقصانات کی تلافی کی بلکہ قوت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی، ہمسایہ افغانوں سے سکھوں کو مدد کی امید نہ تھی[1] مقامی مسلمانوں کو خود انھوں نے اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ تعاون کرتے آئندہ معرکوں کے بیان میں انگریز اہل قلم نے مفت میں فسانہ آرائی سے کام لیا ہے۔ غرض چند ہی تھپیڑوں میں دراز مہ خالصہ کا سارا تار و پود بکھر گیا۔ غرور سرنگوں ہو گیا۔ ڈلہوزی نے اپنی مجلس شوریٰ یا کمپنی کے نظما کی بھی رائے نہ لی۔ پورے پنجاب کے الحاق کا اعلان کر دیا (۱۸۴۹ء) راجہ کی ذاتی جاگیر، مکانات زر و زیور کمپنی کے خزانہ میں داخل کیے انھیں زیورات میں دنیا کا چمکتا ہیرا "کوہ نور" بھی تھا۔ جو نادر شاہ کی لوٹ میں ایران اور درّانیوں کی غارت گری میں کابل گیا اور شاہ شجاع درّانی سے رنجیت سنگھ نے جھپٹ لیا تھا۔ اب تاج برطانیہ کی زینت ہے۔ سب سے ناگوار تعدی یہ تھی کہ نابالغ دلیپ سنگھ کے دین دھرم پر چھاپا مارا، ولایت لے جا کر عیسائی بنا یا میدانِ جنگ کے بجائے فقط گیند بلے کے میدان میں دوڑ لگانے کا فن سکھایا[2]۔

کوہ نور اور دلیپ سنگھ

کوہ نور ہیرا کس جرم میں چھینا گیا۔ اور دلیپ سنگھ کس طرح گورنر جنرل کی زیر سرپرستی عیسائی بنا یہ داستان دلخراش سہی لیکن دلچسپ بھی ہے:۔

" لاہور میں آخر دربار کیا گیا اور فتح مند انگریزوں کے احکام کم عمر راجہ اور ان سرداروں کے روبرو جنھوں نے کھلی بغاوت نہیں اختیار کی تھی۔ پکار کر پڑھے گئے۔ اور پھر ان شرائط کا نامہ پیش کیا

---

[1] : سرحد کے افغانی سرداروں میں اتفاق اور قوت نامہ کا فقدان تھا، عام مسلمان سکھوں کے وحشیانہ برتاؤ اور حضرت سید احمد بریلوی کی تبلیغ سے سکھا شاہی کے دشمن ہو گئے۔ سید صاحب کی شہادت (۱۸۳۱ء ۱۲۴۶ ہجری) نے انھیں حیات جاودانی بخشی۔ اور ان کی تحریک بھی مدتوں تک زندہ رہی۔

[2] : تاریخ پاک و بھارت (سید ہاشمی) صفحہ ۲۵۰

گیا جس میں یہ شرط بھی تھی کہ برٹش گورنمنٹ چار لاکھ روپیہ سالانہ سے نہ کم اور پانچ لاکھ روپیہ سے نہ زیادہ کم عمر راجہ اور اس کے کنبہ کو دے گی، جب تک کہ وہ انگریزوں کا خیر خواہ و نیک اندیش رہے گا اور یہ اس کو اختیار ہے کہ جہاں چاہے وہاں رہے، اس تغیر کا ہونا دلیپ سنگھ کی خوش نصیبی تھی کہ جو سکھوں کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔ اب اس حالت میں اس کے پاس دولت بہت تھی۔ امن و عافیت میں تھا، تمام فکروں اور اندیشوں سے آزاد تھا۔ اور سب سے بڑی برکت اس کو یہ حاصل ہوئی کہ نجات دینے والا مذہب ملا۔ (یعنی عیسائی ہو گیا۔) وہ اپنی بارہ برس کی عمر میں گورنر جنرل کی ولایت میں آیا یعنی اس کا وارڈ ہوا بنگال سپاہ کے اسسٹنٹ سرجن جن کا نام پیچھے سر موجن ہوا راجہ کی تربیت، تعلیم کا مہتمم مقرر ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کم عمر سکھ شہزادہ ایک عیسائی جنٹلمین اور ملکہ معظمہ کا درباری اور اسکاٹ لینڈ کا اشراف مالک زمین ہوا۔ جب دلیپ سنگھ تخت سے معزول ہوا تو سکھ گورنمنٹ کو پچاس لاکھ روپیہ سپاہ کی تنخواہ کے بابت قرض دینا تھا، اس سبب سے اس کا تمام مال اسباب ضبط کر لیا گیا۔ اس میں دنیا کا مشہور الماس کوہ نور بھی تھا۔ جو شاہ شجاع سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ہاتھ لگا تھا۔ اس کو لارڈ ڈلہوزی نے ملکہ معظمہ کی نذر میں لندن بھیج دیا[1]۔

پروپیگنڈا اور نمائش

پھر اس فتح پنجاب کا پروپیگنڈا کس طرح ہوا۔ اور نمائش کے ذریعہ دوسروں کو تخویف و ترہیب کا ہدف کیونکر بنایا گیا۔ یہ بھی ملاحظہ کیجیے:۔

"۸ مئی ۱۸۴۶ء بتاریخ ۱۰ ماہ مئی حال ایک سو توپیں جو سکھوں سے جنگ میں فتحمندی کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ اور ۲۰ توپیں جو گورنمنٹ بہادر کے تسلط کے بعد لاہور کے لوگوں نے خود بخود سپرد کی تھیں، شہر دہلی کی فصیل سے تا این میگزین کے مکان میں رکھی گئیں یہ توپیں بہت بڑی، بہت خوبصورت عمدہ ہیں، ان کے حاصل کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کی فوج بہت جرار و دلاور اور شجاع ہے جس نے ہمت مردانہ کی وجہ سے اس قدر نمایاں کامیابی کے ساتھ مال غنیمت حاصل کیا۔ توپیں

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۹

اِس قدر عجیب و نادر ہیں کہ بڑے بڑے انگریز لوگ اور عامۃ الناس جوق در جوق ان کے دیکھنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں، تین توپیں تو اِن میں سے اِس قدر بھاری تھیں کہ ایک ایک توپ کو تین تین ہاتھیوں نے بمشکل تمام کھینچ کر منزل مقصود تک پہنچایا۔[1]

انگریزوں کا کاروبار

"ملتان میں مُول راج مفسد ختم ہوا اور انگریز وہاں بھی قابض ہو گئے تو انھوں نے فوراً کس قسم کا کاروبار شروع کر دیا یہ بھی انگریزی تاریخ جنگ اور تاریخ اخلاق کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔

"ملتان کی خبر ہے کہ ملتان کے رہنے والوں نے لوٹ مار موقوف رکھے جانے کے معاوضے میں بیس[2] لاکھ روپے داخل کئے، شہر میں افواہ ہے کہ رعایا کا جو سامان مُول راج نے اور خود باہم رعایا نے لوٹا تھا اور وہ انگریزی فوج کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اُن کو واپس لینے کے لیے شہر والے بیس[2] لاکھ روپے دینا چاہتے ہیں مگر سرکار تیس لاکھ روپیہ مانگ رہی ہے ورنہ سامان نیلام کر دیا جائے گا۔[2]

گلاب سنگھ

پنجاب کی جنگ میں راجہ گلاب سنگھ، سکھوں کے ساختہ پرداختہ والیٔ کشمیر نے اپنے آقا کے ساتھ کس طرح بے رُخی اور بے مروّتی برتی اور کس طرح اپنے لیے انگریز آقاؤں کی خوشنودی حاصل کی وہ بھی پیشِ نظر رکھیئے۔

"یہ خبر بھی آئی ہے کہ ضلع جالندھر کا مفسد رام سنگھ بھاگ کر ریاست جمّوں چلا گیا تھا وہاں اس کو مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوج نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔[3]

انگریزوں کا وفادار

"مہاراجہ گلاب سنگھ کا نمایندہ فتح پنجاب کی مبارکباد دینے مری کو لاہور پہنچا اور ریزیڈنٹ پنجاب سے مل کر واپس چلا گیا۔[4]

---

[1] بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۵۵۔

[2] سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۵۹۔

[3] سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۱۲۔

[4] سر طامس مٹکاف کی ڈائری صفحہ ۱۱۲۔

سکھ اور انگریز

جن ریاستوں کے ساتھ ایک تہائی صدی تک انگریز زیادتیاں کرتے رہے، جن پر ظلم کرتے رہے، جن کا الحاق کرتے رہے، جنہیں اِن کے حقوق سے محروم کرتے رہے، جن سکھوں سے اُنہوں نے پنجاب چھینا، چند سال بعد انتہائی جان نثاری اور وفاداری کے ساتھ اُنہوں نے انگریزوں کی خدمت کی، جن ہندو اور مسلمان والیانِ ریاست سے انگریزوں نے غاصبانہ اور جفا کارانہ برتاؤ کیا، انہوں نے اِن کے لیے جان کی بازی لگا دی ـــــ یہ زمانہ کا کتنا عجیب، لیکن سبق آموز پہلو ہے۔

"اب وہ لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی ہندوستانی ریاستوں کے الحاق کی اور متبنّیٰ کرنے کی نہ اجازت دینے کی نہیں رہی تھی، کہ جس سے سارے رئیسوں کے دل شکستہ اور اُداس ہوتے تھے لارڈ ڈلہوزی کی اِس پالیسی کی کہ ہندوستانی ریاستیں الحاق کی جائیں، حکومت بڑی مؤید تھی، مگر جب غدر ہوا اور اِن ہندوستانی ریاستوں نے مدد کر کے گورنمنٹ انگریزی کی ڈوبتی ہوئی سلطنتِ انگلشیہ کو بچایا تو لارڈ ڈلہوزی کی رائے کہ ہندوستانی ریاستوں سے برٹش گورنمنٹ کی کبھی تقویت نہیں ہوتی غلط ثابت ہوئی چنانچہ لارڈ کیننگ نے دربار میں ہندوستانی رئیسوں کا شکریہ ادا کرتے وقت فرمایا کہ ہندوستانی ریاستیں اِس طوفان کا پانی روکنے کے لیے بند ثابت ہوئیں۔ اگر والیانِ ریاست نہ ہوتے تو ہم پانی کے ایک ہی ریلے میں بہہ جاتے، اِن دیسی روساء کے برقرار رہنے سے جو ہمارے دوست ہیں ہماری سلطنت کی محافظت ہوگی اور اس میں امن و عافیت کی ترقی ہوگی اور اگر ہندوستان پر باہر سے کوئی حملہ ہوا یا انگلینڈ کو مشرقی سلطنت میں کوئی خطرۂ عظیم پیش آئے گا تو بھی ہندوستانی ریاستیں برٹش گورنمنٹ کی بڑی پشت پناہ ہوں گی، سر جان لارنس نے پنجاب میں ایام غدر میں ہندوستانی ریاستوں کی خیر خواہی اور معاونت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو انہوں نے اپنی پہلی رائے کو بدل دیا اور لارڈ کیننگ کی طرح ہندوستانی ریاستوں کے قدرشناس ہو گئے کہ اگر ہندوستانی ریاستیں اِن کے ساتھ شریک نہ ہوتیں تو دہلی کبھی فتح نہ ہوتا۔ لارڈ کیننگ نے دیسی روساء کی ریاست کے دوامی قیام کے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ وہ برٹش گورنمنٹ کی جان نثار وفادار خیر خواہ رہیں[1]۔

اور کون کہہ سکتا ہے کہ دیسی ریاستوں نے انگریزوں کے جاتے وقت تک جان نثاری، وفاداری اور خیر خواہی کا مظاہرہ نہیں کیا، وہ انگریز ہی تھے جو انہیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ورنہ اِن کا جذبۂ وفا تو اب تک قائم ہے ؎

چاہیں تو تم کو چاہیں، دیکھیں تو تم کو دیکھیں — خواہش دِلوں کی تم ہو، آنکھوں کی آرزو تم

---

[1] ۔ تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) (از ذکاء اللہ) صفحہ ۳۰۶

باب

مُسلم اَوقاف کا حشر

فرنگی دھاندلی، بددیانتی اور خیانت کا مُرقّع

انگریزوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں، امانت و دیانت کے سلسلہ میں بھی کوئی اچھی اور قابلِ تعریف مثال نہیں قائم کی۔ دلّی اور لکھنؤ کے خاندان شاہی کے افراد نے، مُلک کے امراء و رُؤسا نے، نیز باحوصلہ او مخیّر مسلمانوں نے بڑی رقمیں اور جائدادیں وقف کرکے انگریزوں کی تحویل میں دیں کہ اصل محفوظ رہے، اور نفع کے طور پر جو آمدنی ہو، وُہ کارِ خیر۔ صدقۂ جاریہ، بہبودِ عوام۔ تقریبات مذہبی، ترویج تعلیم، اعانت بیوگان، تدریس دینی اور مستحق لوگوں پر صرف کی جائے، یہ رقومات تو انگریزوں نے لے لیں، اور جائدادوں پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن، واقف کے منشا اور مقصد کے خلاف ...ن کا استعمال کیا، جسے چاہا دیا، جسے نہ چاہا نہ دیا، جو چاہا کیا، نہ کوئی اعتراض سُنا، نہ کسی دلیل کی طرف توجہ کی۔ نہ حق اور استحقاق کا لحاظ کیا، دبدبہ اور جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ اس دھاندلی، بددیانتی اور خیانت کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بھی بلند نہ ہو سکی، اور اگر کوئی مّدھم سی آواز فضا میں بلند ہوتی، تو یا وہ دبا دی گئی، یا خود بخود تحلیل ہو گئی۔

اس سلسلہ میں، اگر، ہم کسی مسلمان کی شکایت یا بیان پیش کریں تو گو وہ کتنا ہی مدلّل اور مبرہن ہو، لیکن اس کی وہ اہمیت نہیں ہو سکتی، جو کسی واقفِ حال انگریز کے مشاہدات کی ہو سکتی ہے؛ ولیم ہنٹر انگریزوں کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، "جو انڈین سول سروس" کے افرادِ والا مقام پر مشتمل تھا، ہندوستان کی حکومت درحقیقت تقسیمِ ہند تک اسی طبقہ کے ہاتھ میں رہی، ہنٹر کا یہ بیان واقعات د

حقائق کی منہ بولتی تصویر ہے، اسی سے، انگریزوں کی دوسری خیانتوں کا بھی اندازہ لگا جا سکتا ہے۔

ع تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

ھنٹر صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:۔

"۱۸۰۶ء میں ہگلی کا ایک دولتمند مسلمان فوت ہو گیا اس نے اپنی جائداد کا بہت بڑا حصہ مصرف خیر کے لیے چھوڑا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں اس کے ٹرسٹیوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ اور یہ جھگڑا ۱۸۱۰ء میں بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ ایک دوسرے کے خلاف بددیانتی کے مقدمات دائر ہو گئے۔ اس پر ضلع کے انگریز کلکٹر نے عدالت کے فیصلہ تک اس جائداد کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یہ مقدمات ۱۸۱۶ء تک چلتے رہے آخر کار گورنمنٹ نے ان دونوں ٹرسٹیوں کو بے دخل کر دیا اور جائداد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ایک ٹرسٹی تو خود گورنمنٹ بن بیٹھی اور دوسرا ٹرسٹی وہ جسے حکومت اپنی مرضی سے نامزد کرے اگلے ہی سال اس ساری جائداد کا دوامی پٹہ لکھا گیا۔ اور ہر دوامی پٹہ دار سے ایک معقول رقم حاصل کر لی گئی۔ ان ادا شدہ رقوم کی میزان مع اس آمدنی کے جو دوران مقدمہ میں جمع ہوتی رہی ایک لاکھ ستاون ہزار پونڈ ہے۔ تقریباً (اکیس لاکھ روپیہ) مزید برآں دو ہزار پونڈ تقریباً (ڈیڑھ لاکھ روپیہ) کچھ اوپر کی رقم وہ ہے جو اس وقت تک جائداد مذکورہ کی سالانہ آمدنی سے بچائی گئی۔

---

* جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں، یہ وقف مصرف خیر کے لیے کیا گیا تھا۔ اور اس کے مصارف وصیت نامہ میں درج بھی تھے، مثلاً بعض مذہبی فرائض اور رسوم کی ادائیگی امام باڑہ، ہگلی کی عظیم الشان مسجد کی مرمت ایک قبرستان اور بعض وظائف اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی ادارے وغیرہ وغیرہ ایک تعلیمی ادارہ بھی اس وصیت کے مقاصد کے تحت میں آتا تھا، مگر وہ تعلیمی ادارہ ایسا ہونا چاہیئے تھا جو مسلمانوں کے خیال کے مطابق ہو، جیسا کہ وصیت کرنے والے

نے خود منظور کیا تھا اسلامی ممالک میں غریب و نادار لڑکوں کے لیے کالج قائم کرنا ہمیشہ ایک نیک کام سمجھا جاتا ہے مگر اس سرمایہ سے ایک غیر مسلم کالج بنانے کی ہر کوشش وصیت کنندہ کی منشاء کے مطابق ایک الحادی کام تھا۔ اور اس سے ٹرسٹوں کی محنت بددیانتی کے سوا کچھ منظور نہیں ہوتا۔

کیا ہم اس غم و غصہ کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مسلمانوں کے اندر اس بات سے پیدا ہوا کہ انگریزی حکومت ایک انگریزی کالج کی تعمیر سے اس سرمایہ کا غلط استعمال کرنے والی ہے۔ بہرحال اس نے ایسا ہی کیا۔ اور اس جائیداد کا سرمایہ جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے مصرف خیر پر خرچ کرنے کے لیے وقف کی گئی تھی۔ ایسے ادارے پر صرف کر دیا جو اپنی ساخت ہی میں اسلامی اصولوں کے خلاف تھا۔ اور جس سے مسلمان عملاً مکمل طور پر خارج کر دیئے گئے تھے۔ اس وقت اس کالج کا پرنسپل ایک معزز انگریز ہے جو عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا وہ ایک خالص اسلامی وقف کو ایسی تعلیم میں صرف کر رہا ہے۔ جس کو ہر مسلمان نفرت سے دیکھتا ہے اس کی تنخواہ پندرہ سو پونڈ سالانہ ہے۔ مگر یہ اس کی غلطی نہیں اگر یہ غلطی ہے تو اس حکومت کی جس نے اس کو اس عہدے پر مقرر کیا ہے اور جو دس سال سے متواتر اس بہت بڑے تعلیمی فنڈ کا جان بوجھ کر غلط استعمال کر رہی ہے۔ انگریزی کالج کے ساتھ ایک مدرسہ کا الحاق کر دینا اس انتہائی بددیانتی کو چھپانے کی ایک فضول سی کوشش ہے۔ کالج کی عمارت پر جمع شدہ سرمایہ کے غلط استعمال کے علاوہ اس میں سے ہر سال پانچ ہزار پونڈ کالج پر خرچ کر دیتی ہے۔ گویا پانچ ہزار دو سو ساٹھ پونڈ کی سالانہ آمدنی میں سے صرف تین سو بیاسی پونڈ اس اسلامیہ سکول پر خرچ کیے جاتے ہیں۔ ص۱

ص۱ "ہمارے ہندوستانی مسلمان"

غدر سے پہلے بغاوت کے آثار

بے اطمینانی، بدامنی، جدوجہد

غدر سے پہلے ہی بغاوت، اور شورش کے آثار پیدا ہو چکے تھے بے اطمینانی عام تھی، بدامنی معذافزوں تھی۔ فرنگی استبداد سے گلو خلاصی کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ فرنگیوں کا آفتاب اقبال ابھی نصف النہار پر تھا، اس لیے ہر قسم کی جدوجہد ناکام ہوئی، بدامنی دبا دی گئی، اور بے اطمینانی کچل دی گئی،

ذیل میں ہم، ایک انگریز آئی سی ایس کے تاثرات ومشاہدات، اور بیان کردہ واقعات، اقتباس وہ استنباط کی صورت میں پیش کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ، غدر سے پہلے ہی حالات نے کیا صورت اختیار کر لی تھی؟

استھانہ کیمپ استھانہ کیمپ سے مراد، مجاہدین کی وہ منظم اور پُرجوش جماعت ہے، جو یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ، ہر قیمت پر مسلمانوں کو، غیر مسلم استیلاء سے نجات دلائے گی ان لوگوں کی صداقت اور راستبازی سے متاثر ہو کر، انگریزی فوج، اور، پولیس کے آدمی بھی ان کا ساتھ دینے لگے تھے۔

۱۸۵۲ء کو انہوں نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آگیا ہے، روپیہ اور آدمی ہمارے علاقہ سے استھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔ اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی۔ اور متعصب نوآبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی

کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے ان کے مقابلے کے لیے بھیجی جاتی۔ ان خطوط سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لیے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔

پھر کہتا ہے:۔

۱۸۵۲ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔ [1]

مجاہدوں کا زور

استھانہ کیمپ کے "باغیوں" یعنی "مجاہدوں" نے موقع پاتے ہی، دوسروں کی امداد اور دستگیری سے بے نیاز ہو کر، ہجوم و اقدام پر عمل شروع کر دیا:۔

"غدر سے ذرا پہلے ۱۸۵۷ء میں انہوں نے ہمارے خلاف عام اتحاد کی بنا ڈالی اور یہاں تک گستاخانہ دلیری سے کام لیا کہ انگریزی حاکموں سے بھی تخویف مجرمانہ میں مدد کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ چنانچہ ہمارے انکار پر وہ اس قدر برانگیختہ ہو گئے، کہ ہمارے علاقہ پر چڑھ دوڑے اور لفٹننٹ ہورن LIEUT HORN کے کیمپ پر شب خون مارا جو اس علاقہ کا اسسٹنٹ کمشنر تھا، اور اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی، اس کا بدلہ لینے کے لیے زیادہ دیر نہیں کی جا سکتی تھی، چنانچہ سر سڈنی کاٹن SIR SIDNEY COTTON پانچ ہزار فوج توپ خانہ سوار پیدل سمیت ۴۸۷۷ باقاعدہ فوج، کی معیت میں پہاڑی علاقہ میں داخل ہو گیا، چونکہ یہ جنگ ان جنگوں میں سب سے پہلی تھی، جو اس جنوبی کیمپ کی وجہ سے ہمیں لڑنی پڑیں، اس لیے اس کو یہیں مختصراً بیان کیے دیتا ہوں۔ اور دوسری لڑائی کو جو ۱۸۶۳ء میں ہوئی، صرف بطور مثال پیش کروں گا۔ کسی قدر وقت کے بعد جنرل سر سڈنی کاٹن کی فوج نے باغی اتحادیوں کے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا۔ ان کے دو نہایت اہم قلعوں کو مسمار اور استھانہ کی باغی نوآبادی کو بالکل تہ و بالا کر دیا۔ لیکن مجاہدین نے صرف یہ کیا۔ کہ یہاں

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۸۔

پہاڑیوں کی دشوار گذار وادیوں میں پیچھے ہٹ گئے، اور ان کی قوت کو ذرا بھر بھی ضعف نہ پہنچنے پایا۔ اور فوراً ہی ہمسایہ قبیلہ نے ملکا کے مقام پر انہیں ایک نوآبادی قائم کرنے کی اجازت دے دی۔[1]

غدر سے پہلے مسلمانوں پر زیادتیاں

سنہ ایہ انگریزوں کے خلاف مسلمان اس شدت سے مشتعل نہ ہوتے اگر ان کا رویہ ان کے ساتھ ذرا بھی ہمدردانہ اور منصفانہ ہوتا، لیکن انہوں نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو تباہ کر کے رہیں گے۔

وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب

اور اس حقیقت کا اعتراف خود ذمہ دار انگریز بھی کرنے لگے تھے۔

"سنہ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنواس نے پھر اس معاملہ کو بڑی شد و مد سے اٹھایا کہ جس معافی کے علاقہ کے متعلق ہندومت سے منظوری نہ لی گئی ہو، اس پر حکومت کا قبضہ ہونا چاہیئے مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس اصول پر کاربند ہونے کا حوصلہ نہ کر سکی پھر یہ معاملہ ۵۸ سال تک کھٹائی میں پڑا رہا۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں حکومت نے ایک بار پھر اسی اپنے حق پر اصرار کیا۔ لیکن اس کے باوجود عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی آخر کار سنہ ۱۸۹۳ء میں مجلس قانون ساز اور محکمہ منتظمہ نے مل کر ایک بہت بڑی کوشش کا آغاز کیا، جس کے ماتحت خاص عدالتیں مقرر کی گئیں۔ اور آئندہ اٹھارہ سال تک تمام صوبے میں مخبر چھوٹے چھوٹے گواہ اور خاموش مگر مستقل مزاج افسران واگذاری گشت کرتے رہے۔ واگذاری کے مقدمات پر ۸ لاکھ پونڈ کی سوا پانچ فی صدی سالانہ کے حساب سے اس رقم کا بہت بڑا حصہ ان زمینوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جو مسلمان اوقات کے پاس معافی کی حیثیت سے ہیں۔ اس سے جو ابتری نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے دیہاتی دستاویزات میں ثبت ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہو گئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دار و مدار انہی معافیوں پر تھا، بالکل تہ و بالا ہو گیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ لہذا جو شخص غیر جانب داری

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۰۳

سے اس کی تمیز کرے گا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ جب واگذاری کے قوانین کا مقصد محض لیے حق کے نافذ کرنے کا تھا جس کو ہم نے بار بار پر زور طریقہ پر اپنے لیے محفوظ رکھا تو پھر واگذاری کے مقدمات میں انتہائی سختی کیوں برتی گئی۔ دراصل یہ کہ وہ ہندوستانیوں کی عام رائے کے بالکل خلاف تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے صاف اور صریح قوانین کی موجودگی میں مروجہ رسم و رواج کا حق ایک غلط سی بات ہے، لیکن پچھتر سال کا قبضہ اس امر کا پرزور حق پیدا کر دیتا ہے کہ حکومت نرمی کا برتاؤ کرے ہمارے واگذاری کے افسر جنھوں نے قانون نافذ کیا تھا، رحم کرنا جانتے ہی نہیں تھے ان دنوں کا خوف و ہراس اب تک بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ اس سے ہمارے خلاف نفرت و حقارت کی ایک شدید وجہ پیدا ہو گئی۔ اس وقت سے کسی شخص کا عالم دیدہ ہونا جو ہندوستانی نوابوں کی نظر میں بڑا قابل عزت اور منفعت بخش پیشہ تھا بنگال میں ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ سب سے زیادہ نقصان اسلامی اوقاف کو پہنچا کیونکہ ہندوستان کے سابق فرمانرواؤں نے اپنے قبضوں سے ایسی ہی بے پروائی کی تھی۔ جیسا کہ دوسرے معاملات میں لیکن جس کا چالاک اور عاقبت اندیش ہندوؤں کے ہاں کوئی امکان نہیں تھا ہم نے ان کی معافیوں کے جو ثبوت طلب کیے ان کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ان کی حیثیت غیر یقینی تھا۔ اور ان کی تسلیم شدہ ذاتی جائدادوں کے معاملے میں بالکل ناکارہ پچھتر سال تک ہم نے اس انتہائی بے ایمانی کو جس کے خلاف ہم احتجاج کرتے رہے جاری رہنے دیا لیکن اس کی مجموعی سزا ایک ہی نسل کو بھگتنا پڑی اس دوران میں بنگال کی و بیک ان کے سلاطین اور قاضیوں کا ستیاناس کرتی رہی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ واگذاری میں ہمیں اس سے بہت کم ملا جتنا ہم سے چھپایا گیا تھا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کی تباہی واگذاری سے ہی شروع ہوتی ہے۔ مذہبی مقدمات کے ختم ہونے وار افسر کی رائے میں یہ مسلمانوں کی تباہی کا دوسرا سبب تھا۔ (۱)

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۶۷

باب ۲۶

غدر

۱۸۵۷ء کا غدر، ایک قیامت سے کم نہ تھا!

اس غدر نے، مسلمانوں کی اس حکومت کا خاتمہ کر دیا، جو کم و بیش ایک ہزار سال سے ہندوستان پر چلی آتی تھی، اور جس نے، اپنے آثار و نقوش اتنے زیادہ چھوڑے ہیں کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کی بہترین کوششوں کے باوجود اب تک نہیں مٹ سکے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط
لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

اس غدر کی تاریخ بڑی دردناک، اور لرزہ خیز ہے، مسلمان مٹ گئے، ان کی حکومت چھن گئی، ان کی لائی ہوئی، اور پھیلائی ہوئی تہذیب و تمدن، اور ثقافت و حضارت کے نقوش کھرچ دیئے گئے، انفرادی، اور اجتماعی طور پر انہیں تباہ و برباد، اور نیست و نابود کرنے کی منظم اور مسلسل کوششیں کی گئیں، انہوں نے مردانہ وار اس ہلاکت آفریں، ماحول کا مقابلہ کیا، مٹے لیکن مٹتے مٹتے بھی، وہ ایک نیا، اور شاید غیر فانی نقش قائم کر گئے۔

میں نے غدر کی شورش، اور ہنگامہ آرائی، مقابلہ اور شکست کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

۱ - غدر کا پہلا دور : ہنگامہ

۲ - غدر کا دوسرا دور : مقابلہ

۳ - غدر کا تیسرا دور : شکست

۴ - غدر کا چوتھا دور : انتقام

غدر کی ساری کارروائیوں کو انہی عنوانات کے ماتحت رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے صورت حالات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔

لیکن قبل اس کے کہ، غدر کے ادوار پر گفتگو کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ، غدر کی اہم تاریخوں کا ایک "چارٹ" پیش کر دیا جائے، تاکہ غدر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پہلے، اس کا ایک نقشہ پیش نظر رہے، اس کی روشنی میں اجمال کی تفصیل سمجھنے میں، قارئین کتاب کو کافی مدد ملے گی۔

غدر کے اہم واقعات

(۱) بر حصہ دہلی ۱۸۵۷ء	۱۰ مئی	میرٹھ میں غدر
باغیوں کا دلی پر تسلط	۸ جون	ایک تھوڑی سی فوج سے انگریزوں کا پہاڑی کو لے لینا
	۱۴ ستمبر	انگریزوں کا دلی پر قبضہ ہوا
(۲) لکھنؤ	یکم جولائی	ریذیڈنسی کی حفاظت کا آغاز
	۲۵ ستمبر	ہیولاک اور اوٹرم کا امداد کو پہنچنا
	۲۲ نومبر	سر کالن کیمبل اور اوٹرم کی آخری امداد و گیریزن کی واپسی
	۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء	لکھنؤ کی فتح
(۳) کانپور	۶ جون ۱۸۵۷ء	مورچوں کی حفاظت کا آغاز
	۲۷ جون ۱۸۵۷ء	مورچوں کی حفاظت کا اختتام
	۲۰ جون	حوالگی اور قتل
	۱۷ جولائی	لشکر انتقامی کا داخلہ
	۲۷ نومبر	گوالیار کنٹنجنٹ سے ونڈھم کی شکست
	۶ دسمبر	کانپور کی لڑائی اور سر کالن کیمبل کی فتح
(۴) وسط ہند و بندیل کھنڈ	جون ۱۸۵۸ء	جھانسی کی رانی کی وفات

اپریل ۱۸۵۹ء تانتیا ٹوپی کا قتل

(۵) روہیلکھنڈ جون ۱۸۵۸ء بریلی کو انگریزوں کا پھر سے لینا

یکم نومبر ۱۸۵۸ء اعلان شاہی بمقام الہ آباد مشتہرہ لارڈ کیننگ

اوّل وائسرائے و گورنر جنرل ۔ (۱)

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اوّل از بشیر الدین احمد ص ۶۷۹

باب ۲۷

غدر کا پہلا دور: ہنگامہ

غدر کا پہلا دور زیادہ تر ہنگامہ آرائی، قتل و غارت، لوٹ مار، اور توڑ پھوڑ پر مشتمل تھا، یہ وہ دور تھا، جس میں، غصہ اور انتقام سے بھرے ہوئے لوگ، مجرم اور معصوم، خطا کار اور بے گناہ کی تفریق سے آزاد تھے، وہ جسے اپنا دشمن سمجھتے تھے اس کی جان لے لینا فرض سمجھتے تھے۔

انگریزوں سے ہندوستانیوں کو، ہندوؤں کو، مسلمانوں کو، سکھوں کو، اور خاص طور پر فوج کے سپاہیوں کو سنگین اور سخت و شدید اختلافات تھے، ان کو یقین تھا کہ انگریز انہی کے بل پر حکومت کر رہے ہیں اور انہی کے سہارے زندگی کی کامرانیاں حاصل کر رہے ہیں۔ پھر بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتے، ان کی توہین کرتے ہیں، انہیں ذلیل کرتے ہیں، انہیں ستاتے ہیں، اور ان کی دولت چھین لیتے ہیں، ان کی ریاست و امارت، جاہ و منزلت اور دولت و ثروت کو لوٹ لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، اور یہ سب کچھ لے چکنے کے بعد اب دین و مذہب کی باری آئی ہے، اب وہ انہیں بے دین بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

انگریز اگر ذرا بھی معاملہ فہمی اور وسعت قلب سے کام لیتے تو شاید یہ غدر واقع نہ ہوتا لیکن وہ ہمیشہ سے حقائق اور واقعات کو اپنے "پرسٹیج" (وقار) پر قربان کر دینے کے عادی رہے ہیں، اس موقع پر بھی انتہائی عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے، انہوں نے یہی کیا، اور اس کے تلخ نتائج بھی برداشت کیے۔

اب ہم مختصر طور پر، غدر کی ہنگامہ آرائی، اور قتل و غارت کی تاریخ بیان کرتے ہیں جو عبرت انگیز بھی ہے، اور سبق آموز بھی۔

چپاتیوں کی پُراسرار تقسیم

غدر کے آغاز میں، چپاتیوں کی پُراسرار تقسیم کا بڑا حصہ ہے، یہ ایک ایسی چیز تھی، جس نے سارے ہندوستان میں، غدر سے پہلے ہی ایک دہشت اور سراسیمگی پیدا کر دی تھی، اور یہ کام اس تنظیم اور ہمہ گیری کے ساتھ ہو رہا تھا کہ ملک کا کوئی گوشہ ان چپاتیوں سے محروم نہیں رہا، دلی کا واقعہ یہ ہے :۔

"پہاڑ گنج کے تھانہ دار کے پاس جو شہر سے باہر واقع تھا۔ ایک چپاتی ایک چپراسی لایا، یہ چپاتی مرد کی ہتھیلی کے برابر تھی اس کا وزن دو تولہ تھا۔ تھانہ دار کو تعجب ہوا اس نے محسوس کیا کہ چپاتی کسی نے بھیجی ہے اور اس روٹی میں کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہوگی اس لیے اس کی وجہ سے تمام ہندوستانی باشندوں میں ایک گونہ دہشت و ہراس چھا گیا تھا یہاں تک کہ ایک دن یہ افواہ اڑی کہ بیرام پور کی ۱۹ویں پلٹن نے کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا ہے جب یہ خبر پھیلی تو اندیشہ ہوا کہ کوئی مصیبت آنے والی ہے ان ہی دنوں ایک ہندوستانی اخبار شائع ہوتا تھا اس نے مختلف پلٹنوں کی بغاوت کو اور بھی شہرت دے دی یہ سمجھ کر کہ ان تمام باتوں کی تہ میں کچھ نہ کچھ ضرور ہے تھانیدار نے فی الفور چند آدمیوں کو مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ تمام حلقہ کا معائنہ کریں اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ آیا اور دیہات میں بھی چپاتیاں تقسیم کی گئی ہیں یا نہیں ان کی مزید تقسیم کو روک دیں ۔" (۱)

چربی والے کارتوس

ایک طرف تو پراسرار چپاتیوں کے ذریعہ، غدر کے لیے، لوگوں کو ابھارا اور اکسایا جا رہا تھا، دوسری طرف، انگریز اس پر بضد تھے کہ ان کارتوسوں کو ضرور استعمال کرائیں گے۔ جن سے ہندوستانی متنفر اور بیزار ہو چکے ہیں، اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا :۔

"میرٹھ کے فوجی افسروں نے چربی والے کارتوسوں کا تجربہ کرنا چاہا چنانچہ انہوں نے ۹ مئی

---

(۱) غدر کی صبح شام، ص ۶۲

۱۸۵۷ء کو حکم دیا۔ کہ دیسی سپاہی چربی والے کارتوس استعمال کریں ۸۵۰ سپاہیوں نے کارتوس چھونے سے انکار کر دیا۔ (۱)

لارڈ کیننگ کا تمرد اور نخوت

ہندوستان کے خیرخواہوں نے لارڈ کیننگ سے عرض والتجا کے انداز میں عرض کیا گیا، کہ یہ کارتوس نہ استعمال کرائیں لیکن ان کا پندار حکومت اس تجویز کے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا، چنانچہ انہوں نے فرمایا!

" مجھے یہ خوف ہے کہ کارتوسوں کا معاملہ ملتوی کرنے سے یہ معلوم ہو گا کہ سپاہیوں کی معروضات منظور کی گئیں، پس یہ فیصلہ کیا گیا کہ نامردی کے ساتھ بعد بدلہ کا انتقام نہ کیا جائے، اور ملٹری سکولوں میں سپاہ کے دستوں کو حکم دیا جائے کہ وہ قواعد جدیدہ اپنی تعلیم کی مدت معینہ تک عمل میں لائیں۔ (۲)

نافرمانی کی سزا

چنانچہ جن سپاہیوں نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا، ان کے لیے فوجی قانون حرکت میں آ گیا:

" ۹ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو کورٹ مارشل کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ پریڈ پر سپاہ ہندوستانی و یورپین جمع ہوئی تیسرے رسالہ کو حکم ہوا کہ وہ پیش آئے پچاس مجرم سوار حوالات سے بلائے گئے، وہ اپنی وردی پہنے ہوئے۔ اب بھی سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ اول سزا کا حکم پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر تمام ان کی وردیاں پیٹھ پر سے اتار لی گئیں، پھر لوہار اپنے اوزار اور بیڑیاں لے کر آئے اور پچاس سواروں کے پیروں میں بیڑیاں ان کے ہمراہیوں کے روبرو پہنا دیں جس سے ان کی بے عزتی کی کوئی حد باقی نہیں رہی، اس وقت یہ حالات دیکھ کر بہت آدمی افسوس کرتے تھے۔ کہ وہ سپاہی جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کی خدمات بڑے کڑے وقت میں کی تھیں، اس طرح ذلیل ہوئے۔ قیدی اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر اور آوازوں کو نکال کر جرنیل کے آگے گڑگڑاتے تھے۔ کہ ان پر رحم کرے اس طرح ذلیل و خوار

---

(۱) کمپنی کی حکومت، ص ۳۶۵

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۳۳۸

نہ کرے کوئی سپاہی ایسا نہ تھا، جس کی غصہ کے مارے گردن کی رگیں نہ پھولی ہوں۔ جب قیدیوں کو بالکل مایوسی ہوئی۔ تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ملامت کرنی شروع کی۔ اس وقت گورہ سپاہ کے ہتھیار چمک رہے تھے۔ ان کے خوف کے مارے ہندوستانی سپاہی کچھ نہیں بولے۔ قیدی ہندوستانی سپاہیوں کے پہرہ میں جیل خانہ پہونچا دیے گئے۔ پریڈ کے سپاہی۔ غمزدہ غصہ میں بھرتے ہوتے اپنی لینوں میں چلے گئے۔ لارڈ کیننگ نے اس کارروائی پر فرمایا، کہ پریڈ پر سواروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنی جس کے اندر کئی گھنٹے لگے ہوں گے۔ ان سپاہیوں کے روبرو جو بالفعل ناراض تھے، اور ان میں بہت سے ایسے ہیں۔ جو کارتوس کی کہانی کو یقین کرتے ہیں۔ بریگیڈ کے تیز ڈنک لگاتا تھا۔ اس برتاؤ کے بعد ۸۵ قیدیوں کو ہندوستانی پہرہ میں بھیجنا ایسی بے وقوفی ہے۔ جو خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ کمانڈر انچیف نے کورٹ مارشل کے فیصلہ کو قائم رکھا۔ مگر یہ کہا پریڈ پر سپاہیوں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا خلاف دستور ہے۔ جیل خانہ میں جو چھاؤنی سے دو میل پر تھا۔ قیدیوں کے پاس تیسرے رسالہ کے کپتان گئے۔ یہ ان کا فرض تھا یا رحم تھا۔ کہ وہ سپاہیوں کی تنخواہ اور قرض کو چکا دیں اور ان سے پوچھ لیں کہ وہ اپنے کنبہ کو جس سے وہ جدا ہو گئے ہیں۔ کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں۔ جیل خانہ میں یہ کام ہو رہا تھا، بازاروں میں یہ وحشت ناک خبریں اڑ رہی تھیں کہ لینوں میں بڑا خوف ہے کہ یورپین میگزین پر قبضہ کرنے کو ہیں، اور دو ہزار بیڑیاں جن کی شہرت پہلے سے ہو رہی تھی، تیار ہو گئی ہیں۔ جن کے تجربہ کا آغاز صبح کو ہو چکا تھا۔ انگریز شام کو آپس میں خوشی خرمی سے ایسے ہی ملے جیسے ملا کرتے تھے۔ ایک ڈنر کی میز پر یہ ذکر ہوا کہ مسلمانوں نے دیواروں پر اشتہار لگا دیے ہیں۔ کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے لوگ تیار ہوں۔ اس پر انگریزوں کو غصہ تو آیا مگر یقین نہیں آیا۔ کھانا کھانے کے بعد انگریز ہنسی خوشی اپنے گھروں میں چلے گئے۔ (۱)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص ۲۹۵

میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت

آخر یہ تشدد رنگ لایا، اور وہ مواد جو ایک عرصہ سے پک رہا تھا، ابھرا، اور ایک خوفناک حادثہ کی صورت میں رونما ہوا۔!

"اتوار کے دن صبح کو مئی کا آفتاب تاباں نمودار ہوا انگریزوں نے گرجا میں اپنی نماز پڑھنے کی تیاریاں کیں بظاہر ایک خاموشی کا عالم نظر آتا تھا۔ مگر ایسی علامتیں بھی نمودار تھیں کہ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان سے کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ بارکوں سے ہندوستانی نوکر بھاگے جاتے تھے۔ افسروں کے بنگلوں پر بھی نوکر غیر حاضر ہوتے جاتے تھے انگریز ان باتوں کو اتفاقات پر محمول کرتے تھے اور کوئی بڑی بات نہ جانتے تھے صبح کی نماز انہوں نے باطمینان خاطر پڑھی دوپہر کے بعد ہندوستانی سپاہیوں کی لین میں اور صدر بازار میں اور گرد کے دیہات میں شورو شر کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں بچے بھی جانتے تھے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ بہت قسم کے آدمی جمع ہو رہے تھے بدمعاش، لچے، شہدے، لیٹرے، فتنہ انگیزی پر آمادہ بیٹھے تھے۔ لینوں اور بازاروں کے ملے جلے آدمیوں میں مختلف قسم کے آدمی تھے۔ کوئی انگریزوں سے نفرت و عداوت رکھتا تھا۔ کوئی انتقام لینا چاہتا تھا۔ کوئی مذہبی جوش میں بھرا ہوا تھا۔ کوئی لوٹ کا بھوکا تھا لیکن ان سب سے زیادہ یہ بات تھی۔ کہ جتنا دن چڑھتا جاتا تھا۔ اتنا یہ خوف بڑھتا جاتا تھا۔ کہ گورے سرے پیر تک مسلح ہو کر ہندوستانی سپاہیوں پر حملہ کریں گے، اور رات ہونے سے پہلے اُن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں گے۔ اور سب آدمیوں کا قتل عام کریں گے۔ اور بازاروں کو لوٹ لیں گے۔ جب آفتاب غروب ہونے کو ہوا تو طوفان اٹھا میرٹھ کے چیپلین مسٹر روٹن بیان کرتے ہیں۔ کہ میں اپنی بیوی کے شام کی نماز پڑھانے کے لیے سوار ہونے کو تھا۔ کہ ہندوستانی آیا نے بہت منت کر کے کہا کہ آپ گھر کے اندر رہیں باہر نہ جائیں جب اُس سے پوچھا کہ کیوں منع کرتی ہے تو اُس نے کہا سپاہیوں کے ساتھ لڑائی ہو گی۔ اس کی بات پر اعتبار نہیں آیا۔ لیکن ہم نے خیال کیا کہ آیا نے بے وجہ کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ پہلے اس سے کہ ہم گرجا میں پہنچیں

بندوقوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور ہندوستانی گھروں میں سے دھواں کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ہم نے بی بی بچوں کو ایک پناہ کی جگہ میں چھوڑا۔ اور خود گرجا کے احاطہ میں داخل ہو کر ساٹھویں رائفل رجمنٹ کا بگل بجا کر خوف سے جمع ہو جاؤ۔ برٹش گورنمنٹ کے سپاہی اپنی بارکوں میں دوڑے گئے کہ اپنے ہتھیار اور گولی لیں نماز کی جماعت آدھی نماز چھوڑ کر جلدی سے پراگندہ ہو گئی بعض انگریز اپنے گھروں کو گئے بعض قریب کے گارد کو چلے گئے۔ (۱)

غدر شروع ہو گیا

اور آخر کار، وہ اندیشہ، جسے انگریز نظر انداز کر رہے تھے، ایک واقعہ بن گیا:

"جب یہ واقعات گذر رہے تھے۔ دو ہندوستانی رجمنٹیں خشناک، اپنی اپنی پریڈوں پر جمع ہوئیں اور اپنی بندوقیں چھوڑنی شروع کیں۔ جب انگریزی افسروں نے یہ فساد دیکھا۔ تو سپاہیوں کی لینوں میں انتظام کے لیے دوڑے گئے حتی المقدور انتظام کے لیے کوشش کی۔ مگر اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ سپاہی اپنے جامہ سے باہر ہو گئے۔ دھمکیوں اور فتنوں کے سننے میں وہ بہرے ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہ رحم اپنے افسروں پر کیا کہ حملہ نہیں کیا۔ مگر ان کو متنبہ کر دیا کہ کمپنی کا راج ختم ہوا، انہوں نے یہ رحم جو اپنے افسروں پر کیا وہ غیر رجمنٹ کے افسروں پر نہیں کیا۔ کرنیل فن لس صاحب جو چالیس برس سے ہندوستانی سپاہیوں کی افسری کرتے تھے۔ اور ان کو بالکل سپاہیوں کی وفاداری پر یقین تھا وہی اول قتل ہوئے۔ وہ اپنی گیارہویں رجمنٹ کو فہمائش کر رہے تھے کہ وہ اپنی نمک حلالی پر متو جہ ہوں کہ بیسویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے ان پر گولیاں چلا کر مار ڈالا۔

اب قتل و لوٹ مار کا بازار گرم ہوا جس میں بازاروں کے اور ہمسایہ کے دیہات کے آدمی بڑی خوشی سے شریک ہوتے۔ ہر طرف سے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑے اور ذرا سی دیر میں ہندوستانی رجمنٹوں نے افسروں کے بنگلوں پر جمع ہو کر انہیں آگ لگا دی علاوہ کرنیل فن لس کے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صہ ۳۹۲

انہوں نے اپنے افسروں اور یورپین افسروں کی بی بی بچوں کو قتل کیا ادھر ادھر جہاں انگریزوں اور ان کے بال بچوں کو پھرتے دیکھا مار ڈالا۔ شہر کی نواح سے آدمی ایسے دوڑے چلے آتے تھے جیسے کہ بھٹوں سے درندے شکار کے لیے نکلتے ہیں۔ میرٹھ کے بھٹوں سے آدمیوں نے نکل کر درندوں کا کام کیا۔

اب سپاہیوں کو اپنی پڑی انہوں نے سرکار کمپنی کے دامن کو تو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ قتل و غارت گری و آتش زنی کے مجرم تھے۔ وہ جانتے تھے۔ اگر ہم میرٹھ میں رہیں گے۔ تو ہم سے سخت پاداش لیا جائے گا۔ اس لیے انہوں دہلی کا رستہ فوراً لیا۔ ان کو بڑا موقع ملا تھا۔ کہ انہوں نے اس باب میں دہلی کے افسروں سے پہلے ہی مشورہ لے لیا تھا۔ ان کو معلوم ہو گیا تھا۔ کہ وہ ان کی امداد میگزین کے لیے اور مغل خاندان کے مردہ سلطنت کے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش سے کریں گے۔ وہ یہی پکار تے تھے۔ کہ دہلی کو چلو۔ چنانچہ وہ گئے اور اپنے لینوں میں سوا اپنے افسروں کے گھر کی خاک کے اور انگریزوں کی لاشوں کے کچھ نہ چھوڑا۔ "[1]

باغیوں کا دہلی کی طرف کوچ

میرٹھ میں یہ ہنگامہ آرائی کر کے باغی دہلی کی طرف بڑھے کیونکہ، اصل میدانِ عمل وہی تھا:۔

دوشنبہ کے روز ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء حسب دستور سب کچہریاں ہو رہی تھیں۔ کہ اتنے میں باغیوں کی آمد آمد کی خبر مشہور ہوئی۔ جب اس امر کی اطلاع مسٹر ہچنسن صاحب مجسٹریٹ شہر کو ہوئی۔ تو گاڑی دوڑا کر چھاؤنی آئے۔ اور بریگیڈیر صاحب کو اس خبر سے مطلع کیا۔ انہوں نے ۵۴ ویں پلٹن کو مع دو ضرب توپ بسر کردگی کرنل ریپلی صاحب تیار ہونے کا حکم دیا۔ جب صاحب مجسٹریٹ چھاؤنی سے واپس کشمیری دروازے پر پہنچے۔ اس وقت ایک بلوۂ عظیم شہر میں برپا ہو گیا تھا۔ اور بڑا ہجوم تھا۔ مسٹر لیباس صاحب جج نے ان کو اندر جانے سے منع کیا۔ لیکن انہوں نے نہ مانا پھر ان کا پتہ نہ لگا کہ کیوں کر اور کہاں

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۲۰۱

مارے گئے۔

مسٹر ٹوڈ صاحب مہتمم تار برقی اور سار جنٹ پل کو باڈی پل [illegible]

اول سوار داخل ہوئے جن سے فریزر صاحب جج اور کپتان ڈگلس صاحب قلعہ دار کا [illegible]

باغیوں نے جیل خانہ جاکر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اور دریا گنج میں جہاں ایک بڑی جماعت

عیسائیوں اور صاحبان میگزین کے بیوہ بچوں کی رہتی تھی۔ قتل کرنی شروع کی۔ کشمیری دروازے کے

یورپی مدرس اور مسٹر رسفورڈ صاحب مہتمم بنک مع تمام کنبہ کے مارے گئے۔ پادری لے [illegible]

اور مسٹر سانڈیسن اور مسٹر لوک کاک صاحب ڈاکٹر چمن لال صاحب سب اسسٹنٹ سرجن دہلی بھی قتل

ہوئے۔ ۵۴ ویں پلٹن جو چھاؤنی سے رفع فساد اور انتظام کے واسطے شہر کو آئی۔ وہ بھی کشمیری دروازے

میں آتے ہی باغیوں سے مل گئی۔ اور کپتان اسمتھ، کپتان بروس لفٹنٹ، ایڈورڈ لفٹنٹ واٹ فیلڈ

ڈاکٹر ڈوپنگ جو پلٹن کے ساتھ تھے باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اور کپتان ریلی صاحب کو جن

کے سترہ زخم لگے تھے مردہ تصور کر کے چھوڑ کے چلے گئے۔ جن کو اسٹورٹ صاحب گاڑی میں ڈال

کر چھاؤنی لے آئے۔ بریگیڈیر صاحب نے پسنکر چھاؤنی کا انتظام کیا۔ اور سب انگریز مع زن و بچہ

نشان برج میں جمع ہوئے۔ یہ ایک چار دیواری کا گول گھر ما بین شہر اور چھاؤنی کے ہے۔ جس پر توپ

کا نشان رہتا تھا۔ اگرچہ یہ مقام مستحکم نہ تھا لیکن امید تھی کہ انگریزی فوج جو میرٹھ میں ہے جلد

آکر مدد دے گی۔ اس لیے سب نے مع بال بچوں کے یہاں پر قیام کیا۔ اور بریگیڈیر صاحب نے فوج

کی تمام موقعوں پر توپیں لگا دیں۔ حکام ملکی وغیرہ مثلاً لیاتس صاحب جج اور ڈاکٹر بالفور صاحب

اور مارشل صاحب سوداگر بھی شہر سے بھاگ کر اس برج میں جمع ہو گئے۔

انگریزوں کی مصیبتوں کا حال بیان سے باہر ہے۔ تمام ملک ان کا یکایک دشمن ہو گیا

گنواروں نے ان کے ساتھ بڑی زیادتیاں کیں۔ اور بعض راستے ہی میں ہزار ہا مصیبتیں اٹھا کر مارے

گئے۔ بے چاری۔ ناز پروردہ مسوں اور میموں کو جنہوں نے گھر سے باہر قدم بھی نہ رکھا

منزلوں بھوکی پیاسی اور برہنہ پا جلتی ہوئی دھوپ میں افتاں و خیزاں چلنا پڑا۔ [illegible]

... اور لوٹ مار کا تو گیا ذکر ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہ رہی کہ جہاں ... پناہ کے سکتے۔ جہاں کہیں وہ تھکے ہارے پناہ کے خواستگار ہوتے تھے ... لوگ باغیوں کے خوف سے ان کو نکال دیتے تھے۔ (۱)

... سپاہی دلی پہنچ گئے

بالآخر، باغی سپاہی، نعرے لگاتے اور جوش انتقام سے مدہوش دلی پہنچ گئے :

"اس رات کو میرٹھ کا انگلش برگیڈیر باغی سوار چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار دلی کی طرف ... تھے کہیں انہوں نے گھوڑوں کی باگ نہیں کھینچی۔ پیدل پلٹنیں بھی ان کے پیچھے پیچھے خوف کے مارے ... کشاں کشاں لمبے قدم اٹھاتی ہوئی رواں دواں تھیں۔ چاندنی رات میں وہ آگے بڑھتے جاتے تھے ... دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں ہماری موت کا فرشتہ تو نہیں آتا۔ لیکن گھنٹے پر گھنٹے گذرتے ... ان کو اپنے تعاقب میں کسی گھوڑے کے پاؤں کی آہٹ بھی سننے میں نہیں آئی۔ صبح ہوتے ... ان کو جمنا جی کے درشن ہوتے۔ جمنا جی کے بے کا آوازہ لگایا۔ اور اب وہ شہر ان کی آنکھوں کے ... تھا جس کو اپنا ملجاؤ ماوا بنانا چاہتے تھے۔ اول سلیم پور میں پرمٹ کی چوکی کو آگ لگائی اور ... کے کلکٹر کو قتل کیا۔ آٹھ بجے سے پہلے جمنا کو عبور لیا۔ مسٹر ٹوڈ پر ہاتھ صاف کیا اور کلکتہ دروازہ پر ... جس کو بند دیکھا تو قلعہ کے نیچے جھروکوں کو آتے۔

میرٹھ سے رات کو ہندوستانیوں کی معرفت دہلی میں بغاوت سپاہ کی خبر بھیجنے میں ... روپیہ خرچ کیا گیا۔ اور یہ خبر بہت سویرے اندھیرے میں مسٹر سائمن فریزر صاحب کمشنر اور بجنس ... کلکٹر دہلی کے پاس پہنچ گئی۔ اسی خبر ہی کے سبب سے باغیوں کے آنے سے پہلے صاحب ... کلکٹر نے شہر کے دروازوں کے بند کرنے کا اور جمنا کے کشتیوں کے پل کا بندوبست کیا۔ میں نے ... کو سائمن فریزر صاحب کمشنر کو گھوڑوں کی بگھی میں سوار اور پیچھے اردلی میں جھجر کے سوار چلے جاتے ... صاحب نے اپنی بگھی کو میگزین کے پاس تھاما یا وہاں تلنگوں کی کمپنی وردی پہنے کھڑی تھی۔ اس

---

(۱) ... عبرت دہلی، صفحہ ۶۹

کے صوبہ دار کو کمشنر صاحب نے بلا کر کچھ باتیں کہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔ ...... پوچھا کہ کیا باتیں کیں تو اُس نے کہا کہ صاحب کمشنر نے کہا کہ ہمارے ساتھ ہو؟ ہم نے کہا کہ ہم اپنے دہرم کے ساتھ ہیں، کمپنی نے کمشنر صاحب کی سلامی دستور کے موافق نہیں اتاری کمشنر صاحب نے اپنی سواری آگے بڑھائی۔ (۱)

یہ کون سپاہی تھے؟

قبل اس کے کہ آپ ان سپاہیوں کے مزید واقعات پڑھیں، ایک مرتبہ پھر یہ معلوم کر لیں، یہ تھے کون؟ کس چیز نے اُنہیں باغی بنایا تھا؟

"میرٹھ چھاؤنی کی فوج نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو فساد شروع کیا۔ فساد کی ابتدا اس طرح سے ہوئی کہ فساد سے ایک دن پہلے کرنیل نے اسی سواروں کو کارتوس کاٹنے کا حکم دیا۔ سواروں نے انکار کیا۔ حکم عدولی کے جرم میں چودہ چودہ برس کی قید ان سواروں کو دی گئی۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہوا کہ آج ان کو جیل بھیجا گیا ہے کل کو یہی دن ہمارے لیے رکھا ہے۔ اس وجہ سے تلنگوں کی پلٹن کو ملا لیا۔ اور غدر کر دیا اور جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں آگ لگانی شروع کر دی۔ میرٹھ کی اس کاروائی کے بعد یہ لوگ اسی رات دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور ۱۱ مئی کی صبح کو ایک آفت ناگہانی کی طرح قلعہ کے جھروکوں کے نیچے راج گھاٹ دروازے سے شہر میں داخل ہو گئے۔ (۲)

ہڑبونگ غدر کا آغاز

راج گھاٹ سے سواروں نے داخل ہو کر جو یورپین ان کو ملا اس کو قتل کیا۔ سارے شہر میں ہڑتال تھی۔ ایک سناٹے کا عالم تھا۔ سارا شہر ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک حیران و سراسیمہ تھا۔ باغی سپاہی شہر کے مالک ہو گئے تھے وہ جانتے تھے کہ چھاؤنی میں جتنی پلٹنیں ہیں۔ ان میں سے ایک سپاہی بھی ایسا نہیں ہے۔ کہ انگریزوں کی حمایت کے لیے اپنی بندوق کا گھوڑا چڑھائے یا تلوار چلائے یا توپ کو فلیتہ لگائے۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۴۰۹

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ، صفحہ ۹

شہر کے ایک سرے سے باغی داخل ہو رہے تھے۔ دوسرے سرے پر کمشنر فریزر۔ اور انگریز گارڈ کے چپراسیوں کو خیر خواہی کے لیے بلا رہے تھے۔ فریزر صاحب نے کپتان ڈگلس کو اپنے پاس کلکتہ دروازہ پر بلایا تو وہ کپتان دلدار علی کی بگھی میں سوار ہو کر فریزر صاحب کے پاس چلے گئے۔ کوتوالی میں جا کر دروازہ کے بند ہونے کا بندوبست کر لیا تھا ——— اس مجمع پر باغیوں نے حملہ کیا ہچنسن صاحب کے بازو کو زخمی کیا۔

اب ان انگلش جنٹل مینوں نے بھاگنا شروع کیا دونوں پولیس اسٹیشن پر اترے جہاں اور انگریز بھی ملے فریزر صاحب نے اپنے گارڈ کس سے بندوق لیکر ایک سوار کے بندوق ماری وہ مر گیا یہ دیکھ کر اور سوار حد پرے ہٹے لیکن شہر کے آدمیوں نے انگریزوں پر ریل پیل ایسی کی کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ اب فرار میں سلامتی ہے۔ فریزر صاحب اپنے بگھی میں بیٹھے اور قلعہ کے دروازہ کی طرف روانہ ہوئے اور ڈگلس صاحب قلعہ کی خندق میں کودے جس سے ان کے پاؤں میں سخت چوٹ لگی وہ آگ سے بچے کھائی میں گرے اس ضرب سے ایسے کمزور ہو گئے کہ چپراسیوں نے اٹھایا۔ ان میں سے ایک نے اپنے کندھے پر بٹھایا اور قلعہ کے اندر لے گیا۔ اور فریزر صاحب اور ہچنسن صاحب جن کا بازو اول ہی بلا سے زخمی ہوا تھا۔ قلعہ میں پہنچے۔

فریزر صاحب لوگوں کی برانگیختگی و غصہ کے فرو کرنے کے لیے زینہ کی سیڑھی پر کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ غل کرنے والی جماعت کو سمجھا رہے تھے۔ کہ مغل بیگ اردلی نے ان کے گال پر اچک کر ایسی تلوار لگائی کہ وہ ہڈی تک پہنچی۔ غرض فریزر صاحب کمشنر اب مردہ پڑے تھے اور مرے پر سو درے ہو رہے تھے۔

اوپر کے کمروں میں ڈگلس صاحب اور ہچنسن صاحب زخمی زار و نزار پلنگوں پر پڑے ہوئے تھے اور پادری صاحب اور ان کی بیٹی تیمار داری کرتے تھے۔ کہ وہ گروہ جس نے کمشنر صاحب کو مارا تھا انگریزوں کی خونریزی کے لیے زینہ سے چڑھ آیا۔ اور اس نے ڈگلس صاحب اور ہچنسن صاحب ہر دونوں انگریز لیڈیوں کو جنہوں نے نیچے کا غل و شور سن کر اپنی نماز شروع کی

تھی - بڑی بے دردی سے مار ڈالا۔ ؎۱

بہادر شاہ کی تقریر

تلنگوں یعنی دیسی سپاہیوں نے سب سے پہلے بادشاہ ... قبضہ کیا، بہادر شاہ کا دل بھی انگریزوں سے دکھا ہوا تھا، انہوں نے ان کی سرپرستی منظور کر لی، اور اپنی حکومت قائم کرنے کے وسائل پر غور کرنے لگے، لیکن بہادر شاہ، مجبوری، اور بے بسی کے باوجود تلنگوں کے آلۂ کار بننے کے لیے ... نہ تھے،

جب صبح ہوئی تو تلنگوں کے کہنے سے بادشاہ کی سواری مع شاہزادوں کے چاندنی چوک میں بیگم کے دروازے پر پہنچی بادشاہ نے فوج سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ میں جان و مال سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن میرے پاس نہ خزانہ ہے نہ فوج نہ ملک۔ البتہ جب میرا ملک مجھ کو مل جائے گا تو میں تم کو لطف عنایت خسروانہ سے سرفراز کروں گا۔ ان لوگوں نے عرض کی کہ نہ ہم ملک کے خواہاں ہیں نہ فوج چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ بندگان عالی ہماری سرپرستی فرمائیں لوگ اپنا سر حضور کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان میں حضور کی سلطنت قائم کر کے ابدی نیک نامی حاصل کریں۔ بادشاہ نے یہ سنکر فرمایا کہ تم لوگ جو کچھ کہتے ہو میری بھی دلی آرزو یہی ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے تمہارے واسطے بھی موجود ہے۔ اس کو کھاؤ پیو اور ہمت کر کے مخالفوں کو نکال دو اور میرا سکہ جاری کر دو۔ قریب شام بادشاہ کی واپسی قلعہ میں ہوئی۔ قلعہ میں پہنچ کر بادشاہ نے ارکان دولت سے مشورہ کیا ہر شخص نے اپنے ... اور عقل کے مناسب بمقتضائے وقت رائے دی۔ آخر اسی صلاح مشورے میں صبح ہو گئی۔ ؎۲

غدر کی کہانی ایک مخبر کی زبانی

۱۱ مئی کی صبح کو میں مجسٹریٹ اور کلکٹر مسٹر ہچنسن کی فوجداری ... میں کسی مقدمہ کے سلسلہ میں پیروکاری میں مصروف تھا۔ ...

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ذکاء اللہ صـ ۱۲

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ صـ ۱۳

کے داروغہ بلدیو سنگھ نے آکر کہا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرٹھ میں انگریزوں
فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی ہے اور یہ فوجیں اب سیدھی دہلی آ رہی ہیں اور راستہ میں
عیسائی اور یورپین ملتے ہیں ان کو قتل کر کے اُن کے بنگلوں کو آگ لگا دیتی ہیں۔ باغیوں کے
تعلق یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ دہلی کے قریب آ گئے ہیں۔ کلکٹر نے فی الفور بلدیو سنگھ کو حکم دیا کہ وہ
جگہ پر چلا جائے اور شہر کا جو دروازہ پُل کو جاتا ہے اس کو بند کروا دینے کا جلد سے جلد انتظام
اس کے بعد کلکٹر اپنی بگھی میں بیٹھ کر کمشنر کے مکان پر گیا۔ مسٹر فریزر سو رہے تھے انہیں جگا
تمام حالات سنائے۔

پھر مسٹر ہچن آ پہنچے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے شہر جانے اور کوتوال کو خبردار رہنے کا حکم دیا
ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ اس کے بعد تم اپنے تھانہ میں واپس چلے جانا اور امن و امان کے قیام
لیے مقدور بھر کوشش کرنا ان سے رخصت ہوتے بعد میں شہر میں سے ہوتا ہوا کوتوال سے ملا
مجسٹریٹ کے احکام سنا دیئے وہ بھی گھوڑے پر سوار ہو کر کچھ دور میرے ساتھ گئے اور ان کی
رائے تھی کہ شہر میں کامل امن و سکون ہے ابھی ہم جا ہی رہے تھے کہ راج گھاٹ دروازہ کا چوکیدار
ہوا آیا اور اُس نے خبر دی کہ کچھ دیسی سوار شہر کی فصیل تک پہنچ گئے ہیں اُنہوں نے آہستگی
مجھے تھانہ میں جانے کے لیے کہا میں اجمیری دروازہ سے ہوتا ہوا پہاڑ گنج پہنچا وہاں پہنچتے ہی
تمام برق اندازوں کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لیں میں ابھی اپنے برق
سے بات چیت کرنے میں مصروف تھا کہ یکایک میں نے ایک یورپین سوار کو گھوڑا سرپٹ
تے ہوئے آتے دیکھا سوار پر نظر پڑتے ہی میں نے پہچان لیا کہ وہ سر تھیوفلس مٹکاف ہیں میں
سے اٹھا اور اُن سے ملنے کے لیے آگے بڑھا اور گارڈ سے سلامی دلوائی سوائے قمیص
وہ اور کچھ پہنے ہوئے نہ تھے میں نے اُن سے تمام کیفیت پوچھی تو انہوں نے جواب
شہر میں گھس آئے ہیں اور تمام یورپین باشندوں کو قتل کر رہے ہیں میں اس گھوڑے
نکلا ہوں اور تمام راستہ وہ میرا تعاقب کرتے آئے ہیں" اُس کے بعد انہوں

نے مجھ سے کہا کہ وہ کیا آپ میری مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے جواب [illegible]
پاس ہے وہ آپ کا ہے میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں اس کے بعد وہ اُترے [illegible]
کپڑے مانگے میں انہیں تھانہ میں لے گیا اور کپڑوں کا بکس سامنے رکھ دیا انہوں نے دیسی پوشاک
کا ایک جوڑا نکالا اور ایک خاص قسم کی تلوار بھی پسند کی جو عام طور پر "تبری گھاٹ" کے نام سے
مشہور ہے انہوں نے پھر اپنا گھوڑا نکلوایا اور اس ارادہ سے کہ اپنے گھر لوٹ جائیں مگر میں
نے بمنت انہیں جانے سے روکا انہوں نے کہا کہ میں اپنے سونے کے کمرہ میں ایک بکس
چھوڑ آیا ہوں جس میں نوٹوں کی شکل میں تیرا ہزار روپیہ ہے اور مجھ سے خواہش کی کہ قابل
اعتماد آدمیوں کو بھیج کر بکس منگوا لو میں نے فی الفور کلیان سنگھ محرر اور امراؤ مرزا کو بکس لانے
کے لیے بھیج دیا۔

اتنے میں دو سپاہی آئے اور اطلاع دی کہ سر تھیوفلس کے مکان کا راستہ باغیوں نے
روک رکھا ہے اور یہ کہ وہ قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور قتل و غارت گری پر آمادہ ہیں ان کے چہرے
سے اندرونی خوف و ہراس نمایاں تھا لیکن سر تھیوفلس اس بیان سے بالکل متاثر نہیں ہوئے
بلکہ یہ کہا کہ میں واپس چھاؤنی میں جانا چاہتا ہوں۔ (۱)

غدر کی کیفیت

ایک مؤرخ نے غدر کی کیفیت یوں بیان کی ہے!
دس مئی ۱۸۵۷ء کا وہ منحوس دن تھا جب میرٹھ کی متعینہ فوج کے سپاہی
بگڑے وہاں اپنے افسروں کو نہایت سفاکی سے تہ تیغ کیا بنگلوں کو جلا کر خاک و سیاہ کر دیا
سے اس بلائے بے درماں نے دلی کا رخ کیا اور قضائے مبرم کی طرح یہاں آن دھمکے پہلے
کی آگ سلگ رہی تھی اس کے بہت اسباب بیان کیے جاتے ہیں لیکن فوری اشتعال کی
یہ ہوئی کہ پچاسی سپاہیوں کو مختلف میعاد کی سزائیں اس قصور سے دی گئی تھیں کہ جو کارتوس دہ بر[illegible]

---

(۱) غدر کی صبح شام۔ ص ۵۶

کے بلا میل وجیت چلاتے رہتے تھے وفعتہً انہوں نے جاین پریڈ کے وقت اُن کے کاٹنے سے سرتابی اور تمردی کی جو فوجی قواعد کی رو سے سخت ترین جرم ہے۔ اُس پر طرہ یہ ہوا کہ دگوں کو سزا ہوئی بلکہ علی رؤس الاشہاد اُن کے بیڑیاں بھی ٹھوکی گئیں تب سے سمندر ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ کھلم کھلا غدر ہو گیا۔

چاہیئے یہ تھا کہ دلی کی طرف جو لوگ بڑھے تھے یورپین فوج اُن کا تعاقب کر کے سدراہ ہوتیں لیکن جنرل نے نہ مانا چنانچہ اسی الزام میں آگے چل کر کمان سے اُتار دیئے گئے۔ لیکن اُسی جنرل کی ناعاقبت اندیشی کی بدولت نہ صرف دلی کے انگریزوں کی جان پر بنی بلکہ آناً فاناً سارے ہندوستان میں انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے۔ دلی کے گردونواح میں ایک اودھم مچ گئی شہر پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۱مئی کی صبح تک دلی میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور نہ کسی قسم کا خطرہ تھا کہ دفعۃً یہ خبر گوش زد ہوئی کہ باغی میرٹھ سے آن پہنچے۔ فریزر صاحب کمشنر۔ مسٹر ہچسن کلکٹر مسٹر تھیافلس مٹکاف مجسٹریٹ سب اکھٹے ہو کر بلوائیوں سے اتمام حجّت کرنے کے لئے گئے اُن کے ساتھ قلعے کے کپتان ڈگلس صاحب بھی تھے۔ باغی پہلے ہی راج گھاٹ دروازہ سے جو قلعہ کے نیچے ہے شہر میں داخل ہو گئے تھے اُن سب نے بہت نرمی اور استمالت سے باغیوں کو سمجھایا بجھایا لیکن اُن کے سر پر شیطان سوار تھا وہ کب سننے والے تھے اس مختصر پارٹی پر ٹوٹ پڑے یہ لوگ پسپا ہو کر لاہوری دروازہ کی طرف کو ہٹے مٹکاف صاحب تو خدا جانے کس طرح بچ کر نکل گئے باقی رہ گئے تین انگریز۔ فریزر۔ ہچسن۔ اور کپتان ڈگلس بے طور زخمی ہوئے انہیں قلعہ میں لائے یہاں باغیوں نے اور ملازمان شاہی نے ان کا کام تمام کر دیا۔

ادھر یہ سانحہ گذرا اب اُدھر کی سنیئے کہ بنگال نیٹو انفنٹری کشمیری دروازہ پہنچی جہاں کے اڑتیسویں بنگال لیبٹ انفنٹری کا گارڈ پہلے ہی سے کھڑا تھا کرنل رپلی آگے آگے تھے اور دوسرے عہدہ دار اُن کے ساتھ ساتھ تھے یہ لوگ کشمیری دروازے کے احاطہ میں سے گذر رہے تھے میرٹھ کے بلوائیوں میں کچھ لوگ ان پر اچانک ٹوٹ پڑے اور کرنل کو مع چار دوسرے

عہدداروں کے کاٹ کر دھر دیا جو عہدہ دار بچ ... نکلے غرض یہ کہ فوج نے اپنے افسروں کی ذرا بھی مدد نہ کی۔

میگزین کے افسر انچارج لفٹننٹ جارج ولوبی تھے اُن کے پاس توپ خانے کے کنڈکٹر اور نان کمیشنڈ افسر تھے ولوبی صاحب نے یہ جان لیا تھا کہ اگر میرٹھ سے کچھ مدد آگئی (جس کی توقع تھی) تو خیر ورنہ یہ سارا گولہ بارود اور توپ خانہ باغیوں کے ہاتھ لگے گا اس لیے انھوں نے ہلکی ہلکی توپوں کو موقع پر لگا دیا کہ بلوائی حملہ کر بیٹھے تو کچھ تو اُن کو جواب دیا جائے اور آخری تدبیر یہ کر لی تھی کہ بارود قطاریں پھیلا دی کہ اگر معاملہ دگرگوں ہو جائے تو سارا سامان دشمنوں کے ہاتھ میں دینے سے بہتر ہے کہ اُسے اُڑا دیا جائے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ہندوستانی گارڈ اور خلاصیوں کو بھی ہتھیار بانٹ دیئے مگر وہ کب ٹکنے والے تھے موقع ملتے ہی سٹک گئے۔ بالآخر فوج کے آنے سے آس ٹوٹ گئی تب سگنل دیا گیا اور بارود کو فتیلہ دیا گیا۔ پھر کیا تھا میگزین دن سے آسمان کی طرف اُڑا اور اپنے ساتھ بہت سے بلوائیوں کو بھی لے اڑا اور ایسا دھکا ہوا کہ شہر لرز گیا اور لوگوں کے کلیجے دہل گئے بلوائیوں نے چھاؤنی کا رخ کیا کشمیری دروازے کی طرف انگریز زیادہ رہتے تھے یہیں صاحبان انگریز اور میم صاحبوں نے پناہ لی تھی اُن سب پر گولیاں برسنے لگیں ان سب کا ستھراؤ ہو جاتا اگر خزانے کی کچہری پاس نہ ہوتی کیونکہ سپاہیوں کا غول کا غول خزانہ لوٹنے کو اُدھر ٹوٹ پڑا اور اُن لوگوں کو جو دن بھر موت کے منہ میں تھے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا یہ سب مل کر فلیگ اسٹاف کے تنگ حصے میں جمع ہوتے اور نہایت اضطراب سے میرٹھ سے فوج آنے کا انتظار کرنے لگے سارے شہر پر تلنگے اور اُن کے ساتھ شہر کے بدمعاش چھاتے ہوتے چو طرف لوٹ رہے تھے اور جہاں پر جو انگریز یا کرانی ملا فوراً ٹکڑے اڑا دیئے۔ آسمان پر دھوئیں کے بادل چھاتے ہوئے تھے سارے بنگلوں کو پھونک دیا۔[1]

---

[1] واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول۔ صفحہ ۱۸۳

ے مشاہدا غدر

مرزا غالب نے بھی غدر کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ فرماتے ہیں :-

"۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو علی الصبح یکایک دہلی کی شہرپناہ اور قلعہ کی دیوار ں زلزلہ پیدا ہوا یعنی میرٹھ چھاؤنی سے کچھ باغی سپاہی بھاگ کر دہلی آئے۔ رب کے سب اوت پر کمربستہ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہرپناہ کے محافظوں نے جو باغیوں کے ساتھ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے قدرتاً ہمدردی رکھتے تھے۔ اور جو ممکن ہے پہلے سے ان کے ساتھ عہد و پیماں بھی کرچکے ہوں۔ دروازے کھول دیئے۔ ان سبک عنان سواروں اور تیز رفتار یادوں نے جب شہر کے دروازوں کو کھلا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ ے۔ اور جہاں جہاں انگریز افسروں کو پایا قتل کر ڈالا۔ بندہ گھر میں بیٹھا تھا کہ شور و غوغا بلند ہوا ل اس کے کہ سبب دریافت ہو۔ چشم زدن میں صاحب ایجنٹ کی قلعہ میں مارے جانے کی آئی ساتھ ہی معلوم ہوا کہ سوار و پیادہ ہر گلی کوچہ میں گشت لگا رہے ہیں۔ پھر تو کوئی جگہ ایسی ی جو گلی خاندانوں کے خون سے رنگین نہ ہو۔ اور باغ میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ویرانی میں مانند ستان نہ ہو۔ کیسے کیسے انگریز افسر منصف مزاج، دانشور، نیک خو، نام آور تلوار کے گھاٹ ے۔ کیسی کیسی پری چہرہ نازک اندام خاتونانِ فرنگ خون میں نہائیں۔ افسوس ان کے ننھے ننھے جن کی شگفتہ روئی لالہ و گل پر ہنستی تھی اور جن کی خوش خرامی کبک و چکور کو شرماتی تھی۔ کس طرح بے درملج کے نذر ہوتے۔ اگر موت ان مقتولوں کے سرہانے ماتم میں سیاہ پوش ریہ وزاری کرے تو روا ہے۔ اگر آسمان خاک ہو کر برسے اور زمین غبار ہو کر اڑے تو بجا ہے ؎

اے نوبہار چوں تن بسمل بخوں بغلط ۔۔۔ اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو

اے آفتاب روئے بسیل کبود کن ۔۔۔ اے ماہتاب داغ دل روزگار شو" (۱)

---

(۱) ارسی تاریخ غدر "دستنبو" کا ترجمہ۔

تلنگوں کی حرص و طمع

تلنگے شہر میں سونا خریدتے پھرتے تھے۔ ان کی ... سبب سے سونے کا بھاؤ سولہ۔ سترہ روپیہ سے تا بیس۔ ۲۸ ... تولہ ہوگیا دلال بازاروں اور گلی کوچوں میں ان کو لیے پھرتے تھے۔ اور ان کو ہندوستانیوں کے گھروں سے سونے کے زیور مول لے دیتے تھے۔ مسلمانوں نے اکثر اپنی ضرورتوں کے سبب سے اور ہندوؤں نے اپنے طمع کی سبب سے سونے کے زیور ان کے ہاتھ بہت بیچ ڈالے۔ سناروں کی دوکانوں پر تلنگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ دلال اگر کسی محلہ میں ان سے دغا کرتے تو پھر سارے محلہ کی کمبختی آجاتی ایسے مالدار تلنگے تو تھوڑے سے تھے۔ مگر مفلس بہت تھے اس لیے وہ بادشاہ پر تنخواہ کا تقاضا کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ گستاخیاں۔(۱)

لوٹ مار کے اسباب

ظاہر ہے، دیسی سپاہیوں، یعنی تلنگوں کی یہ حرکتیں غیر پسندیدہ تھیں، لیکن ان حرکتوں کے اسباب کیا تھے؟ اس پر ایک مؤرخ نے یوں روشنی ڈالی ہے:۔

"ایک سبب لوگوں کے قتل کرنے اور ان کے گھر لوٹنے کا یہ تھا کہ تلنگوں کو شہر کے آدمی یہ بتلا دیتے تھے۔ کہ اس گھر میں انگریز عورت یا مرد چھپا ہوا ہے۔

۱۲ مئی کو نواب حامد علی خان بھی اس بلا میں گرفتار ہوا۔ کہ تلنگوں کو لوگوں نے یہ شبہ ڈلوایا کہ انگریز اس کے گھر میں چھپا ہوا ہے وہ اس کو کشاں کشاں قلعہ میں لائے۔ محبوب علی خان وزیر بادشاہ نے رہائی کے لیے سفارش کی۔ تلنگوں نے اس شرط پر چھوڑا کہ گھر کی خانہ تلاشی لی جائے۔ اگر انگریز نکلا تو ہم اس کا برا حال کریں گے۔ نہیں تو چھوڑ دیں گے۔ مرزا ابو بکر نے نواب کے گھر کی تلاشی لی وہاں کوئی انگریز نہیں نکلا۔ چنانچہ وہ چھوڑ دیا گیا۔

۱۳ مئی کو نرائن داس نہر والے پر تلنگوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس میں کوئی انگریز چھپا ہوا ہے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ صفحہ ۶۷۷

انھوں نے اس کو جاکر گھیرا اور دو فرنگیوں کو نکالا اور اُن کو مار ڈالا۔ اور لالہ کا مکان لوٹ لیا۔ اسی طرح شہر میں اور دو چار غریب آدمیوں کے گھر کی کمبختی آئی۔ ایک درزی کے گھر میں سے تین فرنگی نکالے۔ ایک اور سبب لوگوں کو قتل کرنے اور لوٹنے کا یہ ہوا کہ شبہ ہوا کہ وہ انگریز کے ساتھ سازش رکھتے ہیں۔ ان کو چٹھیاں و خبریں بھیجتے ہیں۔ یا رسد کا سامان ان کے لیے بہم پہنچاتے ہیں تلنگوں کو اکثر صحیح پتہ لگ جاتا تھا کہ شہر میں کون کون لوگ انگریز سے سازش رکھتے ہیں۔ اور کون کون آدمی خبریں بھیجتے ہیں۔ انھوں مان سنگھ اور تراب علی کو۔ مخبری کی علت میں گرفتار کیا۔ حقیقت میں یہ دونوں مخبر تھے ان کو جکڑبند کر کے وہ قلعہ میں لے گئے۔ مگر وہاں جاکر شہزادوں کی سفارش سے وہ چھوڑ دیے گئے۔

تلنگوں نے ایک چھٹی پکڑی اس کے لکھنے کا شبہ محبوب علی خان پر اور حکیم احسن اللہ خاں پر ہوا، دونوں کو گرفتار کیا۔ مگر بادشاہ کی سفارش سے اور ان کے حلف اٹھانے سے چھوڑ دیا۔

راجہ اجیت سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کا چچا دہلی میں رہتا تھا۔ اس کو دو دفعہ تلنگے اس شبہ میں پکڑ کے لے گئے کہ وہ پٹیالہ اور انگریزوں کے پاس خبریں بھیجتا تھا۔ اُس کا بھتیجہ مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کا طرف دار ہے۔

بادشاہ نے اس کو یہ کہہ کر کہ وہ برسوں سے دہلی میں مہاراجہ پٹیالہ سے ناراض ہو کر رہتا ہے۔ یہ کام نہیں کرتا ہوگا۔ رہائی دلائی۔

ایک سبب لوٹنے مارنے کا یہ بھی تھا کہ لوگوں پر یہ شبہ کرتے تھے کہ وہ پہاڑی پر انگریزی لشکرگاہ میں رسد پہنچاتے ہیں۔ کشمیری و موری دروازہ کے نان بائیوں کو اس جرم میں مار ڈالا کہ وہ ڈبل روٹیاں پکا کر پہاڑی پر بھیجتے ہیں۔ ان سببوں کے سوا اور اسباب بھی گھر لوٹنے کے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ سلیم گڑھ کی توپوں میں کنکر پتھر بھرے ہوئے نکلے۔ دوسری دفعہ ان میں میخیں ٹھکی ہوئی نکلیں دونوں باتوں کا شبہ محبوب علی خاں اور حکیم احسن اللہ خاں پر ہوا۔ تلنگوں نے دونوں پر تلواریں سونتیں دونوں نے حلف اٹھایا کہ ہم نے یہ کام نہیں کیا۔ بادشاہ

نے ان کے غصہ کو دھیما کیا۔ اور دو تو کی جان بچائی۔

غرض جیسی لوٹ مار کی شہر میں شہرت ہوئی تھی۔ اس کا سواں حصہ بھی صحیح نہیں ہو... صدہا محلے تھے۔ جن میں ایک کوڑی کا مال بھی نہیں لٹا۔ (۱)

امانت دار سپاہی

انہی زر پرست اور طامع سپاہیوں میں ایسے بھی تھے، جو ایماندار تھے اور سچے دل سے اس لڑائی کو لڑنا چاہتے تھے:۔

"جیل خانہ پر تلنگیوں کا پہرہ رہتا ہے۔ وہ دو پہر تک غل غپاڑہ صبر سے سنتے رہے جیل خانہ کو لوٹنے نہیں دیا۔ مگر پھر انہوں نے نمک حرامی کی اور بغاوت اختیار کی ترک سوار بھی پہنچے انہوں نے جیل خانہ کو توڑا۔ قیدی خوشی خوشی بیڑیاں اتارنے لگے ایک دو جنم قیدی رہائی کی خوشی میں شادی مرگ ہوئے۔ قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔ خزانہ لٹا نہیں امانت کی امانت تلنگوں نے بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ (۲)

مصارف جنگ کا مطالبہ

یہ لڑائی بے سرو سامانی کے عالم میں شروع کی گئی تھی۔ نہ بہادر شاہ کے پاس ایک کوڑی تھی، نہ باغی سپاہی گھر کے رئیس اور زمیندار تھے، جنگ بہرحال لڑنی تھی، چنانچہ صلاح و مشورہ کے بعد، بادشاہ نے چند اہل ثروت اصحاب سے مصارف جنگ کے سلسلہ میں مالی امداد طلب کی جو حسب ذیل تھی:۔

فہرست مطالبہ زر

رئیس چھتاری	سات توپیں اور روپیہ	۵۰۰۰۰
رئیس بریلی		۱۰۰۰۰
رئیس دھرم پور		۵۰۰۰
رئیس دانپور		۵۰۰۰

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۶۹۶

(۲) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ صفحہ ۲۲۲

رئیس پہاسو	۵۰۰۰
رئیس سعد آباد	۵۰۰۰
رئیس دتاولی	۲۰۰۰
رئیس بھیکم پور	۱۰۰۰۰
رئیس بداؤن	۱۰۰۰۰
روسا رجے پور	۵۰۰۰
مہاجنان متھرا	۵۰۰۰۰
راجہ بلّب گڈھ	۱۰۰۰۰۰
رئیس غلام علی اتردلی	۲۰۰۰۰
راجہ بھرت پور	۵۰۰۰۰۰
میزان	۱۲۴۵۰۰۰

لچھمن داس زمیندار متھرا کی بھی عرضی آئی تھی۔ کہ اس کو سند متھرا اور میرٹھ کے درمیان انتظام کرنے کی سند ملے۔ مگر کچھ حکم نہ صادر ہوا۔ (۱)

کتنی معمولی رقم تھی، ؟ —— لیکن، یہ امرائے نامدار اس کا بھی بندوبست نہ کر سکے۔ اس کا انتقام قدرت کی طرف سے انگریزوں نے ان کی اولاد سے لیا۔ جس نے پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے مصارف کا بڑا حصہ، کروڑوں اور اربوں روپیہ کی صورت میں انگریزوں کو نذر کیا، یہ ملکی جنگ کے لڑنے کے لیے، چھوٹی سی رقم نہ دے سکے استعماری جنگ لڑنے کے لیے۔ ان کی اولاد نے خزانوں کے دروازے کھول دیے۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۹۱

• انگریزوں کی پسپائی . . .
• ہندوستانیوں کی شرافت

اگرچہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ لیکن انسانیت زندہ تھی:۔

"پہاڑی پر چھاؤنی میں انگریز بالکل مایوس تھے۔ سپاہی ان سے برگشتہ ہو گئے۔ توپیں ان کے قبضہ سے نکل گئیں۔ اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہ تھا۔ چند سپاہی نمک حلال تھے۔ اور افسروں کے گھر بھی قریب تھے۔ جہاں سے انہوں نے اپنی سواریاں اور گھوڑے گاڑیاں منگوا لیں۔ اور ضروری اسباب ساتھ لیا۔ اور روپے بھی ساتھ لے لیے۔ یہاں شہر کے آدمیوں کا اور بادشاہی ملازموں کا اثر بھی سپاہیوں پر نہ ہوا تھا۔ کہ وہ ان کو بے رحمی سے قتل کرتے۔ جب وہ چلے ہیں تو سپاہیوں نے بھی ان کے ساتھ تھوڑی دور معیت کی۔ اور افسروں سے منت کیا کہ آپ جلدی چلے جائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ شہر سے سرکشوں کی بھیڑ یہاں آ جائے۔ بعض افسروں نے جانے میں اس لیے دیر لگائی۔ کہ وہ اپنے رجمنٹوں کے علم اپنے ساتھ لے جانے چاہتے تھے۔

شہر اور چھاؤنی سے انگریز بھاگ گئے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ وہ کہیں جنگلوں میں اور غیر آباد کھنڈروں میں چھپے۔ کہیں انہوں نے اپنے لباس اتارے کہ نہ پہچانے جائیں۔ کہیں چوروں نے ان کو لوٹا کہیں گنواروں نے دوست بن کر دغا دی کبھی وہ اپنے بال بچوں سمیت دریا کے پانی اور دلدل کو طے کر کے پار اترے۔ کہیں وہ خوب پٹے۔ کہیں وہ دھوپ کی گرمی کی شدت سے دھوپ میں ننگے اور بھوکے پھرے۔ راتوں کو ایسی حالت میں کہ ہر لحظہ جان جانے کا خطرہ تھا۔ نہ سوئے۔ بعض دفعہ نازک عورتیں اپنے خاوندوں سے اور بچے اپنے ماں باپ سے جدا ہو جاتے تھے۔ لیکن سچ بات یہ بھی ہے کہ بہت سے ہندوستانیوں نے اپنی جان پر کھیل پر انگریزوں کی جانیں بچائیں اور اپنی قوم کی سنگدلی اور بدکاری کے داغ کو مٹایا۔ دیہات میں بہت سے ہندوستانیوں نے مفرور انگریزوں کی بڑی خاطر داری کی اور ان کو سلامتی کی جگہ پہنچا دیا۔ ان بچانے والوں میں بڑے بڑے زمینداروں سے لے کر خاکروب تک تھے۔ جنہوں نے عیسائیوں کی جانیں بچانے میں اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال دیا۔"[1]

---

(1) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص ۲۲۷

دیسی سپاہیوں کی وفاداری

بہت سے ایسے سپاہی بھی تھے کہ اس شورش اور ہنگامہ آرائی کے زمانہ میں بھی انہوں نے اپنی وفاداری انگریزوں کے ساتھ قائم رکھی :۔

" غرض وادی پشاور میں دو ہزار پانچ سو یورپین۔ اور دس ہزار ہندوستانی سپاہ تھی جن میں سے دسویں حصہ پر انگریز اعتبار کر سکتے تھے۔

اندرونی خوف سپاہ کی بغاوت کا تھا۔ مگر بیرونی خوف سرحد کی افغانستانی قوموں آفریدی اور یوسف زئی و مہمند وغیرہ کا تھا۔ اگر یہ قومیں انگریزوں کے ساتھ برسر فساد ہوتیں۔ تو اندرونی بیرونی دشمنوں کے ملنے سے انگریزوں پر دوہری مصیبت واقع ہوتی پھر انگریزی جوانمردی ان کی برداشت نہ کر سکتی پھر ان سرحدی قوموں کے سوا کابل کا خوف تھا۔ دوست محمد خان کی دوستی روپیہ دے کر خریدی گئی تھی۔ دوست محمد خان پشاور کے پھر ہاتھ میں آنے کا دیوانہ تھا۔ اس کو یہ موقع خوب ہاتھ لگا تھا۔ اگر سرحدی قومیں اور افغانستان اس وقت انگریزوں سے بگڑ بیٹھتے تو مشکل سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کا حال کیا ہوتا۔ " (۱)

پھر بھی ہتھیار رکھوا لیے گئے

لیکن اس کے باوجود وہ ناقابل اعتبار سمجھے گئے :۔

" ۲ بجے صبح کو پشاور پریڈ ہوئی اس میں بڑی دانشمندی سے کام کیا گیا۔ ایسی خوش اسلوبی سے یورپین سپاہ کھڑی کی گئی کہ ان سے مقابلہ کرنا سپاہیوں کو بے فائدہ معلوم ہوا۔ اور چاروں ہندوستانی رجمنٹوں کو حکم ہوا کہ ہتھیار رکھ دیں ۲۱ ویں ہندوستانی پیدل رجمنٹ اس بے عزتی سے اس سبب سے باز رکھی گئی کہ اس نے کوئی بغاوت کی علامات نہیں دکھائی تھی۔ اس کے افسر بڑے اچھے تھے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ ہندوستانی پیدل سپاہ کے بغیر ملٹری خدمات کی بجاآوری نہایت دشوار تھی۔ " (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۵۶۶

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۵۶۶

پنجاب کے شہریوں سے اسلحے لیے گئے

غدر کے نازک زمانہ میں، سب سے زیادہ تعاون اور ہمدردی کا اظہار پنجاب کی طرف سے ہوا تھا، پھر بھی انگریز، ہر طرح کی امداد پنجاب سے لینے کے باوجود اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔ شہریوں تک سے وہ خائف تھے:۔

"لدھیانہ کے باشندوں سے ہتھیار لیے گئے۔ رکیٹس صاحب نے کوک کی رجمنٹ کے ذریعے اہل شہر سے ہتھیار لے لیے۔ سب جگہ اسی طرح رعایا سے ہتھیار لے لیے۔ گو بہت سے لوگوں نے چھپا رکھے تھے۔ پنجاب کمیشن کا یہ بڑا کام تھا۔ مسٹر بارسن نے مجروسہ ریاستوں کے رئیسوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ اپنے رعایا سے ہتھیار لے لیں۔ بظاہر انہوں نے حکم کی تعمیل کی مگر بڑی تاخیر سے۔ ان کو اس حکم سے انگریزوں کی نیتوں پر شبہ ہوتا تھا۔ یہ وقت ہی ایسا تھا کہ کوئی ایک دوسرے پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور بالفعل تحقیق ہو گیا۔ کہ لوگ فقط ہتھیاروں کو چھپاتے ہی نہیں بلکہ بارود بنانے کے لیے شورہ گندھک اور اجزاء بھی بہت سے خرید لیتے ہیں کہ بروقت ضرورت کام آئیں۔ گورنمنٹ نے اشتہار دے دیا تھا کہ ہتھیاروں اور ان کے چلانے اور بنانے کا اسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جائے اور ان کی خرید و فروخت نہ ہو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ وہ سرکاری مجرم ہو گا۔" (۱)

مالی امداد کے بجائے جنگ پر آمادگی

اس طرح ہندوستان کی مسلسل توہین کرنے والے انگریزوں کے خلاف جب مالی امداد طلب کی گئی تھی، انہوں نے جس طرح اس کا جواب دیا، یہ بھی ملاحظہ ہو:۔

"بغاوت نے ایک اور بری صورت اس وقت اختیار کی جب کہ باغی رسالدار محمد شیر خان ایک رسالہ لے کر پٹودی میں آیا اور شاہ دہلی کے نام پر تین لاکھ روپیہ بحالی سلطنت مغلیہ کے اخراجات کیلئے بطور چندہ کے طلب کیا مگر یہ روپیہ کہاں سے دیا جاتا اس لیے محمد شیر خاں نے تہہ تیغ کرنے کے لیے کمک منگا لی۔"

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ ص۵۷۵

اور نواب صاحب کو شکست دے کر نارنول کی طرف بھگا دیا اور پٹودی میں خوب لوٹ مار کی۔ (۱)

منشی ذکاء اللہ کے مشاہدات

منشی ذکاء اللہ اپنا مشاہدہ غدر کی ہنگامہ آرائیوں کے سلسلہ میں بیان کرتے ہیں: ۔

" جب دریا گنج میں باغی گھس آئے تو انگریزوں کو قتل کرنا اور بنگلوں کو آگ لگانا شروع کیا کشن گڈھ کی کوٹھی نمبر ۵ میں چھ انگریز اور ان کے دو ہوشیار لڑکے اور بیس پچیس عورتیں اور بچے جمع ہوگئے۔ یہ کوٹھی مضبوط تھی اور اس میں تہ خانہ تھا۔ جو اس گرمی کے موسم میں بڑے [illegible] اس کوٹھی کو انگریزوں نے مورچہ بنا لیا۔ بندوقیں اور گولی بارود کا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ اگرچہ بدذات نوکروں نے پانی کے برتنوں میں سے پانی بہا دیا اور اپنے آقاؤں کو پیاسا مارنا چاہا۔ لیکن ایک سقے نے تہ خانے کے موگھے سے پانی پہنچایا۔ اس کوٹھی پر دو روز تک باغی اور سرکش حملہ کرتے رہے۔ آخرکار انگریزوں سے تلنگوں نے بقسم قول و قرار کیا کہ تم اپنے تئیں ہمارے حوالے کر دو ہم جان نہیں لیں گے۔ بادشاہ کی حراست میں تمہیں پہنچا دیں گے۔ وہ اب زیادہ لڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ نہ ان کے پاس گولی بارود تھا نہ کھانے پینے کو تھا۔ وہ ان عورتوں بچوں اور انگریزوں کو جو تیس[2] کے قریب تھے قلعہ میں لے گئے۔ تلنگے شہر کے اندر آنے کے بعد گلی گلی کوچوں کوچوں انگریزوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اور شہر کے آدمی ان کے ساتھ جھوٹ سچ بتاتے پھرتے تھے۔ کہ یہاں انگریز ہے وہاں میم ہے۔ اس طرح بھی ان کو پندرہ بیس[2] بچے عورتیں ہاتھ لگ گئیں جن کو انہوں نے قید خانہ میں پہنچا دیا۔ میں نے چاندنی چوک میں خود دیکھا کہ ایک جوان میم صاحبہ [illegible] لباس پہنے ہوئے ایک تولیہ میں اپنے بچے کو لپیٹے دونوں ہاتھوں سے چھاتی سے لگائے تین چار تلنگوں کے ساتھ [illegible] چلی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ ایک پانچ چھ سال کا لڑکا ان کے پیچھے ان کے سائے کو پکڑے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کے تسلے لوٹا لیے ہوئے جاتا تھا۔ رستہ میں سفاک تلنگے تلوار لیے ہوئے

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب، جلد دوم، صفحہ ۹۱

ان کو دکھا کر تلنگوں سے کہتے تھے۔ کہ یہیں قتل کر دو تو وہ غصہ سے اپنے چہرہ کو آتشناک بنا کے ان کو دیکھتی تھی۔ اور کچھ نہیں بولتی تھی۔ غرض یہ عورت اپنی مردانہ ہمت سے اس طرح جاتی تھی جیسے کوہ ہوا کھانے جاتی ہو۔ جس مکان میں یہ قیدی مقید ہوتے تھے چالیس گز طول میں اور بارہ گز عرض میں تھا اس طرح ۹ ⅓ مربع گز رقبہ ہر قیدی کے لیے تھا مگر گرمی کا موسم تھا۔ انگریزوں کے لیے وہ قفس جان گزا تھا۔ جائے تنگ مردمان بسیار اوّل دو روز اچھا کھانا بادشاہ کے خاصہ سے آیا جس کو تلنگوں نے پھر بند کر دیا پھر خراب کھانا جیسا کہ قیدیوں کو ملا کرتا ہے ان قیدیوں کو ملنے لگا۔ قید میں بھی حرامزادے سپاہی، قیدیوں کو جا کر دھمکاتے اور گالیاں دیتے۔ (۱)

انگریزوں کو نہ ستاؤ

غدر کے دوران میں تخت نشین ہونے کے بعد، بہادر شاہ نے حکم دے دیا تھا کہ انگریزوں کو نہ ستاؤ، ایک فرنگی خاتون اقرار کرتی ہے کہ اس حکم کی تعمیل اس حد تک ضرور ہوئی کہ انگریز عورتوں کو نہیں ستایا گیا۔

"مردوں کے ساتھ تو بدسلوکیاں آخیر تک رہیں۔ لیکن عورتوں سے تعرض کرنا قطعاً چھوڑ دیا تھا کسی قسم کی کوئی اذیت نہ دی جاتی تھی۔ اسی تاریخ کو داروغہ کی طرف سے ایک اعلان تمام شہر کی دیواروں پر چسپاں کر دیا تھا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔

چونکہ حضرت ظل اللہ سبحانی خلیفہ صمدانی سلطان المعظم خاقان الکرم بادشاہ عالی جاہ فلک بارگاہ نے انگریزوں کا قلع و قمع کرنے کے بعد تخت طاؤس پر بہ صعودی جلوہ گاہ سلاطین گورگانیہ کی ہے۔ جلوس فرمایا۔ لہذا حکم شاہی صادر ہوا۔ کہ اب انگریزوں کے اموال و نفوس کا قتل و غارت موقوف رکھا جاتے۔ اب احکام امن و امان جاری ہوں گے اور عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا"! (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۴۳

(۲) مظالم انگلیسی در بلوائے ہندوستان۔

کلکتہ کے بزدل انگریز اور تماشا خواں مؤرخ

غدر کی دہشت کلکتہ تک پھیلی ہوئی تھی وہاں کے انگریز سہمے ہوئے تھے، ایک ہندوستانی مورخ ان کی اس بزدلی میں بھی جمال شہریاری دیکھتا ہے :۔

"کلکتہ کے جن انگریزوں نے سوا امن و عافیت کے کچھ اور نہ دیکھا تھا۔ جب ممالک مغربی کے غدر کا حال سنا تو وہ بڑے سراسیمہ ہوئے۔ اور ان کو خوف پیدا ہوا کہ یہ آفت بنگال پر آئے گی۔ وہ ہتھیار چلانا جانتے ہی نہ تھے۔ اس سبب سے اور بھی زیادہ گھبراتے تھے وہ ان خیالی خوفوں اور دہشتوں کے باعث چاہتے تھے۔ کہ گورنمنٹ ان کی محافظت کرے۔ وہ پہلے امن و عافیت اور اپنی سلامتی پر بھروسہ کیے ہوئے ہندوستانیوں کو کمال ذلیل حقیر جانے ہوئے بیٹھے تھے۔ اب اس کے برخلاف ہندوستانیوں سے خوف و دہشت ان کو مبالغہ کے ساتھ پیدا ہوئی ان کے ڈرپوک پن کی حکایات بہت سی کہی جاتی ہیں۔ کہ وہ دریا میں جہازوں میں، فورٹ ولیم کے اندر اپنے اہل و عیال کو لے گئے۔ اور اپنی نامردی کو تاریکیوں میں چھپانے لگے۔ یہ جبن اور نامردی زیادہ تر یوریشین و پرتگیزوں یا ادنیٰ درجہ کے یوروپین دکانداروں میں تھی۔ ان میں سے بعض نے حوالی شہر میں رہنا چھوڑ دیا۔ بعض نے انگلینڈ کی راہ لی بہت سوں نے بندوقیں اور تمنچے خرید لیے جب وہ باہر جاتے تو بگھی میں تمنچے رکھ لیتے۔ اور اپنے ملازموں کو ان کا بھرنا اور چھوڑنا سکھا دیا تھا۔ دریا میں شب خون کی خوف سے جہاز اور کشتیاں کینوں سے بھری ہوئی ہوتیں۔ ہر جگہ اُن کو غیر محفوظ معلوم ہوتی۔ یہ طبع بشری کا مقتضا تھا۔"(۱)

صاحب ریذیڈنٹ کے قتل کا بادشاہ کو صدمہ

بہادر شاہ کے ایک منصب دار کا بیان ہے کہ :۔

" میں گھوڑے سے اتر کر اور ڈیوڑھی سے گذر کر دیوان خانہ خاص کے صحن میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا دیوان خاص کے در میں ایک ستون کے سہارے لگے ہوئے محبوب علی خاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور سامنے ان کے دوسرے در سے لگے ہوئے حسیکم

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۳۷۲

احسن اللہ خان بیٹھے ہیں۔ اور سب درباری دو رویہ صفیں باندھے بیٹھے ہیں۔ میں نے جا کر سلام علیک کی۔ اور ایک صف میں بیٹھ گیا۔ ان دونوں صاحبان کے بیچ میں ایک مسلمان بزاز جس کی دوکان قلعہ کے سرے پر تھی اور سب شہزادوں اور بیگمات کے ہاں وہی کپڑا دیا کرتا تھا۔ بیٹھا ہے۔ اور اس کے آگے تین سکہ لٹھے کے تھان اور طاقہ سیاہ بانات کے دھرے ہیں اور سکھا خیاط بیٹھا ہے۔ حکیم احسن اللہ خان بتاتے جاتے ہیں۔ اور وہ کفن بیونتا جاتا ہے۔ میری عقل حیران ہوتی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اور کس کا کفن تیار ہو رہا ہے۔ میری برابر میر فتح علی اور ایک جانب مرزا احمد بیگ داروغہ آبدار خانہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے چپکے چپکے کچھ دریافت کرنے لگا۔ وہ کچھ تھوڑا سا حال بیان کرنے پائے تھے کہ حکیم احسن اللہ خان کے کان میں کچھ بھنک پہنچی۔ انہوں نے باآواز بلند کہا کہ کیوں نہیں کہتے۔ کہ صاحب ریذیڈنٹ بہادر مارے گئے ہیں۔ اور بادشاہ کا حکم ہے کہ میرے سب ملازم جائیں۔ اور صاحب کی تجہیز و تکفین کریں۔ اور قلعہ دار صاحب کی باغچی میں ان کو دفن کریں۔ اور حضور کو ان کے مارے جانے کا نہایت قلق ہے۔ سات آدمی مارے گئے ہیں۔ دروازہ قلعہ پر لاشیں پڑی ہیں۔ یہ کلمات سن کر میرے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ پانچ چھ منٹ تک تو کاٹو تو لہو نہ تھا ۔ (۱)

انگریزوں کا قتل اور بہادر شاہ کی ذمہ داری

انگریزوں کے قتل کی ذمہ داری بہادر شاہ پر کہاں تک عائد ہوتی ہے اس کا جواب ایک انگریز دوست مورخ یوں دیتا ہے :۔

"حکیم احسن اللہ صاحب کی یہ رائے کہ اگر بادشاہ عورتوں اور بچوں کو اپنے محل میں لے جاتا اور جب سپاہی ان کے قتل کے لیے ان سے مانگتے تو وہ سپاہیوں سے کہتا کہ میں ان عیسائیوں کے قتل پر جب راضی ہوں گا کہ تم پہلے میری بیوی بچوں کو قتل کر ڈالو تو ظن غالب یہ تھا کہ بادشاہی محل سرا میں سپاہیوں کو داخل ہونے کی جراءت نہ ہوتی۔ کہ وہ عورتوں اور بچوں کو زبردستی پکڑ کر مار ڈالتے یہ رائے ایک

---

(۱) داستانِ غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

فرضی صورت کا فرضی نتیجہ ہے۔ جو غلط اس سبب سے معلوم ہوتا ہے کہ خود بادشاہ کے اختیار ہی میں یہ نہیں تھا کہ وہ قیدیوں کو پاہیوں کے پنجہ سے چھڑا کر محل میں لے جاتے۔ (۱)

انگریزوں کا قتل اور حکیم احسن اللہ خاں

جن حکیم احسن اللہ خاں (بہادر شاہ کے طبیب خاص اور وزیر اعظم) نے انگریزی عدالت میں بہادر شاہ کو انگریزوں کے قتل کا ذمہ دار قرار دیا، اس سلسلہ میں خود ان کا کردار کیا تھا، اسے گھر کے بھیدی کی زبان سے سنیئے:۔

"ایک دن صبح کا وقت ہے۔ کوئی گھڑی بھر دن چڑھا ہوگا۔ میں گھر سے نکل کر قلعہ کی طرف روانہ ہوا اور نقار خانے میں داخل ہو کر دیوانِ عام کے نزدیک پہنچا۔ وہاں مجھ کو خیال آیا کہ خانساماں میں چل کر حکیم جی سے ملتے چلو۔ شاید حضور میں سے کچھ حکم احکام صادر ہوئے ہوں۔ اس لیے جلو کا راستہ چھوڑ کر خانساماں کی طرف سے اندر داخل ہوا۔ جب مہتاب دروازے کے آگے پہنچا کہ پور بیئے قیدیوں کو لیکر باہر جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تم ان کو کہاں لیکر جاتے ہو؟ وہ بولے ہم ان کو قلعہ کے باہر لے جاکر رکھیں گے۔ پھر میں نے کہا کہ یہ تو ہماری تحویل میں ہیں تم ان کو نہ لے جاؤ۔ مگر وہ کب سنتے تھے مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ کچھ حرکت کر بیٹھیں۔ قدم بڑھا کر جلدی سے احسن اللہ خان کے پاس پہنچا۔ وہ خانساماں کے کوٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے جا کر ان سے کہا کہ خان صاحب آپ کو کچھ اور بھی خبر ہے۔ وہ بولے کیا۔ میں نے کہا کہ وہ بدمعاش ان قیدیوں کو لیے جاتے ہیں۔ مبادا وہ ان کو لے جاکر قتل کر ڈالیں۔ تو مجھے جواب دیا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں پھر میں نے کہا کہ خان صاحب وقت نمک حلالی کا یہ ہے کہ اگر بادشاہ کو بچانا چاہتے ہو تو بجھا بجھا کر ان قیدیوں کو بچا لو۔ احسن اللہ خاں نے جواب دیا کہ میاں تم بچے ہو۔ انسان زحمت بالفعل پر زحمت بالقوہ کو ترجیح دیتا ہے۔ ابھی جو ہم ان سے کہتے ہیں۔ تو یہ ان سے پہلے ہم کو قتل کریں گے۔ اور پیچھے

---

(۱) تاریخ سلطنت انگلشیہ: ذکاء اللہ صفحہ ۶۴۳

ان پر ہاتھ ڈالیں گے۔ پھر میں نے جواب دیا اچھا ہے۔ اگر ہم وہ چار آدمی مارے جائیں گے، مگر بادشاہ کی سرکار تو بچ جائے گی۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوا اور ڈیوڑھی پر آیا۔ خواجہ سرا سے عرض کرائی کہ وہ پور بیئے انگریزوں کو نکال کر لے گئے جن کو حضور نے بڑے خاصے میں رکھا تھا۔ بادشاہ نے اسی وقت حکم دیا کہ حکیم جی کو لاؤ۔ وہ اس کا بندوبست کریں۔ خواجہ سرا نے ہمدرسے آکر ہرکارے کو دوڑایا کہ جلدی حکیم جی کو لے کر آؤ۔ غرض ایک ہرکارہ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا ہرکارہ گیا پھر تیسرا ہرکارہ روانہ ہوا۔ اس عرصہ میں گھڑی ڈیڑھ گھڑی کا زمانہ گذر گیا حکیم جی کسی طرح وہاں سے نہ ہلے بعد ڈیڑھ بجے حکیم جی تسبیح خانہ پہنچے۔ اور اندر محل میں حضور کے پاس پہنچے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ تم افسروں کو بلا کر سمجھاؤ۔ اور ان لوگوں کو بچا لو۔ غرضکہ بہت اچھا کہہ کر باہر آئے۔ اور دیوانِ خاص میں بیچ کے در میں کٹہرے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ (۱)

غدر کا روزنامچہ

اب ہم غدر کے دور اوّل کے چند اہم واقعات بہ ترتیب تاریخ بیان کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں :-

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء

بہادر شاہ نے لوٹ مار کا بندوبست کیا

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء روز سہ شنبہ کو بادشاہ دیوانِ عام میں آئے۔ اور مجرئی مجرا بجا لائے۔ ۲۰۔۲۵ روپے شہر کے صوبے داروں نے حاضر ہو کر عرض کی۔ کہ چند اہل کار رسد رسانی کے واسطے مقرر کیے جائیں رام راسئے مل اور دیوالی مل مقرر کیے گئے۔ کہ وہ پانچ سو روپیہ کی رسد خوراک پلٹن کو پہنچایا کریں محمد ابراہیم بن علی محمد کے گھر میں چار انگریز پوشیدہ تھے۔ سواروں نے سن کر سوداگر مذکور کے گھر کو لوٹ لیا۔ اور فرنگیوں کو مار ڈالا۔ اور شہر میں چند دوکانیں لوٹ لیں۔ بادشاہ

---

(۱) داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) صفحہ ۸۲

نے یہ سن کر مرزا منیرالدین کو جو پہلے پہاڑ گنج کا تھانیدار تھا منتظم شہر مقرر کیا اور لوٹ مار کو روکنے کے لیے ایک فوج مع تلنگوں کے اس کے ہمراہ کی۔ مرزا مذکور نے اطلاع کی سپاہی چوڑی والوں کا بازار لوٹ رہے تھے یہ سن کر بادشاہ نے سب پلٹنوں کے صوبے داروں کو طلب کیا۔ اور ان سے اس امر میں اپنی ناراضگی ظاہر کی اور مرزا مغل کو حکم دیا کہ ایک کمپنی سپاہیوں کو ہمراہ لے کر لوٹ کا انتظام کرے۔ چنانچہ مرزا ہاتھی پر سوار ہو کر تھانہ بہ تھانہ گئے۔ اور اعلان عام کیا کہ جو کوئی لوٹے گا اس کی کان اور ناک کاٹ دی جائے گی۔ اور اگر دوکاندار دوکانیں نہ کھولیں گے۔ اور سپاہیوں کے ہاتھ سودا بیچنے سے انکار کریں گے۔ تو سزا پائیں گے اور مقید ہوں گے۔

۱۲ مئی ۱۸۵۷ء

غلہ کا بھاؤ مقرر کرنے کی ہدایت

نواب احمد علی خاں نواب ولی داد خاں والی مالاگڑھ حسب الطلب حاضر ہوئے ان کو حکم ہوا دربار میں روز حاضر ہوا کریں۔ شاہ نے غلہ کے چودھریوں کو حکم دیا کہ غلہ کا ایک بھاؤ مقرر کریں اور اپنی دوکانیں کھول دیں۔

۱۴ مئی ۱۸۵۷ء

انگریز جاسوس کی گرفتاری

چونکہ بادشاہ نے تو جوہر شب شہری منتظم محل والوں اور راج پور وغیرہ کی دوکانیں لوٹ لیتے ہیں۔ مرزا مغل کو حکم ہوا کہ اس تلیج کا تدارک کریں۔ چنانچہ مرزا ابوبکر نے مع اپنے رسالہ کے چند بدمعاش لوگوں کو لوٹا۔ اور ایک گورہ سپاہی جو بطور جاسوس آیا تھا گرفتار ہوا۔

۱۸ مئی ۱۸۵۷ء

مصارف جنگ کا مطالبہ

نواب محبوب علی خان نے ایک فہرست سوداگروں اور ساہوکاروں کی روانہ کی۔ اور ان کو فہمائش ہوئی کہ ۲۵ سو روپیہ روز فوج کا خرچ ہے۔ تم سب کو چاہیئے کہ پانچ لاکھ روپے کی سبیل کردو۔ سب ساہوکار اور سوداگر جمع ہوئے۔ اور محبوب علی خاں کے پاس گئے۔ کہا کہ ہم سب لٹ گئے روپیہ کہاں سے لائیں۔ اور رام جی داس نے کہا اور سب ساہوکار دیں گے تو میں بھی دوں گا۔ مرزا ابوبکر رسالہ کو لے کر چندراولی اور وزیرآباد کے گوجروں کی تادیب کے واسطے گئے۔ لیکن گوجر فرار ہو گئے۔

۲۰ مئی ۱۸۵۷ء

دشمن کے قتل کے بارے میں بہادر شاہ کا استفتا

۲۰ مئی ۱۸۵۷ء بادشاہ محل سے دیوان عام میں برآمد ہوئے۔ محمد سعید ڈاکٹر آداب بجا لایا بادشاہ نے کہا تم نے انگریزوں کے خلاف جامع مسجد میں محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ لیکن اب کوئی انگریز باقی نہیں رہا۔ اب جھنڈے کی کیا ضرورت ہے اس نے عرض کی کہ جھنڈا ہنود نے خلاف کھڑا کیا گیا تھا۔ یہ سن کر بادشاہ نے کہا کہ میرے نزدیک ہندو مسلم ایک ہیں۔

فوج نے آ کر عرض کی پانچ میمیں جو قید ہیں وہ فوج کے حوالے کی جائیں۔ بادشاہ نے محبوب علی ڈاکٹر سے اس کے بارے میں فتوے طلب کیا۔ اس نے کہا کہ از روئے شرع محمدی عورتوں کا قتل جائز نہیں۔ بعدازاں بادشاہ محل میں تشریف لے گئے۔ اور بیگم حمید اور منشی مکند لال سے گفتگو کرتے رہے۔ (۱)

---

(۱) چراغ دہلی۔ مرزا حیرت دہلوی صفحہ ۸

میگزین پر بھی قبضہ کرلیں گے تو اسے اڑادیا،

میگزین کے انگریزوں کو یہ امید نہ تھی کہ ہم میں سے ایک کی بھی جان بچے گی لیکن انگریزوں میں چار انگریز زندہ بچ کر باہر نکل آئے اگرچہ میگزین میں چند بہادروں کی جانیں گئیں مگر انھوں نے میگزین اُڑا کر صدہا اپنے دشمنوں کی جانیں لیں۔ میگزین کے گرد صدہا مردے پڑے ہوئے تھے۔ منصور خان کی حویلی میں بعض لوگ مکانوں کے گرنے سے مرگئے تھے، سیکڑوں اہل شہر اپنے مردوں کو روتے ہوئے رات کو اُٹھا کر لے گئے جن مردوں کے وارث شہر میں نہیں تھے وہ دن کو گرمی میں پڑے سوکھا کیے، میں نے ان لاوارث لاشوں کو دوسرے روز جاکر دیکھا کہ کسی کا سر پھٹا ہوا تھا کسی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی، کسی کے کوئی ضرب نہیں آئی تھی۔ مرا پڑا تھا، اس میگزین کے اڑنے سے شہر میں زلزلہ آگیا تھا، مگر ان بہادروں کا نام تاریخ میں یادگار روزگار رہے گا، ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے تک ان کی تعریف ہوئی، جس وقت انگلینڈ میں یہ خبر پہنچی کہ ایک نوجوان افسر ولوبائی نے دہلی میگزین کو اڑادیا تو ساری قوم نے بڑی خوشدلی سے اس کی تعریف کی، یہ اوّل کام بہادری وشجاعت کا تھا۔ جس پر انگریزوں کو بڑا فخر وناز تھا ان بہادروں کی یادگار میں میگزین کے دروازہ پہ کتبہ لگایا۔ (۱)

بادشاہ کی طرف سے شہر کا انتظام

بہادر شاہ نے تخت پر بیٹھنے کے بعد، ان تخریبی کارروائیوں کے باوجود، حالات کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کی :۔

"اسی روز بادشاہ سلامت کی طرف سے شہر کا انتظام ہوا اور کوتوال مقرر کیا گیا۔ مجھے حکم ہوا کہ سقوں کو لے جاؤ اور میگزین میں آگ لگ رہی ہے اس کو بجھاؤ اور اگر بارود میں آگ لگ گئی تو تمام شہر اڑ جائے گا۔ غرضیکہ کوتوال کی معرفت دو تین سو سقّے میرے پاس پہنچے اور جن مکانوں میں آگ لگ رہی تھی وہ بجھائی۔ دریا کی طرف کا شہر کا ڈنڈا گرا ہوا پڑا تھا، گولوں کے پہاڑ لگے ہوئے تھے، دو سو توپ کے قریب

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۴۲۱

چھتیس پیپے تو چھکڑوں پر تیار تھیں، اسی قدر توپ کی نالیں زمین پر پڑی تھیں، بندوقوں کا کچھ شمار حساب نہ تھا، پیتنچے لا انتہا تھے، غرضیکہ سارا میگزین آلاتِ حرب سے معمور تھا میں تو اس کو اسی طرح چھوڑ کر آیا تھا، دو تین روز کے بعد سنا کہ بدمعاش اس سامان کو لوٹ کر لے گئے، (۱)

باغی سپاہی دہلی میں، جو سپاہی ادھر اُدھر سے جمع ہوئے تھے ان کی تفصیل یہ تھی،

نام مقام	نام و نمبر رجمنٹ
دہلی	تیسری کمپنی ساتویں پلٹن ارٹلری مع نمبر ۵ مدرس ارٹلری بیٹری اور ۳۸ ویں و ۵۴ ویں و ۷۴ ویں رجمنٹ پیدل،
میرٹھ	۳۰ رجمنٹ سواروں کی و ۱۱ ویں ۲۰ ویں رجمنٹیں پیدل
علی گڑھ و بلند شہر	نویں رجمنٹ پیدل
ہانسی حصار سرسہ	ہریانہ پیدل پلٹن و چوتھے غیر آئینی رسالہ کی رجمنٹ کا بڑا حصہ،
میرٹھ و رڑکی	سپیری مائی نرکی دو کمپنیاں
متھرا	۴۴ ویں و چھٹی رجمنٹوں کی کچھ کمپنیاں
فیروز پور و انبالہ	۴۵ ویں رجمنٹ پیدل اور پانچویں رجمنٹ پیدل کے بھاگے ہوئے سپاہی
بریلی	آٹھواں غیر آئینی رسالہ اٹھارہویں و اٹھائیسویں پیدل رجمنٹیں اور ایک بیٹری ارٹلری
نصیر آباد	پندرہویں و تیسویں پیدل رجمنٹیں اور ایک بیٹری ارٹلری
نیمچ	بہترویں پیدل رجمنٹ ساتویں رجمنٹ گوالیار کنٹجنٹ
جالندھر	دو پیدلوں کی رجمنٹیں اور ایک سواروں کی رجمنٹ کے کچھ سپاہی سوار (۲)

---

(۱) داستان غدر راقم الدولہ ظہیر صہ۸۳

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صہ۶۹۵

ولسن کا عذر لنگ

میرٹھ کے انگریز فوجی افسروں پر ایک سنگین الزام یہ تھا کہ انھوں نے باغی سپاہیوں کو میرٹھ سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا؟ اگر انھیں وہیں روک لیا جاتا، تو شاید غدر برپا ہی نہ ہو پاتا، ولسن صاحب نے اس کا جو دلچسپ جواب دیا وہ یہ ہے:

"جب کئی مہینہ کے بعد اعلیٰ درجہ کی ملٹری حکام نے ولسن صاحب سے جواب طلب کیا کہ ۱۰ مئی کی رات کو کیوں نہیں حرکت دی گئی؟ تو برگیڈیر ولسن نے یہ جواب دیا کہ قوانین بنگال فصل ہفتم سے ظاہر ہوتا ہے کہ برگیڈیر کو بہت کم اختیار سپاہ پر اس چھاؤنی میں دیے جاتے ہیں جس میں ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر ہوتا ہے میں یہاں کوئی اپنا جدا حکم کام میں نہیں لا سکتا تھا، جہاں میجر جنرل موجود تھا میں برگیڈیر تھا۔ میجر جنرل کے احکام کی سپاہ میں تعمیل کرنے والا تھا۔ اور چونکہ یہ معلوم نہ تھا کہ سپاہ مفرور کس جانب کو گئی ہے۔ میں اپنی رائے کے صواب ہونے کا یقین کرتا ہوں۔ اگر مفرورین کو تلاش کرنے کے لیے برگیڈ باہر جنید چلا جاتا تو اور باقی حصہ چھاؤنی کا تباہ و غارت ہو جاتا۔ جس میں ہمارے بیمار مرد و عورتیں اور بچے اور قیمتی ذخیرے تھے۔ تو میرٹھ کے کمانڈروں کے برخلاف اب سے بہت زیادہ غل شور مچتا (۱)

انگریزوں کو مدد ملنے لگی

"جنرل انسن نے ایک لمحہ کی تاخیر روا نہ رکھی اور فوراً شملہ کے پاس داغ شاہی اور سپاٹو اور کسولی سے تین یورپین رجمنٹوں کو روانگی کا حکم دیا اسی کے ساتھ ایک عمدہ دار پھلور میں فوج تیار کرنے کو بھیجا گیا اور سرمور کے گورکھوں کو بھی جو اپنے عمدہ کارگزاریوں کے بدولت بڑی ناموری حاصل کر چکے تھے اور دہرہ دون میں تھے میرٹھ بھجوا دیا جنرل انسن بھی خود اسی دن یعنی چودھویں تاریخ کو امدادی فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے اُترے مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے تھانیسر پر قبضہ کرنے کے لیے فوج بھیج دی اور دوسرے روساء نے اپنی اپنی فوجیں رستوں کی حفاظت پر متعین کر دیں،

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۴۳

کیونکہ اب سپاہیوں کے لشکر کا کچھ بھروسہ باقی نہ رہا تھا چند دن حمل و نقل سامان۔ گولی بارود کی فراہمی سامان رسد و سامان خورد و نوش والے چارے کے جمع کرنے میں لگے کیونکہ پہلے سے تو کوئی طیاری نہیں کی گئی تھی جب سامان ٹھیک ٹھاک ہوگیا تو فوج کو چھوٹے چھوٹے دستہ کر کے کرنال کیطرف بڑھایا گیا یہاں ایک بڑا سانحہ گزرا کہ جنرل انسین نے جو لشکر کے روح رواں تھے، ہیضے سے ۲۷ مئی کو انتقال کیا۔ (۱)

انگریزوں نے مقابلہ کی تیاریاں شروع کردیں

بہر حال شروع کی غفلت اور سہل انگاری کے باوجود انگریزوں نے اپنے آپ کو آخر کار لڑنے کے لیے آمادہ کرنا شروع کر دیا،

"سپاہ بمبئی واپس آرہی تھی، جہاں سے ایک علم میں فوراً آتی سپاہ آسکتی تھی، جتنی دیر میں اسٹیمر (دخانی جہاز) آسکتا ہے چین کی مہم سے بھی سپاہ اپنا کام بخوبی انجام دے کے انگلینڈ کو واپس جاتی تھی۔ اس کو لارڈ کننگ نے اپنے دوست لارڈ ایلجین مدارالمہام مہم کو لکھ کر ہندوستان بلا یا مگر پھر بھی چین و ایران کی فوج کے آنے میں ایک عرصہ چاہیئے تھا یہ بھی ایک خوش نصیبی تھی کہ رنگون اڑتالیسویں[۴۸] رجمنٹ کلکتہ کے پاس مارچ میں بلائی گئی تھی اور گوروں کی پینتسویں[۳۵] رجمنٹ کے لیے اسٹیمر بھیجا گیا کہ فوراً اس کو رنگون اور مولمین سے سوار کر کے کلکتہ میں لے آؤ، مدراس کے گورنر کو تار بھیجا گیا کہ تینتالیس[۴۳] رجمنٹ پیدل اور مدراس رجمنٹ کو تیار رکھیں کہ وہ فوراً جہاز پہ سوار ہو جائیں اور ایک معتمد افسر جہاز میں سیلون بھیجا گیا کہ وہاں کا گورنر جس قدر یورپین سپاہ بھیج سکتا ہے بھیج دے۔

گورنر جنرل نے یہ ساری تدبیریں یورپین سپاہ کے جمع کرنے کے لیے کیں اس کے سوا انھوں نے تمام دخانی جہازوں کو جمع کر کے اضلاع بالا میں سپاہ بھیجنے کی تدابیر کی۔ گورنر جنرل

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اوّل صفحہ ۱۸۵

کو سب سے زیادہ بھروسا پنجاب کی یورپین پر تھا اور یہ بھی ان کو یقین تھا کہ سکھ بھی امداد کریں گے کہ مغلوں کے مشہور دارالسلطنت کو خوب لوٹیں۔ کمشنر سندھ کو تار بھیجا گیا کہ وہ انگلش رجمنٹ پنجاب میں بھیج دے۔ ایک اور تار مسٹر کالون کو بھیجا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو جلد سر جان لارنس کو لکھ بھیجے کہ وہ پنجاب کی رجمنٹیں اور یورپین جس قدر بھیج سکیں روانہ کر دیں ہر طرح سے یہ کوشش کی جائے کہ دہلی پھر ہاتھ آجائے جنرل ہیوٹ کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کا زور کمانڈر انچیف پر دے کہ سپاہ جلد از جلد روانہ ہو اور اگر ضرورت ہو تو گورنر جنرل کے نام سے راجہ پٹیالہ اور راجہ جند سے مدد طلب کی جائے۔

کولون صاحب نے حتی الامکان جو کچھ کرنا چاہیے تھا وہ کیا۔ ۱۵ مئی کو انھوں نے لارڈ کیننگ کو لکھا کہ میں خود یہاں کا کمانڈر انچیف بن گیا ہوں، تیمور کے خاندان سے سندھیا اور بھرت پور لڑنے کو تیار ہیں میں نے راجپوتانہ کی ریاستوں کو آمادہ کر لیا ہے کہ جو باغی مغرب کی طرف مفرور ہوں ان سب کو گرفتار کر لیں، تیسرے رسالہ کے مسلمان سواروں نے بڑا خوفناک قتل کیا ہے ایسی بے رحمیوں کا خوفناک عوض ہونا چاہیئے۔ (۱)

انگریز مورچہ بناتے ہیں لیکن ڈر ڈر کر

"پہلے زمانہ میں بندو راؤ مہارانی بیجا بائی کا بھائی یہاں رہتا تھا۔ جنوب مغرب میں ایک لمبی پہاڑی ہے اور وہ دو میل میں پھیل آئی ہے اور بندو راؤ کی کوٹھی کے نیچے ختم ہوتی ہے یہ پہاڑی جو دہلی سے ساٹھ فیٹ اونچی ہے۔ حملہ کرنے کے لیے گوشہ عافیت تھی اور محافظت کے لیے ایک فصیل اس کے نیچے پرانی چھاؤنی اور اس کے گرد انگریزی لشکر خیمہ زن ہوا اس پہاڑی پر قبضہ رکھنے کے لیے برنارڈ نے انتظام کیا۔ اس کے دائیں سرے پر جہاں اب فتح گڑھ بنایا گیا ہے۔ بھاری توپیں لگائیں اس کا نام رائٹ بیٹری رکھا۔ (بیٹری کے معنی یہ ہیں کہ

---

(۱) تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) صفحہ ۸۰

دیوار چھاتی تک اونچی یعنی سینہ پناہ ایسی بنائی جائے کہ اس پر توپیں لگائی جائیں اور وہ توپوں اور سپاہیوں کی پناہ گاہ ہو) جو شہر کی فصیل سے بارہ سو گز کے فاصلہ پر تھا۔

شمال میں تھوڑے فاصلہ پر ایک بھاری مورٹر کا توپ خانہ ڈھلان کے غاروں پر جمایا اس پر سے بندو راؤ کی کوٹھی تھی۔ یہاں پر پکیٹ بٹھایا پکیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑے سے سپاہی لشکر گاہ سے تھوڑے فاصلہ پر پہرہ چوکی کے لیے بٹھائے جائیں کہ وہ دشمن کو دیکھتے رہیں اور مورٹر اس چھوٹی سی توپ کو کہتے ہیں کہ جس کا منہ بہت بڑا ہو اور اس سے بم کے گولے چھوڑے جائیں ایسے گولے جو اندر سے خالی ہوں اور ان میں مصالحہ پھٹنے والا بھرا ہوا ہو۔

شمال میں تین سو گز آگے جہاں نما تھا۔ جو ایک قدیمی مستحکم عمارت تھی وہاں بھاری توپوں کی بیٹری لگائی اور جہاں نما سے پرے پٹھانوں کی ایک قدیمی مسجد تھی جس کی مضبوط دیواریں پکٹ کی بڑی محافظ تھیں اس کے آگے شمال میں فلیگ سٹاف ٹور تھا۔ وہاں پیادوں کو پکٹ لگایا۔ انگریزوں کا لشکر گاہ سب طرف سے بڑا استوار تھا۔ مگر ایک طرف سے بڑا ضعیف تھا۔ وہ طرف سبزی منڈی کے قریب تھی جس میں مکانات اور فصیل اور باغات کا ایک مجمع تھا۔ جس کے سبب سے باغی بائیں طرف حملہ کر سکتے تھے اور انبالہ یعنی پنجاب کی سڑک کو بند کر سکتے تھے۔ (۱)

پہاڑی پر انگریزوں کا قبضہ

آخر، کافی تگ و دو کے بعد، ایک با موقع پہاڑی پر قابض ہو جاتے ہیں:

"اسی دن سر شام خدا خدا کر کے میرٹھ سے لشکر روانہ ہوا اور غازی الدین نگر پہنچا جو اب غازی آباد کہلاتا ہے، غازی آباد میں ۳۰ مئی کو اور اس کے اگلے دو دن باغیوں سے معرکہ رہا ان کو اچھا سبق ملا کہ بڑے نقصان سے پسپا ہوئے، ۴ جون کو انگریزی فوج نے انبالے کے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۷۵

لشکر سے مل جانے کی غرض سے علی پور کی طرف کوچ کیا جو دلی سے تیرہ میل جمنا کے کنارے واقع ہے، اب کمان سر ہنری برنارڈ کے ہاتھ میں تھی۔ چھٹی تاریخ پھلور سے اور ساتویں کو میرٹھ سے لشکر آن پہنچا صرف ان کے آنے کی دیر تھی کہ سب نے دلی کی طرف کوچ کیا، ۸ر جون کو یہ مختصر سا لشکر جو سات سو سوار۔ ڈھائی ہزار پیدل اور بائیس توپوں پر مشتمل تھا آگے بڑھا ابھی پو نہیں پھٹی تھی کہ بھادلی سرائے پر دشمن کی گولہ بارود کی زد میں آن ڈٹا، ایک مختصر سی لڑائی ہوئی اور انگریزوں کی طرف سے ایک زور شور کا حملہ ہوا اور دشمنوں کو سنگینوں کی نوکوں پر دھکو توپیں چھین لیں پیچھے سے سوار گھیرا ڈال کر پہنچے اور دشمن کو پوری طرح منتشر کر دیا۔ اور بڑھتے بڑھتے دشمن کو پسپا کر کے پہاڑی سے ہی لی۔ (۱)

باغی ہوشیار رہتے تھے

"انگریزی حملہ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ انگریزی سپاہ دفعتہً یکایک باغیوں پر ایسی آن کر ٹوٹ پڑتی کہ وہ دیکھتے دیکھتے رہ جاتے مگر باغی ایسے ہوشیار تھے کہ وہ سب باتوں کی خبر رکھتے ان کے پٹرول پھرتے تھے یعنی رات کو گشت کرتے تھے اور اپنے پکٹ بٹھائے رہتے تھے۔ (۲)

باغی جی داری سے لڑتے تھے

"اُ کو بڑی قلعہ شکن توپوں اور مارٹروں سے گولہ باری شروع کی گئی پہلی ہی سیلوو[۳] کے بعد ہی سپاہی فصیل کے کنگوروں پر چڑھ گئے اور بڑے جوش و خروش سے چینرز پر چینرز دینے لگے چونکہ بھاری بھاری توپوں سے بالکل پاس سے گولہ باری کی جا رہی تھی، فصیل جا بجا سے ٹوٹنے لگی تب بھی دشمن کو کچھ ہراس نہ ہوا اور بڑی ہمت اور استقلال سے دوسری جگہ توپیں استادہ کریں اور اُن کے رسالہ نے

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اوّل صہ ۱۸۶

(۲) تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاءاللہ) صہ ۵۹۵

(۳) واقعاتِ دارالحکومت دہلی حصہ اوّل صہ ۱۷۲

یہ غضب کیا کہ لشکر کے عقب پر حملہ کر دیا لیکن خوب منہ کی کھائی۔

باغی بہادری سے ٹکر لیتے تھے

"۷ا جون کو نقصان بہت تھوڑا ہوا لو مبس صاحب کے ایک ہلکا سا زخم لگا اور ان کی ران کے نیچے دو گھوڑے مارے گئے۔ آج تک لڑائی میں اس بہادر جوانمرد کی ران کے تلے پانچ گھوڑے مارے گئے تھے۔ اس کالم میں دو سپاہی مقتول اور نو سپاہی د سات گھوڑے مجروح ہوئے۔ میجر ریڈ کے زیر افسران جو کالم گیا تھا۔ وہ بھی فتحیاب ہوا۔ دو مختلف سرایوں کے دروازوں کو توپوں سے توڑ کے کشن گنج میں داخل ہوا جس میں باغی بھرے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے دیوانہ وار حملہ کیا۔ ان کو ہماری سپاہ نے گولیاں چلا کر مار ڈالا۔ ایک بیٹری کے قریب اکتیس ۳۱ باغیوں کو مردہ پڑا ہوا دیکھا اور کشن گنج کے ایک وسط کی عمارت میں نو مردے پڑے ہوئے تھے، دشمنوں کے پچاس ساٹھ آدمیوں کے درمیان مرے ہوں گے اور بہت سے آدمی ان کے زخمی ہوئے ہوں گے۔ میں نے ان کے مورچے کو جو ابھی بن کر بالکل تیار نہیں ہوا تھا غارت کر دیا۔ گاؤں میں آگ لگا دی۔ جس سے مورچہ وہ بناتے تھے۔ جلا دیا میگزین اور سرائے کے تین دروازے اڑا دیئے۔ (۱)

باغی بزدل اور کم حوصلہ نہیں تھے

"۲۳ جولائی کے بعد چند روز تک کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ طرفین سے گولے ایک دوسرے پر چلتے رہے اور جب باغی انگریزی مورچہ کی دیواروں کے قریب آتے تو کچھ جھڑپ میں ہو جاتیں، لیکن ۳۱۔ جولائی کو کئی ہزار سپاہیوں کا لشکر تین مورٹر اور دس توپیں لے کر شہر کے باہر نکلا اور تیتک کی سڑک پر اس ارادہ سے چلا کہ ایک عارضی پل نجف گڑھ کی جھیل کے نالے پر بنائے اس پل بنانے کے لیے وہ لکڑیاں بھی ساتھ لے گئے تھے انگریزی سپاہ کے عقب پر حملہ کرنے کا

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ صہ ۵۰۹

انگریزی گولوں کی آواز اچھی طرح سُنائی دیتی تھی اور نہ گولہ آتا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر رات کو انگریزی توپوں کی رنجک تک اچھی خاصی نظر آتی تھی اور گولے بھی لال انگارے کی طرح جلتے ہوئے سوجھ پڑتے تھے۔ (۱)

بخت خاں نے پانسہ پلٹ دیا

بخت خاں کے آنے کے بعد حالات بدل گئے، اب تنظیم، استقلال اور عزیمت کا دور شروع ہُوا:

"۲۶ر جون و ۳ر جولائی کے درمیان کمکوں کے آنے پر چھ ہزار چھ سو سپاہی ہر قسم کے انگریزی لشکر گاہ میں ہو گئے تھے۔ باغیوں کے پاس اس وقت بڑی کمک آگئی تھی، پہلی اور دوسری جولائی کو روہیلکھنڈ کے باغی سپاہی دہلی میں آگئے تھے۔ ان سب کا سپہ سالار بخت خاں ایک پرانا صوبیدار توپخانہ کا تھا۔ انگریزی لشکر گاہ میں اس کو بہت سے انگریز افسر جانتے تھے۔ وہ الفربہ تخواہ مخواہ مرد آدمی تھا۔ اور اس کو انگلش سوسائٹی کا بڑا شوق تھا اور انگریز اس کو بڑا ہوشیار اور دانشمند سمجھتے تھے دلی کے بوڑھے بادشاہ نے بھی اس کی بڑی قدر شناسی کی کہ اس کو کل سپاہ کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ اب باغیوں کی سپاہ تیس ہزار کے قریب ہو گئی۔ ان کے پاس توپیں بہت تھیں اور ان کا میگزین اس قدر تھا کہ وہ کبھی خالی ہوتا جاتا نہ تھا۔ (۲)

باغی بہادر بھی تھے اور ماہر جنگ بھی

"انگریزوں نے باغیوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھی اور سمجھے کہ نہ یہ فنون حرب سے واقف ہیں اور نہ ان میں ہمارے مقابلہ کا دم ہے لیکن اب جب روزانہ مڈبھیڑ ہونے لگی تو آنکھیں کھلیں اور عملی طور پر ثابت ہو گیا کہ ان کی اصلی حالت کے اندازہ میں بڑی

---

(۱) حیات النذیر، ص ۴۱

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ۔ (ذکاء اللہ) ص ۵۹۴

غلطی کی گئی تھی وہ فی الواقع جان پر سے اُٹھ کر لڑنے والے اور بڑے جیوٹ تھے فوج کے علاوہ دوسرے انگریزوں کی مٹی پلید تھی۔ (۱)

باغیوں کی بہادری کا اعتراف

سڑک پر مردہ آدمی اور گھوڑے جا بجا پڑے ہوئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کیسی سینہ زوری کے ساتھ لڑائی ہے۔ ایک جگہ چالیس آدمی پڑے ہوئے تھے جن کی بندیوں کو توپوں کے گولوں نے چھید اتھا۔ بعض کے چہرے بگڑے ہوئے تھے اور بعض آرام سے سوتے تھے۔ باغیوں کو رات بھر فرصت اپنے مُردوں کے لے جانے کی ملی تھی مگر پھر بھی اس قدر مُردے پڑے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بھاری نقصان ہُوا تھا ابھی انگریزی لشکر نے کیمپ مراجعت کی تھی کہ دشمنوں نے اپنی توپوں پر جا کر گولہ زنی شروع کی انگریزوں کے لشکر نے پھر آن کر ان کو بہت جلد پراگندہ کر دیا تاکہ دشمن عقب پر آسانی سے حملہ نہ کر سکیں جن کے باعث پنجاب سے آمد و رفت مسدود ہو جائے۔ (۲)

انگریزی لشکر کو کمک مل گئی

"جب پہاڑی پر پہلے ہی دن انگریزی لشکر خیمہ زن ہُوا تو دوپہر کے بعد باغیوں نے شہر سے باہر نکل کر ایک بڑا تیز و تند حملہ ہندو راؤ کی کوٹھی پر کیا۔ انگریزی لشکر کی خوش نصیبی تھی کہ آج ان کی بڑی کمک آ گئی تھی۔ اس سپاہ نے گرمیوں کے موسم میں مردان سے جو یوسف زئی کی سرحد پر ہے، ۵۸۰ میل کا سفر بائیس[۲۲] دن میں کیا تھا۔ اپنے آنے کے چند گھنٹے بعد انھوں نے باغیوں سے دست بدست لڑائی لڑی اور ان کو بھگایا اور بہت نقصان پہنچایا اور شہر کی فصیل تک ان کا شکار کیا۔ لفٹنٹ کوئین ٹن بیٹ صاحب جو گائیڈس کے سواروں کے افسر تھے۔ سخت

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول ص ۱۰۷

(۲) تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۸۰

ارادہ ان کا تھا اگر باغی اس پل کو بنا لیتے تو پھر انگریزی لشکر کو بہت ستاتے۔
مینہ موسلادھار برس رہا تھا اس کے اندر یہ سپاہ صبح کو کیمپ میں گئی اور میجر کاک کا کالم
تیار رہا کہ جس وقت حکم آئے روانہ ہو جائے۔
دوپہر کے بعد باغیوں نے پل تیار کر لیا تھا کہ پانی کی ایسی طغیانی ہوئی کہ پل بہ گیا۔ اس
کی لکڑیاں کیمپ کے پاس بہتی ہوئی نظر آئیں پھر باغیوں کا لشکر دہلی کی طرف چلا گیا اس وقت
شہر سے ایک بڑا انبوہ پیادوں کا نکل کر ان سے ملا جب یہ دونوں لشکر ملے تو وہ کشن گنج کے حویلی
میں داخل ہوئے۔ اور پہاڑی پر انگریزوں کے مورچوں کے داہنی طرف حملہ آور ہوئے اس
وقت آفتاب غروب ہونے کو تھا، رات بھر بندوقیں اور توپیں متواتر چلتی رہیں باغی مورچہ کی
دیوار پاس جاتے تو انگریزی پیدلوں کی بندوقوں کے گراپ کی باڑھ سے پسپا ہوتے ملکے مورٹر
بھی ہمارے پیچھے کے کیمپ کے آدمیوں کی بھیڑ پر گولے مار کر خوب کام کرتے دوسری اگست
کی صبح دس بجے باغیوں کی لڑائی موقوف ہوئی اور انھوں نے چار بجے تک شہر میں مراجعت کی
اگرچہ ان پر شہر اور کشن گنج سے گولے اور گولیوں کی بھر مار متواتر رہی مگر انگریزوں کا نقصان بہت
کم ہوا۔ ایک افسر اور نو سپاہی مارے گئے۔ اور چھبیس زخمی ہوئے باغیوں کا نقصان بہت ہوا
سبجن ہوس کے گرد ایک سو ستائیس لاشیں ان کی شمار کی گئیں۔ ان کی بہت سی لاشیں اور جگہ پڑی
ہوئی تھیں اور معلوم نہیں کہ اندھیرے میں وہ کتنی لاشیں اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ (۱)

دیسی سپاہیوں میں اختلاف رائے تھا

مختلف مقامات سے دہلی میں جو سپاہ جمع ہوئی اس میں
آپس میں اتفاق نہیں تھا۔ جب نجف گڑھ کی لڑائی کے لیے نیمچ اور بریلی کے برگیڈ جانے
لگے ہیں۔ تو اول جھگڑا اس بات پر ہوا۔ کہ کون پہلے جائے؟ اس کو وہ اپنی تذلیل سمجھتے تھے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۱۲

جب اوّل نیمچ کا برگیڈ گیا تو بریلی برگیڈ اتنے فاصلہ پر رہا کہ توپ کی آواز سنتا تھا۔ اس نے کچھ خبر نہ کی کہ نیمچ کی فوج پر کیا پڑی بنی وہ پچھلے پاؤں دہلی کو واپس چلا آیا۔ اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ایک وار کرتا۔ (۱)

- انگریز بہروپیا
- بادشہ کی انگریز عورتیں
- پرتھوی راج کی جے

چار بجے میگزین اڑا تھا۔ چھاؤنی میں برگیڈیر گریوس اور ان کے ماتحت افسران سپاہیوں کو جمع کیے ہوئے تھے۔ جو شہر کو نہیں بھیجے گئے تھے۔ ہر وقت ان کو یہ امید تھی کہ میرٹھ سے سپاہ ان کی امداد کے لیے آتی ہوگی۔ اس کے نہ آنے پر بڑا تعجب تھا۔ اس کی یہ تجویز ہوئی کہ جنرل ہیوٹ کے پاس میرٹھ کوئی شخص بھیجا جائے کہ وہ سپاہی دہلی میں بھیجیں۔ اس خدمت کو چوہترویں پلٹن کے سرجن ڈاکٹر بیٹن صاحب نے قبول کیا۔ ایک چٹھی اس بہادر ڈاکٹر کو دی گئی وہ اپنے بیوی بچوں سے رخصت ہوئے جن سے پھر ملنے کی امید نہ تھی انھوں نے اس جان جوکھوں کے سفر کیے۔ بھیس فقیرانہ بنایا۔ وہ ہندوستانی زبان ہندوستانیوں کے مثل جانتے تھے مگر ان کی آنکھوں کے رنگ نے بتلا دیا کہ وہ انگریز ہیں، سپاہیوں نے ان پر گولیاں چلائیں۔ گنواروں نے ان کے کپڑے اتارے۔ آوارہ سرگرداں حیران پریشان جنگلوں میں بھوکے ننگے پڑے پھرے، بہزار خرابی خدا خدا کرکے انبالہ میں زندہ پہنچے۔ سپاہی بغاوت پر آمادہ تھے۔ مگر افسروں پر دست درازی نہیں کرتے تھے۔ عورتیں اور بچے باڈے پر جمع ہوئے۔ دو توپیں باڈے کے آگے لگی ہوئی تھیں۔ مگر ان کے توپچیوں پر اعتبار نہ تھا باوشہ دہلی کی تاریخ میں ایک بہت بڑا مشہور مقام ہوگیا ہے وہ ایک گول گنبد ہے جس کا قطر ۱۸ فیٹ ہے۔ اس پر چھاؤنی کا جھنڈا

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۲۶

نگا رہتا تھا، اس میں بہت سی لیڈیاں اور بچے تھے اور ان کے ساتھ عورتیں مرد ملازم بھی گھسے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدّت کی وجہ سے ضعیف دماغ لیڈیوں کو غش آئے جاتے تھے ان میں بیوہ عورتیں تھیں۔ جو اپنے خاوند کا ماتم کر رہی تھیں۔ اپنے بہن بھائی کے مارے جانے کی خبر سُن کر رو رہی تھیں بعض ایسی تھیں جن کے خاوند اپنی خدمت پر۔ باغیوں میں گئے ہوئے تھے۔ چھاؤنی میں علاوہ سپاہ کے انیس اور یورپین یا کرسچن تھے میگزین اڑنے کے بعد ہندستانی سپاہ نے چھاؤنی میں کھلی بغاوت اختیار کی۔ بارود خانے پر جو اٹھتیسویں[۳۸] رجمنٹ کی دو کمپنیاں تھیں انھوں نے پرتھوی راج کی جے پکاری۔ (۱)

انگریزوں کی عیّاری

"جنگ میں سب کچھ جائز ہے؟!" ——— اس مقولہ کو انگریزوں نے غدر میں بھی بہت اچھی طرح اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا:

"انگریزوں نے ایک رسالہ پر اشتباہ کر کے اُسی رات اُن سے ہتھیار رکھوا لیے اور اُن کی جگہ خیر خواہان بلا اشتباہ کا ایک نیا رسالہ مرتب کیا اور ان کے سواروں کو سکھا دیا کہ تم لوگ بے دھڑک دین دین کہتے ہوئے باغیوں کے سنٹر میں گھسے چلے جاؤ! باغی لوگ اس دھوکے میں آ گئے اور انھوں نے اس مصنوعی رسالہ کو اپنے سنٹر میں آنے دیا جب وہ لوگ سنٹر میں داخل ہو گئے تو انھوں نے اپنے ساتھ کی ساری توپوں پر بتی رکھ دی یہاں توپوں پر بتّی کا دکھنا تھا کہ ادھر کے کئی ہزار آدمی جو توپوں کی زد میں تھے ہلاک ہوئے اور پھر بھاگڑ مچی اگر انگریز تعاقب کرتے ہوئے چلے آئیں تو اسی روز دہلی فتح ہو جاتی بیچ کے مورچے والوں نے ملی پور والوں کو بھاگتا دیکھ کر کچھ مقابلہ نہیں کیا لیکن انگریزوں نے از خود یا یں خیال کہ شہر میں باغی بھرے ہوئے ہیں چھاؤنی میں ڈیرے ڈال دیئے ورنہ بلا مزاحمت قلعہ پر قبضہ کر سکتے تھے یہاں ان کو کوئی روکنے والا نہ تھا اب طرفین سے گولہ باری شروع ہوئی، دن کے وقت نہ تو

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۲۲

زخمی ہوئے۔ وہ بڑے تیز و تند شمشیر باز سپاہی اور شہ سوار تھے لیکن وہ پہلے ہی لڑائی میں۔ زخم سے افتادہ ہوئے حالت نزع میں انھوں نے اپنی موٹی زبان سے یہ رومیوں کی ضرب المثل کہی کہ وہ اچھی شیریں اور مناسب موت ہے جو اپنے ملک کی حمایت کے لیے جان دینے میں آئے۔ (۱)

• باغی مرتے تھے لیکن لڑنے سے جی نہیں چراتے تھے

• سبزی منڈی پر انگریزوں کا قبضہ

۲۳ جون۔ جاسوس خبر لائے کہ ایک دوسرا حملہ انگریزی کیمپ کے عقب میں ہوگا حملہ کی تاریخ ۲۳ جون مقرر کی گئی تھی۔ جنگ پلاسی پر ایک صدی اسی تاریخ پر ختم ہوئی تھی۔ تمام ہندوستان میں یہ پیشن گوئی پھیل رہی تھی کہ انگریزی راج سو برس بعد ختم ہو جائے گا۔ جوتشیوں نے کہا کہ باغیوں کو ضرور فتح ہوگی۔ شہر کی فصیل پر سے بڑی دہشت ناک توپ زنی شروع ہوئی اور اس وقت باغیوں نے انگریزی لشکر کے دائیں طرف بڑھنا شروع کیا اور ہندو راؤ کی کوٹھی کی پہاڑی پر، سخت توپ زنی شروع کی۔ انگریزوں کے پاس تھوڑی توپیں تھیں وہ باغیوں کی توپوں کو بند نہیں کر سکتے تھے۔ دلاور میجر ریڈ نے باغیوں کی تعریف میں لکھا ہے کہ ان سے زیادہ بہتر سپاہی نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بار بار حملہ کیا اور ایک وقت مجھے یہ خیال ہوا کہ مجھے شکست ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کمک آگئی اور سبزی منڈی سے باغیوں کے نکالنے کے لیے کوشش کی گئی۔ جس کی تنگ گلیوں اور کچی دیواروں اور احاطوں اور مکانوں کی چھپی چھتوں نے پیادوں کو خوب پناہ دی اور انگریزی سپاہ نے جو پیشقدمی کی اس پر دیواروں اور چھتوں سے باغیوں نے گولیوں کا مینہ برسایا۔ دشمنوں کی گولیوں اور سورج کی کرنوں کی تیزی سے سپاہ جلدی جلدی افتاں و خیزاں اور زخمی ہوئی تھی۔ انگریزی سپاہ سبزی منڈی میں ان کے پیچھے تین دفعہ گئی۔

---

(۱) تمدن عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۷۹

باغی گھروں میں دروازے بند کر کے گھس گئے اور جب انگریز سپاہی پہنچے تو باہر نکل آئے اور گولیاں برسانی شروع کیں ـــــ اور سکھ جو تیس میل سفر کر کے آج صبح آئے تھے وہ دشمنوں کے حملہ روکنے کے لیے بلائے گئے۔ ان گرمی کے دنوں میں سارے دن لڑائی رہی۔ شام کو وہ ختم ہوئی باغی شہر کے اندر چلے گئے ایک ہزار آدمی مارے گئے ہوں گے۔ ایک احاطہ میں ڈیڑھ سو مردے ان کے پڑے ہوئے تھے۔ اب سبزی منڈی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا (۱)

سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا

الحاق پنجاب اور انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد سکھوں کا ردِ عمل یہ ہوا کہ وہ دل و جان سے، انگریزوں کے معتقد اور جاں نثار بن گئے، حتیٰ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مہارانی تک کے مقابلہ میں وہ انگریزوں کا ساتھ دینے لگے۔

" بڑا خوف یہ تھا کہ سکھ جو خزانہ کے محافظ ہیں جہاں ان کی جلاوطن مہارانی کے جواہر و زیورات رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کچہری کی عمارت میں آگ نہ لگادیں اور عیسائیوں پر جہاں وہ ملیں ان پر حملہ کرنے لگیں،

لیکن ایک سکھ سردار سورت سنگھ نے اس مصیبت کے وقت میں انگریزوں کی بڑی خدمت گذاری کی سکھوں کی دوسری لڑائی کے بعد اس سردار کو حکم ہوا تھا کہ وہ بنارس میں رہا کرے۔ جس کے سبب وہ سرکار کا بڑا شکر گزار تھا۔ اس کو گبنس صاحب پر بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا وہ صاحب کے ساتھ کچہری میں دونالی بندوق کندھے پر دھرے ہوئے کچہری میں جاتا تھا سکھ سپاہیوں کو جو غصہ آرہا تھا انکو وہ اپنے سمجھانے سے دھیما کرتا تھا اور ان کے دلوں میں جو اپنے بھائی بندوں کے انتقام کا جوش اٹھتا تھا۔ اسے دباتا تھا، غرض اس کے سمجھانے سے سکھوں نے سرکاری خزانہ اور لاہور کے جواہر یورپین کے حوالہ کیے کہ وہ اپنے محافظت کے مقام پر لیے جائیں۔

---

(۱) تاریخِ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۵۶۳

معزز مشہور برہمن پنڈت گوکل چند نے اپنے تمام اثر و رعب داب کا وزن انگریزوں کی خیرخواہی کی، ترازو کے پلڑے میں چڑھادیا۔ وہ جج کی عدالت کا ناظر تھا، گبنس صاحب کے پاس بہت آتا جاتا تھا۔ اگر وہ عیسائی بھی ہوتا تو رات دن برابر انگریزوں کی اعانت ایسی متواتر نہیں کرتا جیسی اس نے پنڈت ہونے کی حالت میں کی۔

ایک اور خیرخواہ بڑے دولت مند صاحب حکومت دیوان نرائن سنگھ تھے وہ برٹش گورنمنٹ کے بڑے خیرخواہ و فرماں بردار بڑے عاقل روشن ضمیر فیاض صاحب مروت و فتوت تھے۔ انھوں نے اہل شہر کو انگریزوں سے برگشتہ نہیں ہونے دیا۔ ان کی خدمات کا خواہ کسی الفاظ میں بیان کیا جائے مبالغہ نہیں ہوگا۔ (۱)

نواب دوجانہ کیسے بچے؟

اس فیصلہ کن دور میں، وہ لوگ جو بہت کچھ کر سکتے تھے اپنی غیر جانبداری پر ناز کرتے رہے:

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت نواب محمد حسین علی خاں صاحب ریاست دوجانہ کے حکمران تھے ان کے پوتے یعنی موجودہ نواب صاحب کا بیان ہے کہ اس نازک وقت میں نواب محمد حسن علی خاں صاحب کا سرکار کی امداد و اعانت سے بے پروائی برتنا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ گورنمنٹ انگلشیہ کے کچھ بدخواہ تھے بلکہ بات یہ ہے کہ وہ اپنے بے حد لحیم و شحیم ہونے کے سبب معذور تھے چنانچہ گو انھوں نے انگریزی سرکار کی امداد دینے میں خود کچھ کوشش نہیں کی اور نہ کسی طرح کی کمک دی لیکن اسی کے ساتھ وہ سرکار کے برخلاف کبھی کسی کو کوئی امداد وغیرہ دینے کے مرتکب نہیں ہوئے اور اسی وجہ سے ان کی ریاست کا وہ حال نہ ہوا جو جھجر اور بہادر گڑھ کا ہوا ہے، نواب محمد حسن علیخان صاحب کے جانشین نواب محمد سعادت علیخاں صاحب ہوئے اور ۱۲ سال تک حکمران رہے۔ (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صہ ۴۹

(۲) تذکرہ رؤسائے پنجاب۔ جلد دوم، صہ ۵۰۹

دِلّی کے من چلے تماشائی

اگرچہ انگریزوں کی یورش مہلک صورت اختیار کر چکی تھی لیکن دلی کے من چلے، ہمت کے ساتھ بدترین حالات کا مقابلہ کرتے تھے، وہ ذرا بھی ہراساں اور دہشت زدہ نہ تھے:

شہر پر جب اول اول پہاڑی پر سے گولے آنے شروع ہوئے، تو شہر کے پورے آدمیوں کو دست آنے شروع ہو گئے۔ مگر چند روز میں گولوں کے ایسے عادی ہو گئے کہ پہاڑی پر جب گولے چھوٹنے کی روشنی معلوم ہوتی تو اس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ کے یہ کہتے کہ یہ آیا وہ آیا اور ایسے خوش ہوتے کہ جیسے بچے شبرات کے پٹاخے کے چھوڑنے سے۔ شہر پر گولے کا اثر اس سبب سے کچھ نہیں ہوتا تھا کہ اس میں دو باغ بڑے بڑے تھے اور چوڑی چوڑی سڑکیں بہت تھیں۔ چند مکانات کے صحن وسیع تھے۔ اکثر گولے خالی جگہ پر آن کر پڑتے تھے جہاں نہ آدمی ہوتا تھا نہ مکان۔ سیکڑوں گولوں نے شاید دس بیس عورتوں بچوں کو مارا ہو یا زخمی کیا ہو۔ اور دو چار مکانوں کی دیواروں اور چھتوں کو کچھ صدمہ پہنچایا ہو۔ شہر کی فصیل پہ اگر گولوں کے اثر کو دیکھیے، تو وہ بہت خفیف معلوم ہوتا ہے۔

موری دروازہ کا گرگج گر کے آدھا ڈھیر ہوا۔ کشمیری دروازہ کی فصیل میں دو شگاف پڑے جن میں سے انگریزی لشکر داخل ہوا۔ فصیل کہیں کہیں سے کھکھری ہوئی ہیں۔ دہلی کا تو یہ اعتقاد ہی اٹھ گیا کہ کوئی شہر یا قلعہ گولوں سے مسمار ہوتا ہے۔ (۱)

باغیوں نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے

بے خبری کے عالم میں بھی اگر انگریز حملہ آور ہوتے تھے، تو باغی نقصان اٹھانے کے باوجود اس وقت تک دم نہیں لیتے تھے جب تک حریف کو بھی مزا نہ چکھا دیں:

---

(۱) تاریخِ عروجِ عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۰۱

ساتویں تاریخ غنیم کے کارتوسوں کا کارخانہ اڑ گیا جس سے بہت سی جانیں تلف ہوئیں اور شہر میں ہل چل مچ گئی اُسی دن بریگیڈیر جان نکلسن جو پنجاب کی فوج کے کمانڈر تھے اپنی فوج کے آنے سے پیشتر ہی ڈاک کی شکرم سے آن پہنچے، آتے ہی انھوں نے چوطرف پھر کر موقع حالت کو بغور دیکھ داکھ گیارہویں کو اپنی فوج میں پلٹ گئے غنیم کو چین نہ تھا کچھ نہ کچھ سلسلہ چلا ہی جاتا تھا۔ آٹھویں کو مٹکاف ہوس کے بکٹ پر گولہ باری شروع کر دی اور روزانہ یہی سلسلہ جاری رہا جو ناقابل برداشت تھا اب جنرل صاحب نے جب یہ حالت دیکھی تو بلا انتظار کے مزید کارروائی شروع کر دی بارہویں تاریخ کو پو پھٹتی ہی لڈلو کیسل کے پاس جو دشمن پڑے بے خبر سو رہے تھے ان کو دڑبڑا لیا اور بہتوں کو تہ تیغ کر کے چار توپیں چھین لیں لیکن خالی خولی نہیں ادھر سے بھی سو آدمی کام آئے، باایں ہمہ دشمن کی ہمت ذرا بھی پست نہ ہوئی شام ہوتے ہی بانوں کی بوچھاڑ شروع کی اور ساری رات گولیاں مارتے اور مٹکاف ہوس کے بکٹ کو پریشان کرتے رہے غرض یہ حالت ایک ہفتہ تک رہی تب کہیں تیرھویں کی صبح کو جا کر اُن کا ہاتھ رکا ایک ہفتہ بعد دشمن نے دریا پار بھاری بھاری توپوں کا توپ خانہ جمایا جو ادھر کی توپوں کی زد سے بالکل محفوظ تھا۔ (۱)

موت بھی مجاہدوں کو نہ ڈرا سکی

اب انگریزوں کے حملوں میں کافی شدت آگئی تھی، انھیں ہر طرف سے کمک مل رہی تھی، اور باغیوں کے رسائل و ذرائع دم توڑ رہے تھے پھر بھی:

"پانچ روز بعد ۱۴ جولائی ایک بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ صبح کو باغیوں نے فصیل پر سے توپیں خوب چلائیں اور ان کا ایک بڑا انبوہ شہر سے باہر نکلا اور سویرے ہی سے ہندو راؤ اور سبزی منڈی کے مورچوں پر یورش کی اور گھنٹوں تک ان پر گولیوں کا متواتر مینھ برسایا پہاڑی پر جو آتش باری ان پر

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول صد ۱۹۶

ہوئی تو اس سے وہ پرے نہیں ہٹے ۔ تین بجے بریگیڈیر شاورس صاحب سبزی منڈی میں مورچوں سے باہر ایک کالم لے کر باغیوں کے بھگانے کے لیے آئے ۔ ان کے کالم میں چھ گھڑ چڑھی توپیں میجر ٹرنر اور کپتان منی کے تحت اور میجر جیکب کے ماتحت اور پہلی پنجاب پیدل پلٹن میجر کوک کے ماتحت اور گائیڈ کے سوار اور ہوڈسن کے سوار کوہاٹ کا رسالہ یہ سب تھے ۔ بریگیڈیر چیمبرلین اس کالم کے ہمراہ تھے ۔ ایک دیوار کے پاس آئے جس پر باغیوں کی صف کھڑی ہوئی تھی

ہوڈسن صاحب معہ گائڈس اور گورکھوں کی سپاہ کے بڑی سڑک پر آئے جو سیدھی دہلی کے دروازے پر جاتی ہے ۔ ہوڈسن صاحب نے باغیوں کو فصیل تک بھگایا ۔ چھ سو گز فصیل رہ گئی تھی اور پھر سپاہ کو واپس چلے آنے کا حکم دیا گیا ۔ یہ کام جلدی سے توپخانوں نے کیا کچھ اس میں بے ترتیبی ہوئی سپاہ نے واپس جانے میں بہت جلدی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں کے پیادوں اور سواروں نے پیچھے سے حملہ کیا ۔ ہوڈسن صاحب اپنے سواروں سمیت سامنے کھڑے رہے اور گائیڈ کے پیدلوں کو لے کر حملہ کیا ۔ گرلوائل صاحب اور میجر جیکب ان کی کمک کے لیے پراگندہ سپاہیوں کو جمع کر کے لائے ۔ باغیوں کے سواروں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا ۔ ہوڈسن کے حکم سے ان کی تھوڑی سی سپاہ نے فیر کیے لیکن انکے پاؤں نہ جمے پراگندہ ہو کر بھاگے اور اپنی توپیں چھوڑ گئے ہوڈسن صاحب نے ان توپوں کے لینے میں کوشش کی وہ توپوں سے تیس قدم کے فاصلہ پر تھے ۔ پچیس مستقل سپاہی توپیں لینے کے لیے کافی تھے ۔ مگر سپاہ کثیر کے سامنے جانے کی جرأت نہ ہوتی ساری سپاہ الٹی چلی گئی تھی ان کی کمک کے لیے بھی کوئی نہ تھا ۔ ہوڈسن صاحب آٹھ سواروں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمع رہے کچھ افسروں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی کہ دفعتہً دو باغی روشن فلیتے ہاتھوں میں لیے اپنی توپوں کے پاس آئے جن میں گراپ بھرے ہوئے تھے اور انکو ہوڈسن صاحب کی سپاہ کے چہروں طرف چھوڑا جب دھواں صاف ہو گیا تو ہوڈسن صاحب نے دیکھا کہ باغی اپنی توپوں کو لے گئے ۔

انگریزوں کا نقصان یہ ہوا کہ پندرہ سپاہی اور دو گھوڑے مارے گئے اور سولہ افسر اور

ایک سو ستتر سپاہی اور گھوڑے زخمی ہوئے اور دو سپاہی گم۔

زخمیوں میں چیمبرلین صاحب کے شانہ میں گولی لگی تھی اور روبرٹس صاحب کے (جو پیچھے لارڈ روبرٹس ہوئے تھے۔) بلکا زخم لگا باغیوں کے نقصان کا ہزار آدمیوں کا تخمینہ کیا گیا ہے گھنٹوں تک چھکڑوں میں باغیوں کی لاشیں شہر کو جاتی ہوئی انگریزوں نے دیکھیں، ایک پرانا مندر تھا جس کا نام انگریزوں نے سمی ہاؤس رکھا تھا وہ پہاڑی کی ڈھلان پر شہر کی طرف ۹۰۰ گز کے فاصلہ پر موری دروازہ سے تھا اور وہ کچھ وقت تک انگریزوں کے قبضہ میں رہا تھا۔ وہاں سخت لڑائی ہوئی وہاں گائیڈس کے پیادے تھے جنھوں نے باغیوں کی کسی کوشش کو مندر کے لینے میں چلنے نہیں دیا۔ صبح کو باغیوں کے اسّی مردے وہاں پڑے ہوئے گئے گئے۔ (۱)

عشق از یں بسیار کردست و کند

"جنگ کی ہولناکیاں بھی، زندگی کی رعنائیوں پر اثر انداز نہیں ہوتیں جنگ بھی جاری تھی، خوں ریزیاں بھی ہو رہی تھیں، اور کیوپڈ اپنے تیر بھی پھینک رہا تھا،

"خورجہ سے سولہ میل پر ایک گاؤں میں ایک میم سیتاپور سے ایک سوار کے ساتھ چلی آئی تھی اور اس سے نکاح پڑھالیا تھا لفٹننٹ روبرٹس صاحب کو مخبر نے اس کی خبر دی وہ اس کے پاس دوڑے گئے میم سے ملے جس کی عمر سولہ برس کی ہوگی اُس نے کہا میں اپنے حال میں خوش ہوں اس لیے صاحب اس کو چھوڑ کر کیمپ میں واپس آ گئے۔ (۲)

بہادر شاہ انگریزوں کا قتل نہیں چاہتے تھے

خوں ریزیوں کے اس دور میں بھی بہادر شاہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز بے تحاشہ قتل ہوں:

---

(۱) تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۰۱

(۲) تاریخ ہندوستان سوم بغاوتِ ہند (ذکاء اللہ) ص۳

شام کے قریب باغی لوگ ساٹھ کے قریب انگریز عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لائے اور قیدیوں کی طرح بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا سخت گناہ ہے۔ ان کو قلعہ کے جیل خانے میں نہایت آرام سے رکھا جائے اور ان کے کھانے پینے کی پوری طرح خبر داری کی جائے۔ یہ لوگ ایک شبانہ روز قید میں رہے۔ تیسرے روز تلنگوں نے ان کو قتل کرنے کے واسطے طلب کیا۔ بادشاہ نے ہر چند ان کے قتل سے روکا، لیکن ان تنگ دلوں نے ایک نہ سُنی اور ان سب کو نکال کر قلعہ کے نقار خانے کے نیچے کھڑا کر کے گولیوں اور تلواروں سے قتل کر دیا اور ذرا بھی خوفِ خدا نہ کیا۔ لوگ ان کی شقاوت قلبی سے سخت متنفر ہو گئے اور گالیاں دیتے تھے۔ (۱)

جامع مسجد کی حفاظت کے لیے دلیرانہ جنگ

مایوس کن حالات میں بھی، مجاہدین جنگ آزادی مذہب کے جذبہ سے سرشار تھے:

"باوجودیکہ باغی لوگ جا بجا سے زخمی تھے۔ کوچہ میں داخل ہو کر دلیرانہ حملہ کر رہے تھے۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ اس جنگ کا باعث یہ ہے کہ جامع مسجد پر گوروں کا رسالہ بندوقیں لیے بیٹھا تھا۔ جو باغی سپاہی اس طرف سے گزرتا تھا۔ اسے گولی ماری جاتی تھی۔ ان لوگوں کو اس عملدرآمد پر بڑا غصہ آیا اور سب نے مل کر دلیرانہ حملہ کیا۔ مقصد ان کا یہ تھا کہ گوروں کو جامع مسجد سے ہٹا کر خود قابض ہو جائیں۔ (۲)

کمانڈر انچیف بار بار بدلے گئے

انگریزوں نے مقابلہ بڑی مایوسی اور بد دلی کے ساتھ شروع کیا تھا، عام انگریز سپاہیوں اور افسروں سے

---

(۱) تبصرت نامہ گورنمنٹ صہ ۱۴

(۲) خانم انگلیس در باوائے ہندوستان

قطع نظر، خود کمانڈر انچیف صاحب کی یہ حالت تھی کہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، اور سایہ سے بھڑکتے تھے، کلکتہ سے بار بار تاکید ہوتی تھی کہ جنگ شروع کرو اور کمانڈر انچیف صاحب اپنی دور اندیشی کے باعث، ترک و التوا کو ترجیح دیتے تھے،

اس مختصر سی مدت میں یعنی مئی سے، ستمبر تک، کئی کمانڈر انچیف بدلے گئے، لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات، کوئی بھی، مرد میدان بن کر عرصۂ حیات میں آنے کی جرأت نہ کر سکا، یہ ایک دلچسپ ریکارڈ ہے، جسے، ہم ضروری واقعات بیان کر چکنے کے بعد، الگ سے درج کرتے ہیں:

"جنرل اینسن۔ کے دل میں یہ بات آئی کہ ان کے پاس جو سامان جنگ موجود ہے۔ اس سے دہلی پر لشکر کشی کرنی حزم و دانائی سے بعید ہے۔ انھوں نے ۱۷ مئی کو سر جان لارنس کو لکھا کہ آپ اس بات پر غور فرمائیں کہ یہاں فوج تھوڑی ہے۔ میرے نزدیک یہ مناسب نہیں ہے کہ اس قلیل فوج کو دہلی پر لشکر کشی کر کے جان جوکھوں میں ڈالوں۔

میری رائے میں اس مہم کے لیے یہ فوج کی تعداد کافی نہیں البتہ اس میں شک نہیں کہ ہم شہر کی دیواروں کو بھاری توپوں کی مار سے مسمار کر دیں گے اور شہر میں داخل ہونے کے لیے ہمارا مقابلہ کم کیا جائے گا۔ مگر میری رائے میں ایسی قلیل سپاہ ایسے بڑے شہر میں جا کر جس کے ہر کوچہ و ہر بازار میں ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ جس کے ہر کوچہ و برزن کے موڑوں، اور گوشوں میں لوگ ہتھیار لگائے برسر جنگ بیٹھے ہونگے۔

اگر وہاں جا کر چھ سات سو سپاہی مجروح اور مقتول ہو جائیں گے تو پھر کیا باقی رہ جائیں گے؟

جب سارا شہر ہمارا مخالف ہوگا تو کیا ہم اس پر اپنا قبضہ رکھ سکیں گے؟ کیا شہر کے اندر یا باہر ٹھہر سکیں گے؟ ان باتوں پر نظر رکھ کر اب میری رائے یہ ہے کہ ہم اپنی تمام سپاہ اور سامان کو یکجا جمع کریں اور اس میں سے تمام برے سپاہیوں اور سامان کو جو

قابل اعتماد نہ ہوں نکال ڈالیں اور بجائے ان کے قابل اعتماد سپاہ اور سامان داخل کریں، اگرچہ اس کام کو سرانجام دینے میں دیر لگے گی مگر پھر کوئی احتمال ناکامی کا نہ رہے گا۔(۱)

کمانڈر انچیف کی موت یا خودکشی؟

یہ ناکام کمانڈر انچیف بہر حال، نامراد دنیا سے رخصت ہو گیا:

"۲۴ مئی کو این سن صاحب انبالہ سے چلے۔ اور دوسرے دن صبح کو کرنال میں پہنچ گئے ۲۶ مئی کو ان کو ہیضہ ہوا۔ ۲۷ مئی کو مسٹر برنارڈ ڈیڑھ بجے رات کے اپنے دوست سے آخیری الوداع ہونے کے لیے آئے گو این سن صاحب حالت نزع میں تھے مگر انھوں نے اپنے دوست کو پہچان کر نہایت لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا کہ برنارڈ میں کمانڈ تم کو دیتا ہوں۔ خدا تم کو برکت دے، گڈ بائی، دو بج کر پندرہ منٹ پر ان کا دم نکل گیا۔ ان کو یوں انسانوں کی مدح وذم سے فرصت ملی۔ فوراً ان کے مرنے کی خبر دہلی میں، باغیوں کے پاس بھی آگئی، انھوں نے یہ خبر اڑائی کہ وہ زہر کھا کر مرگیا، وہ بڑے بہادر اور سچے اشراف تھے۔ ان کو ناحق یہ الزام لگائے جاتے ہیں کہ انھوں نے تساہل کیا اور تذبذب کی حالت میں رہے۔(۲)

نیا کمانڈر انچیف بھی بزدل نکلا

اب نئے کمانڈر انچیف کی کارگزاریاں ملاحظہ کیجیے!

" جنرل برنارڈ نے ۱۳ جون کو لارڈ کیننگ کو لکھا کہ دہلی بڑا مستحکم مقام ہے میرے پاس سامان اور اسباب کے نہ ہونے کے سبب سے اس پر حملہ کرنا یا بتدریج اس کے نزدیک جانا دونوں برابر ہی مشکل ہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ ناممکن ہیں دفعتہً حملہ کرنے میں جو میرا عین مطلب ہے، جان پر کھیل کر کوئی بات نہیں اٹھا رکھوں گا، اگر میں کامیاب ہوا تو سب طرح بھلائی ہے لیکن اگر اس کے برخلاف ہوا تو ہلاکت ہے، میرے پاس سپاہ کا وہ گروہ جو لڑنے والے لشکر

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص ۷۵۹

(۲) تاریخ عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص ۷۶۴

کے پیچھے چھوڑا جائے کہ ضرورت کے وقت مدد کرے نہیں ہے جسے میں مراجعت کر سکوں ،
یقیناً آپ سب صاحب دہلی کی مشکلات کا تخمینہ کم کرتے ہیں۔ باغیوں کے پاس ۲۴ پینی توپیں
ہر دروازہ اور گرگچوں کے بازوؤں پر لگی ہوئی ہیں وہ ان کو بہت اچھی طرح چھوڑتے ہیں ان میں
سے ایک تو ہماری توپوں کو مارتی ہیں۔ ہمارے پاس صرف چھ بھاری توپیں لگی ہوئی ہیں جو ان کی
توپوں کو بند نہیں کر سکتیں۔ (۱)

فتح، شکست سے زیادہ مہلک ہوتی!

یہ کمانڈر انچیف صاحب توپ و تفنگ سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے تھے جتنی منطق اور دلائل کے اسلحہ سے، ملاحظہ ہو!

مراسلہ نمبر ۳

جسے جنرل سر ہنری برنارڈ کمانڈر انچیف نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۸ر جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

۱۸ر جون ۱۸۵۷ء

مائی ڈیئر بارنس

میں نے ابھی آپ کی چٹھی پڑھی اور اس سے مجھے قدرے اطمینان ہوا اس لیے کہ آپ نے اس تجویز کو پسند کیا کہ میں اپنی مختصر سی فوج کو لے کر دہلی میں داخل ہونے کا خطرناک تجربہ نہ کروں اسی طرح سے کہ میرا کیمپ ہسپتال ذخائر، خزانہ، الغرض میری فوج کا سارا سامان بالکل غیر محفوظ حالت میں پڑا رہ جائے۔ مجھے اقرار ہے کہ جو پولیٹیکل مشیر میرے ساتھ کام کر رہے ہیں ان کی ترغیب دہی سے متاثر ہو کر میں اچانک اور زبردست حملہ کی تجویز پر رضامند ہو گیا تھا جس میں مذکورہ بالا تمام امور کا خطرہ دامنگیر تھا۔ صرف حسن اتفاق سے

---

(۱) تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) ص۵۸۵

یہ تجویز عمل میں آنے سے رُک گئی۔ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہو اس لیے کہ جو کچھ میں نے سنا ہے اور جن اشخاص سے مشورہ کرنا میرے فرض منصبی میں داخل تھا۔ ان کی آراء کا خیال کرنے کے بعد مجھے یہ یقین ہو گیا کہ فتح اتنی ہی مہلک ثابت ہوتی جتنی کہ شکست۔

اگر میرٹھ کی فوج فی الفور دہلی میں گھس جاتی تو سب کچھ بچایا جا سکتا تھا لیکن جب انبالہ والی فوج مقام مقصود پر پہنچی ہے تو موقع بالکل ہاتھ سے نکل چکا تھا،

سب سے بڑا میگزین اور سامان جنگ کا ڈپو اس سے پیشتر سے میرے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا، میرے سپاہی اچھی طرح ہیں اور زخمی خاطر خواہ طریقے سے روبصحت ہو رہے ہیں لیکن سب کے سب اس کام سے تھک گئے ہیں۔ (۱)

یہ کمانڈر انچیف بھی رخصت ہوئے

برنارڈ صاحب سے بھی یہ بوجھ نہ سنبھل سکا، آخر، وہ بار حیات تک سے سبکدوش ہو گئے!

"دوسرے دن صبح کو سر ہنری برنارڈ کو ہیضہ نے آسانی سے اپنی قربانی بنایا ان کا دل اور جسم دونوں رات دن کی محنت سے فرسودہ ہو گئے تھے۔

وہ اس ملک میں اجنبی تھے۔ مشرقی جنگ آرائی سے لاعلم تھے۔ وہ جنرل این سن کی وفات کے بعد اس کام پر مقرر ہوئے کہ ایک اپنے ضعیف لشکر کو ایسے دشمن سے لڑائیں جس کی تعداد دہشت ناک تھی اور سامان حرب بہت کچھ اس کے پاس تھا۔

---

(۱) محاصرۂ دہلی کے خطوط ۱۲

انھوں نے دہلی کے سامنے ایک بڑے استوار اور مستحکم مقام میں انگریزی لشکر گاہ کو مقیم کیا۔ ہفتوں تک یہاں بار بار قوی دشمنوں کے حملہ کرنے میں وہ دلیری اور دلاوری دکھائی کہ دشمنوں کے دلوں میں انگریزی ہیبت جو ضعیف ہوگئی تھی، وہ پھر ایسی پیدا ہوگئی کہ وہ اس سے تھرانے لگے۔ ہندوستان کی اور ہندوستانی جنگ آزمائی کی لاعلمی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی اوپر اعتماد کم رکھیں، اور دوسروں کے صلاح ومشورہ پر اعتماد کریں جس سے وہ بڑے دل فگار ہوئے تھے اور اپنی تدابیر کے موافق فیصلہ نہیں کرتے تھے۔ چاروں طرف سے متواتر تقاضا ہوتا تھا کہ دہلی جلد ختم کرو اور ان کو تسخیر کرنے کے منصوبے جن کا عمل میں آنا ممکن نہ تھا۔ بتائے جاتے تھے۔ جن سے وہ بہت دق ہوتے تھے۔ اور ان کے جسم یا روح کو آرام نہیں ملتا تھا۔ ان کی آواز لڑکھڑانے لگی اور پھر ان کا دم نکل گیا۔

جنرل برنارڈ کی وفات کے بعد ان کی جگہ جنرل ریڈ مقرر ہوئے۔ انھوں نے اول ہی سپہ سالار ہوکر دانشمندانہ کام یہ کیا کہ نہر کے سب پل جو چند میل تک متوازی بڑی سڑک کے تھے سوائے بین ماری پل کے اڑا دیئے۔ اس تدبیر سے شہر میں نہر کا پانی آنا بند ہوگیا۔ مگر اس کا اثر کچھ شہر پر نہ تھا دریا پاس تھا اور صدہا کنویں تھے (۱)

تیسرا کمانڈر انچیف بھی گیا

اب جنرل ریڈ کا تقرر ہوا، لیکن ان سے بھی کچھ نہ ہوسکا، یہ استعفا دے کر، شملہ کی برفانی ہواؤں سے لطف اٹھانے چلے گئے۔

"۱۷؍ جولائی کو جنرل ریڈ نے دہلی کے میدان جنگ کی سپہ سالاری سے استعفا دے دیا وہ کچھ پہلے ہی سے بیمار دہلی میں آئے تھے۔ یہاں کی تھوڑے دنوں کی جوابدہیوں کے روزانہ تردّدات نے ان کی صحت کو بالکل بگاڑ دیا۔ سو انھوں نے اپنے عہدہ کے کام پر بریگیڈیر

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۰۱

آرچ ڈیل ولسن کو سپرد کر دیا اور خود شملہ کو اپنی حفظ صحت کے لیے چلے گئے۔ (۱)

چوتھا کمانڈر انچیف

اب قرعہ فال ولسن صاحب کے نام پڑا، دلی کی فتح انہی کے نام پر مقدر ہو چکی تھی۔

"یہ امر یقینی ہے کہ صاحب ممدوح نے جس وقت دہلی کے میدان جنگ کی سپہ سالاری کا عہدہ لیا ہے، اس میں جن حالتوں کا مقابلہ کرنا ان کو پڑا وہ بڑی ہمت ہرا دینے والی اور دل شکن تھیں۔ پہلے دو سپہ سالاروں کو موت آ چکی تھی اور تیسرا قریب المرگ ہو کر چلا گیا تھا۔ اسٹاف کے چیف ایڈجیوٹنٹ جنرل اور کوارٹر ماسٹر جنرل اپنے خیموں میں زخمی پڑے تھے۔ پانچ ہفتہ سے سپاہ دہلی کے آگے، اپنی محافظت دشمنوں سے کر رہے تھے، وقتاً فوقتاً شہر کو حملہ کر کے لینے کے منصوبے باندھے جاتے اور ملتوی کیے جاتے تھے اور آخر کو یہ ارادہ ترک کر دیا گیا ان پانچ ہفتوں میں دشمنوں نے بیس دفعہ حملہ کیا اور مدت سے یہ بات مان لی گئی تھی کہ انگلش محاصرین نہیں ہیں بلکہ خود محصور ہیں یہ ناممکن تھا کہ یہ تمام باتیں سپاہ کے ڈسپلن پر اثر نہ کرتیں۔ باغیوں کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی تھی گو ان کا نقصان انگریزوں کی نسبت زیادہ ہوتا تھا۔ (۲)

لارڈ کیننگ کی طرف سے مذمت

پہلے کمانڈر انچیف سے وائسرائے لارڈ کیننگ اتنے خفا تھے کہ انھیں کہنا پڑا، !

"لارڈ کیننگ نے لکھا ہے کہ میں جنرل این سن کی چھٹیوں سے اخذ کرتا ہوں کہ زیادہ

---

(۱) تاریخ عروج انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۰۷

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۰۰

تاخیر ہونے کے اسباب یہ تھے کہ محاصرہ کا توپخانہ نہ تھا اور یورپین سپاہیوں کے لیے گاڑیاں اور سواریاں نہ تھیں میں یقین کرتا ہوں کہ محاصرہ کے توپخانہ کے نہ ہونے کے سبب سے التوا کرنا نادانی تھی وہ دہلی کی سرکوبی آسانی سے کر سکتے تھے لیکن میں یہ نہیں یقین کرتا کہ اگر محاصرہ کا توپخانہ نہ ہوتا تو ہم کو شکست ہو جاتی بس اس طرح وقت کے ضائع ہونے سے بے شک ہم کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔ (۱)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۰۲

باب ۲۹

غدر کا تیسرا دور شکست

غدر کا تیسرا دور، شکست پر ختم ہوتا ہے

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کوئی وجہ نہیں تھی کہ باغی ناکام ہوتے، لیکن وہ ناکام ہوئے، اس لیے کہ ان کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ کسی نے ان کی رفاقت نہ کی۔ کسی نے اُن سے تعاون نہ کیا ان باغیوں میں ایک معقول تعداد ایسے لوگوں کی تھی، جو موقع پرست تھے، لیکن ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں پر بھی مشتمل تھی جو دل سے یہ جنگ لڑ رہے تھے جو مخلص تھے جو وطن کو اغیار کے تسلط سے آزاد کرنا چاہتے تھے، جو فرنگی استعمار کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے، جو کسی قیمت پر بھی غلامی کی زندگی پر قانع نہیں تھے، جو مسلمانوں کو سربلند اور سرفراز دیکھنا چاہتے تھے، جو اپنی ملت کی عظمت رفتہ کا دیدار پھر سے کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اِن کا جذبہ اخلاص ان کا جوشِ جہاد، اِن کی نیت صالح، اِن کی ہمت رفیع ان کا عزم بلند بام، کام نہ آیا، یہ ناکام ہوئے، انھیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

کیوں ــــ؟ اس لیے کہ ان کی قوم نے ان کا ساتھ نہیں دیا، انکے ملک نے ان سے تعاون نہیں کیا ان کے والیانِ ریاست انگریزوں سے سازباز کرتے رہے ان کے امراء اور رؤسا، فرنگیوں پر جان و مال قربان کرتے رہے، ان کے شریف و نجیب انگریزوں کی جاں نثاری اور مددگاری پر فخر کرتے رہے انکے رہنما اور قائد اپنے حلوے مانڈا کی فکر کرتے رہے، انھیں پکارا گیا لیکن انھوں نے سنی اَن سنی کر دی انھیں جھنجھوڑا گیا لیکن نے خوابِ خرگوش سے
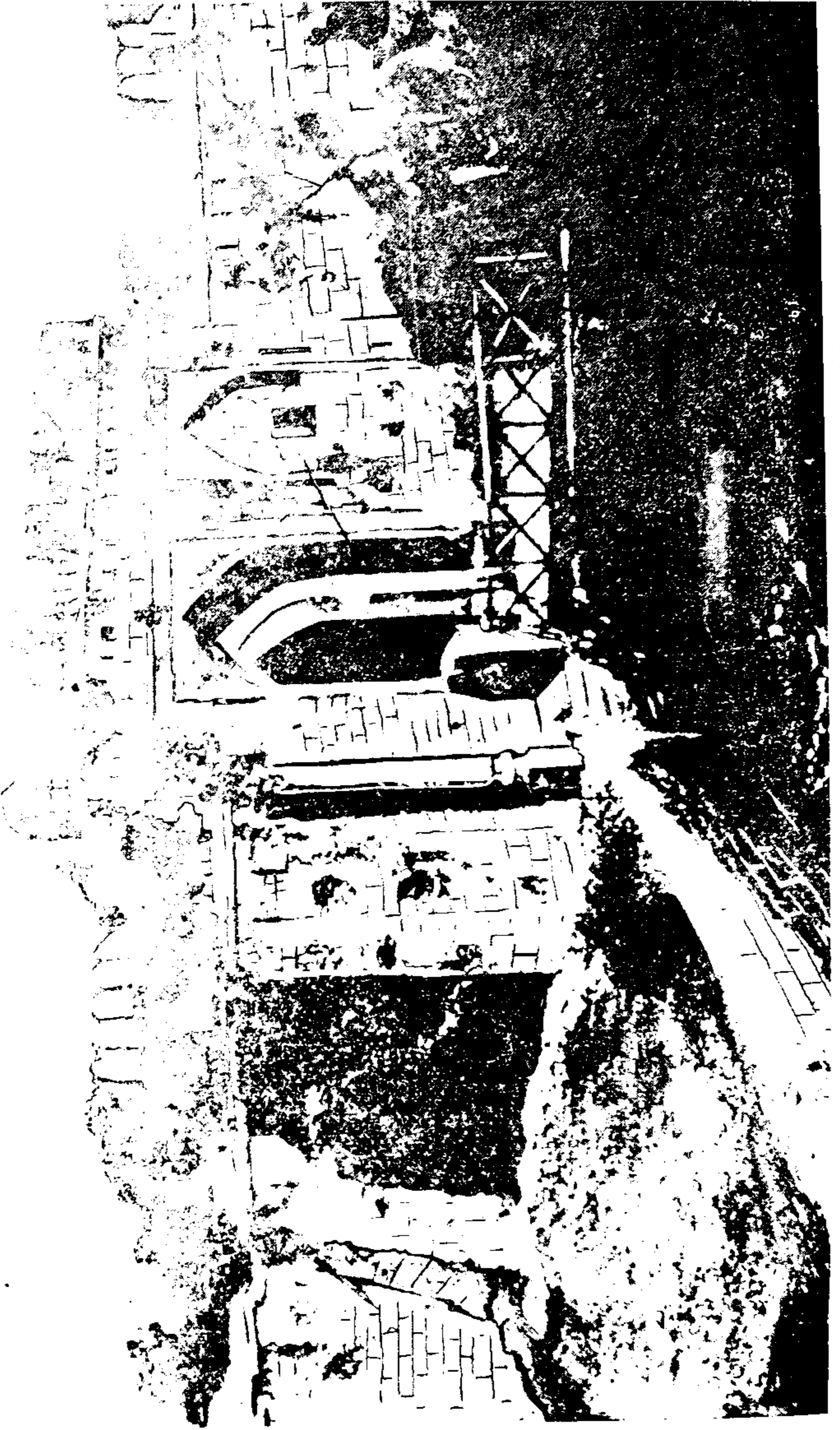
دہلی کا کشمیری دروازہ ۔ انگریزوں اور جنگِ آزادی کے سپاہیوں میں یہاں خوں ریز اور فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔

مفارقت گوارا نہ کی۔ انھیں دین و مذہب اور قوم و ملت اور ملک و وطن کا واسطہ دیا لیکن انھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ انھیں غلامی کی لعنتوں اور آزادی کی نعمتوں سے خبردار اور متنبہ کیا گیا لیکن انھوں نے آزادی کی نعمت ٹھکرادی اور غلامی کی زندگی قبول کر لی۔ انھوں نے اپنی جان بچالی اور آنے والی نسلوں کی نوع فروخت کر دی ؎

ارزاں فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس عنوان کے ماتحت اب ہم ضروری اور اہم واقعات ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔

ہندوستان کس طرح بچا؟

قبل اس کے کہ شکست و ہزیمت کی داستان شروع کی جائے ضروری ہے کہ یہ بتا دیا جائے ہندوستان کس طرح اسیر دام ہوا۔

باغیوں نے پوری سرعت کے ساتھ اتنی بے پناہ یورش کی تھی کہ انگریزوں کے حواس غائب ہو گئے تھے انھیں خود اپنی شکست اور ناکامی کا یقین ہو گیا تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر، دلی کے غدر کی بروقت اطلاع پنجاب کے فوجی افسروں اور کمانڈر انچیف کو نہ پہنچ جاتی تو پھر غدر کی آگ پنجاب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور انگریزوں کو اس صوبہ سے کسی طرح کی مدد نہ مل سکتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکا۔

کلکتہ دروازے سے نصف میل کے فاصلہ پر جو دلی کا قدیم ڈاک بنگلہ تھا۔ اس میں صدر تار گھر تھا اس کے سامنے ایک ستون ان عہدے داران محکمہ تار کی یادگار میں کھڑا کیا گیا ہے جو غدر میں کام آئے اور جس سے ان کی اور نیز ان دو کم عمر سگنلروں کی یاد تازہ کرنا مقصد ہے جو اس معرکۂ عظیم میں جبکہ موت کے سامنے کھڑے تھے، ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ اور انبالہ کو وہ مشہور پیغام تار برقی دوڑایا جس کی بدولت ملک پنجاب بال بال بچ گیا۔ تختی کے سامنے جو عبارت درج ہے اس کا ترجمہ یہ ذیل ہے۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کے ہولناک دن دونوں جوان سگنلر ولیم بریڈش اور جے ڈبلیو پلنکٹ جب تک ان کو چلے جانے کا حکم نہیں دیا گیا، اس وقت تک اپنی ڈیوٹی پر مستعد رہے۔ دہلی میں جو

کچھ گذر رہا تھا، ان واقعات کی اطلاع بذریعہ تار انبالہ کو دینے سے انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کی انمول خدمت گزاری کی۔ سر رابرٹ منٹگمری کے الفاظ میں

"اس تار برقی نے ہندوستان کو بچا لیا"

تار کی نقل

Date 11th May 1857.

We must leava office, all the bunglows are being bunit down by the sepoys of Meerut. They came in this morning. We are off don't roll to day. Mr. C. Todd is dead. We think he went out this morning and has not returned yet. We heard tbat nine Europeans were killed.

Good bye.

ترجمہ

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہمیں دفتر چھوڑنا پڑ رہا ہے، میرٹھ کے سپاہی سارے بنگلے جلا رہے ہیں۔ یہ لوگ آج صبح یہاں پہنچے، ہم جا رہے ہیں، آج گھنٹی نہ بجانا ہمارا خیال ہے کہ مسٹر سی ٹاڈ مر گئے، کیونکہ آج صبح باہر گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے ہم نے سنا ہے کہ نو یورپین قتل کر دیئے گئے

اچھا رخصت!

یہ تار دہلی سے انبالہ گیا، اسی دن دوپہر کے بعد اس کی ایک نقل میجر جنرل سر ایچ برنارڈ سی بی، کمانڈنگ آفیسر ضلع سرہند کو بھیجی گئی، انھوں نے ڈاک سے اس کی نقل سر ہنری لارنس چیف کمشنر کو جو اتفاق سے چند دنوں کے لیے راولپنڈی آئے ہوئے تھے، اور ایک نقل جنرل کمانڈنگ انچیف شملہ کو بھیجی، یہ تار تمام فوجی اسٹیشنوں کو بھیجا گیا، اور جو نقل سر جان لارنس کو پہنچی تھی وہ اب تک سکریٹریٹ کے دفتر میں محفوظ ہے :

ڈبلیو برنڈش یکم ستمبر ۱۸۹۶ء میں پنشن لے کر سبکدوش ہوئے، جے ڈبلیو پلکنگٹن کو باغیوں نے قید کر لیا، لیکن نکل بھاگے، رنڈ کی میں ۲۴ مارچ ۱۸۶۶ء کو وفات پائی ۱؎

حملہ آور لشکر

اس بروقت اطلاع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے جنگ و پیکار کی تیاریاں شروع کر دیں، پنجاب کو چونکہ انھوں نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اس لیے یہاں سے انھیں بہت کافی مدد ملی اور اس بروقت مدد سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ایک لشکر گراں دہلی فتح کرنے کے لیے تیار کر لیا جس کی تفصیل یہ ہے :-

حملہ کرنے والے پیدلوں کی سپاہ کے پانچ کالم تھے، اول کالم بریگیڈیر نکلسن کے ماتحت تھا جس کی تفصیل یہ ہے :

ملکہ معظمہ کی ۷۵ نمبر رجمنٹ	۳۰۰ سپاہی
اول بنگال یورپین فیوزلیر	۲۵۰ سپاہی
دوسری پنجاب پیدل	۴۵۰ سپاہی
	۱۰۰۰

اس کالم کا کام یہ تھا کہ کشمیری دروازہ کے گرد گنج پہ اور شگاف پر حملہ کرے۔

دوسرا کالم بریگیڈیر جونس صاحب کے ماتحت تھا جس میں سپاہ بہ تفصیل ذیل تھی :-

نمبر ۸ ملکہ معظمہ کی رجمنٹ	۲۵۰ سپاہی
دوسری بنگال یورپین فیوزیلر	۲۵۰ سپاہی

۱؎ : دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۲۲ ؛

نمبر ۴ سکھ رجمنٹ پیدل	۲۵۰ سپاہی
	۸۵۰ سپاہی

دریا کی طرف گڑ گنج کی دڑاڑ پر حملہ کرنے کا کام اس کے سپرد تھا
تیسرا کالم کرنل کمپبل کے ماتحت تھا جس میں سپاہ بہ تفصیل ذیل تھی :۔

نمبر ۲۵ رجمنٹ لائٹ انفنٹری	۲۰۰ سپاہی
کماؤں کی پلٹن گورکھوں کی	۲۵۰ سپاہی
پہلی پنجاب رجمنٹ پیدل	۵۰۰ سپاہی
	۹۵۰

اس کا کام یہ تھا کہ جب کشمیری دروازہ اڑا دیا جائے تو وہ حملہ کرے ، چوتھا کالم ماتحت ریڈ صاحب کے تھا ، کل سپاہی ۸۶۰ اور ۱۲۰۰ کشمیری کنٹونمنٹ کے سپاہی تھے اس کا کام یہ تھا کہ کشن گنج اور پہاڑ گنج کے حوالی پر حملہ کرے اور کابلی دروازہ میں داخل ہونے کے بعد حملہ عظیم کرے
پانچواں کالم بریگیڈیر لونگ فیلڈ کے ماتحت تھا

ملکہ معظمہ نمبر ۶۱ رجمنٹ	۲۵۰ سپاہی
چوتھی پنجاب پیدل	۴۵۰ سپاہی
بلوچ پلٹن	۳۰۰ سپاہی
	۱۰۰۰

جیند کنٹونمنٹ کے ۳۰۰ سپاہی اس کے ساتھ ، ان کے سوار اور ملکہ معظمہ کی رجمنٹ نمبر ۶۰ کے دو سو سپاہی نکلسن کے کام کی پیش قدمی کے حامی رہیں اور حملہ ہونے کے بعد وہ ان دستوں سے مل جائیں
ان پانچ کالموں میں پانچ ہزار سپاہی تھے ۔[۱]

انگریز پھر ڈر گئے

اگرچہ انگریزوں کی تیاریاں کافی حد تک اطمینان بخش تھیں پھر بھی وہ بار بار صلاح و مشورہ کرتے تھے ، اور نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ ۱۰

---

[۱] : تاریخ عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۴۳ ؛

ارادے باندھتے تھے باندھ کر پھر توڑ دیتے تھے
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

چنانچہ جنرل نے سب باتوں پر خیال کر کے یہ رائے دی کہ کافی سپاہ کا انتظار کیا جائے۔

اس کونسل میں ممبران کونسل کی رائے دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ شہر پر دفعتہً حملہ کرنے کا ارادہ موقوف کیا گیا۔ اور ۱۰ رجون کو سر جان لارنس کو برنارڈ صاحب نے ایک چٹھی لکھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے پولیٹکل مشیروں کی صلاح اور مشورہ سے شہر پر حملہ کرنے کو میں نے منظور کیا تھا، مگر مشیت ایزدی سے ایسے اتفاقات وقوع میں آئے کہ حملہ نہیں کیا گیا[1]۔

وفادار سپاہیوں سے شرمناک سلوک

ایک طرف تو یہ کیفیت تھی کہ قدم قدم پر ہندوستانیوں کی امداد اور تعاون کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، دوسری طرف یہ حال تھا کہ سرکش اور باغی سپاہیوں کو چھوڑ کر مطیع اور وفادار سپاہیوں تک سے حد درجہ شرمناک اور ذلیل برتاؤ کرتے تھے، اور ذرا نہیں شرماتے تھے۔

جب سحر کی تاریکی دور ہوئی اور دن کی روشنی چمکی بریگیڈ پریڈ کی زمین پر جمع ہوا کوئی نئی بات سوائے اس کے پریڈ پر نہ تھی کہ مونٹ گومری صاحب اور رابرٹس صاحب گھوڑوں پر سوار موجود تھے، سپاہیوں کو جو حکم دیا گیا، اس کی انھوں نے اطاعت کی، رجمنٹیں پیوستہ صف بستہ کھڑی کی گئیں، توپ خانہ اور ۸۱ ویں گورا رجمنٹ کے سپاہی ڈھائی سو سے زیادہ نہ تھے، وہ سواروں کے رسالہ کے جو بائیں طرف تھا، دائیں طرف تھے اور ہندوستانی رجمنٹیں قلب میں تھیں گورے کالوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے سیاہ خطوں کے درمیان سفید نقطے کہیں کہیں لگا دیئے جائیں۔ ہر سپاہ کے سر سے پر باواز بلند گورنمنٹ کا حکم بارک پور کی پلٹن سے ہتھیار لینے کا پڑھا گیا اس کے بعد اصل کام شروع ہوا ہندوستانی اور گوروں کی رجمنٹوں کو ایسا حکم دیا گیا کہ وہ دونوں آمنے سامنے آ گئیں، ان کے پیچھے

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۵۵۰۔

گورے توپوں کو بھر رہے تھے، جو ہندوستانی رجمنٹوں کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

۲۶ ویں رجمنٹ کے ایڈجوٹنٹ جو ہندوستانی زبان خوب بول سکتے ہیں سپاہیوں کی طرف یوں مخاطب ہوئے کہ بغاوت کا عزم اور رجمنٹوں میں ظاہر ہوا ہے جس کے سبب سے بہت سے عمدہ سپاہی تباہ اور برباد ہوئے ہیں۔ یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز رجمنٹیں جنھوں نے سرکاری کمپنی کی بڑی عمدہ خدمتیں کی ہیں، وہ بغاوت کی ترغیب سے اپنے تئیں اس طرح دور رکھیں کہ وہ سب آلات گزند رسانی ہم کو حوالہ کر دیں۔ بس تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہتھیار رکھ دو۔ جس وقت کہ ہندوستانی سپاہ کو ہتھیار رکھنے کا حکم دیا گیا تو انھوں نے دیکھا کہ گوروں کا توپخانہ ان کے سامنے کھڑا ہے اور روشن فلیتے توپچیوں کے ہاتھوں میں ہیں اور اس وقت کرنیل رینی نے ۸۱ ویں رجمنٹ کے گوروں کو حکم دیا کہ بندوقیں بھرو۔ بندوقوں کے گزوں کی جھنکار سنتے ہی سپاہیوں نے جانا کہ اب ہتھیاروں کے دے دینے میں تامل کرنا جان کا کھونا ہے۔ اس لیے انھوں نے حکم کے موافق ہتھیار رکھ دیئے اور سواروں نے بھی کرچیں کمر سے کھول کر رکھ دیں۔ سپاہی حیران و پریشان اپنی لینوں میں گئے اور ان کے ہتھیار کراچیوں میں لادے گئے۔ یہ ایک بڑا کار عظیم بغیر کسی قباحت کے نہایت سلیقہ مندی سے انجام ہوا۔[۱]

ہنڈن ندی کے اس طرف غازی آباد میں گوروں کی فوج آ گئی ہے۔ اب چاروں طرف سے بگل کا شور ہو رہا ہے۔ میگزین کی کراچیاں لدی ہوئی ہیں، پلٹنیں الگ جمی ہوئی کھڑی ہیں رجمنٹیں ایک جانب ہیں، فوج مسلح اور مکمل ہو کر شاہدرے کی سڑک پر روانہ ہوئی۔ دن کے دس بج چکے ہیں۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ اب مستقل توپ کے فائر ہونے لگے لگاتار توپ کی آواز چلی آتی تھی، پھر یکبارگی باڑھ کی آواز آنے لگی، اب توپ بھی چل رہی ہے اور بندوقوں کے باڑیں بھی چل رہی ہیں دو گھنٹہ کامل یہ صدا آتی رہی۔ پھر توپ اور بندوق بند ہوئی اور فائر کی آواز متفرق آنے لگی۔ اب مقام حرب قلعہ سے بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر ہوگا اور دن کے تین بج گئے ہیں۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ چند گھنٹے کے

---

[۱] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۵۵

عرصہ میں وطن کوچ کر کے پہنچ گئے اور لڑائی شروع ہوئی، تین گھنٹے میں فیصلہ ہوگیا۔ ابھی فتح شکست کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کون جیتا کون ہارا۔ پانچ بجے کے قریب میں قلعہ سے سوار ہو کر جاتا ہوں جب لاہوری دروازے کے چھتے پر پہنچا تو مجھے فوج واپس آتی ہوئی ملی، آگے آگے توپ خانہ تھا، مَیں نے دیکھا کہ ایک جوان میگزین کی گاڑی پر صندوق سے لگا بیٹھا ہے مگر بے ہوش آنکھیں بند ہیں میں سمجھا زخمی ہے۔ گھوڑے پر جو بیشتر سوار تھے میں نے ان سے پوچھا اس کے کہاں زخم آیا ہے انھوں نے کہا: زخم نہیں آیا ہے، اس کے ٹھنڈا گولا لگا ہے۔ اس کے صدمے سے بے ہوش ہوگیا ہے اس کے بعد مَیں نے دیکھا کہ سوار ہنستے کودتے باجا بجاتے چلے آتے ہیں قلعہ کے دروازے میں سے مَیں نے نکل کر ایک سوار سے پوچھا کہ تم لوگ اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے۔ اس نے بیان کیا کہ ہماری فتح ہوگئی، گورے مقابلہ پر سے بھاگ گئے، ہم واپس چلے آئے، پھر مَیں نے پوچھا کہ لڑائی کی کیا شکل ہوئی اس نے بیان کیا کہ بندھی ندی کے اس پار ہم تھے اور اس پار وہ تھے جانبین سے توپیں چلتی رہیں ہمارے توپ خانے نے بڑا کام دیا آدمی آدمی کے پیچھے گولہ لگا دیا۔ دوسرے یہ بات بھی ہوئی کہ گورے دھوپ کی تیزی اور حرارت آفتاب کی تاب نہ لا سکے ہم دور سے دیکھتے تھے کہ وہ ندی کے پانی میں کھڑے تھے اور ان کے گھٹنوں تک پانی تھا۔ جب سواروں نے دھاوا کیا تو وہ کلبلا کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن اپنی توپیں وغیرہ سب سامان لے گئے[1]

باغی کس بہادری سے لڑے

اگرچہ انگریزوں کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور وہ کامیابی کی منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، باغی حالات کی ناسازگاری اور رفیقان راہ کی گریز پائی کے باعث دل گرفتہ اور شکست خوردہ ہوتے جا رہے تھے پھر بھی ملن میں جب وہ آتے تھے تو مار کے مرتے تھے۔

"۱۱ ستمبر کی صبح کو آٹھ بجے قلعہ شکن توپوں نے اپنی آگ برسانی شروع کی اور توپچیوں نے خوشی کے

---

[1] : داستانِ غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) ص ۵۶۔

نعرے مارنے شروع کئے، کشمیری دروازہ کے گڑگچ نے اس کا جواب دیا، مگر وہ بہت جلد خاموش کردیا گیا، گڑگچ اور فصیل میں سب طرف سے رخنے پڑنے شروع ہوئے۔

۱۲ ستمبر کو پچاس توپیں اور مورٹر چاروں طرفوں سے گولے گولیاں شہر پر برسانا شروع کیا، یہ بلا کی آتش زنی رات دن جاری رہی۔ لیکن شہر کی سپاہ نے متواتر توپ زنی کو جاری رکھا، جب گڑگچوں پر وہ ایک توپ بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے تو وہ توپوں کو انگریزی بیٹری کے سامنے کھلے میدان میں لے گئے، فصیل میں ایک سوراخ کرکے توپ توپ کے مقابلہ میں لگائی، انھوں نے بان مارنے شروع کئے۔ اور سب سے آگے بڑھے ہوئے مورچہ نے اور فصیلوں پر سے گولیاں مارنی شروع کیں، غرض انگریزی بیٹری کوئی باقی نہ رہی جس کی خبر باغیوں نے اپنی گولیوں سے نہ لی ہو۔

ان کے گولے اور گولیوں نے بہت سے انگریزی سپاہیوں کو ہلاک کیا، بیٹریوں کے کھلنے کے بعد چھ دن کے اندر تین سو انتالیس آدمیوں کا نقصان ہوا[1]

لڑنے والے انگریز کم ہمت بھی تھے

ہر طرح کے مساعد حالات کے باوجود کار بلکہ جنگ کی جب نوبت آتی تھی تو انگریز شجاعت سے زیادہ کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آئندہ کے لیے ایسے متفرق حملوں کا ارادہ ترک کردیا گیا، اور یہ بات ٹھیری کہ شہر کے محاصرے کی تیاری کرنی چاہیئے، تیئیسویں کو دشمن اپنی توپیں کشمیری دروازہ کے باہر نکال لایا اور پہاڑی کے بائیں حصہ کی طرف گولہ باری کرنے لگا گو ادھر سے ہلکی توپوں سے جواب دیا جانے لگا مگر کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوا۔ ادھر سے ایک لشکر کلہ بکلہ جواب دینے کو بھیجا گیا اور قریب تھا کہ وہ دشمنوں کی توپیں چھین لیتے، لیکن ایک قسم کی غلط فہمی اور کچھ کم ہمتی کی وجہ سے کامیابی نہ ہوئی، اس کے بعد چند دنوں تک مینہ کی جھڑی لگی رہی جس کی وجہ سے طرفین ساکت رہے چھبیسویں سے کچھ باغی ادھر آن ملے، لیکن انھوں نے کچھ دن آرام کیا اور ۲۱ کو ان کا ایک لشکر کیمپ کے ٹھیک عقب میں آن پہنچا اور ان کے ساتھ کل سامان مرمت اور مدد ستی کا بھی تھا جو شکست شدہ پلوں کی درستگی کے واسطے لائے تھے، کہ ٹھیک ٹھاک کرکے کیمپ کے پاس آ

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) ص ۶۴۱

جائیں گے۔ اگرچہ بارش موسلا دھار تھی مگر وہ اس حالت میں بھی کام بڑی مستعدی سے کئے جا رہے تھے۔ پہلی اگست کو بقر عید تھی جو مسلمانوں کا بڑا بھاری تہوار ہے۔ دشمنوں نے پل پورا کر لیا تھا، اور بعض اُس پر سے چھُوٹ بھی کر آئے تھے کہ یکایک نجف گڈھ کا نالہ دو دن کی متواتر بارش سے ایسا چڑھ آیا تھا کہ سارے پل کے شہتیروں کو بہا لے گیا اور باغیوں کو شہر کی طرف لوٹ جانا پڑا[1]

باغیوں نے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے

دسویں اور گیارھویں جون کو باغی شکست پاکر اپنی حملہ بازی سے رکے نہیں۔ ۱۲ جون کو انہوں نے انگریزی لشکر کے بائیں طرف حملہ کرنے کا ارادہ مستحکم کیا۔ باڑہ پر تھوڑے فاصلہ پر دو ہلکی توپیں اور ۷۵ ویں پلٹن کی کچھ کمپنیاں دریا کے کنارہ پر سر تھیوفلس مٹکاف کی کوٹھی میں مقیم تھیں۔ باغیوں نے بڑے حوصلہ سے اپنے تئیں درختوں کے اندر چھپایا اور زمین کے لہریا دار ہونے کے سبب وہ پہاڑوں پر چڑھ گئے اور انگریزی سپاہ کو خبر تک نہیں ہوئی اور دفعۃً باڑہ کے پکٹ پر حملہ کیا۔ کپتان نوکس ۷۵ ویں رجمنٹ کے کمان افسر مع اور سپاہیوں اور توپچیوں کے مقتول ہوئے اور قریب تھا کہ باغی توپیں لے لیتے کہ ۷۵ ویں پلٹن نے باغیوں پر حملہ کر دیا۔

باغیوں کی گولیاں کیمپ میں آن کر پڑیں اور بعض باغیوں کے سپاہی پہاڑی کے نیچے کیمپ میں گھس آئے اور تین باغی سپاہی لائن کے خیموں کے قریب مارے گئے۔ پکٹ کی حمایت کے لیے سپاہ جلد پہنچ گئی، باغی بھاگ گئے اور کچھ دیر تک ان کا تعاقب کیا گیا۔ اس لیے کہ لشکرگاہ کے قریب باغی دوبارہ نہ آ جائیں[2]۔

انگریز محاصرہ چھوڑ رہے تھے

اور یہ حالت تو اب تھی، جب انگریزوں نے دلی کا محاصرہ کیا تو خود محصور بن گئے اور راہ فرار

---

۱ : واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ص ۳۱۔

۲ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ ص ۵۸۱۔

تلاش کرنے لگے، ایک انگریز دوست مورخ لکھتا ہے :۔

بیرڈ سمتھ صاحب چیف انجنیئر نے کہا کہ محاصرہ کا اٹھا دینا ہمارے قومی اغراض کے حق میں نہ ہوگا پھر اس نے جنرل سے کہا کہ آپ غور کیجئے کہ محاصرہ کے چھوڑ دینے کا نتیجہ کیا ہوگا، سارے ہندوستان کو یہ یقین ہوگا کہ ہم جو دہلی سے واپس آئے تو اس کا سبب یہ تھا کہ ہم کو شکست ہوئی ایسی صورت میں ہندوستانیوں کے دلوں پر وہی نقش ہوگا، جو ہماری شکست فاش سے ہوتا محاصرہ اٹھا دینے کی صورت میں ہماری پنجاب سے آمدورفت بند ہو جائے گی، اور پھر جو اس ملک سے کمکوں کی امیدیں ہیں وہ جاتی رہیں گی اور پھر ہم کو دہلی پر ان دشمنوں سے جن کی قوت افزونی تعداد سے بڑھ جائے گی لڑنا پڑے گا، اب تو تمام باغی سپاہی دہلی میں جمع ہوتے ہیں اور ہم ان سے لڑتے ہیں، لہٰذا وہ سارے ملک میں نہیں پھیلتے۔

ان دلائل نے جنرل ولسن کے دل کو یقین دلا دیا کہ محاصرہ کا اٹھانا بالکل نامناسب ہے اس لیے چیف انجنیئر کا شکریہ ادا کیا[۱] ؎

جنگ کے دوران میں ہندوستانی ملازموں سے بدسلوکی

جنگ کے دوران میں بھی انگریزوں کی نخوت اور ہندوستانیوں کے ساتھ ذلیل برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔۔ پہاڑی پر موری دروازے کی توپیں انگریزی لشکر کو بڑا ہلاک و حیران اور پریشان کرتی تھیں، باغیوں کے توپچی ظرافت و حشت اور مسرت کے ساتھ انگریزی لشکر کے سارے کاموں کو دیکھتے تھے اگر ٹکٹ پر گوروں کے کھانے کے لیے باورچیوں کے لڑکوں کی قطاریں سروں پر کھانا رکھ کے جاتی تو ان پر گولے چلا کر حیران و پریشان کرتے، لشکر کے آدمیوں کی ان گولوں کو اپنے اوپر آنے کی دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی، وہ ان سے بچنے کے لیے زمین پر لیٹ جاتے۔ لڑکے جھک کر گھٹنوں چلتے اور اپنے سر کے بوجھ کو رکھ دیتے، گولے ان کے سروں پر سے گذر جاتے

---

[۱] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۲۱۱ ؎

تو وہ پھر کمانے کو لے کر چلتے، باوجودیکہ یہ لڑکے بڑی وفاداری اور جاں نثاری سے کام کرتے تھے دفعتہ مرجانے کا خوف نہیں کرتے تھے، چاہئے تھا کہ گورے ان پر مہربانی کرتے مگر وہ نہیں کرتے تھے، بعض انگلش مین کیمپ میں ایسے بھی تھے کہ ان غیر مسلح بے گناہ بدنصیب رذیل ملازموں پر سختی کرتے تھے۔[1]

مکانات کی چھتوں اور سیڑھیوں پر باغیوں کا مقابلہ

باغیوں نے مقابلہ میں کہیں بھی کسی طرح کی کسر نہیں اٹھا رکھی

اس وقت ۱۴ جولائی شہر کی فصیل پر سے اور بہت سی میدانی توپوں سے گولوں کی بوچھاڑ لگی رہی اور جلد اور تیزی سے گولے پھینکے جاتے تھے، بغیر کسی دشواری کے باغیوں کو باغوں سے انگریزی سپاہ نے نکال دیا، لیکن سراؤں اور مکانوں میں باغیوں سے سخت لڑائی ہوئی، مکانوں کی چھتوں پر، ان کی ہر سیڑھی پر چڑھتے ہوئے باغیوں کو انگریزی سپاہ کی سنگینوں نے ہلاک کیا۔ شام کو غروب آفتاب کے وقت کے بعد ان سے باغی بھگا دیئے گئے وہ شہر میں بہت نقصان اٹھا کر داخل ہوئے، انگریزوں کا نقصان یہ ہوا کہ ایک افسر اور ۱۹ پولیس سپاہی مقتول ہوئے اور آٹھ افسر اور ایک سو ساٹھ سپاہی مجروح ہوئے۔ اور گیارہ سپاہی گم ہوئے، باغیوں کے پانچ سو سپاہی مارے گئے، جن میں بہت سے اپنے مقام پر مارے گئے تھے باغی سرداروں کو یہ بھروسہ تھا کہ کیمپ میں ان کے ہندوستانی سوار اور پیادے امداد کریں گے مگر اس ہندوستانی سپاہ نے اپنا چال چلن درست رکھا۔[2]

باغیوں کا دلیرانہ حملہ

"۲۳ جولائی کی صبح کو باغی کشمیری دروازہ سے انبوہ در انبوہ باہر آئے اور انھوں نے لڈلو کیسل پر اور اس کے آس پاس قبضہ کیا"

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ ص ۵۹۰۔

[2] تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ ص ۶۰۴۔

اور مٹکاف کے پکٹ اور پہاڑی پر خاص کر مسجد کے پکٹ پر میدانی توپوں سے آتش زنی شروع کی[1]

سکھ سپاہیوں کی طلبی اگرچہ انگریزوں کو ہر طرف سے اور ہر طرح کی مدد مل رہی تھی لیکن ان کی زبان پر ہل من مزید کا نعرہ جاری تھا۔

مراسلہ نمبر ۵

جسے بریگیڈیئر جنرل نیول چیمبرلین ایڈجوٹنٹ جنرل نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ مقابل دہلی ۱۱ر جولائی ۱۸۵۷ء وقت ایک بجے دوپہر

مائی ڈیئر بارنس

اب جبکہ کرنال ہمارے متحفظ سامان حرب اور ذخائر کا ڈپو بن گیا ہیں وہاں پیدل فوج کا ایک دستہ رکھنا چاہیئے اور چونکہ اس کیمپ سے ہم ایک آدمی بھی نہیں دے سکتے حسب معمول سپاہیوں کی ہمرسانی کے لیے پنجاب سے توقع رکھنی چاہیئے براہ مہربانی اس مسئلہ کے متعلق لاہور سے نامہ و پیام کیجئے اور اگر اور سپاہی نہ دستیاب ہو سکیں تو کم از کم سکھ سپاہیوں کی چار پلٹنوں کو حاصل کرنے کی سعی کیجئے، ہمارا عقب کھلا اور خاموش رہنا چاہیئے اور یہ ہماری فاش غلطی ہوگی، اگر ہم اپنے ذخائر کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ جائیں گے یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے مزید افواج کا مطالبہ کیا ہے اور میں اب بھی ایسا نہ کرتا، لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ہم ایک آدمی کو بھی علیحدہ نہیں کر سکتے، ۹ر جون کو ایک سخت معرکہ میں ہمارے ۲۷۰ سپاہی ضائع ہوئے جن میں مقتول، مجروح اور بیمار سب شامل ہیں[2]

---

۱ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۱۱

۲ : محاصرہ دہلی کے خطوط ص ۱۵

انگریزوں کو کمک پر کمک مل رہی تھی

۶ ستمبر کو جس قدر کمکوں کی امید ہو سکتی تھی وہ سب دہلی کیمپ میں آگئیں، ان میں محاصرہ کا توپ خانہ بھی تھا، جس میں بتیس توپیں تھیں اور ان کے ساتھ بہت سا گولہ بارود تھا۔ اب یہ وقت آگیا تھا کہ ولسن صاحب کے لیے ضرور تھا کہ وہ یہ قطعی فیصلہ کریں کہ آیا دہلی حملہ کر کے لے لی جائے یا اس کے لیے کوشش کرنی چھوڑ دی جائے؟ ہر روز سپاہ کو دھوپ میں جلنا اور مینہ میں بھیگنا پڑتا ہے۔ بیماری کی افزائش کی تو حد باقی نہ تھی، ۳۱ راگست کو ۲۲۶۰ سپاہی بیمار تھے چھ دن کے اندر ان کی تعداد ۲۹۷۷ ہو گئی۔ انگریزوں کی سب قسم کی سپاہ ۸۷۴۸ تھی جس میں برٹش سپاہ ۳۲۱۷ تھی جو اس طرح مرکب ہوئی تھی کہ ۵۸۰ آرٹلری اور ۴۴۳ سوار اور ۲۲۹۴ پیدل، پیدلوں کی سپاہ میں صرف پوست و استخوان باقی تھا ان میں سب سے زیادہ توانا تندرست ۴۰۰ سپاہی تھے تین ہفتے ہوئے کہ ۵۲ ویں رجمنٹ آئی تھی جس میں ۶۰۰ توانا سپاہی تھے۔ اب ان میں ۲۴۲ سپاہی کام کرنے کے قابل تھے۔

اس اوپر کی تعداد میں کشمیر کی کنٹنجنٹ داخل نہ تھی اس میں ۲۲۰۰ سپاہی اور چار توپیں تھیں۔ جو اس وقت دہلی میں آگئی تھیں اور کم سو سپاہی جیند کے لشکر کے ساتھ جنھوں نے پہلے کرنال کی سڑک رکھنے سے بہت فائدہ پہنچایا تھا، راجہ جیند خود آیا تھا اور اس کی درخواست پر اس کی سپاہ کو دہلی فتح کرنے کا اعزاز دیا گیا[1]۔

پنجاب سے سامان اور سپاہی پہنچ گئے

پنجاب میں یہ بڑا اہتمام ہو رہا تھا۔ کہ سب قسم کی رسد اور اسباب دہلی میں برنارڈ کی سپاہ کے لیے بھیجا جائے، سڑک پر رسد رسانی کا تار بندھا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے لیے باربرداری کے جانوروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ غرض، پنجاب ہی سامان اور سپاہی بھیج رہا تھا

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلیشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۲۵۔

کہ دہلی فتح ہو اور سرکشی فرو ہو۔ جنرل این سن کی وفات کے سبب سے جنرل ریڈ پنجاب کے کمانڈر انچیف ہو گئے، دہلی میں باؤلی کی سرائے کی لڑائی میں ایڈجوٹنٹ سپاہ کا مارا گیا تھا، اس کی جگہ پر نیول چیمبرلین مقرر ہوئے اور ان کی جگہ پنجاب کی گشتی سپاہ کے بریگیڈیئر نکلسن مقرر ہوئے۔[1]

پنجاب کے والیان ریاست کی بیش بہا امداد

برناس صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ سب سے اوّل مقصد یہ تھا کہ گرینڈ ٹرنک روڈ (شاہراہ اعظم دہلی و پنجاب کے درمیان) محفوظ و مامون کی جائے، تھانیسر اور لدھیانہ میں فوجیں ایسی تھیں کہ جن پر کچھ اعتماد نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے میں نے ہدایت کی راجہ جیند جس قدر سپاہ فراہم کر سکیں اس کو کرنال روانہ کریں، مہاراجہ پٹیالہ نے میری درخواست پر اپنے بھائی کو افسر بنا کے سپاہ اور تین توپیں تھانیسر بھیج دیں، جو کرنال اور انبالہ کے درمیان ہے راجہ نابھہ اور نواب مالیر کوٹلہ سے درخواست کی گئی کہ وہ سپاہ سمیت لدھیانہ روانہ ہوں اور راجہ فرید کوٹ سے درخواست کی گئی، کہ فیروزپور کے ڈپٹی کمشنر کے ماتحت کام کریں بس اس طرح شاہراہ اعظم کے بڑے بڑے مقامات محفوظ ہو گئے اور راجہ جیند کو یہ ہدایت بھی کی گئی کہ رسد اور میدان جنگ کی سپاہ کے لیے چھکڑے گاڑیاں جمع کریں، جس سے کرنال وغیرہ مقامات کی محافظت ہو۔ سرجان لارنس نے بھی ۲۱ مئی کو انبالہ سے راجہ پٹیالہ کو تار بھیجا کہ وہ ایک رجمنٹ تھانیسر میں اور دوسری رجمنٹ لدھیانہ میں بھیج دیں، اس زمانہ میں یہ بڑی بات تھی کہ انبالہ اور کرنال کے درمیان سڑک کھلی رہے، کرنال پر قبضہ رکھنے میں یہ بھی فائدہ تھا کہ میرٹھ سے آمد و رفت جاری رہ سکتی تھی۔ اور ان دونوں مقامات کی فوجیں آپس میں آسانی سے سفر کر کے مل سکتی تھیں، راجہ جیند، انگریزوں کا دلی خیرخواہ تھا وہ سے باس صاحب کے (دہلی کے سشن جج تھے

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)، ص ۵۷۶۔

جو دہلی سے بھاگ کر کرنال گئے تھے) پاس گیا اور کہا صاحب رات بھر سویا نہیں ہوں، سوچ بچار کرتا رہا ہوں، آخر کو میں نے یہ قطعی فیصلہ کیا ہے کہ اپنی قسمت کو آپ کے ہاتھ میں سپرد کر دوں میری تلوار میری تھیلی میرے ملازمین یہ سب آپ کے حوالے۔ غرض انگریزوں کو ان رئیسوں سے بڑی مدد پہنچی، جب راجہ جیند نے اپنی سپاہ کرنال میں بھیجی، تو پھر اس طرف رعایا کی سرکشی کا خوف جاتا رہا۔ پانی پت میں مہاراجہ جیند کی سپاہ موجود تھی ان رئیسوں کے لشکروں کے سبب سے گوروں کی سپاہ بے کھٹکے سفر کرتی تھی۔ اگرچہ گوروں کو گرمی مضمحل کرتی تھی مگر لڑائی کرنے لیے وہ بڑے سرگرم تھے۔[1]

انگریزوں کی فتحیابی شروع ہوگئی

باغیوں کے وسائل جیسے جیسے کم اور کمزور ہو رہے تھے، انگریزوں کے وسائل ویسے ویسے زیادہ اور مستحکم ہو رہے تھے، اس عدم توازن کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کی فتح، اور باغیوں کی شکست کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

کپتان فریزر کے ماتحت ملکہ معظمہ کی ۷۵ ویں رجمنٹ اور پہلی بنگال رجمنٹ کے ۲۶۰ توانا سپاہی جیکب اور میجر کوک کی رائفل کے ۲۵۰ سپاہی اور ملکہ معظمہ کی آٹھویں رجمنٹ کے سو سپاہی کپتان ربرٹس کے ماتحت اور دوسری رجمنٹ کے سو سپاہی کپتان ہیرس کے ماتحت اور کماؤن کی پلٹن کے سو سپاہی کپتان طامس کے ماتحت اور چوتھی سکھ پیدل پلٹن کے سو سپاہی۔ کپتان چیمبرس کے ماتحت ان کو صاف حکم تھا لڈلو کیسل میں جاکر توپوں سے لو، حکم کے موافق کالم کے دونوں طرف پیدل تھے۔ اور توپ خانہ سڑک پر تھا، چپ چاپ دشمن کے مقام کی طرف پیش قدمی ہوئی۔ باغیوں کے سنتری نے کہا، کون آتا ہے؟ اس کا جواب گولی نے اس کے پیٹ میں جاکر دیا۔ بندوقوں کی باڑ سے باغیوں نے متحیر ہو کر مراجعت کرنے کی کوشش کی، صرف انھوں نے دو چھوڑی تھیں کہ انگریزی سپاہی توپوں کے قریب جا پہنچے تیسری توپ کو ایک سپاہی

(۱) تاریخ ہند (ذکاء اللہ)

ریگن نے لپک کر چھوڑنے نہیں دیا۔ اس میں توپچی فیتہ لگانے کو تھا کہ ریگن نے اس کے سنگین ماری مگر خود بھی شدید زخمی ہوا۔

توپچی اپنی توپوں پر کھڑے ہوئے اور ریگنوں کی طرف بیٹھ کر کے جب تک کہ مارے نہ گئے حملہ کرتے رہے، انگریزوں نے چار توپیں لے لیں، باغیوں نے پاس گھروں میں پناہ لی تھی۔ ان کو انگریزی سپاہیوں نے مار ڈالا، اور انگریزی لشکر بڑی شان سے خوشیاں مناتا ہوا کیمپ میں آیا۔ توپیں جو انھوں نے چھین لیں تھیں، ان کے گھوڑوں پر گورے سوار تھے، اور خوشی خوشی ان کو اپنے کیمپ میں لے جا رہے تھے۔

انگریزوں کا نقصان یہ ہوا کہ ایک افسر مارا گیا آٹھ افسر زخمی ہوئے اور ایک سو نو سپاہی لڑنے کے قابل نہ رہے، زخمی افسروں میں برگیڈیئر شوورس اور میجر کوک تھے، میجر اپنے ہاتھ سے توپ لینے میں زخمی ہوئے تھے، شوورس صاحب کے مرنے سے انگریزوں کا بڑا نقصان ہوا۔ وہ بڑی جری اور عاقل افسر تھے[۱]۔

سنبھالا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کے کام کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انگریزی سپاہ کا بڑا بھاری نقصان ہوا۔ لیکن بہت سی مزاحمتیں دور ہوگئیں اور ایک مستحکم مقام ایسا حاصل ہو گیا کہ جہاں سے آگے کام جاری ہو کر کامل ہو سکتا ہے۔ چھ گھنٹے کی لڑائی میں چھیاسٹھ افسر اور گیارہ سو چار آدمی مجروح و مقتول ہوئے حملہ آور پانچ کالموں میں سے چار کالم شہر کے اندر داخل ہوئے، جس مقام پر وہ قابض ہوئے بڑی وسعت رکھتا تھا، اور چوتھے کالم کی ناکامیابی کے سبب سے داہنے بازو پر اب بھی دشمنوں کی تعداد زیادہ تھی ان کے پاس توپیں بہت تھیں۔ اگرچہ سترہ[۱] انجینئروں میں دس انجینئر

۱: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۱۴

کام کے تھے انہوں نے رات ہی کو کچی مورچہ بندی اور ان میں پکٹ بٹھائے گئے اور گشتی پہرہ جمائے گئے

پانچ حملہ آور کالموں میں پانچ ہزار ایک سو ساٹھ سپاہی تھے۔ جن میں سے گیارہ سو چار سپاہی اور چھیاسٹھ افسر مجروح اور مقتول ہوئے یعنی نو آدمیوں میں دو، کئی بڑے بڑے بہادر انگریز ایسے گئے۔ یا زخمی ہو کر مرے۔

جنرل ولسن کے پاؤں ڈگمگانے لگے

ان حوصلہ افزا حالات کے باوجود جب باغیوں نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور کئی بڑے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو جنرل ولسن کے پاؤں پھر ڈگمگانے لگے وہ سوچنے لگے کہ جنگ ملتوی کر کے سپاہ کو واپس بلا لینا چاہیے۔

نکلسن صاحب مرنے کی حالت میں بھی اس بات کو چاہتے تھے کہ شہر پر قبضہ رہے جب ان سے بیان کیا گیا کہ جنرل ولسن شہر سے مراجعت کا اظہار کرتا ہے تو وہ ایسے غصے اور طیش میں آئے کہ انھوں نے کہا کہ خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اب تک مجھ میں ایسی قوت ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں ولسن کو گولی مار دوں گا۔

ماہر جنگ انگریز اناڑی باغیوں سے ڈرتے تھے

علی گڑھ کی باغی رجمنٹ اور فیروز پور کی باغی مفرور رجمنٹ کے بہت سے سپاہی اور متھرا کی ہندوستانی پیدلوں کی کمپنیاں اور حصار سرسہ کی غیر آئینی سپاہ نے دہلی کی فصیل سے باہر باغیوں کی تعداد کو بہت بڑھا دیا تھا بادشاہ کی خود سپاہ اگرچہ بارہ سو تعداد میں تھی اور کالی اور اگری اور جہجر پلٹنوں میں منقسم تھی۔ اور کچھ توپیں اور سوار بھی تھے مگر ان میں تھوڑی ہی سی ایسی توڑے دار بندوقیں بھرنا اور نشانہ پر گولی لگانا جانتی تھی اور ان کے آس پاس جو انگریزی سپاہی رخصت پر آئے تھے یا پنشن پاتے تھے وہ بھی ان کے دہلی میں جمع ہو گئے تھے تو بھی بہت سے تھے۔ اور اپنے کام میں استاد تھے۔ اور انگریزی سپاہیوں کی تعداد بہ تفصیل ذیل تھی کہ

ملہ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۴۴

۶۰۰ سوار ۴۰۰ پیدل[۱]

باغی آخر وقت تک ڈٹے رہے

۱۴ ستمبر کو انگریزوں نے کشمیری دروازے پر حملہ کیا یہ وہی راستہ ہے جس کے ذریعہ وہ شہر میں داخل ہوئے اور بالآخر اس پر قابض ہو گئے، انگریزی فوجیں حملہ کرتے وقت کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئی تھیں، کوتوالی کے قریب ایک توپ نصب تھی جسے چند سوار اور بدمعاش چلا رہے تھے ان گولوں سے انگریزی ہراول دستہ کے تقریباً پچاس آدمی مجروح و قتل ہوئے۔ باغیوں نے جامع مسجد میں رہ کر مدافعت کی اور انگریزوں کی پیش قدمی کو روک دیا، انگریز پھر کشمیری دروازے کی طرف پسپا ہو گئے باغیوں نے مزید مقابلہ کلکتہ دروازے پر کیا، شہر میں پانچ دن تک جنگ و جدل جاری رہا[۲]

روزنامچہ جنگ

اب ہم روزنامچہ کی صورت میں دوران جنگ کے خاص خاص واقعات بہ قید تاریخ ذیل میں درج کرتے ہیں:

کشن گنج باغیوں نے خالی کر دیا

۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو باغیوں نے کشن گنج کے مواضع کو جہاں سے چوتھے کالم کو پسپا ہونا پڑا تھا، خالی کر دیا محاصرین نے اس پر قبضہ کیا اور بھاری پانچ توپیں ہاتھ آئیں جن کو باغی چھوڑ گئے تھے اس میگزین میں اب بھی ۱۷۱ توپیں اور بوٹ نئے اور ہر قسم کا اسباب جنگ بکثرت موجود تھا، دوپہر کے بعد باغیوں نے اس میگزین اور ورکشاپ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی، ورکشاپ پر قبضہ کر لیا مگر پھر بھگا دیئے گئے۔

اس وقت لفٹنٹ رینی صاحب نے بڑی بہادری کی، وہ میگزین کی چھت پر چڑھ گئے اور

۱: تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاءاللہ، ص ۷۷۵

۲: غدر کی صبح و شام ص ۸۴

یشل گولوں کو جن کے شتابے سلگ رہے تھے اپنے ہاتھ میں لے کر دشمن پر ایسے مارے کہ وہ
نوک دُم بھاگا۔

شہر اور قلعہ پر گولوں کا مینہ برسنے لگا

۱۶، ۱۷، ۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے بنک پر اور میجر ایبٹ کی کوٹھی پر
اور حامد علی خان کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت توپ خانے چپ نہیں رہے تھے شہر پر اور
قلعہ پر گولوں کا مینہ برسا دیا تھا، اب باغیوں میں بھی لڑنے کا دم نہ رہا تھا۔ اب نہ ان کو فتح کی
امید اور نہ جان کی مایوسی، انگریزوں سے لڑ سکتی تھی، ان تین روز میں انگریزوں کا بہت ہی کم
نقصان ہُوا۔

جنرل ولسن کی سراسیمگی

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لاہوری دروازے پر بریگیڈیئر صاحب نے حملہ کیا، مگر وہاں ایک دروازہ کے اندر چھپا کر باغیوں
نے توپ رکھی تھی۔ اس سے گراپ مارنے اور مکان پر گولیاں چلانا شروع کیں جس کے سبب
صاحب ممدوح واپس چلے گئے۔ صبح کو لاہوری دروازہ پر حملہ کرنے سے گوروں نے انکار کر
دیا تھا کہ ان کو گلی کوچوں میں لڑنا پسند نہیں تھا۔ کہ جہاں ان کو دشمن نظر نہیں آتا تھا مگر وہ ان
کی گولیوں سے جو وہ چھتوں پر چڑھ کر مارتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھتے تھے اس وقت
شہر کے اندر تین ہزار ایک سو سپاہی تھے۔ اور ان کو کہیں سے کمک آنے کی امید نہ تھی۔
اور ہنوز شہر کا بہت بڑا حصہ فتح کرنا باقی تھا جس سے جنرل ولسن سراسیمہ ہوئے جاتے
تھے۔ وہ اپنے سپاہ کے بچانے کے لیے پہاڑ پر جانا چاہتے تھے۔

قدم بہ قدم شہر فتح ہو رہا تھا ——— گوروں کی بدمستی

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کپتان برصاحب نے ہروہ گز کچ کو جو کابلی
دروازہ کے درمیان تھا لے لیا اور بریگیڈیئر جونس اپنی سپاہ کو لے کر آگے بڑھے، مگر ان کے سپاہی
بھاگ گئے۔ ان کو بستی کی برانڈی ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس کو پی کر وہ ایسے مست ہوئے کہ افسران

کے بس میں نہ رہے، غرض اس طرح بتدریج شہر کے حصّے فتح ہوتے گئے کہ ایک حصہ لیا اور اس کے پاس کے حصے پر گولے اور گولیاں ایسی ماریں کہ اس کو فتح کر لیا۔

اسی طرح قدم بقدم شہر فتح ہوتا گیا اور جنرل ولسن کو ڈھارس بندھ گئی کہ شہر فتح ہو ہو جائے گا۔

جامع مسجد پر قبضہ، عیدگاہ کا محاصرہ، باغی بے ترتیبی سے بھاگے

۲۰ ستمبر کی صبح کو بریگیڈیر جونس کے کالم نے لاہوری دروازہ اور اجمیری دروازہ پر قبضہ کر لیا اور وہ گڑھ گج لے لیا جو لاہوری دروازہ اور اجمیری دروازہ کے درمیان تھا۔ پھر بریگیڈیر کے پاس حکم آیا کہ وہ اپنی سپاہ کو تقسیم کر کے ایک حصہ کو چاندنی چوک میں بھیجے کہ وہ جامع مسجد پر قبضہ کرے اور باقی سپاہ لے کر وہ اجمیری دروازہ پر جائے۔ بریگیڈ صاحب نے سپاہ ساتھ لے کر بہ آسانی جامع مسجد پر قبضہ کر لیا اور انھوں نے جرنل سے درخواست کی کہ وہ قلعہ پر حملہ کرے اس عرصہ میں جونس صاحب اجمیری دروازہ میں داخل ہوئے رسالہ سواروں کا عیدگاہ کے گرد گیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ دہلی دروازہ کے باہر باغیوں کا کیمپ خالی پڑا ہے۔ لفٹنٹ ہوڈسن نے لپک کر اس پر قبضہ کیا اور ان کے زخمی اور بیمار سپاہیوں کو مارا۔ باغی بہت بدحواس ہو کر بھاگے تھے۔ ان کی گیلی دھوتیاں الگنیوں پر لٹک رہی تھیں ؎

انگریزوں کی فتح

صبح کو حملہ کرنے کی ٹھن گئی پو بھی نہ پھٹنے پائی تھی کہ کالم غالب ہونے لگا ہر کالم میں بڑے بڑے آدمی تھے۔ فصیلوں کی تشرگاہوں کی درستگی غنیم نے کر لی تھی، از سر نو ان پر گولہ باری کرنا پڑی لیکن پھر بھی کامیابی ہوئی، اگرچہ غنیم کی گولہ باری کی وجہ سے سیڑھیاں لگانے میں دقت تھی ایک سے زیادہ پارٹیاں ہلاک ہوئیں مگر کشمیری دروازے کو آخر اڑا

؎ تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) صفحہ ۶۴۶۔

ہی دیا، اور کشمیری دروازے اور پانی برج کی فصیلوں کو لے لیا لیکن غنیم کو شہر بدر نہ کر سکے، وہ بدستور اپنے مقام پر اڑا رہا، گورنمنٹ کالج، نواب احمد علی خاں کا محل سکنتر صاحب کا مکان ان تینوں مقامات پر گو کہ قبضہ ہو گیا تھا لیکن باغیوں کا مجموعہ اب بھی میگزین پر تھا اور انھوں نے ہر ہر گلی کی طرف توپوں کا رخ کر رکھا تھا۔ جدھر سے کہ انگریزی فوج کے گھسنے کا اندیشہ تھا۔ تیسرا کالم جامع مسجد کے قریب جا پہنچا تھا لیکن چاندنی چوک کی طرف سے باغیوں کے ایک جم غفیر نے آن کر ان کو بھگا دیا۔ اور بہت قریب تھا کہ سب کو کاٹ ڈالتے۔ پہلا اور دوسرا کالم کابلی دروازے سے آگے نہ بڑھ سکا اور یہیں ایک تنگ گلی میں نکلسن صاحب بری طرح مجروح ہوئے چوتھا کالم بالکل ناکام رہا کیونکہ اصل فوج کے آگے بڑھ جانے کے انتظار میں ٹھہرنا پڑا اس تاخیر کے سبب سے غنیم جو کشن گنج میں تیار تھا ہمارے ارادوں سے مطلع ہو گیا اور جب یہ لوگ پہنچے تو ان کی گرمجوشی سے خبر لی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ وجہ ہوئی کہ ان گوروں کو خالی دکانوں میں شراب کے ڈھیر مل گئے کئی کئی روز کے تو کئی دن کے پیاسے تھے خوب سیراب ہوئے،

اس ایک دن کے کل نقصان کی تعداد افسر اور سپاہی مجروحین و مقتولین کی گیارہ سو ستر تھی، اگر محاصرے کے آغاز سے اب تک نقصان اسی نسبت سے ہوتا جیسا کہ اس دن ہوا تو مجبوراً محاصرہ اٹھا دینا پڑتا، اور پھر پنجاب بھر میں بغاوت کا زہریلا اثر پھیل جاتا، اور انگریزوں کے قدم اکھڑ جاتے۔ اس کے بعد پانچ دن لڑائی مسلسل جاری رہی ہر ہر قدم پر مجادلہ ہوا۔ انگریز بھاری توپیں بھی شہر میں گھسیٹ لائے اور گولہ باری شروع کر دی ۱۶ ار کی علی الصباح میگزین پر قبضہ ہو گیا اور اسی صبح کو غنیم نے کشن گنج جسے نہایت استحکام سے محصور کیا تھا، خالی کر دیا، ۱۷ تاریخ کو دلی بینک پر گولہ باری ہوئی فوجی ناکوں کو درمیانی مکانات ڈھا ڈھا کر آگے بڑھاتے گئے آخر آدھے شہر پر قبضہ کر لیا، باغیوں کے پیر اکھڑ گئے۔ بھاگنا شروع کیا اور سب ہی ہاتھ پاؤں پڑ گئے، جسے دیکھو شہر چھوڑ کر بھاگنے لگا ۱۹ ار کی

شاموں شام برن بلیسچلیں (لاہوری دروازے کے پاس) فتح ہوگیا، کئی جگہ ناکامیابی کے بعد اگلے دن سارا شہر مع قلعہ کے فتح ہوگیا۔ دیوانِ خاص میں ہیڈ کوارٹر مقرر ہوا، میجر جنرل ولسن نے سرمور کے گورکھوں کا گارڈ چڑھا دیا، ۲۱ر کی صبح کو فتح کے اعلان کے لیے شاہی سلامی سر کی گئی[۱]۔

فتح کے بعد بھی دہشت قائم رہی

ستمبر کی چودہ تاریخ کو صبح ہونے سے پہلے گوروں کی پلٹنیں اور گورکھا پلٹن اور چند سواروں کے رسالے جس طرف سے فصیل ٹوٹ گئی تھی، سیڑھیاں لگا کر فصیل پر چڑھ گئے اگرچہ ان میں سے بہت سے مارے گئے۔ لیکن انگریزوں کے اقبال کا ستارہ اوج پر تھا باغی بھری ہوئی توپیں اور میگزین وغیرہ جہاں تھا وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے، پھر جب کشمیری دروازہ کابلی دروازہ اور اجمیری دروازہ اور میگزین وغیرہ سب پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، تو انھوں نے بن چکی پر اور نواب حامد علی خاں کی کوٹھی کے پاس توپیں لگا دیں جس سے باغیوں کے نکلنے کے سب راستے بند ہوگئے، چند گورے جو بے وقوفی سے شہر چلے گئے تھے مارے گئے جب بادشاہ کو انگریزوں کے شہر میں داخل ہونے کی خبر پہنچی تو انھوں نے فرمایا کہ آج میں خود مقابلہ کروں گا۔ سب کو خبردار کر دو کہ ہماری سواری کے وقت حاضر ہوں اور مدد کریں چنانچہ بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈگی پر آئے۔ شہزادوں نے جو فوج کے افسر تھے فوج سے ہر چند کہا کہ ہمت کرو اور بہادر بنو، مگر تلنگوں نے بھوک اور رسد کے نہ ملنے کا بہانہ کر دیا اور جو کچھ دکانیں باقی رہ گئیں تھیں ان کو لوٹ کر بھاگنا شروع کر دیا، پھر کیا تھا ان کی دیکھا دیکھی بھاگڑ پڑ گئی، اور جتنی باقی فوج تھی سب بھاگ گئی،

۱۹ر ستمبر ہفتہ کے روز بادشاہ نے مایوس ہو کر رات کے وقت تمام مرشد زادوں

---

[۱] : واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اوّل (بشیر الدین احمد) ص ۱۹۵۔

اور بیگمات کو قلعہ سے باہر بھیج دیا، اور خود بھی سوار ہو کر درگاہ نظام الدین اولیا میں پہنچے اور پھر ہمایوں کے مقبرے میں مقیم ہوئے قلعہ اور شہر کے تمام لوگ ننگے سر اور ننگے پاؤں قلعہ سے باہر نکلے اور جس کا جدھر منہ اٹھا چل دیا۔

جب انگریزوں کو یہ معلوم ہوا کہ شہر اور قلعہ بادشاہ اور رعایا سے خالی ہو گیا ہے تو افسر مع گوروں کی پلٹنوں اور گورکھوں اور ہندوستانی سپاہ کے قلعہ میں داخل ہوئے اور شہر کو گھیر لیا[1]

انگریزوں کا دلی میں داخلہ

سب سے پہلے انگریزوں نے شہر کے سب دروازوں کا بندوبست کیا، پھر بغاوت کے جرم میں رعایا اور شرفا و رؤسا کو شہر بدر کر دیا اور جس شخص نے مقابلہ کیا وہ مارا گیا اور تمام مال و اسباب و مکان ضبط کر لیا گیا اور بلا امتیاز ہندو مسلمان تمام مکانات کھود ڈالنے کا حکم ہوا۔ امیروں اور غریبوں کی عورتیں روتی پیٹتی تباہ حال قصبوں اور گاؤں اور درگاہوں کی طرف جو شہر سے متصل تھیں نکل گئیں۔ اور جہاں جس کو بھی ذرا ٹھکانہ پاؤں ٹکانے کا ملا وہ ٹھیر لیکن ان خستہ حالوں کو گوجروں اور خاکیوں نے بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا یہاں تک کہ لوگ نان شبینہ تک کو محتاج ہو گئے سینکڑوں فاقوں سے ہلاک ہو گئے، سینکڑوں بیماریوں کی بھینٹ چڑھ گئے عام لوگوں کے علاوہ تمام شہزادے اور شہزادیاں بھی اس مصیبت میں مبتلا تھے اور ان کی حالت سب سے زیادہ دردناک تھی[2]

لال قلعہ میں انگریزوں کا داخلہ

جس لال قلعہ میں اب تک بڑے سے بڑا انگریز بھی آداب شاہی بجا لانے پر مجبور تھا، آج وہاں فاتح کی حیثیت سے نشہ پندار میں مست انگریز داخل ہو رہے تھے۔ مغلوں کا پرچم اقبال سرنگوں

---

[1] : نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۳

[2] : نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۳

ہوگیا اور انگریزوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے جنرل ولسن نے ایک کالم بھیجا وہ قلعہ جو بڑا نامور تھا، بابر کی اولاد نے جس میں رہ کر فرمان روائی کی تھی وہاں بالکل سناٹا تھا، نہ اس سے کوئی توپ چلتی تھی نہ کوئی بندوق، خاندان تیمور اس میں سے بے سروپا بھاگ رہا تھا، بہت جلدی سے اس کے دروازے کے پاس بارود کے تھیلے رکھ دیئے گئے ہوم صاحب نے آکر اس میں شتابہ لگایا، دروازہ اڑا، انگریزی سپاہ شور مچاتی ہوئی داخل ہوئی اور اس نے دروازہ پر اپنا علم قائم کیا، قلعے کے چھتہ میں جو تلنگوں کا ہسپتال تھا اس میں دو زخمی پڑے تھے جو اپنی پلٹنوں کے ساتھ جا نہیں سکے تھے، انگریزی سپاہ نے اپنی گولیوں سے ان کے زخموں تکلیف کا علاج کیا۔ شہزادے جو اپنے مکانوں کی حفاظت کے لیے بڑے بوڑھے اور گھر سے زائد آدمیوں کو بٹھا گئے تھے وہ بھی مارے گئے۔ غرض اب دہلی بالکل انگریزوں کے قبضہ میں تھی۔ جامع مسجد اور قلعہ وسلیم گڑھ میں انگریزی سپاہ مقیم تھی [۱]۔

- مقتولین و مجروحین و گم شدگان کے اعداد و شمار:
- دیوانِ خاص سے کلیسا کا کام لیا گیا:

نقشہ مقتولین و مجروحین اور گم شدگان جو ابتداء جنگ سے دہلی کے سامنے ۳۰ رمئی ۱۸۵۷ء سے دہلی کی تسخیر کی تاریخ ۲۰ ر ستمبر تک ہوئے۔

تفصیل	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	میزان	[illegible]	[illegible]	[illegible]	میزان
مقتول	۴۶	۱۴	۸۰	۷	۸۶۵	۱۰۱۲	۱۳۹	۵۷۲	۴۴۰	۱۰۱۲
مجروح	۱۴۰	۴۹	۲۰۷	۱۰	۲۳۸۹	۲۷۹۵	۱۸۶	۱۵۶۶	۱۲۲۹	۲۷۹۵
گم شدہ	۰	۰	۱	۰	۲۹	۳۰	۵۳	۱۳	۱۷	۳۰
میزان	۱۸۶	۶۳	۲۸۸	۱۷	۳۲۸۳	۳۸۳۷	۳۷۸	۲۱۵۱	۱۶۸۶	۳۸۳۷

[۱]: تاریخ عروج عہد انگلیشیہ، ذکاءاللہ، ص ۶۶۷۔

دہلی کی لڑائی میں کریمیا کی جنگ سے زیادہ نقصان ہوا۔ کریمیا کی لڑائی میں کل سپاہ ۹۷۱۲۴ تھی جس ۱۲۲۵۹ سپاہی مجروح و مقتول ہوئے تھے، یعنی ۱۲،۶۴۳ فی صدی اور دہلی میں ۳،۶۹ فیصدی جب سارے شہر پر قبضہ ہو گیا اور بادشاہ بھی گرفتار ہو گیا تو دہلی کی فتح کی خوشی میں توپیں چھوٹیں اور دیوانِ خاص میں ۲۷ ستمبر کو اتوار کے دن فتح کی شکرگزاری کی نماز پڑھی گئی۔[1]

ڈر اب بھی نہیں جاتا

فتح سے ذرا پہلے، لیکن غلبہ کی حالت میں بھی انگریزوں کے دل سہمے ہوئے تھے۔

مراسلہ نمبر ۱۲

جسے ہنری گریٹ ہیڈ منیر سپاہی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا،

مائی ڈیئر بارنس

دہلی ۱۴ ستمبر

میرے بھائی دبلی توپ خانہ سے ہندوستان کوٹ تک جاتے زخمی ہو گئے، گولی ان کے دائیں ہنسلی سے گزر کر سینہ کے پار اتر گئی، دوسرے بھائی حملہ کے تمام خطرات برداشت کرنے کے بعد بچ گئے اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اب بالکل تندرست و توانا ہیں کشمیری دروازہ کی فصیل کے سوراخ تک سیڑھی لگا پہنچے اور دروازہ کو بارود کے ذریعہ اڑا دینے اور اندر داخل ہو جانے کی کاروائی بہت کامیاب طریقہ سے عمل میں آئی یہ سب کچھ دن دھاڑے ہوا۔ نکلس کا دستہ فصیلوں کے گرداگرد تاخت کرتا ہوا۔ لاہوری دروازہ کے برج تک پہنچ گیا، وہ زخمی ہو گئے، سامانِ جنگ میں کمی ہو گئی اور انھوں (باغیوں) نے

---

[1] عروج عہد انگلشیہ از کا اللہ، ص ۶۵۳۔

پلٹ کر پھر کابلی دروازے پر حملہ کر دیا، کرنل کیمبل کا دستہ جو جانباز اور بہادر میٹکاف کی زیر کمان تھا، نہایت شاندار طریقہ سے جامع مسجد پہنچ گیا۔ ان کا انجینئر افسر گولی کھا کر مارا گیا اور ریت کے تھیلے پیچھے رہ گئے۔

اور آدمی ٹینڈی اور براؤن (انجینئر) کے ماتحت بھیجے گئے، اوّل الذکر مقتول اور موخر الذکر زخمی ہوئے۔ لاہوری دروازے والے حصّہ سے کوئی امداد نہیں آئی اور اس لیے کیمبل کو پسپا ہونا پڑا، پہلے بیگم کے باغ کی جانب جسے وہ ایک گھنٹہ تک اپنے قبضہ میں رکھ سکے ازاں بعد گرجا کے احاطہ میں۔ یہ ایک نازک موقع تھا ہمارے سپاہی تھک کر چور ہو گئے تھے۔ بہت سے افسر ناکارہ ہو گئے تھے، اور گھبراہٹ بہت زیادہ پھیل گئی تھی اور یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ریڈ کا دستہ کشن گنج پر قبضہ کرنے میں بالکل ناکام رہا، توپیں لائی گئیں اور اس طرح آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

افسوس ہے کہ جموں کی فوجیں جب سے اپنے پہاڑی مقامات سے نکلی ہیں نہ صرف بالکل ناکام رہیں بلکہ کشن گنج میں پانڈیوں کے مقابلہ میں ان کے ہاتھ سے چار توپیں بھی جاتی رہیں اور اس کی وجہ سے انھوں نے ریڈ کے بازوؤں کو خطرے میں ڈال دیا اگر یہ خبر صحیح ہے تو دیوان صاحب ہی نے فرار ہونے میں سبقت کی تھی، جیند کی پیدل فوج کی کارگزاری بہت اچھی رہی۔ آج ہماری پوزیشن (حالت) میں بہت کچھ ترقی ہوئی ہے۔ میگزین پر قبضہ کر لیا گیا اور اب ہمارا تصرف کابلی دروازہ سے لے کر نہر کے برابر اس فوج کی چوکیوں تک وسیع ہو گیا ہے، جو میگزین پر قابض ہے شہر کے اس سارے حصّہ کو باشندوں نے خالی کر دیا ہے اور اس لیے وہاں سے جو روپیہ پیسہ مل سکے گا اپنے قبضہ میں لے لیا جائے گا۔

پانڈیوں کی ایک معقول تعداد مقتول ہوئی اور میرا خیال ہے کہ بہت ہی کم لوگ بچنے پائے ہیں۔

کیمپ کی حفاظت کشن گنج کی ناکامی سے ایک حد تک خطرہ میں پڑ گئی تھی اس پر حملہ کا اندیشہ تھا مگر ہم انہیں سلیم گڑھ اور شاہی محل پر گولے برسائے جا رہے ہیں میرا خیال ہے کہ کامل کامیابی یقینی ہے ہماری فوج میں مقتول و مجروح دونوں کا شمار ۶۰۰ سے کم نہ ہوگا۔ نکلسن کی جان کا سخت اندیشہ ہے ان کے نقصان کی تلافی ناممکن ہے کرنیل کیمبل ۵۲ ویں بھی ناقابل ہو گئے ہیں۔

لوگ بھاگنے لگے

دہلی انگریزوں کے قبضہ میں پھر آ چکی تھی اور لوگ سمجھ رہے تھے اب ان کا کیا حشر ہونے والا ہے، چنانچہ فتح کے ساتھ ہی دلی کے لوگوں نے شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ ایک دروازے سے انگریز شہر میں داخل ہو رہے تھے اور دوسرے دروازے سے شہر والے راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ سب سوار اور پیدل، مستورات اور بچے دلی دروازے کے باہر ہو رہے۔ اس وقت دلی دروازے کا میدان صحرائے قیامت معلوم ہوتا تھا، ہزارہا پردہ نشین عورتیں بچے بوڑھے اور جوان مرد، ہوش باختہ شہر سے نکلے چلے آتے تھے کسی کو ہوش پردے کا نہ تھا۔ بہت سی نیک بختیں بے مقنع و چادر، جو کپڑا سر پہ تھا اوڑھے برہنہ پا چلی آتی تھیں۔

غرضیکہ بہزار مصیبت و مشقت افتاں و خیزاں ہمارا دو تین سو آدمیوں کا قافلہ برف خانے میں پہنچا، شب کو بے آب و دانہ سب نے بسر کی۔ صبح کو خیال ہوا کہ آب و دانہ کا فکر کیجئے میں نے اپنی بی بی سے پوچھا کچھ زیورات وغیرہ ساتھ سے کر نکلی ہو۔ انھوں نے کہا سوائے خدا کے نام کے کچھ پاس نہیں ہے۔ جب یہ بات میں نے سنی تو مجھے نہایت یاس اور فکر ہوا اب کیا کریئے۔ ایک بات خیال میں آئی۔ میں نے اپنے گھر والوں سے کہا تم جلدی کرو، میں ابھی بندوبست کرکے آتا ہوں۔ یہ کہکر میں برف خانے سے نکل کر روانہ ہوا اور چھپتا ہوا اجمیری دروازے سے نکل کر شہر میں داخل ہو کر اپنے مکان پر پہنچا اور چھپر کٹ پہ کھڑا ہوا تھا، میں نے اس کے پتر نوچنے شروع کئے

ط : محاصرہ دہلی کے خطوط صـ ۲۳

من کل الوجوہ ڈیڑھ دو سیر چاندی نوچکر چادر میں باندھی، پھر کوٹھری میں داخل ہُوا تو ایک گٹھڑی جس میں پانچ چار دو شالے اور دو شالی رومال اور انگرکھے بانات کے کنارے دار تھے۔ نظر پڑی وہ گٹھڑی بغل میں ماری اور چاندی کمر سے باندھی اور گھر سے نکلا۔ جب محلہ کے ترا ہے میں پہنچا تو اس وقت ایک تو گٹھری کا بوجھ معلوم ہُوا۔ اور دوسرے یہ خیال آیا کہ یہ گٹھڑی مجھ کو سے کر برف خانے تک کون پہنچنے دے گا راستے میں یہ بھی لٹ جائے گی اور اس کے ساتھ چاندی بھی، کیونکہ ان دنوں گوجروں اور لیٹروں اور گنوار میواتیوں کا یہ زور شور تھا کہ شہر کے باہر قدم رکھا اور لیٹروں نے مار لوٹا اور گنڈاسوں کے گرادیا اور جو کچھ پاس ہُوا وہ چھین لیا حتی کہ بدن کے کپڑے تک وہ مادر بخطانہ چھوڑتے تھے، جی میں آئی کہ اسے واپس گھر میں پھینکتا چلوں کہ سامنے سے ایک جوہری کا نوکر دکھائی دیئے، میں نے ان سے کہا کہ بھائی تم اپنے گھر لے جاؤ اگر لوٹ مار سے بچ گئے تو میں سب کچھ لے لوں گا ورنہ جُوتی کے صدقے سے انھوں نے بہت عذر کیا کہ میں نہیں لیتا، مگر میں ان کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اجمیری دروازے تک پہنچا اس وقت تک خلقت شہر کی نکل رہی تھی اور تمام پہاڑ گنج اور جے سنگھ پورہ وغیرہ میں دلی دروازے تک جنگل آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ غرضیکہ میں بخوبی برف خانے میں پہنچا اور وہ چاندی اپنے گھرانے میں جا کر دی اور یہ تین تولہ چاندی لے کر پہاڑ گنج کے ایک بنئے کی دوکان پر پہنچا اور اس سے کہا کہ اس کا مجھے سامان تول دے۔ اس نے کہا کہ میں بارہ آنے دوں گا، غرض کہ بارہ آنے کو دے کر چار آنے کے پیسے نقد لایا اور باقی کھچڑی لا کر پکنے کو دی اور مٹی کے برتن لایا اور پانی میرا بھائی کنویں پر سے بھر لایا۔ کھچڑی پکی اور سب نے کھائی[1]

---

[1] : داستانِ غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) ص۱۱۳

باب ۴

غدر کا چوتھا دور : انتقام

ہندوستان پر اب تک مسلمانوں کی حکومت تھی۔ آج سے تاریخ بدلتی ہے۔ اور اب ایک غیر ملک کے عیسائی تخت حکومت پر متمکن ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ وہ جنگجو ہیں۔ جہاد ان کا مذہبی فریضہ ہے، قتل و خون ریزی سے وہ شیفتگی رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کا مذہب یہ کہتا ہے کہ جو تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تم اس کے آگے اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے، تاریخ کے آئینہ میں واقعات بالکل برعکس نظر آتے ہیں، مکّہ کے مشرکوں اور کافروں نے، داعیٔ اسلامؐ کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائی تھیں، لیکن رحمت العالمین کا کوکبۂ جلال جب فاتح کی حیثیت سے مکّہ میں داخل ہوا، تو مکّہ کے کافر اور مشرک سہمے ہوئے تھے کہ اب گن گن کر بدلہ لیا جائے گا لیکن دنیا کے سب سے بڑے فاتح نے فرمایا لاتثریب علیکم الیوم۔ اذھبوا انتم الطلقاء (آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، جاؤ تم آزاد ہو) ساتھ ہی سارے مسلمان سپاہیوں کو حکم دے دیا گیا کہ لڑنے والے سے جنگ نہ کریں۔

پھر کئی سو برس بعد، یروشلم میں، ہلال و صلیب کی جنگ ہوئی۔ رچرڈ شیر دل نے عکہ پر قبضہ کر لیا، اور وہاں کے مسلمانوں کو، عام مسلمانوں ہی کو نہیں، عورتوں اور بچوں تک کو لرزہ خیز اور ننگ انسانیت مظالم کا ہدف بنایا۔ صلاح الدین کو، جب ان واقعات کی اطلاع ملی، تو اس نے قسم کھائی کہ، میں اس حرکت کا انتقام عیسائیوں سے لوں گا۔ حالات پلٹے۔ اور صلاح الدین

کی فوجیں فاتحانہ شان سے عکہ میں داخل ہوئیں، وہاں کے عیسائی دہل اٹھے کہ اب انتقام لیا جائے گا،

ہاں صلاح الدین نے انتقام لیا، لیکن کس طرح ؟ اس نے ان تمام لوگوں کو، جو لڑائی کے میدان میں جنگ کرتے ہوئے گرفتار ہوتے تھے رہا کر دیا، جو لوگ فدیہ نہ دے سکے، ان کا فدیہ اپنے پاس سے ادا کیا،

رچرڈ شیر دل کی قوم، جب دلی میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئی، تو اس کا مزاج بدلا ہوا تھا، وہ مسیح ؑ کی تعلیمات فراموش کر چکی تھی، رچرڈ کا کردار اس کے سامنے تھا، اس نے مسیح ؑ کو چھوڑ دیا اور رچرڈ کو لے لیا، اس نے وہی کیا، جو رچرڈ نے عکہ میں کیا تھا، کوئی ایسا ظلم نہ تھا، جو اس نے اٹھا رکھا ہو، اس کے دستِ جفا سے کوئی نہیں بچا، نہ، باغی نہ مطیع، نہ وفادار، نہ خطا کار ـــــ!

دلی والے کس طرح بھاگے

دلی والے، انگریزوں کے مزاج شناس ہو چکے تھے، وہ جانتے تھے، اب ان کی شمشیر انتقام بے نیام ہو گی، اور گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسے گا، چنانچہ انہوں نے عافیت کی تلاش میں بھاگنا شروع کیا، ان لوگوں نے بھی جنہوں نے غدر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا، جنہوں نے غدر میں انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں!

"غرض بڑی بدحواسی سے مولوی مع بال بچوں اور عورتوں کے کوٹھوں کوٹھوں دکن کی طرف بھاگے ان میں ہمارے مولانا بھی شریک تھے اس وقت کی پریشانی بیان نہیں کی جا سکتی جتنے منہ اتنی باتیں بعض کی تو یہ رائے تھی کہ کہیں مت جاؤ یہیں گھروں میں بیٹھے رہو اور بعض کی یہ صلاح تھی کہ جرنیلی حکم آیا ہے تو نکل جانا چاہیے غرض یہی رائے غالب رہی اور عورتوں نے اپنا اپنا زیور نکال کر صحن میں پھینک دیا اور ململ تن زیب کے دو پٹوں کی جگہ فرش کی چاندنیاں پھاڑ پھاڑ کر اوڑھیں صبح ہوتے ہوتے مولوی لوگ باغ میں پہنچے اب انگریزی زد میں اور ان میں ایک سڑک حائل تھی چاہتے تو باغ میں ٹھیرتے مگر ڈر کے مارے سوئی والوں کے محلہ میں

پہنچے وہاں اُن لوگوں کی کچھ رشتہ داری تھی مکان دیکھا خالی ہے چولھے کے پاس تگن میں آٹا گندھا ہوا رکھا ہے توا چڑھا ہے آگ ٹھنڈی پڑی ہے معلوم ہوتا ہے روٹی پکانے کی نوبت نہیں آئی کوئی خطرہ عاجل پیش آیا کہ بھاگ کھڑے ہوئے نیر مولویوں کا خاندان ٹھہرا آگے چل بھی کیسے سکتے ننھے ننھے سو میں ساتھ تھیں پڑے سواری کا کوئی انتظام نہیں عورتیں بچاریوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں ایک ایک کا پاؤں چھلنی ہو گیا۔ (۱)

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

دہلی میں انگریزوں کے داخلہ کے بعد کا ایک منظر: اُس وقت ہماری حضرت کا حال قیامت سے کم نہ تھا میری بیوی ہر چند کہ شرم کے مارے منہ سے کچھ نہ بولی لیکن آنکھیں کیسے ہوتے رو رہی تھی آخر جب اٹھنے لگا تو چپکے سے یہ الفاظ کہے کہ باپ اور چچا تو مارے گئے فقط تمہارے دم کا سہارا تھا۔ مجھے کس پر چھوڑے جاتے ہو؟ میں نے کہا خدا کے حوالے کیے جاتا ہوں۔ اگر زندہ رہا تو آ موں گا اور اگر مارا گیا اور تم سن تو دُھر بخش دینا۔

غرضکہ بہزار خرابی خواجہ صاحب میں پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم کثیر مرد و زن کا قائم ہے۔ شب کو میں نے کچھ چاندی ایک صراف کے ہاتھ فروخت کی۔ لوگوں نے کا بندوبست کر کے ہم زمین پر پڑ رہے۔ صبح کو ایک پندرہ بیس ہزار آدمی کا قافلہ جس میں نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں، اور احمد قلی خاں بادشاہ کے خسر اور بہت سے بڑے بڑے آدمی شامل تھے۔ وہ گوجروں کو دو ہزار روپیہ دے کر اور ہمراہ لیکر خواجہ صاحب سے روانہ ہوئے۔ ہم بھی اس قافلے کے ہمراہ ہوئے۔ راستہ میں ہزارہا عورات پردہ نشین اور بچے ہمراہ تھے۔ منزل دراز تھی دوپہر کا وقت نیچے کی تپتی ہوئی ریت۔ جنگل تو ودق سنے کا نام نہیں۔ تلووں میں آبلے۔ زبانوں میں بے آبی سے کانٹے پڑے ہوئے روتے دھوتے چلے جاتے تھے۔ اب آغاز اور انجام اس سفر کا کچھ معلوم نہیں کہ یہ راستہ کہاں کو جاتا ہے کون کون سے شہر راستے میں پڑیں گے؟ کس ریاست میں پہنچیں

---

(۱) حیات النذیر، ص ۳۲

گے۔ پس ہمراہ قافلے کے ہیں جدھر قافلہ جاتا ہے اُدھر جاتے ہیں۔ گھر سے کبھی نکلے نہیں اس مصیبت کا کبھی سفر کیا نہیں۔ راستوں سے نابلد منزلوں سے ناواقف شہروں اور ریاستوں کا حال سوائے انگریزی علاقہ کے جانتے نہیں۔ ایک دو بار پہلے سفر کا اتفاق ہوا ہے تو انگریزی میرٹھ کی طرف ہوا ہے۔ تو یہ کہاں آسائش بڑی دل لگی کا سفر ہوا ہے۔ نہ اس مصیبت کا کہ زمین تک قدم رکھنے کی روادار نہیں جہاں جھاڑ جھاڑ، کانٹا کانٹا دشمن ہے۔ قصہ مختصر شب کو پڑے رہے۔ صبح ہوتے ہی پھر قافلے کے ہمراہ ہوتے۔ دوپہر کو جا کر فرخ نگر میں داخل ہوتے۔ کچھ چاندی بیچ کر کھانے کی تجویز ہوئی۔ اب وہاں باہم کھچڑی پکنی شروع ہوئی۔ اور صلاح و مشورے ہونے لگے کسی نے کہا ہم ادھر جائیں گے کسی نے کہا ہم اُدھر جائیں گے۔

ہم حیران ہیں کہ یا الٰہی ہم کدھر جائیں۔ آخر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا یہاں سے جھجر قریب ہے۔ یہ نام سنتے ہی جان میں جان آگئی۔ وہاں تو ہمارے ماموں حکیم مرزا قاسم علی خان صاحب مختارِ ریاست ہیں۔ ان کے پاس چلیے اور ان کی صلاح کے کاربند رہیے۔ غرضکہ دوسرے روز جھجر کا راستہ پوچھ کر ادھر کو روانہ ہوتے اور اسی دن جھجر پہنچے۔ اور مکان پوچھ کر ان کے ہاں پہنچے، ماموں صاحب نے جب شکل دیکھی تو چیخیں مار کر رونے لگے۔

آغا سلطان تو باہر ہی ٹھہرے۔ مجھے اور میرے بھائی کو گھر میں لے گئے۔ ممانی سے کہا دیکھو تو بھانجوں کا کیا حال ہے۔ میری بہن بادشاہ بیگم نے ان کو کس مصیبت سے پرورش کیا تھا۔ آج یہ اس مصیبت میں مبتلا ہیں وہ بھی آبدیدہ ہوتیں۔

آدھی رات کے وقت ان کو نواب صاحب نے بلوایا۔ وہ وہاں گئے ایک گھنٹہ کے بعد واپس آئے۔ اور آبدیدہ آئے۔ میں نے پوچھا ماموں خیر ہے۔ فرمایا بھائی کیا پوچھتے ہو انگریزی فوج یہاں بھی آ پہنچی۔

اب تم ایک کام کرو۔ یہاں سے سیدھے پانی پت کو روانہ ہو جاؤ۔ غرضکہ اسی وقت بہلی تیار ہوئی اور ہم تیار ہو کر پانی پت میں آئے۔ اور ایسے وقت کہ رات کے گیارہ بج گئے

تھے۔ اور میرے والد گریہ وزاری کرکے صحن میں کھڑے ہمارے لیے سلامتی کی دعا مانگ رہے تھے۔ میں دروازے پر پہنچا۔ اور میں نے آواز دی کہ دروازہ کھولو۔ میری بڑی خالہ میری آواز پہچان کر دوڑیں غرضکہ دروازہ کھلا اور میں نے جا کر والد کے قدم لیے۔ انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ ہم نے وہاں ایک چھوٹی سی تجارت کا ڈھنگ ڈال کر قوت بسری کی سبیل کی اور ایک دوکان کرایہ کو لی۔ تھوڑے عرصہ میں تین چار سو کا سامان دوکان میں فراہم ہوگیا تھا۔ اور دو روپیہ روز کا میرے گھر کا خرچ تھا۔ پانچ ماہ تک ذرا امن وامان کی صورت رہی۔ مگر فلک کج رفتار اور زمانہ ناہنجار کب دیکھ سکتا تھا کہ یکایک آسمان سے سنگ حوادث برسنے لگے۔ اور زمین نے فتنۂ تازہ برانگیختہ کیے۔ اور حشرات کی طرح زمین سے ایک بچھو پیدا ہوا۔

یعنی دہلی سے دہی موذی اور اوباش مجرموں کا سرغنہ گامی بدمعاش بلائے ناگہانی کی طرح پانی پت میں نازل ہوا۔ اور دار وگیر کا بازار گرم ہوا اور دلی والے گرفتار ہونے شروع ہوگئے۔ ادھر ریست (پانی پت) میں نواب حامد علی خاں صاحب اور ان کے تمام کنبے کو گرفتار کر دیا تو ہر پانی پت میں قیامت برپا ہوگئی۔ اور پانی پت کا محاصرا ہوگیا۔ مگر آفرین مردان پانی پت پر وہ مہر فرنوازی فرمائی کہ باپ بیٹے کے ساتھ یہ سلوک نہ کرے گا۔ دلی والوں کے ساتھ جانیں لڑا دیں اور اپنے گھر کے زنانوں کے ساتھ چھپا چھپا کر رکھا۔ اور جان سے آبرو سے ساتھ دینے کو موجود تھے۔ اور جس دن سے دلی کے لوگ پہنچے تھے۔ اپنے گھروں میں بٹھا لیا تھا اور روپے سے، روٹی سے، کپڑے سے، پیسے سے۔ سب طرح سلوک کرتے تھے۔ قصہ مختصر جب پانی پت کے گرد گھیرا پڑ گیا۔ اور ناکہ بندی ہوگئی۔ اور دلی والے گرفتار ہونے لگے۔ میں ایک دن اپنی پھوپھی کے مکان پر گیا وہاں پہنچ کر میری طبیعت گھبرائی اور دل چلنے لگا۔ میری بہن نے مجھے روکا بھی مگر میں اٹھ کر ڈیوڑی کے باہر چلا آیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے آدمی اس گلی میں چلے آتے ہیں۔ اور آگے تھانہ دار ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ اب جو الٹا پھر کر جاتا ہے تو یہ گھر میں جا کر گرفتار کرلیں گے۔ بس سیدھا یہ کہتا ہوا ان کے سامنے سے چلا گیا۔ بھئی ان دلی والوں کے سبب ہم بھی مصیبت میں آ

گئے۔ اور انہوں نے مجھے نہ پہچانا۔ وہ آدمی اسی مکان میں گھسے جس میں سے میں برآمد ہوا تھا۔ اس تھانیدار نے گھر میں داخل ہو کر میرے پھوپھا اور میرے بہنوئی کو گرفتار کیا۔ اور میرے آگے سے لے گیا۔ جب وہ چلا تو میں وہاں سے نکل کر گریزاں ہوا۔ تو ایسا بے اوسان تھا کہ کئی جگہ گرا۔ غرضکہ افتاں و خیزاں اپنی خوش دامن صاحبہ کے گھر پہنچا۔ اور یہ حقیقت بیان کی اور کہا کہ اب میرا یہاں سے نکل جانا مصلاح ہے، ورنہ گرفتار ہو جاؤں گا،!" (۱)

غالب کی آنکھوں نے کیا دیکھا؟

مرزا غالب بھی انگریزوں کے بڑے قدر شناسوں اور ثنا خوانوں میں تھے، لیکن فرماتے ہیں:

"۱۱ دسمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی سپاہ نے اس شدومد کے ساتھ کشمیری دروازے پر گولہ باری کی کہ کالوں کی سپاہ میں بھاگڑ پڑ گئی۔ اگرچہ ۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک چار ماہ اور چار روز کا وقفہ تھا لیکن چونکہ شہر دوشنبہ ہی کے روز ہاتھ سے نکلا اور دوشنبہ ہی کے روز پھر ہاتھ میں آ گیا۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی دن کے اندر شہر ہاتھ سے نکلا اور ہاتھ میں آ گیا۔

غرض فتح مند فوج اس سڑک سے جو ان کے سامنے تھی شہر میں داخل ہوئی جو شخص راہ میں ملا قتل کر دیا گیا۔ معززین شہر اپنی آبرو کو بچاتے گھر میں پڑے رہے۔ باغی شہر سے بھاگ نکلے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے مقابلہ کیا۔ اور سینہ سپر ہو کر لڑے۔ اپنے نزدیک دوسروں کو کاٹا۔ مگر میرے نزدیک اہلِ دہلی کی جڑیں کاٹ گئے۔ دو تین روز تک شہر میں کشمیری دروازے سے لے کر چاروں طرف کوچہ و بازار میدانِ کارزار بنے رہے۔ رفتہ رفتہ صرف تین دروازے یعنی اجمیری دروازہ ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ کالوں کے قبضے میں رہ گئے۔ گوروں نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے گناہوں اور بے نواؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور جا بجا مکانات میں آگ لگا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب

---

(۱) داستانِ غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

کوئی مقام سخت خونریزی کے بعد حملہ آور کے قبضے میں آتا ہے تو اس مقام کے رہنے والوں پر اسی قسم کی سختیاں اور مصیبتیں نازل ہوتی ہیں ۔

جب اہل شہر نے فتح مندوں کی یہ کینہ وری اور غیظ و غضب دیکھا تو ان کی امید نا امیدی سے بدل گئی۔ اور بے شمار غربا و شرفا اپنی مستورات کو لے کر ان تینوں دروازوں میں سے شہر چھوڑ کر نکل گئے ۔ اور شہر کے باہر چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قبرستانوں میں جا کر دم لیا۔ جب وہاں بھی چین نہ ملا۔ تو ان میں سے بہت سے سفر کے مصائب اٹھاتے ہوئے دور دراز مقامات میں چلے گئے ۔

۱۴ ستمبر کے بعد پانچ روز تک شہر کے اندر کالوں اور گوروں میں جا بجا لڑائی ہوتی رہی ۔ یہاں تک کہ کالے رفتہ رفتہ پیچھے ہٹتے گئے۔ اور گورے شہر پر قابض ہونے گئے ۔ بالآخر ۱۸ ستمبر کو جمعہ کے روز شہر کالوں سے خالی ہوگیا۔ اس کے بعد پکڑ دھکڑ قتل و غارت گری کا بازار اور زیادہ گرم ہوا ۔ (۱)

محمد حسین آزاد کی بپتا

"دفعۃً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل ان کے فرزند بھانجی کے ساتھ ان کے فرزند روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتح یاب لشکر کے بہادر دفعۃً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھا کر کہا کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیری تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا۔ اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کی جنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین! اگر خدا نے کرم کیا۔ اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر استاد کہاں سے پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب ان کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہیں رہے گا۔ وہی جنگ اٹھا بغل میں

---

(۱) "دستنبو" غالب کی فارسی تاریخ غدر ص [illegible]

فرمایا بجائے بچانے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلّی بھی ایک بہشت ہے۔ انہی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں۔ (۱)

سرسیّد کے خاندان کا ماجرا

سرسیّد نے غدر کے زمانہ میں انگریزوں کے گراں بہا خدمات انجام دیتے تھے، لیکن ان کا خاندان بھی ہدفِ ستم بننے سے نہ بچ سکا!

"کچھ اوپر پانچ مہینے سرسید کو میرٹھ ٹھہرنا پڑا میرٹھ میں اُن کو معلوم ہوا کہ دلّی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر لوٹ لیا ہے ان کے ماموں وحید الدین اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں کے ہاتھ سے مارے گئے ان کی والدہ اور خالہ جب گھر لٹ گیا تو حویلی چھوڑ کر جلو خانہ کی ایک کوٹھری میں جہاں ایک لاوارث بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اُس کوٹھری میں بسر کیے اس عرصے میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ جس دن سے ان کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اُسی کو کھاتی رہیں دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی سرسید کہتے تھے

"جب میں نے کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی تو انہوں نے کواڑ کھولے اور پہلا لفظ جو اُن کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ ہیں! تم یہاں کیوں چلے آئے؟ یہاں تو لوگوں کو مار ڈالتے ہیں تم چلے جاؤ ہم پر جو گذرے گی گذر جائے گی میں نے کہا آپ خاطر جمع رکھیئے میرے پاس حاکموں کی چھٹیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں سے اور دلّی کے گورنر سے ملکر آیا ہوں تب اُن کی خاطر جمع ہوئی چاروں طرف سناٹے کا عالم طاری تھا میں سیدھا پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا جب اپنے گھر کے پاس پہنچا دیکھا کہ کوئی بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اُس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے اور کسی قدر بدحواس ہے وہ پانی کی تلاش میں نکلی تھی تھوڑی

---

(۱) آب حیات صـ۴۵۷

وہ چل کر بیٹھ گئی پھر اٹھا نہ گیا میں نے اُس کو آبِ خورہ میں پانی دیا اور کہا کہ پانی پی لے اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبِ خورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور گھر کی طرف اشارہ کیا میں دوڑا ہوا گھر کی طرف گیا اور والدہ اور خالہ کو تھوڑا پانی پینے کو دیا انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بندوبست کروں اور والدہ اور خالہ کو میرٹھ لے جاؤں باہر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ بڑھیا مری پڑی ہے پھر سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے احکام جاری کیے تھے کہیں سواری نہ ملی آخر قلعہ کے حکام نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے وہ   مل جائے میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے گیا۔ (۱)

سنگینیں چبھوئیں، گائے کا گوشت کھلایا

موقع پاکر ان انگریزوں نے کیا نہیں کیا ——— ؟

”انبالہ سے لشکر دلی کی طرف پورا کوچ کر رہا تھا۔ گوروں پر مئی کی گرمی بڑا ستم کر رہی تھی۔ دن کو تو گرمی کی شدت کے سبب سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ رات کو سفر کر سکتے تھے۔ دن کو خیموں میں ہارے تھکے ایسے سوتے تھے کہ مردے سے بدتر معلوم ہوتے تھے۔ مگر شام کے ہوتے ہی پھر زندہ ہو جاتے تھے وہ اس گرمی میں پانی کے پیاسے ایسے نہیں تھے۔ جیسے کہ باغیوں کے خون کے پیاسے جن دیہاتیوں نے ان انگریزوں کو جو دہلی سے مفرور ہو کر گئے تھے۔ ستایا تھا یا مارا تھا۔ جب وہ گرفتار ہو کر آتے تو ان کی گرفتاری اور روبکاری اور سزا یابی کے تھوڑے سے وقت میں بھی بعض گھوڑے   سوار بڑی اذیت ان کو دیتے وہ ان کے بال کھینچتے اور اپنی سنگینیں ان کے بدن میں چبھوتے۔ اور زبردستی گائے کا گوشت ان کو کھلاتے۔ اور گوروں کی ان سب حرکتوں کو ان کے افسر دیکھ کر مسکراتے۔ (۲)

---

(۱) حیاتِ جاوید (حالی)، ص ۵۲

(۲) تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ)، ص ۴۷۲

سکھ دلی لوٹنے کی فکر میں تھے

غدر کے سلسلہ میں سکھوں نے انگریزوں کی غیر مشروط مدد کی، انہیں مسلمانوں سے فرضی اور واقعی جرائم کا بدلہ لینے کا نادر موقع مل گیا تھا، ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ دلی کو لوٹ لیں:

اگرچہ انگریزی عملداری کے اور حصوں میں اختلاف مذہبی تھا، مگر بہت دنوں تک آپس میں رہنے سے ہندو مسلمانوں میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ لیکن پنجاب میں مسلمان ہندوستانیوں سے جدا تھے۔ سکھوں کو دہلی کے بادشاہ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ سکھوں میں یہ پہلے سے پشین گوئی چلی آتی تھی۔ کہ وہ کبھی نہ کبھی دن دہلی کو لوٹیں گے۔ اب موقع ملا کہ فرنگیوں کے ساتھ ہو کر اپنی پیشین گوئی کو پورا کریں۔ (۱)

سکھوں کی وفاداری انگریزوں سے!

اگرچہ سکھ تازہ غلام تھے، اور ان کی سکھ حکومت کا انگریزوں نے خاتمہ کر دیا تھا، لیکن وہ آنکھیں بند کر کے ان کا ساتھ دے رہے تھے:

"معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی رجمنٹ وفادار ہے۔ وہ ہندوستانی سپاہ سے لڑنے کو آمادہ ہے۔ بنارس ہی میں نہیں بلکہ سب جگہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سکھ انگریزوں کے خیر خواہ رہیں گے۔ (۲)

اس وقت تمام سکھ سردار جو بنارس میں قیدی تھے، وہ بڑے خیر خواہ انگریزوں کے ہو گئے تھے۔ وہ کمشنر کے باڈی گارڈ اور اس کے گھر کے پہرہ دار بن گئے تھے۔" (۳)

انگریز سکھوں کو رشوت دیتے تھے

اور انگریز، سکھوں کے اس جذبہ کی پوری پوری حوصلہ افزائی کر رہے تھے، وہ اپنا کام نکالنے کیلئے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۴۹

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۴۸۵ (۳) تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۴۸۵

ان کی خوشنودیٔ مزاج کے متمنی تھے۔ مسلم کش کے سلسلہ میں ان کی ہر خواہش پر لبیک کہتے تھے:

"سکھ قلعہ الہ آباد سے باہر آتے جاتے تھے۔ لوٹ مار خوب کرتے تھے۔ سکھ ڈائن اور سپرٹ بہت سے سوداگروں کی دکانوں کی لوٹ کر قلعہ میں آئے تھے۔ اور پانی کی طرح خود پیتے تھے اور یورپین کے ہاتھ بیچتے تھے۔ بدمستی کی فرماں روائی ہو رہی تھی۔ غرض شراب بھی ایک دشمن تھی جس کو نیل صاحب نے گولی بارود سے نہیں بلکہ اپنی عالی دماغی سے یوں اپنے بس میں کیا کہ کمسریٹ کے محکمہ کو ہدایت کی کہ وہ سکھوں سے ساری شراب خرید لیں۔ اور منہ مانگی قیمت ان کو دے دیں۔ اور گورنمنٹ کے گودام میں رکھ دیں۔ انہوں نے صلاح مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سکھ لوٹ کے بڑے بھوکے ہیں ان کو باغی زمینداروں کے لوٹنے کی ترغیب دی جائے۔ تو وہ بہت خوش ہوں گے۔"[1]

سکھوں نے مسلمان باغیوں کو کس طرح ہلاک کیا؟

یہ ایک بڑی دردناک کہانی ہے ؎

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے
بڑی پر درد ہے اپنی کہانی

کہانی شروع ہوتی ہے:

"سکھ دیہاتیوں کی ایک بڑی جماعت دریائے راوی کے کنارے جمع تھی جس کے چہرے اس لیے خوشی سے چمکتے تھے کہ وہ باغیوں کو آسانی سے پسپا کرنے پر کامیاب رہے تھے چنانچہ ۱۵۰ آدمی گولیوں سے ہلاک ہو گئے اور ایک کثیر تعداد کو دوبارہ دریا عبور کرنے پر مجبور کیا گیا جن میں سے بیشتر حصہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا لیکن باغیوں کی ایک بہت بڑی تعداد دریا کے ٹاپو کی طرف بھاگ گئی جہاں وہ لکڑیوں کے تختوں کے ذریعہ تیرنے میں کامیاب ہوئی اور بعض ایک

---

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص۴۹۹

میل کے فاصلہ پر ایک جزیرہ میں اترنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پر وہ دور سے جنگلی مرغوں کی طرح بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے اب صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ اس جماعت کو محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا جائے جس کے بعد ایسی شدید سزا دی جائے جو دوسروں کے لیے عبرت ہو۔

اب مسٹر کوپر COOPER کے راستے میں ایک عجیب و غریب مشکل حائل تھی لیکن انہوں نے ایک عملی آدمی کی حیثیت سے حالات پر پورا قابو حاصل کر کے حسب منشاء کاروائی کی جس کا ذکر وہ اپنے الفاظ میں کرتے ہیں۔

"باغیوں کی قسمت کو بدلنے کے لیے قدرت اور اتفاقات حسنہ نے ہمارا ساتھ دیا کیونکہ اگر انھوں نے بھاگنے کے لیے کوئی حرکت کی ہوتی تو یقیناً ایک ہولناک لڑائی شروع ہو جاتی لیکن شکر ہے کہ انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ قدرت نے ان کے دماغ میں خاموش رہنے کا خیال ایسا ڈال دیا جو بالکل ہمارے حق میں تھا سورج کی سنہری کرنیں پوری روشنی کے ساتھ چمک رہی تھیں جب ہم نے دو کشتیوں پر سپاہ کو بھیجا جن کی سنگینوں اور پستولوں کی چمک سے خائف ہو کر تمام باغی سرٹ کر دونوں ہاتھ سینوں پر باندھے ہوئے ساحل کی طرف پوری خاموشی اور عاجزی کے ساتھ بڑھے اگرچہ ان میں سے بعض نے چلا نگیں ماریں لیکن فی الفور سنگینوں نے ان کا رُخ پھیر دیا وہ بھی ایک بھیانک نظارہ تھا جبکہ اُن کے لمبے لمبے عکس پانی پر سورج کی کرنوں سے پڑتے دکھائی دیتے تھے لیکن سواروں کو چونکہ حکم دیا گیا تھا۔ کہ کسی آدمی کو گولی سے نہ مارا جائے اس لیے احمق باغیوں نے یہ سمجھا کہ مسٹر کوپر کا منشا ان کو جان سے مارنے کا نہیں بلکہ ان کے خلاف مقدمے چلائے جائیں گے اس غلط امید کے بھروسے پر چھتیس تنومند جوانوں نے اپنے آپ کو ایک ہی شخص کے ہاتھ سے بندھوانے کے لیے خاموشی سے پیش کر دیا اور اس ذلت کو پسند کیا کہ انہیں کشتی کے

ایک گوشہ میں ایک ریوڑ کی طرح ایک دوسرے کے اوپر پھینک دیا جائے۔
آدھی رات تک ۲۸۲ دو سو بیاسی آدمیوں کو قید کر کے کوتوالی کے ایک برج میں بند کر دیا گیا ان کے علاوہ باغیوں کی کافی تعداد کو دیہاتیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا جن کے انجام کے متعلق تاریخ کے صفحات آج تک خاموش ہیں کہ دیہاتیوں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا چونکہ اُسی رات بارش ہو گئی تھی اس لیے پھانسیوں کو دوسرے دن پر اٹھا دیا گیا لیکن مسٹر کوپر جیسا مذہبی جذبات کا دلدادہ انسان ایسے موسم کی افسردہ خوبصورتی کے اظہار تک سے پہلوتہی نہیں کرتا چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"فرحت و تازگی بخشنے والا چاند اپنی خوب صورت اور مختلف النوع اوڑھنی سے
بادلوں کو چیر کر نکلا اور تمام فضا کو جگمگ جگمگ کر دیا گویا کہ وہ قیدیوں کے نوشتے
کو جلا دے رہا تھا۔"

دوسرے دن علی الصبح سکھوں کا ایک دستہ رسّے لیکر پہنچ گیا جو درختوں کی کمی کی وجہ سے استعمال نہ کیے گئے بہرحال مسلمان باغیوں کو نیست و نابود کرنے میں سکھوں نے مسٹر کوپر کا ہاتھ اچھی طرح بٹایا اگرچہ اسے اندیشہ تھا کہ شاید سکھ باوجود وفادار ہونے کے اس حد تک مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں کامیاب نہ ہوں جس طرح مسٹر کوپر چاہتا تھا وہ لکھتا ہے کہ

"پہلی اگست کو بقر عید کے تیوہار کا دن تھا جسے مسلمان ہر سال جانوروں کی قربانی کر کے نہایت دھوم سے منایا کرتے ہیں اس لیے مسلمان سواروں کو وہاں سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک معقول عذر تھا چنانچہ ان کو اس تیوہار منانے کے لیے امرتسر بھیج دیا گیا اور صرف ایک عیسائی افسر وفادار سکھوں کی امداد سے ایک مختصر قسم کی قربانی کرنے کے لیے وہاں پر آگیا جو مطلقاً نہ گھبرایا بلکہ پورے حوصلے اور جرأت سے اس کام کو بخوبی سرانجام دیا اب مشکل یہ پیش آئی کہ لاشوں کو کس طرح دبایا جائے تاکہ وہاں رہنے والوں کی تعفّن و بدبو سے صحت خراب نہ ہو لیکن قدرت نے پھر ہماری امداد کی یعنی اتفاق سے قریب ہی ایک ویران کنواں مل گیا جس سے اس مشکل کا حل بھی نکل آیا۔
قیدیوں کو بازوں سے پیچھے کی طرف باندھ کر دس دس کی ٹولیوں میں میدان میں گولی

سے اڑا دینے کے لیے باہر گھسیٹا گیا اپنی قسمت کا انجام سن کر اُن کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہیں
ہی۔ جس کا نقشہ وہ اس طرح سے کھینچتا ہے ۔
"جب تقریباً ڈیڑھ سو باغیوں کو اس طرح گولی سے اڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے
ایک شخص گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سب سے بوڑھا سپاہی تھا اسے آرام کرنے کے لیے تھوڑا وقفہ
دیا گیا اس کے بعد قتل کی کاروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا اور جب تعداد ۲۲۷ تک پہنچ گئی تو ایک
افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں وہ چند گھنٹے پہلے
سے بند کر دیئے گئے تھے اس پر برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت ہی دردناک
نظارہ دیکھنے میں آیا جس سے ہالول کے بلیک ہول Holwell's Black Hole
کی تلخ یاد دوبارہ تازہ ہو گئی یعنی ۴۵ انسانوں کی مردہ لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت
اور دم کے گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ..... ہلاک ہو گئے تھے۔ ان مردہ اور نیم جان لاشوں
کو اپنے مقتول ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ گاؤں کے بھنگیوں کے ہاتھوں قریب کے ویران کنوئیں
میں پھنکوا دیا گیا کوپر Cooper اس طرح فرسا حادثہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے لکھتا ہے کہ
" متذکرہ صدر حادثہ کے حالات جو خود میری قلم سے لکھے گئے ہیں میرے ہموطنوں کو یقیناً
حیرت و استعجاب میں ڈال دیں گے کہ کس طرح ایک انگریز نے تن تنہا چند ایشائی سپاہیوں کی مدد سے
اتنی خطرناک ذمہ داری کو اٹھا کر اس قسم کی یادگار زمانہ قتل و غارت کو نہایت سہولت سے ہوتے
ہوئے دیکھا جبکہ فریق مخالف کی طرف سے نہ تو کھلی جنگ کی گئی جس سے طبیعت جوش میں آکر
قتل و غارت کرنے کے لیے ابھرتی ہے اور نہ کسی ایک فرد واحد کو کوئی زخم پہنچایا گیا جس کی بنا پر
اس قسم کی شدید منتقمانہ کاروائی کی ضرورت لاحق ہوتی لیکن ایسے اصحاب کو واضح ہونا چاہیئے کہ پنجاب کے
گورنران انگریزی کیریکٹر اور خصلت کے مالک ہیں۔ اس لیے لارڈ نیلسن : LORD NELSON
کی طرح وہ اپنے ماتحت سے متوقع ہیں کہ خطرے کے وقت ہر ایک شخص انگلستان کے لیے اپنا فرض
انجام دے گا۔ کتاب کے مقدمہ میں بھی کوپر نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے چنانچہ اس کتاب کے

لکھنے کا مقصد جہاں یہ بتانا تھا کہ کس طرح انگریز پنجاب میں حکومت کرتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ:۔

"عیسائیت کے فروغ کے لیے خداوند یسوع مسیحؑ کی روشن و ظاہر امداد اور برکت کے مقابلے میں انسانی شجاعت اور دانائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی"

کتاب کے خاتمہ پر وہ لکھتا ہے کہ:۔

اُن انسانوں کے لیے جو ظاہری نشانات سے مستقبل کے متعلق فال لینے کے عادی ہیں ہم دہلی کے عیسائی گرجے کی صلیب کے نشان پر توجہ دلاتے ہیں کہ اگرچہ وہ گولی جس پر صلیب کا نشان کھڑا کیا گیا تھا، باغیوں کی چاندماری سے چھلنی ہو چکی ہے لیکن صلیب کے نشان کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا وہ اُسی طرح سالم کا سالم اپنی پہلی حالت پر موجود نظر آتا ہے تمثیلاً یہ معنی ہیں کہ عیسائیت نے تمام دُنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے"[1]

مسلمان شاعر اور سکھ راجہ

سکھوں کا مسلمانوں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا۔ لیکن مسلمان سکھوں سے ان کے شاہی خاندان سے، ان کے آخری فرماں روا سے ہمدردی رکھتے تھے:

اپنے قارئین کی فرمائش پر فوائد الناظرین نے سکھوں کی لڑائی کا مفصل حال درج کیا ہے۔ نقشے اور چارٹ دیئے ہیں، جس سے فوجوں کی ترتیب اور زخمیوں اور مرنے والوں کی تعداد معلوم ہو سکی، جب مہاراجہ دلیپ سنگھ نے لاہور کو خیر باد کہا ہے تو مفتی غلام سرور نے ذیل کا قطعہ تاریخ کہا تھا۔ جو رام چند نے نقل کیا ہے۔

قطعہ

چوں شد پنجاب از پنجاب رفت
چشمہ سال از چشم مردم کاب رفت

---

[1] The Indian Mutiny (4th Edition) P. 353

عالمے در چشم مردم شد سیاہ
چوں ز چشم آں غیرت مہتاب رفت
جملہ گل در بحر او خوار تد ــــــ ، گل
بلکہ از نرگس خمار خواب رفت
گفت سرور از سرور دیں سخن
نو گلے از گلشن پنجاب رفت (۱)

سکھوں کی وفاداری بھی کام نہ آئی لیکن یہ وفاداری بھی کام نہ آئی، انگریز نے جب اور جہاں چاہا، سکھوں کے حلقوم وگلو پر بھی انتقام کا خنجر بے تکلفی سے چلایا:

"نکلسن صاحب نے ۵۵ پلٹن کے قیدیوں کی نسبت اڈورڈس صاحب کو لکھا کہ اس رجمنٹ کے تمام افسر یہ کہتے ہیں کہ سکھ آخیر تک ہمارے ساتھ رہے۔ اس لیے میں انصاف میں رحم کو ملاتا ہوں اور سکھوں کو اور تمام نوجوان رنگروٹوں کو رہائی دیتا ہوں اور باقی سب کو توپ کے منہ پر اڑاتا ہوں۔ ان لڑکوں کو جو ہنوز اپنے ایام طفلی سے نہیں نکلے اور اصلی خیر خواہ کو جو باغیوں میں شریک نہیں ہوئے رہائی دیتا ہوں رجمنٹ نمبر ۵۵ کی بابت اڈورڈس صاحب نے یکم جون کو لارنس صاحب کو اپنی چٹھی میں لکھا کہ میری تجویز ہے کہ کل لشکر کے روبرو ایک سو بیس[۱۲۰] آدمیوں کو جو قید ہوئے ہیں۔ توپ کے منہ سے اڑا دوں جسے دیکھ کر لوگ بہت خائف ہو جائیں گے۔ اس کا جواب بہ واپسی ڈاک چیف کمشنر نے یہ لکھا کہ دو دیں رجمنٹ کے سپاہی اس وقت گرفتار کیے گئے ہیں جس وقت وہ تم سے لڑتے تھے۔ پس وہ ذرا سے بھی رحم کے مستحق نہیں ہیں۔

چنانچہ مردان کے ایک سو بیس مفرورین کے لیے توپوں سے اڑانے کا حکم ہوا۔ لیکن چیف

---

(۱) اخبار فوائد الناظرین۔

کمشنر نے ان سزاؤں پر تخفیف کی کہ ان میں سے صرف تیس چالیس سپاہی توپوں سے اڑائے جائیں وہ پریڈ پر کل سپاہ کے سامنے مشکیں باندھے ہوئے آئے اور توپوں سے اڑائے گئے۔ ہزاروں تماشائی جمع تھے۔ کسی آدمی نے ان کی حمایت کے لیے ہاتھ نہ اٹھایا۔ ابتدا میں جو سزا دی گئی اس کی سختی و درشتی کو دیکھنے سے بہت سے آدمیوں کی جانیں بچ گئیں۔ اس طرح سپاہیوں سے انگریزوں نے سمجھا رکھوائے۔ تو اس سے سرحدی قوموں کو یقین ہوا کہ ان میں بڑی قوت و ہمت ہے و شجاعت ہے بس وہ قومیں انگریزوں کے ساتھ گرویدہ ہو گئیں۔ اور ہر ایک آدمی جس کے پاس توڑے دار بندوق یا تلوار یا گھوڑا تھا وہ پشاور میں انگریزی افسروں کے پاس سپاہ میں بھرتی ہونے کے لیے آن موجود ہوا۔ جب جون کا مہینہ ختم ہوتے کو ہوا اور دہلی فتح نہ ہوئی۔ تو انگریزوں کو یہ خوف پیدا ہوا۔ کہ سرحد پر کہیں جہاد کے لیے قومیں نہ کھڑی ہو جائیں۔ جن سے پشاور کا بچانا محال ہو جائے۔ مگر مسلمانوں پسلدوپیہ کی محبت ایسی غالب ہوئی کہ انہوں نے جہاد کو سلام کیا ہے (۱)

بے گناہی بھی نہیں بچا سکی

انگریزوں کے ظلم کی کوئی انتہا نہ تھی ؏

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

یہ ظلم گناہ گار اور بے گناہ کی تفریق سے بھی ناواقف تھا:

اس قافلہ کا میر قافلہ مولوی محمد شفیع خان تھا پوتروں کا رئیس خاندانی نواب۔ عزالدولہ وزیر ہند کا رشتہ دار یہ اپنے علم و لیاقت کی بدولت سرکار انگریزی میں ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کا میر منشی ہو گیا تھا جب غدر پڑا اس کے چھوٹے بھائی مولوی محمد تقی نے کہا کہ بھائی صاحب اب شہر میں عزت جان کا خطرہ ہے چلئے کہیں نکل چلیں یہ اس زمانے کے شریف انگریزوں کی آنکھیں دیکھا ہوا تھا راضی نہ ہوا اور کہا کہ انگریز کبھی کسی کو بے قصور نہیں مارتے ہیں باغی ہوں نہ مجرم پھر مجھے کیا ڈر چھوٹا بھائی اپنے لواحقین کو لے کر چلا گیا اور یہ یہیں رہے دوران غدر میں دروازے پر سے ایک آدمی کی آواز

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ از ذکاء اللہ، ص ۵۶۹

آئی کچھ دھماکہ سنائی دیا یہ گھبرا کر باہر نکلے دیکھا تو نوجوان اکلوتا بیٹا خاک و خون میں لوٹ رہا ہے کلیجہ دھک سے ہو گیا دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

اب آنکھیں کھلیں بیجا اعتبار کا نتیجہ پا لیا بڑھاپے کے سہارے کو سپرد خاک کر حرم محترم کو ساتھ لے پانی پت کی طرف روانہ ہوا اب یہ حضرت قلندر صاحب کے آستانہ پر مع اہل وعیال پناہ گزیں ہیں۔

اس کا چھوٹا بھائی مولوی محمد نقی حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر بال بچوں کو لیے سر چھپائے پڑا ہے ایک کو دوسرے کی خبر نہیں زندہ ہیں یا لا پتہ مردے کو تین دن روتے ہیں اور پھر صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں روتا تو انکا ہے جو جیتے جی چھوٹ گئے جب تک سانس ہے اس وقت تک آس ہے۔ (۱)

بچوں اور عورتوں کو بھی گولی کا نشانہ بنایا گیا "گورنر جنرل مع کونسل نے جو کاغذات پارلیمنٹ میں بھیجے ہیں ان میں لکھا ہے۔ کہ بوڑھے اور بچے بھی باغیوں کی طرح مارے گئے ہیں۔ اگرچہ وہ پھانسی نہیں دیئے گئے ہیں۔ مگر جب بھی دیہات جلائے گئے۔ یا ان پر گولیاں ماری گئیں۔ تو ان میں عورتوں اور بچوں کے بچانے کا کوئی لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔ یہ بات بڑے فخر سے سرکاری کاغذ میں بیان کی جاتی ہے۔ کہ تین مہینہ تک روزانہ آٹھ گاڑیاں ان مردوں سے بھری ہوئی صبح سے شام تک بھیجی جاتی تھیں جو سڑکوں اور بازاروں میں پھانسی دے جاتے تھے۔ چھ ہزار آدمی عدم آباد میں بسائے گئے۔ (۲)

کتوں اور گیدڑوں کی طرح انسانوں کا شکار ملٹری افسر سب قسم کے مجرموں کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکار کرتے پھرتے تھے۔ کتوں۔ گیدڑوں یا کیڑوں کی طرح

---

(۱) دلی کا سنبھالا (خواجہ محمد شفیع دہلوی) ص ۱۴۲

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص ۵۰

ان کو مارتے تھے۔ اور کچھ افسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی زمانہ کا ایک انگریز مشاہد لکھتا ہے کہ پریڈ پر ہتھیار لینے کے بعد اس نے اکثر صبح کو یہ دیکھا کہ پھانسیوں کی قطار لگی ہوئی ہے۔ چند روز کے بعد ملٹری کورٹ یا کمیشن ہر روز اجلاس کرتا اور بے غیرتی کے ساتھ آدمیوں کو پھانسیاں دینے کا حکم دیتا۔ کھیل کے طور پر کچھ کم عمر لڑکوں نے باغیوں کے علموں کو بلند کر کے تاشے بجائے تھے وہ سب پکڑے گئے۔ اور ان کو پھانسی لگنے کا حکم ہوا۔ اس کمیشن میں ایک جوان افسر بھی تھا۔ وہ روتا ہوا ایک کمانڈنگ افسر کے پاس گیا کہ وہ اس حکم کو منسوخ کر دے لیکن کچھ رحم نہ کیا گیا۔ ایک گروہ پھانسی دینے والا ضلع میں گیا ایک جنٹل مین اس پر بہت فخر کرتے تھے۔ کہ میں پھانسی بڑی حکمت سے دیتا ہوں کہ مجرم کو ہاتھی پر چڑھاتا ہوں اور مجرم کے گلے میں رسی ڈال کر آم کے درخت سے باندھتا ہوں اور پھر ہاتھی کو بھگا دیتا ہوں اس طرح سے وحشیانہ انصاف کی قربانی آٹھ کے ہندسے کی طرح کچھ دیر کے لیے لٹکی رہتی ہے۔ ملٹری افسروں نے مجرموں کے پھانسی دینے میں جو کام کیا تھا۔ اس سے کچھ کم سولین نے بھی نہیں کیا تھا۔ بنارس کا جیل خانہ ٹوٹا ہوا تھا نئے مجرموں کی کثرت تھی۔ جیل خانہ میں مکانات ان کے سمانے کے لیے نہ تھے۔ اس لیے بڑے مجرموں کو پھانسی دے دی جاتی تھی۔ (۱)

فتح پور کے مسلمانوں کو قتل کر دو

فتحپور کے مسلمانوں نے، غدر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان کے بارے میں حکم ہوا، کہ انہیں بلا تمیز مرد و زن قتل کر دو:

"جون کی آخری تاریخ میں۔ میجر رے نانڈ مدس فیسیلرز کے چار سے یورپین اور تین سو سکھ اور غیر باقاعدہ رسالہ کے سوار لے کر الہ آباد سے روانہ ہوئے۔ نیل صاحب نے ان کو یہ ہدایتیں لکھ کر دیں کہ باغی رجمنٹوں کے تمام سپاہی جو اپنے تئیں بری نہ کر سکیں پھانسی دیئے جائیں۔ فتح پور کے قصبہ نے بغاوت کی ہے۔ وہ برباد کیا جائے اور وہاں پٹھانوں کا محلہ منہدم کیا جائے اور اس کے تمام باشندے قتل کیے جائیں اور تمام باغیوں کے سر کاٹے جائیں۔ اگر وہاں ہم (مسلمان) ڈپٹی کلکٹر پکڑا جائے تو اسے پھانسی دی جائے۔

---

(۱) تاریخ عہد انگلشیہ د ذکا اللہ، صہ ۴۹۲

اور اُس کا سر قصبہ کے مسلمانوں کے اونچے مکان پر لٹکایا جائے - (۱)

چوّن آدمی اسی وقت مارے گئے

"بر وجود فتح ہونے نگینہ کے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر اور جناب اندر سین صاحب بہادر برگٹ میجر مع سپاہیوں پلٹن خاکی کے شہر نگینہ میں تشریف لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کو واسطے انتظام شہر کے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی ناکہ بندی کر کے جیسا کہ چاہئے انتظام شہر کا فرمایا اور تین سو آدمی شہر کے گرفتار کئے گئے اُن میں سے چوّن آدمی اُسی وقت مارے گئے - (۲)

نجیب آباد نذر آتش ہو گیا

نجیب آباد کے نواب محمود خاں نے انگریزوں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا تھا انگریزوں نے اس سے، اور اس کے وطن سے، اس کے گھر سے، اس کے خاندان سے انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں رکھا رکھی:

"نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح شہر کا جلانا منظور نہ تھا شاید اتفاقیہ آگ لگی اور بہ سبب اس کے کہ شہر خالی پڑا تھا اور پانی بھی وہاں بہت کمیاب ہے آگ کے بجھانے کا کچھ علاج نہ ہوا مگر عموماً یہ بات مشہور ہوئی کہ ہندوؤں نے جن کے گھر نواب نے جلا دیئے تھے اس فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر قصداً تمام شہر میں آگ لگا دی اور جو رنج کہ ان کے دلوں میں تھا اس کا بدلہ بخوبی لیا اور کچھ شک نہیں کہ ایسا ہی ہوا - (۳)

نجیب آباد لوٹ لیا گیا

"اٹھارہ تاریخ کو اُسی قاعدہ سے لشکر کا کوچ بھاگو والے سے نجیب آباد ہوا جب لشکر قریب مالن ندی کے پہنچا غنیم کی طرف سے تین آواز توپ کی آئی کچھ شک نہیں ہے کہ سردار باغیوں کے بالکل بھاگ گئے تھے اور تمام شہر خالی پڑا

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۵۰۱

(۲) سرکشی بجنور (سر سید احمد خاں)

(۳) سرکشی بجنور (سر سید احمد خاں)

تھا مگر کچھ سپاہی پتھر گڈھ کے قلعہ میں تھے جب انہوں نے بھاگنا چاہا تو توپیں چھوڑ دیں تاکہ اُن کو بھاگنے کی فرصت ملے جنرل جون صاحب بہادر نے اُسی وقت برگڈیر کوک صاحب کو حکم دیا کہ آگے جاویں چنانچہ صاحب ممدوح آگے بڑھے شہر بالکل خالی پڑا تھا جب قلعہ پتھر گڈھ کی طرف بڑھے تو کچھ باغی قلعہ میں سے بھاگتے دکھائی دیئے ان کے تعاقب میں سواروں نے گھوڑے ڈالے اور تین آدمی ان میں کے مارے شہر اور قلعہ بالکل فتح ہو گیا اور سرکار دولتمدار کے قبضہ میں آگیا قلعہ میں سے چھ ضرب توپ اور گولہ اور سامان حرب اور شہر میں سے دو توپیں ایک احمد اللہ خان کے دروازہ پر سے ایک اُس کارخانہ میں سے جہاں توپیں بنتی تھیں اور ایک شہر اور قلعہ کے بیچ میں جو میدان ہے وہاں سے سرکار دولتمدار کے ہاتھ آئیں شہر نجیب آباد کا لٹ گیا اور تمام شہر میں بکثرت آگ لگ گئی ۔ (۱)

پتھر گڑھ کا قلعہ

یہ محمود خاں کا مسکن تھا : مناسب ہے کہ قلعہ پتھر گڑھ کا بھی تھوڑا حال لکھوں نجیب خان نے ۱۷۵۵ء میں یہ قلعہ بنایا ۱۷۵۰ء میں نجیب خان سے اس قلعہ پر لڑائی ہوئی جبکہ راؤ سیندھیا اور ملہار راؤ مرہٹے نے چاندی کے متصل گومل گھاٹ سے اُتر کر نجیب آباد کو اور اس قلعہ کو لوٹا تھا پھر شاہ عالم کے وقت میں ضابطہ خان پر نواب نجف خان اور سیندھیا اور تکوجی مرہٹے نے چڑھائی کی اور پتھر گڑھ پر توپیں ماریں اور لوٹ لیا پھر ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ نے اس قلعہ پر تسلط کیا پھر ۱۸۰۱ء میں سرکار دولت مدار انگریزی کا اس ملک پر تسلط ہوا پھر ۱۸۰۵ء میں امیر خان نے اس نواح میں غدر مچایا اب ۱۸۵۷ء میں ان نمک حراموں نے اس خاندان کا نام و نشان مٹا دیا۔ (۱) تاریخ کو اطلاع ملی کہ جلال الدین خان بھائی محمود خان کا اور سعد اللہ خان جو پہلے منصف امروہہ تھا کوٹ قادر میں ہیں اُسی وقت جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میجر اسمائیلا صاحب بہادر کو کچھ سوار سائفے لے کر

---

(۱) سرکشی بجنور (سر سید احمد خاں)

ان کی گرفتاری کو گئے مگر پہنچنے سے پہلے اُن دونوں نے اپنے تئیں ملتانی سواروں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ وہ دونوں گرفتار آئے اور گوروں کے قید میں گرفتار ہوئے اور ۲۰ تاریخ سے ان کا کورٹ مارشل شروع ہوا بعد ثبوت جرم کے جنرل جون صاحب بہادر کے حکم سے نور پور کے مقام ۲۳ تاریخ کو گولی سے مارے گئے۔ (۱)

انگریزوں کا انتقام محمود خاں کے مکانات سے

۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات محمود خاں اور جلال الدین خان جو اُن کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں ڈھا دیئے جاویں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی اُن پنشن دار نمک حراموں سے ظاہر ہو اور لوگوں کو بخوبی عبرت ہو چنانچہ اُسی تاریخ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی جگہ تھی اڑا دیا گیا اُسی تاریخ یہ تجویز ہوئی کہ ایک کمپنی سکھ اور توپخانہ تحت حکومت میجر اسماعیل صاحب بہادر اور اول پنجاب رسالہ تحت حکومت کپتان ہوس صاحب بہادر پتھر گڑھ میں رہے اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جنٹ مجسٹریٹ انتظام نصف شمالی ضلع کا اپنے ذمہ میں لیں۔ چنانچہ صاحب ممدوح ہمراہ اُس فوج کے بمقام نجیب آباد مقیم رہے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر نے مجھ صدر امین کو حکم دیا کہ تم بھی صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی اطاعت میں کام کرو چنانچہ میں نے اُس حکم کی تعمیل کی اور صاحب ممدوح کی تابعداری میں حاضر رہا۔ (۲)

وہ مجاہد تھا یا حرام زادہ؟

انگریزوں کی دوستی کے سبب سرسید نے محمود خاں کے اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں کافی تکلیفیں اٹھائیں، وہ تلوار سے انتقام نہ لے سکے، لیکن قلم سے تلوار کا کام لینے میں کوئی کسر بھی نہیں اٹھا رکھی۔

"اور اس وقت سرکاری فوج متصل پکے باغ کے جو پائین باغ کے نام سے مشہور ہے پہنچی، اُس

---

(۱) سرکشی بجنور (سرسید احمد خاں)

(۲) سرکشی بجنور (سرسید احمد خاں)

میں کچھ لوگ ضلع شہر سے بھاگ کر اس میں چھپے تھے اور کچھ باغی بھی بھاگتے وقت گھس گئے تھے منجملہ اُن کے عنایت رسول جو نامی باغی اور مشہور حرام زادہ تھا مع جان محمد اپنے ملازم کے اُس باغ میں گھس گیا تھا، جب سرکاری فوج کے چند سوار اُس باغ کے قریب پہنچے تو اُس نے یا اُس کے نوکر نے اُن سواروں پر بندوق فیر کی اُس وقت یقین ہوا کہ اس باغ میں باغی چھپے ہوئے ہیں سرکاری فوج نے اُس باغ میں جا کر قریب پچاس ساٹھ آدمی کے قتل کیا اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر تیور سے مار دیا عنایت رسول مع اپنے نوکر کے مارا گیا اور اکثر آدمی جو اُس محلہ کے جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے وہ بھی مارے گئے۔ (۱)

داستان انتقام — اعتراف گناہ

ذیل کے واقعات کسی اور کے نہیں بجز گناہ گاران انگریز کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوئے ہیں:

فوراً پھانسی دو

کوپر Cooper نے ہمیں بتایا ہے کہ:

قیدیوں کی دائمی نجات کا راستہ نہایت آسان تھا یعنی باغیوں کو دیکھ کر فرانسیسی انقلابیوں کا نعرہ "A' LALANTAINE" (۲) یعنی پھانسی پر لے چلو بلند کیا جاتا تھا۔ (۳)

گرجا کا فرش صاف کرو پھر قتل ہو جاؤ

ایک پادری کی بیوہ جس کا خاوند غدر میں قتل کر دیا گیا تھا نہایت ناشائستہ انداز میں لکھتی ہے کہ:-

"جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجے کے فرش

---

(۱) سرکشی بجنور (سر سید احمد خاں)

(2) The Crisis in the Punjab P. 147.

(۳) فرانس کی مشہور بغاوت کے زمانہ میں جب فرانسیسی جمہوریت کے مخالفین گرفتار کیے جاتے تھے تو عام طور پر چاروں طرف سے شور و غوغا بلند کیا جاتا تھا کہ ان کو "النین" یعنی لیمپ کے پاس لے چلو جس کے نیچے دیوار پر پھانسی کی رسیاں لٹکتی ہیں بعد ازاں باغیوں کو دیکھ کر انگریز افسران اور سپاہی بھی یہی نعرہ بلند کیا کرتے تھے کہ بغیر کسی تحقیقات کے فی الفور پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

کو صاف کریں مگر باوجودیکہ یہ لوگ اسی قسم کا کام اپنے مذہبی معتقدات کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انہیں اس حقیر کام کے کرنے پر مجبور کیا گیا اُن میں سے بعض آدمیوں نے نہایت پھرتی سے اس کام کو انجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں گے لیکن بے سود کیونکہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے [1]

بہادری سے شہید ہوئے

مجنٹلی لکھتا ہے کہ: "وہ رات ہم نے جامع مسجد پر پہرہ دیتے ہوتے بسر کی اور ہمارا زیادہ تر وقت ان قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے یا پھانسی پر لٹکانے میں گذرتا تھا جن کو ہم نے صبح کے وقت گرفتار کیا تھا ان میں سے بہت سے بے چارے تو اسی جگہ ختم ہو گئے لیکن آخر وقت تک اُن کے چہرے سے شجاعت اور ضبط کے آثار ہویدا تھے جو کسی بڑے مقصد کے شایان شان علامات تھیں [2]

موت کی سزا یقینی ہے

دہلی پر قبضہ کرنے سے پیشتر ایک افسر نے لکھا ہے کہ :- "باغی ہتھیار رکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر موت کی سزا ملنی یقینی ہے اور نہ اس کے سوا اُنہیں کوئی اور امید رکھنی چاہیے تھی [3]

جنرل نیل کی انسانیت سوز ہدایات

میجر رینڈ RENAUD کو جب وہ ہراول فوج کا ایک دستہ لے کر کانپور کے محصورین کی امداد کے لیے روانہ ہو رہا تھا ذیل کی ہدایات جنرل نیل Neill کی طرف سے موصول ہوئیں۔
"بعض دیہاتوں کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے جہاں

---

[1] A lady's escape from Gawalior P. 243

[2] P. 205

[3] Times 24th October 1857 Montgomery Martin

کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں جو اپنے چال چلن کے مطلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔ قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہ تیغ کر دیا جائے کیونکہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے باغیوں کے تمام سرغنوں اور بالخصوص فتح پور کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی دے دی جائے اور ان کے سر کاٹ کر وہاں کی سب سے اونچی عمارت پر لٹکائے جائیں۔[۱]

بیگم اودھ نے ۱۸۵۸ء میں نہایت ہی مایوسانہ وقار کے ساتھ اپنے ایک اعلان میں لکھا کہ

"کسی شخص نے خواب میں بھی یہ نہیں دیکھا کہ انگریز نے کبھی کسی کو معاف کیا ہو۔"[۲]

غدر کے بعد بھی صاحب بہادر ڈر جاتے تھے

ہندوستان فتح ہو گیا، دلّی لٹ گئی، مسلمان مٹ گئے، انگریزوں کے ہاتھ میں حکومت آگئی، لیکن مسلمانوں کی دہشت اب تک قائم تھی، ۲۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو ملکہ وکٹوریہ کا جشن سالگرہ منعقد ہوا۔ اس کی روداد کا حسب ذیل ٹکڑا بڑا دلچسپ ہے:

"ہاں بعض انگریز اس خوف سے نہیں آئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مجمع میں بڑے بڑے انگریزوں کو یکجا جمع دیکھ کر ہندوستانی یہ نہ سمجھیں ان کو حملہ کرنے کا اچھا موقع ہاتھ لگ گیا عید کے دن جو مسلمانوں نے رات کو آتش بازی چھوڑی تو اس سبب سے انگریز چونک پڑے اور سمجھے کہ علی پور کا جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ بہت سے جنٹلمینوں نے اپنی بگھیاں تیار کرا کے قلعہ میں اپنی بیویوں

---

[۱] Kay Book V Chapter No. II

[۲] Montgomery Martin's Progress of the Indian Mutiny Chapter XXVI

[۳] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ص ۶

کے لے جانے کا قصد کیا ہے[۱]

باغیوں اور باغی سربراہوں کا حشر

نانا راؤ اور بالا راؤ وسپاہ دل عظیم اللہ ۱۸۵۹ء نیپال کی لڑائی میں مر گئے بینی مادھو پہلوان سنگھ گورکھوں کے ساتھ لڑائی میں قتل ہوا خان بہادر خان کو مارچ ۱۸۶۰ء میں اس مقام پر پھانسی ملی جہاں اس نے وحشیانہ کام کیے تھے محمود خان نواب نجیب آباد وائم الحبس ہو کر جلا وطن کیا گیا جوالا پرشاد کو ۳ مئی ۱۸۶۰ء کو اس گھاٹ پر پھانسی ملی جہاں نانا کی طرف سے اس نے کشتیوں میں انگریزوں کے قتل کا اہتمام کیا تھا امیر سنگھ برادر کنور سنگھ گورکھپور میں انگریزوں کے ہاتھ لگا اودھ کی بیگم کھٹمنڈو (نیپال) میں پہنچی تجمل حسین خان نواب فرخ آباد عمر بھر کے لیے مکہ کو جلا وطن ہوا بہت سے چھوٹے چھوٹے سرغنہ بغاوت کے جو میدان جنگ سے بھاگ کر جنگلوں میں چلے گئے تھے پکڑے گئے اور ان کے جرائم کی تحقیقات ہوئی سزا ملی یا بری کیے گئے سو پاہی اور مجرم جزیرہ انڈمان (کالے پانی) میں بھیجے گئے اور چند ہزار مجرموں نے تھوڑی میعاد کے لیے قید سخت کی سزا پائی اور دیسی جیل خانوں میں رہے شاید ان سے دو چند سے زیادہ بری کر دیے گئے۔ بڑی زبردست سپاہ بنگال اور مقامی کنٹجنٹوں میں چند ہی رجمنٹیں تھیں جو بغاوت سے الگ تھلگ رہیں۔ ان بدخواہوں میں سے دو سال کے اندر ایک لاکھ آدمیوں سے زیادہ زخموں کی سختی یا حاکموں کی پھانسی دینے سے مرے ہوں گے اور اس عرصے میں جو باغی لڑائی میں مارے گئے ان کو شامل کرو تو تعداد بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور غلطی سے جو بے گناہ مارے گئے ان کا کچھ حساب نہیں ۔[۲]

---

(۱) تاریخ عہد انگلشیہ ص ۴۴۵

(۲) تاریخ ہندوستان د بغاوت ہند۔ ص ۱۹۴

یہ تجمل حسین خاں کون تھے

مذکورہ فہرست میں، نواب تجمل حسین خاں کی جلاوطنی کا ذکر بھی ہے یہ وہی ہیں جن کے لیے، غالب نے کبھی کس جوش و خروش کے ساتھ کہا تھا:

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لیے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

آہ، پھر وہ زمانہ آیا کہ غالب ان کی شان میں قصیدہ کہنا تو درکنار ان کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہوں گے،

دلی پر انگریزی قبضہ: ایک تاثر

دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شہر کی جو حالت ہوئی تھی۔ اس کا نقشہ غالب نے چند اردو اشعار میں بھی کھینچا تھا۔ لیکن یہ اشعار ان کے اردو دیوان میں شامل نہ ہو سکے۔ البتہ نسخہ حمیدیہ میں، اردوئے معلی سے لے کر شامل کر دیے گئے ہیں۔ چونکہ یہ اشعار غالب کے دوسرے کلام کے خلاف عام اشاعت نہ پا سکے اس لیے میں ان کو یہاں درج کرتا ہوں

بسکہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل جاں کا
گاہ جل کر کیا کیئے شکوہ سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا (۱)

دلی کا نام لارنس آباد

ان انسانیت سوز حرکتوں کے باوجود، انگریز ایک مسلمان مورخ کی نظر میں، اتنے اچھے تھے کہ وہ تجویز پیش کرتا ہے ——— :

"جان لارنس اس امر کے مستحق ہیں کہ ہم دلی کا دوسرا نام لارنس آباد رکھیں۔ جن کی بدولت وہ آباد رہا۔ اور اس کی آج وہ رونق ہے کہ شاہجہاں کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ ان کے ہم قوم ان کو سیویر آف انڈیا کہیں یعنی ہندوستان کو بچانے والا جانیں۔ اہل شہر کو چاہیئے کہ ان کو سیویر آف دہلی کہیں۔ اور اس کی جامع مسجد میں۔ ان کی قوم کے لیے دعا مانگا کریں کہ اگر جان لارنس اس کو نہ بچاتے تو یہ مسجد مٹی کا ایک ڈھیر ہوتی۔ جس میں جانوروں کے بل اور گھونسلے ہوتے۔ (۲)

اس کے جواب میں آنے والی نسلیں فردوسی کے الفاظ میں۔ خفیف تغیر کے ساتھ یہی کہہ سکتی ہیں:

کہ تخت جہاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

---

(۱) غالب (غلام رسول مہر) صفحہ ۳۰۳

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۲۹

اس بغاوت کی بڑی عجیب بات

اور یہ وہی مورّخ ہے، جو ہمیں نہایت صفائی، اور سچائی کے ساتھ بتاتا ہے :-

"اس بغاوت میں بڑی عجیب بات تو یہی تھی کہ ہندوستانی ہی باغی تھے اور انگریزوں کی طرف سے ہندوستانی ہی اس بغاوت کے مٹانے والے تھے۔ انگریزوں کے ہندوستانی بدخواہوں اور نیک خواہوں میں خوب لڑائی ہوتی تھی۔ انگریز اپنا ایک کام بھی بغیر ہندوستانیوں کی مدد کے نہیں کر سکتے تھے اگر اس وقت سارے ہندوستانی انگریزوں سے بے وفائی اور بغاوت کرتے تو انگریز ہندوستان میں ایک دن نہیں رہ سکتے تھے کیمپ میں ہر ایک انگریز کے لیے، دس ہندوستانی موجود تھے۔ توپ خانہ میں گوروں سے چوگنے کالے تھے۔ سواروں کے رسالہ میں ہر گھوڑے کے واسطے دو ہندوستانی تھے۔ ان کے بغیر انگریز اپنے گھوڑوں کو نہ دانہ کھلا سکتے تھے۔ نہ توپوں کو چلا سکتے تھے۔ اس محاصرہ میں تمام ہندوستانی ملازم سرکاری اور غیر سرکاری باستثنا چند آدمیوں کے وفادار اور خیرخواہ رہے۔ ماہ بماہ اپنی تنخواہ پاتے رہے۔ اور نوکری کے سارے کام اس طرح بجالاتے رہے۔ جیسے ان ایّام میں غدر نہ ہوا ہو۔ لیکن ان کی قدر شناسی ان خدمات کی جیسی ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی، باورچیوں کے لڑکے کیمپوں پر گوروں کا کھانا توپوں اور بندوقوں کے گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنی جان پر کھیل کر لے جاتے تھے۔ مگر ان کے اس خوفناک کام کا بہت کم خیال کیا جاتا تھا -

کیمپ میں بہت سے انگریز ایسے تھے کہ ہندوستانیوں کی خدمات کے عوض میں گالیاں دیتے تھے۔ اور ڈنڈ لگاتے اور ان پر طعن و تشنیع پہلے زمانہ سے زیادہ کرتے۔ مگر ہندوستانی اس کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے -"(۱)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۸۲

باب ۳۱

مجاہدین: شمع اسلام کے پروانے

•

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

•

اب میں مجاہدین کا کچھ ذکر کروں گا، !

غدر کے سلسلہ میں، بہت سی باتیں کہی جاتی ہیں، اور یہ بات تو بڑے جزم و وثوق سے کہی جاتی ہے کہ تلنگوں اور دیسی سپاہیوں کی بغاوت اور یورش، اور شورش ایک ہڑبونگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی، یہ لوگ نہ بہادر شاہ کے وفادار تھے، نہ ملک کے، نہ قوم کے، صرف اپنے نفس کے وفادار تھے، ان کا مقصد جہاد کرنا، وطن کی لڑائی لڑنا، اور استقلال و حریت کی قربان گاہ پہ قربان ہو جانا نہیں تھا، لوٹ مار تھا، یہ اپنی جیبیں بھرتے رہے، اپنے ہم وطنوں کو لوٹتے

رہے، ملک میں تباہی پھیلاتے رہے، یہ جم کر نہ لڑ سکے، یہ بہادری کے ساتھ میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ تہوّر اور شجاعت کے ساتھ مشکلات و شدائد کا مقابلہ نہ کر سکے، جب ملک انگریز اپنی تیاریوں میں مصروف رہے، یہ لوٹ مار کرتے رہے، جب انگریزوں نے دو ماوا بولا، اور دلّی پر یورش کی، ان کی سنگینیں اور تلواریں حرکت میں آئیں، ان کی بندوقیں اور توپیں چلیں تو یہ بھاگ کھڑے ہوئے، ہندوستانی مؤرخین، اور مسلم مؤرخین تک نے، بڑی بے دردی طنز، اور تحقیر کے ساتھ، بلکہ نفرت اور کراہت کے ساتھ، دیسی سپاہیوں کی ذہنیت اور کردار پر، اپنے قلم سے، وار کیے ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دیسی سپاہیوں کے کردار میں بہت سی کوتاہیاں نظر آتی ہیں، اور ان کوتاہیوں کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ بُری طرح ہارے، اور بری طرح بھاگے۔

لیکن اس سلسلہ میں جو چیز قطعیت کے ساتھ نظر انداز کی گئی ہے، وہ ہے، مجاہدین کا ذکر، مولوی ذکاء اللہ تک نے، اپنی تاریخ میں انہیں "لچا اور شہدا" قرار دیا ہے، ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید نے، اور دوسرے بزرگانِ ملّت نے بھی جو کچھ لکھا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یا تو ان مجاہدین کے وجود سے ناواقف تھے۔ یا اگر واقف تھے، تو نہ صرف یہ کہ انہیں اہمیت نہیں دیتے تھے، بلکہ ان کے جذبہ اور کردار، اور عمل کا استخفاف کرتے رہتے تھے۔ ان کے انداز میں اتنی بے دردی، غیریت، اور پرعناد اجنبیت ہے کہ اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، لیکن خود ان لوگوں نے، اور ان کے آقایانِ ولی نعمت، یعنی انگریزوں نے، دستاویزی ثبوت کو سامنے رکھ کر جو حالات لکھے ہیں، جو واقعات قلمبند کیے ہیں، جن کیفیات کا جائزہ لیا، اور تجزیہ کیا ہے۔ انہیں پیشِ نظر رکھئے، تو ان کے مخالفانہ اور معاندانہ، غیر مہذب، اور ناشائستہ الفاظ ولب ولہجہ کے باوجود بین السطور سے ان مجاہدین کا روشن، بلند، اور سراسر قابلِ رشک کردار، صاف جھلکتا نظر آتا ہے جیسے تیرہ و تار رات میں بجلی چمک جاتی ہے، جیسے گھنے بادلوں کی اوٹ سے سورج جھانکتا ہے، جیسے مایوسی کے اندھیرے میں، امید کی کرن پھوٹتی ہے۔ میں نے جو واقعات لیے ہیں، وہ انہی کی تحریروں سے

لیے ہیں، آپ خود اندازہ کرلیں، کہ میرا خیال صحیح ہے یا ان کا بیان؟

اس باب میں، میں نے، دو قسم کا مواد پیش کیا ہے۔

ایک حصّہ تو وہ ہے، جو مجاہدین کے کردار اور سیرت کا استقلال و عزیمت کا ایثار و فدویت کا، اور ہمت و شجاعت کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کرتا ہے۔ جس سے ان کے جذبہ اور نیت کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا حصّہ وہ ہے، جو اس جماعت مجاہدین کی بعض اہم اور سر برآوردہ شخصیتوں کے احوال و سوانح پر مشتمل ہے، یہ زیادہ تر ھنٹر صاحب کی شہرۂ آفاق کتاب OUR Indian musalman سے ماخوذ ہے، یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے غدر میں شرکت کی، لیکن غدر کے ناکام انجام سے ذرا بھی دل برداشتہ نہیں ہوئے، اس کے بعد بھی انہوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، اپنی تحریک ملک بھر میں پھیلائی، اور فرنگی راج ختم کرنے کے منصوبے بناتے رہے، "وہابی تحریک" در حقیقت یہیں سے شروع ہوتی ہے، یہ تحریک در اصل غدر کی ناکامی کا ردِ عمل تھا، یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں بالآخر پھانسی کی سزا ہوئی لیکن اس سزا پر محض اس لیے —— بقول مولانا جعفر تھانیسری، جو اس تحریک کے لیڈر تھے۔ اور جنہیں خود بھی پھانسی کی سزا ملی تھی —— عمل نہ کیا گیا کہ اگر عمل کیا جاتا، تو ان مجرموں کا شوقِ شہادت پورا ہو جاتا، اور چونکہ مقصود یہ تھا کہ ان کی کوئی تمنا نہ پوری ہو، لہٰذا پھانسی کی سزا، حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی۔

ان صفحات میں یہ بحث چھیڑنا غیر ضروری ہے کہ یہ تحریک بروقت تھی یا ناوقت؛ کامیاب تھی یا ناکام؛ بحث صرف یہ ہے کہ، جو لوگ اس تحریک کو لے کر اٹھے تھے وہ اپنے جذبہ اور اپنی نیت میں مخلص تھے یا نہیں؛ انگریزوں سے، اور انگریزوں میں بھی آئی سی ایس طبقہ کے انگریزوں سے بڑھ کر، ان وہابیوں یا مجاہدوں کا دشمن کون ہوگا جنہیں براہِ راست ان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا؛ وہ انہیں گالیاں دیتے ہیں، ان کے مذہب —— اسلام —— کو برا بھلا کہتے ہیں، جا و بے جا پر شمشیر زبان تیز کرتے ہیں، لیکن ان کے استقلال، ان کی دلیری، ان کے خلوص، اور پاکبازی کی تعریف

پر مجبور ہو جاتے ہیں، ہنسٹر نے جی بھر کر، پانی پی پی کرانہیں کوسا ہے، لیکن ان کی سچائی اور عزیمت کے آگے سر عقیدت بھی خم کیا ہے۔

اب ہم، اِس سلسلہ میں ضروری مواد پیش کرتے ہیں:۔

(۱)

مجاہدین کا کردار

ان مجاہدین کا کیا عالم تھا؟ ان کے کردار و سیرت کی کیا کیفیت تھی، یہ داستان ان کے مخالف مورخ کی زبان سے سنیئے:۔

"سب سے اول مولوی رحمت اللہ کیرانہ سے اس توہ میں آئے۔ کہ دہلی میں جہاد کی کیا صورت ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے۔ عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعہ کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامہ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن کو چلا گیا۔"!

پھر سو دو سو کے قریب وہابی جہادی بن گئے۔ نواب ٹونک نے ان کو خرچ کے لیے پھوٹی کوڑی نہ دی۔ اور نہ کچھ امداد کی۔ دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خان و غوث محمد خان و مولوی امام خان رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار و مولوی سرفراز علی خان آئے۔ تو پھر وہابیوں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کے میر لشکر اور بخت خان اس کا معاون بن گیا تھا۔ جے پور ہانسی حصار پور بھوپال سے بھی جہادی آئے تین چار سو مجاہدین کا مجمع ہو گیا۔ ان وہابیوں نے ایک اشتہار چھاپ کر شائع کیا کہ سب

مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاد کریں۔ اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے۔ مگر بغل میں تلوار یا کمر میں خنجر یا کندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی۔ بادشاہ سے یہ جہادی فریاد کرتے کہ بھوکے مرتے ہیں۔ تو وہ کہہ دیتا کہ خزانہ میں روپیہ نہیں۔ مگر اس نے ان کے لیے یہ انتظام کرا دیا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں اور ثواب کمایا کریں۔ نواب محی الدین خان عرف بڈھے صاحب نے ان کو دو ہزار روپیہ دیے۔ شہر کے چند ہی مسلمان اس جہاد میں شریک ہوئے۔ محمد شریف نامور معتبر دہلی اپنے سارے گھر کا اسباب و مکان سوا بیوی کے زیور کے خیرات کر کے جہادیوں میں شریک ہوا۔ اور پھر زندہ سلامت نہیں آیا۔ نصیر آباد سے عرضی آئی کہ ہم چھ ہزار جہادی دہلی آتے ہیں تو بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ یہاں ساٹھ ہزار سپاہ تو انگریزوں پر فتح نہیں پا سکتی تم چھ ہزار یہاں آن کر کیا کرو گے۔؟ (۱)

(۲)

مجاہد کی شان

یہ واقعہ بہت مختصر ہے، لیکن اس اجمال میں ایثار و فدویت کی کیسی تابناک تصویر ابھر رہی ہے:—

"چند سال بعد جو شہر کے کنویں صاف ہوئے تو بہت سے کنوؤں میں عورتوں کی لاشیں نکلیں۔ ایک جاہل مسلمان نے اپنی بہو بیٹی بیوی کو اس خوف سے کہ دشمن معلوم نہیں ان کا

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۷۵

مال کیا کریں۔ اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ اور خود جہاد کرنے گیا۔ (۱)

(۳)

مُجاہد اور باغی کا فرق

بغاوت یا جنگ کی صورت میں۔ سب کچھ جائز ہے، پہلے بھی جائز تھا، آج بھی جائز ہے اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے ہمیشہ جائز رہے گا، لیکن، اسلام نے، ہر چیز کے حدود مقرر کر دیئے ہیں، جنگ، قتال، اور جہاد کے حدود بھی اس نے مقرر کر دیے ہیں، اور پہلی حد یہ ہے کہ کسی حالت بھی دشمن کے بچوں، اور عورتوں کو نہ قتل کیا جائے نہ اذیت دی جائے۔ یہ مجاہد انگریزوں سے برسر جنگ تھے، لیکن : —

یہیں تو دت ۱۸۵۷ء کے عام فتنہ کے وقت بجائے بغاوت اور فساد کے وہابیوں نے انگریزوں کی میم اور بچوں کو باغیوں کے ہاتھ سے بچا کر اپنے گھروں میں چھپا رکھا تھا (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص ۶۰۰

(۲) تاریخ عجیب ص ۳۰

(۴)

بخاک وخون غلطیدن

یہ مجاہد یہ خدا کے پراسرار بندے، کس طرح پھانسی پر چڑھتے، اور جان، جان آفریں کو سپرد کرتے تھے، دیکھئے :—

۲۹ مئی کو عالیں دارالسلطنت لکھنؤ میں بغاوت کے شعلے بھڑکنے شروع ہوتے۔ حضرت محل کی پشت پناہی کے لیے علماء اور مجاہدین اسلام کی منظم جماعت اودھ میں پہلے سے موجود تھی۔ سب سے پہلے ایک سردار آغا مرزا عرف کمبل پوش نے صرف دو سو مجاہدین کو ساتھ لے کر محمدی جھنڈا بلند کیا۔ لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے ان سب کو گرفتار کر لیا گیا۔ قیصر التواریخ میں مرقوم ہے کہ :-

"ان لوگوں نے جس مرد آدمی کو دیکھا اس کو جہاد کی ترغیب دینے لگے۔ کوتوال سعادت گنج نے ان سب کو گرفتار کرایا۔ جلو خانہ کا دروازہ ان کی شہادت گاہ بنا۔ یہاں پر آغا مرزا کے ساتھ ۱۴۳ مجاہدین کو پھانسی کی سزا[1] دی گئی۔"

(۵)

تازیانہ کا کام

ان مجاہدین کے حوصلے یاس و حرماں کے عالم میں بھی بلند رہتے تھے، تاریخ بتاتی ہے :-

---

[1] قیصر التواریخ صفحہ ۱۹۹ —

ایک روز علی محمد خان نے علم اٹھایا۔ اور قرآن شریف کو مثل جنگ صفین اس میں باندھا۔ اور کلمات یاس کہتے رہے۔

ایک فقیر منش بزرگ جن کو عوام عقیدت سے شاہ جی کہتے تھے۔ ان کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ یکہ و تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر جی گارد پر اشعار ذیل پڑھتے ہوئے حملہ آور ہوئے ہیں

"درمیاں ایں و آں گردد بسے جنگ عظیم — قوم عیسےٰ را شکست بے گماں پیدا شود"

دلی کی شکست کی خبر نے تازیانہ کا کام کیا۔ اور حملوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ [1]

(۶)

مسلمان جون آف آرک

یہ واقعہ مورخوں نے نظر انداز کر دیا ہے، لیکن انگریز، اس کے بیان کرنے پر مجبور تھے:۔

مراسلہ نمبر ۲

جسے لفٹنٹ ڈبلیو۔ ایس۔ آر ہڈسن نے ڈگلس فارسیتھ ڈپٹی کمشنر انبالہ کے نام ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

دہلی کیمپ ۲۹ جولائی ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر فارسیتھ

جو بوڑھی خاتون بہ نفس نفیس اس مراسلہ کے ہمراہ آ رہی ہے، وہ خاصہ دہلی کی کٹی دیکھ چکی ہے

---

[1] قیصر التواریخ ص ۲۸۶

ہے ۔

وہ ہمارے خلاف شہر میں جہاد کا وعظ کہتی تھی۔ اور اپنے مواعظ و نصائح سے اس نے تعجب خیز طریقہ پر مسلمانوں کے دلوں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر ان کی عدم کامیابی سے متنفر ہو کر وہ خود میدان جنگ میں اتر آئی اور سبز لباس پہن گھوڑے پر سوار اور تلوار و بندوق سے مسلح ہو کر اس نے سواروں کے ایک دستہ کی کمان لی اور ۰۵ ویں پیدل فوج پر حملہ آور ہوئی۔ سپاہیوں کا بیان ہے کہ اس ایک کا مقابلہ کرنا ۵ سپاہیوں کے مقابلہ سے زیادہ مہلک تھا۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے ان کے رفقاء میں سے بہت سوں کو نشانۂ بندوق بنا دیا۔ آخر کار وہ زخمی ہو کر گرفتار ہو گئی۔ جنرل نے اوّل اوّل اسے آزادانہ طور پر چلے جانے کی اجازت دینی چاہی تھی مگر میں نے ان سے بمنت درخواست کی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اس لیے کہ وہ پھر شہر میں فاتحانہ طریقہ سے داخل ہو گی۔ اور ہمارے قبضہ سے نکل جانے پر تعصب کا طوفان بے تمیزی مچا دے گی۔ اور بلاشبہ یہ ظاہر کرے گی کہ وہ اپنی کرامت کی وجہ سے بچ گئی ہے۔ اور اس طرح سے جون آف آرک کا سا رتبہ حاصل کرے گی۔

مجھے اس کو آپ کے پاس بھیجنے کی اجازت مل گئی ہے۔ تاکہ وہ جیل خانے میں محفاظت تمام رکھی جائے۔ یا جہاں کہیں آپ مناسب خیال کریں، تاوقتیکہ یہاں کا کام ختم نہ ہو جائے۔ کیا آپ براہ مہربانی اس امر کی نگہداشت رکھیں گے کہ اس کا طرز عمل قابل اطمینان رہے۔ یہ کہتے ہوئے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اس بڑھیا کوسٹ نے معقول اثر پیدا کر لیا تھا۔

آپ کا زیادہ مخلص

ڈبلیو۔ ایس۔ آر۔ ہڈسن (۱)

---

(۱) محاصرۂ دہلی کے خطوط

(۷)

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مجاہدین کا طبقہ زیادہ تر مولویوں اور عالموں پر مشتمل تھا، یہ لوگ کس بہادری سے جان دیتے تھے، یہ منظر بھی دیکھ لیجیے:—

مولانا پیر علی پٹنہ کے مشاہیر علماء سے تھے۔ ان کا کاروبار کتاب فروشی تھا۔ مگر دل میں انگریز سے دشمنی رکھتے تھے۔ ہنگامہ کی خبر نے ان میں بھی حرکت پیدا کر دی۔ کاروبار چھوڑ میدانِ مبارزت میں نکل آئے۔ عوام کو ہاتھ میں لیا۔ اور مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے لگے۔ علم سبز لہرایا گیا۔ اور نقارہ جہاد بجا دیا گیا، لوگ جوق جوق بلا امتیاز مذہب ان کے جھنڈے تلے آ جمع ہوئے۔ پہلا دھاوا رومن کیتھولک چرچ پر کیا۔ ڈاکٹر لائل جو اسلام اور ہندو مذہب پر طعن زنی کیا کرتا تھا۔ اسے آلیا۔ وہ جان سے مارا گیا۔ کچھ دن شہر پر غلبہ رہا۔ مگر سکھوں کی رجمنٹ پہنچ گئی۔ ان سے نہتے کیا لڑ سکتے۔ بہت سے وطن پر نثار ہوئے۔ ۱۳ مجاہد گرفتار ہوئے۔ پیر علی بھی پکڑے گئے لطیف علی رئیس پٹنہ بھی مولانا کے ساتھ تھا اور مالی معاونت کر رہا تھا وہ بھی دھر لیا گیا مگر اس کے روپیہ پیسہ نے اس کو بچا لیا۔ مولانا اور ۱۲ مجاہدین کو مسٹر ٹیلر نے دار پر لٹکا دیا۔ [1]

اور یہ خدا کے سرفروش سرخ رو ہو کر رب سے جا ملے۔

نہ کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱؎ تاریخ بغاوت ہند ص ۲۶۱ —

انہی کے بارے میں مولانا غلام رسول مہر اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں فرماتے ہیں :۔

دوسرا قابل ذکر واقعہ پیر علی خان کا ہے، جو لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن مجاہدانہ سرگرمیوں کے سلسلہ میں پٹنہ چلے گئے تھے اور وہاں کتابوں کی دوکان کھول لی تھی، تجارت مقصود نہ تھی، اُن کی اصل غرض یہ تھی کہ اہل وطن کو انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے تیار کریں، غالباً وہ کسی خفیہ جماعت کے بہت بڑے رکن تھے۔ جس کے حالات اب تک نہ معلوم ہو سکے، اور جماعت ہی نے انہیں کار خاص کے لیے پٹنہ بھیج دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا تو پیر علی خان نے پٹنہ میں منظم طریق پر کام شروع کر دیا، اور وہ خاصی دیر تک لڑتے رہے، لیکن زخمی ہو کر پکڑے گئے گرفتاری کے بعد انگریز حاکم نے پوچھا کہ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو، تو تمہیں کوئی گزند نہ پہونچایا جائے گا، لیکن بہادر پیر علی خان نے جواب دیا :۔

"زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان بچا لینا کار ثواب ہوتا ہے، ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان دے دینا ہی سب سے بڑی نیکی گنی جاتی ہے، تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو لیکن اس سرزمین سے ہزاروں تمہارے خلاف اٹھتے رہیں گے اور اطمینان سے حکومت کرنے کا جو مقصد تمہارے سامنے ہے، وہ کبھی پورا نہ ہوگا" اس گفتگو کے بعد انگریز حاکم نے پیر علی خان کے لیے سزائے موت تجویز کر دی، بہادر پیر علی خان نے صرف چند باتیں پوچھیں

۱ ۔ میرے مکان کے متعلق تمہارا فیصلہ کیا ہے؟ انگریز حاکم نے جواب دیا، کہ اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی،

۲ ۔ میری جائداد کے بارے میں کیا حکم صادر کر رہے ہو؟ انگریز حاکم نے کہا، وہ ضبط کر لی جائے گی،

۳ ۔ میرے بال بچوں کے بارے میں تم نے کیا تجویز کیا ہے؟ انگریز حاکم نے جواب دیا، کہ اُن کے متعلق فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا، نہ وعدہ کیا جا سکتا ہے،

پیر علی خان نے یہ جواب سنے اور کسی پریشانی یا جزع فزع بغیر پھانسی پانے کے لیے

روانہ ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (۱)

(۸)

تحریک جہاد کے چند اکابر

اب ہم تحریک جہاد کے چند اکابر کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ حالات اس تحریک کے بدترین انگریز مخالف، ہنٹر کی کتاب Our Indian Musalmans سے ماخوذ ہیں۔ سب و ہیہ کی تھی نظر انداز کر دیجئے۔ اسلام پر جو ناروا حملے، غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ میں کیے گئے ہیں ان پر بھی صبر سے کام لیجئے۔ جہاد سے متعلق جن عقائد کا اظہار کیا گیا ہے، انہیں بھی دل تھام کر پڑھ لیجئے لیکن یہ دیکھئے کہ یہ انگریز آقا اپنے باغی غلاموں کی سیرت اور کردار کا کیا نقشہ کھینچتا ہے :—

(۱)

مولانا جعفر تھانیسری

جعفر کی سوانح عمری جو تھانیسر کی منڈی میں عرضی نویس تھا۔ بہت دلچسپ ہے۔ وہ بہت

---

(۱) "چٹان" کا سالنامہ، ۲۰ جنوری ۱۹۵۶ء

ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ لیکن اپنی قابلیت کے صدقے بڑھتے بڑھتے قصبے کا نمبردار ہوگیا۔
ایک دن وہ اتفاقاً ایک سفری وہابی مبلغ کا وعظ سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس خوشحال شہری انسان کے مذہبی جذبات برانگیختہ ہوگئے۔ اس نے مسلمانوں کے بدعتی اعمال پر غور کرنا شروع کر دیا۔ اور جان بنین (John Bunyan) کی طرح روحانی تاریکی سے گذر کر اپنے آپ کو علانیہ وہابی کہنے لگا اور ہمہ تن مذہبی اصلاح میں مشغول ہوگیا۔
اس نئے وہابی نے اپنا بہت سا وقت اپنے نفس کا جائزہ لینے میں صرف کیا۔ اور اپنے نفس کی کیفیات کا بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کرتا رہا۔ اس نے اپنے مذہبی تجربات کو جعفر کے نصائح کے زیر عنوان لکھنا شروع کر دیا۔ اور وہ ان دستاویزات میں سے ایک نہایت ہی دلچسپ دستاویز ہے۔ جو کسی سیاسی مقدمہ میں پیش کی گئی ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے۔ میں نے یہ کتاب منگل کے روز ۱۸ ذوالحجہ ۱۲۸۵ھ میں لکھنی شروع کی ہے۔ اس کا انتظام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اس میں کسی خاص طریقہ کی پیروی نہیں کی۔ میں نے صرف وہ واقعات لکھ دیئے ہیں۔ جن کا تعلق دین و دنیا سے ہے۔ اور جن میں، میں نے وقتاً وقتاً حصہ لیا۔ مزید برآں میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ دنیا فانی ہے، انسان، جن، فرشتے، حیوانات، نباتات جو کوئی بھی اس دنیا میں پیدا ہوا۔ اپنے وقت مقررہ پر فنا ہو جائے گا۔ سوائے خدا کی ذات کے اور کوئی ہمیشہ رہنے والا نہیں جو کوئی اس دنیا میں پیدا ہوا وہ ہزارہا سال تک کیوں نہ زندہ رہا آخر افسوس اور ندامت کے سوا اور کچھ نہ لے گیا۔ میری اپنی حالت یہ ہے کہ میں نے دس برس کی عمر تک کوئی تعلیم حاصل نہ کی اپنے باپ کے فوت ہو جانے کے بعد جب میری عمر دس بارہ سال کی تھی۔ اور میرا چھوٹا بھائی چھ مہینے کا تھا۔ ہم اپنی والدہ کی سرپرستی میں تعلیم پانے لگے میری والدہ بالکل ناخواندہ تھی اسے کوئی مذہبی تعلیم بھی نہ دی گئی تھی لڑکپن میں میں نے تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور آوارہ پھرتا رہا۔ جب مجھے تھوڑی سی عقل آگئی تو میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔
۱۸۵۶ء میں عرضی نویسوں کے زمرہ میں داخل ہوگیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ تمام وکیل اور عرضی نویس

مجھ سے قواعد و ضوابط اور کونسل کے ایکٹ کے متعلق مشورے کرنے لگے۔ اور میں سب سے بازی لے گیا یہ عرضی نویس ایک قسم کے غیر رجسٹر شدہ معمولی وکیل ہوتے تھے۔ جو مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ بازوں کی عرضیاں لکھ دیا کرتے تھے۔ جعفر کی بہت اچھی پریکٹس تھی۔ مگر کافروں کی عدالت سے جو روپیہ وہ اس طرح حاصل کرتا وہ اس کے لیے کسی کام کا نہ تھا وہ کہتا ہے۔ اس کے برعکس اس پیشے میں میں نے اپنے مذہب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ایسا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں۔ اگر میں اس کو اختیار نہ کرتا۔ تو میری مذہبی حالت بہت اچھی ہوتی جب مجھے عدالتوں سے فرصت ملتی خواہ وہ دن ہی کے لیے تو میری حالت بہت اچھی ہو جاتی کافروں کے مسلمان ملازمین کے ساتھ محض تعلق ہی ہونا میرے پیشے کا بڑا نقص تھا۔ اور میرے نفس کے لیے ایک زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا۔

اگرچہ جعفر اس پیشے کو پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی قانون دانی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ارد گرد کے طاقتور زمیندار خاندانوں نے اس کو اپنا خاندانی قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ وہ بہت ہی مخلص آدمی تھا۔ وہ اپنی دنیاوی کامیابی کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں کبھی حائل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کے پاس جو کوئی آتا وہ اثر سنے بغیر نہ رہتا۔ آنحضرت کی طرح اس نے اصلاح کا کام اپنے ہی گھر سے شروع کیا۔ چنانچہ اس کا ایک منشی اپنے آقا کے سخت امتحان کے وقت بھی وفادار رہا۔ اور انبالہ کے سیشن جج کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے کے اندر اپنے آقا کے پہلو بہ پہلو مذہب کی حمایت میں کھڑا رہتا۔ ۔ ۱۸۵۷ء میں جب غدر شروع ہوا۔ تو جعفر اپنے دس معتبر مریدوں کے ساتھ جہادیوں کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جنگ کے غیر جانبدار کام میں بھی اس کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو نمایاں کر دیا اور اب وہ ان لوگوں میں شامل ہونے لگا جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دہلی کی جب باغیوں کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تو جعفر عرضی نویس کے کام پر چند ماہ واپس آ گیا۔ اور غدر کی ان پوشیدہ مصلحتوں پر غور کرنے لگا۔ جس نے آقا کو فتح دی کھلم کھلا جنگ میں اس کو شکست ہو چکی تھی۔ اب خفیہ سازشوں میں داخل ہو گیا۔ اس کے خفیہ دشمنوں نے اس کے نفرت انگیز پیشہ

کو مقدس بنا دیا۔ کیونکہ وہ اس کے متعلق لکھتا ہے۔ ہیں تے اس کام کو ایک خاص آدمی کے حکم کے مطابق اور ایک خفیہ مقصد کے لیے اختیار کر رکھا ہے یہ خاص شخص پٹنہ کا مولوی یحیٰ علی ہندوستان میں وہابیوں کا پیشوا تھا۔ اور خفیہ مقصد یہ تھا۔ کہ یہاں کی وہابی نو آبادی کو رنگروٹ اور اسلحہ بہم پہنچائیں جائیں جو اس وقت علانیہ انگریزی حکومت سے برسرِ پیکار تھی۔

میں پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کا حال بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت یہ شخص اس کا رہنما تھا۔ ۱۸۶۴ء میں مقدمہ سے بہت پہلے تمام ہندوستان میں یہ ادارہ اصلاحی جماعت خانہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عمارت محلہ صادق پور کے بائیں جانب واقع تھی۔ اس کا حجرہ کافی بڑا تھا۔ اور گلی میں پیچھے کی جانب بھی کافی دور تک چلا گیا تھا۔ اپنی ظاہری صورت میں اس کا منظر ویسا ہی حسرت ناک اور ویران تھا۔ جو ہندوستان کی ہر اینٹ چونے کی عمارت کا برسات کے مہینے کے بعد ہو جاتا ہے۔ یہ مشرق کے متعلق ہمارے عظیم الشان تصور کا کیسا حقیر جواب ہے۔ اس تمام عمارت میں سب سے زیادہ اہم ایک معمولی مسجد تھی جس میں ہر وقت نماز باجماعت ادا کی جاتی اور جمعہ کے دن خطبہ بھی ہوتا۔ جمعہ کے یہ وعظ بڑے ولولہ انگیز تھے۔ ان میں سب سے زیادہ کفار کے خلاف جہاد کے فرض پر زور دیا جاتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا جاتا۔ کہ عقیدہ کے بغیر ہر فعل عبث ہے۔ سامعین کو بہت بڑے روحانی خطرے سے آگاہ کیا جاتا ۔اور ان کو روحانی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی۔ یہ لوگ پیغمبر اسلام کی سادہ عبادت کا مقابلہ ان تکلیف دہ مراسم اور لاتعداد نقلیوں اور مساجد کے رکوع و سجود سے کرتے۔ اور ان لوگوں کو بہت برا کہتے جو وہابیوں کے جہاد یا ہجرت کے اصولوں کی مخالفت کرتے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کا روحانی معیار عام لوگوں کی قابلیت سے بہت بلند تھا۔ ان کے سامعین اگرچہ وقتی طور پر بہت گہرا اثر قبول کرتے تھے۔ لیکن اپنے دلوں میں بالعموم یہ خیال لے جاتے تھے۔ کہ ان کے لیے بڑی دشواریاں پیدا کر دی گئیں۔ شہر کی دوسری مساجد کے واعظ گو محلہ صادق پور کے واعظوں کے علم اور فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن اس بنا پر ان کی مخالفت کرتے کہ وہ متبرک

روایات کے منکر اور سخت موحد واقع ہوئے ہیں یحییٰ علی مبلغین کا افسر اعلیٰ اور خلیفہ تھا۔ اس نے پٹنہ کے مرکزی دارالاشاعت کے نظام کو بڑی مضبوطی لیکن نرمی کے ساتھ چلایا۔ ان رنگروٹوں کا جنہیں سفری مبلغ جنوبی بنگال کے مختلف اضلاع سے جوق در جوق بھیجتے تھے۔ جماعت خانہ میں بڑے جوش سے خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کو فوراً مجاہدین کے کیمپ میں بھیج دینا مقصود ہوتا۔ ان کو ان کے دنیاوی بھائی کے سپرد کر دیا جاتا اور وہ ان کو جماعت کے اصولوں سے زیادہ واقفیت پیدا کرنے کی تکلیف دیئے بغیر ان کے جوش و خروش کو مستقل کر دیتا۔ یہ دنیاوی بھائی دارالاشاعت کا وظیفہ خوار اور بہت ہی کارآمد شخص تھا۔ اس نے جماعت خانہ کے تمام دنیاوی کاروبار سنبھالے ہوئے تھے۔ اور رنگروٹوں کے سامنے ہر روز جہاد کے فرائض پر وعظ کہتا۔ وقتاً فوقتاً جب رئیس المبلغین کسی اور کام میں مشغول ہوتا تھا۔ تو دینیات کے طالب علموں کو جو اصل میں اس کے ماتحت نہ تھے۔ الہیات پر بھی درس دیتا۔ وہ جو کچھ بھی کرتا پورے اخلاص کے ساتھ کرتا۔ اور انجام کار بڑی دلیری کے ساتھ اپنے آقا کے ہمراہ انبالہ کی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ یحییٰ علی رئیس المبلغین کے بہت سے فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں تمام سفری مبلغین کا روحانی پیشوا ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط و کتابت کرتا۔ پھر جملہ دستاویزات کو خفیہ زبان میں ترتیب دیتا۔ اور لکھتا۔ جس کے ذریعہ سے بڑی بڑی رقوم بلا خوف و خطر سلطنت کے دارالخلافہ سے سرحد کے پار کے مجاہدین تک پہنچ جاتیں۔ وہ مسجد میں نماز جماعت کی امامت کرتا۔ اور ان بندوقوں کی جانچ پڑتال بھی کرتا۔ جو مجاہدین کو روانہ کی جاتیں۔ وہ طالب علموں کو الہیات پر درس دیتا تھا۔ اس کا اپنا مطالعہ عربی بڑا وسیع تھا۔ عربی مصنفین سے بھی اس نے کافی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن سازشیوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کا دارالاشاعت تھا جس کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے۔ مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے۔ رنگروٹوں کا پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی کو اپنی بستی سے راستہ میں ہزارہا تکلیف دہ سوالات پوچھے جانے کا احتمال تھا۔ شمال مغربی صوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی۔ اس کی اجنبیت ہر گاؤں میں اپنے تمدن اور زبان

کی وجہ سے بہت جلد ظاہر ہو جاتی۔ لیکن اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی قابلیت پوری طرح بروئے کار آئی اس نے تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اور ان کا انتظام معتبر مریدوں کے کے ہاتھوں میں رکھا۔ اس نے جرنیلی سڑک کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس طرح سرحدی کیمپ کو جانے والا باغی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا۔ اس کو یقین تھا۔ کہ ہر پڑاؤ پر اس کو ایسے دوست مل جائیں گے۔ جو اس کے لیے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راہ میں پڑتے ان کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے۔ مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے میں ہمہ تن معروف تھے اور ایک مقامی سازشی ان کا صدر ہوتا تھا۔ یحییٰ علی نے ایسے اشخاص کے انتخاب میں اپنی مردم شناسی کا بہترین ثبوت دیا کیونکہ ان میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا لالچ کی ترغیب سے اپنے تباہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

(۲)

مولانا یحییٰ علی رح

سب سے زیادہ یہ کہ یحییٰ علی ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پٹنہ میں انگریزی حاکموں کے ساتھ اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ اس کے خاندان میں سے ایک ہماری حکومت کے اعزازی عہدے پر مامور اور دوسرا ہماری سرحد پر مجاہدین کی چھاپے مارنے والی جماعت کی رہنمائی کر رہا تھا۔ شاید ہی کسی عدالت نے ایسے پُر اثر الفاظ کہے ہوں گے جیسے کہ سر ہربرٹ ایڈورڈ نے اس کے لیے سزائے موت تجویز کرتے ہوئے کہے۔ سر ہربرٹ نے کہا۔ یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا ہے۔ کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے جس کا انکشاف اس مقدمہ میں ہوا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا۔ اور اس مذہبی رعایت کے ماتحت پٹنہ کی مسجد میں اسلام کے قابلِ نفرت

اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ اس نے اپنے ماتحت ایجنٹ رکھے ہوئے تھے جو روپیہ جمع کرتے اور جہاد کی تعلیم دیتے تھے۔ اس نے اپنی سازشوں سے ہندوستانی حکومت کو ایسی سرحدی جنگوں میں دھکیل دیا۔ جس میں سینکڑوں جانیں ضائع ہوگئیں۔ وہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہے۔ اور اپنی لاعلمی کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا سوچ سمجھ کر عمداً اور سخت باغیانہ طریقہ پر کیا۔ وہ موروثی باغی ہے۔ اور ایک متعصب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خواہش ایک مذہبی مصلح کے درجہ تک پہنچنے کی ہے۔ لیکن بنگال کے برہمو سماجی ہم وطنوں کی طرح دلیل اور فطرت صالحہ سے اپیل کے بجائے وہ اپنا مقصد سیاسی انقلاب سے پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور دیوانوں کی طرح اس حکومت کے خلاف سازش کرتا ہے۔ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو تباہی سے بچایا اور یقینی طور پر مذہبی آزادی عطا کی۔

(۳)

محمد شفیع

جعفر عرضی نویس اور یحییٰ علی رئیس المبلغین نے ۱۸۶۴ء کے قیدیوں میں سازش کے مذہبی رہنما ہونے کی حیثیت سے نمایاں جگہ حاصل کی۔ لیکن ان کی باغیانہ قابلیت کا عملی پہلو دہلی کے ہتھنیک فروش قصاب اور پنجاب میں انگریزی فوجوں کو گوشت مہیا کرنے والے ٹھیکیدار محمد شفیع کی قابلیت سے بہت کم تھا۔ محمد شفیع شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے تاجر خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ گورنمنٹ کے ساتھ اس کے خاندان کے تعلقات کی بنا ہمیں وارن ہیسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کی جنگوں کی طرف لے جاتی ہے۔ محمد شفیع کے دادا پڑدادا معمولی چرواہے تھے۔ جنہوں نے کچھ تو اپنی ہوشیاری اور کچھ کفایت شعاری سے دنیا میں نام پیدا کر لیا تھا۔ یہ زمانہ دولت کمانے کا تھا۔ نہ کہ اس کو جمع کرنے کا۔ جنگ کے زمانہ کی قیمتیں رائج تھیں۔ فوجوں کی آمد و رفت متواتر جاری تھی اس لیے کیمریٹ والوں کو ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ شمالی ہندوستان کے گڈریوں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے جائیں۔ ممکن ہے اس غدار

خاندان کی برتری کا سبب ۱۷۶۹ء کا قحط ہوا ہو جس نے انگلستان کے باشندوں کو ہندوستان میں اپنی ذمہ داری محسوس کرنے کے لیے بیدار کیا تھا۔ اس کا دادا اس صدی کے آخری دس سالوں میں بہت بڑی ذمہ دار حیثیت پر پہنچ گیا۔ وہ کمسریٹ کے افسر انچارج کی پوری تسلی کے ساتھ بڑے بڑے ٹھیکے پورے کرتا رہا۔ محمد شفیع کے والد نے اس تجارت کو زیادہ بڑھا دیا تھا اس روپے کے علاوہ جو معمولی معمولی پیشہ وال کو وہ پیشگی دے دیا کرتا تھا اس کے پاس اور سرمایہ بھی تھا۔ اس سرمائے کو اس نے قابلِ اعتماد ضمانتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سود پر لگا دیا۔ اس کا لڑکا بہت بڑی جائداد کا مالک تھا۔ لیکن والد ہی کا پیشہ اختیار کرنے والی ہندوستانی ذہنیت کی تقلید میں اپنی خاندانی تجارت میں پوری قوت کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ وہ ایک ساہوکار، اور تھوک فروش قصاب کی حیثیت سے ایسے ناجائز افعال کرتا رہا جن کی پاداش میں اس کو انبالہ کے جیل خانہ میں قید ہونا پڑا۔"

کوئی شبہ نہیں حضرت صاحب۔ اس ذکر میں جوشِ غضب سے بے قابو ہوئے جا رہے ہیں، نہ ان کی زبان قابو میں ہے، نہ قلم، وہ ایک مہذب قوم کے مہذب فرد ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، اور ایک باوقار قوم کے با اختیار نمائندے ہیں لیکن اس کے باوجود، جوشِ تعصب، اور جوشِ غضب سے اتنے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں کہ

نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں،

وہ اپنی قوم کو بھی لتاڑتے ہیں، اس کی کمزوریوں پر بھی اسے متوجہ کرتے ہیں، اس کی خامیاں بھی واشگاف کرتے ہیں، لیکن اپنی مستعمرہ کے ایک "باغی" کا ذکر جب کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، تہذیب، شائستگی، سنجیدگی اور متانت سے وہ خود بھی باغی ہو چکے ہیں، کسی اخلاق اور اصول کے قائل نہیں ہیں، بہرحال، بہت کچھ آپ سن چکے، اب دیکھئے اس سلسلہ میں ان کی گل افشانی، گفتار کیا رنگ دکھاتی ہے،

ارشاد ہوتا ہے:۔

"چونکہ رئیس المبلغین سب کا سردار تھا۔ اس لیے یہ شخص اس سازش کا دستِ راست تھا۔ ہندوستان

کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں تھیں - اور جرنیلی سڑک کے ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا، پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اس کے خاندانی یا تجارتی تعلقات تھے۔ وہ اپنے بڑھتے ہوئے ملازمین کے دائرے کا مرکز تھا - جو شمالی ہند کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے تھے - اس کے تجارتی کاروبار نے سرحد پار کی، گذر یا اقوام کے ساتھ بھی اس کے تعلقات پیدا کر دیئے تھے - وہ ہر سال انگریزی حکومت سے لاکھوں پونڈ وصول کرتا - وہ اپنے کام میں وقت کا بڑا پابند تھا - وہ افسروں کا حکم خادموں کی طرح بجا لاتا تھا - چنانچہ اس نے کمسریٹ کے افسر کو فریب دے کر فوجوں کو گوشت مہیا کرنے کے ٹھیکہ کی تجدید کرالی - وہ ملکہ کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں ماخوذ تھا - اس طرح ہمارا ملازم ہونے کی حیثیت سے جو عالمگیر اقتدار اسے حاصل ہوگیا تھا - وہ اس کو ہماری تباہی اور بربادی کے لیے استعمال کرنے لگا - وہ اس سازشی جماعت کا ساہوکار تھا - اور مجاہدین کو روپیہ پہنچانے کے لیے اس نے اُن مراعات کو جو فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں - نہایت چالاکی سے استعمال کیا - اس میں بذاتِ خود کوئی مذہبی جوش نہ تھا - اس نے کسی بے ہودہ تعصب کو اپنی عقل پر غالب نہ آنے دیا - وہ کسی مجاہدانہ قربانی کا ملزم نہ تھا - وہ اس عرصہ میں بہت ہی ہوشیار دوربین اور کمینہ تجاویز سوچنے والا ثابت ہوا - اس نے بہت زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے عمداً اس خطرناک کام میں ہاتھ ڈالا اور اپنی قابلیت اور اپنی حیثیت پر اعتماد کیا جن کے متعلق خیال تھا کہ اسے راستہ کے تمام خطرات سے محفوظ رکھیں گی -

داستان ابھی ختم نہیں ہوئی، آقا، جب اپنے غلام کی سرتابی اور سرکشی، اور بغاوت کا ذکر کرتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے - ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہے، اس ہنٹر کو باغی غلام کے جسم پر مار لیتا ہے، تب دو سطریں ہی لکھتا ہے، کبھی اس کی بھویں تنتی ہیں - کبھی اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوتی ہیں - کبھی اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے، کبھی وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے قلم سے الفاظ کے بجائے انگارے، اور شرارے نکلنے لگیں، وہ جو کچھ لکھتا ہے، احتساب کے خوف سے بے پرواہو کر لکھتا ہے - اور روانیٔ قلم کے جوہر دکھاتا ہے -

ہنٹر صاحب، اس داستان کا ایک ٹکڑا، اپنی متین اور مہذب زبان میں اور پیش کرتے

ہیں ۔

جعفر علی اور یحیٰی علی کے خلوص کا اعتراف

جعفر عرضی نویس اور یحیٰی علی رئیس المبلغین نے اپنی وفاداری کا کبھی جھوٹا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہم سے کوئی مراعات طلب کیں ۔ وہ بڑے مخلص اور با اصول انسان تھے ۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو اس زہر آلود ہتھیار سے مجروح کیا ۔ جس کو ایک جھوٹے مذہب نے ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا ۔ لہٰذا اب جب کہ اُنہوں نے اپنی غداری کی سزا بھگت لی ہے ، ان کے اس انجام پر رحم کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے ۔ اس کے برعکس شفیع نے ہمارے ہاتھوں کو کاٹنے کے لیے چاٹا اور ان لوگوں سے جو اس کے ساتھ سازش میں شریک تھے ناجائز سود وصول کرتا رہا ۔ اس نے باغیانہ خطرے کے درمیان دلالی کا کام بہت زیادہ منافع پر کیا ۔ اور چھوٹے موٹے غداروں کے درمیان جن کو ۱۸۶۴ء کے مقدمہ نے انبالہ جیل میں جمع کر دیا بالکل ہی الگ حیثیت رکھتا تھا ۔ اس کو ان خطرناک بدمعاشوں کی یادگار سمجھئے جو روحانی جمہوریت کے زوال سے پیدا ہو گئے تھے ۔ اور جن کا حال سسرو (CECER O) کی آتش بیانی نے ہم تک پہنچایا ۔ اس میں اوپیونیس (OPPIANC E i) کی بے رحمی اور لینٹیوس (Lan tulus) کی احتیاط پائی جاتی ہے ۔ ایک قدم جو اس نے اُٹھایا ، یہ تھا کہ جنگی جہاز کے نمودار ہونے پر بھی اس نے بحری ڈاکوؤں کا ساتھ نہ چھوڑا ۔

بغاوت کے نمایاں پہلو

اس بغاوت کے تین نمایاں پہلو جو مقدمہ کے دوران میں ظاہر ہوئے یہ ہیں ۔ پہلی وہ حیرت انگیز قابلیت جس سے دُور دراز تک پھیلی ہوئی بغاوت کو منظم کیا ۔ دوسرے وفاداری کا وہ رویہ جو اس کے ممبروں نے ایک

دوسروں کے ساتھ روا رکھا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے عمدہ فرضی ناموں کی ترکیب اور خفیہ زبان پر تھا۔ جس کا نمونہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ لیکن میں اس یقین کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تمام سازشی سوائے محمد شفیع قومی ٹھیکیدار کے اپنے کام انتہائی خلوص اور فطری جوش کے ساتھ خدائی کام سمجھ کر کرتے تھے ان کا عہد تھا کہ مرتے دم تک اس فرض کو سرانجام دیں گے۔ صوبے کی سب سے بڑی عدالت نے ان کی اپیل کو نہایت متانت کے ساتھ سننے کے بعد مسٹر ہربرٹ کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق کیا کہ وہ فی الواقعہ مجرم ہیں۔ اور پھانسی کی سزا کو حبس بعبور دریائے شور سے بدل دیا۔[۱۱]

(۹)

نواب وزیر الدولہ کا کردار

جب وہ صرف یہی نہیں ہے کہ گذشتہ وقتوں کا مطالعہ کیا جائے، ہم اپنی عزت و حرمت کے لیے ہر خطرہ کو خندہ جبیں کے ساتھ خوش آمدید کہتے بھی ایک قسم کا جہاد ہے اور مسلمان اس میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے، نواب وزیر الدولہ کا یہ واقعہ خاص اہمیت کا حامل ہے:

نواب وزیر الدولہ پر غدر میں الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے نانا صاحب کو یہاں درخواست بھیجی تھی کہ جو کام میرے لائق ہو مجھے سپرد کیا جاوے میں خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ ابھی امتحان نہ ہوا تھا۔ کہ آگرہ میں لارڈ لارنس کا دربار ہوا جس میں والیان ریاست و نواب مدعو تھے اور مقصود اس سے والیان ریاست و نواب کا امتحان تھا۔ اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا۔ نواب وزیر الدولہ اس

۱۱۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۲۲ تا ۱۵۲

پر جم گئے۔ کہ میں جمعہ چھوڑ کر دربار میں نہ جاؤں گا۔ جب یہ خبر نواب یوسف علی خاں والی رامپور اور سکندر بیگم والیہ بھوپال کو ہوئی تو یہ دونوں آئے اور اُکر سمجھایا کہ آپ مسافر ہیں۔ اور مسافر پر جمعہ فرض بھی نہیں۔ پھر آپ پر الزام بھی قائم ہے۔ اس لیے مناسب نہیں ہے۔ کہ آپ دربار میں نہ شریک ہوں انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ صحیح ہے۔

"مگر میں یہ ہرگز نہ کروں گا۔ کہ اپنے نفس کے لیے خدا کے دربار کو چھوڑ کر دُنیا کے دربار میں شریک ہوں۔ القصہ اُنہوں نے کسی طرح ترک جمعہ منظور نہیں کیا۔ اور چٹھی لکھ دی۔ کہ آج جمعہ ہے۔ اور مجھے نماز جمعہ میں شریک ہونا ہے۔ اس لیے میں حاضری دربار سے معذور ہوں۔ اُس چٹھی کا جواب آیا کہ اگر ہمیں پہلے سے خیال ہوتا۔ تو ہم جمعہ کو دربار نہ کھولتے۔ مگر اب اعلان ہو چکا ہے۔ اس لیے دربار تو نہیں موقوف ہو سکتا۔ آپ نماز جمعہ پڑھیں آپ کے لیے دربار خاص منعقد کیا جاوے گا۔ یہ مضمون بیان فرما کر خانصاحب نے فرمایا۔ کہ تم جانتے ہو۔ وزیر الدولہ کی یہ حالت کیوں تھی۔ اس کا سبب محض یہ تھا۔ کہ اوس نے خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب کی خاک چاٹی تھی۔ (۱)

(۱۰)

جان بچی لاکھوں پائے

ذیل کا واقعہ دلچسپ بھی ہے، اور سبق آموز بھی، اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کے لیے، یہ بات کتنے عظیم خطرات کا پیش خیمہ تھی کہ وہ وہابیوں کا ہمدرد ہے۔

---

(۱) امیر الروایات ص ۳۷

نتیجہ کی اطلاع نواب کو اس چٹھی سے دی گئی جو گورنمنٹ نے کمشنر کے نام بھیجی تھی اور جس کا مفصلہ ذیل فقرہ قابل اندارج ہے :-

"نواب لفٹننٹ گورنر بہادر خواہشمند ہیں کہ آپ نواب گنج پورہ کو اطلاع دے دیں کہ مخبروں نے اُن کو معتوب کرانے کی غرض سے جو الزامات لگائے تھے ان کی تحقیقات سے گورنمنٹ عالیہ کی رائے میں ثابت ہو گیا ہے کہ اگرچہ مخالفین نے وہابیوں کا ایک قاصد اُن کے پاس بھیک مانگنے کے بہانے سے بھیج کر پھنسانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اپنے مدعا کے حصول میں بالکل ناکام رہے ہیں اور سرکار دولتمدار کی نظروں میں نواب صاحب نہ صرف الزامات سے پاک ثابت ہوئے ہیں بلکہ ان کی عزت وتکریم پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔" (۱)

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد اوّل صفحہ ۳۴

باب ۳۲

شاندار "کردار"

غدر کے دوران میں مسلمانوں کی سیرت و کردار کے ناقابل فراموش نمونے

مسلمان انگریزی حکومت سے نفرت کرتے تھے، انگریزوں کے ظلم و استبداد نے انہیں بغاوت سرکشی، شورش اور مقابلہ پر آمادہ کر دیا تھا، غدر جب شروع ہوا تو انہوں نے انتقام لیا، اور انگریزوں کو بہت جور و ستم بنایا، لیکن اس ابتلاء عام میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انگریزوں سے، اور ان کے نظام حکومت سے بے انتہا متنفر ہونے کے باوجود، انہوں نے ان کی جان بچائی، ان کے ساتھ احسان کیا، انہیں مصیبت اور ذلت کے بھنور سے نکالا،

باوفا ملازم منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں پر کوئی رات ایسی دہشت ناک نہیں گذری جیسی کہ دسویں گیارہویں کے درمیانی شب گذری چاروں طرف انگریزوں کے بنگلے جل رہے تھے۔ باغیوں کا غل شور اور بندوقوں کی آوازیں دلوں کو ہلا رہی تھیں۔ بعض ہندوستانی ملازم ان بے وفاؤں میں ایسے وفادار تھے۔ جنہوں نے اپنے گورے رنگ کے آقاؤں کی جانوں کو بچایا۔ اور محسن کشی نہیں کی سید میر خاں ایک مسلمان پنشندار نے کمشنر اور میم صاحب کی جان بچائی بعض میمیں جن کے شوہر لین میں اپنے فرض منصبی ادا کرنے گئے تھے۔ اپنے جلے ہوئے گھروں میں بڑی بے رحمی سے قیمہ قیمہ ہوئیں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے اپنی ماؤں کے سامنے قتل کئے گئے۔"[1]

[1] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۱۰۴

ایک شاعر کی آپ بیتی

بہادر شاہ کے مقرب خاص، راقم الدولہ ظہیر دہلوی، تحریر فرماتے ہیں:

مجھے اس وقت تشنگی کا نہایت غلبہ تھا۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ روزہ دار تھا اس پر یہ تکلیف شاق ہی وہیں تسبیح خانے کے سائبان کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک اور ہنگامہ برپا ہوا۔ کیا دیکھا کہ تسبیح خانے کی سیڑھیوں پر ایک جوان ولایتی چلا آتا ہے۔ اور پوربی اس کو لیے ہوئے ہیں۔ اور ولایتی کے سیدھے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیتل کی لٹیا اور موٹھ تلوار کی ہے۔ مگر ٹوٹ کر آدھی رہ گئی ہے۔ اور وہ نصف تلوار قبضہ تک خون میں بھری ہوئی ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں ایک نوجوان حسین مہ جبین نازنین کا ہاتھ ہے۔ اس لڑکی شکیلہ وجیہہ کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی معلوم ہوتی ہے۔ دراز قد کتابی چہرہ باریک کمر سفید براق سایہ اس کے گلے میں ہے۔ مگر اس پر کچھ کچھ خون کی بوندوں کے نشان معلوم ہوتے تھے۔ اور لڑکی کا منہ فق رنگ سپید۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اوسان ٹھکانے نہیں۔ پسینے پسینے ہو رہی ہے۔

راقم یہ کیفیت دیکھتے ہی فوراً بے تابانہ اس کے پاس پہنچا۔ اور دل میں خیال کیا کہ اس کے پاس ہاتھ میں شمشیر برہنہ موجود ہے۔ اور سر پر خون سوار ہے مبادا مجھ پر ہی وار کر بیٹھے۔ یا اس نازنین پر ہاتھ چھوڑے گا تو اس کا کام تمام ہو جائے گا۔ پہلے اس کے ہاتھ سے تلوار چھین لی جائے پھر اس لڑکی کا ہاتھ چھڑا لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے جاتے ہی پہلے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی خوب طاقت سے پکڑی اور بائیں ہاتھ تلوار کی کنڈی پر ڈالا۔ اور زبانی یہ الفاظ کہے کہ میاں بے ادب۔ تو نہیں جانتا کہ یہ بادشاہی ڈیوڑھی ہے۔ یہاں ہتھیار باندھنے کی ممانعت ہے۔ اس میں اور آدمی بھی آ کر چمٹ گئے۔ اور اس نازنین ہرنی رم رسیدہ نے جو اس طرح کا ترحم اور حامی و مددگار پایا تو وہ میری اوٹ میں ہو گئی۔ اور میری کمر میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ جب اس کا جسم میرے جسم سے مس ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ مارے خوف کے بید کی طرح لرزاں و ترساں ہے۔ کلیجہ اس کا دھڑک رہا تھا غرض کہ میں نے تلوار تو اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور پوچھا کہ تیرا کیا مطلب ہے منہ سے بیان کر جوان ولایتی بولا۔ بھائی خدا کی قسم ہے ہم نے کچھ نہیں لوٹا۔ دنیا سارے شہر کا مال لوٹ کر لے گئی۔ ہم نے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ہم نے فقط یہ مال لوٹا ہے۔ ہم کو یہ مال مل جائے

اور ہم کو کچھ نہیں درکار۔

راقم نے وہ شمشیر شکستہ اس کے حوالے کی اور کہا۔ ابھی تم کو یہ مال نہیں مل سکتا۔ بہتر یہ ہے کہ تھوڑے روز تم صبر کرو۔ جب ہنگامہ فرو ہو جائے گا۔ اور غدر مٹ جائے گا۔ اس وقت یہ امانت تمہاری تم کو مل جائے گی۔ ابھی تمہارے بادشاہ کے پاس رہے گی۔ اس میں خواجہ سرا وغیرہ جو سب ڈیوڑھی پر موجود تھے راقم کے ہم زبان ہوئے۔ اور سمجھا بجھا کر وہاں سے روانہ کیا اور اس نوجوان نازنین کے ذرا جان میں جان آئی۔ اور مجھ سے الگ ہو کر کھڑی ہوئی۔ اب میں نے اس مس سے اس کا حال دریافت کیا کہ یہ کیوں تم کو لایا؟

نوجوان مس نے منہ کو ہاتھ لگا کر پانی کا اشارہ کیا۔ میں نے آبدار خانے میں سے پانی منگوا کر اس کو پلوایا۔ جب ذرا ہوش درست ہوئے۔

نوجوان مس۔ اس آدمی نے صاحب کو مار ڈالا۔ اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر لے چلا۔ راستے میں سپاہی لوگ ہم کو چھیننے لگے۔ اس نے نہ دیا۔ مرنے مارنے پر تیار ہوا۔ لڑتا بھڑتا یہاں تک آیا۔ مال و اسباب ہمارا و نیا نے لوٹ لیا۔ کیا اب ہم کو پھر اس آدمی کو دے دو گے۔؟

راقم:۔ نہیں۔ نہیں ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب بادشاہ کی پناہ میں آ گئی ہو۔ جیسا بادشاہ کا حکم ہو گا ویسا کیا جائے گا۔ ابھی تم کو حفاظت میں با آسائش رکھا جائے گا۔ کوئی تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ جس وقت غدر مٹ جائے گا تم کو اختیار ہے جہاں چاہو رہو۔ تم مختار ہو۔ تمہاری زندگی تھی کہ تم زندہ سلامت یہاں آ گئیں۔ اب تم کو کوئی نہیں مار سکتا۔

ٹھنڈا سانس بھر کر دیکھنا چاہیے۔

راقم نے خواجہ سرا سے کہا کہ ان کو محل میں بھجوا دو۔ اور خواجہ سرا نے ڈیوڑھی کا پردہ اٹھایا اور باری دار کو آواز دی۔ بی باری دار میم صاحب آتی ہیں۔ انھیں حضور میں پہنچا دو۔ ڈیوڑھی کا پردہ اٹھا۔ اور وہ نوجوان نازنین خاتون اندر داخل ہوئی۔ (۱)

---

(۱) داستان غدر ص

ذکاء اللہ نے کیا کیا؟ پادری سی ایف اینڈریوز فرماتے ہیں:
پروفیسر رام چندر نئے نئے عیسائی ہوئے تھے۔ انتہائی خطرہ میں پڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر چمن لال کو جو ان کے ہم مذہب اور نہایت خدا ترس انسان تھے۔ اور رفاہ عامہ کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ سپاہیوں نے فوراً ہی قتل کر دیا۔ اس کے بعد پروفیسر رام چندر کی تلاش شروع ہوئی۔ منشی پیارے لال صاحب دہلوی نے جو اُن چند اشخاص میں سے تھے۔ جو غدر میں بچ گئے تھے۔ مجھ سے بیان کیا۔ کہ کس طرح سے اس صبح کو جب کہ میرٹھ سے آنے والے باغیوں نے دہلی پر قبضہ کیا۔ دس بجے کے قریب ان کی ملاقات ذکاء اللہ سے ہوئی۔ جو اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر دہلی کالج جا رہے تھے۔ تاکہ وہ کسی نہ کسی ترکیب سے پروفیسر رام چندر کو بچائیں۔ کالج پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ ان کے کسی دوسرے طالب علم نے انہیں پہلے سے آگاہ کر دیا ہے۔ ذکاء اللہ اس نازک موقعہ پر مزید امداد کرنے کے قابل ہو گئے۔ چنانچہ پروفیسر رام چندر چند دن تک وسط شہر میں چھپے رہے۔ اور بالآخر اپنے شاگردوں کی مدد سے بھیس بدل کر اندرونِ ملک میں چلے گئے اور اسطرح خطرہ سے باہر نکل گئے۔ اس اثنا میں انہیں انتہائی اندوہ ناک پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ (۱)

وفاداری کا صلہ ٹھکرا دیا غدر میں بہت علماء مخالف تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ جہاد نہیں ہے انہیں میں میر محبوب علی صاحب بھی تھے۔ اور آپ وعظ و نصیحت کے ذریعہ لوگوں کو غدر سے روکتے تھے۔ جب غدر فرو ہوا۔ تو انگریزوں کی طرف سے ان کو گیارہ گاؤں مسلم انعام میں دیے گئے تھے۔ اور ایک بڑا انگریز گاؤں کی معافی کا پروانہ لے کر خود مولوی صاحب کی خدمت میں پہونچا اور کہا کہ گورنمنٹ نے آپ کی وفاداری کے صلہ میں آپ کو گیارہ گاؤں عطا کیے ہیں۔ اور یہ پروانۂ معافی ہے۔ مولوی صاحب یہ سنکر نہایت برہم ہوئے۔ اور پروانہ لے کر اس انگریز کے سامنے پھاڑ ڈالا۔ اور فرمایا۔ کہ میں نے کیا تمہارے لیے کیا تھا میرے نزدیک مسلم

---

(۱) ذکاء اللہ دہلوی (سی ایف اینڈریوز) ص ۱

یل ہی تھا۔ اس لیے ہی لوگوں کو منع کرتا تھا۔ (۱)

مخبر کی شہادت غدر میں انتہائی اشتعال کے باوجود ذمہ دار مسلمانوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچانے کی پورے اخلاص کے ساتھ جدوجہد کی:

جیون لال مخبر نے یہ بھی بیان کیا۔ کہ مرزا مغل نے یہ کہا تھا کہ عورتوں اور بچوں کا مارنا ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ تو تلنگے مرزا کو مارنے چلے بہ مشکل بھاگ کر انہوں نے اپنی جان بچائی۔

۱۶ مئی کے بعد نہ دلی میں نہ چھاؤنی میں ایک فرنگی باقی تھا۔ مغلوں کی دارالسلطنت میں برٹش کا کوئی قدم نہ تھا۔ (۲)

"میم" کی جان کس طرح بچی؟ ایک انگریز عورت کی جان دلی کے ایک مولوی خاندان نے، اپنی خواتین کی سلامتی خطرہ میں ڈال کر کس طرح بچائی؟ یہ واقعہ بہت اہم ہے:

مولویوں نے یہ کیا تھا کہ شاہی رتھ خانے سے ایک رتھ مانگ کر لائے جو اُن کو آسانی سے مل گئی اور یہاں مغرب سے پہلے میم کو بٹھایا اور اُس میں مولوی عبدالقادر صاحب کی بیٹی مولانا کی سالی اور مولوی نذیر حسین صاحب کی بیٹی کو کہ وہ بھی مولانا کی سالی ہوئیں اور مولوی عبدالقادر صاحب کے خالہ ۳ یا ۴ بچے سب رتھ میں بھر گئے سب کے بیچ میں میم صاحب بیٹھ گئیں رتھ کے ساتھ شعیب تھا جب لاہوری دروازے پر یہ لوگ پہنچے تو پہرے والوں نے پردہ اٹھا کر تلاشی لینی چاہی اُن سے یہ عذر کیا گیا کہ مولویوں کی بہو بیٹیاں ہیں قدم شریف منت اتارنے جاتی ہیں اور ابھی چھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ کر آئیں گی مولویوں کا نام سن کر باغیوں نے کاوش نہیں کی اور رتھ کو نکل جانے دیا۔ (۳)

ایک عبرت انگیز واقعہ اوپر جس "میم" کا ذکر ہوا ہے۔ وہ ایک انگریز خاتون، مسز لیسن تھی، اسے بچانے والے، دلی کے بہت بڑے عالم، مولانا عبدالقادر

---

(۱) امداد الروایات صـ ۱۳۸

(۲) تاریخ عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۴۳۱

(۳) حیات النذیر۔ صـ ۴۳

تھے، ڈپٹی نذیر احمد کے خسر مولانا عبدالقادر بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ لال قلعہ میں بھی ان کا بہت احترام ہوتا تھا، وہ انگریزوں کے دشمن نہیں، تو دوست بھی نہیں تھے، لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض سمجھتے تھے کہ کسی کا خون ناحق نہ ہونے دیں، آپ اس واقعہ کی تفصیل خاندان کے ایک فرد کی زبان سے سنیئے:

مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم جوانی کی حدود سے تجاوز کر رہے تھے۔ بڑھاپا اُن کے شباب کو فنا کر چکا تھا۔ مگر جوانی جیسے بیش بہا جوہر گمشدہ کے آثار ابھی چہرے پر موجود تھے۔ لاہوری دروازے کے پاس انہوں (۱) نے کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ یہ ایک مظلوم انسان کی صدا تھی۔ جو اس شخص کے کان میں آئی جس کی موت کا اس جرم میں فیصلہ قطعی ہو چکا تھا۔ کہ وہ انگریزوں کی دشمنی میں باغیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ زخمی کے نالوں نے مولانا کو اپنی طرف کھینچا۔ اور انسانیت کی رہبری قریب لے گئی۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک انگریز عورت خون میں شرابور زخموں میں چکنا چور دم توڑ رہی ہے۔ گو تکلیف کی شدت نے دست و پا بیکار کر دیئے ہیں۔ مگر موت کی پیاس پانی کا تقاضا کر رہی ہے۔ ایک بد نصیب زخمی انگریز عورت کے سرہانے ایک مسلمان مرد کا جس کے قتل کا فتویٰ بغاوت کے جرم میں صادر ہو چکا ہے۔ کھڑا ہونا آسان کام نہ تھا، دل کہہ رہا تھا۔ کہ ظالم گرانی کی خبر سن پائیں گے تو بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔ انسانیت اور ایمان کا تقاضا یہ تھا۔ کہ جان صداقت پر قربان ہو۔ ایک بے گناہ عورت کی حمایت میں ہر مصیبت راحت اور ہر اذیت مسرت ہوگی۔

رات کے ابتدائی حصہ میں جب دنیائے اسلام کا سر خدائے عزوجل کے حضور میں جھکا ہوا تھا تو مولوی عبدالقادر صاحب ایک انگریز عورت کو کندھے پر لیے گھر میں داخل ہوئے۔ زخمی خاتون سسک رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور جسم کے اکثر حصوں سے خون نکل رہا تھا۔ گھر کی عورتیں اپنے بد نصیب مہمان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ زخموں کو دھویا۔ بدن صاف کیا۔ پانی اور شربت حلق میں ٹپکایا

---

(۱) مولوی نذیر حسین محدث دہلوی بھی ہمراہ تھے۔

رہے تھے۔ دو بجے دروازے پر دین دین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ اس شخص کا گھر ہے۔ جس کی
موت کا مسئلہ صبح ہی سے طے ہو چکا تھا۔ اور یہ وہ عورتیں ہیں۔ جو دن بھر شوہر اور باپ کی موت
کو رو چکی ہیں۔ اور یہ اس شخص کے قتل کی کوشش ہے، جو جہاں آباد کو انسانیت کے معنی بتا رہا ہے
غریب عورتوں کی جان نکل گئی۔ بھولے اور سیانے بچوں کے ہوش جاتے رہے۔ لیکن مولوی
صاحب مرحوم نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باغیوں نے دروازے پر آفت مچا دی۔ اور دین دین
کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ سوچتے سوچتے مولوی صاحب کی سمجھ میں ایک تدبیر آئی۔
اور وہ یہ کہ مہمان کو اوپلوں کی کوٹھڑی میں لٹا کر اوپر سے اُپلے چُن دروازہ کھول دیا۔

رات کے تین بج رہے ہیں۔ اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ پندرہ
بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ تلواریں اور بلم صاحب خانہ کے سر پر چمک
رہے ہیں۔ اور دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ مولانا خاموش ہیں۔
عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں۔ بچے رو رہے ہیں۔ اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے
ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ اوپلوں کی کوٹھڑی تھی۔ اور وہ جفا کار اس میں داخل ہوئے۔ آج کے
مسلمان اس اتفاق محض سے تعبیر کر رہے ہیں۔ یا وقت سے ہیں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں۔ کہ حاکم حقیقی
ہر نیک کام میں اپنے بندوں پر رحمت کے پھول برسا کر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ کس طرح اس کا کرم شامل
حال ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ایک نہیں پندرہ بیس آنکھوں پر پردہ بن کر پڑا اور چاروں طرف دیکھ بھال
کر باغی چیختے پیٹتے واپس ہوئے۔

ہفتہ بھر سے زیادہ ہو چکا زخمی کی دوا نیم کی پتیاں اور غذا مکئی کا پانی ہے۔ مگر قدرت کے
تماشے دیکھنے کے قابل ہیں۔ حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ زخم بھر رہے ہیں۔ اور دماغ لمحہ بہ لمحہ
صحیح ہوتا جاتا ہے۔ باغیوں کا زور بھی گھٹ رہا ہے۔ دین دین کی آوازیں بھی کم ہو رہی ہیں۔ اور شہر
کے بڑے حصہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ سترھواں روز تھا کہ صبح کے وقت مہمان نے میزبانوں
سے رخصت طلب کی اور کہا صرف مجھ کو انگریزی کیمپ تک پہنچا دیجئے یہ خواہش کچھ کم

خطرناک نہ تھی مگر اب نسبتاً شہر میں امن بھی تھی قتل وغارت کے واقعات پوری طرح بند نہ ہوئے تھے لیکن وہ بے چینی نہ تھی۔

رات کے آخری حصے میں عورتوں نے اپنے مہمان کو وداع کیا۔ اور مولوی عبدالقادر صاحب نے اس انگریزی خاتون کو انگریزی کیمپ تک پہونچا دیا۔ (۱)

تصدیق مزید اس واقعہ کی مزید تصدیق، مولوی بشیر الدین احمد (ڈپٹی نذیر احمد کے صاحبزادے) نے بھی اپنی تاریخ میں فرمائی ہے:

مسز لیسن سے میں خود ملا ہوں وہ اپنا واقعہ کہتی تھیں تو اُن کی گھگی بندھ جاتی تھی وہ ایک توپ خانہ کے ملازم کی بیوی تھیں دو لڑکیاں اُن کے ساتھ تھیں ایک کوئی آٹھ دس برس کی تھی دوسری گود میں کوئی سوا ڈیڑھ مہینوں نے اور بچوں نے کشمیری دروازہ کی طرف ایک تہہ خانہ میں پناہ لی تھی ۳ دن بے آب ودانہ رہے بچوں کو رونے کا حکم نہ تھا کہ کہیں اُن کی آواز سن کر باغی نہ گھس آئیں۔ آخر کیپ تک باغی آئے اور سب کو تلواروں اور طمنچوں سے مار ڈالا۔ ماؤں کی گودوں سے پھول ایسے بچے جو سہمے اور ڈرے ہوئے ماؤں کی کلیجوں سے چمٹے ہوئے تھے گھسیٹ گھسیٹ کر سنگینوں کی نوکوں پر اُن کو دھر لیا۔ لیسن صاحب کی میم کی بھی دونوں بچیاں اس بے رحمی سے ماں کی آنکھوں کے سامنے ماری گئیں میم صاحب کو بھی گولی لگی اور کئی زخم آئے۔ جس کے دو بچے اُس کے سامنے ذبح کر دیے جائیں اُس کی ماں یوں بھی بے جان تھی میم صاحب زخمی ہو کر مُردوں کی انبار میں دب گئیں شہر میں خبر مشہور ہوئی کہ باغیوں نے آج یہ ستم ڈھایا کہ کسی کی موت اور کسی کا تماشہ لوگ جوق در جوق دیکھنے گئے سنا کہ ان میں جو جان بلب سسک رہے تھے اُن کو ان لوگوں نے ختم کیا۔ میرے نانا مولوی عبدالقادر صاحب متوسلان شاہی میں سے تھے وہ بھی گئے اُن کے ساتھ ۲ پنجابی پٹھان تھے کشتوں کے پشتوں میں انھوں نے دیکھا ایک عورت میں ابھی دم باقی ہے جس نے ہاتھ سے پانی کا اشارہ کیا ان میں سے ایک افغان نے مارنے کو پتھر اٹھایا

---

(۱) دلی کی آخری بہار (علامہ راشد الخیری) صہ ۴۲

میرے نانا نے پکڑ لیا کہ ناحق نادرداتم کیوں مارتے ہو اور چلے آئے دن چھپے وہ اکیلے گئے اور میم صاحب کی گٹھری باندھ کر اپنی پیٹھ پر لاد کر اپنے گھر لائے۔ وہ طبیب بھی تھے میم صاحب کی مرہم پٹی کی اور علاج معالجہ کیا خدا نے اُن کو اچھا کر دیا اسی اثناء میں کسی نے سرپھری چھوڑ دی کہ مولوی صاحب نے کسی میم کو چھپا رکھا ہے ہمارے گھر پر باغیوں کی دوڑ آ گئی میم کو اوپلوں کی کوٹھری میں چھپا کر اوپر سے اُپلے ڈال دیئے باغی ڈھونڈ ڈھانڈ کر چلے گئے اب مشکل یہ پڑی کہ اُن کو برٹش کیمپ میں کیونکر پہنچایا ہے اُن کو ایک بہلی میں بٹھا کر اور انہی کے ساتھ ہمارے گھر کی دو چار عورتیں بیٹھ گئیں اور پردہ ڈال لیا بیچ میں میم صاحب کو لے لیا کئی جگہ راستہ میں روک ٹوک ہوئی مولوی صاحب ساتھ تھے لوگوں نے سمجھا کہ مولوی صاحب کا زنانہ ہے بہ ہزار مشکل میم صاحب کو کیمپ تک پہنچا یا بعد کا قصہ طول طویل اور غیر متعلق ہے۔ میم صاحب اور اُن کے شوہر ۱۸۷۷ء تک زندہ رہے اب بھی اُن کی ۲ بیٹیاں زندہ ہیں۔ (۱)

مسز لیسن پر اس احسان کا اثر

مسٹر اور مسز لیسن اس کے بعد مولوی صاحب کے اس قدر گرویدہ ہوئے۔ کہ پنشن کے بعد بھی ولایت نہ گئے۔ اور دہلی میں رہ پڑے ہر سال مسز لیسن کے اس واقعہ کی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ اور مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا تھا۔

مسز لیسن کی کوٹھی کشمیری دروازے کے باہر تھی۔ اور ہر جمعہ کو دو پہر کا کھانا مولوی صاحب اس کے بچوں کے ساتھ کھاتے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ اور دیکھتا تھا۔ کہ مسز لیسن کس طرح مولوی صاحب کے احسان کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ (۲)

نواب باندہ اور اس کے سپاہی

اگر نواب باندہ اور رانی لچھمی بائی ان مفرورین کی حفاظت کا انتظام اچھی نہ کرتے۔ تو ان مفرورین میں سے ایک بھی زندہ سلامت نہ بچتا۔ انہی کی عنایت سے یہ مفرورین انگریزی عملداری میں پہنچ گئے۔ باندہ میں نمبر ۱۵ رجمنٹ کے کچھ

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول از بشیر الدین احمد ص ۱۴۲

(۲) دلی کی آخری بہار از علامہ راشد الخیری ص ۴۹

ہندوستانی سپاہی رہتے تھے۔ انہوں نے ۱۴ جون کو بغاوت کی مگر نواب باندہ کے افسروں نے جان بچادی۔ اس نواب نے سب انگریزوں کی جو ہمیر پور اور فتح پور سے بھاگ کر آئے تھے۔ جان بچائی۔ مگر نواب باندہ کا بھی حال مہاراجہ رستھیا اور راجپوتانہ کے راجاؤں کا سا تھا کہ اپنی سپاہ اس کے کہنے میں نہ تھی، وہ باغیوں کے ساتھ بغاوت میں شریک ہوگئی تھی۔ نواب باندہ سرکار کا دلی خیر خواہ تھا، مگر اپنی سپاہ کے برگشتہ ہو جانے سے وہ سرکار کی کوئی خدمت نہ کر سکتا تھا۔ (۱)

سرسیّد کا اعتراف

سرسید احمد خاں نے اس قسم کے حالات اور واقعات سے گذر کر، اور ان کا مشاہدہ کرکے، ذرا ہمت کیجے الفاظ میں، حقائق کا اعتراف یوں کیا تھا:

یہ جو مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے یہ خاص ایسے ہی برے وقت کے لیے کہی گئی ہے۔ اس کم بخت وقت کا یہ خاصہ ہے اگر ایک آدمی بھی برا کام کرے ساری قوم کی قوم رسوا اور بدنام ہو جاتی ہے مگر اسی قوم میں ہزار آدمیوں نے اچھے کام کیے ہیں مگر ان خوبیوں پر کسی کو خیال نہیں ہوتا۔

یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے مسلمانوں پر گذرا کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی ہو۔ وہ رام دین مریا ماتا دین کیوں نہ کی ہو۔۔۔ ان دنوں میں میری نگاہ سے انگریزی اخبارات کثرت سے گذرے اور جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا اب اور

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۶۹۳

کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیرخواہی میں اپنی جان۔ مال عزت آبرو کھوئی ہو زبانی بات چیت کی خیرخواہیاں ملا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں مگر مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیرخواہی میں اپنی اور کنبے کی جان دی ہو اور ہر وقت ہاتھ پاؤں اور دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا ہو۔ (۱)

---

(۱) حیات جاوید صـ۸۵

باب ۳۳

غدر کے ہیرو

۱۸۵۷ء کا عالم آشوب غدر اس اعتبار سے بھی ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے متعدد ایسے لوگوں کو منصۂ شہود پر جلوہ گر کیا کہ اگر غدر نہ ہوتا تو ان کی وہ صلاحیتیں جو غدر کے دوران میں نمایاں ہوئیں ہرگز نہ ابھرتیں۔ لکشمی بائی، رانی جھانسی اپنے محل سرا میں سوگ اور تپاگ کی زندگی بسر کرتے کرتے ایک روز اس دنیا سے رخصت ہوجاتیں، حضرت محل کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی کچھ نہ جانتا کہ وہ واجد علی شاہ کی بیگم تھیں۔ تانتیا ٹوپی ایک بڑے علاقہ کا خوش بخت نوجوان ہوتا، جو صرف عیش و عشرت سے سابقہ رکھتا۔ نانا صاحب انگریزوں کی بے وفائی اور دغابازی کا مرثیہ پڑھنے کے سوا کچھ نہ کرسکتا۔ مولوی احمد اللہ خاں اور مولوی لیاقت علی مسند درس و افتا سے ایک قدم باہر نہ نکالتے۔ ڈاکٹر وزیر خاں کی زندگی، مطب میں یا عیسائی مناظروں سے کلہ بہ کلہ جنگ کرنے میں بسر ہوجاتی، بہادر خاں کا بزم و انجمن میں ذکر بھی نہ ہوتا، خاندان نجیب الدولہ کا گوہر شب چراغ محمود خاں اپنی ایام عشرت میں زندگی کے ماہ و سال گزار دیتا۔ بخت خاں انگریزوں سے اپنی وفاداری پر فخر کرتا اور ایک اوسط درجہ کے فوجی افسر سے زیادہ ترقی نہ کرسکتا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی منطق و فلسفہ کی تدریس و تعلیم میں عمرِ عزیز بسر کردیتے، لیکن غدر نے ان حضرات کی ایسی صلاحیتوں کو جن سے یہ خود بھی ناواقف تھے، ابھارا اور انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لکشمی بائی نے میدانِ جنگ میں وہ کارنامے انجام دیئے اور شہامت و دلیری کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ وہ امر ہوگئی۔ حضرت محل نے جس خودداری، بہادری اور شان و تمکنت سے فرنگی قہرمانیت کا مقابلہ کیا وہ نہ صرف تاریخ نسائیت کا بلکہ تاریخِ عالم کا ایک نادر واقعہ ہے۔ تانتیا ٹوپی اپنی بزم عشرت سے

نکلا اور اس نے فرنگی استبداد کا اس استقلال و عزیمت کے ساتھ مقابلہ کیا کہ دشمن بھی اس کے اخلاص اور حُبِ وطن کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے، نانا صاحب نے اگرچہ جوشِ انتقام میں انسانیت کش حرکتیں کیں لیکن اس نے بھی زندگی جاوید حاصل کر لی ورنہ —— (کانپور) اور پونہ میں بھی اس کا کوئی یاد کرنے والا نہ ہوتا، اس کے بارے میں فرانسیسی مصنف گارساں تاسی لکھتا ہے "یہ خونخوار انسان انگریزی تقریر میں ید طولیٰ رکھتا ہے اس نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے کا ترجمہ کیا تھا۔ مولوی احمد اللہ خاں اور مولوی لیاقت علی نے مولوی ہونے کے باوجود ایک طرف انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیئے، دوسری طرف حکمرانی اور نظم ملک میں مہارت کا غیر معمولی ثبوت دے کر دنیا کو بتا دیا کہ مولوی بھی اگر مسندِ درس و افتا سے اُٹھ کر تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں اور تیسری طرف اپنے تہوّر اور ناقابلِ شکست حوصلہ مندی کا لوہا اپنے بدترین دشمنوں —— انگریزوں سے بھی منوایا ڈاکٹر وزیر خاں نے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا جسے نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ فراموش کیا جا سکتا ہے۔ بہادر خاں کے کارناموں نے بھی تاریخ میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ محمود خاں نے انگریزی قہرمانیت کا چیلنج قبول کیا اور نہایت پامردی کے ساتھ ان کے جبر و جور کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، سرسید اس سے اتنے خفا تھے کہ جہاں اس کا ذکر کرتے ہیں "نا محمود خان" کہہ کر (تاریخ بجنور) ہر کہیں دل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں لیکن محمود خاں نے ثابت کر دیا کہ وہ ان باتوں سے کہیں بالا تھا ؎

طبعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز
عشقِ من از پسِ من فاتحہ خوانم باکیست

بخت خاں نے جب دِلّی کی سرزمین پر قدم نہیں رکھا تھا یہ غدر ایک ہڑبونگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لیکن جب اس نے کمان ہاتھ میں لی تو انگریزوں کو دن میں تارے نظر آنے لگے، انگریزی لشکر کے کمانڈر انچیف بار بار بدلے گئے اور ہر مرتبہ ناکام ہوئے کوئی اس غم میں مر گیا، کوئی مستعفی ہو گیا، کوئی واپس بلایا گیا۔ جنگ جب شروع ہوئی تو بھی ہر ہر قدم پر وسائل و ذرائع

کی ہدایات کے باوجود غیر معمولی دشواریاں اور مصیبتوں کا صاحب بہادر لوگوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بخت خان نہ ہوتا
تو یہ لڑائی چند روز میں ختم ہو جاتی۔ وہ بخت خاں ہی تھا جس نے کئی ماہ تک نامساعد حالات کے
باوجود اس لڑائی کو نہایت کامیابی اور شان و وقار کے ساتھ جاری رکھا اور ایسے غیر فانی کارنامے
انجام دیئے کہ غدر کی تاریخ میں خواہ وہ دشمنوں ہی کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہو، ناقابل فراموش اور قابل
صد احترام مقام حاصل کر لیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی فارابی اور ابن سینا کے حکمت سے نکل کر میدان جہاد
میں گامزن ہوئے۔ انھوں نے ایسے تدبر، معاملہ فہمی، اصابت رائے، حسن انتظام اور دوربینی کا ثبوت
دیا جس نے غدر کی تحریک کو ایک نئی تحریک بنا دیا اور اس راہ میں روح فرسا شدائد برداشت
کئے مگر بہ زبان حرف شکایت سے آشنا نہ ہوئی۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق ہمعصر تھے دونوں
میں تعلقات ——— تمام تھے لیکن علمی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی تھی۔ دونوں کی فکر و نظر میں اختلاف
تھا لیکن پیش نظر دونوں کے صرف یہ تھا کہ مسلمان سربلند ہوں اور ان کا اقتدار دوبارہ وہ عروج و ترقی سے
ہمکنار ہوں اور اپنی عظمت رفتہ پھر حاصل کریں۔

من و تو گر فنا شدیم چہ باک
غرض اسلامیاں سلامت ہست

اور کوئی شبہ نہیں دونوں کی زندگی اسی مقصد جلیل پر نثار ہوئی۔ مولانا اسمٰعیل نے بالاکوٹ کے عرصہ کارزار میں
جام شہادت نوش کیا اور فضل حق نے انڈمان (کالا پانی) کے محبس میں جان، جان آفریں کو
سپرد کی ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مذکورہ سطور میں ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے صرف بخت خان اور مولانا
فضل حق خیرآبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے دلی کے محاربات غدر میں مرکز نشین ہو کر حصہ لیا
ہے۔ باقی حضرات یو۔پی کے رہنے والے تھے اور ان کی سرگرمیوں کے مراکز بھی یو۔پی کے مختلف
اضلاع لکھنؤ، آگرہ، الہ آباد، جھانسی، بریلی وغیرہ رہے۔ لہذا ہم اس کتاب میں بخت خان اور مولانا

فضل حق خیرآبادی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں باقی لوگوں کا ذکر اپنی دوسری کتاب "واجد علی شاہ" کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جو تسوید کے مراحل سے گزر کر عنقریب بتبیض کے مرحلہ میں داخل ہونے والی ہے۔

بخت خاں اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا، کہ ان کا ذکر عام دہشت اور سراسیمگی کے باعث ان کے مداح و ثناخواں بھی ڈر ڈر کر اور چبا چبا کر کرتے ہیں، آج ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ غدر کے بعد، علما کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ انگریزوں کی نازک دماغی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور وہ ذرا ذرا سی بات پر اور معمولی سے شبہ پر جور و ستم کی بارش شروع کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کا اکابر کا اوّل تو مرتب اور منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے مقدور بھر ہم نے کوشش کی ہے اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ارباب نظر کی نگاہیں یہ کوشش "سعیٔ مشکور" کہلائے گی۔

باب ۳۴

(۱)

بخت خان

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

بخت خاں جیسے اولوالعزم، دلیر، شجاع اور عہد آفرین لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اگر کسی زندہ اور بیدار قوم کا فرد ہوتا تو اپنی قسمت بھی بنا لیتا اور قوم کو اوجِ ثریا تک پہنچا دیتا، لیکن وہ ایک زوال پذیر انحطاط آشنا اور آمادہ مرگ قوم کا فرد تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی وہ آگے بڑھتا تھا، ساتھی پیچھے ہٹاتے تھے۔ وہ قوم کی سربلندی کی تدبیریں کرتا تھا لیکن قوم اس کی طرف توجہ نہ کرتی تھی وہ خاندانِ مغلیہ کو ایک مرتبہ پھر ہندوستان کا فرماں روا بنانا چاہتا تھا لیکن اس خاندان کے شہزادے اس سے جلتے تھے۔ اس کے کام میں روڑے اٹکاتے تھے اس کے خلاف سازشیں کرتے تھے اس کے خلاف سپاہیوں کو بھڑکاتے تھے اس کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے اس کی کامیابیوں کو ناکامی سے بدلنے کی کوشش کرتے تھے اسے ذلیل اور رسوا کرنے کی اسکیمیں بناتے تھے مدبر سب ان پر یہ الزام لگاتے کہ وہ انگریزوں کا جاسوس اور درم کا خریدہ غلام ہے جس طرح سرسید نے محمود خاں کا نام "نامحمود خاں" رکھا تھا اسی طرح شمس العلماء مفتی ذکاء اللہ، بخت خاں کو کم بخت خاں کے نام نامی و اسم گرامی سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ شیکسپیئر کے الفاظ میں "گلاب کے پھول کو کسی نام سے بھی یاد کرو وہ گلاب کا پھول رہے گا۔"

بخت خاں یہ سب کچھ دیکھتا تھا، سنتا تھا، معلوم کرتا تھا لیکن اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ انگریز اس کے نام سے دہلتے تھے اور یاران بزم اسے گالیاں دیتے اور اس کی بدگوئیاں کرتے تھے

اور وہ ان سب سے بے نیاز، خلوص اور دل جمعی کے ساتھ اپنی دُھن میں اور اپنے حال میں مست تھا۔

"نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا"

وہ اپنے سینہ کی دہکتی ہوئی آگ دوسروں کے سینوں میں بھی منتقل کر دینا چاہتا تھا لیکن برف خانہ میں جاکر وہ بھی برف کا ٹکڑا بن جاتی تھی ——— وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی ناکامیابی صد ہزار فتح و ظفر سے زیادہ قابل فخر اور مایہ ناز رشک تھی۔

آیندہ صفحات میں الفاظ کے ذریعہ ہم بخت خاں کا مرقع کھینچنے کی کوشش کریں گے۔

حسب و نسب

بہت سے لوگوں نے مثل مولوی ذکاء اللہ کے جن کا قلم جزل صاحب کی تحقیر و تخریب کے لیے تیار رہتا ہے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ ان کا تعلق کسی گمنام اور پست خاندان سے تھا۔

لیکن بخت خاں نے ۱۸۵۷ء میں جو کارہائے نمایاں کیٔے اور تحریک کو جس قابلیت کے ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلایا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا تعلق ضرور کسی اعلیٰ خاندان سے ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی اور اہم شہادت نواب دوندے خاں کی پر پوتی چندا بیگم کی ہے، جو خدا کے فضل سے ابھی بقید حیات ہیں۔ ان سے معلوم ہوا ہے کہ غلام قادر روہیلہ سے ان کی قرابت قریبہ تھی، والیٔ روہیلکھنڈ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کا خاندان جب انگریزوں اور شجاع الدولہ کے مظالم کا شکار ہو کر برباد ہوا، تو غلام قادر خاں کا خاندان بھی اس سے محفوظ نہ رہا، اس انتشار میں جس کا جدھر منہ اٹھا چلا گیا، چنانچہ بخت خاں کے والد معہ اہل خاندان اودھ کے موضع سلطان پور میں بس گئے۔

نواب عبد اللہ خاں روہیلہ جو خوبصورتی اور بہادری میں منفرد زمانہ تھے شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے اور اس معتوب روہیلہ سردار کی خاندان اودھ سے قرابت داری ہو گئی۔[۱]

۱: حیات علامہ فضل حق خیر آبادی مصنفہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔

خود بخت خاں نے بھی ایک مرتبہ شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے کہا تھا :-

" میں موضع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے ہوں۔ اگر آپ کو میرے بیان پر شک ہو تو آپ تصدیق فرما سکتے ہیں "

بادشاہ نے فرمایا " تصدیق کی ضرورت نہیں مجھے آپ کی شرافت، اور نجابت پر پورا یقین ہے"[۱]

یہ امر کچھ بعید از قیاس نہیں کہ جو قوم حافظ الملک نجیب الدولہ اور غلام قادر جیسے سرفروش اور اللہ داد خاں جیسے مدبر پیدا کر سکتی ہے کیا وہ ہندوستان کو آخری جنگ آزادی میں بخت خاں جیسے جانبازوں کو جنم نہیں دے سکتی۔

تعلیم و تربیت اور ملازمت

زمانہ قدیم کے نوابی خاندان کے لوگ کافی پڑھے لکھے ہونے کے علاوہ فنون حرب میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بخت خاں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، سلطان پور کی جاگیر نواب اودھ کی جانب سے ملی تھی اول تو خاندان کی ضروریات کے لیے ناکافی تھی دوسرے ان کی اولوالعزم اور بے چین طبیعت اس پرسکون زندگی کی متحمل نہ ہوئی، بنا بر آں انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کی اور بہت جلد ترقی کر کے ممتاز عہدے پر فائز ہو گئے۔ مسٹر سیل کے تحت جنگ افغانستان میں ایسے بہادرانہ کارنامے دکھلائے کہ توپ خانہ بیٹری کے سب سے بڑے افسر ہو گئے۔ ان کے ماتحت تمام ہندوستانی توپچی رہتے تھے یہ بیٹری اپنی کارگزاریوں کے لیے بہت مشہور تھی۔ اعزاز کے طور پر ان کی توپوں پر پھولوں کا محراب بنا ہوا تھا جس میں جلال آباد لکھا تھا بخت خاں جلال آباد میں بھی اس بیٹری کے ساتھ کام کر چکے تھے[۲]

افغانستان سے واپس آنے کے بعد نیمچ کی چھاؤنی پر بھیج دیئے گئے اور صوبہ داری کا عہدہ عطا کیا گیا۔ اس طرح بخت خاں توپخانہ کے بڑے افسر تھے اور انگریزی لشکر کا دہی بہت سے

---

۱ : غدر کی صبح و شام۔ حسن نظامی۔

۲ : یادداشت نوشتہ جی ایم۔ ایچ پکٹس سی پیلی ؛

لوگ ان کو جانتے تھے وہ ایک فربہ اندام شخص تھے اور انگریزوں کو بڑا ہوشیار اور دانش مند جانتے تھے[1]۔

روہیلکھنڈ میں نوابی دور

شورش کی آگ بھڑکتے ہی بخت خاں نے جو بعد کو جنرل کے لقب سے مشہور ہوئے، اپنے اجداد کے وطن بریلی کا رُخ کیا، بریلی جاکر خان بہادر خاں کو جو حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے اور خاندان میں بہت با اثر اور بہادر تھے تخت امارت پر بٹھایا، روہیل کھنڈ میں روہیلہ قوم اپنے غیر معمولی شجاعانہ کارناموں کی وجہ سے ابھی تک تفوق خاص کی مالک تھی، دولت اور حکومت تو ختم ہو چکی تھی لیکن ترکہ آبائی میں شجاعت و بسالت کا تھوڑا اندوختہ باقی رہ گیا تھا جو اس وقت بروئے کار آیا چنانچہ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:-

"جن ضلعوں میں بغاوت ہوئی وہ روہیل کھنڈ کی بغاوت کے آگے خفیف تھی[2]"۔

بریلی جو عرصہ تک حافظ رحمت خاں کا دار السلطنت رہا تھا جنرل بخت خاں کی توجہ کا مرکز قرار بنا۔

بخت خاں بریلی میں

جب تک جنرل صاحب کا بریلی میں قیام رہا، نواب خان بہادر خاں کے دست راست رہے چنانچہ جو امن و اماں اس نواب گردی میں عوام کو حاصل تھا، اس میں بخت خاں کا بھی حصہ ہے۔ میں نے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون سے سنا، جن کی والدہ نے اپنے چشم دید حالات ان کو بتائے تھے کہ اس دوران میں کثرت سے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات ہوئیں اور ان میں کسی طرح کی بے اطمینانی اور انتشار نہ پایا جاتا تھا، ہر چیز کی ارزانی اور بہتات ——— تھی گرانی کا کہیں ذکر نہ تھا۔

---

[1]: عروج عہد انگلشیہ ——— غدر ۱۸۵۷ء کے پامرو۔

[2]: عروج عہد انگلشیہ

روہیل کھنڈ کے علاوہ تمام ملکوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف سخت ہیجان برپا تھا[1]

بخت خاں کی دہلی میں آمد

ایک ماہ تک اسی طرح لڑائیاں ہوتی رہیں کہ اتنے میں مسمّی بخت خاں و محمد شفیع تلنگوں کی چار پلٹنیں اور ایک ہزار پانچ سو جہاد کرنے والے قریب قریب بارہ ہزار کی جمعیت سے کرمع توپ خانہ اور میگزین وغیرہ جولائی کے مہینے میں دہلی پہنچے، دہلی دروازے کے باہر قیام کیا اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے، بادشاہ کی طرف سے ان کو خلعت عطا ہوا اور عہدۂ جرنیلی پر سرفراز کیے گئے اس عرصہ میں بے شمار فوجیں چھاؤنی نیمچ نصیرآباد حصار لکھنؤ اور کسولی سے آکر دہلی میں جمع ہوئیں بادشاہ کو ان کے آنے سے مسرت ہوئی اور رعایا بھی مطمئن ہو گئی[2]

بخت خاں کی سادگی

بخت خاں بریلی چھوڑ کر دہلی روانہ ہوئے، نانا راؤ کا بھائی ہمراہ تھا بدایوں سے ہوتے ہوئے فرخ آباد آئے، جہاں جہاں سے گزرے راجہ اور جاگیرداروں کو معاونت پہ آمادہ کرتے گئے، ظہیر دہلوی رقمطراز ہیں :-

"جنرل بخت خاں چودہ ہزار کا کمپو، چند توپ اور تین رجمنٹیں سواروں کی لے کر اور کئی لاکھ روپیہ سمیت ۲ جولائی کو دہلی میں داخل ہوا۔ سر پہ انگوچھا لپٹا ہوا، کرچ گلے میں پڑی ہوئی، پیچھے حال کھلا بریلی والا جنرل یہی تھا، بظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا سا تھا، میں تو سمجھا جیسے اور پوربیئے سپاہی ہیں یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا[3]

علاوہ کثیر التعداد فوج کے ایک سو کے قریب علماء بھی ان کے ہمراہ تھے جنھیں اس زمانہ میں مجاہدین کہا جاتا تھا۔

---

۱ : غدر ۱۸۵۷ء کے ہیرو

۲ : نصرت نامہ غدر ص۳ ۔

۳ : داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی)

بخت خاں کے دم خم

ایک انشاپرداز مورخ نے بخت خاں کے جمال و کمال کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے: "ڈیڑھ دو مہینے کی سخت بدنظمی اور افراتفری کے بعد بریلی کی فوج انگریز کو ہندوستان سے اور مغل سلطنت کو ذلت کی قبر سے نکالنے کے لیے دہلی پہنچی۔ اس کی تعداد چودہ ہزار تخمینہ کی گئی ہے اس میں صرف کمپنی کے باغی سپاہی نہ تھے بلکہ بہت سے مجاہدین تازہ بھرتی کئے گئے تھے خود سپہ سالار بخت خاں روہیلہ خاصا دیندار اور سنجیدہ قسم کا آدمی نظر آتا ہے جو پہلے انگریزی فوج میں رسالداری کر چکا تھا، نئی تنظیم اور قواعد جنگ سے آشنا تھا، پھر کہا جاتا ہے کہ اپنے پیر کے حکم سے کافر فرنگی کی نوکری چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گیا تھا اس کے وطنی جذبہ کی دلیل یہ واقعہ ہے کہ انگریزوں کے جانی دشمن دھوندو پنت (نانا صاحب) کے بھائی کو بٹھور سے بلا کر اپنا شریک کار بنالیا تھا، انگریزوں کی ہمعصر شہادتوں میں اعتراف کیا گیا ہے کہ اس نے دہلی آکر امن و انتظام پر توجہ کی اور ایک شہری مجلس بٹھائی کہ بدنظمی کو سر اٹھانے نہ دے عید الاضحیٰ کے موقعہ پر شاہی فرمان جاری کرایا کہ ہندو ہم وطنوں کی خاطر گائے بیل کی عام قربانی نہ کی جائے۔

انہی کارگذاریوں کی بنا پر بہادر شاہ نے ملکی اور عسکری اختیار بخت خاں کے سپرد کئے اور گویا اپنا نائب السلطنۃ بنا دیا تھا، حقیقت میں کم سے کم دہلی کے دائرے میں یہی شخص توجہ کا محور ہو کر ذاتی لیاقت و کارروائی سے آگے بڑھا۔ اور دلیری اور حوصلہ مندی کے ساتھ انتظام کی قابلیت و فراست سے اتصاف رکھتا تھا"[۱] [۲]

بخت خاں کا تدبر

بخت خاں خود بھی مسلمان تھا اور مسلمانوں کی جبلت سے بھی اچھی طرح واقف تھا وہ جانتا تھا یہ جنگ اس وقت تک سر نہیں

---

[۱]: لڑائی لائٹ .... بحوالہ سانڈرس پیپرز۔ وغیرہ مارٹن اور کرنر (جلد دوم) کی تاریخوں اور مقدمہ بہادر شاہ کی روداد میں یہ واقعات جستہ جستہ منقول ہیں ہمعصر شاعر ظہیر دہلوی کی داستان غدر بھی لائق اعتماد شہادت پیش کرتی ہے۔

[۲]: تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سید ہاشمی) صفحہ ۳۳۲۔

ہوسکتی، جب تک مذہبی طور پر مسلمان اس کے قائل نہ ہوجائیں کہ فرنگی استیلا کے خلاف جہاد کرنا ایک کارِ ثواب ہے، اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے علمائے کرام سے فتوائے جہاد حاصل کیا۔

جب تک دہلی میں بخت خان نہیں آیا، جہاد کے فتویٰ کا چرچا بہت کم تھا۔ مساجد میں ممبروں پر جہاد کا وعظ کم تر ہوتا تھا، دہلی کے مولوی اور اکثر مسلمان خاندانِ تیمور کو ایسا حوزِ خبطہ جانتے تھے کہ وہ ناممکن سمجھتے تھے، کہ اس خاندان کی بادشاہی ہندستان میں ہو مگر اس کے ساتھ جاہل مسلمانوں کا یہ یقین تھا کہ انگریزی سلطنت کے بدن میں یہ ایسا پھوڑا نکلا ہے جس سے وہ جانبر نہیں ہوگی۔

یہ کام پنجے شہدے مسلمانوں کا تھا کہ وہ جہاد جہاد پکارتے پھرتے تھے مگر جب بخت خاں جس کا نام اہلِ شہر نے کم بخت خاں رکھا تھا۔ دہلی میں آیا تو اس نے یہ فتوے لکھایا کہ مسلمان پر جہاد اس لئے فرض ہے کہ اگر کافروں کی فتح ہوگی تو وہ ان کے سب بیوی بچوں کو قتل کر ڈالیں گے اس نے جامع مسجد میں مولویوں کو جمع کرکے جہاد کے فتوے پر دستخط، مہریں ان کی کرائیں اور مفتی صدرالدین نے بھی جبر سے اپنی جعلی مہر کردی لیکن مولوی محبوب علی و خواجہ ضیاء الدین نے فتوے پر مہریں نہیں کیں۔ اور بے باکانہ کہہ دیا کہ شرائطِ جہاد موافق مذہبِ اسلام موجود نہیں۔ اس فتویٰ کا اثر یہ تھا کہ جاہل مسلمانوں میں جوشِ مذہب زیادہ ہوگیا جن مولویوں نے فتوے پر مہریں کیں تھیں وہ کبھی پہاڑی پر انگریزوں سے لڑنے نہیں گئے، مولوی نذیر حسین جو وہابیوں کے مقتدا اور پیشوا تھے ان کے گھر میں تو ایک میم چھپی بیٹھی تھی اس فتویٰ پر کچھ مہریں اصلی کچھ جعلی تھیں ۱؎۔

مولوی ذکاء اللہ کی روایت اگر صحیح ان لی جائے تو بھی موردِ الزام "بے عمل علماء" ٹھہرتے ہیں نہ کہ بخت خاں، وہ تو آخر وقت تک جہاد کرتا رہا، مولوی نذیر حسین کے گھر میں میم کا پناہ گزین ہونا تو یہ ایک انسانی اور اسلامی فعل تھا، اسے نہ غداری قرار دیا جاسکتا ہے نہ سازش۔

۱؎ : تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۹۵۔

فتوے جہاد پر جبری دستخط کی روایت بھی قابل قبول نہیں، سوال یہ ہے کہ جب مولوی محبوب علی اور خواجہ ضیا الدین نے اخلاقی جرأت سے کام لے کر نہ صرف فتوے پر دستخط نہیں کیے بلکہ علانیہ اس جنگ کو "جہاد" ہی تسلیم نہیں کیا۔ اور بخت خان نے ان حضرات پر نہ کسی طرح کا تشدد کیا نہ انھیں پھانسی، قید اور ضبطی املاک وجائداد کی سزا دی، تو پھر آخر مفتی صدر الدین دستخط کرنے پر بادل نخواستہ کیوں مجبور ہو گئے۔

حلف نامہ

فتوائے جہاد کے بعد بخت خاں نے دوسرا کام یہ کیا کہ سپاہیوں سے حلف وفاداری بھی لیا۔ اس فتوے جہاد کے علاوہ بخت خاں نے ایک حلف نامہ بھی تقسیم کرایا اور اس پر ہر سپاہی سے جن کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی، عہد لیا، مرزا مغل نے یہ حلف نامہ فوجوں کو پڑھ کر سنایا، جس پر انہوں نے اقرار کیا کہ ہم آخری دم تک لڑیں گے، جنرل بخت خاں خلوت میں جلوت میں جب چاہتے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوتے، کوئی پابندی حائل نہ تھی، بادشاہ نے ایک مرتبہ عید قربان کے روز حسب ذیل شعر لکھ کر ان کو بھیجا[1]

لشکر اعدائے الٰہی آج سارا قتل ہو گورکھا، گوجر سے لے کر تا نصاریٰ قتل ہو

نظم وضبط

بخت خاں کو اس کی بڑی فکر تھی کہ کوئی بات نظم وضبط کے آئین کے خلاف نہ ہو۔ بخت خاں نے شہر کے کوتوال کے پاس حکم بھیجا کہ شہر میں آئندہ لوٹ مار ہوگی تو کوتوال کو پھانسی دی جائے گی اور اس نے ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ سارے دکاندار اپنے پاس ہتھیار رکھیں اور گھر میں کوئی مرد بغیر ہتھیاروں کے نہ رہے اور جس کسی کے پاس ہتھیار نہ ہوں تو وہ ہم سے ہتھیاروں کی درخواست کرے ہم اس کو ہتھیار مفت دیں گے اور جو سپاہی لوٹتا ہوا گرفتار ہوگا اس کے ہتھیار لے لیے جائیں گے[2]

---

[1] : رسالہ بغاوت ہند، بابتہ ۱۸۵۹ء (۱۵ دسمبر)

[2] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۹۶

بخت خاں کی مساعی جمیلہ

جنگ جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ بخت خاں دوسرے بااثر لوگوں کو ہمنوا بنانے کی کوشش بھی کرتا رہتا تھا، اور اس میں کامیاب بھی ہوتا تھا۔ پیدل فوج کی دو پلٹنیں اور رسالہ کے پانچ سو سپاہی چھ توپوں اور سامان اسلحہ کے ساتھ بخت خاں کے حکم سے باغپت روانہ ہوئے تاکہ انگریزوں کو پل تعمیر کرنے سے روکیں اس کے علاوہ فوج کی کثیر تعداد مع سامان حرب کے علی پور روانہ ہوئی سہ پہر کو یہ افواہ اڑی کہ باغیوں کو بڑی فتح ہوئی، اس کی وجہ سے عوام میں بڑا جوش و خروش پھیل گیا، دہلی سے اجمیری دروازہ تک فوجوں کی پریڈ لی گئی، جنرل نے سپاہیوں کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ بات چیت کی اور بادشاہ کا پیغام پہنچایا کہ "جو شخص میدان جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے گا اسے پانچ بیگھہ زمین دی جائے گی اور یہ کہ اعزازی عہدہ بھی دیا جائے گا۔"

جنگی کونسل کے سامنے بخت خاں نے بیان کیا کہ وہ کشمیری دروازے کے بالمقابل مورچہ بنا رہے ہیں ہندوستان میں جہاں کہیں بغاوت ہوئی اس کی سرپرستی اور رہنمائی بادشاہ کی طرف سے ان کے سپرد تھی وہ لوگ ان سے براہ راست ہدایتیں منگواتے اور اس کے مطابق عملدرآمد ہوتا تھا۔ جنرل صاحب کے ایک خط سے جو انھوں نے جنرل سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کو روانہ کیا ہے ان کے اس مقصد عظیم کا اندازہ ہو سکتا ہے جس کو لے کر وہ اٹھے تھے وہ لکھتے ہیں :-

"محمد بخت خاں گورنر بہادر اور دہلی کے دارالخلافہ میں جو فوج ہے اس کے سپاہی اور افسران آداب بجا لاتے ہیں اور تم کو مبارک باد دیتے ہیں۔ جو بہادرانہ کارنامے تمھارے متعلق ہیں ہم سب کو ان پر فخر ہے، ہم میں سے ہر شخص اور تمھارے بادشاہ شب و روز عیسائیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں خدا نے چاہا تو بہت تھوڑے عرصہ میں دہلی کا ملک ان سے پاک ہو جائے گا۔"

جواب سدھاری سنگھ :-

"خدا کے فضل سے دہلی کی جو سلطنت وجود میں آئی ہے عالم طفولیت میں ہے خدا نے آپ کو اس بچہ کی پرورش کے لیے بھیجا ہے آپ کے تحت پانچ دستے ہیں اور آپ کا خطاب جنرل بہادر

ہے اور آپ کے ہاتھ ہر قسم کی قوت ہے[1]۔

بخت خاں اور اس کے سپاہیوں کی بہادری

بخت خاں اور اس کے سپاہی کس جیداری اور حوصلہ مندی سے لڑے، یہ داستان جمیل قدم قدم پہ ایک دل آویز مرقع کی صورت میں نظر آتی ہے۔

توپچیوں نے جنرل کی سرکردگی میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی صفوں میں ہلچل ڈال دی تھی، ظہیر دہلوی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں:۔

"چاندنی رات ہے اور میں ایک دوست کے کوٹھے پہ بیٹھا ہوا ہوں کہ تیاری کا بگل ہوا اور فوج کی کمر بندی ہوگئی اور میگزین سے بڑی بڑی چھتیس پیٹیاں دس دس بارہ بارہ جوڑی بیل لے چلے اور میگزین کی کرچیاں جدا گانہ تھیں، کوئی پانچ گھڑی رات گئے یہ سب فوج باہر ہوگئی بڑی بڑی توپیں پہاڑوں پہ چڑھا کر مورچے باندھ لیے، دریا درمیان ہر دو لشکر کے بیچ ایک میل کا فاصلہ ہوگا، ملکی توپوں نے بڑا کام کیا اور فوج انگریزی کا بڑا نقصان ہوا، زرد کوٹھی کے متصل پوربیوں نے ایک مورچہ قائم کر رکھا تھا اور بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں، ان توپوں سے انگریزی فوج کو بہت نقصان پہنچتا تھا، اس مورچہ کی حفاظت کے لیے ہر وقت دو پلٹنیں اور گولہ انداز موجود رہا کرتے تھے"[2]

انگریزی فوج نے ایک رات شب خون مارا، رات بھر ہنگامہ تکبیر و کشش گرم رہا، دونوں طرف سے توپ چلتی رہی، لڑائی کیا قیامت کے آثار نمودار تھے، خدا جانے طرفین سے تین سو توپیں چل رہی تھیں یا چار سو، اس کا علم خدا کو ہے۔

گھوڑ چڑھی کے توپ خانے نے یہ کام کیا کہ محلدار خاں برابر نہر پولیہ ہے اس پہ توپیں

---

[1] : محاصرہ کے دوران میں جنرل بخت خاں کا خط سدھاری سنگھ کے نام غدر کا ریکارڈ (از گوری شنکر)

[2] : داستان غدر

لگادیں اور دو پلٹنیں باغیچہ میں چھپ کر کھڑی ہوگئیں۔ تر پولیہ کے تینوں دروں پر توپیں لگی ہوئی تھیں اور دونوں طرف سے باغیوں نے راستہ روک رکھا تھا لیکن انگریزی توپ خانے نے ایسے گولے برسائے کہ تینوں توپیں بیکار ہو کر شہر روانہ ہوگئیں، فوج انگریزی اس سے بے خبر تھی کہ پلٹنیں گھات میں بیٹھی ہیں اور وہ بہ سلسلہ میں بندھی تعصب میں چلی آئیں۔ باغیوں نے جب دیکھا کہ وہ بیچ میں آگئیں، یکبارگی باغات کی دیوار کے پیچھے سے کھڑے ہو کر دونوں طرف سے باڑھ جھونک دی۔ اس وقت فوج کا یہ حال ہوا، جیسے کبوتروں میں چھرا مار دیا ہو بہت سے آدمی ضائع ہوئے اور مورچہ چھوڑ کر اُلٹے چھاؤنی کی طرف بھاگے[1]

جنرل صاحب کی قیادت میں عوام نے سر دھڑ کی بازی لگا کر بے جگری سے اپنے خون کی ہولی کھیلی اور ان کو معلوم ہو گیا کہ مقابلہ کسی معمولی دشمن سے نہیں ہے فوج باغی نے بڑی سختی اور مضبوطی سے فوج انگریزی پر حملہ جاری رکھا اور کوئی تدبیر یا دقیقہ ان کے وہاں سے نکال دینے اور غارت کرنے میں باقی نہ چھوڑا، دشمنوں نے اپنی مورچہ بندی ایک اچھے موقع پر باغات اور مکانات کی آڑ میں کی تھی، توپیں بہت عقلمندی کے ساتھ سرکیں اور اس سرعت سے آگ برسائی کہ ایک لمحہ کیلئے بھی توقف نہ تھا[2]

انگریزوں سے جنگ

۹ رجولائی کو بخت خاں نے نو ہزار کی جمعیت کے ساتھ انگریزی فوج پر حملہ کیا اور تیس ہزاری میدان ان سے چھین لیا اور بہت سا سامان میدان جنگ سے ہاتھ آیا، مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں :-

" ۲۹ رجولائی کے دربار میں جنرل بخت خاں بادشاہ کا قائمقام ہو کر آیا، بادشاہ نے ساری سپاہ اور شہر پر نیم بادشاہ بنا دیا۔ جنرل نے بھی کمانڈر انچیف کی نقل اتاری، آج میگزین دیکھتا ہے

---

[1]: داستان غدر

[2]: رسالہ تاریخ بغاوت ہند بابت اگست ۱۹۶۹ء

اس میں الترتیب سامان رکھنے کی ہدایت کرتا ہے۔ لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان بزازوں کی قسم کی پریڈ لی تمک اور شکر پر جو محصول تھا وہ معاف کر دیا تاکہ غربا کو تکلیف نہ ہو، نیز یہ بھی کہا کہ جو شہزادہ شہر کو لوٹے گا میں اس کی ناک کٹوا دوں گا"[1]

خراج تحسین انگریزوں کی طرف سے

بخت خاں کی مہارت جنگ، دلیری شجاعت اور حکمت عملی سے انگریز اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ غصہ اُتر جانے کے بعد انھوں نے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا۔

ولیم فورلیس رقم طراز ہیں :۔

"محاصرے کے زمانے میں باغیوں نے متعدد حملے کئے اور یہ باغیوں کی لیاقت کا اچھا ثبوت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی معمولی آدمی سے مقابلہ نہ کر رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد چھبیس تھی، ان میں سے ہر ایک نہایت ہی منظم حملہ تھا۔ ان کے علاوہ بے شمار حملے مدد افتادہ چوکیوں اور ہراول پر ہوئے، یہ ہمارے آدمیوں کے بہت کم قریب میں آتے تھے اور یہ بھی اس وقت جب ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا تھا مگر روزانہ جنگ آزما ہوتے تھے، ان کی اس مستقل مزاجی اور ہمت سے کوئی چیز بازی نہیں لے جا سکتی تھی"[2]

چارلس بال صاحب رقم طراز ہیں :۔

"شہر کے جس حصے پر ہم نے سب سے پہلے حملہ کیا اس پر شراب کا کافی مقدار میں موجود ہونا باغیوں کی انتہائی چالاکی کا ثبوت ہے"[3]

---

[1] : عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[2] : غدر کا عظیم تذکرہ (ولیم فورلیس)

[3] : تاریخ غدر ہند (چارلس بال)

بخت خاں کی ناکامی کے اسباب

بخت خاں کو ناکامی سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟ اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ:-

ہر کہ آموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

اور تاریخی جواب یہ ہے کہ "رفقائے منزل کے حب جاہ و منصب نے قدم قدم پر مشکلات پیدا کیں اور اسے دوسری چیزوں میں الجھانے کی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھا۔

ذیل میں ہم مولوی ذکاء اللہ کا ایک مخالفانہ بلکہ معاندانہ بیان ضروری قطع و برید کے بعد درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ بخت خاں کیسے حوصلہ شکن حالات سے دوچار تھا:

بخت خاں کا استقبال

جولائی کے شروع میں بخت خاں بڑی سلیقہ مندی اور ہوشیاری سے دہلی آیا، جب وہ شہر کے قریب شاہدرہ میں پہنچا تو بادشاہ نے نواب احمد قلی خاں اپنے خسر کو اس کے استقبال کے لیے بھیجا اور جب وہ بادشاہ سے ملاقات کرنے آیا تو اس نے مصافحہ کیا، اس کی دعوت کے لیے اپنے خاصہ سے ستر توڑے بھیجے:

بخت خاں کا انکسار

جب بادشاہ نے اس سے کہا کہ تم بڑے بہادر ہو تو اس نے کہا آپ جب مجھے بہادر فرما دینگے کہ میں پہاڑی پر انگریزوں کا بالکل قلع قمع کر دوں۔ بادشاہ پر کچھ اس نے ایسا سحر کیا کہ وہ اس کے کہنے میں آگیا، اس کو اپنے فرزند کا خطاب دیا اور ساری سپاہ اور شہر پر اس کو نیم بادشاہ بنا دیا۔ بادشاہ نے حکم جاری کر دیا کہ سپاہ شہزادوں سے بالکل تعلق نہ رکھے۔

ایک دن جنرل بادشاہ کے پاس دو یورپین سارجنٹوں کو ساتھ لے گیا اور بادشاہ سے عرض کیا کہ دونوں بریلی سے ہمارے ساتھ آئے ہیں، وہ توپ خانے کے فن سے خوب ماہر ہیں بادشاہ نے

ان کو حکم دیا کہ وہ سلیم گڑھ اور کشمیری دروازہ، لاہوری دروازہ کے گرگجوں کے توپ خانوں کو دیکھ کر رپورٹ کریں، جنرل نے لال ڈگی اور جامع مسجد کے درمیان ہزاروں سپاہیوں کی پریڈ لی اور ان کو اپنے اپنے مقام پر واپس کیا۔

غربا کی تکالیف کا خیال

بادشاہ کو اس نے عرضی دی کہ چار لاکھ روپیہ نواب جھجر سے طلب کیا جائے، اس کی درخواست منظور ہوئی، بخت خاں نے نمک اور شکر پر جو محصول مقرر ہوا تھا وہ اس نظریے سے موقوف کیا کہ غربا کو تکلیف نہ ہو۔

سازش اور شکایت

مرزا مغل نے ایک عرضی اس کی شکایت میں ۷ ار جولائی کو بہ لکھی کہ جہاں پناہ سلامت، مودبانہ عرض کرتا ہوں کہ حضرت عالی خوب آگاہ ہیں کہ بخت خاں کے آنے سے پہلے ہر روز بلا ناغہ ہنگامہ جنگ گرم ہوتا تھا، حضور اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ جب سے جنرل آیا ہے کئی لڑائیاں ہوئی ہیں، آج کا یہ واقعہ ہے کہ فدوی نے آج حملہ کرنے کے لیے شہر سے باہر سپاہ کو کھڑا رکھا۔ مگر جنرل نے کچھ کام نہ کرنے دیا بلکہ ان سے دریافت کیا کہ تم کس کے حکم سے شہر سے باہر لڑنے گئے ہو تم کو بغیر میری اجازت کے جانا نہیں چاہیے، اب واپس آؤ، یہ کام تو کوئی کھلا دشمن بھی نہیں کرے گا۔ کہ سپاہ حملہ کرنے جائے اور اس میں مداخلت کر کے واپس بلائے اس لیے فدوی التماس کرتا ہے کہ اگر حضور نے سپاہ کا کل انتظام جنرل کے سپرد کر دیا ہے تو پھر فدوی کے پاس تحریری حکم ارسال فرمائے کہ وہ سپاہ کے کسی کام میں مداخلت نہ کرے پھر میں کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا اور سپاہ کی کل افسران کو اطلاع دے دوں گا کہ آئندہ تم جرنیل کے ماتحت رہو، اس کی فرماں برداری کرو، اگر اس کے حکم کے خلاف کوئی اعلیٰ ادنیٰ افسر کام کرے گا، تو سزا پائے گا اور اگر حضور سپاہ کے کام کو فدوی کے سپرد کرتے ہیں تو جنرل کو حکم فرمائے کہ وہ سپاہ کے کسی معاملہ میں دخل نہ دے، اس کو اپنی رجمنٹ پر کلی اختیار ہے اس کی رجمنٹ سے جو خدمات کی درخواست کی جائے اُن کو وہ ہمیشہ منظور کرے، اس عرضی پر بادشاہ نے کوئی حکم نہ دیا۔

بخت خاں پر ایک الزام

۹ ار جولائی کو دربار ہوا، جس میں بخت خاں بادشاہ

شہزادہ مغل، بہادر شاہ کے بیٹے اور باغی افواج کے سپہ سالار اعلیٰ

کا قائم مقام ہو کر آیا۔ اس میں سپہر مائی نز کے صوبہ دار قادر بخش نے جنرل بخت خان پر الزام لگایا کہ وہ انگریزوں پر حملہ کرنے سے غفلت و کاہلی کرتا ہے۔

بخت خاں کے خلاف شکایت

سپاہ بھی بخت خاں کی شکایت بادشاہ سے کی کہ وہ صرف اپنے سپاہیوں کے لیے سامان رسد مہیا کرتا ہے اور باقی سپاہ کے لیے سامان رسد نہیں مہیا کرتا بادشاہ نے کہا کہ یہ شکایت تم خود بخت خاں سے کرو۔

بخت خاں نے برسر دربار کوئی بات بادشاہ کے کان میں کہی تھی اس پر شہزادوں نے اس کو دھتکار بتائی تو بخت خاں نے بڑی چاپلوسی اور خوشامد سے اپنا قصور معاف کرایا۔ سپاہ سے بادشاہ اس سبب سے ناراض تھا، کہ وہ کبھی مرزا ابوبکر کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے کبھی مرزا مغل کو جب بخت خاں آیا تو اس نے صلاح دی کہ سپاہ کے اختیارات شاہزادوں کے ہاتھ میں زیادہ نہ جائیں۔ تمام احکامات میرے پاس بھیجے جائیں اور جو بادشاہ کرنا چاہے وہ مجھ سے کہے بادشاہ شہزادوں سے ناراض تھا۔ اس صلاح سے وہ بخت خاں پر بہت مہربان ہو گیا اور اس کو سب سے اعلیٰ اور برتر بنا دیا، اور اس کو گورنر مقرر کر دیا، جب مرزا مغل نے بخت خاں کی شکایت میں عرضی دی تو اس میں اور بخت خاں میں ناچاقی ہو گئی، مگر پھر دونوں کا آپس میں ملاپ ہو گیا۔

بہادر شاہ اور بخت خاں

۲۲ جولائی کو بخت خاں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ بعض شریر بدنفس یہ مشہور کرتے ہیں کہ میں انگریزوں سے ملا ہوا ہوں اور جب سپاہ انگریزوں سے لڑنے جاتی ہے تو خود پہلوتہی کرتا ہوں اور سپاہ بے ترتیب لڑتی ہے۔ بادشاہ نے کہا "تمھاری خیر خواہی میں مجھے کچھ شبہ نہیں مجھے افسوس ہے کہ بدنہاد آدمی اس غلط بات کو مشہور کر کے تمھاری دل آزاری کرتے ہیں۔

مرزا مغل کی سازش

سپاہ نے عرضی دی کہ بخت خاں توپ خانہ کا افسر تھا وہ اس کام کو جانتا تھا، میدان جنگ میں سپاہ کے لڑانے

میں بے بہرہ ہے وہ گورنر کے عہدہ کے قابل نہیں نہ وہ بادشاہ کا ادب کرتا ہے نہ خزانہ بادشاہ کی نذر کے لیے لایا ہے، مرزا مغل کو جو سپاہ کے تمام کاموں میں کل اختیارات دے گئے تھے وہی اس کا سزاوار تھا بلکہ وہ گورنر جنرل ہونے کے لائق ہے، ساری سپاہ یہی چاہتی ہے۔

سازش کامیاب رہی

۲۳ اگست کو بخت خاں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ اب سپاہی میرے حکم کو نہیں مانتے، تو بادشاہ نے کہا کہ جو سپاہی حکم نہیں مانتے ان سے کہدو کہ وہ شہر خالی کریں۔ چوتھی اگست کو حکیم حسن اللہ خاں کا گھر کو لٹا تو بادشاہ نے سپاہ کے تمام افسروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ میں نے مرزا مغل اور بخت خاں کو تمھارا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا، ان میں سے جن کو چاہو انتخاب کر کے اپنا جنرل مقرر کرو، میں تمھارے انتخاب کو پسند کروں گا مگر یہ پسند نہیں کرنے کا کہ شہر کے باشندے حیران سرگردان ہوں۔ انگریز غارت نہ ہوں مگر ہندو مسلمان تباہ ہوں، سپاہی اپنی شیخی بگھار اکریں کہ ہم شہر سے باہر انگریزوں کو غارت کرنے جاتے ہیں لیکن وہ پھر شہر کے اندر آجاتے ہیں، شہر کی فصیل ان کی پشت پناہ ہے جو انکو سلامت رکھتی ہے، مجھے یہ صاف نظر آتا ہے کہ آخر کو شہر انگریز فتح کر لیں گے اور مجھے مار ڈالیں گے، بادشاہ کے اس کہنے سے یہ افسر متاثر ہوئے ان کو کچھ غیرت آئی، انھوں نے کہا کہ حضور ہمارے سروں پہ ہاتھ رکھیں ہم یقینی فتح یاب ہوں گے بادشاہ نے افسروں کے سروں پہ ہاتھ رکھا اور دعا دی اور کہا کہ جلد جاؤ اور پہاڑی کو فتح کرو۔[1]

حالت یہاں تک پہنچ گئی

۹ اگست کو بخت خاں کی ایک عرضی بادشاہ کے پاس آئی کہ بادشاہ کو لوگ جو لڑائی کی صلاح دیتے تھے، اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، پس آئندہ میں سوا اپنی بریلی سپاہ کے کسی سپاہ سے تعلق نہیں رکھوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں تم سے راضی ہوں تم ہی سپاہ کے سپہ سالار رہو۔

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۸۶

سیپر مائنر (سفر مینا) نے یہ شکایت کی کہ ہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایک بیٹری بنائی تھی کہ لڑائی کے وقت وہ حضور کی سپاہ کی محافظ ہو مگر سپاہی رات کو ان کو چھوڑ کر چلے آئے، انگریزوں نے اسے غارت کر دیا، بادشاہ نے بخت خاں کو حکم دیا کہ وہ اس شکایت پر توجہ کرے غلام معین الدین رسالدار نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی ٹونک سے تقریباً پانچ سو آدمیوں کے ساتھ آیا، ان کو سپاہ کی صورت میں مرتب کیا اور پندرہ سو اور جہادی غازی یا شہید بننے کے لئے جمع ہوئے ہیں کل میں اور میرے ہمراہی حملہ میں شریک ہوئے اور ہم نے اٹھارہ کافروں کو فی النار کیا اور پانچ جہادی شہید اور پانچ زخمی ہوئے جب ہم کافروں سے لڑے تو سپاہ نے ہماری کچھ مدد نہ کی۔ اگر وہ ہماری امداد کرتے تو خدا کی مدد سے بالکل فتح ہوتی مگر خدا کی مرضی میں چارہ نہیں مجھے امید ہے کہ کچھ ہتھیار لڑنے کے لیے اور کچھ روپیہ خرچ کے واسطے مرحمت ہو گا، جس کے سبب سے ہماری مرادیں پوری ہوں گی"

اس عرضی پر ۱۷ راگست کو غالباً مرزا مغل نے حکم صادر کیا کہ بالفعل ہتھیار موجود نہیں اگر کہیں سے آجائیں تو دیئے جائیں گے روپیہ کا بھی انتظام ہو کر عطا کیا جائے گا[۱]

اسباب ناکامی

مذکورہ بالا قربانیوں کا جو افسوس ناک انجام ہوا، اس کا ایک بڑا سبب اس میگزین کی تباہی تھا جس کی بربادی نے کامیابی کو ناکامیابی سے اور فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا تھا، ظہیر دہلوی لکھتے ہیں :-

"اُس زمانے میں یہ ستم ہوا کہ شہرو کی بیگم کی حویلی میں جو میگزین تھا اور جس میں سات سو من بارود تھا، ایک دھماکہ کی آواز آئی میں اپنے دو منزلہ پر چڑھا، دیکھتا کیا ہوں کہ گرد و غبار اور دھواں آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ میگزین اُڑ گیا، بارود کی عدم موجودگی کی وجہ سے تمام آلات حرب بیکار تھے، دشمن دروازے پر کھڑا تھا باہر سے امداد کی کوئی صورت نہ تھی، بادشاہ پہلے ہی سوختہ

۱: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۵۶

جگہ اور سوختہ سامان ہو رہے تھے مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسا افسوں کیا کہ قلعہ چھوڑ کر ہمایوں کے مقبرہ میں گوشہ گیر ہونے میں عافیت تصوّر کی "

میلسن لکھتا ہے کہ :-

"باغی فوج کے سپہ سالار بخت خان نے اُسی شب شہر کو خالی کر دیا اور اپنے ہمراہ اُن لڑنے والوں کو بھی لے گیا جن پر اس کو اعتماد تھا بخت خان نے ممکن الفاظ میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ چلیں، انھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اگرچہ انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے لیکن ملک کے دروازے ان پر کھلے ہوئے ہیں کہ بادشاہ کی موجودگی سے اب بھی اُن کے نام پر جنگ جاری رکھنا ممکن ہے اور کامیابی کے امکانات ہیں[1]"

پھر بھی حوصلہ قائم تھا

جنرل محمد بخت خان تھوڑی سی فوج لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے بہت درخواست کی کہ حضور میرے ساتھ لکھنؤ بھاگ چلیں، اُنھوں نے منتشر افواج کو جمع کرنے اور شہر کے باہر انگریزی افواج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے اپنی خدمات پیش کیں، مگر بوڑھے بادشاہ نے ان کی امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد بخت خان باقی ماندہ فوجیں لے کر لکھنؤ روانہ ہو گئے[2]

بخت خان جیت گیا

بخت خان ہار کر بھی جیت گیا! بخت خان اس جواب سے مایوس ہو گیا اور ہونٹ چباتا ہوا مقبرہ کے شرقی دروازہ سے دریا کی طرف اُتر گیا اور فوج کو ساتھ لے کر ایسی جگہ غائب ہوا جہاں آج تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

---

[1] : تاریخِ غدر (از میلسن)۔

[2] : خدنگِ غدر ص۸۵۔

وُہ ایسا عاقل آدمی تھا اور اس کی فوج اس کی ایسی اطاعت گزار تھی کہ جب سے اس نے فوج سمیت بغاوت کی تھی اور دہلی میں آیا تھا، اس وقت سے دہلی کی شکست تک کبھی اس کا یا اس کی فوج کا کچھ نقصان نہیں ہُوا، دہلی نے چند مہینے تک جو مقابلہ کیا وہ اس کی حسنِ تدبیر کا نتیجہ تھا اور باقی فوجیں ایسی ابتری کی حالت میں تھیں کہ دو دن بھی مقابلہ نہ کر سکتیں :

بہادر شاہ سے رخصت ہونے کے بعد بھی اس کی عقل نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ایسا روپوش ہُوا کہ انگریزوں کے انتقام سے خود بھی بچا رہا اور اس کی فوج کا ہر ایک آدمی بھی محفوظ رہا، حالانکہ بغاوت کا وہی سب سے بڑا سرغنہ اور پیشوا تھا قسمت نے بخت خاں کو ناکام رکھا، ورنہ عجیب نہیں تھا کہ ھندوستان کا تاجدار بن جاتا اور انگریزوں کو ملک سے خارج کرنے کے بعد تیموریوں کی کمزور ہستی کو بھی درمیان سے دور کر دیتا اور دوسرا تیمور شاہ تاریخوں میں لکھا جاتا[1]

---

[1] : دلی کی جانکنی صـ۴۲ ؛

باب ۳۵

(۲)

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے، عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے، علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے اور ان سب خصائص سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاستدان، مفکر اور مدبر بھی تھے، مسند درس پر بیٹھ کر وہ علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوان حکومت میں پہنچ کر وہ دور رس فیصلے کرتے تھے وہ بہادر اور شجاع بھی تھے غدر کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے لیکن مولانا فضل حق، ان لوگوں میں تھے جو اپنے کئے پر نادم اور پشیمان نہیں تھے انہوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام و عمل کے نتائج بھگتنے کے لیے وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے، سراسیمگی، دہشت اور خوف یہ وہ چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔

مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم و فضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے، فراموش کر دیئے گئے اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کریں گے کہ یہ کون بزرگ تھے۔

مولانا کے حالات وسائل کی کمی کے باوجود جو کچھ بھی مستند طور پر دستیاب ہو سکے وہ مختصر طور پر درج کیے جاتے ہیں:-

غدر میں علماء کا حصہ

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں علماء نے نمایاں حصہ لیا بقول ایک اہل قلم اور محقق کے:-

مولانا فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی مفتی صدر الدین خان آزردہ، مفتی عنایت احمد کاکوروی

منصف صدر امین کول و بریلی، مولانا فضل رسول بدایونی سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوان مفتی انعام اللہ گوپا موی قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد، مولانا مفتی لطیف اللہ علیگڑھی سررشتہ دار امین بریلی علامہ فضل حق خیر آبادی، سررشتہ دار ریذیڈنسی دہلی و صدر الصدور لکھنؤ مہتم حضور تحصیل اودھ مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑ گاؤں مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہ یہ سب ایسے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علماء تھے، حکومت کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں تھی، مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی، موقعہ کا انتظار تھا ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے والیان ریاست اور ارکین دولت میں ناقوس حریت پھونکنے والے یہی تھے، عوام کو ابھارنا اور فتویٰ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے اور آتش حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستان آزادی کے پروانے تھے۔

سر سید احمد کا خراج عقیدت

سر سید احمد مولانا فضل حق کے بارے میں لکھتے ہیں :-

جناب مولانا مولوی فضل حق : یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مولانا فضل امام کے۔ زبان قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا ہے اور فکر دقیق نے جب سر تا پا کو دریافت کیا فخر جہاں پایا، جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے، علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت، جو بزم سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں بارہا دیکھا گیا جو لوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے

صلہ : تذکرہ اہل دہلی از سر سید احمد

تحصیل علوم، تصانیف اور پایۂ علم

علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی وطن خیر البلاد خیرآباد میں پیدا ہوئے[1]

آپکے والد ماجد مولانا فضل امام خیرآبادی علماء عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے درجہ پر سرفراز تھے دارالسلطنت دہلی میں صدر الصدور کے عہدہ جلیلہ پر فائز اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھے[2] نسباً آپ شیخ فاروقی تھے، علوم عقلی کی تحصیل اپنے والد بزرگوار سے کی اور حدیث کو شاہ عبدالقادر سے سنا، قرآن مجید کو چار مہینے میں حفظ کیا، تیرہ ۱۳ سال کی عمر میں تمام علوم کی تحصیل سے فراغت پائی دور دور سے لوگ آپ کے درس میں آتے تھے چنانچہ آپ دہلی وغیرہ میں مناصب جلیلہ پر مقرر رہے عربی وفارسی میں نظم ونثر فائق لکھتے ہیں چار ہزار اشعار آپ کے شمار کئے گئے ہیں اور اکثر قصائد آپ کے مدح آنحضرت اور ہجو کفار میں ہیں آپکے اور استاذی مفتی محمد صدر الدین خاں صدر الصدور دہلوی کے درمیان بڑی دوستی تھی آپ کی تصنیفات سے (۱) رسالہ یجنس لغافی فی شرح جوہر العالی (۲) حاشیہ شرح مسلم قاضی مبارک (۳) حاشیہ افق المبین (۴) حاشیہ تلخیص الشفاء اور (۵) ہدیہ سعیدیہ حکمت طبیعہ (۶) رسالہ تحقیق العلوم والمعلوم (۷) رسالہ روض المجود فی تحقیق حقیقیہ الوجود (۸) رسالہ تحقیق الاجسام (۹) رسالہ تحقیق الکلی الطبعی (۱۰) التشکیک (۱۱) رسالہ الہیات، تاریخ فتنہ ہندوستان وغیرہ ہیں،

وفات آپ کی جزیرہ رنگون میں بحالت قید سرکار انگریزی ۱۲ ماہ صفر ۱۲۷۸ ہجری میں واقع ہوئی[3]

مولانا فضل حق کے ادوار حیات

مولوی فضل امام خیرآبادی کی تصنیف مرقات علم منطق آج تک شامل درسیات ہے، بہت سی کتابیں تصنیف

ص۱ : دیباچہ ہدیہ سعیدیہ

ص۲ : باغی ہندوستان صلا

ص۳ : حدائق الحنفیہ ص۴۸۰ ؛

کی ہیں ریاست پٹیالہ میں ملازمت کی پھر دہلی میں صدر الصدور رہے ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۲۱۲ ہجری میں وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا فضل حق خیر آبادی تھے جو ۱۷۹۷ء مطابق ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے مرزا غالب کے بالکل ہمعصر تھے اور بڑے مخلص اور بے تکلف دوست، دہلی میں سررشتہ دار رہے پھر جھجر، الور اور ٹونک کی ریاستوں میں ممتاز عہدوں پر رہے لکھنؤ میں بھی صدر الصدور رہے۔ ریاست رامپور میں نواب یوسف علی خاں نے بلایا اور تلمذ اختیار کیا، نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ پڑھا۔ بڑے عالم متجر تھے اور عربی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر۔

سرسید احمد خان نے "آثار الصنادید" میں اور منشی امیر احمد مینائی نے "انتخاب یادگار" میں مولانا فضل الحق کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے[1]

ایک علمی لطیفہ مولانا غوث علی شاہ قلندر واقعہ بیان کرتے تھے کہ علامہ نے ایک قصیدہ عربی میں امرالقیس کے ایک قصیدہ کی طرز پر لکھا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کو سنانے کے لیے گئے۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا، اس کے جواب میں انھوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیئے۔ مولانا فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے وہ فرمانے لگے کہ بس حد ادب۔ علامہ نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر تو ہے نہیں فن شاعری ہے اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تم سچ کہتے ہو مجھ کو سہو ہوا[2]

علامہ عربی کے سوا فارسی میں بھی فکر سخن کرتے تھے۔ فرنیتی تخلص تھا یہ شعر نقل ہے

فرنیتی در کعبہ رفتی بارہا
نا مسلمانی نا مسلمانی ہنوز

مومن خاں سے تعلقات : مولانا فضل حق کے تعلقات حکیم مومن خاں سے بھی خاصے

---

[1] : داستان تاریخ اردو / حامد حسن قادری ، ص ۲۲۵

[2] : تذکرہ غوثیہ (از مولانا گل حسن شاہ پانی پتی)

گھرے تھے، اختلاف فکر و نظر کے باعث کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، ذیل کا واقعہ یقیناً دلچسپی پڑھا جائے گا۔

مولوی اسمٰعیل صاحب کا قاعدہ تھا کہ جب آپ کے پاس مولوی فضل حق صاحب کی تحریر پہنچتی تو فوراً جواب دیتے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ مومن خاں اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیل رہے تھے اور مولوی فضل حق نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے پاس تحریر بھیجی تھی، اتفاق سے ان کے شطرنج کھیلنے ہی میں آدمی واپس آگیا، مولوی فضل حق صاحب نے دریافت کیا کہ جواب لائے" اس نے کہا "جواب نہیں دیا" اور کہا "فلاں وقت دوں گا" چونکہ یہ بات مولوی اسمٰعیل کے طرز کے خلاف تھی اس لیے مولوی فضل حق صاحب نے یہ کہا کہ بس دے لیا جواب" یہ بات مومن خاں کو یہ بات ناگوار ہوئی، چونکہ گفتگو میں مزاج مکدر ہو گیا تھا، اس لیے مومن خاں یہ شعر کہہ کر چل دیئے۔

قابل تحقیق شطرنج

بے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

آرزو مولوی فضل حق صاحب کا تخلص ہے، جب مولوی فضل حق صاحب نے دیکھا کہ مومن خان ناراض ہو گئے تو وہ اُن کو منانے کے لیے گئے، کچھ گفتگو ہو کر صلح ہو گئی اس وقت مومن خاں نے یہ شعر پڑھا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مولانا فضل حق اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

اختلاف مسلک کے باوجود مولانا فضل حق مولانا اسمٰعیل شہید کا احترام کرتے تھے، کچھ اس لیے کہ دونوں میں عمر کا کافی تفاوت تھا، مولانا اسمٰعیل مولانا فضل حق سے تقریباً بیس سال بڑے تھے اور کچھ اس لیے کہ اس خانوادہ فضل و کمال سے وہ بھی فیض کر چکے تھے۔ اور زیادہ تر اس لیے کہ اختلاف رکھتے ہوئے بھی وہ مولانا اسمٰعیلؒ کے خلوص کے قائل تھے۔

ے : امیر الروایات صفحہ ۱۶۰

مولوی فضل عبد الرشید صاحب غازی پوری رامپور میں مولانا فضل حق صاحب سے پڑھتے تھے یہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے، اتفاق سے ان کے ایک دوست مل گئے، ان دوست نے ان سے کہا کہ چلو مولوی فضل حق صاحب کے یہاں چلیں تو ان کے (مولانا اسمٰعیل صاحب کے) معتقد ہو، آج تمھیں تمھارے استاد سے ان پر تبرے سنوائیں گے، انھوں نے کہا چلو جب یہ دونوں وہاں جاکر بیٹھے تو مولوی عبد الرشید صاحب سے کہا کہ حضرت یہ مجھے یہ کہہ کر لائے ہیں کہ مولوی صاحب سے تمھیں مولوی اسمٰعیل پر تبرے سنواوں گا، مولوی فضل حق صاحب نے کہا "اچھا اس غرض سے لائے ہیں اور یہ کہہ کر ان پر بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا میں اور مولوی اسمٰعیل پر تبرا کروں یہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہہ کر ان کو اپنی مجلس سے اٹھوا دیا۔ اور فرمایا کہ میرے یہاں کبھی نہ آنا[1]

سلسلۂ ملازمت

اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا، دلی میں ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا، اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہوگئے۔ ابو ظفر ولی عہد سے دوستانہ مراسم تھے قلعہ میں آتے جاتے، دلی وہ دلی تھی کہ ایک طرف حدیث وفقہ کا دور دورہ تھا، دوسری طرف منطق وفلسفہ کی گرم بازاری، شعر وسخن کے گلی کوچہ میں چرچے بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر موجود، ان کے ہم سبق مفتی صدر الدین خاں آزردہ دوستوں میں مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبد اللہ خاں علوی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر تاں، نصیر الدین نصیر شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبد الرحمٰن احسان، میر حسن تسکین جیسے باکمال لوگ تھے، تمام کو مولانا کے یہاں نشست رہا کرتی[2]

تجارت اور کاروبار

مولانا کو تجارت اور کاروبار سے بھی دلچسپی تھی۔ اللہ کے دیئے ہوئے ہاتھی اونٹ اور عمدہ قسم کے گھوڑے امراء ونوابوں میں اطاعت خداوندی سے نہ روکتے تھے، آپ ان میں سے تھے کہ تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر میں حارج

---

[1] : امیر الروایات ص ۱۹۱

[2] : گل رعنا ص ۳۱۲

نہ ہو سکتی تھی ہر ہفتہ ختم قرآن پاک فرماتے، تہجد کی نماز پابندی سے ادا کرتے جو نوافل پر اس وجہ سے طبیعت گرتا ہوا اس کے فرائض کا حال خود سمجھ میں آتا ہے طلبہ پر شفیق اور ذہین تلامذہ کے پڑھانے پر حریص تھے، آسان اور سہل الفاظ میں سمجھاتے کسی کے سمجھانے سے بات نہ سمجھتے بلکہ خود تہہ تک پہنچتے تعلیم و تدریس میں اپنے جگر گوشہ اور عام طالب علم میں ذرہ برابر فرق نہ کرتے[۱]

بہادر شاہ کی عقیدت

مولانا فضل حق نے بوجوہ سرکار انگریزی کی ملازمت ترک کر دی۔ عرصہ کے بعد ریذیڈنسی کمشنری میں اپنے آپ کو تبدیل کرالیا مگر یہاں بھی رنگ بے رنگ تھا یہ نازک مزاج واقع ہوئے تھے، حکام تھے تنگ مزاج، حفظ مراتب کہاں ارباب علم اور بے علم سب ایک آنکھ سے دیکھے جاتے، علامہ نے استعفیٰ دیا، نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر نے پانچ صد روپیہ ماہوار مصارف کے لیے پیش کیا اور قدر دانی کے ساتھ اپنے پاس بلایا روانگی کے وقت ولی عہد سلطنت صاحب عالم ابو ظفر بہادر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ کو اڑھا دیا اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو گئے کہا کیونکہ آپ جانے کے لیے تیار ہیں میرے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں مگر خدا علیم ہے لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔

ایک عرصہ تک جھجر رہے پھر مہاراجہ الور نے بلوا لیا، کچھ دنوں ــــ سہارنپور قیام رہا پھر نواب یوسف علی خاں نے رام پور بلا لیا، خود تلمذ اختیار کیا اور محکمہ نظامت اور مرافعہ عدالتوں میں منسلک کر دیئے گئے، نواب کلب علی خاں نے بھی کچھ آپ سے پڑھا آٹھ دس برس رہنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے[۳] وہاں صدر الصدور ہو گئے۔

لکھنؤ کا قیام : اب مولانا نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، اور یہاں ایک ذمہ دارانہ

---

۱ : خطبہ ہدیہ سعیدیہ

۲ : باغی ہندوستان ص ۱۳۶ ؛

۳ : انتخاب یادگار امیر مینائی ص ۲۹۱

منصب پر فائز ہو کر اپنے فرائض انجام دینے لگے۔

۲۶ صفر ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ اختر اپنے والد امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد سریر آرائے سلطنت اودھ ہوئے ابتداء عمر ہی سے عیش و عشرت کے خوگر تھے حکمران ہونے پر بھی عادت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ انجام سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی[1]

لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے دوسرے ہی سال ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ پہنچ کر فہمائش کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے مقرر ہوئی اس کے مہتمم علامہ فضل حق خیرآبادی ہی قرار پائے۔ مستغیثان سپاہ فوج سرکار کمپنی سکنہ ملک اودھ کی زمینداری کا مقدمہ محکمہ جات شاہی میں فیصل ہوا کرتا تھا مگر غفلت یا طمع عمال سے یا سرکشی تعلقہ داران سے وہ لوگ اپنے حق کو نہ پہنچ کر ہمیشہ داد بیداد کرتے رہتے تھے ان کی دادرسی کے لئے حضور تحصیل مقرر ہوئی تھی۔[2]

مسند درس

لیکن اس گراں بار منصب کے باوجود مسند درس سے مولانا نے اپنا تعلق نہیں منقطع کیا مولوی رحمت علی خاں تذکرہ علمائے ہند میں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں:۔

میں نے ۱۲۶۴ ہجری میں بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے۔ اور ایک طالب علم کو افق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے[3]

اولاد

مولانا فضل حق کی اولاد نرینہ میں مولانا عبدالحق تھے جو ہر اعتبار سے ان کے صحیح جانشین تھے علامہ کی صاحبزادی بی بی سعید النساء (والدہ حضرت مضطر خیرآبادی) بھی بڑی شاعرہ تھیں

۱؎ : انتخاب یادگار منشی امیر احمد مینائی

۲؎ : تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۷۰ نجم الغنی خاں رامپوری

۳؎ : باغی ہندوستان ص۲۹ ۔

۴؎ : غدر کے چند علماء ص۳۶ ؛

حسرتان تخلص فرماتی تھیں یہ مشہور وزبان زد شعر موصوفہ ہی کا ہے

خانہ یار کا کیا تم کو پتا بتلاؤں
جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

غدر کا آغاز

واجد علی شاہ کی معزولی کے کچھ عرصہ بعد ہندوستان گیر غدر شروع ہوا۔ مولانا فضل حق کو اپنا وطن عزیز تھا وہ اس کی غلامی پر کڑا ھتے تھے وہ اس سے واقف تھے کہ مسلمانوں نے جاہ و جلال کے ساتھ اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کی اور یہ حکومت اب مائل بہ زوال و انحطاط ہے اور اس زوال و انحطاط کا سبب انگریز ہیں، وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے، چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تامل شریک ہو گئے وہ بہادر شاہ کے معتمد مقرب اور مشیر تھے ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے انہیں اہم معاملات و مسائل پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے حامی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔ مولانا نے غدر میں دلیری اور جرات کے ساتھ علانیہ حصہ لیا انھوں نے متعدد والیان ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی جس جس والئی ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات و مراسم تھے، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان خود اس کے پاس پہنچے اور اسے آزادی وطن کا واسطہ دے کر اس جد و جہد میں شریک کرنے کی کوشش کی حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو مولانا کی شرکت سے بڑی قوت پہنچی

ہندو مسلم اتحاد اور مولانا فضل حق

مولانا فضل حق، جذباتی آدمی نہیں تھے وہ واقعات اور حقائق کو تسلیم کرتے تھے پھر اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے تھے وہ اپنے مسلک اور عقیدے میں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ قائم رہتے تھے، خواہ اس راستے میں انھیں کفر کے فتووں سے سابقہ پڑے، یا، یا طنز و تشنیع اور ملامت سے۔

ملاحظہ: باغی ہندوستان ص ۶۶ ؎

لکھنؤ اور دلی میں واقعات ایسے پیش آئے جن سے مولانا کی ہر دلعزیزی اور وقار و رسوخ پر بہت بُرا اثر ڈالا وہ بدنام کیے گئے، ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کیے گئے انھیں مورد طعن بنایا گیا ان کی نیت اور ذات پر پست اور رکیک حملے کیے گئے لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہے۔

مولانا کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا ہے تو انھیں ہندوؤں سے بہر حال اچھے تعلقات رکھنا پڑیں گے انھیں ہر ایسی حرکت سے اجتناب کرنا پڑے گا جو ہندوؤں کو ان کا دشمن بنا دے اور انگریزوں کو مداخلت کا موقعہ دے۔ وہ اس حقیقت کو محسوس کرتے تھے کہ اگر ہندو اور مسلمان باہم متحد ہوں تو انگریز اس دیس سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہیں لیکن اگر یہ دونوں بڑی اور عظیم قومیں باہم برسر پیکار ہوں تو ان دونوں کو غلامی کی زندگی بسر کرنی پڑے گی اور انگریزوں کی بادشاہت کو ثبات و استحکام حاصل ہو جائے گا۔

مولانا فضل حق مجتہد اور مدبر کی حیثیت سے

چنانچہ مولانا کے زمانہ قیام لکھنؤ میں جو دھیا کی مسجد کا واقعہ پیش آیا جس کی بازیافت کے لیے مولانا سید امیر علی شہید اپنے چند جان نثار ساتھیوں کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے مولانا فضل حق نے اس جہاد کے خلاف آواز بلند کی بعض ان مجاہدین کی نیت نیک اور خالص تھی لیکن کوئی شبہ نہیں مولانا فضل حق کی رائے دور اندیشی اور حکمت و تدبر پر مبنی تھی۔ ان کی رائے اگر مان لی جاتی اور یہ معاملہ دوستانہ فضا میں طے کرنے کی کوشش کی جاتی تو انگریزوں کو مداخلت کا موقعہ نہ ملتا لیکن ان کی رائے نہیں مانی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے قدم جم گئے مسلمانوں کی حکومت اودھ سے کچھ ہی عرصہ بعد اٹھ گئی اور معاملہ جوں کا توں رہا۔

اسی طرح غدر شروع ہونے کے بعد مولانا نے فتوے دیا کہ گاؤ کشی بند کرا دی جائے اس فتوی کی توثیق بہادر شاہ کے فرمان شاہی نے کر دی۔ ملتی ذکا اللہ لکھتے ہیں۔

ضلع گوڑگانواں کے زمینداروں کی طرف سے درخواست آئی کہ سارے ضلع میں

بدنظمی ہو رہی ہے کوئی حاکم انتظام کے لیے بادشاہ کی طرف سے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے یہ کام مولوی فضل حق کے سپرد کیا، مولوی صاحب عالم متبحر مشہور تھے وہ الور سے ترک ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لیے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا، جس کی دفعہ اول یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو، جس پر مولویوں نے ان کا خوب مضحکہ اڑایا، ان کو اس بغاوت کے سبب سے سزا جلاوطنی کی ملی تھی۔[1]

مولانا فضل حق اس بات کو محسوس کرتے تھے کہ اگر ہندوؤں کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ "مسلم" حکومت کیوں گوارا کریں گے، وقت کے متعدد علماء نے ان کا "مضحکہ" اڑایا لیکن وہ اپنی رائے پر اڑے رہے اور اپنی رائے نافذ کر کے رہے، انھوں نے اس کی ذرا پروانہ کی کہ لوگ ان کے بارے میں کیا مشہور کرتے ہیں

مولانا کی یہ روش تدبر اور فراست پر مبنی تھی، ورنہ جہاں تک حب اسلام و مسلمین کا تعلق ہے انھوں نے اپنی دولت، املاک، جائداد، ثروت حتیٰ کہ جان تک اسی راہ میں قربان کر دی۔

فضل حق اور بہادر شاہ

بہادر شاہ کی نظر میں مولانا فضل حق کی کیا حیثیت تھی اور مہمات امور میں وہ کس طرح حصہ لیتے تھے، اس کا ہلکا سا اندازہ اس روزنامچہ سے ہوتا ہے۔

میرٹھ سے دہلی پر باغی فوج نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا بادشاہ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے، علامہ بھی شریک مشورہ رہے منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶ راگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۹۸

۵؍ستمبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ — دربارِ عام میں تشریف فرما ہوئے مرزا الٰہی بخش مولوی فضل حق میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے۔

۶؍ستمبر ۱۸۵۷ء : مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷؍ستمبر ۱۸۵۷ء : بادشاہ دربار میں آئے حکیم عبدالحق میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام امراء اور روساء شریک دربار ہوئے[1]

غدر کے بعد مولانا کے مصائب

علامہ نے رسالہ "ثورۃ الهندیہ" میں لکھا ہے کہ وہ انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ یوم تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے پانچویں روز اہل و عیال اور ضروری سامان لے کر شب میں چھپ کر نکلے دریا عبور کیے بیابان قطع کئے نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آکر اٹھارہ روز رہے صاحبزادے مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے بھیکن پور کی گڑھی میں برج پر جانب شرق واقع ہے اب مسٹر عبدالصبور خاں شیروانی بی اے (علیگ) کے تصرف میں ہے، نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے، علامہ کے ورود اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے نو سال بعد بچپن میں والد ماجد اور عم محترم سے یہ واقعات سنے اور فطرت خداداد کی بنا پر انھیں یاد رکھا موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبدالحق میں کافی تعلقات بھی ہو گئے جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے[2]

گرفتاری اور سزا یابی : اگرچہ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان شائع ہو چکا تھا اور عفو عمومی کا اعلان کیا گیا

---

[1] : غدر کی صبح و شام روزنامچہ منشی جیون لال صفحہ ۲۱۷ تا ۲۴۷

[2] : باغی ہندوستان ص ۱۵

چکا تھا، پھر بھی مولانا گرفتار کر لیے گئے۔ اور انھیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

ضبطی املاک جائداد

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات پر ہی نہیں ہو جاتا۔ اولاد و احفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا، سب سے بڑی مصیبت ضبطی جائداد املاک کی تھی علامہ بڑے امیر کبیر تھے دولت دنیا، دین دونوں سے بہرہ ور اور صاحب عزت و وقار تھے احکام وقت شاہزادگان عالی تبار امراء و روساء اور علماء و صلحا سبھی عزت کرتے تھے شاہانہ زندگی گزاری، ہاتھی گھوڑے پالکی نفیس اور دوسری شان و شوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں، جب مولانا عبدالحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص و عوام اور برادرانِ وطن نے بھی بطور اظہار خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپے کے پیش کئے ۱؎

جرم بغاوت ثابت ہو جانے پر خیر آباد کا سنگین و عالی شان ، دیوان خانہ اور محل سرا ضبط کرکے بصلہ خیر خواہی سردار محمد ہاشم سیتاپوری (مورث اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دے دیئے گئے اُنھوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے، عرصہ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور اُن کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے، مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا عبدالحق فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار ہیں میں نے اسے محفوظ رکھا ہے جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے شکست و ریخت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ تو ایک انجینئر کو درستی کے لیے بھیجا تخمینہ درستی تیس بتیس ہزار روپیہ بتایا گیا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لیے اور کچھ سامان حکیم سید انوار حسین خیر آبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقہ داران اودھ کو دے دیا، دروازہ بطور یادگار باقی رہنے دیا جو آج بھی صاحب مکان کی عظمت و جلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے ۲؎

۱؎ : حسرۃ العلماء بوفاۃ شمس العلماء مولفہ حکیم برکات احمد ٹونکی

۲؎ : باغی ہندستان ص ۱۰۱

انڈمان کی زندگی

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ وقصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے، سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا، مشرقی علوم سے واقفیت رکھتا تھا اور فن ہیئت کا بڑا ماہر تھا، اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے انہیں ایک فارسی کی کتاب ہیئت ـــــ دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کردیں، مولوی صاحب سے تو کام چلا نہیں، علامہ سنتے نے رہ گئے تھے، ایک ہی سال گذرا تھا، ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کرکے تصحیح کی گذارش کی، علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کرکے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے، جب یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے تو وہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا، کہنے لگا مولوی صاحب تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالہ ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل ہیں یہاں کہاں ہیں ؟

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لیکر بارک میں آیا، علامہ موجود نہ تھے، کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آتے ہیں وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا، معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا، گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔

فضل حق اور غالب

غدر کے المناک کا ایک خونچکاں باب اکابر علم وحاذق کی مصیبتیں ہیں غالب کے مکاتیب میں اس موضوع پر بھی کافی مواد موجود ہے، مولانا فضل حق خیرآبادی دور آخر میں معقول کے امام تھے۔

دہلی سے روانگی کا وقت آیا تو بہادر شاہ نے جو اس وقت ولی عہد تھے مولانا کو بلا کر رومال لبوس خاص ان کے کندھوں پر رکھ دیا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا۔

ہر شامے گوئید کہ من رخصت مے شوم مرا جز اینکہ
تپدیرم گزیر نیست۔ اما ایزد داناست واند کہ لفظ وداع

از دل بہ زباں نمی رسد الا بہ ہزار جر ثقیل "

غدر کے بعد مولانا بھی باغیوں کی اعانت سے متہم ہوئے اور حبس دوام کی سزا دے کر انڈمان بھیج دیا گیا غالب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

"مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوامِ حبس بحال رہا، بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا، ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے جو ہونا تھا سو ہو لیا انا للہ وانا الیہ راجعون

میاں داد خاں سیاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے، تو غالب انھیں ۲۸ اکتوبر ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں :-

"ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھے لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی؟ وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے، گزارہ کس طرح ہوتا ہے"۔

مولانا فضل حق نے انڈمان میں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ ہجری کو وفات پائی، نامہ غالب میں ایک موقعہ پر مولانا کے ایک رسالہ سے اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے "فخر الفضلا" "خاتم العلماء امیر الدولہ مولوی فضل حق رحمۃ اللہ علیہ[1]

مولانا کا حکمِ رہائی صادر ہوا، لیکن کب؟ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے :

عید ہوئی ذوق وسے شام کو

۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق پر جرم بغاوت عاید کیا گیا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم صادر ہوا۔ لیکن مولانا کے فرزند اور منشی غلام غوث بیخبر نے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی اور

---

[1] : غالب (غلام رسول مہر) ص ۲۷۶

آخر رہائی کا حکم حاصل کر لیا، لیکن تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود والا مضمون صادق آیا جس وقت پروانہ آزادی پہنچا اس وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا ۱۲۷۸ھ ہجری مطابق ۱۸۶۱ء میں وفات پائی اور انڈیمان میں سپردِ خاک ہوئے[1]

ابوالکلام کی روایت مولانا ابوالکلام فرماتے تھے والد صاحب نے معقولات کی تکمیل مولوی فضلِ حق سے کی تھی، اثنائے درس میں کبھی ان کا ذکر آجاتا تھا تو فرماتے تھے میں نے ایسا خوش تقریر انسان عمر بھر نہیں دیکھا مجلس کی تقریر اور درس کی تقریر دونوں میں بے مثل تھے ان کی ایک تقریر وحدت الوجود پر اس قدر مشہور ہوئی کہ دور دور سے اہلِ علم اس کے سننے کے لیے آتے تھے[2]

رفیقِ محبس کی یاد مشہور شاعر منیر شکوہ آبادی، مولانا کے ساتھ انڈیمان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے کس حسرت سے کہتے ہیں:-

مولوی بے نظیر فضلِ حق اسم شریف ‏ ‏ دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن

قید میں میں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ ‏ ‏ عین سمندر میں تھے غرقۂ بحرِ محن

نسف قسمت کیا سامنے اُن کے رقم ‏ ‏ ختم ہوا جب بچے وہ ہمدم گور و کفن[3]

غالب کی تاریخِ وفات: مرزا غالب نے حسبِ ذیل تاریخ وفات لکھی:-

اے دریغا قدوۂ اربابِ فضل ‏ ‏ کرد سوئے جنت الماویٰ خرام

چوں ارادت از پئے کسبِ شرف ‏ ‏ جست سالِ فوت آں عالی مقام

چہرہ ہستی خراشیدم نخست ‏ ‏ تا بپائے تخرجہ گردد تمام

گفتم اندر سایہ لطفِ نبی

بود آرامگہ فضلِ امام

۱۲۷۸ھ

---

[1]: داستانِ تاریخ اردو (حامد حسن قادری) صفحہ ۲۹۶

[2]: غالب: غلام رسول مہر

[3]: ہند کے چند علماء

[4]: سبدچیں (غالب)

[5]: باغی ہندوستان صفحہ ۲۵

باب ۳۶

مشاہداتِ غدر

مولانا فضل حق خیر آبادی، نہ صرف منطق و فلسفہ کے امام تھے بلکہ وہ عربی کے بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ وہ عربی زبان پر اہل زبان کی سی قدرت رکھتے تھے۔ "ہدیہ سعیدیہ" محض ایک فنی کتاب ہے لیکن اس کی ایک ایک سطر، مولانا کے ذوق ادب کی تصویر ہے۔ فقرے سانچے میں ڈھلے ہوئے نکلتے ہیں۔ الفاظ موتی کی طرح اپنی چمک دمک دکھاتے ہیں، انداز بیان کی فصاحت و بلاغت یہ محسوس ہونے نہیں دیتی کہ ہم فلسفہ کے خارستان میں بادیہ پیمائی کر رہے ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چمنستان ادب اور حدیقۂ معنی کے گلگشت میں مصروف ہیں۔

حبس دوام بعبور دریائے شور کے عہد پر محن میں، جب نہ عافیت میسر تھی، نہ تسکین خاطر، نہ قلم پاس تھا، نہ صفحۂ قرطاس، مصائب کے ہجوم، تکالیف کی یورش، اور آلام ہجوم کے غلبہ نے دل و دماغ کی کی کائنات درہم برہم کر رکھی تھی، عیش و نشاط کی بساط الٹ چکی تھی۔ فارغ البالی اور امارت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ تنعم اور کامرانی کا عہد، دور ماضی بن چکا تھا، یہ عالم بے بدل اور باعمل، کنج قفس میں بیٹھا کوئلہ کو قلم بنا کر پھٹے پرانے کاغذات کا سہارا لے کر اپنے مشاہدات اور واردات قلم بند کر رہا تھا، ــــــ نثر میں بھی اور نظم میں بھی،

"الثورۃ الہندیہ"، یعنی بغاوت ہند کی داستان، وہ داستان، جس کا وہ ایکٹر بھی تھا۔ اور تماشائی بھی، اپنے نوک حقیقت رقم سے صفحۂ قرطاس پر ثبت کر رہا تھا۔ اس داستان کا یہ ترجمہ صاف ہے۔ واضح ہے۔ دل نشین ہے، بامحاورہ ہے، لیکن اس میں وہ عذوبت وہ لطافت، وہ فصاحت و بلاغت وہ روانی، اور جوش، وہ مٹھاس اور کیفیت کہاں، جو اصل عربی میں ہے، جو فضل حق کی کلک

گوہر سلک سے ٹپکی اور حیات جاوید پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ تاریخ پر ثبت ہو گئی۔ بہر حال اب وہ داستان پڑھیے، پیراگرافنگ ہم نے کی، ضمنی سرخیاں بھی ہم نے قائم کی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لیے ہیں جس سے بغیر کسی ناامیدی کے محنت وآزمائش کھنگی و بوسیدگی اور غم وتکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اُسے بہترین عطایا اور بیشمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے بالخصوص مظلوم ومضطر کی آہ مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔

سلام ہو اُس خوشرو خوشخبری سنانیوالے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام نبی نوید مسرت آمد سناتے آئے بلاؤں وباؤں کے دور کرنے دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے بڑی بدبختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی گنہگاروں اور سیہ کاروں کو اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے سلام ہو اس کی شریف ونجیب کریم اولاد پر اور اس کے عظیم المرتبہ شدید ورحیم اصحاب پر خصوصاً پاکباز صاف باطن خلفاء پر اللہ کی رحمتیں وبرکتیں سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح وتہلیل کرتے رہیں اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

داستان حسرت کشیدہ میری یہ کتاب ایک دل شکستہ نقصان رسیدہ حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے جو اب تھوڑی سی تکلیف کی بھی طاقت نہیں رکھتا اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے جو ابتدائی عمر سے عیش وفراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود اب محبوس دام ظلم اور تباہ شدہ ہے ——— اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے اور بڑی مشکلات میں مبتلا اور بدترین ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے ان ظالموں نے اچھے لباس سے معرا کر کے غم وحزن کی وادیوں اور ایسے تنگ وتاریک قیدخانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ قلعوں کے مرکز ہیں وہ محبوس وحزیں سخت دل اُچکے اور ظالم

افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہے وہ ایک سیدھا
سادہ نرم خو اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے شریر و بدفطرت کی قید میں ہے اور ظالم و جابر بدخلق و بدکردار کے
مظالم سے حیران و پریشان ہے وہ آفت رسیدہ ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک
قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و اضطراب میں گرفتار ہو
چکا ہے۔ وہ سفید و سیاہ دل متلون مزاج ترشرو کجی آنکھ گندم گون بال والوں کی قید میں آچکا ہے جس کو
اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے
لو لگائے ہوئے ہے اپنے تمام اعزہ و اقربا سے دور اور بہت دور ہے مدعی اور متنازع کے بغیر اس پر فیصلہ
صادر کر دیا گیا ہے وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے اس کے بازوؤں کو سخت تصادم
سے کمزور کر دیا گیا ہے وہ غمزدہ تنہا اور دور افتادہ ہے اسے اپنی زمین و شہر سے جلاوطن اور اپنے
اہل و عیال سے دور کر دیا ہے یہ سارا ظلم و ستم ظالم بداندیش نے روا رکھا ہے اور اس کے اہل و عیال
کو مصیبت کی بجاری میں چھوڑ دیا ہے اسے قید کر کے ہر ممکن مصیبت پہنچائی گئی ہے اس کا قصور صرف ایمان اور
اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علمائے اسلام میں شمار ہونا ہے اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان
درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے چشمہ سے کو نیچے گرانا ہے وہ صفحات قرطاس سے بھی نام و نشان مٹانا
چاہتے ہیں۔

حادثہ فاجعہ

یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ (انقلاب ۵۷ء) کی وجہ سے ہوا ہے جس نے آبادیوں
کو ویران اور مصیبتوں کی شور زمین کو شاداب بنا دیا ہے جس سے غموں کے بادلوں
سے کڑکتی ہوئی بجلیاں مصیبت زدگان وطن پر گریں اور ان پر بادشاہوں کو غلام و قیدی اور امراء کو محتاج
و فقیر بنانے والی محتاجی و ناداری مسلط کر دی گئی یہ داستان الم اس طرح ہے کہ وہ بد طینت نصاریٰ جن
کے دل ممالک ہند کے دیہات و بلاد پر قبضہ اور اس کے اطراف و اکناف و سرحدات پر تسلط کے بعد
عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل و خوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس
قابل نہ چھوڑا تھا کہ سر نافرمانی کو جنبش دے سکے انہوں نے تمام باشندگان ہند کیا امیر کیا غریب

چھوٹے بڑے مقیم و مسافر شہری و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بناتی ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار و معاون نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جراءت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی دین پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو گا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لیئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لیا شروع کیا انہوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیئے۔ پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لیکر نقد دام ادا کیئے جائیں۔ اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے اس طرح بھاؤ کو گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کی خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں پر آ پڑے اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاری اور ان کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مقاصد چھپے ہوئے تھے۔

انگریزوں کی زیادتیاں اور شرارتیں

مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا شریعت و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین مبین کو مٹانا وغیر ذالک۔ ایسے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجا لانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عتاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہو سکے گی انہوں نے ہندو لشکریوں کو حکم دیا

ہیں بہت زیادہ تھے گائے کی چربی مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب اور اعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا ان کے اس اضطراب نے خرمن امن پر چنگاری کا کام کیا گروہ انصاری کا قتل ڈاکہ زنی ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے ۔

قساوت قلبی اور شوریدہ سری انہوں نے قساوت قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا بچوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کی قتل و غارتگری سے رسوائی و ذلت کے مستحق بن بیٹھے پھر تمام باغی گروہ لشکریان اپنی چھاؤنیوں سے اپنے افسروں سے نپٹنے کے بعد چل کھڑے ہوتے عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے راستوں کے امن میں خلل و فتور مخلوق خدا میں فتنہ و فساد اور دیہات و بلاد میں شور و شغب پھیل گیا طوفان حوادث جوش میں آ گیا ۔ بہت سے لشکر شہر مشہور بلدۂ معمور مسکن آل تیمور دار السلطنت دہلی جا پہنچے وہاں پہنچ کر ان سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنا لیا جو اس سے پہلے بھی ان کا امیر[1] و حاکم تھا جس کے پاس اس کے ارکان دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف غمزدہ اور ناتجربہ کار تھا عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا اور سچ پوچھیے تو امیر و حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات[2] اور وزیر[3] کا مامور و محکوم تھا اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز اور ان کی محبت میں غالی تھا صحیح معنوں میں حاکم و والی اور نصاریٰ[1] کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا یہی اس امیر و حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا ان میں سے بعض[4] مقرب

---

[1] سراج الدین بہادر شاہ ظفر ۔
[2] ملکہ زینت محل
[3] حکیم احسن اللہ خاں
[4] بعض مغل شہزادے

یادگار اور رازدار بھی تھے یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے اپنی آراء پر عمل پیرا ہوتے تھے لیکن اس کی اطاعت کا اظہار کرتے تھے اور وہ ایسا ضعیف دم ناتجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا نہ اچھا برا سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا نہ کسی کو خفیہ یا علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا نہ کسی کو نفع و ضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا

فتوائے جہاد۔ جدال و قتال

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت علماء[1] و جہلاء و ائمہ اجتہاد سے جہاد کا فتویٰ لے کر جدال و قتال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ادھر اس ناتجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش خائن اور بزدل اولاد[2] کو امیر لشکر بنا دیا یہ لوگ چونکہ ہوشیار عقلمندوں سے متنفر تھے۔ انہیں نہ تو میدان کارزار سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی یا نیزہ بازی کا ہی موقع ہوا تھا انہوں نے بلند نسبی لوگوں کو ہم نشین و جلیس بنا لیا اس طرح یہ ناآموزہ کار اسراف بیجا اور فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے، وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے جب مالدار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے لوگوں سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے لیکن اس میں سے ایک حبہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا جاتے تھے یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن ان کو تو زمانہ ناشائستہ و تباہ کار رفیقوں کی قیادت اور کمینوں کی شب باشی نے لشکر کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا اور آلات عیش و طرب نے آرام طلبی میں ڈال کر پیش قدمی سے بھی پیچھے کر دیا ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا اسی سبب سے لشکر میں ثابت قدمی سے روکا شومئی قسمت نے میمنہ سے اور رفتار و تونگری نے میسرہ سے باز رکھا ان کے خوشامدی اور نامحرم ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا دستہ) سے بھی علیحدہ رکھا ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نااہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے اور کمزور پر بھاری بوجھ لاد دیا جاتا ہے وہ رات سو کر اور دن بدمست ہو کر گزارتے جب بیلد

۱؎ مولوی ابو سعید متنفی وغیرہم

۲؎ مرزا مغل و خضر سلطان وغیرہما

وہ ہشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے نوبت بایں جا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر ان پر آکر ٹوٹ پڑا ایک بلند پہاڑی پر چڑھ کر[1] شہر کا رخ کیا شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود ڈالیں پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ باری شروع کر دی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔ ہندوستان کا برسرپیکار اور "باغی لشکر" مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی بعض کی طاقت فقر و فاقے کے سبب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا گیا کچھ تھوڑا سا مال غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہو گئے تھے کچھ لرزاں و لرزاں قلب کے ساتھ بھاگ چھوٹے تھے بعض طغیانیوں اور سرکشی سے بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے بعض نے میدان جہاد کے تنگ و سخت فوجی کپڑے پہن کر صفوف جنگ میں داخل ہونے کو برا جانا صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ کا دھاوا اور یورش

نصاریٰ جب دیتے دیتے تھک گئے اور پست ہو گئے غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے ہندوؤں نے کچھ لشکر اور ساز و سامان حرب سے تھوڑی ہی مدت میں پے در پے مدد کی تب تو نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کر لیے ان کے لشکریوں میں گورے منہ کے گروہ بھی تھے اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی اور بدبخت دہریے کیش بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہو کر اپنے دین کو چند سکوں کے بالعوض بیچ چکے تھے ہزار ہا شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے اور تمام ہندوستان کے ساتھی ہو گئے مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع و قمع کرنے میں مکر و حیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ان کے اندر افتراق و انشقاق پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں دربانوں

---

[1] پہاڑی دھیرج

اور محافظوں پر حملہ کرنے لگے ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے اُن کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لیے اہم ترین فرض قرار دیا دن رات پیدل اور سوار داد شجاعت دینے لگے چار مہینے[2] تک متواتر جنگ ہوتی رہی ۔

دشمن سے زوردار مقابلہ

دشمن اس مدت میں کثیر لاو لشکر اور ساز و سامان کے باوجود شہر میں داخل نہ ہوسکا جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور سے یلغار کو روک رہے تھے مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھاتے تھے مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے ان میں سے بہت سے جام شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے نیکوکاروں کے لیے بہشت حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کرکے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر ہی شہر پناہ کی حفاظت اور شہر کی سرحدات کی نگہداشت کرتی بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کے محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست بزدل اور کسلمند جماعت مقرر کر دی گئی وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سو گئی دشمن نے موقع غنیمت جان کر شبخون مارا اور ہتھیاروں پر قبضہ کرکے اُسے قیامت تک کے لیے سُلا دیا جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کر لیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پر ان کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لیے لگا دیں دن رات گولوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینہ برسانا شروع کر دیا جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے پھاٹک گر پڑا اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے حائل پردہ درمیان

---

[1] مثل نجابت خان روہیلہ اور شاہزادہ فیروز شاہ وغیرہ۔

[2] ۵ مئی ۱۸۵۷ء تا ستمبر ۱۸۵۷ء

سے اٹھ گیا کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا جو جھانک سکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

لشکر نصاریٰ کی چال اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے یہ دیکھ کر مجاہدین اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہوگیا اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہوگیا۔ یہ موقع پاکر نصاریٰ اور ان کا لشکر اسی گرے ہوئے پھاٹک ٹوٹی ہوئی دیوار اور منہدم برج سے داخل شہر ہوگئے وہاں انہیں کوئی مزاحم اور مدافع نہیں ملا بس وہ تلاش کرکے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے ان کے معاون اور مددگار بن چکے تھے انہوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا انہیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔ مکانوں کے دروازے بند کرکے دیواروں میں روزن کر دیئے تاکہ جو باغی ادھر آنکلے اس پر گولی چلا کر مار ڈالتے اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔ وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقع پاکر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں بھی پہنچ کر انہیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں۔ لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے جاتے اس لیے جہاں انہیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے اس کے باوجود انہیں پہاڑی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی اور ہر عیسائی دوست ہندو ان کی مدد میں پیش پیش تھا بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں کوئی جائے پناہ نہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی رہا تھا کیونکہ حاکم (بادشاہ) اپنی اہل و عیال کو لیکر شہر سے تین میل دور مقبرہ[1] میں جا چکا تھا وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا جس نے کذب و بہتان سے کام لے کر دھوکے میں ڈال رکھا تھا اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلا دیا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اسی کو بزرگی اور سرداری بخش دیں گے۔

---

[1] مقبرہ ہمایوں

فریب خوردہ بادشاہ

وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراء و متعلقین بھی اپنے اہل و عیال کو لیکر گھروں میں مال و متاع چھوڑ کر چلے گئے تھے ان سب کے شہر چھوڑ کے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی و رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا مرعوب و متاثر لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا انہوں نے مال و متاع لوٹا باقیماندہ ضعیفوں بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا بہادران شہر دہلی سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔ باغی لشکر ان میں سے بعض تو نصاریٰ[1] کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے بعض کئی بار شہر میں مصروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے اب بلیملی اور دوسرے ہندوؤں جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں نے جو مجاہدوں کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں انہوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات اور قصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا

دشمن کی کارگر تدبیر

یہ تدبیر کارگر ہوئی لشکری اور شہری بھوک پیاس سوزش اور بے چینی سے دن رات گذارنے لگے بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوٹے پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک شہر پناہ قلعہ بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل و عیال[2] موجود تھے اور مجھے بلایا بھی گیا تھا ساتھ ہی فلاح و کامیابی کشائش شادمانی کی امید بھی تھی جو کچھ ہونے والا تھا میں نے دہلی کا رخ کر دیا۔ وہاں پہنچ کر اہل و عیال سے ملا اپنی عقل اور فہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انہوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔ جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکری و شہری باقی نہ رہا غلہ اور پانی دشمنوں کے

---

[1] مرزا الٰہی بخش وغیرہ

[2] مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ

ظلم واستبداد کی وجہ سے ناپید ہوگیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع یعنی
مال واسباب چھوڑ کر (باربرداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل وعیال کو ساتھ
لے کر نکل کھڑا ہوا۔ شہر اور اس کے مال و دولت پر سفید رو لشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر نصاریٰ کی تمام
تر توجہ بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔ ان سب نے اب تک
اپنا مستقر (مقبرہ) نہ چھوڑا تھا تقدیر الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا انہیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی
کذب بیانی پر اعتماد تھا وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے

فریب خوردہ بادشاہ

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ دل پلیدہ بیٹوں اور
پوتوں کے ساتھ پابزنجیر شہر کی طرف لے جایا گیا راستہ میں بیٹوں اور
پوتوں کو کسی سردار[1] نے بندوق کا نشانہ بنا دیا دھڑ وہیں پھینک کر سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے
تحفۃً پیش کیا پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا بادشاہ کو گورے منہ سیاہ دل گندی بال اور کنجی آنکھ
والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھڑی میں مقید کر دیا پھر اس وسیع ملک سے
نکال کر دور دراز جزیرہ[2] میں پہنچا دیا بادشاہ کے ساتھ اس بیگم کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت
بھی مطیع و دوست تھی جبکہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی وہ اپنی آرزو (بیٹے کو جانشین بنانے) میں ناکام رہی
اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا وہ زینت۔ بجنے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدحیثیت بن
بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں
کے ساتھ بھی عمل کیا گیا ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظریں بچا کر شہر
سے بھاگ گیا اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور
سرداروں کو قتل کر کے ان کی جائداد غصب کی مویشی مال و متاع ہاتھی گھوڑے اونٹ اور ہتھیار وغیرہ کو لوٹنا
شروع کیا اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل وعیال کو بھی قتل کر ڈالا حالانکہ یہ سب رعایا ان جیسے تھے دریا الرق

---

[1] مترجم کہتا ہے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہ تھا جن کو ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا تھا۔
[2] رنگون

سے فرمانبردار بن ہی جاتے انہوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھا دیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے سے ہی بچ پاتے باقی سب پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے پھر چادر تہبند قمیص پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے وہ ان کے لیے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے جوان بوڑھا شریف اور ذلیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔

ہندوؤں کے ساتھ رعایت و مروّت

ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا خدشہ تھا اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے انہیں میں سے بادشاہ کا وہ عام شعبی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا اس کا حال متغیر ہو گیا زمانہ میں ذلیل و خوار ہو کر جیا دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے اُدھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو روسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گذرے اُسے پکڑ لیا جائے ان بدا طواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا نہ کوئی عالی خاندان کا فرد بچ سکا اور نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا پھر اطراف و اکناف ملک میں لشکر بھیجے جنہوں نے قتل و غارتگری کی انتہا کر دی اس ابتلاء عظیم میں پردہ نشین خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں جو تھک کر عاجز ہو گئیں بہت سی خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں۔

مشرقی شہروں اور دیہاتوں پر انگریزی دھاوا

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول

لہ حکیم احسن اللہ خان۔

ہوتی وہاں بھی بڑا فساد مچا یا قتل غارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا بے شمار مرد اور پردہ نشین مستورات موت کے گھاٹ اتر گئے اور سینکڑوں ہزاروں رعایا کے آدمی مارڈالے گئے میرا کیا پوچھنا میں اپنے وطن مالوف (خیر آباد) کی طرف چلا جا رہا تھا راستہ خوفناک اور ڈگ ڈگ اندوہناک تھا میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف و خطرہ سے بھری ہوئی منزلیں تھیں نصاریٰ اور ان کا لشکر دن رات تلاش و تجسّس میں سرگرداں رہتا جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی انہوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے بلکہ خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے ملاحوں کو روک دیا تھا کہ کوئی سپاہی یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے تھا

مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت و ہلاکت سے محفوظ رکھ کر پل اور کشتی کی مدد کے بغیر دریاؤں اور نہروں کو عبور کرا کے نجات دی اور ہم سب کو آفات سانحات مہالک سالک حوادث راہ اور مصائب گذرگاہ سے محفوظ و مامون رکھا اور اپنی پوری حفاظت کامل حمایت شمول نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ہمیں اپنے جوار و دیار اور احباب و رشتہ دار تک پہنچا یا ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجالاتے ہیں۔

داستان لکھنؤ نصاریٰ کے باغی گروہ اور ہمارے نواح کے متقدد لوگوں نے اپنے سابق والی[1] کی ایک بیگم[2] اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ لڑکے[3] کو امیر و حاکم بنا دیا لارڈ نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا وہ بڑا واہی وباہی تھا عیش طرب میں منہمک انتظام ملکی سے غافل عقل و خرد سے بیگانہ اور نفس عبد و شیطان میں یگانہ تھا نصاریٰ کی عملداری مستحکم ہونے پر وہ ملک بدر کر دیا گیا اس کا لڑکا چھوٹا ناتجربہ کار نازپروردہ ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا اور لاپروا تھا رند بیراموز ممکن

---

[1] واجد علی اختر۔ بادشاہ اودھ

[2] حضرت محل۔ ملکہ واجد علی شاہ

[3] برجیس قدر۔ واجد علی شاہ کا کمسن لڑکا۔

اجراء احکام اور قیادت فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اُس کے اعیانِ سلطنت اور ارکان دولت سب کے سب نااہل سست بزدل احمق خائن۔اور غیر دیانتدار تھے اکثر ذلیل اور بعض بندگان زر تھے ان میں سفیہ عیش پرست نادان بلند آواز سست منافق چرب زبان ذلیل غلام زادہ حیران و پریشان ظالم و جابر حیلہ ساز و متکبر خائن و مکار بندہ زر عیب جو سبھی قسم کے لوگ تھے بعض ایسے بھاگنے والے مدبر تھے کہ ان کی تدبیر تباہی و بربادی وادیار کی طرف لے جاتی تھی۔ اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب عجیب مناظر دکھاتی تھی ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون و مددگار اور محب وفا شعار تھے اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے نصاریٰ[1] اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ شہر[2] تک محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں[3] میں محفوظ تھے۔

نصاریٰ کی جنگی تدبیریں

نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی مقابل لشکر ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا جو کچھ کہتا وہ کر نہ پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لیے سفید رو گروہ آگیا شہر میں داخل ہونے لگا۔ تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا بہت سے گورے مارے گئے باقیماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا اور قوت و بہادری سے اُسی کو اپنا گڑھ بنا لیا وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان جمع کر لیا وہ لشکر جو پہلے ہی سے شہر میں موجود تھے اور وہ جو دہلی سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آ گئے تھے جن کو ملکہ نے قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے

---

[1] ممو خان وغیرہ

[2] لکھنؤ۔

[3] بیلی گارد۔ انگریزوں کا سب سے محفوظ اور مضبوط قلعہ

[4] جنرل بخت خان و شہزادہ فیروز شاہ وغیرہ۔

نا دادا ماتا اور تنخواہ دار سپاہیوں کا وہ جم غفیر جو حرب و ضرب سے نابلد اسلحہ بندی سے ناواقف اور مسلمت و معرکہ سے ناآشنا تھا یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جا ڈٹے دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقابلہ اور مقاتلہ اور نیزہ بازی اور تیر اندازی ہوتی رہی ۔

انگریزوں نے نیپال سے مدد مانگی

تنگ آ کر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی اس نے اس کی آواز کے مطابق ۳۰ ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی اب تو نصاریٰ ان کی گوری فوجوں کرایہ کے سپاہیوں اور لالچی معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا یہ حملے بڑے سخت متواتر اور مسلسل تھے جنہوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلا دیا اور اُن کے پاؤں اکھیڑ دیئے اور کمین گاہوں سے ایسی بُری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت اور اعیان سلطنت نے دغا کی اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ سے ان کی مدد کی اعانت عزت و آبرو مال و دولت کیلئے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے نصاریٰ کی موافقت و رفاقت کرنے لگے نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہو گئے شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لیکر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پہنچ گئی بیمن دان شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کس عورت سے اس نازک موقعہ پر دستگیری کو تیار نہ ہوا نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر میں کہیں جاتے پناہ بی رہی ۔

چٹیل میدان بے آب و گیاہ جنگل

آخر کار بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہو کر ولیعہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر چٹیل میدان ، در بے

لے مہاراجہ نیپال ۔ قوم کا دشمن ، انگریزوں کا خیرخواہ

آب و گیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی اب اس کے گرد کمزور سواروں کی کچھ جماعتیں پیدل مردوں کا انبوہ کثیر شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد اکٹھی جمع ہو گئی وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے حالانکہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالانکہ گرامی قدر پردہ نشیں اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں وہ سرسبز و شاداب خطوں سے چٹیل میدانوں کی طرف پھینک دی گئیں وہ پیوندوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اسی پر اکتفا کرتیں ایک میدان سے دوسرے میدان میں پہنچیں۔ بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پرخطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات پائے گاہیں اور ریاستیں چھوڑنا پڑیں حالانکہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتی تھیں۔

عام ہلاکت اور بربادی

یہاں تک کہ حال متغیر و بال نازل اور ہلاکت عام ہو گئی پر ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان آزادوں کو غلام مالداروں کو فقیر و مسکین اور شریفوں کو خوار و ذلیل بنا دیا جو اپنے اہل و عیال میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے خوش حال اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا فقیری و تنگدستی نے ہمنشینوں کی مجالست اور اضطراب و اضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا رونے والے آہ درازی نیاز فریاد و شیون کرتے آرزو مند چلاتے اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیئے گئے تھے بوڑھے لوگ جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے نہ ان کا کوئی ٹھکانا تھا نہ بیماری کی دوا تھی ان کے دل خالی تھے ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انہیں کوئی بات بھاتی تھی زندگی اور موت ان کے لیے دونوں برابر تھے وہ مسرت شادمانی تخت شاہی دیباج و حریر میوے خوش طبعی عیش و عشرت لطافت و نزاہت و نعمت نغمہ و سرور مال و دولت یکرنگی و مروت میں پلے تھے آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں سامان و زاد راہ کا پتہ نہیں کپڑے بوسیدہ ہیں عیش و راحت میں کوئی حصہ نہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

ملکہ حضرت محل کی سرگذشت

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ

میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو یکہ ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جس سے بغیر کشتی کے عبور مشکل دشوار تھا وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہو گیا اور دریاؤں کے گھاٹوں پر سوار پیادے بٹھا دیے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیں اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لیے شہروں اور قصبات اور دیہات میں عامل بھیج دیتے لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے اس دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا بھیجدیا تاکہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ و مقاتلہ مزاحمت و مجادلہ کیا جاتے لیکن یہ تمام امور مہمہ اور ان کا اہتمام و انصرام ایسے ذلیل غافل اور متحیر[1] عامل کو سونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا وہ صحیح مشورہ سے گریزاں اور جہل سے ہمکنار تھا آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا وہ ذلیل احمق اور بزدل تھا اس نے مکالمت اور مشاورت مجالست اور منادمت کے لیے احمق جاہل اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا وہ نخوت و غرور کی بناء پر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب و حاکم بنایا چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین ذلیل بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنایا وہ بڑے ہی لالچی تھے، جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی کھا جاتے ۔

بددیانت کینہ پرور خائن وہ بددیانت تھے اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے کسی وقت بھی ان کو راحت و سکون میسر نہ تھا بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت و حاجت کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں ۔ نصاریٰ دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے اطراف و جوانب کی طرف نہ نکلے انہوں

---

[1] نواب احمد علی خان عرف ممو خان ۔

نے گردو نواح کے کاذوں دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیف قلب شروع کر دی ان کی خطاؤں کو درگذر ان کے خراج میں تخفیف اور تاوان میں کمی کی اس مہربانی پر وہ مطیع و فرمانبردار اور معاون مددگار بن گئے ادھر سے مطمئن ہو کر اطراف ملک میں شہر و دیہات و قبضہ کرنے کے لیے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔

بارہ بنکی پر نصاریٰ کا ہجوم جب نصاریٰ اس مرشدؒ کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا اور جس میں سوار پیادے اور وہ رذیل و ذلیل نادر عظیم بھی تھا تو وہ کمین قائدان کے آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا بہادر مجاہدوں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر مکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی یہ تین سو سے زیادہ نہ تھے دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے وہ فرار کی عار برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے بھی انہیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کے لیے موجود تھا خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنا لیا وہیں فوج جمع کر لی اور مدت تک وہیں مقیم رہے وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے وہ سرداران لشکر کی امیدوں کی تکمیل اور ان خائنوں کے ایفائے عہد کے منتظر تھے اس لیے اپنے ایفاء وعدہ میں بھی تاخیر کر رہے تھے ادھر سے فارغ ہو کر مغلوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے عام باشندے ان کے مطیع ہو چکے تھے اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے وہاں بھی ملک کی طرف سے نا عاقبت اندیش غیر مدبر نا تجربہ کار اور ذلیل عامل تھے وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کیے بغیر بری طرح بھاگا سرنگ میں ہو کر راستہ بنایا اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہادیوں نے معاہدہ و قسم کے باوجود وقت بد دغا کی غدر و مکر کی انتہا کر دی ناز و نعمت اور پر عیش و مسرت زندگی کا کفران کیا۔

مولانا احمد اللہ مجاہد کا ذکر معاہدوں سے انکار کر کے کفر میں اضافہ اور انکار میں زیادتی کر لی اس موقع پر ستم نصاریٰ سے قتال کے لیے دوسری طرف کا ایک

لہ نواب گنج ضلع بارہ بنکی - اودھ کا مشہور شہر۔

عاملؔ[1] اٹھ کھڑا ہوا اس نے خیرات و مبرات سعادات وحسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کر لیا تھا وہ بڑا ہی پاک طینت صاف باطن متقی پرہیزگار بہادر اور رسول ملاحم اور نبی مراحم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمنام تھا۔ اس لیے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی اپنی ساری کوشش ختم کر کے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط اور محفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور سالار کے پاس شہر میں پیغام بھیجکر مدد مانگی انھوں نے ایک لشکر اور منافقین و دہاتین کا جم غفیر جنہوں نے عہد شکنی کی تھی ان محصورین کی مدد کو بھیج دیا ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی غدار زمیندار[2] نے بڑا داؤ کھیلا اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابل پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر بھروسہ کر کے اس دیانتدار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے تو بندوقوں اور توپوں سے چہروں اور سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں اور پیچھے سے اس غدار مکار زمیندار کی جماعت نے پشت اور سر کو پھوڑنا شروع کیا وہ دراصل النصاریٰ کے انصار و اعوان اور شیاطین کے اتباع و اخوان تھے وہ خدا پرست عامل معرکہ میں گر کر شہید ہوا اور اس کی ساری جماعت نے بھی اس کے نقش قدم پر چل کر جام شہادت نوش کیا ان سب ابرار و اخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطرار سے پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھا۔

نصاریٰ کا تعاقب اور قتل و غارت

نصاریٰ نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالا تھوڑے سے وہ بچ رہے جنھوں نے بھاگنے میں تیزی اور عجلت سے کام لیا اس لڑائی کے بعد سارے شہر کے دہقانی ناہنجار کمینے اور ہندو وغیرہم سب مطیع و فرمانبردار بن گئے البتہ دو بہادر غیرتمند اور خاندانی جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا اپنی

---

[1] شاہ احمد اللہ مدراسی جن کی بہادری کا انگریز بھی اعتراف کرتے ہیں ۔

[2] بعدلو سنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہانپور ـــ

بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلت اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار پیادے ٹھکانے لگا دیتے آخرکار مجبور ہو کر اپنی بہادری سے جان بچا کر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کر سکا اب وہ فاتح بھی صاف ہو گیا ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہو گیا یہ واقعہ رنجدہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اور اس جنگ کا خاتمہ تھا نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے اور جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم و فکر میں مبتلا ہو جاتے اور لڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے ان تمام محنتوں کے بعد بھی ملکہ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی اس مکر کی وجہ سے انہیں بڑی قوت و طاقت حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کا فرمان عام

اس نے تمام دیہات شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکمنامے جاری کیے جن میں عام معافی کا اعلان کیا کہ تمام "باغی" لشکر اور سرکش و نافرمان لشکریوں کو ان لوگوں کو چھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنہوں نے عورتوں بچوں اور ان نصاریٰ کو جنہوں نے مجبور ہو کر پناہ لی تھی ظلم و عداوت سے قتل کر ڈالا یا وہ جنہوں نے سلطنت و ریاست قائم کی یا وہ جنہوں نے سرکشی و عدوان پر لوگوں کو ابھارا ادھر وہ "باغی لشکر" اور دوسرے بیگم کے ساتھی روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ و ضروریات زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہو چکے تھے نصاریٰ کے مسلط ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا زمین کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی وہ بڑی سخت مصیبت و تنگی میں پڑ گئے تھے وہ سب تنگدست اور عیش و راحت دور تھے ان کے دل اہل و عیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے ایسے حالات میں مجبور و مضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے ان کے پاس ہتھیار گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا اور پروانہ امان دے دیا گیا اب وہ اہلِ وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے پھر نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد بچے کھچے تھوڑے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑیوں[1] کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

---

[1] سرحد نیپال

ان سب کو گرفتار کرلیا بدعہدی سارے مذاہب میں مذموم و ممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا یہ بدبخت نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز و منتقم کے غضب سے بھی نہ ڈرا۔

قتل، قید، جلاوطنی نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا اکثر شہ فارکو قتل اور باقی کو قید جلاوطنی اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے ابعرو العام کا مستحق بن گیا یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی اب میرا ماجرا سنیئے مکر و تلبیس سے نصاریٰ نے مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کر دیا مصیبت پر مصیبت غم پر غم پہنچایا میرا جبہ اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنائیے نرم اور بہتر بستر چھین کر خواب سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا گویا کانٹے بچھا دیے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا پیالہ اور کوئی برتن نہ چھوڑا بخل سے ماش کی دال کھلاتی اور گرم پانی پلایا صاحبان خلوص کی آب محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی و کبرسنی کے باوجود ذلت و رسوائی سے ہر وقت سامنا رہا پھر ترشد و دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنھیں دریائے شور کی لہریں ڈھانپ لیتی تھیں اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی لعنت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں تھا اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا اس کی زمین آبلہ دار اس کے سنگریزے بدن کی چھنیلا اور اس کی ہوا ذلت خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی ہر کوٹھری پر پتھر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔

دریائے شور کا حال میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں ہوا بدبودار اور مرض کا مخزن تھی مرض سستا اور دوا گراں بیماریاں بے شمار خارش و قوباد زدہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے، عام تھی بیمار کے علاج تندرست کے لئے صحت

اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی معالج مرض میں اضافہ کرنے والا معالج ہلاک ہونے والا طبیب تکلیف درنج بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ کوئی غم خواہی ہی کی جاتی نہ اُس پر رنج و افسوس کا ہی اظہار ہوتا دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے بخار موت کا پیغام مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تامہ ہے بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام و نشان نہیں۔ نصرانی ماہر طبیب مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے رگ کو قبر اس کے اوپر بناتا ہے مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا ہے جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل و کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریت کے تودے میں دبا دیتا ہے نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے یہ کیسی عبرتناک اور اندوہ انگیز کہانی ہے۔

موت کی آرزو، خودکشی کی حسرت

یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی اور اچانک موت سب سے زیادہ قابل رشک نعمت ہوتی اور اگر مسلمان کو خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب و عتاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مصیبت و مجبوری اور تکلیف و اذیت نہ دیکھ سکتا اور مصیبت سے نجات پا لینا بڑا آسان ہوتا یہ ناقابل برداشت حالات تھے کہ میں متعدد امراض میں مبتلا ہوگیا جس کی وجہ سے میرے جسم کا سب سے مضبوط حصہ سینہ تھا وہ ٹوٹا چاند و عشق ... عزت ذلت سے بدل گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار و سخت رنج و غم سے کیونکر چھٹکارا ہوسکے گا۔ خارش و تو بار میں ابتلا اس پر مستزاد ہے صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے روح کو مضمحل کردینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں نمناک ہوتا رہتا ہے۔

ہر حالت میں خدا کا شکر

وہ وقت دور نہیں جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچا دیں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی اب مجبوراً قریب ہلاکت ہوں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب خسرو خلائق

غنی اور صحیح و سالم تھا اب اپاہج اور زخمی ہوں بڑی سخت مصیبت میں اور بلبیوں مصیبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں
ٹوٹی ہوئی ہڈی کی طرح لکڑی اور ہڈی کا بوجھ اٹھاتا ہے اس طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے
ہیں۔ ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل و کرم سے شکر گزار ہوں کیونکہ اپنی آنکھوں سے دوسرے
قیدیوں کو بیمار ہوتے بھی بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں انہیں لوہے
کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے محنت و نفرت کینہ و عداوت
کا پورا مظاہرہ کرتا ہے تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے اور پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے خدا کا
شکر ہے کہ اس نے ان آفات و تکالیف سے محفوظ رکھا۔ میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور
میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں میرے دوست میرے مرض کے امداد سے لاچار ہیں دشمنوں کے
دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقاید کی طرح راسخ ہو گیا ہے ان کے پلید سینے کینہ و عداوت
کے دفینے بن گئے ہیں۔

امیدوں کا انقطاع نجات سے مایوسی

اُن ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں لیکن
اپنے رب عزیز و رحیم رؤف و کریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں
کو نجات دلاتا ہے اور وہی تو زخمی مظلوموں کے زخموں کو اپنے رحم و کرم کے مرہم سے بھرتا ہے وہ
ہر سرکش کے لیے جبار و قہار ہے ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا ہر نقصان رسیدہ فقیر کا کامیاب
بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے اسی نے نوح علیہ السلام کو غرق اور ابراہیم علیہ السلام کو طپش
و حرق ایوب علیہ السلام کو مرض و مصائب یونس علیہ السلام کو شکم ماہی اور بنی اسرائیل کو بربادی و تباہی سے
نجات دی اسی نے موسیٰ و ہارون علیہ السلام کو ہامان و فرعون و قارون اور عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو مکر ماکرین
اور اپنے حبیب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دجل و فریب کفار پر غالب کیا پھر اگر مجھے مشقتوں مصیبتوں
اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں وہی میرا رب شافی
و کافی اور خطا پوش و آمرزگار ہے۔ بہت بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں۔

شفا پاتے ہیں بہت خطاکار جب اقرار واستغفار کرتے ہیں مقبول بارگاہ ہوئے ہیں بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں مصیبت سے نجات پاتے ہیں بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں مراد کو پہنچتے ہیں بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں خلاق مطلق انہیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ واحسان چھٹکارا دلاتا ہے۔

مظلوم و دل شکستہ کی پکار

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور بیکس و ذلیل و محتاج بنکر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں اس کے حبیب کو وسیلہ بناکر اور امیدوار رحمت ہوکر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں وہ وعدہ خلاف نہیں اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابت دعوت اور کشف مصیبت کا وعدہ کیا ہے۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا وہی امراض سے شفا بخشے گا وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا وہی میرے گریہ و بکا پر رحم کرے گا وہی میری بدبختی و شامت کو مٹائے گا وہ دعا کا سننے والا ہے بہت دینے والا اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے اسی سے جلاوطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں اے میرے رب مصیبتوں سے مجھے نجات دے اے امیدواروں کے امیدگاہ اور اے التجا کرنیوالوں کے پناہ گاہ۔ اپنے حبیب اور اس کی آل طاہرین و مبارکین اور اس کے صحابہ حافظین دین کے صدقے میں جلدی سن لے! اے ارحم الرحمین اور اکرم الاکرمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے بیشک ساری تعریفیں سارے جہان کے پالنے والے کے لیے ہیں۔ یہ پُر درد دلم گیر مناجات ختم ہوئی۔

قصائد غدریہ کا ذکر

میں نے اپنی مصیبت و پریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی کہا ہے ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے اور دوسرا دالیہ ہے جس میں اس غمگین و معذور کی طلب و رنج کا تذکرہ ہے ان دونوں قصیدوں کو سرور کائنات علیہ السلام والصلوٰۃ کی مدح پر ختم کیا ہے ان دونوں سے پہلے نون کے قافیہ میں بھی قصیدہ لکھا تھا جو در یتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے اس کا ہر شعر ضبط و مرتفع لفظ پر ختم ہے اس کے اتمام کی نوبت نہیں آئی مصائب آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا اس کا مطلع یہ ہے۔

ماناح اورق فی اوراق اشجان

الاّ ھیجّ اشجانی و اشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کرکے ختم کروں گا، جسے مکارم اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ وسلام

واللہ سبحانہ ولی التوفیق والاکرام ۵ ۔

(باب ۳۷)

غدر کے دن، غدر کی راتیں

غدر میں ہندوستانیوں کو جو مصائب برداشت کرنا پڑے، وہ ایک المیہ بھی ہے۔ لیکن انگریز قوم کے گناہوں کی سزا، انگریز افراد کو بھی بھگتنی پڑی۔ اور یہ بھی کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ انگریزوں کے جرائم سب اپنی جگہ پر بجا اور درست تھے، لیکن انگریزوں پر جو ظلم توڑے گئے ان کے لیے کوئی وجہ جواز نہ تھی۔ لیکن جب انسان جذبات کے سمندر میں بہتا ہے، تو وہ ہوش میں نہیں رہتا۔ ۱۹۴۷ء کے خونیں حادثات میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کی اور مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی گردنیں کاٹنے میں تامل نہیں کیا۔

اگلے صفحات میں آپ ایک انگریز عورت کی داستان درد پڑھیں گے۔ یہ داستان اس نے خون جگر سے لکھی ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اس نے اپنے ہم قوموں اور اپنے وفادار شوہر کو، اپنے محبوب کو، اپنی نوجوان لڑکی کو، اپنے چھوٹے خورد سال بچہ کو قتل ہوتے، ہلاک ہوتے دیکھا اور خود شاید اس لیے زندہ بچ گئی کہ مرنے سے پہلے یہ خونیں داستان قلمبند کر جائے۔

اس داستان کو پڑھئے۔ اس میں جگہ جگہ رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات ملیں گے۔ لیکن ساتھ ہی ایسے واقعات بھی ملیں گے، جو انسانیت کے لیے باعث شرف ہیں۔ کاش اس طرح کے دو چار واقعات انگریزوں کی تاریخ میں بھی مل جاتے تو شاید ہندوؤں اور مسلمانوں کی کچھ اشک شوئی ہو جاتی۔

میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

ناظرین! میرا مولد انگلستان نہیں ہے۔ میں ایک فرانسیسی خاتون ہوں۔ لیکن میرا شوہر چونکہ انگریز ہے۔ اور اس سے میرے دو بچے بھی پیدا ہو چکے ہیں، اس لیے میں انگلش لیڈی مانی جاتی ہوں۔

کاش تمام انگریزی جھنڈے ہندوستان سرنگوں ہوتے کاش دنیا کی تمام انگریزی فوجیں فنا ہوجائیں، اس سلطنت کی تمام ثروت و قوت ضعف ذلت سے بدل جاتی مگر میرے شوہر اور اولاد کی جان سلامت رہتی۔ اور میں بدبخت اس روز بد کا منہ نہ دیکھتی یہ میری مجنونانہ بڑ نہیں یہ ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے یہ زخمی جگر کی آہ ہے۔ یہ ایک فلک کی ستائی آفت کی ماری، سوختہ دل۔ سوختہ جگر کی آہ اور نالے ہیں۔ جو قیامت تک سننے والوں کے دل ہلا ہیں گے۔ دنیا کی عورتیں جب میری اس دردناک سرگذشت کو سن کر میری پرحسرت و اندوہ زندگی کا تصور کریں گی تو یقیناً دنیا اور لذات دنیا سے ان کا دل کھٹا ہو جائے گا، پیاری بہنو! مہربان دوستو! یہاں کا عیش۔ یہاں کی لذت۔ یہاں کی عزت، یہاں کی حکومت محض ایک دھوکا ہے۔ فقط ایک شعبدہ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں جس کے لیے کسی قسم کا ثبات و قرار نہیں +

آغاز داستان ہمارا مکان شہر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ ولیم[1] کا قاعدہ تھا کہ ہر روز رات کو دہلی سے ہمارے گھر آتا اور اس فتنہ و فساد کی بابت ہر طرح سے اطمینان کرجاتا۔ جب اس کے سامنے کوئی ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کا قصہ چھیڑتا تو وہ ہندوستانیوں کی بزدلی کا خوب مذاق اڑاتا وہ کہتا۔ میں ان کی بہادری سے خوب واقف ہوں۔ خدا کی قسم ہمارے چار گورے ان کے چار رسالوں کے واسطے کافی ہیں جیسے بکریوں کے ایک بڑے گلّے کے لیے ایک چرواہا۔

ولیم کی ان باتوں سے ہمارے دل کی بڑی ڈھارس ہو جاتی تھی۔

ہندوستانی کتّا ٹھیک اسی روز جبکہ دلال ہماری کاشت کا معاملہ کرنے آیا تھا، میں اور میرا شوہر ایلن ولیم اور رویل[2] (میرا تین سال کا لڑکا) شام کے وقت دریائے جمنا کے کنارے اپنے کھنڈروں کے قریب ٹہل رہے تھے، اور یہ ذکر کرتے جا رہے تھے، کہ انگاگان کا ایک بڑا پادری

---

[1] مصنّفہ کا داماد

[2] مصنّفہ کا لڑکی

چاہتا ہے کہ ہندوستانیوں کو دینِ مسیحی میں داخل کرے۔ جو لوگ خوشی سے اس کا دین قبول نہیں کرتے
ان سے سختی کے ساتھ پیش آتا ہے اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم چاروں میں سے
ہر شخص اپنا اپنا خیال اس کی بابت ظاہر کر رہا تھا۔ ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں ایک طرف جنگل کی
وجہ سے اور دوسری سمت جمنا کے باعث راستہ تنگ تھا اور ایک خم ہو کر آگے کو جاتا تھا۔ موڑ کے
قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایک فقیر لنگوٹ باندھے رستے کے درمیان اس طرح پڑا ہوا ہے کہ آنے
جانے والوں کی راہ بند ہے۔ ولیم جو ہمارے آگے دوڑتا تھا۔ وہ اس عجیب ہیئت مخلوق کو راہ میں پڑا
دیکھ کر جھجکنے لگا اور جلدی سے آکر مجھ سے لپٹ گیا۔ ولیم جو ایلن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہم سے چند قدم
آگے جا رہا تھا۔ ولیم کی اس وحشت کو دیکھ کر گھبرایا اور اس فقیر کے پاس جا کر نہایت سخت لہجہ میں
بولا "اٹھو راستہ چھوڑو"۔ فقیر نے ان الفاظ پر ذرا بھی توجہ نہ کی اور جس طرح پڑا تھا پڑا رہا۔ [illegible] ہم لوگوں
کو یہ بے اعتنائی سخت ناگوار ہوئی۔ مگر ان چاروں گوروں کو جو اس کے ساتھ ہو رہے تھے حکم دیا کہ
لنگے کو زمین سے اٹھا کر دریا میں ڈال دو!

لرزہ خیز منظر

غدر شروع ہوئی۔ بعد اس کتاب کے لکھنے والی [illegible] کے [illegible]
بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ اپنا ایک مشاہدہ بیان کرتی ہے ——

"جہاں ہم پوشیدہ تھے وہاں سے ایک راستہ نظر آتا تھا۔ [illegible] سے
[illegible] کے ساتھ کچھ باتوں کی آواز آئی۔ وہ چار منچوں کے قریب [illegible]
نیچے سے کچھ روشنی سی نمودار ہوئی۔ [illegible] چند [illegible] ہندوستانیوں [illegible]
دیکھے جو اوپر نیچے در پے ہمارے مکانوں میں [illegible] آ رہی تھی [illegible]
شکل سے وہ تین منٹ گزرے ہوں گے [illegible] ایک مرد بال [illegible] گوشت [illegible]
لیے ہوئے نکلے [illegible] کے پاس [illegible]
لے گئے۔ وہ بیچارے [illegible] کے [illegible] تھے [illegible]
گئے۔ [illegible] کو آگ میں پھونک دیں [illegible] آگ [illegible] اور

گرداگرد تلواریں اور خنجر کھینچ کر کھڑے ہو گئے جب وہ بے چارہ شعلوں سے بچ کر بھاگنا چاہتا تھا خنجر کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں سے چرکے دے دے کر پیچھے کو لوٹا دیتے تھے۔ وہ بھی ایسا غیرت مند نوجوان تھا کہ دو تین بار سر توڑ رہائی کی کوشش کی۔ پھر خاموش ہو رہا اور دشمنوں سے کسی قسم کی التجا نہ کی۔ البتہ ہاتھ اٹھا کر اس جانکنی کے عالم میں کچھ خدا سے دعا مانگی اور جھلس کر رہ گیا۔

میں نے اس وقت اپنے منہ میں رومال بھر لیا کہ مبادا اس جانکاہ منظر کا مشاہدہ شدت دہشت سے فریاد بلند کرا دے اور وہ بے رحم ہم پر ٹوٹ پڑیں اور اس طرح آگ کا ایندھن بنا دیں۔

معصوم بچہ ان میں ایک چار سالہ لڑکا تھا جس کا جسم زخموں سے محفوظ تھا۔ جوں ہی اس نے ہم کو آتے دیکھا۔ بھاگ کر کشتوں کے درمیان چھپ گیا۔ ایلن نے اس کو انگریزی زبان میں تسلی و تشفی دی تو ہم کو ہم وطن سمجھ کر کشتوں کے درمیان سے نکلا اور ایلن کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کو پیار سے چومنے اور عاجزانہ حرکتیں کرنے لگا۔

وفادار فیل بان مکان کے صحن سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز ہمارے کان میں آئی ہم نے سمجھ لیا کہ ہمارا فیل بان آ پہنچا۔ چونکہ اس انقلاب و شورش میں ہم انگریز ان ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے بہت ذلیل و خوار ہوئے تھے۔ اس لیے یہ امید نہ تھی کہ ہمارا فیلبان وفاداری سے پیش آئے گا۔ ہاتھی کی آواز سنتے ہی ہم فوراً باہر نکل آئے۔ اور فیل بان سے مل کر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا۔ اس مرد باوفا نے بھی اپنی خوشی کا ثبوت دیا اس شخص کا نام محمدؐ تھا۔ یہ ایک عرصہ سے ہمارے یہاں ملازم تھا۔ حق پوشی ہو گی اگر ہم اس بات کا اقرار نہ کریں کہ اس خاص موقعہ پر اس نے بڑی جوانمردی اور انسانیت سے کام لیا۔

میں۔ محمدؐ۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ ہم کو یہیں رہنا چاہیئے کہ دوسرا مقام تلاش کریں؟

محمدؐ۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ اس وقت ظلمت شب کو غنیمت سمجھ کر یہاں سے نکل چلو۔

میں۔ تمہارا خیال درست ہے لیکن جائیں کہاں۔ اگر ہم اپنے ہم وطنوں کے گھر جاتے ہیں

تو خود اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ اور اگر یہیں رہتے ہیں تو صبح ہونے والی ہے۔ یہ گھر مسلمانوں کی مسجد کے بالکل قریب ہے۔ یہاں کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے۔ ہندوستانیوں میں ہمارا کوئی ایسا خیرخواہ نہیں کہ دو چار روز اپنے گھر میں پناہ دے۔

محمد۔ آپ لوگ زیادہ پریشان نہ ہوں میں اپنے ہم مذہب ایک نیک اندیش مسلمان کے یہاں لے چلتا ہوں اور تو کوئی ڈر نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ چونکہ وہ ایک راسخ الاعتقاد مسلمان ہے۔ بہت ممکن ہے کہ دوسرے مسلمانوں کی تقلید میں پناہ دینے سے انکار کرے۔ اس کی بہتر صورت میرے ذہن میں یہ آتی ہے کہ تم لوگ اس طریقہ سے اس کے مکان میں داخل ہو جاؤ کہ اسے اطلاع نہ ہو۔ پھر تمہارے لیے وہ ایک محکم قلعہ ہو جائے گا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص ان کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے آ جاتا ہے۔ خواہ طلب خواہ بے طلب۔ وہ اپنے مذہب کے حکم کے مطابق اس کی دلجوئی اور عیش رسانی شرط ایمان سے جانتے ہیں۔ خاص کر ان مہمانوں کو جو پناہ کے طالب ہوں۔ خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں۔ وہ ان کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتے اور مظلوم کی دستگیری فرض دینی خیال کرتے ہیں۔ اگر ان کی حمایت میں جان بھی کام آ جائے تو دریغ نہیں کرتے۔

مِن۔ محمد۔ اگر یہ بات ہے تو کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچاؤ۔ کیا وہ اس وقت گھر ہوگا؟

محمد۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت یقیناً تمام مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے قتل کرنے پر مشغول ہوگا۔ اگر اس وقت وہاں پہنچ گئے۔ تو اس کی غیبت میں سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنہ نہ معلوم وہ اجازت دے یا نہ دے۔

ہائے میرا بچہ! کسی شخص کے دل کو کیسے گزار ہو گئی ـــــــ خدا محمد کا بھلا کرے اس نے مزید اطمینان کے لیے راستہ میں ہم سے پھر کہا کہ اگر شہر دہلی تمام دنیا کے برابر وسیع ہو جائے تب بھی وہیں اس دایہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ ہم نے دل میں اس کو سینکڑوں دعائیں دیں اور زبان سے بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔

پناہ گاہ

آخر چلتے چلتے :—— محمدؐ ایک بڑے مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا ایک منٹ سے زیادہ نہ گذرا تھا کہ دروازہ کھل گیا فیل بان اور صاحب خانہ سے کئی منٹ تک گفتگو ہوتی رہی ؛

ہم کو اس گفتگو کے سننے کا جس قدر اشتیاق ہوتا وہ کم تھا - کیونکہ ہماری موت و حیات اس گھر سے وابستہ تھی - یہ گفتگو پانچ منٹ سے زیادہ نہ رہی ہوگی - چونکہ ہم امید و بیم کی حالت میں تھے - اس لیے ہم کو یہ پانچ منٹ پانچ سال کے برابر طولانی معلوم ہوتے - خدا خدا کر کے بات چیت تمام ہوئی - فیل بان نے اپنی آواز پر ہاتھی کو بلایا - اور ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل دیئے - جب اس مکان کے قریب پہنچے دروازہ کھلا ہوا پایا - فیل بان نے ہم کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر لیا —— ایک بڑے کشادہ باغ سے گذرتے ہوئے - ہم ایک عالیشان عمارت میں پہنچ گئے - جو چیزیں ہاتھی پر تھیں - محمدؐ نے ان سب کو اتار کر ایک کمرہ میں رکھا - اور ہم سے کہا اب اطمینان سے رہو اب کوئی کھٹکا نہیں -

دہلی کی یاد

اس کمرہ کے درمیان ایک لیمپ روشن تھا - اور بہت سی چار پائیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں - ہم نے چار پائیوں پر چاہا کہ تھوڑی دیر لیٹ کر سو رہیں تاکہ کچھ دیر تو رنج و غم سے نجات ملے - مگر مجھے گمان ہے کہ ہم میں سے شاید کسی کی بھی پلک نہ جھپکی - ہاں وہ چھوٹا لڑکا جو ہمارے ساتھ تھا ضرور بے فکر سو رہا تھا - ہم میں سے ہر ایک آئندہ مصیبتوں کے تصور اور گذشتہ واقعات کے افسوس میں مبتلا تھا - ایسی حالت میں نیند کہاں ؟

کروٹوں پر کروٹیں بدلیں - مگر مقصد برآری نہ ہوئی - اوروں کے تفکرات کی تو مجھے کیا خبر - البتہ اپنی نسبت کہہ سکتی ہوں - کہ نہ تو مجھ کو اس وقت باغیوں کی شورش کا خیال تھا نہ گھر کے جل جانے کا غم نہ فقر و فاقہ کا اندیشہ - نہ دربدری کا افسوس میں تمام گذشتہ واقعات و آئندہ مصائب کو بھولے ہوئے اپنے بچے ہی کے تصور میں ڈوبی ہوئی تھی - نہ معلوم میرے بچے پر کیا گذری ہوگی - خدا جانے مار ڈالا گیا

یا دایہ کے پاس صحیح و سالم ہے۔ میں اسی لوھیڑ بن میں تھی، کہ صبح کی روشنی اچھی طرح نمودار ہوگئی۔

ایلین کا حال زار

اس کمرہ میں صرف چھ آدمی تھے۔ ان کے تین حصہ ہوگئے۔ وہ دو عورتیں جو ہمارے ساتھ تھیں، ایک جگہ بیٹھی تھیں۔ میری لڑکی اور وہ لڑکا ایک مقام پر تھے میں اور شوہر ایک گوشہ میں :

ایلین کی حالت دیکھ کر میرے اور بھی چھکے چھوٹے جاتے تھے۔ ہر چند میں نے اس بارہ میں کوشش کی کہ وہ تھوڑی دیر رو لے، تاکہ اس کے دل کا بخار کم ہو۔ اور بھری ہوئی طبیعت کچھ ہلکی ہو جائے لیکن وہ خدا کی بندی خاموش بت بنی بیٹھی رہی۔ کھانا بھی مطلق نہ کھایا۔ ہم نے البتہ تھوڑے سے چاول اور کچھ پھل جان بچانے کے لیے زہر مار کر لیے تھے۔!

باغیوں کی جرأت محصورین کی ہمت

اسی درمیان میں دہلی کے بادشاہ کا ایک عہدہ دار انگریزی سرداروں کے پاس بادشاہ کا پیغام لے کر پہنچا کہ اگر تم لوگ بارود خانے سے دست بردار ہو جاؤ۔ تو ہر طرح سے امان دے دی جائے! انگریزی افسروں نے پیغامبر کو ڈانٹ کر لوٹا دیا۔ اور سب نے ملکہ وکٹوریہ کی سلطنت قائم رہنے کی دعا کی ؛

جب بادشاہ دہلی کو مایوسی ہوئی تو اس نے بارود خانے پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حکم دیتے ہی اس قدر کثرت سے لوگ اس پر ٹوٹے کہ اگرچہ کئی توپیں متواتر داغی جا رہی تھیں مگر ان کا ہجوم کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ بارود خانہ ہاتھ سے نہ نکلے۔ لیکن جب پیش نہ گئی تو آگ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ وہ وقت بھی اس بدنصیب گروہ کے لیے عجیب ہولناک تھا، موت آنکھوں کے سامنے تھی۔ اور ہزاروں ارمان دل میں۔ ایک نے دوسرے کو بکمال حسرت و یاس دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں الوداع کہہ دی۔ اس سردار اعظم نے فتیلہ روشن کو جو ہاتھ میں پکڑا تھا۔ فوراً بارود کے خطہ پر لگا دیا۔ جس سے ایک چشم زدن میں تمام بارود خانہ بھک سے اڑ گیا۔

بجز چند آدمیوں کے جن کی جان بچ جانا ایک قسم کا معجزہ ہے۔ اور سب وہیں جل بھن کر رہ گئے

بھوک، بھوک، بھوک

چودھویں تاریخ ظہر کے وقت فیل بان ہمارے پاس آیا۔ تو بر سبب شدّت گرسنگی ہم اپنی خودداری کو بھول کر اُس کی طرف اس خیال سے دوڑے کہ شاید کوئی چیز کھانے کی ہمارے لیئے لایا ہو۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ ہاتھ خالی ہیں۔ تو ایک ایک کے چہرہ پر مردنی چھاگئی نبضیں ساقط ہو گئیں۔ کلیجہ بیٹھ گیا۔

نئی مصیبت

وہ سیدھا کمرہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اور تمام توشکوں اور گدوں کو اٹھا کر چار پائیوں پر پھیلانے لگا، میں نے کہا محمد یہ کیا کرنا ہے۔

فیل بان۔ تم لوگ جلدی ان چارپائیوں کے نیچے گھس جاؤ۔ اور چاروں طرف سے توشکوں سے ڈھک لو:

ہم لوگ یہ سنتے ہی پلنگوں کے نیچے ہو رہے۔ مگر میری لڑکی برابر نالہ و فریاد کیئے جاتی تھی۔ اور بار بار کہہ رہی تھی اگر بارود خانہ جل گیا۔ ہتھیار خانہ جھک گیا۔ تو میا شوہر کیا ہوا للہ بتاؤ کوئی میرا شوہر کیا ہوا؟

مسلمان کی وفاداری

ہم نے زبردستی اُس کا منہ بند کیا۔ اور اپنے ساتھ لے کر پلنگوں کے نیچے چھپ گئے۔ یہ پلنگ زمین سے زیادہ اُونچے نہ تھے اس لیے مجبوراً پیٹ کے بھل زمین پر لیٹنا پڑا۔ فیل بان نے تمام توشکیں ہمارے اُوپر ڈال دیں۔ اور تمام سامان جس سے دشمن کو کوئی شبہ ہوتا۔ دم بھر میں غائب کر دیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ظالم ہندوستانی دھم دھم کرتے کمرے میں آگھسے ہم اگرچہ اُن کو دیکھتے نہ تھے۔ لیکن ہتھیاروں کے باہم ٹکرانے کی آواز، پاؤں کی آہٹ اور بات چیت کی صدا برابر سُن رہے تھے۔

ایک۔ لینا۔ کہاں ہیں۔ وہ کافر بچے؟

دوسرا۔ ایک کو زندہ نہ چھوڑنا۔

تیسرا۔ بھاگ گئے۔

چوتھا۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے، اس کمرے میں ڈھونڈو۔

پانچواں۔ اس کمرے میں ہوتے تو کیا سوئی تھے رہو نہ ملتے ؟

اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے وہ دیوانے کتوں کی طرح ادھر سے اُدھر اور اُدھر سارے کمرہ میں بھاگے بھاگے پھرتے تھے، آخر ہمارے فیل بان کی جان آئی اور رونے تمسخر کہنے لگا۔

فیل بان۔ کہو۔ ہم نے کیا کہا تھا دھوکا کھا کر فضول اپنے آپ کو زحمت و پریشانی میں ڈالا ہماری ایک نہ سنی۔ میں برابر کہے جاتا تھا کہ وہاں ایک بھی فرنگی نہیں۔ اگر ہوتے تو میں تم سے چھپا رکھتا مگر باوجود مسلمان ہونے کے تم نے میری قسم کا یقین نہیں کیا بھلا یہ تو سوچا ہوتا۔ میں اور دشمنوں کو پناہ دیتا۔ یا تمہارے ساتھ قتل کرنے کے لیے لے جاتا۔ اور الٹا انہیں چھپاتا ؟

مسلم کیریکٹر کا اعتراف

حق بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان تمام دنیا کی ماتذیر سے کم جھوٹ بولتے ہیں اور جب کسی بات پر قسم کھالی جاتی ہے۔ تو پھر کبھی جھوٹ بولتے ہی نہیں۔ اگرچہ ہمارے فیل بان نے باغیوں کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اس کمرہ میں کوئی فرنگی نہیں ہے۔ تو وہ ایک حد تک اپنے قول و قسم میں سچا تھا۔ کیونکہ ہم لوگ بظاہر کمرہ میں نہ تھے۔ بلکہ توشکوں کے نیچے چھپے ہوئے تھے فیل بان نے اگرچہ بہت کچھ کہا سنا مگر باغیوں کو اطمینان نہ ہوا اور مثل اُن چور قلیوں کے جو ریلوے اسٹیشنوں پر بوریوں میں سنگیاں مار کر یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر کیا مال ہے۔ انہوں نے بھی اپنی تلواریں توشکوں اور چارپائیوں میں گھسانا شروع کر دیا چنانچہ ایک تلوار کی نوک میرے بازو میں لگی اور خون جاری ہو گیا۔ میں نے خوف و دہشت سے دم نہ مارا۔ فیل بان پریشان تھا کہ مبادا ہم میں سے کوئی پریشان ہو کر چلا نہ اُٹھے اور سب بھید کھل جائے۔

دستِ طلب

بھوک سے حالت ابتر ہو رہی تھی، آخر ضبط نہ ہو سکا۔ باغیوں کے جانے کے بعد محمد سے کہا۔

جس طرح ممکن ہو۔ تھوڑے سے چاول ہمارے لیے بہم پہنچاؤ۔

فیل بان۔ تاوقتیکہ تاریکی شب پردہ نہ ڈالے یہ ناممکن ہے کہ میں آپ لوگوں کے لیے کوئی غذا فراہم کر سکوں ؟

کٹے ہوئے سر کا انعام

بیں۔ کیوں ؟

فیل بان۔ میم صاحب۔ آپ کو کیا خبر ہے۔ آج داروغہ نے مجھے بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا۔ اگر تو نے سچ سچ نہ بتایا۔ کہ تیرے صاحب لوگ کہاں چھپے ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا تو یاد رکھنا گردن مار دوں گا۔

میں۔ پھر تم نے کیا کہا ؟

فیل بان۔ کہتا کیا۔ یہی کہا کہ میں بقسم کہتا ہوں۔ مجھے ان کا پتہ صرف دلّی دروازہ تک معلوم ہے۔ اس کے بعد چونکہ میں اُن سے جدا ہو گیا۔ لہٰذا خبر نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ اور کس حال میں ہیں۔ مر گئے یا جیتے ہیں۔ شہر میں ہیں یا نکل گئے۔

میں۔ محمد۔ تو نے ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی کی۔

فیل بان۔ خیر یہ تو ہو گیا۔ اب سُنیئے۔ اسی داروغہ نے آج خاص طور پر یہ حکم دیا ہے۔ کہ خوب اچھی طرح دہلی میں انگریزوں کی تلاش کرو۔ گوشہ گوشہ ڈھونڈو اور جو انگریز جس جگہ ملے۔ مرد ہو یا عورت۔ جوان ہو یا بڈھا۔ لڑکا ہو یا لڑکی سب کو تہ تیغ کر دو۔

جو شخص سر کاٹ کر داروغہ کے پاس لے جائے گا۔ اس کو مرد کے سر کا تین سو روپیہ عورت کے سر کا دو سو پچاس روپیہ۔ اور لڑکے کے سر کا دو سو انعام ملے گا۔

ہم لوگ اس خبر کو سنتے ہی کانپ گئے۔ اور کچھ ایسے پریشان ہوئے کہ بھوک پیاس سب جاتی رہی۔ فیل بان یہ حالت مشاہدہ کر کے بے حد پشیمان ہوا اور تسلی دے کر چلا گیا۔

وفادار محمد

اتنے میں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا اب کیا کرنا چاہیئے میرے شوہر نے کہا۔ بے کھٹکے دروازہ کھول دو۔ اگر یہ لوگ دشمن ہوتے اور ہماری اذیت کے خیال سے آتے تو اتنے ہلکے ہلکے قدم نہ رکھتے۔ اور نہ ایسے آہستہ سے دستک دیتے۔ مجھے بھی یہ رائے پسند آئی۔ اُٹھی اور دل کڑا کر کے دروازہ کھول دیا۔ دیکھا کہ دو ہندوستانی عورتیں سفید چادریں

سروں پر ڈالے اس طرح کھڑی ہیں جیسے کوئی مردہ قبر سے نکل کر آ رہا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بغیر کچھ کہے سنے اندر چلی آئیں اور زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان میں سے ایک نے صندوقچہ اپنے لبگل میں سے نکالا اور چند چادریں سفید جو ہندوستانی عورتیں مسلمان و ہندو گھر سے باہر نکلتے وقت اوڑھتی ہیں پردہ کی غرض سے نکال کر ہم سے کہا "تم لوگ ان چادروں کو اوڑھ لو اور ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

میرا شوہر۔ ہم کو کہاں تک تمہارے پیچھے جانا پڑے گا۔

ایک عورت۔ جہاں محمد فیل بان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

محمد فیل بان کا نام سن کر جان میں جان آئی۔ بدظنی و دہشت یک قلم زائل ہو گئی۔ خوشی خوشی سب اٹھ کھڑے ہوئے اور چادروں کو جسم پر خوب لپیٹ کر ان دونوں عورتوں کے پیچھے چل دیئے ؏

نئی پناہ گاہ کچھ راہ طے کرنے کے بعد ایک ایسے کوچہ میں داخل ہوئے جس کے ایک طرف کو لکڑیوں کا بہت بڑا انبار لگا ہوا تھا۔ وہ عورت اسی طرف کو چلی اور ایک مقام پر جھک کر لکڑیوں کا پشتارہ جو ایک کنارہ پر جمع تھا ہٹا دیا اور ہم کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ دیکھا کہ ایک دالان کی دہلیز ہے۔ جس کے اندر بہت ہی تنگ راستہ داخل ہونے کا ہے اس نے ہاتھ سے داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ ہم سب بمشکل تمام اس سوراخ کے ذریعہ سے ایک پٹی ہوئی کوٹھری میں جو مثل ایک غار کے اندھیری گھپ تھی پہنچ گئے۔ ہوا یا روشنی کے آنے جانے کے لیے کوئی کھڑکی یا روشن دان اس میں نظر نہ آتا تھا۔ صرف دو مٹی کے چراغ دھیمی دھیمی لو سے ٹمٹما رہے تھے جن کی روشنی اس قدر کافی نہ تھی۔ کہ اس مکان کی ہر ایک چیز اچھی طرح نظر آ سکے۔

بھوک میں انگریزوں کی بیتابی کھانے پینے کا سامان ہم لوگوں کے لیے یہ تھا۔ کہ وہی نیک دل شخص جس کا یہ مکان تھا۔ دن اور رات میں دو دو دیگیں پلاؤ کی اور دو مشکیں پانی کی بھیج دیتا تھا لیکن ہم نے یہاں وہ نفرت خیز طریقہ پایا جس کے بیان سے شرم آتی ہے۔ جس وقت اس کے نوکر یہ کھانے کر مکان میں آتے ہیں تو ہمارے بھوکے

ساتھی یکایک ان پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اور عورت خود وہاں خود کی ٹھہر جاتی تھی جہاں تاہے بلے تامل دیگ میں ہاتھ ڈال دیتا اور گرم گرم کھانا نکال کر نگل جاتا چونکہ پھونک کر کھانے میں تاخیر کا خیال تھا کہ اس لیے ہاتھ بھی جلتا اور منہ علیحدہ پھنکتا ہے !

گرمی کی زیادتی سے پسینہ بہ کثرت آتا تھا۔ اس لیے سارا لباس جسم پر گل کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اگرچہ ہمارے پاس روپیہ پیسہ تھا کئی بار دل میں آیا۔ کہ صاحب خانہ سے درخواست کریں کہ ہم سے روپیہ لے کر ہماری پوشاک تیار کرا دو مگر پھر اس خوف سے خاموش ہوگئے کہ مبادا اس کو ہمارے مال کی قدر و حرص دامنگیر ہو اور ہمارے قتل پر آمادہ ہو جائے گا۔

بچھڑوں کا ملاپ

ہم تہہ خانہ میں پہنچے دیکھا کہ وہ میرے کلیجے کا ٹکڑا ایک گوشے میں پڑا سو رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میں آغوش شوق پھیلائے ہوئے دوڑی دایہ نے اسے میری گود میں آہستہ سے دیدیا اور کان میں کہا۔ ابھی سویا ہے کچی نیند ہے۔ جگا دیجئے نہیں۔ میں اسے گود میں لیکر خداوند کریم کا شکر و سپاس کرتی رہی۔ کبھی اس کے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبالی تھی، کبھی پیشانی سے بوسہ لیتی تھی۔ دل چاہتا تھا۔ کہ پروانہ وار اس پر نثار ہوں!

ہاتھی کی چنگھاڑ

ہمارے چلے آنے کے بعد دور تک ہاتھی کی چنگھاڑ کی آواز آتی رہی جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کو ہماری جدائی کا بے انتہا قلق ہے!

پھر مصیبت

راستہ میں کچھ لوگوں نے دھوکا دیا۔ میں نے شوہر پر لعن طعن کی۔ اس نے کہا، کیا ہم یہاں اپنی مرضی سے آتے ہیں جو افسوس کریں۔ دغا باز ملاحوں نے کشتی کو شکستہ کر کے اس طرف لا ڈالا۔ تاکہ ہمیں قتل کر کے سارا مال و اسباب اس بڑی سڑک سے لے کر چلدیں۔

مین۔ ولیم تو کیا بڑی سڑک بالکل محفوظ ہے۔؟

ولیم۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ہندوستان کی کوئی راہ آج کل بالکل محفوظ ہو!

مین اور ایلن باری باری ولی کو گود میں لیتے تھے۔ بچہ تو گرمی اور دھوپ کی تیزی سے پیاسا

ہوا دریا کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے مم مم کی صدا بلند کرتا تھا۔ اس کی اس بے چینی نے مجھے بے قرار تو بہت کیا۔ مگر تپ مہلک عارض ہونے کی خوف سے میرے دل کو یہ گوارا نہ ہوا کہ جھٹ کے بہتے پانی سے اسے سیراب کروں۔ اس کے بلکنے سے چھاتی پھٹی جاتی تھی۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ مگر مجھے کسی طرح جرأت نہ ہوتی تھی۔

مجبوری سی مجبوری ہے

افسوس اس بات کا ہے کہ بکثرت ناریل درختوں میں لگے ہوئے تھے۔ مگر ہم سے کسی کا ہاتھ وہاں تک پہنچتا ہی نہیں۔ اگر کسی صورت سے ایک پھل بھی ہاتھ آجاتا تو میں اس کے عرق سے دل کی پیاس بجھا دیتی مجھے یہ اندیشہ اور بھی کھائے جاتا تھا کہ اگر اس طرح ہم کو تمام دن چلنا پڑا اور قیام کے لیے کہیں مناسب جگہ نہ ملی تو میرا پیارا بچہ تڑپ کر یہیں مر جائے گا۔

دنیا اندھیر ہوگئی۔ میرا شوہر، میرا داماد

دو چار ستم کیشوں نے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے اس کھیت کی طرف یک بار ہی کئی بندوقیں بلا نشانہ کے چھوڑیں۔ ہائے ان بندوقوں کے چلتے ہی دو شخص آہ کا نعرہ مار کر خاک پر گر پڑے ایک میرے آگے داماد۔ دوسرا میرے پیچھے شوہر۔ ان کا گولی لگ کر گرنا تھا کہ تمام دنیا میری نگاہوں میں تیرہ و تار ہوگئی دل کو گودی سے پھینک کر روتی ہوئی شوہر کے پاس گئی اور جلدی سے اس کا سر اٹھا کر آغوش میں رکھ لیا۔ ہائے ایسے سخت وقت میں بھی اس کے دل سے میرا خیال کم نہ ہوا مجھے روتا دیکھ کر کہنے لگا۔

شوہر۔ زیادہ بے قرار نہ ہو۔ صبر سے کام لو۔ میرا تو کام تمام ہو ہی گیا ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا نالہ و شیون کو سن کر وہ ستم پیشہ یہاں آجائیں اور میرے معصوم دل کو ہلاک کر ڈالیں۔

شوہر۔ دل اور ایلن کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس آخری وقت میں ان کو اپنے سینے سے لپٹا لوں۔

میں جلدی سے دل کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے پاس لے گئی۔ ہائے لبل باپ نے کس حسرت

سے اس پھر پر نگاہ ڈالی ۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ۔ سینہ سے لپٹا لیا اور اس کرب بے چینی کے عالم میں رخسار پر بوسہ دیا ۔

وہ میرا شوہر پیارا ہائے میں اس مرد پر جتنا سر پیٹتی بجا تھا ۔ جس قدر اشک آنکھوں سے بہاتی وہ سب روا تھا ۔ کیونکہ یہ وہ شخص تھا ۔ جس سے میرا لطف زندگی وابستہ تھا ۔ اس دم کے سہارے سے مجھے دنیا کی نعمتیں حاصل تھیں ۔ اس وجہ سے میرے لیے بہت کچھ تھا ۔ یہ میرا مالک تھا ۔ میرا ہمدرد تھا ۔ یہ دکھ کا شریک اور غم کا ساتھی ۔ یہ خوشی کا دینے والا اور الم کا دور کرنے والا تھا ۔ کیا ہو گیا ۔ اب اس مرگئے ملنے کو کہاں سے لاؤں گی ۔ آف درد دل کس کو سناؤں گی ؟ !

بھائی کی بہن سے محبت میرا طفل صغیر ولیم چونکہ کوتاہ قامت تھا ۔ اس لیے کنوئیں میں چلے جانے کے بعد اس کا وجود دکھائی نہ دیتا تھا ۔ وہ ہر منٹ کے بعد مجھ سے جدا ہو کر اپنی بہن کے پاس جاتا تھا اور اس کو پیار کر کے لوٹ آتا تھا ۔

مُردار خور جانور ولیم اور ایلس بڑی محنت کے ساتھ قبر کھود رہے تھے ۔ کہ نگاہ پشت کی جانب سے جہاں ولیم کی لاش پڑی ہوئی تھی ۔ ایک آواز ہمارے کان میں آئی ۔ ہم دونوں نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا اور معاً دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ولیم زندہ ہو کر تو نہیں اٹھ بیٹھا ۔ مگر افسوس کہ یہ خیال بالکل لغو اور بے بنیاد تھا ۔ ولیم ایسی نیند نہ سویا تھا کہ اس سے بیدار ہو جاتا ۔ آہ دیکھا تو یہ دیکھا کہ مُردہ خور جانور اس کے گرد جمع ہو گئے اور اپنے چنگل سے اس کے رُخسار کو پکڑ پکڑ کر زمین سے اٹھا رہے تھے ۔ ہم دونوں دوڑے وہ ہمیں آتا دیکھ کر اس بے چارے کو زمین پر ڈال کر بھاگ گئے ۔

ایلس نے رو کر کہا ۔ "اماں جس طرح بنے ان کے دفن کرنے میں جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ وحشی جانور ہجوم کر کے لاشوں کو لے بھاگیں یا ہمارے سامنے ہی تکا بوٹی کر دیں " تین گھنٹے متواتر ہم نے حرارت آفتاب میں وہ گڑھا کھودا ۔ جب بقدر ضرورت گہرا ہو گیا ۔ تو ہم نے چاہا ۔ کہ دونوں لاشوں کو زیر خاک سونپ دیں ۔ لیکن فکر یہ تھی کہ کیونکر ان کو اٹھا کر یہاں تک لائیں اور کونسی لاش نیچے

دکھیں اور کون سی اوپر ؟

قبر کا کوتہ

میں اور ایلن دونوں مل کر ان لاشوں کو یہاں تک لائیں یا ہم میں سے ہر ایک اپنے عزیز کی لاش کو اٹھا کر لائے ۔ اور قبر میں رکھیں ۔ محبت مادری نے مجھے اس پر مجبور کیا کہ چند منٹ اپنی دختر کو اور مہلت دوں کہ وہ اپنے شوہر کو وقت آخیر اور سیر ہو کر دیکھ لے ۔ اس لیئے میں نے اپنے شوہر کے دفن کو مقدم سمجھا ۔ اس کی لاش کے پاس گئی ۔ اور سر کو زمین سے اٹھا کر شانہ پر رکھا ۔ اور جسم کو آغوش پر رکھ کر کھینچتی ہوئی قبر کے کنارے پر لے آئی ۔ میرا بچہ اس خیال سے کہ اس کام میں مجھے مدد دے ۔ اپنے باپ کا دامن —— ہاتھ میں پکڑے چلا جاتا تھا جب ہم قبر کے پاس پہنچ گئے ۔ تو یہ خیال میرے دل میں آیا ۔ کہ کیا اس طرح اپنے شوہر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤں اور کوئی نشانی اس سے نہ لوں ؟

آخری پونجی

بدوں تردد ہاتھ بڑھا کر وہ اشرفیوں کی تھیلی جو اس کی کمر میں تھی ۔ کھول کر اپنی کمر میں باندھ لی ۔ یہ مختصر سرمایہ تھا ۔ جو ہماری کثیر دولت سے باقی رہ گیا تھا ۔ یہ وہ املاک تھی جو میرے یتیم بچے نے اپنے باپ کی املاک سے پائی ۔ یہ وہ بضاعت تھی جو ایک بیوہ عورت کو بے کسی کی زندگی گذارنے کے لیے شوہر سے ملی ۔ لیکن یہ معدودے چند اشرفیوں کی تھیلی کیونکر ہمیشہ کے لیے میرے واسطے شوہر کی یادگار بن سکتی ہیں ۔

محبّت بُری بلا ہے

بہرحال کمال حیرت و افسوس سے میں نے پھر ایک نظر اس کے چہرہ پر نگاہ ڈالی سر بے حرکت تھا ۔ آنکھیں بند تھیں ۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا ۔ سر کے بال خاک میں بھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے چپکے ہوئے دیر تک کمبلا ہوئی صورت دیکھ کر روئی ۔ ایک بار جوش محبت میں پیشانی پر بوسہ دیا ۔ بالوں سے خاک صاف کر کے ان چکنے اور چند بال لے کر حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیے ۔ اور یہ عہد کیا کہ جب تک زندہ رہوں گی ۔ اس نشانِ محبت کو اپنے سے جدا نہ کروں گی ۔ بلکہ اپنے ساتھ گور میں لے کر جاؤں گی اور اس کے بدلے میں وہ انگشتری جو شادی کے روز اس نے مجھے پہنائی تھی ۔ اپنی انگلی سے اتار کر اس کی انگلی میں پہنائی ۔ جس

سے یہ مَنت تھا۔ کہ جب تک زندہ رہوں گی دوسرا شوہر نہ کروں گی اور بیوہ کی حالت میں زندگی گذاروں گی۔ اس کے بعد ایلن کو آواز دی اور اس کی مدد سے لاش کو گڑھے میں اتارا۔ پھر داماد کی لاش کو بھی وہیں رکھا۔ اور ایک مختصر سی دعا پڑھنے کے بعد وہ تمام اسلحہ جو ان کے ساتھ تھے۔ سوائے ایک خنجر کے جس کو میری لڑکی نے شوہر کے مال سے لے لیا تھا اس گڑھے میں ڈال دیے اور اُس پر مٹی ڈالنی شروع کی۔ مٹی ڈالتے وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ زیادہ مٹی پڑنے سے ان کو تکلیف ہوگی۔ ہائے محبت بُری بلا ہے!

دشمنوں کے نرغہ میں شوہر اور داماد کو دفن کرنے کے بعد دشمنوں کا غول نظر آیا۔ اور ایک مرتبہ ہی ان دیو سیرت انسانوں نے ہم پر حملہ کیا۔ ان کے اس حملہ سے میں ایلن سے جُدا ہوگئی۔

ایلن کی مصیبت ہر چند اس مجمع میں اس طرف سے اس طرف نظر دوڑائی۔ لیکن کہیں اس کی صورت دکھائی نہ دی۔ ایک گھنٹے کے بعد دور سے دیکھا کہ ان وحشیوں کے ہاتھ سے رہا ہو کر جنگل کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ اور دو بدسرشت برابر اُس کے پیچھے دوڑتے چلے جاتے ہیں کہ اس کو پکڑ کر کام تمام کر دیں۔ اتفاقاً ایک مقام پر چند ہندوستانی عورتیں ایک خیمہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایلن بیچاری اس خیمہ میں جا چھپی۔ حسن اتفاق سے جو عورتیں اس خیمہ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کا شمار ہندوستان کے شرفا میں تھا ان کے درمیان میں ایک عورت زیادہ سن رسیدہ اور ذی اثر تھی۔

ایلن نے عاجزی سے اپنے آپ کو اُس کے سامنے ڈال دیا۔ بمقتضائے انسانیت اُس نے ایلن کے سر پر ہاتھ رکھ لیا یعنی اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر وہ دو ہندوستانی سوار جو اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے واپس چلے گئے۔ میں بھی جلدی سے ویل کو گود میں اٹھا کر اس خیمہ میں ہو رہی تمام ہندوستانی خیمہ کے گرد جمع ہو گئے اور شور مچانا شروع کیا۔ کہ بیگم صاحب ان بدمعاشوں کو آپ نے کیوں اپنی پناہ میں لیا۔ ان کو باہر نکال دیجئے۔ تاکہ ہم ان کو موت کا مزہ چکھائیں۔ یہ انگریز

ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کی جائے۔

وہی فقیر، وہی درویش

میں موقع پاکر اپنے لڑکے اور لڑکی کی طرف دوڑی اور تینوں نے ایک دوسرے کو اس قدر مضبوط پکڑ لیا کہ باغیوں نے لاکھ لاکھ کوشش کی کہ ہم کو ایک دوسرے سے جدا کریں۔ نیزوں کی نوکیں بھی چبھوئیں۔ خنجر بھی دکھلائے لیکن ہم کہاں علیٰحدہ ہونے والے تھے انہوں نے غصہ ہو کر ہم کو اس صورت سے کھینچنا شروع کیا اور آگ کے ایک ڈھیر پر لے جاکر کھڑا کر دیا۔ آگ دیکھتے ہی ہمارے اجسام میں لرزہ پیدا ہو گیا۔ اور امید حیات جاتی رہی۔ اس عالم مایوسی میں میں نے ہر طرف نگاہ ڈالی۔ لیکن کسی کو حامی و مددگار نہ پایا۔ اتفاق سے میری نگاہ اس صوبہ دار پر پڑ گئی۔ اس وقت افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ ابتدا میں اس کی کڑوی باتیں بھول جاتی۔ اور اظہار ملال نہ کرتی۔ تو یہ مصیبت نازل نہ ہوتی۔ ہر چند میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور معذرت چاہی۔ اپنے حال پر رحم دلایا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیونکہ راجہ سامنے بالاخانہ پر بیٹھا دیکھ رہا تھا ہمارے قتل ہونے کا تماشہ۔ اور یہ صوبہ دار نہایت ادب سے سینہ پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑا تھا۔ شاید اس خیال سے کہ ہمارا انگریز ہونا سب پر ظاہر ہو چکا تھا۔ اس نے کسی قسم کی سفارش مناسب نہ سمجھی یا اس کینہ سے کہ ہم نے اس کی بیجا خواہش کو پورا نہ کیا تھا۔ غرض ہماری امید ہر طرف سے منقطع اور موت ——— ہو گئی ——— ایلن اپنا سر میرے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔ ناگاہ میں نے دیکھا۔ کسی شخص نے میرے لڑکے کو میرے ہاتھ سے بجبر کھینچا۔ میں نے اس امید پر کہ شاید کوئی ہمارا نجات دہندہ ہے اس کو چھوڑ دیا۔ لیکن گاڑھا گاڑھا دھواں اس قدر آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ کہ میں یہ نہ دیکھ سکی کہ کون لے گیا۔

پھر ایک ہاتھ میرے شانے پر پہنچا اور کسی نے مجھے اور ایلن کو اس آگ کے انبار سے جدا کر لیا۔ وہاں سے ہمارا ہٹنا ایسا تھا۔ جیسا مردے کا قبر سے زندہ ہو کر نکلنا یا کسی کا نیست سے ہست ہونا۔ اس دست غیبی نے ہم کو آگ سے ہٹا کر ایک بلندی پر بٹھا دیا، اور وہ شخص خود مثل نجات دہندہ کے مجسم دیوتا بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور ان تحریروں سے ہندوستانی

زبان میں کچھ بات چیت کرنے لگا۔ میں نے ان لوگوں کو اس قدر اس کا مطیع پایا کہ جس طرح ایک بادشاہ کی رعایا۔ ایک آقا کے فرمانبردار ملازم ہوتے ہیں۔ جو بات اس کے منہ سے نکلتی تھی، وہ جماعت اس پر اظہار اطاعت کرکے زمین خدمت کو بوسہ دیتی تھی۔ میں نے جب ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی درویش ہے، جس کو جمنا کے کنارے شہر دہلی کے قریب میرے لڑکے نے ایک روپیہ بطور صدقہ دیا تھا۔ اب اس نے اس قلیل صدقے کے بدلے میں اس قدر بڑا احسان ہمارے ساتھ کیا۔

انگریزوں سے نفرت کے اسباب

اس فقیر کو دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا۔ دل میں کہتی تھی کہ وہی گدائے بے سروپا اور درویش بے برگ و ا ہے جو سر سے پاؤں تک مٹی میں بھرا ہوا جمنا کے کنارہ پڑا تھا! یہ وہی ہے کہ جس کے بال اس قدر پریشان تھے کہ عمر بھر ان میں کنگھی ہونے کا احتمال بھی نہ ہو سکتا تھا جس کی داڑھی میں جب سے جوان ہوا اصلاح کی نوبت ہی نہ آئی۔ ایسا معمولی آدمی اور اس قدر صاحب اعزاز کہ جوں ہی اس نے اپنے ہاتھ سے ان خونخواروں کو اشارہ کیا۔ فوراً سب ہم سے علیحدہ ہو گئے اور بہت دور حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "اے سیّد آقا ہمارے بڑے خدا ان فرنگیوں کی رعایت نہ کیجئے۔ سالہا سال سے ہم ان کے ہاتھوں سختی اٹھا رہے ہیں۔ سو برس سے زیادہ ہوئے کہ ہم ان کے دست قہر میں اسیر و ذلیل ہیں نہ یہ ہمارے دین کی رعایت کرتے ہیں۔ نہ مذہب کی نہ ہمارے فوائد کے خواہاں ہیں نہ اپنے وعدے کو وفا کرتے ہیں۔ ہمارے معابد کی حرمت، ہمارے علما کی عزت قدر ان کی نگاہ میں نہیں۔

اپنے پادریوں سے تحریک کرتے ہیں کہ ہم کو اپنے آبا و اجداد کے دین سے برگشتہ کرکے دین نصاریٰ میں داخل کریں۔ انہوں نے ہمارے عزیزوں کو ذلیل کیا ہے۔ اور شاہی خاندان کے درمیان مخالفت پیدا کرکے سب کو منتشر اور پراگندہ کر دیا ہے۔ اور ان کی سلطنت ضبط کر لی ہے۔ ہمارے دین کی عزّت اور وطن کی آبرو کو برباد کر دیا ہے۔ طرح طرح کے باب ایجاد کرکے ہماری دولت کو لوٹ

لیا ہے رحم کو یہ لوگ وحشی اور غیر مہذب کہتے ہیں اور اپنے کو باوجود انتہائی بے مروتی کے انسان کامل سمجھتے ہیں۔ آپ ان کے حامی نہ ہو جایئے۔ اور ہمیں دے دیجئے تاکہ ہم کمینوں کو آگ میں جلا دیں اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لیں۔

درویش نے یہ تقریر سن کر کوئی صاف جواب ان کو نہ دیا۔ صرف اسی قدر اشارہ ان پر ظاہر کیا کہ یہ لوگ میری حمایت اور حفاظت میں ہیں اور ایک خاص وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ ان کو صدمہ پہنچے!

نئی زندگی غلاصہ یہ کہ اس احسان و نیکی کی وجہ سے جو فقیر نے ہمارے ساتھ کی۔ ہم نے اس کے کثیف لباس اور بدبودار جسم سے ذرا کراہت نہ کی بلکہ اس کے جسم کی بدبو ہم کو مشک سے زیادہ خوشبودار معلوم ہوتی تھی اور اس کی کریہ المنظری اور بدنواری ہمارے لیے محاسن و محامد کا مجموعہ تھی۔ بہ کمال شفقت و مہربانی کارواں سرائے کے اندر جہاں ایک حوض بھی تھا ہمارا محل اقامت قرار پایا۔

یہ خلوت گاہ اس طریقہ سے واقع ہوئی تھی کہ باہر سے آنے والا پہلے دالان اور دالان سے گذر کر یہاں تک پہنچتا تھا۔ اگر اس کا مستحکم دروازہ بند کر دیا جائے۔ تو پھر کسی کا داخل ہونا غیر ممکن تھا۔ بلکہ کسی کا وہاں رہنے کا تصور و احتمال بھی نہ ہو سکتا تھا، کچھ معمولی سی باتیں کرنے کے بعد درویش باہر چلا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد گھاس کا ایک بڑا گٹھڑ باندھے ہوئے واپس آیا اور ہم سے کہا۔ لو اسے بجائے فرش کے بچھا لو اور کہیں اس مکان سے باہر نہ جانا۔ کم از کم پندرہ روز کا کھانا تمہارے لیے موجود ہے کیا بعید ہے کہ اس مدت میں خداوند عالم تمہارے لیے کشائش پیدا کر دے اور دشمن دور ہو جائیں یا دوستوں کا گروہ ادھر سے گذرے اور تم کو قید غم سے رہائی دے۔

اتنا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ اور دم کی دم میں ہماری نظروں سے غائب ہو گیا ہم پہلی بار اس گوشہ امن و اماں میں نہایت اطمینان سے سوئے!

راہبوں سے رعایت جب سرائے سپاہیوں کے وجود منحوس سے خالی ہوگئی تو مجھ سے ایک تارک الدنیا عورت نے کہا۔

راہبہ۔ کہئے آپ کا کیا ارادہ ہے۔ اگر ہمارے ساتھ چلنے کا قصد ہے تو بسم اللہ اب کیا دیر ہے۔ اگر کوئی دوسرا ارادہ ہے۔ تو آپ جانتے۔

میں۔ میں ابھی اس کشمکش و پیچ میں ہوں کہ میں کیا کروں۔ یہی خیال ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ پھر ستم گر حملہ کریں۔

راہبہ۔ میرے خیال سے اگر آپ نے ہمارے ساتھ سفر کیا تو شاید آپ زیادہ محفوظ رہیں۔ کیونکہ ہندوستانی لوگ ہمارے ساتھ خاص طور سے رعایت کرتے ہیں۔

کانپور کی طرف کوچ "چوتھے روز ہم نے اس قافلے سے علیحدگی اختیار کی۔ وہ سب عورتیں الہ آباد کی طرف روانہ ہوگئیں۔ اور ہم کانپور کی طرف۔ لیکن کانپور کے قریب پہنچنے تک ہم کو اس کا مطلق پتہ نہ چلا کہ نانا راؤ ایک شخص فرقہ باغی کا سردار کانپور اور اس کے مضافات کا مالک بن گیا ہے۔ اور جنرل وہلر جس کی ذات سے ہماری تمام امیدیں وابستہ تھیں۔ سرکاری شفاخانہ میں چند انگریزوں کے ساتھ محصور ہے اس واقعہ کی اطلاع ہم کو اس وقت ہوئی۔ جب کہ ہم شہر کانپور کے قریب گنگا کے کنارے پر پہنچ گئے!

ہندوؤں اور مسلمانوں کا سلوک یہ ہماری خوش نصیبی اور نیک بختی تھی۔ کہ نانا راؤ کے سواروں کی نظر ہم پر نہ پڑی۔ حالانکہ یہ لوگ کئی روز سے برابر دریائے گنگا کے کناروں پر گھومتے پھرتے تھے تاکہ جو فرنگی الہ آباد۔ کلکتہ یا بنارس جانے کے خیال سے کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کو عبور کریں۔ ان سب کو گرفتار کریں بعض دہقانوں کو جو ہندو و مسلمان دونوں فرقوں سے تھے۔ ہماری حالت پر بہت رحم آیا اور از راہ شفقت انہوں نے ہم سے کہا کہ تم لوگ کانپور ہرگز نہ جاؤ۔ ورنہ یقیناً مار ڈالے جاؤ گے۔ چند روز۔ یہیں گنگا کے کنارے پر جو وسیع جنگل ہے۔ اپنے کو پوشیدہ رکھو۔ ممکن ہے کہ شہر میں امن و امان

قائم ہو جائے۔ اور تمہاری خلاصی کی صورت نکل آئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی حیثیت کے موافق کچھ کھانا اور کچھ لباس بھی دیا۔

قسمت کا چکر غالباً بدبختی کے موقعہ پر انسان کے ہوش و حواس بہ نسبت ایام سعادت زیادہ درست ہوتے ہیں۔ ہم نے اس وقت یہ خیال کیا کہ پہلا دستہ باغیوں کا ہے اور دوسرا انگریزی سواروں کا۔ کیونکہ یہ لوگ انگریزی زبان میں کلام کر رہے تھے ہم سب نہایت خوشی خوشی اطمینان قلب کے ساتھ اُن کے پاس گئے۔ اور زبان انگریزی میں گفتگو شروع کی۔ وہ ہماری گفتگو سنتے ہی یکا یک رُک گئے۔ میں نے مختصر طور سے اپنی سرگذشت بیان کی اور اپنا اور اپنے شوہر اور اپنے داماد وغیرہ کا نام ان سے بیان کیا اور کوئی امر اپنے متعلق پوشیدہ نہ رکھا جب اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ ذی ثروت اور آبرودار ہیں۔ خاص کر جب یہ جانا کہ میرا داماد انگریزی فوج کا سردار تھا تو وہ سب اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم کو جنرل وہلر کے پاس پہنچا دیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ اور وہاں سے چل دئے تھوڑی دیر بعد ہم جنرل وہلر کے مکان میں داخل ہوئے۔ یہ واقعہ ۲۷۔ جون کا تھا۔ بیس روز ہوئے تھے کہ نانا راؤ نے اس انگریزی سردار کو اپنے محاصرہ میں کر لیا تھا۔ جنرل مذکور بہت زخمی ہوا تھا۔ جب ان لوگوں پر زیادہ تشدّد ہوا اور کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا۔ تو مجبوراً اپنے کو نانا راؤ کے سپرد کر دیا۔ مگر اس شرط پر کہ جنرل مذکور مع اپنے ساتھیوں کے شہر کے باہر چلا جائے۔ اور سپاہ بغاوت پیشہ ان سے کسی طرح کا تعرض نہ کرے۔ نانا راؤ نے اس کو منظور کیا اور چند کشتیوں کا انتظام ہم لوگوں کے عبور کرنے کے لیے دریا گنگ پر کرا دیا۔ میں جنرل وہلر کے واقعات تفصیل سے لکھنا نہیں چاہتی۔ اس کو مورخین پر چھوڑتی ہوں۔ میں صرف انہیں واقعات کو لکھتی ہوں۔ جس کا تعلق میری سرگذشت سے ہے۔

کشتیوں پر آتش باری المختصر ایک روز ہم شفاخانہ سے باہر نکلے۔ میں اور میرا بچہ ایک گاڑی میں اور دوسرے لوگ اور گاڑی میں بیٹھے ہوئے دریا کے کنارہ کی طرف

جہاں بہت سی کشتیاں موجود تھیں چلے جاتے تھے۔ چونکہ نانا راؤ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہم کو بہ عزت آبرو کے ساتھ اپنی حفاظت میں دریائے گنگا سے پار اتار دے۔ اس لیے ہماری حفاظت کو دونوں طرف مسلح سپاہی شفاخانہ سے گنگا کے کنارے تک کھڑے ہوتے تھے۔ اور ان کے پیچھے ایک کثیر جماعت شہر کے تماشائیوں کی کھڑی ہوئی ہم لوگوں کے جانے کا تماشہ دیکھ رہی تھی غرضکہ ہم لوگ صحیح و سلامت کنارے پر پہنچ کر کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ کشتیاں نہایت تیزی کے ساتھ پانی کو چیرتی ہوئی چلی جاتی تھیں تا اینکہ ہم درمیان دریا میں پہنچ گئے۔ میں شکر خدا بجا لائی کہ اس نے مہلکہ عظیم سے ہم کو نجات دی۔ اور موت کے منہ سے بچایا مگر آہ اس کی خبر نہ تھی۔ کہ تازہ مصیبتیں ابھی اور نازل ہونے والی ہیں۔ ابھی آسمان ہمارے ستانے سے باز نہیں آیا۔ ابھی ہماری تکلیف کی انتہا نہیں ہوئی ؟

امید نجات کی دو ایک موجیں سے زیادہ دل میں نہ اٹھی ہوں گی کہ یکایک عین دریا سے آتش بار توپوں کے دغنے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ کہ بہت سے ہمارے ساتھی کشتیوں میں گولے کھا کر تڑپ رہے تھے۔ کشتیاں گولوں کی رد سے شکستہ ہو گئیں اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ قریب تھا۔ کہ سب ایک بار ڈوب جائیں۔ حسن اتفاق سے ہوا تیز چلی اور میری کشتی سب سے پہلے ساحل پر جا لگی۔ میں جلدی سے کشتی سے کودی اور ایلن اور ویل کو گود میں لے کر اتارا۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی وقائع نگاروں پر چھوڑتی ہوں کہ کشتی سے اتر کر میں اپنے بچے سمیت دریا کے کنارے پر مثل مُردوں کے پڑ رہی اور اس بات کا انتظار کیا کہ خونخوار باغی جلدی سے یہاں آ کر ہم لوگوں کا کام تمام کر دیں۔ تا کہ ان روحانی تکالیف سے نجات مل جائے۔ اس وقت کے خوف کی حالت کا لکھنا میری طاقت سے باہر ہے۔ وہ ہیبت ناک منظر تھا۔ کہ میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔ کلیجہ خوف سے دھڑ دھڑ ہو رہا تھا !

نانا راؤ اچھا آدمی تھا

نانا راؤ سرداروں کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں وارد ہوا۔ اس کے اشارہ سے تمام تلواریں نیام میں چلی گئیں۔ اور نانا راؤ ہم سب کو اپنے آگے کر کے مثل قیدیوں کے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ ہم لوگ زن و مرد سب تعداد میں ایک سو ساٹھ سے

زیادہ ہوں گے۔ اس کے حکم سے ہم لوگوں کو ایک انگریز سردار کے مکان میں جگہ دی گئی جہاں ہماری آسائش کا کافی سامان مہیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی حکم تھا کہ اس مکان سے باہر نکل کر کہیں نہ جائیں۔ میں نے نانا راؤ کو اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا تھا۔ لوگ جو کچھ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں وہ جانیں مگر میں کہتی ہوں کہ اس قتل و غارت کا باعث وہ نہیں تھا۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ بیس برس کی عمر کا ہوگا۔ چہرہ نہایت کشادہ صورت نہایت شگفتہ۔ طبیعت اچھی۔ عادات پسندیدہ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر فرقہ باغی اس کی اطاعت کر لیتا تو یقیناً یہ قتل و غارت ہرگز نہ ہوتا۔ یہ امر جو اس سے خلاف عہد ظہور پذیر ہوا یعنی دریا میں ہمارے اوپر گولے برسائے گئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جنرل ہاولوک جنرل وہلر کی رہائی کی غرض سے کانپور کے نزدیک آ گیا ہوا تھا۔ جس وقت کہ ہم کشتی میں بیٹھ کر عازم الہ آباد ہوئے وہ بارود کا ڈھیر جو خفا خانہ میں تھا۔ محافظوں کی غفلت سے جل اٹھا۔ ہندوستانیوں نے خیال کیا انگریز لوگ پھر جنگ پر آمادہ ہوئے ہیں۔ اور ابھی کانپور سے باہر نہیں گئے۔ جنرل ہاولوک کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ وجہ تھی کہ ہم سب لوگوں کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن جب ہم لوگوں کی بے گناہی معلوم ہوئی۔ تو نانا راؤ نے ان لوگوں کو جو قتل ہونے سے رہ گئے تھے۔ نجات دی۔

انگریزوں کا قتل عام

باوجود اس کے کہ نانا راؤ نے اس مکان سے باہر جانے کی سخت ممانعت کر دی تھی۔ چند انگریز عورتیں پھر بھی ادھر سے باہر چلی گئیں۔ اور باہر کے لوگوں سے نامہ و پیام کرنے لگیں۔ خطوط ہتھوڑوں میں باندھ کر باہر پھینکے جاتے تھے۔ اور جاسوس ان کو مطلوب تک پہنچا دیتے تھے اسی طرح باہر کے خطوط اندر آتے تھے۔ بعض خطوط سے معلوم ہوا کہ انگریزی فوج نے نانا راؤ کو شکست دی اور عنقریب باغی شہر کو چھوڑ کر بھاگنے والے ہیں۔ دوسرے روز صبح کو شہر سے بہت زیادہ شور و غل کی آواز کان میں آئی جس سے پتہ چلتا تھا کہ شہر میں بڑا فتنہ فساد ہو رہا تھا اسی درمیان میں چند لوگ نانا راؤ کے ہمارے مکان میں آئے اور ان چار عورتوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔ جنہوں نے لوگوں سے خط و کتابت کی۔ اور باہر نکلتے ہی

چاروں کو کمال کر ڈالا۔ اس کے بعد پھر بہت سے شہر والے ہمارے محبس میں گھس آئے۔ اور حملہ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ آہ اُس وقت ہم لوگوں کی بے کسی و بے لسی قابل دید تھی۔ چاروں طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے تھے مگر کوئی اپنا ہمدرد نظر نہ آتا تھا:

دشمن تھے کہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور مارلو مارلو کی صدا بلند کر رہے تھے۔ تلواریں برابر چل رہی تھیں اور خون کے فوارے بہہ رہے تھے۔ چند بے کس ہیلیاں یکے بعد دیگرے ان ستم پیشوں کی تیغ ظلم کا شکار ہو رہی تھیں۔

ایلن اور ویل کا قتل

ایک پر دس دس آدمی ٹوٹے ہوئے تھے۔ میں اس گڑبڑ میں اپنے بچوں سے جدا ہو گئی۔ آہ اس پریشانی کے عالم میں بھاگی بھاگی جو ایک طرف گذری تو دیکھا کہ میرے دونوں نور نظر لخت جگر گردنیں کٹے خون میں نہاتے خاک میں پڑے ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ اور میں کتنی دیر غش میں پڑی رہی۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ چند ہم وطن میرے گرد جمع ہیں۔ اور مجھے ہوش میں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔

یہ تھی وہ میری سرگذشت جس کو یاد کر کے عمر بھر خون کے آنسو آنکھوں سے بہاؤں گی۔ آہ شوہر چھوٹا۔ داماد چھوٹا۔ اولاد چھوٹی۔ اور میں بدبخت ابھی تک باوجود ان مصائب برداشت کرنے کے زندہ ہوں۔

کاش مجھے پہلے ہی موت آگئی ہوتی تاکہ ان جانکاہ مناظر اور روح فرسا حوادث کو نہ دیکھتی آہ مقدر کا لکھا کبھی سے نہیں ملتا۔ خیر جب جنرل ہاولوک کا قبضہ شہر پر ہو گیا تو چند روز بعد مجھے کانپور سے الہ آباد اور وہاں سے بنارس اور کلکتہ بھیجا۔ کلکتہ سے کشتی میں سوار ہو کر کولمبو اور وہاں سے انگلینڈ پہنچی۔

باب ۳۸

غدر کے بعد باغیوں کے حوصلے

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پر ہم اک حرفِ غلط
لیکن اُٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

فتح و شکست کا حقیقی فیصلہ میدانِ جنگ میں نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ، فتح ان لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، جو جنگ کے میدان میں ہار جاتے ہیں لیکن تاریخ ان کی فتح و ظفر کو اپنے اوراق میں غیر فانی بنا دیتی ہے۔ دلی کے میدانِ جنگ میں، انگریزوں نے فتح حاصل کرلی تھی۔ اپنے دشمنوں کو کچل دیا تھا۔ ہزاروں سپاہیوں کو تہ تیغ بے دریغ کر دیا تھا۔ جس پر ذرا بھی شبہ تھا کہ یہ میدانِ جنگ میں جا سکتا ہے اسے بغیر کسی جرم و خطا کے قضا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لیکن، انگریزوں کی سنگینیں اور بندوقیں اس عزیمت کو نہ کچل سکیں۔ جو آزادی، حریت کے ان پرستاروں کو قدرت نے عطا کی تھی۔ انگریزوں اور گوروں نے بڑی بڑی عمارتیں ڈھا دیں۔ شاندار حویلیاں زمین کے برابر کر دیں۔ قلعوں کو مسمار کر دیا۔ مستحکم اور مضبوط مکانوں کو تہس نہس کر دیا۔ لیکن وہ اس عزم و ہمت کو نہ ڈھا سکے۔ جو حریت پرستوں کا شعار بن گیا تھا۔ انگریزوں کی بندوقوں، اور سازو سامانِ جنگ نے، ایک پوری قوم کو، جو کروڑہا کروڑ افراد پر مشتمل تھی اپنا غلام بنا لیا، لیکن وہ ان مٹھی بھر آدمیوں کو اپنا مطیع و منقاد نہ بنا سکے۔ جو کفن سر سے باندھ کر میدان میں اترے تھے، جو موت کو کھیل سمجھتے تھے۔ اور زندگی جن کے نزدیک، صرف ایک راہ گزر تھی آخری منزل کی۔

غدر کے بعد لو انگریزوں کے تسلط کے بعد بھی، جب ہر طرف، دہشت چھائی ہوئی تھی، ایک

مرگ آسا سناٹا طاری تھا ہر ذی حیات پر، جب لوگ ڈرے ہوئے تھے، دبے ہوئے تھے، دہائی دے رہے تھے، زندگی کی دریوزہ گری کر رہے تھے، زندہ رہنے کے لیے، مخبری کر رہے تھے، اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو پھانسیوں پر چڑھوا رہے تھے، کچھ ایسے من چلے بھی تھے، جو موت کی جستجو کر رہے تھے، جو تلاش مرگ میں، سرگرداں تھے، جنہیں زندہ رہتے ہوئے عار آتا تھا، جن کا گھر مٹ چکا تھا، اہل و عیال بچھڑ چکے تھے، سازوسامان جنگ ختم ہو چکا تھا، سہارا ٹوٹ چکا تھا، لیکن وہ ان سب سے بے نیاز، اپنے ٹوٹے اور شکستہ ہتھیاروں سے چپٹے اور چمٹے، لڑنے پر تیار تھے جہاں اور جب موقع ملتا تھا، ان شکستہ ہتھیاروں سے بھی دشمن کی ایسی سرکوبی کرتے تھے کہ وہ تلملا کر رہ جاتا تھا ۔

پھانسی کے میدانوں میں، جیل کے احاطوں میں، شہر کی وسیع و عریض دنیا میں، حویلیوں، اور کاشانوں میں، لاکھوں کی تعداد میں جو مخلوق موجود تھی، نہ صرف یہ کہ انگریز اس سے خائف نہیں تھے، بلکہ اس کی بے بسی کا مذاق اڑاتے تھے، اسے تعزیر و عقوبت کے شکنجہ میں برابر کستے چلے جا رہے تھے، لیکن یہ چند سر پھرے، جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود اب تک لڑنے پر تیار، اور جنگ پر مستعد تھے۔ وہ تھے جن سے ایوان فرنگ میں زلزلہ برپا تھا، جن کا چرچا سن کر بڑے بڑے جیالے، انگریز دہل جاتے تھے، لرز اٹھتے تھے ۔

آئیے ایک نظارہ، ان بے مایہ، لیکن، سرفروش، جان ہار، اور فدا کار لوگوں کا بھی کریں :

شہر پناہ کے اندر لڑائیاں

ایک حقیقت نگار شاہد افسانہ کے الفاظ میں کہتا ہے :—

انگریزوں نے دو طرف سے شہر پر حملہ کیا، تھوڑی دیر توپیں چلیں اس تسلسل کے ساتھ کہ جیسے کبھی زور کی جھاڑ میں بجلی ہے کہ برابر کوند رہی ہے، اور گرج ہے کہ ایک لمحے کو نہیں تھمتی، پھر بندوقیں چلنی شروع ہوئیں، ان اوقات کو دور سے بس ایسا سن پڑتا تھا کہ بھاڑ میں گویا چنوں کے گھان بھن رہے ہیں ۔

ہم سب سمجھتے تھے کہ شہر ایک دن میں فتح ہو جائے گا، مگر ابھی تک باغی موجود ہیں نہیں معلوم کتنی لڑائیاں شہر پناہ کے اندر ہوں گی۔ (۱)

کمانڈر انچیف کی دہشت

سر ہنری برنارڈ کمانڈر انچیف تھے۔ لیکن باغیوں کے حوصلہ نے انہیں پریشان اور حواس باختہ کر رکھا تھا:

مراسلہ نمبر ا

جسے جنرل سر ہنری برنارڈ کمانڈر انچیف نے جارج کارنگ بارنس۔ جو دریائے ستلج کی مغربی ریاستوں کے کمشنر تھے، کے نام ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

از کیمپ بالائے دہلی مورخہ ۱۴ جون ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس

میں یہاں سے ابھی دہلی کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ اور ہر گھڑی مجھے یہ امید ہوتی ہے کہ ہماری توپیں شہر کی دیواروں کی توپوں کو خاموش کر سکتی ہیں اور مجھے اس قابل بنا سکتی ہیں۔ کہ کامیابی کی معقول امید کے ساتھ قریب پہنچ کر اس مقام پر قبضہ کر لوں۔ لیکن ان باغیوں کی توپوں کی زیادتی میری ہمت پست کیے دیتی ہے۔ پس اب جب کہ واقعہ ہے۔ میرے سامنے اور مجھے کسی چیز کا خوف نہیں۔ سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں۔ کہ میں ایک اچانک اور زبردست حملہ کر دوں مگر ان روشن راتوں میں یہ کام آسان نہیں معلوم ہوتا۔

میں صرف چھ توپوں کا انتظام کر سکا ہوں۔ اور ان کے چلانے والے بھی بالکل ناتجربہ کار ہیں۔ یہ باغی حیوان تقریباً ہر روز باہر نکلتے ہیں۔ اور دو دفعہ تو میں نے انہیں نقصان کے ساتھ واپس بھیجا۔ لیکن میرے سپاہی بھی نہ تھے جاتے ہیں۔ اور مجھے ان کی بہت کچھ حوصلہ افزائی کرنی پڑتی ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ آٹھویں تاریخ سے لے کر اب تک اوپر تلے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں

---

(۱) ابن الوقت (ڈپٹی نذیر احمد) صفحہ ۴۳

وہ آٹھویں تاریخ کے بعد سے اپنے نقصانات کا اندازہ دو ہزار سے زیادہ کرتے ہیں۔
لیکن مجھے شک ہے کہ اس میں وہ تعداد شامل نہیں کی گئی جس کا پتہ نہیں لگتا۔

جب آپ حقارت آمیز طریقہ سے دہلی کی فصیلوں کا ذکر کر رہے تھے۔ تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے آپ لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ ۲۴ پونڈ وزنی گولہ پھینکنے والی توپیں باغیوں کے برجوں میں ہر جگہ نصب ہیں۔ اور اُن کے پیچھے تقریباً ۰ ہزار سپاہی بھی موجود ہیں۔ ایسی حالت میں داخلہ آسانی کے ساتھ نہیں ہو سکتا اور میرے انجنیئر کہتے ہیں۔ کہ ہم باقاعدہ خندقیں بنا کر قلعہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور میرے توپ خانہ والے بھی یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم ان توپوں کو جو میرے پاس ہیں نہیں چلا سکتے۔ پس اب میرے پاس ایک تدبیر رہ گئی ہے۔ اور اسے بھی پوری طرح آزما لینا چاہیئے۔ اگر اس میں ناکامیابی ہوئی تو میرے پاس کوئی محافظ فوج باقی نہ رہے گی۔ اور یہ گویا بالکل تباہی کے آثار ہوں گے۔ ہندوستان کے لیے کون سی بات کم مضرت رساں ہے۔ یہ کہ امدادی فوج (کمک) کے انتظار میں تضیع اوقات کی جائے۔ یا ناکامی کے خطرہ کو برداشت کیا جائے

وہ باغی اپنی ہذیری آمد (حملہ) کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور اس لیے مجھے اپنے مراسلہ کو جلد ختم کر دینا چاہیئے۔ مسز بارنس سے میرا سلام کہہ دیجئے۔

آپ کا صادق۔ ایچ۔ ایچ برنارڈ

ہار کر بھی ہتھیار نہیں ڈالے

غالب انگریزوں کے بہت زیادہ مدّاح اور عقیدت مند تھے۔ انہوں نے۔ انگریزوں کی فتح و کامرانی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ کتنا دل آویز اور ساتھ ہی ساتھ مبنی بر حقیقت بھی ہے۔

اٹھارہ مارچ بروز پنج شنبہ شام کے وقت گرد دل شاد۔ توپوں کی آواز نے خبر دی کہ لکھنؤ میں کامل طور پر انگریزوں کا تسلّط ہو گیا۔ اپریل کے مہینے میں حکیم محمود خاں صاحب کے ساتھیوں نے جو

---

(۱) محاصرہ دہلی کے خطوط، صفحہ ۱

اس وقت تک حوالات میں تھے رہائی پائی۔ اور حکیم صاحب اپنے عزیز اقربا کے ساتھ پٹیالہ روانہ ہوئے۔ مئی کے شروع میں خبر آئی کہ انگریزی سپاہ نے مراد آباد باغیوں سے خالی کرا لیا اور فتح کے بعد مراد آباد نواب یوسف علی خاں صاحب والی رام پور کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بریلی کو فتنہ پرداز باغیوں سے خالی کرایا۔ چنانچہ اب قوی امید ہے کہ انگریزی سپاہ ہر جگہ باغیوں کا قلع قمع کر دے گی۔ اور پھر تمام ہندوستان از سر نو سرکار انگریزی کے سایۂ عدل انصاف میں آجائے گا۔

۱۳ جون یک شنبہ کے روز شام کے وقت بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ کو بلا کر حکم جان بخشی سنایا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک ہزار روپے ماہوار کے وظیفہ کا مژدہ سنایا گیا۔

۲۲ جون کو ۲۱ توپوں کی سلامی نے خبر دی کہ انگریزی سپاہ کی جانبازانہ کوششوں سے گوالیار اور قلعہ گوالیار فتح ہو گیا۔ جس کی مختصر روداد یہ ہے کہ باغیان سرکش دیگر مقامات کی طرح گوالیار پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ راجہ گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ شہر اور شہر یاری چھوڑ کر آگرہ بھاگ گیا اور انگریزوں سے مدد مانگی۔ انگریزوں نے ایک جرار فوج سے اس کی مدد کی چنانچہ راجہ نے انگریزی فوج کی مدد سے باغیوں کو شکست فاش دی۔"

پھر باغیوں کی حالت بتائی ہے، الفاظ میرے ہیں لیکن کیا یہ ان کے بلند حوصلوں کو داد کا مستحق نہیں کرتے؟

باغیوں کا جو کچھ حشر ہوا وہ ان کے کردار کی کافی سزا تھی۔ یہ گمراہ سرکش ہر طرف سے ہزیمت پا کر گوالیار پہنچے لیکن جب وہاں بھی شکست فاش کھائی تو مدت تک رواں دواں پھرتے رہے اور رہزنی لوٹ مار کرتے پھرے۔ آخر کار ہر جگہ نہایت ذلت و خواری کے ساتھ ایک ایک کر کے مارے گئے۔ (۱)

---

(۱) غالب کی فارسی تاریخ غدر (دستنبو)

ملک دشمنوں کی سرکوبی انگریزوں کی فتح یابی کے بعد بہت سے "باغی" گروہ منتشر ہو گئے، اور انہوں نے ان لوگوں کی سرکوبی اپنا مقصد حیات بنا لیا، جو انگریزوں کے دوست اور ملک کے دشمن ثابت ہوئے تھے۔ انہیں ڈاکو اور لٹیرا کہا گیا۔ لیکن یہ اپنا کام کرتے رہے۔

"۔ نواب ججھر کے خسر عبدالصمد خاں ڈھائی سَو سوار لے کر بادشاہ کی مدد کو آئے تھے اور برابر بادشاہی فوجوں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتے رہے۔ جب تلنگے بھاگے تو یہ بھی ان کے ساتھ بھاگے۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا گروہ ہے۔ اور اب ڈکیتی کرتے پھرتے ہیں۔"[1]

ہندو بھی ان مسلمان حریت پرستوں کی آگ ان کے ساتھیوں تک بھی پہنچی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، چنانچہ مرزا غالب بتاتے ہیں :

اگرچہ دہلی میں فتنہ فرو ہو گیا۔ مگر ابھی بدکردار باغیوں نے ایک طرف بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں شورش برپا کی ہے۔ اور دوسری طرف سے ہند اور میوات کے علاقے میں فتنے کی آگ بھڑکا رکھی ہے تلارام نامی ایک شخص نے کچھ دنوں ریواڑی میں شورش برپا کی پھر دیویا میو کے ساتھ مل کر میوات کے پہاڑ اور جنگلات میں انگریزوں کے مقابلے کے لیے آمادہ ہوا ۔ (۲)

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ، صـ۱۶

(۲) غالب کی فارسی تاریخ غدر "دستنبو"

باب ۳۹

غدر کے بعد سفاکی اور درندگی کے مظاہر

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

•

انگریز جب فاتح اور کشورکشا کی حیثیت سے اپنا پرچم اقبال لہراتے ہوئے دلّی میں داخل ہوئے تو اُن کے ساتھ کئی چیزیں تھیں، تیغ و تفنگ، لشکرِ جرار، ساز و سامان، سیم و زر کے انبار، تیر و شمشیر، توپ اور بندوق لیکن ایک چیز ان کے لیے عنقا کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے وہ یکسر محروم تھے اور وہ تھی "انسانیت" ———— ! انگریز دلی میں آ گئے لیکن انسانیت چھوڑ آئے تلواروں سے زیادہ ان کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا وہ شیر اور چیتے سے زیادہ خونخوار بن کر داخل شہر ہوئے اور ان کی خون آشامی کا ہدف بننے سے کوئی نہ بچ سکا۔ نہ فقیہ شہر، نہ رندمے آشام نہ امیر کبیر، نہ غریب فقیر۔ ان کی تلوار بجلی کی طرح چمکتی تھی اور برق بن کر لوگوں کے خرمن حیات پر گرتی تھی اور ہر جاندار شے کو خاکستر کر کے رکھ دیتی تھی۔

فرنگی سامراج کے دامن پر بہت سے سیاہ دھبے ہیں لیکن غدر کے بعد جس دیدہ دلیری، شقاوت، سفاکی اور بہیمیت کے ساتھ انھوں نے گناہ گاروں سے زیادہ بے گناہوں کا قتل عام کیا جس طرح عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں تک کو نشانہ بنایا اور ان کی بے بسی و بے کسی کا تماشہ دیکھ دیکھ کر مارا اور قتل کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اتنا بڑا دھبہ ہے کہ آب کوثر سے بھی دھویا اور صاف نہیں

کیا جا سکتا۔

اب ہم جستہ جستہ اور چیدہ چیدہ واقعات اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں :-

شہر کس طرح خالی کرایا گیا —؟

•

مسلمان عورتوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے کنویں

•

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے
بڑی پُر درد ہے اپنی کہانی

دلّی کی فتح کے بعد غیرت مند اور عصمت مآب عورتوں کی بپتا کتنی لرزہ خیز تھی۔
بعض غیرت مند عورتوں نے اپنے بے عصمت ہونے کے خوف سے اور گھر سے باہر نکل کر بے پردہ در بدر خاک بسر پھر کر جینے سے مرنے کو اچھا جانا، وہ کنوؤں میں مرنے کے لیے کود پڑیں کنوؤں میں عورتیں اتنی گریں کہ پانی میں ڈوبنے کی جگہ نہ رہی پھر جو ان پر اور عورتیں گریں وہ زندہ رہیں جب مال کی تلاش میں گورے ان کنوؤں کے پاس گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان میں عورتیں زندہ ہیں، انھوں نے ان پر رحم کھا کر خود کنوؤں میں اُتر کر ان کو زندہ نکالا، ایسی عورتیں مدتوں تک مُردوں سے بدتر زندہ رہیں۔[۱]

قتل، پھانسی، کالا پانی

دلّی پر تسلط حاصل کرنے کے بعد، انگریزوں نے ظلم و جور میں اپنے دل کی کوئی حسرت اٹھا نہ رکھی۔

فتح کے بعد دلی میں مارشل لا، جرنیلی قانون جاری ہُوا۔ اور ایک فوجی گورنر مقرر ہُوا اور سارے

۱؎ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)، ص۷۰۵

شہر میں گھر گھر تلاشی ہونے لگی کہ کہیں باغی بھیس بدلے نہ بیٹھے ہوں چنانچہ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور پھانسی پر چڑھائے گئے۔ اور جب آتش انتقام ٹھنڈی ہوئی تو پھر سیکڑوں جزائر انڈیمان یعنی کالے پانی بھیجے گئے۔ لیکن جو پھانسیاں چاندنی چوک میں گاڑی گئیں تھیں ان پر بیشمار آدمی لٹکائے گئے۔ قیامت کا نمونہ اور نفسی نفسی کا معاملہ تھا۔[۱]

جس دوست کو پوچھا یہ سنا قتل ہوا وہ

فرنگی غلبہ اور تسلط کے بعد قتل عام شروع ہوا۔ اس خون ریزی کے بعد دہلی

میں قتل عام شروع ہوا جس کی بابت انگلستان کا ایک مؤرخ اسپنسر والپول لکھتا ہے کہ:۔

"وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ مار نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے وہاں جائز رکھی۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے تھے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ والپول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے انتیس ۲۹ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ستائیس ۲۷ ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔ غریب بادشاہ و زینت محل کی حویلی میں قید تھا۔ خوراک کے لیے پانچ روپیہ روزینہ ملتے تھے۔ وہ اس ظلم و ستم کی خبریں روز سنا کرتے تھے۔"

مشتاق تھے جس کے خبر آئی کہ مُوا وہ
جس دوست کو پوچھا یہ سنا قتل ہوا وہ[۲]

فوج کو تین دن تک لوٹنے کی اجازت

فاتح فوج کو تین دن تک عام لوٹ مار کی اجازت دیدی گئی

۱؎ : واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول البشیرالدین احمد ۱۹۲ ؁

۲؎ : ملاحظہ ہو قیصر التواریخ

اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر اس مہذب فوج کے متمدن سپاہیوں نے کیا کیا، ملاحظہ فرمایئے

انگریزی سپاہ میں زیادہ تر سکھ، پنجابی و سرحدی قومیں تھیں جو غارت گری کے پیشہ میں بڑا کمال رکھتی تھیں وہ اپنے اس پیشۂ آبائی کو کبھی بدسلیقگی سے نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ ان سے جس قدر ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ لوٹا گیا لوٹا، وہ شکاری کتوں کی طرح سجھولی پہنے گلی کوچوں میں پھرتیں وہ دیواروں پر تھپکیاں مار کرکے پہچان لیتی تھیں کہ اس کے اندر روپیہ تو نہیں ہے، وہ زمینوں پر پانی ڈال کر اس کے جذب ہونے سے پہچان لیتی تھیں کہ اس میں مال تو نہیں دبا ہوا ہے۔ وہ یقین کر چکی تھیں کہ دہلی میں تاروں کا خزانہ بھرا ہوا ہے وہ سیم و زر و جواہر و گوہر کی کان ہے۔ وہ اس لالچ و طمع میں دور و دراز فاصلہ سے لڑنے آئیں، اور لڑائی کی نہایت سخت مصیبتیں اٹھائیں اور آفتیں جھیلیں اس سپاہ کا یہ حق تھا کہ سرکار اس کو تین دن کی اجازت دیتی کہ وہ شہر کو جس طرح چاہیں لوٹیں، اس تین دن کی لوٹ کے بعد سپاہ نے خود درخواست کرکے پرائز ایجنسی کا ایک محکمہ مقرر کرایا جس کا یہ کام تھا کہ تین دن کے لوٹنے کے بعد شہر کا کل مال و متاع، سب قسم کا جو لوٹ سے بچے یکجا جمع کرے اور اس کو نیلام کرکے فروخت کردے اور زرِ قیمت جو ہاتھ لگے وہ اُس کو سپاہ میں تقسیم کردے یہ محکمہ بھی لشکریوں کی لوٹ کو روک نہ سکا، جب ان کا لوٹ کا مال شہر کے دروازے سے باہر لے جانا بند ہو گیا تو انھوں نے اس کو لے جانے کی یہ ترکیب نکالی کہ آپس میں مل کر دو گروہ بنتے، ایک شہر کے اندر آن کر مال کو فصیل کے باہر اُتارتا، دوسرا اس کو اکٹھا کر لے جاتا۔

اب پرائز ایجنسی کے محکمہ کے کارپردازوں نے اس کے کاموں کو آپس میں تقسیم کر لیا، کسی نے شہر کے تہخانوں کو توڑ کر اور زمین کو کھود کر مال نکالنے کا کام شروع کیا، اس کارپرداز کا نام کھدیکا صاحب ہندوستانیوں نے رکھا تھا۔ کسی کارپرداز نے کتابوں کے جمع کرنے کا کام لیا کسی نے برتنوں و چارپائیوں و چلیوں کے جمع کرنے کا۔ جب تلنگے شہر میں گھسے تھے تو اہل شہر نے سیم و زر و زیور و جواہر کو زمین کے اندر دفن کیا تھا اور ہر قسم کے اسباب لباس و برتنوں وغیرہ کو کوٹھریوں میں اور کوٹھیوں میں بند کرکے دو پردے تیغہ نامعلوم لگا دیا تھا، اگرچہ یہ کام انھوں نے اپنے معتبر

مزدوروں سے کرایا تھا، مگر جب ان تیغہ کرنے والوں کو معلوم ہوا کہ کھدنی کے ایک صاحب ایسے مقرر ہوئے ہیں کہ جو ان کو تیغہ کے اندر کا اور زمین کے نیچے کا مال اسباب بتاتا ہے، تو ہن کو وہ فیصدی مال کی قیمت پر روپیہ دیتے تھے تو وہ راج مزدور مخبر بن گئے اور کھدنی کے صاحب کے پاس جاکر جو تیغے انھوں نے لگائے تھے، بتلا دیئے۔

صاحب وہ تیغے توڑتے اور زمین کھودتے اور مال و اسباب برآمد کرتے اور اس کو لدوا کر گوداموں میں بھر واتے، منصور خاں کی حویلی میں شہر کے اندر تانبے پیتل کے برتن بھرے جاتے پروفیسر رامچندر کی کوٹھی میں سے ایک دفینہ برآمد ہوا۔ جس میں ساٹھ ہزار روپیہ ڈیک کے سکے کے تھے، جس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ اس پرائز ایجنسی کے سوا ایک اور طریقہ بھی امیرل کے لوٹنے کا تھا کہ بعض ذی اختیار انگریز مجرموں کو سب طرح سے بری ہونے کی اسناد دے دیتے اور ان سے خاطر خواہ روپیہ لیتے تھے، مشہور ہے کہ حامد علی خاں اور مفتی صدر الدین خاں اور مکند لال مصر نے اسی طرح زر کثیر دے کر اپنی جانیں بچائی تھیں۔ ایک صاحب جوان بخت بادشاہ کے بیٹے کو ہاتھی کی عماری میں بٹھا کر زینت محل کے مکان میں لال کنویں بیٹے گئے اور جوان بخت سے دھمکا کر سارا حال زینت محل کے مال کا پوچھ لیا اور اس کو نکال کر معلوم نہیں خود لیا یا پرائز ایجنسی کے حوالے کر دیا۔[1]

مسلمان ہونا جرم تھا

مسلمان جہاں زیادہ تر جاکر رہتے تھے، جیسے قدم شریف وغیرہ ہیں وہاں سرجھونپس مٹکف جاکر حلقہ ڈالتے یعنی خاص حدود کو محدود کر کے پولیس سے گھیر لیتے اور جو مسلمان جوان تنومند یا وجیہ ہوتے تو پچاس پکڑ کے کوتوالی بھیج دیتے۔ ان کو مختلف طرح کی سزائیں دیتے۔

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۱۴ ؛

[2] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۱۳ ؛

صدہا مخبر چھوٹے ہوئے تھے اور جا بجا سے دلی کے آدمی گرفتار ہو کر دلی میں لائے جاتے تھے اور دلی میں تین پھانسیاں کھڑی تھیں ہر روز سینکڑوں پھانسی پر کھینچے تھے اور مٹکاف صاحب شکار کھیلتے پھرتے تھے جس کو جوان دیکھتے طمنچے سے شکار کرتے اور کچھ پرسش قصوری و بے قصوری کی نہ تھی۔ چنانچہ بہت سے بے قصور اشخاص اور شرفاء دلی کے جن میں اکثر امیرزادے بھی تھے۔ مثل نواب محمد حسین خاں اور نواب مظفر الدولہ اور میر محمد حسین وغیرہ ساکنان محلہ بلّی ماراں الور سے گرفتار ہو کر دلی کو آئے تھے جب مقام گڑگانواں پہنچے، تو حاکم قلعہ نے حکم دیا ان کو دلی لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ ان کا یہیں فیصلہ ہوا چاہئے اور ان غریبوں کو وہیں باڑہیں ماری گئیں اور ان کا کام تمام کر دیا گیا دلی میں ہزاروں بے گناہ پھانسی پا گئے۔[1]

دلی ——— یا لاشوں کا شہر

ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے انگریز آقاؤں کا حکم پا کر ہندوستانی دارالسلطنت کی کیا گت بنائی

اسے دیکھنے کے لیے پتھر کا دل چاہئے:۔

رابرٹس صاحب اپنی تاریخ جہل ویکسالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ہم صبح کو لاہوری دروازہ سے چاندنی چوک گئے۔ تو ہم کو شہر مُردوں کا شہر نظر آیا ہے۔ کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نہ سنائی دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا۔ ہم بہت ہولے سے بولتے تھے خوف تھا کہ آواز سے مُردے چونک نہ پڑیں اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کے اعضا کتے بھنبوڑ کے کھا رہے ہیں، دوسری طرف لاشوں کے گرد گِدھوں کے جھنڈ ان کے گوشت سے مزے لے رہے ہیں وہ ہماری آواز سن کر کھانے کو چھوڑ کر تھوڑے فاصلہ پر جا بیٹھے تھے تو ہم کو بڑی عبرت ہوئی تھی اور دل رنجور

---

[1] : داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) صفحہ ۱۴۰

ہوتا تھا، بہت سے مردے زندہ معلوم ہوتے تھے، بعض مردے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے ہیں، غرض ان مردوں کی کیفیت نہیں بیان ہو سکتی، ہم کو ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا، ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر ڈر کے مارے بدکتے اور ہنہناتے تھے، مُردوں کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں، ان کے تعفن سے ہوا میں بدبو بیمار کرنے والی اٹھتی تھی، ایک دو انگریز رحمدل لکھتے ہیں کہ دلی کے باشندے اگرچہ بالکل نہیں مگر آدھے بے قصور شہر کے گرد و نواح کے دیہات مقامات میں پڑے ہوئے ہلاک ہو رہے ہیں۔

ان سب کیفیتوں کی مجموعی ہیئت سے ایک ایسا سماں بندھا ہوا تھا کہ جس کو دیکھ کر پتھر بھی پگھل جاتے ہے

کبھی کچھ دیکھ کر آنکھوں سے آنسو تھم نہیں سکتا
کبھی کچھ سوچ کر دل زیر پہلو تھم نہیں سکتا

کسی زبان کے اس شعر کا ترجمہ جان لارنس کی لائف میں لکھا ہے۔[۱]

سکھوں نے تنومند اور خوبصورت مسلمانوں کو مار ڈالا

مسلمانوں کا قتلِ عام کس طرح ہوا یہ داستان کتنی جگر گداز ہو مگر ہے قابلِ مطالعہ:-

شہر کے ملٹری گورنر کرنل برن صاحب مقرر ہوئے، انھوں نے چاندنی چوک میں قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اقامت کی۔ ایک سپاہ گشتی مقرر کی کہ وہ دن بھر سارے شہر میں چکر لگائے جہاں آدمیوں کی آبادی پائے ان کے پاس پکڑ لائے، چنانچہ بہت دنوں تک یہ سپاہ دن بھر شہر میں پھرتی اور آباد گھروں میں سے عورتوں بچوں مردوں کو پکڑ لاتی، یہ گرفتاری بھی بڑی دردانگیز تھی

---

[۱] تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ، ص

عورتیں بچوں کو گود میں لیتیں مرد اوڑھنے بچھونے کا پشتارہ سر پر رکھتے ،محمد یکم پاس آتے ان کے پاس جو اسباب بیش قیمت نکلتا وہ چھین لیا جاتا ، اور جو اسباب ایسا ہوتا کہ وہ کسی قیمت پہ بک نہیں سکتا ہے دے دیا جاتا ، کوئی برتن بھانڈا نہیں لے جا سکتے تھے پھر وہ پہرہ کی حوالات میں لاہوری دروازہ سے باہر چھوڑ دیئے جاتے کہ جہاں ان کے سینگ سمائیں ، وہاں چلے جائیں بہت ہی کم خوش نصیب لوگ ایسے تھے جو روپیہ ، پیسہ اور اوڑھنا بچھونا لے کر شہر سے باہر نکلے ہوں ۔ اس طرح سارا شہر خالی ہو گیا تھا مگر اس میں ایک محلہ نیل کا کٹڑہ لالہ مہیسری داس کمسریٹ کے گماشتہ کی خیر خواہی کے سبب سے آباد تھا ۔ یہ غدر اس محلہ کے لیے ، مبارک ہوا ، دس پانچ گھر اور آباد تھے ، اگرچہ سرکار کی طرف سے شہر میں خیر خواہوں کو اپنے گھروں میں آباد رہنے کے سرٹیفکیٹ مل گئے مگر یہ سرٹیفکیٹ ان کو لوٹ مار سے بچا نہ سکتے تھے ، گو شہر میں وہ آباد رہ سکتے تھے مگر خوف کے سبب سے اپنا سارا مال و اسباب چھوڑ کر باہر چلے گئے ۔

ایک خانگی عورت نے اپنا گھر اس طرح خوب بچایا ۔ کہ اس کی کسی زمانہ میں کسی انگریز کرنل سے آشنائی تھی اور اس سے اولاد بھی ۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی جن کو باپ کے مرنے کے بعد ان کے وصیت نامہ کے موافق بہت دولت ہاتھ آئی تھی ۔ دن ماں بیٹیوں نے انگریزی لباس پہن کر اپنے تئیں اپنے کو انگریز بنایا اور اسناد وراثت دکھائی اور کالوں کے ہاتھ سے جو مصیبت اٹھائی تھی ، کچھ سچی کچھ جھوٹی بتائیں وہ بھی آباد رہیں ، شہر میں تو ایک محلہ اور چند گھر آباد تھے ، مگر قلعہ میں تو صفا چٹ تھا اس میں ایک گھر بھی نہ تھا مگر شہر کے اشراف زادیوں اور امیر زادیوں کو جو بے پردگی کی دولت اور پیادہ روئی کی تکلیف اٹھانی پڑی وہ کسی دشمن کو بھی پیش نہ آئیں ۔

غرض وہ عورتیں جنھوں نے کبھی اپنے دروازے سے باہر قدم نہ رکھا تھا وہ پیادہ پا دو چار قدم مشکل سے چل کر گر پڑتی تھیں ۔ مگر پھر ان کو اٹھ کر چلنا پڑتا تھا ۔ پاؤں میں چھالے پڑے ہوئے تھے ۔ وہ عورتیں جو کہ نامحرموں کی نگاہ کے سامنے آنے کو موت سے بدتر جانتی تھیں وہ بے پردہ صحرا نوردی کرتی تھیں ۔ غرض اس وقت طفل عورت ، اور مرد جوان پر جو مصیبت

پڑی وہ کبھی جب سے دہلی آباد ہوئی تھی کاہیکو پڑی تھی، ان کو کسی پہلو سے کل نہیں آتی تھیں، مگر ان میں سے ہزار ہا کو اجل نے کل سے بٹھایا۔ ہیضہ نے بھی رحم کیا کہ دنیا کی ذلت و مصیبت سے چھڑا دیا جب سپاہ نے شہر میں قدم رکھا تو اس کے سامنے جو مرد آیا، اس کو وہ گولی مارتے۔ اس وقت دوست دشمن و مجرم میں تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ مگر جب سارے شہر میں قبضہ ہو گیا تو انگریزی سپاہ کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ سپاہ میں گورکھے اور گورے نھوڑے تھے وہ گلی کوچہ میں سوائے بڑے بازاروں کے پھرتے بھی نہ تھے۔ مگر سکھ اور پنجابی اور سرحدی سپاہی بہت تھے وہ کوئی گلی کوچہ ایسا نہ تھا کہ جس میں نہ جاتے ہوں سکھوں کے گرو تیغ بہادر کو جب سے دہلی کے بادشاہ نے قتل کیا تھا وہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، وہ جس گلی کوچہ میں کسی مسلمان کو وجیہہ و تنومند جوان دیکھتے اس کو نشانہ بنا کے دل ٹھنڈا کرتے، ان کے ہاتھ بہت سے معزز خاندانی مسلمان جو اپنی بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے مارے گئے۔ وہ بوڑھے باپوں کے سامنے ان کے جوان بیٹوں کو مار ڈالتے اور باپ کو کہہ دیتے کہ چلا جا۔ غرض حسین اور وجیہہ مسلمانوں کو اتنا انھوں نے مارا کہ دلی میں خوش شکل صورت مسلمانوں کا وجود ہی کم ہو گیا، اگر دلی کے مسلمانوں کی پہلے اور اب کی صورتیں ملا کر دیکھی جائیں تو معلوم ہو گا کہ غدر نے ان کی حسامت و جاہت و صورت کو بہت بدل دیا ہے۔[1]

سرکاری دستاویزات سے مظالم کی تائید

غدر کے بعد دلی کے مسلمانوں پر جو بے پناہ مظالم ٹوٹے

ان کی تصدیق و تائید خود انگریزی دستاویزوں سے بھی ہوتی ہے۔ پادری ایڈورڈ روز کی طویل **تحقیقات** کا مختصر خلاصہ کر کے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

مبالغہ آمیزی کے تمام خطروں سے بچنے کے لیے یہ سب سے بہتر ہو گا کہ فتح کے بعد تباہ کن ایام کے واقعات کو اپنے الفاظ میں نہیں بلکہ ان مراسلات اور خطوط کے الفاظ میں بیان کر دیا

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۰۰ ؛

جائے، جنھیں میں نے حکومت ہند کے خفیہ محکمہ کی جانب سے شائع کردہ دو جلدوں سے نقل کیا ہے میں حتی الامکان اختصار سے کام لوں گا۔

سب سے پہلے سی۔ بی۔ سانڈرس کمشنر دہلی کی یادداشت ہے جو اس نے ولیم میور (بعد کو سر ولیم میور) کے نام آگرے بھیجی تھی، وہ لکھتا ہے:۔

تمام فوج سراسر اور کُلی طور پر گمراہ ہو گئی تھی اور حملہ کے تین چار گھنٹوں کے اندر ہی —— نظم و نسق کا خاتمہ ہو گیا، کئی دن تک ہماری گورا فوج نشے کے ہذیان میں مبتلا رہی۔ اسی افسر ولیم میور کے نام ایک دوسرے مراسلہ میں ذیل کے الفاظ تحریر کئے تھے:۔

جنرل ولسن نے حکم دیا تھا کہ حفاظتی ٹکٹ اس وقت تک کارآمد نہ ہونگے جب تک کہ ان پر خود ان کے تصدیقی ثبت نہ ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم اشخاص کو پناہ مل سکی سرکاری مال غنیمت جمع کرنے والے ایجنٹ اور فوج کے سپاہی عام طور پر یہ چاہتے تھے کہ یہ اصول بنایا جائے کہ دہلی کا سارا شہر فوج کی ملکیت ہے جسے حملہ کر کے فتح کیا گیا ہے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ ذاتی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو بھی ٹھکانے لگائیں۔ بسا اوقات یہ بیان کیا جاتا ہے کہ گوروں میں جو جنونی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ زیادہ تر وہ کہانیاں تھیں جو انگریز خواتین کی عصمت دری کے بارے میں مشہور ہو گئی تھیں جنھیں دورانِ غدر میں قتل کر دیا گیا، چونکہ باغیوں کے خلاف یہ الزام بار بار دہرایا گیا ہے اور سنسنی پیدا کرنے والے ناولوں کا موضوع رہا ہے جنھیں خصوصیت کے ساتھ ایسے مصنفین نے لکھا ہے جنھوں نے غدر کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے اس لیے اس مقام پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام براہ راست شہادت پیش کر دی جائے جو غدر کے بعد موقع پر لی گئیں تھیں مسٹر ولیم میور جو شمالی اضلاع میں محکمہ سراغ رسانی کے سب سے بڑے افسر تھے ۳۰ دسمبر ۱۸۵۷ء کو ذیل کے الفاظ لکھتے ہیں:۔

"حکومت کے صدر مقام آگرہ میں سراغ رسانی کے محکمہ کے ساتھ جو میرا تعلق رہا ہے اس کی وجہ گزشتہ چھ مہینے کے اندر ملک کے تمام حصوں کے قاصدوں اور جاسوسوں سے ملنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔ بڑی حسرت کے اپنی تصدیق کا اضافہ کرتا ہوں کہ میرے

علم میں کوئی ایسی چیز نہیں آئی۔ جو نہایت معمولی طریقہ سے بھی عصمت دری کی ان داستانوں کی تائید کرتی ہو، جو ہماری کتابوں یا اخبارات میں درج ہیں۔ جہاں کہیں براہِ راست شہادت دستیاب ہو سکی ہے وہ مستحکم طور پر تکذیب کرتی ہے۔ ایک خصوصی تحقیقاتی کمیشن بھی بٹھایا گیا تھا کہ وہ فوراً تحقیقات کرے یہ کمیشن شہر دہلی کی تسخیر کے بعد ہی آگرہ میں بیٹھا تھا اور ۱۸۵۸ء کے اختتام کے پیشتر اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا جس پر مسٹر ڈبلیو۔ میور پہنچے تھے، کہ اس قسم کی بے حرمتی کے واقعات ظہور میں آئے[1]

دادرسی یوں بھی ہوتی ہے

مرزا غالب فرماتے ہیں کہ "ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا، حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہو کر املاک مانگتے ہیں۔ قبضہ و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر ہے۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون ہے؟ عرض کیا کہ اصل نام میرا محمد بخش ہے ممو مشہور ہوں۔ فرمایا اچھی بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، اور حافظ ممو بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں ممو اپنے گھر چلے آئے۔[2]

کبوتروں کی کئی نسلیں فنا ہو گئیں

انگریزوں کی سفاکی اور دہشت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اہلِ شہر جو اپنی بدحواسی کے باعث کبوتروں کو کابکوں میں اور ناشتادوں، لالوں، پدڑیوں اور طوطوں، میناؤں کو اپنے پنجروں میں بند چھوڑ گئے تھے ان کی جانوں نے تو آب و دانہ کے نہ ملنے سے قفس ہی سے پرواز کی اور جو لوگ ان کابکوں اور پنجروں کو

---

۱ : ذکاء اللہ دہلوی اسی ایف ریڈریوز، ص ۱۰۹۔

۲ : غالب کا روزنامچہ ص ۔

کھول کر ان پرندوں کو آزاد کر گئے تھے۔ ان میں سے کبوتر تو چھیریوں کے شکار ہوئے یا بھوکے پیاسے مر گئے۔ ان کا ایسا ستیاناس ہوا کہ ان کی بعض نسلیں جو مخصوص دہلی سے تھیں ایسی فنا ہو گئیں کہ پھر دہلی میں نہیں پیدا ہوئیں ۔[1]

الملک اللہ والحکم اللہ

پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے اُس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے کر ٹکٹ لے گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائیے آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر میں بسنے کی کون صورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملک اللہ والحکم اللہ !

مسلمان کس طرح مٹے ؟ ہندو کس طرح بنے ؟

منشی ذکا اللہ کا شمار ان لوگوں میں ہے، جو انگریزوں کے معرف تھے، وہ ان کے ہر بُرے کام کی تاویل کرنا سعادت سمجھتے تھے، لیکن وہ بھی حقائق بیان کرنے پر مجبور ہیں، ان حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک کا بگڑنا دوسرے کے بننے کا پیش خیمہ ہوتا ہے، یہ بتلانا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کے پاس لٹنے سے پہلے کتنے روپے کا مال تھا اور بعد لٹنے کے کتنا باقی رہا۔ مگر اس بات کا بتلانا کچھ مشکل نہیں کہ وہ کس کس طرح لوٹے گئے اور ان کی دولت کس کس کے پاس گئی؟ بہادر شاہ کو لاکھ روپیہ ماہوار اور چند نوابوں اور رئیسوں کو ہزاروں روپیہ کی پنشن ملتی تھی، وہ سب سرکار کے قبضہ میں ضبط ہو گیا ہے۔

گو مسلمان سُود لینے کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر پرومیسری نوٹوں کے سُود لینے کو بعض سنّی مسلمان اور کل شیعہ علی العموم حلال سمجھتے تھے۔ ان کے پاس پانچ سات لاکھ روپیہ کے نوٹ تھے۔ ان مسلمانوں کو یقین تھا کہ انگریزی عملداری یقینی ہو گی خریدتے تھے۔ اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ نقد روپیہ جو ان کے گھر

---

(۱) غالب کا روزنامچہ صفحہ ۲۰۔۲۱

میں ہے۔ وہ وبالِ جان ہے۔ اس کو باغی لوٹ لیں گے یا بادشاہ ڈنڈ یا قرض میں لے۔ یکا اس کی جگہ نوٹوں کا لینا بہتر ہوگا۔ غرض کئی لاکھ روپے کے نوٹ مسلمانوں نے ۵۴ روپیہ سینکڑہ کے بھاؤ سے بیچ ڈالے ان کے اس نقصان سے ہندوؤں کو فائدہ پہنچا۔

مسلمانوں کا سارا اسباب جو پرائز ایجنسی نے یکجا جمع کیا تھا وہ زیادہ تر ہندوؤں نے نیلام میں بہت ارزاں خریدا جس کے سبب سے بہت سے ہندوؤں نے اس شہر میں اس مال و اسباب کی دوکانیں کھول کر خوب فائدے کمائے۔ باغی مسلمانوں کے جو مکانات ضبط ہو کر نیلام ہوئے وہ سب ہندوؤں نے بہت ہی سستے خریدے۔ اب ان کی قیمت دس بیس گنی ہوگئی ہے۔ بڑے بڑے مکانات جو مسلمانوں کے تھے۔ جیسے کلاں محل، مرزا خجستہ بخت کی حویلی۔ جھجر والوں کا کوٹھی شیش محل۔ نواب منصور خاں کی حویلیاں جو ایک محلہ کے برابر تھیں، سب ہندوؤں کی خریداری میں آگئیں،

جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملک سے ایک مکان نہ تھا۔ غدر کے بعد ان میں سے بہت مکانات ان کی ملکیت ہوگئے تھے،

مسلمانوں نے اپنی ضرورتوں کے سبب سے اپنا زیور جو گڑا دبا نہ کیا تھا بہت سستا ہندوؤں کے ہاتھ بیچا۔ بارہ آنہ تولہ چاندی، چودہ پندرہ روپیہ تولہ سونا۔ غرض انگریزی سپاہ کی تین دن کی لوٹ میں اور پرائز ایجنسی کی لوٹ میں تو ہندو مسلمان میں کچھ تمیز نہ تھی دونوں برابر تھے مگر اس سبب سے کہ شہر میں ہندو مسلمانوں سے پہلے آباد ہوئے اور ان کو مسلمانوں کے مال و اسباب و مکانات کے خریدنے مقدور تھا انھوں نے فائدہ کمایا۔ ہندوؤں کے گھر اوٹے مگر اتنے برباد نہ ہوئے تھے جتنے خوش حال ہوئے۔ بہت سے ہندوؤں کے گھر میں غدر سے پہلے آبادی کی بہ نسبت زیادہ دولت مند ہوگئے۔ جب ہندو آباد ہوگئے ہیں تو لال ڈگی پر ان کی دکانوں کی قطاریں اور لوٹ کے اسباب کی لگی تھیں جو انھوں نے سپاہیوں سے لوٹ کا یا چوری کا بہت ارزاں خریدا تھا (۱)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۱۶

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

دلّی کی خوبصورت اور خاندانی لڑکیاں غدر کے بعد کتنی پست اور سستی ہو گئی تھیں؟ :

(۱)

یہ شریف زادیاں

تین علاوہ ان شہزادیوں کے اندصدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کیا، راتوں کو برقع اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی یا کھڑی رہتیں - اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتیں۔ بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا - اگر کوئی شخص کبھی کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے یا کچھ کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں، جن میں سے بعض صورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں - جو خود کبھی صدہا روپے کی خیرات کرتی تھیں، اب کوڑیاں مانگتی ہیں جن کے آگے دو دو چار چار ماماٸیں کام کرتیں تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں، بعض بڑی حسین عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگنوں کو بھی رشک آتا تھا، اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر میں بیٹھ گئیں، دلّی میں پہلے بہت ہی کم خانگیوں کے گھر تھے، اشراف کبھی اپنے محلوں میں آباد نہیں ہونے دیتے یا پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلّہ میں ایسے تین چار گھر ضرور ہوتے -(۱)

(۲)

یہ بدقسمت عورتیں

جب ہزارہا مسلمان مارے گئے تو ان کی بوڑھی و جوان عورتیں بیاہی و کنواری لڑکیاں لاوارث ہوئیں، انگریزی سپاہ میں ایسے مسلمانوں کی کمی کب نہ تھی، جو غنیمت سمجھتے تھے کہ کوئی خوبصورت عورت دلّی کی ہاتھ لگ جائے۔ ایسی عورتیں تلاش کر کے نکاح پڑھوا لئے اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے - ان عورتوں نے یہ اپنی خوش نصیبی جانی کہ ان کو خاوند ایسا ہاتھ لگ گیا جس کے پاس لوٹ کا زیور اور ندی گوٹے کا لباس پہنانے کو تھا۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاءاللہ) ص ۷۱۱

اور روٹی کھانے کو تھی! (۱)

ستم ظریف گورے

انگریزی فوجیں جب دلی میں داخل ہوئیں تو مسلمان تو اپنے گھروں سے نکل گئے، لیکن؛

مگر بلیاں اپنے گھر سے باہر نہ نکلیں، ان کی خوش قسمتی سے بعض محلّوں میں گوروں کے پکٹ بٹھائے جاتے تھے۔ وہ ان کے پاس جمع ہو جاتیں تھیں جو ان کو کچھ کھانے کو دے دیتے تھے مگر ان کو اچھال اچھال کر یہ تماشا بھی دیکھتے تھے کہ وہ خواہ کتنی بلندی سے انھیں پھینکیں وہ ہمیشہ اپنے چاروں پاؤں کے بل گرتی تھیں کبھی کبھی یہ کھیل بلّیوں کی موت کا باعث ہو جاتا تھا۔ (۲)

انگریز ہر حالت میں تاجر ہے

غدر کے بعد مسلمانوں کو دلی میں داخلہ کی اجازت نہ تھی، لیکن جب ایک عرصہ کے بعد انھیں اپنے لٹے ہوئے گھروں میں داخلہ کی اجازت ملی تو بہ چند شرائط کے ساتھ:

جب سر جان لارنس دہلی میں آئے تو انھوں نے مارچ ۱۸۵۸ء میں دہلی میں مسلمانوں کے آباد ہونے کا حکم دیا، شہری مسجد میں منشی دیوکی نندن جو چوکیدارہ کا بخشی تھا آنکر بیٹھا۔ اسکے پاس چوکیدارہ کا رجسٹر تھا اس کے موافق سرٹیفکیٹ مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں میں آباد ہونے کے لیے تقسیم کیے۔ اس آباد ہونے کے ساتھ یہ حکم بھی تھا کہ ڈیڑھ روپیہ دے کر دو چار پائیاں اور ایک چکّی وہ مول لیں، اس کے سوا چار پائیاں اور چکیاں جو سارے شہر کی جمع ہوئی تھیں آسانی سے فروخت ہو گئیں جب مسلمان اپنے گھروں میں آباد ہوئے تو ان کے مکانوں میں نہ کوئی اسباب تھا نہ ان کے دروازوں کے کواڑ ان کے ویران گھروں کے کواڑوں کو ان لوگوں نے جو شہر میں آباد تھے بڑی بیدردی سے ایندھن کی طرح جلایا۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلیشیہ از ذکاء اللہ ص۳۱۲

(۲) 〃 〃 〃 〃 〃 ص۳۱۲

مسلمانوں کی تباہی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ مئی ۱۸۵۸ء میں ان کی آبادی کا جو تخمینہ کیا گیا تو موجودہ باشندے آبادی سابق کی ایک چوتھائی بھی نہ تھی، ۱۸۵۹ء تک مسلمانوں کے مکانات سرکاری ضبطی سے چھوٹے نہیں تھے اور نہ ان کے اخراج کا حکم منسوخ ہوا۔ وہ شہر کے اندر بغیر کسی افسر کے پاس کیے نہیں آسکتے تھے۔ (۱)

غالب نے بھی مسلمانوں کیلئے سرکاری پاس کا ذکر کیا ہے

یہ تو آفت دلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے

لکھنؤ کے علاوہ دوسرے شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی، اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں، میں نے بھی دیکھے فارسی عبارت یہ ہے

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بشرط ادخال جُرمانہ۔" مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر مقرر ہے۔ آج پانچہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے کل اتوار یوم التعطیل ہے، پرسوں دوشنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔ (۲)

عجیب انکشاف

ذکا اللہ جو کچھ خود اپنے قلم سے نہ لکھ سکے وہ ان کے دوست پادری سی الیف انڈریوز نے لکھ دیا ہے:

دہلی کی تسخیر کے بعد کئی دن تک کسی کی زندگی محفوظ نہ تھی۔ قتل کے واقعات عام طور پر ہو رہے تھے، تشدد تقریباً ہمہ گیر تھا، ذکا اللہ اپنی نازک حساس فطرت کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان کے متعلق سب کچھ سن رہے تھے اکثر اوقات انھیں مجبوراً یعنی شاہد بننا پڑا؛ اور یہ مناظر ان کے دماغ سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ جس پروفیسر سے انھیں بے حد محبّت تھی اور جس کا دنیا میں وہ سب سے زیادہ احترام کرتے تھے یعنی مولوی امام بخش صہبائی جو ولی صفت انسان تھے، ان کا

---

(۱) تاریخ عروج عہدِ انگلشیہ (ذکا اللہ) ص۶۱۲

(۲) غالب کا روزنامچہ ص۴۹

قتل غالباً ذکاءاللہ کی تمام المیہ داستان میں سب سے دردانگیز واقعہ تھا۔ باغیوں کے خلاف جو نفرت انھیں پہلے ہوگئی تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے مسٹر ٹیلر اور دوسرے انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے سب ہی شامل تھے۔ قتل کردیا تھا۔ وہی نفرت اب انھیں اس فاتح فوج کے خلاف ہوگئی جس نے فتح کی حالت میں بے انتہا ناقابل بیان مظالم کیے تھے۔ (۱)

کرے کوئی بھرے کوئی

انگریزی انصاف وعدالت کا شاہکار

زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے بازپرس ضرور ہوتی مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ اسے لو کئی دن ہوئے کہ حمید خان گرفتار ہو کر آیا ہے، پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، حوالات میں ہے دیکھیے کہ حکم آخر کیا ہو، نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں تو سو روپیہ مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپیہ مہینہ تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا۔ (۲)

انارکلی کا مقبرہ گرجا گھر بن گیا

دلّی تو دلّی، دلّی کے باہر بھی، انگریزوں کی انتقام پسند طبیعت اپنا کام کرتی رہی:

مقبرہ انارکلی جہاں اب بعملداری سرکار انگریزی گرجا گھر مقرر کیا گیا ہے اب وہاں ایک ساعت کلاں انگریزی جس کا آواز تمام چھاؤنی انارکلی میں جاتا تھا اور خود بخود بجتی ہے نصب کی گئی ہے۔ (۳)

---

(۱) ذکاءاللہ دہلوی (سی الف اینڈ ریوز) ص ۱۱۳

(۲) غالب کا روزنامچہ ص ۲

(۳) تاریخ چشتی

عیسائیوں کو نصاریٰ کہنے پر پھانسی

غدر کے بعد، فتحمندی نے، انگریزوں کو کتنا نازک مزاج بنا دیا تھا، اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوگا:

سرسیّد مراد آباد ہی میں تھے کہ اُن کو معلوم ہوا کہ بعض اضلاع میں مسلمانوں کی بعض تحریریں ایام غدر کی ایسی پیش ہوئیں جن میں انگریزوں کو لفظ نصاریٰ سے تعبیر کیا تھا حکام نے اِس لفظ کو بھی بغاوت سمجھا اور ان کے لکھنے والوں کو وہ سزائیں دی گئیں جو ان کی قسمت میں لکھی تھیں اس وقت جیساکہ سرسیّد نے لکھا ہے مسلمانوں کی ہر ایک بات بُرے پہلو پر ڈھالی[1] جاتی تھی انگریزوں نے جو بعض مسلمانوں کی تحریروں میں اپنی نسبت نصاریٰ کا لفظ دیکھا تو انھوں نے یہ خیال کیا کہ جس طرح یہودی حضرت عیسٰیؑ کو حقارت سے ناصری (یعنی قریہ ناصرہ کا رہنے والا) کہتے تھے اسی طرح مسلمانوں نے انگریزوں کو نصاریٰ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

سرسیّد نے اس غلطی کے رفع کرنے کو فوراً ایک رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ میں رکھا، اور اس کو اُردو اور انگریزی میں چھپوا کر حکام اور گورنمنٹ کو اس کے مضمون سے مطلع کیا ہم کو اس کتاب کے لکھتے وقت وہ رسالہ دستیاب نہیں ہُوا مگر جو کچھ سرسیّد نے زبانی بیان کیا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے مشتق نہیں بلکہ نصر سے مشتق ہے اور مسلمان اس وجہ سے کہ قرآن سے ایسا ثابت ہوتا ہے اس کو نصر سے مشتق سمجھتے ہیں نہ کہ ناصرہ سے کیونکہ قرآن میں صاف آیا ہے کہ جب حضرت عیسےٰؑ نے کہا : من انصاری الی اللہ تو حواریوں

---

(۱) غدر کے چند سال بعد دلی میں بھی ایک اسی قسم کا اشتباہ پیدا ہوا تھا دلی کالج کے ایک مسلمان پروفیسر نے ایک ایڈریس کے مسودہ میں عیسائی کی جگہ ترسا کا لفظ لکھ دیا تھا جو فارسی میں راہب یعنی منک کو کہتے ہیں کالج کے ایک یورپین افسر نے اس کو حقارت کا لفظ سمجھا اور نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس لفظ کو مسودہ میں سے کٹوا دیا۔

نے کہا نحن انصار اللہ اور اسی لیے حواریوں کی پیروی کرنے والوں اور عیسی پر ایمان لانے والوں کو اسی صفات کے ساتھ جس کی حواریوں نے حامی بھری تھی موصوف کیا گیا ہے اور ان پر نصاریٰ کا اطلاق کیا گیا ہے قرآن میں کہیں قریہ ناصرہ کا ذکر نہیں آیا اور نہ کہیں حضرت عیسیٰ کو ناصری کہا گیا ہے اس کے سوا قرآن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائی آنحضرت کے زمانہ میں خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے جیسا کہ سورہ مائدہ کی اس آیت میں بیان ہوا ہے

ترجمہ

(یعنی اے محمدؐ تو پائے گا اہل کتاب میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا دوست ان کو جن کا قول ہے کہ ہم نصاریٰ ہیں) جہاں تک معلوم ہوا اس رسالہ کی اشاعت کے بعد پھر کسی سے اس لفظ پر مواخذہ نہیں ہوا ہم نے سنا ہے کہ جب یہ رسالہ شائع ہوا تو کسی انگریزی اخبار میں یہ لکھا تھا کہ سید احمد خان کا بیان غلط ہے کیونکہ کسی شخص کو نصاریٰ کا لفظ لکھنے پر سزا نہیں ہوئی اس پر ایک معزز یورپین افسر نے اس کا جواب دیا اور لکھا کہ خود ہمارے سامنے ایک شخص کو اسی جرم میں پھانسی دی گئی۔(۱)

دلی کو پنجاب میں بھی شامل کیا گیا؟

دلی پہلے، صوبہ جات متحدہ کے ماتحت تھی پھر اسے پنجاب میں شامل کر لیا گیا لیکن کیوں؟

۱۱ جنوری ۱۸۵۸ء کو مارشل لا اُٹھ گیا اور دلی سول عہدہ داروں کے تفویض کی گئی اور جولائی کے مہینہ میں عدالت ہائے دیوانی کھل گئیں۔ غدر کے اودھم میں دفاتر کی بڑی بربادی ہوئی بہت حصہ دفتر کا ضائع ہو گیا، ۲ فروری ۱۸۵۸ء میں دلی کو ممالک مغربی شمالی (یو پی) سے نکال کر پنجاب میں داخل کیا گیا اس استحقاق سے کہ فتح کا سہرہ پنجاب ہی کے سر تھا حصار اور دلی کے ۲ ضلعے قائم ہوئے۔

یکم نومبر کو کمپنی برخاست اور ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ نے حکومت اپنے دست قدرت

---

(۱) حیات جاوید (حالی) صہ ۶۹

بن لی - (۱)

مسلمان امرا کی داستان درد

غدر کے بعد، تباہی صرف دلّی ہی پر نہیں آئی، ہر جگہ مسلمان مٹے، اور برباد ہوئے،

ایک ممتاز انگریز آئی سی ایس لکھتا ہے:

اگر کسی خاص مثال کی ضرورت ہو تو میں ناگر کے نوابوں کی مثال پیش کر سکتا ہوں، پہلے پہل جب انگریزوں کو ان سے واسطہ پڑا تو ان کی سالانہ آمدنی دو صدیوں کی غلطیوں اور فضول خرچیوں کے باوجود پچاس ہزار پونڈ تھی۔ ان کی مسجدیں اور لاتعداد بارہ دریاں ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چاروں طرف چلی گئی تھیں، نواب کی خانگی سیڑھیوں سے ہر روز ایک سنہری بجیرا استانہ دار اس جزیرہ کا رُخ کرتا تھا جو اس جھیل کے عین وسط میں واقع ہے اور زنگا رنگ کے پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ محل کے دروازہ پر سپاہی پہرہ بدلتے رہتے تھے اور جب آفتاب غروب ہونے کے قریب ہوتا تھا تو شہزادیوں کے باغات سے بچّوں کے کھل کھلانے اور خواتین کی شیریں آوازیں سننے میں آتی تھیں مگر اب سوائے فلک نما ڈیوڑھی کے اس محل کا کوئی نشان باقی نہیں۔ مسجد کے بے بام و در دیواروں سے استرکاری کی تمام زیبائش مٹ چکی ہیں۔ وسیع و عریض باغ اور ان کی صاف ستھری نہریں ویرانہ ہیں۔ اب ان میں چاولوں کی کاشت ہوتی ہے، اور ان کے زنگا رنگ مچھلیوں والے تالاب گندے اور سڑے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ بارہ دریوں کی جگہ اب صرف اینٹوں کا ملبہ ہے، کہیں کہیں اگر کسی دیوار کا کوئی حصہ نظر آجاتا ہے تو عربی وضع کی کسی کھڑکی سے اس نظارے پر اور بھی حسرت برسنے لگ جاتی ہے۔

مگر ان میں سب سے زیادہ حسرت ناک منظر شاہی جھیل کا ہے جس کے کنارے محل اب بھی استادہ ہے جو پرانے زمانہ کا خوبصورت اور ستونوں والا محل نہیں بلکہ ایک ویران کھنڈر

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی (حصہ اوّل) بشیر الدین احمد صہ ۵۹،

ہے۔ اس کی خراب وخستہ دیواروں کو سطح آب پر جمی ہوئی کائی سے بڑی ہی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ وہ بدنصیب خواتین جو کبھی شہزادیاں کہلاتی تھیں اب کبھی بھی شام کی سیر کو پردہ دار بجیروں میں نہیں نکلتیں۔ ان کے زنان خانوں پر چھت تک باقی نہیں اور ان کے مکیں اب ان معمولی مکانوں میں چلے گئے ہیں،

میں نے بنگال کے مسلمان نوابوں اور کاشتکاروں کے حالات ذرا وضاحت سے بیان کیے ہیں، تاکہ انگریزوں کے سامنے ان لوگوں کا نقشہ کھینچ دوں جن کی شکایات کا بیان اس باب میں بیان کیا جائے گا۔ میں یہ بھی بتلادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے، کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اُٹھایا ہے پھر اگر میں دوسروں کو یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہوا کہ یہ بیانات تمام مسلمان ہند پر صادق آتے ہیں۔ تو مجھے اس پر معاف فرمایا جائے۔ (۱)

غدر کے بعد مسلمانوں کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں

اب ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں بھی جہاں اب بھی پرانے طریقہ کے مطابق دوستی کی بنا پر ملازمت مل جانے کا امکان ہے، بہت کم مسلمان افسر ہیں جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں باقی ہیں، وہ بہت بوڑھے ہیں۔ ان کا کوئی جانشین مسلمان نہیں۔ ابھی دس سال ہوئے ناظر یا مالگذاری کے افسر کی اسامیاں مسلمانوں کے مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں، مگر اب جیل کی ایک دو غیر معتمد اسامیوں کے سوائے ہندوستان کے یہ سابق فاتح اور کسی ملازمت کی اُمید نہیں رکھ سکتے۔ مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۲۴

ذمہ دار اسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں بھی سرکاری اسکول کے چالاک ہندو لڑکوں سے پُر کی جاتی ہیں۔

لیکن اس تسلیم شدہ حقیقت کی اور مثالیں پیش کرنا جو سول لسٹ کے ہر صفحہ سے عیاں ہیں غیر ضروری ہے، میں نے ان گزیٹڈ ملازموں کی ایک فہرست تیار کی ہے جن پر ہندو مسلمان اور انگریز سب فائز ہو سکتے ہیں۔

بنگال میں سرکاری ملازمتوں کی تقسیم اپریل ۱۸۷۱ء میں،

	یورپین	ہندو	مسلم	کل تعداد
اکونٹنٹ سول سروس جن کا تقرر انگلستان میں بادشاہ کیطرف سے ہوتا ہے	۲۶۰	۰	۰	۲۶۰
عدالت ہائے دیوانی کے افسر غیر منظور شدہ اضلاع میں	۴۷	۰	۰	۴۷
اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر	۲۶	۷	۰	۲۳
ڈپٹی مجسٹریٹ و ڈپٹی کلکٹر	۵۳	۱۱۳	۳۰	۱۹۶
انکم ٹیکس اسیسر	۱۱	۴۳	۶	۶۰
رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ	۳۳	۲۵	۲	۶۰
عدالت خفیفہ کے جج اور سب جج	۱۴	۲۵	۸	۴۷
منصف	۲	۱۷۸	۳۷	۲۱۶
محکمہ پولیس تمام گریڈ کے افسر	۱۰۶	۳	-	۱۰۹
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ انجینیئر	۱۵۴	۱۹	۰	۱۷۳
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کا ماتحتی عملہ	۷۲	۱۲۵	۴	۲۰۱
پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ اکونٹنٹ	۲۲	۵۴	۰	۷۶
میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میڈیکل کالج جیل خیراتی ڈسپنسری حفظان صحت	۸۹	۶۵	۴	۱۵۸
چیچک کا ٹیکہ اور اضلاع کے میڈیکل افسر	۳۸	۱۴	۱	۵۳
محکمہ تعلیم و دیگر محکمہ جات چونگی بحری افسر افیون سروے	۴۱۲	۱۰	۰	۴۲۲
کل میزان ۲۱۱۱	۱۳۳۸	۶۸۱	۹۲	۲۱۱۱

ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب

ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا، ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے جو ان کے سابق فاتح اپنے دسترخوان سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی مسلمانوں اور ہندوؤں کا اور یورپینوں کا تناسب ایک دو کا، مسلمانوں اور یورپینوں کا تناسب ایک اور چودہ کا تمام نظام حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت اجارہ داری تھی کم ہوتے ہوتے ایک تیس رہ گیا - اور وہ بھی ان گریڈ ملازمتوں میں ہے ۔ جہاں خاص طور پر تناسب کا خیال رکھا جاتا ہے، پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے ۔ ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے اور اصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے، قلی اور چپڑاسی دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں ۔ (۱)

مالِ غنیمت میں سپاہیوں کا حصہ

تین دن کی عام لوٹ کے بعد بھی کروڑوں روپیہ کا مال واسباب اور نقد چھینا گیا لیکن سرکار نے وعدہ خلافی کی، اور سپاہیوں کو اس نعمت سے محفوظ رکھا،

لوگ کہتے تھے کہ انگریزوں کی پکڑ بڑی زبردست ہے لوگوں کو برسوں خمیازہ بھگتنا پڑا، مطلب یہ تھا کہ جس طرح تیمور اور نادر شاہ نے قتل عام کر کے ایک دم پاپ کاٹ دیا تھا یہاں برسوں تک دار وگیر کا سلسلہ جاری رہا، لوٹ کے مال واسباب کی بھی چھان بین بڑی سختی سے کی گئی، میجر جنرل ولسن نے مال غنیمت سپاہیوں کو دلانے کا وعدہ کیا تھا لیکن لارڈ کیننگ نے

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۲۴۲

کہا کہ یہ اقرار و قرار میں کچھ نہیں جانتا لوٹ کا مال حق سرکار ہے نہ کسی اور کا ان جان جوکھوں کی جنگی خدمات کا معاوضہ سولجروں (سپاہیوں) کو چھ چھ مہینے کا بھتہ دیا گیا جس کی ایک بہت جزوی رقم اڑتیس روپیہ کی ہوئی بہت سے لوگ لنگڑے لولے اور لنجے ہو گئے اور ایک زخمی سولجر نے دیوار پر چاک سے گھسیٹ دیا تھا کہ

(۱)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جب سنا تو لارڈ کیننگ کے حکم میں اتنی ترمیم کر دی کہ رقم کو ڈبل کر دیا، یہ تھا وہ صلہ جو غدر کے میدان لڑنے والے بہادروں کو ملا۔(۲)

صلۂ وفا

اور غدر میں، جن لوگوں نے اپنی جان پر کھیل کر، اور سر ہتھیلی پر رکھ کر، سرکار انگریزی کی گراں بہا خدمت انجام دی تھی، انھیں ملا بھی تو کیا؟

واضح ہو کہ بغرض اس خیر خواہی کے جو اس ہنگامہ میں رات دن ملازمان سرکار دولتمدار سے ظہور میں آئی سرکار دولتمدار نے بموجب رپورٹ جناب مسٹر الگزنڈر شیکسپیر صاحب بہادر دام اقبالہ مورخہ ۵ جون ۱۸۵۸ء سید احمد خان صدر امین بجنور کو عہدۂ صدر صدوری مراد آباد پہ مقرر فرمایا اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن حین حیات ان کے بڑے بیٹے کے مقرر فرمائے اور محمد رحمت خان ڈپٹی کلکٹر بجنور کو دیہات زمینداری متصل خورجہ ضلع بلند شہر میں جس کی جمع مالگزاری پانچ ہزار روپیہ سالانہ سے کم نہو مرحمت فرمائی اور میر تراب علی تحصیلدار کو اوپر عہدۂ فاخرہ ڈپٹی کلکٹری و ڈپٹی مجسٹریٹی کے ممتاز فرمایا اور دیہات زمینداری ضلع آگرہ میں جس کی جمع مالگزاری ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ سے کم نہو مرحمت ہونے تجویز فرمائے۔(۳)

---

(۱) دلی فتح ہو گئی، ہندوستان بچا لیا گیا (کٹنے میں صرف) نی لڑائی

(۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول (بشیر الدین احمد) صہ ۴۴۳

(۳) تاریخ سرکشی بجنور (سر سید احمد خاں)

غالبؔ کی آہ شرربار

غدر کے بعد مسلمانوں کی دلّی میں کیا حالت تھی، اسے غالبؔ کی زبان سے سنئیے:

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دلّی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کیا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

باب ۴

بہادر شاہ کا مقدمہ

کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

یہ لال قلعہ ہے !

تیموری جاہ و جلال اور شان و شکوہ کا مرکز !!

یہاں پہلے پہل شاہجہان اعظم کا پرچم لہرایا تھا جس کے دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم تھا کہ وقت کے بڑے بڑے ملوک و سلاطین اس کے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتے تھے، یہیں عالمگیر اورنگ زیب حکمت پر متمکن ہوا تھا جس کی ہیبت اور سطوت کی یہ کیفیت تھی کہ دیارِ غیر کے عالی مرتبت سفرا الزماں نذر ساں اس کے حضور میں حاضر ہوتے تھے، یہی وہ مقام ہے جہاں بابر اور ہمایوں، اکبر اور جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کی اولاد نے انحطاط آشنا ہونے کے باوجود ——— کم از کم اس چار دیواری کے اندر ——— شکوہِ خسروی اور داب شاہی کی زندگی بسر کی اور آج اسی لال قلعہ میں خاندان تیموری کا آخری تاجور اور عظیم مغل سلطنت کا آخری فرمانروا، فرنگی عدالت کے کٹہرہ میں ایک بے یار و مددگار ملزم کی حیثیت سے حاضر ہے آج نہ اس کے گرد فوج و سپاہ ہے نہ مصاحبوں اور نمک خواروں کا جمِ غفیر ——— میلے کپڑے، بال پریشان، نہ کوئی ہمدم نہ دمساز نہ رفیق نہ یاور، نہ غمگسار نہ چارہ ساز، وہ ہے اور اس کی تمنائے ناکام، وہ ہے اور نوشتہ تقدیر آج اس کی قسمت کا فیصلہ وہ کر رہے ہیں جو اس کے محکوم اور تابعدار تھے، جو اس کے نمک خوار اور خادم تھے، جو اس کے حضور میں اس طرح حاضر ہوتے تھے جس طرح شاہ کج کلاہ کے دربار میں ایک چاکر حاضر ہوتا ہے آج وہ ملزم ہے، باغی ہے، غدار ہے جو اس کی درازیٔ عمر و ترقیٔ اقبال کے دعا گو تھے آج وہ اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں ؎

مد [یار اغیار ہو گئے اللہ
انقلابات ہیں زمانہ کے]

یہ بڑی دل دوز روداد ہے لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاریخ کی ایسی کڑی ہے جس کے بغیر غدر کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ آیئے باچشم پرنم یہ داستان بھی پڑھ لیں۔

بہادر شاہ کے مقدمہ کی پوری تفصیل اگر درج کی جائے تو بجائے خود ایک کتاب کی ضخامت چاہیئے کوئی شبہ نہیں اس داستان میں عبرت و بصیرت اور موعظت کے بہت سے پہلو ہیں لیکن نہ داستان میں اتنی تاب تکلم ہے کہ ساری کہانی کو سنائے۔ نہ سننے والوں میں اتنا یارا ہے کہ یہ قصہ غم سنتے رہیں اور پہلو نہ بدلیں، بہتر یہی ہے کہ طول کلام پر اختصار کو ترجیح دی جائے۔ بہر حال یہ داستان کا ایک ٹکڑا ہے پوری داستان نہیں :

قیدی بادشاہ

قبل اس کے مقدمہ کی روداد بیان ہو، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عدالت کا منظر دیکھ لیا جائے جہاں بہادر شاہ آخری مغل تاجدار کو ایک بے بس قیدی کی حیثیت سے پیش کیے گئے تھے موت و زیست کا فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو کبھی اس کے قدیمی خاص ہونے پر نازاں تھے جو اس پر فخر کرتے تھے کہ بادشاہ جم جاہ کے محافظ ہیں، وکیل ہیں جان نثار ہیں :

سر جان لارنس صاحب کے حکم سے بادشاہ کی تحقیقات جرائم کے لیے ایک کمیشن ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو مقرر ہوا جس میں غلام عباس بادشاہ کا وکیل اور میجر ہیریٹ گورنمنٹ کا وکیل تھا اس کمیشن کا اجلاس دیوان خاص میں ہوتا تھا جس میں بہادر شاہ قیدیوں کی طرح آتا اور بلنگڑی پر کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹتا جہاں اس نے جاہ و حشمت کا تماشہ علوس کیا تھا وہاں اس کے جرموں کی شہادت دینے کے لیے بعض چپڑاسی اور چوبدار آتے اور اس کی طرف قیدی کا خطاب کرتے[1]

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلیسیہ (ذکاء اللہ) ص ۳۱

فوجی کمیشن

انگریزی فوجی کمیشن کی کارروائی جو بتاریخ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو بمقام دہلی بحکم میجر جنرل پینی سی، بی کمانڈنگ افسر اور حسب ہدایت سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب اس غرض سے منعقد ہوئی کہ اس قسم کے جو قیدی حاضر ہوں ان کے اظہار لیں۔

پریزیڈنٹ

لفٹیننٹ کرنل ڈاوس۔ توپ خانہ ؛

ممبران

میجر پامر شاہی توپ خانہ نمبر ۶۔ میجر ریڈ منڈ شاہی نمبر ۶۱ رجمنٹ، میجر سائرز شاہی نمبر ۶، قرابین بردار۔ کپتان روتھن نمبر ۴، سکھ پیدل ترجمان۔ مسٹر جمس مرفی ؛

وکیل سرکار

ممبر ایف۔ جے ہیریٹ۔ ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل

پہلے دن کی کارروائی ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء دن کے گیارہ بجے قلعہ دہلی کے دربار خاص میں اجلاس منعقد ہوا۔ پریزیڈنٹ ممبران و ترجمان و ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل موجود تھے۔ عدالت قائم کرنے اور منعقد کرنے اور لفٹیننٹ کرنل داوس توپ خانہ کے پریزیڈنٹ مقرر کرنے کے بعد احکام پیش کئے اور سنائے گئے۔

ان افسروں کے نام جو عدالت میں کام کرنے کے لیے مقرر ہوئے تھے، قیدی کو سنائے گئے ؛

طلبِ دعوےٰ

سوال: عدالت (خطاب بہ قیدی بادشاہ) پریزیڈنٹ یا کسی اور افسر کے جو فوجی کمیشن میں اجلاس کرے گا اپنے مقدمہ میں سماعت کرنے پر تمہیں کچھ عذر ہے؟

جواب: نہیں:

پریزیڈنٹ و ممبران و ترجمان و ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل نے حلف اٹھایا۔ کل گواہوں کو باہر کردیا۔ الزامات پڑھے گئے اور حسب ذیل درج مثل ہوئے ۱؎:

الزامات

باوجود سلطنت برطانیہ ہند کا پنشن خوار ہونے کے ۱۰ مئی و یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانہ میں مختلف اوقات پر اس نے محمد بخت خان توپ خانہ کی رجمنٹ کے صوبیدار و مختلف اشخاص ویسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ہندوستانی کمیشن افسروں اور نامعلوم سپاہیوں کو سلطنت کے خلاف غدر و بلوہ کرنے میں جرأت و امداد دی اور اعانت کی۔

۱۰ مئی و یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانے میں مختلف اوقات پر بمقام دہلی اپنے بیٹے مرزا مغل رعیت و حکومت برطانیہ مذکور دیگر نامعلوم اشخاص باشندگان دہلی و صوبہ ممالک مغربی و شمالی ہند کو جو نیز حکومت برطانیہ مذکور کی رعایا تھے، سلطنت کے خلاف بلوہ کرنے اور لڑنے میں جرأت و امداد دی و اعانت کی۔

درصورت رعایا حکومت برطانیہ ہند ہونے کے حق اطاعت کا خیال نہ کیا اور بمقام دہلی ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء یا اس کے قریب کی کسی تاریخ میں سلطنت سے نمک حرامی کرکے اپنے تئیں بادشاہ شہنشاہ ہند مشہور و ظاہر کیا اور دغابازی سے دہلی پر بے ضابطہ قبضہ کرلیا اور علاوہ ازیں ۱۰ مئی اور یکم اکتوبر

۱؎: چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) صفحہ ۱۱۲

کے درمیانی عرصہ میں مختلف اوقات پر شل نمک حراموں کے مرزا مغل و محمد بخت خاں رجمنٹ صوبے دار توپ خانہ اور دیگر نامعلوم مفسدہ پردازوں کے ساتھ سلطنت کے برخلاف سرکشی کرنے اور لڑائی لڑنے میں مفسدانہ سازش و مشورہ اور اتفاق کیا اور نیز سلطنت برطانیہ ہند کے انہدام اور غارت کرنے اور اپنے مفسدانہ منصوبے پورے کرنے کے لیئے مسلح فوج کو جمع کیا اور سلطنت برطانیہ مذکور کے خلاف لڑنے کے لیئے روانہ کیا۔

یہ کہ ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء یا کسی قریب کی تاریخ پر بمقام دہلی قلعہ کی چار دیواری کے اندر ۴۹ آدمیوں کو قتل کرادیا اور قتل کرنے میں مدد دی جن میں خاص کر انگریزی عورتیں، بچے اور دو غلے انگریز شامل تھے اور مزید برآں ۱۰ مئی و یکم اکتوبر کے درمیانی عرصہ میں مختلف سپاہیوں اور دیگر اشخاص کو انگریزی النسل اور دیگر انگریزی رعایا کو جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے قتل کرنے کی جرائت دی اور اعانت دی اور اس کام کے لیئے قاتلوں کو ملازمت ترقی و خطابات دیئے اور وعدہ کیا، نیز یہ کہ ہندوستان کے خود مختار والیی حکمرانوں کو احکامات بھی دیئے کہ انگریزوں کو جب کبھی بھی اپنی حدود میں دیکھیں قتل کر ڈالیں یہ فعل کل یا اس کا کوئی جزو ہندوستان کی قانونی کونسل کے ایکٹ ۱۶ مصدرہ ۱۸۵۷ء کے مطابق جرم عظیم ہے۔

دستخط ایف جے ہیریٹ میجر

ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل و وکیل سرکار

سوال: محمد بہادر شاہ جو الزامات تمہارے خلاف قائم کیے ہیں تم ان کے مجرم ہو یا نہیں؟

جواب: مجرم نہیں ہوں :

تمام گواہ باہر کر دیئے گئے۔ [1]

۲۹ جنوری ۱۸۵۸ء یوم جمعہ

دربار خاص میں اس دن پھر عدالت منعقد ہوئی، امیر مجلس و ممبر ترجمان اور ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل موجود تھے قیدی عدالت

---

[1] چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۱۱۶

میں لایا گیا اور غلام عباس بطور معاون کے لایا گیا۔ ترجمان نے اصل کاغذات فارسی میں ملاحظہ کیے اور جس کا
ترجمہ جج ایڈوکیٹ نے دوسرے دن پڑھا تھا۔ یعنی نمبر [illegible] تک' غلام عباس اب بطور گواہ قرار
دیا گیا۔ جج ایڈوکیٹ نے اظہار لیے۔

سوال: ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو تم کہاں تھے جبکہ مفسد رسالہ میرٹھ سے آئے؟

جواب: میں اسی دربار خاص کے دروازے پر تھا۔

سوال: جو کچھ تم نے اس موقع پر دیکھا بیان کرو۔

جواب: قریب آٹھ بجے صبح کے میں نے سنا کہ کمپنی کے رسالہ کے پانچ یا چھ سوار آئے اور
بادشاہ کے خلوت خانے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بے تحاشا غل مچایا جس پر بادشاہ نے
اپنے خواص میں سے کسی کو حکم دیا کہ دیکھو یہ غل کیا ہے؟ ان میں سے ایک شخص جھروکے میں گیا
یہ سواروں سے کچھ باتیں کرکے بادشاہ کے پاس واپس آ گیا۔ میں بادشاہ کے ساتھ ان کے خلوت خانے
میں گیا اور پھر حسب الحکم میں کپتان ڈگلس کو لے آیا۔ بادشاہ نے کپتان ڈگلس سے استفسار کیا کہ ان
کو کچھ اس معاملے کی خبر ہے یا نہیں' نیز یہ کہ یہ فوج کیوں آئی ہے اور کہا کہ فوراً مناسب بندوبست
ہونا چاہیے۔ کپتان ڈگلس نے درخواست کی کہ وہ نیچے کے دروازے سے جاکر باغیوں سے بات
کریں گے۔ لیکن بادشاہ نے ایسا نہ ہونے دیا کہ مبادہ باغی ان کو مار ڈالیں اور بادشاہ نے کہا کہ اگر
تم ان سے باتیں کرنا چاہتے ہو تو جھروکے میں سے کر لو اس کے بعد کپتان ڈگلس دربار خاص کے کمروں
اور شاہی کمروں کے درمیان برآمدے میں آئے اور ادھر سے اس مقام کو دیکھا جدھر سے باغی جمع
تھے۔ میں کپتان صاحب کے ساتھ کٹہرے تک آیا' کپتان ڈگلس نے سواروں سے کہا کہ اس طرف مت
آؤ' بادشاہ کی محلسرا ہے اور اس طرف تمہارا آنا ان کی بے عزتی ہے۔ اس پر سب چلے گئے کپتان ڈگلس نے
کہا کہ قلعہ اور شہر کے دروازے فوراً بند ہو جائیں مبادہ یہ لوگ شہر میں گھس آئیں اس کے بعد
کپتان ڈگلس انتظام کرنے چلے گئے اور میں حکیم احسن اللہ خاں دربار خاص کے اس کمرہ میں آ بیٹھا
ابھی ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ ڈگلس صاحب کا ملازم دوڑتا ہوا آیا اور ایک رقعہ حکیم صاحب کو دے کر کہا

صاحب یاد فرماتے ہیں حکیم صاحب کے کہنے پر میں ان کے ہمراہ گیا جو آدمی ہم کو لینے آیا تھا اس نے
کہا کپتان صاحب سلح خانے میں ہیں، مگر جب ہم وہاں پہنچے تو وہ واپس جا چکے تھے۔ اس وقت ہم
نے دیکھا کہ دریا گنج کی جانب بڑا دھواں اُڑ رہا ہے اور کچھ راہگیروں سے معلوم ہوا کہ باغی شہر میں
گھس آئے ہیں اور انھوں نے بنگلوں میں آگ لگا دی ہے۔ ہم قلعہ کے لاہوری دروازے کے اوپر
جہاں ڈگلس صاحب کی فرودگاہ تھی گئے اس جگہ ہم کو معلوم ہوا کہ کپتان صاحب تیسرے کمرے میں
ہیں اور درمیانی کمرے میں مسٹر فریزر صاحب تھے، حکیم صاحب کپتان صاحب سے ملنے چلے گئے اور
میں فریزر صاحب کے کہنے پر ان کے ساتھ واپس آگیا اور انھوں نے مجھے حکم دیا کہ میں بادشاہ سلامت
سے جا کر کہوں کہ کپتان ڈگلس صاحب کے مکان کی حفاظت کے لیے دو توپیں اور کچھ سپاہ پیادہ
بھیج دیں اور فریزر صاحب اور ان کے ہمراہ جو انگریز تھے، زینہ سے اترے، فریزر صاحب کے ہاتھ
میں غلاف دار تلوار تھی۔ اور دوسرے صاحب کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں بندوق تھی میں
جلدی سے فریزر صاحب سے پہلے بادشاہ کے پاس پہنچا اور ان کو کپتان فریزر کا پیغام دیا انھوں
نے فوراً دو توپیں اور پیادہ سپاہ کا ایک دستہ کپتان ڈگلس کی فرودگاہ پر بھیجا ÷

حکیم احسن اللہ کا حصہ

اسی وقت حکیم صاحب پہنچے اور انھوں نے کہا کہ دو پالکیاں بھیج
کر ان میموں کو بلا لیجیے جو ان کے ہاں پناہ گیر ہیں تاکہ ان کو محلسرا میں
چھپایا جا سکے اور بادشاہ نے حکیم صاحب سے انتظام کرنے کے لیے کہہ کر خاصہ کے آدمیوں کو
دو پالکیاں باغ کی طرف سے کر کے وہاں روانہ کیں تاکہ باغی ان کو نہ دیکھ سکیں، بادشاہ یہ دیکھنے
کھڑے ہوئے کہ آیا ان کے حکم کی تعمیل بھی ہو رہی ہے۔ یا نہیں، حکیم صاحب بھی وہیں
کھڑے تھے، کچھ دیر کے بعد ان میں سے ایک آدمی واپس آیا۔ جو پالکیاں لے کر گیا تھا اس نے کہا کہ
فریزر صاحب تو قتل کر دیئے گئے یہ دس بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا، حکیم صاحب نے فوراً اور
آدمیوں کو کپتان ڈگلس کی خیریت معلوم کرنے بھیجا اور ان لوگوں نے آکر بتایا کہ نہ صرف فریزر
صاحب بلکہ کپتان ڈگلس اور دوسرے وہ لوگ جو ان کے ہمراہ رہتے تھے سب قتل کر دیئے گئے اور

وہ میمیں بھی۔ یہ سن کر بادشاہ اندر چلے گئے اور میں اور حکیم صاحب پریشانی میں پھر دیوان خاص میں آئے، تھوڑی ہی دیر بعد دونوں کمپنیاں جو باہر محافظت پر تھیں مفسد رسالہ کے ساتھ دیوان خاص کے سامنے والے میدان میں جمع ہو کر غل مچانے اور خالی کارتوس چلانے لگیں۔ بادشاہ یہ غل سن کر باہر آئے اور خاصہ کے آدمیوں سے کہا کہ ان کو خاموش ہونے کے لیئے کہیں پھر ہندوستانی افسر آگے بڑھے اور انھوں نے دریافت حال کیا، اس پر مفسد لوگوں نے بتایا کہ ان کو کارتوس منھ سے کاٹنے کے لیئے بتایا گیا تھا اس سے مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمان اپنے مذہب سے گمراہ ہو جائیں کیونکہ ان میں سور اور گائے کی چربی لگی ہوئی تھی۔ اس پر ان لوگوں نے مشتعل ہو کر پہلے میرٹھ کے انگریزوں کو قتل کیا پھر بادشاہ کی محافظت کے لیئے یہاں چلے آئے۔ بادشاہ نے جواب دیا میں نے نہیں بلایا اور جو کچھ تم نے کیا بہت برا کیا یہ سن کر وہ مفسد لوگ جو میرٹھ سے آئے تھے اوپر کمرے میں آگئے اور کہا کہ جب تک بادشاہ ہمارے ساتھ نہ ہوگا ہم بے سہارا ہوں گے اور نہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس پر بادشاہ نے کیا کہا؟

اس پر بادشاہ کرسی پہ بیٹھ گئے اور سپاہی اور افسر غرضیکہ کل یکے بعد دیگرے آگے بڑھے سب بادشاہ کے سامنے آکر کہتے تھے کہ ہمارے سر پہ ہاتھ رکھیئے اور بادشاہ ایسا ہی کرتے جب ہجوم زیادہ ہو گیا تو میں چلا آیا لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے، تھوڑی دیر بعد شاہ اپنے کمرہ میں چلے گئے، سواروں نے گھوڑے صحن میں بند کر دیئے اور اپنی اپنی جگہ منتخب کر لی اور قلعے کے چاروں طرف پہرے دار مقرر کرکے میں حکیم احسن اللہ خان کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا، قریب چار بجے شام کے بڑی سرنگ اڑنے کی خبر آئی۔ اور میگزین کی طرف بڑی ناک اٹھتی نظر آئی جو لوگ وہاں تھے انھوں نے بتایا کہ مفسدوں نے حملہ کر دیا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے مقیم انگریزوں ہی نے یہ کارروائی کی تھی، شام کو معلوم ہوا کہ مفسدوں نے آٹھ انگریز عورتیں بچے پکڑے اور ان کے قتل کی درخواست کی۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ قیدیوں کو میرے حوالے کر دو اور ان کو میں اپنی حفاظت میں رکھوں گا چنانچہ اس شرط پر قیدی دیئے گئے۔ کہ ان پر محافظ ان ہی میں سے رکھے جائیں اور بادشاہ نے ان کو ایک کمرے میں

معید گر کے بن کے کھانے کا انتظام اپنے توشہ خانہ سے کیا، شام کو میں نے اپنے گھر جانا چاہا، تو سامنے دروازے پر رسالہ کے اور سواروں اور شہر میں رجمنٹوں کے سپاہی تھے، پھر میں گھوڑے پر سوار ہو کر گھر آیا۔ دوسری صبح کو معلوم ہوا کہ رات کو دس گیارہ بجے جو توپیں شروع ہوئیں تھیں وہ دیسی توپ خانے نے بادشاہ کی سلامی میں سر کی تھیں یا کسی وجہ سے، پھر میں دیوان خاص میں حکیم احسن صاحب سے ملا اور دریافت کیا کہ بادشاہ نے اس بے چینی کو رفع کرنے کا کوئی بندوبست کیا؛ انھوں نے بتایا کہ شاہ نے ایک اونٹنی سوار کو خط دے کر لفٹیننٹ گورنر کے پاس آگرہ بھیجا ہے اور تقریباً پندرہ روز بعد میں نے پھر پوچھا کہ اس خط کا جواب آیا یا نہیں تو انھوں نے بتایا کہ وہ سوار بغیر رسید یا جواب کے واپس آگیا، لیکن خط ان کو مل گیا اور جواب دینے کا انھوں نے وعدہ کیا ہے، اوّل دن کے واقعہ کے بعد میں نے قلعہ کی باقاعدہ حاضری ترک کر دی، صرف تیسرے یا چوتھے دن آتا تھا اور محض بادشاہ کو سلام کر کے واپس چلا جاتا تھا چنانچہ اور واقعات کے بعد گفتگو کرنے کی نوبت نہ آئی[1]۔

"اظہارِ حسن عسکری"

پیرزادہ حسن عسکری عدالت میں طلب ہوئے اور ان کو حلف دیا گیا

سوال : کیا بلوہ کے زمانے میں تم دہلی میں تھے اگر تھے تو کیا شغل تھا ؟

جواب : ہاں میں دہلی ہی میں تھا اور پیری مریدی کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب بادشاہ بیمار ہوئے تو میں ان کے علاج کے لیئے بلایا گیا تھا جب میرے دم کرنے سے بادشاہ کو فائدہ ہوا تو وہ مجھے اکثر بلانے لگے، مگر مجھے اس سے بے آرامی ہوتی تھی، ایک دن بادشاہ سے التجا کی کہ حضور بار بار نہ یاد فرمایا کریں جس پر ارشاد ہوا کہ آیندہ جب تک میں سخت بیمار نہ ہوں گا تم کو نہ بلاؤں گا۔

سوال : کیا تم شیدی قنبر شاہی ملازم سے واقف ہو ؟

جواب : میں بادشاہی ملازموں میں چند حبشیوں سے واقف تھا جن میں سے صرف دو یا تین

---

[1] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی ص۱۴۰)

کے نام مجھے یاد ہیں، شیدی قنبر ان میں کوئی نہ تھا۔

سوال: اس عدالت میں یہ اظہار ہوا ہے کہ تم نے شیدی قنبر شاہی ملازم کو شاہ کی طرف سے خطوط دے کر ایران بھیجا تھا، اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

جواب: مجھے اس معاملے کی قطعاً خبر نہیں۔

سوال: عدالت میں یہ بھی اظہار ہوا ہے کہ تم کو قوت پیشن گوئی حاصل ہے تم خوابوں کی تعبیر بتا دیتے ہو اور تم نے خدا سے ہم کلام ہونے کا حیلہ اور صاحب معجزہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا جس کی صداقت قیدی نے خود بھی کی ہے اس کا جواب تمہارے پاس کیا ہے۔

جواب: خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس قسم کی باتوں کا کبھی حیلہ نہیں کیا۔

سوال: کس وجہ سے تم بادشاہ پر دم کیا کرتے تھے۔ تمہارا خیال تھا کہ تمہارے سانس میں اثر صحت ہے؟

جواب: ہماری کتابوں میں تحریر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے لیے دعا کر کے اس پر دم کرے تو اس سے فائدہ ہوگا۔

سوال: کیا تم نے اپنا یہ خواب بادشاہ سے بیان کیا تھا کہ ایک طوفان مغرب یا کسی اور سمت سے ہندوستان پر آیا ہے اور طغیانی کے سبب زمین برباد ہوگئی۔ اس سے بادشاہ کو فروغ ہوا اور انگریز تباہ ہو گئے؟

جواب: خدا جانتا ہے کہ میں نے نہ تو کبھی ایسا خواب دیکھا اور نہ کبھی ایسا خواب بیان کیا البتہ قلعہ والوں نے اکثر مجھ سے ایسے خواب بیان کئے جس کی تعبیر میں نے توہمات ہیں مجھ کو خواب پر اعتقاد نہیں۔

سوال: دہلی سے تم کب گئے اور جب تک پولیس نے تمہارا کھوج نہیں نکالا تم کیوں چھپے رہے۔

جواب: جب یہ شہرت ہوئی کہ شہر پر حملہ ہونے والا ہے تو شہر والوں نے جوق جوق باہر

جانا شروع کردیا، میں بھی انھیں کے ہمراہ شہر سے باہر چلا گیا، اوّل میں نظام الدین میں تھا اس کے بعد قطب صاحب، پھر وہاں سے گڑھی پر سرو گیا جہاں بیمار ہو گیا اس کے بعد اور مقامات میں ہوتا ہوا موضع لکھنوٹی میں پہنچا، وہاں مجھے یہ خبر لگی کہ گنگوہ میں میری تلاش ہو رہی ہے میں نے خود وہاں جانے کا اپنے دل میں قطعی فیصلہ کر لیا، چنانچہ میں وہاں گیا اور میرے وہاں پہنچنے کی خبر اُڑی اور میں گنگوہ کے قریب ہی تھا کہ سپاہیوں نے مجھے امام صاحب کے مقبرے میں بحالت نماز گرفتار کر لیا۔

قیدی نے جرح سے انکار کیا اور گواہ واپس ہوا[۱]۔

جرح جج ایڈوکیٹ

سوال: جن وجوہ سے بادشاہ دہلی گورنمنٹ انگریزی کی رعیت اور پنشن خوار بنا اس کے متعلق تم عدالت کو کچھ اطلاع دے سکتے ہو؟

جواب: غلام قادر نے جب شاہ عالم بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکالیں اور اس کی سخت بے عزتی کی تو ۱۷۸۸ء میں مرہٹوں نے اپنا قابو پالیا، ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے علی گڑھ فتح کر کے دہلی پر حملہ کیا، اس وقت بادشاہ دہلی کے اختیار دہلی کے اندر ہی اندر تھے، وہ مثل قیدی کے تھا، اور لارڈ لیک نے حملہ کر کے شہر اور قلعہ کو مرہٹوں سے چھین لیا، اس وقت شاہ عالم نے انگریزوں کی پناہ میں آنے کی درخواست کی اور ۱۴ ستمبر کو جو ۱۸۵۷ء کے واقعہ میں اور زیادہ قابل یادگار تاریخ بن گئی ہے، انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی اس وقت سے بادشاہان دہلی انگریزوں کے پنشن خوار بنے اور ۱۸۲۷ء کے بعد بادشاہ کے اختیارات صرف قلعہ تک رہ گئے اور وہ محض اپنے ملازموں کو خطابات اور خلعت عطا کر سکتا تھا، دوسروں کے لیے اسے ممانعت کر دی گئی تھی۔

---

[۱] چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۱۶۷۔

سوال: کیا قیدی کے لئے مسلح آدمیوں کی تعداد محدود کر دی گئی تھی ؛

جواب: قیدی نے لارڈ آکلینڈ سے درخواست کی تھی کہ جس قدر وہ مناسب سمجھے اس قدر مسلح آدمیوں کی تعداد رکھے اور نواب گورنر جنرل نے یہ حکم دیا تھا کہ جس قدر آدمیوں کی تنخواہ تم اپنی پنشن میں سے دے سکتے ہو رکھو ؛

سوال: بلوہ کے وقت قیدی کو کتنی پنشن ملتی تھی ؛

جواب: اس کے لیے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کی پنشن منظور ہوئی تھی جس میں سے نناوے ہزار تو اسے دہلی میں دیئے جاتے تھے اور ایک ہزار اس کے خاندان والوں کو لکھنؤ میں ملتے تھے اس کے علاوہ ڈیڑھ لاکھ سالانہ اسے زمینوں اور مکانوں سے بھی وصول ہوتا تھا ؛

قیدی نے جرح سے انکار کیا اور گواہ واپس کیا گیا[1] ؛

مکند لال بادشاہ دہلی کا سکتر عدالت میں طلب ہوا اور اس کو حلف دیا گیا۔

جرح جج ایڈوکیٹ

سوال: کیا تمھیں ہندوستانی فوج کی بغاوت کی کچھ اصلیت معلوم ہے ؛

جواب: کوئی دو سال پیشتر سے بادشاہ دہلی گورنمنٹ کی جانب سے بددل ہو گیا تھا اور گورنمنٹ کی وقعت اس کے دل سے جاتی رہی تھی جس کی تفصیل یوں ہے کہ جب مرزا حیدر شکوہ اور مرزا فرید پسران مرزا خان بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ سے آئے تو انھوں نے حسن عسکری سے مل کر ارادہ کیا کہ ایک نامہ شاہ فارس کو بھیجا جائے اور نامہ میں یہ لکھا جائے کہ انگریزوں نے شاہ کو قید کر لیا ہے اور اس کی وہ عزت نہیں رہی جو تھی

---

[1] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص۱ ؛

اور ولی عہد کی تخت نشینی کی کوئی امید نہیں رہی۔ اور نہ یہ امید ہے کہ علاوہ ولی عہد کے کوئی اور شہزادہ ولی عہد کیا جائے۔ اس خط سے منشا یہ تھا کہ باہمی ملاقات خط و کتابت قائم ہو جائے۔ سیدی قنبر اس کام کے لئے مقرر ہوا اور نواب محبوب علی خاں کی معرفت اس کو ستّر روپیہ زاد راہ دے کر مع خط ایران روانہ کیا اور یہ خط بادشاہ کے خاص سکتر میں لکھا گیا تھا اس کے بعد مرزا حیدر اور ان کے بھائی واپس چلے گئے اور بادشاہ کے دور کے عزیز مرزا نجف اور مرزا بلاقی پسر مرزا اشرف الدین اور مرزا آغا جان کے ہاتھ اس قسم کی تحریر بادشاہ کے ہاتھ بھیجی۔ تین سال کا عرصہ ہوا کہ دہلی کے انگریزی سپاہی مرزا علی اور حمید خاں کے ذریعہ سے بادشاہ سے مل گئے تھے، مرزا علی کا یہ کام تھا کہ جس قدر وہ خواستیں آئیں وہ بادشاہ کے روبرو پیش ہوں اور بادشاہ ہر ایک کو اس وقت ایک تحریر دیتے تھے، جس میں پہلے آنے والوں کے بالترتیب نام ہوتے تھے اور ایک رومال بطور نشانی دیا جاتا تھا، ایجنٹ لفٹیننٹ گورنر کو اس معاملہ کی اطلاع ہوگئی، انھوں نے بعد تحقیقات بادشاہ کو منع کر دیا کہ انگریزی سپاہیوں کو اپنا مرید نہ بنائیں بادشاہ اور فوج میں تعلقات پیدا ہونے کی یہی تاریخ ہے بغاوت سے بیس روز پیشتر خبر آگئی تھی کہ میرٹھ میں فوج غدر کرنے والی ہے، مگر یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ غدر کر کے وہ دہلی ہی میں آئیں گے، رسالہ والے سب سے پہلے قلعہ کے جھروکوں کے نیچے آکر کھڑے ہوئے اور انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہم نے جس قدر انگریز میرٹھ میں تھے ان کو قتل کر دیا اور جس قدر یہاں ہیں ان کو بھی قتل کر دینگے اور اب آپ ہمارے بادشاہ ہیں اور جس قدر انگریز ہندوستان میں تھے، سب تہ تیغ کر دیئے گئے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ تمام فوج آئندہ سے تابع فرمان ہے۔ بادشاہ نے یہ اس کا جواب دیا تھا کہ تمہارا یہی ارادہ تھا تو تم کو ہر ایک بات کے لیے تیار ہونا چاہیے اور اگر تم تیار ہو تو اس معاملہ کا کل انتظام اپنے ہاتھ میں لو۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مفسد شہر میں گھس آئے، بادشاہ کے خاص ملازم ان سے جا ملے اور قادر داد خاں ایک کابلی نے مسٹر فریزر کو قتل کر دیا اور پیدل سپاہیوں نے شاہی ملازموں کے اشارے سے افسر گارد قلعہ کے مکان پر چڑھ کر اس کا بھی خاتمہ کر دیا، اس کے بعد جو انگریز

شہر میں ان کے ہاتھ لگا قتل ہوا۔ ایک دن یہ ڈھنڈورا پٹا کہ خدا شہنشاہ عالم ہے اور بہادر شاہ اس ملک کے بادشاہ۔ اور ان کا حکم بالاتر ہے۔

دوسرے دن ۱۲ مئی کو جب میرٹھ کے سوار اور دہلی کے رسالے ملے، بادشاہ نے تخت پر بیٹھ کر وزیر محبوب علی خاں کو کل فوج کی دعوت کرنے کا حکم دیا۔

چنانچہ فوج میں شیرنی تقسیم ہوئی اور افسروں کو روپے بھی دیئے گئے ۱۸۴۲ء سے پیشتر بادشاہ خاص خاص موقعوں پر چاندی کے تخت پر بیٹھ کر جود۔ بار خاص میں ہوتا تھا انعام دیتے تھے مگر اس کے بعد ایجنٹ جنرل نے اس رسم کو بند کر دیا اور تخت کو اٹھوا کر بادشاہ کے خلوت خانے کے نیچے والے راستہ میں رکھوا دیا۔ ۱۲ مئی کو بادشاہ نے اسے منگا کر اس پر بیٹھ کر دربار کیا۔

سوال: کیا ۱۱ مئی سے پیشتر فوج نے کچھ تجاویز بادشاہ کے سامنے پیش کی تھیں؟

جواب: مجھے ان تجاویز کے کھلم کھلا پیش ہونے کی تو خبر نہیں البتہ شاہی درباروں میں تذکرہ ہوتا تھا کہ فوج عنقریب بغاوت کر کے قلعہ میں داخل ہوگی اور بادشاہ کی حکومت پھر قائم ہو جائے گی اور قدیم ملازموں کے رتبے اور تنخواہوں میں اضافہ ہوں گے[1]۔

شہادت حکیم احسن اللہ خان

لارڈ ایلنبرا کے عہد انتظام میں جس وقت سے بادشاہ کو نذر دینا بند ہوا۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا۔ بادشاہ سرفت[illegible] اس وقت ولی عہد تھا اور اس نے اس معاملہ کے لیے ولایت میں تحریک کی اور بعد میں ہمیشہ اس حکم کے شاکی رہے اس کے سبب اپنی بددلی ظاہر کرتے رہے بعد میں گورنمنٹ نے جب ان کی یہ خواہش کہ ان کا چھوٹا بیٹا جوان بخت بادجود یکہ بیٹے پا چکا تھا کہ سب سے بڑا لڑکا مرزا فتح الملک ان کے بعد گدی نشین ہوگا۔ ولی عہد بنا دیا جائے، پوری نہ کی تو ان کو اور بھی زیادہ رنج ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مرزا حیدر مرزا افغان بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ مع اپنے بھائی مرزا امراد کے لکھنؤ سے دہلی آئے

---

[1]: چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) صفحہ ۲۰۶۔

وہ پیشتر بادشاہ سے ملاقات کیا کرتے تھے، سب سے پہلے انھوں نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ "میں نے ان شہزادوں کو گورنمنٹ کے دفتر میں اپنا ایجنٹ مقرر کیا ہے، ایجنٹ لفٹیننٹ گورنر نے اس انتظام کو اس وجہ سے منظور نہ کیا کہ اس فرض کے لیے کبھی شہزادے مقرر نہ ہوئے تھے پہ یہ شہزادے بادشاہ کی مہر ثبت کرکے چند کاغذات اپنے ہمراہ لے گئے، وہ بلا روک ٹوک محلات شاہی میں بھی آیا کرتے تھے[1]۔

حکیم احسن اللہ خاں کی گواہی

بادشاہ نے باغیوں کی آمد کے لیے پہلے سے کچھ تیاری نہیں کی تھی۔ اور جس کا ثبوت اس بات سے ہو سکتا ہے کہ میں نے اور غلام عباس وکیل نے بادشاہ سے کہا کہ قلعہ کے کمانڈنگ گارڈ اور ایجنٹ لفٹیننٹ گورنر نے دو توپیں مع دو توپچیوں کے اور دو پالکیاں میموں کے واسطے منگائی ہیں تو بادشاہ نے بلا عذر تعمیل کرنے کا حکم دے دیا تھا[2]۔

جواب دعویٰ

جج ایڈووکیٹ نے قیدی کا حسب ذیل جواب دعویٰ پڑھا۔ "میں حسب ذیل واقعات پیش کرتا ہوں :-

" بلوے سے پیشتر بلوہ کے متعلق مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ صبح کے قریب آٹھ بجے مجھے خبر ہوئی کہ باغی سوار شہر میں داخل ہو گئے۔ اور انھوں نے جمع ہو کر دریچوں کے نیچے کھڑے ہو کر غل مچانا شروع کیا، میں نے دروازے بند کر دینے کا حکم دیا۔ باغیوں نے بتایا کہ کارتوسوں پر سور اور گائے کی چربی ہوتی تھی اس لیے ہم نے ان کو چلانے سے انکار کر دیا اور میرٹھ کے انگریزوں کو قتل کر آئے ہیں، پھر میں نے قلعہ کے افسر گارڈ کو بلایا اس نے خود باغیوں سے بات کرنے کی خواہش کی مگر میں نے دروازے نہ کھولے تو اس نے کھڑے ہو کر باغیوں سے کچھ

---

[1] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۲۲۴ :

[2] : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۲۳۴ :

باتیں کیں اور پھر انتظام کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ اور فریزر صاحب نے دو پالکیاں منگائی تھیں کہ وہ میمیں جو گارڈ کے یہاں تھیں ان کو محلسرا میں چھپا دیا جائے، پالکیاں بھیج کر میں نے توپیں روانہ کرنے کا حکم دیا اور ابھی پالکیاں روانہ ہی ہوئیں تھیں کہ ان سب کے قتل کی اطلاع ملی ۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ باغی دربار خاص میں گھس آئے اور ہر طرف اپنے سنتری مقرر کر دیئے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ تم یہاں سے چلے جاؤ ۔ اس پر انھوں نے کہا کہ تم خاموش تماشا دیکھتے جاؤ اس وقت ہم اپنی جانوں پر کھیل رہے ہیں جو کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں گے۔ میں اپنی جان کے خوف سے زنانخانہ میں چلا گیا۔ قریب شام کے مفسد کچھ میموں اور بچوں کو پکڑ لائے۔ لیکن میں نے خوشامد کر کے ان کو باز رکھا اور وہ اس وقت اس شرط پر مان گئے کہ ان کو اپنے پہرے میں رکھیں گے اور پھر اس کے بعد بھی انھوں نے دو مرتبہ ان کو قتل کرنے کی کوشش، مگر میں نے بمشکل ان کو روکا اور پھر ایک مرتبہ آخر انھوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ اس قتل کے لیے میں نے کوئی حکم نہیں دیا۔ ممکن ہے مرزا خیر سلطان یا مرزا مغل نے جو میرے خواص میں ہیں میرا نام لے دیا ہو۔ مگر مجھے یقین نہیں اور یہ بھی کہ بغیر میرے حکم کے میرے مسلح سپاہی اس قتل میں شریک ہوئے، ممکن ہے مرزا مغل نے ایسا کیا ہو۔ لیکن باوجود اس کے ان لوگوں کے قتل میں میرے ملازم شریک تھے، مگر میں نے ان کو کوئی حکم اس قسم کا نہیں دیا تھا قتل کے بعد کے متعلق کچھ علم نہیں، اگر ملازموں نے ایسا کیا تو اپنی مرضی سے کیا ہوگا میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے کبھی فریزر صاحب اور دوسرے لوگوں کے قتل کا کوئی حکم نہیں دیا۔ گواہوں کے بیانات غلط ہیں مرزا مغل مرزا خیر سلطان وغیرہ باغیوں سے ملے ہوئے تھے ممکن ہے انھوں نے کبھی کوئی ایسا حکم دیا ہو، پھر اس کے بعد باغی مرزا مغل مرزا خیر سلطان اور مرزا ابو البا قر کو میرے پاس لائے کہ ہم ان کو اپنا افسر بنانا چاہتے ہیں مگر میں نے ان کی درخواست نامنظور کر دی تو مرزا مغل بگڑ کر اپنی ماں کے پاس چلے گئے اور میں خاموش ہو گیا۔ اور پھر طرفین کی رضامندی سے مرزا مغل سپہ سالار مقرر ہوئے ۔

میری مہر اور دستخط کے بارے میں صاف بات یہ ہے کہ جس دن بغاوت ہوئی اس دن انھوں نے مجھے بھی اپنا قیدی بنا لیا، جس طرح اس وقت تمھارے بس میں ہوں اسی طرح اس وقت ان کے قابو

میں تھا اور انھوں نے اپنے احکام پر بجبر مجھ سے مُہر لگوائی وہ مسودے لاتے اور میرے سکتر سے صاف کراتے کبھی وہ صاف احکام لاتے اور مسودے دفتر میں چھوڑ کر مجھ سے دستخط کراتے تھے اسی سبب مختلف مسودے اس میں شامل ہیں اکثر انھوں نے مجھ سے سادہ لفافوں پر مہر کرائی اور مجھے معلوم نہیں ان میں کیسے کیسے خطوط کس کس کے نام بھیجے، اس میں کہیں یہ فہرست بھی شامل ہے۔ کسی نے مکند لال کے نام بھیجی تھی، اس میں یہ بات صاف لکھی کہ کتنے کتنے احکام کس نے کہاں کہاں دیئے تھے، چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ جس نے جہاں چاہا احکام دیئے اور مجھ سے دستخط کرائے اور مجھے احکام کے مضمون تک نہ بتائے لیکن میں اور میرا سکتر جانوں کے خوف سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، جب کبھی سپاہی یا مرزا مغل اور مرزا خیر سلطان کوئی درخواست میرے پاس لائے تو اپنی مرضی کے احکام بھی اپنے ساتھ اکٹھے لاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پر بھی دستخط کرو اور دھمکی بھی دیتے تھے، کہ جو شخص ہماری مرضی پر نہ چلے گا پچھتائے گا اور جان کے خوف سے میں کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا ساتھ ہی اس کے وہ میرے خاص مشیروں حکیم احسن اللہ خان، محبوب علی خان اور زینت محل بیگم کو انگریزوں سے سازش رکھنے کا الزام دیتے اور کہتے تھے کہ ہم ان کو اس حرکت پر مار ڈالیں گے، چنانچہ ایک روز انھوں نے حکیم صاحب کا مکان لوٹ لیا اور ان کو قتل کے ارادے سے پکڑ لیا مگر ان کی منت سماجت پر ان کو قید میں رکھا، وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ مرزا مغل کو تخت نشین کرنے کے لیئے وہ مجھے تخت سے اتار دیں گے یہ امر غور طلب ہے کہ میں کس قدر مطمئن ہو سکتا تھا اور میرے اختیارات کتنے تھے۔

افسران فوج اس قدر گستاخ ہو گئے تھے کہ انھوں نے کہا کہ زینت محل کے متعلقات انگریزوں سے دوستانہ ہیں ان کو ہمیں دے دیجئے تاکہ ہم ان کو قید میں رکھیں اگر اُس وقت میرا اختیار ہوتا تو ممکن نہ تھا اس وقت حکیم احسن اللہ خاں اور محبوب علی خان قید ہو جاتے اور حکیم صاحب کی جائداد لٹ جاتی؟

باغیوں نے ایک اجلاس قائم کیا ہوا تھا جس میں ہر چیز پر بحث ہوتی تھی اور جو قرار داد منظ

ہوتی، اس پر عمل در آمد ہوتا تھا۔ مگر میں کبھی ان کے جلسوں میں نہ شریک ہوا۔ اس پر انھوں نے نہ صرف بہت سے آدمیوں کو لوٹا بلکہ بعض بازار لوٹ لیے اور جس کو چاہا قتل کیا اور جس کو چاہا قید کر لیا اور شہر کے جس شخص کا مال اچھا پایا ضبط کر لیا ؛

جو کچھ بھی تھا باغی فوج کے ہاتھ میں تھا میں کیا کر سکتا تھا مجھے بے خبری میں آکر گرفتار کر لیا اور مجھ پر کچھ خوف طاری ہو گیا تھا اور جان کے خوف سے جو وہ کہتے کرتا تھا میرے ملازموں تک کو جان بری کی امید نہ تھی اور میں تو شاہی پر گدائی کو ترجیح دینے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ گیروے کپڑے پہن کر پہلے قطب صاحب کو جاؤں اور وہاں سے اجمیر شریف ہو کر کعبۃ اللہ چلا جاؤں مگر فوج نے نہ جانے دیا ؛

باغیوں نے میگزین کو لوٹا اور خزانہ کو بھی لوٹا گیا۔ لوٹ میں سے ایک پیسہ بھی نہ میں نے ان سے لیا اور نہ انھوں نے مجھے دیا۔ ایک دن وہ زینت محل بیگم کا مکان لوٹنے بھی گئے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اگر میرے اختیارات ہوتے تو وہ مجھ سے میری بیوی کو قید کرنے کے لئے کیوں مانگتے جبکہ کوئی شخص ایک غریب آدمی کی بیوی کو بھی نہیں مانگ سکتا ؛

قنبر حبشی نے مکہ جانے کی رخصت حاصل کی تھی، میں نے اس کو ایران نہیں بھیجا میں نے کوئی خط شاہ ایران کو نہیں بھیجا ہے۔ محمد درویش والی درخواست میری تحریر نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے اگر میرے یا حسن عسکری کے کسی دشمن نے یہ درخواست بھیجی ہو تو وہ بھی قابل اعتبار نہیں ؛

باغی فوج نے کبھی میرا ادب نہ کیا اور وہ جوتیاں پہنے ہوئے دربار خاص اور [illegible] میں پھرا کرتے تھے، جس حالت میں کہ انھوں نے اپنے آقاؤں کو قتل کیا تھا، ان پر کیا [illegible] کر سکتا تھا جس طرح انھوں نے اپنے آقاؤں کو قتل کیا اسی طرح مجھے قید کیا اور مجھ پر ظلم کئے اور میرا نام کرنے کے لیے جو کچھ چاہا کیا۔ انھوں نے افسروں کو قتل کر دیا اور بارود ذخیرہ لوٹ لیا تو میں کس طرح بغیر فوج اور گولہ بارود کے لڑ کر آزاد کر سکتا تھا۔ پیادے سوار رسالہ [illegible]

تھے جب وہ جھروکوں کے پاس آئے تھے، مَیں نے اُن کو فوراً بند کرا دیا تھا اور قلعہ کے کمانڈنگ گارڈ کو اِس واقعہ کی اطلاع کر دی تھی ؛

اس کے بعد جو کچھ مَیں نے کیا وہ جان کے خوف سے کیا، چند ملازم بھی اپنی جان کے خوف سے رکھے، مندرجہ بالا میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے اور نہ کوئی بات سچائی کے خلاف ہے، اس بات کو خدا جانتا ہے۔ اور وہی میرا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے بالکل صحیح ہے اور اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں ہے، میں ابتدا میں حلف اُٹھا چکا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ سچ کہوں گا اور یہی مَیں نے کہا ہے ؛

دستخط بہادر شاہ ؂۱

بحث جج ایڈوکیٹ

صاحبان : مَیں الزام کے متعلق آپکے مشاہدات کو ختم کرتا ہوں، اب آپ کا یہ کام رہ گیا ہے کہ یا تو آپ فیصلہ آخری سے قیدی کو عزلت اور تنہائی میں ان اعزاز کا جو ایک تخت سے اُترے ہوئے بادشاہ کے لیے زیبا ہیں مستحق قرار دیں یا اس کو صفحہ تاریخ کے بڑے ملزموں میں جگہ دیں۔ یہ ظاہر کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے کہ خاندان تیموریہ کے اس آخری بادشاہ کو جو عمر و بدقسمتی کے سبب خمیدہ پشت مگر شاید اپنی تکالیف اور قوم کے مصائب کے سبب مستقیم قامت ہے آج اپنا آبائی قلعہ اور محل چھوڑنا ہوگا یہ شاندار دربار عام کی عمارت یہ انصاف کے اعلیٰ مدارج کا معبد اسی فیصلہ سے اس مذہب کو حاصل کر چکا ہے جس میں موجودہ وکل زمانوں کی بابت یہ تحریر کیا جائے گا کہ بادشاہ جرم کی وجہ سے قید کئے جاتے ہیں اور ایک خاندان کی برس ہا برس کی شان و شوکت، ایک دن میں صفحہ روزگار سے ناپید کر دیا گئی ہے۔

؂۱ : چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) ص ۲۶۸ ؛

غدر پر برہمن اور مسلمانوں میں بے غرضانہ اتفاق تھا۔ فوج میں ہمیشہ لباس کے سبب وہ
بھائی بھائی تھے وہ ایک دوسرے کے تہواروں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے اور اس اتفاق پر گورنمنٹ
کی چشم پوشی کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔ میں وہ کل باتیں جن کے سبب یہ مصیبت پیش آئی اس جگہ بیان کرنا نہیں چاہتا
شاید بے محل ہونے کے سبب نامنظور کی جائیں مگر میرا خیال ہے کہ کارتوس کے معاملے میں بات نے
طول نہیں پکڑا۔ سپاہیوں میں پیشتر ہی سے اس معاملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تمام ملک اور نیز مسلمانوں
میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک جو معاملات ظاہر ہوئے انہیں مسلمانوں کی سازش سے موسوم
کرنا چاہیئے اس سے خاص منشا یہ تھا کہ انگریزوں کی طرف سے بد دلی پھیلا دیں اور جھوٹی خبریں اڑا کر
گورنمنٹ کی مہربانی پر افترا پردازی کرکے انقلاب اور بلوہ کے لیے لوگوں کو آمادہ کریں تحقیقات
سے معلوم ہوا کہ اس کی ابتدا قیدی اور اس کے معتمدوں سے ہوئی جو اس کے خفیہ اور راز کے
جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے مثلاً حسن عسکری وغیرہ۔ میرے خیال میں کوئی آدمی اس بات میں
شبہ نہیں کر سکتا کہ شیدی قنبر کو خطوط دے کر فارس اور قسطنطنیہ اس ملک کے بادشاہ کے پاس بطور
ایلچی بھیجنا اور اس سے مدد اور تخت نشینی کی التجا کرنا، قیدی کی خاص سازش تھی جو سنہ ۵۷ کے خوفناک
بلوے اور اس کے ہولناک نتیجوں میں ثابت ہوئی۔

مئی ۱۸۵۷ء سے ٹھیک دو سال پیشتر شیدی قنبر کا روانہ ہونا اور جن دنوں میں بلوہ ہوا ہے
اس کا واپس آنے کا وعدہ کرنا قابلِ لحاظ بات ہے اگر ہم اس بات کو مسلمانوں کی پیشگوئی سے مقابلہ
کریں کہ جنگ پلاسی واقعہ ۱۷۵۷ء سے ایک صدی بعد انگریزوں کی حکومت ہندوستان سے جاتی رہے گی
تو ہمیں دوبارہ ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کے متعلق ان کے تعصّب کا یقین ہو سکتا ہے۔

ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے

جب ہم ان مسلمانوں کی نہ صرف حرکات کو بلکہ ان کی نفرت
کو جو ان کی درخواستوں سے مترشح ہے جو اسی زندگی پر ختم نہیں
ہوتی بلکہ آخرت میں بھی ہمارے لیے دائمی تکالیف ثابت ہوتی ہے تو ان کے بغض کو خیال کرتے ہوئے
ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے۔

سامع یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کیا انگریزوں کے خلاف ایسے خیالات رکھنے والے لوگ ہزاروں اور لاکھوں ہیں؛ میں ان لوگوں کا ذکر نہیں کرتا جو یہ بات سنکر فوراً رائے قائم کریں اور انہیں میری رائے کی ضرورت نہ ہو مگر ہمیں مس الول سے معلوم ہوا کہ محرم میں انہوں نے مسلمان عورتوں کو مسلمانوں کی کامیابی اور انگریزوں کے غارت ہونے کی دعا مانگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن عورتوں اور بچوں کی ظالمانہ موت اور تکالیف سے بھی ان کے کینے کی آگ نہ دبی اور ان کے دلوں میں رحم ذرا بھی پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ ہمیں مقامی اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا ہے۔ کہ جس وقت قتل ہونے کو تھا کوئی دو سو مسلمان حوض سے لگے ہوئے کھڑے تھے اور قیدیوں کو نہایت تلخ گالیاں دے رہے تھے۔ اگر ایسی بات کی اچھی طرح تصدیق نہ ہوتی تو اس سخت کینے کا یقین نہ ہوتا۔

مسلمانوں کا ذکر اس میں ایڈیٹر نے ان واقعات کو پیش نظر رکھا ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص کر مسلمان کی وجہ سے فساد اور سازش کی اور ۱۸۵۷ء کی دہشتناک آفات واقع ہوئیں اس نے حتی الوسع اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قیدی ہندوستان میں اسلامی پیشوا ہونے کی حیثیت سے اس سازش کے ترتیب میں خواہ بطور پیشوا یا بطور رفیق مذہب کس قدر تعلق رکھتا تھا۔ ہندوؤں کو بالعموم بلوہ کرنے اور فوج کو بالخصوص بغاوت پر آمادہ کرنے میں ہندوستانی مطابع اور مسلمانوں نے جو کچھ حصہ لیا ہے اس کا بھی میں تذکرہ کر چکا ہوں اور ان واقعات کی مزید تصدیق سے یہ بات سامنے ظاہر ہو جائے گی کہ مسلمانوں ہی کی نمبر ۳ لائٹ کولری نے میدان پریڈ پر کارتوس لینے سے انکار کیا تھا اور یہ سے سپاہی یعنی بیشتر مسلمان تھے ان لوگوں کا کچھ مذہب نہ تھا اور ان لوگوں کے نزدیک سور کی چربی کا ملا ہونا یا نہ ہونا سب برابر تھا۔ کپتان مانٹنو ہم سے بیان کرتا ہے کہ انبالہ ڈپو میں جہاں تک کارتوسوں کے واقعہ کا تعلق تھا مسلمان سپاہی اس کا مضحکہ اڑاتے تھے اور اس طرح ہم کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے بغیر کسی عذر کے کھلم کھلا بغاوت پر کمر باندھی، ان کی بناوٹی تکالیفوں میں کچھ کمی نہ آئی۔ اور انھوں نے ہمارے خلاف بلوہ کرنے میں اتفاق کر لیا اور ہندوؤں کو زبردستی مذہب ترک کرانے کے خیال پر بظاہر داری سے جوش دے کر اپنے ساتھ مل جانے کی ترغیب دی اور

اس بیان میں ہمارے پاس شہادت ہے اور اس سلسلہ میں ہندوؤں کے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ تھی اور نہ ہندوؤں نے اس کے دریافت کرنے کی کوشش کی کیونکہ جو شہادت ہم نے بار بار نقل کی ہے اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈن کی لڑائی کے بعد ہی معاملات کے پہلو بدل لینے پر انھوں نے بہت افسوس ظاہر کیا، مسلمانوں کو دھوکہ دینے پر لعنت ملامت کی اور اس بات پر شکوک معدوم ہوتے تھے کہ واقعی انگریزی گورنمنٹ کا یہی منشا تھا کہ ہمارے مذہب میں مداخلت کرے بہت سے ہندو سپاہیوں نے اس وقت یہ ظاہر کیا کہ اگر ہماری جان بخشی ہو جائے تو بخوشی ہم سرکاری ملازمت کرنے واپس چلے جائیں گے۔ مگر مسلمان برخلاف اس کے اسی بات پر جمے ہوئے تھے کہ انگریزی کی نوکری سے شاہی ملازمت بدرجہا بہتر ہے اور یہ کہ اگر نواب اور راجہ بادشاہ کو فوجیں دیں تو وہ ایک دم فتح حاصل کر لیں گے۔

مسلمان ہی سب کچھ تھے

اگر ہم مختلف حالات پر جو ہمیں دوران تحقیقات میں معلوم ہوئے ہیں قدیم زمانے کے متعلق نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کہ اس جنگ کارروائی میں مسلمان ہی سب کچھ تھے اور مسلمانوں کا صاحب مرکز شخص [illegible] سب سے معزز اور واعظ مسلمان بادشاہ اور اس کے احمق رفیق مسلمانوں کی [illegible] خفیہ [illegible] یہاں دہلی کی مسلمانوں کی قوتوں کے پاس ہمارے زوال کے متعلق مسلمانوں کی پیشگوئیاں [illegible] کا رہا ہے بعد [illegible] مسلمان قاتلوں کے ہاتھ سے بے رحمی کا قتل [illegible] عروج کے [illegible] مدد دینے والے اسلامی مطلب اور بغاوت کی ابتدا کرنے والے مسلمان [illegible] پر نہ کوئی الزام دیا گیا اور نہ اس کی تائید کی گئی۔ اگر انھوں نے کہیں سرکشی [illegible] تو محض اپنے مقصد ہمسایوں کی حکم برداری کی وجہ سے ہوگا۔[1]

بہادر شاہ مجرم ہے

بالآخر ایک عرصہ کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا وہ فیصلہ جو عدل کے منافی تھا۔

۱؎ : چراغ دہلی / مرزا حیرت دہلوی / صفحہ [illegible]

جیسے آئین انسانیت و شرافت سے کوئی سروکار نہ تھا، چند طاقتور غاصب عدالت کی کرسی پر بیٹھ گئے تھے، تلوار ان کے ہاتھ میں تھی۔ فوج ان کے قبضہ میں تھی۔ سیم و زر کے انبار ان کے قبضہ میں تھے لہٰذا ان کی سزا انصافی عین انصاف تھی، بہادر شاہ نے یہ فیصلہ سُنا اور زبانِ حال سے کہا ؎

آپ جو چاہیں کریں آپ کی بن آئی ہے

مرقومہ دہلی ۹ مارچ ۱۸۵۸ء

دستخط این جے بیرٹ میجر
ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل وکیل سرکار

عدالت اپنی تجویز پر غور کرنے کے لیے بند ہوئی۔

تجویز

جو شہادت عدالت کے روبرو ہے اس کی رائے یہ ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ معزول شدہ بادشاہ ان کل اور جزو الزامات کا جو اس پر لگائے گئے مجرم ہے۔

دستخط ایم ڈاس لفٹیننٹ جنرل
پریسیڈنٹ

دستخط:۔ ایف جے بیرٹ میجر
ڈپٹی جج ایڈوکیٹ جنرل

مَیں تجویز کو مستحکم کرتا ہوں

دستخط:۔ این پینی میجر جنرل
کمانڈنگ قسمت میرٹھ

مورخہ ۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کمپ سہارنپور[1]

---

[1]: چراغ دہلی / مرزا حیرت دہلوی / ص ۳۱۹

بہادر شاہ کے مقدمہ پر تبصرہ

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ انگریزوں کے بڑے ہوا خواہ اور معتقد تھے انھیں بہادر شاہ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی نہ "اسلامی" سلطنت کا احیاء ان کے لیے کوئی کشش رکھتا تھا۔ اُنھوں نے اپنی مشہور اور مستند تاریخ کے ہر صفحہ پر انگریزوں کے گن گائے ہیں اور بہادر شاہ کے اقدام عمل پر بیدردی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے لیکن اس مقدمہ پر ایک مورخ کی حیثیت سے انھوں نے جو لکھا وہ قابل دید ہے آخر کہاں تک وہ حقائق سے نبرد آزما ہوتے:

ہم فقط حکیم احسن اللہ خاں کی شہادت کا خلاصہ اس باب میں تحریر کرتے ہیں: حکیم احسن اللہ خاں نے اپنی شہادت میں بیان کیا کہ لارڈ ایلن برا نے جو بادشاہ کی نذریں بند کیں تو اس سے بادشاہ ہر وقت اُداس رہا کرتا تھا۔ اوّل اس معاملہ کے باب میں انگلینڈ کو لکھا پھر ہمیشہ وہ اس حکم کا شاکی رہا۔ بعد ازاں جوان بخت کے ولی عہد نہ ہونے سے اور مرزا فتح الملک کے ولی عہد ہونے سے اور زیادہ غمگین ہوا۔ اس عرصہ میں مرزا حیدر شکوہ مع اپنے بھائی مرزا مرید کے دہلی میں آیا۔ یہ شہزادے بادشاہ کے بھتیجے تھے وہ بادشاہ کے پاس محلوں میں بے روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ اوّل اُنھوں نے چاہا کہ بادشاہ ایجنٹ کو لکھے کہ ان شہزادوں کو گورنمنٹ کے دفتر میں بادشاہ کا ایجنٹ مقرر کرے لیکن یہ درخواست نامنظور ہوئی۔

بادشاہ پولیٹکل معاملات میں بڑا غیر محتاط تھا۔ خواجہ سرا اُن کے ہاتھ میں اس کے سارے کام تھے۔ میں نے کبھی وہ خط نہیں پڑھا جو بادشاہ دہلی نے شاہ ایران کو بھیجا مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اس نے شاہ ایران سے روپیہ اور سپاہ کی امداد مانگی ہوگی۔ بادشاہ مذہب پرست تھا جس کی یہ وجہ ظاہر ہے کہ روپیہ کی لالچ کے سبب اس نے بڑھاپے میں مذہب بدل ڈالا۔ میں نے کسی شخص سے یہ نہیں سنا کہ بادشاہ نے جو خط شاہ ایران کو بھیجا تھا اس میں کوئی اشارہ اس امر کا ہو کہ انگریزوں کی سپاہ کو برٹش گورنمنٹ سے اغوا کر کے باغی بنائے، اس تجویز کا تو قصہ میں تو کبھی ذکر نہیں ہوا۔

مجھے خواجہ سرا ڈن کے زبانی یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ رشیدی قنبر کو جو اس نے اپنے دستخطی کاغذات دیئے تھے ۔ اس کو یہ ہدایت کی تھی ۔ کہ مرزا النجف کو یہ کاغذات دے کر ان کی اور پہلی تحریرات کا جوابات کے لیے تقاضا کرنا جس وقت بوشہر پر لڑائی ہو رہی تھی ۔ بادشاہ کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا ۔ کہ ایران سے روپیہ اور سپاہ کی امداد آنے کی اس کو بہت کچھ توقع ہے جب مرزا النجف ایران پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی بوشہر میں لڑائی ہوئی تو یہ بات کھلی کہ بادشاہ کو وہاں سے امداد آنے کی امید رہے مگر مرزا النجف نے ایران سے کوئی خبر بادشاہ کے پاس نہ بھیجی ، اگر بھیجی ہوگی تو اپنے بھائی کو لکھی ہوگی ۔

حکیم صاحب نے اپنی شہادت میں اپنے علم کے سوا اپنے قیاسات کو بھی دخل دیا ہے جن کا واقعات نفس الامری ہونا ضروری نہیں مثلاً حکیم صاحب کا یہ کہنا کہ اگر بادشاہ زر پرست نہ ہوتا تو بڑھاپے میں اپنا مذہب سنی سے شیعہ کیوں بدلتا اس کے ساتھ ان کو یہ کہنا بھی چاہیئے تھا کہ بادشاہ نے فارسی زبان میں نظم میں ایک کتاب دفع الباطل تصنیف کی اور اس کو چھپوا کر شائع کیا جس میں اپنے شیعہ ہونے کو باطل ثابت کیا اور پھر مولویوں سے اس نے استفتا طلب کر کے اپنا سنی ہونا ثابت کیا ۔

دلی میں وہابی مولویوں کا گروہ بہادر شاہ کو بڑا بدعتی جانتا تھا اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتا تھا کہ جن میں بادشاہ کی طرف سے امام مقرر ہوتا تھا اور ان کا اہتمام ہوتا بادشاہ کا میلان شیعہ مذہب کی طرف دیکھ کر وہ زیادہ اس سے متنفر ہوتے ، دلی میں خاندان تیمور کی سبک اور نااہل حرکتوں کے سبب سے خواص کی نگاہ میں کچھ عزت باقی نہ رہی تھی ۔ مگر عوام الناس اس کو اپنا بادشاہ جانتے تھے اور کیوں نہ جانتے جب وہ ہر روز ڈنکہ کی چوٹ ڈھنڈوروں میں یہ سنتے تھے کہ خلقت خدا کی اور ملک بادشاہ کا حکم سرکار کمپنی کا تو وہ بادشاہ سے مراد بہادر شاہ ہی جانتے تھے ، ان کا ذہن کب اس پر پہنچتا تھا کہ انگلینڈ میں ہندوستان کا بادشاہ رہتا تھا ، سارے ہندوستان کے شہروں اس کے نام کا خطبہ عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھا جاتا تھا جب مجسٹریٹ ضلع پیشہ وروں پر زیادتی کرتا تھا تو وہ گروہ جھروکوں کے

سامنے رہتی ہیں بادشاہ کے آگے فریادی ہوکر جاتا، دھوبیوں بھنگیوں قصائیوں نے یہی کیا تھا کہ اپنے کاموں کو سب نے بند کر کے بادشاہ سے فریاد کر کے اپنی داد چاہی، دلی میں بہت آدمیوں کو قلعہ سے ایسا تعلق تھا کہ وہ جب شاہ دہلی کی شان کے خلاف گورنمنٹ انگریزی کی کوئی حرکت دیکھتے تھے تو بہت ناخوش ہوتے سر چارلس مٹکاف صاحب کو بادشاہ فرزند ارجمند شفقت میں القاب لکھا کرتا تھا جب ان کے انتقال کے بعد ہوارڈ سے صاحب ایجنٹ ہوکر دلی میں آئے تو انھوں نے بادشاہ کو کہلا دیا کہ ہم کو آپ کا فرزند بننا منظور نہیں۔ پہلے بادشاہ کی سواری کے جلوس کا یہ ادب کیا جاتا تھا کہ کوئی انگریز جلوس کی قطار کاٹ کر اپنی سواری نہیں لے جاتا تھا مگر انگریز اب اس قاعدہ کے پابند نہ تھے، ایسی باتوں کو دیکھ کر دلی کے مسلمان ناخوش ہوتے تھے کہ ان کے بادشاہ کی کچھ عزت باقی نہیں رہی[1]۔

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۲۹۱۔

باب ۴۱

شاہی خاندان کی بپتا

اس زمانہ میں بھی جو عہد مظلمہ سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ دستور تھا کہ شکست خوردہ بادشاہ، اس کے خاندان، اور اہل و عیال کے ساتھ فیاضانہ، اور روادارانہ برتاؤ کیا جاتا تھا، دور کیوں جائیے، ہندوستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مسلم ملوک و سلاطین نے، باغی ہندو تاجداروں کے ساتھ مہر و مروت، شرافت اور عالی ظرفی، رواداری، اور سیر چشمی کا برتاؤ کیا۔ تاریخ ہند میں علاء الدین خلجی، اپنے تشدد، درشت مزاجی، اور سفاکی بنا پر خاص طور پر بد نام ہے، لیکن تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اس نے ان ہندو راجوں مہاراجوں کے ساتھ لطف و محبت کا برتاؤ کیا، جنہوں نے بغاوت اور سرکشی کا مظاہرہ کیا تھا، محمود غزنوی سے بڑھ کر معتوب کون فرماں روا مسلمانوں میں گذرا ہے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ لاہور کے ہندو راجہ نے بار بار بغاوت کی، بار بار ہرا کیا، اور ہر مرتبہ اس کے دربار سے، اپنا تاج خسروی واپس لایا؟

لیکن روادار، اولوالعزم، انصاف پسند، اور با اصول انگریزوں نے، دلی کے آخری بادشاہ، اس کے خاندان اور اہل و عیال کے ساتھ ایسا ننگ انسانیت سلوک کیا کہ خود انگریز اب اس کے ذکر سے شرمانے ہیں بلکہ ان حادثات کے بعد ہی سے شرمانے لگے تھے، خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے مسدس میں، خاندان شاہی کی درگت کی جو تصویر کھینچی ہے، وہ کتنی سچی اور ساتھ ہی ساتھ کتنی الم انگیز ہے:

بہت آگ چلموں میں سلگانے والے — بہت گھاس کی گٹھڑیاں لانے والے

بہت دربدر مانگ کر کھانے والے — بہت فاقہ کر کر کے مر جانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں یہ جوہر

تو نکلیں گے نسل ملوک ان میں اکثر!!!

انہیں کے بزرگ ایک دن حکمران تھے — انہیں کے پرستار پیر و جوان تھے
یہی حامی عاجز و ناتواں تھے — یہی مرجع دیلم و اصفہان تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی
انہی کے گھروں میں تھی صاحبقرانی
یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے — کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے — جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل
اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

کٹے ہوئے سروں کا تحفہ

بہادر شاہ کی گرفتاری کے بعد، شہزادوں کا نمبر آیا، ان کے ساتھ جو سلوک ہوا، اسے ملاحظہ فرمائیے:

جب بادشاہ کو شہر میں لے گئے ہیں۔ اور رعیت سے ہتھیار طلب کیے ہیں۔ اس کے دوسرے روز ہڈسن صاحب جمعیت سواران ہمراہ لیکر نظام الدین میں پہنچے۔ اور مرزا الٰہی بخش شہزادے کی زبانی دہلی سے تیس شاہزادگان دہلی کو کہ ان میں بادشاہ کے بیٹے۔ پوتے۔ نواسے اور داماد تھے گرفتار کر کے لائے۔ اور بیرون دروازہ دہلی ان کو قتل کرا کے سر منگا کر بادشاہ کے پاس بھیج دیے۔ (۱)

قتل کی اس لرزہ خیز واردات پر مشہور مؤرخ منشی ذکاء اللہ نے ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:
جن ایجنٹوں نے بادشاہ کو پکڑوایا تھا۔ انہوں نے ہی ہڈسن صاحب کو مطلع کیا کہ بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتا جنہوں نے ۱۰ مئی کے قتل میں بڑا حصہ لیا تھا باغی سپاہیوں کے ساتھ نہیں گئے مقبرہ میں یا اس کے پاس چھپے ہوئے ہیں۔ اس اطلاع سے ہڈسن صاحب کا خون جوش میں آیا

---

(۱) داستان غدر ص ۱۲۳

اور کہا ان آدمیوں پر رحم نہیں کیا جائے گا۔ ان بدکاروں کو قتل کر کے زمین کو ان کی نجاست سے پاک کروں گا دوسرے دن صبح کو جنرل سے اجازت حاصل کر کے۔ لفٹیننٹ ڈو بینڈ کو ہمراہ لے کر ان شہزادوں کے قتل کے لیے وہ روانہ ہوا۔ سو سوار اور دو جاسوس منشی رجب علی اور مرزا الہٰی بخش ساتھ تھے تینوں شاہزادے مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان و مرزا ابوبکر۔ مقبرہ میں تھے۔ اور ان کے ساتھ بہت سے بدمعاش تھے۔ جن میں بعض دل چلے ہڈسن صاحب سے لڑنے کی صلاح دیتے تھے مگر شاہزادوں نے دو گھنٹے تک جان بخشی کے اقرار کے لیے گفتگو کی مگر ہڈسن صاحب نے اس کو نامنظور کیا ناچار انہوں نے اپنے تیئں ہڈسن صاحب کے حوالے کیا۔ صاحب ان کو رتھوں میں سوار کر کے دہلی سے ایک میل کے فاصلہ پر لائے پھر ان کو رتھوں سے اترنے کا اور کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ اور ایک سوار سے قرابین لے کر تینوں کو خود مار ڈالا اور لاشوں کو لاہوری دروازہ سے لا کر کوتوالی میں چوبیس گھنٹہ تک لٹکائے رکھا اب اس بات پر مختلف رائیں ہیں کہ ہڈسن کا یہ کام محمود تھا یا مذموم لارڈ رابرٹس صاحب لکھتے ہیں: کہ ہڈسن صاحب نے اپنی نیک۔ نامی میں۔ اس کام کے کرنے سے بٹا لگایا۔ اور بے ضرورت شہزادوں کو مارا۔

دہلی میں یہ واقعہ یوں غلط طور پر بیان کیا گیا ہے کہ شاہزادے بادشاہ کے ساتھ آئے تھے۔ ان کو جیل خانہ کے قریب ہڈسن صاحب نے خود مار ڈالا۔ بعد ان کا خون پیا اور کہا کہ میرا خون اس وقت ایسا جوش میں آیا تھا۔ کہ اگر ان شاہزادوں کو نہ مار ڈالتا تو میرے دماغ میں خلل آ جاتا۔ (۱)

مبارک باد کا خط

ہڈسن کو اس فعل پر اس کے ایک ہم پیشہ نے یوں مبارک باد دی: کو پر نے اس کامیاب مہم کے تھوڑے عرصہ بعد ہڈسن کو ایک ایسے فعل پر مبارکباد کا خط لکھا جس کی درندگی اور سفاکی کو کسی نے بھی پسند نہیں کیا بلکہ اُن انگریز افسران نے بھی اس واقعہ کی کوئی حمایت نہ کی جنہوں نے غدر کی یادداشتیں مرتب کیں۔

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ صفحہ ۱۵۰

"میرے پیارے ہڈسن۔ بادشاہ کو گرفتار کرنے اور اس کے بچوں کے قتل کرنے پر تم اور تمہاری پلٹن ہر طرح کی مبارکباد کے مستحق ہے"[1] مجھے امید ہے کہ آئندہ ایسے معاملات میں ہمیشہ کامیاب رہو گے"[2]

کیا بلوے کا اندیشہ تھا؟

مولوی بشیر الدین کی تاریخ ذکاء اللہ کی تاریخ کے کچھ عرصہ بعد لکھی گئی ہے، اس مختصر مدت کے بعد، اب لوگوں کی زبانوں پر واقعات وحقائق آنے لگے تھے، چنانچہ انہوں نے جرات سے کام لے کر، صاف گوئی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور اس قتل کی توجیہ میں وہ بات لکھی ہے، جسے ذکاء اللہ لکھنے کی جرات نہ کر سکے تھے:

اگلے دن قیامت کا دن تھا ہڈسن صاحب پھر مقبرے گئے اور تین شہزادوں مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر کو گرفتار کر کے سواروں کے نرغے میں آگے بھجوا دیا اور خود ہمراہیان شاہی کے ہتھیار لینے کو ٹھہر گئے۔ جب بادشاہ اور شاہزادگان والا تبار کو پکڑ لیا تھا تو ان لوگوں کا ہتھیار ڈال دینا کون سی بڑی بات تھی غرض اپنا کام پورا کر کے ہڈسن صاحب گھوڑا سرپٹ ڈال کر [illegible] سے جا ملے دیکھتے کیا ہیں کہ سکارٹ کو خلقت نے گھیر رکھا ہے اور موقع بے ڈھب آن پڑا ہے ممکن ہے کہ یہ لوگ شہزادوں کو چھڑا لیں۔ حلیہ شرعی یہ ٹھہرایا کہ ان کی جان کی امان کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ ہڈسن صاحب نے اپنے ہاتھ سے طمنچہ چھوڑ دیا اور تینوں شہزادگان والا تبار کو دم کے دم میں راہی عدم کو پہنچا دیا۔ جنرل سر ہیو گاف جی سی بی۔ وی سی جو دہلی کے محاصرہ میں کمانڈنگ آفیسر تھے اپنی کتاب اولڈ میموریز میں لکھتے ہیں کہ ہڈسن صاحب پر اس بات کا الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے شہزادوں کو بے رحمی سے کیوں مارا میں تو اس معاملے کے وقت ان کے ساتھ تھا نہیں اس واقعہ کا چشم دید گواہ صرف ایک ہی شخص [illegible] کا کنڈل تھا جو بعد میں شمس آباد میں مارا گیا جس نے مجھ سے اسی وقت بلا رعایت ساری کیفیت ورا

---

1. Lord Lawrence F. 114.
2. تصویر کا دوسرا رخ

اور رسالدار مان سنگھ اور دوسرے ہندو افسران سے بھی ہیں ۔ ان سب کا متفقاً یہی بیان تھی کہ جبکہ ہڈسن صاحب اپنے تلہ سواروں کی جمعیت کے ساتھ دلی کے قریب پہنچ رہے تھے ہندوستانیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور اُن کے تیوروں سے معلوم دیتا تھا کہ اُن کا ارادہ (شہزادوں کی) چھڑا لینے کا ہے اب سوائے اُن کی موت کے اور چارہ کار باقی نہ تھا میکنڈرول صاحب کہتے تھے کہ ہیں ہماری جانیں معرکی شمار و قطار میں نہ تھیں مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ مجھے ہمیشہ اس بات کا ملال ہی رہا کہ ہڈسن نے اپنے ہاتھ کیوں خون میں آلودہ کیے اور جلاد کا کام کیا جو ایسے جمیل آدمی کی شان کے بالکل خلاف تھا ۔ کم بخت شاہزادے ۔ بزدل اور بدمعاش وہ اسی سلوک کے مستحق تھے ۔

دلی والوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ شہزادوں کے سر کاٹ کر ایک خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بھیجے گئے تھے اگر ایسا ہوا تو بادشاہ کا کیا حال ہوا ہوگا جس کے ۳ بیٹے وقت واحد میں تہ تیغ کیے گئے ؟ [۱]

شہزادوں پر ننگ انسانیت مظالم

معاملہ صرف ان تین شاہزادوں پر ختم نہیں ہو گیا ، بلکہ ہر اس شخص کی تلاش تھی ، جو شاہی خاندان سے کچھ بھی تعلق رکھتا تھا تاکہ اسے پھانسی دے کر ، یا بدترین مظالم بنا کر دل ٹھنڈا کیا جائے ، ذکاء اللہ انگریزوں کے کٹر حامی ہیں لیکن کہنا پڑتا ہے کہ :

بہت سے شاہزادے دور دور خوف کے مارے بھاگ گئے ۔ مگر پھر بھی دلی کے ارد گرد ان کی کمی نہ تھی ۔ کیا خدا کی قدرت ہے کہ مئی کا مہینہ تو یہ بیداد ساتھ لایا ۔ کہ شہر میں گھر گھر یہ تلاشی ہو رہی تھی کہ فرنگی تو اس میں چھپا ہوا نہیں ہے جو ملتا مارا جاتا اب ستمبر اپنے ساتھ یہ ستم لایا کہ مارنے کے لیے شہزادوں کی تلاش ہونے لگی ان کے پکڑنے کے لیے دلی میں مخبروں کی کمی نہ تھی ۔ خود ایک شہزادہ مرزا کالے بابر کا بیٹا شہزادوں کے پکڑنے کا مخبر تھا ۔ یہ مخبر شہزادوں کو پکڑواتے اور ان کو سکھا دیتے

---

[۱] واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول (بشیر الدین احمد) صفحہ ۳

کہ حاکموں کے سامنے تم یہ کہنا کہ ہم بادشاہ کے قریب کے رشتہ دار ہیں۔ تو وہ تم کو بادشاہ کے پاس بھیج دیں گے۔ وہاں تمہاری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی۔ غرض اس سکھانے سے ان کی یہ تھی کہ حکام سے نزدیک ان کا رسوخ پیدا ہو۔ غرض دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے جن کی ۲۹ تعداد بیان کی جاتی ہے۔ پکڑے گئے۔ اور ان میں بوڑھے لنگڑے بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکا گئے۔ سب سے بوڑھا شہزادہ مرزا قیصر اکبر شاہ کا بھائی تھا۔ اور مرزا محمود شاہ اکبر شاہ کا پوتا وجع مفاصل میں مبتلا تھا۔ اس کی لاش پھانسی پر گویا لاٹھی بنی ہوئی لٹکی تھی۔ ان شہزادوں کے لیے جان لارنس نے سفارش کی کہ شہزادوں کی تحقیقات واجبی کی جائے۔ ان میں جو کوئی فرنگی مرد یا عورت یا بچے کا قاتل یا قاتل کا معاون ہو تو سزا دی جائے۔ اس سفارش نے کچھ کام نہ کیا۔

شہزادے بے رحمی کے ساتھ پھانسی پاتے تھے۔ یا جبر خانے میں جبر قیدی بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ جہاں وہ چکی پیستے یا چکی نہ پیس سکنے پر مار کھاتے کھاتے بہت جلد مر جاتے تھے۔ کئی شہزادے جیل خانہ میں جا کر چندہی روز جیتے تھے۔ (۱)

مرزا غالب کی تصدیق

مرزا غالب بھی ان عبرت انگیز واقعات کی تائید و تصدیق پر اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں:

شہزادوں کا ان خاندان تیموری میں سے کچھ لڑائی میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہو کر قید خانوں میں پڑے ہوئے اپنے دن پورے کرتے ہیں معدودے چند ایسے تھے۔ جو جان بچا کر بھاگ گئے۔ ضعیف العمر بادشاہ کی گرفتاری کا حکم صادر ہے۔ کہ باز پرس کی جائے۔ والیان جھجر بلب گڑھ اور فرخ نگر کو علیحدہ علیحدہ مختلف اوقات میں پھانسی دے دی گئی۔ (۲)

شہزادی "غریب خانہ" میں

بہادر شاہ کی ایک بھتیجی نور النساء کو بوائداللہ نے اپنا مستقل مہمان سانحۂ غدر کے بعد بنایا تھا، پادری سی الیف اینڈریوز

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صـ ۱۸۱

(۲) غالب کی فارسی تاریخ غدر دستنبو صـ ۲۸

لکھتے ہیں:

"شہنشاہ کے بھائی مرزا بابر کی صاحبزادی کو جبکہ مغلیہ گھرانا تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس وقت وہ خود عالم ضعیفی میں تھیں۔ جب وہ بغرض حفاظت ان کے گھر میں بعد احترام لائی گئیں اور وہ مکان کے اس حصہ میں ٹھہرائی گئیں۔ جہاں خود ان کی والدہ رہا کرتی تھیں۔ لہذا وہ ان سے ہمیشہ شاہی مہمان کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ وہ جب کبھی سفر پہ جاتے۔ یا جب کوئی نیا کام ہاتھ میں لیتے۔ تو سب سے پہلے بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے۔ اور ان سے دعا کے خواستگار ہوتے۔ وہ دعائیں دیتیں۔ لہذا انہیں اپنے بیٹے کی طرح سمجھیں۔ وہ مرتے دم تک منشی ذکاءاللہ کے مکان میں رہیں۔ جہاں ان کے ساتھ نہایت ادب و احترام کا برتاؤ روا رکھا جاتا تھا۔"[۱]

بہادر شاہ کی لڑکی

لیکن خاندان شاہی کی ہر لڑکی اتنی خوش قسمت نہیں تھی کہ وہ شرفا کے گھروں میں مہمان بن کر رہتی، چنانچہ بہادر شاہ کی ایک صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنیئے:

احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو غدر میں کام آئے۔ بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ ان کی سرکار بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ دروازہ پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے۔ اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم یعنی احمدی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے کا ارادہ کیا۔ دو پتیلیاں زیور سے بھری تھیں ہزاروں کا مال تھا۔ شہر کی کیفیت لحظہ بہ لحظہ ردی ہو رہی تھی۔ عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں نکل کھڑی ہوئیں۔

احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا۔ انہوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں۔ اور بہت سخت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن بھی وقت سے میسر نہ ہوا۔

---

[۱] ذکاءاللہ دہلوی ڈی الیف اینڈریوز ص ۴۹

فالج نے بالکل بیکار کر دیا تھا۔ چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گذارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔ میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا۔ کوچے آدمیں گیا اور مرزا شیشہ والے کے گھر پر جا کر جو بندریا والے مشہور تھے اس لیے کہ ان کے ہاں بندریا پلی ہوئی تھی۔ ان کا گھر پوچھا۔ اس وقت تو خیال بھی نہ ہوا۔ مگر آج جب دھیان آتا ہے۔ تو اس گھر اور گھر والوں کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ شہزادی کے گھر میں کھانے کے واسطے مٹی کے ٹوٹے برتن تھے۔ اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی یہ اولاد دبکی اور سکڑی بیٹھی تھی۔

احمدی بیگم اس روپیہ کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں۔ اور جو دعائیں ان کے دل سے نکلیں ان کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت ہنستا ہوا گیا۔ اور ہنستا ہوا آیا۔ مگر آج جب احمدی بیگم کی اس ٹھنگار چارپائی کا خیال آتا ہے۔ تو تڑپ جاتا ہوں۔ (۱)

شہزادیاں کسبی بن گئیں

احمدی بیگم پر جو کچھ گذری، وہ دردناک داستان ضرور تھی، لیکن بہر حال اس میں عزت کا شائبہ تھا۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کرتی تھیں، طوائفیں اور کسبی بن گئیں۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

" کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ دلی نہیں ہے ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول شدہ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوان ہیں کسبیاں۔" (۲)

شہزادی کا نکاح باورچی سے

تب سمجھتے پر نچے اڑ رہے تھے اور جسم بینا اندھی ہو جائے گی جب یہ سنتے تھی کہ جن و بیمزوں پر پرندہ پر نہ مار سکتا تھا۔

---

(۱) دلی کی آخری بہار، از خدا آمر راشد الخیری۔ صفحہ ۱۔

(۲) غالب کا روز نامچہ صفحہ ۱۱۔

کی رہنے بسنے والی خواتین کی قیمت چند روٹیاں یا سیر دو سیر آٹا تھا دل نہیں چاہتا کہ کہوں اور قلم کی زبان پر وہ الفاظ آنے دوں جو قلب کے ٹکڑے اڑا دیں مگر کہتا ہوں اور رو کر کہتا ہوں کتنا نازک وقت ہے کہ متواتر فاقے یہ رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے !!!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو (۱)

منشی ذکاء اللہ، اس شادی کا ذکر، طنز و تعریض کے ساتھ یوں کرتے ہیں :

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ بیگم نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لیے پڑھایا کہ روز تر دیگچی کھانے میں آئے گی۔ فاطمہ سلطان نے جس کے باپ کے سر پر تاج شاہی رکھا جاتا مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کر معلّمی کا پیشہ سیکھا۔ اور معلّمہ بن کر اچھی طرح کچھ مدت تک زندگی بسر کی۔ (۲)

شہزادیاں استانی بن گئیں

کچھ پڑھی لکھی شہزادیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا :

خجستہ اختر۔ محمدی بیگم۔ فاطمہ سلطان خاصی تعلیم یافتہ بیویاں تھیں فاطمہ سلطان تو غدر کے بعد بھی مدتوں زنانہ مشن میں بڑی استانی رہیں اور تلاش کیا جائے تو شہر میں اب بھی اس کی دو چار شاگردیں زندہ ہوں گی۔ (۳)

گویا شہزادہ

ذرا چشم تصور وا کیجئے، اور یہ منظر دیکھئے :

ایک جوگی بروگی بھبوت ملے گیروا کپڑے پہنے گوالیار دربار میں کھڑا ہے ستار جان کے ساتھ ہے حکم ہوتا ہے کچھ چھیڑو دربار کا ستار نواز دست بستہ عرض کرتا ہے کہ اگر اجازت ہو

---

(۱) نوبت پنج روزہ (راشد الخیری) ص ۱۵۹

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۴۲۱

(۳) نوبت پنج روزہ (راشد الخیری) ص ۱۱۶

تو پہلے خانہ زاد پیش کرے اشارہ ہوتا ہے اچھا تو شروع کر صاحب کمال ہے کمال دکھاتا وہ وہ تان پہنچ لیتا ہے ایسے ایسے سوت مینڈ کھینچتا ہے کہ باید و شاید محفل پر جادو سا کر دیتا ہے کچھ ایسا رنگ جماتا ہے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے ہیں صاحب نظر جان جاتے ہیں کہ اب کالے خاں کا رنگ جمتا دکھائی نہیں دیتا جب وہ ختم کرتا ہے تو کالے خاں کو حکم ہوتا ہے، جو چیز اس نے شروع کی تھی وہی یہ بھی چھیڑتا ہے صاحب فہم دلدادہ سمجھتے ہیں جانتے ہیں کہ بھلا کہ اس میں کیا عہدہ برآ ہو سکتا ہے لیکن اُن کی آن میں محفل کو متحیر کر لیتا ہے جو انگ اس میراثی نے دکھائے تھے وہ سب پیش کرتا ہے اور پھر اپنا راستہ الگ نکالتا ہے نئے سوت نرالی مینڈ ہیں۔ انوکھا انگ نرالا رنگ زمانہ کی آنکھیں دیکھا ہوا میراثی اس نام نہاد کالے خاں کی آنکھوں کی طرف نظر ڈالتا ہے مغلیہ آنکھ شاہانہ پیچ و خم نظر آتی ہے تڑ جاتا ہے دست بستہ عرض کرتا ہے سرکار آپ کالے خاں نہیں مرزا کالے ہیں اپنا اصلی نام سن کر رنگ رو متغیر ہو جاتا ہے پرانا ٹھاٹ آنکھوں کے آگے پھر جاتا ہے طبیعت کو مشکل سنبھالتا ہے ارباب محفل وطن دریافت کرتے ہیں بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎

گل ہوں تو کوئی چمن بتلاؤں
غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

ہم فقیروں کا کیا گھر کیا دروغ درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست۔ اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر لوگ استفسار حال کرتے ہیں آنکھ اٹھا کر ان کی جانب دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

چہ پرسی از سرو سامان من عمریست چوں کاکل
سیہ بختم پریشاں روزگارم خانہ بردوشم

جاراج میراثیوں میں نہیں مصاحبوں میں جگہ دیتے ہیں اور مرزا کالے کے نام سے یاد فرماتے ہیں دست بستہ عرض کرتا ہے کہ مرزا کالے صاحب عالم دہلی غدر میں مارے گئے اب تو یہ روسیاہ کالے خاں زندہ ہے سرکار اگر آئندہ کالے صاحب فرمائیں تو کرم ہوگا باقی زندگی اس گمنامی کے عالم میں گذار کر راہی ملک عدم ہوتا ہے۔"[1]

---

[1] دلی کا سنبھالا د خواجہ محمد شفیع دہلوی ص ۲۳

بہادر شاہ رخصت ہوتے ہیں

آخر بہادر شاہ کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا:

نارنول کا پرگنہ جس کی سالانہ آمدنی ۲ لاکھ تھی پٹیالہ کو دے دیا گیا پرگنہ کرونڈا کو بذریعہ نیلام فروخت کر دیا گیا۔ اور مہاراجہ پٹیالہ کو وفاداری کے صلہ میں اُسے خرید لینے کی اجازت دے دی گئی۔ پرگنہ گولی راجہ نابھہ کے حوالہ کیا گیا داوٗ کے رئیس کی بے وفائی کی وجہ سے ریاست ضبط ہوئی اور جیند میں ملحق کر دی گئی۔ دوجانہ۔ پاٹودی اور لوہارو دلی ریاستوں کے خلاف برطانوی گورنمنٹ نے کوئی کاروائی نہیں کی۔ بادشاہ اور اُن کی بیگموں کو جواں بخت اور اُن کی بیگم کی معیت میں رنگون جلاوطن کیا گیا اور یورپین گارڈ کی حفاظت میں انہیں منزل مقصود کی طرف بھیج دیا گیا ان کے گذارہ کے لیے ایک مناسب رقم انگریزی گورنمنٹ نے منظور کی اور بادشاہ کو اجازت دی گئی وہ اپنی قدیمی جلو واردں میں سے چار آدمیوں کو ملازمین کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھیں ٭ (۱)

بہادر شاہ کے وداعی اشعار

ایک ہمعصر مؤرخ لکھتا ہے:

قصہ مختصر بہادر شاہ جرم بغاوت میں گرفتار ہو کر مع اپنے بیٹے جواں بخت اور اپنی چاہیتی بیوی زینت محل کے قید ہو کر رنگون بھیج دیے گئے۔ جو اشعار شہر بدر ہوتے وقت بادشاہ نے اپنی زبان سے کہے تھے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ یہ اشعار جس قدر درد انگیز اور عبرت خیز ہیں اسی قدر اُن سے بوڑھے بادشاہ کی طبیعت کا افسوسناک نقشہ اچھی طرح کھینچتا ہے۔

اشعار

کر رحم غریبی پہ میری گردشِ ایام
بدعہدیٔ دوراں نہ کر اتنا مجھے بدنام

برگشتگی و بخت نہ رکھ اتنا مجھے بدکام
ای شومیٔ طالع نہ کر اتنا مجھے بدنام

---

(۱) خدنگ غدر صفحہ ۹

بے مہریٔ جاناں تو میرے ساتھ وفا کر
ای نالۂ شبگیر میرے حق میں دعا کر
اے رنج تو ہی دل کی مسرت کا سبب ہو
حرماں تو ہی اب دافع اقسام تعب ہو
اے شورش دل واسطۂ دوری تپ ہو
اے روز سیاہ جلد کہیں فضل کی شب ہو
اے گردۂ پیار تو آنکھوں کو ضیا دے
اب ہاں میری کشتی کو کنارے سے لگا دے
اے دست جنوں میرے گریباں سے خبر دار
اے خار مغیلاں میرے داماں سے خبر دار
مجھ عاشق جانباز کو کیوں تو نے ستایا
بتلا دے کسی بات میں باہر مجھے پایا
زندہ کو تو مردہ کیا مردے کو جلایا
ای عیسیٔ دوراں تجھے کچھ رحم نہ آیا
کیوں چرخ ستم گر میرا یہ حال تباہ ہے
شہباز کو کنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

غزل دیگر

کہاں خلقت عزیز و زیر چرخ پیر چرتی ہے
یہ فانوس خیالی ہے ہر ایک تصویر پھرتی ہے
تو چرخ آسیا ہوں تجھ سے ہنوز ہوں تو بگولا ہوں
مجھے تو کیوں لیے اے گردش تقدیر پھرتی ہے

ہوئی ہے جوش گل سے جوشش وحشت اسقدر پیدا
کہ ہر موج ہوا پہنے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

تمہیں آتا ہے زیر چرخ خواب اے غافلو کیونکر
کہ شب کو کہکشاں کھینچے ہوئے شمشیر پھرتی ہے

اُترتے ہیں گلے میں گھونٹ آب زندگانی کے
چھری جب حلق پر قاتل! دم تکبیر پھرتی ہے

ظفرؔ کو منزل مقصود پر تقدیر سے لے پہونچی
کہ ہر بیشکی ہوئی پر عقل بے تدبیر پھرتی ہے (۱)

---

(۱) تذکرہ تاریخ عالم (شائع کردہ بلاقی پرشاد) ص ۲۴۲

رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے آخری [illegible] لے رہے ہیں
ناک کا بانسہ پھر گیا ہے۔ کوئی مونس و ہمدم مرنے والے شہنشاہ کے پاس
نہیں ہے۔ سکرات و جانکنی طاری ہے۔ چند منٹ کے بعد
خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ اصلی تصویر ہے جو
مرنے کے وقت لی گئی تھی۔

اے ہندوستان میں دنیا سے جاتا ہوں
اور اب تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ جس نے
آج تیموری سلطنت کے چہرہ پر موت کا پردہ
ڈھک دیا

بہادر شاہ کا دم واپسیں

زینت محل: —— ایک بوڑھی عورت، جو کبھی ملکۂ ہند تھی

باب ۲۴

عمارات شاہی کا حشر

بہادر شاہ، ان کے اہل و عیال، اور خاندان شاہی کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا، وہ تو ذکر کیا، لیکن انہوں نے بہادر شاہ کی اور ان کے اسلاف کی، اور ان کے عہد کی بنائی ہوئی عمارتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو چنگیز اور ہلاکو جیسے بدترین دشمنوں کے [illegible] کیا کرتے تھے۔

ذیل میں ہم مختصر سا خاکہ ان عمارتوں کا پیش کرتے ہیں جنہیں انگریزوں نے اس جرم میں زمین کے برابر کر دیا کہ وہ بہادر شاہ کی بنوائی ہوئی تھیں، یا بہادر شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی تھیں۔ ان عمارتوں میں سے اکثر کھنڈروں کے ڈھیر میں بدل گئیں، زیادہ تر انہدام کی زد میں آئیں اور [illegible]

بہادر شاہ اور عہد بہادر شاہ کی عمارتیں

سب سے پہلے ان برباد عمارتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو بہادر شاہ نے خود تعمیر کیں یا ان کے عہد میں تعمیر ہوئیں

ظفر محل یا جل محل

قلعہ شاہجہان کے باغ حیات بخش میں جو حوض ہے اس کے بیچوں بیچ میں ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی نے سنہ جلوس مطابق [illegible] ۱۸۴۲ عیسوی ایک مکان بنایا ہے، سنگ سرخ کا ہے اور ظفر محل اس کے بننے کی تاریخ ہے اس کے بیچ میں ایک درجہ ہے یعنی کمرہ کے اور چاروں طرف غلام گردش ہے اور دونوں پر حجرہ اور چاروں ضلعوں میں شہ نشین ہیں جانب مشرق مکان کے ایک پل بنایا ہے، اگرچہ یہ مکان بھی بہت اچھا بنا ہے الا حوض کی وہ کیفیت نہیں ہے۔

ہیرا محل

قلعہ شاہجہان میں موتی محل کے تلے نہر بہشت کے کنارہ پر ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء کے ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی نے ایک بارہ دری نہایت سنگ مرمر کی بنائی ہے

اور ہیرا محل آمس کا نام رکھا ہے اس محل کے آگے جو قدیمی نہر جاری کی ہے اس میں ۲۴ فوارے چاندی کے تھے وہ تو اب نہیں رہے مگر نہر رہ گئی ہے یہ نہر بھی اس زمانہ کے لائق بہت اچھی ہی ہے ۔ (۱)

مولانا بشیر الدین احمد نے اس محل کا ذکر زیادہ شاندار الفاظ میں کیا ہے :

حمام کے شمال میں یہ محل ہے ، اس میں اور حمام میں صحن چھوٹا ہوا ہے اس صحن کے بیچ میں نہر کے کنارے ایک بڑی بارہ دری سنگ مرمر کی بہادر شاہ ثانی ، خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار کی بنوائی ہوئی ہے ، جو مرزا فخرو ولی عہد کی بارہ دری مشہور ہے ، حمام کے پیچھے ایک کنواں بہادر شاہ کا بنوایا ہوا ہے اس پر یہ تاریخ کندہ ہے ۔

ظفر نمیر شد ایں چاہ کشرین

کہ آبش شربت قند و نبات است

ازیں خوشش ترنہ باشد سال و تاریخ

ہویدا چشمۂ آب حیات است

۱۲۵۷ھ

اس کے دیکھنے سے شاہجہان کے زمانہ میں اور آخری دور مغلیہ میں جو فرق بیّن طرز عمارت میں ہو گیا ہے ظاہر ہوتا ہے ۔ اس کی چھت کے چاروں کونوں پر چار چھوٹی چھوٹی چوکنڈیاں بنائی ہیں جن کی برجیاں سنہری ہیں ۔ (۲)

کوٹھی دلکشا

قطب صاحب کے نواح میں یہ ایک سیرگاہ اور مکان دل کشا ہے صاحب والا مناقب عالی مناصب فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطان معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خاں سرتامس تھیوفلس مٹکاف صاحب بہادر بارونٹ بہادر فیروز جنگ صاحب کلاں بہادر شاہجہان آباد کا صاحب ممدوح نے اس کوٹھی کو ۱۲۴۰ ہجری مطابق ۱۸۲۴ عیسوی کے بنانا شروع کیا ، یہ کوٹھی نہایت نفیس

---

(۱) آثار الصنادید سر سید احمد خاں طبع اول

(۲) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم بشیر الدین احمد صفحہ ۶۹

لطیف ہے اور یہ شعر اسی پر صادق آتا ہے ۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است ہمیں است ہمیں است

باولی درگاہ حضرت قطب صاحب

قطب صاحب کی درگاہ کے پاس مسجد کے آگے قدیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں بہادر مستقیم جنگ نے ۱۲۶۰ ہجری مطابق ۱۸۴۴ عیسوی کے یہ باولی بنانی شروع کی اور ۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۶ عیسوی کے یہ باولی بن چکی باولی بھی بہت خوب صورت بنی ہے نرے چونے اور سنگ خارا سے بنی ہوئی ہے ۔ قریب ۱۴۰۰۰ روپیہ کے سوائے قیمت پتھر کے اس باولی کے بننے میں خرچ ہوئے ہیں[1]

آہنی پل

غازی آباد کے پاس ہنڈن ایک ندی ہے اس پر سرکار انگریزی نے ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء کے آہنی پل باندھا ہے یہ پل نہایت عجیب ہے زنجیروں کی کمانیوں پر عجب خوب صورتی سے لٹھے لٹکائے ہیں اور ان پر راستہ بنایا ہے ایسی ترکیب ان کمانیوں کی رکھی ہے کہ جب کوئی وزنی چیز آتی ہے تو بوجھ پہنچانے کو کمانی جھک جاتی ہے ہر چیز کے چلنے سے یہ پل لچکتا ہے اور کمانیاں بوجھ اٹھاتی ہیں اس نواح میں اس قسم کا پل عجائبات روزگار سے ہے ۔

لال ڈگی

شہر شاہجہان آباد میں قلعے سے نیچے خاص بازار کے سامنے بموجب حکم لارڈ ہارڈنگ بہادر کے ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء یہ حوض تیار ہوا ہے اس حوض کو سرے پاؤں تک سنگ سرخ کا بنایا ہے اور چاروں کونوں پر چار برج کنگرے دار بہت خوشنمائی سے بنائے ہیں دونوں طرف حوض میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں نہر کے پانی سے یہ حوض ہمیشہ بھرا رہتا ہے طول اس کا [illegible] فٹ اور عرض [illegible] فٹ ہے اس حوض کے بننے سے اکثر کنوئیں میٹھے ہو گئے ہیں اس سبب سے لوگوں کو بہت آسائش ہے ۔

---

(۱) آثار الصنادید از سر سید احمد خاں، طبع اول

پل جدید نگمبود نگمبود کے گھاٹ کلکتہ دروازہ کے سامنے اور سلیم گڑھ کے برابر ۱۲۶۸ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء کے سرکار انگریزی نے دریا پر یہ پل بنایا ہے اگرچہ یہ پل چونے اور اینٹ کا ہے لیکن ایسی خوشنمائی اور مضبوطی سے بنایا اور خوش قطع اور بڑے در لادے ہیں کہ دیکھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے اس کے بننے سے دریا کو اور بھی رونق ہوگئی ہے اور نگمبود کے گھاٹ اس پل سے بہت خوش نما معلوم ہوتے ہیں برسات کے دنوں میں صدہا آدمی سیر و تماشا دیکھنے کو جاتے ہیں اور ہر روز میلا رہتا ہے۔ (۱)

زینت محل ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء بہادر شاہ کی جیب اگرچہ خالی تھی، لیکن حوصلہ دہی تھا، جو شاہجہان، اور جہانگیر کا تھا زینت محل کے لیے نہایت شاندار محل تعمیر کیا:

" یہ محل باہر سے تو کچھ معلوم نہیں دیتا، مگر اندر کی محل سرائیں بہت عالی شان، کشادہ اور وسیع ہیں، لب سڑک صرف ایک دو منزلہ کمرہ ہے جو زینت محل کے نام سے مشہور ہے اس کا بڑا عالی شان پھاٹک لب سڑک ہے۔ یہ محل سارا کا سارا مع کمرہ کے پٹیالہ اسٹیٹ کے قبضہ میں ہے، غدر کے بعد خیر خواہی سرکار میں ملا ہے، اس کے دروازے پر ایک سنگ مرمر کی تختی پر، یہ کتبہ بہادر شاہ، بادشاہ آخری کا طبع زاد لگا ہوا ہے،

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصرے بے بدل
شد بر محل سال بنا، ایں خانہ زینت محل (۲)
۱۲۶۲ھ

اس محل کی مزید تفصیل یہ ہے:

اس سے آگے بائیں جانب کمرہ زینت محل ہے نہایت عالی شان شاہی عمارت ہے اس کے اندر بہت بڑے دالان در دالان بنیلیوں کما پچے۔ کمرے۔ کوٹھریاں ہیں۔ صحن میں حوض نہر مختصر سا باغیچہ خوض

---

(۱) آثار الصنادید (سر سید احمد خان، طبع اوّل
(۲) واقعاتِ دار الحکومت دہلی حصّہ اوّل، صـ ۲۱۵

نہایت فرحت بخش اور ادنی کا مکان ہے (۱)

موتی محل ہیرا محل کے شمال میں، اور حیات بخش باغ کے مشرقی آبشار کے سامنے موتی محل تھا۔ جو غدر کے بعد توڑ ڈالا گیا۔ اور وہاں توپ خانے کی بارک بنا دی گئی۔

و یہ محل سنگ سرخ کا تھا۔ جسے سنگ مرمر سے سفید کرکے رنگ آمیزی اور طلاکاری کے گل بوٹے بنائے تھے۔ اندر کی عمارت میں لمبائی تک سنگ مرمر لگا ہوا تھا، باقی سنگ سرخ تھا ۔ (۱)

حسن عقیدت بہادر شاہ کو بزرگوں سے اور ان کے مزارات سے بہت عقیدت تھی۔ مالی ضعف کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے؛ چنانچہ انہوں نے، قطب صاحب کی درگاہ پر ایک دروازہ تعمیر کر دیا ۔۔۔

۱۰ محرم ۱۲۴۳ھ میر عمارت نے درگاہ حضرت خواجہ قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے اسی خوب صورتی اور زیبائش کے ساتھ دروازہ تعمیر کر دیا کہ حضور انور بہت مسرور و محظوظ ہوئے خلعت دوشالہ وتبار کمخواب اور سر رقم جواہر سے معزز و ممتاز فرمایا اور محرر تعمیر کو بھی خلعت سہ پارچہ اور دو رقم جواہر عطا ہوئے (۳)

(یہ محل اور دروازہ مہرولی میں درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ۔۔۔ کے غربی دروازے کے متصل موجود ہے محل شکستہ ہو گیا ہے دروازہ سلامت ہے

نام ہے مگر نشان نہیں بہادر شاہ کے تعمیر کیے ہوئے ایک محل کا ذکر۔ ایک مورخ یوں کرتا ہے: یہ محل بہ خیر نہایت آراستہ و پیراستہ تھا۔ جس کے سامنے دریا کی طرف ایک سائبان نکلا ہوا تھا۔ جس میں ایک پرندہ کی نہایت خوب صورت شکل بنی ہوئی تھی۔ اب اس محل کا نام و نشان تک نہیں رہا، میں نے غلط کہا، نام تو اب بھی باقی ہے مگر نشان البتہ نہیں رہا (۴)

(۱) یادگار دلی ص ۱۴۳

(۲) آثار الصنادید از سر سید احمد خان طبع دوم

(۳) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۱۵۵

(۴) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم از بشیر الدین احمد ص ۹۹

ملکہ تاج محل کی حویلی

خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں:

نواب تاج محل بیگم زینت محل بیگم سے دوسرے درجہ پر منظور نظر تھیں اور رنگون بادشاہ کے ہمراہ نہ بھیجی گئی تھیں ان کی خوب صورت حویلی مالیواڑہ میں ایک ہندو کے قبضہ میں ہے۔(۱)

مزید معلومات یہ ہیں:

تاج محل کا خوب صورت مکان۔ گزرہ خوش حال زمانے میں تھا۔ کہ جو ہندوؤں کے مشہور محلہ مالی واڑہ کے قریب واقع ہے۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے۔ اور اس مکان میں دہلی کے مشہور ساہو کار لالا رام کشن داس رہتے ہیں۔ جن کے ہاں سونے چاندی کا بیوپار ہوتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی قدامت کی خوب صورتی کو بھی برقرار رکھا ہے۔ اور جو ید خوشنما اضافے بھی کیے ہیں۔ مگر زینت محل کے گھرے میں ریاست پٹیالہ نے کوئی ترقی نہیں کی۔ بلکہ سابق کے آثار میں بھی بوسیدگی واقع ہو رہی ہے(۲)۔ اور یہ تاریخی مکان چند دن کا مہمان ہے۔(۳)

خجستہ بخت کی حویلی

حویلی مرزا خجستہ بخت بہادر جو اکبر شاہ بادشاہ کے بھائی تھے۔ نہایت عالی شان حویلی ہے دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے (مکان خجستہ بنیاد) سے اس کی تاریخ نکلتی ہے اس وقت یہ حویلی بھولا ناتھ، لیشمبر ناتھ ساکن گلی پہاڑ والی کے پاس ہے۔(۴)

محل سومنگ یا تھڑ بن گیا

ابوظفر سراج الدین نے یہ محل سرے پاٹک سنگ سرخ کا بنایا ہے کا ایک درجہ ہے، اور چاروں طرف غلام گردش کے طور پر مکانات اور کوتوں پر حجرے اور چاروں ضلعوں میں نشیمن ہیں، اور ایک طرف اس مکان پر آنے جانے کا پل بنایا

---

(۱) بہادر شاہ کا روز نامچہ صفحہ ۔

(۲) غالب کا روز نامچہ صفحہ ۳۵۔

(۳) بعد میں اس کی مرمت خواجہ حسن نظامی کی روایت کے مطابق ہندو صاحب خانہ نے کرا دی

(۴) یادگار دہلی صفحہ ۱۰

تھا۔ اس پل کا تو اب نشان بھی نہ رہا، دالان کی چھت بھی گر گئی ہے۔ یہ مقام عرصہ دراز تک فوج کا سومنگ باتھ، یعنی تیرنے کا حوض رہا ہے (۱)

تورجہاں

یہ عمارت بھی قلعہ کی دوسری عمارات کی طرح نہایت خوشنما تھی، لیکن مرزا جہانگیر بہادر نے اس میں تصرفات جدید کیے تھے۔ اب یہ عمارت موجود نہیں ہے، دریا کی طرف محلات میں سب سے آخری محل تھا۔ اس میں پھول باغ، اور انواع و اقسام کے نوادر درخت تھے، خوشنما روشیں گھنے سایہ دار درخت، مندوے، فوارے، آبشار، سرد خانے، بارہ دریاں، مصفا چبوترے، سبزہ زار فرش زمردیں کے تختے بچھے ہوئے۔ جون کی گرمی اور لو میں آفتاب کی تمازت سے آدمی سر سے پا تک پسینے میں شرابور ہو جاتا ہے یہاں آکر دم میں دم آجاتا تھا۔ مسٹر گارڈن رزلی ہرن لکھتے ہیں "اگر وہ پرانا زمانہ پھر کسی طرح آجائے، تو دلی والوں کے نصیب جاگ جائیں اور روپیہ پانی کی بہنے لگے۔" (۲)

مسجد حامد علی خاں

ہملٹن روڈ پر یہ مسجد، نواب حامد علی خاں کی بنوائی ہوئی ہے ۱۲۴۴ھ - ۱۸۲۸ء اونچے چبوترے پر سترہ سیڑھیاں چڑھ کر جانا ہوتا ہے، صحن میں بجانب مشرق ایک دالان ہے مسجد کے جنوب مشرقی کونے میں ایک حوض قیمتی کا شیعہ لوگوں کا ہے۔

یہ مسجد نواب اعتماد الدولہ حامد علی خاں صاحب وزیر اعظم بہادر شاہ ثانی کی بنائی ہوئی ہے پیش طاق پر غالب کا یہ قطعہ کندہ ہے۔

اعتماد الدولہ کز لطف الٰہ
ہست در پیشش کنش تقدیر خدیر
ساخت در دہلی ہمایوں مسجدے
تا شود طاعت گر برنا و پیر

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم از بشیر الدین احمد ص...

(۲) دلی کے سات شہر

غالب آں طرفہ نشینِ عندلیب
زد باندازِ سخن سنجی صفیر
شد نظیرِ کعبہ در عالم پدید
سال تعمیرش بود "کعبہ نظیر" (۱)
۱۲۵۷ھ

کتب خانہ دارالشکوہ

اس عمارت کے بڑے بڑے نہایت اونچے اونچے کھلے در ہیں، اس کے دروازے کے ستون پر ایک تختی پر یہ کتبہ بخط انگریزی لکھا ہوا ہے:

کتب خانۂ دارالشکوہ خلعت شاہ جہاں		۱۶۳۷ء
مکان مسکونہ علی مردان خاں	وائسرائے پنجاب	۱۶۳۹ء
سرڈیوڈ اکڑلونی کی ریذیڈنسی		۱۸۰۳ء
گورنمنٹ کالج	۱۸۷۷ -	۱۸۰۴ء
مدرسہ ضلع	۱۸۸۶ -	۱۸۷۷ء
میونسل بورڈ اسکول	۱۹۰۴ -	۱۸۸۶ء (۲)

اس سرسری خاکہ سے باسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ، انگریزوں نے، غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے بعد، عمارتوں تک سے انتقام لینے میں تامّل نہیں کیا ع

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ایک مؤرخ کا بیان ہے:

شہر کے بے زبان در و دیوار سے یہ انتقام لیا گیا کہ قلعہ کے قریب کے عالیشان گنجان محلے اڑ گئے

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۲۷۵

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۲۸۹

بازار مسمار کرا دیتے ان پر گورا سپاہی فوجی قواعد کرتے اور زمین کے برابر کر دینے پر بھی شاید قدموں سے روند کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے اور شہر والوں کو جلاتے تھے۔ لال قلعے اور شاہی عمارتوں کو تڑوا دینے کی تجویز تھی مگر کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت روپیہ خرچ ہوتا اس لیے منسوخ کر دی ۔ (۱)

ما
ر

---

(۱) تاریخ پاکستان و بھارت جلد دوم (سیّد ہاشمی) ص۳۲۱

باب ۴۲

جامع مسجد کا حشر

تیرا جمال و جلال ہے مرے خدا کی دلیل
وہ بھی جمیل و جلیل تو بھی جمیل و جلیل
تیری بنا پائیدار، تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیلؑ
مٹ نہیں سکتا مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیمؑ و خلیلؑ
مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

•

ہندوستان میں مسلم عہد کی تعمیرات پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا، انہوں نے قلعوں مقبروں اور مسجدوں کی تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا، ان تعمیرات پر انہوں نے اپنی ہنرمندی صناعی اور دولت و ثروت ختم کر دی، انہوں نے، فلک فرسا، محلات اور قلعے بنائے، عظیم الشان، اور عظیم المرتبت مقبرے تعمیر کیے، اور حسین و جمیل مسجدوں کی بنا ڈالی،

غدر کے جوش انتقام میں انگریزوں نے شاہی محلّات وقصور منہدم کر ڈالے، قبر میں سونے والے بے گناہ، لوگوں کو بھی معاف نہیں کیا، اور بے تعصبی و رواداری کا دعویٰ کرنے کے باوجود مسجدوں کی شکست وریخت میں تامل نہیں کیا۔ انہوں نے نہ جانے کتنی مسجدیں ڈھا دیں، نہ جانے کتنی مسجدوں کو ویران کیا۔ بے شمار مسجدوں کو ضبط کر لیا بے شمار مسجدوں کو گودام اور سرکاری دفاتر میں تبدیل کر دیا، مسلمان شکست خوردہ تھے، سہمے ہوئے تھے، ناچار، اور مجبور تھے، وہ کچھ نہ کر سکے سوا اس کے کہ با چشم پرنم، یہ ستمگاریاں، اور شقاوتیں دیکھتے رہتے ع

آشیاں لٹتا رہا، ہم ناتواں دیکھا کیے

دلی کی جامع مسجد اپنے حسن و جمال، رعنائی و زیبائی، دیدہ زیبی اور خوشنمائی، نیز مضبوطی اور استحکام کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے، اس مسجد کے بارے میں بھی، یہ فیصلہ تقریباً ہو چکا تھا کہ یا تو اسے ڈھا دیا جائے، ورنہ گرجا بنا لیا جائے، لیکن ایک شریف انگریز کی مداخلت کے باعث یہ اسکیم عملی جامہ نہ پہن سکی،

اب ہم ذیل میں جامع مسجد اور دلی کی دوسری مسجدوں کی درگت کا ایک عبرت انگیز لیکن مجمل خاکہ پیش کرتے ہیں :—

جامع مسجد کے خصوصیات

دلی اور جامع مسجد کا تذکرہ کرتے ہوئے مٹکاف صاحب فرماتے ہیں:۔

دہلی دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر آباد ہے موجودہ شہر تقریباً ۱۰ میل کے گھیر میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے ۳ طرف اونچی فصیل ہے جو اینٹوں اور پتھروں سے بنائی گئی ہے اس کے سات دروازے ہیں :۔ نمبر ۱ لاہوری دروازہ نمبر ۲ دلی دروازہ نمبر ۳ اجمیری دروازہ نمبر ۴ ترکمان دروازہ نمبر ۵ موری دروازہ نمبر ۶ کابلی دروازہ اور نمبر ۷ کشمیری دروازہ یہ سب پتھر کے ہیں اور اس میں خوب صورت محرابیں بنی ہوئی ہیں ان میں شہر کے گارڈ کے لیے رہنے کی جگہیں بھی ہیں غدر سے چند سال قبل کرنل ایڈورڈ اسمتھ (انجینیرز) نے کشمیری دروازہ کی از سر نو تعمیر کی تھی موجودہ شہر مسلمانوں کا تعمیر کردہ ہے اس کی داغ بیل اور تعمیر شاہجہان نے [illegible] میں کرائی تھی یہ تعمیر

شہر دریا سے دور فصیلوں کے باہر واقع ہے جس زمانہ میں رچرڈ صلاح الدین اور عربوں کے خلاف عیسوی لڑائیاں لڑ رہا تھا اس وقت دہلی میں ایک ہندو راجہ پرتھوی راج کرتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں شہر کا نام اندرپرست (یعنی دیوتا اندر کے رہنے کی جگہ) تھا موجودہ مہرولی اب جس جگہ آباد ہے یہاں مشہور و معروف کنوئیں واقع ہیں اور جو شاہ عالم اور اکبر شاہ کا مدفن ہے۔ مقبرے اور کھنڈرات جو موجودہ شہر کے چاروں طرف بیس میل کے گھیرے میں پھیلے ہوئے ہیں اس امر کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ تاریخ کے مختلف زمانوں میں اس کے مختلف مقامات آباد رہے ہیں کیونکہ ہندوؤں کے عقیدے میں اپنے بزرگوں کی تعمیرات کی مرمت کرنا ناجائز ہے بلکہ نئی جگہ پر از سرنو تعمیر کرنی چاہیے گرد و پیش کے علاقہ کی زمین بہت کٹی ہوئی ہے اور اس میں بے شمار گڑھے ہیں۔ شہر کے شمالی اور مغربی حصہ میں وسیع باغات اور شرفا کے مکانات واقع ہیں تقریباً ۱ؕ۱ میل کے فاصلہ پر جے سنگھ کا تعمیر کردہ رصد خانہ ہے جو ۱۶۹۳ء میں تعمیر ہوا تھا اور جسے دہلی کے لوگ جنتر منتر کہتے ہیں اس مشہور ہیئت داں نے چند الواح بھی تیار کی تھیں جن کا ہندوستانی آج تک جنتریاں تیار کرتے وقت استعمال کرتے ہیں جنتر منتر کی عمارات بہت بڑی دھوپ گھڑی جس میں پیتل کا پتر لگا ہوا ہے اور درجہ دار سنگ مرمر کی محرابوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ ایک اور بھی دھوپ گھڑی ہے جو درجہ دار نصف دائرہ کی شکل کی ہے بر اٗن اجسام فلکی کی بلندیاں مشاہدہ کرنے کے لیے ہے جو سمت الراس کے جنوب یا شمال کی طرف خط نصف النہار میں سے ہو کر گذرتے ہیں دو اور عمارتیں بھی قریب ہی واقع ہیں اور ایک مقصد اور غرض سے بنائی گئی ہیں تاکہ بیک وقت دو آدمی مشاہدات کر سکیں علاوہ ازیں ایک مقصد نصف دائرہ بھی ہے جس میں نظام شمسی کے بعض معمولی اجسام کی وضاحت کی گئی ہے یہ عمارتیں ان پیتل کے آلات کی نقل ہیں جو سمرقند کے رصد خانہ میں استعمال کیے گئے تھے شہر کے شمالی حصہ میں شالا مار باغ ہے جہاں سے دہلی کے مضافات کا خوشگوار منظر نظر آسکتا ہے یہاں بہت سی مساجد مقابر اور باغاتی مکانات کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں جہاں شہر میں بہت سے خوب صورت محل ہیں جو سب عظیم الشان اور پتھر کے بنے ہوئے ہیں جہاں سف

سنگ مرمر کے حمام ہیں اور موسم گرما میں استعمال کیے جاتے ہیں ان تہہ خانوں میں بہت سے کونے ایسے ہیں کہ اگر صاحب مکان چاہے تو پناہ گزین کو پناہ دے سکتا ہے۔

جامع مسجد کے خصوصیات وسط شہر میں خوب صورت جامع مسجد واقع ہے جو جبولا پہاڑ پر تعمیر کی گئی ہے اس میں چڑھنے کے لیے سیڑھیاں ہیں اور سرخ پتھر کے دروازوں میں سے اندر جانے کا راستہ ہے مسجد کا صحن کشادہ ہے اور ۱۴۰۰ فٹ ہے یہ صحن بھی سرخ پتھر کا ہے اس کے بیچوں بیچ فوارہ ہے جہاں مسلمان نماز ادا کرنے سے پیشتر وضو کرتے ہیں۔

چبوترہ پر سرخ پتھر کے دالان چلے گئے ہیں جن کے اوپر بیٹھنے کی غرض سے ہشت پہلو برج بنے ہوتے ہیں مسجد مستطیل شکل کی ہے اور ۲۶۱ فٹ لمبی ہے اس کے ۳ خوبصورت سفید سنگ مرمر کے گنبد جن پر سنگ موسیٰ کی دھاریاں پڑی ہوتی ہیں اور جن کے ہر دو طرف ۱۳۰ فٹ کے ۲ بلند مینار واقع ہیں ان میناروں کی تعمیر میں سنگ سرخ اور سنگ موسیٰ کام میں لایا گیا ہے۔

ہر مینار میں سفید سفید سنگ مرمر کے ۳ کھنڈ بنے ہوئے ہیں ان کی برجیاں اس پتھر کی ہشت پہلو کی شکل کی بنی ہوتی ہیں اس عمارت کے سامنے کا تمام حصہ خوب صورت سنگ مرمر کی سلوں سے بنایا گیا ہے اور ستونوں کے بالائی حصہ کے برابر دس کتبے ہیں جن میں سے ہر ایک چار فٹ لمبا ۲½ فٹ چوڑا ہے جس میں بخط نسخ تمام قرآن نہیں تو اس کا بیشتر حصہ بالضرور درج ہے یہ ایک ایسی عام غلطی ہے جس کا ارتکاب ہر اس شخص سے ممکن ہے جس نے کتبات کو پڑھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی ۔مترجم) مسجد کا بیرونی حصہ سفید سنگ مرمر کی بڑی بڑی سلوں سے بنایا گیا ہے اور کنارے سنگ موسیٰ سے بنائے گئے ہیں اور یہ تمام کام نہایت نازک اور خوب صورت ہے یہ مسجد ۳ فٹ لمبی اور ۱½ فٹ چوڑی ہیں دیواریں اور چھت بھی سفید سنگ مرمر کی ہیں اور قبلہ کے قریب ایک خوب صورت محراب ہے جس کا رخ مکہ کے جانب ہے اور جو اعلیٰ درجہ کی پچی کاری کے کام سے مرصع ہے اس کے قریب ہی سنگ مرمر کا منبر ہے جس میں چار کٹہرے دار سیڑھیاں ہیں بلند برجوں پر چڑھنے کے لیے پیچ دار زینہ میں سے گذرنا پڑتا ہے جس میں ۱۳۰ سیڑھیاں ہیں ادھر سے شہر او محل کا

خوب صورت نظارہ کیا جا سکتا ہے گنبد تانبے کے کلس سے مرصع ہیں جن پر سونے کا پترہ چڑھا ہوا ہے اور جو دور سے بہت خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔ اس مسجد کی ابتدا شہنشاہ شاہجہاں نے اپنے سن جلوس کے چوتھے سال میں کی تھی اور اس کی تکمیل سن جلوس کے دسویں سال میں ہوئی کُل لاگت ۱۰ لاکھ آئی تھی باہر کے استحکامات سے مسجد اس قدر فاصلہ پر واقع ہے کہ انگریزوں نے باؤنڈ سے جو گولے پھینکے تھے اُن سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا صرف ایک گولہ مسجد کے صحن میں آکر پھٹا تھا شہر میں اس وقت ہندوؤں کے مناور کے علاوہ ۴۰ اور بڑی بڑی مسجدیں تھیں جن میں کلاں مسجد (کالی مسجد) جو جدید شہر دہلی کی تعمیر سے ۴۵۰ سال قبل بنی تھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ (۱)

جامع مسجد برنیر کی نگاہ میں

برنیر عہد عالمگیر کے مشہور سیاح نے، جو ملکی تعصب کا پتلا ہے، اس مسجد کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا ہے،

بڑی مسجد جو وسط شہر میں ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہونے کے سبب بہت دور سے نظر آتی ہے اور اس کی بنیاد رکھنے سے پہلے پہاڑی کی سطح کو خوب ہموار کر دیا گیا اور چاروں طرف چوکور میدان کھول دیا گیا جہاں مسجد کے چاروں سمتوں سے چار بڑے بازار آکر ملتے ہیں چنانچہ ان میں سے ایک صدر دروازہ کے سامنے ہے اور دوسرا عقب میں اور دو دونوں بغلی دروازوں کے محاذی! اور اندر جانے کے لیے تینوں ضلعوں میں کوئی ۲۵-۲۵ یا ۳۰-۳۰ پتھر کی خوب صورت سیڑھیاں بنی چلی گئی ہیں اور پشت کی جانب پہاڑی کی اونچائی پر پتھر گھڑ کر اور صاف صاف کر کے لگائے گئے ہیں۔ جن میں سے پہاڑی کی ناہمواری چھپ کر عمارت خوب صورت ہو گئی ہے اس کے تینوں دروازے سنگ سرخ سے بنے ہیں اور نہایت عالیشان ہیں اور اُن کے کواڑوں پر تانبے یا پیتل کی پتیاں جڑی ہوئی ہیں مگر صدر دروازہ جس پر سفید سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی برجیاں بنی ہوئی

---

(۱) غدر کی صبح و شام، (مشتاق صاحب کا مقدمہ) ص ۲۷

ہیں اور بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں اور زیادہ شان دار ہے مسجد کے پیچھے کے حصّے میں تین بڑے بڑے گنبد ہیں جن کے اندر اور باہر سفید سنگِ مرمر لگا ہوا ہے اور بیچ کا گنبد دوسروں کی بہ نسبت بہت بڑا اور اونچا ہے اور مسجد کا صرف وہی حصہ مسقّف ہے باقی گنبدوں سے لے کر صدر دروازے تک بالکل کھلا ہوا ہے اور جو گرمی کی وجہ سے کھلا رہنا ضروری ہے اور مسجد کے اندرونی حصّہ میں سنگِ مرمر کا فرش پر سنگِ موسیٰ کی تحریر سے مصلّے بنے ہوتے ہیں، اور بیرونی میں سنگِ سرخ کی سلوں کا فرش ہے۔

برنیر کا تعصّب

میں قبول کرتا ہوں کہ یہ عمارت بموجب ان اصول کے جن کو ہم لوگ پسند کرتے ہیں نہیں بنی لیکن میں اس میں کچھ عیب بھی نہیں پاتا اس کے ہر ایک حصّہ کی تقسیم عمدہ طور پر ہے اور تعمیر بھی عمدہ ہے اور تناسب کا بخوبی لحاظ رکھا گیا ہے چنانچہ مجھے امید ہے کہ اگر پیرس میں کوئی گرجا اس کے نقشہ پر بنایا جائے تو اپنی نرالی اور عجیب وضع کے لحاظ سے سب لوگوں کو پسند آئے تینوں گنبدوں اور چھوٹی برجیوں کے سوا جو سنگِ مرمر کے ہیں باقی عمارت سنگ سرخ سے بنی ہے جو سنگ مرمر کی بہ نسبت ذرا نرم ہے اور زمانہ پاکر اُس میں سے ورق جھڑنے لگ جاتے ہیں! ہندوستان کے لوگوں کا یہ قول ہے کہ جس کان سے یہ پتھر نکلتا ہے کچھ مدت بعد اُس میں پھر پیدا ہو جاتا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو نہایت عجب ہے اور غلط یا صحیح اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ برسات کے دنوں میں کان میں پانی بھر جاتا ہے مگر میں اس امر کی نسبت کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتا۔

بادشاہ ہر جمعہ کو جو مسلمان ملکوں میں ہمارے اتوار کی طرح مقدّس سمجھا جاتا ہے اس مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتا ہے جس راستہ سے اُس کو گذرنا ہوتا ہے اُس پر پہلے سے گرمی اور گرد و غبار کے فرو ہو جانے کے لیے چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے اور قلعہ کے دروازے سے لے کر مسجد تک ۳ بام سو سپاہی دو رویہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جن کے پاس چھوٹی چھوٹی مگر بہت خوب صورت بندوقیں ہوتی ہیں جن پر سرخ بانات کا غلاف ہوتا ہے۔

پانچ یا چھ عمدہ سوار قلعہ کے منارہ پر اس غرض سے موجود رہتے ہیں کہ سواری کے وقت راستہ کھلا اور صاف رکھیں اور وہ اتنے فاصلے سے آگے آگے چلتے ہیں کو ان کی گرد سے بادشاہ کو تکلیف نہ پہنچے اور جب یہ ساری تیاری ہو جاتی ہے تو بادشاہ قلعہ سے کبھی تو ہاتھی پر جو خوب سجایا ہوا اور جس پر سنہری اور منقش کام کی عماری لگی ہوتی ہے سوار ہو کر نکلتا ہے اور کبھی سنہری اور لاجوردی کام کے تخت پر جو کمخواب یا ارغوانی رنگ کی مخمل وغیرہ سے منڈھے ہوئے ڈنڈوں پر بندھا ہوا ہوتا ہے اور جس کو آٹھ چیدہ اور بھاری بھاری وردیوں والے کہار کاندھے پر اٹھاتے ہیں اور پیچھے پیچھے بہت سے امرا ہوتے ہیں جو بعض تو گھوڑوں پر اور بعض پالکیوں پر سوار ہوتے ہیں اور انہیں میں ملے جلے بہت سے منصبدار اور چاندی کی چھڑیوں والے چوبدار وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں اس سواری کو سلطان روم کی باشان و شوکت سواری سے تشبیہ نہیں دے سکتا اور نہ بادشاہان یورپ کے جنگی طور کے جلوس سے کیونکہ اس کا تجمل اور عظم و شان اور ہی طرح کا ہے مگر کچھ کم شاہانہ نہیں ہے۔ (۱)

سرسیدؒ کی تحقیق سرسیدؒ احمد خاں نے، جامع مسجد کے حالات بڑی تحقیق و جستجو اور کدو کاوش کے بعد مرتب کیے ہیں، ان کا بیان بھی پیش نظر رہنا چاہیے :۔

اس مسجد کی بنیاد ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ مطابق ۱۶۵۰ء میں رکھی گئی تھی اور ہر روز ۵ ہزار راج مزدور بیلدار اور سنگ تراش کام کرتے تھے اور باوجود اس اہتمام کے چھ برس میں ۱۰ لاکھ روپیہ خرچ ہو کر تیار ہوئی اس کے تین گنبد ہیں نوئے گز طول اور تیس گز کے عرض میں اور اندر کو سات محرابیں ہیں اور باہر صحن کی طرف ۱۱ دروازے جن میں سے ایک تو بہت بلند ہے اور پانچ پانچ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں اور بڑے دروازے پر کلمہ "یا ہادی" طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہان کے نام کا کتبہ اور تاریخ تعمیر او مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے خط نسخ سے لکھا تھا سنگ موسیٰ

---

(۱) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر ج ۱، ص ۳۰۵

کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے اور دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں جن
میں اوپر جانے کے لیے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں بہت دل کش بنی ہوئی ہیں:
شمالی مینارہ بجلی کے صدمہ سے گر پڑا تھا اور عمارت اور صحن کا فرش بھی جو تمام سنگ سرخ کا
ہے جا بجا سے بگڑ گیا تھا مگر سرکار عالیہ انگریزی نے ۱۲۳۲ھ ہجری مطابق ۱۸۱۷ء میں اس
مینار کو بنوا دیا اور فرش بھی درست کرا دیا اس مسجد میں چونکہ مکبّر بنا ہوا نہ تھا اور اس وجہ
سے امام کی آواز تکبیر سب نمازیوں کو نہیں پہنچ سکتی تھی اس واسطے شہزادہ میرزا سلیم ابن معین الدنیا
محمد اکبر شاہ بادشاہ نے ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں بڑے دروازے کے بیچ میں مکبّر سنگ موسیٰ
کا بہت خوشنما بنوا دیا ہے مسجد کے اندر تمام فرش سنگِ مرمر کا ہے اور اس میں سنگ موسیٰ
کی پچی کاری سے مصلے بنا دیے ہیں ممبر بھی سنگ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے: جانب
شمال کے دالان میں کچھ تبرکات جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رکھے ہیں۔ اور وہ مقام
درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے مسجد کا صحن ۱۳۶ گز کے عرض و طول سے اور اس کے بیچ میں ۱۵ اور
۱۲ گز کا ؟ ے سنگ مرمر کا حوض ہے جس میں فوارہ لگا ہوا ہے صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے
دالان اور حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں اور چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں جنوبی
اور شرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندی نماز کا وقت دیکھنے کو بنا ہوا ہے اور مسجد کے تینوں دروازوں
میں برنجی کواڑ چڑھے ہوئے ہیں جنوبی دروازے میں رہنے کے لائق حجرے بنے ہوئے ہیں
اور ۳۳ سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو مجمع عام ہوتا ہے اور بساطی اور فالودہ والے اور کبابی
اور اصیل مرغ بیچنے والے اور شوقین جوان انڈے لڑانے والے آن کر جمع ہوتے ہیں شمالی
دروازہ میں بھی رہنے کے حجرے بنے ہوئے ہیں اور اس طرف ۳۹ سیڑھیاں ہیں اگرچہ اس طرف
بھی کبابی بیٹھتے اور سودے والے دوکانیں لگاتے ہیں لیکن بڑا تماشا اس طرف مداریوں اور قصہ
خوانوں کا ہوتا ہے قصہ خوان مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے اور داستان امیر حمزہ یا قصہ حاتم طائی
اور کہیں داستان بوستان خیال سناتا ہے جس کے سننے کو سینکڑوں آدمی جمع ہوتے ہیں ایک طرف

علاوہ تماشا کرتا ہے اور یہاں مٹی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے شرقی دروازے میں بھی مکانات بنے ہوئے ہیں اور اس کے آگے ۲۵ سیڑھیاں ہیں جن پر ہر روز گزری لگتی ہے جو گویا ہر روز کا میلہ ہے۔ بزاز طرح طرح کے کپڑے الگنوں پر ڈالتے ہیں اور شوقین جوان طرح طرح کے خوش آواز جانور پنجروں میں لیے ہوتے سیر کرتے پھرتے ہیں اور ایک طرف کبوتر والے کبوتر بیچتے ہیں اور ایک جانب گھوڑے والے گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ (۱)

جامع مسجد سے انتقام لینے کی اسکیمیں

انگریز جتنے مسلمانوں سے خفا تھے، اس سے کہیں زیادہ جامع مسجد سے خفا تھے۔ خفگی کے کئی وجوہ تھے، مثلاً یہ کہ وہ مسجد کیوں ہے گرجا کیوں نہیں ہے؟ اس لیے، بھی خفا تھے کہ مسجد ہو کر، فنی اور عماراتی نقطۂ نظر سے، دستِ قدرت کا شاہکار کیوں معلوم ہوتی ہے؟ اس کا یہ جرم بھی ہرگز معمولی نہیں تھا کہ، وہ اسلام اور مسلمانوں کے دورِ عروج کی یادگار تھی، اور ان کا حال یہ تھا کہ نہ اسلام کا نام سننا چاہتے تھے، اور نہ مسلمانوں کی صورت دیکھنا چاہتے تھے، دونوں کے استیصال کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔

پہلی ناکام کوشش

غدر کے زمانہ میں جب انگریزوں نے دلّی پر چڑھائی کی، تو کوشش کی کہ دورانِ جنگ میں مسجد کو زمین کے برابر کر دیں، لیکن، اتفاق کہیے، یا قدرت کی مشیّت یہ بات کچھ چلی نہیں، کیمبل صاحب آئے اسی ارادہ سے تھے، لیکن ان کا مددگار منٹگمری وقت پر نہیں پہنچا، اس لیے پلٹ آنے پر مجبور ہو گئے۔

کیمبل کالم جن کے راہ نما۔ سر تھیو فلس مٹکاف صاحب تھے۔ وہ شہر کے حال سے اس بدد سے خوب واقف تھے۔ کہ شہر کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے وہ اس کالم کو ایسے راستہ سے لے گئے

---

(۱) آثار الصنادید، (سرسید احمد)

جس میں دشمنوں کی آتش باری بہت کم تھی وہ اس کالم کو لے کر جامع مسجد کے پاس پہنچے اور یہاں نصف گھنٹے تک انتظار کیا اور کالم اُن کی مدد کو آئیں۔ مگر اوپر بیان ہوا کہ ان کو اور جگہ ایسے کام کرنے تھے۔ جن کے لیے وہ کافی نہ تھے۔ بس کیمبل صاحب جو زخمی ہو گئے تھے۔ کمک کے آنے سے مایوس ہو گئے تھے۔ توپیں اور باروت کے تھیلے ان کے پاس نہیں تھے جس سے کہ وہ جامع مسجد کے دروازہ اڑا دیتے وہ ترتیب و انتظام کے ساتھ سپاہ کو گرجا میں واپس لے آئے اور ریزرو کالم میں مل گئے ۔ (۱)

بہت سے انگریز کہتے تھے کہ دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ جن کا غصہ کچھ اتر گیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جامع مسجد کو گرجا بنا دو اس کے میناروں میں صلیب لگا دو اس کی سنگ مرمر کی سلوں پر جو بہت سی ہیں۔ اس عیسائی کا نام کندہ کر دو جو غدر میں شہید ہوا ہے۔ جب پنجاب کے ذی اقتدار انگریز افسروں اور ان کے دلی دوستوں نے اور بعض نے اصالتًا حاضر ہو کر یہ دلیل بیان کی کہ جامع مسجد برباد کر دینے سے مسلمانوں کے مذہب پر ایک ضرب پڑے گی تو جان لارنس نے بہت نرمی و ملائمت سے دلائل کو بیان کیا۔ جب دیکھا کہ اس کہنے کا کچھ اثر نہیں ہوتا تو وہ کھڑے ہوئے اور کہا بابا یہ رائے نہ دوں گا۔ بہت سے امور ایسے ہیں کہ جن کے لیے تم مصر ہو سکتے ہو۔ کہ میں ان کو کروں مگر کبھی اس باب میں مجھ سے اصرار نہ کرنا ۔ ۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لارڈ کننگ کو اپنی چٹھی میں انہوں نے لکھا ہے۔ کہ مجھے معلوم نہیں لارڈ شپ نے دہلی کے باب میں کیا تجویز کیا ہے۔ اگر جناب اس کو شہر کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تو میرے نزدیک پرائز ایجنسی کی کاروائیوں کو روکنا چاہیئے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ شہر میں سے مارشل لا موقوف کیا جائے ۔ (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۴۰

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۶۴۲

جامع مسجد میں سور پکائے گئے

منشی ذکاء اللہ، اپنی انگریز دوستی کے باوجود، یہ لکھے بغیر نہ رہ سکے:۔

مساجد کا حال یہ ہوا۔ کہ جامع مسجد جو شہر کی کل مسجدوں کی ناک تھی انگریزوں نے اس کو یوں نکٹا بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اس کو بنایا۔ اس میں پاخانہ پیشاب کرنے سے کچھ پرہیز نہ کیا سکھوں نے سور ذبح کر کے پکائے کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے۔ وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے ایک اور مسجد رفیع الشان زینت المساجد تھی۔ جو گوروں کی سکوٹ گھر بنی۔ (۱)

مسجد ضبط نماز بند

اب جب خدا خدا کر کے، دنیا کی لعنت ملامت کے ڈر سے، مسجد جامع، سکھ سپاہیوں سے خالی ہوئی، تو اس پر تالا چڑھا دیا گیا، نہ نماز پڑھنے کی اجازت، نہ اندر گھسنے کی،

یہ واقعہ بھی، ایک انگریز دوست' اہل قلم سے معلوم ہوتا ہے:۔

شاہجہان کے بعد بادشاہ کے زمانہ میں مسجد عمدہ حالت میں رہی، غدر میں مسجد ضبط، نماز بند، اور سرکاری پہرا چوکی قائم ہو گیا، کئی برس یہی حال رہا، خدا خدا کر کے ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو مسلمانوں کی استدعا پر گورنمنٹ نے مسجد کو واگزشت کر دیا، (۲)

مسجد کی واگزاری

غرض جامع مسجد کئی سال تک "ضبط" رہی کبھی اس میں سکھ سپاہیوں نے ڈیرا ڈالا، اور ان کی بارک کی حیثیت سے وہ استعمال ہوئی، اور اس طرح مسلسل اس کی بےحرمتی ہوتی رہی، کبھی اس پر تالا لگا دیا گیا، مسلمانوں کے لیے فرمان صادر کر دیا گیا کہ نہ وہ داخل ہو سکتے ہیں نہ نماز پڑھ سکتے ہیں،

آخر ۵ سال کے بعد، مسجد مسلمانوں کو واپس ملی، لیکن چند شرائط کے ساتھ، وہ شرائط ملاحظہ ہوں

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۶۷۱

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص۹

نقل اقرار نامہ مہتمان مسجد جامع

ہم اشخاص مفصلہ ذیل جو باتفاق ہمدگر مہتمم جامع مسجد قرار پائے ساتھ کمال شکر گذاری سرکار ابد پائدار بخوشی اور رغبت اقرار کرتے ہیں :۔

۱ - یہ کہ ہم لوگ ذمہ دار ہیں کہ جو کچھ دنگا فساد مسجد میں نہ ہونے پائے گا۔

۲ - اگر کوئی مقدمہ متعلقہ مسجد کی بابت واقع ہو تو ہم بطور خود اس کا فیصلہ کریں گے۔

۳ - کوئی امر شورش کا مسجد کے موجب تحقیر و اہانت یا بدخواہی سرکار نہ ہونے پائے گا۔ اگر اتفاقاً کوئی بات وقوع میں آئی اور ہمارے تدارک و اختیار سے باہر ہو اس کی اطلاع بحضور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کریں گے۔

۴ - مرمت شکست و ریخت کی کرتے رہیں گے اور حساب کتاب کرایہ دوکانات و نہ بازاری وغیرہ مال وقف کا بخوبی درست رکھیں گے۔

۵ - منجملہ مہتمان کے جو کوئی کم ہو جائے کسی سبب سے تو اس کی جگہ دوسرا یہ تجویز خود ہا مقرر کر لیں گے۔

۶ - اقرار کرتے ہیں کہ اگر خلاف مرضی سرکار کوئی امر ظہور میں آوے تو سرکار کو اختیار رہے کہ دروازہ مسجد بند کر دے۔

المرقوم ۲۴ نومبر ۱۸۶۲ء

العبد	العبد	العبد	العبد	العبد	العبد
مرزا الٰہی بخش	محمد صدر الدین	محمد ابراہیم	محمد ابراہیم	محمد حسین	
العبد	العبد	العبد	العبد	العبد	العبد
نصیر الدین	تراب علی	حافظ داؤد	محمد تفضل حسین	محبوب بخش	

العبد

حافظ میر محمد امام

بقلم تراب علی

ہدایات

۱ - بعد نماز پڑھنے سب آدمی مسجد سے باہر چلے جائیں -
۲ - کوئی شخص رات کو مسجد میں نہ رہے سوائے موذن اور امام مسجد کے -
۳ - قوم ہندو اندر مسجد کے جاویں کچھ مزاحمت نہیں - مگر ادب سے جاویں -
۴ - افسران صاحب سول و ملٹری و دیگر صاحبان انگریز کو اجازت اندر جانے کی ہے - کچھ جوتا اتارنے کی احتیاج نہیں ہے - الّا امید ہے کہ کتّا ساتھ نہ ہوگا - اور چرٹ وغیرہ نہ پئیں گے -
۵ - گورہ لوگ فوج کے - اندر نہ جانے پاویں گے - بلا پاس افسر کمان یا صاحب ضلع کے -
۶ - دو سنتری دو دروازہ پر متعین رہیں گے - بطرف جنوب و شمال اور ان کی تنخواہ ذمہ مہتمان مسجد کے ہوگی - (۱)

ان شرائط سے اندازہ ہوتا ہے، کہ مسجد ازراہ رحم و کرم، مسلمانوں کو واپس نہیں کی گئی تھی، نہ اس میں، سیاست اور مصلحت کی کارفرمائی تھی، اس کی واگزاری صرف اس لیے عمل میں آئی تھی کہ مسلمانوں کو اور ان کے اکابر کو ذلیل کیا جائے -

ان شرائط میں گوروں کو جوتا اتارے بغیر مسجد میں جانے کی اجازت ہے - ہندوؤں کو مسجد کی سیر کرنے کی اجازت ہے، دروازوں پر سنتری رکھنے کا حکم ہے، لیکن ان کی تنخواہ مسجد دے گی، دستخط کنندگان کے بڑے بڑے نام دیکھیے، اور یہ رسواکن شرائط دیکھیے،

غدر کے بعد مسجد کی آمد و خرچ

اب شاہی خزانے کی ایک پائی بھی، مسجد پر خرچ نہیں ہو سکتی تھی، عیسائی حکومت، کیوں مسجد کے حال زار پر توجہ کرتی ؟

خدا کا شکر ہے، مسلمانوں نے اس طرف کچھ توجہ کی، اور حالات ذرا سنبھل گئے - !

کل آمدنی جائداد مسجد کی تقریباً دو ڈھائی ہزار ہے اور اسی کے قریب خرچ ہے - متفرق آمدنی

---

(۱) تاریخ یادگار دلی، (سید احمد) صـ ۲۸

چوروں وغیرہ سے ہوتی ہے۔ مسجد کی تعمیر وغیرہ میں صرف ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ نواب کلب علی خاں صاحب بہادر مغفور والی ریاست رامپور نے ایک لاکھ پچپن روپیہ ۱۸۸۶ء میں مرمت فرمایا جس سے تمام مسجد کی مرمت اور پالش وغیرہ ۱۸۸۶ء سے شروع ہوئی۔ سعید زماں شاہ صاحب نگراں سے ۱۹۰۱ء میں ختم ہوئی۔ بہاولپور کے روپے سے مینار درست ہوتے علیٰ ہذا القیاس"

مسجد کا کل سرمایہ ایک معتبر کوٹھی میں جمع رہتا ہے اور تمام دفتر اور کاغذات مسجد کے جنوبی دروازے کے متصل حجرہ میں رہتے ہیں۔ (۱)

دوسری مسجدوں کی درگت

جامع مسجد تو خیر اس لیے بچ گئی کہ وہ دنیا کی نگاہ میں تھی۔ انگریز اگر اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے، تو ان کے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی، لیکن دوسری مسجدوں کو شہید کرنے، ڈھانے، ضبط کرنے، اور ان کی ہیئت بگاڑنے میں انہوں نے کوئی تامل نہیں کیا۔

ذیل میں، اس طرح کی مسجدوں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے، مع ان کے تاریخی پس منظر کے، تاکہ قارئین یہ اندازہ کر لیں کہ، جرم کتنا بڑا اور کتنا سنگین ہے، مسلمانوں پر یہ الزام لگانے والے لوگ کہ انہوں نے کلیساؤں اور مندروں کو مسجد بنا لیا، یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی، ان گنت مسجدوں کو کلیساؤں، اور مندروں میں تبدیل کر چکے ہیں، : ——— حالانکہ پہلا الزام بعوث ہے، دوسرا حقیقت:

توپ خانہ زینت المساجد میں

محلہ دریا گنج لب دریائے جمن مسجد زینت المساجد ہے شہر شاہجہاں آباد کی مسجدوں میں جامع مسجد کے بعد اسی مسجد کا شمار ہوتا ہے، اس مسجد کو موقع اور محل ایسا ملا ہے کہ بایداور شاید یہ مسجد جمنا کے جنوبی کنارے پر مرتفع مقام پر بنائی گئی ہے اس کے لال لال منارے دور دور سے دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسجد کوسوں سے نظر آتی ہے اول تو کرسی بہت بلند پھر دریا کی طرف اس کے آگے اور کوئی عمارت

---

(۱) تاریخ یادگار دلی، ص ۳۰

بنہیں اس مسجد نے خداداد حسن پایا ہے، اور مسجد کی فضا، اور مینت کاری، اور پرچاین رادی کی بہار اور ہر سبزہ زار، اور فصیل شہر سے دریا کا ٹکراتے ہوئے بہنا اور موجوں کا بل کھانا عجب عالم دکھاتا ہے، سر سے پاؤں تک سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے تینوں برج سنگ مرمر کے ہیں اور ان میں سنگ موسیٰ کی دھاریاں بنائی گئی ہیں، تاکہ چشم بد سے محفوظ رہے، اور برجوں پر نہایت خوشنما سنہرے کلس ہیں کہاں کی دمک آفتاب کی چمک کو مات کرتی ہے، مینار اس کے آسمان سے باتیں کرتے ہیں اس مسجد کے سات در ہیں۔ (۱)

صحن مسجد ایک سو پچانوے فٹ لمبا اور ایک سو پندرہ فٹ چوڑا ہے جس میں سنگ سرخ کے چوکے بچھے ہوئے ہیں، صحن مسجد کے وسط میں ایک مستطیل حوض ۴۲ فٹ لمبا اور ۲۳ فٹ چوڑا اور ۴ فٹ عمیق ہے، چبوترے پر سنگ مرمر کا حاشیہ لگا ہوا ہے، مسجد کے صحن کے چاروں طرف سنگ سرخ کا دو فٹ اونچا کٹہرا ہے، مسجد کے شمال اور جنوب میں پختہ سنگ بست سہ دریاں بنی ہوئی ہیں، یہ مکان غالباً امام، مؤذن جاروب کش، یا دیگر خدام مسجد کے لیے، بنائے گئے تھے۔

لیکن غدر کے بعد، اس مسجد کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، اور اس عظیم و جلیل اور مقدس عمارت کو کس طرح، مذموم اور مکروہ مقاصد کے لیے، استعمال کیا گیا۔ اس کی داستان بھی سن لیجیے:—

صحن میں ایک پختہ سنتری روم فوج کے قیام کی نشانی اب تک باقی ہے، چونکہ یہ مسجد غدر کے بعد، عرصہ تک سکونت کے کام میں لائی گئی، اس کے اندر جا بجا دیواریں اٹھا کر جدا جدا کمرے بنا لیے تھے۔

اسٹیفن صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "مسجد کے عقب میں چار سنگ مرمر کے کشادہ برج تھے، افسوس اب ان کا کہیں پتہ نہیں" اس مسجد میں من مانی توڑ پھوڑ کی گئی ہے، حتیٰ کہ زینت النساء بیگم کا مقبرہ بھی بہ اغراض فوجی ڈھا دیا گیا! اس مسجد میں عرصہ تک توپ خانہ رہا، پھر برسوں تک اس

---

(۱) آثار الصنادید، از سرسید احمد خاں طبع دوم)

میں گوروں کا روئی گودام بھی رہا، جس سے رہی سہی رونق بھی جاتی رہی۔

زینت النسا بیگم نے اپنی قبر احاطۂ مسجد میں اپنے حین حیات بنوائی تھی جس میں وہ ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء میں مدفون ہوئیں، ایک قبر اب بھی صحن مسجد کے شمال میں ہے جو صرف چونے گچی کی ہے اور یہی بانیٔ مسجد کی قبر ہے۔

کتبہ: "مونس ما در لحد فضلِ خدا تنہا بس است
سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

امید وار حسن خاتمہ، فاطمہ زینت النسا بیگم بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر غازی،

۱۱۲۲ھ " (۱)

سر سید کا بیان گرمی اور برسات میں اب بھی دلّی کے اکثر باشندے سہ پہر کو جمنا پر جاکر پانی کی سیر دیکھتے ہیں اور تیرنے والے تیرتے ہیں مگر پچاس برس پہلے وہاں اشراف تیرنے والوں کے بہت دلچسپ جلسے ہوتے تھے سر سید کہتے ہیں

"میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلّی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جس میں مرزا مغل اور مرزا طفل بہت سربرآوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی باؤلی تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانہ میں بھی ۳۰ - ۴۰ آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے انہیں دنوں میں نواب اکبر خان اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا مغرب کے وقت

---

(۱) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد)، ص ۱۳۲

سب نیراک زینت المساجد میں جمع ہوتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھکر اپنے گھر چلے آتے تھے میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا ۔ (۱)

سنہری مسجد کی بے حرمتی

کوتوالی کے چبوترے سے ملی ہوئی سنہری مسجد ہے، اس کے پچھلے حصہ میں ایک مشہور عالم مولانا فخرالدین کا مکان مسکونہ تھا جو قطب صاحب کی درگاہ میں مدفون ہیں، ایام غدر میں یہ بڑا معرکہ الآرا مقام رہا ہے، کوتوالی کے چبوترے کے سامنے ہی ان تین شہزادوں کی نعشیں لٹکائی گئی تھیں جن کو غدر ۱۸۵۷ء میں ہڈسن نے گولی کا نشانہ بنایا تھا، اور یہیں برابر پھانسیاں گاڑی گئی تھیں، جن پر باغیوں کو سرجان تھیا فلس مٹکاف صاحب کے سامنے لٹکایا جاتا، سرتھیا فلس کا عالی شان محل مع بیش بہا مال و اسباب کے غدر میں لوٹ لیا گیا تھا، اس سبب سے صاحب موصوف بہت برافروختہ تھے ۔ (۲)

مسجد فتحپوری کی دکانیں ضبط ۱۸۵۷ء

غدر کیا آیا تھا، گویا دلی پر قہر خدا تھا، یہ خانہ خدا بھی اس کی زد میں آگیا۔ اور نہ صرف دوکانیں ضبط کر لی گئیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ ۲۹ ہزار کو نیلام بھی ہو گئیں، بھلا مسلمانوں میں اتنا دم کہاں تھا کہ لیتے؟ لالہ چھناملل صاحب نے کہ جن کا شمار دہلی کے بڑے رئیسوں میں تھا انہوں نے جھٹ خرید لیں، مسلمان منہ دیکھتے دیکھتے رہ گئے، تازہ تازہ غدر ہوا تھا، انگریزوں کے دل میں غصہ بھرا ہوا تھا، کسی نے داد فریاد نہ سنی،

سنہ ۱۸۹۳ء میں انجمن راشدین صلاح کُلی اسلامیہ کی طرف سے جائداد وقفی اور تنسیخ نیلام کی درخواست دی گئی، گورنمنٹ نے لالہ کو، پانچ آنہ سیکڑہ سود کے حساب سے ایک لاکھ دس ہزار روپیہ دے کر دکانیں خریدنا چاہیں اور اس کے معاوضہ میں ایک موضع تحصیل پلول میں دینا چاہا، مگر لالہ صاحب نے انکار کیا۔

---

(۱) حالات جاوید (حالی)، صہ ۲۶

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم، صہ ۲۲۵

۱۸۹۴ء میں اس جائداد کا کرایہ بذریعہ تحصیل، وصول ہو کر سرکار میں جمع ہونے لگا، ۱۸۹۵ء کرایہ مجتمعہ اور اس موضع کی آمدنی سے جو ۲۵ ہزار میں نیلام ہوا، ایک لاکھ دس ہزار روپیہ اصل و سود لالہ صاحب کو دے کر باقی پندرہ سو روپے اور مسجد کی کل جائداد واگزاشت کر کے مسلمانوں کو دے دیا۔ (۱)

مسجد پنجابی کڑہ ریل پر قربان ہوگئی

پنجابی کڑہ ایک محلہ تھا، جس میں پنجابی (مسلمان تجار) رہتے تھے اس کڑے میں ایک مسجد بھی مصفا اور دل ربا سنگ سرخ کی نہایت خوش وضع اور خوب صورت تھی جس میں مولوی عبدالخالق صاحب پدر مولوی نذیر حسین صاحب محدث دہلوی درس و تدریس فرماتے تھے، اور دن رات قال اللہ و قال رسول کا ذکر رہتا تھا، اس مسجد میں مکانات اور ایک بہت پاکیزہ حوض تھا، اس مسجد کا صحن بہت وسیع تھا، دلی کی بہترین مساجد میں اس کا شمار ہوتا تھا یہ مسجد نواب اورنگ آبادی بیگم صاحبہ نے جو اورنگ زیب بادشاہ کی محل تھیں، بنوائی تھی یہ مسجد ریل میں آگئی، اور اس کا نشان تک باقی نہ رہا۔ یہ مسجد اس جگہ تھی جہاں دلی کا بڑا ریلوے اسٹیشن ہے، میرے نانا صاحب کو جو اس مسجد کے امام تھے ان کی حیات تک گورنمنٹ سے پندرہ روپیہ ماہوار پنشن امامی کے ملتے رہے مگر عمارت مسجد کا کچھ معاوضہ نہ ملا، کہ وہ شاہی عمارت تھی۔ (۲)

• ایک مسجد میں گدھے بندھے
• مہاراجہ جیند کو مسجد عطا کی گئی
• مہاراجہ نے مسجد مسمار و منہدم کرادی

شیعوں کی مسجد جو سب سے بڑی تھی مسجد نواب حامد علی خان کی تھی۔ اس میں گدھے بندھے۔ قلعہ کے نیچے میدان کرنے میں ایک بڑی عالیشان مسجد اکبرآبادی بالکل منہدم ہوئی۔ اور بہت سی اور چھوٹی چھوٹی

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم، صفحہ ۲۳۹

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۲۰۴

مسجدیں مسمار ہوئیں۔ ان کے معاوضہ ملنے کی درخواست مسلمانوں کی طرف سے خواجہ علی احمد خان نے کی سرکار نے کچھ التفات اس درخواست پر نہ کیا۔ ان کا مالک خدا تھا جس کو وہ معاوضہ نہیں دے سکتے تھے۔

کوتوالی کے قریب سکھوں کے گردوارہ سے چسپاں ایک مسجد تھی اس کے لینے کی درخواست مہاراجہ جیند نے سرکار سے کی وہ اس کو سرکار نے دے دی مہاراجہ نے اس کو مسمار کرا کر مندر میں ملا لیا۔ (۱)

بہادر شاہ کی مسجد میں سپلائی کا گودام

ایک مسجد چھتہ چوک کے شمال میں ہے، اور اب سپلائی اور ٹرانسپورٹ کے احاطے میں آ گئی ہے، بہادر شاہ کی بنائی ہوئی ہے، اس مسجد کا صحن نہیں، مسجد کی چھت مسطح اور دالان ہیں، اور پانچ در ہیں، اب اس مسجد میں سپلائی اور ٹرانسپورٹ کا گودام ہے۔ (۲)

برسہا برس کے بعد مسجد واپس ملی

دائیں طرف گلی جھیم بقا آگے بائیں جانب منڈی ممک پھر بائیں جانب لال مسجد یہ مسجد ۱۲۳۸ھ میں مسماۃ مبارک بیگم نے بنوائی تھی جو ایک انگریز کے گھر میں بیوی کی حیثیت سے رہتی تھی اور اس کی تمام جائیداد اور ملکیت پر قابض تھی۔ اُسی مال میں سے اُس نے یہ مسجد اور اُس کے پاس کا مکان جس میں تھانہ نمبر ۲ واقع ہے تعمیر کروایا۔ غدر کے بعد مسجد سرکاری قبضہ میں آئی اور ویران پڑی رہی۔ پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ انجمن معید الاسلام کی درخواست پر سرکار نے واگذاشت کی اور انجمن نے اس کی درستی کرائی دو کانیں از سرِ نو بنوائیں۔ نماز کے جواز عدم جواز میں اختلاف ہوا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ سے فتوے منگایا۔ نماز بجماعت شروع ہوئی۔ ایک آدمی انجمن کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہے

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۷

(۲) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص ۸۱

مسجد سے متصل چھ دوکانیں اور سہ دری میں مختصر سا مکان ہے۔ کرایہ کی آمدنی تقریباً عہ[۲] ہوتی ہے جو انجمن میں پہنچ جاتی ہے۔ (۱)

اس سلسلہ میں مالک رام کا بیان بھی پیش نظر رہے تو اچھا ہے :-

مالک رام صاحب ایم اے نے ذکر غالب میں لکھا ہے۔ کہ مرزا اکبر علی خاں نواب احمد بخش خان کے ایک بھائی مرزا نبی بخش خاں کے پوتے تھے انھوں نے ڈیوڑھا آکر ہولی کی لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ جو ایک مسلمان عورت مبارک بیگم کے بطن سے تھی۔ اس کا نام مالک رام صاحب کے قول کے مطابق خورشید بیگم اور غالب کے قول کے مطابق حسن جہاں بیگم تھا۔ مبارک بیگم کی بنائی ہوئی ایک مسجد حوض قاضی کے بازار سرکی والاں میں ہے۔ (۲)

مسجد حکیم شریف خاں

بلی ماراں ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء یہ مسجد دو منزلہ ہے، اوپر گنبد، مسجد کے نیچے پانچ دوکانیں، صحن کے شمالی سرے پر چودہ سیڑھیوں کا زینہ ہے، یہ جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں کے دادا کی بنائی ہوئی ہے حکیم شریف خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ جن کو سلاطین مغلیہ کی جانب سے، علاوہ جاگیر کے اشرف الحکما کا خطاب بھی تھا۔ اس مسجد کے پیش طاق پر یہ کتبہ ہے۔

شکر خدائے یعنی محمد شریف خاں
شد طرح مسجدے کہ بود کعبۂ صفت
برخاست چوں ندائے مؤذن خطیب عشق
گفتا بجوئے سال دے از ہ خ نہ خدا ہد (۳)
۱۲۶۱ھ

یہ مسجد بھی خطرہ میں پڑ گئی تھی لیکن بچ گئی۔

---

(۱) یادگار دہلی، صفحہ ۱۰۱
(۲) غالب غلام رسول مہر، صفحہ ۷۹
(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم از بشیر الدین احمد صفحہ ۲۶۲

مسجد بارود سے اڑا دی گئی

قلعہ کے دلّی دروازے کے برابر پریڈ گراؤنڈ کے پاس سنہری مسجد کے سامنے ایک لمبی سڑک فیض بازار سے دلّی دروازے تک چلی گئی ہے، اس سڑک کے مشرق جانب میں غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک بنگلہ تھا، اور اس ڈاک بنگلہ کے مغرب میں بڑی بھاری اکبرآبادی مسجد شاہجہان بادشاہ کی بیگم صاحبہ کی تھی یہ مسجد تو قلعہ کے اطراف گولہ اندازی کے لیے میدان صاف کرنے کی نذر ہوئی ۔ (۱)

مسجد سدّھو گھوسن

چونے والاں، ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷-۳۸ء یہ مسجد دو منزلہ تین گنبد اور تین دروں کی ہے، اوپر مسجد۔ نیچے چار دوکانیں ہیں، پیش طاق پر یہ کتبہ ہے۔

مسجد و مدرسہ و چاہ و مکان و مسکن

ہمہ را وقف شد از عاجزہ سدھو گھوسن

وارث ہر سہ مکاں کس نہ شود غیر خدا

گر شود روز جزا دست من از وے دامن

من الہجرۃ النبویہ ۱۲۵۳ھ (۲)

لیکن اب کہاں !

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصّہ دوم (بشیر الدین احمد) صـ ۲۷

باب ۴۴

لال قلعہ کی بربادی

ایک تہذیب • ایک تمدّن • ایک عہد کا قتل

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے اگرچہ زمانہ کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

یہی دلّی تھی، جسے زمانہ کی تند و تیز گردشوں نے، غارت کر کے رکھ دیا تھا، یہاں بہت سی تہذیبیں نمودار ہوئیں، بہت سے تمدّنوں نے جنم لیا، بہت سی قومیں آئیں، اور اپنا جاہ و جلال دکھا کر رخصت ہو گئیں، لیکن اب دلّی کے کھنڈرات پر پھر ایک نئی دلّی "شاہجہان آباد" کے نام سے تعمیر ہو رہی تھی، شاہجہان اعظم کا حسین و جمیل خواب: —— دلّی اب پھر ایک بہت بڑی، شاندار اور باوقار قوم کا مرکز بن چکی تھی، اس ویرانہ میں پھر نئی زندگی کی کروٹیں لے رہی تھی، نئی تازگی، نئی رعنائی، نیا بانکپن ابھر رہا تھا، یہ خطّہ پھر ایک نئی تہذیب، ایک نئے تمدّن، ایک نئی تاریخ کا نشیمن بن رہا تھا، دلّی اب مغل امپائر کی راجدھانی تھی: —

"بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے"

اور واقعی شاہجہاں نے یہی کر دکھایا، دیکھتے دیکھتے دلّی، دنیا کا بہت بڑا، بارونق اور پرشکوہ شہر بن گیا، یہاں محلات تعمیر ہوئے، کوشکوں کی بنیاد پڑی، باغات بنے، چمن بندی ہوئی، پارک بنائے گئے، بڑی بڑی حویلیاں عالم وجود میں آئیں، فلک فرسا اور شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں، مسجدوں، خانقاہوں، اور دانش کدوں کی بنا پڑی، اور لال قلعہ بھی عالم وجود میں آ گیا، شاہجہانی دور عظمت و جلال کا حسین و جمیل مرقّع!

لیکن غدر میں یہ بے قصور قلعہ بھی، مجرم سمجھ کر تعزیر و عقوبت کے شکنجہ میں کسا گیا، اس کی عمارتیں ڈھا دی گئیں، اس کے محلّات مٹی میں ملا دیئے گئے، اس کے ایوان کھنڈر بنا دیئے گئے، اسکے باغات اُجاڑ دیئے گئے، اس کی نہریں بند کر دی گئیں، اس کے فوّارے اور آبشار خشک کر دیئے گئے، اس کی رونق کھرچ لی گئی، لیکن یہ اتنا سخت جان تھا کہ پھر بھی قائم رہا، فرنگی دورِ استبداد کا ایک ایک ظلم اس نے سہا، لیکن اپنے زخمی وجود پر موت نہیں طاری ہونے دی،

یہ قلعہ، انقلاب و تغیّر کی آماجگاہ رہا ہے، اس نے شاہجہاں کا جلال و جمال دیکھا، اس نے عالمگیر کا دبدبہ اور طنطنہ دیکھا، اس نے عالمگیر کے جانشینوں کی خانہ جنگیاں دیکھیں، اس نے نادر شاہ درّانی کو اپنا مہمان بنایا، اس نے احمد شاہ ابدالی کے لیے اپنے دروازے کھول دیئے، اسے مرہٹوں کے لشکر نے پامال کیا، مرہٹہ سرداروں نے زیر و زبر کیا، یہیں غلام قادر روہیلہ نے، اپنے کمزور اور بے کس آقا شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں، اور خاندان تیموری کو ذلیل کیا، یہیں مادھوراؤ سندھیا، بادشاہ کا وکیل اور سرپرست بن کر پہونچا، اور بادشاہ کا ندیم و مقرّب، محافظ اور وکیل بن کر سلطنت مغلیہ کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا، یہیں لارڈ لیک کے لشکر نے بسیرا کیا، مرہٹوں کا عمل دخل ختم ہوا، اور فرنگی اقتدار کا پرچم اس کے پھاٹک پر لہرانے لگا، یہیں آخری مغل تاجدار، بہادر شاہ تخت نشین ہوئے اور یہیں، باغی تلنگوں، اسلام کے مجاہدوں، خاندان شاہی کے، نمک حراموں، اور جاسوسوں بخت خاں جیسے سورماؤں، اور الٰہی بخش جیسے غدّاروں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، اور بالآخر انگریزوں کا ساتھ

دے کراس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، یہیں، بہادر شاہ، ایک ملزم کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرہ میں حاضر کیے گئے، اور یہیں سے اپنی قسمت کا فیصلہ سُن کر جلا وطن کر کے رنگون بھیجے گئے، اس قلعہ میں وہ شاہزادے کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے، ولی عہد کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تھے، بادشاہ جمجاہ کی حیثیت سے اورنگ نشین ہوئے تھے، اور پھر یہیں، ایک معمولی شخص، لیکن ایک غدار، خطاکار، اور دشمن سرکار کی حیثیت سے فرنگیوں کے ایوان عدالت سے سزایاب ہوئے،

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

بہادر شاہ کی داستان کے ساتھ، ممکن نہیں کہ لال قلعہ کی داستان نہ چھیڑی جائے، اس کی شکست وریخت کا افسانہ، تو اپنے موقع پر کسی دوسرے باب میں آپ ملاحظہ کریں گے، اس صحبت میں صرف قلعہ کا دور سے ایک نظارہ کیجیے پھر قلعہ کے اندر داخل ہو کر، ذرا اس کی چہل پہل، رونق، گہما گہمی، اور زندگی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجیے:۔

قلعہ کیوں بنا؟ شاہجہان کی تخت نشینی کا جلوس بھی بڑی دھوم دھام سے اس کے جد امجد کے محل آگرہ میں ہُوا، گیارہ برس کے بعد جب جاہ و حشم کے ہجوم کے لیے آگرہ اور لاہور کے قلعہ میں گنجائش نہ رہی تو شاہجہان نے یہ جگہ جہاں کہ اب لال قلعہ ہے، قلعہ کی تعمیر کے لیے منتخب کی، اور پھر قلعہ کے اطراف شاہجہاں آباد کی بنا ڈالی جس کو دہلی کہا جاتا ہے اور ایسا قلعہ بنوانا شروع کیا، جو آگرہ کے قلعہ سے دو چند اور لاہور کے قلعہ سے چند در چند زیادہ ہو، مکرمت خاں نے ۹ سال کی لگاتار محنت سے سنہ جلوس شاہجہانی میں تعمیر کا کام حسن اختتام کو پہنچایا، کُل قلعہ کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے،

برنیر کے معلومات برنیر سیاح نے جو اورنگ زیب کے زمانہ میں اس ملک میں آیا تھا اس قلعہ کے متعلق سنہ ۱۶۶۳ء میں لکھا ہے:۔

قلعہ کی عمارات مدور، بلکہ نصف دائرے کی شکل کی ہیں قلعہ پر سے دریا کا منظر

خوب ہے، قلعہ اور دریا کے بیچ میں ایک بڑا ریتلا میدان حائل ہے، اس میدان میں ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشہ ہوتا ہے، امیروں، جاگیرداروں، راجاؤں اور رئیسوں کی افواج بغرض ملاحظہ خداوندی یہیں صف آرا ہوتی ہیں اور بادشاہ سلامت نشیمن میں برآمد ہو کر ملاحظہ کا شرف بخشتے ہیں !"

"قلعہ کی فصیل بلندی اور استحکام میں شہر کی فصیل سے کہیں زیادہ ہے، قلعہ کی طرف چھوڑ کر سب طرف سنگین خندق ہے جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا ہے اور مچھلیاں خوش فعلیاں کرتی رہتی ہیں، خندق سے ملے ہوئے بڑے بڑے باغات ہیں، جن میں انواع واقسام کے ہرے بھرے درخت ہیں اور رنگ برنگ کے پھول ہمیشہ کھلے رہتے ہیں جن کی بہار دماغ کی تازگی اور دل کے سرور کے علاوہ ایک ایسا خوشنما اور دلچسپ نظارہ ہے کہ جس نے یہ سماں دیکھا ہو وہی اس کا کچھ اندازہ کر سکتا ہے "

قلعہ کے شمال رخ فصیل کی جانب کا سارا میدان عمارتوں سے پٹا پڑا تھا، جن میں کارخانے (ورک شاپ) تھے، جن کی نسبت برنیر نے اپنے ایک دوست مانسٹر ڈی لا موھنی لی ویر کو لکھا تھا :

قلعہ میں اکثر جگہ جو بڑی بڑی عمارتیں دکھائی دیتی ہیں وہ سب کارخانہ جات ہیں، جو کاریگروں، اور اہل حرفہ کی درکشاپیں ہیں ایک ہال میں زردوز اور کارچوب ہر وقت اپنے کام میں گتھے رہتے ہیں، ان پر ایک داروغہ مسلط ہے، ایک دوسری جگہ سنار ہیں جو زیور گھڑا کرتے ہیں، تیسرے قطعہ میں نقاش، چوتھے میں رنگ ساز، پانچویں میں لوہار، بڑھئی، خرادی، درزی، موچی وغیرہ وغیرہ، چھٹے میں زربفت، کمخواب، ریشمیں پارچہ جات، اور باریک ململ بننے والے، ہمہ اقسام کے پارچہ بات، جو پگڑیاں، سیلے، پٹکے، دوپٹے، اور ہر طرح کے پھول دار زنانے لباس کے لائق کپڑے بناتے ہیں، جن میں سے بعض بعض ایسے باریک اور نفیس اور نازک ہوتے ہیں کہ ایک دفعہ کے پہننے ہی میں مسک

جاتے ہیں، کام والے لوگ اپنے اپنے کارخانوں میں صبح گجرِ دم اپنے کام سے آن لگتے ہیں اور سارے دن کام پہ لگے رہتے ہیں، اور شام کے قریب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں!

محلّاتِ شاہی اور اُمراء کی ڈیوڑھیاں دیوانِ عام کے جنوب میں، محلّاتِ شاہی، اور امراء کے محلّات کا سلسلہ تھا، جو قلعہ کی جنوبی فصیل پر جاکر منتہی ہوتا تھا، برنیر لکھتا ہے :-

"ان دو شوارع کے سوا قلعہ میں دائیں بائیں اور بہت سے چھوٹے بڑے رستے ہیں جو امراء اور رکاب کے مکانوں کو جاتے ہیں ان امراء کی باری ہفتہ وار آتی ہے ان امراء کے مکانات بجائے خود شاندار محلّات ہیں اور ہر امیر اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے کہ اس کے مکان کی شان و شوکت اور آراستگی اپنے ہم پلّہ امراء سے کسی طرح گری ہوئی نہ رہے، یہ مکانات عموماً وسیع اور مرتفع ہیں جن میں کشادہ اور بڑے بڑے کمرے، دالان، اور خانہ باغ ہیں، باغوں میں حوض ہیں اور چوطرف پانی کی نالیاں دوڑ رہی ہیں، حوض میں فوارے چھوٹ رہے ہیں؛ شاہی محلّات میں علیحدہ علیحدہ نہایت خوبصورت سجے سجائے کمرے ہیں، جو بہت وسیع اور شاندار، ہر ایک بیگم کے مرتبہ و اعزاز و تموّل کے شایاں ہیں، ہر کمرے کے سامنے حوض اور آب رواں ہے، اور ہر طرف خانہ باغ، دلکش چمن، اور روشیں، سایہ دار درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ، پانی کی نالیاں، فوارے، حجرے، تہ خانے جن میں تمازتِ آفتاب سے پناہ ملتی ہے، اونچے اونچے کمرے اور برآمدے، جن میں رات کو ٹھنڈک اور آرام ملتا ہے ان دلکش محلّات کی چار دیواری کے اندر گرمی کی تکلیف بالکل نہیں محسوس ہوتی۔"

قلعہ پر کیا لاگت آئی؟ شاہجہان نے اپنے جلوس کے بارھویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان آباد کی آبادی کا حکم دیا اور بارھویں ذی الحجہ کو قلعہ بننا شروع ہوا استاد حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے اس کی تعمیر کے لیے مقرر ہوئے!

پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا اور پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور مصالحہ جمع ہوا اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہوئی۔ پھر الہ وردی خاں کو یہ کام سپرد ہوا اور دو برس ایک مہینہ گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار ۱۲-۱۲ گز اونچی ہو گئی! پھر مکرمت خاں کے ذمہ ہوا اور بیسویں سال جلوس یعنی قریب نو برس کے عرصہ میں سب کام تیار ہو گیا اور چوبیس ۲۴ ربیع الاول ۱۰۸۵ھ ہجری مطابق ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا، یہ ہشت پہل بنا ہے اور اس کا طول ایک ہزار اور عرض چھ سو گز کا ہے جس کی کل زمین چھ لاکھ گز ہوئی اور اس حساب سے یہ اکبر آباد کے قلعہ سے دوگنا ہے اس کی فصیل ۳۵ گز اونچی ہے اور گیارہ گز گہری بنیاد ہے! دیوار کا آثار بنیاد سے ۱۵ گز اور اوپر سے دس گز کا ہے اس کی خندق ۲۴ گز چوڑی اور دس گز گہری بنی ہوئی ہے جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز کا ہے، اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ خرچ ہوا تھا اور کتاب مرات آفتاب نما میں لکھا ہے کہ کروڑ روپیہ صرف میں آیا تھا یعنی پچاس لاکھ قلعہ کے بننے میں اور پچاس لاکھ اس کے اندر کے مکانوں کی تعمیر میں خرچ ہوا تھا (۱)

بادشاہ کی شان

قلعہ جس میں شاہی محلسرا اور بادشاہی مکانات ہیں اور جن کا ذکر میں آئندہ کروں گا قریباً نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور سامنے دریا جمنا بہتا ہے اور قلعہ کی دیوار اور پانی کے مابین ایک ریتلا وسیع میدان ہے جسمیں ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی جاتی ہے اور امیروں اور سرداروں اور ہندو راجاؤں کی فوجیں بادشاہ کے ملاحظہ کے واسطے کھڑی کی جاتی ہیں جن کو بادشاہ محل کے جھروکوں میں سے دیکھا کرتا ہے۔(۲)

قلعہ کی آن بان

قلعہ کی دیوار اپنی پرانی وضع کے گول برجوں کے لحاظ سے شہر پناہ کے مشابہ ہے لیکن چونکہ یہ کچھ اینٹ کی اور کچھ لال پتھر کی بنی ہوئی ہے جو سنگ مرمر کے

---

(۱) آثار الصنادید (سرسید احمد خاں)

(۲) وقایع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر ۲۴۰، مطبوعہ ۱۸۸۶ء صفحہ ۲۵۴

مشابہ ہے اس سبب سے شہر پناہ کی بہ نسبت زیادہ خوبصورت ہے اور شہر پناہ سے اونچان اور مضبوطی اور چیکلان میں بھی زیادہ ہے شہر کے رُخ چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھی ہوئی ہیں اور دریا کے جانب کے سوا قلعہ کے سب طرف پختہ اور عمیق خندق بنی ہوئی ہے جس کی رد کار کے پتھر صاف اور گھڑے ہوئے ہیں اور پانی سے بھری رہتی ہے جس میں کثرت سے مچھلیاں ہیں! اس خندق کے قریب ہی ایک بڑا باغ ہے جو پھولوں اور پودوں سے ہمیشہ بھرا رہتا ہے اور قلعہ کی عظیم الشان اور سرخ رنگ کی فصیل ایک ایک بادشاہی چوک ہے جس کے ایک طرف تو قلعہ کا دروازہ ہے اور دوسری جانب شہر کے دو بڑے بازار آن کر ختم ہوئے ہیں جو ملازم راجہ حسب معمول ہفتہ وار چوکی دینے آتے ہیں ان کے خیمے اس چوکور میدان میں لگائے جاتے ہیں کیونکہ یہ لوگ جو ایک قسم کے چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہیں قلعہ میں رہنے سے سخت عذر کرتے ہیں اور اس بیچ قلعہ کے اندر پہرہ امرا اور منصب داروں کا ہوتا ہے (۱)

عام و خاص کے بڑے دالان کی بغل میں ایک خلوت خانہ ہے جسے غسل[۲] خانہ کہتے ہیں یہاں صرف چند ہی شخصوں کو حاضر رہنے کی اجازت ہے اور یہ وسعت میں اگرچہ عام و خاص کے برابر نہیں ہے مگر نہایت خوبصورت اور وسیع اور روغنی اور سنہری کام کا بنا ہے اور ایک بڑے شہ نشین کی طرح چار یا پانچ فٹ اونچی

---

(۱) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر ج د صفحہ ۲۷

(۲) بادشاہ نامہ میں لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں قلعہ آگرہ میں محلسرا اور دیوان خانہ کے مابین ایک مکان تھا جس میں بادشاہ غسل کیا کرتا تھا اور خاص خاص لوگ اور وزیر اور بخشی بعض ضروری اور اہم معاملات میں وہاں حاضر ہو کر حکم حاصل کیا کرتے تھے شاہجہان کے زمانے میں جو نئی عمارتیں بنائی گئیں تو اگرچہ بادشاہ نے اس مکان کا نام جہان سلطنت کے نہایت مخفی اور اہم معاملات امراء اور وزراء کے مشورہ سے طے کیے جاتے تھے دولت خانہ خاص رکھا لیکن لوگ اس کو بھی غسل خانہ ہی کہتے رہے اور اس لیے اگر بادشاہ سفر میں کبھی ہوتا تو حمام شاہی میں سے ایک خیمہ غسلخانہ کے نام سے نامزد رہتا تھا اس میں دربار خاص ہوتا تھا اور وہ غسل کے کام سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا

فٹ کا اونچا ہے جہاں بادشاہ کرسی پر بیٹھ کر وزرا سے جو ادھر ادھر کھڑے ہوتے ہیں تخلیہ میں امرا اور صوبہ داروں کی عرائض سنتا اور سلطنت کے اہم معاملات پر غور کرتا ہے اور جس طرح صبح کو عام وخاص کے دربار میں حاضر نہ ہونے کے باعث امرا پر جرمانہ کیا جاتا ہے یہاں شام کو حاضر نہ ہونے پر سزا ملتی ہے۔ (۱)

شاہی محلسرا

اب میں نہایت خوشی سے آپ کو بادشاہی محل سرا کی سیر کراتا ہوں جیسا کہ قلعہ کی اور عمارات کی کرائی لیکن کسی سیاح کو وہاں کی کیفیت چشم دیدہ بیان کرنی ناممکن ہے کیونکہ بادشاہ کے دہلی میں موجود نہ ہونے کے وقت اگرچہ مجھے کئی دفعہ وہاں جانے کا موقع ملا اور میں خیال کرتا ہوں کہ ایک دفعہ ایک بڑی بیگم کے علاج کی ضرورت سے جو شدت مرض کی وجہ سے معمول کے موافق باہر کے دروازے تک نہیں لائی جاسکتی بہت دور تک اندر جانے کا اتفاق ہوا مگر میرے سر پر ایک کشمیری شال اسی طور سے اڑھادی گئی تھی کہ ایک لمبے سکارف (اوڑھنی) کی طرح پاؤں تک لٹکتی تھی اور ایک خواجہ سرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجھے اسی طرح لے گیا تھا جیسے کسی اندھے کو لے جایا جاتا ہے! اس لیے آپ کو صرف اسی پر قناعت کرنی چاہیے جو بعض خواجہ سراؤں سے سن کر میں نے لکھا ہے ان کا بیان ہے کہ محلسرا میں بیگمات کے مدارج اور حیثیت اور ان کی معاش کی مناسبت سے علیحدہ علیحدہ بہت خوبصورت اور بڑے بڑے محل بنے ہوئے ہیں جن کے دروازوں کے سامنے حوض اور سب طرف باغیچے اور دلچسپ روشیں اور سایہ دار آرام گاہیں اور نہر اور فوارے اور دن کی گرمی کے بچاؤ کی خاطر عمیق تہ خانے اور رات کو خنکی میں آرام کرنے کے لیے اونچے اونچے چبوترے بنے ہوئے ہیں اور ایسے دلکش مکانات ہیں کہ ان میں اس ملک کی تکلیف دہ گرمی کو مطلقاً دخل نہیں ہے اور یہ لوگ ایک چھوٹے سے برج کی جو دریا کی طرف ہے حد سے زیادہ تعریف کرتے ہیں جس میں آگرہ کے دونوں برجوں کی طرح سونے کے ورق چڑھے ہوئے ہیں اور

---

(۱) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر

لاجوردی کام کیا ہوا ہے اور نہایت عمدہ نقش و نگار بنے ہوئے اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ (۱) (۲)

دادگستر بادشاہ

دائیں بائیں شہزادے ہوتے ہیں۔ خواجہ سرا مورچھل ہلاتے یا بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا ادائے خدمت کے لیے دست بستہ گردنیں جھکائے ہوئے بڑے ادب سے کھڑے رہتے ہیں، تخت کے نیچے چاندی کا جنگلہ لگا ہوا ہے جس میں تمام امرا اور راجہ اور غیر ملکیوں کے سفیر آنکھیں نیچی کیے ہوئے اور ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے رہتے ہیں اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی طرح منصب دار یعنی چھوٹے چھوٹے امرا حسب مراتب ایستادہ رہتے ہیں اور ان سے جو جگہ خالی رہتی ہے وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگ اعلیٰ اور ادنیٰ سے بھرا رہتا ہے، کیونکہ یہی مقام ہے جہاں رعایا کا ہر شخص اپنے عرض حال کے لیے باریاب ہو سکتا ہے اور کسی شخص کے آنے کی ممانعت نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کو خاص و عام کہتے ہیں، کامل ڈیڑھ دو گھنٹہ تک لوگوں کا مجرہ و سلام ہوتا رہتا ہے۔ اس موقع پر مستغیث جو عرضیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام و کمال بادشاہ کے ملاحظہ میں آتی ہیں اور بادشاہ بذات خاص مستغیثوں سے دریافت حال کرتا ہے اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کو فوراً داد دیتا ہے، اور ہفتہ میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے جو مستغیثوں میں سے پرہیے جاتے ہیں، اور جن کے پیش کرنے کا کام ایک نیک دولت مند اور بوڑھے شخص کے سپرد ہے

---

(۱) آثار الصنادید میں اس برج کا نام برج طلا یا مثمن برج لکھا ہے اور سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے، جس میں سونے کا کام اور پچی کاری اور منبت کاری کی ہوئی ہے جو کلس سمیت باہر سے بھی سنہری ہے اور ہشت پہلو ہونے کے باعث مثمن برج کہلاتا ہے تین ضلع اس کی خوابگاہ کی عمارت کی طرف ہیں اور پانچ دریا کی جانب اور پانچوں میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہوئی ہیں اور ایک نشیمن بطور برآمدے کے دریا کے رخ بنا ہوا ہے۔

(۲) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر جلد ۲ صفحہ [illegible]

اور ایک دن عدل و انصاف کے کمرے میں جس کو عدالت خانہ کہتے ہیں، دو بڑے وزیروں کے ساتھ بیٹھ کر دادرسی کرتا اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتا۔ (۱)

بادشاہ قطب صاحب میں

ابونصر معین الدین اکبر ثانی[۲] جب بیٹے کی منت پوری کرنے پھول والوں کی سیر منانے مہرولی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا برکھا رت، ساون کا مہینہ بادشاہی خیمہ مخملی بانا تی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سوتی طنابوں سے جکڑے کھڑے تھے ان کی سنہری کلس اور شمسی سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جابجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا بادشاہی خیمہ سے لیکر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں دو رویہ قنات کھڑی تھی، کیونکہ ملکۂ دوران مرزا جہانگیر کو لیکر منت ادا کرنے کے لیے دربار میں حاضر ہوں گی تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے حضرت ظل سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آگیا پس ملکۂ دوران نے پچاس خوان اندر سے گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کیے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنا، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی طرّہ عطر میں بسا کر اس کے سر پہ بندھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پہ بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہ زادے کی بلائیں لے کر کہا، جان من منّت کی کشتی سنبھال کر اور سر ادب و نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو آؤ۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پہ اور صندل اور عطر دان ملکہ نے اپنے سر پہ اور مٹھائی کے خوان شہزادوں نے اپنے سروں پہ رکھ کر سب نے مل جل کر آستانہ پاک کی راہ لی، بیگمیں، شہزادیاں تلوان جوڑے پہنے تھیں گوکھرو کے جال سلمہ ستارہ کلابتوں کے نماسی زری بوٹی، زربفت کمخواب زری، چھا اطلس دلدائی یا برنیٹ بنارس گجرات سورت احمد آباد شریف لاہور کے شاہی

---

(۱) چراغ دہلی۔ (مرزا حیرت دہلوی) ص ۲۲۸

(۲) بہادر شاہ کے والد

کارخانوں کی ریشمی اور زرّین کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ میں تھا پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی ڈھیلے پائچوں کو دو لونڈیاں اٹھائے چلتیں دو دو باندیاں پیچھے دوپٹے کو سنبھالے چلتی تھیں آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والی سب عورتیں تھیں بیگموں کے جھانجن چوڑیوں اور پازیب کے جھنکار سے دل کانپتے تھے، قنات در قنات یہ سب لوگ درگاہ شریف پہنچے باجے گاجے سب آستانہ کے باہر تھما دیئے ملکۂ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک جا کر رک گئیں اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا، عورتوں کے لیے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر تشریف لے گئے پہلے غلاف وصندل چڑھایا اور اوپر سے عطر لگایا پنج آیت پڑھی شیرینی تقسیم ہوئی نقد نذرانہ مجھری میں بھر دیا گیا بادشاہ زادہ کو قدم بوس کرایا اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہو لیے رات کے کھانے کے بعد محل سرا میں ناچ گانا ہونے لگا صحن میں کم عمر کڑے تھے نو عمر بادشاہ زادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انھیں جھلانے اور غزل گانے لگیں،

تورہ بندی پھول والوں کی سیر سے فارغ ہو کر بادشاہ شاہجہان آباد میں تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے یہ رسم دلّی سے مٹ گئی اور نئی ناتی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے اس لیے نقیر فراق تورہ کے معنی عرض کرتا ہے تورہ ترکی زبان میں آئین یا قانون کو کہتے ہیں اس واسطے دہلی میں محاورہ بنا شروع تورہ یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنی میں استعمال کرتی ہیں، مثلاً اللہ رے عورت تیرا تورہ بوا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا "تورہ پٹی" دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان ہیں اور توران میں اس کھانے کے خوان کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصے بخرے کے بھائی بندوں عزیز اور دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں. مغل بادشاہ ہندستان میں فرمانروا ہوئے توران کے ساتھ تورۂ چنگیزی بھی آیا بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام نام تاکہ عین تقریب میں طرح نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دسترخوان پر نہ بٹھایا یا ہم دسترخوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی ہماری توہین کی گئی

اس لیے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خاندان میں بھیج دی جاتی تھی اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو وہ دسوں تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لیں پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کر دی جاتی تھی چاہے لینے والے نقد لے لیں ایک منشی معہ دوات قلم اور پانچ خادموں کے تورہ کے ساتھ ہو لیتا ایک تھیلی روپیہ کی ان کے ہمراہ ہوتی اس کے ذمے پچاس تورہ ایک دن میں تقسیم کے لیے ہوتے رسید لے کر تورہ دے دیتا تھا جو نقد لینا چاہے اسے نقد دے دیتا تھا ہر تورہ ایک کہار کی بہنگی میں ہوتا تھا تورہ جو ادنیٰ قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی تورہ کا کھانا مٹی کے لاکھی برتنوں میں عموماً ہوتا تھا تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ ہے۔ ایک لکڑی کے رنگین خوان میں سب سے نیچے:۔

۱۔ باقرخانیاں دو عدد ڈھائی سیر پختہ کی

۲۔ دو پیالے قورمہ ہر پیالے میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ

۳۔ کباب شامی ۵ عدد

۴۔ بریانی دو طباق

۵۔ متنجن دو طباق

۶۔ فرنی دو پیالہ ہر پیالہ میں آدھ سیر

۷۔ مربہ آم وغیرہ ایک پیالی

۸۔ اچار کئی قسم کا ایک پیالی

۹۔ دہی ایک پیالہ آدھ سیر

۱۰۔ گاؤ زبان دو عدد

۱۱۔ گاؤ دیدہ دو عدد

۱۲۔ نان تنوری یعنی ابلی روٹی دو سیر کی چار عدد

یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے مانڈہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو

شب برات میں بکتی ہے ایک مثل بھی مانڈہ کے متعلق مشہور رہے "مردہ دوزخ میں جائے چاہے جنت میں انھیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے"۔

یہ معمولی تورہ ہے ورنہ بادشاہوں کے تورے ہزاروں نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے،

اس رسم کو بادشاہوں سے دلّی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے آپ تو ٹی پارٹی کی گرما گرمی ہے۔ (۱)

شاہی حمّام

جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید نہ سمجھ سکیں کہ یہ حمّام کیا ہے؟ ایک عالیشان عمارت ہے اور اس کے دو درجہ ہیں ایک گرم دوسرا سرد، عمارت کا جو حصّہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے، اور جو جمنا کے رُخ پر ہے وہ سرد ہے، ریتی کے رُخ پردہ ڈال کر خس خانہ بنالیا جاتا ہے، اندر نہر بہتی ہے بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں ان میں فوّارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے؟ ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ (۲)

قلعہ کا باغ، زنانہ محفل، میلہ کی دھوم

اب قلعہ کی اندرونی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں، لکھنے والا بہادر شاہ کا درباری، لال قلعہ کا مستقل مکین، قلعہ معلّی کی اردوئے معلّی کا ماہر ہے، اس بیان میں جہاں قلعہ کی زندگی جھلکتی ہے وہاں قلعہ کی خاص زبان کے خاص الفاظ اور خاص محاورات کا لطف بھی ایک عجیب کیف کا عالم طاری کر دیتا ہے۔

بادشاہ کے موتی محل کے آگے ایک بہت بڑا باغ حیات بخش اس کا نام ہے بیچوں بیچ میں ساٹھ گز سے ساٹھ گز چوکور حوض ہے حوض میں جل محل ہے شمال اور جنوب کو آمنے سامنے ساون بھادوں سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کے ہیں ان کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے حوض ہیں حوض میں پانی کی چادریں گرتی

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) صد ۱۱۴

(۲) دلّی کی آخری شمع صد ۲۳

ہیں، چاروں طرف لال پتھر کی بڑی بڑی چار نہریں ہیں اُن میں پانی جاری ہے نہروں کے گرد لال پتھر کی لالا ری کی کیاریاں کیاریوں میں گیندا، گل مہندی، گل نورنگ شبو بنق۔ گل طرہ، سورج مکھی وغیرہ کھل رہا ہے موتیا چنبیلی، جوہی، رائے بیل، گلاب سیوتی، مدمالتی مولسری کے پھولوں سے سارا باغ مہک رہا ہے بلبل چہک رہی ہے سبزہ لہک رہا ہے دیکھو آم، شہد کوزہ بتاشہ، بادشاہ پسند محمد شاہی لڈو وغیرہ اور انار، امرود، جامن، رنگترہ نارنگی، چکوترہ، کھٹا، نیبو، انجیر، شہتوت بیدانہ، فالسہ کھرنی، آڑو، شفتالو، آلوچہ، سیب، انگور، ناشپاتی، کمرک بیری، کٹھل، بڑھل، پاکھل، کگرونده وغیرہ کے درخت پھل پھولوں میں لدے ہوئے جھوم رہے ہیں مینہ کا جھمکا لگ رہا ہے، مور جھنکار رہے ہیں پپیہا، پیہو پیہو کر رہا ہے کوئل کوک رہی ہے، اے لو وہ باغ کا زنانہ ہوا اور حکم ہوا سر سے پاؤں تک سب لال جوڑے پہن کر آئیں، دیکھو سب نے لال جوڑے رنگوائے مارا مار کر کے اُن پر مصالحہ ٹکوائے باغ میں خیمے کھڑے ہوئے حوض کے گرد لکڑیوں کی باڑیں بندھی اُوپر فرش ہوا ایک طرف بادشاہ کی جہاں نما کھڑی ہوئی حوض میں نوار[1] سے چھوٹے دو کانیں لگیں، مالنیں بیوپارنیں اور ترکاری میوے گوٹہ کناری کپڑے والیاں دہی بڑے اور پوریاں پھلکیاں تل رہی ہیں کبابنیں کباب لگا رہی ہیں، دہی بڑے والیاں دہی بڑے بیچتی پھرتی ہیں بساطی اور سادہ کاروں کے لڑکے طرح طرح کا اسباب اور انگوٹھیاں چھلے لیے بیٹھے ہیں حلوائیوں کے چھوکرے پوریاں کچوریاں، مٹھائیاں بیچ رہے ہیں، اہاہا! ذرا چھپر اپلٹنوں کو دیکھو کیا چھوٹے چھوٹے لڑکے تلنگوں کی سی وردیاں پہنے بندوق توسدان لگائے قطار باندھے برابر قدم سے قدم ملائے چلے آتے ہیں الیو وہ ٹکناسی توپیں ننھے ننھے گولنداز نیلی وردیاں پہنے توپیں کھینچے لیے چلے آتے ہیں جابجا چھپرہ پلٹنوں کے پہرے لگ گئے توپیں الگ ایک جا لگ کھڑی ہو گئیں لو باغ کی تیاری ہو چکی اب بیگمات میں اور شہزادیاں آنی شروع ہوئیں لال لال چوچہاتے جوڑے جھم جھماتے پہنے ہوئے سونے میں پیلی موتیوں میں سفید چھم چھم کرتی چلی آتی ہیں ساتھ ساتھ انا مغلانیاں دوا،

---

(۱) چھوٹی کشتیاں، ڈونگے

چھوچھو، ہیا نوکریں، چاکریں لونڈیاں باندیاں، ہاتھوں چھاؤں اللہ بسم اللہ کرتی صدقے گئی واری
گئی نیچ بیچ میں چلو، سفید بادلہ اوڑھ لو اس چھتے میں چوٹی والا رہتا ہے اور اسی کا بھی ڈر ہے دور پار
شیطان کے کان بہرے کسی کا کہیں سایہ نہ ہو جائے تو یہ ٹوٹا جونڈا کورے استرے سے منڈ جائے جو
کسی نے بناؤ کو ٹوکا تو قہر آگیا۔ انا مانی۔ دوا شیچے جھاڑ کے اُس کے پیچھے جمپٹ گئیں حف تمہاری نظر
تمہارے دیدوں میں رائی لون دیکھو تمہاری ایڑی میں گو لگا ہوا ہے اچھی دیکھو اُس کلمجی نے ایسا ہونسا
مجھے تو آج اپنی بچی کا پنڈا کچھ پھیکا پھیکا دکھائی دیتا ہے ذرا اس کلھیاری کے پاؤں تلے کی مٹی چولھے
میں جلائیو دیکھو اب باغ میں چاروں طرف گانا بجانا ہو رہا ہے اور آپس میں ہمجولیاں مل کر اور
ٹڈولیوں میں جھوم رہی ہیں۔ ایک ایک پر بولیاں ٹھٹولیاں مار رہی ہیں آج تو اس لال جوڑے پر
چوٹ پر چوٹ ہوا تم نے تو سنہری جوڑے کو کالی گوٹ لگا کر کلمجی پھیکا کر دیا واہ اچھی یہ برا معلوم ہوتا
ہے خاک تمہاری اور واہ اچھی تمھیں کیا نہیں سوجھا دشمنوں کے دیدے پٹم ہو گئے اِلو ماٹ کی انگیا
مونجھ کا بخیہ در گور تمہاری صورت یہ مواصدف کلابتو اس پر یہ بھاری مصالحہ،

اہاہا! کوے کی چونچ میں انار کی کلی اس کلموئی شکل پہ یہ لال جوڑا کیا کھلتا ہے بی تمہاری وہی
کہاوت ہے کہ آ بوا لڑیں لڑے ہماری بلا بلائے جائے، ذرا سی بات تم سے پوچھی تھی تم تو جھاڑ کا کانٹا
ہو گئیں دیکھنا سر کڑے دلی پاؤں کہاں آئیں بیوی نوبہار، اچھی میں کہتی ہوں تمہارا کیوں ہڈڑا گیا ہے آدمی کدھر
اڑ گئے جو اکیلی پانچے پھڑکاتی پھرتی ہو اوہو ہو اچھی تمھیں ہماری جان کی قسم ہمارا حلوا کھائے ہمیں کو ہے
ہے کر کے بیٹھے جو اس ٹہیل کی وہیج کو نہ دیکھے مرگلا نہ بولا سینگ کٹا بچھڑوں میں ملیں، منہ میں دانت
نہ پیٹ میں آنت۔ لال جوڑا مٹکائے کیا ٹھسے سے بیٹھی ہیں اِلو! یہ اور قہر توڑا کہ پوپلے منہ میں
مسّی کی دھڑی اور سوکھے ہاتھوں میں مہندی بھی لگی ہوئی ہے اچھی یہ لال کپڑے تو خیر بادشاہ کا
حکم ہے مگر کمبخت یہ مہندی اور مسّی کی دھڑی جما کر لیا ان کی سرتی نہ تھی، دیکھو لونڈیوں پر غصہ ہو رہا
ہے اری گل بہار، نوبہار، چنبیا، چنبیلی، گل چمن، نرگس، مان کنور، انند کنور، چنچل کنور، مبارک قدم
نیک قدم کدھر گئیں اِلو! وہ باغ میں کدکڑے لگاتی پھرتی ہیں، گگڈے مارتی پھرتی ہیں، بھلا ری

علامہ دہر، قطامہ، چڑیل، مالزادی قحبہ بچی، سر منڈی، ناک کاٹی ایسی مشٹ بے تھلا جوگئیں الیا دیدے کا ڈر نکل گیا سب کو ازار میں ڈال کر بہن لیا، کام کاج پر دیدہ ہی نہیں لگتا ایک جا پاؤں ہی نہیں ٹکتا، جلے پاؤں بلی کی طرح نچلی ہی نہیں بیٹھتیں، سارے باغ کے جالے لیتی پھرتی ہیں میں لہو کے گھونٹ بیٹھی گھونٹ رہی ہوں کیسے تنکلے کے سے بل نکالتی ہوں، بوا تم بھی کیا نین تتنی ہو ذرا ذرا سی بات پر ٹسوے بہاتی ہو ایسی کیا انوکھی اچرج جان آدم نعمت کی ماں کا کلیجہ چیل کا موت عنقا چیز تھی جو تم ایسی بلک گئیں، چھوٹی بہن تھی اگر اس نے لے لیا تو کیا ہوا آؤ میں تمھیں منگا دوں اچھی دیکھتی ہو اس فتنی کو کیا شیطان چڑھا ہے کیسے دہیے مچا رکھے ہیں اپنا لہو پانی ایک کیے ڈالتی ہے کسی عنوان نہیں ہیلتی ارے کاکا! ارے فلاں جائیو بیوی کے لیے یہ چیز لائیو، بیگم صاحبہ میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں کسی دوکان پر نہیں ہے ایسا کیا بازار میں اوڑا پڑ گیا یہ حرامی ٹکا، مادر بخطا، کام چور نوالہ حاضر یہیں سے بیٹھا بھیگی بلی بتا رہا ہے ٹالم ٹوے کرتا ہے اری یاقوت اری زمرد تو جا کر جہاں سے ملے ابھی ڈھونڈ کے لے کر آ،

ایلو یہ موا غارتی کہیں سے یہ موٹے موٹے چھنگڑ موٹے لچکونڈر سے اپنے نگلنے اور ٹھسنے کو اٹھا لایا، یہ تم ہی بیٹھ کر ٹھور د، کھانے کو بسم اللہ کام کو نعوذ باللہ یہ ہمارے نمک کا اثر ہے ان کی کیا خطا ہے؟ چلو اب تو نہ ر دھوا ڈمن جاؤ غصے کو تھوک دو بہت چوچلے نہ بگھارو، آپس میں پیرا کھیری کٹم کٹا نہیں کرتے ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی، مجھے تو دونوں آنکھیں برابر ہیں تم کیا جنت میں لے جاؤ گے وہ کیا مجھے دوزخ دکھائے گی چلو نین تتنی نہ بنو۔ جوتی کی نوک سے تم روٹھے ہم چھوٹے ایلو وہ چھوٹی بہن کیا کہہ رہی ہے ہم بھی جلے کو جلائیں گے نون مرچیں لگائیں گے،

تو اب دو گھڑی دن باقی رہا حضور کی آمد آمد کی خبر ہوئی وہ جسولنی نے آواز دی خبردار ہو سواری آئی دیکھو بادشاہ کی کبھی لال پوشاک ہے لال ہی رنگے ہوئے ہما کے پروں کے مورچھل ہیں چھپیرہ پلٹنوں نے سلامی اتار دی چھوٹی چھوٹی توپیں دغنے لگیں سب حوض پر آ بیٹھیں، بادشاہ اپنی جہاں نما میں ہیں سرو قد کھڑے ہو گئے سب نے آداب مجرا کیا دیکھو حوض کے گرد گویا گل لالہ کھل گیا، ایلو ادہ باغ

لوٹنے کا حکم ہوا۔

اہاہا! دیکھنا کیسی بے تحاشہ گرتی پڑتی تو مجھ پر ہیں تجھ پر دوڑیں کوئی چھپٹ میں آکر گر پڑی، دیکھو انا
وہ کیسی پھیپڑا ہلاتی بلبلاتی دوڑیں جھٹ جھاڑ پونچھ کے اٹھا لیا ایک لوٹا پانی کا اس جا کے چھڑک دیا لاکھوں
فضیحتے کھڑی کر رہی ہیں، ایسی خرمست ہو گئیں آنکھوں پر چربی چھا گئی ہے یہ کیا الٹا زمانہ آگیا میرے چوٹ
ووٹ کہیں نہیں لگی تم ناحق اتنے پھیپڑے ہلاتے مچاتی ہو کھیل میں شاہ وگدا برابر ہے دیکھو! درختوں کو بلا کی
طرح جا کر لپٹ گئیں پھل پھول پتوں تک نوچ کھسوٹ ڈالے، بیویاں جھولی پھیلائے نیچے کھڑی ہیں
لونڈیاں باندیاں اوپر سے توڑ توڑ کر ان کی گودی میں ڈالتی جاتی ہیں کوئی کہتی ہے اچھی میری دردانہ دل
شاد مجھے وہ رنگترہ توڑ دے کوئی کہتی ہے اچھی میری اچپل تو مجھے وہ بڑا سا کھٹا توڑ دے میں تجھے اکڑ بیہ
دوں گی اے لو ایک بوا ٹیں انھیں کچھ نہ ملا تو وہ کسی کی گودی کسی کے ہاتھ میں سے اچک لے گئیں یہ منہ تکتی
کی تکتی رہ گئیں لوبی چوروں پر مور پڑے اپنے کچھ ہاتھ نہ آیا تو نفت آمارنے کو اوروں کو لوٹ لیا اب یہ سر
خود چونڈا ایمان کبونڈا سب میں بیٹھ کر شیخیاں بگھاریں گی ہم بھی لوٹ لائے ہیں کبھی کوس کوس کے ڈھیر کرونگی،

لو اب شام ہوئی دونوں وقت ملتے ہیں جھٹ پٹا ہو گیا بس چلو صاحبو چاند نے کھیت کیا چاندنی
چھٹکی چاند کی بہار ہوئی۔ دیکھو اب حوض اور نہر کی پٹڑیوں پر بیٹھی چاندنی منا رہی ہیں نواڑ دن میں بیٹھی حوض
میں تیر رہی ہیں سفید سفید پھولوں کے کنٹھے گلے میں کانوں میں پھولوں کی بالیاں لال لال کپڑوں
پر عجب بہار دکھا رہی ہیں کہیں ڈھولکی بج رہی ہے گانا ہو رہا ہے، کہیں پچیسی، قصّے کہانیاں پہیلیاں
کہہ مکرنیاں ہو رہی ہیں، دس بیس مل کر کھڑی ہو گئیں آدھی آنکھ مچولی کھیلیں قطار باندھ کے ایک سے
سامنے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا اٹنگ ٹنگ ٹلی زیر تنگ مالی جی کا تھان کھیلے چوغان جس کے
نام پر دس آتا گیا اس کو نکالتی گئیں آخر میں جس کے نام پر دس آیا وہ چور بنی ایک بڑی بوڑھی کو بیچ میں
دائی بنا کر بٹھا دیا۔ دائی نے چور کی آنکھیں بھینچیں اور سب نے کہا تمھاری گود میں کیا چور نے کہا مٹر
انھوں نے کہا تمھاری آنکھیں چڑ پٹر ہو دیں جب تم آنکھیں کھولو یہ کہہ کر کونوں کھتروں میں جا چھپیں،
ایک نے آواز دی چور چھوٹے دائی کی بلا لوٹے دائی نے چور کی آنکھیں کھول دیں، چور ہکا بکا ادھر ادھر

دکھیتی پھرتی ہے ڈھونڈ کے ایک کو پکڑا وہ جھپ سے بیٹھ گئی چور سے کہنے لگی ہٹو بھی گاڑی بھر رستہ دو اور نکل نکل کے بھاگیں چور اُن کے پیچھے دوڑی کسی نے دوڑ کر دائی کو چھولیا اور کہا دائی دائی تیرے ساتوں بھائی دوڑتے میں کوئی ہاتھ لگ گئی یا ذرا سا چور کا ہاتھ بھی کسی کو لگ گیا بات دفعہ سے کوئی زیادہ بیٹھی تو اب یہ چور بنی اور سات دفعہ چور بنی اس کا ایک ہاتھ ٹخنے سے ملا کر آدھے دپٹہ سے باندھا آدھا دپٹہ ہاتھ میں پکڑے سارے میں لیے کہتی پھرتی ہیں ہاریں ساتوں بہاریں جب اس نے تھک کر ناچار اقرار کیا، ہاں بھئی ہاری جب اس کی ٹانگ کھولی۔

سات دن تک اسی طرح روز نئے سج دھج انوکھے کھیل نرالی باتیں ہوتی رہیں، آٹھویں دن جمعرات کو پنکھے کی تیاری ہوئی وہ بھاری بھاری تلوان نئی نئی دلھن کے لال لال جوڑے سونے کی سچے جڑائی اور موتیوں کے گہنے پہنے بناؤ سنگار کیے سارے شہر کی عورتیں اُمنڈ آئیں باغ گوناگوں ہوگیا دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں طولیاں ہاتھ لیا رتی ہیں،

لو اب چار گھڑی دن باقی رہا، چاندنی چوک کے باغ سے پنکھا اٹھا دیکھو ہاتھی پر سونے کا پنکھا نیچے سچے موتیوں کی جھالر اُس میں سچے آویزے اوپر سونے کا مور اُس کے پیٹ میں گلاب کیوڑا بھرا ہوا پنجوں میں سے نکل نکل کر سب کو معطر کرتا جاتا ہے آگے آگے پھولوں کی چھڑیاں۔ نفیری بجتی ہوئی ہزارے چھوٹتے ہوئے سپاہیوں کے مانند باجا بجاتے ہوئے پیچھے سلاطین اور امیر امراء ہاتھیوں پر سوار دو طرفہ آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ اس دھوم دھام سے باغ کے دروازے پر پنکھا پہنچا سب لوگ ٹھہر گئے سلاطین پنکھا لے کر اندر آئے بادشاہ سوار ہوئے، چھوٹی چھوٹی توپیں نئے نئے گولنداز ونادن چھوڑنے لگے، چھپرہ پلٹن سلامی اتار آگے ہوئیں، ان کے پیچھے تاشے باجے روشن چوکی والیاں تاشہ ڈھول جھانج طبلہ نفیری بجاتی چلیں ان کے پیچھے سلاطین پنکھا لیے ہوئے پنکھے کے پیچھے بادشاہ ہوادار میں سوار خوجے مورچھل کرتے جیتیاں۔ ترکنیاں قلماقنیاں اردا بیگنیاں، ہٹو بچو کرتے چوبینیاں خبردار پکارتی شاہزادے تخت کا پایہ پکڑے شاہزادیاں۔ سلاطینوں کی بیگماتیں، نوکریں، چاکریں لونڈیاں باندیاں شہر کی عورتیں پیچھے ساتھ ساتھ چلیں اس وقت کی بہار دیکھو کبھی میٹھی میٹھی پھوار پڑتی ہے کبھی

مینہ برسنے لگتا ہے، آسمان پر کالی گھٹا گھنگھور گھمنڈ رہی ہے زمین پر دیکھو تو لال گھٹا کس طور امنڈ رہی ہے ادھر بادل کی گرج بجلی کی چمک ادھر گوٹے کی جھمک جواہر کی دمک سے آنکھوں میں چکاچوندی آتی ہے نفیری کی آواز قہر ڈھاتی ہے محل میں گلیوں میں عورتوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ چلے آتے ہیں کوٹھوں پر ٹھٹ لگے ہوئے ہیں کہیں تل دھرنے کی جا نہیں۔

تھالی پھینکو تو سر پر گرے جدھر نظر اٹھا کر دیکھو ایک چھت بیر بہٹیاں سی دکھائی دیتی ہیں اس تجمل و کر و فر سے درگاہ میں پنکھا چڑھا کر پھر سب باغ میں آئے روشنی کی تیاری ہوئی حوض کے گرد نہر کی پٹڑیوں اور دو رستہ کی تیاری ہوئی حوض میں لال لال کنول ان میں دغدغے روشن ہوئے چاروں طرف سے آگ سی لگ گئی فواروں میں روشنی جیسی چھلاوے حوض میں پھر رہے ہیں درختوں میں قمقمے جگنو کی طرح چمک رہے ہیں کہیں ناچ رنگ ہو رہا ہے،

رات اسی سیر و تماشہ میں ختم ہوئی صبح کو سب اپنے اپنے گھر گئے لو میلہ ہو چکا۔ (۱)

برسات کی بہار

برسات کے موسم میں جب بیر بہوٹیاں نکل پڑتیں تو بادشاہ زادیوں کو ان کا لال مخملی پن پسند آتا ہے ایک ایک بیر بہوٹی ایک ایک اشرفی کو مول لی جاتی اور بچوں میں بانٹی جاتی، ایک بادشاہزادی جس کی عمر پانچ برس کی ہوتی بیر بہوٹی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتی وہ ہاتھ کے ہلنے چلنے سے اپنے پنجے سمیٹ لیتی اور گول مول ہو کر مردہ بن جاتی تو شاہزادی کہتی بیر بہوٹی پنجہ کھول تیرا ماموں آیا آخر ہتھیلی کی حرکت تھم جاتی تو پھر بیر بہوٹی اپنی انگلیاں کھولتی اور چلنے لگتی اس پر وہ خوشی مناتی کہ اللہ اللہ شام کے وقت سونے کی ڈبیہ میں بیر بہوٹی بند کی جاتی اور دار دانہ کے سپرد ہوتی اگر کہیں رات کو بیر بہوٹی مر جاتی تو صبح اٹھ کر چھوٹی بیگم روتے روتے اپنی آنکھیں سجھا لیتیں بڑی بیگم اپنی بچی کو چمکارتیں اور فرماتیں، قربان کی تھی اپنی لاڈو پر سے موئی دو کوڑی کی بیر بہوٹی، اری ساز گار دردانہ ذرا ڈیوڑھی جانا دس اشرفیاں روتہ کو دے آنا اور سمجھانا کہ بیوی بنو کے لیے موٹی موٹی نرم بیر بہوٹیاں

---

(۱) بزم آخر ص ۳۳

لادے روتا اشرفیاں لیکر جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ میں پلٹ کر آتا اور ڈیوڑھی میں کھڑا ہوتا اور چیخ کر کہتا حضور بیر بہوٹیاں آگئیں ہیں، مگر آج منڈی میں بیر بہوٹیوں کا بھاؤ دگنا تھا دس اشرفیاں قرض لے کر آیا ہوں، بڑی بیگم فرمائیں لے اور دو تاکہ بیر بہوٹی والے کا قرض چکا آئے اور انعام کے گیارہ روپیہ اُسے الگ دیئے جائیں۔ (۱)

قلعہ کا محرّم

محرم کا چاند دکھائی دیا ماتم کے باجے بجنے لگے سبیلیں رکھی گئیں بادشاہ حضرت حسن حسین کے فقیر بنے سبز کپڑے پہنے گلے میں سبز کفنی ڈالی جھولی میں الائچی دانے سونف خشخاش بھری، درگاہ میں جاکر سلام کیا، نیاز دی دس دن تک صبح کا کھانا شام کو شربت فقیروں کو بٹے گا چھٹی تاریخ ہوئی آج بادشاہ لنگر میں کھنچیں گے۔

دیکھو! چاندی کے دو پنجے بنے ہوئے دو لکڑیوں پر لگے ہوئے لال سبز کپڑے ان پر بندھے ہوئے ان کو شدّے کہتے ہیں، بادشاہ کے دونوں ہاتھوں میں ہیں ایک چاندی کی زنجیر کمر میں پڑی ہوئی ہے دو سیّدوں نے آن کر زنجیر پکڑ دو چار قدم بادشاہ کو کھینچا ایلو وہ زنجیر بادشاہ کے گلے میں ڈال دی دونو شدّے سیّدے گئے ساتویں تاریخ ہوئی، دیکھو! ابرک کے کنول ان میں شمعیں روشن بانس کی کھپچیوں کی ٹٹیاں لال کاغذ سے منڈھی ہوئی اُن پر لال لال کنول بیچ میں دغدغے روشن ہیں مہندی اور مالیدے کے خوان بڑی بڑی طوغیں جلتی ہوئی ساتھ ساتھ ہیں آگے آگے تاشے باجے روشن چوکی والیاں پیچھے پیچھے بادشاہ اور بیگماتیں حبشنیاں ترکنیاں خوجے وغیرہ سب چلے جاتے ہیں لو مہدی امام باڑے میں پہنچی آرائش سب لٹ گئی مہدی مالیدہ طوغین درگاہ میں چڑھا دیں، آٹھویں تاریخ ہوئی ایلو آج بادشاہ حضرت عباسؓ کے سقّے بنے لال کھاروے کی ایک لنگی بندھی ہوئی شربت کی بھری ہوئی ایک مشک کندھے پر رکھے ہوئے معصوموں کو شربت پلا رہے ہیں لو شربت پلا چکے مالیدے پر نیاز دی سب کو بٹوا دیا۔

---

(۱) لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) ص ۲۲

آج دس تاریخ ہے عشرے کا دن ہے مٹی کے آبخورے لمبے گلے کے بیچ میں سے پتلے کورے کورے آئے ان کو کوزیاں کہتے ہیں، دودھ اور شربت ان میں بھرا گیا لال لال کلاوے ان کے گلوں میں باندھے تازے تازے ترملوے کے کونڈے بھر کر رکھے گئے نیاز ہوئی دیکھو! چھوٹے چھوٹے بچے دوڑے چلے آتے ہیں ایک ایک دودھ ایک ایک شربت کا کوزہ پی حلوہ چٹ کر پیسے کوڑیوں کی جھولیاں بھر کیسے اُچھلتے کودتے کلانچیں مارتے چلے جاتے ہیں ظہر کا وقت ہوا بادشاہ برآمد ہوئے موتی مسجد میں عاشورے کی نماز پڑھی دیوان خاص میں حاضری کی تیاری ہوئی ایک بڑا سا دسترخوان بچھا اُس پر شیرمالیں چنی گئیں شیرمالوں پر کباب پنیر پودینہ اور کرمولیاں کتر کے رکھیں بادشاہ نے کھڑے ہو کر نیاز دی ذرا سا شیرمال کباب پنیر مولی کا ٹکڑا پہلے آپ چکھا پھر ایک ایک شیرمال اور کباب وغیرہ پہلے ولی عہد پھر شہزادوں اور معزز امیروں کو اپنے ہاتھ سے دیا، باقی سب کو بٹ گئیں، ابلو وہ جامع مسجد سے تبرکات نالکی میں رکھے ہوئے آگے آگے سپاہیوں کے من باجہ بجتا ہوا آئے، بادشاہ تعظیم کو کھڑے ہو گئے، تبرکات نالکی میں سے نکال کر چوکی پر رکھے گئے۔ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ اور نعلین آنکھوں سے لگائیں حضرت علیؓ کے ہاتھ کا قرآن شریف سر پر رکھا بوسہ دیا۔ حضرت امام حسنؓ حسینؓ کی خاک شفا کو آنکھوں سے لگایا، پھر حضرت صلعم کے موئے مبارک کو گلاب اور خوشبو میں غسل دیا۔ لو اب زنانہ ہوا، بیگماتیں آئیں تبرکات کی زیارت کی، بادشاہ اور بیگماتیں محل میں داخل ہوئیں۔ تبرکات اُسی طرح نالکی میں باجے گاجے سے جامع مسجد گئے شام کو اُسی طرح محل کی درگاہ کے تبرکات کی زیارت کی، دیکھو گوٹا بٹ رہا ہے۔ بُن ڈلیاں، الائچیاں، جوس، چھالیاں کتر کے بھونے ہوئے خربوزوں کے بیج اور دھنیا کترا ہوا کھوپرا اُس میں ملا کے گوٹا بنایا، شیشے اور کاغذ کی پلیٹوں اور کارچوبی بٹوؤں اور چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں رکھ اُن میں مہین مہین رنگین کھوپرے کے پھول بنا آپس میں بٹ رہا ہے اکثر سلاطین قلعہ میں تعزیہ داری کرتے تھے فقیر پیک بنتے تھے، کوئی نشانچی کوئی نقیب بنتا تھا۔ کوئی تاشہ کوئی ڈھول کوئی جھانجہ تعزیوں کے آگے بجاتا تھا۔ مرثیہ خوانوں کی درگاہ میں سے چار چار طشتریاں بُن مکھی ڈلیاں۔ بھنے ہوئے

خرلوزے کے بیج اور دھنیے کی ملا کرتی تھیں، بڑی دھوم دھام سے علم اٹھاتے تھے۔ (۱)

سلاطین کی اصطلاح

مولانا شبلی اکثر کھانے پر تاریخی واقعات اور سلاطین مغلیہ وغیرہ کے حالات دریافت کرتے تھے، ایک مرتبہ مولانا نے داغ کا ایک شعر پڑھا، جس میں سلاطین کی جمع الجمع سلاطینوں آئی تھی، اس پر میرے دوست نے داغ کا مضحکہ اڑایا، سر سید ہنس کر چپ ہو رہے، جب دوبارہ یہ بحث شروع ہوئی تو فرمایا کہ سلطان کی جمع عربی میں سلاطین آتی ہے لیکن اس شعر میں سلاطین سے (قلعہ معلیٰ کی اصطلاح کے مطابق) دوسرے معنی مراد ہیں، تب مولانا نے عرض کیا کہ تفصیل سے ارشاد فرمائیے، میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ "ولی عہد کے علاوہ جس قدر تیموری شاہزادے قلعہ معلیٰ میں تھے ان میں سے ہر ایک کا لقب سلاطین تھا اور یہ صیغہ جمع بہ معنی مفرد اردو میں مستعمل ہوتا تھا اس سبب سے سلاطین کی جمع سلاطینوں صحیح ہے، داغ نے قلعہ معلیٰ میں عہدِ طفلی سے جوانی تک تعلیم و تربیت پائی تھی لہٰذا اس کا کلام مستند ہے، (۲)

---

(۱) بزم آخر صہ ۱۵

(۲) یادِ ایام (عبدالرزاق) صہ ۱۴

لال قلعہ کی اصطلاحیں

ا

اردا بیگنیاں :- اسم مونث۔ شاہی محلوں میں حکم احکام پہنچانے والی ہتھیار بند عورت

اُلش :- اسم مذکر۔ پس خوردہ، جھوٹا کھانا

اوقچہ :- پلنگ کی زرین چادر جو پلنگ پوش کے نیچے نمائش کے لیے بچھائی جاتی ہے

آب حیات :- وہ پانی جس کے پینے سے آدمی نہیں مرتا یا بادشاہوں کے پینے کے پانی کو آب حیات کہتے ہیں،

آفتابی :- اسم مونث وہ دائرہ جو بادشاہوں کے جلوس میں ماہی مراتب کے ساتھ چلتا ہے اور اس کا سایہ بادشاہوں کے سر پر پڑتا ہے۔

آنی دار :- اسم مونث، نوکدار جوتی۔

آداب گاہ :- وہ مقام گاہ جہاں کھڑے ہو کر بادشاہوں کو سلام کیا جاتا ہے۔

الغن اسم مونث، پتنگ کی ایک قسم۔

اچیرج اسم مذکر، اچنبا، تعجب۔

انوٹ :- چھب/انداز۔ پاؤں کے انگوٹھے میں پہنے کا زیور اُودا پڑنا، کال پڑنا، غارت ہونا،

(ب)

بینی پاک :- ناک پونچھنے کا رومال۔

بھنڈہ :- حقّہ

بخشی :- فوج کو تنخواہ تقسیم کرنے والا منشی۔

بیلے کا ہاتھی :- وہ ہاتھی جس پر بیٹھ کر خیرات تقسیم کی جائے۔

بجھ بند :- بازو بند (زیور)

بیوی زن :- پاک دامن عورت

بیراگھیری :- عداوت دشمنی۔

بھبنی :- جھلک نشان

(پ)

پاؤں پاک :- پاؤں پونچھنے کا رومال۔

پوزی :- گھوڑے کا پیش بند

پرادلتون :- بے اولاد سے۔

پرپرلوں :- نانی پرنانی۔

پرلیوں دار :- پتنگ کی ایک قسم

پھپھڑا جلاتی :- خیر خواہی کرتی۔

(ت)

ترکنیاں :- قلماقنیاں، وہ عورت جو بادشاہوں کے محل میں پہرہ دے۔

تاش :- ایک قسم کا زری کا کپڑا۔

تبک :- روئی دار گول گھٹنا۔

تپک :- اسم مؤنث، توپ کی تصغیر۔

توس دان :۔ کارتوس رکھنے کا ڈبہ جو سپاہیوں کی پیٹی میں لگا ہوتا ہے

تہ پوشی :۔ زنانہ پاجامہ، پیٹی کوٹ ساڑھی کے نیچے پہننے کا۔

تھی تھی :۔ ناچنے گانے کی آواز۔

ٹ

ٹاٹ کی انگیا مونجھ کا بخیہ :۔ مثل، جیسی چیز ویسا ہی اُس کا لازمہ پیوند میں پیوند۔

ج

جسولینی :۔ اسم مونث، صحیح لیولینی، چوبدارنی وہ عورتیں جو شاہی محل میں خبر پہنچاتی ہیں۔

جیگڑ :۔ اسم مونث، پانی کے بھرے ہوئے مٹکے

جائی جوئی :۔ ایک قسم کا پھول اور آتش بازی

جہاں نما :۔ شاہی خیمہ وخرگاہ۔

چ

چھلب دار :۔ وہ گوٹے جو چھاجن دار دائروں پر لگاتے ہیں۔

چھیتی چھکا :۔ جھاڑ پھونک

چھیتی چھپتیا :۔ چاہیتی، پیاری۔

چارقب :۔ ایک قسم کی ولایتی پوشاک۔

چراغی :۔ مزار پر چراغ جلانے کا نذرانہ۔

چھائیں پھوئیں :۔ تو ج خدا نہ کرے۔

چوغان :۔ چوگان بازی۔

ح

حالت آنا :۔ راگ سُن کر وجد میں آنا۔

حوریں :۔ کنیزیں، بیویاں۔

خ

خمریاں :- خمروں کی عورتیں جو میلوں ٹھیلوں میں گا کر مانگتی ہیں۔
خمرے :- فقیر۔

د

دُلما :- وہ سالن جو قیمہ اور پنیر وغیرہ ٹنڈوں کریلوں بینگنوں میں بھر کر پکاتے ہیں۔
دُمچی :- گھوڑے کی دُم کا تسمہ
دغدغے :- قمقمے، قندیلیں، کنول۔
دوغ :- دودھ کی چھاچھ۔
دَدا :- بچّوں کی پالنے والی۔
دلیہ :- برسی سالانہ فاتحہ

ڈ

ڈھکیت :- ڈھال تلوار والا سپاہی، سپر بند۔

ر

روزہ اُچھلنا :- روزہ کی حالت میں غصّہ ہونا۔
رسّی :- سانپ۔
راوٹیاں :- چوگوشے خیمے، چھوٹے تنبو۔

ز

زمنبور :- چھوٹی توپ جو اُونٹ پر لدی ہوئی بادشاہ کی سواری کے ساتھ ساتھ چھوٹتی ہے،
زیرپائی :- زنانی جوتی۔
زناخی :- قلعہ کی بیگمات کا خطاب، مثلاً سہیلی، پھیلی، دِل جان، جان من،

س

سُمرن :- چند دانوں والی تسبیح۔

سراسری :- ماتھے کا زیور۔

سنگوٹیاں :- بیلوں کے سینگوں پر چڑھانے کا پیتل کا خول۔

سرگالا منہ بالا :- بڑھاپے میں جوانی کی باتیں کرنا۔

سگڈے مارنا :- جگہ بہ جگہ دوڑتے اور اچھلتے پھرنا۔

سُرتی :- چالاک، چوکس، ہوشیار عورت

سرخرو چونڈا ایمان بھونڈا :- ظاہر میں ایماندار لیکن باطن میں بے ایمان

ش

شولہ :- گوشت میں پکی ہوئی کھچڑی۔

شدّے :- شدا کی جمع جو تعزیوں کے ساتھ نکلا کرتے ہیں۔

ص

صحنک :- حضرت فاطمہ علیہا السّلام کی نیاز و فاتحہ کا کھانا۔

ط

طوغیں :- عَلم کی قسم کا ایک نشان جس میں موم بتی روشن ہوتی ہے۔

ع

عملہ فعلہ یوزک رکاب حاضر (۱) ملازمان دفتر (۲)، صوبیدار

عرض بیگی :- بادشاہ کی خدمت میں عرضیاں پیش کرنے والا۔

غ

غیبانی :- ایک گالی۔

ف

فقیر بیک :- ماہِ محرّم میں امام حسینؑ کا فقیر بننا۔

ق

قلار :- لال انگرکھے اور کالی پگڑی والے وہ سپاہی جو شاہی سواری کے ساتھ چلتے ہیں اور جو کوئی خلاف ادب حرکت کرتا ہے، اس کو مارتے ہیں،

قورخانہ :- سلح خانہ۔

ک

کرامات :- بادشاہ کا خطاب جیسے خداوند نعمت صاحب عالم۔

کڑکیت :- بادشاہ کی سواری کے آگے تعریفی یا رزمیہ داستانیں کرسانے والے۔

کلکڑ والے :- بازار میں حقہ پلانے والے، ساقی۔

کھچم :- پتنگ کو اڑاتے وقت کھینچنا

کرکری تاش :- ایک قسم کا ریشمی کپڑا جس کا تانا ریشم کا اور بانا بادلے کا ہوتا ہے۔

کنیانا :- کترانا پتنگ کا ایک طرف کو جھکنا۔

ککھباری :- جھگڑالو عورت، زبان دراز۔

کلیجی پھپھڑا کرنا :- بے میل کرنا۔

کمالے :- داؤں پیچ

کلبوت :- قالب۔

گ

گاؤزبان :- ایک قسم کی روٹی جو دیکھنے میں مثل گائے کے زبان کے ہو۔

گاؤدیدہ :- میدہ کی خمیری لمبوتری روٹی جو بیل کی آنکھ جیسی ہو۔

گجباک :- آنکس جس سے ہاتھی کو ہانکتے ہیں۔

گل تکیہ :- گالوں کے نیچے رکھنے کا تکیہ۔

ل

لمکا:- زریں جھنڈا۔

م

مردھے:- بادشاہی پیادے جو جریب لے کر چلتے ہیں۔

مُجرا:- ملاقات، سلام، کورنش

من وسلوی:- (۱) خوان نعمت (۲) ایک قسم کا نفیس کھانا جو مرغ کے گوشت سے پکتا ہے۔

متصدی:- منشی، نقل نویس۔

میر عدل:- چیف جج۔

ماہی مراتب:- وہ اعزازی نشان جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے ہاتھیوں پر چلتے ہیں۔

ماہی پشت:- ایک قسم کا کارچوب جو پشت ماہی سے ملتا جلتا ہے۔

ن

نورمحل پلاؤ:- ایجاد نور جہان۔

نمش:- دودھ کے جھاگ جو دولت کی چاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ سردیوں میں صبح کے وقت بکتی ہے۔

نیگڈمبر:- بادشاہ کے بیٹھنے کے لیے دو برجیوں والی عماری جو ہاتھی پر لگی ہوئی ہوتی ہے۔

نین مُتنی:- ہر بات پر رونے لبورنے والی۔

نواڑے:- پانی کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ڈونگے۔

ہ

ہوادار:- تام جھام۔ بادشاہ کی سواری کا وہ تخت جو کہار اُٹھا کر چلتے ہیں۔

ی

یاقوتی :۔ ایک قسم کا نشاستہ (۲) معجون ۔ (۱)

عجائب خانہ آثارِ قدیمہ

۱۸۶۸ء میں مسٹر کوپر ڈپٹی کمشنر نے اس کی بنا ڈالی تھی، ۱۹۰۱ء میں ایک ماہر علوم طبعی کے سیاح نے لارڈ کرزن کو عجائب گھر کی غیر منتظم اور گرتی ہوئی حالت کی طرف توجہ دلائی، لاٹ صاحب نے اس معاملہ کو محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کیا، بالآخر ڈاکٹر روگل کی رپورٹ سے یہ قرار پایا کہ قلعہ کے نوبت خانہ (نقار خانہ) میں ایک تاریخی عجائب خانہ قائم کیا جائے، جس میں قلعہ معلیٰ کے متعلق زمانۂ قدیم کے تاریخی نوادر جمع کیے جائیں، ۱۹۰۲ء میں مسٹر جان مارشل محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر ہوئے، خدا خدا کر کے ۱۹۰۷ء میں پرانے عجائب گھر کو بند کیا گیا، جنوری ۱۹۰۹ء سے آثار قدیمہ کا عجائب خانہ نوبت خانہ میں کھولا گیا، اور بہت سی نوادر اشیا جمع کی گئیں، اس عجائب گھر کی اکثر نوادرات دربار تاج پوشی میں مستعار دی گئی تھیں، جن کا ذکر جے پی طامس آئی سی ایس نے اپنے خاص کیٹلاگ میں کیا ہے،

ممتاز محل جس میں اب عجائب خانہ ہے، یہ محل شاہی تھا، لیکن ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا تو فوجی اغراض کے لیے لیا گیا، چند روز پیشتر تک یہ سارجنٹوں کا میس تھا، اس کی دیواروں پر کئی تہیں چونے کی چڑھی ہوئی تھیں ان کو جب کھرچوایا گیا تو اندر سے ان تمام نقاشیوں کے نشانات نمودار ہوئے، جو سفیدی سے ڈھک دیئے گئے تھے چنانچہ اب بھی درمیانی ہال اور مشرقی جانب کے کمرے میں نقش و نگار نظر آتے ہیں قلعۂ دہلی کا پرانا نقشہ جو دریا کے رخ سے بنایا گیا ہے اور جو عجائب خانے میں محفوظ ہے اس کے دیکھنے سے ممتاز محل کی سابقہ اور اصلی حالت معلوم ہوتی ہے کہ اس کی چاروں کونوں پر چھتریاں تھیں جن پر سنہرے کلس چڑھے ہوئے تھے۔(۲)

---

(۱) بزم آخر صـ۱۲۶

(۲) دیباچہ کیٹلاگ، مرتبہ مسٹر گارڈن سنڈرسن سپرنٹنڈنٹ محمڈن و برٹش مانومنٹ قلعہ آگرہ، عجائب خانہ کے آثار قدیمہ دہلی،

باغ حیات بخش کی بربادی

باغ حیات بخش موتی مسجد کے شمال میں تھا، (غدر میں اسے بھی تباہ و برباد کر دیا گیا) ۱۹۰۲ء میں یہ باغ بالکل ملبے کے انباروں میں دبا ہوا تھا اور باقی حصہ سڑکوں میں آ گیا تھا، اس کی نہریں، روشیں، آبشار، نالیاں، سب ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہو گئیں تھیں، (۱)

قلعہ کا آخری منظر، بہادر شاہ کی آخری کیفیت

قلعہ کا بیان اب ختم ہوتا ہے لیکن قبل اس کے کہ یہ محفل برخاست ہو، قلعہ کا آخری نظارہ کر لیجئے اور یہ دیکھ لیجئے کہ اس قلعہ کا آخری مکین ——— بہادر شاہ ——— اس قلعہ سے کیونکر اور کس حالت میں الوداع ہوا:-

"جان لارنس کی لائف میں قلعہ کی حالت لکھی ہے جس میں سے چند فقرے نیچے نقل کیے جاتے ہیں جو بڑے دردانگیز ہیں۔ قلعہ میں ایک بڑے سلسلہ خاندان شاہی کے آخری بادشاہ کی عالی شان غلام گردشیں اور شاہانہ خلوت سرا عوام الناس کی نگاہ کے روبرو کھلی ہوئی تھیں اور مسلح آدمی جو اس کے سرپرست نہ تھے۔ آستان متبرک پر مجتمع تھے، ایک دوسرے سے پیوستہ صدہا کمرے دور تک چلے گئے تھے جو اصل میں ان اشعار کے مصداق تھے۔

خلوتیں وہ سجی سجائی ہوئی
شب کو دولہا دولہن کے بننے کی
بیگمیں رشک زہرہ و ناہید
جس سے بہتر ہے وارثوں کی امید
سونے چاندی کا ہر طرف اسباب
لوٹ کا مال بے شمار و حساب

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صہ ۲۷

یہاں بیچارہ بوڑھا بادشاہ جو بمجبوری باغیوں کے ہاتھ کٹ پتلی بنا تھا، اپنے محل سے نکالا ہوا، ایک علیحدہ کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پھانسی دینے کے بارے میں عنقریب تجویز ہونے والی تھی اور جو افسروں اور سپاہیوں کی گالیاں، گھڑکیاں سن رہا تھا اور اس کے گرد شہنشاہ بیگم اپنے تئیں چھپاتی تھی کہ مبادا کسی نامحرم یا ظالم کا سامنا ہو جائے۔ اس بدنصیب جماعت میں سب سے زیادہ خوش یا کہیے، کہ سب سے کم ناخوش خود بادشاہ تھا جس کو ظاہرا اپنی مصیبت یا ہتک عزت کا کچھ خیال نہیں ہوتا تھا: بقول شاعر

جو فرط پیری سے ہوش گم تھے تو پیچھے کا سا طور کچھ تھا
نہ سامعہ تھا نہ باصرہ تھا نہ ذائقہ تھا نہ اور کچھ تھا! (۱)

قلعہ کی بربادی

سیکڑوں مزدور، قلعہ اور شہر کے مکان کھودنے کے لیے مقرر کیے گئے مزدور رات اور دن مکان کھود کر روپیہ اور پیسہ نکال کر سرکاری خزانہ میں جمع کر رہے تھے، جاگیرداروں اور راجاؤں کے نام پروانے لکھے گئے کہ مفسدوں اور مخبروں کو گرفتار کریں اور پروانوں کے ساتھ چند مخبر بھی بھیجے گئے، سانڈرس صاحب کمشنر مقرر ہوئے اور لباس صاحب سشن جج اور اجرٹن صاحب دہلی کے کلکٹر مقرر ہوئے۔ اور جان مٹکاف صاحب مفسدوں کی گرفتاری کے لیے مقرر ہوئے" (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۲۳۷

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۴ ۔

میں پہنچا ہوں اور مستورات نے مجھے دیکھا ہے ایک کہرام مچ گیا۔ دو سو عورتیں برابر سر پیٹ رہی ہیں اور شور و نالہ و فریاد آسمان تک جاتا ہے، وہ غل و شور جب فرو ہوا تو میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، بڑی بیگم صاحبہ نے بیان کیا کہ جس دن تم ہم سے جدا ہوئے ہو، تھوڑی دیر بعد پانچ چار گورے گھر میں گھس آئے اور کہا کہ ہم کو روپے دو، عورتیں تو کوٹھریوں میں گھس گئیں اور مردوں نے کچھ دے کر ٹال دیا، تھوڑی دیر کے بعد اور آئے، ان کو بھی کچھ دیا، غرضیکہ اب تانتا بندھ گیا، ایک آتا ہے ایک جاتا ہے میاں ناصر الدین نے کہا کہ میں جاتا ہوں، جرنیل صاحب کے پاس اور بندوبست کراتا ہوں وہ دو خدمتگاروں کو لے کر جامع مسجد میں پہنچے، وہاں جا نے کیا گفتگو ہوئی کہ ایک خدمتگار آیا اور ان عورات عیسائیہ کو جن کو انھوں نے ہنگام غدر اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا لے گیا اور وہ عورات کہہ گئیں کہ ہم ابھی آتے ہیں مع میاں ناصر الدین کو اپنے ساتھ لاتے ہیں اور سارٹیفکیٹ لاتے ہیں غرضیکہ وہ عورتیں بھی جامع مسجد میں پہنچ گئیں اور خدمتگار باہر مسجد کے دروازے پر کھڑے رہے مگر پھر نہ وہ عورتیں اور نہ میاں ناصر الدین لوٹے، اپنے خدمتگاروں نے تمام کو واپس آکر حال بیان کیا۔ رات بھر سب کو تشویش رہی اور اس عرصہ میں تمام محلہ کی عورات مرد ہمارے مکان میں آکر جمع ہو گئے، باہر باغ میں مرد اندر دونوں حویلیوں میں عورتیں دو سو آدمی زن و مرد دیکھا تھے منشی آغا جان اور ان کی تین اور عورتیں سب یہیں تھیں صبح کے وقت منشی آغا جان اور ان کا بیٹا، اور یہ سب باغ میں بیٹھے ہوئے تھے، اور میاں امیر مرزا نماز پڑھ کر اپنے شغل اشغال میں حسب معمول مشغول تھے اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی ضربیں لگا رہے تھے کہ ناگہاں دو گورے باغ میں آئے اور کہا ہمیں روپیہ دو۔ میاں امیر مرزا نے کہا ہمارے پاس روپیہ کہاں ہے ان میں سے ایک نے بندوق ماری کہ منشی آغا جان کے سینے پر لگی کہ اس نے باپ کو پکارا۔ میاں امیر مرزا نے کہا کہ بیٹا خدا کا نام لے، اس وقت باپ کو یاد نہیں کرتے انھوں نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہا تھا کہ دوسرے نے گولی ماری کہ وہ ان کے سینے پر لگی انھوں نے "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کہا اور چت ہو گئے۔ اور تسبیح کا ہاتھ ان کے سینے پر رہا۔ اور ان جفاکاروں نے پھر بندوقیں بھریں اور دو خدمتگاروں

کو مار کر اپنا رستہ لیا۔ مٹیا محل میں ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اس غل و شور کی آواز جامع مسجد میں پہنچی، وہاں سے دو انگریز داد و بلاس کرآئے، پوچھنے لگے کہ یہ کیا غل و شور ہے۔ عورتوں نے کہا کہ دیکھو تو تمہاری فوج نے یہ ظلم برپا کر رکھا ہے، ہمارے وارثوں کو بے خطا و قصور مار ڈالا، دیکھو، دیکھو یہ لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ تو بولے ہم کو روپیہ دو، ہم تم کو شہر سے باہر کر دیں گے۔ سب نے کہا بہت اچھا، ہم دیں گے مگر اتنا صبر کرو کہ ہم ان لاشوں کو زمین میں دفن کر دیں۔ چنانچہ سب نے جلدی جلدی گل کر گڑھے کھودے اور شہیدوں کو اسی پہنے ہوئے لباس میں سپرد خاک کیا اور انگریزوں کے ساتھ ہوئے۔ وہ ہم کو لیے ترکمان دروازے سے آئے اور جس کے پاس جو تھا ان کے حوالے کیا اور انہوں نے دروازہ کھلوا کر ہم کو باہر کیا۔ غرضیکہ یہ حقیقت سن کر مجھ پر بہت غم سا ہے میں آیا۔ مگر خاموش رہا۔ اب اگر ان کا ذکر کرتا ہوں تو یہاں کہرام مچا جاتا ہے۔ اب میرے گھر میں اتنے میں کہ تم نے دو تین لڑکیاں ہو، آخر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، میری بی بی جان گئی کہ کچھ واردات ہوئی ہے۔ مجھے قسم دلا کر پوچھا۔ میں نے اتنا کہا کہ جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی ہوا۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا باپ شہید ہوا۔ پھر تمام عورتوں میں رونا دھونا مچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے تمام کیفیت بیان کر دی۔[1]

غالب کی گواہی

مرزا غالب فرماتے ہیں "مگر خانا باقر علی [illegible] اس سے علاوہ کہ خیرات خانہ سے ایک بڑے قدیم وسیع مشہور اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔ مجذوب کی دو دکانیں بھیلیوں کے گھر نیل خانہ۔ بلاقی بیگم کے کوچہ تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج یہاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلی کے ویرانے سے خوش ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو کیا چولھے میں ڈالوں"[2]

---

[1] : داستان غدر: راقم الدولہ ظہیر دہلوی، ص ۱۲۵ ۔

[2] : غالب کا روزنامچہ ص ۱۹

غالب کے اس بیان پر خواجہ حسن نظامی مرحوم کا حسب ذیل حاشیہ خاص طور سے غور طلب ہے،

" پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جا رہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلے تھے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے پائے آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھروں کے برتنے کی چیزیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار اور محلے مسمار کئے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اس میں دب گیا خیال یہ تھا کہ گنجان محلوں اور بازاروں کا توڑنا ہوا صاف کرنے کے لیے تھا۔ مگر ۱۹۱۱ء میں یہ نشانیاں دیکھ کر اندازہ کر لیا جاتا تھا کہ مسماری جوش انتقام سے بھی تعلق رکھتی تھی۔ جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ داری کے اسباب کو بھی ملیامیٹ کر دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ غالب جب اس تباہی کا ذکر لکھتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے"

آگے چل کر مرزا غالب پھر فرماتے ہیں :۔

" دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی، دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑھ تک ڈھیئے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے۔ شہر ڈھ رہا ہے بڑے بڑے نامی بازار اردو بازار، خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے، صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی"[1]

مگر وہ مکین کہاں

ایک حساس انشاپرداز کے آنسو وہ میں نے دلی کا وہ دور نہیں دیکھا جب چپے چپے اور کونے کونے میں گوہر یکتا چمک رہے تھے، ہاں چوک کے وہ بیر درخت جو جیٹھ بیساکھ کی گرمی کے تھکے ماندے مسافروں کو پناہ دیتے تھے میری آنکھ کے سامنے

---

[1] : غالب کا روزنامچہ ص۱۴۱ ؎

ہیں، سعادت خاں اور مورسرا کی نہریں میرے سامنے بہتی ہیں، پن چکی کو برابر چلتے ہوئے میں نے دیکھا ہے، زینت محل کے کمرے کی پچھلی تصویر اب بھی میری آنکھوں میں ہے، صحیح بری کا ہیسے جیسے گئے سرسبز اشجار، خرنا تاب اور بارگنج کی عالیشان عمارتیں میرے سامنے ڈھنڈار ہوئی ہیں، آج دلی عبارت ہے، ولیسرگل لاج سے کورنٹھا ہاؤس سے رائے سینا کی پختہ سڑکوں اور خوشنما باغیچوں سے اور جب سنتا ہوں کہ قطب تک عمارتیں ہی عمارتیں بن گئیں ہیں جنگل میں منگل ہو رہا ہے تو بے ساختہ کہتا ہوں کہ "مکان بن گیا مگر وہ مکیں کہاں" [۱]

دلی کس طرح غارت ہوئی

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں "لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اب جو میدان ہے یہاں دہلی کے سب سے گنجان محلے آباد تھے، قلعہ کے لاہوری دروازے سے نکل کر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے، تو ایک بڑے پررونق بازار میں سے گزرنا پڑتا تھا یہ اردو بازار کہلاتا تھا یعنی فوج کا بازار، خانم کا بازار بھی اسی طرف تھا، قلعہ کی خندق سے لے کر سڑک تک اب کھلا میدان ہے۔ اس میدان میں بھی محلے آباد ہو گئے تھے۔ زیادہ تر امراء کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں، قلعہ میں ان کو نوبت بہ نوبت حاضر باش رہنا پڑتا تھا اس لئے یہیں مکانات تعمیر کر لئے گئے تھے۔ قلعہ محلوں اور عمارتوں کے احاطوں سے چھپ گیا تھا جب تک خندق پر نہیں پہنچتے تھے قلعہ کی دیواریں دکھائی نہ دیتی تھیں"

مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاء اللہ پر جو کتاب لکھی ہے اس میں ان کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ "میرا خاندانی مکان قلعہ اور مسجد کے درمیانی حصے میں تھا۔ فتح دہلی کے بعد فوج کے افسر اور سپاہی پہنچے اور بچے کھچے مکانوں کو حکم دے کر خالی کرا لیا کہ یہ محلہ سارا منہدم کر دیا جائے گا ایک گھنٹہ کے اندر صدیوں کے بسے ہوئے گھر چھوڑنے پر لوگ مجبور ہو گئے اور تمام محلہ بارود سے اڑا دیا گیا۔ میدان کا یہ حصہ سڑک سے کئی فٹ بلند واقع ہوا ہے یہ بلندی اسی لیے ہوئی ہے کہ مکانوں کا ملبہ پھیلا کر بچھا دیا گیا۔ قلعہ کی اس سڑک پر کشمیری

---

[۱] : دلی کی آخری بہار (علامہ راشد الخیری) ص ٢٢ ۔

دروازے کی طرف بڑھیں تو ریل کا پُل آتا ہے اور بائیں طرف ریلوے اسٹیشن جانے کی سڑک ملتی ہے، یہاں پنجابی کٹرہ آباد تھا جس کے وسط میں اورنگ آبادی کی بڑی عمدہ مسجد تھی مولوی عبدالقادر کا خاندان یہیں رہتا تھا، مولوی نذیر حسین مرحوم نے اسی مسجد میں درس حدیث دینا شروع کیا تھا۔ غدر کے بعد یہ تمام محلہ بھی اڑا دیا گیا اب قدیم صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس محلہ کے انہدام کے بعد مولانا نذیر حسین حبش خاں کے پھاٹک میں چلے آئے اور آخر تک وہیں مقیم رہے

قلعہ سے کچھ آگے بڑھیں تو داہنی جانب ایک پرانی عمارت نئی عمارتوں کے اضافوں کے ساتھ ملے گی، یہ دارا شکوہ کا کتب خانہ تھا، اسی کے قریب اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ جس کا ذکر فرخ سیر اور احمد شاہ کے زمانے کے واقعات میں ضمناً ملتا ہے۔

با یک جہاں کدورت باز ایں خرابہ جائیست ؎[1]

قلعہ کے پیچھے اس سبب سے مکان مسمار کئے گئے کہ اس کے آگے ایک وسیع میدان کرنا ضروری تھا، ان مکانوں کو ہاتھیوں نے ڈھایا تھا، اوّل ان کا کاٹھ کباڑ نیلام ہوا اسی طرح ایک میدان قلعہ کے آگے ہوگیا، پھر اس میدان میں لکڑی کے مضبوط درخت جیسے املی وغیرہ تھے نیلام ہوئے اور اب ان کی بنیادوں کے پتھر بیچے گئے بعض مکانات ثابت کے ثابت اینٹ پتھر سے بھر کے برابر کر دیئے

اس سبب سے بلاقی بیگم کا کوچہ، خانم کا بازار، خاں دوراں خاں کی حویلی، گلیوں کا بازار، دریا گنج کی گھاٹی، انگوری باغ وغیرہ بارٹی، بعض بالکل اور بعض کے کچھ حصے منہدم ہوگئے۔ ان مکانات مسمار شدہ کے مالکوں کو جو باغی تھے معاوضہ نہیں دیا گیا باقی اور

---

[1] : غالب از غلام رسول مہر، صفحہ ۲۷۵،

سب کو مکانوں کا معاوضہ اس طرح دیا گیا کہ جو روپیہ ان مکانات منضبط کے نیلام کی قیمت کا سرکار کے ہاتھ آیا اسے مالکان مکانات کو معاوضہ میں دے دیا۔[1]

چوک سعد اللہ خاں

غدر کے بعد دلی کس طرح لٹائی گئی؟ اس کا اندازہ ذیل کی دو لفظی تصویریں پیش نظر رکھ کر آسانی سے ہو سکے گا۔

(۱)

یہ چوک قلعہ شاہی کے دروازے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دلی کا بہت ہی خوبصورت بازار ہے، یہاں صبح و شام اس قدر مجمع رہتا ہے اور اس قدر رنگ رنگ کے جوڑے نظر آتے ہیں کہ پہلی دفعہ دیکھنے والا حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص کے لیے یہ بازار کا تماشا دلچسپ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں حیرت اور دلچسپی اور تعجب کی بہت سی چیزیں ہیں۔ ذرا غور کر کے دیکھیے، ایک طرف بیٹھے ہیں واعظوں کے بہت سے منبر نظر آئیں گے یا اونچی اونچی کرسیاں ملیں گی۔ جن پر مشہور مقرر واعظ بیٹھے تقریریں کرتے ہیں۔ موقع اور وقت کی مناسبت سے ان کا وعظ بڑا دل لبھانے والا ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں رمضان کے فضائل اور روزے کے فرائض سنیں۔ حج کے مہینے میں حج کے مناسک گوش گذار کیجئے۔ محرم الحرام کے مہینے میں ذکر شہادت سنئے اور خوب روئیے۔

یہ واعظ پیشہ ور ہیں کیونکہ اپنے وعظ کے خاتمہ پر پیسے وصول کرتے ہیں۔ یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ یہ لوگ بلا کے جادو گفتار اور سخن ور اور عوام کی نفسیات سے واقف ہوتے ہیں۔ بڑی فصاحت و بلاغت سے تقریر کرتے ہیں اور ایک ایک لفظ اس خوبصورتی سے کہتے ہیں

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صفحہ ۷۰۰۔

کہ عوام کی سمجھ میں پوری تقریر آجاتی ہے ان لوگوں کی تقریروں میں جاہلوں اور عالموں سب ہی کا مجمع ہوتا ہے ان لوگوں کو مسلسل کئی کئی رات تک ایک ہی موضوع پر بیان کرنے کی قدرت حاصل ہے گویا مذہبی داستان گو ہیں[1]

(۲)

لیکن اس بارونق، آباد اور رشک نگار خانۂ چین کوچہ کا حشر انگریزوں کے ہاتھوں کیا ہوا؟ اس کی کیا گت بنی؟ اور یہ کس طرح ویران ہوا۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں:۔

"سعد اللہ خاں کا چوک اب خواب و خیال ہوگیا، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ چوک اور اس کے قریب کے سب محلے مسمار کر دیئے گئے۔ اب وہاں ہو کا عالم نظر آتا ہے[2]۔"

خاص بازار

جامع مسجد کے شرقی دروازے کے سامنے اس نام کا بازار تھا، نہایت وسیع اور دلکشا۔ اس بازار میں سب طرح کے سودے والوں کی دکانیں تھیں۔ غدر کے بعد سب کا سب میدان صاف کر دیا گیا۔ جامع مسجد کے دروازے سے لے کر قلعہ کے دلی دروازے کی طرف جو سڑک جاتی ہے اور سڑک خاص کہلاتی ہے یہ اس اجڑے بازار کی نشانی ہے۔

خاص بازار میں سے خانم کے بازار اور خان دوران خاں کی حویلی کو راستہ جاتا تھا، خانم کا بازار ایک بلند بڑا اور پر رونق بازار تھا، جو قلعہ کی فصیل کے برابر برابر سرادگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا جہاں اب ٹھنڈی سڑک ہے یہ سارا میدان ہی صاف ہوگیا۔ اس میں اب ایڈورڈ پارک بنا ہے اور پریڈ گراؤنڈ ہے[3]۔

---

[1]: دو صدی پہلے کی دہلی (نواب درگاہ قلی خاں بہادر جد اعلیٰ نواب سالار جنگ بہادر مرحوم) صفحہ ۲۴؛

[3]: واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) صفحہ ۱۲۳۔

جہاں آرا بیگم کی سرائے

۱۰۶۰ھ ہجری ۱۶۵۰ء عیسوی

اس سرائے کے دو دروازے تھے جنوبی رخ کا دروازہ بازار چاندنی چوک کے سامنے تھا دوسرا شمال میں۔ سرائے کے صحن میں دو بڑے کنویں اور ایک مسجد تھی صحن کے چاروں طرف دو منزلہ بڑے بڑے کمرے تھے جن میں مسافر کثرت سے اترا کرتے تھے اور بیوپاری والے سوداگر بھی دکانیں لگا کر سامان فروخت کیا کرتے تھے۔

برنیر نے اس سرائے کا حال یوں لکھا ہے:

"یہ کارواں سرائے ایک بڑی چوگان عمارت ہے جس کے چاروں طرف دومنزلہ کمرے ہیں جن کے پیش میں برآمدے ہیں۔ یہ سرائے ممالک غیر ازبک وغیرہ کے تجار کی فرودگاہ ہے۔ یہ لوگ سرائے کے کمروں میں بآرام و آسائش بحفاظت تمام رہتے ہیں اور چونکہ سرائے کا دروازہ رات کو بند ہو جاتا ہے لہذا کسی قسم کا کھٹکا باقی نہیں رہتا۔"

لیکن

انگریزوں کی ہوس انتقام اس عظیم عمارت کا وجود بھی برداشت نہ کر سکی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز گورنمنٹ نے اس کو مسمار کر کے سارا میدان صاف کرا دیا۔ اب اس جگہ [illegible] کی عمارت بنی ہے

حط: واقعات دار الحکومت دہلی صفحہ ۲۳۶

مدرسہ مولانا شاہ محمد اسحٰق[1]

جس وقت شاہ عبدالعزیز کی دختر نیک اختر یعنی مولانا شاہ اسحٰق کی والدہ کا انتقال ہوا۔ حضرت کو خیال ہوا بیٹوں کے سامنے نو اسے وارث نہ ہوں گے اس لیے مولانا شاہ اسحٰق اور مولانا یعقوب کے لیے قطعہ زمین یہیں خرید کر اس میں عمدہ مکانات بنا دیئے، اور انہی کے نام کروا دیئے، چنانچہ مولانا صاحب چند سال ان مکانوں میں رہے، اس کے بعد ہجرت فرما گئے، یہیں ایک چھوٹی سی مسجد آپ کے نام سے مشہور ہے جس میں آپ نماز پڑھا کرتے تھے،

غدر کے بعد :-

مسلمانوں کی عمارتیں کوڑیوں کے مول نیلام کی گئیں اور ہندوؤں نے خرید لیں چنانچہ :-

اب چونکہ یہ کل جائداد رائے بہادر لالہ شیو پرشاد صاحب کی ہے اس لیے اس گلی پر

"مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس"

کا نقشہ دیا گیا ہے۔ اور اب ۱۹۴۷ء کے خون ریز انقلاب کے بعد تو تاریخ نے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ عبرت انگیز طور پر دوہرایا ہے

فاعتبروا یا اولی الابصار

ہائے یہ مکان اف وہ مکین

"کمرہ بنگش نہایت بے نظیر کمرہ ہے رفعت میں آسمان سے باتیں کرتا ہے استواری میں کوہ پر طعنہ مارتا ہے۔ نواب فیض اللہ خاں بنگش نے ہزاروں روپے کے صرف سے بنایا ہے، اس وقت لالہ بشمبر سہائے گماشتہ مکسٹریٹ ساکن اجمیری دروازہ کے قبضہ میں ہے"[2]

---

[1] : واقعات دار الحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد) ص ۱۶۷ ؛

[2] : یادگار دہلی (سید احمد دہلی) ص ۹ ؛

ضبط شدہ عمارتیں عیسائیوں کے تبلیغ گھر

احمد پانی کی رائے کے پاس تراہا ملتا ہے بائیں ہاتھ کے رخ پر نہر سعادت خان کے اس طرف کیمبرج مشن کی بڑی عالی شان عمارت سرمئی رنگ کی وسیع کوٹھی ہے مشن نے یہ کوٹھی نیلام میں کوڑیوں کے مول بارہ ہزار روپیہ میں خرید لی۔ یہ کوٹھی نواب بہادر جنگ کی تھی جو ضبط ہو گئی تھی[۱]

کلاں محل لالہ جی کے قبضہ میں

شاہجہانی عمارت ہے قلعہ معلیٰ کے بننے سے پہلے شاہجہان بادشاہ اس میں مقیم تھے کسی زمانہ میں بہت بڑا محل تھا، موجودہ محل اس سے کم ہے غدر کے بعد لالہ چھنا مل نے کوڑیوں کے مول لے لیا ہے[۲]

مسجد مندر میں شامل کر دی گئی

رکاب گنج کے مندر کے مغربی گوشہ میں ایک مسجد تھی جو غدر کے بعد منہدم کر دی گئی اور وہ جگہ مندر میں شامل کر لی گئی[۳]

املی محل

ایک پرانی مگر عالی شان عمارت املی محل کی ہے حال میں سلطان سنگھ رئیس دہلی نے خرید لیا ہے اور اپنے طرز پر بنوا رہے ہیں[۴]

بادشاہ پرست ہندو راجہ

انگریزوں نے لال قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجاتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کو جلا وطن کر دیا۔ خاندان مغلیہ کو نیست و نابود کر دیا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں افتراق کی خلیج پیدا کر دی لیکن اس نقش کو نہ مٹا سکے جو اس باعظمت خاندان نے قائم کر دیا تھا۔

---

۱ : واقعات دارالحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) حصہ دوم، ص ۲۵۱۔

۲ : واقعات دارالحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) حصہ دوم ص ۱۶۳۔

۳ : واقعات دارالحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) حصہ دوم ص ۲۱۵۔

۴ : واقعات دارالحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) ص ۱۶۲۔

"ایک تاریخی واقعہ یاد آگیا ہے وہ بھی لکھتا ہوں" جب قلعہ معلیٰ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو کچھ زمانے کے بعد مہاراجہ جے پور بطریق سیر داخل قلعہ ہوئے، جب تخت کے سامنے پہنچے ننگے پا ہاتھ جوڑ کر تخت کے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا۔

" جہاںپلی پھر کروٹ لے "

تمام راجہ اکبر اعظم کو جہاںپلی " زبردست قوت والا " کہہ کر خطاب کرتے تھے۔
مہاراجہ نے بھی دولت مغلیہ کی گود میں پرورش پائی تھی لہذا عالم بے خودی میں چیخ اٹھے کہ "اکبر اعظم ایک مرتبہ پھر آکر تخت مغلیہ پر جلوس فرما"
بادشاہ پرستی کا یہ حقیقی جذبہ تھا اور یہی وہ احساس تھا جس نے واحد علی کو بھی آداب بجا لانے پر مجبور کیا تھا۔ آج دنیا میں شاہ اور زہرہ دونوں نہیں ہیں لیکن یہ سچے جذبات اس قابل ہیں کہ موجودہ اور آئندہ نسلیں اس واقعہ کو یاد رکھیں اور ہمیشہ قومی حکومت کا احترام کریں۔
واحد علی شاہ کے ہاتھ میں ایک مرصع عصا تھا وہ نذر میں پیش کیا جس کو شاہ ظفر نے منتوں سے قبول کیا اور ظفر شاہ کے ہاتھ میں جو زمرد کی تسبیح تھی وہ واحد علی شاہ کو عنایت فرمائی اس عطیہ پر شاہ نے پھر سلام کیا اور دست بوسی پر یہ ملاقات ختم ہوئی[1]

---

[1] : یادِ ایام (عبدالرزاق) ص ۲۴۹

باب ۴۶

کالا پانی

کالا پانی ——— کتنا بھیانک، کتنا لرزہ خیز، اور کتنا ہولناک لفظ ہے!

لیکن یہی کالا پانی، جب مجاہدوں اور سرفروشوں کا مرکز بن جاتا ہے، تو یہ ایک مقدس مقام بن جاتا ہے، اب تک یہاں، وہ لوگ پکڑ پکڑ کر بھیجے جاتے تھے، جو انسانیت کے دشمن تھے، اقدار انسانی کے مخالف تھے، اب وہ لوگ پابجولاں لائے گئے ہیں، جن کی ذات پر، مسند علم و فضل کو فخر ہے، جن کے ارشادات کو کروڑ بیان جوش عقیدت سے بے خود ہو کر سنتے ہیں ؎

جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم اُبلتا ہے

کالے پانی کی کہانی، اپنے اندر نوادرات و عجائبات کی ایک دنیا پنہاں رکھتی ہے لیکن "نظر سے خوش گزرے" کے طور پر اس کے جستہ جستہ، اور چیدہ چیدہ واقعات، ذیل میں مختلف ماخذوں سے اخذ و التقاط کے بعد درج کرتے ہیں:

کالا پانی کیسے بنا؟

سو برس ہوئے سب سے اوّل لفٹنٹ بلیر ایک جہازی سردار نے یہاں آکر لنگر ڈالا تھا۔ اسی سبب سے پورٹ بلیر اس جزیرہ کا نام ہوا۔ انہی ایام میں جس کو سو برس ہوئے سرکار نے پہلے بھی یہاں قیدیان حبس لعبور دریائے شور کا رکھنا تجویز کیا تھا مگر ناموافقتی آب و ہوا کے سبب سے ۱۷۲۶ء میں یہ جزیرہ آباد ہوکر پھر اُجڑ گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سرکار کو پھر اس کی ضرورت ہوئی، اور

مارچ ۱۸۵۸ء سے گویا دوبارہ اس کی آبادی شروع ہوئی۔ اور پہلے پہل بغاوت کے قیدی یہاں لاکر رکھے گئے۔ (۱)

کالے پانی کے دُرہائے مکنوں

کالے پانی میں کیسے کیسے علماء حق اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے؟ چند کے نام سُن لیجئے:

آٹھویں دسمبر ۱۸۶۵ء کو جہاز سے معہ دیگر قیدیوں کے روانہ پورٹ بلیئر انڈمان ہوئے۔ صعوبات و تکالیف جہاز طے کرکے گیارھویں جنوری ۱۸۶۶ء یہ قافلہ جزیرہ انڈمان روانہ ہوا۔ یہاں منشی سیّد اکبر زمان اکبرآبادی ہنگامہ ۵۷ء کے باغی علما سے تھے۔ انھوں نے اپنے مکان میں لے جاکر رکھا۔ مولانا احمد اللہ و مولانا یحییٰ علی ایک جگہ رہے۔ میاں عبدالغفار بھی ان کے پاس رہے۔ منشی صاحب موصوف نے ہر قسم کی معاونیت ان صاحبوں کی مولانا یحییٰ علی صاحب نے ۲۰ فروری ۶۸ء کو انتقال فرمایا۔ (۲)

درس قرآن و حدیث

کالے پانی کے یہ مجرم، نہ ڈاکو تھے، نہ چور، نہ قزاق، نہ رہزن، نہ قاتل، ۔ نہ ٹھگ، یہ اسلام کے مجاہد اور مبلغ تھے، میدان جہاد ان کے یمن قدم سے مقدس بن گیا، کالے پانی کا سیاہ خانہ ان کی عبادت اور مجاہدے سے منوّر ہوگیا، لازم کے میدان میں یہ احکام الٰہی سے غافل نہ ہوئے جس کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بھی یہ اپنا فرض ادا کرتے رہے:

" صادق پور پٹنہ کے مکانات جن میں جماعت کے لوگ ٹھہرتے تھے۔ معہ مکانات مسکونہ کھدوا کر پھنکوا دیئے گئے۔ ۱۸۷۲ء کے آخر تک بہار اور بنگال میں گرفتاریوں کا سلسلہ

---

(۱) تاریخ عجیب ص۲۴۳

(۲) درمنثور (عبدالسلیم صادق پوری)

جاری رہا۔ پٹنہ میں امیر خاں سوداگر چرم اور مولوی تبارک علی وغیرہ، پٹنہ میں مولوی نصیر الدین صاحب اور اسلام پور میں ایک معمر و ضعیف شخص ابراہیم منڈل گرفتار کر لیے گئے اور پرانے گواہوں سے گواہی دلوا کر کالے پانی روانہ کر دیا گیا۔ امیر خاں کی جائداد سے حکومت نے مقدمہ کا کل خرچ پورا کیا۔ (۱)

مولانا جعفر نے ایک نو مسلمہ سے شادی کر لی وہاں ان کے اولاد ہوئی۔ مولانا جعفر اور مولوی یحییٰ علی نے وہاں بھی درس قرآن و حدیث جاری رکھا۔ گھر گھر جا کر یہ لوگ نماز روزہ کی تلقین کرتے۔

مولانا جعفر اٹھارہ سال انڈمان رہے۔ ۱۸۸۳ء میں معہ رفقاء کے رہا ہو کر ہندوستان واپس آئے۔

بوستانِ ہفت کشور

یہ علماءِ حق، جن کے سینے علم کی روشنی سے منور، جن کے دماغ علم الٰہی کے مخزن، اور جن کے دل، حبِ رسول سے سرشار تھے، دریائے شور کی تکلیفوں اور اذیتوں سے بے پروا، اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، وہی ذوقِ یقین، وہی شوقِ جستجو، وہی جذبۂ تبلیغ، جیسے انھیں ہر طرح کی آسودگی، اور آسائش حاصل ہے:۔

علامہ فضلِ حق جزیرہ انڈمان پہنچے مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی و کول مفتی مظہر کریم دریاآبادی اور دوسرے مجاہد علماء وہاں پہلے پہنچ چکے تھے ان علماء کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرت نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا خرابی آب و ہوا تکالیف شاقہ اور درد جدائی احباب اور اعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے، مفتی صاحب نے علم الصیغہ جیسی صرف کی مفید کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ سرکاری

---

(۱) سیرت سید احمد شہید (ابوالحسن ندوی) صفحہ ۳۲۴

ڈاکٹر حکیم امیر خان کی فرمائش سے تواریخ حبیب اللہ بھی تالیف کی (یہی تاریخی نام بھی ہے)
ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے تاریخی یادداشت ترتیب واقعات قواعد فنون ضوابط علوم، سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

واپسی ہندوستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علیگڑھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی۔

چو بفضل خالق ارض و سما   او ستادم شد ز قید غم رہا
بہر تاریخ خلاص آنجناب   بر نوشتم اِنّ استاذی نجا (۱)

منشی مظہر کریم نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر مراصد الاطلاع کا ترجمہ کیا، سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی نے پانچ اشعار میں تاریخ لکھی آخری شعر یہ ہے ؎

منیرؔ اس کی کہی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیر جدید بوستاں ہفت کشور ہے (۲)

شہیدانِ حُرّیت!

اب تک کالا پانی، قاتلوں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کا مرکز تھا، اب یہاں کی زمین آسمان بن گئی، یہاں وہ لوگ آبسے، جو موت سے بے پروا ہوکر، میدانِ جہاد میں کودے تھے، جو بظاہر ناکام رہے، لیکن جن کی کامرانی پر فرشتے رشک کرتے تھے۔

"میں نے وہاں جاکر دیکھا کہ اس غدر ۱۸۵۷ء کی بدولت بیسیوں راجے اور نواب اور زمیندار و مولوی، مفتی، قاضی، و ڈپٹی کلکٹر و منصف و صدر امین و صدر الصدور رسالدار

---

(۱) استاذ العلماء

(۲) کلیات منیر شکوہ آبادی

وصوبہ دار و جمعدار وغیرہ وہاں بند ہیں ۔(۱)

علمی مباحث، ادبی مشغلے

یہ بے کیف، پُرسوز، اور اذیت رساں زندگی بھی، علمی ولولوں، اور ادبی سرگرمیوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی، اس حالت میں بھی، بحثیں ہوتی تھیں، نقد و جرح کا سلسلہ قائم رہتا تھا، شعر و شاعری کے مشاغل جاری رہتے تھے،

منیرؔ اپنے ایک خط میں انڈمان سے محمد وزیر خان مقیم شہر باندہ کو (۲۲ مارچ ۱۸۶۴ء) لکھتے ہیں ۔

"بیشتر غزلیات و بعض قصائد لباس نظم پوشیدہ از انجملہ یک قصیدہ در طرز بدر چاچی و خاقانی کہ بہ مبالغہ و اصرار عالم معقول وادب علامہ لبیب المشتہر فی الہند جناب مولوی فضل الحق خیرآبادی بہ نظم آوردہ بالجملہ قصیدہ الیست کہ از قدرت ایزدی خبر میدہد (۲)

علامہ کے اصرار پر (۱۰۱) اشعار کا حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کی منقبت میں بڑی قابلیت سے ایک قصیدہ لکھا، قصیدہ کا پہلا مطلع یہ ہے

اشک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن

غرق ہوا نیل میں یوسف گل پیرہن

آخری اشعار کے ذریعہ ساری روداد منیرؔ ہی کی زبان سے سنیئے ۔

مخزن فضل و کمال عالم عالی مقام	ناقد تازی زبان نبض شناس سخن
مولوی بے نظیر فضل حق اسم شریف	دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں میں اور وہ رہتے تھے ایک جگہ	عین سمندر میں تھے غرقۂ بحر محن

---

(۱) تاریخ عجیبہ (مولانا جعفر تھانیسری) صہ ۹۱

(۲) کلیات منیرؔ

کہنے لگے ایکدن کچھ سبب اس کا بتا — شاعرِ اُردو زبان اسمیں ہوں گویا کہن
مصطلحات عجم اور کنایات فرس — کس لیے کرتے نہیں زینتِ نظمِ سخن
یا متحمل نہیں لہجہ اُردو زباں — یا کوئی لائق نہیں تم میں ہے بے بیتِ وطن
گو غزل میں نہو پر ہے قصیدے میں فرض — دقّتِ مضمون سے ہے حُسن بوجہ حَسن
حضرت سودا بغیر کس نے قصیدے کہے — وہ بھی پر اس راہ میں ہو نہ سکے قطرہ زن
شاعروں میں جز غزل پھر نہ کسی نے کہا — زعم میں گو اپنے ہو طوطیٔ شکّر شکن

میں نے کہا راست ہے آپ جو فرماتے ہیں — آپ سنیں تو کہے کچھ یہ اسیرِ محن
مصطلحات غریب جو کہ نہ معروف ہوں — نظم کرے کس طرح شاعرِ ہندی سخن
جو متعارف ہوا شاعروں میں پہلے سے — اس کو بھی سُن سُن کے آج ہوتے ہیں سب طعنہ زن

کہنے لگے یہ کلام مہمل و بے مغز ہے — ہیں شعرا بے سواد جہل ہے ان کا وطن
گرم ہوئے بڑھ گیا سلسلہ قہر و خشم — بسکہ تھے نازک مزاج ماتھے پہ آئی شکن
کہتے تھے وہ بار بار ہندیوں سے ہے محال — رمز و کنایات میں دقّت و لطفِ سخن

ہو کے ادب سے خموش پھر یہ قصیدہ کہا — کوچۂ نو میں چلا قاصدِ مشقِ کہن
قید میں قحطِ کتاب حافظہ از بس ضعیف — پر ملا غیب سے خامہ ہوا حرف زن
بعض تراکیب خاص طبع کی ایجاد ہیں — نظم ہوئیں جو تھیں یاد مصطلحاتِ کہن
نصف قصیدہ کیا سامنے ان کے رقم — ختم ہوا جب وہ تھے ہمدمِ گور و کفن
میری خطائیں کریں صاحبِ انصاف عفو — قید میں خود میں ہوں پوچ پوچ ہے میرا سخن
غیب سے تاریخ تو ہاتھ لگی اے منیر — جزوِ دل و جان ہوئی شرحِ حدیثِ حسن (۱)

۱۲۷۹ھ

(۱) کلیاتِ منیر

مولانا جعفر تھانیسری کی سرگذشت

کالے پانی کے بارے میں ہمارے معلومات بہت نامکمل اور تشنہ ہیں، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مدد مولانا جعفر تھانیسری سے مل سکتی تھی، وہی ایک ایسے شخص ہیں، جس نے وہاں کے مشاہدات پر پوری ایک کتاب لکھی ہے، لیکن اپنے حالات لکھنے میں انھوں نے جتنی دریا دلی دکھائی ہے، دوسرے رفقائے محبس کے حالات لکھنے میں اتنا ہی بخل کیا ہے مولانا نے وہاں کے حالات پر مشتمل ایک کتاب "تاریخ عجیب" تحریر فرمائی تھی، اس تاریخ کے مختلف مقامات کے ٹکڑے، ہم ایک داستان کی صورت میں مرتب کرکے اپنی طرف سے کوئی لفظ بڑھائے بغیر، درج کرتے ہیں، اس داستان سے، دوسروں کے حالات کا بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہوجائے گا۔

(۱)

گرفتاری

پارسن صاحب دوسرے دن میری گرفتاری کا وارنٹ لے کر تھانیسر آیا اور مجھ کو وہاں نہ پاکر شہر میں آفت مچادی۔ سینکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی۔ پچاسوں مرد عورت پکڑے گئے۔ میری بوڑھی والدہ اور میرے چھوٹے بھائی محمد سعید کو جو اس وقت صرف بارہ تیرہ برس کا تھا، اس کی بیوی کو پکڑ کر ان پر سخت عذاب اور مار پیٹ شروع کی اور ایسا ظلم اور زیادتی پردہ نشین عورات پر ہوئی کہ جس کو سن کر دل کانپ جاتا ہے۔ میری بیوی کو بھی پکڑنے کے لیے ایک وڈ پانی پت کو گئی۔ مگر مولوی رضی الاسلام صاحب کی جوانمرد والدہ کی دلیری سے میری عورت بچ گئی۔ غیران مار کھانے والوں میں ایک میرا بھائی محمد سعید نہایت کم سن اور لذت ایمانی اور فضائل ثابت قدمی سے سراسر بے بہرہ تھا۔ اس سخت مار پیٹ کو نہ اٹھا سکا، اور ڈر گیا اور اپنی جان بچانے کے واسطے بول اُٹھا کہ میرا بھائی دہلی کو گیا ہے۔ یہ میری خود غلطی تھی کہ ایک ایسے اہم راز میں ایک نابالغ بچے کو آگاہ کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ میری گرفتاری ہوئی۔ اس وقت پارسن صاحب میرے بھائی کو لیکر لسواری دہلی پہونچے۔ ادھر پنجاب میں میری جابجا تلاشی ہوئی۔

دس ہزار روپیہ کا اشتہار میری گرفتاری کا جاری ہوا۔

(۲)

پھانسی گھر اسی دن شام کو جب میں تیمم کر کے نماز پڑھ رہا تھا پارسن صاحب وہاں پہنچ گئے اور مجھ کو قید میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حکم دے دیا کہ اسے پھانسی گھر میں بڑی حفاظت کے ساتھ بند کر دو۔ اسی دن میں ایک بڑی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور دو تین پہرے اس کے گرد مقرر کر دیئے گئے۔

(۳)

دھمکی اور مارپیٹ دوسرے دن پارسن صاحب سپرنٹنڈنٹ اور میجر ونکفیل صاحب ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس اور کپتان ٹامی صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ مثل یاجوج ماجوج کے میری کوٹھڑی میں آئے اور مجھ سے کہا کہ تم اس مقدمہ کا سب حال بتا دو تمہارے واسطے بہت بہتر ہوگا۔ میں نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت پارسن صاحب نے مجھ کو پہلی دفعہ دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا تو ٹامی صاحب اور ونکفیل صاحب کوٹھڑی سے باہر کھڑے ہو گئے اور جب اس قدر مار پر بھی میں نے کچھ نہ بتلایا تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔ میں نے جب یہ کیفیت ظلم اور تعدی کی دیکھی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ اب مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمے کچھ رمضان کے روزے باقی تھے۔ دوسرے دن سے میں نے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

دوسرے دن جب میں روزے سے تھا، علی الصبح پارسن صاحب پھر آئے اور وہی کارروائی شروع کی۔ مگر تھوڑی زدوکوب کے بعد مجھ کو اپنی بگھی میں بٹھلا کر ٹامی صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا۔ جہاں وہ دونوں صاحب یعنی ٹامی صاحب اور ونکفیل صاحب بھی موجود تھے۔ اس دن انھوں نے میری بڑی چاپلوسی کی اور کہا کہ ہم تحریری عہد کرتے ہیں کہ اگر تم دوسرے شرکاء اور معاونین جہاد کو بتلا دو تو تم کو سرکاری گواہ کر کے رہا کر دینے کے علاوہ بڑا عہدہ بھی دلویں گے

اور بصورت نہ بتلانے کے پھانسی ہوگی۔ مَیں نے اس چاپلوسی پر بھی انکار کیا تو پھر پارسن صاحب
انگریزی میں ان دونوں سے کچھ باتیں کر کے مجھے الگ کمرے میں لے گیا۔ جہاں لے جاکر پھر مارنا
شروع کیا۔ میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھے اتنی مار پڑی کہ شاید
کسی پر ہی پڑی ہو۔ لیکن بفضلِ الٰہی سب سہار گیا۔ مگر اپنے ربّ سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے
ربّ یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھ کو اس وقت ثابت قدم رکھیو جب وہ ہر طرح سے مایوس ہوگئے
تو لاچار بعد آٹھ بجے رات کو مجھے جیل خانہ کو بھیج دیا۔ میں تمام دن روزے سے تھا۔ بنگلہ سے نکل
کر درخت کے پتوں سے روزہ افطار کیا اور جیل خانہ میں پہنچ جو میرے حصہ کا کھانا رکھا تھا اس کو کھا کر
اور شکر الٰہی کر کے سو رہا۔

(۴)

بھائی سرکاری گواہ بن گیا

آمدم برسر مطلب دسمبر سے اپریل تک یہ سب دارو گیر
ہو کر بماہ اپریل مجسٹریٹی ضلع انبالہ میں یہ مقدمہ پیش ہوا
اور ہم سب کو پھانسی گھروں سے نکال کر کچہری لے گئے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ میرا حقیقی بھائی
محمد سعید میرے اوپر اور محمد ربیع حقیقی بھائی محمد شفیع کا اس کے اوپر پھانسی کی [illegible] سے گواہ
ہوگئے اور اس کارروائی سے پچاس ساٹھ آدمی جن میں اکثر مولوی ملّا [illegible] تھے ہمارے اوپر گواہ
بنائے گئے۔ لیکن اکثر گواہ گواہی دیتے وقت ہماری طرف دیکھ کر زار زار روتے بھی جاتے تھے۔
مگر بے بس اگر گواہی نہ دیویں تو قطع نظر مار پیٹ کے پھانسی کا بھی سامنا تھا اور یہ سب گواہ تا ادائے
شہادت محکمہ سشن کے مثل قیدیوں کے زیر حراست [illegible] میں رکھے گئے تھے اور پولیس ہی ان کو
عمدہ خوراک اور لباس ملتا تھا۔ چنانچہ لاکھوں روپیہ سرکار کا ان بے جا [illegible] میں صرف ہوگیا
اور مار پیٹ کی تو یہ حالت تھی کہ عباس نام کا ایک لڑکا جو مدت تک میرے گھر میں [illegible] پرورش
پایا تھا۔ جب مجسٹریٹی میں گواہی دیتے وقت مجھ کو دیکھ کر پیار سے محبت کے [illegible] اور آموختہ بیان میرے
اوپر کرنے سے ہچکچایا تو اسی [illegible] رات کو ایسی سزا دی گئی کہ وہ بچہ اسی صدمہ سے قبل از پیشی
مقدمہ سشن کے مر گیا۔

(۵)

انگریزوں کا تعصّب

صاحب لوگوں کا تعصب ہم لوگوں سے یہاں تک تھا کہ جب بیروقت درپیشی مقدمہ کے ہم نے یہ درخواست کی کہ ہماری نماز کا وقت آگیا ہے، ہم کو نماز پڑھنے کی اجازت بخشی جائے تو یہ اجازت بھی ہم کو نہ دی گئی، مگر وہ ہمارا کیا کر سکتے تھے۔ ہم نے عین دوران مقدمہ میں تیمم کر کے بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لی۔

(۶)

مولانا مجتبیٰ علی

مولوی مجتبیٰ علی صاحب کی کیفیت اس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تھی وہ بڑے درد اور عشق سے یہ شعر اکثر سیّد صاحب کے فراق میں پڑھا کرتے تھے۔

آتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آن ملیے گا دن بہت انتظار میں گذرے

(۷)

پھانسی کی سزا

بعد التوائے دراز کے ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو پھر ایک آخری اجلاس سشن ہوا جج صاحب موصوف اپنی تجویز اور فتوئے سزا اپنے گھر پر بیٹھ کر حسب ایماء گورنر صاحب کے لکھ لائے تھے۔ اس دن اجلاس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے چار اسیسروں سے جج صاحب نے مخاطبہ ہو کر فرمایا کہ آپ لوگوں نے اس مقدمہ کو اوّل سے آخر تک سنا اب جو آپ کی رائے ہو لکھ کر پیش کرو۔ ہم نے دیکھا یہ چاروں اسیسر اس وقت بھی ہماری شکلیں دیکھ کر آنسو بھر بھر لائے تھے اور دل سے ہماری رہائی کے خواہاں تھے۔ مگر جب صاحب جج اور کمشنر صاحب کی رائے کو ہماری سزا پر مائل پایا تو مارے ڈر کے انھوں نے بھی لکھ دیا کہ ہمارے نزدیک بھی جرم مندرجہ فرد قرارداد ان پر ثابت ہے۔ پھر تو صاحب جج اور کمشنر نے بعد حصول اس حیلہ قانونی کا اپنی تجویز جو پہلے ہی سے پر لکھی رکھی تھی، پڑھنی شروع کی، پھر سب سے پہلے

میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم بہت عقلمند۔ ذی علم اور قانون دان اور اپنے شہر کے رئیس اور نمبردار ہو۔ تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا ہے، تمھارے ذریعہ آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی اور تمھاری کل جائداد ضبط سرکار ہوگی اور تمھاری لاش بھی تمھارے وارثوں کو نہ دی جائے گی۔ بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ اس گورستان جیل میں گاڑدی جائے گی، اور آخیر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔ یہ سارا بیان میں نے صاحب موصوف کا نہایت سکون سے سُنا۔ مگر اس آخری فقرے کے جواب میں میں نے کہا کہ جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کردے لیکن اس جواب باصواب پر وہ بہت خفا ہوا مگر پھانسی کا حکم دینے سے زیادہ اور میرا کیا کر سکتا تھا جس قدر سزائیں اس کے اختیار میں تھیں سب دے چکا تھا، مگر اس وقت میرے منہ سے الہامی فقرہ ایسا نکلا تھا کہ میں تو اس وقت تک زندہ ہوں، مگر وہ حکم دینے کے تھوڑے عرصہ بعد ناگہانی موت سے راہی ملک عدم ہوا۔ مجھ کو اپنی اس وقت کی کیفیت خوب یاد ہے کہ میں اس حکم پھانسی کو سُن کر ایسا خوش ہوا تھا کہ شاید ہفت اقلیم کی سلطنت ملنے سے بھی اتنا مسرور نہ ہوتا۔ اسی حکم کے سننے سے میری وہ کیفیت ہوئی کہ جنت الفردوس اور حوریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگیں تھیں۔ میرے بعد مولوی یحییٰ علی صاحب اور حاجی محمد شفیع صاحب تین آدمیوں کے واسطے پھانسی باقی آٹھ آدمیوں کے واسطے لعبور دریائے شور مع ضبطی کل جائداد کے سزا ہوئی، میں نے مولوی یحییٰ علی صاحب کو بھی نہایت بشاش پایا لیکن محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ تاہم انھوں نے بھی اپنی طبیعت کو بہت تھاما۔ اس دن پولیس والے اور تماش بین مرد و عورت بہت تھے۔ قریب شام کے احاطہ کچہری انبالہ کا خلقت سے بھرا ہوا تھا۔ حکم سُنا کر ان کا چپ ہونا تھا کہ صدہا مسلح اہل پولیس

زیرِ حکم کپتان پارسن صاحب میرے نزدیک آکر کہنے لگے کہ تم کو پھانسی کا حکم ملا ہے۔ تم کو رونا چاہیئے تم کس واسطے اتنا بشاش ہے۔ میں نے چلتے چلتے اس کو بولا کہ شہادت کی امید پر جو سب سے بڑی نعمت ہے اور تم اس کو کیا جانو اس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ پارسن بھی ایڈورڈس صاحب سے بڑھ کر متعصب تھا اور اس مقدمہ میں شروع سے اس نے بڑا ظلم کیا تھا۔ کہ جس کی تفصیل یہ قلم بیان نہیں کر سکتی۔ مگر خدا تعالیٰ منتقم حقیقی تو موجود تھا گو اس کے کام دیر اور سہولت کے ہوتے ہیں۔ ہم کو سزا ہو کر تھوڑے دن ہوئے تھے کہ یہ بے خوف بھی دنیا میں پاگل ہو کر راہی مُلکِ عدم ہُوا۔ جیل خانہ تک بیسیوں مرد عورت اور گرد سڑک کے ہمارا منہ دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حالت کے اندر پولیس ہم کو جیل خانہ میں لے گئی اور وہاں پہنچ کر ہمارے کپڑے اور لباس معمولی ضبط کر لیے گئے اور ہم سب کو گیروا لباس پہنا دیا ہم تینوں پھانسی والوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ تین پھانسی گھروں میں بند کر دیا باقی آٹھ آدمیوں کو جیل خانہ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ ملا دیا۔

(۸)

انگیریزوں کو تعجب

اہالیان جیل ہم کو پھانسی دینے کا انتظام کر رہے تھے اور ادھر ہم انگریزوں کا تماشہ بن رہے تھے صدہا صاحب اور میم لوگ ہم کو دیکھنے پھانسی گھروں میں آتے تھے۔ مگر بخلاف دوسرے عام پھانسی والوں کے ہم کو نہایت شاداں و فرحاں دیکھ یہ یورپین بہت تعجب کرتے۔ اکثر پوچھتے تھے کہ تم کو بہت جلد پھانسی ہو گی تم خوشی کس واسطے کرتے ہو ہم اس کے جواب میں صرف اس قدر کہہ دیتے کہ ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجہ شہادت کا ملتا ہے۔ اس واسطے ہم کو خوشی ہے۔

(۹)

مجاہد کا استقلال

ایک دن رات کو اسی پھانسی گھر میں ہم تینوں آدمی ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کرتے تھے کہ اس وقت ہمارے

سب محافظ صلح کر کے کہنے لگے کہ تم تینوں آدمی اس اندھیری رات میں بھاگ جاؤ ہم کو بجرم غفلت کچھ قید وغیرہ کی سزا ہو جائے گی۔ سو اس کو ہم بھگت لیں گے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ خداوند کریم اس نیک نیتی کا اجر تم کو دیوے، مگر ہم نہیں بھاگیں گے۔

(۱۰)

انتقام کا انوکھا طریقہ

جب بہت سے صاحب اور میم ہم کو پھانسی گھروں میں نہایت شاداں اور فرحاں دیکھ گئے تو یہ چرچا سب صاحب سب لوگوں میں پھیلا۔ تب ان صاحب لوگوں نے جو ہمارے جانی دشمن تھے۔ یہ خیال کیا کہ ایسے دشمنوں کو منہ مانگی موت شہادت جس واسطے وہ ایسا خوش ہو رہے ہیں دینا نہیں چاہیئے بلکہ ان کو کالے پانی بھیج کر وہاں کے مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرانا چاہیئے ہم نے دیکھا صاحب ڈپٹی کمشنر انبالہ ۱۹، ستمبر کو پھانسی گھروں میں تشریف لائے اور فرمایا کہ تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت درست تصور کرتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو اس لیے سرکار تمھاری دل چاہتی سزا تم کو نہ دے گی، تمھاری پھانسی سزائے دائم الحبس بعبور دریائے شور سے بدل گئی بہ مجرد سنانے اس حکم کے ہم کو پھانسی گھروں سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بارکوں میں ملا دیا اور جیل خانے کے دستور کے موافق مقراض سے ہماری داڑھی اور مونچھ اور سر کے بال وغیرہ سب تراش کر منڈی ہوئی بھیڑ سا بنا دیا۔ اس وقت میں نے دیکھا مولوی یحییٰ علی صاحب اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے تھے کہ افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے کتری گئی۔

(۱۱)

رہائی کے بعد، وہ پرانا آشیانہ

جب میں تھانیسر میں گیا تو میں نے اپنے موروثی مکان مسکن پر جا کر مالک مکان سے جو اس وقت اس مکان میں آباد تھا بہ عاجزی تمام یہ اجازت چاہی کہ اپنے زنانوں کو کسی ایک کمرے میں علیحدہ

کر کے مجھ کو اس مکان کے اندرونی قطعات کی زیارت کر لینے دو۔ مالک مکان نے مجھ کو شناخت کر کے بڑے اخلاق سے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ مجھ کو اس جگہ بھی قدرت الٰہی یاد آئی کہ جس مکان کو خود میں نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے تعمیر کیا تھا اب اس کے اندر میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ اب میں امید کرتا ہوں کہ خداوند کریم اس مکان کو ریا سے پاک کر کے قبول کر لیوے اور اس کا بدل کوئی مکان آخرت میں عطا کرے۔

(۱۴)

نئی زندگی، نئے حوصلے

بفضلِ الٰہی اب میں قطعی آزاد ہوں، جہاں چاہوں رہوں اور جو چاہوں روزگار کروں۔ بضرورت کاروبار ریاست لاہور اور کلکتہ کے مابین دورۂ سیر میں رہتا ہوں بلکہ ایک مقدمہ ریاست ارنولی کی پیروی میں میرا ولایت جانے کا بھی ارادہ ہے۔ جہاں انشاءاللہ تعالیٰ ڈاکٹر ٹیٹیر صاحب اور دوسرے مخالف اور موافق لوگوں سے ملاقات کر کے اس قدرت الٰہی کا ان سے اعتراف کراؤں گا جب میں کچہری انبالہ کے اس مقام کو دیکھتا ہوں کہ جہاں مجھ کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تھا اور یا جب جیل انبالہ کے پاس سے جس میں ڈیڑھ برس قید رہا تھا گزرتا ہوں اور یا ان سڑکوں پر سے گزرتا ہوں کہ جہاں سے بعد سنانے حکم پھانسی کے ہم کو جیل خانے لے گئے تو قدرتِ الٰہی کو دیکھ کر ہمارا دل ہل جاتا ہے اور یہ خیال ہو جاتا ہے کہ بروز سنانے حکم پھانسی کے کسی کو گمان نہ تھا کہ میں پھر اس کمرہ عدالت میں یا ان مقاموں پہ کبھی کھلا ہوا بے روک ٹوک پھرونگا ہرگز کسی بشر کو گمان کیا اس کا وہم بھی نہ تھا یہ فقط اس ربِ قدیر کا کام ہے۔

باب ۴۷

خونِ ناحق

قتل —— پھانسی

قریب ہے یارو، روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر؟
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

•

فاتح کی سفاکی، شقاوت، اور خون آشامی کے اصل مظاہرہ کا وقت میدانِ جنگ نہیں ہوتا، شہر کی گلیاں ہوتی ہیں، چوراہے ہوتے ہیں۔ وہ مدِ مقابل سپاہیوں کو اس بے دردی سے قتل نہیں کرتا، جس سنگ دلی سے ان لوگوں کی گردنیں کاٹتا ہے، جو گو شریکِ جنگ نہ ہوں، لیکن جنگ کرنے کی استعداد و صلاحیت رکھتے ہوں۔

دلّی فتح کرنے کے بعد، انگریزوں نے، اس طرح قتلِ عام شروع کر دیا، جس طرح عہدِ مغلیہ میں چنگیز اور ہلاکو کی فوجیں کیا کرتی تھیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ چنگیز اور ہلاکو اپنی لوگوں کی گردنیں قلم کرتے تھے، جنہیں معافی نہیں دیتے تھے، لیکن انگریزوں نے یہ قتلِ عام، عفوِ عمومی کے اعلان، اور ملکہ وکٹوریہ کے منشور کے بعد کیا۔

جو لوگ قتل کیے گئے، جنہیں پھانسی دی گئی جنہیں ہلاک کیا گیا، ان میں عام و خاص، غریب و امیر، بے اثر، اور با اثر، جاگیردار، اور فقیر بوریہ نشیں، ہر طرح کے لوگ تھے، قتل و ہلاکت کا فریضہ ادا کرنے میں اس قدر تعجیل مدِ نظر تھی کہ کسی کے کیس، پر غور کرنا، کسی کی فریاد سننا، کسی کے دلائل

اور وا[illegible] غور کرنا، وقت کا ضائع کرنا تھا،

حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے لیئے محاضرات کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ اس نے ایک یوم غضب مقرر کر رکھا تھا، اس دن جس شخص پر نظر پڑ جاتی، خواہ وہ کتنا ہی مقرب بارگاہ ہوتا، اس کی گردن قلم کر دی جاتی، غدر کے بعد انگریزوں نے "یوم غضب" کو ایک دن تک نہیں، ہفتوں اور مہینوں تک طول دیا اور اس عرصہ میں جو قاتل کے سامنے سے گذرا اسے نذر میں اپنا سر پیش کرنا پڑا،

یہ واقعات تعداد میں بہت زیادہ، اور نوعیت میں بہت مفصّل ہیں، لیکن اگر سب کو بیان کرنے کی طاقت نہیں، تو چند کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس داستان کو کسی نہ کسی حد تک تو سننا ہی پڑے گا۔ اجمال سے تفصیل آپ خود پیدا کر لیں ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں از یں مجمل

پھانسی کا عام نظارہ

غدر میں شرکت کے جرم یا اشتباہ میں جو لوگ گرفتار ہوئے، انہیں کس طرح پھانسی دی گئی، یہ جگر خراش منظر کلیجہ تھام کر دیکھئے۔

ان میں سے کچھ تو گوڑگانوہ کے مجسٹریٹ نے درختوں پر پھانسی میں لٹکائے باقی جو دہلی میں آئے ان کے گلوں میں بھی پھانسی کی رسی پڑی۔ ان کی ٹاٹ بافی جوتیاں اور سروں کے بناری دوپٹے جو پھانسی کے وقت آئے ان کو لے کر پھانسی دینے والا حلال خور نہال ہو گیا۔ آج کے دن دو چار بوڑھی شریف زادی عورتیں اپنی اولاد کے دیدار کو آخری وقت میں دیکھنے کے لیے۔ کسی طرح پھانسی کے پاس آ گئیں تھیں۔ اس وقت کی حالت بیان نہیں ہو سکتی۔ جان لارنس کی لائف میں لکھا ہے کہ ایک واقف کار ولیی دوکاندار نے یہ بندوبست کیا تھا۔ کہ اپنی دوکان کے سامنے چند کرسیاں لا کر بچھا[illegible] تھا اور ان کرسیوں پر چند انگلش افسر بیٹھ کر چرٹ پیتے تھے اور کرسیوں کے کرایہ کا پیسہ دیتے تھے اور پھانسی والوں کی حالت نزع کا تماشہ دیکھتے تھے۔ کبھی جیسوں کا گذر آدمیوں کے پھانسی کے لگنے کے وقت۔ پھانسی کے پاس ہوتا تو وہ اپنی ٹوپی اتار کر اپنا چہرہ چھپا لیتی تھیں۔ "۱"

"۱" تاریخ عروج عہد انگلیشیہ د ذکاء اللہ صفحہ ۱۱۷

نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ کو پھانسی کی سزا

دہلی فتح ہونے کے چند دن بعد مالاگڑھ کے رئیس اور دیگر تعلقہ داروں کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ ہوئی۔ جب فوج وہاں پہنچی تو مالاگڑھ کے رئیس نے تھوڑی دیر انگریزی فوج سے مقابلہ کیا آخر مع رئیس کلیا کے بھاگ کر ۲۵ ستمبر کو بریلی پہنچے۔

انگریزی فوج نے مالاگڑھ کے علاقے کو ضبط کر کے مالاگڑھ کے قلعہ کو کھود کر زمین کے برابر کر دیا۔ اور بلند شہر کے کلکٹر صاحب نے باغیوں کو بلند شہر خان پور اور خورجہ سے گرفتار کر کے کسی کو پھانسی دی۔ کسی کو حبس دوام کی سزا دی۔ اور باقی لوگوں کو میرٹھ بھیج دیا۔ اور کچہری وغیرہ کا کام پھر بدستور جاری ہو گیا۔ اسی طرح دہلی کے حکاموں نے مجرموں کو گرفتار اور جاگیرداروں وغیرہ کو طلب کر کے قید کر دیا۔ اور سینکڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان ہی جاگیرداروں میں عبدالرحمٰن خان رئیس جھجر اور راجہ بلب گڑھ بھی تھے ان پر یہ الزام تھا کہ اگر کسی انگریز نے جان بچا کر ان سے پناہ چاہی۔ تو انہوں نے پناہ نہ دی۔ اسی جرم میں ان دونوں کو پھانسی دی گئی۔ اور ان کی جاگیر وغیرہ ضبط کر لی گئی۔ قصہ مختصر روزانہ لوگ گرفتار ہو ہو کر آتے تھے۔ اور سزائیں پاتے تھے۔ بعض چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ مخبر ہر چہار طرف چھوٹے ہوئے تھے اور انعام کے لالچ میں لوگوں کو گرفتار کراتے تھے۔ (۱)

ان لوگوں کو کس طرح پھانسی دی گئی، یہ بھی دیکھ لیجئے :-

"جھجر کے نواب کو اور بلب گڑھ کے راجہ کو اور فرخ نگر کے رئیس کو جدا جدا مختلف تاریخوں پر پھانسی دی گئی۔ سب کی پھانسی کا وقت سہ پہر تھا۔ ان کی پھانسی کے دن شہر کے سب دروازے بند ہو جاتے تھے اور سپاہ کی ایک کمپنی باجہ بجاتی ہوئی کوتوالی کے سامنے پھانسی کے پاس آن کر کھڑی ہوتی تھی اور رئیس پھانسی پانے والا کرانچی پر جس کے گرد کٹہرا ہوتا تھا۔ اکڑوں بٹھایا جاتا تھا۔ اور اس کی مشکیں کسی ہوئی ہوتی تھیں۔ چھت پر کچھ کپڑا ڈال دیا جاتا تھا۔ چاروں طرف کوتوالی کے گرد تماشائی کھڑے

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۴۹

ہوتے تھے۔ جس وقت مجرم کو تختہ پر چڑھا کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کے تختہ کو پیچھے گراتے تھے تو تماشائی فرنگی دل شاد ہو کر ایک خندہ و دندان نما کرتے تھے۔ لاش پھانسی سے اتار کر ایک کراچی میں ڈال کر شہر سے باہر کسی گڑھے میں دفن کی جاتی تھی! (۱)

علماء، معززین شہر، اور بے گناہوں کو پھانسی

"نواب جھنگ خاں کے صاحبزادے محمد علی نے بوداری کے راجہ کے بھتیجے تھے۔ اپنے تحفظ کے لیے مکان کے دروازے بند کر لیے تھے۔ چند گورکھوں اور یورپینوں نے جو شہر میں لوٹ مار میں مصروف تھے دروازوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ کوشش میں ناکام رہنے کے باعث وہ دیواروں پر چڑھ گئے۔ ایک انا جو یہ نظارہ دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی اپنے گود کے بچہ سمیت کوئیں میں گر پڑی گھر کی دیگر خواتین نے اس کی تقلید کی اور اسی کوئیں میں گر کر ہلاک ہو گئیں۔

محمد علی نے وسط مکان سے بندوق چلائی اور تین یورپینوں کو مار گرایا اس پر ایک بڑی فوج مکان پر حملہ آور ہوئی اور تمام اہل خانہ کو قتل کر ڈالا محمد علی بھی مقتولوں میں تھے مگر آخر وقت تک لڑتے رہے تھے تقریباً ۶ ہتھیار بند آدمی جن میں شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے صاحبزادے بھی شامل تھے جو دہلی کالج سے متعلق تھے باغی سمجھ کر قتل کر دیے گئے۔ ان میں فلاح اللہ خاں بھی تھے جو اپنے زمانے کے مشہور طبیب بھی تھے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے بغاوت میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا تھا۔ پھانسی پر لٹکائے گئے۔ بھوجلا پہاڑی پر میاں امین صاحب نے جو ایک مشہور معروف شخص تھے سپاہیوں کو اپنے مکان میں داخل ہونے سے روکا انہوں نے داخل ہونے والے پہلے انگریزی سپاہی کو گولی مار دی اس کے بعد خود انہیں سنگینوں سے ہلاک کر دیا گیا لیکن انہوں نے مرتے مرتے اپنے قاتل کو بھی مار ڈالا۔

مولوی فریدالدین صبح کی نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے کہ انگریزی دستہ انہیں راستہ میں ملا جس شد و مد کے ساتھ انگریزوں کا رُکا ہوا دریا اُبل رہا تھا اُس کا تقاضہ تھا وہ ان لہروں میں غائب

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۷۱

ہو جائیں۔ حکیم احمد حسین خان اور حکیم رضی الدین خان بھی اسی طوفان کے نذر ہوئے۔ مرزا اسد اللہ خان کے بھائی مرزا یوسف خان جو مدت دراز سے حالت جنون میں تھے گولیوں کے شور کی آواز سن کر یکایک باہر نکلے اور مارے گئے۔ شہر کے اور بھی بہت سے آدمی مارے گئے کیونکہ اُن کی نسبت غلطی سے یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ باغی ہیں، خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اس طرح سے قہر نازل کیا کہ خشک و تر سب ہی کچھ جل گیا بے گناہوں اور مجرموں کو یکساں سزا ملی۔ جس طرح سے مئی کو بے گناہ عیسائی قتل ہوئے تھے اسی طرح ۲۰ ستمبر کو بے گناہ مسلمان قتل ہوتے جو لوگ تلوار سے بچ رہے انہیں پھانسی پر لٹکا یا گیا ان میں نواب مظفر الدولہ محمد حسین خان۔ مرزا احمد خان۔ میر محمد حسین خان۔ اکبر خان۔ میر خان نوشہر خان۔ حکیم عبدالحق۔ خلیفہ اسماعیل۔ محمد خان۔ رسالدار صفدر بیگ خان۔ عبد یار خان۔ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شہزادے بھی دار پر کھینچے گئے۔ بہت سے آدمی جیل خانوں میں مر گئے باقی اور طریقوں سے ہلاک ہوئے یہاں تک کہ سر جان لارنس نے از سر نو امن و امان قائم کر دیا۔ اور مجرموں کی سماعت مقدمہ کے لیے عدالتیں کھول دیں۔ (۱)

سرسیّد کے ماموں شہید کر دیئے گئے

قتل اور پھانسی سے وفادارن سرکار بھی نہ بچ سکے: دبیر الدولہ کے دو بیٹے تھے جو سرسید کے ماموں ہوتے تھے، بڑے وحید الدین خان جو مرزا جہانگیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے یہ بعد فتح دہلی فوج کے کسی سپاہی کی گولی سے نماز پڑھتے ہوئے مارے گئے۔ دوسرے نواب زین العابدین خان جن کو اُن کے والد کی وفات کے بعد دبیر الدولہ کا خطاب بادشاہ نے دیا تھا۔ (۲)

پھانسی کیوں دی گئی

پھانسی کے وجوہ بھی بڑے دلچسپ ہوتے تھے: حکیم عبدالحق ابن حکیم حسین بخش۔ یہ چند سال تک بلم گڑھ کی دیوانی پر

---

(۱) غدر کی صبح و شام صفحہ ۵۶

(۲) حیات جاوید (حالی) صفحہ ۱۸

مقرر ہوئے۔ جب خوب روپیہ پیدا کر لیا اور مالدار ہو گئے تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر آ گئے۔ اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کا اکثر حامد علی خان کے ہاں راجہ جے سکھ راؤ کے لڑکوں کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا۔ اس لیے ان کو پھانسی دی گئی۔ (۱)

پھانسی پانے والوں میں زخمی بھی تھے

باصول انسانیت نواز، اور رحم دل انگریزوں نے زخمیوں کو بھی پھانسی پر لٹکایا چنانچہ پھانسی پانے والوں میں ایک صنف میگزین کے ملازموں کی بھی تھی جنہوں نے میگزین میں انگریزوں کے ساتھ شرارت کی ان کا سردار کریم بخش تھا۔ میگزین کے ملازمین میں سے بہت تھوڑے بھاگ کر بچے۔ تیسری صنف زخمی جہادیوں کی تھی۔ جو مسجدوں میں پڑے ہوئے ملے تھے۔ اور زخمی سپاہیوں کی تھی جو بھاگ نہیں سکتے تھے۔ چوتھی صنف باغی تلنگوں کی تھی جو آس پاس سے چھپے چھپائے پکڑے آتے تھے۔ پانچویں صنف اجمیری دروازہ کے موچیوں کی تھی۔ جو اپنی دوکانوں کے پردے کے بانس نکال نکال کر سر تقیدِ خلص مشکات کے مارنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ جب وہ گھوڑے پر سوار اجمیری دروازہ کے باہر اپنی جان بچانے کے سبب جاتے تھے۔ چھٹے میواتی اور گوجر تھے۔ جنہوں نے بڑی لوٹ مچائی تھی۔ کوتوالی اور ترپولیہ کے درمیان جو حوض تھا۔ اس کے تین طرف پھانسیاں کھڑی کی گئیں تھیں۔ ان میں ایک دفعہ دس بارہ آدمی کے پھانسی لگ سکتی تھی۔ جس روز پھانسی پانے والے زیادہ ہوتے تھے۔ تو ان میں سے ایک گروہ پھانسی پر چڑھتا تھا۔ دوسرا گروہ کھڑا دیکھتا تھا۔ کہ اب ہماری باری آئے گی۔ (۲)

سو برس کا بوڑھا بھی....

ایک شخص میاں امیر صاحب خوشنویس بہت طاقتور اور لمبے تڑنگے آدمی تھے پورا نوے برس کی عمر تھی۔ مگر پنجہ میں بڑی طاقت تھی۔ بے مثل خوش نویس تھے۔ اور اپنے زمانہ کے کامل الفن استاد سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی فوج کے ایک

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ ص۲۵

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص۷۱۲

سپاہی کی گولی سے شہید ہو گئے ۔ (۱)

ذوق کے بیٹے فوق کو پھانسی

ذوق کا بیٹا فوق اس سبب سے پھانسی دیا گیا ۔ کہ وہ ایام غدر میں بادشاہی اہل کار تھا ۔ (۲)

کیوں پھانسی ملی؟

ایک شخص قاضی فیض اللہ خاں کشمیری جو اٹھارہ سال تک صدر الصدور کی کچہری میں سررشتہ دار تھے ۔ ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد سوداگری کا سلسلہ کر لیا تھا ۔ اور خوب آرام سے رہتے تھے ۔ باغیوں کے دور میں کوتوال ہو گئے ۔ جب انگریزی عملداری ہوئی تو ان کو پھانسی دے دی گئی ۔ (۳)

شہزادے بھی پھانسی سے نہ بچ سکے

اواخر ۱۸۵۸ء تک بڑے بڑے باغیان غدر ماخوذ کر کے فوجی کمیشن کے سامنے پیش کیے گئے ۳ شہزادے پہلے قتل ہوئے بخاور شاہ اور مرزا جنید دو اور رہ گئے تھے کمیشن نے انھیں مجرم قرار دیا جمنا کی ریت میں انھیں لے جا کر گوروں نے باڑھ مار دی ۔ (۴)

بخت خاں سے ملنے کی سزا پھانسی

میر محمد حیات بڑے با اثر کم آدمی تھے ۔ اور بہت متمول تھے پہلے انور میں مرزا اسفندیار بیگ کے علاقے پر ملازم تھے ۔ اکثر بخت خاں جرنیل فوج شاہی کی صحبت میں آتے تھے ۔ اور عہدہ پانے کی امید میں قلعہ بھی جاتے تھے ۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی ۔ روپیہ پیسہ بہت تھا اور حسین تھے ۔ الورسے یہ بھی گرفتار ہو کر قریب دو ماہ کے کوتوالی میں قید رہے ۔ بعد میں ان کو بھی پھانسی دے دی گئی ۔ (۵)

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۵۰

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ صفحہ ۶۲

(۳) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۵۱

(۴) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول ۔ بشیر الدین احمد صفحہ ۲۶

(۵) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ ۵۲

کنویں لاشوں سے پٹ گئے

غرضکہ جو لوگ شہر میں رہ گئے تھے۔ ان میں کئی اشخاص باکمال نام آور اور فرد روزگار مارے گئے ہیں۔ جو دہلی کی ناک اور یگانۂ آفاق تھے۔ جن کی نظیر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ہوگا۔ میاں محمد امیر پنجہ کش جن کا ثانی روئے زمین پر نہیں۔ مولوی امام بخش صہبائی۔ اور ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی داستان گو اور چیلوں کے کوچے کے اور بہت سے شریف لوگ۔ اس محلہ کے چودہ سو لوگ راج گھاٹ کے دروازے سے دریا پر لے جاکر بندوقوں کی باڑیں مار دی گئیں۔ اور لاشیں دریا میں بہوا دی گئیں۔ عورات کا یہ حال ہوا کہ گھروں میں سے نکل نکل کر بچوں سمیت کنویں میں جا گریں۔ چیلوں کے کوچے کے تمام کنویں لاشوں سے پٹ گئے تھے۔ آگے میرا قلم نہیں چل سکتا۔ نہ مجھے اس کی تحریر کی تاب ہے۔ باقی اور اضلاع شہر کا یہ حال ہوا کہ عورات اور مردوں کو شہر سے نکالا گیا تو اس طرح کہ مردوں کو تو کشمیری دروازے سے باہر کیا۔ اور عورات کو کابلی دروازے کی راہ سے شہر بدر کیا۔ کہ باہمی مفارقت ہوگئی۔۔۔۔ ایک ایک کو ڈھونڈتا پھرا۔ (۱)

باپ بیٹے کو پھانسی

"نواب میر خاں پنشن دار خلف نواب مرتضیٰ خاں جاگیردار پلول معہ نوجوان بیٹے عثمان خاں عرف دھولا الور سے گرفتار ہو کر آئے۔ اور اس جرم میں کہ مرزا عبداللہ کے دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ پھانسی دی گئی۔ ان کے اہل و عیال حیران و پریشان ہو کر جاورہ چلے گئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ (۲)

جانوروں کی طرح انسانوں کا شکار

قیدی جو پکڑے ہوئے آتے تھے۔ وہ اسی جگہ جہاں بغاوت کی تھی پھانسی دیئے جاتے تھے۔ یا توپ سے اڑا دیئے جاتے تھے۔ ہزارہ میں دو سو سپاہیوں کو پھانسی ہوئی۔ وہ وحشی جانوروں کی طرح شکار کیے جاتے تھے تاکہ سرکار جہانگیری صولت و سطوت و شوکت کا یقین سرحدی قوموں میں ہو۔ (۳)

---

(۱) داستان غدر (راقم الدولہ ظہیر دہلوی) صہ ۱۲۸

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ صہ ۵۲

(۳) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صہ ۵

بغیر تحقیق پھانسی

سرکار فرنگ کا ایک خیر خواہ لکھتا ہے :

نواب مظفر الدولہ و حسین مرزا یہ دونوں بھائی نواب حسام الدین حیدر ابن آغا شفیع خان کے بیٹے تھے۔ ان میں سے نواب مظفر الدولہ تو گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ دوسرے بھائی حسین مرزا بعہدہ نظارت قلعہ شاہی میں متعین تھے۔ یہ دونوں بھائی بہت لائق اور ہوشمند تھے۔ یہ بیچارے بھی جان کے خوف سے مکان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن مظفر الدولہ تو الور سے گرفتار ہو کر آ گئے۔ اور گوڑ گانواں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کو گولی مار دی گئی۔ دوسرے بھائی حسین مرزا ناظر مقام برت کو چلے گئے۔ کچھ دن بعد نابینا ہو گئے۔ ان کے دو بیٹے تھے طالع یار خاں اور اصغر یار خاں یہ دونوں بہت حسین نوجوان تھے۔ دہلی میں ان کا مثل کوئی نہ تھا۔ جس وقت وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے لوگ سکتہ میں آ جاتے۔ یہ دونوں بھائی بھی گھنشام چپراسی اور مسمی پیبدار مخبروں کی مخبری کرنے سے الور لائے گئے ان دونوں نے ہر چند مخبروں کی خوشامد کی لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور ایک سو آٹھ قیدیوں کے ہمراہ دہلی بھیج دیا۔ دو ماہ قید رہے اور پھر ان دونوں کو بغیر تحقیق کے پھانسی دے دی گئی۔ ان کے پھانسی پانے سے اہل شہر کو سخت رنج و افسوس ہوا۔ ان کے پھانسی پانے کے بعد جو حال ان کے باپ حسین مرزا کا ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ بقیہ عمر روتے ہی رہے۔"[1]

تمری تمکین بے حد کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

"کچھ ایسے لوگوں کو بھی پھانسی کی سزا ملی، جو کوڑا کے مستحق تھے لیکن پھانسی کے نہیں۔ اور ان کی پھانسی اپنے پیچھے کچھ پر لطف یادیں بھی چھوڑ گئی!

"نواب محمد حسن خان کو پھانسی اس لیے ملی کہ انہوں نے ایک حکیم کو گھر میں چھپا دیا گردن پر جو شیطان سوار ہوا تو اسے حاملہ بنا دیا۔ اس جرم میں پھانسی ملنے کا حکم ہوا۔

مگر حکیم صاحب نے نواب کی بی بی سے یہ سلوک کیا کہ اس کا سارا سامان مال و متاع لوٹ

---

[1] نصرت نامہ گورنمنٹ صدا۵

سے بچا کر اور کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیکر اس کے آرام و آسائش کا سامان کر دیا۔ (۱)

پنشن خوار مستحق دار

"نواب اکبر خاں ابن فیض اللہ خاں بنگش جن کی دو سو پچاس روپے پنشن سرکار سے مقرر تھی۔ اور ایک سو روپے ان کی بیوی کی پنشن تھی۔ بڑے فضول خرچ اور جوئے کے عادی تھے۔ ہمیشہ قرضدار رہتے تھے اور قرض خواہوں کے خوف سے گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ کرایہ وغیرہ کی آمدنی معقول تھی یہ بیچارے بھی جو لوگ اور سے گرفتار ہو کر آئے تھے ان میں تھے اور گوڑگانواں میں ان کو بھی پھانسی دی گئی۔ ان کے بیٹے فیض محمد خاں عرف بدھن بچ گئے اور ان کے متعلقین کو لے کر اجمیر شریف چلے گئے۔ معلوم نہیں وہاں کہاں رہتے ہیں۔ (۲)

سپاہیانہ شان کی سزا پھانسی

"بہت ہی کم مسلمان ایسے تھے۔ کہ سپاہیانہ شان رکھتے تھے اور وہ پھانسی کی رسیاں سے بچ نہ ہوتے ہوں۔ ایک دفعہ بارہ آدمی کا گروہ کمیشن کے روبرو ہوا۔ ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ مگر وہ سپاہیانہ صورت رکھتے تھے۔ پھانسی پانے والوں کی تعداد تاریخوں میں چار سو کے قریب بتلاتے ہیں۔ مگر ان کی ٹھیک تعداد خدا جانتا ہے۔ یا موت کا فرشتہ اگر کوئی ہو۔ (۳)

مسلمان ہونے کی سزا پھانسی

"ایک (انگریز) ڈاکٹر ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ جب وہ کسی ہندوستانی سے پوچھتا کہ تو ہندو ہے۔ یا مسلمان تو جہاں اس نے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو اس کو گولی سے مار ڈالتا تھا۔ (۴)

رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگ گلو باقی

"ایک افسر جو رینا ڈ (Renaud) کے دستے کے ساتھ متعین تھا بتاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس کثرت

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ صـ ۶۱۲

(۲) حضرت نام گورنمنٹ صـ ۵۳

(۳) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۶۱۳

(۴) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۶۰۶

کے ساتھ پھانسیوں پر لٹکایا گیا جو بیان سے باہر ہے دو دن کے اندر ۴۲ آدمیوں کو سڑک کے کنارے پھانسی دی گئی اور ۱۲ آدمیوں کو تو صرف اس جرم میں پھانسی کی سزا ملی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گذری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کیے وہاں پر قرب و جوار کے تمام دیہات جلے ہوتے تھے یہ کہنا کہ یہ سب مظالم کانپور کے حادثہ کا جواب تھے صحیح نہیں کیونکہ کانپور کا شیطانی واقعہ ان خوفناک حوادث کے بعد پیش آیا تھا افسر مذکور نے رینا ڈ RENOUD کو اس طرز عمل کے خلاف احتیاطاً مشورہ دیا اگر ہم اس طرح دیہات کو جلانے کی کاروائی کرتے رہیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ فوج کو راستے میں رسد اور چارہ بالکل دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ (۱)

فرخ آباد کے نوابوں کی پھانسی

نواب فرخ آباد بھی بجرم بغاوت پھانسی پر لٹکائے گئے منیر نے تاریخ کہی:

اقبال مند خاں، و غضنفر حسین خاں
دونوں در محیط قضا آہ آہ بہ گئے
دونوں جواں نیک امیران ذی حشم
مقتول تیغ تیز قضا آہ آہ ہوئے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہید راہ خدا آہ آہ ہائے! (۲) ۱۲۷۳ھ

بچوں کو پھانسی کی سزا

بنارس اور الہ آباد میں کانپور کے حادثہ سے پہلے:—
ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی کی سزا دی گئی

---

(1) Russel Diary P. 221

(۲) غدر کے چند علما انتظام اللہ شہابی ص ۳۸

کہ انہوں نے غالباً شوخیٔ طبع کے طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھائے ہوئے پائے تھے ان ناسمجھوں میں منادی کی گئی کہ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پرنم آنکھوں سے کمانڈر انگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے لیکن بے سود اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں کے سے گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بلا دریغ قتل کیا گیا پھانسیاں دینے کے لیے رضاکارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے دیہات میں دورہ کیا اس حالت میں کہ ان کے ساتھ پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہیں تھا نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریق سے پوری واقفیت تھی چنانچہ ان میں سے ایک "شریف آدمی" اپنی شاندار کامیابی کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کیا کرتے تھے یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اسی طرح تڑپتے اور جانکنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے "8" ہندسے کی دلچسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔" (۱)

شبہ میں پھانسی کی سزا

عام عدالتی اصول یہ ہے کہ شبہ کا فائدہ ملزم کو ملتا ہے، لیکن غدر کے بعد شبہ کی صورت میں ملزم کو پھانسی دے دی جاتی تھی خواہ وہ کتنا ہی نیک نیت اور نیک کردار کیوں نہ ہو، یہ داستان ایک انگریز دوست اہل قلم کی زبان سے سنیئے:

"قاضی فیض اللہ صاحب کشمیری حمید منزل دریا گنج میں ایک مشہور حویلی ہے وہ انہی کی ملکیت میں تھی۔ غدر میں باغیوں نے عیسائیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان عیسائیوں میں ان کے بھی کچھ دوست تھے۔ ان کو آزاد کرانے کی کوشش میں شاہی کوتوالی میں نوکر ہو گئے تھے۔ انگریزوں کا تسلط ہوا تو شبہ میں ان کو بھی پھانسی دی گئی۔" (۲)

۱؎ Kay Book V Chapter 11.

۲؎ نصرت ناصر گورمنٹ مست

خیرخواہی میں پھانسی ملاتی

نواب علی بخش خاں کے بڑے لڑکے غلام فخرالدین خاں انگریزی علداری میں کوٹ قاسم کے تحصیلدار تھے۔ اشرف شاہ اور حیدر شاہ مجذوب کے ساتھ جے پور اور الور سے ۱۱ مئی ۱۸۵۸ء کو کمشنر کے حکم سے دو شنبہ کے دن الور کی فوج کی حراست میں دہلی لائے گئے۔ اور کوتوالی میں دوسرے سپاہیوں کے ساتھ ان کو بھی قید کر دیا گیا۔ حیدر شاہ اور اشرف خاں نے صرف خیرخواہی کے لیے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کر دہلی بھیجا تھا جن میں سے آدھے لوگ تو گاؤں میں قتل کرا دیئے گئے۔ اور باقیوں کو دہلی میں پھانسی ہوئی۔ انھوں نے سینکڑوں بے گناہوں کا خون اپنی گردن پر لیا۔ (۱)

قتلِ عام

" ہندوستانیوں کے خلاف طبائع اس حد تک برانگیختہ ہو گئی تھیں کہ آج اس پر یورپ میں مشکل سے لوگ یقین کریں گے چنانچہ ہندوستانیوں کا وہ طبقہ جو شروع سے آخر تک نہایت جانفشانی کے ساتھ وفادار رہا اُن سے بھی بعض افسران نے نہایت بے جا طور پر سختی کی یہاں تک کہ اکثر کو زدوکوب کیا جاتا تھا اور پاس کرتے وقت پانی پلانے والوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ پانی مہیا کریں حالانکہ بہت سے اس کام میں گولیوں کا نشانہ بنتے گئے یعنی پانی مہیا کرنے کے لیے ان کو گولیوں کی زد سے گذرنا پڑتا تھا جس سے وہ بدقسمت گولیوں کا شکار بنتے تھے ماشکی گھسیارے اور کہاروں کو دن کی گرمی اور رات کی سردی میں کھلے میدان کے اندر سخت وقت کے ساتھ وقت گذارنا پڑتا تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر ہماری خدمت کرتے ہوئے زخمی بھی ہوئے تھے دہلی میں باشندوں کے قتلِ عام کی منادی کی گئی۔ حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ ہماری فتح کے خواہش مند تھے ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرنے کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں وغیرہ کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا علانیہ اظہار کرتے تھے۔ (۲)

---

(۱) نصرت نامہ گورمنڈلے ص۳۹

(۲) The Chaplains narrative of the Siege of Delhi.

بے گناہ مجرم

عبدالصمد خان ابن علی محمد خان بادشاہ کی فوج میں رسالدار تھے۔ یہاں سے ملازمت چھوڑ کر واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں کسی پلٹن کے افسر ہو گئے جب اودھ کی سلطنت متزلزل ہوئی۔ تو یہ پھر دہلی آ گئے۔ کچھ دن بعد جن جا یک سوار کے ساتھ الور چلے گئے اور وہاں ملازمت کر لی۔ دہلی فتح ہونے سے چند دن پہلے دہلی آئے تھے خود کیا آئے تھے قضا لائی تھی۔ عبدالرحمن خاں والی جھجر کے خسر کے شبہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ اور اسی شبہ میں گولی مار دی گئی۔ ان کے بعد ان کے باپ اور چچا بھی ان ہی کے غم میں جلد ہی انتقال کر گئے۔ (۱)

موت کی ارزانی

"ہے ہے کیوں کر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی۔ اور احمد حسین خان ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے تھے۔ فتح دہلی دونوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر جھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ (۲)

بندوق کی گولی

محمد علی خاں خلف نواب شیر جنگ خاں چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے۔ بہت خوب صورت جوان تھے۔ چار سو روپے کی آمدنی نواب بہادر جنگ خاں کے پرگنہ سے تھی۔ خوب عیش و عشرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ جب انگریز شہر میں گھسے تو یہ گھر میں ہی رہے۔ آخر بندوق کی گولی سے شہید ہو گئے۔ (۳)

بے گناہوں کا رنج

"حکیم شرف الدین خاں مرحوم کے نوجوان بیٹے نظام الدین خاں اور استاد ذوق کے بیٹے خلیفہ اسماعیل چند دوستوں کے ساتھ قدم شریف سے گرفتار کر لیے

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ صہ ۱۶

(۲) غالب کا روزنامچۂ غدر

(۳) نصرت نامہ گورنمنٹ صہ ۱۶

گئے۔ ایک رات کوتوالی میں رہے دوسرے دن بالکل بے قصور پھانسی دے دی گئی۔ حالانکہ ان پر کوئی ثبوت نہ تھا۔ ہر شخص ان کی بے گناہی کا رنج کرتا تھا۔" (۱)

مقتولوں کی یاد

غم مرگ میں تمام تا مبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ۔ میرا بھانجا اس کا بیٹا۔ احمد مرزا، انیس برس کا بچہ مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش اللہ اللہ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ (۲)

سکھ توپ سے اڑا دیئے گئے

"سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان کی وفاداری میں، اپنے دھرم اپنے راج، اپنی قوم تک کو فراموش کر دیا، ان کی بروقت مدد نے انگریزی حکومت کے استحکام میں غیر معمولی حصہ لیا، لیکن وہ بھی نہ بخشے گئے، جب وقت آیا تو وہ بھی توپ سے اڑا دیئے گئے۔

"۱۴ جنوری ۱۸۷۲ء کو ایک ہزار کے قریب سکھ مذہبی دیوانوں نے پنجاب کے ایک شہر مالیر کوٹلہ پر حملہ کیا جس کے بعد کی تفصیل ایک انگریز مورخ کے قلم سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

اس مقام پر نہایت ہی خوفناک قسم کی لڑائی ہوئی جس میں فریقین کا بہت نقصان ہوا بالآخر ۶۶ کے قریب سکھ جن میں ۲۲ کے قریب زخمی تھے ریاست پٹیالہ میں بھاگ کر پناہ گزین ہوئے جہاں پر ان کا محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا گیا بعد اس رات انہیں شیر کوٹ کے قلعہ میں بند رکھا گیا اس شکست کے ساتھ ہی پنجاب کی بغاوت کا خاتمہ ہو گیا مسٹر کوون نے جو ان دنوں لدھیانہ کا ڈپٹی کمشنر تھا ۱۶ جنوری کو ریاست کے حکام کو لکھا کہ قیدیوں کو مالیر کوٹلہ بھیج دیا جائے جہاں وہ خود بھی اسی دن پہنچ گیا لیکن دوسرے

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۵

(۲) غالب کا روزنامچہ ص ۱

دن کے پہر کے وقت یعنی ۱۷ جنوری کو اُسے کمشنر کا یہ پیغام پہنچا کہ ابھی قیدیوں کو شیر کوٹ کے قلعہ ہی میں
رکھا جائے مسٹر کووَن نے اس تحریری حکم کو تو جیب میں ڈال کر تقریباً فراموش کر دیا اور قیدیوں کا منتظر رہا۔
چنانچہ شام کے چار بجے کے قریب   قیدی مالیر کوٹلے میں پہنچائے گئے جنہیں دیکھتے ہی مسٹر کووَن
نے بغیر کسی قسم کی نمائشی عدالت کے حکم دینے کے فی الفور توپوں سے باندھ کر اڑا دینے کا حکم دے دیا۔
ان بدقسمت انسانوں کی تعداد پچاس تھی جن کو اُسی وقت چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر توپوں سے باندھ کر اڑانا شروع
کر دیا گیا شام کے ۷ بجے کے قریب آخری چھ قیدیوں کی ٹولی کو توپوں سے باندھ چکے تھے جب مسٹر فورستھ
FORSYTH کا یہ حکم پہنچا کہ قیدیوں کو فی الفور اس کے پاس لدھیانہ بھیج دیا جائے کہ جہاں اُن پر بغاوت کا
مقدمہ چلایا جائے گا چنانچہ مسٹر کووَن نے جو جواب گورنمنٹ کو بعد میں دیا اس میں اس حکم کے متعلق
اُس نے ذیل کے فقرات لکھے کہ :-

میں نے اس حکم کو پڑھ کر کاغذ مسٹر پرکینز Perkins کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ توپوں کے ساتھ
باندھ دیئے جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ ایسی حالت میں قیدیوں کی سزائے موت ملتوی کر دی جائے
کیونکہ اس کا اثر لوگوں پر بہت برا پڑے گا۔ چنانچہ پہلے ۴۴ قیدیوں کی طرح آخری ۶ قیدیوں کو بھی ہلاک
کر دیا گیا پچاسواں آدمی بھی مارا گیا اسی طرح جب اس روح فرسا واقعہ کی اطلاع گورنمنٹ کو پہنچی تو اس نے مکمل
غور کے بعد ذیل کی قرار داد کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کیا :-

"ہز ایکسی لینسی اور ممبران کونسل اس رنجیدہ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ اُن کی رائے میں مسٹر
کووَن کا طرز عمل نہ صرف سراسر قانون کے خلاف تھا بلکہ پبلک ضرورت کے بھی منافی تھا نیز اس تمام
واقعہ میں بعض ایسے حوادث پیش آئے ہیں جنہیں انسانیت اور تہذیب کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں۔
بنابریں جناب والسرائے دلی رنج کے ساتھ اس حکم کے صادر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مسٹر کووَن
کو فی الفور نوکری سے برطرف کیا جائے لیکن دوسری طرف مسٹر فورستھ کے طرز عمل پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی
اور اُسے ایک اور صوبے میں کمشنری کی حیثیت میں سابقہ تنخواہ پر تبدیل کر دیا گیا اور کچھ عرصے بعد یارقند
کے علاقہ میں پولٹیکل خدمت پر مامور کیا گیا جن خدمات کے صلے میں سرداری یعنی (NIGHT HOOD

کا اعزازی خطاب مرحمت فرمایا۔ (۱)

نواب سخاوت کو پھانسی کی سزا

غدر کے سلسلہ میں فرخ آباد کے نواب سخاوت حسین برادر خورد نواب فرخ آباد کو بھی سزائے پھانسی دے دی گئی، منیر نے تاریخ کہی۔

ریاض خلق سخاوت حسین خاں نواب

نہال باغ کرم زیب مسندِ شوکت

جواں قابل و فرزند خاص نصرت جنگ

غلام آلِ نبی سرو قد قمر طلعت

وہ بے گناہ ہوا تیغ مرگ سے مقتول

عنایت اس کو کیا حق نے گلشن جنت

منیر نے یہ بھی اس کے قتل کی تاریخ

ہوا شہید امیر دلیر با ہمت (۲)

۱۲۷۴ھ

مولوی پیر علی اور شیخ گھسیٹا کو سزائے موت

"چوتھی پانچویں جولائی کو شہر پٹنہ میں سرغنوں کی تلاش ہوئی ۱۴ فتنہ انگیز گرفتار ہوئے۔ ان میں پیر علی بھی جو اصل بانی فساد تھا۔ اور شیخ گھسیٹ جو لطف علی خاں کا بڑا معتبر ملازم تھا۔ گرفتار ہوئے لطف علی خاں پٹنہ میں سب سے زیادہ دولت مند تاجر تھا۔

ان ۴۱ مجرموں میں سے۔ جن کو فوراً پھانسی دی گئی۔ وارث علی بھی تھا۔

یہ ثابت ہوا کہ تمام فسادات کی جڑ پیر علی تھا جس نے انگریزوں کے برخلاف جہاد قائم کیا۔ شیخ گھسیٹا مدتوں سے بہت سے آدمیوں کو تنخواہ دیتا تھا کہ جب وقت آئے تو وہ اپنے

---

(۱) Cotton Indian & Home memories

(۲) غدر کے چند علماء (انتظام اللہ شہابی)، ص۔۔۔

مذہب اور شاہ دہلی کے لیے لڑنے کو تیار ہوں ان کاموں کے واسطے بہت روپیہ چاہیے تھا۔ پیر علی تو غریب آدمی تھا۔ شیخ گھسیٹا ایک بڑا مہاجن تھا۔ غرض ان دونوں کو پھانسی ہوئی۔ (۱)

مرنے والے بزدل نہ تھے

شہر کے رئیسوں اور عمائدین میں سے کوئی ایک آدمی نہ بچا جو کوتوالی میں یا کرنیل برن کے پاس قطب الدین کی کوٹھی میں حوالات میں نہ رہا ہو۔ یہ بڑے رئیس ایک ہی پخانہ میں کٹہروں میں بیٹھ کر آپس میں بے حجاب باتیں کرتے تھے۔ ایک غریب آدمی جو کوتوالی کی حوالات سے چھوٹ کر آیا تھا۔ تو اس نے کہا کہ آج میں نے جانا کہ شہر سے جلاوطن ہوا۔ حوالات میں تو روز پخانہ میں نواب حامد علی خاں و مفتی صدر الدین خاں اور شرفاء و روساء سے بے تکلف باتیں برابر کی ہوتی تھیں۔ اب یہ بات مجھے کب میسر ہے۔ قلعہ کی حوالات میں جو رئیس تھے اور حکیم احسن اللہ خاں و نواب احمد قلی خاں وہ سید سردار مرزا اور ان کے بھائی اور بہت سے امیرزادے تھے۔ ان میں سے بعض ایسے لہو و لعب کے شوقین تھے کہ شطرنج و گنجفہ و چوسر حوالات میں بھی کھیلتے تھے۔ ان میں سے ایک دو کو روز پھانسی ملتی تھی۔ (۲)

غدر کے سلسلہ میں کتنے آدمی ہلاک ہوئے؟

فرنگی مظالم کی تحقیق کے ساتھ تفصیل بیان کرنا محال ہے۔ ایک وسیع آباد رقبے میں مہینوں تک گورے پاپی اور سردار نہتے یا شہریوں کا شکار کھیلتے پھرے ان مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ کون پا سکتا ہے؟ معلوم ہندیوں کی یہ ہمت نہ تھی کہ جو کچھ گزری تھی، صحت اور وضاحت کے ساتھ اُسے قلمبند کرتے البتہ مختلف مقامات کی زبانی روایتیں ایک زمانے تک زبان زد رہیں۔ ہم عصر انگریزی اور چند سال بعد کی اردو تحریروں سے ان قصوں کی صرف اجمالی تصدیق ہو سکتی ہے اور یہ سرسری تخمینہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ہر انگریز کے عوض میں کم و بیش ایک ہزار دیسی مارے گئے۔ فرنگی مقتولوں کی مجموعی تعداد اور پانچ سات ہزار نفوس کہی

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۶۱

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۷۱۲

جاتی ہے۔ حلا فرنگی کے یہ فیصلے عموماً جمنا کے کنارے عمل میں لائے جاتے اور دریا میں بعدازاں بے تعداد لاشیں بہتیں اور مچھلیوں کی خوراک بن جاتی تھیں۔ "قیصر التواریخ" میں دہلی کے ان کشتگان فرنگ کا تخمینہ ستائیس ہزار لگایا گیا ہے (۲ صفحہ ۲۸۵) (۱)

دہشت زدگی کی دلچسپ مثال

ان پھانسیوں اور اس قتل عام نے دہشت کی کیسی فضا پیدا کر دی تھی اس کا اندازہ ذیل کے دلچسپ، لیکن عبرت انگیز واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:

ایک دن ایک ہندوستانی جوہری مسز گارسٹن (Mrs GARSTIN) کے پاس سونے چاندی کے ظروف بیچنے کے لیے لایا اور مسز موصوفہ نے یہ بھانپ کر کہ دام کچھ زیادہ بتائے گئے ہیں۔ ویسے ہی تفنن طبع سے کہا کہ دیکھو تم کو میٹکاف صاحب کے پاس بھیج دیں گے چنانچہ اس فقرے کو سنتے ہی وہ حواس باختہ ہو گیا اور اس طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگا کہ اپنے قیمتی ظروف بھی وہیں چھوڑ گیا۔ جس کے بعد اس نے کبھی اپنی صورت نہ دکھائی اور نہ ہی ظروف کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ (۲)

---

(۱) تاریخ پاکستان و بھارت (سید ہاشمی)، صفحہ ۴۴۴

(۲) Escape from Gawalior P. 269

باب ۴۸

"چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر؟"

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

غدر دہلی کے اختتام کا ایک دور تو وہ تھا، جب انگریز آتش بجاں، فاتح کی حیثیت سے دوبارہ دلی میں داخل ہوئے، یہ دور تھا انتقام کا، تعزیر و عقوبت، شکست و ریخت کا، ہلاکت اور بربادی کا، قتل اور پھانسی کا، لوٹ مار کا، جو سامنے آیا مارا گیا، خواہ وہ پیر فانی ہو، یا لب گور مریض، یا بے گناہ عورت یا معصوم بچہ، جس میں زندگی کی رمق تھی وہ ہدف جور و ستم بنا، یہاں تک کہ قتل کرتے کرتے ہاتھ تھک گئے، لوٹتے لوٹتے، ہمیانیاں بھر گئیں، جیب و دامن میں جگہ نہ رہی، جو گداگر بے نوا تھے، وہ غنی اور دریادل بن گئے۔

پھر دوسرا، دور وہ تھا، جسے بجا طور پر ہم اعتراف گناہ، احساس ندامت، اور احتجاج و برہمی سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور یہ اعتراف گناہ وہی لوگ کر رہے تھے، جن کی تلواروں سے خون ٹپک رہا تھا، احساس ندامت ان پر طاری تھا، جو خون ناحق کے مرتکب ہو چکے تھے، احتجاج و برہمی کا مظاہرہ ان لوگوں کی طرف سے ہو رہا تھا، جن کے ہم قوموں نے، خون کے دریا بہائے تھے، کٹی ہوئی گردنوں کے منارے کھڑے کئے تھے، آبادیوں کو بن، شہروں کو ویرانہ، اور شاندار عمارتوں کو کھنڈر بنا دیا تھا،——!

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا،

بہر حال تاریخ غدر کا یہ ایک دلچسپ باب ہے۔

ذیل میں ہم چند شہادتیں، اور دستاویزی ثبوت پیش کرتے ہیں، جو اس حقیقت کے شاہد

ہیں کہ

ع جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(۱)

لال قلعہ فوجی بورڈنگ بن گیا

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد، انگریزوں نے قلعہ کی عمارتوں کو توڑ پھوڑ کر اپنی ضروریات کے مناسب حال بنالیا، قلعہ کی چار دیواری کے اندر اب جا بجا دو منزلہ بارکیں بن گئیں ہیں، لاہوری دروازہ، دلّی دروازہ نقار خانہ، اسد برج اور شاہ برج کی عمارتوں میں اب گورے رہتے ہیں،

مسٹر فرگوسن نے اپنی بیش بہا تصنیف میں قلعہ کو فوجی دارالاقامہ بنانے پر بہت کچھ برا شفتگی کا اظہار کیا ہے، انہوں نے عہدہ داران فوج کے شاہی عمارات کو منہدم کر ڈالنے کے عذر کو بالکل تسلیم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے اس خیال کی بھی تضحیک کی ہے کہ دلّی کی گھٹی ہوئی اور تھتی آبادی کی نسبت یہ واہمہ کہ وہ کبھی سر نہ اٹھا بیٹھے، ایک ایسی بات قرار دیا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی، ؛" (۱)

(۲)

دلّی کے ایک لاکھ مکان مسمار کیے گئے

ذیل کا بیان، ایک ایسے مسلمان مشاہد کا ہے، جو دل وجان سے انگریزوں

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم (بشیر الدین احمد)

کا وفادار تھا، اس کی وفاداری غدر کے دوران میں بھی قائم رہی، یعنی اس نے مغلوب اور مغرور انگریزوں کی مدد کی، غدر کے بعد بھی، اس کی وفاداری کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا، اس نے، ان کی تائید و حمایت میں ایک پوری کتاب لکھ ڈالی، لیکن واقعات کو کہاں تک چھپاتا؟ چنانچہ اعتراف کرتا ہے:—

کیا دہلی کے انگریز افسروں کو یہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ کہ بے گناہ اور شریف عورتیں جن میں جوان بھی ہیں اور بوڑھی بھی ہیں۔ اور ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی ہیں دہلی کے باہر جنگلوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانا ہے نہ کپڑا ہے۔ اور نہ رات کو سونے اور دن کو دھوپ سے بچنے کا کوئی ٹھکانہ ہے۔

دہلی کے افسروں نے ان کو ان کے گھروں سے اس لیے نکال دیا ہے کہ مال واسباب جمع کیا جا سکے۔

دہلی کے ایک لاکھ مکان مسمار ہو کر کھنڈر بن گئے ہیں۔ اور یہ آباد شہر ایسا ویران ہوا ہے کہ دیکھنے سے رونا آتا ہے۔ (۱)

(۳)

بیویوں کو شوہروں نے قتل کر کے خودکشی کرلی

میں نے دہلی کے گنام بازاروں میں بسر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیونکہ کل ایک ایسا دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایک افسر بیس سپاہی لے کر شہر

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ ص۳۳

کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ہمراہ ہو لیا راستے میں ہم نے ۱۴ عورتوں کی نعشوں کو شالوں میں پٹے ہوئے بازاروں میں پڑا پایا جن کے سر دھڑوں سے اُنکے خاوندوں نے جدا کیے تھے چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ اگر انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ اُن کی عصمت دری کریں گے اس لیے بحالات موجودہ ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب خیال کیا گیا جس کے بعد انہوں نے خود بھی خودکشی کر لی چنانچہ ہم نے اُن کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا[1]

"نادر شاہ کی تاریخی لوٹ اور قتل عام کے بعد جبکہ اس نے چاندنی چوک کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا ایسا دردناک نظارہ آج سے پہلے شاہجہان کے دارالخلافہ نے کبھی نہیں دیکھا[2]

(۴)

بے گناہوں کو پھانسی

انگریز فوجوں نے راستے میں سینکڑوں میل تک سڑک کے دونوں طرف دیہاتوں کو بے دریغ قتل و غارت سے برباد کر کے ملک کو صحرا کی طرح ویران و سنسان بنا دیا دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزارہا شہری پھانسی کے تختہ پر لٹکائے گئے حالانکہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا[3]

---

1. Times, Letters Dated 18.11.57 Montgomery martin
2. Times 16.11.57
3. Romesh Chander Dutt. India in the Victorian age P. 224

(۵)
یہ بھی سُنئیے

"نصرت نامہ گورنمنٹ"، کا مصنف، انگریزوں کی تعریف و توصیف کا حق کرنے کے بعد بھی یہ سمجھتا ہے کہ :-

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن، دلّی کی بربادیاں، اور اہلِ دلّی کی تباہیاں اسے یہ کہنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں :-

۲۴ فروری ۱۸۵۸ء کو بدھ کے روز لارنس صاحب چیف کمشنر پنجاب دہلی میں داخل ہوتے۔ جو لوگ شبہ میں گرفتار تھے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ حقیقتہً دہلی کی فتح میں اُنہوں نے کافی حصہ لیا اور رسد و خزانہ اور فوج وغیرہ سے بہت امداد کی۔ اگر یہ امداد نہ کرتے تو گوروں کی قلیل فوج سے دہلی کا فتح کرنا نہایت دشوار تھا۔ ان کی ان خدمات کے صلہ میں کمپنی نے دہلی کو حکومت پنجاب کے ماتحت کر کے صاحب موصوف کو لفٹنٹ گورنر کر دیا صاحب موصوف کے تشریف لانے کے تین دن بعد دہلی میں دربار عام منعقد کیا گیا اور تمام مظلوموں اور دردمندوں نے اپنی عرضیاں پیش کیں۔ صاحب موصوف نے نہایت مہربانی سے لوگوں کی عرضیاں لے کر اہل کاروں اور منشیوں کے سپرد کر دیں۔ اس کے بعد مقدمات کی سماعت کے لیے۔ ایک عدالت مقرر ہوئی۔ جس میں چار انگریز تھے۔ چونکہ اس سے پیشتر ایسا ہو چکا تھا۔ کہ مخبروں کی مخبری پر سینکڑوں بے گناہوں کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ اس وجہ سے اب یہ طے ہوا کہ جب تک چاروں حاکم فیصلہ پر متفق نہ ہوں سزا نہ دی جائے۔ اس دن سے سوائے مجرموں کے کسی کو سزا نہ دی گئی۔ اور سینکڑوں بے گناہ قیدی چھوڑ دیے گئے۔

صاحب موصوف ابھی دہلی کا انتظام نہ کرنے پائے تھے۔ کہ پنجاب کے بلوے کی خبر پہنچی اور صاحب ممدوح ۱۸۵۸ء مارچ کے آخر میں وہاں کے انتظام کے لیے سانڈرس صاحب اور حکیم

احسن اللہ خان کو لیکر چلے گئے، ساونڈرس کرنال سے واپس آگئے۔ اور حکیم صاحب پانی پت میں مجرموں کی شناخت کر کے واپس آگئے۔ اور جو کام ان کے سپرد تھا اس میں مصروف ہو گئے۔ جان مٹکاف صاحب بیمار ہو کر چھ ماہ کی رخصت پر ولایت چلے گئے۔ ان کی جگہ مرفی صاحب مقرر ہوئے۔ یہ چاروں صاحب شہر کا بہت اچھا انتظام کرتے ہیں اب تک لوگ شہر کے باہر پڑے ہوئے ہیں اور ہزاروں نے دیہات اور قصبات میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ الغرض ان فلک کے ستائے ہوئے لوگوں نے جو نہ دیکھا تھا وہ دیکھا۔ اور جو کبھی نہ سنا تھا وہ اب سنا۔ کیا مصیبتیں تھیں جو دہلی کے رہنے والوں کو نہ اٹھانی پڑیں۔ گھر ویران ہو گئے۔ سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ جیسی بربادی دہلی کی ہوئی اور جیسی رعایا یہاں کی بے گھری اور بے دری ہوئی ہے۔ کہیں کی نہ ہوئی ہوگی اور جو مظالم دہلی کی فتح کے بعد دہلی میں ہوتے ایسے کہیں نہ ہوئے ہوں گے۔ (۱)

(۶)

وزیر اعظم انگلستان کے آنسو

ڈزرالی (Desraeli) وزیر اعظم انگلستان نے پہلی دفعہ اس دردناک واقعہ کے متعلق جرأت کے ساتھ اظہار خیال کیا اور اُس وقت جبکہ وحشیانہ جذبات کی نمائش خوب دل کھول کر ہو رہی تھی مسٹر موصوف نے ذیل کے الفاظ میں اپنی بیزاری اور ناپسندیگی کا اعلان کیا جو کسی غیر ملکی قوم کے افعال کے خلاف نکتہ چینی نہیں تھی بلکہ اپنی ہی قوم کی دیوانگی اور بربریت کے خلاف آواز تھی۔

"جنگ کی تباہ کاریاں کسی تحریک کی شرمندہ نہیں ہوا کرتیں چنانچہ جو تباہی اور بربادی اس

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ

(۵)
یہ بھی سُنئیے

"نصرت نامہ گورنمنٹ" کا مصنف، انگریزوں کی تعریف و توصیف کا حق کرنے کے بعد بھی یہ سمجھتا ہے کہ :-

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن، دلّی کی بربادیاں، اور اہلِ دلّی کی تباہیاں اسے یہ کہنے پر بھی مجبور کر دیتی ہیں :-

۲۴ر فروری ۱۸۵۸ء کو بدھ کے روز لارنس صاحب چیف کمشنر پنجاب دہلی میں داخل ہوئے۔ جو لوگ شبہ میں گرفتار تھے ان کو چھوڑ دیا گیا۔ حقیقۃً دہلی کی فتح میں انہوں نے کافی حصہ لیا اور رسد و خزانہ اور فوج وغیرہ سے بہت امداد کی۔ اگر یہ امداد نہ کرتے تو گوروں کی قلیل فوج سے دہلی کا فتح کرنا نہایت دشوار تھا۔ ان کی ان خدمات کے صلہ میں کمپنی نے دہلی کو حکومت پنجاب کے ماتحت کر کے صاحب موصوف کو لفٹنٹ گورنر کر دیا صاحب موصوف کے تشریف لانے کے تین دن بعد دہلی میں دربار عام منعقد کیا گیا اور تمام مظلوموں اور دردمندوں نے اپنی عرضیاں پیش کیں۔ صاحب موصوف نے نہایت مہربانی سے لوگوں کی عرضیاں لے کر اہل کاروں اور منشیوں کے سپرد کر دیں۔ اس کے بعد مقدمات کی سماعت کے لیے۔ ایک عدالت مقرر ہوئی۔ جس میں چار انگریز تھے۔ چونکہ اس سے پیشتر ایسا ہو چکا تھا۔ کہ مخبروں کی مخبری پر سینکڑوں بے گناہوں کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ اس وجہ سے اب یہ طے ہوا کہ جب تک چاروں حاکم فیصلہ پر متفق نہ ہوں سزا نہ دی جائے۔ اس دن سے سوائے مجرموں کے کسی کو سزا نہ دی گئی۔ اور سینکڑوں بے گناہ قیدی چھوڑ دیے گئے۔

صاحب موصوف ابھی دہلی کا انتظام نہ کرنے پائے تھے۔ کہ پنجاب کے بلوے کی خبر پہنچی اور صاحب ممدوح ۱۸۵۸ء مارچ کے آخر میں وہاں کے انتظام کے لیے سانڈرس صاحب اور حکیم

احسن اللہ خان کو لیکر چلے گئے، سانڈرس کرنال سے واپس آ گئے۔ اور حکیم صاحب پانی پت میں مجرموں کی شناخت کر کے واپس آ گئے۔ اور جو کام ان کے سپرد تھا اس میں معروف ہو گئے۔ جان مٹکاف صاحب بیمار ہو کر چھ ماہ کی رخصت پر ولایت چلے گئے۔ ان کی جگہ مرفی صاحب مقرر ہوئے۔ یہ چاروں صاحب شہر کا بہت اچھا انتظام کر رہے ہیں اب تک لوگ شہر کے باہر پڑے ہوئے ہیں اور ہزاروں نے دیہات اور قصبات میں سکونت اختیار کر لی ہے۔ الغرض ان فلک کے ستائے ہوئے لوگوں نے جو نہ دیکھا تھا وہ دیکھا۔ اور جو کبھی نہ سنا تھا وہ اب سنا۔ کیا مصیبتیں تھیں جو دہلی کے رہنے والوں کو نہ اٹھانی پڑیں۔ گھر ویران ہو گئے۔ سینکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ جیسی بربادی دہلی کی ہوئی اور جیسی رعایا یہاں کی بے گھری اور بے دری ہوئی ہے۔ کہیں کی نہ ہوئی ہو گی اور جو مظالم دہلی کی فتح کے بعد دہلی میں ہوئے ایسے کہیں نہ ہوئے ہوں گے۔ (۱)

(۶)

وزیر اعظم انگلستان کے آنسو

ڈزرائیلی (Desraeli) وزیر اعظم انگلستان نے پہلی دفعہ اس دردناک واقعہ کے متعلق جرأت کے ساتھ اظہار خیال کیا اور اس وقت جبکہ وحشیانہ جذبات کی نمائش خوب دل کھول کر ہو رہی تھی مسٹر موصوف نے ذیل کے الفاظ میں اپنی بیزاری اور ناپسندیگی کا اعلان کیا جو کسی غیر ملکی قوم کے افعال کے خلاف نکتہ چینی نہیں تھی بلکہ اپنی ہی قوم کی دیوانگی اور بربریت کے خلاف آواز تھی۔

"جنگ کی تباہ کاریاں کسی تحریک کی شرمندہ نہیں ہوا کرتیں چنانچہ جو تباہی اور بربادی اس

---

(۱) نصرت نامہ گورنمنٹ صفحہ

وقت ہندوستان میں رونما ہو رہی ہے اُس کے لیے کسی ترغیب کی ضرورت نہیں مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ ہماری برّی اور بحری فوجیں ایسا شدید انتقام لے رہی ہیں جس کو دیکھنے کی تاب بھی کوئی انسان مشکل سے لا سکے گا۔ مگر جہاں تک میری عاجزانہ رائے کا تعلق ہے میں بلا توقف اس پالیسی سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک تمام ذمّہ دار افسران کا یہ فیصلہ نہایت ہی مکروہ ہے کہ آئندہ کے لیے انگلستان اپنے معاملات اور مناقشات کے تصفیہ کے وقت انصاف سے آنکھیں بند کر کے انتقام کو ہی اپنا اصول قرار دے دے میں ایک منٹ کے لیے اس اصول کو پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ آئندہ سے ایک انگریز بھی نانا صاحب جیسا ظالم و سفّاک کہلایا جائے میرے نزدیک یہ نہایت ہی ناپسندیدہ پالیسی ہے کہ ظلم کے مقابلے میں ویسا ہی ظلم روا رکھا جائے۔ کچھ عرصہ سے ایسی ہولناک اطلاعات سننے میں آئی ہیں۔ جن سے میں مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ غالباً اس زمانہ میں میری قوم کے مذہبی معتقدات میں زبردست تبدیلی واقع ہو گئی ہے یعنی میری قوم اب جناب مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے منحرف ہو رہی ہے اور اس کے بجائے پرانے یونانی دیوتا مولوک (Molock) (قتل و غارت کا دیوتا) کی پرستش کی رسم کو از سرِ نو زندہ کرنے والی ہے۔ (۱)

(۷)

احسان کا بدلہ بربریت

غدر کے اعلان بعد سپاہیوں نے ہر اُس انگریز کو جو اُن کے ہتھے چڑھا بے دریغ قتل کیا یعنی مشکل سے کوئی ایسا خاص واقعہ نظر آتے جہاں کوئی خوش قسمت انگریز باغی سپاہی کے ہاتھ سے بچ

---

(1) Life by Buckle IV P. 98.99 Speech at Newport pagnel 30.9.1957

نکلا ہو اس کے مقابلہ میں سول رعایا نے عام طور پر ہمارے آدمیوں کو پناہ دی اور اپنے آپ کو جوکھم میں ڈال کر انگریزوں کی جان بچانے میں مدد کی[۱] شاید ہی کوئی ایک آدھ ایسا واقعہ ملے جہاں سول رعایا کے ہاتھوں کوئی انگریز قتل کیا گیا ہو۔[۲]

(۸)

بادشاہ ۔ جیسے جنگل میں شیر

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم بھی ان لوگوں میں تھے، جو غیر مشروط طور پر انگریزوں کے حامی و معتقد تھے، لیکن اپنی ایک کتاب میں، حقیقت کو افسانہ کے طور پر بیان کرتے ہوئے ایک انگریز مسٹر نوبل کی زبان سے فرماتے ہیں: ـــــ

"لوگوں کو، کیا رعایا، کیا فوج سرکاری ضوابط و قواعد سے بھی کسی قدر نارضامندی ضرور تھی۔ اور سرکاری عہدے داروں نے اس نارضامندی کی مطلق پروا نہیں کی۔ اور ہزار ہا باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ سرکار نے صرف بزور شمشیر اپنی حکومت قاہرہ کو ہٹانا چاہا، اور سلطنت مطمئنہ کی شرط ضروری ہے، خوشنودی رعایا ہے۔ افسوس ہے کہ تمام تر نہیں تو اس کا بڑا حصہ فوت ہوا، اور گورمنٹ کا منشا پاکر، عہدہ داران سرکار نے بھی استمالت قلوب خلائق کی طرف ذرا توجہ نہ کی۔ بادشاہ ہے، مگر اسی طرح کا بادشاہ جیسے جنگل میں شیر۔"[۳]

---

(۱) Memories of my Indian Career, I. P. 233

(۲) انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ۔ ص ۱۳۲

(۳) ابن الوقت (ڈپٹی نذیر احمد) ص ۳۳

(۹)

بدمعاش مسلمان جان لیں کہ ....

لفٹننٹ رابرٹس ROBERTS جو بعد میں قندھار کے لارڈ رابرٹس کی حیثیت سے مشہور ہوا ، پشاور کی پھانسیوں کے بعد اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں اس واقعہ پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" ہم پشاور سے جہلم پا پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ " کام " بھی کرتے چلے آئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکایا چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے اکثر استعمال کیا ہے اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی یہ طریقہ سزا اگرچہ نہایت ہی دلخراش منظر ہے لیکن یہ حالات موجودہ اس کے سوا چارہ نہیں فوجی عدالت کے حکم سے فی الفور سر قلم کر دیئے جاتے ہیں اور یہی پالیسی اس وقت ہر چھاؤنی میں لائی جاتی ہے ۔ [۱]

لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس " کام " کا مقصد یہ ہے کہ

ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے ۔ [۲]

---

۱ Letters written during Indian Mutiny June 1857

۲ Letters written 31st December 1857

(۱۰)

توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا

یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسیحی انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ چالیس[۱] انسانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا جائے چنانچہ ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کے دن چالیس[۲] بدقسمت انسانوں کو ممکن سے ممکن اذیت پہنچا کر نہایت ہولناک طریقہ سے منظر عام میں توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ یہاں پر یہ امر خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ نہ تو سر ہربرٹ ایڈورڈز (Sir HERBERT EDWARDS) نے پشاور کی سرکاری رپورٹ میں اور نہ سر سڈنی کاٹن (Sir Sidney Cotton) نے اپنی مطبوعہ سرگذشت میں اس دردناک سزا کی پبلک نمائش کا کوئی ذکر کیا ہے جب ان بہادر انسانوں نے اس رنجدہ واقع کے بیان سے جھجک کی ہے اور اخفا کو ترجیح دی ہے تو میں بھی اس کی مزید تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھتا لیکن جہاں تک اس واقع کی تفصیل اور جزئیات کا تعلق ہے وہ نہایت ہی درد انگیز اور ہولناک ہیں۔ اور اس وقت بھی اُس زمانہ کی دستاویزات کی شکل میں میرے پاس محفوظ ہیں۔[۲]

(۱۱)

سر اُڑ کر راہرو پر گرا

مثال کے لیے ہم ایک پادری صاحب کی بیوہ کی ایک تحریر کی کھینچی ہوئی تصویر پیش کرتے ہیں۔

---

۱ Kaye Book VI Chapter IV

۲ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۶۱

"لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے جس کے ساتھ ہی ایک ناقابل بیان دھیمی مگر وحشتناک چیخ بھی سنائی دی دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا، تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آئی۔" لے

آگے چل کر مرقوم ہے:—

آخر کب تک ہم بنی نوع انسان کو اس دلخراش طریق پر گرم سلاخوں پر سکڑتے اور بھنتے دیکھنے کی اذیت برداشت کرتے رہیں گے۔

(۱۲)

وفادار سکھوں کو کیا صلہ ملا؟

کوپر Cooper ڈپٹی کمشنر امرت سر غدر کے شروع ایام میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے جس پر کہ اس نے خود بھی سختی سے عمل کیا تھا فخریہ طور پر اس طرح بیان کرتا ہے کہ پنجاب کے حکام نے

لے Miss Coopland's escape from Gawalior P. 233

لے انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ص ۵۸

اس اصول پر عمل کیا کہ انتقام کا تصور بھی فریق مخالف کو لرزہ براندام کردے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"مسٹر مونٹ گومری (Montgomery) کے حکم سے پنجاب میں جہاں عام طور پر لوگ ابھی تک وفادار ہیں ایک سکھ پلٹن کے صوبہ دار سوار پولیس کے رسالدار اور ایک داروغہ جیل کو "فرض کی کوتاہی" کے الزام میں پھانسی پر لٹکانا ضروری سمجھا گیا اس سے یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو بخوبی ذہن نشین ہو جائے کہ پنجاب کے حکام بہرحال ابتدا ہی میں "بلا توقف" "متشددانہ" کارروائی کرنے کی پالیسی سے لوگوں کے دلوں میں اپنا رعب قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ صرف یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک میں وقار قائم رکھا جا سکتا ہے دوسری طرف سخت پالیسی کا مقصد یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ حکومت رعایا سے غیر مشروط اور غیر مبہم وفاداری کی متوقع ہے[1]

(۱۳)

مسلمانوں کا برہنہ جسم گرم سلاخوں سے داغا گیا

جن اذیتوں کو دینے کی آرزو کا اظہار نکلسن (NICHOLSON) نے نہایت بے چینی سے کیا تھا ان کے پورے ہونے میں کچھ زیادہ عرصہ انتظار نہ کرنا پڑا مسٹر موبری تھامسن[2] (MOBERY THOMPSON) نے بعض قیدیوں کی دردناک سرگذشت جن کو اس نے خود قید کیا تھا سر ہنری کاٹن (Henry Cotton) کو ذیل کے الفاظ میں سنائی ۔

"شام کے وقت ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کر کے پوچھنے لگا آپ غالباً یہ دیکھنا

---

[1] The Crisis in the Punjab P. 151, 152

[2] Cotton, Indian Home Memories P. 143

پسند کریں گے کہ ہم نے قیدیوں کیسا تو کیا سلوک کیا ہے یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کی گئی ہو میں فوراً لیک کرزن کے خیمے میں گیا جہاں پر میں نے اُن بد بخت مسلمانوں کو عالم نزع میں بے حال دیکھا یعنی مشکیں باندھ کر برہنہ اُن کو زمین پر لٹایا گیا اور سر سے پاؤں تک جسم کو گرم سلاخوں سے داغ دیا تھا اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے ان کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں مناسب سمجھا۔ سرہنری کاٹن نے جب حیران ہوکر یہ سوال کیا کہ اس کے بعد کیا کیا گیا تو جواب یہ ملا کہ کچھ بھی نہیں[1]

کچھ کیوں نہیں کیا گیا اس کا جواب ملاحظہ ہو:—

یہاں پر یہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں کچھ کہا جاتا ہے کسی واقعہ کو زیادہ عرصہ تک حافظہ میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت مشرقی دماغ کو فطرتاً زیادہ نصیب ہوئی ہے حالانکہ انگریزوں کا حافظہ اس کے مقابلہ میں اتنا تیز نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ۶۰ سال پہلے کی پھانسیوں یا گولیوں کے ذریعہ ہلاکت کے واقعات کو سامنے رکھے ہوئے ہیں۔

(۱۴)

سکھوں نے مسلمانوں سے انتقام لیا

لیکن ان سے بھی زیادہ حیرت و استعجاب سکھ قوم کی قوت یادداشت پر ہوتی ہے جن کے

کے بک[1]

ہر ایک سپاہی کو سزا دیتے وقت بغیر کسی قسم کی تحقیقات کرنے کے فرض کر لیا جاتا تھا کہ اس نے انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے

انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رُخ صفحہ ۵۹ [2]

اباؤ اجداد کو شاہانِ مغلیہ کے ہاتھوں دردناک مظالم سے جان دیے ہوئے اگرچہ ڈیڑھ سو سال کا زمانہ گذر چکا ہے لیکن اُن کی تلخ یاد ابھی تک اُن کے سینہ میں تازہ ہے جس کا پورا انتقام اُنہوں نے غدر میں لیا ہے۔ یعنی وہ نہایت وحشیانہ مسرت کے ساتھ غدر کے ہنگامے میں دہلی کے برخلاف اپنا بدلہ لینے کے لیے ہمارے مددگار کے طور پر شریک ہوئے چنانچہ ایک عینی شاہد بیان کرتا ہے کہ کس طرح سکھوں اور انگریزوں نے ایک مسلمان قیدی کے چہرہ کو بار بار سنگینوں سے زخمی کر کے زندہ ہلکی آگ میں جلایا۔

"بدنصیب قیدی کے جلتے ہوئے گوشت سے مکروہ بو نکل کر آس پاس کی فضا کو مسموم بنا رہی تھی انیسویں صدی میں جبکہ تہذیب اور شائستگی پر ناز کیا جاتا تھا ایک ایسا دردناک نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک انسان نہایت وحشیانہ طریق سے زندہ آگ میں جلایا جا رہا ہے اور سکھ اور یورپین نہایت اطمینان اور متانت سے چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر ارد گرد کھڑے دیکھ رہے ہیں گویا وہ ایک تفریح کا سامان تھا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خواہ بدقسمت قیدی کے مفروضہ جرائم کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں پھر موجودہ سفاکانہ اور دردناک سزا کے بھگتنے کے بعد یقیناً اس نے اپنے گناہوں کی قرار واقعی پاداش اٹھائی ہے"۔[۱]

ٹائمز آف انڈیا اخبار کے فوجی نامہ نگار مسٹر رسل RUSSEL نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے کہ:۔

چند دنوں بعد میں نے اُس شخص کی جلی ہوئی ہڈیوں کو اسی میدان میں پڑا ہوا پایا۔[۲]

۱؎ LFF Majendie up among the pandies, P. 18

۲؎ My diary in India in the year 1858, 1859, P. 301, 302

(۱۵)

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سیا گیا

پہلی آواز جس نے دنیا کو ان وحشیانہ مظالم سے روشناس کر کے روکنے کی کوشش کی وہ ٹائمس آف انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر ڈی لین (Delean) کی تھی جو آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک آرٹیکل میں اس نے لکھا:۔

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے اُن کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دُنیا کی کوئی تہذیب بھی کبھی اجازت نہیں دیتی ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہے جس کا کفارہ یقیناً ہمیں ایک دن ادا کرنا پڑے گا اس قسم کی جسمانی اور دماغی سزائیں دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جراءت کر سکتے ہیں۔ لہ ؎

(۱۶)

جرائم کا اجمالی خاکہ

انڈین سول سروس کے ایک ممتاز انگریز رکن مسٹر ھنٹر نے، اُن جرائم کا اجمالی خاکہ ذیل کی

لہ Russel diary, ii P. 43 (May 1858).

؎ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ صفحہ ۶۵

سطروں میں پیش کیا ہے۔ جن کا ارتکاب انگریزوں نے مسلمانوں پر کیا :۔

"اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے۔ کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر عائد کیے گئے ہوں وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں۔ کہ ہم نے ایک ایسا طریقہ تعلیم رائج کر دیا ہے۔ جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اور جو ان کی ذلت وخواری کا سبب بن گیا ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارہا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے یہ قاضی نکاح کے لیے مذہبی اجازت دیتے تھے۔ اور ان کا کام زمانہ قدیم ہی سے اسلام کے متبرک قوانین کی نگہداشت اور نفاذ عمل میں لانا تھا۔ ان کو شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لیے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیا۔ ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی اوقاف میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے ان کے سب سے بڑی تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق ان کو یقین ہے۔ بآسانی ثابت کیے جا سکتے ہیں۔ اور بھی بہت سی شکایات ہیں۔ جو جذبات پر مبنی ہیں۔ اور شاید انگریزوں کے قصور سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں مگر آئرلینڈ کی طرح ہندوستان میں بھی یہ شکایتیں مسلمانوں کو حاکموں سے بدظن رکھتی ہیں۔ وہ علی الاعلان کہتے ہیں۔ کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا۔ تو مسلمانوں کے ملازم کی حیثیت سے لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پروا نہیں کی۔ اور نو دولت طبقہ کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم جذبات شرافت سے معرا اور سرمایہ ہیں کمینوں کی طرح بددیانتی سے کام لینے والے اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے مرتکب ٹھہراتے ہیں۔" (۱)

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۱۶ – ۲۱۸

باب ۴۹

اشک و آہ

۱۸۵۷ء کے غدر کا نتیجہ صرف یہ نہیں نکلا کہ ایک شہر جس کا نام دلی تھا، مٹ گیا، واقعہ اگر صرف اتنا ہوتا تو گو بجائے خود افسوس ناک ہوتا لیکن اتنا غم انگیز نہ ہوتا کہ فریاد و شیون اور آہ و فغاں سے آسمان سر پر اٹھا لیا جاتا۔ لیکن دلی کے ساتھ ساتھ ایک قوم بھی تباہ ہوئی۔ ایک تہذیب بھی برباد ہوئی۔ ایک ثقافت نے بھی موت کی ہچکیاں لیں۔ وہ روایات بھی مٹ گئے جو صدیوں کے میل جول شکست و ریخت اور اتحاد و ائتلاف سے عالم وجود میں آئے تھے۔ وہ تمدن بھی فنا کے گھاٹ اتر گیا۔ جو کسی ایک قوم کی میراث نہ تھا بلکہ دنیا کی دو عظیم قوموں کا مشترک سرمایہ تھا اور ناقابل تقسیم۔

شاعر سے بڑھ کر حساس کوئی نہیں ہوتا، وہ عالم خیال میں بھی کسی کا دکھ درد برداشت نہیں کر سکتا وہ معمولی معمولی باتوں سے اثر پذیر ہوتا ہے، وہ مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھتا ہے، اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے، وہ ننھی ننھی کلیوں کو مسلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے لبوں سے آہ و فغاں کی تراوش شروع ہو جاتی ہے وہ بلبل کے دردناک نغمہ کو اس کی فریاد، کوئل کی درد بھری آواز کو اس کا نالہ سمجھتا ہے اور خود سراپا شیون بن جاتا ہے پھر جس بدبخت شاعر نے اپنی آنکھوں سے عظیم المرتبت اور فلک شکوہ عمارتوں کو کھنڈر ہوتے دیکھا ہو جس نے آباد، بارونق اور بھرے پرے محلوں کو خاک میں ملتا اور مٹتا دیکھا ہو جس نے بے قصور بچوں کو، جوانوں کو، بوڑھوں کو پھانسی پاتے، گولی کھاتے، اور خاک و خون میں لتھڑے دیکھا ہو، جس نے عصمت مآب پردہ نشین اور سراپا عفت خواتین اور دوشیزاؤں کو بے بسی اور بے کسی کے عالم میں پریشان حال پریشان مو آشفتہ حال، برگشتہ بخت پھٹے ہوئے لباس میں بھاگتے، دوڑتے، دریا میں کودتے، کنوؤں میں چھلانگتے زہر کھاتے خودکشی

کرتے دیکھا ہو جس نے شاہزادوں کو شاہزادیوں کو بیگمات شاہی کو، خود ظل اللہ کو مرتے قتل ہوتے سزا پاتے اور جلاوطن ہوتے دیکھا ہو، اس کے قلب ناتواں پر کیا کچھ نہ بیت گئی ہوگی، دلی کی معمولی سی شورش اور تباہ کاری نے میر کو میر بنا دیا۔ پھر دلی اور دلی والوں کی تباہی اور برگشتہ بختی دیکھنے والے شاعر کیا کچھ نہ بن گئے ہوں گے؟ ان کے تاثرات اور احساسات کا کیا عالم ہوگا کیونکر ممکن تھا کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ دہکتا ہوا انگارہ نہ بن جاتے۔

غدر کے فوراً بعد دلی کے شعرا نے دلی کے حال زار پر آنسو بہائے انھیں مجموعہ کی صورت میں غالب کے شاگرد منشی تفضل حسین کوکب نے "فغانِ دہلی" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں شائع کیا تھا۔ ذیل کی نظمیں اور غزلیں اس سے ماخوذ ہیں۔

(۱) میں نے بے دردی کے ساتھ انتخاب کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ مختصر کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) عنوانات میں نے قائم کئے ہیں۔

(۳) شاعر پر جو تبصرہ کوکب نے کیا ہے اسے میں نے خلاصۃً نظم یا غزل سے پہلے درج کر دیا ہے، اس کی زبان فارسی ہے اور میں نے ایسی ہی رہنے دی ہے۔

اب آپ تصور کیجیے ایک محفل کا جس میں وقت کے شاعر اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

دِلّی کا مَرثیہ

صدرالدین خان آزردہ

ما از نتائج افکار عمدۃ العلماء زبدۃ الفضلا مولوی صدر الدین خان بہادر متخلص بہ آزردہ کہ شاعری مرثیہ اوست، از اکابر این شہر لطافت بحر است بارب این برگزیدہ روزگار کہ باعث رونق دہلی است، عمر جاودانی یابد و بر خضر و مسیحا رشک افزاید:

(۱)

آفت اس شہر پہ قلعہ کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جس کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل دنیا اہل سے خلطہ انھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقف اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشان در در

تیموری چراغ کی آخری
روشنی۔ جسکے بعد وہ
ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔

بہادر شاہ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہیں

خاک بھی ملتی نہیں اُن کو جو ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
گاچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتی ہیں
دو قدم چلتی ہیں مشکل سے تو پھر گرتی ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتی تو کیا گھبراتی
شام سے صبح تلک نیند نہ اُس کو آتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی

اُن کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوش پہ ستارہ نہ چلتے دیکھا
صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا
پاؤں دلبے پہ بھی کروٹ ہی بدلتے دیکھا

وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور ویرانے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

روک سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے
صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھی لڑتے تھے

پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے
آنچلوں سے زرِ مقیش پڑے جھڑتے تھے

ان کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطرِ صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے
کنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
بیٹھ خلوت میں وہ زلفوں کو بنایا کرتے
وہ سنگار آئینہ کو بھی نہ دکھلایا کرتے

اب نہیں کچھ بھی انھیں زلف پریشاں کی خبر
نہ گریبان کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں
بیٹھنا ناز و ادا سے وہ دوکانوں کا کہاں
شور ہر کوچے سے پٹوں کی وہ تانوں کا کہاں
لطف ساقی کا مزہ اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اس کو نہ پھر دکھلائے
ان کی پوشاک کو دیکھیں تو پھریری آئے
نظر آ جائیں اگر وہ سپرا ہے گا ہے
خون اپنا کریں یا ان کا یہی جی چاہے
جن کے ہاتھوں سے نہ لیں بیر بھی دو کوڑی کے

چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وُہ اجلے گہلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے
مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آرزوہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جُرم جو صہبائی ہو

یادِ دلّی

تشنہ دہلوی

تصنیفِ تشنہ، مردِ آزاد وضع است و آزادانہ بسر می برد، از شاگردان شیخ محمد ابراہیم ذوق است، نامش محمد علی است، فکرِ رسامی دارد۔

(۲۱)

عجیب کوچۂ رشکِ جناں تھا دہلی کا
بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا
خطابِ خطۂ ہندوستاں تھا دہلی کا

غضب ہے اس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

یہاں کی خاک میں کیفیت ابرِ باراں کی
یہاں کے آب میں تاثیر آبِ حیواں کی
یہاں کی بادِ بہاری ہوا زمستاں کی
یہاں کی آگ میں گرمی تھی شعلہ رویاں کی

ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا
مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا

وہ تختِ سلطنت و بارگاہِ سلطانی

کہ جس میں بیٹھتے تھے آ کے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی
بجا اس اوج پہ تھا دعوے سیمانی —

ہر ایک قصر کو دعوے تھا طاق کسریٰ کا
داغ عرش پہ تھا قلعہ معلّےٰ کا

کبھی زمانے میں ایسا تھا یاں کا تخت نشین
خراج دیتے تھے سب بادشاہِ روئے زمین
خطا و ملکِ ختن سب تھے اس کے زیرِ نگین
تمام کانپتے تھے اس سے چین اور ماچین

دیارِ ہند تھا مشہورِ خلق نام اس کا
چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اس کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ
کہ اس سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ
رعیت اس کی ہوئی اس سے بھی زیادہ تباہ

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا
مثل ہے بھڑکوں نے تنگوں کو آ کے لوٹ لیا

یہاں جو آن کی دیکھی تو دار کی صورت
وہ دار کیجئے جیسے ذو الفقار کی صورت
مثادی چشم زدن میں ہزار کی صورت
نظر پڑی نہ کی بے قرار کی صورت

برنگ تیر شہاب آگ میں جلے لاکھوں

سپردِ دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں

مکاں کو آ کے جو دیکھا تو لامکاں ہے وہ
جہاں نہ چند بھی بیٹھے اب آشیاں ہے وہ
جو شہر یار کو پوچھا کہو کہاں ہے وہ
تو یہ سنا کر کھنڈر دیکھ لو نشاں ہے وہ

نہ اہل شہر رہے اور نہ شہریار رہا
رہا تو نام ہی خالق کا برقرار رہا

کوئی فقیر جو کوڑی دوکان مانگے ہے
تو اس کو کہتے ہیں کیا تو ہر آن مانگے ہے
تری طرح سے یہاں سب جہان مانگے ہے
چل اپنی راہ لے کیا ہم سے دان مانگے ہے

جو مال بڑھتا ہی جاتا تھا گھٹ گیا بالکل
دوکانداروں کا طبقہ الٹ گیا بالکل

شہر آشوب

نواب مرزا صاحب داغ دہلوی

"نواب میرزا صاحب دہلوی متخلص بہ داغ جوان خوش فکر است زانوئے تلمذ بخدمت شیخ محمد ابراہیم ذوق تہ کردہ، و در ریختہ گویان طبع معنی یاب می دارد و اکثر بطرز استادی راند"

۲

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دہلی
جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدرداں کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانندِ صبح نورانی
یہاں کے ذرّے میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعلِ رمّانی
یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ تھا کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغِ رشکِ تجلائے طور تھا اس کا

فلک تھا خوبی و حسن و جمال کا دشمن
صباحِ عشرت و شامِ وصال کا دشمن
عدوئے اہلِ کمال اور کمال کا دشمن
غرض کہ اب تو ہوا جان و مال کا دشمن

یہ مفت بر جو تلاشی ہے نقدِ جاں کے لیے
خضر بھی روئیں گے اب عمرِ جاوداں کیلئے

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین
جو ہاتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متین
کئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا، کام ہی تمام کیا

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا
تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا

غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی
پڑی جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب آنکھ تا مژہ خوں چکاں نظر آئی
تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گل رخان سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلان خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

لہو کے چشمے ہیں چشم پر آب کی صورت
شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
لٹے ہیں گھر دل خانہ خراب کی صورت
کہاں یہ حشر میں توبہ عذاب کی صورت

زباں تیغ سے پرسش ہے دادخواہوں کی
رسن ہے طوق ہے گردن ہے بیگناہوں کی

زمین کے حال پہ اب آسماں روتا ہے
ہر اک فراق مکیں میں مکان روتا ہے
کہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہے
غرض یہاں کے لئے اک جہان روتا ہے

جو کہئے جوشش طوفاں نہیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

برنگ بوئے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھ زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے
قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت
چڑھے ہی آتے تھے سر پہ بخار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی اک اک گنوار کی صورت
چھپی نہ ان سے پر اہلِ دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا
تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو تتار آیا

زبانیں بدلیں تو صورت بدل نہیں جاتی
ملیں جو خاک بھی منھ پر تو ل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے شال سپیہ رنگ مہ جمالوں کا
دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا

عجیب حال دگرگوں ہے دِلّی والوں کا

کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ پا ہوں وہ اں شہ سوار صد افسوس
لہو کے گھونٹ پیئں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہلِ وقار صد افسوس
ھزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس

جھکے ہیں بار الم سے تنے ہرے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
تلاش بہر سیاست ہے خوش بیانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
کہ حکم عام ہے، بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں
کہ ہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پیئں جو آبِ بقا بھی تو زہر بن جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

جہان آباد

مسوزا قربان علی خان سالک

شاعر بے بدل نکتہ پرور بے مثل آسمان سخن را ماہ نیم ماہ و فلک بلاغت را مہر نیم روز مرزا قربان علی خاں متخلص بہ سالک یادگار اکبر مرزا عالم بیگ خان مرحوم حیدآبادی مولد شاہجہان آباد کا مسکن فن سخن از جناب استادی مولائی نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب کسب کرد

ہم

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد
بس ان بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہُوا کہاں آباد
گیا عدم کو دوبارہ ہُوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیوں مٹا دیا اس کو
ارم کا جوڑ سمجھ کر اٹھا لیا اس کو

زمین پست یہاں کی تھی آسماں منظر
ہر ایک ذرہ یہاں کا تھا مہر کا ہمسر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر
یہاں کے آب میں آب حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا اک مکان سرور
ہر اک کوچہ یہاں کا اک جہان سرور
ہر اک دکاں یہاں کی تھی اک دکان سرور
غرض یہ شہر نہ تھا، تھا یہ اک کان سرور
جدھر کو دیکھتے آواز بربط و نے ہے

نہ جانتا تھا کوئی رنج و غم کو کیا شے ہے

یہ شہر کس لیے برباد ہو گیا یا رب ؟
لگی کسی کی یہ کیا ایسی بد دُعا یارب ؟
یہاں کے لوگوں سے کیا ہو گئی خطا یارب
ہوئے ہیں کس لیے یہ موردِ جفا یارب

رہی نہ خاک پہ امن و امان کی صورت
کچھ اور ہو گئی سارے جہان کی صورت

مکان شکستہ ہیں مانندِ خاطرِ مایوس
اُجاڑ کوچے بسان دل الم مانوس
وہ شکل ری نہ رہی شہر ہو گیا معکوس
ستم کیا فلکِ بد شعار نے افسوس

یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو عبرت آئے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ
ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ
پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ

زمین ہو گئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جائے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کی نشاط کی قسمیں
پڑے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں

محل میں رہتے تھے یا اب پڑے ہیں مجلس میں
نہ تاب دل میں ہے طاقت نہ جان بیکس میں
جو تشنہ لب ہوں تو آب دم سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بے جرم لوگ دلی کے
بہشت چاہئے پہلے انھیں قیامت سے
کیا جناب الٰہی میں عرض رضواں نے
کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے

ملا جواب کہ دلی کو لاؤ اٹھوا کر
اور اس گروہ کو اس میں بساؤ لے جا کر

وہ جس کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے
پیادہ کیونکہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
اٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے
قدم کہے کہ ٹھیر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھڑی کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا ہے ہے
بیان مجھ سے ہو کیونکر یہ ماجرا ہے ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہے ہے
نکل کے گھر سے چلی ہیں پیادہ پا ہے ہے

کبھی نہ غصہ میں بھی جامہ سے جو باہر ہوں

غضب ہے یہ کہ وہ یوں بے ردا و چادر ہوں

ہجوم مسجد جامع کا کیا کروں اظہار
صفوف ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلیوں کا شمار
اب اس کو دور ہی سے دیکھنا ہُوا دشوار

نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہے

بیان سُن کے یہ سالک اُٹھے جو میرے ہوش
بسان صورت دیوار رہ گیا خاموش
ہجوم فکر سے خوں دل میں مارتا تھا جوش
کہ ناگہاں سخن غیب سے بہ بانگ سروش

رسید مژدہ کہ ایام غم نہ خواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

زمیں پہ چرخ کی قائم مقام تھی دہلی

سید ظہیر الدین ظہیر

" افکار تازہ سید ظہیر الدین ظہیر عرف نواب مرزا متخلص بہ ظہیر خلف اکبر میر جلال الدین خوش نویس مغفور، از کاملین دہلی است دست گاہے در خط نسخ چناں می دارد کہ اگر یاقوت برابر کند لائق است در فن سخن از شیخ ابراہیم ذوق بہ کمال رسانید "

(۵)

فرشتہ مسکن و جنت نشان تھی دہلی
زمین کے پردے میں اک آسمان تھی دہلی
جہاں میں ایک عجائب مکان تھی دہلی
غرض کہ اہل بصیرت کی جان تھی دہلی

یہ وہ زمیں تھی زمیں جس کی زر اُگلتی تھی
یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

سواد ہند میں عرش احتشام تھی دہلی
بیاض مردمک خاص و عام تھی دہلی
زمیں پہ چرخ کی قائم مقام تھی دہلی
جب آیا عہد جوانی تمام تھی دہلی

فغاں کہ جس کو ملائک نے انتخاب کیا

ستم ہے اس کو زمانے نے یوں خراب کیا

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا

یہ وہ مکاں تھا مکین جس کے قیصر و جم تھے
یہ خطہ وہ تھا گدا جس کے فخرِ حاتم تھے

نقوش پیکر ارژنگ تھے در و دیوار
نگار خانۂ چینی تھے کوچہ و بازار
مکاں مکاں سے ہویدا تھا جوشِ فصلِ بہار
بنا محلہ محلہ تھا غیرتِ گلزار

فلک صفائے عمارت پہ زہر کھاتا تھا
چمک سے ذروں کی خورشید تھرتھراتا تھا

گلی گلی سے ہے آتی صدائے وا ویلا
زمیں زمیں سے ہے اٹھتی نوائے وا دردا
دکاں دکان سے گھر گھر سے حشر ہے پیدا
مکاں مکان سے اٹھا غلغلہ ہے شیون کا

چہار سمت رواج ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پر بلا برستی ہے

زمیں زمین کے درپے ہے خاک اڑانے کو
مکاں مکان کے دوڑے ہے کاٹ کھانے کو

رہی نہ جائے زمانے کے سر اٹھانے کو
ٹھکانے ڈھونڈتے پھرتے ہیں بیٹھ جانے کو
گھروں کو دیکھ پکڑنے لگے ہیں گھر عبرت
بنے ہیں روزنِ دیوار دیدۂ حسرت
ہوئی جو شام تو شامت زدوں کی شامت ہے
نمودِ صبح قیامت پہ اک قیامت ہے
بلا بلا پہ مصیبت پہ اک مصیبت ہے
گھڑی گھڑی ہے غضب لحظہ لحظہ آفت ہے
ترے ستم سے کہاں بچ کے چھپ جائیں
زمین شق ہو تو اے چرخ ہم سما جائیں
جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے
جو قد کہ رشکِ صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرتِ گل تھے وہ خار خار ہوئے
حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے
جو سینے گلشنِ خوبی تھے داغ داغ ہوئے
جو دل کہ خانۂ عشرت تھے بے چراغ ہوئے
ہر ایک رونقِ بزمِ جہان قتل ہوا
ہر ایک قبلۂ ہر خاندان قتل ہوا
ہر اک طوطیٔ شیریں زبان قتل ہوا
ہر ایک بلبلِ نوشیں بیان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں

نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

نکلنے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے
ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں، بدل نہیں سکتے
قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے
کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمینِ شہر نے ایک اک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگ تپاں وہ گرم ہوا
وہ فوج فوج ہر اک سو سے نرغۂ اعدا
وہ کینہ دوزیٔ غارت گرانِ بے پروا
اور اس پہ ظلم گنواروں کا وہ کہ واویلا
جو ہم سے سنتے ہیں اس انقلاب کی باتیں
وہ لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتماتے ہوئے
وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
لبوں پہ آہ، جگر میں الم سمائے ہوئے
جفا کی تیغ سے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے
وہ داغ مرگ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگ و خار مغیلاں و آبلہ پائی

نہال گلشن اقبال پائمال ہوئے
گل ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے

یہ کیا زوال ہوسے اور کیا کمال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے

جو عطرِ گل کا نہ ملتے ملے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں

کہاں وہ خسرو عالی نظر بہادر شاہ
کہاں وہ سرورِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہ دادگر بہادر شاہ
کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ

کہاں سے باغیٔ بے دین آ گئے ہے ہے
کہ نام اس کا جہاں سے مٹا گئے ہے ہے

جہاں میں جتنے تھے اوباش ورند و نافرجام
قمار باز و چنڈو خوار بدمعاش تمام
ہوئے شریک سپاہ شریر و بد انجام
کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام

وہ چند آتشِ فتنہ کو سربلند کیا
کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا

شریر دمنوی و نااہل سر اٹھانے لگے
کہ گھر ہوں کو رہِ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سراغ و نشاں بتانے لگے
پکڑ پکڑ کے ستم گار خوں بہانے لگے

اٹھائی گیرے اُچکے گھروں سے دَھر جاگے

جو گٹھ کٹے تھے وہ گٹھری لپک کے گھر بھاگے

ظہیر بے ہودہ تا چند خامہ فرسائی
خیال ہرزہ و رائی و یاوہ پیمائی
عبث عبث یہ تگاپو و آبلہ پائی
ہمیں پسند نہیں تیری نغمہ آرائی
زبان کو بند کر اور منہ سے کچھ نکال نہ بات
مثل سُنی بھی ہے تُو نے گذشتہ را صلوات

یہ شہر وہ ہے کہ تھا افتخار ہفت اقلیم

حکیم محمد محسن خان محسن

• از تازہ نوائی حکیم محمد محسن خان متخلص بہ محسن خلف حکیم محمد حسن خان مرحوم مغفور از
شاگردان نواب غلام حسن خان خواہد ؎

(۹)

دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی
ثریا جاہ و فلک بارگاہ تھی دہلی
تمام شہر کی پشت و پناہ تھی دہلی
گناہگار ہوئی ، بے گناہ تھی دہلی

یہ انقلابِ زمانہ سے ہو گئی برباد
اکھڑ کے جھک گئی اب اس کی بیخ و بنیاد

یہ شہر وہ ہے کہ تھا افتخار ہفت اقلیم
محل پایۂ اورنگ خسروانِ قدیم
شکوہ و رفعت و شوکت میں رشک عرش عظیم
فضا حسن میں غیرت فزائے باغ نعیم
خدا ہی جانے کہ اس پر لگی ہے کس کی نظر
ہر ایک قصبہ و قریہ سے ہو گیا کم تر

وہ لال قلعہ جسے کوہ طور کہتے تھے
فضا کو جس کی فضائے قصور کہتے تھے
وہ نازنین جنھیں رشک حور کہتے تھے
وہ شاہزادے جنھیں سب حضور کہتے تھے

رہا نہ کوئی حسیں اور نہ کوئی وارث تخت
مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں کمبخت

وہ لال پردہ کہ بس پردہ پوش عالم تھا
وہ گویا پردۂ پرنور چشم آدم تھا
وہ مجرا گاہ سلاطین و حاتم و جم تھا
وہ سجدہ گاہ نریمان و زال و رستم تھا

تمام کھودتے پھرتے ہیں اس جگہ مزدور
ظہور اس کا ہوا جو خدا کو تھا منظور

وہ نو محلہ کہ تھا رشک کوچہ و بازار
طواف کرتی تھی ہر صبح جس کا باد بہار
ہر اک مکان مصفا تھا صورت گلزار
بنا تھا کوچہ ہر اک اس کا مصر کا بازار

اب اس محلے کا باقی رہا نہ نام و نشاں
نظر وہ قلعہ میں آتا ہے مثل گورستاں

وہ جن کی ڈیوڑھی تھی رشک وادیٔ ایمن
کہ شمع طور تھی ہر اک وہاں کی شمع لگن

مہک رہی تھی وہ پھولوں سے صورتِ گلشن
سجی ہوئی تھی حسینوں سے مثلِ صحنِ چمن

وہ دشتِ قیس کی مانند ہوگئی ویران
جرس کی آتی ہے آواز اس جگہ ہر آن

ہوئی ہے ڈیوڑھی بسیاد کی بھی یہ برباد
کہ گویا پھینک دی اس کی اکھیڑ کر بنیاد
نشان ہی نہ رہا اس کا نہ اب کسی کو یاد
ھر ایک دیکھ کے اب اُسکو کرتا ہے فریاد

الٰہی کیا ہوئے اب یاں کے سب مکاں و مکیں
فلک اٹھا کے کہیں لے گیا ہے یاں کی زمیں

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتے تھے
وہ بانکپن سے اُٹھا پائنچوں کو چلتے تھے
وہ ہاتھ پاؤں میں مہندی کو اپنے ملتے تھے
وہ بات بات میں انداز سے مچلتے تھے

ہوئے ہیں رنج و تردّد میں اب تو وہ مجبور
بجائے مہندی کے ملتے ہیں وہ کفِ افسوس

دکھانا ان کو تبسم سے وہ لبِ اعجاز
سنانی ان کو وہ شوخی سے ناز کی آواز
مچل مچل کے دکھانا وہ ان کا عشوہ و ناز
نئی ادا سے دکھانا وہ چال کا انداز

یہ ان کا ہوگیا ہے اب تباہی سے احوال
کہ ساری بھول گئے اپنی وہ ادا کی چال

کسی کے جسد معنبر میں نقرئی موباف
کسی کا چہرۂ پُرنور مثل آئینہ صاف
کروں میں محرم و کرتی کا ان کے کیا اوصاف
قلم کی طرح سے ہوتا ہے غم سے سینہ شگاف

نصیب ان کو شب و روز اب ہے سینہ زنی
ملی ہے کھانے کو ہیرے کی بھی نہ ان کو کنی

وہ لوگ بستر سنجاب پر جو سوتے تھے
سحر گلاب سے جب منھ کو اپنے دھوتے تھے
تمام عمر کو لہو و لعب میں کھوتے تھے
وہ بال بال میں موتی سدا پروتے تھے

اب ان کا حال تباہی سے ایسا ابتر ہے
بچھونا خاک ہے اور خشت بالش سر ہے

جو کنٹھے پھولوں کے پہرتے تھے پہنے گردن میں
اکڑتے پھرتے تھے مانند سرو گلشن میں
سراپا محو تماشا تھے اپنے جوبن میں
خوشی سے پھولے سماتے نہ جامۂ تن میں

ہوئے وہ ان دنوں نان شبینہ کو محتاج
اگرچہ شیر تھے پر ہو گئے وہ روبہ مزاج

وہ ہائے دہلی میں رہتی تھیں طوطیانِ حسیں
کوئی تھی حور شمائل، کوئی تھی زہرہ جبیں
خجل تھا عارض روشن سے جن کی ماہ مبیں
سرِ ود رقص سے پامال ان کے اہلِ زمیں

یہ انقلاب فلک سے وہ ہو گئیں ناچار
جہاں میں پھرتی ہیں آوارہ مثل گرد و غبار

پہنے ہوئے تھے وہ چوبتر کے چوک میں بالا
کہ جیسے چار چمن ہوں بہ سطحۂ گلزار
ہر ایک دیدۂ آئینہ روشن و ہموار
خجل تھا جن سے خطِ عارضانِ گل رخسار

ہر ایک دُکان میں بیٹھا ہوا ہے فریادی
ٹپک رہی در و دیوار سے ہے بربادی

اور اس میں حوض تھا اک مثل چشمۂ کوثر
بجائے آب وہ لبریز نور سے یکسر!
ضیا میں چشمۂ خورشید سے بھی روشن تر
صفا میں چادرِ مہتاب کا تھا وہ ہمسر!

سراپا بھر دیا ہے اس میں یہ خس و خاشاک
اٹھا ہوا وہ پڑا ہے بہ مثل تودۂ خاک

یہ نہر دونوں طرف اس کے خوشنما تھی رواں
زمین میں چھپ گیا خجلت سے چشمۂ حیواں

صفائے آب سے شرمندہ اس کی تھانیاں
لبوں کو چاٹتے تھے پانی پی کے حور وشاں

ہوئی ہے فرط کدورت سے اب وہ خاک آلود
تمام خاک میں بس مل گئی ہے اس کی نمود

وہ موجیں اس کی لطافت میں مثل کاکل حور
حباب اس کے نمایاں بہ شکل قبۂ نور
چراغ اس کے فروزاں بہ مثل شعلۂ طور
بوقت سیر وہ تھی خاص و عام کی منظور

یہ کاو کاو زمانہ سے ہوگئی ہے خراب
کہ جیسے ماہی تڑپتی ہے خاک پر بے آب

سناتے پھرتے تھے سقے کٹوروں کی جھنکار
وہ گل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار
وہ سودا بیچتے تھے لوگ واں پکار پکار
وہ پھرنا خوانچہ والوں کا واں قطار قطار

دکھا تھا دہلی کا لوگوں نے نام عشق آباد
بسانِ خانۂ عاشق وہ ہوگئی برباد

جو ناف شہر میں واقع تھی مسجد جامع
وہ حسن و رفعت وسعت میں گویا تھی جامع
بسان برج حمل اس کے برج تھے لامع
مؤذنوں کے فرشتے وہاں تھے سامع

نہ کیونکہ ہوئے جہاں میں وہ واجب التعظیم
بنی ہوئی ہے سراسر وہ شکل عرش عظیم

تھے اس کے چار سو چوپڑ کے خوشنما بازار
خجل تھا جن سے خط عارضان گل رخسار
برنگ بزم وہ آراستہ تھے لیل و نہار
کرسپہر کو بھی گزرے گی سیڑھیوں پہ بہار

فلک نے کر دیا ہر سمت اس کے ویرانہ
بنا ہے ایک طرف اس کے اب شفاخانہ

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں
ہر ایک شخص جہاں تھا بجائے خود رضواں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانی غلماں
دبیر چرخ کا ہمسر تھا یاں ہر ایک جواں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیر امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر

اکڑ کے پھرنا جوانوں کا وہ سر بازار
پہن کے ٹوپیاں زریں وہ باندھ کر دستار
کسی کے ہاتھ میں باندی کوئی لیے تلوار
کوئی تھا گھوڑا اکڑاتا کوئی تھا فیل سوار

نہ وہ جوان رہے اور نہ کوئی بھی خوش حال
ہے شہر میں بس اب کھانے والے ماش کی دال

میں دردِ دل کہوں اب کس سے جا کے انجمن

نہ کوئی یار رہا ہے نہ کوئی اہلِ وطن

شبانہ روز ہوں میں مبتلائے رنج و محن

مٹا ہے سامنے آنکھوں کے میرے یہ گلشن

خدا کرے کہ یہ ہو جائے پھر چمن آباد
مثالِ گل کے ہوں باشندے یاں کے خرّم شاد

مل گئی خاک میں شانِ دہلی

حکیم محمد مرزا خاں اکرام

"شاعر نازک خیال تاثیر بے مثال حکیم محمد مرزا خاں متخلص بہ اکرام ازاں اوست"

(۷)

پوچھ مت حالِ زبانِ دہلی
ہائے ہیں اور بیانِ دہلی
اب تو نکلا ترا اے چرخ غبار
مل گئی خاک میں شانِ دہلی
دولتِ حسن کو غم نے لوٹا
چھپ گئے سیم برانِ دہلی
بن کے چہرہ کے دیتا ہے
بے کسی ہائے کسانِ دہلی
خاک میں مل گئے الماسِ ہنر
کھود کر دیکھ لو کانِ دہلی
اب تو جز حسرت و افسوس و الم
کون آتا ہے میانِ دہلی
گریہ کی سیل ہے یہ نہر نہیں
روتے ہیں پیر و جوانِ دہلی
نہ وہ صورت رہی نے وہ زینت
غدر تھا آفتِ جانِ دہلی

سروِ آزاد تھا اک ایک جوانِ دہلی

مرزا داغ دہلوی

" روشن بیانی نواب مرزا داغ کہ محامدِ شانِ و مسدسات ذکر یافتہ "

(۸)

یوں مٹا جیسے کہ دلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی
پوربی پھپے اڑاتے تھے زبانِ دہلی
زنی والوں کے لئے تازہ بنے کی جنت
لے گئے سر پہ ملک تحفۂ دکانِ دہلی
گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تونے خزانِ دہلی
رشک شمشاد تھا ہر خوش قد خوش رفتار
سروِ آزاد تھا اک ایک جوانِ دہلی
عارض صاف تھا اک ایک صدف پارہ
چشم پر جلوہ تھی اک ایک کانِ دہلی
آج بے ہاتھ کرکوئی تحریر ہوئے حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی

دے دیے فوج کو حکام نے انعام یہ سب
گنج قاروں سے فزوں گنج نہان دہلی

روکش سد سکندر اسے کہیے تو بجا
فتح گڑھ ہے جو پہاڑی پہ قرانِ دہلی

یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند
اہلِ کعبہ کہیں، وہ آئی اذانِ دہلی

نیر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

کچھ نئے رنگ کے ہیں بادہ کشانِ دہلی

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

مدرِ بختہ کلک جواہر سلک نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ صاحب
گلشن بے خار از اعظم اُمرائے شاہجہان آباد اند و بہ پارسی حسرتی تخلص مے فرمایند؛

(۹)

ہائے وہ دن رہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی

وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پھر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی

کُل یوم ہو فی شان کی ہے جلوہ گری
کیا ہوا اگر نہ رہی شوکت و شانِ دہلی

گر نہ کہوں کہ یہ دلی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دلی والوں کو بھی دلی پہ گمانِ دہلی

دلی اب ہے تنِ بیجاں تنِ بیجاں کیا خاک
جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

ربع مسکوں سے زیادہ ہے بہت وسعت میں
چاندنی چوک کہ واقع ہے میانِ دہلی

صورتیں ہوگئیں معنی جسد ارواح ہوئے
بے خبر کہتے ہیں ویراں ہے جہانِ دہلی
رند پریاں کے کریں رشک ثقاتِ امصار
بادشاہوں پہ کریں ناز شہانِ دہلی
دل قدح، بادہ محبت، گل و ریحاں عرفاں
کچھ نئے رنگ کے ہیں بادہ کشانِ دہلی
پیر خوش رائے مگر ہیں تو جواں ہیں خوش رو
عجب انداز کے ہیں پیر و جوانِ دہلی
شیفتہ اور ستائش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں یہ ہے زبانِ دہلی

کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی

سید ظہیر الدین ظہیر

" سید ظہیر الدین ظہیر صاحب متخلص بہ ظہیر کہ محامد شان در مسدسات ذکر یافتہ "

(۱۰)

بل بے دہلی وہ رہے شوکت و شان دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکان دہلی
مل گئی خاک میں سب شوکت و شان دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشان دہلی
اے فلک اپنے گریبان میں منھ ڈال ذرا
ہائے یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی
وہ قیامت ہیں فرشتوں کو لٹا دیتے ہیں
شوخ و بدمست و فسوں کار بتان دہلی
نام کوثر کا نہ لو حضرت واعظ دیکھو
چوس جائیں نہ کہیں دُودِ کشان دہلی
زمزمہ بھول گئے نغمہ طرازان چمن
ہے ہر اک نوحہ گر و مرتبہ خوانِ دہلی

رہ گئے کہنے کو کچھ یہ فسانے باقی

اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

فلک پیر نے مٹی میں ملایا سب کو

پھرتے ہیں خاک بہ سر پیر و جوانِ دہلی

ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید

ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی

دلبر با مہر لقا، ماہ جبیں، دشمنِ دیں

کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی

ایک سے ایک طرحدار نظر آتا ہے

عالمِ آشوب ہیں یہ کج کلہانِ دہلی

نہ رہا نام و نشانِ دہلی

حکیم آغا جان عیش دہلوی

"از افکارِ حکیم آغا جان صاحب متخلص بہ عیش کہ ذکرش در سندرت گزشت"

(۱۱)

مل گئی خاک میں شانِ دہلی
نہ رہا نام و نشانِ دہلی
دشتِ غربت میں پھریں چھانتے خاک
یوں فلک پیر و جوانِ دہلی
گردِ کلفت ہوئی افسوس افسوس
غازۂ ماہ رخسانِ دہلی
شان و شوکت ہوئی ان کی برباد
جن سے تھی شوکت و شانِ دہلی
کیا ہوا فائدہ اے چرخ تجھے
سچ بتا کر کے زیانِ دہلی
دیکھ کہتی تھی جسے چشم فلک
کھا کے گندم جانِ دہلی

سنبل بندِ چمن دہر کو کیا
ناپسند آئی تھی آنِ دہلی
مل گئے خاک میں کیسے کیسے
اے فلک سرو قدانِ دہلی

عندلیبانِ چمن ہیں نالاں
یاد کر غنچہ دہانِ دہلی
دل بھر آتا ہے خاموش ہو عیش
تجھ سے سن سن کے بیانِ دہلی

دِلّی

سید حسن علی خان عابدؔ

و نتائج فکر سید حسن علی خان صاحب متخلص بہ عابدؔ خلف سید محمد ابراہیم صاحب مرحوم، اصلاح شعر از مرزا قربان علی بیگ سالکؔ گرفتہ۔

(۱۴)

ہم نے مانا کہ ہی خاک میں شانِ دہلی
ڈھونڈھئے اب بھی کوئی شہر بسانِ دہلی
فاقہ مستی اسے کہتے ہیں کہ غارت ہو کر
پھر اسی رنگ میں ہیں پیر و جوانِ دہلی
کرتے ہیں لوگ جو دلّی کی ارم میں باتیں
حوریں سنتی ہیں بصد شوق زبانِ دہلی
خونِ دل پیتے ہیں اور شکر خدا کرتے ہیں
یوں بسر کرتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی
توبہ کی عرض سے کب حضرتِ عابدؔ تم نے
نہ رہے توبہ شکن جب کہ بتانِ دہلی

رشکِ حورانِ بہشتی ہیں بتانِ دہلی

حکیم محمد محسن خان محسن

" انداز بیان حکیم محمد محسن خاں محسن کہ در سدرسات ذکر یافتہ "

(۱۴)

بے نشاں ہو گیا عالم میں نشانِ دہلی
لامکاں بن گیا اک ایک مکانِ دہلی

نامہ بر، کوچہ، نہ بازار و محلہ باقی
خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشانِ دہلی

ادب آموز ملائک ہیں یہاں کے جاہل
رشکِ حوران بہشتی ہیں بتانِ دہلی

گھر کھدا، مال لٹا، جان گئی، اشک بہے
ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی

ماریں آنکھیں پس قتل بھی مقتولوں کی
تن بے جاں تھے مگر تھے نگرانِ دہلی

ایسی سرسبز تھی عالم میں فرشتے آکر
لا کے دکھلاتے تھے رضواں کو مکانِ دہلی

نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

مرزا پچّھے صاحب ہنر

"سخن طرازی مرزا پچّھے صاحب متخلص بہ ہنر ابن مرزا منوّر بخت بہادر ابن مرزا فیروز بخت بہادر خلف شاہ عالم بادشاہ خلد آرام گاہ:"

(۱۴)

تھے ہنر ہم سببِ عظمت و شانِ دہلی
نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

واہ کیا گرمی ہے گفتار میں سبحان اللہ
شعلہ و برق و شرارہ ہے زبانِ دہلی

نام مٹنے کا نہیں، حشر تلک رہوے گا
گو فلک تو نے مٹایا ہے نشانِ دہلی

حوریں جنت کی جنھیں دیکھ کے پڑھتی تھیں درود
وہ حسین حق نے بنائے تھے بتانِ دہلی

بہادر شاہ بہ حیثیّت شاعر کے

خصُوصیّات • اسلوبِ کلام • نمونۂ سخن

بہادر شاہ گوناگوں خصائص کے حامل تھے، ان کے خصوصیّات میں ایک بڑی خصوصیّت یہ بھی تھی کہ وہ بڑے اچھے شاعر تھے، وہ اپنا ایک خاص طرز رکھتے تھے، جس میں انفرادیت بھی تھی، اور کشش بھی، وقار بھی، اور استادانہ پختگی بھی، زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی، فصاحت و بلاغت کا معیار، وہ خود تھے،

مستند ہے میرا فرمایا ہُوا،

اور ان سب باتوں پر بالا، وہ سوز تھا، جو ان کی فطرت اور طبیعت میں رچ گیا تھا، وہ ایک بادشاہ تھے، لیکن عملاً شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے، ان کا دِل، حوصلوں، اور امنگوں کا مرکز تھا، لیکن فرنگی استبداد نے ان کے حوصلوں کو کچل دیا تھا، اور امنگوں کو پامال کردیا تھا، انھوں نے ایک شاہزادے کی حیثیت سے آنکھیں کھولیں، بادشاہ کی حیثیت سے زندگی بسر کی لیکن قدم قدم پر انھیں اپنی بے لبی، بے کسی، بے مائگی، اور بے اثری کا احساس ہوا۔ ان کی زندگی اس حال میں گذری کہ ایک دن بھی سکھ کا میسّر نہ آیا، ایک لمحہ بھی، خود مختاری حاصل نہ ہوئی، نام ان کا تھا، کام دوسرے کرتے تھے، بادشاہت ان کی تھی، بادشاہ دوسرے تھے، ملک ان کا تھا، راج ان کی قسمت میں نہ تھا، یہ مناظر دیکھ کر ان کا دل خون ہوجاتا تھا، اور یہی خون اشک رواں کی صورت میں آنکھوں سے برستا تھا، اور نالۂ بے اختیار بن کر شعر کا لباس پہن لیتا تھا،

ظفر کی شاعری سر تا سر حال اور واردات پر مشتمل تھی جو کچھ ان کے دل پر گذرتی تھی، نالۂ موزوں کی صورت اختیار کر لیتی تھی، ——— یہی ان کی شاعری تھی،

یوں تو بہادر شاہ نے کچھ تصنیفات بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں، مثلاً منشی امیر احمد علوی تحریر فرماتے ہیں:۔

" بادشاہ نے زمانۂ ولی عہدی میں ایک کتاب " لغت اور اصلاح سخن " کی تین جلدوں میں لکھ کر ۱۲۲۶ھ میں تمام کی تھی۔ شرح گلستان سعدی کے دیباچہ میں ظفر نے اس تالیف کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کا نام " تالیفات ابوظفری " تھا، افسوس ہے کہ زمانہ کے انقلاب سے یہ گنج شایگان برباد ہو گیا اور آج اس عالمانہ تالیف کا کہیں نشان نہیں ملتا۔

شرح گلستان ۱۲۵۹ھ (۶ سنہ جلوس) میں مطبع سلطانی سے شائع ہوئی تھی۔ مگر ہنوز نایاب نہیں ہے یہ عجیب و غریب کتاب علم تصوف میں ہے شیخ سعدی کی عبارات اور گلستان کی حکایات سے مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی سعی بلیغ کی ہے ضمن کلام میں دوسرے فقرا اور بزرگوں کے حالات بھی درج کیے ہیں اس کا تاریخی نام " خیابان تصوف " ہے نام کی شان نزول یوں تحریر فرماتے ہیں!

" بعد از تنظیم ایں سلک لآلی آبدار تفرح کناح از مقام دتی محل داخل محل معنی گردیدم و قطع تاریخ اتمام کتاب کہ ہمنام از طریق تخرجہ بحصول می انجامد بدیں گونہ از جیب عدم سر بر آورد

بنوشت ولی عہد شہ اکبر ثانی ایں شرح گلستان پئے بنیان تصوف
چوں کرد قلم لفظ " بجز " دور بر آمد تاریخ مع نام خیابان تصوف

۱۲ ۱۴ ۱۲ = ۲۸ ۱۲

شرح کے خاتمہ پر بڑی دل پسند عبارت لکھی ہے۔

" ایں گلدستۂ عرفان اعنی شرح گلستان بہ نسیم عنایت نخلبند خیابان جہان مطالق مشرب ارباب وحدۃ الوجہ ولوجود رسید و بہ لطف پاک مالک ابتداد اختتام با اختتام انجامید

رباعی

ایں شرح ز طبع نا قصم کامل شد — ختمش بر حسب مدعائے دل شد
صد شکر کن اے ظفر کہ از فضل خدا — بر خاتمہ بالخیر ظفر حاصل شد

الٰہی بہ مقبولان توحید بنیان ایں سواد را مقبول مقبولاں خود گردان و بہ محبوبان وحدت نشان ایں مصنف را بمقام محبوب محبوبان خویش برسان،

وآخر دعوانا ان الحمد اللہ رب العالمین[1]

لیکن طبیعت کا سارا زور شاعری ہی پر مرکوز رہا، اس زمین کو انھوں نے بلندی میں آسمان بنا دیا۔ زبان اور محاورے کے لحاظ سے، مغز و معنی کے اعتبار سے، چستی اور بندش الفاظ کی نشست، الفاظ کا ترنم، الفاظ کی سحر آفریں ترکیب، ان سب چیزوں نے مل کر ظفر کی شاعری کو اوج کمال پر پہنچا دیا، وہ ذوق کے شاگرد تھے، پھر غالب سے بھی مشورہ سخن کرنے لگے، لیکن ان کے کلام میں، نہ ذوق کا رنگ ہے، نہ غالب کا اثر، انفرادیت ہے کہ پھوٹی پڑتی ہے، وہ جذبہ، ذوق کہاں سے لاتے، قدرت نے بہادر شاہ کے سینہ کو جس سے معمور کر رکھا تھا؟ وہ بات غالب میں کہاں سے آسکتی تھی جو پیہم نامرادی اور ناکامیوں نے ظفر میں پیدا کر دی تھی؟ غالب کو اگر اس پر ناز تھا کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

تو ظفر کو بھی اس پر فخر تھا کہ،

میں سوائے جہان آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

جو شوق، جو درد، جو کسک، جو سوزش، بہادر شاہ کے دل میں حوصلہ شکن حالات، یاس انگیز ماحول، اور ہلاکت آفریں، بے بسی نے پیدا کر دی تھی، وہ قدرت کا خاص عطیہ تھی،

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

شاہ نصیر سے استفادہ

ظفر نے شاہ نصیر سے بھی استفادہ کیا تھا:

خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار مرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ اکبر شاہ ثانی کے بیٹے تھے۔ ولادت ۱۷۷۵ء میں ہوئی اور باپ کے مرنے کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے اور غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں معزول ہو کر ملک برما میں جلاوطن کئے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا، بہادر شاہ شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اکثر اپنا وقت اس میں صرف کرتے تھے، چونکہ سلطنت کا کام کاج کچھ نہ تھا زیادہ تر وقت شعر گوئی میں گذرتا تھا۔ استاد ذوق اور مرزا غالب کو کلام دکھاتے تھے مگر قبل اس کے شاہ نصیر سے استفادۂ سخن کیا تھا، شاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی ان کو اچھا دخل تھا۔ ان کی اکثر ٹھمریاں شمالی ہند میں بہت مقبول ہوئیں۔ خوش نویس بھی بہت اچھے تھے اور اکثر اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام مجید دہلی کی مسجدوں میں بطور ہدیہ بھیجتے تھے۔ (۱)

ذوق اور ظفر کے رنگ میں فرق

ذوق اور ظفر کا رنگ سخن جدا جدا تھا:

ظفر کی وفات بمقام رنگون ۱۸۶۲ء ہوئی تھی۔ اس میں کلام نہیں کہ شاعر اعلیٰ درجہ کے تھے۔ اگرچہ بہادر شاہ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے۔ لیکن انصاف سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو مشہور ہے کہ استاد ذوق اشعار کہہ دیا کرتے تھے۔ اور بہادر شاہ اپنے نام سے محفل میں سنا دیا کرتے تھے۔ محض غلط اور بالکل لغو ہے۔ جس کو کچھ بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کا مذاق ہوگا، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ذوق اور ظفر کے رنگ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کل اشعار میں ایک کا بھی رنگ نہیں ملتا۔ تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ جب معمولی سے معمولی کنجڑے۔ چھوکرے اور بھٹیارے۔ قصائی، اشعار موزوں کر لیتے تھے۔ تو کیا بہادر شاہ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکتے

---

(۱) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) صفحہ ۲۰۸

شاعری کے معاملے میں بہادر شاہ کے متعلق یہ خیال کرنا بہت ہی رکیک ہے۔ (۱)

الزام کی تردید

ظفر کی شاعری خود انہی کی ہے یا دوسروں سے حاصل کیا ہُوا مال غنیمت؟ اس پر ایک مؤرخ اور نقاد کیا لکھتا ہے یہ بھی سُن لیجیے!

" انھوں نے ایک شرح گلستان بھی لکھی جو ایک اچھی کتاب کہی جاتی ہے مگر ان کی شہرت کی اصلی بنا ان کی ضخیم کلیات پر ہے جو بہت مشہور ہے۔ چار دیوان ان کے شائع ہو چکے ہیں ان کو لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کی غزلیں اس قدر مقبول ہیں کہ اکثر ناچ رنگ کے جلسوں میں گائی جاتی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے استاد ذوق اور غالب ان کو غزلیں لکھ کر دیتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی چند غزلوں میں ان دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن پھر بھی ظفر کے خود شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ کیونکہ ان کی بہت سی غزلیں خاص ان کے رنگ کی ہیں، جو ذوق اور غالب سے بالکل علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ظفر نے بحالت قید بھی مشغلہ شعروشاعری جاری رکھا تھا۔ یا نہیں، اغلب ہے کہ یہ دلچسپ مشغلہ ان سے نہ چھوٹا ہو اور کچھ ان کا کچھ اس زمانے کا بھی کلام ہو۔ کیا معلوم کہ سعی و تلاش اس معاملہ میں آئندہ کامیاب ہو۔ (۲)

ایک اور تردید

ظفر کے ہم عصر منشی کریم الدین صاحب" تذکرہ شعرائے اردو" نے ذوق اور ظفر پر جو کچھ لکھا ہے اسے پیش نظر رکھیے۔ تو بات اور زیادہ صاف ہو جاتی ہے:

منشی کریم الدین مرحوم نے تذکرہ شعراء اُردو موسوم بہ" طبقات شعراء ہند" ۱۸۴۷ء میں لکھا۔ اس وقت ظفر اور ذوق دونوں موجود تھے، وہ ذوق کی بابت تحریر کرتے ہیں۔

"فن شعر میں ابتدائے عمر سے مصروف ہیں مگر حالت صبا سے آج تک یہ عادت طبیعت

---

(۱) چراغ دہلی (مرزا حیرت دہلوی) صفحہ ۲۶

(۲) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) صفحہ ۲۰۹

میں متمکن ہے کہ جو شعر کہتے ہیں کسی کو نہیں دیتے ہیں، بادشاہ کے اُستاد ہیں۔ اصلاح شعر کی بادشاہ کو دیتے ہیں۔

جب ذوقؔ کی بابت اُن کے ہم عصروں کا بیان ہے کہ "وہ اپنا شعر کسی کو نہیں دیتے تھے تو شمس العلما آزادؔ کا یہ بے سروپا افسانہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ساڑھے تین دیوان ظفرؔ کی طرف سے تصنیف کر دیئے؟

ظفرؔ کی بابت منشی کریم الدین لکھتے ہیں،

"شعر ایسا کہتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں اُن کے برابر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ابراہیم ذوقؔ سے اصلاح لیتے ہیں۔ تیرہ چودہ برس کا عرصہ ہوا کہ تخت نشین ہوئے۔ ابتداء میں ولیعہد تھے، ان ایام میں بھی ان کے شعر اچھے ہوتے تھے۔ تمام ہندوستان میں اکثر قوال اور رنڈیاں ان کی غزلیں اور گیت اور ٹھمریاں گاتے ہیں، ہر ایک قسم کے شعر ہیں ایک قصیدہ انھوں نے مدح پیغمبر خدا میں کہا ہے داخل تذکرہ کرتا ہوں۔"

موکب ترے ملائک و مرکب ترا براق — مولد ترا ہے مکّہ و معبد ترا حرم
رنگ ظہور سے تیرے گلشن رخ حدوث — نور وجود سے تیرے روشن دلِ قدم
کرتا ہے تیرے اسم مبارک کو دل پہ نقش — اس واسطے عزیز جہاں ہو گیا درم
اے معدن کرم تیری ہمّت کے رُوبرو — کمتر ہے سنگریزے سے قدرِ نگین جم
صدقہ زمیں کے ہوتا نہ پھر پھر کے آسمان — رکھتا سرِ زمین نہ اگر اپنا تو قدم
محروم تیرے دست مبارک سے رہ گیا — کیونکر نہ چاک اپنا گریباں کرے قلم
عالم کو تیرا نور ہوا باعث ظہور — آدم ترے ظہور سے ہے مظہر اتم
ہیں زائران روضہ اقدس ترے جہاں — آتا ہے پائے بوس کو واں روضۂ ارم
واللیل تیرے گیسوئے مشکیں کی ہے ثنا — والشمس ہے ترے رخ پرنور کی قسم
قرآن میں جب کہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا — کیا تاب کہتر قلم کو جو کچھ کر سکے رقم

تیری جناب پاک میں ہے یہ ظفر کی عرض صدقہ میں اپنی آل کے اے شاہ محتشم
صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر آئینہ ضمیر سے میرے غبار غم

اہل نظر جانتے ہیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل ہے۔ بقول عرفی "عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست" "آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را"۔ لیکن ظفر کے ہم عصر شعراء میں اتنا موثر نعتیہ قصیدہ کسی نے نہیں کہا، وہ کچھ اور نہ بھی کہتا تو صرف یہی قصیدہ اس کے اعجاز شاعری کے لیے دلیل و برہان تھا۔ (۱)

اس قصیدہ کے بعد منشی کریم الدین نے ایک غزل بادشاہ کی نقل کی ہے اور لکھا ہے۔

"یہ ایک غزل بادشاہ کی بہت اچھی ہے۔ تیمناً داخل تذکرہ کرتا ہوں"

ہیں یہاں رنج کے آثار خوشی کے باعث اشک آنکھوں سے ٹپکتے ہیں خوشی کے باعث
جان آجائے جو مرغان قفس تک صیاد بوئے گل آئے نسیم سحری کے باعث
تم جو غصہ ہو تو غصہ میرے سر آنکھوں پہ پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث

منشی احمد حسین سحر نے ۱۲۶۱ھ میں تذکرہ "بہار بے خزاں" مرتب کیا۔ اس وقت بھی ذوق و ظفر دونوں زندہ تھے، وہ ظفر کی بابت لکھتے ہیں:

"ظفر تخلص مرزا ابوظفر بادشاہ دہلی بفن شعر میلے و مناسبتے تمام دارد۔ ابراہیم ذوق از مخصوصان حضرت اوست۔ وافکار ایشاں باصلاح او چوں گوہر آبدار اند۔"

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے تذکرہ "گلشن بے خار" ۱۲۵۰ھ میں تمام کیا۔ اس وقت مرزا ابوظفر ولیعہد تھے۔ محاسن اخلاق کی بابت لکھتے ہیں کہ "با اکثر صفات موصوف و بہ محامد مکارم معروف۔ وہ اکثر فنون دستگاہ ہے شائستہ دارد شاعری پر ریویو کرتے ہیں۔

"بایں فن بسیار مالوف است۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نقش ذلہ ربا وظیفہ خوار است۔ وافکار ایشاں بحک واصلاح او درست و ہموار" غور کیجیے سحر و شیفتہ دونوں ظفر کے ہمعصر ہیں

---

(۱) بزم تیموریہ ص ۳۲۷

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ظفر کو فن شعر سے "میل و مناسبت تمام ہے"۔ دوسرے رقم پرداز ہیں کہ ظفر فن شعر سے "بسیار مالوف" ہیں۔ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ ذوق ظفر کے افکار پر اصلاح دیتے ہیں۔ مگر شمس العلماء نصف صدی کے بعد روشنی ڈالتے ہیں کہ ذوق غزلیں تصنیف کر کے ظفر کا تخلص ڈال دیا کرتے تھے۔

شیفتہ کی سخندانی مسلم ہے انھوں نے ظفر کے چند اشعار اپنے تذکرہ میں نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ "از اشعار آبدار الیشان است"۔ وہ اشعار ضرور سننے کے قابل ہوں گے،

(۱) ضبط فریاد کردں گریہ کو روکوں لیکن — دل بیتاب کو تھاموں یہ نہیں ہو سکتا

(۲) اب بھی وہ آنکھ تیری آئینہ رو ہے کہ نہیں — اگلے طوروں پہ خدا جانیئے تو ہے کہ نہیں

(۳) دل دے کے انکو ایسی اذیت ہوئی ہمیں — اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں

(۴) پی لاکھ بار صبا کی لاکھ بار توبہ — اب کر چکا میں توبہ تو بہ ہزار توبہ

تذکرۂ بزم سخن میں ظفر کی شاعری پر مختصر الفاظ میں بہترین ریویو ہے :۔

"در سخن پایۂ ارجمند داشت، گفتارش اگرچہ سادہ پرکار ہست اما ہمہ اش خاطر شکار است محاورہ گوئی ازاں اوست و معاملہ نویسی زیر فرمان او"

دور جدید کے اول نقاد نظم۔ خواجہ الطاف حسین حالی اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارا اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں۔ صفائی سے بہت دور پڑ جاتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے"

دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ ظفر اور ذوق کا طرز بیان جدا جدا ہے کلیات ظفر ذوق کا دیوان نہیں ہے۔ مولف تذکرہ گل رعنا لکھتے ہیں۔

"ذوق پھر بھی ذوق ہیں ظفر کے اُستاد۔ ان کے کلام کی رنگینی۔ ترکیب کی چستی۔ مضمون کی بندش۔ جوش و خروش ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں۔ ظفر کے یہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا۔ محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی۔ مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا"۔

ظفر کی شاعری اور اس کا پس منظر

"بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لیے نہیں بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت اور عظمت کی یاد میں آنسو بہانے کے لیے، سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی، سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا، اس کی ساری بادشاہی قلعہ معلّی کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں نہ وہ سلطنت کے فرامین صادر کرتا، اور نہ اعیان حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے پھوڑتا۔ اور جب وہ ٹوٹ کر بہہ جاتے تو اُس کے سوز گداز کا اظہار اپنے نالہائے موزوں سے کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ اور شعراء کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے۔

اے ظفر یہ ترے اشعار ہیں یا نالۂ زار
کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج تخت کا گو نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ ضرور تھا، جہاں اس نے اپنی ذہانت ذکاوت اور طبیعت کی بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ سیاسی امور میں انہی اوصاف کو کام میں لاتا تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاست دان بھی ثابت ہوتا لیکن نہ اب رزم کی

معرکہ آرائیاں تھیں، اور نہ بزم کی نکتہ آفرینیاں، لامحالہ ایک بے چین اور بے قرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہوگئیں اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا،

ظفر کا دور ہندوستانی شاعری کا دور شباب تھا، نصیر، ذوق، ممنون، مومن، غالب، تسکین، اور شیفتہ کی شاعری نے ریختہ کی زمین کو آسمان پر پہنچا دیا تھا، ان ہی اساتذہ کے ساتھ ظفر نے بھی طبع آزمائی کی اور نمایاں حیثیت حاصل کی، نصیر نے ریختہ میں مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی، ذوق نے غزل کو زبان اور محاورات سے آراستہ کیا، مومن اپنی نازک خیالی اور شوخیٔ ادا کے لیے ممتاز رہے، غالب کے طرز بیان، مسائل تصوف اور نکات فلسفہ نے شاعری کو عرش معلیٰ پر پہونچا دیا، مگر اس گروہ میں ظفر کی شاعری میں جو سلاست صفائی اور روزمرہ کی سادگی پائی جاتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے،

طرز سخن کا اپنے ظفر بادشاہ ہے اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا

ظفر کلام میں تیرے عجب صفائی ہے کہ ہر سخن ترا در خوش آب سے اچھا

خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو ترا ہر شعر تو ہر بحر میں بحر المعانی ہے

ظفر شاعری سے طبعی مناسبت رکھتا تھا، ایام شہزادگی سے زندگی کے آخیر دنوں تک شعر و سخن کی مشق کرتا رہا، ولی عہدی کے زمانہ میں دلی کے تمام باکمال شعراء مثلاً حکیم ثناء اللہ فراق حافظ عبد الرحمٰن خاں احسان، حکیم قدرت اللہ خاں قاسم، میر قمر الدین منت، نظام الدین ممنون، اُسکے در دولت پر حاضر رہتے وہ ان کو اپنا کلام سناتا، اور اُن سے ان کے نتائج فکر سنتا، سریر آرائے حکومت ہوا تو قلعہ معلّٰی کے اندر بزم مشاعرہ منعقد کراتا، کبھی کبھی شہر میں جا کر مشاعروں میں شریک ہوتا اپنی غزلیں پڑھتا، دوسروں کی سنتا، داد لیتا اور داد دیتا تھا، یہاں تک کے اساتذۂ فن میں شمار کیا جانے لگا تمام ارباب نظر نے اس کی سخن سنجی اور نکتہ آفرینی کی دل کھول کر داد دی،

ظفر شاعری میں پہلے تو نصیر، پھر بے تراپ، پھر ذوق اور آخر میں غالب کا شاگرد ہوا مگر اس کی ذہین اور مجتہدانہ طبیعت نے کسی ایک کی بھی ناصحانہ تقلید و پیروی نہیں کی، طبیعت میں خاکساری تھی اس لیے اساتذہ فن کی شاگردی قبول کر لیتا تھا، مگر اساتذہ اپنے لائق شاگرد کو اپنے خیالات اور جذبات سے متاثر نہ کرسکے، وہ شاید صرف فن کے اغلاط اور اسقام درست کردیتے تھے، ورنہ اگر ظفر اپنی راہ چھوڑ کر اپنے استادوں کی راہ پر گامزن ہوتا تو اُس کے سارے کلام میں اوّل تو نصیر کی مضمون آفرینی اور شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے یا پھر ذوق کی طرح اقلم زبان کی کہاوتیں اور عام لوگوں کے اوہام و مزعومات کی کثرت ہوتی، یا آخر میں غالب کے فلسفہ تصوف کے غوامض اور فارسی کی پرشوکت ترکیبیں ہوتیں، مگر ان میں سے کسی کے رنگ کی اثر پذیری اس کے کلام میں نہیں۔ وہ اپنے ہی رنگ اور طرزِ ادا کا مالک رہا، بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا پھر زندگی کچھ ایسی گذری کہ شاعرانہ بھی ہوتا تو انقلابات زمانہ اور حوادث روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہوجاتا۔

اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی عزت و وقار کا خاتمہ ہوا، نونان شبینہ کو محتاج ہوگیا دربدر ٹھوکریں کھاتا پھرا، لخت ہائے جگر کو خون میں تڑپتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس اور مقیّد ہوکر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ جان دے دی۔ شاعر بننے کیلئے اور کیا چاہیے تھا اور شعراء نے بلبل کے نالہ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی، اور شعراء نے عاشقاں زبوں حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں کھینچ کر عبرت کا پیام دیا ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستاں رہی، اس لیے اس کی جو صدا صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آواز بازگشت ہوگئی اور شعراء نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا رونا رویا، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستان کو اُجڑتے ہوئے اپنی آنکھ سے دیکھا اس کے خیالات میں محشر بپا نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا؟ اپنی شاعری میں خون جگر خوب خوب بہایا، اس کی تمام شاعری

مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہے یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری سلطنت کا آخری فرمانروا وہ ہو جو صحیح طور پر اس کے کمال کے زوال کا خونچکاں ماتم کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری حزن ملال، رنج الم، اور یاس و حسرت کی سراپا داستان ہے، دیوان میں بعض مثالیں ضرور ہیں جن میں رنگینیوں اور سرمستیوں کی جھلک ہے اور بعض تو متانت اور سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہیں، مگر یہ شاید غایت رنج و مصیبت غم والم کا ردعمل ہے،

ظفر کی اندوہناک زندگی میں کوئی ایسی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ دو چار گھنٹے بیٹھ کر غم غلط کر لیتا۔ گذشتہ روایات کے مطابق نہ شکار کی تفریحیں تھیں نہ عیش نشاط کی محفلیں اور قلعہ معلیٰ کے اندر مسرت اور شادمانی کی مجلسیں۔ لامحالہ شدت غم سے چھٹکارا پانے کے لیے ظفر شاعری میں رندبلانوش اور غافل از تمکین و ہوش ہو جاتا ورنہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ مصیبت و نکبت کی وجہ سے فقر و درویشی نے مزاج پر ایسا استیلا پا لیا تھا کہ وہ نہ صرف برابر اذکار و وظائف میں مشغول رہتا بلکہ آل تیموری کی لفظی و سیاسی پیری مریدی ظفر کے یہاں حقیقت بن گئی تھی، جس کا ذکر انھیں صفحات میں آئے گا۔

ظفر کا دیوان نولکشور پریس لکھنؤ سے چار جلدوں میں شائع ہوا ہے جس میں ہر قسم کے تیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں مثلاً حمد، نعت، سلام۔ مرثیہ۔ مسدس۔ مثلث۔ مخمس۔ مستزاد۔ قطعات، رباعیات۔ پنکھا او سہرا ہیں، بھاکا، پنجابی اور فارسی کے اشعار بھی ہیں، جن سے ظفر کی طباعی اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے اس مجموعہ میں وہ حصہ شامل نہیں جو ظفر نے غدر کے بعد کہا اس زمانہ کا کلام شائع نہ ہو سکا بلکہ ضائع ہو گیا۔ حالانکہ اس عہد کی شاعری میں نہ صرف پختگی بلکہ جذبات میں اور بھی درد اور شدت پیدا ہو گئی ہوگی۔ (۱)

ظفر کی شاعری کے محرکات اور عوامل

بہادر شاہ ظفر نے شعر کو اپنے سخن کا پردہ ٹھہرایا تھا۔ شاعری

(۱) بزم تیموریہ، ص ۳۲۶

میں یوں بھی بات صاف صاف نہیں کی جا سکتی تشبیہ اور استعارہ شاعری کی جان اور کنایہ بلاغت کی پہچان ہے۔ پھر شاعری میں غزل خاص طور سے اس اشاریت اور رمزیت کی علمبردار ہے بیان فنی نزاکتیں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں اور شاعر اپنے احساسات اور کیفیات کو چند مخصوص اشاروں اور علامتوں سے واضح کرتا ہے۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ، دام و دانہ، قید و قفس، صید و صیاد، بہار و خزاں، خندۂ گل، گریۂ بلبل، برق سوزاں، طوفان باد و باراں، نشیمن و شاخ نشیمن، قاتل و شہید، خون شہیداں، محضر شہادت، تیر و سناں، تیزہ و خنجر، رقیب و ناصح، کوچۂ یار سایۂ دیوار اور اسی قسم کے بے شمار استعارے غزل گو شعراء کے سخن کا پردہ ہیں اور انھیں پردوں میں ہمیں ان کا اصلی روپ دیکھنا ہوگا۔

غزل گو شاعر ہونے کے علاوہ بہادر شاہ ظفر کے لیے ایک اور بھی مشکل تھی۔ دوسرے غزل گو شعراء نے کبھی کبھی جذبات کی شدت میں صاف گوئی اور تلخ نوائی بھی اختیار کر لی ہے اور اس کے لیے شہر آشوب ہجویات، مثنویات وغیرہ بھی لکھ ڈالی ہیں۔ بہادر شاہ کی حیثیت عام شعراء سے کچھ الگ تھی۔ وہ بادشاہ نام کے تھے اور قلعہ معلّٰی میں بھی اُن کی حکومت بالکل آزاد نہ تھی۔ وہ یہاں بھی لب کشائی نہ کر سکتے تھے، پرچہ نویس اور مخبر ان کے روز و شب کی روداد انگریز ریذیڈنٹ کو پہنچاتے رہتے تھے، ایک تو اس وجہ سے کوئی بات کہتے ڈرتے تھے۔ دوسرے فقر منشی اور بے نوائی کے باوجود نام کے شہنشاہ ضرور تھے اور کسی قدر رکھ رکھاؤ کے لیے مجبور تھے اور بھی شاعروں کی عام سطح پر اتر کر نالہ و فریاد آہ و بکا کرنے میں سودا یا نظیر اکبرآبادی کا رنگ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جن بندشوں کو عوام تک محسوس کر چکے تھے اور جن کے توڑنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں کوشش کی گئی تھی۔ قدرتی طور پر بہادر شاہ انھیں اور بھی شدت سے محسوس کرتے ہوں گے ان کے سامنے صرف اپنی مجبوری ہی نہ تھی آل تیمور کا وہ کھویا ہوا اقبال اور جاہ و جلال بھی تھا جس پر دلّی کا سنگین قلعہ گواہ تھا۔ اس اقبال اور شان و شکوہ کو جو ان کی میراث تھا حاصل کرنے کی خواہش ان کے دل میں بھی چٹکیاں لیتی تھی۔ بندشوں سے آزاد ہونے کا جذبہ ان میں قدرتی طور پر زیادہ شدت سے نمایاں ہوا ہوگا اور ان کا کلام بھی اسی کی شہادت دیتا

ہے۔ سے

دل بتوں سے لگا کے کیا پایا — دین و ایماں گنوا کے کیا پایا

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر — تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

نہ بجھا سوزِ دل جب آنکھوں سے — ہم نے دریا بہا کے کیا پایا

اس غزل سے تسلی نہ ہوئی تو اسی زمین میں ایک اور غزل کہی، اس کا ایک شعر دیکھیے :۔

کشتۂ تیغِ غم سے پوچھ اپنے — تو نے جی سے گزر کے کیا پایا

حاسدوں نے ظفر مرے سر پر — پوچھ بہتان دھر کے کیا پایا

یہ دونوں غزلیں ایک ایسے شخص کی کیفیت کی آئینہ دار ہیں جس نے جدوجہد کر کے کچھ نہ پایا ہو۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کچھ اس قسم کی ثابت ہوئی، سیاسی شعور پختہ نہیں ہوا تھا، تعلیم کی کمی تھی، اپنی صفوں میں انتشار تھا۔ راجے اور مہاراجے اپنے حلوہ مانڈے کی فکر میں تھے اور برطانیہ کے خیر خواہ قریہ قریہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان حالات میں اس جدوجہد کو اسیرانِ خانہ زنجیر کے غل مچانے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ شعر پڑھیے ۔

اے اسیرانِ خانۂ زنجیر
تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا

غیر ملکی حکومت کے غلاموں کے لیے اسیران خانہ زنجیر کا استعارہ بالکل واضح ہے اسیر اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے اور اس کا نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔ لیکن اس جدوجہد میں ایسا انتشار، اس قدر بدنظمی اور بدسلیقہ پن تھا کہ اسے صرف غل مچانے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مصرع میں "یاں" کا لفظ خاص حالات اور واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے حالات مختلف ہوتے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو شاید غل مچانے سے بھی کوئی نتیجہ برآمد ہوتا۔ لیکن جیسی دار و گیر سختی اور سخت گیری یہاں تھی اس نے اس کا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہونے دیا۔ اس جدوجہد

اور جنگ آزادی میں بہت سے لوگ جی سے گذر گئے، کچھ بدامنی کے زمانہ میں مارے گئے اور اس سے زیادہ امن قائم ہونے پر پھانسی پر لٹکائے گئے۔ خاندان کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے جن بیگمات کو کبھی چشم فلک نے نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے جنگلوں میں ٹھوکریں کھائیں اور جن کے یہاں لکھ لٹتا تھا۔ ان کے بچوں نے تین تین دن کے فاقے کیے۔ بہادر شاہ ظفر کو کئی وقت کے فاقہ درگاہِ نظام الدین اولیاء اور ہمایوں کے مقبرے میں گزارنے کے بعد بیسن کی روٹی اور سرکے کی چٹنی نصیب ہوئی تھی، اس کے بعد امن کے قیام کا اعلان ہوا خیر خواہوں کو انعامات جاگیریں اور خطابات ملے۔ ان کے مقابلہ میں

کشتۂ تیغ غم سے پوچھ اپنے
تو نے جی سے گزر کے کیا پایا

اس جدوجہد کا ایک رُخ یہ تھا کہ اسے ایک منظم سازش اور بغاوت یا غداری کا نام دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر پر الزام یہ تھا کہ وہ افغانستان اور رُوس سے ساز باز رکھتے تھے اور انگریزوں کے خلاف اُن سے مدد کے طالب تھے اور انہی کے اشارے پر مولویوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ یہ سب بہادر شاہ پر بہتان تھے اور محض سازش کا مقدمہ مضبوط کرنے اور انھیں سزا دینے میں انصاف کی آڑ لینے کی کوشش تھی، بہادر شاہ ظفر کو جو کرنا تھا کر گذرے مگر خود اُن کا فیصلہ کرنے والوں کا بھی ایک دن تاریخ فیصلہ کرے گی بہادر شاہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے

حاسدوں نے ظفر مرے سر پر
پوچھ بہتان دھر کے کیا پایا (۱)

ظفر کا رنگ کلام

ظفر کے کلام کی خصوصیت کیا ہے؟ بہتر ہے کہ اس پر بھی ہم ایک نظر ڈالتے چلیں:۔

---

(۱) غزلِ المتغزلین صد ۱۵۲

ان کا طرز کلام بہت صاف اور سادہ ہے۔ کلام بہت مزیدار صاف اور سلیس ہوتا ہے۔ اور ایک خاص درد و اثر رکھتا ہے جو ان کے مصائب کی اصلی تصویر ہے۔ ظفر اکثر جگہ مشکل بحریں، اور سخت ردیف اور قافیہ میں بھی غزلیں کہتے تھے۔ جو بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ ان کے خیالات بلند اور تشبیہ رنگین اور جذبات دلنشیں ہوتے تھے۔ (۱)

کلام کی ترتیب و اشاعت

ظفر کو خود بھی اپنے کلام کی اشاعت اور ترتیب سے دلچسپی تھی، چنانچہ غدر سے پہلے ہی ان کا ایک دیوان چھپ گیا تھا:

"۲۴ اکتوبر ۱۸۴۵ء، بادشاہ سلامت کا اُردو دیوان مرتب ہو کر مطبع سیّد الاخبار سراج الاخبار میں چھپ گیا ہے، خط نستعلیق ہے کاغذ ولائتی ہے کل ۶۶ جزء ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۶ سطریں ہیں چمڑے کی جلد بھی بنائی گئی ہے۔ آٹھ روپیہ میں فروخت ہوتا ہے۔ صاحبان ذوق کلام الملوک ملوک الکلام کا لطف اٹھانا چاہیں تو دونوں مطبعوں میں سے جس مطبع سے چاہیں طلب فرمائیں۔ (۲)

مجموعۂ کلام

بادشاہ کے پانچ دیوان تھے لیکن دفتر پنجم آشوب غدر میں ضائع ہو گیا اور اب رائج الوقت کلیات میں صرف چار دیوان ہیں۔

پہلا دیوان زمانۂ ولی عہدی کی تصنیف ہے اس کا بیشتر حصہ ۱۲۲۳ھ یا ۱۲۲۴ھ میں شیخ ابراہیم ذوق کی شاگردی شروع ہونے سے پہلے مرتب ہو چکا تھا مگر تفکرات اور تہی دستی کی بدولت مدت تک شائع نہ ہو سکا۔ سنہ ۹ جلوس میمنت مانوس (۱۲۶۱ھ) میں پہلی مرتبہ مطبع سلطانی واقع قلعہ معلّی میں چھپا۔

اس دیدہ زیب ایڈیشن کا ایک نسخہ کتب خانۂ سرکاری ریاست رام پور میں موجود ہے

---

(۱) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) صـ ۲۱۰

(۲) بہادر شاہ کا روزنامچہ صـ ۲۹

اور اس کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت نواب کلب علی خان مرحوم کے دست خاص کی لکھی ہوئی ہے۔

"نسخہ ہذا بتاریخ بستم رجب ۱۲۶۵ھ از جائے بطریق تحفہ نزد عاصی محمد کلب علی آمد، ہرگز نرفت برہ من سرورسے بالاتر از دمیکہ ایں نسخۂ بہاریں یا فتم"

نواب خلد آشیاں اُس وقت ولی عہد تھے۔ بادشاہ کا دیوان پاکر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار جن مختصر اور معنی خیز الفاظ میں کیا ہے اُن سے ظفر کی عزت و توقیر میں افزائش نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ خود نواب کاتب کی سخن فہمی۔ نکتہ سنجی اور قدر شناسی کی دلیل روشن ہیں۔

اس دیوان میں علاوہ غزلیات اور قطعات کے ۱۹ مخمس۔ ۶ مسدس اور ۲۰ مثلث شامل ہیں فی الحقیقت ظفر کا بہترین کلام اسی دیوان میں ہے۔ بادشاہ کا دوسرا دیوان ۱۲۶۶ھ (۱۳ سنہ جلوس) میں مطبع سلطانی سے شائع ہوا۔ اس میں علاوہ غزلیات کے ایک سلام، ایک مرثیہ اور چھ مخمس ہیں۔

غدر کے بعد اس دیوان ثانی کی ایک کاپی لکھنؤ۔ پہونچی اور شیخ قادر بخش مالک "اودھ گزٹ محلہ حسین گنج در کوٹھی غلام حسین" نے ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۶۰ء) میں شائع کیا دیوان اول کا مکمل نسخہ شیخ قادر بخش کو دستیاب نہ ہوسکا۔ چند غزلیں اس دیوان کی میسر آئی تھیں لہٰذا "انتخاب دیوان اول" کے نام سے اس دیوان کے ساتھ بطور ضمیمہ کے چھاپی گئیں۔

مالک مطبع نے خاتمہ پر لکھا ہے کہ

"بصد دقت صرف ایک نسخہ مطبوعہ دہلی برائے کتابت ہاتھ آیا۔ وقت مطالعہ غلط پایا۔ شائقین کا شوق بہ درجہ کمال دیکھا، دوسرا نسخہ سر دست ممکن ہونا محال دیکھا، ناچار مطابق نسخۂ مذکور کے چھپوایا۔

دیوان سوم اور دیوان چہارم بھی غدر سے پہلے مطبع سلطانی سے شائع ہوئے تھے ان میں بھی علاوہ غزلیات اور قطعات کے سلام اور مخمسات ہیں۔ دیوان چہارم میں چند رباعیات بھی ہیں۔ ایک رباعی سنیئے،

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعث غم گن گن کے
شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کے
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں
ہم ظفر اس لیے رکھتے ہیں قدم گن گن کے

سب سے پہلے مطبع مصطفائی دہلی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے بادشاہ کے چاروں دیوان ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۲ء) میں یکجا شائع کیے اور اہل ملک کی قدردانی سے چند روز میں فروخت ہو گئے، منشی نولکشور لکھنوی نے ۱۸۶۹ء میں اسی مجموعہ کی منشی امیر اللہ تسلیم سے تصحیح کرائی اور اپنے مشہور مطبع سے ۱۸۷۰ء میں کلیات مروّجہ کا پہلا ایڈیشن شائع کیا۔

کلام ظفر کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ چند روز میں کل کاپیاں بک گئیں اور بازار سے ھل من مزید کی صدا آنے لگی۔ کلّیات دوبارہ چھپا۔ سہ بارہ چھپا اور ۱۹۱۹ء میں پانچویں بار طبع ہوا۔ افسوس ہے کہ ہر ایڈیشن میں غلطیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور اب مروّجہ دیوان کا کوئی ورق اغلاط سے خالی نہیں ہے۔ خدا کسی عالی ہمت کو توفیق دے کہ وہ اس کلیات کو دواوین مطبوعۂ قلعہ معلیٰ سے مقابلہ کر کے شائع کرے اور کلام ظفر کو دوبارہ زندگی نصیب ہو۔ (۱)

ظفر کی تاریخیں ظفر اگرچہ ایک نغز گو شاعر تھے، لیکن انھوں نے جو برجستہ اور معنی آفریں تاریخیں لکھی ہیں، وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں ذیل

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)،

میں ہم ان کی چند تاریخیں درج کرتے ہیں:۔

(۱)

انگریزی سرکار کی کوشش سے نہر کا پانی قاضی کے حوض میں پہنچا دیا گیا تھا اور محبوب علی خواجہ سرا نے اپنے پاس سے حوض کی مرمّت کرائی تھی۔ اس لیے بادشاہ سلامت نے صاحب ایجنٹ بہادر کے پاس یہ قطعہ بھجوا دیا تاکہ پتھّر پر کندہ کرا کے حوض پر لگوا دیا جائے ؎

آب در منبع ایں نہر جدید ۔۔۔ کرد چوں معتبر الدولہ رواں
ہاتفِ غیب بوصف فیضش ۔۔۔ گفت تاریخ لبا فیض رساں (۱)

(۲)

مسجد و مکان حکیم احسن اللہ خاں

درگاہ شریف کے قریب یہ مکان نہایت خوش نما سرِ راہ واقع ہے۔ جو مشہور زمانہ احترام الدولہ عمدۃ الحکما معتمد الملک حاذق الزمان حکیم محمد احسن اللہ خاں صاحب بہادر ثابت جنگ کا بنوایا ہوا ہے۔ بہادر شاہ کے دورِ آخری کے سب سے بڑے رکن یہی تھے۔ مسجد اور مکان دونوں پر قطعاتِ تاریخی لگے ہوئے ہیں اور یہ ہیں:۔

تاریخ مسجد

مسجدے ساخت چوں بحُسنِ عمل ۔۔۔ احسن اللہ خان پاک سرشت
اے ظفر بہرِ سالِ تاریخش ۔۔۔ خامہ ام "خانۂ خدا" بنوشت
۱۲۶۱

تاریخ مکان

از سالِ بنائے نو بدرگاہ ۔۔۔ پیر خرد م نمود آگاہ
برداشت سر از دیار دہلی ۔۔۔ تعمیر فقیر احسن اللہ
۱۲۶۳

---

(۱) سرطامس مٹکاف کی ڈائری ص۔

اب اس مکان میں عیسائی لوگ رہتے ہیں۔ اسی کے پاس مرزا ثریا جاہ کی حویلی بھی ایک قدیم عمارت ہے۔ (۱)

(۳)

ولی عہد بہادر (دارا بخت) کی وفات کی تاریخ خود بدولت نے زبان مبارک سے اس طرح ارشاد فرمائی،

آں ولی عہدے کہ "دارا بخت" بود
کرد چوں رحلت ازیں دنیائے دول
شد درون خلق داغ از سوز غم
گشت سال رحلتش "داغِ درون" (۲)

اب ہم ظفر کے کلام پر، زبان اور محاورہ کی حیثیت سے

کلام ظفر زبان اور محاورہ کی حیثیت سے

ایک سرسری نظر ڈالیں گے:

بلا ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، زنجیر ڈال دینا، تاثیر ڈال دیتا، دریا میں ڈال دینا، آگ میں ڈال دیتا، شمشیر ڈال دیتا، جیسے محاورات پر ظفر کی طبع آزمائی:۔

(۱) دل بہ بلائے زلف گرہ گیر ڈال دی
تو نے مصیبت اے میری تقدیر ڈالدی

(۲) جب روبرو وہ آئے تو پائے نگاہ میں
موج سرشک چشم نے زنجیر ڈال دی

---

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ سوم ص ۲۸۹
(۲) سرطامس مٹکاف کی ڈائری، ص ۲۵

(۳) اپنی بھویں بنا کے دکھائیں جو یار نے
شمشیر گر نے ہاتھ سے شمشیر ڈال دی

(۴) لکھا جو ہم نے اپنی سرافگندگی کا حال
گردن قلم نے بھی دم تحریر ڈال دی

(۵) جب ہم سمجھ گئے کہ ہے تقدیر کیمیا
دریا میں ہم نے جیسی کہ تھی اکسیر ڈال دی

(۶) چوں مہر و مہ بہم ہوئے دوبار گرد و روز
تو نے جدائی اے فلک پیر ڈال دی

(۷) مانی دکھا کے اپنا مرقع خجل ہوا
جب اس کے سامنے تیری تصویر ڈال دی

(۸) کیونکر نہ ہو اثر دل عالم میں اے ظفر
ترے سخن میں عشق نے تاثیر ڈال دی

کھینچنے کے مختلف محاورات بھی سن لیجیے :-

(۱) جو خنجر گل نے عندلیب زار پر کھینچا
تو قمری کو بھی ہے سرو چمن نے دار پر کھینچا

(۲) کھڑا ہوں محو حیرت یوں لگا دیوار سے تیرے
کسی نے نقش ہو جیسے کوئی دیوار پر کھینچا

(۳) وفا کا کر کے تو اقرار ہم سے ہو گیا منکر
تری الفت سے ہم نے ہاتھ اس انکار پر کھینچا

صنائع لفظی اس کا کلام لفظی صناعی سے، جو متاخرین کے کلام کا زیور ہے خالی نہیں، پہلے مصرع کے لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیکھیے کیسے دوسرا مصرع بنا

لیتا ہے۔

یہی ایک غم ہے یہی ایک الم ہے
مری چشم نم ہے اسی رنج و غم میں
خدا کی قسم ہے یہ کہتا ہوں سچ میں
کیا کب رقم ہے کوئی شکوہ میں نے

یہی اک الم ہے یہی ایک غم ہے
اسی رنج و غم میں میری چشم نم ہے
یہ کہتا ہوں سچ میں خدا کی قسم ہے
کوئی شکوہ میں نے کیا کب رقم ہے

ظفر کیا ستم ہے ہوا دوست دشمن
ہوا دوست دشمن ظفر کیا ستم ہے

بدائع کی اصطلاح میں اس کو عکس کہتے ہیں، یہ صفت اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نظر سے نہیں گذری، البتہ قدیم فارسی شعراء کے یہاں ملتی ہے، اس کے علاوہ دوسری لفظی صنعتیں بھی ظفر کی شاعری میں پائی جاتی ہیں مثلاً کسی موصوف کی پے در پے صفتوں کو لانا جیسے!

(۱) شوخ چشمے خوش نگاہے بیوفائے بدگمانے
دلفریبے دلنوازے دلربائے دلستانے

(۲) ہم ظفر ہیں اس پہ مفتوں خوار و رسوا، زار، محزوں،
وہ پہچانے یا نہ مانے وہ یہ جانے یا نہ جانے،

ایک ہی تشبیہ کو طرح طرح سے ادا کرنا

زلف اور سانپ کی تشبیہ معمولی چیز ہے مگر دیکھیے ظفر اس معمولی چیز میں اپنی جدت طبع سے کیسی کیسی ندرتیں پیدا کرتا ہے۔

(۱) زلف یوں روئے عرق آلود پر لہرائے ہے
صبح جوں ناگن گلوں پر چاٹنے اوس آئے ہے

---

(۲) اڑ کر بھی زلف یار سے ناگن نہ بچ سکی
جس وقت اس کے منہ پہ چڑھی مار کھا گئی

---

(۳) کیوں سوتے سوتے چونک پڑے خواب میں ظفر
وہ مار زلف دیکھ کے شاید ڈرے سے ہو

محاورات اس سادگی کے باوجود ظفر کو زبان پر اتنی قدرت ہے، کہ بادشاہ سخن بن کر زبان اور الفاظ پر فرماں روائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلعہ معلیٰ بلکہ اردو زبان کا کوئی محاورہ ایسا نہیں جو اس کے دیوان میں موجود نہ ہو اور ان محاورات کو اس خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں باندھ جاتا ہے کہ اشعار کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا۔ (۱)

فنکارانہ اشعار ظفر کے کلام میں، مخصوص فنون کی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں، اور محاورات بھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے ہر پہلو پر ان کی نگاہ کتنی وسیع تھی، اور اظہار و بیان کی کیسی عجیب قدرت خدا نے انھیں عطا فرمائی تھی:۔

مرغ بازی کے اصول و قواعد پر عبور اشعار ذیل سے ثابت ہے۔

رہے ہے پر خلش دشمن دم جنگ
نہیں یہ مرغ لڑتا کھل گے کانٹے

ابھی ہونے کا نہیں لڑنے کو تیار عدو
بھڑکے یہ مرغ تو دو چار برس میں بھڑکے

موسم گل کی خبر سن کے قفس میں صیاد
آکے کریال میں ہر مرغ خوش آہنگ کھلا

مستعد ہے جنگ پر غیروں کے کہنے سے ظفر
ہے یہ مرغ بے حیا کس چاؤ پہ پانی چڑھا

---

(۱) بزم تیموریہ صفحہ ۲۵

بٹیربازی کی شان سب سے اعلیٰ ہے :-

چھوٹیں لڑنے کو اگر یہ تو لڑیں مرغ سے بھی
مرغ کو بلکہ یہ سیمرغ کو لیں مار بٹیر

چاک کرتے ہیں حریفوں کے بٹیروں کا جگر
تیز جو کرتے ہیں یہ خنجر منقار بٹیر

مجھکو یہ عشق ہے ان سے کہ کھلاؤں انکو
کھائیں گر دانہ کی جا گہ پر شہوار بٹیر

تیلیاں پلکیں ہوں اور چشم بنے جوں کابک
گر رہیں آنکھوں میں یہ مرغ نظردار بٹیر

ہوئے اس کھیل میں دل صدیوں کے بند ایسے
دام صیاد میں ہوں جیسے گرفتار بٹیر

اتفاقاً کوئی ان میں سے جو گھٹ بھی جاوے
بے مزہ دیں جو لڑا مرے طرفدار بٹیر (۱)

دردوسوز ظفرؔ کے کلام کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے، جس کے الفاظ سوز تاثیر سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً!

(۱)

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے
شغال اب ہیں جہاں رہتے کبھی بستے بشریاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں
کبھی اُڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے

جہاں چٹیل ہے میداں اور سراسر ایک خارستاں
کبھی یاں قصر و ایوان تھے چمن تھے اور شجر یاں تھے

جہاں ہیں سنگ ریزے تھے یہاں یاقوت کے تودے
جہاں کنکر پڑے ہیں اب کبھی رُلتے گہر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشاں
کبھی کیا کیا تھے ہنگامے کیا کیا شور و شر یاں تھے

جہاں اب خاک پر ہے نقش پائے آہوے صحرا
کبھی محو تماشا دیدۂ اہل نظر یاں تھے

ظفر احوال، عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

---

(۱) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

(۲)

(۱) نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

(۲) نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

(۳) ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

(۴) لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
وے ناز و کرشمہ کی تیغ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

(۵) ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

ظفرؔ کے سو شعر

ظفرؔ کا مجموعۂ کلام چار دیوانوں پر مشتمل ہے، اور بلا مبالغہ ہزارہا اشعار پر محیط ہے، ان اشعار کا انتخاب اگر مختلف عنوانات کے ماتحت ضروری تشریح و تعبیر کے ساتھ کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب اس موضوع پر تیار ہو سکتی ہے، ظاہر ہے اس کا موقعہ نہیں، میں نے چاروں دیوانوں میں سے ۲۵-۲۵ اشعار چن لیے ہیں۔ اس طرح سو اشعار کا گلدستہ تیار ہو گیا ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے، اس سے ظفرؔ کے اسلوب کلام کا اندازہ بہرحال ہو جائے گا۔

(۱) دل پر خوں سے فکر چشم نہیں ہم خوں نہ بھر لا دیں
جو شیشہ ہو گا مے ہو گی تو پیمانہ کبھی ہووے گا

(۲) جیسے چشم میں آنسو ہیں کب ہوتے صدف میں ایسے ہیں
دیکھ بہ چشم غور گہر ایک اس میں کا اک اس میں کا

(۳)
نصیحت سن چکے ہم تیری ناصح
خدا کے واسطے بک بک نہ کر، چپ

(۴) جز اشک مسلسل نہیں کچھ پاس ہمارے
یہ تیرے لیے موتیوں کا ہار ہے موجود

(۵) یہ تکمۂ یاقوت نہیں تیرے گلے میں
ہے قطرۂ خونِ دلِ دلگیر گلوگیر

(۶) ہر روز ستم تازہ ہے، ہر روز نیا ظلم
اے شوخ ستمگر تیری ایجاد کو شاباش

(۷) نہ کچھ شراب و نگہ میں تری کمی بیشی
نہ تیری چشم میں اور ساغر شراب میں فرق

(۸) دامن چرخ جلا دے نہ کہیں دیکھ اے ابر
شعلۂ آہ مرا، برقِ شرر بار سے مل

(۹) رُخ کو تیرے نہ کہوں برق، نہ شعلہ، نہ قمر
بلکہ خورشید جہاں تاب کہے تو کہہ دوں

(۱۰) کاروان عمر جاتا ہے کدھر؟ پائیں کہاں
گرد بھی اس کی سرِ راہ سفر اڑتی نہیں

(۱۱) برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچہ میں اے بادِ سحر خاک نہیں

(۱۲) اے ظفر چرخ پہ خورشید جو یوں کانپے ہے
جلوہ گر آج کہیں یار سرِ بام نہ ہو

(۱۳)

کہتے ہیں وہ آئینہ میں جلوہ اپنا دیکھ کر
ماہ پیکر، مہر طلعت ہم نہ ہوں تو کون ہو ؟

(۱۴) برنگ گل ہنساتے گر نہیں تم ہے!
تو شبنم کی طرح رلواتے کیوں ہو؟

(۱۵) ہم اپنا عشق چمکائیں تم اپنا حسن چمکاؤ
کہ حیراں دیکھ کر عالم ہمیں بھی ہو تمھیں بھی ہو

(۱۶) ہو کیوں کہ کسی سے ظفر امید محبت
ہم جانتے ہیں جیسے ہیں احباب زمانہ

(۱۷) کسے دماغ ہے سنے کون ؟ دردِ سر کے سوا
نہیں ہے فائدہ واعظ کی قیل و قال میں کچھ

(۱۸) زلف و رخ جاناں کا مت پوچھ ظفر مجھ سے
وہ ابر بہاراں ہے، یہ برق درخشاں ہے

(۱۹) منزل عشق بہت دور ہے اللہ اللہ
ایک ہی گام میں تم تھک کے ظفر بیٹھ گئے

(۲۰) تیری نگاہ جو بُتِ بے پیر پھر گئی
قسمت مری اُلٹ گئی، تقدیر پھر گئی

(۲۱) آتے آتے اس طرف ان کی سواری رہ گئی
دل کی دل میں آرزوئے جاں نثاری رہ گئی

(۲۲) ناصح نہ اُٹھا سر کو درِ یار سے میرے
کرتا ہے خلل کیوں تو عبادت میں کسی کی

(۲۳)
جو درد ہوتا تو غل مچاتا، جو سایہ ہوتا تو سر ہلاتا
الٰہی دل کو مرض یہ کیا ہے نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

(۲۴) تھے برنگِ گل شگفتہ، غیر کی محفل میں وہ
دیکھتے ہی مجھ کو چہرے پر اداسی آ گئی

(۲۵) ابرِ تر ہم چشم کیا ہو ابرِ مژگاں کے مرے
اس سے برسے آب، یہ خوں نا تر برسائے ہے

(۲۶) چراغ و شمع میں کیا، برق کیا اور شرر میں کیا
جہاں دیکھا وہاں ایک جلوہ تیرے نور کا دیکھا

(۲۷) مری نگہ نے مرا راز کہہ دیا اس سے
بلا سے گر نہ کہا، میں نے مدعا نہ کہا

(۲۸) آیا نہ میرے دیدۂ گریاں کے سامنے
سو بار دیکھا ابرِ بہار اٹھ کے رہ گیا

(۲۹) کہاں میں اور کہاں کوئے عشق یہ جانو
لکھا تھا کعبہ کا تقدیرِ برہمن میں سفر

(۳۰) اس نے پوشیدہ الٰہی کسے لکھا ہے خط؟
سنتے ہیں ہم کہ چھپا کر کہیں بھیجا ہے خط!

(۳۱) فروغِ حسن میں ہے نشۂ شراب کو دخل
نمودِ صبح میں ہے نورِ آفتاب کا میل

(۳۲) جاؤ غماز کی نہ باتوں پر
ہے وہ بیہودہ گو خدا کی قسم

(۳۳)

نالۂ شب ہی کے کیا اگلے اثر کو روئیے
تجھ میں بھی تاثیر اے آہ سحر اگلی نہیں

(۳۴) نہ ہم کچھ ہنس کے سیکھے ہیں نہ ہم کچھ رو کے سیکھے ہیں
جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں کسی کے ہو کے سیکھے ہیں

(۳۵) جو دوست تھے وہ ہیں دشمن عجب تماشہ ہے
ہوا ہے دیکھو زمانہ کا حال کیا کچھ!

(۳۶) نہیں تحقیق کہ کیا ہے ترے بیمار کا حال
کل خبر اور سُنی آج خبر اور سُنی

(۳۷) آئے گا خاک ہو کے بھی، دامن نہ اس کا ہاتھ
قسمت تو اپنی ساتھ ہی ہیہات ہووے گی

(۳۸) نکلیں گے خانقاہ سے جس وقت پھر وہی
ہم ہوں گے، رند ہوں گے، خرابات ہوے گی

(۳۹) بلا سے گر نہیں ہے سایۂ بال ہما سر پر
تری دیوار کا سایہ کچھ ایسا ہے کہ کیا کہیئے

(۴۰) کل ظفر بیٹھے تھے بن کر پارسا اور آج پھر
میکدہ کا قصد ہے تو پارسائی ہو چکی

(۴۱) ہنسے جب گل ترے منہ پر تو اس کو
طمانچے پھر صبا مارے کہ چھوڑے

(۴۲) جاگیر میں وحشت نے دیا ہم کو جو صحرا
جانا کہ ترقی ہوئی منصب میں ہمارے

(۴۳)

ہیں ظفر گرچہ گہر بار ہمیشہ بادل
لیک خوں بار مری طرح کوئی ہو تو سکے

(۴۴) بن سکتی ہے تدبیر اگر بن کے بگڑ جائے
کیا بن سکے تقدیر اگر بن کے بگڑ جائے

(۴۵) یا نہ ہو وہ مری نظر سے دور
یا مری آنکھ دور بیں ہو جائے

(۴۶) کس کا محشر اگر وہ آ جائے
حشر برپا ابھی یہیں ہو جائے

(۴۷) سب ہے تدبیر کی کہی جاتی
نہیں تقدیر کی کہی جاتی

(۴۸) دہن زخم گر زباں رکھتا
صفت اس تیر کی کہی جاتی

(۴۹) بلا سے خاک عاشق کی اگر برباد ہو جاتی
پر اس کوچہ میں اے باد سحر پہونچا تو دی ہوتی

(۵۰) کہوں کیا ماجرائے بے ثباتی نقش ہستی کا
مٹا جاتا ہے یوں گویا کہ یہ پانی پہ لکھا ہے

(۵۱) افسوس اپنے اشک کی جانی نہ ہم نے قدر
کیا بے بہا نگینۂ الماس کھو دیا

(۵۲) کچھ لطف زندگی کا اگر ہے اسی میں ہے
ہے یہ جو دوستوں کی ملاقات چند روز

(۵۳)

ہم چمن میں کر رہے ہیں آشیاں اپنا درست
کرتا ہے صیاد فکر دام و تدبیرِ قفس

(۵۴) ہیں خوشامد بھی اگر اس کی کروں
ہو کے وہ ناخوش کہے ہے یوں "چہ خوش"

(۵۵) حق وہی ہے جو حق کو ہے منظور
اور سارے ہیں قیل و قال دروغ

(۵۶) ناصح نصیحتیں تری ہم سُن چکے بہت
خاموش ہو کہ اب نہیں طاقت دماغ میں

(۵۷) ہر شب ہمیں فرقت میں روتے ہی گزرتی ہے
نے صبح کو سوتے ہیں نے شام کو سوتے ہیں

(۵۸) مرا اور مجنوں کا ہے ایک عالم
برابر کی صورت، برابر کا نقشہ

(۵۹) ہر جگہ ایک نیا رنگ ہے اللہ اللہ
واہ کیا جلوۂ نیرنگ ہے اللہ اللہ

(۶۰) کیا ترا چہرۂ پر نور ہے سُبحان اللہ
کیا ترا طرۂ شبرنگ ہے اللہ اللہ

(۶۱) ہے ساغرِ مے جامِ جہاں بیں سے مشابہ
میخانہ ہے اک سلطنتِ جم کا نمونہ

(۶۲) نہ رہا یار، نہ غم خوار، نہ مونس، نہ رفیق
مگر اک غم نے دیا عاشقِ غمگیں کا ساتھ

(۶۳)

ہم اُٹھائیں کیوں ستم ان کے، ہمیں کیا واسطہ
یہ تو ہے اے حضرتِ دل سب تمھارا واسطہ

(۶۴) شکل اس نے ہمیں آ کر جو دکھائی اللہ
دل میں کیا اس بُتِ کافر کے یہ آئی اللہ

(۶۵) ہم نے تم سے بھلائی ایسی کی
تم نے ہم سے برائی ایسی کی

(۶۶) اثر کیا خاک ہے گریہ میں تیرے ڈوب مرشبنم
کہ گل ہنستا ہے تجھ پر ادھر غنچہ مسکراتا ہے

(۶۷) وہ آئے یا نہ آئے پر دلِ بیتاب کو اپنے
تسلّی میں یہ دیتا ہوں اب آتا ہے اب آتا ہے

(۶۸) نہیں ناداں کی دوستی بہتر
بلکہ دانا کی دشمنی اچھی!

(۶۹) جو کریں گے جمع یاں غافل نہیں جائیں گے چھوڑ
ہاں مگر ارمان و حسرت ساتھ لے جائیں گے

(۷۰) خوں اپنا گراؤں جو گرے ان کا پسینہ
اور ہائے ستم وہ مرے لوہو کے ہوں پیاسے

(۷۱) بات وہ کرتا نہیں لیکن ادھر
چپکے چپکے دیکھتا جاتا تو ہے،

(۷۲) سنتا نہیں کوئی میری کہانی
اگرچہ ہیں واں قصہ خواں اچھے اچھے

(۷۳)

ظفرؔ شکوہ نہ کر اُس نے، تجھی سے بے وفائی کی
بتا اس بے وفا نے اور کس سے یاں وفا کی ہے؟

(۷۴) وفورِ اشک سے ہے اب یہ عالم چشمِ گریاں کا
کوئی کہتا ہے قلزم ہے، کوئی کہتا ہے جیحوں ہے

(۷۵) بیٹھے اب باتیں بنائیں ہم بیاں ہوتا ہے کیا
بات اپنی جب وہاں کچھ بن نہ آئی کیا رہی؟

(۷۶) قربان ترے ہاتھوں کے کماں دار کہ تو نے
کیا میری طرف تیر بھویں تان کے چھوڑا

(۷۷) یہ مریضِ عشق جاں بر ہو چکا
اے طبیب اس کی دوا کرتا ہے کیا؟

(۷۸) ہم تو ترسیں جمال کو تیرے
دیکھے آئینہ دم بدم صورت

(۷۹) پاتے نہیں ہم تو کبھی رندوں کو مشوّش
آتی ہی نہیں بزمِ خرابات میں تشویش

(۸۰) انساں کی زندگی ہے تو اک دو نفس تلک
ساماں کرے ہے جینے کا لاکھوں برس تلک

(۸۱) پوچھتے ہو کیا حال مرا جو کچھ ہے سو وہ سامنے ہے
بالیں پر اک لحظہ میرے، آؤ بیٹھو، دیکھو تم

(۸۲) مغز میرا اڑ گیا، ناصح نصیحت کو سلام
بوسہ ہا رو تم تو میں کرتا ہوں حضرت کو سلام

(۸۳)

غم مرا غم گسار ہے میرا!
غم کا غم خوار ہے تو یاں میں ہوں

(۸۴) ترے مریض کے سو سو علاج ہوں لیکن
شفا نہ اس کے نصیبوں میں ہو تو کیونکر ہو؟

(۸۵) ہر ادا اک بلا معاذ اللہ
تو وہ کافر ادا معاذ اللہ

(۸۶) دیکھنے دو مجھے بد بیں جو بُرا کہتا ہے
میں بُرا ہوں کہ بھلا اس کو خدا دیکھتا ہے

(۸۷) جب وہ تشریف ادھر لاتے ہیں چلتے پھرتے
گالیاں ہم کو سنا جاتے ہیں چلتے پھرتے

(۸۸) دل کو وہ تاڑ لے ہے نظروں میں
لاکھ کوئی بچا کے لے جائے

(۸۹) تدبیر لوگ کرتے ہیں کیا کیا پڑے ظفر
چلتی نہیں کسی کی مقدّر کے سامنے

(۹۰) نہ نکلا فلک ایک ارمان اپنا
رہی دل ہی میں آرزو سو طرح کی

(۹۱) نصیبہ جب مرا اچھا تھا اور تقدیر اچھی تھی
مری ہر بات اچھی تھی، ہر اک تدبیر اچھی تھی

(۹۲) گرچہ بہ رنگ گل ہنسے باغ جہاں میں ایک دم
شبنم گل کی طرح پھر روتے ہی ہم چلے گئے

(۹۳)
رسائی ہوئی غیر کی بھی وہاں تک
یہ آہِ رسا نے رسائی دکھائی

(۹۴) دیکھ کر اشک آنکھ سے نکل ہی گئے
گھر میں لڑکے نہ چپلبلے بیٹھے

(۹۵) آزاد کب کرے ہمیں صیّاد دیکھیے
رہتی ہے آنکھ بابِ قفس پہ لگی ہوئی

(۹۶) آج کل الفت کہاں بغض و عداوت کے سوا
نام ہی الفت کا ہے الفت کے وہ دن ٹل گئے

(۹۷) دیکھا نہ تجھ کو، ہم یونہی محروم ہی چلے
آتے ہیں تیری دید کو کس اشتیاق سے

(۹۸) اسی کو دوست سمجھتے ہیں وہ جو کچھ نہ کرے
کرے جو ان سے جواب و سوال دشمن ہے

(۹۹) گئے ہیں حضرتِ دل کوچۂ زلف میں تنہا
الٰہی خیر ہو واں بال بال دشمن ہے

(۱۰۰) لکھ ڈالے ظفر دفترِ اشعار کے اک دم میں
ہاتھوں میں ذرا اپنے جس وقت قلم پڑے

باب ۱۵

قصائدِ غدّریہ

مولانا فضل حق خیرآبادی نے اپنی داستان مصائب اور غدر کی کہانی نثر میں، الثورۃ الہندیہ یعنی بغاوت ہند کے نام سے ارقام فرمائی ہے، جس کا ترجمہ اس کتاب میں شامل ہے لیکن وہ عربی زبان کے یکتائے زمانہ ادیب ہی نہیں، بلند پایہ اور عالی مرتبت شاعر بھی تھے، غدر کی کہانی انھوں نے زبان شعر سے بھی بیان فرمائی ہے، اور کوئی شبہ نہیں یہ کہانی بڑی درد انگیز، لرزہ خیز، اور دہشت ناک ہے نثر میں جو بات کہی جاتی ہے، اس میں مصلحت وقت بھی پیش نظر ہو سکتی ہے، وضع احتیاط بھی ملحوظِ خاطر رکھی جا سکتی ہے، ایں و آں کا خیال بھی رکھا جا سکتا ہے، لیکن شاعر کی روانی طبع ان تمام بندھنوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتی ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے، وہ برہنہ حقیقت ہوتی ہے۔ تلوار کی طرح دھار دار اور خنجر کی طرح نکیلی —— اب فضل حق کے قصائد غدریّہ پڑھئے، جن میں یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں؛ ——

(۱)

سوزِ دل سے میرے پہلو کی ہڈیوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔
آنسو خشک اور اندرونی اعضا پگھل گئے ہیں۔
مجھ پر نازل شدہ مصیبتوں اور میری اہلِ وطن سے دوری پر دوست روتے اور دشمن خوش ہوتے ہیں۔
میں عزت و عظمت کی زندگی بسر کر رہا تھا جو شرفاء و عظماء کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔
میرے درد و غم اور تباہی و ہلاکت پر دوست غمگین و حیران ہیں اور چارہ گروں نے تیمارداری کا برا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔
مخبروں کی خبر رسانی جاسوسوں کی ریشہ دوانی اور میرے تغیرِ حال پر دشمن خوشیاں منا رہے ہیں۔
ہم پر رنج نازل اور غم طاری ہو گیا اور بادشاہ ہماری دوری میں تنگی و سختی سے۔
بڑی بڑی مصیبتوں نے گھیر لیا جن کی وجہ سے ہڈیاں کمزور اور اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے۔
مجھے ایک عورت[1] کے مکر نے مبتلائے مصائب کر دیا عورتوں کا مکر بڑا ہی زبردست مکر ہے۔
یہ ظاہر ہموار کرکے مخلوق کو فریفتہ بنا لیتی ہیں اگرچہ ان کے عہد و میثاق میں نہ وفا ہے نہ قرار۔
اس نے یہ اعلان کیا کہ جو لوگ گھر سے مجبور پڑے ہیں انھیں امن دیا گیا۔
ایسے لوگ اس کے امان نامہ سے دھوکے میں آ کر اپنے مردوں کو خوش خوش واپس ہو گئے۔
میں بھی کافرہ متسلطہ کے اعلانِ امان سے فریب کھا کر مکان پہنچ گیا۔

---

[1] ملکہ وکٹوریہ۔

پھر حکام سلطنت نے اس کے عہد و میثاق کی پروا نہ کرتے ہوئے سختی شروع کی اور میری بھی طلبی ہوئی
انہوں نے مجھے محبوس کر لیا اور غوسہا ذیتیں پہنچائیں گویا ملک کے اعلان پر ایفائے عہد کی نیت ہی نہ کی گئی تھی
جب میں قیدی بن کر بھی ان کا اطاعت گذار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی
زیادتی کر دی گئی۔

تیں خوشگوار عیش و عشرت میں تھا یکایک غموں کا ہجوم اور مصائب کا ورود ہوا۔
ان کے سینوں کو کینوں نے بھر دیا ان کی زبانوں سے بھی بغض کی وجہ سے دشمنی ظاہر ہونے لگی۔
انہوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا میں زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس پر مسرت
زمانہ کو بھول گیا جس میں راحت تھی۔

میری رات دن سخت گرمی اور اندھیرے میں گذرتے ہیں گویا کہ سخت موسم گرما کے دن اور
آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں۔

رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور نہ دن کے لیے شام اور رات ہے
مجھے سب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں ٹھہرا دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی
قسم کی ہوا نہیں پہنچ سکتی کیسی مصیبت تھی اس کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اس
کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی۔

کیسا پریشان کن قید خانہ تھا نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اس کے پاخانہ میں
آب دست خانہ تھا۔

انہوں نے درشتی کے ساتھ دوستوں بھائیوں اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا۔
میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لیے دے دی گئی۔
لباس اتار کر قیدیوں کی کملی پہنا دی میرے پاس اس خراب کملی کے سوا دوسری چادر نہ رہی
میرے برتن اور جوتے بھی ظلماً چھین لیے میرے استعمال کے لیے کوئی برتن اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا
میرے ننگے پاؤں رہنے پر کوئی مہربانی سے پوچھنے والا بھی نظر نہ آیا حالانکہ یہ کملی اوڑھنے

سے قبل مجھے مجدد شرف حاصل تھا۔

میرے بہت سے مہربان مخلص اور صاف دل دوست جنکی محبت صدق وصفا پر مشتمل تھی۔
انہیں روک دیا گیا وہ کیسے ملاقات کر سکیں بات چیت بطور زیارت سے انہیں مجبوراً محروم رکھا گیا۔
وہ مجھے ننگے پاؤں دیکھتے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے اور میری برہنہ پائی پر اُن سے
جھگڑا کر بیٹھے۔

قید خانے میں میرے پاس کوئی خادم بھی ایذ رسائی کی زیادتی کے باعث نہ چھوڑا۔
صبح وشام بے چینی سے گذرتے ہیں کانٹے اور چنگاریاں بستر کے بجائے مقدر ہو چکی ہیں۔
بہت سے سفید رنگ شراب خور مونچھوں والے دشمن مجھ پر ظلم و بیداد کرتے ہیں۔
وہ سیاہ جگر سیاہ فام نرم جلد اور سخت قلب واقع ہوتے ہیں۔
وہ بد بخت و بے شرم ہیں انہیں نہ ننگ وعار ہے نہ غیرت وحلم ان کے پاس ہو کر گذری ہے۔
بڑے جھگڑالو اور سخت دل ہیں اُن میں نرمی اور حمایت و حمیت نام کو نہیں ہے۔
سارے عیوب اُن میں موجود ہیں مردوں میں سرکشی اور عورتوں میں حرام کاری پائی جاتی ہے۔
ان سب کی بدمعاشیاں مردوں کی سرکشیاں عورتوں کی حرام کاریاں فسق و فجور کی اشاعت و کثرت
کا سبب بنی ہوئی ہیں۔

ظلم وستم کے لیے میری قید ہی کافی نہ سمجھی گئی بلکہ جلا وطنی اور غربت و مسافرت کی سزا بھی دی گئی
قید کر کے ایسے پہاڑ پر رات میں لے گئے جہاں پہنچ کر بہت سے قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔
اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں۔
یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور آنے والے کے لیے وبال ہے وبائیں ہر طرف عام ہیں۔
یہاں شریف ذلیل اور گریہ کناں ہیں دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں۔
اس کی کھائیوں میں عقوبت و ہلاکت عام ہے یہاں دوا دارو بھی بیماری میں اضافہ کرتی ہے۔
یہاں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ماش کی دال غذا ہے گوشت پیاز ترکاری ککڑی کچھ میسر نہیں۔

یہ دریا کا کنارہ ہے جہاں گیہوں اور سبزی کسی چیز کا پتہ نہیں۔

قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے۔ جو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں

میت کی نماز جنازہ قبر کفن اور پرشش کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔

یہاں ننگے کے لیے کوئی عار اور طالب احسان محتاج کے سوائے سوال کی حیا نہیں۔

یہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقتور انسان پر بھی رہنے کے بعد زرد پتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔

ان کے کینہ کی وجہ سے قیدیوں کی بیڑیاں مضبوط ہو گئیں اور نگہبانوں نے دشواری میں ڈال دیا۔

بلاؤں اور سختیوں نے انہیں ہلاک کیا اور چوکیداروں اور مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔

ان کی غم انگیز تشنگی اور بھوک پر پیاس قلت غذا اور گرانی نے مبتلائے مصیبت کر دیا۔

انہوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں زمین زمین ہے نہ آسمان آسمان۔

اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہیں جنکی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین سنگریزے ہیں۔

یہاں بارش نہیں ہوتی گرمی کی شدت سے فضائے آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا ہے۔

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔

رات تو اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہے۔

اس میں سورج والا کبھی دن نہیں ہوتا اور نہ چاندنی والی راتیں ہوتی ہیں۔

اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا۔

وہ خود تاریک ہے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے۔ اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی۔

یہاں کی فصل بہار و خزاں میں کوئی فرق نہیں یہاں نہ گرمی گرمی ہے نہ جاڑا جاڑا۔

یہاں آنے والا حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور دشمنوں کا کبر و غرور بڑھ جاتا ہے۔

وہ تونگری مسرت اور مال و دولت سے ہمکنار تھے متکبر بن کر قیدیوں پر ظلم و ستم کرنے لگے

و فقیر بن گئے (گویا اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو گئے)۔

اس کا راستہ ہچکولے کھانے والی کشتیوں کے ذریعہ ہے جو بھی ان پر سوار ہوتا ہے درد سر یا متلی میں ضرور مبتلا ہوتا ہے۔

اس کی جوش مارتی ہوئی موجیں کپڑوں اور بستروں کو تر کرتی ہیں اور ان کی تری سے مسافر بھیگ جاتے ہیں۔

مجھے ظلماً اہل وطن سے اچانک دور کر دیا گیا مجھے کمزور و نحیف اولاد کو بھی چھوڑنا پڑا۔
میری اولاد کو زبردستی ان کے مکانوں سے نکالدیا گیا ان کے لیے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی
وہ مسکین و فقیر بن گئے مکان رونق اور کوئی چیز بھی ان کے لیے نہ رہی۔
میں نے انہیں حالت گرسنگی میں چھوڑا نہ اُن کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت
اُن سے اپنے بیگانے بن کر علیحدہ ہو گئے اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔
میرے خاندان اور اقارب کو قید بند نے دور کر دیا اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے
میرے بیٹوں سے میری خبریں ایسی پوشیدہ ہیں جیسی کہ ان کی مجھ سے۔
نہ احباب و اعزہ کی دوری پر روتا ہوں اور وہ میری جدائی پر۔
ان کا مجھ پر رونا ایک حد تک ٹھیک بھی ہے کیونکہ مرنا اور ذلیل قید میں زندگی گذارنا دونوں برابر ہیں
مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا اس قید خانے (جزیرے) میں دو قسم کے وحشیوں ڈاکوؤں اور اجنبیوں کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور وبائی ہے نہ تو اس کے کھانے میں شکم سیری ہے نہ پانی میں سیرابی۔
پانی گرم ہے جس میں سیرابی نہیں جس طرح غذا ماش ہے جس میں مزا نہیں۔
یہاں نہ شیریں پانی ہے نہ لذیذ کھانا اور نہ وسیع میدان ہی سامنے ہے۔
میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں قولنج نقرس اور لقوہ (داد) نے اضافہ کر دیا۔
میرا غم و الم مٹنے والی عاقبت پر ہے اور مصائب نے مجھے بھی مٹانے میں کسر نہیں رکھی اور

اس کی ہوا کچ ہے۔

فضل حق کے لیے رفعت و بلندی کا فضل تھا اس کی وجہ سے مجھے برابر والوں پر سربلندی حاصل تھی
شرفاء میں قدر و منزلت وجاہت میسر تھی جس کے سامنے رؤساء و اعیان ملک جھکتے تھے۔

کمال رفعت وسعت تندرستی بزرگی برتری
زندگی خوش بختی نصیبہ وری یہ سب نعمتیں حاصل تھیں جنہیں آزمائش و مصیبت بھی بوسیدہ نہ
کر سکی ہے۔

پوری عافیت بڑھتے ہوتے سامان کی بنا پر بڑھتی ہوئی آبرو اور پائدار عزت بھی نصیب تھی۔
بہت سی عیش کی زندگی متغیر اور کتنی نعمتیں زائل ہو گئیں سختی اور بدحالی نازل ہو گی۔
اللہ نے مجھے وہ علوم عطا کیے کہ ان میں سے بہت کچھ علماء نے حاصل کیے۔
میرے اور میرے احباب کے درمیان جدائی حائل ہو گئی نعمت متغیر ہو گئی۔
شرارتیں گھر آئیں اور فتنے اچانک چھا گئے مسرت جاتی رہی شادمانی و راحت پھر گئی۔
نصرانی ہمارے شہروں پر مسلّط کر دیئے گئے کج فہم ہندوستانی ان کے مددگار بن گئے۔
وہ اسے نہ سمجھ سکے کہ نہ ان کے پاس وفاداری ہے نہ وسعت و حمایت۔
اس سے قبل ان پر ایسا شخص حکمران تھا جسے غناء و سرود اور مال و دولت نے خدمت اہل دیار
سے روک دیا تھا۔

اب جبکہ نصاریٰ کی پوری طور پر مدد کی گئی تو ظلم و ستم میں افراط سے کام لینے لگے۔
اور کمزوروں کو تو جور و جفا نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔
وہ دیار جو آباد تھا ویران ہو گیا جس طرح کرام اور رؤساء تباہ و برباد ہو گئے۔
وہ قوم سبا کی طرح متفرق و منتشر ہو گئے ان کے بہت سے گروہوں کو قید و بند نے آدبایا۔
مالدار فقیر عزیز و شریف ذلیل عظیم و کریم خوار اور بڑے چھوٹے بن گئے۔
جنکو پکڑ لیا ان کو قتل و ہلاک کیا حالانکہ جو جرم ان پر لگائے گئے تھے ان سے وہ بری تھے۔

انھوں نے اپنی بے گناہ رعایا کو بری طرح ہلاک کیا خون ایسا بہا جیسے چشمے اُبل کر بہتے ہیں۔
بہت سے شہروں کو برباد و خراب کر کے انکا نشان تک نہ چھوڑا وہ جنگل اور میدان معلوم ہونے لگے۔
مسجدوں اور محلوں کو منہدم کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ کوئی عمارت ہی نہ رہی نہ وہاں کبھی کچھ بنا ہوا تھا
ان کی نحوست اور ذلت کی وجہ سے زمین کی پیداوار میں کمی ہوگئی اس میں کوئی نشو و نما باقی نہ رہا۔
انھوں نے لوگوں پر زندگی تنگ کر دی ان کے لیے رات اور دن کا کھانا بھی نہ رہا۔
ان کے سینوں میں بھرے ہوتے کینوں کے بوجھ سے ان کی ہڈیاں بوجھل ہوگئیں۔
کیا حد سے متجاوز سرکشی کی بھی کوئی حد ہے؟ اور کیا سرکشوں کی بھی کوئی سزا ہے؟
میں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان سے کسی قسم کی محبت و دلچسپی نہیں رکھی۔
اور بات یہ ہے کہ نص قرآنی سے ان کی محبت کفر ہے حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا۔
ان سے محبت بھلا کیسے رکھی جا سکتی ہے جبکہ آسمان و زمین جس کی وجہ سے پیدا کیے گئے
اس ذات گرامی کے یہ نصاریٰ دشمن ہیں۔
وہ پہلا نور ہے جو دنیا میں چمکا اور اس کی روشنی سے سارا عالم منور ہوا۔
وہ اوّل و آخر پیغمبر ہیں انہی پر نبوت ختم ہوئی اور انہی سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔
وہ بہترین سردار ہیں خدا نے اپنا بھید انہی کے ذریعہ ظاہر کیا اور انہی کی وجہ سے آفرینش و حیات ہے۔
خدا نے انھیں ایسے بلند اوصاف کے ساتھ مختص کیا جو کسی جدید و قدیم کو نہ بخشے گئے۔
انہیں ایسا فضل و علو مرتبہ عطا کیا کہ اس میں کوئی بھی ان کا شریک سہیم نہیں۔
انھے اچھے نام رکھ کر رفیع شان بنایا خالق کے ناموں میں سے ان کے بھی بہت سے نام ہیں۔
نبی، مرتضیٰ، کثیر الفضل صاحب قوت بردی رحم، محسن کثیر العطا ان کے اوصاف و اسماء ہیں۔
ان کی پیدائش نے مکہ کی شان کو دوبالا کر دیا اور بطحا نے ان کے وجود سے شرف پایا۔
ان کے قیام سے طیبہ (مدینہ منورہ) پاک و بلند رتبہ ہوا۔ دور دور سے لوگ اس کی زیارت کا
قصد کر کے آتے رہے۔

وہ خوشخبری سنانے والے انسان ہیں ان سے پہلے صحف آسمانی اور انبیاء کرام ان کی بشارت دیتے آئے۔
ان کی بعثت کی عیسیٰ علیہ السلام اور ان سے قبل موسےٰ علیہ السلام نے بشارت دی جیسے کہ شعیبؑ
نے عیسےٰ علیہ السلام کی بشارت دی تھی۔
شہزادیاں ان کے دربار میں لونڈیاں بن کر حاضر ہوئیں اسی طرح صحیفۂ آسمانی کی پیشگوئی تھی۔
چمکنے اور چمکانے والے چاند کو انھوں نے اشارہ سے دو ٹکڑے کرکے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔
سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا کہ ادائے نماز کے لیے ٹھہر گیا۔
پتھروں اور درختوں نے انہیں سلام کیا اور بہت سے چوپائے ان سے فصاحت کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔
انگلیوں سے پانی جاری کرکے انھوں نے پیاسوں کو سیراب و شاداب کیا۔
ان کی برکت سے بہت سے بھوکوں کا تھوڑی سی غذا نے پیٹ بھر دیا اور بہت سے نادار مالدار بن گئے۔
ان کی جدائی پر کھجور کا تنا اس عاشق کی طرح رویا جسے محبوب کی دوری سوز و تپش رلاتی ہے۔
وہ امین و مستند ہیں امی ہوکر ایسی حکمت کی تعلیم دیتے ہیں جسکے سمجھنے سے حکماء و عقلا بھی عاجز ہیں۔
وہ عالم ہیں ذکر حکیم کی تلاوت کرتے ہیں اس کی آیتیں محکم ہیں ان میں ہدایت و شفا ہے۔
وہ ذکر حکمتوں اور حکموں پر مشتمل ہے جس سے عقلیں دنگ اور اہل عقل و دانش عاجز ہیں۔
اس ذکر حکیم کی بلاغت کمال کو پہنچی ہوئی ہے اس نے بلیغوں کو ساکت اور فصیحوں کو گونگا بنا دیا ہے۔
انھوں نے اپنی سہل روشن اور منور شریعت کے ذریعہ منسوخ شریعتوں کی سیاہی کو دور کر دیا۔
ان کی ملت کے ظہور نے تمام ملتوں کو اس طرح مٹا دیا جیسے تارے سورج کے چمکتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔
سورج کی روشنی ستاروں کی چمک مٹا دیتی ہے اور سمندر دریاؤں پر غالب آجاتا ہے۔
اللہ نے ان کے دین کو غالب و باقی رکھا اور ——— اسی کو بقا ہے۔
اگر بے وقوف اور معاند دشمن ان کے کمالات کا انکار کرتے ہیں تو تعجب کی بات نہیں۔
قرص خورشید کو اندھے کی آنکھ کی بے نوری ضرر نہیں پہنچا سکتی۔
اذان میں ان کے نام کو بلند آواز میں پکارنا اللہ نے ضروری قرار دیا۔

اگر آدم کے مراتب اس فرزند سعید کی بدولت بلند ہو گئے تو تعجب کیوں ہے بہت سے باپ بیٹوں کی وجہ سے بلند مرتبہ ہوئے۔

بہت سے رسولوں نے امت وسط ہونا چاہا ان میں سے بعض کی آرزو پوری کر دی گئی۔ دیکھیے کہ زمانہ امام مہدی نبیے علیہ السلام یہ شرف حاصل کریں گے۔

میدان حشر میں لوگوں کی سراسیمگی کے وقت وہ جائے پناہ ہیں ان کے سوا کسی سے امید نہیں ہو سکتی۔ لوگ حضرت آدم اور دوسرے رسل علیہم السلام کے پاس طلبگار شفاعت ہو کر پہنچیں گے مگر وہ سب خاموشی اختیار کر لیں گے۔

ان سب سے مایوس ہو کر وہ سب اس سخی داتا کے خدمت میں حاضر ہوں گے جو فلاح دنیا والی سخاوت سے کام لے گا۔

انھوں نے مخلوق کے لیے خالق کی وہ خوشنودی چاہی جو اس نے برگزیدہ بندے کی رضا تھی۔ لوگ ان کی رضا اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ ایمان والوں کو عذاب سے نجات ملے۔

ان کی اولاد شریف بزرگ اور سردار ہے مخلوق پر انہیں رفعت و بلندی حاصل ہے اور ان کی چمک دمک کے سامنے سب ماند ہیں۔

وہ عظیم و کریم اور نجیب و نقیب ہیں۔

ان کے اوصاف و مناقب کا احاطہ کسی مدح کرنے والے کی مبالغہ آمیز مدح بھی نہیں کر سکتی۔

ان بزرگوں کی فیروز بختی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے جبکہ ان کے جد امجد افضل خلق خدا ہیں اور وہ سب ان کے اجزاء ہیں۔

ان کے صحابہ بڑے بہادر آپس میں رحیم اور دشمن پر شدید ہیں۔

اللہ نے قرآن کی آیت میں انکا وصف بیان کیا ہے یہ وصف ایسا ہے کہ اس سے بڑھ کر ان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

انہیں السابقون الاولون سے یاد کیا گیا ہے یہ طبقہ صحابہ میں سب سے بہتر ہے اور ان

میں بھی سب سے اعلیٰ خلفاو راشدین ہیں ۔

اے رحمت عالم اس شخص پر رحم کیجیے جس کے لیے زمانے میں کہیں رحم نہیں ۔

میں آپ پر قربان! اس قیدی پر احسان فرمایئے جس پر نہ کوئی رحم کرنے والا ہے اور نہ اس کے پاس فدیہ و احسان ہے ۔

ناامیدی اور تاخیر کے بغیر اس کی شفاعت فرمایئے ۔ کیونکہ زمین اور اس کے وسیع و عریض اطراف واکناف اس کے لیے تنگ ہو چکے ہیں ۔

اے شاکی اونٹ کے فریاد رس! مجھ پر بھی ویسی ہی مہربانی فرمایئے مجھے بھی بیماری اور مجبوری کی شکایت ہے ۔

مصائب کی رسی زمانہ دراز سے دراز ہے اسے دور فرمایئے ۔ تاکہ اس اذیت سے نجات ملے ۔

سخاوت و عطا کے سوا اب رحیم و مصطفیٰ کے سامنے مجھے کوئی امید نہیں ۔

مجھے نفع پہنچایئے اور خدا کی بارگاہ میں سفارش فرمایئے میری مصیبتوں پر رحم فرمایئے کیونکہ آپ مستجاب الدعوات ہیں ۔

اے خدا میری امیدوں کو ثابت کر دکھا اور دشمنوں سے مجھے نجات دلانے میں تاخیر نہ فرما

میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا ۔

میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے موقع پر باز رہا یہ میں نے بڑا جرم کیا جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لیے پکارا تو میں حاضر نہ ہو پایا میں شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا ۔

اے آمرزگار! میرے قصور کو معاف کر اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی ہے اس سے درگذر کر ۔

تجھی سے عفو و درگذر کی امید ہے ۔

اگر میرے جرموں کی فرد بڑی ہے تو تیرے پاس ایسی وسیع رحمت ہے جس کی حد و نہایت نہیں ۔

مغفرت و عفو فرما تو یہ قبول کرتے ہوتے دشمنوں اور چغلخوروں کے ابتلا سے مجھے نجات دے ۔

میری مصیبتیں اگر میرے حق میں مقدر بھی ہو چکی ہوں تب بھی مظلوم کی دعا سے رد قضا ہو جایا کرتا ہے
مجھے بد بختی میں نہ ڈال نیک بخت بنا پھر سعادت کے بعد شقاوت کی نوبت نہ آئے۔
جو مظلوم تجھے پکار رہا ہے اس کی سن لے اور اس کی مصیبت دور کر کافروں نے ظلم و تعدی کا اس کے
ساتھ برا برتاؤ کیا ہے۔
ان کی طرف سے معائب اتہامات اور رسوائیوں کے پے در پے حملوں نے مجھے ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے
تو ہی میرا وکیل ہے میرے معاملہ کو ایسے دشمنوں کے سپرد نہ کر جن کی ایذا رسانی نے مجھے مصیبت
میں ڈال دیا ہے۔
اے خدا! ان سے انتقام لے اور انہیں رسوا کرتا کہ ان کی رسوائی سے میرے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکے۔
اے پروردگار میرے دشمنوں سے انتقام لے اور مجھے پناہ دے میری مدد کر مدد اور پناہ تیرے
ہی پاس ہے۔

کامیابی کا مجھے مدت سے انتظار ہے اب میری امید نجات میں تاخیر نہ ہو۔
اے پروردگار! عجلت فرما تا کہ جلا وطنی کی تکلیفوں سے رہائی و خلاصی نصیب ہو۔
مجھے اعتراف ہے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا بلکہ بداعمالی ہی میں مبتلا رہا۔
میری عمر لہو و لعب میں بے کار گذری اور خواہشات نے مجھے نیکیوں سے غافل رکھا۔
کوئی ثواب کا کام نہ کر سکا میرے قول و فعل میں ریاء و نمائش کو دخل رہا۔
لیکن تیرا فضل و کرم وسیع ہے اسی سے اپنی بیماری اور گناہوں سے برأت کی امید ہے۔
مجھ پر رحم فرما مجھے الٰہی آزمائش سے سابقہ پڑا ہے کہ اس سے زیر کی اور اصابت رائے بھی نہ
بچا سکی۔
ساٹھ سال تک تو نے مجھے امن و عافیت میں رکھا تیرے فضل سے اس مدت میں نعمتیں بڑھتی
ہی رہیں۔
پھر اچانک میری عافیت مختل اور احتیاج مسلط ہو گئی رحم فرما خیر و عطا تیری ہی جانب سے

مل سکتی ہے۔

اے میرے رب تیرے دربار میں میرے وسیلے حضرت محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم علیؑ، حسنؑ، حسینؑ اور فاطمہؓ زہرا ہیں۔

اے پروردگار جب تک سر سبز و شاداب مرغزاروں میں کبوتروں اور سبز رنگ پرندوں کی آوازیں گونجتی رہیں سرکارؐ پر رحمتیں نازل فرما اور جب تک بارشیں اور مسلسل نمی زمین کو سیراب کرتے رہیں اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ان سب بزرگوں پر نازل ہوتی رہیں۔

(۴)

اے محبوبہ[1]! واپس آ اور ایک ایسے مریض کی عیادت کر جس کا مرض قدیم اور متعدی ہے اور جو ہلاکت سے اس درجہ قریب پہنچ چکا ہے کہ دشمن بھی عیادت کو آنے لگے ہیں۔

وہ امراض کا عادی بن چکا ہے اس کے عیادت کرنے والے اس سے تنگ آ کر کنارہ کش ہو چکے ہیں حالانکہ ستار اور بانسری بجانے والے اس کے گرد رہا کرتے تھے۔

وہ مرض ہلاکت کا خوگر ہو گیا ہے چارہ ساز و غمخوار بھی تھک چکے ہیں وہ عیادت گروں اور اہل و عیال پر بار گراں بن گیا ہے۔

وہ ایسا مریض ہے جس کی بیماری ایسا عجز و درماندگی ہے جس کی کوئی دوا نہیں اس کے ظاہر مرض کی وجہ سے موت ہر وقت سامنے کھڑی ہے۔

زمانہ کی حالت پر حسرت و افسوس ہے کہ مریض کو شفایاب ہونے نہیں دیتا اور اس کا علاج غم کی زیادتی کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

میری بیماری سخت ہے عیادت گروں کی بار بار چارہ فرمائی بھی ایسے مریض کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی جو امراض کے ہجوم و درد کا عادی ہے۔

میرے سینے میں وہ غم و اندوہ بھر گیا جس نے اندرونی و بیرونی اعضاء و غضا[2] کی لکڑی کی طرح جلا ڈالا ہو جاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے۔

---

[1] عربی شاعری میں ہم سفر، تمثیل یا محبوبہ سے خطاب کیا جاتا ہے اور عموماً قصیدہ کی ابتدا اسی خطاب سے ہوتی۔

[2] غضا ایک درخت ہے جس کی لکڑی سخت ہوتی ہے اس کی چنگاری دیر تک نہیں بجھتی۔

بہت فرق ہے اس آگ میں جس کے جلنے کی جگہ تنور کا پیٹ ہو جس کا ایندھن ہماری آنتیں پسلیاں اور قلب و جگر ہیں۔

نیک بختی نے پشت دکھا دی اب نہ سلمی ہی مصالحت کرتی ہے اور نہ سعاد ہی سعادتمندی کا اظہار کرتے ہوئے مدارات پر آمادہ ہے۔

میں غم اٹھاتے اٹھاتے بدصورت بن گیا ہو لوگ مجھے یوم پیدائش سے پہچانتے ہیں انھیں بھی شناخت میں تامل ہونے لگا۔

میری طاقت کم ہو گئی اور ضعف دونا ہو گیا یہ سب کچھ قویٰ اور جسم میں بہت زیادہ نقص کی وجہ سے ہوا میرے قلب روح جسم اور بدن کو جو مصیبتیں پہنچیں انکی وجہ سے مجھ میں قوت باقی نہیں رہی۔

سخت مصیبت کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ گیا روحانی اور جسمانی اذیتوں میں گھر کر شیخ فانی بن گیا۔

اچانک مصیبت نے آ دبایا اس نے میرے اہل خاندان اور رشتہ داروں کو رلایا اور دشمنوں اور حاسدوں کو ہنسایا۔

اس مصیبت نے مجھے کمزور و ناتواں بنا دیا اور شریر و بدخصلت لوگوں کے مکر نے مجھ سے زیرکی و دانائی کو زائل کر دیا۔

رعایا فوج اور لشکر کے گروہوں کے لیے امن کا اعلان کر کے ان نصاریٰ کی ملکہ نے بھی مکر سے کام لیا۔

اس نے پہلے تو مسلمانوں اور بت پرستوں کی جماعتوں کو نصرانی بنانے کا قصد کیا۔

ان سب نے اعتراض کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا اور اُسے بُرا سمجھتے ہوئے دوری اختیار کر لی البتہ تھوڑے ذلیل و رذیل اشخاص نے اس کا کہنا مان لیا۔

انھوں نے اس کی سفید فوج پر حملہ کیا اور گردش تقدیر سے شکست کھا گئے جیسے بکریاں بھیڑیئے اور قبر سے دور بھاگتی ہیں یہی ان کا بھی حال ہوا۔

پھر اس نے ہندوؤں سے جاٹ ٹھاکروں کو اپنی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

انھوں نے اپنے ساتھیوں پر حملہ کر کے زیادتی سے کام لیا اپنے مقابل لوگوں سے پوری طرح تیاری

سے پیش آکر بڑا ظلم کیا۔

ان سب نے دشمن کی مدد کے لیے بہت سا سامان جنگ اور بے شمار لشکر اکٹھا کیا۔

پھر اس ملک نے پہاڑیوں سے مدد لی انہوں نے پوری رغبت اور بے جگری سے مدد کی۔

اس نے حواریوں اور دشمنوں کی امان کے اشتہارات جاری کیے۔

کہ بچوں عورتوں اور قیدیوں کے قاتلوں کے سوا سب کو امان ہے۔

جنھوں صلح کی آلاتِ حرب اس ملک کے عاملوں کے سپرد کر دیئے اور فرمانبرداروں کی طرح اطاعت گذار بن گئے۔

اس نے تمام دہقانوں کو لالچ دیا جس کی وجہ سے اکثر دیہاتی اور بادیہ نشیں اس کے مطیع ہو گئے۔

ان سب کی مدد نے ان کو مسلط و غالب کر دیا جبکہ ہر پستی و بلندی پر ان کی مدد کی۔

انھوں نے شہروں پر غارتگری کے سبب قبضہ کر لیا اور ان کے آثار و نشانات بھی باقی نہ چھوڑے۔

وہ بلند و پست مقامات پر پہنچے اور قتل لوٹ مار اور سارے علاقہ میں فتنہ و فساد پیدا کر دیا۔

عبادت گاہوں کو منہدم اور مسجدوں کو مسمار کر دیا خدا کے بندوں کو قتل کیا اور عابدوں کی ہلاکت تک حد سے تجاوز کر گئے۔

جن لوگوں نے اس ملک کی طاعت نہیں کی تھی ان پر ایسی بزدلی چھائی تھی کہ نہ اپنے سردار کا حکم مانتے تھے اور نہ حاکم کی بات سنتے تھے۔

ان میں سے ایک فریق کو فقر و فاقہ نے جنگ سے تھکا دیا تھا اور دوسرے گروہ کو بزدلی نے پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔

جب ملک نے دیکھا کہ کوئی جنگ کا خواستگار دشمن باغی اور سرکش باقی نہیں رہا۔

تو اپنے قول سے پھر گئی اور دشمنی پر اتر آئی کوئی اپنا وعدہ پورا نہ کیا اور عہد و میثاق کی رسیوں کو کاٹ دیا۔

؎ اہل نیپال۔

پہلے وعدہ کر کے لوگوں کو آرزو مند بنا دیا پھر عداوت وظلم سے کام لیا در اصل اس کا وعدہ وعید کے لیے مکر تھا۔

اس کاذہ کے جھوٹے وعدوں اور قسموں سے دھوکے میں پڑکر میں بھی اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹ آیا۔

ہمارے ساتھیوں میں دوسرے سرپوش لوگ بھی واپس آگئے مگر نصاریٰ نے صرف مجھی کو قید میں ڈال دیا۔

وہ مجھے قید خانے کھینچ کر لے گئے اور ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں بندھے ہوئے درماندہ وشکستہ دل قیدیوں میں شامل کر دیا۔

وہ بڑے جفا کش قیدی تھے قید خانہ کے دربانوں اور نگہبانوں کی بے انتہا سختی اور ان کے مزاج کی تیزی برداشت کرتے تھے۔

بدخو اور درشت مزاج نگہبانوں کی محنت ومشقت نے ان کے بدن پر کھال نہ چھوڑی تھی اور جلاد کے کوڑوں نے بدن کی کھال پھاڑ دی تھی۔

دشمنوں کی جماعت نے دشمنوں کو اور مجھے جمع کر دیا اور میرے اعضاء کو جدا کر دیا۔

جن لوگوں سے مجھے امیدیں تھیں وہ اعراض کر گئے اور میرے دوستوں اور ساتھیوں کو مجھ علیحدہ رکھا گیا۔

میرے اور اعزہ کی درمیان جدائی حائل ہوگئی اور اولاد واحفاد کے فراق نے مجھے غم میں ڈال دیا میں غمگیں وحزیں جیل میں پہنچا دیا گیا میرے پاس میرا کوئی رفیق باورچی یا خدمتگار بھی نہ چھوڑا گیا میرا عمدہ لباس اتار کر قیدیوں کے کپڑے پہنا دیئے میرا توشہ اور کپڑے چھین لیے۔

انہوں نے سخت موٹا اور چبھنے والا بستر ایسے راحت پسند شخص کو سونے کے دیا جو نرم بستر کا عادی تھا۔

میں نے پیاس کی شکایت کی تو گرم اور کھاری پانی پلایا اور ایسی غذائیں مہیا کیں جن کا میں کبھی

عادی نہ تھا۔

میرے قید کرنے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ اس کے ساتھ جلاوطنی مسافرت اور اہل وطن سے دوری کا بھی اضافہ کر دیا۔

مجھے اور دوسرے قیدیوں کو جہاز پر سوار کر کے لے چلے اور وہ جہاز سمندر کی موجوں سے ہچکولے کھاتا چلتا تھا۔

اور مجھے ان قیدیوں کے ساتھ ایک دور دراز پہاڑی پر اتار دیا جہاں کسی کا وہم و گمان بھی نہ پہنچتا تھا۔

ہمارے قید کرنے والوں نے ہم پر ظلم روا رکھکر ہماری دید سے لوگوں کو محروم کر دیا اور ہمارے درمیان ایسے سمندر کا کنارہ حائل ہو گیا جس میں پانی کے جوش سے جھاگ پیدا ہوتے تھے۔

وہاں کی ہوا اپنی خرابی کی وجہ سے جان نکال لیتی تھی وہ اس ہلاکت خیز آندھی کی طرح تھی جو قوم عاد پر اس سے قبل بھیجی جا چکی تھی۔

اس میں آرزوئیں پامال اور موت عام تھی اور کسی میت کے لیے دفن و قبر کا کوئی انتظام نہ تھا

غموں کے بادل قسم قسم کے رنج و الم برساتے رہتے ہیں اور وہ بادل صبح و شام اور شب کو آتے جاتے رہتے ہیں۔

وہاں کبھی دن میں سورج کی روشنی نظر آتی ہے نہ چمکنے والے چاند اور تاروں کی رات میں چمک۔

میرا دن رات کی طرح ہے اور میری رات کو دوام ہے آسمان پر ستارے ایسے رکے ہوئے ہیں جیسے میخوں میں انہیں باندھ دیا گیا ہو۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہماری تاریک راتیں روشن دن کی طرح تھیں اور ہمارے دن عید کے دن تھے۔

میری رہائی کے لیے کیا حیلہ ہو سکتا ہے جو ذہن میرا بار اٹھائے ہوئے ہے اس کے سارے راستے مسدود ہیں۔

مجھے چھٹکارا کیسے نصیب ہو سکتا ہے میرا دشمن ظالم و بدخو ہے اس کا ذکی خرابی ہو جو خدا کا

بھی منکر ہے۔

مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے نصاریٰ نے ایسے زندیقوں کو آمادہ کیا جو ان کے مقرب ہیں اور وہ بھی جن سے ان کے اتحاد کی وجہ سے محبت کرتے ہیں۔

وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے اور میری اذیت رسانی میں ہر ممکن جدوجہد سے کام لیا۔ پس دشمنی برتی اور بغض و کینہ کا کھلا مظاہرہ کیا۔

اپنی تدبیروں کے انقطاع پر میں ناامید و مایوس ہو گیا اور شکاری کے جال میں پھنسے ہوئے پرندہ کی طرح حیران و پریشان۔

میری حالت اس ہرن سے مشابہ تھی جو شکاری کی لکڑی سے موقع شکار کے خوف سے مصالحت کر بیٹھا ہو۔

میں نے چند لوگوں سے ان قحط زدہ اشخاص کی سی امید باندھی جو ایسے بادلوں سے جو گرج اور چمک کر چھٹ گئے ہوں امیدیں باندھ لیتے ہیں۔

میں نے خدا کے سوا سب سے کنارہ کشی اختیار کر لی اس کے سوا کسی دوسرے سے بخشش و امداد کی امید نہیں ہے۔

اس بادشاہ عادل کی رحمت کا ہی میں امیدوار ہوں جس کا ذکر میرا حرز جان اور میرا ورد ہے۔

وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا حیا رکھنے والا اور پکارنیوالوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنیوالا ہے ہلاکت زدہ اور مظلوم و مضطر کی دعا رد نہیں کرتا ہے۔

وہ کمزور قیدیوں کو ایسے جابر متکبر اور سخت انسانوں سے نجات دلاتا ہے جو وادی میں پتھروں کو کاٹنے والے ہیں۔

وہ فرعون و شداد جیسے سخت و جابر بادشاہوں پر کمزوروں اور عاجزوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

اس مصیبت زدہ کیلئے جس کا کوئی حیلہ وسیلہ نہ ہو اور جس کی رہائی کے لیے نہ کوئی فدیہ ہو اور نہ احسان خدا کے سوا کون چارہ ساز ہے۔

اے پروردگار اس عاجز دخستہ کو ستودہ صفات احمد و حماد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل میں کافر دشمنوں کے چنگل سے نکال ۔

تو نے انہیں تمام مخلوق کی طرف رہبری و ہدایت اور عطا و اعانت کے لیے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے ۔

وہ مصیبت و عذاب روکنے کے لیے پکارنے والوں کے فریاد رس روز قیامت ہم ہماری پناہ گاہ اور مجلس میں بڑی سخی و جواد ہیں ۔

وہ گمراہ کے لیے ہادی نابینا کے حامی فریادی کے مددگار سفارش چاہنے والے کے شفیع اور سائل کو عطیات سے نوازنے والے ہیں ۔

ظلم سے شاکی پڑوسی کے محافظ ہیں امداد چاہنے والے کے معاون اور طالب عطا کے لیے سخی ہیں ۔

وہ خوشخبری سنانیوالے ہادی ہیں راہبوں نے ان کی آمد کی اطلاع حالت خوف میں پہنچائی ہو اسی طرح یہود نے ۔

انھوں نے ہر گم کردہ راہ کو سیدھا راستہ بتایا اور ہر ٹیڑھے کو سیدھا کر دیا ۔

وہ غمگین کے فریاد رس ور طالب بارش کے لیے بادل گھاٹ پر آنے والوں کے لیے دریا چارہ اور پانی کے متلاشی کے لیے (سرسبز) میدان ہیں ۔

وہ دریا ہیں ان کی شریعت روشن اور صاف ہے جس کے احکام پیاسوں کے لیے شیریں چشمہ ہیں ۔

وہ بڑے نیک اور سخی ہیں بھوکوں کا ان کی انگلیاں پیٹ بھتی ہیں جب انگلیاں سخاوت پر آتی ہیں تو تشنہ لبوں کی پیاس پر غالب آجاتی ہیں ۔

آدم علیہ السلام کی بزرگی میں ان کی وجہ سے اضافہ ہوا تو تعجب کیوں ہے بہت سے آباؤ اجداد نے اپنی اولاد کے مجد و شرف کے باعث بلند مرتبہ پایا ہے ۔

وہ خاتم النبیین ہیں نبیوں میں سب سے افضل و اول ہیں مخلوق میں اولیت کا شرف انہی کو حاصل ہے اور انہی کی روشنی سب سے پہلی ایجاد ہے ۔

ان کا دین تمام دینوں کا ناسخ اور رہتی دنیا تک رہنے والا ہے۔

انہوں نے حکمت والی مضبوط اور فیصلہ کن کتاب کی تلاوت کی وہ کتاب متلاشی حق کے حق میں اور

نفی کے خلاف فیصلہ صادر کرتی ہے۔

رسولوں نے ان کے امتی بننے کی خدا کی بارگاہ میں دعا کی روایات میں اسناد کے ساتھ اس کا تذکرہ

موجود ہے۔

انھوں نے امت وسط شاہد عادل (امت محمدیہ) میں شمار ہونے کی دعا کی جو کہ تمام سابقہ امتوں

پر قیامت کے دن گواہ بنے گی۔

ان میں سے بہت کی آرزو پوری نہ ہوتی اور بعض اپنی مراد کو پہنچے۔

کس قدر قابل عظمت ہے ان کی شریف بزرگ نجیب اور بلند رتبہ اولاد

ان کے صحابہ نے دین کے لیے جہاد کیا معاونت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور اس سلسلہ میں

طرح طرح کی کوششیں کیں۔

اے مخلوق کے سردار اور اخلاق میں سب سے بلند و بہتر امیدوں کے بہترین سہارے اور تمام

اہل سخاوت سے بلند مرتبہ رکھنے والے۔

میں آپ پر قربان! مجھ پر رحم فرمایئے اور مجھے بخشش سے نوازیئے اپنی عطا سے میری شفقتوں

اور غموں کی تلافی کیجیے اے جود و عطا کے مالک!

مجھ پر کرم کرتے ہوئے خدا سے میری سفارش کیجیے کہ مجھے جلاوطنی اور قید تنہائی کی مصیبت

و آزمائش سے نجات دے۔

اور جلد سے جلد میری ان پریشانیوں اور اذیتوں کو دور کرے جو حد شمار سے متجاوز ہو چکی ہیں

اور مجھے عجلت کے ساتھ اپنی عافیت میں لے اور میرے غم کو سرور اور شقاوت کو سعادت سے

بدل دے۔

اے میرے محافظ و رہنما اس بات کی بھی دعا کیجیے کہ خدا میری موت آپ کی اقامت گاہ کے

جوار میں شہادت کی موت مقدر کر دے ۔

میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں اپنے کرم سے میری مدح و ستائش قبول فرمائیے۔

تاکہ اشعار خوانی کی بدولت میں اپنی مراد کو پہنچوں ۔

آپ پر اللہ کی پاکیزہ رحمتیں نازل ہوتی رہیں جب تک سرسبز و شاداب مرغزاروں اور قمریوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور گانے والے گاتے رہیں ۔

مصنف علیہ الرحمۃ نے آخر میں تحریر فرمایا :۔

"یہ دونوں قصیدے رجب ۱۲۷۵ھ میں بحالت اسیری جزیرہ وبائی میں تمام ہوئے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وسیعہ اور قدرت بدیعہ سے اپنے حبیب اور اس کی آل اطہار اور اولاد امجاد کے طفیل اس وبائی جزیرہ سے نجات دے ان سب پر اللہ کی روشن نعمتیں اور پاکیزہ رحمتیں نازل ہوں ۔!"

ان دونوں قصیدوں کو پڑھئے اور بار بار پڑھئے یہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھو ۔

ان میں طلاقت لسانی کا جوہر ہے، روانی سخن ہے، زور کلام ہے، آمد ہے، خلوص ہے، سچائی ہے، جذبہ ہے، عقیدت ہے اور ان سب چیزوں نے مل کر ایک ایک لفظ کو دہکتا ہوا انگارہ بنا دیا ہے ۔

ان قصائد میں آپ بیتی ہے، جگ بیتی ہے، سیاست ہے، عملی سیاست ہے، تاریخ ہے بیتی ہوئی دیکھی ہوئی، گزری ہوئی ادب ہے، فصاحت ہے، بلاغت ہے، جادو ہے ؛ ——

ان من البیان لسحرا

ان میں دعا ہے، عرض نیاز ہے، پیمان وفا ہے، اعتراف خطا ہے، ابر کرم ہے - حمد الٰہی ہے، نعت رسول ہے، منقبت اہل بیت اطہار ہے، اور ان سب چیزوں میں وہ کھرا پن، وہ سچائی وہ راستی ہے، جس نے الفاظ کو برق بنا

دیا ہے ؂

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں — طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

باب ۵۲

بعد غدر کے چند دِلّی والے

تہذیبیں مٹتی ہیں، مرتی ہیں، فنا ہوتی ہیں لیکن یہ عمل تدریجی ہوتا ہے۔ دِلّی کی تہذیب بھی مٹی لیکن رفتہ رفتہ، غدر سے پہلے یہ تہذیب اپنے شباب پر تھی، غدر کے دوران میں اس کے گلے پر خنجر ستم چلا اور غدر کے بعد یہ مٹ گئی لیکن آگ بجھنے کے بعد کچھ خاکستر باقی رہ جاتی ہے اور اس خاکستر میں ایک آدھ چنگاری بھی نظر آ جاتی ہے غدر کے بعد جو خاکستر باقی رہ گئی تھی اس میں کچھ چنگاریاں بھی تھیں، اور بالآخر یہ بھی فنا کے گھاٹ اتر گئیں ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

لیکن افسردہ ہونے سے پہلے ان چند چنگاریوں کی چمک دیکھ لیجیے

مسلمان فقیر اور فرنگی امیر

"جامع مسجد دہلی کے مشہور امام شمس العلماء مولوی سید احمد صاحب نے والد سید محمد صاحب کی روایت بیان کرتے تھے کہ غدر کے بعد کوئی فرنگی سیاح جامع مسجد دیکھنے کے لیے آیا، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بھیک مانگنے والے اب بھی بیٹھے رہتے ہیں اس فرنگی نے بٹوا نکال کر انھیں بھیک دی اور چلا گیا، پھر گھر پہنچا تو بٹوا غائب پایا۔ بٹوے میں دس بارہ اشرفیاں تھیں۔

دو تین دن گزار کر فرنگی کا جی پھر جامع مسجد کی سیر کو چاہا۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتا تھا کہ ایک بھکاری نے پکارا "صاحب! یہ تمھارا بٹوہ تو نہیں ہے اس روز یہاں پڑا ملا تھا" فرنگی نے بٹوہ لے لیا اشرفیاں گنیں اور ایک اشرفی بطور انعام بھکاری کی طرف بڑھائی، بھکاری نے گردن ہلائی اور ہاتھ سے فرنگی کا ہاتھ روک دیا فرنگی نے پوچھا "اور چاہیے" بھکاری نے کہا "اجی مجھے کچھ نہیں چاہیے"۔

فرنگی کو تعجب ہوا کہ یہ کس قسم کا بھکاری ہے اول تو اسے بٹوا واپس کرنے کی کون سی مجبوری تھی اب انعام بھی نہیں لیتا، سوال کیا تم اتنے ایماندار اور مستغنی کیوں کر ہو گئے ۔ بولا ایماندار اور مستغنی کیا ہوں بس یہ گوارا نہیں کہ میرے پیغمبر کی تمہارے پیغمبر کے سامنے ہیٹی نہ ہو تمہارے پیغمبر نے کہیں چھیڑ دیا کہ آپ کے امتی نے ہمارے امتی کی اشرفیاں ہتھیا لیں یا آپ کی امتی نے اپنی ایمانداری کا صلہ اینٹھ لیا تو میرے پیغمبر کو شرمندہ ہونا پڑے گا، لہذا اشرفیاں آپ ہی کو مبارک ہوں ؎

چچا ننو ایک صاحب تھے سید محمد یعقوب ان کی نشست و برخاست ایسے لوگوں میں تھی کہ ننو عرف پڑ گیا تھا میں نے انھیں بچپن میں دیکھا ہے میرے والد کے ہم عمر تھے اور خاصے قریب کے رشتہ دار۔

ایک دفعہ ہمارے مکان سے ملی ہوئی ہماری کسی دکان خالی تھی اس میں ننو صاحب آبراجے۔ والدہ گھبرائیں کہ قفل نہ لگا دیں والد بسلسلہ ملازمت باہر تھے انھیں خط لکھا اور پوچھا کہ اس آفت ناگہانی کا کیا علاج کیا جائے والد نے جواب دیا کہ محمد یعقوب دنیا بھر سے برے ہوں ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے اور جب تک دکان میں رہیں رہنے دو۔

یہ محمد یعقوب عرف ننو جگت چچا تھے اپنے پرائے چھوٹے بڑے سب کے چچا ننو، مرتے مرتے رنڈیوں کے یہاں جانا نہ چھوڑا، اونچی اونچی ڈیرے دار رنڈیاں ان کا ادب کرتی تھیں کبھی کسی کی نانی دادی سے تعلق رہا ہوگا اب تو رنڈیوں کے بھی چچا تھے گرمی کے موسم میں رات کے دو بجے کوئی گانا سنوانے کی فرمائش کر دیتا، بڑھیا سے بڑھیا گانے والی کے ہاں پہنچ جاتے اور وہ سوتے سوتے اٹھتی اور خوشی خوشی گانا سناتی،

چچا کیا، رنڈیوں کے تو پیر تھے جب رنڈی کی لڑکی گانا سیکھ چکتی تو پہلا مجرا اس کا چچا ننو کے مکان پر ہوتا، روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے نہیں برکت حاصل کرنے کی غرض سے —— مرنے کے بعد سالہا سال رنڈیوں نے چچا ننو کا عرس کیا ؎

چچا ننو خود تو رنڈیوں کے یہاں جاتے تھے لیکن ان کے کسی عزیز یا ہم محلہ کی مجال نہ تھی کہ

رنڈی کے ہاں قدم دھرنے، رنڈی کے لیے جاننا ضروری تھا کہ فلاں شخص ننو کا عزیز یا ہم محلہ ہے، پھر اسے گھسنے نہ دیتی تھی ؎

چچا ننو نے ممکن ہے اپنی زندگی تباہ کی ہو مگر بے شمار نوجوانوں کی زندگی کو تباہی سے بچا دیا ؎

قلعہ بنتے بنتے ڈھے گیا

سنہ ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ایک نہایت بلند مرتبہ دوست لاہور سے دلی تشریف لائے خواجہ صاحب اس زمانہ میں میرے مہمان تھے، ان دوست نے بھی غریب خانہ کو سرفراز فرمایا۔ ہم دونوں ان کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن گئے، پلیٹ فارم پر چلتے چلتے انھوں نے مسکرا کر کہا: واحدی صاحب دلی کی کسی عورت سے شادی کرادو، یہاں کے قلیوں کی زبان اس قدر شیریں ہے تو خواتین و بیگمات کی زبان کیسی ہوگی۔ سنہ ۱۹۱۱ء تک دلی ریلوے اسٹیشن کے سب قلی دلی والے تھے، میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں مگر گھر پہنچ کر بار بار اسی طرح اصرار ہوا تو خواجہ صاحب کے مشورے سے میں نے ایک عزیز سے تحریک کردی کہ اپنی بھتیجی کے واسطے کوشش کیجیے۔ اس بھتیجی کے ابا فوراً راضی ہو گئے، لیکن انھوں نے فیصلہ اپنے چچا پر چھوڑا۔ میں ساتھ تھا جب عزیز مذکور نے چچا سے گفتگو کی ہے عزیز کے اتار چڑھاؤ بہت کامیاب تھے اور قریب تھا کہ منظوری مل جائے کہ اتفاقاً ان کی زبان سے یہ فقرہ نکلا: ایسے شخص سے رشتہ ہوجانا ہماری عزت میں اضافے کا موجب ہوگا۔ بس چچا نے اس فقرے کو پکڑ لیا، بولے: ان صاحب کا نام میں نے سنا ہے مشہور اور ممتاز آدمی ہیں بے شک ان سے رشتہ ہوجانے سے ہماری عزت بڑھے گی مگر بیٹی دے کر ہم نے عزت کبھی نہیں بڑھوائی باقی تم جانو اور تمھارے بھائی جانیں، قلعہ بنتے بنتے ڈھے گیا ؎

مرزا چپاتی

دلی میں بنگش کے کمرے کے سامنے ایک صاحب کی کنکووں پتنگوں اور تکلوں کی دوکان تھی، یہ صاحب کنکوے پتنگیں اور تکلیں بناتے تھے اور اڑاتے بھی خوب تھے، پتنگیں کنکوے اور تکلیں بیچتے بھی تھے اور اڑانی بھی سکھاتے تھے اسی پر ان کی گذراوقات تھی اکیلا دم تھا کچھ اداؤں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، چار مہینے جاڑے کے بنگش کے کمرے والی

دو کان پر چار مہینے گرمی کے اجمیر شریف میں چار مہینے برسات کے قطب صاحب (مہرولی) میں جہاں جاتے وہیں کنکوے، پتنگیں اور تکلیں بناتے اور بیچتے اُڑاتے اور اڑانا سکھاتے *

دوسرا شغل اور شوق شعر کہنے اور شعر سننے کا تھا بالکل بے پڑھے لکھے تھے، شعر کہتے اور کسی آنے جانے سے فرماتے «میاں ذرا لینا یہ قلم دوات کاغذ ایک شعر گھسیٹتے جاؤ» اتنے میں دوسرا شعر ہوگیا کوئی اور سامنے پڑا اس سے لکھوا لیا۔ غزل پوری کرائی حفاظت سے رکھ دی، بہترین غزلیں تو شعر نقل کرنے والے کھا گئے اور اپنی بنا بیٹھے اس پر بھی مرتے وقت خاصا بڑا دیوان چھوڑا تھا، کام ہی دو تھے کنکوے بنانا اور شعر کہنا *

بے پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ توتلے بھی تھے اور پوپلے بھی، لوگ ان کا اس لیے لحاظ کرتے تھے کہ شجرہ نسب بغیر شک و شبہ اکبر ثانی سے ملتا تھا۔ وہ مشاعروں میں جاتے تو عزت سے بٹھایا جاتا اور شعر پڑھتے تو تتلانے پر کوئی نہ ہنستا، کہیں مسکراہٹ دیکھ لیتے تو تیموری خون جوش میں آجاتا بگڑ کر اُٹھ کھڑے ہوتے، اُن کا نام تو مجھے یاد نہیں عرف مرزا فخرو تھا جسے وہ مرزا فترو کہا کرتے تھے لیکن عام طور سے مرزا چپاتی کے عرف کے ساتھ مشہور ہوگئے تھے *

میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے عرسوں میں ہمیشہ جا آکرتا تھا یہ وہی عرس ہیں جنھیں دلی والے بڑی سترھویں اور چھوٹی سترھویں کے ناموں سے یاد کرتے ہیں، عرسوں میں سب کچھ روا ہے قرآن خوانی بھی ذکر و شغل بھی، قوالی بھی، بازاری عورتوں کے ناچ گانے بھی کھیل تماشے بھی اور مشاعرے بھی جس طرح قوالی اور ناچ گانے جگہ جگہ ہوتے اسی طرح مشاعرے جگہ جگہ ہوتے تھے چند شاعر اور شاعروں کے قدردان جہاں بیٹھ گئے وہیں مشاعرہ جم گیا *

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے تھوڑی دیر ہمایوں کا مقبرہ ہے سترھویں کا سلسلہ درگاہ سے مقبرے تک پھیل جاتا تھا، مقبرے سے متصل حضرت خواجہ صاحب نظام الدین اولیاءؒ کے رہنے کا مکان ہے اور خانقاہ ہے گویا اس جگہ سے لے کر جہاں حضرت بعد وصال آرام میں ہیں اس جگہ تک جہاں زمانہ حیات میں تشریف رکھتے تھے عرس کے مناسب و نامناسب مراسم ہوتے ہیں

خانقاہ کے ایک حجرہ میں جو حضرت کا کبھی کتب خانہ تھا آج سے باون ترپن برس پہلے ایک ترحی میں مشاعرہ ہو رہا تھا، میں پھرتا پھراتا وہاں پہنچ گیا، مرزا چپاتی غزل پڑھ رہے تھے، غزل تو کیا یاد ہوتی لیکن غزل کا ایک شعر ایسا تھا کہ بھلائے نہیں بھولتا، ارشاد ہوا ؎

میں سر جھکا کے سوئے جہنم چلا ہی تھا
کچھ رحم آ گیا مرے پروردگار کو

۵۰ برس پہلے میں نے دلی کے ایک بوڑھے ہندو سے یہ فقرہ سنا تھا بوڑھے مسلمان دوست سے رخصت ہونے لگے تو بولے "بھائی جو دم گذر جائے غنیمت ہے جام بریز ہو چکا چھلکنے کی دیر ہے"

۵۰ برس پہلے کی ایک حلال خوری بہو سے لڑ رہی تھی لڑتے لڑتے کیا کہتی ہے "مرت تلف جلائے جا جا منھ میں جھاڑو ٹھونس دوں گی، معلوم ہوگا کہ ددا تار انکل آیا"۔

۵۰ برس پہلے کے مغل شاہزادے کی زبان کا اس سے اندازہ کیجیے، مرزا چپاتی ہر وقت پھولوں کا مینہ برساتے رہتے تھے۔

میر باقر علی داستان گو

ہندوستان کہانی قصے اور ڈرامے کا ملک ہے کہانی قصہ اور ڈرامے سے ہندوستان کو بڑا تعلق ہے ہندو مذہب کی تو بڑی حد تک کہانی قصے اور ڈرامے کی جیسے ہے ہندوؤں کو مجمع رکھنے والی اکثر چیزیں کہانیوں، قصوں اور ڈراموں کی شکل میں لکھ دی گئی ہیں جنھیں ہر ہندو دلچسپی سے پڑھتا اور سنتا ہے اور ڈراموں کو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کی واقعات ایک سبق آموز قصے کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے پیغمبروں کے قصے بھی قرآن مجید میں موجود ہیں ماننا پڑے گا کہ اسلام بھی قصے کہانی سے بالکل بے تعلق ہرگز نہیں ہے، قرآن مجید نے ان واقعات کا نام خود "قصص" رکھا ہے۔ اور مسلمان بادشاہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں قصے کہانی کو جیسا اپنایا تھا کہ معلوم ہوتا ہے قصے کہانی کا جتنا شوق انھیں ہوا اتنا شوق کسی کو نہیں ہوا

مشہور عربی کتاب "الف لیلہ" جس کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے ایک طویل قصے کا مجموعہ جو ہزار رات مسلسل خلیفہ ہارون رشید کے سامنے کہا گیا تھا ؛

داستان امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" وغیرہ کی طویل و عریض اور ضخیم مجلدات بھی مسلمان بادشاہوں اور ان کے خوشہ چینوں کے شوق کا نتیجہ ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ کے فسانہ آزاد" کو بھی اسی زنجیر کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ قصے لکھ کر بھی سنائے جاتے تھے اور زبانی بیان کر کے بھی، زبانی سنانے والوں کی آخری یادگار کا نام میر باقر علی تھا۔ میر باقر علی کی باپ دادا شاہان مغلیہ کو زبانی داستان سنانے پر مقرر تھے اور اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے داستان گوئی میر باقر علی کا موروثی حصہ تھا اور داستان گوئی انھیں گھٹی میں گھول کر پلائی گئی تھی ؛

میرا لڑکپن تھا اور میر باقر علی ادھیڑ تھے میں نے انھیں پہلی مرتبہ نامور اخبار نویس سید جالب مرحوم کے ہاں دیکھا پھر میں ادھیڑ ہو گیا اور میر باقر علی بالکل ضعیف اتنے طویل زمانے تک مجھے ملنے کا اکثر وبیشتر اتفاق ہوتا رہا اور میں نے سینکڑوں داستانیں ان کی زبان سے سنیں ؛

میر باقر علی مخنی سے آدمی تھے۔ وھان پان قد بھی معمولی تھا لیکن داستان کہتے کہتے کبھی کسی بادشاہ کا ذکر آ جاتا کہ اس نے یہ کہا اور وہ کہا اور یہ دیا تو بادشاہ کی کہن اور بادشاہ کا حکم اس شان اور ایسے لہجہ میں ادا کرتے کہ گمان ہوتا کہ اس وقت ہمارے سامنے کوئی دبلا پتلا داستان گو نہیں ہے بلکہ ہم واقعی ایک قہار بادشاہ کے دربار میں ہیں اور اسے بولتا دیکھ رہے ہیں اسی طرح اگر ظالم ڈاکو کی نقل کرتے تو میر باقر علی میں اور ڈاکو فرق نہ رہتا تھا۔ پھر اگر کسی شریف معمر عورت کی بولی بولتے تو شریف بڑھیوں کی گفتگو کا انداز اختیار کر لیتے۔ دانت ہوتے ساتے بے دانتوں کے بن جاتے اور سرائے کی بھٹیاری کا خاکہ اڑاتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہم سرائے میں بیٹھے ہیں اور ہمارے سامنے بی بھٹیاری گل افشانی فرما رہی ہیں ؛

اردو کے علاوہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان یا عربی فارسی کے فقرے داستان میں بولنے پڑ جاتے تو اہل زبان کی طرح بولتے اور لطف یہ تھا کہ لوگ میر صاحب کے ان کمالات سے مرعوب

ہو جاتے اور کبھی محظوظ ہو کر بے اختیار داد دیتے لیکن میر صاحب کے چہرے پر ان تمام تاثرات کا اثر نہ آتا وہ مشین کی طرح اپنا کام کیے چلے جاتے اور داستان کو چھوڑ کر کسی اور بات کی طرف متوجہ نہ ہوتے البتہ جب داستان ختم کر چکتے تو داد کا نہایت مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرتے۔

میر باقر علی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی معلومات کو آخر عمر تک بڑھاتے رہے۔ ان کی باضابطہ تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن میں نے انھیں داستان گوئی کے علاوہ ہر علم و فن کے آدمیوں سے باتیں کرتے دیکھا ہے زبان تو اپنے مقابلہ میں جس کی چاہتے بند کر سکتے تھے لیکن معلوم ایسا ہوتا تھا کہ ہر علم و فن میں انھیں دخل ہے میں نے انھیں داستانوں میں بھی بڑے دلچسپ طریقے سے علمی و فنی نکات شامل کرتے دیکھا خصوصاً طبیعات، علم الارض، علم الکلام، طب جسمانی و روحانی کا ایک آدھ نکتہ کہے بغیر ان کی داستان پوری نہ ہوتی تھی۔ الگ کہنے کی ضرورت نہیں ہے یہ نہیں تھا کہ چند داستانیں انھیں حفظ تھیں اور انہی کو دہرایا کرتے تھے بلکہ ان کی داستانیں طبع زاد ہوتی تھیں۔

دلی کا ہر رئیس خواہ ہندو ہو خواہ مسلمان ان کی قدر کرتا تھا باہر کے امراء و رؤسا اور راجہ نواب بھی انھیں بلاتے تھے۔ اودھ کے ذی علم اور فیاض طبع رئیس راجہ نوشاد علی خاں مرحوم جب تشریف رکھتے تھے تو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کے رین بسیرے میں میر باقر علی کو ایک یا دو چار بار ضرور سنتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ داستان گوئی میر باقر علی پر ختم ہو گئی۔ میر باقر علی گھر کے سید تھے نسلی اعتبار سے بھی شریف اور ذاتی اعتبار سے بھی شریف کوئی ان کی شرافت کو ٹھیس نہ لگا سکتا تھا وہ راجہ نوابوں اور بڑے بڑے امیروں رئیسوں کے یہاں جاتے تھے اور بہ حیثیت داستان گو سنتے تھے لیکن ایک دفعہ ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے خودداری کو ہاتھ سے دیا ہو وہ فرق مراتب کو سمجھتے تھے اور آدمی کو پہچانتے تھے کوئی نو بڑھیا اور ان کرہ امیر حدود سے نکلتا تو داستان، داستان میں اس کی خبر لے ڈالتے اور بغیر کچھ لیے اس کے ہاں سے چلے آتے تھے جب ان کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو ایک دستکاری جانتے تھے اُن کے ذریعہ گزارہ کر لیتے مگر ضرورت مندی کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے حتیٰ کہ خود ہی کوئی انھیں داستان کہنے کے لیے بلاتا۔ چھالیہ ایسی کترتے تھے کہ شاید اب کوئی ویسی کتر سکتا ہو

ہمیشہ اُجلا لباس پہنتے، دلی کا انگرکھا، لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی، تنگ مہری کا پاجامہ، اچھے کاریگر کے ہاتھ کی بنی ہوئی چمڑے کی نازک اور خوبصورت جوتی۔ خندہ پیشانی تھے، بااخلاق تھے، ملنے جلنے میں اور ہر معاملے میں پابند وضع۔ بڑھاپے کی وجہ سے جب کہیں آنے جانے کے قابل نہ رہے تو اپنے گھر پر جمعہ کے جمعہ یا اتوار کے اتوار داستان کہنے لگے تھے، لوگ جوق درجوق وہاں پہنچتے تھے اور حسب مقدرت ان کی خدمت کرتے تھے۔

میر صاحب نے ایک دفعہ فرمایا "ہم نے عمر بھر میں فقط ایک مرتبہ چرکہ کھایا ہے اور آدمی کے سمجھنے اور پہچاننے میں غلطی کی ہے اور اُسی دن سے مجھے زیادہ احتیاط کی عادت ہوگئی ہے" یہ واقعہ خاص لطیفہ ہے اس لیے بیان کیے دیتا ہوں۔

میر صاحب کو ریاست پٹیالہ میں کسی رئیس نے داستان کہنے کو بلایا۔ میر صاحب نے سوچا ایک کے ہاں تو داستان کہوں گا ہی کیوں نہ یہاں کے دو چار اور امیروں سے بھی فائدہ اٹھاؤں، دو چار امیر داستان کہلوالیں تو خاصی اچھی رقم اس شہر سے مل جائے گی۔ چنانچہ داستان شروع کرنے سے پہلے اور داستان کہنے کے دوران میں جو نیا آدمی آتا میر صاحب اُس سے ایسا برتاؤ کرتے جس سے وہ اُن کی طرف متوجہ ہوجاتا۔

آنے والے ایک صاحب انھیں بہت ہی ذی شان نظر آئے، نہایت قیمتی کپڑے اور کوٹ پہنے خوب اُجلی شلوار، سر پر گپڑی پلیے ترنگے، وجیہ، میر صاحب نے ان کا سب سے زیادہ تپاک سے استقبال کیا اُن صاحب نے بھی توجہ سے استقبال کا جواب دیا۔ میر صاحب سمجھے یہ شخص امیر ہی نہیں خلیق بھی ہے۔ میر صاحب نے انھیں مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر وہ میر صاحب کے قریب بلکہ میر صاحب سے کسی قدر نیچی جگہ بیٹھ گئے۔ میر صاحب کو خیال ہوا کہ اس امیر میں اللہ تعالیٰ نے انکسار بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ غرض میر صاحب دوران داستان میں ان صاحب کی طرف خاص التفات کرتے رہے۔ انھوں نے بھی میر صاحب پر اتنی نظر کرم رکھی کہ میر صاحب کو یقین ہوگیا کہ یہ امیر سب سے بڑا قدردان نکلا اور یہ اپنے ہاں میری داستان ضرور کہلوائے گا۔

جب داستان ختم ہوئی تو میر صاحب نے اُن صاحب سے دریافت کیا "حضور کا دولت خانہ یہاں کہاں ہے"؟ انھوں نے کہا "جی پٹیالہ کے نزدیک ہی ایک گاؤں ہے، میں وہاں پٹواری ہوں" میر صاحب

کو سنا ٹا آ گیا اور میر صاحب کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اس وقت سے میر صاحب نے عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی لالچ کر کے ذلیل نہ ہوں گا، میر صاحب کس طرح بولتے تھے اور بولنے میں اُن کے کیا خوبی تھی اسے وہی شخص جان سکتا ہے جس نے انھیں بولتے سنا ہے میں اس سے زیادہ اُسے آپ کے ذہن نشین نہیں کرا سکتا، جتنا میں نے ذکر کر دیا، لیکن بہ حقیقتاً دریا کا ایک قطرہ ہے بولنے کے مقابلے میں میر صاحب کی تحریر بہت کم درجے کی تھی تاہم ایک تحریر کی چند سطریں نمونتہً پیش کرتا ہوں داستان کہتے کہتے نئی بیاہی لڑکیوں کو سمجھاتے ہیں ۔

" شرم کا دستور اس لئے مقرر ہے کہ تم خاموش رہ کر دیکھو کہ اس گھر کا طریقہ کیا ہے مزاج کیسے ہیں، عام عادتیں کیسی ہیں، جب تم کو ان باتوں کا علم ہو جائے تو اس وقت اپنی زندگی کا فیصلہ کرو اور یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ یہ ماں باپ کا گھر نہیں ہے یہاں کے لوگ تم سے محبت اُس طرح نہیں کریں گے جس طرح تمھارے ماں باپ کرتے تھے یہاں تبادلہ ہو گا، تم اگر کسی کو آرام دو گی تو وہ تم کو آرام دے گا، آدمی کا آرام اور تکلیف سب اپنے ہاتھ ہے، نظیر اکبر آبادی نے خوب لکھا ہے ؎

کر مشکل آسان اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے

روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے
مہمان کر تو اور کو تجھ کو بھی مہمانی ملے

جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجھدار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے

کل جگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

خاوند کا خیال رکھو کہ تمھاری ذات سے اس کو آرام پہنچے، جب اس کو یہ ثابت ہو جائے گا کہ میرا آرام اس کی ذات سے وابستہ ہے تو پھر وہ اپنے آرام کے واسطے تم کو آرام دے گا، خوبی تمھاری یہ ہے کہ اپنی عقل سے ہر شے کو دریافت کرو اور اتنا مادہ نہیں ہے تو نہایت ادب سے کسی

جاننے والے سے پوچھ لو، ادب انسان کے لیے عجیب زیور ہے خصوصاً عورت کے واسطے

ادب تاجیست از فضل الٰہی   بنہہ بر سر برو ہر کہ خواہی

خاوند کی تمام ضروری چیزیں احتیاط سے رکھو اور ہر چیز کے واسطے جگہ مقرر کرو کہ اگر رات کو بھی ضرورت ہو تو تم فوراً لے آؤ، اور اگر ایسا کرو گی کہ جو چیز جہاں پڑی ہے پڑی ہے تو اوّل تو وقت پر اس کے ڈھونڈنے میں وقت ضائع ہوگا، دوسرے جس کام کے لیے ڈھونڈھ رہی ہو وہ کام خراب ہوگا اور اکثر چیزیں جاتی رہینگی ایک انگریز کا کیا اچھا قول ہے کہ ہندوستان کیوں برباد ہوا" اس کا سبب وہ یہ بتاتا ہے کہ ہندوستانی چیز کو جگہ سے نہیں رکھتے۔

سسرال میں تم کو بے وجہ کوئی سخت و سست کہے تو یہ سمجھو کہ آدمی کا کام آدمیت ہے اس نے آدمیت کے خلاف کوئی حرکت کی تو وہ انسانیت سے گرا ہوا ہے تم نے اسکا بھی ویسا ہی جواب دیا تو تم بھی اس حد میں داخل ہوئیں اور اگر ایسا کرے تو سمجھو کہ اس کو دورہ پڑا ہے' ایک حکیم کا قول ہے کہ: غصہ کی ابتدا جنون اور انتہا پشیمانی ہے:

حضرت ذوقؔ بہادر بادشاہ کے استاد تھے کسی نے اُستاد کی ہجو لکھی' ایک شاگرد نے اُستاد سے کہا کہ استاد صاحب آپ بھی جواب لکھیں' استاد نے فرمایا میاں! جس زبان سے میں خدا کا نام لیتا ہوں اس زبان سے مجھ سے گالی نہیں نکلے گی۔

خدا نے تم کو زبان اچھے لفظ بولنے کے لیے عنایت کی ہے سہ

قُدرت کو ناپسند ہے سختی زبان کی   پیدا ہوئی نہ اس لیے ہڈی زبان کی

اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے پر عنایت کرتا ہے اسے منی آرڈر نہیں بھیجتا بلکہ اس کا خیال درست کر دیتا ہے تم ہر وقت اپنی سمجھ سے کام لو کیونکہ عقلمند کی زبان سے آگے عقل ہوتی ہے اور بے وقوف کی عقل کے آگے زبان' بات جب تک تمھارے منھ میں ہے تمھاری غلام ہے اور جب منھ سے نکلی تم اس کے غلام ہو گئے' اپنی زندگی غلامی میں نہ گزارو، آقا بن کر جیو ؛

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سسرال میں کمینی عورتیں میٹھی میٹھی باتیں کر کے تمھارے دل کا حال دریافت

کر لیتی ہیں۔ اور پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر ذلت کا باعث ہوتی ہیں۔ تم اُن سے نہ ملنا۔ شریف اور پاجی میں اتنا ہی فرق ہے کہ شریف دیکھتا ہے کہ میرا نقصان ہے لیکن منہ پھیر لیتا ہے، پاجی برابر سے نکلا اور اس نے طمانچہ لگایا۔ اگرچہ ہم نے اس سے پوچھا کہ ہمارا کیا قصور ہے تو ہنس کر کہتا ہے معاف کرنا طبیعت نہ رکی۔

چھوٹوں سے مہر و محبت سے پیش آؤ، لیکن اُن کو سہیلی نہ بناؤ کہ وہ تمہارا مقابلہ کریں۔ ایک حکیم کسی نے دریافت کیا کہ ہم اپنے چھوٹوں سے کیسا برتاؤ کریں تو اس نے جواب دیا کہ جو تم اپنے بڑوں سے چاہتے ہو۔

مولانا محمد اسحٰق صاحب

کراچی میں بندر روڈ پر کچہری ہاؤس کے بالکل بالکل مقابل کپڑے کی دوکان ہے وہاں ایک صاحب کپڑا اوڑھاتے نظر آئیں گے کپڑا بیچتے ہوئے نہیں کپڑا بیچنے کا کام اِن کے بھائی بھتیجے اور بیٹے کرتے ہیں ان کا کام صرف یہ ہے، بیچنے والا جس کپڑے کو کہے اسے الماری میں سے نکال کر سامنے ڈال دیں، پھر تہ کر کے اس کی جگہ پہنچا دیں۔ خاندانی پارچہ فروش ہیں۔

خیر تو جس صاحب کے ذمہ کپڑا دکھانے کا کام ہے آپ کبھی اُن سے بات کیجیے، تمام دنیاداری کی باتوں میں آپ سے انھیں ایسی انسیت ہوگی، جیسی کپڑے کا بھاؤ تاؤ بتانے والے اور کپڑا نکال نکال کر دینے والے میں ہوتی ہے لیکن دین دانش کا کوئی ایسا مسئلہ پوچھ کر دیکھیے جسے آپ انتہائی دشوار سمجھتے ہوں ان سے بہتر اس مسئلہ کا حل دوسرا نہ بتا سکے گا۔ مجھے اُن بزرگ کی خدمت میں بتیس تینتیس برس سے نیاز حاصل ہے اور میرا اور بڑے بڑے ذی علم لوگوں سے بھی تعلق رہا ہے میں نے اس قابلیت کا آدمی نہیں دیکھا ان کا نام محمد ایوب ہے افسوس ہے لکھنے کی مشق نہیں کی ورنہ مولانا محمد ایوب صاحب اُردو میں غزالی اور رازی کی سی کتابیں چھوڑتے، مولانا محمد اسحٰق ان مولانا محمد ایوب کے اُستاد تھے۔

مولانا محمد ایوب صاحب نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی، مولانا محمد ایوب کے بس ایک اُستاد

مولانا محمد اسحٰق تھے اور مولانا محمد اسحٰق کے ایک شاگرد مولانا ایوب ایسے مولانا اسحٰق صاحب کے پاس سینکڑوں طالب علم تھے، مَیں نے خود مولانا محمد ایوب سے پہلے اُن کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا لیکن نہ میں کچھ سیکھ سکا نہ دوسرے کچھ سیکھ سکے حقیقی شاگرد مولانا محمد اسحٰق کے مولانا محمد ایوب ہیں ۔

مولانا محمد ایوب میں غور و فکر کی صلاحیت مولانا محمد اسحٰق سے زیادہ ہے مولانا محمد ایوب بلا کے ذہین اور حاضر دماغ ہیں مگر علوم پر جتنا عبور مولانا محمد اسحٰق کو تھا اتنا مولانا محمد ایوب کو نہیں ہے غور و فکر کا فن بھی مولانا ایوب نے مولانا اسحٰق کے ذریعہ ہی جانا ہے، ہاں غور و فکر کرنے کی مشق خود بڑھائی اور اللہ کے دیئے ہوئے غیر معمولی دماغ کی وجہ سے بڑھائی، مولانا ایوب صاحب میں مولانا اسحٰق صاحب کی اور باتیں بھی بہت ہیں، مثلاً بڑے سے بڑے عالم کو خاطر میں نہ لانا اور بڑی سے بڑی شخصیت سے متاثر نہ ہونا - لیکن اب مولانا ایوب صاحب میں پہلے جیسی سختی نہیں ہے مولانا اسحٰق صاحب بہ ادا تا دم واپسین نباہ گئے ۔

مولانا اسحٰق صاحب در اصل رام پور کے باشندے تھے، بیس سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ حکیم مومن خاں مومن سے ملنے دلّی آئے والد واپس چلے گئے اور مولانا دلّی ٹھیر گئے اور ایسے کہ دہلی کے ہو گئے، کوچہ چیلان میں گلی مومن خاں میں قیام تھا، لوگوں نے کہا نواب شرف الدین آپ کے مشتاق ہیں ناگوار نہ ہو تو ذرا تشریف لے چلیئے ۔

نواب شرف الدین خاں کی حویلی بالکل سامنے تھی مولانا ان کے ہاں تشریف لائے نواب صاحب اس وقت کہیں باہر جا رہے تھے پھاٹک میں کھڑے کھڑے بات کرنے لگے اور بات بھی اس طرح کہ کبھی مولانا سے مخاطب ہوتے اور کبھی دوسروں سے، مولانا نے ساتھ لانے والے سے دھڑلے کہا میاں کس کے پاس لے آئے یہ تو آداب گفتگو سے بھی واقف نہیں ہیں - نواب شرف الدین خاں علم دوست اور مردم شناس رئیس تھے، انھوں نے باہر جانا ملتوی کیا مولانا سے بے معذرت چاہی اور عزت سے کمرے میں بٹھایا اور مدارات کے بعد کہا میری خواہش ہے

کہ میرے بچوں کی تعلیم و تربیت آپ فرمائیں۔ حویلی کے کمرہ پر پھاٹک تھا اس میں نواب صاحب نے بے شمار نایاب قلمی کتابیں جمع کر رکھی تھیں، وہیں فرش کرا دیا اور پلنگ بچھوا دیا اور مولانا محمد اسحٰق صاحب نواب شرف الدین کے بچوں کو پڑھانے لگے۔

نواب شرف الدین خاں سرسید احمد خاں (بانی دار العلوم علی گڑھ) کے سگے ماموں زاد بھائی تھے۔ جسٹس محمود کے خسر سر راس مسعود کے نانا سر راس مسعود کی والدہ اور ماموں نے تعلیم و تربیت کا زمانہ مولانا اسحٰق صاحب کے زیرِ نگرانی گزارا۔ نواب شرف الدین خان کے علاوہ خاتم المحدثین میاں نذیر حسین صاحب رح کے مدرسہ نذیریہ میں بھی مولانا محمد اسحٰق درس دیتے تھے اور آخر عمر میں خان بہادر مولوی عبد الواحد کے مطبع مجتبائی میں عربی کتابوں کی تصحیح کے لیے جانا اختیار کر لیا تھا۔ مگر صرف کام سے کام تھا۔ سیدھے گیے اور سیدھے چلے آئے تعلقات نہ میاں صاحب سے بڑھائے اور نہ مولوی عبد الواحد سے مولانا اسحٰق صاحب قریباً نوّے ۹۰ برس جیئے، شادی نہیں کی بالکل آزاد اور بے نیاز تھے۔

مولانا ایوب صاحب نے ایک دفعہ ندوہ میں آ کر اُن سے کہا تھا حضرت شادی کیجئے اور میرے برابر بیوی بچوں کو ذمہ داری اٹھایئے اور پھر دیکھیئے دماغ کس کا کام کرتا ہے۔

مولانا اسحٰق صاحب جس کمرے میں اوّل دن آ کر بیٹھے تھے اور جس پلنگ پر اوّل رات سوئے تھے اس کمرے سے ایسی حالت میں بھی نہ ہٹے کہ کمرے کی آدھی چھت غائب ہو گئی تھی اور پلنگ تو مرتے مرتے وہی اُن کے نیچے رہا۔

سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات مولانا اسحٰق صاحب پسند نہ کرتے تھے سرسید احمد خاں نے سب ہی سے زور ڈلوایا کہ دو منٹ کے واسطے کمرے میں آنے کی اجازت دے دیجئے۔ منظور نہیں کیا۔

دہلی کے پنجابی سوداگروں میں ایک صاحب تھے جن کا ان کے بچپن سے مولانا اسحٰق صاحب بے حد لحاظ کیا کرتے تھے۔ اُن کی درخواست پر تفسیر کبیر کا ترجمہ شروع فرمایا۔ ترجمہ ہوتا جاتا تھا اور چھپتا جاتا تھا ڈھائی سو صفحے بڑی تقطیع کے چھپ چکے تھے کہ امیر حبیب اللہ خان والئی کابل کی آمد کا غلغلہ مچا، سوداگر صاحب نے مولانا سے عرض کیا کہ ترجمہ امیر صاحب کے نام معنون کر دیا جائے تو کیسا ہے مولانا ترجمہ

بول رہے تھے اور لکھ رہے تھے ایک دم رک گئے۔ ترجمہ کا جو فقرہ زبان پر تھا اُسے بھی پورا نہیں کیا، اور کہا محمد اسحٰق اور تفسیر کبیر دونوں کی تم نے خوب عزت افزائی کی اب مجھ سے ترجمہ نہیں ہوگا۔

مرنے سے شاید آدھ گھنٹہ قبل مولانا ایوب صاحب نے پوچھا کچھ طبیعت تو نہیں گھبرا رہی بولے "اجی واہ" اس سے آگے زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اجی واہ کا مطلب تھا کہ میں اور مرنے سے گھبراؤں گا۔

ایک دفعہ ٹھوکر لگی گر پڑے اور لوہے کی کیل پنڈلی میں آر پار ہو گئی سی تک نہیں کی بڑی مضبوط طبیعت کے انسان تھے اُن کے علم و فضل کے متعلق رائے قائم کرنے کا میں اہل نہیں ہوں۔ البتہ یہ آنکھوں سے دیکھا ہے کہ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ جیسے ریاضی داں اپنے بیٹے رضا اللہ (انجینئر) کو مولانا اسحٰق صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے کہ یہ سوال مولانا حل کر سکیں گے اور مولانا کبھی منشی ذکاء اللہ کے پاس جاتے تو منشی صاحب تمام کام چھوڑ کر ان کے استقبال کے لیے نکل آتے۔ دوسرے علمائے شہر کو بھی میں نے ہمیشہ اُن سے مرعوب پایا اور مولانا ایوب صاحب اُن کے شاگرد کا نمونہ بتاتا ہے کہ مولانا اسحٰق صاحب کا علم و فضل کس پایہ کا تھا۔

دنیا کے واسطے نہ مولانا ایوب صاحب کچھ چھوڑ سکے اور نہ مولانا اسحٰق صاحب نے کچھ چھوڑا۔ ترجمہ تفسیر کبیر کے ڈھائی سو صفحے مولانا اسحٰق صاحب کی یادگار سمجھ لیجئے۔

بہرحال مولانا اسحٰق صاحب اپنے رنگ کے لاجواب انسان تھے اور دِلّی ہی نہیں دنیا کے ممتاز علماء میں ضرور تھے۔

میر محمد حسین

میر محمد حسین تفضّل حسین کے حقیقی پوتے تھے جنھیں ۱۸۵۷ء کا باغی قرار دے کر انگریزوں نے دار پر چڑھایا تھا۔ تفضّل حسین کی کھڑکی ایک محلہ دِلّی میں ہے یہاں تفضّل حسین کی حویلی تھی اس کی اب صرف کھڑکی باقی رہ گئی ہے۔

کلاں محل کے بھی تفضّل حسین خاں مالک تھے ۱۸۵۷ء کے بعد بطور سزا کے مزید جب اُن کی جائداد نیلام ہوئی تو پانچ روپیہ میں یا بیس روپیہ میں یا ایسی ہی بہت قلیل رقم میں اس عظیم الشان محل کو چھنا مل کے نام چھوڑ دیا گیا تھا۔

چاندنی چوک کے بازار کو قلعہ کی طرف وسعت دی گئی تو نئی دوکانوں میں سے ایک دکان میر محمد حسین نے لے لی اور وہاں فونٹین پن اور سائیکلوں وغیرہ کی تجارت شروع کی پہلے میر صاحب محکمہ نمک میں انسپکٹر تھے، تحریک عدم تعاون میں نوکری ترک کر دی تھی دوکان خوب چل رہی تھی حکیم اجمل خاں صاحب نے انھیں میونسپل کمیٹی دہلی کے ممبری کے لیے کھڑا کیا اور خلافت اور کانگرس کا ٹکٹ دے دیا منتخب ہو گئے لیکن ڈو دی رائٹ (DO THE RIGHT) ان کا تکیہ کلام تھا یعنی صحیح کام ہو کسی کی تابعداری پسند نہ کرتے تھے اپنے ضمیر کے پابند تھے ممبری کانگرس اور خلافت نے عطا کی تھی اس کے باوجود کانگرس اور خلافت کی غلط بات کا میر صاحب ساتھ نہ دیتے تھے لہذا تین سال بعد جب دوبارہ الیکشن ہوا تو کانگریس اور خلافت نے ان کے سر پر ہاتھ نہ رکھا۔

دور اب وہ تھا کہ انگریز پرانی طرز کے خان بہادروں اور رائے بہادروں کو عبث سمجھنے لگے تھے انگریزوں نے میر محمد حسین کو ایماندارانہ اور آزادانہ روش دیکھی تو انھیں سرکاری ممبر مقرر کر دیا۔ انگریزوں کی نمایندگی کے زمانے میں بھی میر صاحب حق کی حمایت کے عادی رہے تاہم انگریزوں نے انھیں نبھایا کانگرس تین برس میں گھبرا گئی انگریزوں نے نو برس میں ہٹایا۔ پبلک کا انتخاب ہوتا ہے نیب گورنمنٹ اپنے ممبر چنتی ہے میں ۱۹۳۴ء میں پہلی دفعہ میونسپل کمیٹی دہلی کا ممبر منتخب ہوا انتخاب سے فراغت پاچکا تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت میر صاحب تشریف لائے اور فرمانے لگے لیجیے یار! پتہ تو کٹ گیا، مجھے میونسپل کمیٹی کی ممبری پر آمادہ کرنے والے میر صاحب ہی تھے میں نے پوچھا کیا مطلب بولے آج چیف کمشنر نے ٹٹولا تھا کہ نئی کمیٹی غالباً سرکاری صدر (یعنی ڈپٹی کمشنر) کے خلاف تجویز پیش کرے گی، غیر سرکاری صدر بنانے کے حامی اس دفعہ زیادہ منتخب ہوئے ہیں آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے میں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک میونسپل کمیٹی کا صدر غیر سرکاری ہونا چاہیے۔

میں نے سوال کیا پھر چیف کمشنر نے کیا فیصلہ کر دیا کہ آپ کو نامزد نہیں کرے گا؟ بولے اس پائے کے انگریز زبان سے نہیں کہا کرتے کرتے ہیں خیر میر صاحب کا اندازہ صحیح تھا، میر صاحب نامزد نہیں ہوئے اور اتفاق کی بات سرکاری صدر کے ہٹانے کی تجویز پیش کرنے کا قرعہ اس فقیر کے نام پڑا چھے

میر صاحب نے ممبری پر آمادہ کیا تھا میری ممبری کی پہلی تجویز اور پہلی تقریر اسی مضمون پر تھی جس کے تعدد سے میر صاحب
کو کمیٹی بدر کیا گیا تھا، میر صاحب کے لیے یہ خوشی کافی تھی کہ میں نے اس تجویز کو پیش کیا بہر حال میر صاحب
نے تین سال گذارے اور اگلے انتخاب میں وہ اس علاقے سے کھڑے ہو گئے، جسے سر عبدالرحمٰن نے خالی کیا
تھا، سر عبدالرحمٰن مدراس ہائی کورٹ کے جج بن کر جانے والے تھے اور میونسپل کمیٹی کی ممبری اب نہیں کر سکتے تھے
سر عبدالرحمٰن کی امداد کے باوجود صرف اس جرم کی بنا پر کہ میر صاحب شیعہ تھے پبلک نے انہیں قبول نہیں کیا
اور کارآمد آدمی سے میونسپل کمیٹی کو محروم کر دیا۔

میر صاحب حقیقتاً ایسے آدمی تھے جیسے آدمیوں سے ملک اور قوم کا کام لینا چاہیئے تھا، انگریز
کمیٹی سے ہٹا دینے کے باوجود انہیں مانتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے، بڑے بڑے وفدوں کا اثر نہ
ہوتا تھا، اور میر صاحب کا تنہا کہہ دینا کافی ہو جاتا تھا وفدوں کی بات جھوٹی سمجھی جاتی تھی اور میر صاحب سچے
سمجھے جاتے تھے، میر صاحب کے کھرے پن کی انگریزوں نے جتنی قدر کی اتنی سُنّی کیا شیعوں نے نہیں کی۔

میر صاحب کے کیریکٹر کا دو مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے میری ممبری کی عمر سات
آٹھ برس ہو چکی تھی، میونسپل کمیٹی کے ایک چپڑاسی نے مجھ سے کہا "چیٹرجی صاحب کے نام سفارش کا
خط لکھ دیجیے، ریورنڈ چیٹرجی صوبہ دہلی اور مارواڑ کے ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ تھے اور اس کی وجہ سے
میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے، میں نے چپڑاسی سے کہا، چیٹرجی پر محمد حسین کا ممبر نہ رہنے کے باوجود مجھ سے
زیادہ اثر ہے کہو تو میر صاحب کو لکھ دوں وہ چیٹرجی صاحب سے سفارش کر دیں گے، چنانچہ میر صاحب
کو میں نے خط لکھ دیا، دوسرے دن میر صاحب تشریف لائے اور فرمانے لگے "واحدی صاحب
میں آپ کی بات نیچی نہیں کر سکتا، لیکن آپ بھی جو کام مجھ سے لیا کیجیے، اسے ٹھونک بجا لیا کیجیے اکل
میں آپ کا خط پہنچتے ہی اس چپڑاسی کے ساتھ چیٹرجی کے یہاں چلا گیا تھا، مسٹر چیٹرجی نے جو حالات
سُنائے ان سے معلوم ہوا کہ معاملہ ہرگز سفارش کے لائق نہیں تھا۔

ایک صاحب بالکل اجنبی میرے ہاں آئے اور کہنے لگے الہ آباد کا رہنے والا ہوں آپ سے
تعارف حاصل نہیں ہے، مگر مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے تکلیف دینے پہنچ گیا ہوں میری لڑکی نے

مسلم یونیورسٹی سے ایف. ایس. سی کیا ہے اسے لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج میں داخل کرانا ہے۔ لوگ کہتے ہیں مسز آصف علی کی سفارش سے لڑکی داخل ہو سکتی ہے۔ میں نے مسز آصف علی کی بجائے انہیں میر محمد حسین کے پاس بھیج دیا اور مکان کا پتہ بتا کر سمجھایا کہ زینے پر چڑھ کر پکاریئے گا —— میر صاحب —— " میلے اور موٹے جھوٹے کپڑے پہنے میر صاحب آ کھڑے ہوں گے یہ خیال نہ کیجئے گا کہ ان کے بس کا کام نہیں ہے، کام کیئے گا اور میرا حوالہ دیجیئے گا، میر صاحب مسز آصف علی کی طرح لیڈی ہارڈنگ کالج کی گورننگ باڈی کے ممبر ہیں۔ میر محمد حسین میونسپل کمشنر نہ رہنے کے بعد بھی بہت سے اداروں کے ممبر سیکرٹری اور صدر تھے، دہلی کا عربک کالج ان کی سکرٹری شپ میں ڈگری کالج بنا تھا، چنانچہ میر صاحب شیروانی ڈال الہ آباد کی ضرورت مند کے ہمراہ ہوئے اور ان کی لڑکی کو داخل کرا دیا اور دوسرے دن آ کر کہا ایسے صحیح کام لیا کرو، ایسے کام لینے والے پر میں احسان نہیں جتاتا بلکہ اس کا احسان مند ہوتا ہوں۔

ایک دفعہ میر صاحب نے فرمایا فلاں لڑکا میرا عزیز ہے، اسے کمیٹی میں میٹر ریڈر کرا دو میں نے میونسپل انجینئر سے کہہ دیا، مہینہ سوا مہینہ کے بعد میر صاحب نے دریافت کیا، بھئی اس لڑکے کا کیا کیا؟ میں نے کہا وہ نوکر ہو گیا ہے بولے "اچھا" مگر تعجب ہے وہ مجھ سے نہیں ملا میں نے کہا نوجوان نہیں سوچا کرتے کہ پھر بھی کبھی کام پڑے گا، میر صاحب اٹھے اور کوچہ چیلان سے قرول باغ تین میل کا فاصلہ طے کر کے اس لڑکے کے گھر پہنچے اور واپس آ کر کہا آپ نے بالکل درست کہا تھا ایک بات اور آپ کی مجھے یاد ہے آپ نے کہا تھا جس کا کام نہ کرنا ہو، اسے اس کے کام میں تھوڑا سا کام بتا دینا چاہیے کہ اتنا تو کر لا آگے میں کر دوں گا، پھر انشاء اللہ وہ نہیں پلٹے گا، ایک بات آپ نے مجھے آج سکھائی ہے میں دونوں باتیں گرہ میں باندھ لوں گا میر صاحب نے میری دو باتیں گرہ میں باندھی تھیں میں نے میر صاحب کی خدا جانے کتنی باتیں گرہ میں باندھ رکھی ہیں۔

ایک زمانے میں میلاد شریف کا بڑا چرچا ہوا، غربا تو میلاد کی محفلیں کیا ہی کرتے ہیں امرا رؤسا خطاب یافتہ اور اونچے لوگ یہ محفلیں کرنے لگے تھے، اسلامی کالجوں اور مسلم یونیورسٹی میں بھی محافل

میلاد منعقد کی گئیں اور ہر گھر ہر مسجد سے نوبت ہر سڑک تک آگئی ہیں نے میر صاحب سے کہا میر صاحب میلاد کی محفلوں کا یکا یک اتنا زور کیوں بندھ گیا ہے کیا لوگوں نے دنیا جاتی دیکھ لی ہے میر صاحب نے فرمایا انگریزوں نے مسلمانوں کی توجہ ادھر پھیر دی جدھر آسانی سے پھیری جاسکتی تھی، میں نے کہا، میر صاحب بات گلے نہیں اُتری فرمایا آجکل دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انگریز کے اشارے سے ہوتا ہے، یہ اس وقت کی ہے جب انگریز ہی انگریز تھے امریکہ برطانیہ پر نہیں چھایا تھا اور روس نے مقابلہ کے لیے خم نہیں ٹھونکے تھے ٭

میر صاحب لکھتے بھی اچھا تھے اور تقریر بھی اچھی کرتے تھے لکھنے والے اور تقریر کرنے والے اور ہر آن متحرک رہنے والے میر صاحب کے ہاتھوں پر اور زبان پر فالج گرا، سارا جسم فالج زدہ ہوگیا، اس حالت میں بھی میر صاحب دوسروں کے کام کئے جاتے تھے میر صاحب سے گھر میں نہیں ٹکا جاتا تھا لیڈر اور ممبر اپنے آپ کو بھی چمکایا کرتے ہیں اور اپنے کاروبار کو بھی چمکا لیتے ہیں مگر میر محمد حسین مولانا حسرت موہانی سے مشابہ تھے خود تو خاصے چمکے مگر کاروبار ان کا لیڈری اور ممبری کے ہوگیا جوں جوں انہماک خدمتِ خلق کی جانب بڑھتا جاتا تھا دون دون کاروبار گرتا جاتا تھا، آخری زمانہ افلاس کا زمانہ تھا، افلاس میں جیسا مستقل مزاج میں نے میر محمد حسین کو دیکھا کسی کو نہیں دیکھا، مفلسی کی کوئی کمزوری پاس نہیں پھٹکی افلاس میں استقلال اور بیماری میں ہمت میر صاحب کا حصہ تھا مسکرا مسکرا کر جان نذر جان آفریں کر دی ٭

---

(۱) یہ واقعات ملا واحدی صاحب ایڈیٹر "نظام المشائخ" کے ایک مقالہ سے ماخوذ ہیں، واحدی صاحب ان لوگوں میں ہیں، جو دلی کی تہذیب و ثقافت کا زندہ نمونہ ہیں۔ بوڑھے ہو چکے ہیں، لیکن ان کی آن اب بھی وہی ہے خدا انہیں مدتوں زندہ رکھے ٭

باب ۵۳

مخبر اور غدار

ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن

اس سرزمین پر بڑے بڑے علما اور صلحا پیدا ہوئے، جن کے علم نافع اور عمل صالح نے گمراہوں کو راہ یاب کیا، بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم دکھائی، جاہلوں کو علم کی نعمت عطا کی، یہاں بڑے بڑے صوفیا اور مشائخ نمودار ہوئے، جن کی روحانیت، کردار بلند اور تابناک سیرت نے تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیئے۔ آرنلڈ نے، اپنی کتاب (دعوت اسلام) میں لکھا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی رحؒ جب اجمیر سے دلی گئے، تو ان کی صورت و سیرت کے جلوے دیکھ کر راجپوتوں اور دوسری قوموں کے آٹھ سو گھرانے، —— یاد رکھئے آٹھ سو افراد نہیں آٹھ سو خاندان — مشرف بہ السلام ہوئے، یہاں بڑے بڑے ہنرور اور فنکار ابھرے، جن کے ہنر اور فن کے آگے، ملوک و سلاطین، ارباب جاہ و حشم اور صاحبان عیش و تنعم نے سر تسلیم خم کیا یہاں اسی سرزمین پر ان مجاہدوں کے قافلے اترے، جو جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر، گھر بار سے رشتہ توڑ کر، امیدوں اور آرزوؤں سے دستکش ہو کر وارد ہوئے تھے —

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ نہ مالِ غنیمت کے بھوکے تھے، نہ کشور کشائی کے متمنی، یہ آئے اور ان کے آتے ہی رنگ محفل بدل گیا۔ جہاں کفر کے ناقوس بجتے تھے وہاں صدائے تکبیر و تہلیل بلند ہونے لگی۔ جہاں دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی، وہاں خدائے واحد کی عبادت ہونے لگی۔ انہوں نے، سرکشوں، باغیوں، نخوت پرستوں اور دشمنوں کے سر کاٹے، لیکن ایک طرف سے

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا، اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سب ہی ایک ہوئے

اور دوسری طرف۔ یہ تلوار کے دھنی مجاہد، امر الٰہی کے اتنے پابند تھے کہ ان کی تلوار نے کسی بوڑھے کو، کسی عورت کو، کسی بچہ کو، کسی بیمار کو، کسی جنگ جو کو، حد یہ ہے کہ کسی درخت تک کو نہیں کاٹا۔ انکے جلال و جمال کے یہ مناظر ایسے نہ تھے کہ لوگ دیکھتے اور متاثر نہ ہوتے میدان جنگ میں ہار نہ ماننے والے سورما، جب انکا خلوص انکی اہلیت انکی صداقت و دیانت انکی پاکیزگی دیکھتے تھے، تو ہار مان لیتے تھے، اور اسلام کا کلمہ صدق دل سے پڑھنے لگتے تھے۔

یہی ہیں وہ میدان اور وادیاں، شہر اور ویرانے، صحرا، اور خارستان، جنگل اور آبادیاں جہاں وقت کے قیصر و فغفور، ملوک و سلاطین، بادشاہ اور شہنشاہ، اپنے صبا رفتار گھوڑوں پر فتح و نصرت کا پرچم لہراتے، شان و شکوہ، جاہ و تجمل اور دبدبہ و طنطنہ کے ساتھ، اپنے مٹی بھر سپاہیوں کے ساتھ، اپنے خدا پر بھروسہ اور اپنے جذبۂ اسلام پر اعتماد کرتے ہوئے آئے اور اپنے سے کئی گنا زیادہ مسلح اور طاقت ور حریف پر غالب آ گئے۔ غالب آنے کے بعد، انہوں نے انگریزوں کی طرح، نہ لوٹ کھسوٹ شروع کی، نہ الگ تھلگ رہے، اپنے وطن سے ترک تعلق کر کے یہیں رہ پڑے، یہیں کے ہو گئے، یہیں جیئے اور یہیں مرے، اور یہاں رہ کر اس ملک کو، اس ملک کے رہنے والوں کو، انہوں نے وہ بلند و بالا، خوب صورت اور خوش نما، دیدہ زیب اور سحر طراز عمارتیں دیں جو آج بھی موجود ہیں، اور شاید مرور ایام کے باوجود، ابھی بہت دنوں تک رہیں گی، جن کا طرز، جن کی وضع جن کا فن، پہلے بھی منفرد تھا، اب بھی یکتا ہے۔ انہوں نے صرف عمارتیں ہی نہیں بنائیں، دلکشا اور نظر افروز باغ لگائے، چمن بنائے، گلستان تعمیر کیے، جنہیں بڑی حد تک زمانہ نے مٹا دیا، لیکن ان کے آثار و نقوش اب بھی موجود ہیں، تاج محل، لال قلعہ، اور جامع مسجد کے ساتھ، فتح پور سیکری کے کھنڈر، شاہان اودھ کے ویرانے

دکن کے خرابے، اب بھی گزرنے والوں کو، دعوتِ تامل دیتے ہیں ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

ان آثار و نقوش کو مٹاتے مٹاتے زمانہ خود بھی مٹ جائے گا۔

کہتے ہیں کہ طاؤس اپنا جمال اور رنگا رنگی دیکھ کر بے خود ہو جاتا، اور رقص کرنے لگتا ہے، پھر ناچتے ناچتے جب اسکی نظر اپنے پائے زشت پر پڑتی ہے، تو، رقص بند کر دیتا اور سر جھکا لیتا ہے، شرما جاتا ہے اپنے وجود پر!!

ہم نے ابھی، اپنے علماء و فضلا صوفیا و مشائخ۔ ملوک و سلاطین۔ مجاہدین تہوّر شعار، اور غازیان دیندار کا ذکر کیا ہے، اور کون دل ہے، جو اپنے اسلاف و اکابر کی اس بزرگی اور عظمت پر، رقص نہ کرلے لیکن عین فخر و انبساط کے اس عالم میں پائے زشت نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ — یہ ہیں وہ مخبر جنہوں نے اپنی قوم کے خلاف، دوسری قوم سے مخبری کی، جنہوں نے اپنی قوم کی جاسوسی کی، اپنی قوم سے غداری کی، اور ذرا نہ شرمائے، انہوں نے اپنی حکومت کو ڈھانے کے لیے دشمنوں سے پھاوڑا لیا، اور بنیادیں کھودنے لگے اور دشمن کی حکومت کی بنیادیں، اسی پھاوڑے سے زمین کھودی اور استوار کر دیں۔ انہوں نے اپنا دامن سیم و زر سے بھر لیا، لیکن اپنی قوم کو بھیک منگوا دیا۔ انہوں نے اپنی جان بچالی۔ لیکن قوم کی گرانمایہ ہستیوں کے گلے پر چھری چلوا دی، انہوں نے جاگیریں لیں انعام لیے خطابات حاصل کیے، لیکن قوم کو تباہ کرا دیا۔ جب دشمن پوری طاقت سے حملہ کر رہا تھا، یہ اس کے دستِ بازو بنے ہوتے تھے ع

ترا اے کاش کہ مادر نہ زادے

ان غداروں، باغیوں، جاسوسوں، اور مخبروں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن دل کے ٹکڑوں کی طرح بکھری ہوئی ہے اسے سمیٹنا جمع کرنا، اور ایک لڑی میں پرونا بڑا تحیر کا کام ہے، ان کے حالات مرتب اور منضبط صورت میں اور کسی کتاب میں نہیں ملتے، برسبیل تذکرہ کہیں کہیں ان کا ذکر ملتا ہے، اس داستان کو مکمل کرنے کے لیے بلا مبالغہ میں نے ہزاروں صفحے پڑھے، جہاں سے جو مواد ملا، اکٹھا کیا، پھر اسے ترتیب دیا اور اب وہ اس کتاب کے ایک باب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے آپ اسے تھوڑی دیر میں پڑھ لیں گے، لیکن یہ تھوڑی دیر میں ختم ہو جانیوالا مواد میں نے کتنے دن کی تلاش

تفحص، تحقیق اور کاوش مطالعہ کے بعد فراہم کیا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تحقیق کے مرد میدان ہیں،
بہ این اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ، ناموس وطن کے ان غداروں کا تذکرہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

(۱)

گھر کا بھیدی

اس غدر کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ تھی کہ جن جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔
جن لوگوں کو، زیادہ سے زیادہ، بادشاہ کا، خاندان شاہی کا، اور، انقلابی لیڈروں کا وفادار ہونا
چاہیے تھا، وہی مخبر اور جاسوس بن گئے، دشمنوں نے ان کی مخبری سے فائدہ اٹھایا، دوست ہلاک ہوگئے۔
اسی دور میں، شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ایک ناول میں، جو غدر کے احوال و کوائف
پر مشتمل ہے، اور جس میں خود ان کے مشاہدے اور تجربے جھلک رہے ہیں، ایک واقعہ لکھا ہے جو
بالکل سچ ہے، لکھنے والے نے اس واقعہ میں طنز اور ملامت کا پہلو بادشاہ کے لیے نکالا ہے، جو
مرعوب ذہنیت کا نتیجہ ہے، ورنہ حقیقۃً یہ واقعہ بھرپور طنز خود اپنے قومی کردار پر ہے
غدر کی ناکامی کے :——

"اگلے دن خود جہاں پناہ بھاگنے کی تیاریاں کرنے لگے، سمجھا کہ بس اب صبح شام انگریز داخل
ہونے والے ہیں۔ وہاں کے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر واپس آ رہا تھا کہ بادشاہ کے خاص الخاص معتمد
یاقوت نے پیچھے سے آواز دی اور برابر آ کر کہنے لگا، بھلا ہوا میں نے آپ کو جاتے دیکھ لیا ورنہ
آپ کے گھر جانا پڑتا، جو انگریز آپ کے گھر میں چھپا ہے، یہ چٹھی اس کے نام کی ہے اس کو دے
دیں۔، یہ کہہ کر الٹے پاؤں پلٹ گیا، ابن الوقت اپنے دل میں کہتا چلا آتا تھا کہ اسی برتے پر
تتا پانی، مرہٹگی کا وہ حال کہ ایک دن قلعہ سے باہر قدم نہ رکھا، بیدار مغزی اس درجے کی کہ اپنے
خاص الخاص خدمت گار انگریزوں سے ملے ہوتے تو بغاوت کرنی کیا ضرور تھی؟ (۱)

---

(۱) ابن الوقت (ڈپٹی نذیر احمد) ص ۳۱

(۲)

الٰہی بخش اور رجب علی

غداران ملک کی تاریخ میں، الٰہی بخش اور رجب علی کا نام غیر فانی حیثیت اختیار کر چکا ہے الٰہی بخش بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔ ان کی لڑکی ولی عہد مرزا فخر الملک کی بیوی تھی۔ بہادر شاہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، اور اعتماد کی وجہ بھی تھی، اگر اتنے قریبی عزیز پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تو کس پر کیا جا سکتا ہے؟ لیکن انہوں نے قلعہ کا رتی رتی حال انگریزوں کو پہنچایا، بہادر شاہ کی گرفتاری اور شہزادوں کا قتل انہی کا کارنامہ ہے، رجب علی الٰہی بخش اور انگریزوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے۔ الٰہی بخش سے جو معلومات حاصل ہوتے تھے، ان سے انگریزوں کو باخبر کرتے تھے۔ ان دونوں کی غداری کامیاب ہوئی، تحریک انقلاب ناکام ہوئی۔ بہادر شاہ قیدی بنکر رنگون پہنچے اور مر گئے۔ انگریز مستقل طور پر اس دیس کے حکمران بن گئے۔ ہم نے ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ اس لیے کیا ہے کہ ان دونوں کے حالات بہت گڈمڈ اور ملے جلے ہیں، ایک دوسرے سے الگ کرنا، گوشت کو ناخن سے جدا کرنا ہے۔

انگریزوں کے جو خدمات ان دونوں نے انجام دیے، ان کا شاندار الفاظ میں اعتراف کیا گیا۔ انعام دیا گیا۔ جاگیریں بخشی گئیں، لیکن جو "خفیہ" کارنامے انہوں نے انجام دیے، ان کا ذکر کرنا انگریز مفاد عامہ کے اور اپنے مصالح کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا یہ داستان بہت تشنہ ہے، پھر بھی جو کچھ جہاں سے مل سکا، وہ حاضر ہے:—

الٰہی بخش اور بہادر شاہ

مرزا الٰہی بخش انگریزوں کی طرف سے اس بات پر مامور کیے گئے تھے۔ کہ کسی طرح بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ نہ جانے دیں۔ منشی رجب علی جو انگریزی کیمپ میں مخبری کے دفتر کے سر دفتر تھے۔ اور ہڈسن صاحب کی ناک کا بال

بنے ہوتے تھے۔ وہ برابر مرزا الٰہی بخش کو پیغام بھیج رہے تھے۔ اگر تم نے بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ جانے سے روک لیا۔ تو انگریز تم کو نہال کر دیں گے اور ساری عمر تم کو اور تمہاری اولاد کو اپنے انعامات سے شاہانہ زندگی بسر کرائیں گے۔ انگریزوں نے یہ وعدہ پورا کیا۔ بارہ سو روپے پنشن ان کی اولاد کو ملتی ہے۔

جس وقت بخت خاں بادشاہ سے ملاقات کر کے چلا گیا۔ تو مرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سامنے آئے۔ اور عرض کیا کہ لارڈ گورنر بخت خاں بہادر نے جو کچھ حضورِ عالی کے سامنے گذارش کیا ہے۔ فدوی کو اُس کے حرف حرف سے اتفاق ہے مگر مجھے ایک ضروری معاملہ گوش گذار کرنا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ آیا یہ لڑائی حضور سے ہے یا باغی فوج سے؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ انگریزوں کی فوج ان سے باغی ہوگئی اور سرکشی کر کے آپ کے پاس آگئی۔ آپ مجبور تھے۔ آپ کے پاس طاقت نہ تھی۔ جو ان کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ انگریز اندھے نہیں ہیں۔ وہ آپ کی مجبوری کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے۔ کہ آپ کے نام سے جس قدر کام کیے ہیں۔ اور جیسے جیسے حکم احکام جاری کرائے ہیں ان میں سے ایک میں بھی آپ کا دخل نہیں ہے۔ پھر آپ کو کس بات کا اندیشہ ہے فکر نہ کرنا چاہیئے۔ البتہ اگر آپ باغیوں کے ساتھ چلے گئے۔ تب بیشک انگریز آپ سے باز پرس کریں گے اور آپ کو مجرم قرار دینے کا ایک بہانہ اُن کو مل جائے گا۔ مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے۔ کہ باغی کسی جگہ جم کر مقابلہ کر سکیں۔ بخت خاں بہادر نے جو کچھ کہا اُس کو تو میں لفظاً مانتا ہوں۔ بیشک ہندوستان کی ریاستیں اور ہندو، مسلمان دل سے آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ باغی فوج آپ کے یا بخت خاں کے قابو میں رہے گی۔ جو فوج ایک ایسے آقا کے قبضہ میں نہ رہ سکی جس کے پاس روپیہ علم اور ہنر اور سب سے بڑی دولت عقل بخت خاں بہادر سے کہیں زیادہ تھی۔ تو پھر اکیلے بخت خاں بیچارے کیونکر ایسی خود سر اور بے مہار فوج کو مطیع کر سکیں گے۔ [۱۱]

---

[۱۱] دہلی کی جانکنی صفحہ ۱۴

الٰہی بخش کے دلائل الٰہی بخش نے بڑے نفسیاتی حربے استعمال کرکے بخت خاں کو مشتعل کیا۔ اور بہادر شاہ کو اسیر دام کر لیا۔ بادشاہ کا ہمدرد اور غمگسار بن کر کہا:۔

"گرمی کا موسم ہے۔ برسات آگئی ہے۔ حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہے۔ گھر سے باہر نکل کر مسافرت میں امن بھی ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسر آنا محال ہوتا ہے۔ اور لڑائی بھڑائی کی حالت میں تو لازمی طور سے بڑی بڑی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں شہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات کو کہاں کہاں لیے پھریں گے۔ لہٰذا میری گزارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرادوں گا۔ اور آپ پر آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔ سلطنت کا انجام جو کچھ ہو۔ آپ کی پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں جاتی ہے گی۔"

مرزا الٰہی بخش کی یہ تقریر سن کر بادشاہ چپ ہو گئے۔ کچھ جواب نہ دیا البتہ جب ایک خواجہ سرا نے عرض کیا کہ حضور صاحب عالم بہادر تو انگریزوں سے ملے ہوتے ہیں آپ بخت خاں بہادر کی گزارش پر توجہ فرمائیے۔ ان لوگوں کے کہنے میں نہ آئیے۔ مرنا اور تکلیف اٹھانا تو ہر زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے" تو بادشاہ نے فرمایا میں دونوں باتوں پر غور کرکے کل جواب دوں گا۔

دوسرے دن بادشاہ اور ان کی بیگمات قلعہ سے روانہ ہو کر ہمایوں کے مقبرہ میں آئے۔ بادشاہ نے عورتوں اور بچوں کو تو ہمایوں کے مقبرے میں بھیجا۔ اور خود درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں جاکر پہلے سلام کیا۔ اور پھر مقبرہ میں واپس آگئے۔

رجب علی اور الٰہی بخش مرزا الٰہی بخش نے تمام کیفیت منشی رجب علی کے ذریعہ سے ہڈسن صاحب کو بھیج دی تھی۔ اور لکھ دیا تھا۔ کہ بظاہر میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے۔ اور کل دوبارہ مقبرہ ہمایوں میں ملنے کا

وعدہ ہوا ہے اس لیے آپ کچھ فوج لیکر مقبرہ کے غربی دروازہ کی طرف سے آجائیے کیونکہ بخت خاں مشرقی دروازہ سے مقبرہ کے اندر آئے گا۔ اس کی فوج دریا کی ریتی میں پڑی ہوئی ہے۔ جس وقت بخت خاں رخصت ہوکر جائے۔ آپ فوراً اندر آکر بادشاہ کو گرفتار کر لیجیے۔

ہڈسن صاحب نے اس خبر کی اطلاع جنرل ولسن کو دی۔ اور اس کے ساتھ ہی منشی رجب علی کو حکم بھیجا کہ تم مرزا الٰہی بخش کو اطلاع دے دو کہ وہ جہاں تک ہو سکے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دیں۔ اور جب بخت خاں چلا جائے۔ تو ہم ۲ گھنٹے تک بادشاہ کو مقبرہ میں روکے رکھیں۔ اس کے بعد سب انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ جس وقت بخت خاں مقبرہ ہمایوں میں بادشاہ کے پاس آیا۔ تو بڑی دیر تک حجت بازی رہی۔ بادشاہ جانا چاہتے تھے۔ بخت خاں لے جانا چاہتا تھا۔ اور مرزا الٰہی بخش کی بھی آپس میں کچھ تیز و ترش گفتگو ہوئی۔

بخت خاں اور الٰہی بخش

مرزا الٰہی بخش نے کہا لارڈ گورنر صاحب! کل آپ نے فرمایا تھا۔ کہ میں حضور کو ہر تکلیف و فکر سے محفوظ رکھوں گا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے۔ کہ جہاں پناہ کے نام کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ظلِ سبحانی کو اس سخت موسم اور اس بڑھاپے کی حالت میں آپ کیا محض اس وجہ سے لے جاتے ہیں۔ کہ ہندوستان کی بادشاہی آپ کو مل جائے۔ اور صدیوں کا انتقام مغلوں سے لیا جائے۔ جنھوں نے پٹھانوں کی سلطنت تلوار کے زور سے چھینی تھی۔ میں جانتا ہوں۔ کہ آپ بھی پٹھان ہیں اور پٹھان سینکڑوں برس تک کینہ کو نہیں بھولتے۔

مرزا صاحب کی یہ بات سن کر بخت خاں اس قدر بگڑا کہ قریب تھا مرزا صاحب کو ہلاک کر دے مگر بادشاہ نے اس کو روکا اور فرمایا۔

بہادر! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ اس لیے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ۔ اور کچھ کام کرکے دکھاؤ۔ میں نہیں میرے

خاندان میں سے نہیں رہی تم یا اور کوئی ہندوستان کی لاج رکھے ہمارا فکر نہ کرو۔ اپنے فرض کو انجام دو۔"(۱)

فریب کھل گیا

بہر حال جس وقت ہڈسن صاحب کا پیغام بادشاہ کو پہنچا انہوں نے مرزا الٰہی بخش کو گھور کر دیکھا اور کہا تم نے مجھ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا اگر انگریزوں کو مجھ سے کچھ سروکار نہیں تھا جیسا کہ تم نے بیان کیا تھا تو پھر مجھ کو وہ گرفتار کرنے کیوں آئے ہیں؟" مرزا الٰہی بخش سر جھکائے خاموش کھڑے رہے اور بادشاہ نے پھر ارادہ کیا کہ کسی کو بھیج کر بخت خاں کو واپس بلا لیا جائے۔(۲)

الٰہی بخش کا ایک اور کارنامہ

اپنے آقا و ولی نعمت بہادر شاہ کو گرفتار کرا کے الٰہی بخش کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا۔ بہادر شاہ کے بیٹوں کو بھی انہوں نے گرفتار کرایا۔ اور قتل کرایا:—

مرزا الٰہی بخش نے نصیحت کی وقت کھو دیا۔ اور وہ ... ہو جاؤ دکھاوے کو ہم ہڈسن صاحب شہزادے مقابلہ اور مجادلہ سے دست بردار ہو گئے۔ اور مرزا کے مشورے کے موافق تین شہزادے بلا کسی شرط کے رتھوں پر سوار ہو کر ہڈسن کے پاس چلے آئے۔ انگریزوں نے ان مصیبت زدوں کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور دہلی کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ جب دہلی ایک میل رہ گئی تو ہڈسن نے شہزادوں کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے اتار ڈالیں۔ بدنصیب بے بس تھے۔ فوراً تعمیل کی۔ لباس شہزادگی جسم سے جدا کیا۔ اور حسرت سے ہڈسن کی طرف دیکھنے لگے کہ اب کیا کہتا ہے۔ ان کو خیال تھا کہ شاید اس جگہ سے مقید کر کے پا پیادہ لے جانے کا ارادہ ہے۔ مگر نوشتہ تقدیر کچھ اور تھا۔ میجر غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اور اپنے ہاتھ سے شہزادوں کے مقام قلب پر تین گولیاں ماریں۔ مظلوم باپ کے دھوکہ کہہ کر گرے اور تھوڑی دیر خاک و خون میں غلطاں رہ کر راہی عدم ہوئے۔

---

(۱) دلی کی جاں کنی ص۴۲

(۲) دلی کی جاں کنی ص۴۵

جب لاشیں ٹھنڈی ہوگئیں تو اُن کو شہر میں لایا اور کوتوالی کے دروازہ پر ایک رات دن سر بازار آویزاں رکھا۔ مشہور ہے کہ ان مظلوموں کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفے ارسال کیے گئے۔ لیکن یہ انسانیت سوز وحشیانہ حرکت کسی معتبر تاریخ میں درج نہیں ہے اور غالباً غلط ہے

ہڈسن کے اس ظلم پر شریف انگریزوں نے اعتراض کیا۔ لارڈ ابرٹس نے اس کو خطا قرار دیا۔ جسٹس مکارتھی نے قتل عمد کے برابر سمجھا۔ مسٹر ڈسریلی نے کہا کہ انگریز افسر نے کانپور کے نانا صاحب کی سی وحشیانہ کارروائی کی مگر اس ستمگاری کے تھوڑے ہی دن بعد وہ لکھنؤ میں عالم باغ کے قریب باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لہٰذا اُس کے خلاف زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہے۔ (۲)

الٰہی بخش کی پنشن

مرزا الٰہی بخش کی جلاوطنی منسوخ ہوئی۔ اور وہ مرتے دم تک درگاہ حضرت سلطان جی رح میں رہے۔ غالب کی قبر کے پاس ان کا شاندار مکان بنا۔ جواب کھنڈر پڑا ہے۔ جلاوطنی ہی منسوخ نہیں ہوئی۔ بلکہ بارہ سَو روپیہ ماہوار پنشن بھی نسلاً بعد نسل شروع ہوگئی۔ جو ان کے بیٹوں مرزا سلیمان شکوہ عرف بڑے مرزا ثریا جاہ اور مرزا اقبال شاہ میں تقسیم ہوئی۔ اور اب مرزا ثریا جاہ کے مرنے کے بعد ان کی بیگمات و ورثا کو ملتی ہے۔ مرزا الٰہی بخش احسان کے لڑکے درگاہ حضرت سلطانجی رح کے شرقی رُخ سنگ سرخ کی جالیوں کے اندر دفن ہیں مرزا الٰہی بخش آخر میں خیر خواہ سرکار ثابت ہوئے تھے۔ بہادر شاہ کے سمدھی تھے (۳)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا

لیکن خواجہ حسن نظامی صاحب کی یہ تحقیق صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ سرلیپل گریفن نے پنجاب کے روسا اور امرا کا جو تذکرہ سرکاری ریکارڈ اور دستاویزوں کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ اس

۱؎ ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ۔ جلد ۲۲۔ ص ۱۸۸۔ ۱۸۹ ۔ ۱۲

(۲) بہادر شاہ ظفر (امیر احمد علوی)

(۳) غدر کی صبح و شام۔

میں جہاں اس پنشن کے بارے میں صحیح معلومات دیے ہیں، وہاں، کچھ اور اہم معلومات بھی درج کیے ہیں ہم ذیل میں اس کا ایک حصہ درج کرتے ہیں :-

" ضلع دہلی کے پروانشل درباریوں کی فہرست میں مرزا قربان جاہ عرف کیوان شکوہ کی جگہ سب سے اعلیٰ ہے اس کو جاہ و مرتبہ اپنے والد مرزا الٰہی بخش سے جس نے ۱۸۵۷ء میں سرکار انگریزی کی جان نثاری و خدمت گذاری بدرجہ غایت کی تھی ورثہ میں ملے ہیں۔ محل شاہی میں مرزا الٰہی بخش کی خوب چلتی تھی کیونکہ نواب زینت محل بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی کی چہیتی بیوی اس پر بڑی مہربان تھی مرزا کی ایک لڑکی بادشاہ کے سب سے بڑے لڑکے فتح الملک مرزا فخرو سے جس کا غدر شروع ہونے سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا بیاہی ہوئی تھی غدر ہو جانے پر جب دہلی کا محاصرہ شروع ہوا تو مرزا الٰہی بخش شہر پناہ کے اندر ہی رہا اور اس وجہ سے وہ باغیوں کی کارروائیوں کی ضروری اطلاع بہم پہنچا سکتا تھا اور ہمارے (سرکار انگریزی کے) ایجنٹوں کی حفاظت اور مدد کر سکتا تھا اس نے پچاس عیسائیوں کی ایک جماعت کی جانیں بچانے میں حد درجہ کی کوشش کی مگر وہ بادشاہ کے علم سے قلعہ کے اندر بے رحمی اور سختی کے ساتھ قتل کر دیے گئے انگریزوں کی جنگی کارروائیوں میں جو واقعی امداد مرزا نے کی وہ یہ تھی کہ دہلی کے جمنا کے پل کو جو شہر کے مقابل تھا کاٹ دیا جس سے مشرقی جانب سے باغیوں کی رسد اور فوجی امداد کا آنا بند ہوگیا۔ بعد ازاں مرزا نے ایسی کارروائی کی کہ لڑائی جھگڑا ہونے کے بغیر ہی بادشاہ حراست میں آگیا اور اس کے بعد اس نے شہزادگان خضر سلطان اور ابوبکر کے گرفتار کرنے میں بھی ہڈسن صاحب بہادر کی امداد کی جن گرفتاری کے بعد باغیوں کا کوئی خاندانی سردار نہ رہا اور بغاوت فرو ہوگئی غدر کے فرو ہونے پر مرزا کی کارروائیوں کی اچھی طرح چھان بین ہوئی نقصان کا مناسب معاوضہ دیا گیا یعنی یکم مئی ۱۸۵۷ء سے مرزا اور اس کے کنبے کو مبلغ ۲۲۴۴۰ روپے سالانہ کی نسلاً بعد نسلٍ پنشن ذیل عطا کی گئیں :-

مرزا کی ذات خاص کے لیے	۹۵۵۰ روپیہ
مرزا کی بیوی کے لیے	۴۵۴۰ روپیہ

مرزا کی لڑکیوں کے لیے — ۴۴۷۰ روپیہ

مرزا کے دوسرے رشتہ داروں کے لیے — ۱۰۸۰ روپیہ

بعدازاں ۱۸۶۱ء میں اس عطیہ کے عوض جو غدر سے پہلے مرزا اور اس کے رشتہ داروں کو مشترک طور پر مواضعات سانپلا آسودہ ضلع رہتک سے ملا کرتا تھا گورنمنٹ ہند نے صرف مرزا کو ۵ ہزار روپیہ سالانہ کی مالیت کی دوامی جاگیر عطا کر دی اور ۱۸۶۶ء میں اضلاع دہلی اور میرٹھ میں مبلغ ۲۲۲۶ روپیہ سالانہ کے مالیت کے چند مواضعات کا مالیہ مرزا اور اس کے کنبے کے لیے واگزاشت کر دیا نیز ایام غدر کے محاصرے میں مرزا کے مال و اسباب کے نقصان کی تلافی میں گورنمنٹ عالیہ نے مبلغ ۱۱۴۳۷۶ روپیہ عطا کیے اور ۱۸۶۲ء میں ۲۵۰۰۰ روپیہ بطور قرضہ دیا جس میں سے بعض سے زیادہ رقم مرزا پر خاص مہربانی کے نظر سے معاف کر دی گئی اور پھر ۱۸۷۷ء میں حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند کے خطاب شہنشاہ اختیار کرنے کے موقع پر اس کی پنشن میں ۲۲۵۰ روپیہ کا اضافہ کیا گیا۔ جب ۱۸۷۸ء میں مرزا الٰہی بخش کا انتقال ہو گیا تو اس کا سب سے بڑا بیٹا مرزا سلیمان شکوہ اس کا جانشین ہوا مگر بارہ سال کے اندر ہی یعنی ۱۸۹۰ء میں انتقال کر گیا اور اسی سال مرزا ثریا جاہ عزت کیوان شکوہ اپنے بڑے بھائی کی جگہ مغلوں کا بزرگ خاندان تسلیم کیا گیا۔ مرزا ثریا جاہ عدالت ہائے دیوانی میں بذات خود حاضر ہونے سے مستثنٰی ہے شہر کا آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہے اور جامع مسجد اور مسجد فتح پوری اور اینگلو عربی ہائی اسکول کی منتظمہ کمیٹیوں کا ممبر بھی ہے مرزا اور اس کے کنبے کو ۲۰۹۰ روپیہ ماہوار کی پنشن ورثہ میں ملی ہے جس میں سے ۸۷۶ روپیہ تو مرزا کی ذاتی پنشن ہے اور باقی ماندہ اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے۔ (۱)

"دہلی کا غدار"

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں۔

یہ وہی الٰہی بخش ہیں جنہوں نے بہادر شاہ کو گرفتار کرایا تھا۔ اور جنہیں باسودھ

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد اول ص

اسمتھ مصنّف سوانح لارڈ لارنس "دہلی کا ٹریٹر" لکھتا ہے۔ سانڈرس نے ان کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے "فاتحوں کی ادنیٰ خوشنودی کے لیے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے باپ کو پکڑوا دے" چونکہ غدر کے بعد گورنمنٹ چاہتی تھی کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی نام و نشان دہلی میں باقی نہ رہے اس لیے الٰہی بخش جیسے خاندان فروش کو بھی دہلی میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ بہرحال کچھ دنوں کی زار نالی کے بعد انہیں قیام کی اجازت مل گئی۔ اور وہ خاندان شاہی کے ہیڈ مقرر ہوئے۔ عید کے دن انہوں نے چاہا تھا کہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر عیدگاہ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا تو چوبدار بھیج کر ممانعت کردی کہ یہ امتیاز قلعہ کے شہزادوں کو حاصل تھا اب وہ زمانہ گیا۔ (۱)

یادگار خاندان تیموریہ

لارڈ لارنس کے سوانح نویس باسورتھ اسمتھ نے الٰہی بخش کو "ٹریٹر" یعنی غدار کہا تھا۔ لیکن "نصرت نامۂ گورنمنٹ" کا مصنّف انہیں "یادگار خاندان تیموریہ" قرار دیتا ہے۔ الفاظ اور ان کی بندش ملاحظہ ہو: —

کئی شہزادے جو شریک بغاوت تھے کیفر کردار کو پہنچے۔ اللہ اللہ عدل سرکار ابد پائیدار شہنشاہ انگلینڈ و بنداِم اقبالہ کہ باوجود ایسی حرکات ناشائستہ کے جو اس خاندان سے سرزد ہوئیں جو لوگ کہ حد اعتدال پر قائم رہ کر وفادار و غاشیہ بردار اطاعت رہے ان پر الطاف شہانہ خسروانہ مرعی رہیں چنانچہ دہلی میں مرزا الٰہی بخش صاحب یادگار خاندان تیموریہ بقوت تمام پنشن خوار رئیس شاہجہاں آباد ہیں (۲)

رجب علی

اب مولوی رجب علی — جو بعد میں "ارسطو جاہ" کے خطاب سے عدد جاگیر کے نوازے گئے — سامنے آتے ہیں۔ دیکھیے ایک انگریز ان کا تعارف اس طرح کراتا ہے: —

---

(۱) غالب (غلام رسول مہر) صـ ۲۹۱

(۲) نصرت نامہ گورنمنٹ

انگریز کی نظر میں

مولوی رجب علی نے ۱۸۲۶ء میں اٹھارہ برس کی عمر میں دہلی کالج سے جو اس وقت شمالی ہندوستان میں بہترین درسگاہ تھی فارسی مضمون لکھنے کا انعام حاصل کیا اور پھر عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ اُسے انبالہ کے پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں ایک چھوٹا عہدہ مل گیا وہاں وہ فوراً ترقی کرکے اعلیٰ سررشتہ دار (ہیڈ کلرک) ہوگیا اور اسی حیثیت میں مسٹر ایلیسن صاحب بہادر کے ماتحت ۱۸۳۹ء میں لدھیانہ بھیج دیا گیا بعدازاں ہنری لارنس صاحب کے ہمراہ وہ لاہور آیا اور بہت جلد پنجاب کے رؤسا اور شرفا میں جن سے اس کو سابقہ پڑا رسوخ پیدا کر لیا سرہربرٹ ایڈورڈ صاحب مرحوم اس کی بڑی قدرو منزلت کیا کرتے تھے اور انہوں نے ۱۸۴۸ء میں اس کی نسبت یہ تحریر کیا کہ "میں پالیسی کے معاملات میں اس کی رائے کو قابل قدر سمجھتا ہوں" نیز سر ہنری لارنس کے خیال میں یہ شخص نہایت راز کی خبروں کا بڑا قابل اعتبار امین ثابت ہو چکا ہے میں اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں کہ مولوی اگرچہ صاحب قلم ہے مگر تلوار کی چمک سے بھی ڈرنے والا نہیں ۱۸۴۶ء میں جب لاہور میں گاؤکشی پر بلوہ ہوا تو اس نے کمال اطمینان خاطر و شجاعت سے کام لیا۔

صاحبان ایلیٹ کری۔ جارج کلارک۔ رابرٹ منٹگمری اور ٹیمپل نے بھی جو مولوی رجب علی کو اچھی طرح جانتے تھے اور جن کو اُس کے اطوار دیکھنے کا بہت موقع ملا اس رائے کی تائید کی ہے۔ ۱۸۵۳ء میں جب سر ہنری لارنس نے اس کی موضع علی گڑھ کی جاگیر کو علی الدوام کردینے کی سفارش کی تو اس طرح سے لکھا کہ "لاہور میں بلوے کے وقت میں نہیں جانتا کہ ہم رجب علی کے بغیر کیا کرتے۔ اس وقت سے مجھے تمام پولیٹیکل انتظامات اور عمدہ بیان کرنے میں بڑی امداد دیتا رہا۔

نوازشات کی بارش

۱۸۵۳ء میں سر ہنری لارنس نے رجب علی کی خدمات کا صلہ دلانے کی کوشش کی تھی وہ آخر کار ۱۸۶۶ء میں لارڈ لارنس وائسرائے ہند نے عطا کیا یعنی اسے موضع علی گڑھ اور دولوں تلونڈیوں میں جو تحصیل جگراؤں ضلع لدھیانہ میں واقع ہیں ۲۶۹۶ روپیہ سالانہ کی جاگیر اُن بیش قیمت خدمات کے صلے میں ملی جو اُس نے ۱۸۵۷ء

کے محاصرۂ دہلی میں کیں اور نیز اُن خدمات کے عوض جو اُس نے اُس وقت انجام دیں جبکہ فرمانروا سے بہتا آ کے مابین اس باب میں عمدہ بیان ہو رہے تھے کہ سرکاری فوج کو افغانستان کے مہموں میں جن کے باعث پنجاب کا سرکار انگریزی کے علاقے کے ساتھ الحاق ہوا شامل ہونے کے لیے سکھ سرحد سے گذرنے کی اجازت مل جائے ایام غدر میں مولوی رجب علی کی خدمات کوارٹر ماسٹر جنرل مقیم بیرون شہر دہلی کے سپرد کی گئیں تاکہ وہ ہاؤسن صاحب کو انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ کے ترتیب دینے اور چلانے میں امداد دے چنانچہ وہ اس اہم فرض کی انجام دہی میں کامیاب ہوا اور اُسے دہلی کے محاصرہ کی خدمات کے صلے میں ۱۰۰۰۰ روپیہ انعام ملا۔

"مولوی کو ۱۸۶۶ء میں خان بہادر کا اور ۱۸۵۸ء میں ارسطو جاہ کا خطاب عطا کیا گیا اس کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا جس کا اس کے تمام جاننے والوں کو رنج ہوا۔" (۱)

جنگی کاغذات میں ذکر

رجب علی کے "شاندار" کارناموں کا ذکر، جنگی خط و کتابت میں بھی، اچھے اور مربیانہ الفاظ میں موجود ہے، دو تحریریں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:۔

مراسلہ نمبر ۱۳

جسے سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے جارج کارنک بارنس کے نام ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

لاہور ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس

میں نے سانڈرس کو لکھ بھیجا ہے کہ مولوی رجب علی (صاحب) کو بھیج دیں یہ غریب اپنی خدمات کے باوجود عجیب زغہ میں پھنس گئے ہیں۔ مجھے مولوی کو پنجاب میں واپس بلا لینے سے خوشی ہوگی۔ اور وہاں میں ان کے فوائد کا خاص خیال رکھوں گا۔

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اوّل، ص ۳۳۹

طوفان ختم ہوگیا۔ اور ہمیں سانس لینے کی فرصت ملی اور جب میں گذشتہ واقعات پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ہم لوگ کس طرح سے اب تک ہوں کے توں زندہ موجود ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کے رحم کی وجہ سے ہم زندہ بچے ہیں۔ یقیناً یہ بات ہماری توقعات سے زیادہ نکلی کہ تمام پنجابی پلٹنیں وفادار ہیں۔ ہزارہ کے بارہ میں مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا مری میں بھی اہم معاملہ رو نما ہونے والا تھا۔ اور جیسی کہ میں نے توقع کی تھی۔ معاملات ابھی تک پورے طور پر طے نہیں ہوتے ہیں پنڈی میں ایک اور فوج بھیج رہا ہوں اور اس فوج کو ہٹا دیا جاہتا ہوں۔ جو لدھیانہ میں ابھی بھرتی کی گئی ہے۔ جان پٹنیں جنہوں نے فوج کی کمان کی تھی۔ سخت بزدل نکلے اس لیے کہ جب بدمعاش قبضہ میں تھے۔ وہ ان کا کچھ نہ کر سکے۔ اب انہیں بخار چڑھ آیا۔ لہٰذا انہیں بالضرور واپس آ جانا چاہیئے۔

سکھوں کی ان دو پلٹنوں کا کیا حشر ہوا جنہیں رکٹس نے بھرتی کیا تھا مجھے امید ہے کہ انہیں چھوڑ نہ دیا گیا ہوگا۔

پٹیالہ نابھ اور جیند کے لیے جو انعامات ہمیں تجویز کرنے چاہئیں ان پر ذرا اپنے ذہن میں غور و خوض کر لیجئے۔ انہیں ضرور انعام و اکرام دینا چاہیئے۔ اگر وہ وفاداری نہ کرتے تو ہم کہاں کے رہتے۔

آپ کا صادق

جان لارنس ۔ (۱)

"تزک رجب علی"

مولوی رجب علی نے اپنے جو حالات، خود، "تحقیقات چشتی" کے لیے تحریر فرماتے ہیں، وہ ذیل میں درج کیے گئے ہیں۔ اسلئے کہ ع

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

"سنہ ۱۸۱۶ء میں بمقام تلونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں دیوان محکم چند افسر فوج مہاراجہ

---

(۱) محاصرۂ دہلی کے خطوط صہ ۳۲

رنجیت سنگھ نے تلونڈی کو معہ دیہات بے سبب بلا وجہ ضبط کرکے ہمارے بزرگوں کو جلا وطن کر دیا وہاں سے نکل کے گجراؤں میں آتے سردار فتح سنگھ بہادر اہلوالیہ نے محض عالیجاہی سے دو ہوڑیاں واسطے استقامت کے گجراؤں میں عطا کیے اور پھر راجہ نہال سنگھ ان کے فرزند نے کچھ زمین باغ کے لیے بخش دی اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے پھر راقم واسطے تحصیل علوم کے بعمر دوازدہ سالگی لاہور کو گیا اور علوم طلبیہ کو سید خیر شاہ لاہوری تلمیذ حکیم اعلیٰ سے حاصل کیا اور کتب امامیہ کو ملا مہدی خطائی تلمیذ جناب ملا محمد مقیم صاحب یکے از تلامذہ جناب شیخ حر عاملی علیہ الرحمۃ سے کہ علمائے اعلام شیعہ سے ہیں پڑھا تھوڑی صرف نحو بھی حاصل کی ۱۸۲۵ء میں دہلی میں مدرسہ تجویز ہوا حکام درپے اشاعت علوم متوجہ ہوئے تو راقم نے بھی علوم متداولہ رسمیہ وہاں حاصل کیں اور مدرسہ دہلی میں مدرس علم ریاضی کا رہا حکام حضور چارلس مٹکف صاحب بہادر لورالیٹ صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی عنایت کرتے تھے اور خصوصاً سر چارلس تریولین صاحب بہادر جو اب مدراس میں گورنر ہیں ان کی عنایتوں کی تو نہایت نہیں بہت نظر عنایت میرے حال پر مبذول تھی بلکہ جب حضور لارڈ امہرسٹ صاحب گورنر جنرل ہندوستان نے دہلی میں بعد فتح بھرت پور دربار کیا تو میں بھی بذریعہ انہیں صاحبان جلیل الشان کے حاضر دربار ہو کر خلعت سے معزز و ممتاز ہوا اور بمقتضائے قدردانی علم کے پیشگاہ بندگان حضور لارڈ گورنر جنرل بہادر سے دربار میں کرسی بھی مرحمت ہوئی۔

۱۸۳۰ء میں بعد قطع تعلق مدرسہ براہ آگرہ و گوالیار وارد ہوشنگ آباد ہوا تب جان ولیف ولسلی صاحب بہادر وہاں حاکم تھے تعریف اُن کے اخلاق کی بیرون از احاطہ تحریر ہے خصوصاً جو توجہ پر غائیں کرتے تھے میں بیان ان کا نہیں کر سکتا چند دن وہاں متوقف رہا آخر الامر حسب صلاح و صوابدید جناب صاحب موصوف بھوپال میں کرم محمد خان مختار ریاست کے روبرو آیا خانصاحب نے واسطے تحریر فتاوی شرعیہ و امور محکمہ گورنری مقرر فرمایا قریب تین سال کے وہاں توقف کیا اس اثنا میں حسب ایمائے خانصاحب عبداللہ بغدادی کہ مدعی جامعیت علوم تھا اور مقام ہندوستانی میں ایک لاکھ حدیث کا یاد ہونا بیان کرتا تھا مکلف مباحثہ شیعہ وسنی کا اس سے رہا

صدہا آدمی محض واسطے سماعت ان مضامین کے حاضر دربار ہوتے تھے اور اخبار نویس انگریزی بھی کیفیت اس مباحثہ کی بخدمت ولکنسن صاحب بہادر ایجنٹ سیہور لکھا کرتا تھا۔ آخرکار عبداللہ مذکور مع اپنے حامیوں کے جو باشندگان رام پور و ملک یوسف زئی کے تھے حقیت مذہب شیعہ کا اقرار کیا تب باشندے بھوپال کے اس سے بداعتقاد ہوگئے بلکہ عوض بعض حرکات ناشائستہ کے دربار سے بھی نکالا گیا لیکن چونکہ سکندر بیگم کی والدہ کا پیر تھا اس سبب سے آنا جانا اس کا دربار میں پھر جاری ہوگیا۔

۱۸۴۳ء میں بھوپال سے بذریعہ رخصت جگراؤں میں آیا سردار فتح سنگھ اہلوالیہ نے جو قدردان اہل علم وفضل تھے کپور تھلہ میں یاد کیا اور مصاحبین میں مقرر فرمایا اور مجھے واسطے نہر کے حکم دیا۔ میں نے نقشہ بعد مساحت ارتفاع وانخفاض زمین کا درست کر دیا چنانچہ عہد راجہ نہال سنگھ بہادر اہلوالیہ میں بموجب نقشہ کے اجرائے نہر عمل میں آیا خلاصہ راقم چار مہینے بخدمت سردار صاحب حاضر رہا بعد اس کے بحصول رخصت و خلعت بعزم بھوپال روانہ ہوا اثناء راہ میں جب وارد انبالہ ہوکے ملازمت حضور آنریبل سر جارج رسل کلارک صاحب بہادر جن کے اوصاف سے زبان قلم قاصر ہے حاصل کی تو صاحب موصوف نے یکم فروری ۱۸۴۷ء کو بخدمت منشی گری ملک محفوظ مابین جمن و ستلج اولاً میر منشی ممالک پنجاب مامور فرمایا جب سے خدمت جارج براڈفوٹ صاحب بہادر و مہر فریڈرک کری بارنٹ صاحب بہادر و سر ہنری لارنس صاحب بہادر و بندگان حضور مستر جان لارنس صاحب بہادر جو بفضل الٰہی سریر آراستے محکمہ گورنری کشور ہند ہیں بمعاودر خود کاروبار میں سرگرم رہا۔ انہیں گورنر جنرل بہادر کو جب حاکم اعلیٰ لاہور کے تھے ۱۸۵۳ء میں استعفا دے کر بحصول رخصت و خلعت و خط انگریزی جاگیردار جگراؤں ہوا بعد اس کے حسب الطلب سر ہنری لارنس صاحب بہادر ملک راجپوتانہ کا بھی سیر کیا اور حین معاودت حیدر علی مصنف منتہی الکلام سے بمقام دہلی مباحثہ ہوا۔ روبروئے مفتی صدرالدین خان سابق صدرالصدور دہلی حیدر علی مغلوب ہوا اور یہ مضمون رسائل میں دہلی میں چھپ گیا اور مسائل بھی اس میں تحریر ہوتے۔

مفسدہ ۱۸۵۷ء میں بمقام دہلی بالائے پہاڑی کمپوئے سرکاری میں بعہدہ میر منشی گری کمانڈر انچیف بہادر معزز و ممتاز ہو کے تحت حکم جناب جرنیل فلیچر صاحب جو کچھ خدمت مجھ سے ہو سکی اس سے قاصر نہ رہا بعد فتح دہلی بحصول رخصت وطن چلا آیا جارج کارناک بارنس صاحب بہادر کمشنر نے رپورٹ خدمات کی کی تو پیشگاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند وائسرائے سے، خلعت ۵ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل حال مرحمت ہوا اور کچھ جاگیر بھی عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا اور خطاب خان بہادر کا ہم لاہور میں پیشگاہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر گورنر جنرل سابق سے عطا ہو چکا تھا ۱۸۶۱ء و ۱۸۶۲ء براہ سکھر و کراچی و بمبئی و عدن مشرف بحج و زیارت ہو کر وارد جگراؤں ہوا اور بتقریب سیر عجائب خانہ کے بھی بحضور صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب حاضر ہو کر مورد مراحم بے پایاں ہوا اور شکر گذار عنایت مرخص ہوا۔

۱۸۶۲ء سے آمد و رفت راقم کی لاہور میں گاہے گاہے بطور خود گاہے بسفارت سرکار انگلشیہ اور اکثر اوقات بسبب تعلق محکمہ عالیہ لاہور رہے لاکن جیسا لاہور کو اس مرتبہ بر آراستگی باغات گرداگرد شہر کے اور صفائی سڑکوں کی اور فروش بازار کے اور عمارات عالیہ نواح کے جو بتوجہ حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دام شوکتہم ہوئے ہے دیکھا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہزار ہا درجہ فوق زیادہ ہے گویا لاہور کی حقیقت بدل گئی حوالی لاہور پر صورت جدید مبداء فیاض کی جانب سے آئی ہے۔ اگرچہ مجھ میں کوئی لیاقت اور قابلیت نہیں مگر الحمد اللہ کہ اوقات میری عزت و آبرو سے بسر ہوتے حکام عہد ہمیشہ عزت افزائی میں مصروف رہے امثال و اقران میرے مجھ کو ہمیشہ بنظر اعلیٰ و اوئذار دیکھتے رہے صاحبان ڈپٹی کمشنر بہادر لدھیانہ ابتدا سے آج تک مجھ پر نظر عنایت مبذول رکھتے ہیں چنانچہ جناب چارلس ایبٹ صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر حال بہت عنایت رکھتے ہیں۔ (۱)

اعمال نامے | مرزا الہی بخش اور منشی رجب علی آج دونوں اس دنیا سے رخصت ہو چکے مگر انکے اعمال نامے انکی کتاب حیات کے واقعات باآواز بلند کہہ رہے ہیں، منشی رجب علی محکمہ خبر کے افسر اعلیٰ تھے اور مرزا الہی بخش بظاہر بادشاہ کے معتمد مگر باطن خواہ

(۱) تحقیقات چشتی (نور احمد چشتی) مطبوعہ سنہ ۱۸۶۷ء

کے پہلے اور منشی صاحب کے یار وفادار انھوں نے ساری کیفیت مفتی صاحب کو سنائی اور مفتی صاحب نے جنرل وسٹاور مسٹر ہڈسن کو۔"(۱)

(۳۶)

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں بہت بڑے طبیب، اہل علم، صاحب دماغ، اور مدبّر تھے لیکن اسی پایہ کے غدّار بھی تھے، وہ انگریزوں سے ملے ہوتے تھے۔ بادشاہ کی نبض دیکھتے تھے اور مزاج کا سارا حال آنا فانا فرنگ سے بیان کر دیتے تھے۔ دہلی کے عوام انہیں غدار، جاسوس اور مخبر سمجھتے تھے، انھوں نے غدر کے دوران میں بار بار، انہیں پکڑنے اور مارنے کی کوشش کی، لیکن ہر مرتبہ، بادشاہ سلامت آڑے آگئے، وہ اپنے طبیب خاص، معتمد خاص، اور محب خاص کو، غدار اور جاسوس کیسے سمجھ لیتے؟ وہ آخر وقت تک حکیم صاحب پر اعتماد کرتے رہے، اور حکیم صاحب آخر وقت تک، اپنے آقائے ولی نعمت سے غدّاری کرتے رہے۔

ع تم اپنی خو نہ چھوڑو گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

یہ تاریخ بڑی دلچسپ اور ساتھ ہی ساتھ بڑی حسرت انگیز ہے، اب عہد بہ عہد کا انقلاب دیکھئے:

ریذیڈنٹ اور حکیم صاحب

"۱۳ نومبر ۱۸۴۶ء — حکیم احسن اللہ خان نے عرض کیا کہ جناب صاحب کلاں بہادر مجھ سے بہت ناراض ہیں کیا تدبیر کرنی چاہئے جس سے ان کا ملال خاطر رفع ہو حضور نے صاحب کلاں کے نام ایک رقعہ تحریر فرمایا کہ حکیم احسن اللہ خان بہادر خیر خواہ آدمی ہیں ان سے کبیدہ خاطر ہونا مناسب نہیں ہے لہذا ان کی طرف سے آپ اپنا دل صاف کرلیں اور ان سے جو کچھ بھی رنجش ہو اُسے دل سے نکال دیں۔ صاحب کلاں بہادر نے بادشاہ عالی جاہ کے ارشاد فیض بنیاد کی تعمیل کی اور اپنے سینہ بے کینہ کو حکیم صاحب کی طرف سے جو رنج و غبار تھا اُس سے پاک کر لیا حکیم صاحب ان کے اس لطف و کرم سے بہت مسرور

(۱) نوبت پنج روزہ (راشد الخیری راشدی) صفحہ ۱۳۰

ہوتے اور بادشاہ جہاں پناہ کی بھی اس ذرہ نوازی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور نیز ترقی عز و جاہ وتوسیع مملکت کی دعا کر کے اپنی فرمانبرداری دخیر خواہی و وفا شعاری کا ثبوت دیا۔ (۱)

غالب اور حکیم صاحب

اندرون شہر کی کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ ایک شخص جو حکیم احسن اللہ خان صاحب کا پروردہ اور آوردہ تھا اور بجو خیانت سے بہت کچھ روپیہ جمع کر چکا تھا۔ اس خیال سے کہ جب تک حکیم صاحب جن کو اس کی غرد برد کا علم تھا زندہ ہیں راز فاش ہونے کا اندیشہ رہے گا۔ ان کے قتل کے درپے ہوا اور یہ افواہ اڑائی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں۔ اس طرح باغیوں کو ان کے خلاف برانگیختہ کیا۔ چنانچہ ایک روز بدبخت باغی حکیم صاحب کو قتل کرنے کے لیے ان کے دولت کدہ پر حملہ آور ہوتے۔ مگر خوش قسمتی سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ کی خدمت میں تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ناہنجاروں میں سے کچھ لوگ قلعہ پہنچے۔ اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا۔ اور ان کی جان بچائی۔ اگرچہ حکیم صاحب کی جان بچ گئی۔ مگر بدبخت باغیوں کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک کہ انہوں نے حکیم صاحب کا مکان لوٹ کر اس میں آگ نہ لگا دی۔ افسوس کوئی غلام جب تک اس کی اصل میں فراق نہ ہوا اپنے آقا کے ساتھ ایسا نہ کرے گا (۲)

"حکیم احسن اللہ خاں پر مصیبت" (۱)

حکیم احسن اللہ خاں کے ایک پالک نے ناجائز طریقوں سے روپیہ جمع کر لیا تھا۔ حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پالک نے اپنی بددیانتی پر پردہ ڈالنے کے لیے افواہ اڑا دی۔ کہ احسن اللہ خاں انگریزوں کا دہی خواہ ہے۔ ان کے لیے جاسوسی کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ باغی بگڑ گئے۔ اور حکیم صاحب کی قتل کی نیت سے ان کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ حسن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں

---

(۱) بہادر شاہ کا روزنامچہ ص ۸۹

(۲) غالب کی فارسی تاریخ غدر "دستنبو" ص ۶۴-۶۵

بادشاہ کے پاس موجود تھے۔ باغی تعقب میں قلعہ پہنچے۔ اور جاتے ہی حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو حکیم صاحب پر ڈال دیا۔ اس طرح جان بچ گئی لیکن باغیوں نے حکیم صاحب کا سامان لوٹ لیا۔ اور مکان کو آگ لگا دی۔ سارا مکان جل کر راکھ بن گیا۔ دیواریں دھوئیں سے سیاہ بن گئیں۔ گیا مکان کے ماتم میں انہوں نے سیاہ لباس پہن لیا۔ (۱)

کیا حکیم صاحب بے قصور تھے؟

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی حکیم صاحب بے قصور تھے، اور ان کے ایک نمک حرام پرور دہ نے انہیں نقصان پہنچانے کے لیے، یہ الزام تراش لیا تھا کہ وہ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، لیکن واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کا دامن غداری سے داغدار تھا، وہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے، ذیل میں ایک سرکاری جنگی مراسلہ درج کرتے ہیں جس سے اس دعوے کی صداقت پر روشنی پڑے گی۔: ـــــــ

مراسلہ نمبر ۸

جسے ہنری گریٹ ہیڈ منیجر سیاسی متعینہ افواج نزد دہلی نے جارج کارنگ بارنس کو ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو ارسال کیا۔

کیمپ مقابل دہلی ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء

مائی ڈیر بارنس۔

" مولوی رجب علی صاحب نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع دوں کہ انہوں نے حکیم احسن اللہ (صاحب) کے نام ایک مراسلہ بھیجا تھا جو مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ اس سے کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔ بلکہ ممکن ہے۔ کہ اس کی وجہ سے حکیم (صاحب) بادشاہ اور باغیوں کے منصوبوں کے اندرونی راز بتانے کے قابل ہو جائیں۔ مولوی (صاحب) کہتے ہیں کہ اس کے باعث حکیم (صاحب) کی سخت بے عزتی ہوئی۔ اس لیے کہ وہ مراسلہ سپاہیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ اور ان

---

(۱) غالب (غلام رسول مہر) ص ۲۴۳

کے مکان کی تلاشی لی گئی ۔ یا ان کو کچھ نقصان پہنچا ۔ کیمپ کی حالت میں نمایاں ترقی ہو گئی ہے ۔ ہم ہر لحاظ سے آرام سے ہیں اور ابھی تک افواج کی صحت اچھی ہے ۔ جس کے لیے ہم خدا کے شکر گذار ہیں ، دشمن کو تمام مقامات پر اور تمام جنگی چالوں میں کلیتہً ناکامی ہوئی ہے ۔ جب تک کہ فلک تک تو پیں مع پورے ساز و سامان کے نہ پہنچ جائیں اس وقت تک کسی زبردست جنگی کارروائی کا فیصلہ کرنا بالکل بے سود ہے ۔ اور اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ آیا جنرل ہاویلاک کا انتظار کرنا چاہیے یا نہیں ۔ اب تک تو ہر بات سے یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اودھ کی باغی فوجوں کا بہت جلد صفایا ہو جائے گا ۔ مجھے آگرہ سے یہ خبر ملی ہے ۔ کہ ۱۲ ہزار نیپالی افواج جنرل ہاویلاک سے لکھنؤ کے مقام میں ملنے والی تھیں ۔ ورمنڈ کو بالآخر آگرہ کے دیسی افسروں کی نالائقیوں کی سزا بھگتنی پڑی ۔ انھوں نے ان پر اعتماد کیا ۔ اور وہی اسٹیشن کو تباہ کرنے میں پیش پیش تھے ۔ پانی پت میں ۳۲۲۰۰۰ روپیہ مد محاصل میں موصول ہوا ہے ۔ اور میرٹھ والوں نے اپنے خزانوں کو بھرپور کر لیا ہے ۔ ہڈسن گائڈز رہنماؤں کے ساتھ باہر گئے ہیں ۔ اور وہاں وہ ان باغیوں کے دستہ کی دیکھ بھال کریں گے جو رہتک چلا گیا ہے ۔ ان باغیوں کا یہ ارادہ تھا کہ وہ ایسے چند دستوں کو باہر بھیجیں تاکہ وہ ملک کو شورش پر آمادہ کر سکیں ۔ لیکن کسی شخص نے کہا کہ یہ حکیم احسن اللہ (صاحب) کی ایک چال ہے ۔ تاکہ وہ دہلی کی باغی فوج کے کچھ حصہ کو باہر بھیج کر اسے کمزور کر دیں اور پھر شہر کو ہمارے قبضہ میں کرا دیں ۔ (۱)

کیا اس کے بعد بھی حکیم صاحب کو بے قصور قرار دیا جائے گا ؟

حکیم صاحب کی گواہی

بہادر شاہ کے مقدمہ کے دوران میں حکیم صاحب نے جو گواہی دی تھی وہ بھی ان کی غدارانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے :۔

"حکیم احسن اللہ خان جو بہادر شاہ کے قدیمی نمک خوار کہ جن کا گوشت پوست شاہی نمک

---

(۱) محاصرہ دہلی کے خطوط صہ ۲۱

سے بنا تھا اپنی شہادت میں بادشاہ کے خلاف فرماتے ہیں کہ شاہی ملازموں مثل سیدی نصیر خواجہ سرا اور شہزادوں میں مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان اس میں شریک تھے میں نے دو روز بادشاہ کو قتل سے روکا مگر بالآخر بادشاہ نے حکم دے دیا وہ اگرچاہتا اور یہ کہہ دیتا کہ پہلے میرے بیوی بچوں کو قتل کردو تو باغی باز آجاتے !"

صاحبِ تاریخ ہندوستان (ذکاء اللہ) کی رائے ہے کہ احسن اللہ خان کا بیان قطعی لغو ہے بادشاہ کے اختیار میں ہی نہ تھا کہ وہ ان باغیوں کی رائے کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکتا وہ اس کے ثبوت میں لکھتے ہیں کہ چھنی لال مجزکا یہ بیان موجود ہے کہ مرزا منجھلے نے کہا کہ عورتوں اور بچوں کا قتل اسلام میں جائز نہیں تو تلنگے اُن کے مارنے پر آمادہ ہوگئے اور منجھلے نے بھاگ کر جان بچائی (۱)

"ہمیشہ یونہی نہیں رہے گا!"

غدر کے بعد حکیم صاحب، اور الٰہی بخش کو اگرچہ انعامات ملے۔ لیکن دیر سے پریشان ہونے کے بعد۔ غداری کا صلہ فوراً نہیں ملتا، اس میں بھی تاخیر ہوتی ہے۔

مرزا غالب کہتے ہیں :۔۔۔۔۔۔

برنسبت حکیم احسن اللہ خان کے جو بات مشہور ہے (جلا وطنی) وہ محض غلط، ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھیے کیا حکم ہو۔ حکیم جی کو ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے۔ کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ ع تو بے کسی وغریبی ترا کرمی پرسد ؟

نہ جزا - نہ سزا - نہ نفرین نہ آفرین ، نہ عدل نہ ظلم ، نہ لطف نہ قہر (۲)

(۳)

---

(۱) نوبت پنج روزہ راشد دہلوی صد ۱۲۸

(۲) غالب کا روزنامچہ صد ۵۳ - ۵۴

موردِ لطف و کرم

اب کچھ ان لوگوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جنہوں نے غدر کے زمانہ میں اپنی قوم سے کٹ کر انگریزوں کا ساتھ دیا، اور دامنِ مراد گلِ آرزو سے بھر لیا، ان میں سے بعض نے تمنا پایا کر تنگیٔ داماں کی شکایت کرنے لگے، اور بعض نے خود تو پایا مگر اپنی اولاد کو کچھ نہ دلا سکے، مرگئے ہی سب کچھ ضبط ہوگیا -

(۴)

سرفراز خاں (کھرل)

یہ ایک ہوا خواہ سرکار کی سرگذشت ہے :——

مظفر خاں کے بعد اس کا بھائی محمد سرفراز خاں جانشین کھرل ہوا جو ایک قابل آدمی اور بہادر سپاہی تھا خاندانی جاگیر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت کے دوران میں اس کے قبضے میں رہی مگر راجہ ہیرا سنگھ نے اسے گھٹا کر کل ۳۰۰ کی مالیت کا کر دیا - سرفراز خان نے بہت سے مواقع پر سرکار انگریزی کی اعلیٰ خدمات کیں ۱۸۴۶ء میں اس نے لفٹنٹ برأس صاحب بہادر کو جبکہ وہ بطور سفیر دریائے راوی کی راہ سے لاہور کی طرف جا رہے تھے دل و جان سے امداد دی، سکھوں کی دوسری لڑائی میں جو ۱۸۴۸ء - ۱۸۴۹ء میں ہوئی یہ سرکار انگریزی کا وفادار رہا بہیں صاحب رزیڈنٹ کے احکام کے مطابق اس نے اپنی قوم کے لوگ جمع کر کے سکھوں پر حملہ کیا جن سے یہ ماننا پڑتا ہے اسے نفرت کرنے کی معقول وجہ تھی اس نے باغیوں سے قلعہ تلنبہ چھین لیا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنے آدمی مامور کئے اس کے صلے میں لڑائی کے ختم ہونے پر اس کو ۵ سو روپیہ سالانہ کی پنشن تا حینِ حیات عطا کی گئی اور کمالیہ کے قصبہ کی آمدنی میں سے ۲۷۵ روپیہ سالانہ بھی دیتے گئے ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب کہ قوم کھرل کا بہت سا حصہ احمد خان کے ماتحت باغی ہوگیا تو سرفراز خان سرکار کا وفادار اور نمک حلال رہا اسی نے کپتان

لفٹنٹ صاحب بہادر کو ان کے مکان پر آکر رات کے وقت خبر دی کہ فساد برپا ہونے کو ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ صاحب موصوف نے لاہور سے مدد منگوالی۔ بعد ازاں یہ باغیوں کے ارادوں کی خبر حاصل کرنے میں بڑا مفید ثابت ہوا اور جب وہ منتشر ہو گئے تو اس نے ان کے لوٹے ہوئے مال کے برآمد کرانے میں بڑی امداد دی ان خدمات کے عوض میں ان کو خان بہادر کا خطاب ۵ سو روپیہ کا ایک خلعت اور حین حیات کے لیے ۲۰۵ روپے کی ایک جاگیر مرحمت فرمائی گئی۔

سرفراز خان اکتوبر ۱۸۶۳ء میں فوت ہوا اور علاوہ گیارہ چاہات کے جو بسبیل علی الدوام واگزار کیے گیے اس کی تمام جاگیریں اور پنشن بر تعداد ۱۷۷۵ روپیہ ضبط سرکار ہو گئیں اس نے ایک لڑکا امیر علی خان چھوڑا جس کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ (۱)

(۵)

دہاڑا سنگھ

۱۸۵۷ء کے فسادات کے دوران میں دھاڑا سنگھ کو اپنے پرانے دشمن احمد خاں سے بدلہ لینے کا موقع ملا اس رئیس نے جس کا قوم کھرل میں بہت رسوخ تھا اور جو اپنے زمانے میں بہت سی لڑائیوں میں سرگروہ رہ چکا تھا یہ خیال کیا کہ بغاوت ۱۸۵۷ء میں لوٹ و فساد کا ایسا اچھا موقع ہے کہ اس کو ہاتھ سے کھو دینا گناہ ہوگا چنانچہ اس نے اپنی قوم کو برانگیختہ کر کے بغاوت پر آمادہ کر دیا اور دہاڑا سنگھ کو پیغام بھیجا کہ اس کے ساتھ شامل ہو مگر سردار مذکور کو اپنے تباہ شدہ گھر اور لوٹی ہوئی فصل کا خیال آگیا اور اس نے احمد خاں کے ارادوں کی گورنمنٹ کو خبر پہنچا دی اور خود میجر مارسڈن صاحب بہادر کے زیر حکم فوج میں شامل ہو گیا اور باغیوں کے مقابلے میں لڑنے کو گیا اور کئی معرکوں میں موجود رہا اور اس کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے احمد خاں

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب، جلد اول صفحہ ۳۵۱

کو اپنے ہاتھ سے گولی سے مارا جب بغاوت فرو ہو گئی تو دھاڑا سنگھ نے ضروری جنرل ویل حمن
سے اکثر باغیوں پر جرم ثابت ہوتے خواہ دھاڑا سنگھ کا جوش وفاداری تھا یا بدلہ لینے کی نیت
تھی۔ اس کی جو خدمات تھیں وہ بہر حال قابل قدر تھیں تھیں ان کے صلے میں اس نے ۳۰۰ روپیہ سال
کا عطیہ حاصل کیا نیز گاش کوڑی اور وان مہر سنگھ دو مواضعات کی مالیت ۲۰۰ روپیہ تھی اور جو اس کی
پرانی جاگیروں سے تھے جاگیر علے الدوام میں حاصل کیے۔
دھاڑا سنگھ نے دو لڑکے اتم سنگھ اور شیر سنگھ چھوڑ کر ۱۸۶۲ء میں وفات پائی۔(۱)

(۶)

دیوا سنگھ

اب ایک اور "وطن دوست" کا مرقع ملاحظہ ہو :—

جب ۱۸۵۱ء میں پنجاب ملٹری پولیس بنائی گئی تھی تو دیوا سنگھ اس کے لیے منتخب کیا گیا۔
۱۸۵۷ء کے غدر شروع ہونے پر جب ہندوستانی پلٹنوں سے امرتسر میں ہتھیار چھین لیے گئے
تو اس موقع پر ایسے بڑے مقام میں صرف یہی ایک مسلح پلٹن تھی جو شہر میں امن خزانے کی حفاظت
اور حکام سول کی حکومت قائم رکھنے میں امداد دیتی اور دو بے ہتھیار ہندوستانی پلٹنوں کی نگرانی
کرتی رہی اس پلٹن نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا جس کا باعث بہت کچھ دیوا سنگھ کی مستعدی
لیاقت اور اعلیٰ درجہ کی وفاداری تھی اس نے دہلی پر خدمت انجام دینے کے لیے فوج بھرتی
کرنے میں بڑی اعانت کی اور غدر ۵۸-۱۸۵۷ء کے دوران میں بہت سے رنگروٹ بھرتی کیے اور
ان کو خدمات کے لیے بھیجا ان خدمات کے صلہ میں دیوا سنگھ کو سی۔ ایس۔ آئی اور سردار بہادر
کے خطاب دیے گئے اور ۱۲ سو روپیہ سالانہ کا وظیفہ اس کی ذات خاص کے لیے مقرر کیا گیا۔

---

(۱) تذکرہ روٴسائے پنجاب جلد اول، صفحہ ۳۸۲

یکم جنوری ۱۸۶۱ء کو جب پرانی پولیس توڑ کر از سر نو محکمہ پنجاب پولیس ترتیب دیا گیا تو دیوا سنگھ ایک عرصے دراز تک جنگی خدمات عزت کے ساتھ کر کے علیحدہ ہوا اس نے ۳۰۰۰ روپیہ کی پنشن حاصل کی اور اسے ۲۰۰ ایکڑ بنجر زمین عطا کی گئی جس کے حقوق مالکانہ اس خاندان کو علی الدوام حاصل ہیں دیوا سنگھ ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا اس کے بیٹے امر سنگھ نے اچھی تعلیم پائی ہے اور کچھ عرصے تک تحصیلداری کا امیدوار رہا مگر ملازمت نہیں کی ایک زمانے میں یہ زیرا کے لوکل بورڈ کا سیکرٹری تھا اور اب اپنے علاقہ کا ضلع دار اور تحصیل زیرا کے سب ڈویژن کا سب رجسٹرار رہے یہ پراونشل درباری ہے اور منصور وال میں رہتا ہے۔ (۱)

(۷)

محمد حیات خاں

۱۸۵۷ء میں نکلسن صاحب بہادر پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے اور جب بغاوت پہلے پہل شروع ہوئی تو انہوں نے محمد حیات خاں کو خدمات کے لیے آفریدیوں کا ایک دستہ بھرتی کرنے کی ہدایت کی اور جب صاحب موصوف اُن فوجوں کے جو لڑائی پر جانے والی تھیں افسر مقرر ہوتے تو انہوں نے نوجوان حیات خاں کو اپنا اڈیکانگ بنا لیا جب نکلسن صاحب بہادر نے نمبر ۵۵ پلٹن کے باغیوں کو تریموں گھاٹ پر عبرت انگیز سزا دی تو محمد حیات خاں ان کے ساتھ ہی تھا اور انہیں کی فوج کے ساتھ دہلی جا کر محاصرے کے دوران میں بڑی بہادری سے لڑا جب جرنیل نکلسن صاحب کو شہر کے فتح ہونے پر مہلک زخم لگا تو یہ آخر دم تک ان کے پاس رہا اور زخم لگنے کے کچھ دن بعد کہ وہ زندہ رہے ان کی دل و جان سے خبر گیری کرتا رہا ان خدمات کے صلے میں ۲۵۰ روپیہ سالانہ کی وہ پنشن جو اس کا باپ لیتا تھا اور جو باپ کی وفات پر

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اول، صفحہ ۳۶۵

اس کے نام جاری ہوتی تھی بڑھا کر ۳۰۰ روپیہ کر دی گئی اور نیز اسے ایک بڑا قیمتی خلعت عطا ہوا۔

دہلی فتح ہو جانے کے بعد محمد حیات خان پشاور واپس آیا جہاں اسے تھانیدار مقرر کیا گیا ۱۸۶۱ء میں اسے جہلم تبدیل کر کے تلہ گنگ کا تحصیلدار بنا دیا گیا ۱۸۶۲ء میں اسے ترقی دے کر اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا اور شاہ پور تعینات ہوا اور وہاں سے بنوں تبدیل ہو گیا ضلع بنوں میں زیادہ تر اسی کی بے نظیر کوششوں اور ہمہ تن سرگرم کار ہونے کی وجہ سے محمد خلیل وزیری مغلوب ہو گئے اور سرحد میں جہاں ۱۸۶۸ء میں کچھ بغاوت ہو چلی تھی امن و امان قائم رہا اور اس کی بے نظیر خدمات کے لیے گورنمنٹ ہند نے اس کا شکریہ ادا کیا ۱۸۷۲ء میں اسے اسسٹنٹ کمشنر بنا دیا گیا اور سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب عطا ہوا ۱۸۷۸-۷۹ء کے کرم فیلڈ فورس کا اور ۱۸۷۹-۸۰ء کے کابل فیلڈ فورس کا پولیٹیکل افسر مقرر ہوا اور پنشن پر جانے سے پہلے صوبہ پنجاب میں ڈویژنل جج مقرر ہو گیا تھا ۱۸۹۳ء میں اسے نواب کا ذاتی خطاب عطا ہوا۔ اس کا انتقال ۱۹۰۱ء میں ہوا اور اس کا سب سے بڑا بیٹا خان محمد اسلم حیات خان جو اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہے اس کی جگہ خاندان کا بزرگ ہوا۔(۱)

(۸)

بشن سنگھ

۱۸۵۷ء میں بشن سنگھ اس دستہ فوج کے ساتھ جس کے افسر سر ڈائنیٹن پرابن صاحب بہادر تھے دہلی گیا اور دوران غدر میں بہت ہی اعلیٰ درجہ کی خدمات کیں جرنیل پرابن صاحب بہادر اس کی نسبت تحریر فرماتے ہیں "یہ واقعی ۵۰ لڑائیوں میں شامل تھا اور اس سے زیادہ بہادر میں نے کبھی کوئی شخص نہیں دیکھا یہ جانتا ہی نہ تھا کہ خوف کیا بلا ہوتی ہے یہ خطرے کے وقت بہت خوش ہوتا تھا اور بہت سے مواقع پر اس نے نمایاں بہادری کی" غدر کی خدمات کے صلہ میں سردار بشن سنگھ

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، ص ۲۹۴

کو تمغات آرڈر آف میرٹ اور برٹش انڈیا ملے اور تھوڑے ہی عرصے بعد اپنے رسالے کا رسالدار میجر ہوگیا اس کا انتقال ۱۸۶۳ء میں ہوا یہ ۸۰۰ روپیہ سالانہ تنخواہ پاتا تھا اور اس کے قبضہ میں موضع سا موضع گجرات کی تھوڑی سی جاگیر اور کڑیالہ ضلع جہلم میں ۱۲۵ روپیہ کی معافی تھی (۱)

(۹)

ملک فتح خاں

ملک صاحب خان کے دوسرے بھائی ملک فتح خان نے ۱۸۴۸ء میں ایڈورڈز صاحب کی فوج کے ہمراہ ملتان کے قریب نمایاں خدمات کیں اور چنیوٹ کی لڑائی میں زخمی ہوگیا یہ چا چڑان کی لڑائی میں بھی شامل رہا اور ایک بہادر سپاہی اور تلوار کا دھنی ثابت ہوا غدر کے شروع ہوتے پر یہ اس فوج میں موجود تھا جو اس کے بھائی صاحب خان کے ماتحت تھی اور جہلم۔ اجنالہ اور فیروز شاہ کی لڑائیوں میں بھی شامل تھا جہاں اس نے باغیوں کا تعاقب کرنے میں انتہا درجے کی بہادری ظاہر کی ان خدمات کے صلہ میں اسے ۱۵۰ ایکڑ اراضی بطور حین حیات معافی عطا ہوئی ملک فتح خان ۱۸۹۵ء میں فوت ہوگیا اور اس کا بیٹا ملک مظفر خان جو پہلے رسالہ گائیڈز میں جمعدار تھا اس کا جانشین ہوا۔ (۲)

(۱۰)

ملک شیر محمد خاں

غدر کے شروع میں ملک شیر محمد خان نے صرف تین سو سوار بھرتی کیے تھے یہ دستے پہلے

---

(۱) تذکرہ روساتے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۳۶۵

(۲) تذکرہ روساتے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۲۹۸

پہلی مہم ستلج اور دہلی کے علاقوں میں امن قائم کرتے رہے اور پھر ۱۸۵۸ء میں کمانڈر انچیف کے ماتحت اودھ کی لڑائی میں بھی گئے جہاں انہوں نے کئی لڑائیوں میں کارہائے نمایاں کیے جو کام ملک کے سپرد تھا وہ اس نے ایسے طریقہ سے انجام دیا کہ اُن افسران کی نظروں میں اس کی بڑی عزت ہوگئی جن کی ماتحت اس نے خدمات کیں اور ان کا خیال اس کی نسبت اچھا ہو گیا گورنمنٹ ہند نے ان خدمات کے صلہ میں اسے "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا اور ۶۰۰ روپے کی علی الدوام جاگیر اور ۲۴۰ روپے کی حین حیات جاگیر بخشی۔ اس کے قبضے میں تحصیل خوشاب کی ۱۳۰۰۰ ایکڑ کی غیر مزروعہ زمین بھی تھی۔ اور جہلم کے قریب ۱۵۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین اس نے اجارے پر لی تھی ملک شیر محمد خان ۱۸۹۰ء میں دو نابالغ لڑکے دوست محمد خان اور غلام جیلانی خان چھوڑ کر فوت ہوا۔ (۱)

(۱۱)

جواہر سنگھ

۱۸۵۷ء میں سردار جواہر سنگھ ہی پنجاب کے سرداروں میں پہلا شخص تھا جس کو صاحب چیف کمشنر بہادر نے ہندوستان میں خدمات انجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ صاحب موصوف کے اس انتخاب یا بھروسہ کو اپنی عزت سمجھ کر اس سے بہتر کسی اور نے بہادری نہ دکھائی یہ سکھوں کے پہلے رسالہ کا رسالدار اور پرانا دیسی افسر تھا لکھنؤ، جھدر، کانپور، کالپی اور جہاں کہیں یہ رسالہ لڑائی میں گیا جواہر سنگھ اس کے ساتھ موجود رہا یہ دشمن کے ساتھ ۹ لڑائیوں میں لڑا اور ۱۸۵۹ء کے آخر میں اسے بعد اپنی خدمات کے ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی اس جاگیر کے ملنے سے پہلے اس نے میدان جنگ میں نمایاں خدمات کے صلے میں آرڈر آف برٹش انڈیا کا تمغہ حاصل کیا یہ ۱۸۶۲ء میں گوجرانوالہ کا آنریری مجسٹریٹ مقرر ہوا اور اپنی وفات یعنی ۱۸۷۷ء تک رہا۔ (۲)

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم۔ صفحہ ۲۹۳

(۲) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۱۳۷

(۱۲)

مراد خاں گردیزی

ایام غدر کی اچھی خدمات کے صلہ میں اسے ایک سند اور ۲۰۰ روپیہ کا خلعت عطا ہوا ۱۸۶۶ء میں اسے ریاست بہاولپور کا ڈپٹی ایجنٹ مقرر کیا گیا اور بعد ازاں پولیٹیکل ایجنٹ اور سپرنٹنڈنٹ کا نائب مقرر ہوا اس نے انہار منچن واہ اور فورڈ واہ کی تیاری میں اچھی کار گذاری دکھائی جس کے صلہ میں صاحب پولیٹیکل ایجنٹ بہادر کی سفارش پر اس کو ۷۰۰ روپیہ نقد انعام عطا ہوا اور تنخواہ میں بھی ترقی کی گئی پھر جبکہ ۱۸۶۸ء میں ریاست میں چیف کورٹ قائم ہوا تو مراد شاہ یہاں کا چیف جج مقرر ہوا اور چیف جج کے علاوہ ریاست کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی رہا ۱۸۷۲ء میں لارڈ نارتھ بروک بالقابہ وائسرائے ہند نے ملتان میں ایک دربار کیا جس میں سید مراد شاہ گردیزی کو ۸۰۰ روپیہ کا خلعت عطا ہوا ۱۸۷۴ء میں مراد شاہ کے عہدہ چیف جج پر نہایت اعلیٰ درجہ کا کام کرنے کے صلہ میں اس کی تنخواہ بڑھا کر ۱۰۰۰ روپیہ ماہوار کر دی گئی جنوری ۱۸۷۸ء میں بحالت ملازمت اس کا انتقال ہوا اور ریاست نے عطیہ حسن خدمات کے طور پر اس کی بیوہ اور لڑکے کو ۶۰۰ روپیہ مرحمت کیا۔ (۱)

(۱۳)

ملک صاحب خاں ٹوانہ

مئی ۱۸۵۷ء میں غدر کے شروع ہوتے ہی ملک صاحب خاں نے بھی ۲۰۰ سواروں کا ایک دستہ بھرتی کیا جس کو ہمراہ لے کر یہ جہلم کی لڑائی میں پلٹن نمبر ۱۴ کے باغیوں سے معرکہ آرا ہوا

۱؎ تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم ص ۵۱۲

بعد ازاں مسٹر کوپر صاحب بہادر کے ماتحت پلٹن نمبر ۲۶ کے باغیوں سے اجنالہ کی لڑائی میں لڑا اس جنگ میں صاحب خان کی بیش بہا راتے اور کارگذاری سے تقریباً ۲۰۰ باغی بغیر ایک گولی چلائے کے گرفتار ہو گئے اور لطف یہ تھا کہ صاحب خان کے پاس اس وقت صرف چالیس سوار موجود تھے جو اپنے گھوڑوں پر بھی سوار نہ تھے انہوں نے باغیوں کو گرفتار کر لیا ۔

صاحب خان کا رسالہ اس کے بعد کانپور کے گرد و نواح میں جہاں کے لوگ ابھی تک باغی تھے امن قائم کرنے کے لیے متعین کیا گیا دریائے جمنا کے راستہ کی حفاظت کا کام اس رسالے نے بڑی کامیابی کے ساتھ کیا اور پھر کالپی کے مقام پر اس رسالے نے ان دستوں کو جو توپ تانہ لگانے میں مصروف تھے بڑی بہادری کے ساتھ امداد دے کر نہایت قابل قدر خدمات کیں اس کے بعد یہ رسالہ جرنیل نیپئر کے ہمراہ وسطی ہندوستان کی لڑائی میں گیا اور وہاں جب کبھی لڑائی کی امید ہوتی تھی تو یہی رسالہ پیش قدمی کرتا تھا ۔

غدر کی خدمات کے صلہ میں ملک صاحب خان کو خان بہادر کا خطاب اور اس کی ۴۸۰ روپیہ حین حیات پنشن کے علاوہ ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ آمدنی کی اور ذاتی جاگیر بھی عطا ہوئی ملک صاحب خان نے پنجاب میں واپس آکر اور بھی بہت سی زمینیں حاصل کیں اور آبپاشی کے لیے دریائے جہلم سے بکمال سرگرمی ایک نہر کھدوائی اور بڑی کامیابی حاصل کی اسے گھوڑوں کی نسل بڑھانے کا بڑا شوق تھا اور خاص قسم کی قدرتی استعداد اور لیاقت کی وجہ سے اس نے ضلع شاہ پور میں ترقی نسل سیاں کے متعلق بڑا کار نمایاں کیا مگر ملک صاحب خان نے سب سے بڑھ کر یہ کام کیا کہ اپنے آپ کو اُن خاندانی جھگڑوں سے جن میں اس کے رشتہ دار عادۃً مبتلا رہتے تھے بالکل علیحدہ رکھا اور اپنی صاف دلی ، سچائی اور قابلیت سے بڑی شہرت حاصل کی ان اوصاف کی وجہ سے اور میدان جنگ میں بہادری اور وفاداری کے صلہ میں اسے سی ۔ ایس ۔ آئی کا خطاب ملا ملک صاحب خان کے اکلوتے بیٹے ملک عمر حیات خان نے ایچیسن کالج میں تعلیم پائی ہے اور ۱۸۹۵ء میں اپنی جائداد کا کلی اختیار خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ (۱)

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم ، صفحہ ۲۹

(۱۴)

صادق محمد خان

۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہونے کے وقت صادق محمد خان لاہور میں موجود تھا اور اس نے گورنمنٹ کو اپنی خدمات پیش کیں فوجی نوکری دینے کے لیے ۵۰ سوار بھرتی کرنے کا حکم اس کے نام پہلے ہی ملتان جاچکا تھا مگر اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ سوار حاجی غلام مصطفےٰ خان نے بھرتی کیے پنجاب کے جنوبی حصہ کی طرف واپس آکر یہ کرنیل ہملٹن صاحب کے ہمراہ گوگیرہ کے باغیوں کے مہم پر گیا اور اس مقام پر جو لڑائی ہوئی اس میں موجود رہا اور جس بیڑے کے ذریعہ سے فوج نے دریائے راوی اور تھالی کو عبور کیا اس کے تیار کرنے میں مفید ثابت ہوا ۱۸۶۰ء میں صادق محمد خان ملتان میں انکم ٹیکس کا تشخیص کنندہ مقرر ہوا اور اپنے فرض منصبی کو لیاقت اور دیانتداری سے بجالایا اس نے اپنی پنشن کے تبادلہ میں محمد خان والا باغ بطور علی الدوام جاگیر کے حاصل کیا اور لطف آباد اور کوٹ ملک میں حین حیات جاگیر اور بہاولپور میں ایک چاہ بھی لیا یہ سب املاک ۲۹۲۷ روپیہ مالیت کے تھے ملتان میں انکم ٹیکس کی تشخیص مکمل ہو چکنے کے بعد صادق محمد خان کو شجاع آباد کا تحصیلدار مقرر کیا گیا اور ۱۸۶۵ء میں اپنی ملازمت سے مستعفی ہونے کے وقت تک اسی عہدے پر مامور رہا۔ (۱)

(۱۵)

صاحب دیال

دوران غدر ۱۸۵۷ء میں راجہ صاحب دیال نے اپنی صلاح اور کارگذاری سے سرکار کی

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۵۲۵

وفاداری ظاہر کی اور ۱۰۰۰ روپیہ کا خلعت پایا ۱۸۶۰ء میں اس کو ۲۰۰۰ روپیہ کی جاگیر علی الدوام علاوہ جاگیر سابق کے عطا ہوئی۔ فروری ۱۸۶۴ء میں ہندوستان کی مجلس واضع آئین اور قوانین کا ممبر مقرر کیا گیا اور کلکتہ میں کونسل مذکور میں شریک ہوا اجلاس کونسل کے برخاست ہونے کے بعد پنجاب واپس آیا تو ۱۸۶۶ء میں اسے کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب دیا گیا ۱۸۸۵ء میں امرتسر میں اس کا انتقال ہوا[1]

(۱۶)

سردار نہال سنگھ

۱۸۵۷ء کے نازک وقت میں سردار نہال سنگھ بغاوت سے ہی کنارہ کش نہ رہا بلکہ اس نے وفاداری اور جوش کے ساتھ سرکار انگریزی سے وفاداری کی یہ ہر وقت صاحب چیف کمشنر بہادر کی خدمت میں حاضر رہا اس کا مشورہ جو اس نے صاحب موصوف کو دیا اور خبریں جو بہم پہنچائیں خاص طور پر قابل قدر تھیں اور یہ اُسی کی امداد کا نتیجہ تھا کہ صاحب چیف کمشنر بہادر نے سکھوں کا پہلا رسالہ بھرتی کیا اور غدر کی خدمات کے لیے پرانے سکھ افسروں میں سے ایسے افسر منتخب کیے جو گذشتہ ایام میں سرکار انگریزی کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے تھے۔ جب گوگیرہ کی وحشی مسلمان اقوام باغی ہوئیں تو سردار نہال سنگھ اُن کے مقابلہ کے لیے بھیجا گیا اس کی باغیوں کے ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں اور ان میں سے ایک لڑائی میں سردار کے گھٹنے پر سخت زخم لگا ان خدمات کے صلے میں نہال سنگھ کو اکتوبر ۱۸۵۸ء میں ۱۰۰۰ روپے انعام ملا اور ۶۰۰ روپے کی ایک جاگیر عطا ہوئی جو اُس کے نرینہ ورثاء صلبی کو اسی شرط پر نسلاً بعد نسل ملنی منظور ہوئی کہ وہ ہمیشہ وفادار اور نمک حلال رہیں اور نیز سردار نہال سنگھ کے کنٹنجنٹ کے باقی ماندہ چار سوار بھی معاف کر دیے گئے۔[2]

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب۔ جلد اوّل، صفحہ ۲۲۶

(۲) تذکرہ رؤسائے پنجاب، جلد دوم، صفحہ ۳۹۲

(۱۷)

نند سنگھ اور مکھن سنگھ

۱۸۵۷ء میں نند سنگھ اور اس کے بھائی مکھن سنگھ نے اپنی نمایاں وفاداری کو ثابت کر دیا کہ وہ سرکار انگریزی کی خدمت گذاری کرنے کے بے حد خواہش مند ہیں اور انہوں نے حکام مقامی کو ایسے نازک وقت میں مدد دی نہایت مفید خبریں بہم پہنچائیں اور عوام الناس کے خیالات سے باخبر رکھنے میں حتی الامکان امداد دی کوہ مری کی بغاوت کے موقع پر نند سنگھ اور مکھن سنگھ دونوں نہایت مفید ثابت ہوئے نند سنگھ صاحب چیف کمشنر بہادر کے لیے بھی نہایت مفید ثابت ہوا کیونکہ یہ راولپنڈی اور جہلم کی درمیانی تمام چھاؤنیوں میں گیا اور بعد ازاں ایک بات بھی اس کی رپورٹوں کے خلاف ثابت نہ ہوئی ان خدمات کے معاوضہ میں موضع مصریوٹ نند سنگھ اور اس کے ورثاء نرینہ کو نسلاً بعد نسل عطا کیا گیا اور موضع کٹاریاں مالیتی ۲۰۰ روپیہ اس کی حین حیات کے لیے واگذار ہوا اور یہ قرار پایا کہ اس کا نصف تو اس کی وفات کے بعد ضبط ہو جائے گا اور باقی نصف اس کے نرینہ وارثان کے لیے نسلاً بعد نسل رہے گا مکھن سنگھ کو بھی اس موقع پر ۲۰۰ روپیہ کی پنشن عطا ہوئی۔ (۱)

(۱۸)

گھروں کو اجاڑنے والا

الیشری پرشاد وغیرہ جو نہایت اونچے عہدے پر تھے ڈپٹی کلکٹر وغیرہ ہو گئے اور بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیریں سرکار کو دھوکا دے کر لیں۔ اور غزنی خان مجبر نے تو ایک محض جھوٹا قصہ اپنے بیٹے کے قاتلے کو پھنسنے کا گھڑ کر ایک دو گاؤں جاگیر سرکار سے لے لیے۔ اور

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۲۹۶

آخر ۱۸۶۳ء سے دس برس تک برابر ہندوستان کے مسلمانوں پر قیامت برپا رکھی۔ صدہا مسلمان مارے خوف کے گھر بار چھوڑ کر عرب وغیرہ ملکوں میں جا بسے۔ (۱)

(۱۹)

قادیان کا نمک حلال خاندان

الحاق کے موقع پر اس خاندان کی جاگیر ضبط ہو گئی مگر ... روپیہ کی ایک پنشن غلام مرتضےٰ اور اس کے بھائیوں کو عطا کی گئی اور قادیان اور اس کے گرد و نواح کے مواضعات پر ان کے حقوق مالکانہ رہے اس خاندان نے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران میں بہت اچھی خدمات کیں غلام مرتضےٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کیے اور اُس کا بیٹا غلام قادر جنرل نکلسن صاحب بہادر کی فوج میں اُس وقت تھا جبکہ افسر موصوف نے تریمو گھاٹ پر نمبر ۴۶ نیٹو انفنٹری کے باغیوں کو جو سیالکوٹ سے بھاگے تھے تہ تیغ کیا جنرل نکلسن صاحب بہادر نے غلام قادر کو ایک سند دی جس میں یہ لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں خاندان قادیان ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا۔ (۲)

(۲۰)

"نہایت وفادار"

خاندان منڈل کے مرحوم بزرگ نواب احمد علی خان نے ۱۸۵۷ء میں نہایت وفاداری سے خدمات کیں جن کا اعتراف لارڈ کیننگ کی چٹھی بنام چیف کمشنر پنجاب میں مفصل ذیل پیرایہ میں کیا گیا ہے "لارڈ ممدوح کی رائے ہے کہ گورنمنٹ کو نواب صاحب کی خدمت کا اعتراف اسی طرح دل

---

(۱) تاریخ عجیب جعفر تھانیسری) ص۲۴

(۲) تذکرہ رؤسائے پنجاب۔ جلد دوم، ص۶۸

کھول کر کرنا چاہتے جیسی انہوں نے سرکار کو بے تردد و تامل امداد دی ہے نواب صاحب کی خدمات جیسا کہ ان فوجی اور سول افسران نے تصدیق کی ہیں جن کو اسی مضمون پر اپنی رائے قائم کرنے کا موقعہ ملا ہے واقعی نہایت گراں قدر ہیں شروع سے نواب صاحب بے کھٹکے کھلم کھلا گورنمنٹ انگریزی کے حامی رہے ہے اور ان کے افعال ہمیشہ ان کے اقوال کے مؤید ثابت ہوتے انہوں نے نہ تو ذاتی جدوجہد کی اور نہ عملی امداد دینے میں کوتاہی کی بلکہ اپنا تمام عملہ اور سارا مال و متاع کھلے دل سے سرکار انگریزی کی خدمت میں پیش کر دیا ایسی بیش قدر خدمات کا صلہ بھی ایسا ہی ہونا چاہیے اس لیے حضور گورنر جنرل بہادر بالقابہ نہایت خوشی سے آپ کو (چیف کمشنر صاحب کو) ایما کرتے ہیں کہ ۵۰۰ روپیہ سالانہ کا لگان جو نواب صاحب آج کل سرکار کو ادا کرتے ہیں نواب صاحب اور ان کی نرینہ اولاد صلبی کو نسلاً بعد نسلٍ معاف کر دیا جائے اور یہ کہ نواب صاحب کو دس ہزار روپیہ کا ایک خلعت حتی الامکان عام اور معزز طریق سے عطا کیا جائے۔

حضور ممدوح یہ بھی خواہش کرتے ہیں کہ آپ (چیف کمشنر) یہ سند جو اس چھٹی کے ساتھ روانہ کی جاتی ہے اور جس میں نواب صاحب کی نمایاں نمک حلالی اور خدمات کی قدر کا جو انہوں نے اپنا مال و متاع گورنمنٹ میں پیش کرنے میں کی ہے اعتراف کیا گیا ہے نواب صاحب کو دے دیں۔"[۱]

(۲۱)

کرتو کر، نہیں خدا کے غضب سے ڈر

یہ انعام پانے والے اور دربار فرنگ میں سرخ رو ہونے والے مخبر، بے گناہوں کو کس طرح پھنساتے تھے، اس کا ایک نمونہ ایک شخص بخشی کی مخبری ہے، جس نے جھوٹی مخبری کر کے مولوی عبدالقادر صاحب کو ایک انگریز کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا دیا، حالانکہ انہوں نے ایک

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اول، ص ۵۵

میم مسز جین کی جان بچائی تھی، داستان دلچسپ ہے سنیئے :

"اس شخص نے مولویوں کو تو چھوڑ دیا لیکن جو شخص ایسا قسی القلب ہو کر صدہا آدمیوں کو پھانسی دلوا دے اور اس کا دل نہ پسیجے اُس نے یہ بات بے فائدہ تو نہیں کہی ہوگی کہ یہ لبساطی ہیں اُس زمانۂ شورش میں صرف مولوی کہہ دینا پھانسی دینے کے واسطے کافی تھا بعد تسلط عملداری انگریزی اس نے مولوی عبدالقادر صاحب کو دبایا کہ لائیے مولوی صاحب کچھ دلوایئے میں نے آپ سب صاحبوں کی جان بچائی ورنہ میرا ایک لفظ بھی آپ کو تحت الثریٰ پہنچا دیتا مولوی عبدالقادر صاحب بہت ہی کھرے قسم کے آدمی تھے فوراً یہ سنکر برافروختہ ہو گئے مخبر کو دیا دلایا کچھ نہیں اور الٹا اُسے للکارا تازہ شورش تھی باغیوں کی تحقیقات ہو رہی تھی سینکڑوں انگریز اور میمیں اور بچے مارے گئے تھے مخبر نے فوراً جڑ دیا کہ مولوی عبدالقادر نے فلاں انگریز کو مار ڈالا ہے مولوی صاحب فوراً گرفتار ہو گئے کئی مہینے حوالات میں رہے ۲۰ گواہ چشم دید واقعہ قتل کے پیش ہوئے حتیٰ کہ دو میمیں آئیں اور ان سے بھی کہلوا دیا کہ یہ ہمارے خاوند کا قاتل ہے اب کیا باقی تھا مولوی صاحب کی طرف سے یاس ہو گئی۔ اس کی خبر مسز جین کی میم نے اپنے شوہر کو دی وہ بچارہ کہیں باہر تھا وہ دوڑا ہوا آیا اور کہا یہ کیا غضب ہے ان ہی مولوی نے اپنی جان خطرے میں ڈالکر میری میم کی جان بچائی یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انگریز کے قاتل ہوں غرض یہ انگریز کچہری میں آیا مولوی عبدالقادر صاحب اس کی صورت نہیں پہچانتے تھے۔ حاکم مجوز بہت دیر تک کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے بحث مباحثہ ہوتا رہا مولوی صاحب نے سمجھا کہ شاید مجسٹریٹ کی بدلی ہوئی ہے کوئی دوسرا صاحب آیا ہے اور وہ چارج لے رہا ہے لیکن بعد کو وہ اٹھا کر جاؤ مولوی صاحب کے کپڑے لاؤ میں دھلے ہوئے کپڑے آئے مولوی صاحب نے کپڑے بدلے آفت سے نجات پائی اور بڑی دھوم دھام سے مولوی صاحب چھٹ کر گھر آئے یہ ہے کرتو ڈر اور نہ کرتو خدا کے غضب سے ڈر سنا ہے کہ مخبر صاحب نے مولوی صاحب سے ۵ سو روپیہ مانگے تھے اگر مولوی صاحب اُسے دے دیتے تو اس کشمکش میں نہ پڑتے۔" (۱)

---

(۱) حیات النذیر، ص۲۲۴

مولوی عبدالقادر خوش قسمت تھے کہ بچ گئے، لیکن لور سینکڑوں بے گناہ پھانسی پر چڑھائے گئے۔

(۲۲)

یہ بھی ــــــ؟

شاہ شجاع کا بیٹا شہزادہ شاہ پور سرکار انگریزی سے اپنی وفات یعنی ۱۸۸۶ء تک ۴۸۰۰ روپیہ سالانہ بطور وظیفہ لیتا رہا اور پھر اس کا سب سے چھوٹا بھائی شہزادہ نادر خاندان کا بزرگ ہوا۔ شہزادہ نادر میونسپل کمیٹی کا پریزیڈنٹ آنریری مجسٹریٹ لدھیانہ کا سب رجسٹرار اور پراونشل درباری تھا اور ۶۰۰ ۳ روپیہ سالانہ پنشن پاتا تھا۔ اس کی خدمات کا جو اس نے ایام غدر میں پیش کیں گورنمنٹ نے باقاعدہ اعتراف کیا ۱۸۶۱ء میں اسے اور اس کے بھائی شہزادہ شاہ پور کو ۴۰۰ ایکڑ زمین ضلع منٹگمری میں دی گئی اور ۱۸۸۸ء میں شہزادہ نادر کو سی۔آئی۔ای کا خطاب عطا کیا گیا۔ شہزادہ نادر کا ۱۸۹۵ء میں انتقال ہوا اور اس کی پنشن میں سے ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ اس کے سب سے بڑے بیٹے سردار محمد ہمدم کے نام جو ضلع گجرات میں تحصیلدار اور ڈویژنل درباری ہے رکھا گیا (۱)

(۲۳)

" عزرائیل "

ایک مجز غلام فخرالدین کا ذکر مولوی ذکاء اللہ ان الفاظ میں کرتے ہیں: ــــــ

زیادہ تر عمائد شہر جن میں بعض بڑے عالی خاندان شرفا تھے ــ یہ سمجھ کر الور بھاگ گئے تھے کہ وہاں دلی کے آدمی بڑے بااختیار ہیں ان کی جان بچا لیں گے ۔ مگر ان کی جان کے لیے غلام

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد اول، صفحہ ۳

فخر الدین خاں عزرائیل بن کے پہنچا۔ اور لوگوں کو چن چن گرفتار کر کے لا یا (۱)

(۲۴)

لعنت کے آوازے

واجد علی شاہ کے وزیر اعظم علی نقی خاں بھی، احسن اللہ خاں، اور الٰہی بخش سے کم نہ تھے، جس روز انگریزوں نے بادشاہ کو معزول کر کے اودھ پر قبضہ کیا اور نقی علی خاں کو شرف باریابی عطا فرمایا اُس روز :۔۔۔۔۔

• روز پنجشنبہ ۷ فروری کو اوّل صبح سے ایک تلاطم عظیم شہر میں برپا ہوا اور کوچہ و بازار میں رعایا منادیٔ صور اسرافیل کی منتظر رہی، کوتوال شہر کوٹھی ریذیڈنسی میں اس منادی کے لیے حاضر تھا لیکن منادی موقوف رہی رعایائے شہر خاص بازار سے بیلی گارد تک جمع تھی اس عرصہ میں صاحب ریذیڈنٹ نے وزیر کو طلب کیا تو بادشاہ کے حکم سے علی نقی خاں داخل ریذیڈنسی ہوئے بعد اُن سے ملاقات کر کے پھر آئے، اس موقع پر ایک ثقہ آدمی نے وزیر کو بازار سے گذرتے دیکھا تھا اُن کا بیان ہے کہ آزاد آدمی اُس پر تُف اور لعنت کے آوازے کستے تھے۔ اور نہایت سخت الفاظ میں تعریض کرتے تھے۔ (۲)

(۲۵)

بڈھا خان

۱۸۵۷ء کے غدر کے موقع پر بڈھا خان سرکار کا خیر خواہ رہا جس کے صلہ میں اس نے موضع

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ۱۱

(۲) تاریخ اودھ جلد پنجم (نجم الغنی) صـ۲۶۲

کھڈوال کی ۵۰۰ روپیہ کی علی الدوام جاگیر اور ۵ سو روپیہ کا خلعت حاصل کیا بڈھا خان بڑا بارسوخ آدمی تھا اور جب علاقہ سے ہتھیار لے لیے گئے تو اسے چالیس تلواریں بلا لائسنس رکھنے کی اجازت مل گئی یہ اپنی تین بیویوں سے کئی لڑکے چھوڑ کر ۱۸۶۶ء میں فوت ہوا۔ (۱)

(۲۶)

گامی خان مخبر

شہر میں مخبروں کی کمی نہ تھی گامی خاں اور غلام فخرالدین خان نے مخبری میں بڑا نام پایا۔

گامی خان خود اپنے تئیں پھانسی سے نہ بچا سکا۔ پھر باغیوں کے کئی اصناف تھے کہ جو اُن میں سے پکڑا جاتا تھا فوراً پھانسی پاتا۔ اول صنف پادشاہی خاص برداروں کی تھی جنہوں نے قلعہ میں انگریزوں کے معصوم بچوں اور عورتوں کے خون سے اپنے ہاتھ لال کر کے منہ کالا کیا تھا ان میں سے ایک بھی پھانسی سے نہ بچا۔ (۲)

(۲۷)

مظفر خان

ایام غدر میں تمام ملک عملی طور پر وفادار ثابت ہوئے مظفر خان (کالا باغ) اور اُس کے بیٹے یار محمد نے تقریباً ۱۰۰ آدمی بھرتی کیے اور ایڈورڈز صاحب بہادر کی خدمت میں بجا آوری خدمات کے لیے حاضر ہوئے اور شہر کے ایک دروازہ کی حفاظت ان کے سپرد ہوئی مظفر خان کا ایک

۱؎ تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم ص۳۳۴

۲؎ تاریخ عروج عہد انگلشیہ ذکاء اللہ ص۷۱۱

بھائی کچھ فوج کے ساتھ کپتان کارکس صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر کی خدمت میں بنوں رہا جو اُس وقت سندھ کا دوسرا بندوبست ایسے اطمینان کے ساتھ کر رہے تھے کہ گویا دور کے مشرقی علاقہ پنجاب ممالک مغربی و شمالی اور بنگال میں کسی قسم کا فساد ہی نہیں ہے ۔ (۱)

(۲۸)

خیر خواہ سرکار

غدر کے بعد جب سرکاری فوجیں نگینہ کو لوٹ رہی تھیں :۔۔۔۔۔۔

اُسی وقت جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے مولوی محمد علی رئیس نگینہ کو جو خیر خواہ سرکار تھے تلاش کر کے بلایا اور اپنے لشکر میں رہنے کا حکم دیا اور جہاں تک ممکن ہوا ان کے گھر کو بھی لٹنے سے بچایا باقی تمام شہر نگینہ کا شام تک لٹتا رہا اس لڑائی میں سرکار کی جانب سے بہت کم نقصان ہوا مگر افسوس ہے کہ لفٹنٹ کاسٹنگ صاحب بہادر اس معرکہ میں بہت دلاوری سے کام آئے (۲)

(۲۹)

شیر خان

۱۸۵۷ء میں شیر خاں نے اس طرح نمایاں وفاداری کی کہ وقتاً فوقتاً بڑی مفید مطلب خبر بھی دیتا رہا فوج مہیا کی کمشنر صاحب بہادر کے ہمراہ مری گیا اور جب وہاں بغاوت ہوئی تو خدمات انجام دیں اس نے کچھ باغی سپاہیوں کے تعاقب میں بھی امداد دی جو بڑا سخت مقابلہ کرنے کے بعد مارے گئے اور بعد ازاں یہ عمر قیدیوں کو لے کر ملتان گیا اس کی معافی ۴۹۲ روپیہ سے بڑھا کر ۷۵۰ روپیہ کر دی گئی

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم صفحہ ۳۷۲

(۲) سرکشی بجنور ، (سر سید احمد خاں)

جس میں سے ۵۰۰ روپیہ کا خلعت بھی عطا کیا گیا غدر کے بعد جبکہ رعایا سے ہتھیار لے لیے گئے تو اسے ۱۰ بندوقیں اور ۱۰ ڈھالیں رکھنے کی اجازت مل گئی۔ (۱)

(۳۰)

اودھ کے غدّار

بنگال اور دلی کی طرح اودھ میں بھی اندرونی غداری کا سلسلہ جاری تھا۔ اور بیلی گارڈ کی برنت جانی انگریزی فوج کی بہادری کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ غداران وطن کی مہربانیوں کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ مصنف قیصر التواریخ رقم طراز ہیں "انگریزوں نے جب پہلا حملہ کیا تو بموجب حکم حضرت محل قیصر باغ کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ نجیب آبادی تلنگے شہر والوں کو برا بھلا کہتے تھے۔ اور کہتے کہ اگر یہ لوگ رسد وغیرہ بیلی گارڈ میں نہ پہنچاتے تو انگریز فاقوں سے مر جاتے" (۲)

(۳۱)

ملک جہان خان

سردار بہادر ملک جہان خان غدر کے شروع میں ملک صاحب خان کے رسالے کے ساتھ شامل ہو کر جہلم اور انبالہ کی لڑائیوں میں داد مردانگی دیتا رہا بعد ازاں اس نے کالپی کے مقام پر بھی اچھی خدمات کیں اور جرنیل نیپر کی اردلی فوج میں شامل ہو کر وسط ہندوستان کی لڑائی میں جانبازی کی اس نے کئی بڑی لڑائیوں میں نمایاں حصہ لیا اور راناڈے کی لڑائی میں اس نے بغیر کسی امداد کے ۵ یا ۶ دشمنوں پر بہادری سے حملہ کر کے خاص امتیاز حاصل کیا مگر لڑائی میں مغلوب ہو کر سخت زخمی ہو گیا بعد ازاں یہ بنگال کے ۱۸ رسالہ

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم ص۱۸۴

(۲) قیصر التواریخ ص۲۳۳

میں رسالدار مامور کیا گیا اور تھوڑے عرصے کے لیے لارڈ نیپر کے سٹاف میں اے ڈی کانگ مقرر ہوا بہاں میں شہرت حاصل کرنے کے بعد یہ رسالدار کی پوری پنشن لے کر نوکری سے علیحدہ ہوا اور اس کی اعلیٰ درجہ کی بہادری اور جنگی قابلیت کے صلہ میں اسے سردار بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا۔(۱)

(۴۲)

جیون لال مخبر کون تھا؟

منشی جیون لال تعلیم یافتہ ہندوستانی تھے جن کا تعلق غدر سے پیشتر شاہ دہلی کی درباری زندگی سے برسوں تک اور دوران غدر میں بھی رہا ان کے والد گردھاری لال جو اورنگ زیب کے وزیراعظم راجہ رگھوناتھ کی براہ راست اولاد میں سے تھے ابتدا میں سر ڈیوڈ اکٹرلونی کے منشی تھے اور اس کے بعد سر چارلس مٹکاف کے منشی ہو گئے جبکہ وہ مغلیہ دربار میں گورنر جنرل کے ایجنٹ تھے جیون لال نوعمری کے زمانہ میں بھرت پور اور جے پور کے محاصرہ کے وقت موجود تھے جبکہ جون ۱۸۳۵ء میں مسٹر بلیک اسسٹنٹ ریزیڈنٹ مارے گئے ہیں۔ بعد ہر وہ ان بے شمار پنشنوں کے محاسب مقرر ہو گئے جنہیں انگریزی گورنمنٹ بادشاہ کے خاندان کو دیا کرتی تھی اور اس طرح ان کی حیثیت ایلچی کی سی ہو گئی تھی چونکہ گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس سے ان کا براہ راست تعلق رہا اور اس طرح سے وہ بادشاہ کے گرد و پیش کے مختلف افراد اور قلعہ کی سازشوں سے واقف تھے دہلی میں غدر اور شہر کے محاصرہ کے دوران میں وہ شہر ہی میں مقیم تھے اور دہلی کی اندرونی حالت سے واقف تھے اور خبریں دیتے تھے ان پر لوگوں کو اکثر سرکاری مخبر کا شبہ ہو جاتا تھا لیکن قلعہ کے رسوخ کی وجہ سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے وہ ذات کے کایستھ تھے اور بلحاظ پیشہ محرر تھے وہ روزمرہ کے واقعات کو قلمبند کرتے رہتے تھے اور اس طرح سے وہ ایام محاصرہ کا قیمتی تفصیلی روزنامہ چھوڑ گئے ہیں۔ انگریزی سلطنت کے دوبارہ قائم

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم، ص ۳۰۳

ہو جانے پر منشی جیون لال آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر بنا دیے گئے اور جب ان کا انتقال ہوا تو ہندوستانی باشندوں یا انگریز عہدہ داروں میں کوئی ایسا نہ تھا جسے افسوس و رنج نہ پہنچا ہو کیونکہ وہ سب ان کی نیکی اور قابلیت کے معترف تھے برطانوی حکومت کو ان سے زیادہ وفادار ملازم نہیں ملا اور ۱۸۵۷ء کے ایام غدر کے جن واقعات کو انہوں نے قلمبند کیا ہے اس سے زیادہ قابل اعتماد شہادت میسر نہیں آسکی دہلی میں شاہی دربار کے موقع پر انہوں نے مجھے اپنی ذاتی عنایت کی اور ساتھ ہی انہوں نے میرے لیے سرکاری درباری ڈائری بھی حاصل کر لی ہے کہ بادشاہ کے عبادت خانہ کے مولوی لکھا کرتے تھے۔ (۱)

مخبر جیون لال کی کہانی اسی کی زبانی

جیون لال انگریزوں کا باقاعدہ مخبر تھا۔ وہ اپنی کہانی کہتا ہے:

"نذر علی جو پہلے مسٹر سائمن فریزر کی ملازمت میں تھے اور اب تھانے کے منتظم تھے۔ مبارک شاہ کوتوال کی چھٹی لے کر مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ تلوے سپاہی ننگی تلواریں لیے ہوئے تھے چونکہ دروازہ سقوں کے لیے کھول دیا گیا تھا، اس لیے دروازہ کو کھلا پاتے ہی وہ نہایت تیزی کے ساتھ داخل ہو گئے، گھر کی مستورات بیٹھی ہوئی مہاراج لال کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔ جن کی بذریعہ اپریشن پتھری نکالی گئی تھی اور جو بے حد کرب و تکلیف کی حالت میں پڑے تھے، سپاہیوں کو دیکھتے ہی وہ جان بچانے کے خیال سے ادھر ادھر بھاگیں اور زیورات اور پامال اپنے ساتھ لیتی گئیں، مجھے گرفتار کر لیا گیا اور پالکی میں بٹھا دیا گیا، اور ننگی تلواروں کے گارد کی حفاظت میں مجھے کوتوالی پہنچا دیا گیا، مبارک شاہ سے وہاں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بہت احترام سے مجھے بٹھایا، پہلے وہ چونگی کے افسر تھے اور پھر وہ بادشاہ کی ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے اندیشے اور وسوسے بے بنیاد ہیں، اور کہا ڈرو نہیں اس لیے کہ میں خود بھی انگریزوں کا ملازم ہوں، اس کے بعد انہوں نے میری گرفتاری کے متعلق، مرزا خضر کا دستخطی حکم دکھایا۔ میرے علاوہ منشی سلطان سنگھ، چھٹن لال اور

---

(۱) غدر کی صبح و شام (مشکاف صاحب کا مقدمہ) صـ ۱۲

سنت لال کی گرفتاری بھی عمل میں آئی، ہمیں دھوکے میں رکھنے کی خاطر حکم میں یہ الفاظ درج تھے کہ ہمیں مشورہ کی غرض سے طلب کیا جا رہا ہے، پھر مجھے اور منشی سلطان کو مرزا مغل کے روبرو پیش کیا گیا پہنچتے ہی ایک صوبہ دار مجھے خنجر سے یہ کہہ کر ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ "یہی وہ شخص ہے جو انگریزوں کو خبریں بھیجتا ہے" مجھے مجمع نے اور حقیقت خدا نے، بچا لیا اور کہا انہیں روپیہ لینے کی غرض سے بلایا گیا ہے۔ اس سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوا بعد ازاں مجھے ادھر مرزا مغل کی پیشی میں ملے گئے، وہاں میں نے عجیب غریب قطع کے آدمیوں کی ایک کثیر جماعت دیکھی، ایک جانب مرزا مغل تکیوں سے سہارا لگائے بیٹھے تھے، راجہ سالگ رام، حامد علی خاں، حکیم عبدالحق اور بادشاہی دربار کے چند دیگر افسر بھی موجود تھے، ان کے بالمقابل باغی فوج کا بریگیڈ افسر کرُے سنگھ بیٹھا ہوا تھا، شاہی افسر بلا حکم ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ لالہ سالگ رام (خزانچی) رام جی داس گروالا، لالہ گردھر لال، زور آور چند اور تقریباً ۲۵ دیگر مہاجن بھی گرفتار شدہ حالت میں وہاں بیٹھے تھے، مجھے بھی ان کے ساتھ قطار میں بیٹھنے کا حکم ملا، میرے دوست لالہ گھان لال، لالہ ناطھی لال، اور لالہ سنت لال، میری رہائی کی کوشش کرنے کی غرض سے وہاں آئے، تھوڑی دیر بعد مرزا احمد جان مرزا مغل کے پاس گئے اور ان کے کان میں کچھ کہا، جس پر مرزا مغل نے سنت لال کو بلایا، اور نہایت شفقت و نرمی سے فرمایا کہ اس سے ۵ ہزار روپے لیے جائیں گے جسے فی الفور ادا کرنا چاہیئے ورنہ اسے قید کر دیا جائے گا دوسروں سے بھی اسی طرح روپیہ کا مطالبہ کیا گیا، اور بالآخر ہم غریب منشیوں کو دھمکایا گیا اور توپوں کو ہمارے کندھوں پر رکھ کر چھوڑا گیا مگر ہم خدا کے کرم سے نہایت ثابت قدم رہے، ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ ہم مرنا پسند کریں گے، اور ان باغیوں کی دھمکیوں کی کچھ پروا نہیں کریں گے، ہمیں انجام کی کچھ خبر نہ تھی، باغیوں نے صبح سے لیکر ۲ بجے دوپہر تک مشورہ کیا، اسی حالت میں مرزا الٰہی بخش بھی خلاف توقع حضرت خضر کی طرح آ پہنچے بعینہ جس طرح سے کہ سوکھے ہوئے پتوں میں جان ڈالنے کے لیے ابر رحمت یکا یک برس جاتا ہے، انہوں نے مجھے دلاسا دلایا، اور مرزا مغل سے درخواست کی کہ ریخ کی ملاقات کے لیے وقت دیا جائے، میرا گمان ہے کہ انہوں نے دوران ملاقات میں ہمارے متعلق

یہی دلائل استعمال کیے ہوں گے کہ یہ غریب محرر ہیں۔ اور صرف اپنی آمدنی پر گذران کرتے ہیں، اور یہ کہ انگریزی راج ابھی تک ختم نہیں ہوا، ممکن ہے انگریز شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیں اور جب آپ انگریزوں کے ہاتھ میں اسیر ہو جائیں گے تو ممکن ہے یہ غریب کلرک اس وقت آپ کے لیے مفید ثابت ہوں مرزا مغل نے جواب دیا کہ یہ انگریزوں کو خبریں بھیجتا ہے اور اُن کی کامیابی کے لیے دست بدعا رہتا ہے، مرزا الٰہی بخش نے کہا کہ یہ اُن کے وفادار ہیں جن کا نمک اُنھوں نے کھایا ہے، احمد مرزا نے کہا کہ ان سے کثیر رقم وصول کرنی چاہیئے، یا ان کے مکانات پر قبضہ کر لینا چاہیئے، غالباً مشورہ دینے والے کو یہ امید ہوگی کہ قتل کر دیئے جانے پر میرا مکان اسے مل جائے گا، یہ گفتگو شام تک ہوتی رہی جو زیورات سپاہیوں نے میرے مکان سے ضبط کیے تھے، اُنھیں مرزا مغل کی خدمت میں پیش کیا گیا اور تولنے کے بعد اُن کی مالیت کا اندازہ دو ہزار روپیہ کیا گیا، حکم ہوا کہ یہ رقم مطالبہ سے منہا کر دی جائے جو مجھ سے کیا جا رہا تھا، اس کے بعد پستول منگائے گئے، اور ہمیں ڈرانے کے لیے بندوقیں بھی منگوائیں گئیں لیکن یہ دیکھ کر کہ میرا ارادہ مستقل ہے اور مرزا الٰہی بخش میری مدد پر ہیں، مجھے بالآخر اُن کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اچھے مرزا صاحب مجھے کمال تلطف اور مہربانی کے ساتھ سید ہے میرے مکان پر لے گئے اور مجھے مشورہ دیا کہ تبدیل مکان کر لو اور کہیں چھپ جاؤ، ورنہ باغی پھر تمہارا پتہ ڈھونڈھ نکالیں گے، اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارا ضامن ہوں اور انشاء اللہ باغی تمہارا بال بیکا نہ کر سکیں گے، اس طرح سے خدا تعالےٰ نے اپنا فضل کر کے میری جان بچالی مرزا الٰہی بخش نے اس آڑے وقت میں جو ہمدردی مجھ سے کی، اس کا معاوضہ مجھ سے ادا نہیں ہو سکتا اور نہ مناسب الفاظ میں ان کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔ صرف زبان سے اُن کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گرفتار ہو جانے پر لالہ شام لال نے مرزا الٰہی بخش خاں کو لکھا کہ امداد کا لوفت ہے، اس لیے کہ وہ انگریزی ملازم ہیں، اور آپ بھی انگریزوں کے بہی خواہ ہیں، مرزا کے صاحبزادے کا آج صبح انتقال ہو گیا تھا اور جلدی سے تجہیز و تکفین کر کے میری مدد کرنے کے لیے آ گئے ان سے بڑھ کر سچا دوست کبھی میسر نہیں ہو سکتا۔ (۱)

---

(۱) غدر کی صبح و شام (روزنامچہ جیون لال صفحہ ۲۰۶)

(۳۳)

مذہبی پیشوا، انگریزوں کا مددگار

۱۸۵۷ء میں مخدوم شاہ محمود نے گورنمنٹ کی بڑی اچھی خدمت انجام دی یعنی یہ صاحب کمشنر بہادر کو ان تمام ضروری واقعات کی خبر دیتا رہا جو اس کو معلوم ہوتے رہتے تھے اور غلام مصطفےٰ خان کے رسالے کے لیے ۲۰ آدمی اور گھوڑے اور کئی آدمی نئی پولیس کے لیے مہیا کیے اس نے پولیس اور فوج میں اور آدمی بھی دے کر مدد کی اور خود بھی کرنیل ہملٹن صاحب کے ہمراہ ۲۵ سواروں کے ساتھ باغیوں سے لڑنے گیا کچھ کیمپ کی خدمت بھی اپنے ذمہ لی اور جو اسباب اگلے پڑاؤ پر بھیجا جا رہا تھا اس کی حفاظت کی جنگ کے اس موقع پر مخدوم شاہ محمود کی موجودگی سے باغیوں پر بڑا اثر پڑا، انہوں نے یہ دیکھ کر خود ان کے مذہب کا ایک نہایت مقتدر آدمی اور پیشوا ان کی بغاوت کے خلاف ہے اپنے دل ہار دیئے ملتان میں بغاوت کرنے والی رجمنٹوں سے ہتھیار چھیننے کے موقع پر مخدوم محمود نے مع اپنے مریدین کے صاحب کمشنر بہادر کا ساتھ دیا اور اس پل کی حفاظت کے لیے کمشنر صاحب سے جا ملا جس پر گذر کر لوگ چھاؤنیوں کو جاتے تھے مخدوم کے مریدوں میں سے کوئی بھی باغیوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا اور یوں اس کی کارگذاری اور خیر سگالی مخدوم پاک پٹن کی کاروائی اور خیر خواہی سے بڑھ کر رہی۔ کیونکہ پاک پٹن کے مخدوم کے پیرو بلوہ گوگیرہ کے موقع پر بلوائیوں میں آگے آگے تھے ان خدمات کے صلہ میں مخدوم شاہ محمود کو ۳۰۰۰ روپیہ نقد انعام ملا زیارت کے نقد وظیفہ کا جو دلہ ۱۰۸۰ روپیہ مالیہ کی ایک ارضی جاگیر کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ جاگیر ان ۵۵۰ روپیہ مالیت کے ۸ چاہات کے علاوہ تھی جو مخدوم کو لبطور علی الدوام عطیہ کے ملے تھے پھر ۱۸۶۰ء میں حضور وائسرائے بہادر کی تشریف آوری لاہور کے موقع پر مخدوم کی ذات خاص کے لیے ایک باغ ۱۵۰ روپیہ سالانہ آمدنی کا عطا ہوا جو "بھنگی والا باغ" مشہور ہے۔ (۱)

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۴۹۸

(۳۴)

۲۶ مواضعات کا انعام

مزید برآں جرنیل جان واٹسن صاحب بہادر اس کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :-

"کہ وہ سب سے قابل اور عمدہ ترین افسروں میں سے ہے اور مجھے کسی ایسے آدمی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا اس سے زیادہ دیانت دار اور کھرا غدر کے تمام لڑائیوں کے دوران میں یعنی دہلی کے محاصرے سے لکھنؤ کے فتح ہونے تک وہ میرے کاموں میں دست راست رہا ہے" ان تعریفوں کی سر جیمس ہوپ گرانٹ بالقابہ نے جو لکھنؤ کے مقام پر رسالے کے افسر تھے اور سر کالن کیمبل صاحب بہادر بالقابہ سپہ سالار نے بہت زور سے تصدیق کی ہے لڑائی کے اختتام پر سردار جے سنگھ اودھ کی سوار پولیس کی چوتھی رجمنٹ کا کپتان بنا دیا گیا اس کو علاوہ آرڈر آف میرٹ اور آرڈر آف برٹش انڈیا اور معمولی فوجی پنشن کے علاقہ ضلع بہرائچ کے ۲۶ مواضعات عطا کیے گئے اس کی وفات ۱۸۶۷ء میں واقع ہوئی ۔ (۱)

(۳۵)

سچی خبریں

انگریزوں کے مخبر قلعہ کے اندر جا کر کیسی سچی خبریں لاتے تھے، اسے ایک مورخ کی زبان سے سنیئے۔

"جاسوس یہ خبریں لائے کہ علی العموم شہر کے باشندوں اور فوجی افسروں اور سارے دربار میں آپس میں حد سے زیادہ نفاق اور عناد و فساد ہے ایک دوسرے کا بس نہیں چلتا کہ کھا جاتے تلنگے آپس میں جلے کٹے مرتے ہیں بادشاہ کی توہین بر سر دربار سپاہی کرتے ہیں۔ بادشاہ کے سامنے فوج کے جرنل

---

(۱) تذکرہ روساتے پنجاب جلد اول صفحہ ۹۸

لڑتے جھگڑتے ہیں۔ بادشاہ کے بیٹے باپ کو معزول کر کے خود بادشاہی کے لیے سازشیں کرتے ہیں، خزانہ بالکل خالی پڑا ہے۔ کمبخت مہاجنوں سے تین دفعہ قرض لیا گیا۔ اب ان کی حالت ایسی ہوگئی ہے۔ کہ کچھ امید باقی نہیں رہی ہے کہ وہ روپیہ سے امداد کر سکیں۔ بادشاہ نے مہتاب باغ میں سے سپاہیوں کے چلے جانے کا حکم دیا مگر انہوں نے حکم نہیں مانا۔ بادشاہ نے سپاہ پر لعن طعن کی کہ تم کو متواتر شکستیں ہوتی ہیں تم دشمنوں سے جن کی تعداد بہت تھوڑی ہے ایک توپ بھی نہیں چھین سکے مگر بادشاہ یہ جانتا ہے کہ میرے حکموں کا اثر سپاہ پر کچھ نہیں ان پر لعن طعن کا اثر ہوتا ہے نہ دھمکیوں کا = (۱)

(۳۶)

تسلائی عدل

جب مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی کے غدر کی خبر ناگپور میں پہنچی تو تفضل حسین خان ہی وہاں کے مقامی رسالہ کا افسر تھا اور اس کے رسالے تے اگرچہ اس علاقہ میں بغاوت برپا کرانے کی بہت کچھ کوششیں کیں لیکن وہ سب ناکام رہیں جو ایک حد تک تفضل حسین ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ اس کے صلہ میں اسے سوار پولیس میں عہدہ رسالداری اور خطاب سردار بہادر عطا ہوئے پھر ۱۸۶۰ء میں کپتان موصوف کو فرخ نگر اور ریواڑی ضلع گوڑگانوہ میں حقوق لبسوہ داری دجاگیر جس کی آمدنی ۶ ہزار روپیہ سالانہ تھی ۔۔ ۱۵ سو روپیہ بطور نذرانہ وضع ہونے کی شرط پر عطا کیے گئے کپتان تفضل حسین کے بعد اس کے لڑکے محمد سراج الدین حیدر خان کے نام جو اس کی جگہ خاندان کا سرکردہ اور ڈویژنل درباری مقرر ہوا یہی عطیہ برقرار رکھا گیا۔ (۲)

---

(۱) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) صـ ۶۳۲

(۲) تذکرہ رؤسائے پنجاب، جلد اول۔ صـ

(۳۷)

فتح خاں

۱۸۵۷ء میں فتح خان سرکار انگریزی کا اسی طرح خیر خواہ رہا جیسا ۴۹-۱۸۴۸ء کے زمانہ میں رہا تھا اور اس کی خدمات کے صلے میں اسے ۶۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن حین حیات اور ۱۰۰۰ روپیہ کا ایک خلعت عطا ہوا اور اس کی جاگیریں بھی بحال رہیں ۱۸۶۰ء میں اسے جاگیردار مجسٹریٹ بنایا گیا اور آٹھ مواضعات پر فوجداری اور دیوانی اختیارات ملے ۱۸۶۶ء میں جبکہ ضلع کی حد بندی ہوئی تو کالاچٹا پہاڑیوں کے علاقہ میں تقریباً ۲۰۰۰ ایکڑ کا ایک رقبہ الگ کر کے اسے اس کو گھوڑوں اور مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر مل گیا اور جنوری ۱۸۸۶ء کو خطاب خان بہادر عطا ہوا۔ (۱)

(۳۸)

نیا دربار

انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کر لیا نئے گورنمنٹ ہاؤس کی سیر: ــــــــ

اس کے بعد مہاراجہ بالکرشن اور عمدت الدولہ غلام رضا اور منصف الدولہ سید باقر افسر عدالت اور مرزا علی رضا کوتوال شہر اور میر نادر حسین مہتم روزنامچہ اور دوسرے اہل خدمت مثل بندہ علی خاں اور دیانت الدولہ اور احسن الدولہ اور اعظم علی بیگ اور طالب علی وغیرہ حاضر ہوئے۔ ہر ایک نے صاحب ریذیڈنٹ سے اپنی خدمت کو بیان کیا صاحب ریذیڈنٹ جو اس وقت چیف کمشنر تھے ہر ایک کو ایک صاحب کے سپرد کرتے تھے باقی درجہ دوم کو حکم ہوا کہ تم اپنے اپنے متعلق کیے کام سے ہوشیار رہو خلاف حکم سرکار نہ کرو ورنہ نارسا ٹھہرو گے۔ بعد اس کے سب رخصت ہوتے۔ مرزا علی رضا

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۲۵۶

کوتوال شہر نے چاہا کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے لیکن چیف کمشنر نے اُس کا استعفےٰ قبول نہ کیا اور تنخواہ میں دو سو روپے اضافہ کر دیئے۔ اور شہر کی صفائی کے لیے حکم دیا۔ (۱)

(۳۹)

"علی رضا خان اور اس کا بہادر خاندان"

بعد ۱۸۵۷ء میں جبکہ سرکار انگریزی کو نہایت ضرورت تھی علی رضا خان نے ایک رسالہ دہلی کے پاس خدمات کے لیے بھرتی کیا چونکہ اس کا لاہور میں رہنا ضروری خیال کیا گیا تھا اس لیے اس نے اپنے روپیہ سے لاہور کی جائداد اور مکان رہن رکھ کر فوج کا خرچ دیا اور اپنے بھائی کے علاوہ اپنے بھتیجوں عبداللہ خان محمد حسن خان محمد زمان خان غلام حسین خان اور غیر محمد خان کو بھی بھیجا یہ فوج جو علی رضا خان نے بھرتی کی تھی ہڈسن صاحب کے مشہور رسالہ کا ایک حصہ بن کر جہاں کہیں یہ بہادر فوج گئی لڑائیوں میں خدمات کرتی رہی اور اس کی دلاوری ہمیشہ نمایاں رہی۔

کھاسی گنج کے مقام پر محمد تقی خان بہادری سے لڑتا ہوا کئی باغیوں کو اپنے ہاتھ سے مارنے کے بعد مارا گیا علی رضا خان کا چھوٹا بھائی محمد رضا خان اپنی بے خوف رجمنٹ میں شجاع ترین سپاہیوں میں تھا علاوہ اور شمس آباد کے مقام پر یہ دو دفعہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے اس کی ران کے نیچے مارے گئے جہاں کہیں گھمسان کی لڑائی ہوتی تھی وہیں بہادر محمد رضا خان پایا جاتا تھا لڑائی کے بعد اس نے اول درجے آرڈر آف میرٹ حاصل کیا۔ سردار بہادر کا خطاب لیا اور دو سو روپیہ کی علی الدوام پنشن حاصل کی۔ لکھنؤ میں جہاں لڑائی کے تھوڑی مدت بعد رخصت پر گیا تھا راہ گرائے عالم بقا ہوا۔

علی رضا خان لاہور ہی میں آنریری مجسٹریٹ تھا اور شہر میں لازمی طور پر اس کا بڑا رسوخ تھا جس کو وہ ہمیشہ بھلائی کرنے میں استعمال کرتا رہا کابل سے یہاں آنے پر اسے ۸۰۰ روپیہ ماہوار اور اس

---

(۱) تاریخ لاہور جلد پنجم (نجم الغنی)، صفحہ ۲۶۲

کے بھائی محمد رضا خان کو دو سو روپیہ ماہوار پنشن دی گئی غدر کے بعد اس نے بہرائچ اور اودھ کے ۱۴۷ مواضعات کی جن کی آمدنی ۵۰۰۰ روپیہ سالانہ تھی تعلقہ داری حاصل کی اس کو خان بہادر کا خطاب بھی دیا گیا اور اس کے متذکرہ بالا بھتیجوں کو جنہوں نے ایام غدر میں ایسی اچھی خدمات کیں تھیں سردار بہادر کے خطابات سے معزز کر دیا گیا پھر اس کے وفات سے دو سال پہلے ۱۸۶۴ء میں اُسے موروثی نواب بنا دیا گیا۔

علی رضا خان کے تین لڑکے تھے جن میں سے سب سے بڑا نوازش علی ۱۸۴۸ء میں سکھ فوج کے باغی ہو جانے کے موقع پر میجر جی لارنس صاحب بہادر کے پاس پشاور میں تھا یہ آخیر وقت تک صاحب موصوف کے ساتھ رہا اور اس کی اس وفاداری کے سبب سے اس کا مکان اور جائیداد جو پشاور میں تھے ضائع ہو گئے دوسرا بیٹا ناصر علی خان خاندانی املاک واقعہ اودھ کا مہتمم تھا وہاں اُسے آنریری اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا اس کی کارگذاری حکام کی مرضی کے عین مطابق رہی۔

۱۸۶۶ء میں علی رضا خان کی وفات پر نواب کا خطاب اس کے بیٹے نوازش علی خان کو ملا اور یہ بھی اپنے باپ کا قابل جانشین ثابت ہوا اس نے اپنی ساری عمر رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کی اور امن و آسائش کے دنوں میں لڑائیوں کے بعد اس نے اپنا وہ نام پیدا کیا جو دیانت داری اور راست بازی کی وجہ سے پنجاب کی صف اول میں داخل ہے ۱۸۷۷ء میں آنریری اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا گیا اور تین سال تک لاہور کی میونسپل کمیٹی کا پریزیڈنٹ رہا۔

۱۸۸۵ء میں اسے سی آئی ای کا خطاب اور اُس کے تین سال بعد کے سی آئی ای کا خطاب ملا ۱۸۸۸ء میں یہ لیجسلیٹو کونسل کا زائد ممبر نامزد کیا گیا اور اس سے ایک سال پہلے اسے رکھ تلیانہ ضلع لاہور کے حقوق مالکانہ عطا کیے گئے ۱۸۹۰ء میں سر نوازش علی خان کی وفات کے بعد نواب کا موروثی خطاب اس کے چھوٹے بھائی ناصر علی خان کو عطا کیا گیا جو خاندان کا بزرگ اور اپنے بھائی کی جگہ پراونشل درباری ہو گیا ناصر علی خان پراونشل سول سروس میں ۲۵ سال تک ملازم رہا اور ۱۸۹۶ء میں فوت ہوا اُس کا جانشین اس کا بھتیجا فتح علی خان ہوا جو نواب کا خطاب اور اپنے چچا کی جاگیرات وورثہ میں حاصل کر کے خاندان کا بزرگ اور پراونشل درباری ہے ۱۸۹۷ء میں نواب فتح علی خان پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا ۱۹۰۲ء میں وہ ہز مجسٹی

شہنشاہ کی تاجپوشی میں پنجاب کی طرف سے شامل ہونے کے لیے انگلستان گیا اور ۱۹۰۳ء میں سرکاری مہمان
کی حیثیت سے دہلی دربار میں شامل ہوا جہاں اسے سی۔ آئی۔ ای کا خطاب عنایت ہوا پھر ۱۹۰۸ء میں اسے
گورنر جنرل لیجسلیٹو کونسل کا زائد ممبر نامزد کیا گیا کئی دفعہ ثابت ہو چکا ہے کہ نواب فتح علی خان سرکار انگریزی
کا فرمانبردار اور وفادار ہے اور بالتواتر کئی وائسرایوں اور لفٹننٹ گورنروں نے اس کی تعریفیں کی ہیں یہ
تمام خیراتی کاموں میں دریا دلی سے چندے دیتا ہے اور اس کے فلاح خلائق کے جوش اور پنجاب کے
مسلمان امرا میں ممتاز ہونے کی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے لوگ اس کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔

نواب ناصر علی خان کا لڑکا محمد علی خان آنریری مجسٹریٹ اور لاہور کی میونسپل کمیٹی کا وائس پریذیڈنٹ
ہے سردار بہادر محمد رضا خان کا لڑکا سردار رضا علی خان اپنے باپ کی خدمات کے صلہ میں ۲۰۰ روپیہ
ماہوار پنشن پاتا ہے وہ ڈویژنل درباریوں سے ہے اور کچھ عرصے تک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہا اور ۱۸۷۸ء میں
سر لیپل گریفن کے پولیٹیکل عملہ میں ممبر ہو کر صاحب موصوف کے ہمراہ کابل گیا پھر پنشن مرحمت سے دستکش
ہونے کے بعد اس نے میونسپل کمیٹی لاہور میں رہ کر بہت سے مفید کام کیے اور ۱۹۱۱ء میں درجہ دوم
تمغہ قیصر ہند حاصل کیا۔ محمد اعظم خان کا لڑکا علی حسین خان بیرسٹر ایٹ لاء اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہے (۱) آج
۸۰ برس سے زیادہ عرصہ ہوا ہے علی رضا خان اور اس کی اولاد نے انگریزوں کی بڑی عقیدت سے خدمت گذاری
کرتی رہی ہے جس کی بالکل بے غرض صداقت کے متعلق شبہ نہیں۔ علی رضا خان اس وقت انگریزوں کی رعایا
میں پیدا نہیں ہوا تھا مگر سارے ہندوستان میں ایسا کوئی خاندان مشکل سے ملے گا جو گو احسان مندی کی وجہ سے
یا اپنا فرض سمجھ کر سرکار انگلشیہ کا کتنا ہی خیرخواہ کیوں نہ ہو مگر جس نے سردار موصوف کی طرح ایسی
فراخدلی کے ساتھ جان اور ہر شے کو جس سے زندگی کا حظ حاصل ہو سکتا ہے خطرے میں ڈالا ہو جب
تک کہ کابل کی پہلی لڑائی کے ان سخت مصائب کے دنوں کے برابر مصائب انگریزی فوج پر کبھی نہیں پڑے
اور جب تک ۱۸۴۱ء کے مصائب و آلام اور فتح و نصرت انگریزی کے کارناموں میں روزانہ قصے کے طور پر ان
کے تب تک علی رضا خان اور اس کے بہادر خاندان کا نام تمام سچے انگریزوں کو احترام و احسانمندی کے ساتھ یاد رہیگا

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اوّل۔ صفحہ ۲۲۱

(۴۰)

جب پنشن خوار وفات پا جائے گا!

۱۸۵۷ء میں محمد اسماعیل خان نے پھر نمایاں خدمات کیں اس نے ایک رسالہ بھرتی کرنے میں امداد دی بذات خود بھی باغیوں سے لڑا اس خیر خواہی کے صلہ میں اسے ۵۰۰ روپیہ کا ایک خلعت اور خان بہادر کا خطاب عطا ہوا ۶۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن بڑھا کر ۹۰۰ روپیہ کر دی گئی اور اس پر ۱۵۰ روپیہ کی حین حیات جاگیر کا بھی اضافہ کیا گیا ۱۸۶۱ء میں خود محمد اسماعیل خان کی خواہش پر اس کی پنشن کا بھی حین حیات جاگیر سے تبادلہ کر دیا گیا ۔

محمد اسماعیل خان کے حقوق خدمات کے معاملہ پر گورنمنٹ عالیہ نے ۱۸۶۵ء میں مکرر غور فرمایا اور خاندان کی حیثیت اور اس کے رسوخ کا لحاظ کرنے کے علاوہ رئیس کی سچی وفاداری اور اچھے برتاؤ کو مدنظر رکھ کر سر رابرٹ ایجرٹن بالقابہ نے سفارش کی کہ اس کی حین حیات جاگیر بڑھا کر ۱۰۰۰ روپیہ کی کر دی جائے اور اگر گورنمنٹ کی مرضی ہو تو رئیس مذکور کے بعد بھی وہ جاگیر کسی منتخب وارث کے نام رہے اس کی نسبت گورنمنٹ ہند نے یہ قرار دیا کہ اس معاملے پر اسی وقت غور کیا جائے گا جب کہ پنشن خوار وفات پا جائے گا ۔ (۱)

(۴۱)

پنجاب سنگھ

۱۸۶۶ء میں لفٹنٹ جرنیل براؤن صاحب بہادر بالقابہ نے اس کی نسبت حسب ذیل تحریر کیا :-
" کسی شخص نے بھی ایسے بہادری کے کام نہیں کیے جیسے کہ پنجاب سنگھ نے کیے ہیں اس کی قوت

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب ، جلد دوم ، ص ۴۸۸

(۴۴)

پہلے باغی پھر وفادار

غدر ۱۸۵۷ء کے وقت سردار صورت سنگھ بہ عالم جلا وطنی بنارس میں ہی تھا بر گشتگی ایام نے
اس کو عقل سکھا دی تھی اور اب وفاداری میں اتنا ہی سرگرم تھا جتنا کہ پہلے بغاوت کرنے میں تیز و طرار
۴ جون ۱۸۵۷ء کو دیسی پلٹن نمبر ۳۷ بنارس میں توڑ دی گئی اور لدھیانہ کے سکھوں کی پلٹن یہاں جو اس
وقت موجود تھی کچھ مشتبہ حرکات دیکھی گئیں اس لیے ہی توپیں جو ۳۷ نمبر کے سپاہیوں پر گولہ باری کر
رہی تھیں ان سکھوں کی طرف موڑ دی گئیں معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام معاملہ میں سخت غلطی ہوئی
اور کوئی وجہ یقین کرنے کی نہیں کہ سکھ نمک حلال نہ تھے مگر نمک حلالی کے لیے سخت امتحان کے لیے وہ
البتہ تیار نہ تھے چنانچہ انہوں نے توپوں پر حملہ کیا اور بڑا نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے اور میدان جنگ سے
بھگا دیئے گئے۔ اتفاقیہ بنارس کے خزانے پر جس میں مہارانی جنداں کے بتیس لاکھ کی مالیت کے جواہرات
تھے سکھوں کی اس پلٹن کے کچھ آدمیوں کا پہرہ تھا جو مار دیئے گئے خزانے کے بالکل قریب ہی کلکٹر
صاحب بہادر کی کچہری ایک مضبوط عمارت میں تھی جس کی چھت پر ۱۲ اسول عہدہ دار فساد ہونے کی
حالت میں خزانہ اور اپنی جانوں کے بچانے کے واسطے کھڑے تھے جب سکھوں کے گارد نے اپنے رفیقوں
کی سرگذشت سنی تو ان کی پریشانی اور غصہ حد درجہ کو پہنچ گیا وہ بلا شبہ سرکش ہو کر خزانہ کو لوٹ لیتے
اور پور پین افسروں پر حملہ کرتے اگر صورت سنگھ ان کے پاس جا کر اپنے ذاتی نفوذ اور بڑے بحث مباحثے
سے ان کو حق نمک کا پاس کرنے پر مجبور نہ کرتا جون مہینے کی اس لمبی رات کو سردار مع پنڈت گوکل چند کے
جو اس کی لیاقت کے ساتھ مدد کرتا رہا ان سکھوں کی منت کرتا اور ان کو سمجھاتا رہا حتیٰ کہ صبح کے قریب
یہ چھوٹی سی جمعیت گورہ فوج کی حفاظت میں ٹکسال کو بھیجی گئی جو نپور میں لدھیانہ کی پلٹن کی ایک اور
جمعیت متعین تھی جب ان لوگوں نے اپنی پلٹن کی تباہی کا حال سنا تو ان کو سخت غصہ آیا انہوں نے اپنے
کمان افسر کو گولی سے مار دیا صاحب جائنٹ مجسٹریٹ کو قتل کر دیا اور خزانہ لے کر لکھنؤ کو روانہ ہو گئے

اگر صورت سنگھ بہادری اور وفاداری نہ کرتا تو بنارس میں بھی ایسی ہی واردات قتل ہوتی تھوڑے عرصے کے بعد سردار صورت سنگھ اُس فوج کا افسر مقرر ہوا جو سلطان پور سے بھاگے ہوئے آدمیوں کو لانے کے لیے بھیجی گئی تھی اور کئی اور مواقع پر بھی میدان جنگ میں اس سے نمایاں بہادری ظہور میں آئی ۲ جولائی کو راجپوتوں کی ایک جمعیت کے ساتھ جنہوں نے بنارس پر حملہ کیا تھا لڑتے ہوئے سردار صورت سنگھ کی ران پر تلوار کا سخت زخم آ گیا جس کے سبب سے وہ کئی مہینہ تک چارپائی پر پڑا رہا اور اسی زخم کی وجہ سے لنگڑا ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ عالیہ نے سردار صورت سنگھ کو ۴۸۰۰ سالانہ کی ایک پنشن عطا کی اور ڈمری ضلع گورکھپور واقع ممالک مغربی و شمالی میں ایک قیمتی حین الدوام جاگیر دی اور اس کو پنجاب میں واپس آنے کی اجازت بھی مل گئی (۱)

(۴۴)

بہادر شاہ کو گرفتار کیا

۱۸۵۷ء کے غدر کے شروع ہوتے ہی مان سنگھ رسالدار کے تین ٹرپوں کے ساتھ جن میں سے ایک نواب امام الدین خان نے ایک راجہ تیج سنگھ نے اور تیسرا زیادہ تر خود مان سنگھ نے بھرتی کیے تھے میجر ہڈسن صاحب کے ساتھ شامل ہونے کے لیے دہلی آ پہنچا یہ فوج بعد میں ہڈسن کے رسالے کے نام سے مشہور ہوئی اور ابتدا میں ہڈسن صاحب کے مشہور رسالے کے ساتھ ... کی تھی مان سنگھ نے دہلی کے محاصرے اور اس کی فتح کے دوران میں خوب خدمات کیں ۳ ستمبر ... بادشاہ دہلی کی گرفتاری اور تمام شہزادوں کی گرفتاری اور پھانسی دینے میں اور اس دن جس دن بادشاہ پکڑا گیا اعانت کی بہادری اور شجاعت اس پلے کی تھی جیسی کہ خود اس نے بہادر ہڈسن صاحب کی ... کے بعد اسے کرنل شاورز صاحب بہادر کے دستہ فوج کے ساتھ ضلع ریواڑی میں بھیجا گیا اور ...

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد اول صفحہ ...

ماہ اکتوبر کے آخر میں دہلی واپس آنے پر میجر ہڈسن صاحب نے ۵۰۰ رنگروٹ بھرتی کیے اور اپنی ضمانت پر بہت سا روپیہ جس کے خرچ کرنے کی ضرورت تھی قرض لیا اور تقریباً ۴ مہینے میں یہ آدمی بھرتی کر لیے اور نہایت عجلت کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گیا لکھنؤ میں یہ شہر کے عین فتح ہونے کے وقت پہنچ گیا مگر افسوس ہے کہ اپنے کمانڈر صاحب کا شکریہ نہ لے سکا جو اس کے وہاں پہنچنے سے ایک دن پہلے مارا گیا تھا۔

مان سنگھ ۱۸۵۸ء کے موسم گرما میں برابر لڑتا رہا اور سرکاری کی خدمات میں اس کی بہادری کے حالات جو اس نے اپنی رجمنٹ کے لفٹنٹ بگر صاحب کے چھڑانے میں جن کو دشمنوں نے گھیر لیا تھا ذکر کیا گیا ہے اس موقع پر مان سنگھ کے دو سخت زخم آئے تھے اور اس کے گھوڑے کو تلوار کے صدہا زخم لگے اس لڑائی کی خدمات کے عوض میں اس نے آرڈر آف میرٹ حاصل کیا ۱۸۵۸ و ۱۸۵۹ء میں اودھ کی لڑائیوں میں شریک اور بہت خطرناک موقعوں پر موجود رہا نند گنج کے مقام پر اس نے توپیں چھین لیں اس کے بعد ایک گولہ بارود کے صندوق کے پھٹ جانے سے جو دشمن کے کسی خطرناک آدمی کا کام تھا اس کے بہت سی ضربیں لگیں جن کی وجہ سے کئی مہینے تک یہ سخت تکلیف میں رہا مان سنگھ کی خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ نے اسے ۶۰۰ روپیہ سالانہ کی مالیت کی جاگیر اودھ میں اور ۴۰۰ روپیہ سالانہ کی جاگیر پنجاب میں عطا کی۔ (۱)

(۴۵)

ایک لطیفہ

باندہ میں جب انگریزی فوج نے اس کو فتح کیا تھا تو سب سے پہلے مرزا امداد علی بیگ ملازم نواب باندہ کو بلا سماعت عذر کے جو باظہار خیر خواہی کیا تھا پھانسی پر چڑھا دیا تھا اور پھر

---

(۱) تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم، صـ ۱۶۲

جب حال خیر خواہی اس کا پایہ ثبوت کو پہنچا تھا اور عرائض اس کے جو وہ براطلاع حالات نقل و حرکت فوج اور بغاوت نواب باندہ کے پہنچا رہا تھا دفتر الہ آباد میں برآمد ہوئے تو کل املاک منضبط اس کے وارثان کو نہایت افسوس کے ساتھ واپس کر دی تھی۔ (۱)

(۴۶)

مخبر اور غدار نمبر ایک

معین الدین حسن ایک بزرگ تھے، بظاہر مسلمانوں کے دوست، حقیقتاً انگریزوں کے جان نثار انہوں نے غدر کے عہد میں کیسے کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان کی ایک جھلک: ——

"پہلا کوتوال شہر میں معین الدین مقرر ہوا۔ جو نواب قدرت اللہ خان کا بیٹا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے یہ کوتوالی اس لیے اختیار کی تھی۔ کہ انگریزوں کی خیرخواہی اس بدخواہی کے لباس میں کروں وہ چند روز میں اپنے ظلم و ستم کے سبب برخاست ہوا۔ (۱)

وہ خود کہتا ہے: ——

سر تھیوفلس کی مدد "مجھے سب سے زیادہ سر تھیوفلس کی فکر ہوئی اس لیے کہ بادشاہ نے آپ کی گرفتاری کے لیے ۱۰ ہزار روپے کا انعام مقرر کیا تھا ابھی میں اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں سر تھیوفلس کے پاس سے مجھے یہ زبانی پیغام ملا کہ بھاگ جانے کے لیے میری اعانت کرو۔ اسی دن شام کو میں نے ایک اعلیٰ درجہ کا گھوڑا اور کچھ روپے پیش دیئے اور سفر کے متعلق ہدایات بھی دے دیں۔ مجھے تشویش یوں ہوئی کہ اگر میں خود جاتا ہوں یا مدد سے تعلق کی شہرت ہو جاتی ہے تو میری تمام محنت اکارت ہو جانے کی تجویز یہ تھی سر تھیوفلس دیسی لباس پہنیں اور شیر خان نام اختیار کریں اور یہ کہ آئندہ سے خط و کتابت میں اسی کا نام

---

(۱) سرگذشت ایام غدر (خالد پاہر) نایت حسین معین المہام بھوپال

(۲) تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۱۹۵۲

استعمال کیا جائے دوسرے دن جھوٹے روپیہ کی باقاعدہ رسید وصول ہوگئی۔ یہ معلوم کرکے اطمینان ہوگیا کہ سر تھیوفلس بھورے خاں اور ان کے دو بھائیوں کے معیت میں بخیر و عافیت جھجر پہنچ گئے ہیں۔ (۱)

جو کچھ وہ کہتا ہے، اس کی تصدیق دوسرے بیانوں سے بھی ہوتی ہے :——

"جان مٹکاف صاحب جنٹ مجسٹریٹ دہلی۔ بلوے کے دن تنہا ہاتھ میں تلوار لیے شہر سے باہر نکلے اور ان ظالموں سے بچتے بچاتے پہاڑ گنج کے تھانے میں پہنچے۔ مرزا معین الدین حسین خان تھانہ دار نے صاحب موصوف کو کپڑے بدلواکر اور تبدیل ہیت کرکے بھنورا نمبردار گاؤں باغ کے پاس پہنچا دیا نمبردار مذکور نے صاحب موصوف کو درگاہ حضرت سید حسین رسول نما پہنچایا اور پھر پوشیدہ طور پر ایک محفوظ جگہ پر رکھا، اور صاحب کے کھانے پینے کا انتظام کردیا۔ پھر چند دن کے بعد صاحب موصوف کو جھجر پہنچا دیا۔ لیکن نواب صاحب نے تلنگوں کے خوف سے صاحب موصوف کو اپنے ہاں پناہ نہ دی۔ بلکہ ملاقات بھی نہ کی، ایک بیان یہ بھی ہے کہ ملاقات کی تو مگر جیسا کہ چاہیے تھا اخلاق و مروت سے کام نہیں لیا۔ بلکہ جھجر میں ٹھہرنے بھی نہ دیا مٹکاف صاحب نے جب یہ سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھی تو وہ وہاں سے رنجیدہ ہو کر چلے گئے" (۲)

سر تھیوفلس مٹکاف کی رہائی کے حالات

یہی داستان دوسرے الفاظ میں، اور دوسرے پیرایہ سے :——

"۱۱ مئی کی صبح کو سر تھیوفلس مٹکاف گاڑی میں بیٹھ کر عدالت گئے، اس وقت انہیں کہا گیا کہ باغی سپاہی شہر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کو روکنے کی غرض سے وہ فوراً بگھی میں آ بیٹھے اور گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر کوتوالی پہنچے اور وہاں سے انہوں نے گارد بھیجی تاکہ راج گھاٹ دروازہ کو کھولنے سے روکا جائے اور ساتھ ہی دوسرے دروازوں کو بند کرا دیا جائے بعد ازاں وہ کلکتہ دروازہ پہنچے، جہاں انھوں نے دیکھا کہ تمام جگہ شور و غوغا بلند ہے۔ باغی فوجوں کو چھاؤنی کی فوج سے کافی امداد مل گئی تھی اور شہر کے بدمعاش

---

(۱) غدر کی صبح شام، صہ ۸۵

(۲) نصرت نامۂ گورنمنٹ صہ ۱۳

ہوئی بھی ہر لحظہ اس شورش انگیز مجمع کی تعداد میں اضافہ کر رہے تھے ۔

کئی آویزشوں کے بعد جن میں سر تھیوفلس بال بال بچے اور جن میں اُن کی بگھی بھی جاتی رہی وہ بالآخر کچھ حصہ پیدل چل کر یا بعد میں گھوڑے پر بیٹھ کر جسے انہوں نے ایک سوار سے چھین لیا تھا، پہاڑ گنج کے تھانہ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ۔ یہاں معین الدین حسن خان نے ان کا تپاک آمیز استقبال کیا اور بلا کسی پس و پیش کے وفاداری سے اُن کی امداد کرنے کا وعدہ کیا اور ابتدائی کارروائی کے طور پر انہوں نے اپنا پاس ان کے حوالے کر دیا جس کے بعد سے انہوں نے دیسی بھیس اختیار کر لیا ۔ یہ خیال کر کے کہ شہر کے اس قدر قرب میں رہنے سے خود ان کی جان اور تھانیدار کی جان خطرے میں پڑ جائے گی (کیونکہ باغیوں نے شہر میں تمام یورپین باشندوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا) سر تھیوفلس تھانیدار کی پر زور درخواست پر دہلی میں واپس جانے سے روک دیئے گئے اس لیے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ نکلتا کہ اُن کی جان جاتی رہتی ۔ بجائے اس کے انہوں نے معین الدین کی یہ تجویز منظور کر لی کہ قرول باغ تک انہیں بحفاظت تمام پہنچا دیا جائے جہاں انہیں بھورے خان نمبردار کے یہاں (جس نے باوجود بھیس بدل لینے کے فی الفور سر تھیوفلس کو پہچان لیا) پناہ مل گئی ۔ سر تھیوفلس کو سب سے پہلے جس بات کی پریشانی تھی وہ یہ تھی کہ شہر کے دوسرے یورپینوں کی حالت دریافت کریں ۔ اس لیے انہوں نے تھانیدار کو ہدایت کی کہ وہ معلوم کر کے جلد از جلد انہیں بتائیں اور ساتھ ہی اس امر کی درخواست کی کہ جتنی جانیں بچ سکیں بچانے کی کوشش کریں ۔ لیکن جانیں بچانے کا زمانہ گذر چکا تھا ۔

چونکہ تھانیدار پر سر تھیوفلس کو بچانے اور مدد دینے کا شبہ کیا جا رہا تھا اس لیے خود ان کی جان بھی خطرہ میں تھی لیکن وہ بہت سی احتیاطوں اور مختلف تدابیر کے ذریعہ پناہ گزین کے حالات کو مخفی رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور شہر کے خونیوں کو کسی طرح ان کا پتہ لگنے نہیں دیا ۔ اس اثنا میں بھورے خان نے ان کی حفاظت کرنے یا ان کی ضروریات پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔

مزید حفاظت کی غرض سے قرب و جوار کے جنگل میں ان کے لیے جائے پناہ تلاش کر لی گئی جہاں وہ ملت کو نکل کر اپنی جان بچا سکتے تھے، بشرطیکہ باغی فوراً موقع پر نمودار ہو جائیں ۔ مزید برآں بھورے خان نے

خطرہ کی حالت میں اپنے چند قابل اعتماد دوستوں کی امداد کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔ اُن میں دو راجپوت تھے جن کے نام پوران سنگھ اور ہمت سنگھ تھے، جب سر تھیوفلس نے یہ دیکھا کہ وہ دہلی میں اپنے زمانہ قیام کو طول دے کر خواہ مخواہ اپنی اور اپنے رفقاء کی زندگی کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔ تو اس وقت اُنہوں نے بھورے خان پر زور دیا کہ میرا جھجر جانے کا انتظام کر دو، اس ریاست کا نواب سر تھیوفلس کا ذاتی دوست تھا اور ان کے ساتھ سر تھیوفلس اور اُن کے والد نے بہت سے احسانات بھی کیے تھے اس لیے اُن کو توقع تھی کہ اگر میرا تپاک آمیز استقبال نہ ہوا تو کم از کم میری حفاظت تو ہو جائے گی اور جائے پناہ مل جائے گی، بھورے خان شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُن کے انتظامات کی خوبی اور اُن کے راجپوت رفقاء کی جانثاری کی بدولت وہ بہ حفاظت تمام جھجر پہنچ گئے ۔[1]

(۴۷)

مخبری کی گرم بازاری

راقم الدولہ ظہیر دہلوی، جنہوں نے غدر کے مصائب مردانہ وار برداشت کیے، فرماتے ہیں:۔

"غرضکہ جب زن و مرد شہر سے باہر ہو گئے۔ تو اب مخبری کا بازار گرم ہوا۔ اور وہی نمک حرام جو بدمعاشوں کے ہمراہ ہو کر شہر کو لٹواتے تھے۔ اب سرکاری مخبری اور شہر والوں کو پھانسیاں دلوانے لگے دو روپیہ آدمی پیچھے مخبری کا صلہ ملتا تھا۔

چنانچہ چار پانچ روز ہم کو برف خانے میں گذرے تھے کہ میر نواب کپتان شاہی کو پکڑ کر پھانسی

---

[1] اس مقام پر مصنف نے بیان کیا ہے، کہ جن آدمیوں نے مصیبت کے زمانہ میں سر تھیوفلس مٹکاف کی امداد کی تھی بعد میں جبکہ حالات بہتر ہو گئے اور انگریزی سلطنت کا از سر نو قیام ہو گیا تو اس وقت انہیں فراموش نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں معقول انعامات وغیرہ عطا ہوتے ۔

[2] غدر کی صبح شام ص ۲۶۵

دے دی گئی۔ باوجود یہ کہ وہ میر حیدر علی داروغہ فیل خانہ انگریزی کا داماد تھا اور تمام غدر میں ہمراہ صاحبان انگریزی پہاڑی پر رہا کرتا تھا۔ تمام کمسریٹ کا کام اس کے سپرد تھا اور سرکار کی بہت سی خیرخواہی کی تھی۔ اور میر نواب کپتان اس کا داماد تھا۔ اس نے بہت کچھ معذرت کی مگر کچھ نہ سنی گئی۔ اور اس کی خیرخواہی پر کچھ نظر نہ کی گئی۔ جب یہ واقعہ نظر سے گذرا تو سب کو اپنی اپنی جانوں کا فکر ہوا۔ (۱)

والیان ریاست

اب کچھ والیان ریاست کا ذکر ہوتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے غدر میں اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے بادشاہ سے غداری کی، اور گراں بہا صلے پائے، حویلیاں ملیں، حدود ریاست میں اضافہ ہوا، سونے چاندی کے سکے ملے، سب کی فہرست تو لمبی ہے چند کی "تاریخ" ملاحظہ ہو:۔

(۴۸)

مہاراجہ پٹیالہ

مہاراجہ پٹیالہ کو دلی میں ملکہ زینت محل کے محل کے علاوہ۔ جو عطیہ انگریز والی [illegible] وہ یہ ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد مہاراجہ پٹیالہ صاحب کو ایام غدر کی بیش بہا خدمات کے صلہ میں نواب جھجر کی ضبط شدہ ریاست کے حصہ نارنول میں جس کے مالیہ کی جمع دو لاکھ روپیہ تھی شاہی حقوق کے ساتھ دے دیے گئے کہ وہ کسی عام خطرہ یا ملکی بدامنی کے موقع پر سرکار کو فوجی امداد دیا کریں نیز یہ اجازت دی گئی کہ اس قرضہ کی بے باقی میں جو انہوں نے ایام غدر میں سرکار انگریزی کو دیا تھا بھوکا پرگنہ [illegible] کم قیمت خرید کریں جن پر ان کے شاہی حقوق نسلاً بعد نسل جاری رہیں گے علاوہ ازیں مہاراجہ کو چند [illegible] اضافہ [illegible] اختیارات عطا کیے گئے اس علاقہ کی لاوارث اور ضبط شدہ جائداد کا حق بازیافت [illegible]

---

(۱) داستان غدر از راقم الدولہ ظہیر دہلوی۔

دیا گیا اور ۵۲۶۵ روپیہ کی وہ رقم جو اس سے پہلے سرداران بھڈوڑ سرکار انگریزی کو ادا کیا کرتے تھے اب مہاراجہ موصوف کو ملنے کی منظوری دی گئی ۔ ۱۱؎

(۴۹)

مہاراجہ نابھہ

سری راجہ بھرپور سنگھ نابھ غدر کے چند ماہ بعد سن بلوغ کو پہنچے انہوں نے غدر کے دوران میں قابل تقلید وفاداری ظاہر کی اور پنجاب کے دوسرے روساء کی طرح نمایاں خدمات انجام دیں غدر کے شروع ہوتے پر شہر لدھیانہ اور خود اس کے زیر قبضہ ستلج کے گھاٹوں کا اہتمام ان کے سپرد تھا۔ نابھ کی فوج کے ایک اور دستہ نے جس میں صرف ایک سو پچاس جوان تھے پھلور کے مقام پر جالندھر کے باغیوں کا مقابلہ کرکے انہیں دریا عبور کرنے سے روکنے میں کامیابی حاصل کی اور لیون صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی قابل تعریف امداد کی راجہ صاحب نابھ نے تھوڑی سی فوج دہلی کو بھی ارسال کی تھی اور اس فوج نے محاصرہ دہلی میں اچھی خدمات کیں بعد ازاں راجہ جی نے اپنی رعایا میں سے بہت سے سپاہی بھرتی کیے سرکار انگریزی کے لیے سامان رسد اور بار برداری مہیا کیا گیا اور باغیوں کو گرفتار کرتے رہے اس کے علاوہ ان سے جو خدمت طلب کی گئی انہوں نے نہایت وفاداری سے بدل و جان انجام دی ان خدمات کے صلہ میں سری راجہ بھرپور سنگھ کو باول اور کانٹی کے دو علاقے عطا ہوئے یہ علاقہ جات ضبط شدہ ریاست جھجر کے حصص تھے اور ان کا مالیہ ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ تھا اس عطیہ کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی کہ راجہ صاحب نابھ عام خطرہ اور شورش یا ہل چل کے موقع پر گورنمنٹ کی فوجی اور پولٹیکل خدمات انجام دیتے رہیں انہیں دوسرے راجگان پھلکیاں کی طرح اپنی رعایا میں پھانسی کے اختیارات اور متبنیٰ کرنے کا حق ہوا اور سرکار انگریزی نے وعدہ کیا کہ وہ ریاست کے اندرونی معاملات

۱۱؎ تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، ص ۱۵۰

میں کبھی دخل نہ دے گی بعد ازاں راجہ صاحب کو اجازت دی گئی کہ انہوں نے گورنمنٹ کو جو قرضہ دیا تھا اس کی ادائیگی میں کنونڈ کے سب ڈویژن ججھر کا ایک اور حصہ خرید لیں ۔ (۱)

(۵۰)

مہاراجہ جیند

سری راجہ سروپ سنگھ جیند نے غدر کے دوران میں بھی نمایاں وفاداری دکھلائی اور ۸ سو آدمیوں کی جمعیت لے کرنال کی چھاؤنی پر قابض اور دہلی سے ۱۰ میل شمال میں مقام بھاگ پت پر دریائے جمنا کے پل کے محافظ بنے رہے اور اسی طرح گویا راجہ سروپ سنگھ ہی کی امداد سے میرٹھ کی فوج سرایچ برنرڈ بارنا کی فوج سے آ کر مل سکی ۸ جون کو مقام علی پور کی لڑائی میں راجہ صاحب بذات خاص شریک تھے اور سپاہ انگلیڈ کے کمانڈران چیف نے ان کی جوانمردی اور سپاہیگری کی مہارت پر داد اور مبارک دینے کے علاوہ غنیم سے چھینی ہوئی توپوں میں سے ایک توپ بھی عطا کی آخر میں جس وقت دلی میں بٹر ہوا ہے اس وقت راجہ صاحب کی رجمنٹ نے سرفروشی میں نمایاں حصہ لیا انگریزی فوجوں کے ساتھ فصیل شہر کی دیواروں پر چڑھ گئی اور اس کے بہت سے آدمی زخمی اور مقتول ہوئے ۔

ایام غدر کے وفادار اور معین و مددگار دیسی والیان ملک میں سری راجہ سروپ سنگھ واحد شخص تھے جو بذات خاص دہلی پر حملہ کرنے والی فوج میں حاضر اور شامل ہوئے اور شرکت جنگ کے علاوہ انہوں نے تمام حلقہ محاصرہ میں دہلی کی محاصر فوج کا دیگر مقامات کی افواج اور علاقہ سے رسل و رسائل کا سلسلہ قائم رکھا اور اس کی آمد و رفت کی سڑکوں کو کھلا رکھنے میں نمایاں مستعدی ظاہر کی مزید براں راجہ صاحب موصوف خاص اپنی ریاست کے گرد و نواح کے اضلاع میں بھی امن قائم رکھ کر اپنی لیاقت و ریاست دانی کا ثبوت دیتے رہے ۔ شہر دہلی کے فتح ہو جانے کے بعد راجہ صاحب نے ۲۰۰ آدمی جرنیل وان کورٹ لفٹنٹ صاحب بہادر

---

(۱) تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، صفحہ ۲۹۴

کے ہمراہ ہانسی اور ۱۱۱ آدمی کرنیل آر لارنس صاحب بہادر کے ہمراہ جھجر کو بھیجے اور ان کے ۲۵۰ آدمی رہتک کے تم
میں ادائے خدمات کے لیے حاضر رہے۔ نواب گورنر جنرل کشور ہند بالقابہ نے اپنے اعلان مورخہ ۵ نوم
۱۸۵۸ء میں ان کی نسبت یوں ارشاد فرمایا کہ :

" راجہ صاحب جیند مستقل اور دلیرانہ امداد و اعانت دیتے رہنے کی وجہ سے گورنمنٹ کے خاص
شکریہ کے مستحق ہیں " سری راجہ سروپ سنگھ کو ان مذکورہ بالا بیش بہا خدمات کے صلہ میں دادر
کا چھ سو مربع میل کا علاقہ عطا کیا گیا جو نواب بہادر گڑھ کی املاک تھا اور اس کی غداری کی وجہ سے
ضبط کر لیا گیا تھا قصبہ سنگرور کے پاس ہی جہاں اب راجہ صاحب کا دارالحکومت ہے پرگنہ کالار
کے تیرہ مواضعات بھی راجہ صاحب کو دیئے گئے جن کا مالیہ ۱۳۸۰۰ روپیہ تھا نیز خاص شہر د
میں ایک مکان ۶۰۰۰ روپیہ کی مالیت کا ان کو مرحمت ہوا اور ان مادی عطیات کے علاوہ بہت سے
اعزازی خطاب بھی دیئے گئے گیارہ ضرب توپیں ان کی سلامی مقرر کی گئی اور دیگر راجگان پھلکیاں
طرح ان کو بھی ایک سند عطا کی گئی جس کی رو سے راجہ صاحب جیند کو اختیار دیا گیا کہ خاص اپنی
اولاد نہ ہونے کی صورت میں کسی کو اپنا متبنیٰ کر سکیں۔[1]

سری راجہ سروپ سنگھ ۱۸۶۴ء میں فوت ہوئے سر لیپل گریفن تحریر فرماتے ہیں کہ " سروپ
کی شکل و شباہت بالکل شاہانہ تھی سکھوں کی بہادر قوم بمشکل تمام کوئی ان سے زیادہ بلند بالا اور قوی ا
آدمی پیش کر سکتی ہے جب یہ اپنی نہایت مرغوب پوشش یعنی زرہ بکتر سے آراستہ ہو کر اپنی فوج کے
ساتھ سوار ہوتے تھے تو ایسے بہادر اور اصلی سپاہی دکھائی دیتے تھے کہ ہندوستان کا کوئی اور ش
شاید ہی ویسا وجیہ و دلیر معلوم ہو سکتا راجہ سروپ سنگھ سے بڑھ کر سرکار انگریزی کا کوئی بھی صادق
دوست ثابت نہیں ہوا اور انہوں نے سرکار کی خدمت گذاری محبت سے کی نہ کہ خوف سے "[2]

---

[1] ملاحظہ ہو۔ کتاب راجگان پنجاب کا صفحہ ۳۷۴۔

[2] تذکرہ روسائے پنجاب جلد دوم، ص ۶۷۵

(۵۱)

مہاراجہ کپورتھلہ

۱۸۵۷ء میں سرکار انگریزی کے طرفدار رہے تھے غدر شروع ہونے کی خبر آتے ہی راجہ رندھیر سنگھ جی کپورتھلہ نے اپنے چھوٹے بھائی کنور بکرام سنگھ کو ساتھ لے کر مع فوج و سپاہ جالندھر کی طرف کوچ کر دیا اور شہر دہلی کے فتح ہونے تک دوآبہ جالندھر پر قبضہ رکھنے میں جہاں ہماری فوج بالکل نہ ہونے کے قریب تھی سرکار کی امداد کی راجہ رندھیر سنگھ ستلج کے شمالی علاقہ جات میں ایک سربرآوردہ سکھ رئیس تھے اور ان کی اس مخلصانہ اور دلی وفاداری سے ملک میں نہایت مفید سیاسی اثر ہوا راجہ کو اس عمدہ کارگذاری کے صلہ میں راجہ راجگان کا خطاب عطا ہوا اور ان کے ذمہ کے خراج میں ۲۵۰۰۰ روپیہ سالانہ کی تخفیف کر دی گئی ۱۸۵۸ء میں پنجاب میں امن و امان ہو جانے کے بعد راجہ رندھیر سنگھ صاحب کو اجازت ملی کہ وہ اپنی سپاہ کا کنٹنجنٹ ملک اودھ کو لے جائیں اور وہاں کے پرشورش ضلعوں کے اندر امن و امان قائم کرنے میں حصہ لیں چنانچہ راجہ صاحب مع اپنے بھائی کے دس ماہ کے عرصے تک اودھ کے میدان جنگ میں شریک رہے اور چھ بڑی بڑی لڑائیوں میں دشمن کا دلیرانہ مقابلہ کیا بیان کیا جاتا ہے کہ اس طویل عرصے میں راجہ صاحب نے کبھی نقصان یا خوف کی پروا نہ کی اور ہمیشہ اپنی فوج کے سر پر موجود رہے یہی سبب تھا کہ ان کی فوج نے ہر ایک موقع پر بہادری سے لڑ کر فن سپاہ گری میں بہت اچھا نام پیدا کیا ان اعلےٰ خدمات کے صلہ میں راجہ صاحب کو ملک اودھ کے دو ضبط شدہ محلات بونڈی واقع ضلع بہرائچ اور بھیتولی واقع ضلع بارہ بنکی میں استمراری حقوق عطا ہوئے جن محلات کی سالانہ آمدنی ۴۲۵۰۰۰ روپیہ تھی اور چونکہ راجہ جی کے بھائی کنور بکرام سنگھ جی بھی ان کے ہمراہ اودھ گئے تھے اور لڑائی کے میدان میں بڑی بہادری اور شجاعت کا ثبوت دیا تھا لہٰذا کنور صاحب موصوف کو بھی ضلع بہرائچ کے تعلقہ اکونا کا ایک حصہ عطا ہوا جس کی آمدنی ۴۵۰۰۰ روپیہ سالانہ تھی اگرچہ ابتداءً ۱۸۶۹ء میں سر ہنری ڈیوس صاحب بالقابہ چیف کمشنر اودھ کے ارشاد نمبر کے رو سے راجہ جی نے

ان کا علاقہ تو خود لے لیا اور کنور بکرام سنگھ جی کو اُس کی بجائے اضلاع رائے بریلی اور لکھیم پور میں ۵۵۰۰۰ روپیہ کی دیگر اراضیات خرید دیں ۱۸۸۱ء میں گورنر جنرل کشور ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ ان اراضیات پر کنور بکرام سنگھ اور ان کی اولاد کا قبضہ دائمی اور نسلاً بعد نسلٍ رہے گا بعد ازاں لیجسلیٹو کونسل نے اسی مطلب کا ایک ایکٹ (قانون) بھی پاس کر دیا جو بکرام سنگھ اسٹیٹ (ایکٹ ۱۰ ۱۸۸۳ء) کہلاتا ہے[1]

(۵۲)

ریاست کلسیہ

سری لہنا سنگھ جی نے ۱۸۵۷ء میں اچھی خدمت انجام دی اور ایک سو آدمیوں کی جمعیت جنہیں کی جس کو اودھ میں بھیجا گیا دہلی کے اوپر کی طرف دریائے جمنا کے بعض گھاٹوں کی حفاظت کرنے میں بھی انہوں نے امداد کی اور مقام دادوپور میں ایک پولیس چوکی پر قابض رہے اور تیز کا رکار- انبالہ اور فیروزپور کے مابین بڑی بڑی سڑکوں پر پہروں کے لیے آدمی مہیا کیے سری سوبھا سنگھ جی کے صاحبزادے سری سردار لہنا سنگھ جی کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا اور ان کی جگہ سری سردار بشن سنگھ جی جو ابھی نابالغ تھے تخت نشین ہوئے سری بشن سنگھ کی شادی متوفی راجہ صاحب جھیند کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی[2]

(۵۳)

مہاراجہ کشمیر

گورنر جنرل مع کونسل مہاراجہ رنبیر سنگھ والی کشمیر کا بڑی خوشی کے ساتھ شکریہ ادا کرتے ہیں - انہوں نے عین وقت پر میجر لارنس کے ماتحت جموں کنٹینجنٹ کو دہلی بھیجکر امداد کی، کشمیر کے فرمان روا نے بے ریا صادق دوست ہونے کا طریقہ قائم رکھا ہے[3]

---

[1] تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، ص ۶۹
[2] تذکرہ رؤسائے پنجاب جلد دوم، ص ۷۱
[3] تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۶۵۹

باب ۵۴

لٹیرے تاج شہریاری پہنتے ہیں

۱۸۵۷ء کا غدر ختم ہوگیا، دلّی پر، دلّی والوں پر، ہندوستان پر، اہلِ ہند پر، جو آفتیں ٹوٹیں جو مصائب نازل ہوئے، جن تباہیوں کا نزول ہوا وہ جگر خراش داستان، اپنے موقع پر بیان ہوچکی ہے، اب یہ دیکھیے کہ شکاری شہریار کیونکر بنتا ہے؟ لٹیرا مسندِ شہریاری پر کس طرح متمکن ہوتا ہے؟ غاصب تختِ خسروی پر کس طرح قابض ہوتا ہے؟

انگریز اس دیس میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، مغل فرماں رواؤں کی عنایات و مدارات کے باعث انھیں کچھ خصوصی حقوق بھی حاصل ہوگئے، رفتہ رفتہ، اپنے جوڑ توڑ، سازش، خدع و مکر، اور فریب سے، وہ اس ملک کی سب سے بڑی طاقت بن گئے۔ انھوں نے اس ملک کے بادشاہوں کو ختم کیا، ریاستوں کو ضبط کیا، راجوں، مہاراجوں، نوابوں، سرداروں اور امیروں کو مبتلائے مصائب کیا۔ سپاہیوں کو، شہر میں رہنے والوں اور دیہات میں بسنے والوں کو تاراج کیا،

ایک دلّی کا لال قلعہ اب تک سلامت تھا، اب غدر کے بعد وہ بھی نہ رہا، اس قلعہ میں آلِ تیمور کا آخری فرد ــــ بہادر شاہ ظفر ــــ ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھا یادِ الٰہی میں مصروف تھا، اسے "باغی" قرار دیا گیا، پھر جلاوطن کرکے برما بھیج دیا گیا، جہاں کسمپرسی کے عالم میں ایک روز وہ اس جہان گزاری سے رخصت ہوگیا۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تُو نے اے بادِ صبا
یادگارِ شمعِ تھی محفل میں پروانے کی خاک

بہادر شاہ کو جلاوطن کرنے کے بعد، انگریز، اس ملک کے بادشاہ بن گئے۔
بادشاہ بننے کے بعد، یاجوج فرنگ نے اپنی دھاک کس طرح بٹھائی؟ ان الفاظ کے طلسم میں لوگوں کو کس

طرح اسیر کیا؟ داب خسروی، اور جلال شہریاری اور وقار شاہی کا کس طرح استعمال کیا، یہ بڑی لمبی داستان ہے اسے مختصر کریں، تو چند تصویریں نظر آتی ہیں،

شاہی میگنا چارٹا ———— یعنی ملکہ وکٹوریہ کا وہ اعلان جو، غدر کے بعد، رعایائے ہند کے نام شائع ہوا اور جس میں عفو عام کی بشارت، مساوات کی نوید اور عدل عام کی خوشخبری دینے کے باوجود تقریباً ایک سو سال تک ہندوستانیوں کو مبتلائے عذاب رکھا گیا، یہ تاریخی دستاویز ہے اور تاریخ غدر کا مؤرخ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا،

۱۸۷۱ء میں ڈیوک آف اڈنبرا کی تشریف آوری، تاکہ "شاہی" رعب داب اہل ہند اور والیان ریاست پر قائم رہے۔

۱۸۷۷ء کا دربار قیصری ———— یہ اس بات کا اعلان تھا کہ، اب انگریز اس ملک کے بادشاہ ہیں اور یہاں کے تمام والیان ریاست خواہ انفرادی طور پر وہ کتنے ہی باشرف اور ان کے خدمات کتنے ہی عظیم و جلیل کیوں نہ ہوں شاہ انگلستان کے ماتحت، باج گزار اور تابع فرمان ہیں، اس دربار کی تفصیل ایک مستقل درس عبرت ہے، جو ایک خوددار وطن دوست کا خون کھولا دینے کے لیے کافی ہے۔

۱۹۰۴ء کا دربار تاجپوشی ———— یہ گویا ۱۸۷۷ء کا تتمہ تھا، اس دربار میں ایڈورڈ ہفتم نے انگلستان سے آکر شرکت کی تھی، اس کی تفصیل وقت کے مشہور مؤرخ، مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ نے، اپنی کتاب یاد ایام میں درج کی ہے،

اب ہم آئندہ صفحات میں، علی الترتیب یہ تصویریں پیش کرتے ہیں:۔

شاہی میگنا چارٹا مرقومہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء

وکٹوریہ بفضل خدا وارث سلطنت متحدہ گریٹ برٹین و آئرلینڈ مع مضافات و متعلقات جو یورپ ایشیا، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا میں واقع ہیں۔ حامی دین۔ ہرگاہ کہ ہم نے بباعث چند در چند قوی وجوہ کے بصلاح و رضامندی علماء و فضلائے دین و عمائد و اکابران مملکت، و وکلائے رعایا جو مجلس پارلیمنٹ میں مجتمع ہوتے ہیں۔

ممالک ہندوستان کی حکومت کو جو اب تک ہماری طرف سے امانتاً زیر انتداب دی آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلی اپنے قبضہ و تسلط میں لینے کا مصمم ارادہ کیا ہے اس واسطے اب بذریعہ اعلان ہذا مشتہر کیا جاتا ہے کہ بصلاح و رضامندی مذکورۃ الصدر ممالک مذکورۂ ہند کی عنان حکومت ہم نے اپنے دست قدرت میں لے لی ہے اور ممالک مذکورہ میں ہماری رعایا سے یہ ارشاد کیا جاتا ہے کہ وہ سچی وفادار اور صادق مطیع ہماری اور ہمارے جانشین و ثناد کی بنی رہے اور جن اشخاص کو ہم وقتاً فوقتاً ممالک مذکورہ کے انتظام و انصرام کے واسطے اپنی طرف سے اور اپنے نام سے مقرر کریں اُن کی اطاعت اختیار کرے۔

چنانچہ ہم نے اپنے معتمد عزیز بھائی اور مشیر چارلس جان والی کونٹ کیننگ کی فراست اور لیاقت ذخیرگالی پر خاص یقین و اعتبار کر کے مومی الیہ کو ممالک متذکرہ پر عموماً ہمارے نام سے اور ہماری طرف سے حکومت اور فرمان دہی کے اختیارات دیئے، اور انھیں اپنا اول نائب السلطنت اور گورنر جنرل مقرر کیا اور تمام عہدہ داران اور افسران جنگی اور ملکی جو اب تک آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے، زیر اطاعت ہماری خوشنودی اور قواعد اور قانون کے جو آئندہ نافذ ہوں، مقرر ہوئے اور ہم تمام رؤسائے ہند کو مطلع کرتے ہیں کہ تمام عہدنامجات و معاہدات جو مابین اُن کے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تھے ہم مقبول و منظور کرتے ہیں۔ پوری احتیاط کے ساتھ اُن کی پابندی کی جائے گی اسی طرح اُن کی جانب سے بھی اُن کی تکمیل و تعمیل کی امید ہے۔

ہم کو ممالک مقبوضہ موجودہ کو وسعت دینے کی خواہش نہیں ہے اور جب ہم اپنے حقوق اور ممالک پر کسی طرح کی دست درازی اور بدانتظامی برداشت نہیں کر سکتے تو دوسروں کے حقوق پر بھی کسی طرح کا تجاوز نہ روا رکھیں گے۔

رؤسائے ہند کے حقوق و دولت اور توقیر و منزلت کا ہم ایسا ہی لحاظ رکھیں گے جیسا کہ خاص اپنا۔ اور ہماری خواہش ہے کہ وہ اور نیز ہماری رعایا اس خوشحالی اور تمدنی ترقی کا حظ اٹھائیں جو اندرونی امن اور حسن انتظام سلطنت سے میسر آ سکتی ہے۔

ممالک ہندوستان کے باشندوں کی نسبت ہم اپنے تئیں انھیں فرائض کا پابند کرتے ہیں جیسا کہ ہم اپنی دیگر رعایا کی نسبت پابند ہیں اور ان فرائض کو بہ یمن خداوند کریم ہم ایمان داری اور دیانت داری سے ادا کریں گے۔

ہم کو اپنے دین عیسوی کا ایمان واثق ہے اور مذہبی تشفی کے ہم شکر گزاری کے ساتھ معترف ہیں۔ مگر ہمارا منشا یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ایمان کو اپنی رعیت پر ٹھونسیں، للذا ہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری شاہانہ خوشنودی اور مرضی یہ ہے کہ مذہبی رسوم اور دینی عقائد میں تمام اشخاص مساوی قانونی حفاظت سے متمتع ہوں گے اور جو لوگ ہمارے ماتحت اور صاحب اختیار ہوں گے اُن کو یہ ہمارا سخت حکم ہے کہ وہ ہماری کسی رعایا کی مذہبی رسوم و پرستش میں کسی طرح کی دست اندازی سے باز رہیں ورنہ نہایت ناخوشنودی کے مستوجب اور مورد عتاب ہونگے

مزید براں ہماری مرضی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری رعایا کو بالالحاظ نسل و قوم آزادانہ ہماری ملازمت میں عہدے دیئے جائیں جس کے فرائض وہ اپنی علمیت لیاقت و دیانت سے انجام دے با حسن الوجوہ اس کے جو محبت باشندگان ہند کو اپنے ملک سے ہے اُس کو ہم بخوبی جانتے ہیں اور ملحوظ رکھتے ہیں پس ان کے تمام حقوق ہم محفوظ رکھیں گے۔

ان خرابیوں اور مصیبتوں کا جو ہندوستان پر من چلے لوگوں کے افعال کی بدولت آئیں اور جھنوں نے جھوٹی خبروں سے اپنے ابنائے وطن کو دھوکا دے کر کھلی بغاوت پر ابھارا ہم کمال افسوس کرتے ہیں میدان جنگ میں اس بغاوت کے فرد کرنے میں ہماری طاقت کا اظہار ہو چکا ہے مگر اب ہم اُن لوگوں کے جرائم جو دھوکے میں پڑ گئے تھے اور اب اپنے فرائض بجا لانے کے متمنی ہیں معاف کر کے اپنے رحم و کرم کا اظہار کرتے ہیں

اب بھی ایک صوبہ اودھ میں شورش باقی ہے اس خیال سے کہ مزید خون ریزی کا سدباب ہو اور ہماری مملکت ہند میں جلد امن و امان قائم ہو جائے جو ہمارے نائب السلطنت گورنر جنرل نے ان اشخاص کو جو گذشتہ ناگوار غدر اور بلوے میں ہماری گورنمنٹ کے خلاف مرتکب جرائم ہوئے تھے خاص خاص شرائط سے وعدہ معافی دیا ہے اور ان اشخاص کی نسبت کسی شخص سے کسی طرح کی رو رعایت نہ کی جائے جن کے جرائم معافی کی زد سے باہر ہیں، ان کے لیے وہ سزا تجویز کردی ہے جو اُن پر عائد کی جائے گی ہم اپنے نائب السلطنت اور گورنر جنرل کے مذکورہ بالا فعل کو نظر استحسان سے ملاحظہ فرماتے اور منظور کرتے ہیں۔ مزید براں ہمارا ارشاد اور اعلان حسب ذیل ہے:۔

ہماری مراعات کو تمامی مجرمین تک توسیع دی جائے گی بجز اُن مجرموں کے جن کی براہ راست شرکت انگریزی رعایا کے قتل میں ثابت ہو چکی ہے یا آئندہ ہو ایسے اشخاص کی نسبت جو بغاوت

میں سرغنہ اور بانی مفسدہ تھے اُن کی نسبت سزا تجویز کرتے وقت اُن حالات کا جن کے باعث وہ حلقہ اطاعت و انقیاد اتار پھینکنے پر آمادہ ہوئے تھے بخوبی لحاظ کیا جائے گا اور اُن اشخاص کی نسبت جن کے جرائم بسبب سریع الاعتقادی ایسی جھوٹی خبروں کے مان لینے کے ہیں جو مفسدہ پرداز لوگوں نے پھیلائیں۔ واقع ہوئے بڑی رعایت اور فراخدلی کی جائے گی تمام دوسرے اشخاص کو جنھوں نے سرکار کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے ہم بذریعہ اعلان ہذا تمام جرائم سے جو اُن سے برخلاف مابدولت ہمارے (تاج وتخت) اور ہماری قدرومنزلت کے سرزد ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے آنے اور پُرامن کاموں میں مشغول ہونے پر بلا شرط معافی اور عفو تقصیر کا اقرار فرماتے ہیں۔

ہماری شاہانہ خوشنودی یہ ہے کہ رحم وکرم اور جان بخشی کے شرائط ان تمام لوگوں تک وسیع کی جائیں جو آئندہ پہلی جنوری تک ان شرائط پر کاربند ہوجائیں۔ جب خدا کے فضل سے اندرونی امن چین پھر قائم ہوجائے گا اس وقت ہندوستان کی صنعت وحرفت اور دستکاری کو ترقی اور عامہ خلائق کے رفاہ اور فلاح کے کاموں کو وسعت دینے کی کوشش کرنا ہمارا منتہائے نظر ہے اُن کے فارغ البالی میں ہماری قوت ہے ان کی خوشنودی اور رضامندی میں ہمارا استحکام اور ان کی احسان مندی اور شکرگزاری ہمارا بہترین معاوضہ ہے۔ خدائے قادر مطلق ہم کو اور ہمارے ماتحت صاحبان اختیار کو ہماری رعایا کی بہبودی اور ہماری اُن خواہشوں کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

اس اعلان کے نفاذ کے بعد گورنر جنرل کا لقب اب وائسرائے یعنی نائب السلطنت قرار پایا اور کمپنی کا لشکر شاہی لشکر میں ضم ہوگیا اگرچہ اس انتظام کو عملی لباس پہنانے میں ایک حد تک تاخیر اور دقتیں عمل میں آئیں کیونکہ یورپین سولجروں نے بدوں انعام ملنے کے اس تبدیلی سے انکار کیا اور یہ ایک قسم کا بلوہ تھا جو (گوروں کے بلوے) کے نام سے مشہور ہے ممکن ہے کہ اس کی بناوہ ممسکانہ سلوک ہو جو محاصرہ دہلی کے بعد کیا گیا تھا یعنی یہ لوگ منہ پھیلائے بیٹھے تھے اور وہاں نکلے ڈھاک کے تین پات، خیر سبب کچھ بھی رہا ہو بہتوں نے شاہی لشکر کی شرکت سے دست کشی کی اور نوکری چھوڑ کر الگ ہوگئے آخر کار ۱۸۶۱ئ میں معاملہ سلجھ گیا ان لوگوں کو رقم انعام مل گئی اور جو لوگ سرکاری فوج میں شامل ہوئے اُن کے ساتھ یہ رعایت بھی کی گئی کہ کمپنی کا زمان ملازمت پنشن میں محسوب کرلیا گیا۔

مقتولین غدر کی یادگار میں ان کے ساتھیوں نے ۱۸۷۰ء میں پہاڑی پر ایک مینار بنوایا جو "میوٹنی موریل" کے نام سے مشہور ہے ۱۸۶۵ء میں کلکتے کے بشپ صاحب (لاٹ پادری) ڈاکٹر کاٹن نے عیسائی مقتولین غدر کی یادگار میں سینٹ سٹیفن کے گرجا کا سنگ بنیاد رکھا اس گرجا کا افتتاح قتل کی دسویں برسی کے دن دسویں مئی ۱۸۶۷ء کو ہوا۔ ترویج اشاعت انجیل مقدس کی سوسائٹی ۱۸۵۴ء سے قائم تھی جس میں ایک پادری اے آر ہبرو کیمبرج یونیورسٹی مشن کے غدر میں مارے گئے۔ غدر کے بعد مشن پھر قائم ہوا اور ۱۸۸۰ء میں کیمبرج یونیورسٹی مشن اس میں ضم ہوگیا، دلی میں ۱۸۱۳ء سے بپٹسٹ مشن بھی قائم ہے اور پادری جے میکے صاحب نے دریا گنج میں مشن کی حفاظت میں بڑی جواں مردی دکھائی مگر آخر کار باغیوں نے انھیں پکڑ کر مار ڈالا۔

دلی کی آبادی ۱۸۴۷ء میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی لیکن غدر کے سبب سے ایکدم بیس ہزار گھٹ گئی۔ غدر کے بعد لوگ پلٹنے شروع ہوئے مگر آہستہ آہستہ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں کہیں جا کر ۱۸۴۷ء کی تعداد پوری ہوئی اس کے بعد تیس برس کی مدت میں اور پچاس ہزار آدمی سمٹ آئے اور اب دلی تجارت کا ایسا بڑا بھاری مرکز ہے کہ ہندوستان کے سارے شمالی حصہ کی سربراہی یہیں سے ہوتی ہے؟

ڈیوک آف ایڈنبرا کی تشریف آوری

۱۸۷۵ء میں ملکہ معظمہ نے اپنے دوسرے صاحب زادے ڈیوک آف ایڈنبرا کو سیاحت ہندوستان کے لیے بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کے رؤسا و امرا اور والیان ملک سے مل کر خاندان شاہی سے سلسلہ روابط کا ملاقات ذاتی سے مستحکم کریں ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

"ایلبرٹ ایڈورڈ شاہزادہ ویلز کا ورود مسعود ہندوستان میں"

؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اواخر ۱۸۷۵ء میں حضور ملکہ معظمہ کے ایما پر آپ نے سیاحت کا قصد فرمایا تاکہ ہندوستان کے والیان ملک امرا و رؤسا سے براہ راست تعارف ہو کر سلطنت میں استحکام پیدا ہو دوسرے سرزمین ہندوستان جنت نشان کو بہ نفس نفیس ملاحظہ فرمائیں جو مقبوضات برطانیہ کا ایک بیش بہا جواہر ہے اور اس طرح جس ملک کی حکومت دست قدرت میں آنے والی ہے اُس سے ذاتی واقفیت حاصل کریں آپ کے اخراجات کے لیے پارلیمنٹ سے ایک لاکھ پونڈ کی گراں قدر رقم منظور ہوئی آپ کا قدم مبارک مع اسٹاف کے ۹ رنومبر ۱۸۷۵ء کو ساحل بمبئی پر پرتو افگن ہوا جہاں ہز اکسلنسی گورنر صاحب بہادر نے مع حکام والیان ریاست امرا و رؤسا آپ کا شان دار استقبال کیا آپ گورنمنٹ ہاؤس میں رونق افروز رہے، تمام راستے دو رویہ جھنڈیوں، پھریروں اور مصنوعی دروازوں سے آراستہ تھے آپ کے دیدار کے لیے سڑکوں پر دو طرفہ اور کوٹھوں پر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ بمبئی کے مشہور مقامات کو ملاحظہ فرمایا اور بڑی بڑی دعوتیں اور جشن ہوئے والیان ریاست اور بڑے بڑے امرا کو شرف باریابی حاصل ہوا اس کے بعد

صُوبہ ہائے۔ مدراس۔ کلکتہ۔ یو۔ پی۔ پنجاب حیدرآباد دکن۔ میسور۔ بڑودہ اور دوسری مشہور ریاستوں کی سیر میں تقریباً سوا چار مہینے صرف ہوئے۔ ہر جگہ گورنمنٹ اور پبلک کی طرف سے شاہانہ استقبال اور مراتب مہمان داری ادا ہوئے۔ رعایا نے اپنی آنکھیں فرش راہ کیں اور اپنی غایت درجے کی اطاعت فرماں برداری۔ وفاداری اور حسن عقیدت کا ثبوت دیا دہلی میں آپ کی تشریف آوری پر نہایت شاندار جلوس کے علاوہ بڑا بھاری فوجی ریویو اور دیوان خاص میں ایک بڑا بال ہُوا جس میں ملکہ معظّمہ کا جام صحت بڑی گرم جوشی سے نوش کیا گیا۔ لاہور کے چار روزہ قیام میں بھی یہی دھوم دھام رہی مشہور مقامات کی سیر کرائی گئی، والیان ریاست سے ملاقاتیں ہوئیں میونسپلٹی نے خیر مقدم کا ایڈریس گزارنا حضور نے سپاہیوں کی ایک نمائش کا افتتاح فرمایا۔ شالامار باغ میں روشنی اور گارڈن پارٹی کا لُطف اُٹھایا جس کے بعد جموں تشریف فرما ہُوئے جہاں بڑے اعلیٰ پیمانے پر خاطر تواضع ہوئی اور سات میل آگے بڑھ کر مہاراجہ صاحب نے استقبال فرمایا اور وقت مراجعت نذر کے علاوہ بہت سے بیش بہا گراں قدر تحائف پیش کیے جس میں ایک مرصّع تلوار بھی تھی جسے پیش کرتے وقت ہز ہائینس نے فرمایا کہ "اگر اس کا تجربہ کرنا ہو تو یہ گردن حاضر ہے" اس مخلصانہ اظہار عقیدت کا حضور ممدوح پر ضرور اثر پڑا ہوگا۔

الگزینڈرا پُل کا افتتاح: ۔جموں سے واپسی پر سواری مبارک وزیر آباد دریائے چناب کے پُل کے لیے تشریف لے گئی جو ریلوے نے باون لاکھ کے صرفہ سے تیار کرایا تھا وہاں ایک کمرے کے چاروں طرف یہ فقرے درج تھے:۔

(۱) خدا ملکہ معظمہ کو سلامت رکھے۔

(۲) خدا پرنس آف ویلز کو برکت دے۔

(۳) خدا کرے الگزینڈرا مشرق و مغرب کے اتّحاد کا باعث ہو۔

(۴) اے سمندروں کے بادشاہ کی بیٹی چناب تیری ملکیت ہے۔

آخری دو فقرے حضور کے دل میں کھُب گئے کیونکہ شاہ ڈنمارک جو آپ کے خسر تھے سمندروں کے بادشاہ کہے جاتے تھے۔ دریا کے پُل پر یہ قطعہ بھی تھا

قطعہ

بازبکشا والبرٹ ایڈورڈ — چوں الکزینڈر رائل محکم
یادگارِ زحضرت ایڈورڈ — سال تاریخ آں نوشت رقم

یہاں سے امرتسر کا ملاحظہ ہوا جہاں باشندگان شہر اور دیسی عیسائیوں نے خیر مقدم کا ایڈریشن پیش کیا، الغرض ہندوستان کے مختلف مقامات کی چار مہینہ چار دن سیر فرما کر ۱۳/ مارچ ۱۸۷۶ء کو خیر و خوبی کے ساتھ آپ بندرگاہ بمبئی سے نہضت فرمائے انگلینڈ ہوئے، آپ ہندوستانیوں کی بے ریا اور مخلصانہ گرم جوشی کا گہرا اثر دل پر لے گئے ہندوستان کے سفر کے بعد ولایت پہنچ کر آپ نے اُس شاندار استقبال کے موقع پر جو وہاں کے لوگوں نے حضور اقدس کا کیا تھا زبان مبارک سے یہ ارشاد فرمایا کہ "اگرچہ آپ صاحبوں کو دلی محبت کے باعث میرے اس دُور دراز سفر کی تکالیف کا خیال رہا ہوگا مگر اصل یوں ہے کہ ایسے سفر کو بہت ہی خوش آیند و شیریں کہنا چاہیے جس کا انجام ایسا مسرت انگیز ہو جیسا کہ آپ نے دلی خلوص سے میرا استقبال کیا ہے۔"

۱۸۷۷ء کا دربارِ قیصری

لیڈی بٹی بالفور نے اپنی تاریخ کی کتاب لارڈ لٹنز میں

میں اس دربار کے اغراض و مقاصد کا حال نہایت عمدگی سے لکھا ہے جس کا لب لباب یہ ہے:-

ملکہ کا نیا خطاب

جب ہندوستان کا نظم و نسق ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر بادشاہ وقت کے دست قدرت میں منتقل ہوا تو رعایائے ہند اور باج گزار رؤسا کی نگاہ میں معلوم ہوا کہ حکومت اب براہ راست ایک مقتدر وجود انسانی کے دست قدرت میں منتقل ہوئی ہے یہ تبدیلی ان کی مرغوب طبع اور بالکلیہ اُن کے قدیم خیالات کے موافق تھی۔

انگریزی لفظ کوئین کے مترادف اردو کا (سیدھا سادا) لفظ صرف ملکہ تھا جو بالعموم ہز ہائینس کی خاتون کو دیا جاتا ہے اور اس لیے محض ملکہ کا لفظ انگریز بادشاہ ہند کے حقیقی مرتبے (وقعت) کے لحاظ سے نامناسب تھا۔ بلحاظ اُن تعلقات کے جو ریاستوں اور دیگر ممالک ہند سے ملکہ معظمہ کے تھے صرف شہنشاہ یا بادشاہ ہی مناسب و حسب حال تھا اور یہی لفظ ہندوستانیوں کی زبان پر بھی چڑھا ہوا تھا اور وہ اُسی سے مانوس بھی تھے اور ان کے نزدیک موثر اور باوقعت بھی تھا۔ کسی مناسب اور باموقع لقب کی تلاش نے ایک عرصہ سے پریشانی میں ڈال رکھا تھا۔ ہندوستان کے حکام کو اس شدید ضرورت کا احساس روز بروز بڑھتا جاتا تھا ۱۸۷۵ء میں شاہزادہ ویلز کی تشریف آوری کے اثناء میں مختلف واقعات کچھ ایسے پیش آ گئے کہ اب اس مسئلہ کا تصفیہ ناگزیر ہو گیا لارڈ نارتھ بروک نے تحریک کی کہ واقعات کی مطابقت۔ دستاویزات سرکاری کی طرز تحریر اور معمولی مروجہ طرز بیان کے لحاظ سے حضور ملکہ معظمہ کو بادشاہ ہند کے لقب سے مخاطب کرنا مناسب ہوگا یعنی بشمول والیان ہند سب سے بڑی حکمران طاقت۔

چنانچہ یہ سلسلہ ۱۸۷۶ء کی پارلیمنٹ کے اجلاس میں پیش ہوا، اگست ۱۸۷۶ء تک نئے خطابات کی

منادی کی اسکیم مرتب ہوگئی اور والسرائے کی کونسل سے دلی تائید کے ساتھ منظور ہوئی، نئے خطابات کا ترجمہ ملکی زبان میں کیا ہونا چاہیے تھا یہ معاملہ بہت قابل غور اور شورہ طلب تھا گورنمنٹ ہند نے قیصر ہند کا لقب پسند کیا جو مختصر اور بھاری بھر کم ہونے کے علاوہ ایسے شاہی اوصاف پر حاوی تھا جس کی تلاش تھی مزید برآں یہ ایک ایسا خطاب تھا جو قدرت کی خصوصیت رکھتا تھا۔ روم کے شہنشاہ کو بھی قیصر روم سے مخاطب کیا جاتا تھا اور اب بھی کل وسط ایشیا میں شہنشاہ کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔

دلی کی تجویز اس امر کا تصفیہ کیا گیا کہ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ایک بڑے بھاری مجمع میں دہلی کے تاریخی مقام پر اس نئے خطاب کا اعلان کیا جائے جس میں ہندوستان کے کل صوبوں کے افسر جس میں بارہ سو سولین اور پندرہ ہزار نہایت آراستہ و پیراستہ برٹش اور جواڑوں کی فوج (۷۷) والیان ریاست جو قائم مقام ہیں، ایک وسیع سلطنت کے جو برٹین فرانس اور جرمنی کے مجموعی رقبے کے مساوی ہے، اس کے علاوہ تین سو امراد رؤسا و معززین بھی مدعو کیے گئے تھے۔ کل ملا کر اڑسٹھ ہزار لوگ بلائے گئے تھے جو درحقیقت اس مبارک تقریب میں شریک بھی ہوئے جن کا دتی اور اس کے گرد و نواح کے کیمپوں میں پورے چودہ دن تک مجمع رہا۔

دربار شاہی جو دہلی میں منعقد ہوا تھا اس سے غرض یہ تھی کہ اعلیٰحضرت ملکہ معظمہ نے جو خطاب قیصرۂ ہند اختیار کیا ہے اس کا اعلان شان و شوکت کے ساتھ ہو جائے جن ملکی تغیرات کے سبب ہند میں انگریزی سلطنت قائم ہوئی ہے وہ بالطبع اس امر کے مقتضی تھے کہ ایسا ایک دربار منعقد ہو۔

جلسہ قیصریہ اٹھارہ برس گذرے کہ جزائر برطانیہ کی ملکہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور جلسہ قیصریہ دہلی سے اس بات کی پختگی ہوگئی۔ ملکہ معظمہ یوں تو پہلے شہنشاہ ہند تھیں مگر اب انھوں نے قیصرۂ ہند کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ اس قسم کا جلسہ ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں ہے یہ رسم یہاں قدیم سے چلی آتی ہے، جب کبھی کوئی نئی سلطنت قائم ہوئی یا کوئی نیا سلطان اعظم تخت سلطنت پر متمکن ہوا ہے تو اس ملک کے سارے راجہ اور فرمانروا اسی طرح جمع ہوئے ہیں۔ ایسے جلوس کا حال رامائن اور مہابھارت میں مذکور اور آج تک مشہور ہے۔ راجپوتوں کے زمانے میں ایسے جلوسوں کا راج سیوجگ اور اسو میدھ جگ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے عہد میں اس قسم کی تقریب دربار یا جشن کہلاتی ہے۔

قلمرو ہند میں دہلی سے بڑھ کر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہند کی شہنشاہی کا جشن کرنا موزوں ہو، یہ شہر ایسے مقام کے قریب واقع ہے کہ اس سے قدیم تر ہند میں شاید ہی کوئی مقام ہو، ہند کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس کے ساتھ اس شہر کا کوئی علاقہ نہ رہا ہو، خواہ راجپوتوں کا عہد سلطنت ہو خواہ مسلمانوں کا اور خواہ مرہٹوں کا ہر ایک کے ذکر کے ساتھ اس کا تذکرہ ضرور آئے گا، اس کے کوچوں اور بازاروں کی بنیاد تاریخی زمانے کے آب و گل سے پڑی ہے اور ان کی حکائتیں صفحۂ تاریخ پر موجود ہیں۔

اس کے گرد نہایت قدیم زمانے کے آثار نظر آتے ہیں جن کو پرانے سے پرانے شہر کے ساتھ ہم عصری کا دعویٰ ہے اس کے ڈھیروں تلے شہر اندرپرست کی خاک دبی ہوئی ہے راجہ اور امیر اور وہ انبوہ کثیر جن کا یہ مسکن تھا سب خاکستر ہو گئے مگر ان کے افسانے اب تک مہابھارت میں باقی ہیں ؎

ہم نے مانا صحبتیں اگلی فسانہ ہو گئیں
اے فلک یہ تو بتا دے وہ فسانہ کیا ہوا

دلّی کی تاریخی حیثیت

دہلی اور اس کے نواح کی سرزمین شہر اندرپرست کی یادگار ہے۔ اندرپرست اور دہلی ہند کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دہلی کے جلسہ قیصری کی روداد لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے اور بعض بڑے بڑے واقعات کا حال لکھا جائے جو ان رسموں کے خاندان سے متعلق ہیں جو اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے جتنے رئیس اس عظیم الشان دربار میں آئے تھے ان میں سے ایک بھی ایسا نہ ہوگا جس کے بزرگ تاریخ ہند کے کسی نہ کسی زمانے میں اس تماشہ گاہ میں جلوہ افروز نہ ہوئے ہوں ان میں سے بعض کو یہ دعویٰ ہے کہ ان سورماؤں کی اولاد ہیں جو رامائن اور مہابھارت کے معرکوں میں صف آرا ہوئے تھے، جب سور و صیدا[1] کے تاجر پرانی تراش کے جہازے کر مشرقی سمندروں میں تجارت کے لیے آتے جاتے تھے یا جب سکندر اعظم اور اس کے ہمراہی یونانی پنجاب پر چڑھ کر آئے تھے یا جب رومی تاجروں کے جہازوں کی ہند کے بندروں میں آمد و رفت تھی۔ بعض کے بزرگوں نے راجپوتوں یا مسلمانوں یا مرہٹوں کے عہد سلطنت میں نام پا کر جاہ و اقتدار حاصل کیا

---

[1] بحیرہ روم کے مشرقی کنارے پر دو شہر ہیں جو پرانے زمانے میں بہت مشہور تھے۔

پس ان رئیسوں کو اُس زمانے کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے جس میں اس ملک کے اندر سلطنت انگلشیہ کا آغاز و عروج ہُوا اور اس سبب سے اُن رئیسوں کے خاندانوں کے افسانے انگریزوں کی تاریخ سے مِل جُل گئے ہیں۔
سلطنت انگلشیہ کے قائم ہونے سے پہلے ہند کی تاریخ میں تین بڑی سلطنتوں کے عروج و زوال کا ذکر ہے

اوّل راجپوت

دوم مسلمان

سوم مرہٹے

ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کا پرچم باری باری سے سارے ہند پر چمکا ہے اور جب زوال آیا تو یہ سلطنت عظمیٰ ٹوٹ کر کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئیں جنھوں نے اس نئی سلطنت کی اطاعت قبول کی ہند کے اکثر رئیس اِن مٹی ہوئی سلطنتوں کے یادگار ہیں۔

یہ دربار بالکل مناسب وقت پر ہُوا ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے مدت دراز تک حکمرانی کی تھی غدر ۱۸۵۷ء کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ اگر حضور ممدوحہ چاہتیں تو اُسی وقت لقب "قیصرۂ ہند" اختیار کر سکتی تھیں مگر وہ وقت مناسب حال نہ تھا کیونکہ لقب شہنشاہی کے اعلان کے ساتھ ساتھ بغاوت اور بے وفائی کا ذکر کرنا پڑتا اور اس وجہ سے ایک ایسے واقعہ کی جس سے بڑھ کر ہند کی تاریخ عہدِ انگلشیہ میں کوئی مکروہ واقعہ نہیں ہے ہمیشہ کے لیے شہرت ہو جاتی۔

دہلی کا جشن ایسے سعید وقت میں ہُوا کہ چوطرف امن و امان تھا جو غدر چھوڑ کر ساٹھ برس سے برابر قائم تھا یہ سچ ہے کہ سرحدوں پر کچھ فتنہ و فساد رہا ہے مگر ہندوستان کے اندر کبھی امن میں خلل نہیں آیا اور کسی بیرونی دشمن نے ہند میں دخل نہیں پایا۔ جلسہ قیصریہ نے ملکہ برطانیہ کو "قیصرۂ ہند" بنایا بلکہ اُس نے ملکہ ممدوحہ کو ہند کے تخت شہنشاہی پر بٹھایا۔ ملکہ کی سلطنت امن و امان کی سلطنت ہے نہ ملک کے اندر کہیں فتنہ فساد ہے نہ کسی سے پرخاش و عناد۔

دَورِ انگریزی کی خصوصیّت

ہند میں پُرانے دُشمن قوی دوست بن گئے اور اگلے زمانے کے لڑائی جھگڑے سب مٹ گئے خطاب قیصری کا اعلان صرف فتح و ظفر ہی

کا شادیانہ نہ تھا، بلکہ جو لوگ طریق اطاعت و ہوا خواہی سے منحرف ہو گئے تھے اُن کے لیے عفو قصور کا پروانہ اور اشتہار مرحمت خسروانہ کا اظہار تھا،

بعض لوگ اِس دربار کو شاہزادہ عالم و عالمیان پرنس آف ویلز کی تشریف آوری کا بہترین نتیجہ سمجھے،

ع سالیکہ نکوست از بہارش پیدا

اور خطاب قیصری کا لینا ایک مبارک فال اس امر کی تھی کہ ملکہ معظمہ کی توجہ گراں مایہ اب ہندوستان کی طرف زیادہ مبذول ہوئی ہے سب لوگوں کی خوشی اسی میں تھی کہ نئے خطابات کا اعلان حضور والسیرائے کے روبرو ہو، اِس تقریب میں سب احاطوں کے حکام ذوی الاقتدار اور رؤسائے خود مختار اور اُمرائے باوقار شریک ہوں، یہ موقع رؤسا کو اس بات کے جتانے کا تھا کہ نئے خطاب کے اختیار کرنے سے اُن تعلقات میں سرکار کے اُن سے اور رعایا کے ساتھ اُن میں کوئی ایسی تبدیلی نہ ہوگی جس سے ان کا نقصان ہو بلکہ بہبودی اور فلاح کی توقع ہے ہند کے رئیس کیا راجپوت کیا مسلمان کیا مرہٹے جنھوں نے کبھی ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھی تھی اور جن کے بزرگوں میں پشتہا پشت تک کشاچھنی رہی سرکار کے سایہ عاطفت میں اُن کو دوستانہ ملنے جلنے کا موقع ملا۔

بڑی غرض اس جشن کے انعقاد کی یہ تھی کہ کیا رؤسا کیا رعایا برایا سب کو سلک ہوا خواہی ملکہ معظمہ میں منسلک کر دیا جائے اور رئیسوں اور گورنروں انگریزوں اور ہندوستانیوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر بٹھلایا جائے اور اسی طرح اتحاد باہمی کی روح پھونکی جائے۔

شہر کے باہر شہر

دربار شہر کے اندر نہیں ہوا بلکہ شہر کے باہر ڈیروں اور خیموں کا ایک اور وسیع شہر بسایا گیا ڈیروں کا شہر کھلے میدان میں اس طرح چشم زدن میں نمودار ہو گیا جس طرح قصہ کہانیوں میں سُنا کرتے تھے کہ رات کی رات میں قلعہ یا محل بن کر طیار ہو گیا، وہ بات سچ ہو گی۔

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگار ساخت

ہر ہر کیمپ میں دائیں بائیں خیموں کی دو قطاریں اور بیچ میں چوڑی سڑک تھی بعض رؤسا کے کیمپ بہت آراستہ تھے، سڑکوں کے دو طرف ہری ہری گھانس کے علاوہ چمن بندی اور نہایت نفیس گلکاری تھی غرض یہ کہ جیسا مکین تھا ویسا ہی مکان بھی تھا وائسرائے کے کیمپ میں۔ درباری خیمہ کرپچ کا تھا۔ وہ خیمہ کیا تھا ایک شاہی محل نصف دائرے کی شکل کا آٹھ سو فٹ لمبا تھا جو وائسرائے کی تخت گاہ کے سامنے تھا اسی میں سب مہمان گورنران و رؤسا و عمائدین و معززین مع ہمراہیان اور بہت سے اعلیٰ عہدہ داروں کی نشست اسی ترتیب سے تھی کہ ہندوستانی رؤسا اور صاحبان انگریز سب کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

وائسرائے کی تخت گاہ

وائسرائے کی تخت گاہ کے پیچھے دائیں بائیں طرف دو بہت بڑے بڑے پویلینوں میں تماشائیوں کے علاوہ پرتگال کے گورنر جنرل خان قلات ممالک غیر کے کانسل۔ یورپین اور ہندوستانی معززین جو تمام ہندوستان سے سمٹ آئے تھے گرد کے وسیع میدان میں گوروں اور ہندوستانیوں کی کثیر التعداد فوج ایک وسیع حلقہ باندھے ہوئے استادہ تھی انگریزوں کی خیام گاہوں میں زیادہ تر سادگی تھی مگر راجاؤں اور نوابوں کے لشکروں میں کچھ عجیب سجاوٹ۔ رونق۔ چہل پہل۔ طمطراق تھی ہر ایک رئیس کے لشکر کے لیے علیحدہ علیحدہ جگہ نامزد کردی گئی تھی اور مہینوں پہلے سے ان کی آراستگی شروع ہوگئی تھی، بہت سے کیمپ قدیم وضع قطع کے تھے۔ جیسے سلاطین مغلیہ کے زمانے میں ہوتے تھے ان کے بعض خیمے رنگ برنگ کے زرق برق تھے جن کے ستاروں پر سنہری لٹو اور اپنے اپنے مذاق کے موافق طرح بطرح کی آراستگی و آرائش تھی۔

بانات اور مخمل کی قناتیں

اکثر لشکروں کے گرد بانات اور مخمل کی قناتیں لگی ہوئی تھیں جن کے بانسوں پر سنہری لٹو یا پھل لگے ہوئے تھے، نوابوں اور خیام گاہ کے گرد اُن کی اپنی اپنی جمعیتیں انواع و اقسام کے ہتھیاروں سے اوپچی بنی ہوئی مکمل جمع رہتی تھیں سوار ہاتھوں میں جھنڈی دار برچھے پکڑے گھوڑوں پر ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے بڑے بڑے کوہ پیکر ہاتھی اُن پہ ہودے عماریاں کی ہوئی مغرق جھولیں پڑی ہوئیں گھنٹے ٹنٹناتے ہوئے طرح طرح کے ساز و سامان سے بنے سنورے ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے اور اسی طرح شتر سوار اور سانڈنی سواروں

کی بہار تھی غرض ان لشکروں میں ہر وقت بڑی رونق اور چہل پہل رہتی تھی۔ اکثر بینڈ باجے بجتے رہتے تھے یا تاشوں نوبت نقاروں ڈنکوں کی صدا گونجتی رہتی تھی پھر بھی وہ غل شور نہ تھا جو ایسے موقعوں پر یورپ کے ملکوں میں ہوتا ہے، ہند کے لوگوں کا خاصہ یہ ہے کہ کیسا ہی عالم سرور و انبساط کیوں نہ ہو اور کتنا ہی جوش ولولہ طبیعت کو کیوں نہ ابھارے یہ کبھی اپنی ثقاہت و متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور طبیعت کو قابو سے باہر نہیں ہونے دیتے۔

جہاں گولے برستے تھے

انگریزوں کے لشکر اس مقام پر تھے جہاں غدر میں شہر پر گولے برستے تھے اور دوسری طرف وہ نہر تھی جو نجف گڈھ کی جھیل سے نکلتی ہے یہ منظر دیکھ کر بے اختیار غدر کا خیال دل میں موج زن ہوتا ہے اور جو تغیرات عظیم اس زمانے میں ہوئے ہیں سب نظروں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ یہی مقام جو غدر میں گوروں اور کالوں کا میدان کارزار تھا آج گل گلزار پُر بہار تھا جنگل میں منگل ہو رہا تھا انگریز و ہندوستانی باہم دوستانہ ملاقاتیں کر رہے تھے جہاں گولوں اور گولیوں کا مینہ برس رہا تھا، رات دن اب سرور انبساط کا دفور تھا۔ وائسرائے کے نزول اجلال سے دو دن پہلے ہر ایک علاقہ کے لوگ اپنے اپنے کیمپوں میں آنے شروع ہوئے خاص دہلی اور اس کی نواح کی جو عمارتیں قابل دید ہیں وہ سب دیکھ بھال چکے تھے، قطب صاحب کی لاٹ لوہے کی لاٹ اور تغلق آباد کی ایسی عمارتیں ہیں کہ جب دیکھو نئی۔ قطب صاحب کی لاٹ اور اس کے آس پاس کی عمارتیں اس مذہبی جوش کی شہادت دیتی ہیں جو تاریخی واقعات تحریری سے ایسی اچھی طرح ظاہر نہیں ہوتا جیسا کہ دیکھنے سے۔

جو مسلمان ابتداء میں یہاں آئے تھے اُن میں مذہبی جوش اور ولولہ بہت تھا اور اُن کے خیالات بھی بہت بلند تھے، لاٹ اور اُس کے اطراف کی عمارتوں پر کثرت سے قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں جس کا جی چاہے آج جا کر پڑھ لے، ولیوں کے مزار، اُن کی شاندار عمارتیں اُن کے بانیوں کی خوش اعتقادی کی شہادت دیتے ہیں اس لاٹ کے بنانے والے کا مدعا یہ تھا کہ یہاں ایک بڑی مسجد بنا کر ہندوستان اور پنجاب میں ظفرمندی کا ڈنکا بجایا جائے۔ یہ لاٹ مسجد کا ماذنہ تھی چنانچہ اسی قسم کی ایک ادھ بنی، لاٹ علاؤالدین خلجی نے یہیں قریب بنوانی شروع کی تھی جو اس کی وفات کے سبب سے مکمل نہیں ہو سکی اگر یہ بھی بن جاتی تو ان دونوں

میناروں کے بیچ میں ایک عالی شان مسجد بنتی جو ہندوستان کی ساری موجودہ مسجدوں سے بڑی اور شاندار ہوتی بلکہ سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے گرجاؤں سے بھی بڑھ کر شان دار ہوتی۔

موجودہ دلی جس کو مسلمان شاہ جہان آباد کہتے ہیں اس کی بنا کو دو سو برس سے اُوپر ہی اُوپر ہوئے، یہ بات اندرپرست کی بربادی کے بعد سے برابر چلی آتی ہے کہ یہ مقام مملکت ہند کا تخت گاہ رہا ہے چنانچہ پہلے زمانہ کے سارے سلاطین اسلام کی تخت نشینی کے جشن اسی دلی میں ہوئے اور خاندان مغلیہ جو اُن کے بعد اس ملک میں قابض ہوئے ہیں اگرچہ ان میں سے کسی نے آگرہ اور کسی نے لاہور کو اپنا دار الخلافہ بنایا مگر وہ اصل بادشاہ اُسی وقت تسلیم کیئے گئے جب دہلی میں آکر تخت نشین ہوئے۔

دربار کے نتائج اس دربار سے بے شمار مفید نتائج مرتب ہوئے جن لوگوں کی پوری پوری قدردانی نہیں کی گئی ان کو کافی معاوضہ دیا گیا۔ پُرانے پنشن خوار جنھوں نے اس مدت میں اپنی بے لوث خیرخواہی سے اپنے آپ کو مزید امداد کا مستحق ثابت کیا تھا ان کی مزید امداد میں اضافہ کیا گیا۔ بہت سے ہندوستانی رؤسا کو عطیات تاحیات ماہوار اضافہ کے ساتھ جاری کیے گئے ہر رئیس کو جو سلامی کا مستحق تھا ملکہ معظمہ کی جانب سے پورے مراسم کے ساتھ ایک جھنڈا دیا گیا جس کے ایک جانب ملکہ معظمہ کا بانا تھا اور دوسری طرف خود اس رئیس کا۔ یہ جھنڈے مختلف رنگوں اور طرز کے حسب حیثیت و مرتبہ امرا کیے گئے تھے۔ طلائی اور نقرئی تمغے بھی مضروب ہو کر رؤسا اور دیگر ذو معززین کو ملے۔

تمام ہندوستان کے آنریری مجسٹریٹوں۔ میونسپل کمشنروں کو اعزازی سارٹیفکٹ ملے ہندوستانی فوج کے کمیشنڈ افسروں کی تنخواہوں اور الاؤنس میں اضافہ کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو خطابات کی سرفرازی ہوئی۔

انعام واکرام ہندستانیوں کے اعزاز و اکرام کے سوا یورپین۔ کیمونٹی کی خدمات کے اعتراف کا مسئلہ بہت اہم تھا جو مشرقی قوت سلطنت کی جڑ بنیاد تھے جنھوں نے نہ صرف فتح حاصل کی بلکہ نظم و نسق کو برقرار رکھا اور جس پر اُس کی ترقی کے دار و مدار کا احساس تھا، یہ ایک

بڑا بھاری سوال عرصے سے زیر غور تھا اور خود وائیسرائے کو اس طرف زیادہ توجہ تھی اُن کی دلی خواہش تھی کہ معقول طریقہ پر ان کی قدر افزائی ہونی چاہیے لیکن وائیسرائے کی تحریکات پر اعتراضات ہوئے اور جو ہو سکا صرف یہی تھا کہ چند لوگ طبقہ سٹار آف انڈیا میں شامل کیے گئے اور غیر ملازمین کے لیے ایک نیا طبقہ انڈین ایمپائر کا قائم کیا اور نیٹو رجمنٹوں کے انگریز عہدہ داروں کی بہتری کی کچھ شکل نکلی بحری لوگوں اور گوروں کو جو اس دربار میں شریک تھے ایک ایک دن کی تنخواہ دی گئی۔

ہندوستان پورٹ بلیر اور سٹریٹ سٹلمنٹ میں بحساب ۱۰ فیصدی (۵۹۸۰) قیدی رہا کئے گئے اور سرکاری خرچ سے اپنے اپنے گھروں کو پہنچائے گئے جن میں سو روپے سے کم قرضے والے دیوانی کے قیدی بھی شامل تھے جن کا قرض سرکار نے اتارا، علاوہ ازیں عام قیدیوں کی بحساب فی سال ایک ماہ معیاد قید رعایت کی گئی۔

۲۲ر دسمبر تک تمام مدعو شدہ مہمان رؤسا۔ سرداران و جاگیرداران حکام و دیگر معززین سب جمع ہو چکے تھے۔

وائیسرائے کی آمد

۲۳ر دسمبر کو ہز اکسلنسی لارڈ لٹن پوری شان و شوکت سے اسپیشل ٹرین سے دہلی میں رونق افروز ہوئے۔ تشریف آوری کے وقت تمام رؤسا بغرض استقبال ریلوے اسٹیشن پر چشم براہ تھے صاحب موصوف نے ریل سے اترتے ہی بڑے بڑے رؤسا و حکام سے مصافحہ اور مزاج پرسی کے بعد والیگان، نوابان، سرداران و امرا کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ:-

"ہندوستان کے کل علاقوں سے لوگ اِس رسم ہمایوں میں شریک ہونے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس سے امید کی جاتی ہے کہ حضرتِ ملکہ کی گورنمنٹ اور اس گورنمنٹ کے بڑے بڑے دوستوں اور ماتحت رئیسوں کے درمیان بناء اتحاد زیادہ مستحکم ہو گی۔ جس دلی محبت سے آپ صاحبوں نے میری دعوت کو قبول کیا ہے میں اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مجھ کو امید ہے کہ ہماری کارروائی کا اختتام بھی ایسا ہی ہوگا جیسا کہ آج کا آغاز ہوا ہے سب صاحب میری طرف سے خیر مقدم قبول کریں۔"

تزک و احتشام

حضور وائیسرائے بہادر کی سواری دہلی میں ہفتہ کے دن ۲۳ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو سہ پہر کے وقت برآمد ہوئی اس صبح ہی سے ہر لشکر میں

دھوم دھام مچی ہوئی تھی سارے شہر میں سواری کے برآمد ہونے کا شور تھا جس قدر انگریزی فوج اس وقت دہلی میں موجود تھی سب کی سب سواری کی گذرگاہ پر دونوں طرف صف بستہ کھڑی تھی اس کے سوا خود مختار رئیسوں سے کہا گیا تھا سب اپنی اپنی فوج اور جلوس کو سڑک پر دو رویہ جا بجا انگریزی فوج کے بیچ میں استادہ کردیں اور اُن کی وضع اور تراش وخراش اُن کی قوم اور اُن کے دستور کے موافق ہو۔

راجپوتانے کے رئیسوں کی فوج اور جلوس کو سڑک کے دونوں طرف نجف گڑھ کی نہر کے قریب سے لے کر چاندنی چوک تک کھڑا کیا گیا تھا۔ پنجاب کے روٗسا کی فوج لاہوری دروازہ کے باہر سجائی گئی تھی۔ جو پہاڑی پر بادشے تک چلی گئی تھی۔ بمبئی صوبہ جات متحدہ اودھ وآگرہ۔ ممالک متوسط۔ بنگال۔ مدراس اور وسط ہند کے راجاؤں کی فوجیں اور مقامات پر استادہ تھیں اور راجاؤں کی فوج کے بیچ میں جا بجا سارے رستے پر انگریزی فوج تھی، رئیسوں کی تزک وشان اور شکوہ وتجمل ایسا تھا جیسا کہ ہونے کا حق ہے، ہاتھیوں کی لمبی لمبی قطاریں جا بجا قرینے سے کھڑی تھیں ان کے ساز و سامان اور ہودے ایسے زرق برق تھے جیسے تہواروں کے موقع پر یا کسی اور بڑی رسم وتقریب کے وقت اُن کے دارالخلافہ میں ہوا کرتے ہیں جھولوں پر سنہری روپہلی زردوزی کا کام تھا یا سرخ اور نیلے رنگ کی بہار تھی ہودے کیا تھے سونے چاندی کے تخت تھے ہر ایک کی شکل نرالی اور ہر ایک کی وضع جدا۔ بہت سے ایسے تھے جن پر منبت کاری کا کام تھا اور عجیب عجیب بوٹے اور طرح طرح کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، بعض ہاتھیوں پر شیر یا اژدہے یا ہاتھی کی مورتیں بعض پر دیوتاؤں اور نامی گرامی سورماؤں کی صورتیں بعض پر چاند اور سورج کی جگمگاتی ہوئی تصویریں تھیں اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ جن جن سرداروں کے یہ ہاتھی ہیں وہ چندر بنسی اور سورج بنسی راجہ ہیں۔

سواری کے جلوس میں سب سے زیادہ دیکھنے کے قابل جنگی ہاتھی تھے ان پر جنگ جو سورما تن پر زرہ بکتر سجائے سر سے پاؤں تک ہتھیار لگائے بیٹھے تھے ان ہاتھیوں کے دانتوں پر فولادی نوکیں چڑھی ہوئی تھیں سونڈوں پر لوہے کا جال پڑا ہوا تھا پشت پر فولادی ہودے ایسے سجے ہوئے تھے جن پر گولے اور گولیاں اثر نہ کرسکتے تھے۔ ہودوں پر جو سپاہی بیٹھے تھے وہ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے ہر قسم کے ہتھیار۔ بندوق، برچھی نیزہ تلوار سجائے۔ پستول۔ پیش قبض۔ خنجر کمر میں لگائے ہوئے تھے۔

غرض یہ کہ اگلے زمانے کے ہندو سورماؤں کی طرح سرتا پا غرق آہن تھے۔ ہاتھیوں کے علاوہ سواروں کے پرے کے پرے تھے۔ جن کے بدن پر زرہ سر پر فولادی خود سجے ہوئے تھے۔

افسروں کی رنگا رنگی

افسروں کے سینوں اور پشت پر چار آئینے جگمگا رہے تھے اور خودوں میں پر لہرا رہے تھے ان کے گھوڑوں کے سروں پر کلغیاں لگی ہوئی تھیں بعض تو صرف پروں کی تھیں بعض سونے اور چاندی کی بنی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں پر چار جامے سنہری روپہلی کام کے پڑے تھے ان کے علاوہ بہت سے کوتل گھوڑے بھی مختلف مقامات پر ساز و یراق سے آراستہ کھڑے تھے بڑودے کی سونے چاندی کی توپوں پر بھی سب کی نگاہ پڑتی تھی۔ ایسی توپوں کا ڈھالنا اہل ہند ہی کا حصّہ ہے اور یہ اُن ہی لوگوں کی ایجاد ہے یہ توپیں چھپی تھیں اور دھوپ میں ماہی مراتب کی طرح جھلک رہی تھیں سونے کی توپ کے پہیئے تو چاندی کے تھے اور چاندی کی توپ کے پہیئے سونے کے۔ گجرات کے نہایت عمدہ بیل ان توپوں میں جتے ہوئے تھے یہ وہ قوی ہیکل بیل ہیں کہ ملکہ الزبتھ کے زمانے سے جو سیاح مغربی ہند میں آیا اس نے انھیں سراہا اور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ چاندی کی توپ کے بیلوں کے سینگوں پر سونے کی سنگوٹیاں چڑھی ہوئی تھیں اور سونے کی توپ کے بیلوں پر چاندی کی، ان کی پیٹھ پر زردوزی اور زربفتی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور اتنی لمبی تھیں کہ زمین تک لٹکتی تھیں۔

جس روز سہ پہر کو سواری نکلنے والی تھی اس روز کی صبح کی کیفیت کچھ نہ پوچھو، بادل کا آسمان پر کہیں نام نہ تھا آفتاب کی صاف شعاعوں نے ہر ایک شے کے رنگ و روپ کو دوبالا کر دیا تھا اور جنوری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے دھوپ کی حدت بہت کم کر دی تھی سارے شہر میں ایک بڑا میلہ لگا ہوا تھا ہر ایک مقام پر جہاں سے سواری نظر آ سکتی تھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع تھے۔ دروازے۔ کھڑکیاں۔ برآمدے چھتیں غرض کوئی مقام تماشائیوں سے خالی نہ تھا کہیں کہیں بازاروں میں بیرقیں لگی ہوئی تھیں چاندنی چوک میں خصوصاً لوگوں کا بڑا اژدہام تھا اور ایک بڑا جمگھٹ پہاڑی پر لگا ہوا تھا۔

جامع مسجد سے نظارہ

شہر میں جس قدر لوگ جامع مسجد کے بُرجوں اور چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے اس قدر اور کہیں نہ تھے اُن ریاستوں کے رئیس جو دولت برطانیہ

کے تابع نہیں ہیں ۔ اُن بستیوں کے گورنر جو یورپ کی اور قوموں نے مشرق میں بسائی ہیں ۔ ریاست ہائے غیر کے ایلچی اور سفیر جو خاص اس دربار گوہر بار میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے اور غیر ریاستوں کے کونسل اور تمام خطابی رئیس اور نواب گورنر جنرل بہادر اور لوکل گورنمنٹوں کے مہمان سب اسی جگہ جمع تھے سیڑھیوں پر لوگوں کے سروں پہ سر اس طرح نظر آتے تھے جس طرح سمندر پر لہریں نظر آتی ہیں اور سروں پر پگڑیوں اور عماموں کے وضع وضع کے رنگ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا ۔ یہ سب لوگ کئی گھنٹہ تک سواری کے انتظار میں اپنی اپنی جگہ جیسا یہاں کے لوگوں کا خاصہ ہے خاموش بیٹھے رہے شہر کے اندر سواری کے گذرنے کا جو انتظام کیا گیا تھا اُس سے ہندوستانی لوگ بہت خوش ہوے کیونکہ شہر کے سب لوگوں کو سواری دیکھنے کا بخوبی موقع مل گیا تھا ۔

وائسرائے بہادر دوپہر ڈھلے دربار میں رونق افروز ہوئے ، پندرہ ہزار گورے اور دیسی فوج نے سلامی اُتاری دربار کے عالی شان دروازے پر پہنچکر لاٹ پادری صاحب اور لیڈی ڈفرن صاحبہ مع اسٹاف کے گاڑیوں پر سے اُتر کر ڈائیس[ا] (چبوترے) پر تشریف فرما ہوئے ہز اکسلنسی وائسرائے بہادر سٹار آف انڈیا کے کالر ۔ بیج اور پوشاک میں تھے جب آپ دربار کے خیمے میں داخل ہوئے تو سارے حاضرین تعظیماً کھڑے ہوئے اور جب تک بیٹھے نیشنل انیتھم (قومی ترانہ) بجتا رہا ۔

چیف ہرلڈ (نقیب اعلیٰ) نے اصل اعلان انگریزی میں پڑھا اور فارن سکرٹری نے اُردو میں ۔ اسکے ختم پر ذرا دن ایک سو ایک توپیں سر ہوئیں اور شاہی جھنڈا بلند کیا گیا اور بینڈ نے نیشنل انیتھم بجایا[۵۲]

---

[۵۱] اسی درباری ہال کے وسط میں جانب شمال ایک دس فٹ بلند چبوترہ تیار کیا گیا تھا جس پر نقرئی ستونوں پر ایک گنبدی چھت ڈالی گئی تھی جس کے ہر ستون پر شاہی علم و پرچم ۔ چاندی کی ڈھالیں اور کلاتوں سے زردوزی نشانات یونین جیک آویزاں کیے گئے تھے چبوترے پر ہلکے نیلے رنگ کا نفیس فرش بچھا کر اس پر حضور وائسرائے اور ان کی لیڈی صاحبہ کی دو عالی شان جگمگاتی ہوئی سنہری کرسیاں بطور تخت کے رکھی گئی تھیں ۔

[۵۲] واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اوّل (بشیر احمد) ص ۷۵۹

دہلی دربار

تاجپوشی ملکِ معظّم ایڈورڈ ہفتم

یکم جنوری ۱۹۰۳ء

" زوالِ دولتِ مغلیہ کے بعد (ہندوستان) میں شاہی درباروں کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوا ہے لیکن یہ دربار معمولی تھے اور ان میں وہی راجہ اور نواب مدعو ہوتے تھے جن کی ملکی خیر خواہیاں قابلِ صلہ تھیں لیکن حضور ملکۂ معظمہ کوئن وکٹوریہ نے ۱۸۷۷ء میں پہلا دربار کر کے گذشتہ دربار کی نوعیت تبدیل کردی تھی اور اسی دربار دہلی کے بعد حضور قیصر ہند کہلائیں اور اس خطاب سے ہندوستان کے تاج میں گویا ایک اور کوہ نور کا اضافہ ہُوا۔

دربارِ قیصری کے حالات بس تاریخوں میں پڑھ چکا تھا اور عہد طفلی سے یہ آرزو تھی کہ کاش! ہندوستان میں کوئی دوسرا دربار ہو کہ وہی منظر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ چنانچہ خدا خدا کر کے یکم جنوری ۱۹۰۳ء میں (۲۶ سال کے بعد) ملک معظّم ایڈورڈ ہفتم کا دربار تاجپوشی دلّی میں منعقد ہوا اور اس دربار کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اس کو لارڈ کرزن جیسا سلیقہ شعار و نفیس مزاج مہتمم مل گیا۔

جب لارڈ موصوف نے اخبارات میں دربار کا خاکہ شائع کیا اس وقت سے پبلک میں جوش اور ہر دل میں دربار کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

چنانچہ رجواڑوں نے چھ ماہ قبل اور اعلیٰ طبقے کے نوجوانوں اور متوسط طبقے نے آخیر دسمبر ۱۹۰۲ء سے روانگی دلّی اور آرائش مکان و قیام کا اہتمام شروع کیا۔

دسمبر کی ۲۷ر تاریخ تھی کہ ہماری مختصر جماعت کانپور سے بعد نماز مغرب دلّی کو روانہ ہوئی ٹکٹ گھر سے مسافر خانے تک اور پھر اس مقام سے پلیٹ فارم تک سو گز کا راستہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا تھا اور جو اس ہنگامے میں گر پڑا پھر اُس کو اُٹھنا نصیب نہ ہُوا۔ ریل پر سوار ہونے کی کٹھن منزل ہنوز باقی تھی۔

جب میل ٹرین کا انجن پھولوں سے سجا ہوا اور نغمۂ مسرت گاتا ہُوا، پلیٹ فارم پر آیا اُس وقت کا مجمع اور بدحواسی قابلِ دید تھی۔ فرسٹ سیکنڈ۔ انٹر۔ تھرڈ کلاس کا امتیاز اُٹھ گیا تھا۔ جو ڈبہ مسافروں کے سامنے تھا اس میں بیٹھنے کی کوشش کی گئی اور پولیس بھی انتظام سے قاصر رہی ہماری جماعت نے مصلحتاً دو پہلوانوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا چنانچہ یہ دُور اندیشی کام آئی اور کسی کی یہ طاقت نہ تھی کہ ہمارے درجہ میں قدم رکھ سکے۔ چنانچہ چار معزز رئیسوں کو جن کے ٹکٹ درجہ اول کے تھے اور ان کے لیے تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ تھی اخلاقاً ان کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ طلوعِ آفتاب سے قبل ٹرین دلی پہنچ گئی۔

کوچہ چیلان میں جامع مسجد کے قریب ایک کمرہ دس یوم کے لیے سو روپے کرائے پر پہلے سے لے لیا تھا۔ اُس میں مقیم ہوئے اور نہاری کے بعد ہی دلی کی سیر شروع ہو گئی۔ چنانچہ دسمبر کے چار دن بہ مشکل ختم ہوئے اور وہ رات آئی کہ جس کی صبح کو دربار تھا۔ "بقول سودا" یہ وہ رات تھی کہ ع

نہ لگی شوق میں جس کے کبھی شائق کی پلک

نمازِ صبح سے بہت پہلے جامع مسجد کی سیڑھیوں کے مچان پر قبضہ کیا گیا فی ٹکٹ دس روپیہ کرایہ تھا مسجد کا یہ وہ رُخ تھا جس کے سامنے قلعہ معلّے واقع تھا اور اسی راستے سے شاہانہ جلوس گزرنے والا تھا سورج کی کرنیں جامع مسجد کے میناروں اور طلائی برجیوں پر پڑ رہی تھیں کہ دُور سے انگلش بینڈ کی سریلی آواز کانوں میں آنے لگی اور تقریباً ۴۵ منٹ میں جلوس زیرِ مسجد پہنچ گیا۔

جلوس کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے آگے شاہی نقیب ایک دیو گھوڑے پر نظر آیا۔ نقّاروں سے کڑم دھڑم دھم کی سُریلی آوازیں آ رہی تھیں اور جب یہ دوہری ضرب لگاتا تھا تو سارا میدان گونج اٹھتا تھا۔ فردوسی طوسی نے شاہنامے میں ایک جگہ نقّارے کی آواز الفاظ میں دکھائی ہے اور اس کا یہ کمال ضرب المثل ہے۔ لیکن انگلش نقارچی کے ظرف سے جو آواز نکلتی تھی وہ بھی روح میں ایک نئی زندگی پیدا کرتی ہے۔ علاوہ بریں بینڈ میں جس قدر آلات تھے اُن میں سے ہر ایک کی آواز طرب انگیز تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزار داستان ہر سانس میں نئی بولیاں بول رہا ہے جب باجے والوں کی ٹولیاں آگے بڑھ گئیں اور نیشنل اینتھم (قومی ترانہ) ختم ہو گیا اس وقت یکایک سیاہ بادلوں کی صورت میں ہاتھیوں کی قطار نظر آئی اور یہ معلوم ہوا کہ ہم اس وقت کجلی بن کی

سیر کر رہے ہیں،

جلوس میں سب سے آگے لارڈ کرزن نائب السلطنت کا ہاتھی تھا اور لیڈی کرزن طاؤسی میں اپنے شوہر کے دوش بدوش تھیں یہ لباس ہندوستانی صنعت کا بہترین نمونہ تھا۔ سورج کی کرنیں جب لباس پر پڑتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا صدہا مور (طاؤس) ناچ رہے ہیں۔

لارڈ کرزن جس ہاتھی پر سوار تھے یہ ڈیل ڈول میں سب سے بڑا اور اکبر اعظم کے جگنا تھا اور مہادیو کے ٹکر کا تھا اور بلاشبہ اس پر کوہ پیکر کا اطلاق صحیح تھا۔ یہ راجہ صاحب بلرام پور (تعلقہ دار اودھ) کا تھا۔ اس کے دانت گویا چاندی کے دو سڈول ستون تھے جو زمین سے صرف چار انگل اونچے اور تقریباً دو فٹ چاندی کے خول ان پر چڑھے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں کی سیاہ بختی مشہور ہے جنھوں نے سیکڑوں راجاؤں کو میدان جنگ میں شکست دلائی ہے لیکن زرّین جھولوں اور نقرئی زیورات نے ان کے سروں کو چھپا دیا ہے۔

شہنشاہ اکبر کا اقبال تاریخوں میں مشہور ہے لیکن آج کل ایڈورڈ ہفتم کا اقبال سب سے بالاتر تھا یہ عبرت کا سماں قابل دید تھا کہ نائب السلطنت کے پیچھے تمام ہندوستان کے فرمانروا درجہ بدرجہ ہاتھیوں پر چلے جا رہے تھے اور وائسرائے کے بعد ہی دکن کا وہ تاجدار تھا جس کی حکومت ۲ کروڑ نفوس (میر محبوب علیخاں نظام دکن) پر ہے، حضور معلیٰ بالکل سادہ لباس میں تھے۔ سیاہ ریشمی شیروانی اور سفید فلالین کی پتلون اور کلاہ (آصف جاہی) میں صرف ایک ہیرا چمک رہا تھا اور چنور بردار، مکلف لباس میں غرق تھا اور باقی راجہ مہاراجہ قیمتی لباسوں اور زیورات میں ملبوس تھے، حقیقت میں یہ وہ منظر تھا جو کسی مغل فرمانروا کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ میں آہستہ خرامی کے ساتھ جلوس ختم ہوا اور مہمان درباری پنڈال (امفی تھیٹر) میں جا کر ٹھہر گئے۔

واجد علی شاہ جان عالم پیا نے جو اندر سبھا قائم کی تھی اس کو مداری لال اور امانت نے تفصیل سے لکھا ہے اور تقریباً پچاس سال ہوئے جب اس سبھا کو میں نے اصلی رنگ و روپ میں دیکھا تھا۔ لیکن لارڈ کرزن کی اس سبھا کا اور ہی کچھ نقشہ تھا۔

اب ہم آپ کو اکبر الہ آبادی کی زبان سے اس پرستان کا منظر دکھاتے ہیں۔

پہلے اس مصرعے کو ذرا بلند آواز سے اٹھایئے ؎

" سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے "

حاضرینِ سبھا بیقرار تھے کہ یکایک پہلا پردہ اٹھا اور آلاتِ طرب سے آواز ملا کر پریوں نے خیر مقدم کا ترانہ گایا ؎

سبھا میں دوستو کرزن کی آمد آمد ہے
گلوں میں عشرتِ گلشن کی آمد آمد ہے
رئیس و راجہ و نواب منتظر ہیں بہ شوق
کہ نائبِ شہِ لندن کی آمد آمد ہے
چمک ہے کرچوں کی ہر سو گمک ہے توپوں کی
چھا چھم اور دنادن کی آمد آمد ہے

اس سبھا میں کوئی دیو سیاہ نہ تھا البتہ پریوں میں سبز پری - زمرد پری اور نیلم پری موجود تھیں لیکن اقبال پری کا راگ سب سے زیادہ دل کش تھا یہ پیرس کی نیو فیشن پشواز پہن کر دل کھول کر ناچی گائی اس کے دو شعر سب کو پسند آئے -

ہر ڈھنگ سے دکھلاتی ہوں شان اپنی جہاں کو
ہر رنگ میں، میں مست مئے جلوہ گری ہوں
انگلینڈ پہ ہوں سایہ فگن حکمِ خدا سے
شاہنشہ ایڈورڈ کی صورت پہ مری ہوں

بے شک! ایسا جانِ عالم کس کو مل سکتا ہے؟ الغرض اقبال پری کے راگ پر جلسۂ رقص و سرور کا خاتمہ ہوا۔ پھر ملک معظم کا فرمان پڑھا گیا اور عطر و پان کے بعد دربار ختم ہوا۔ مہمانوں کی واپسی میں بھی وہی لطف تھا جو آمد میں تھا۔ ہماری جماعت بھی مدراس کی ایک شاندار وکٹوریہ گاڑی (جس کا کرایہ فی گھنٹہ پندرہ روپیہ تھا) پر سوار ہو کر قیام گاہ پر واپس آئی -

آتش بازی

صبح کا سماں تھا، رات کا سین اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ آٹھ بجے کے بعد قلعہ معلی کے میدان میں آتش بازی کی سیر کرائی گئی، بچپن میں قصبات کی آتش بازی کے کرشمے شب برات میں خوب دیکھ چکے تھے فریقین میں مقابلے ہوتے تھے اور کتنے ہی نوجوان اور بوڑھے ختم ہو جاتے تھے لیکن یہ آتش بازی کچھ اور ہی چیز تھی ہر انار اور چرخی سے جو شرارہ نکلتا تھا وہ فلک اول پہ جا کر ختم ہوتا تھا اور ہر انار میں سو سو طرح کے گلے پھوٹتے تھے حکما نے رنگوں کی تقسیم کی ہے۔ اس آتشبازی میں وہ سب موجود تھے۔ چرخیوں اور ہتاشوں میں عجیب و غریب جدت تھی اور یہ آتش بازی ایک عجیب سائنس تھا جس کی صرف اہل علم سمجھ سکے تقریباً ایک لاکھ روپے کی آتش بازی جل کر راکھ ہو گئی۔ لیکن نہ آنکھوں میں دھوئیں کا اثر تھا نہ کہیں بارود کی بو تھی اور کسی کو یہ بھی محسوس نہ ہوا کہ اس میدان میں آتش بازی جلائی گئی ہے۔ یہ امریکہ اور لندن کی صناعی تھی۔

نمائش

اس نمائش کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر صناع اور کاریگر اپنی اپنی جگہ عملی کاموں میں مصروف تھا۔ سنار زیور بنا رہے تھے، حکاک (نگینہ ساز و مہرکن) ہیروں کی قلمیں تراش رہے تھے اور اس سے مقصد یہ تھا کہ اہل یورپ ہندوستان کی ان صنعتوں کو حاصل کریں جو ہنوز یورپ میں نہیں ہیں۔ تفصیل کے لیے ایک وسیع مضمون کی ضرورت ہے، میں کارخانوں کو دیکھتا پھرتا تھا کہ ایک بنارس کی ایک کارگاہ میں گذر ہوا۔ جہاں کرگھے میں کمخاب کا تھان بنایا جا رہا تھا اور مانچسٹر کے مالکان بل کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تانا بانا دیکھ رہے تھے،

کارگاہ میں چار ملازم تھے ان میں سے ایک سرے پہ بیٹھا ہوا تھا۔ دو دائیں بائیں تھے اور چوتھا سامنے رخ پر تھا۔ تین کاریگر سوت کے ڈوروں کو شمار کر کے الگ کرتے تھے اور وہ استاد کو اطلاع دیتے تھے کاریگر نمبر ایک تلی کو ڈوروں کے اندر پھینکتا تھا اور اسی طرح پر ایک پھندا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک گھنٹے کے اندر مور (طاؤس) کا ایک بازو بن کر تیار ہوا جس میں مختلف شوخ اور چمکیلے رنگ تھے۔

اس تھان میں مور بنایا جا رہا تھا (جس کا سر بن چکا تھا اور باقی اجزا تیار ہو رہے تھے) اور کاریگر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایک یورپین تاجر سے سوال کیا گیا کہ مشین یہ کام کر سکتی ہے؟ اس نے حسرت و افسوس

سے جواب دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے، یہ کام صرف ہاتھوں ہی سے ہو سکتا ہے۔

اسلحہ خانہ

میں فوجی افسر تو نہ تھا جن کو اسلحے سے عشق ہوتا ہے لیکن شاہ نامے میں رستم اور سہراب اور اسفندیار وغیرہ کے معرکے پڑھ چکا تھا، فردوسی نے تمام آلات حرب کی تصویریں الفاظ میں کھینچی ہیں اس لیے اسلحہ خانے کو میں نے کئی بار دیکھا اور ساسانی (قباد و نوشیروانی) عہد سے اسلام کے آخیر دور تک کے جملہ اسلحہ دیکھے تب ان کی ساخت کا اندازہ ہوا۔

مرقّع تصاویر

دلی دربار کے بعد الہ آباد اور لکھنؤ میں وسیع پیمانے پر نمائشیں ہوئیں لیکن لارڈ کرزن نے تصاویر کا جو سلسلہ (صدی وار) جمع کیا تھا وہ منظر کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ تیمور کے دور سے آخیر مغلی دور تک ہر مصور کا عمل جداگانہ تھا جن میں اکثر ہندو تھے۔

قلمی کتابیں

اہل علم کے لیے یہ سب سے نادر مرقع تھا، اس کمرے میں قلمی مصور کتابیں بہت تھیں اور اس میں بھی یہ اہتمام تھا کہ علم خط نے صدی وار جس قدر ترقی کی ہے اسی ترتیب سے کتابیں سجائی گئی تھیں۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر کتاب ایک بکس میں بند تھی جس پر آئینہ لگا ہوا تھا اور کتاب کا نظارہ آئینے کے اوپر سے ہوتا تھا اس مرقع میں سب سے قیمتی کتاب گلستانِ سعدی تھی۔ ریاست الور کے ایک راجہ کے حکم سے سترہ سال میں یہ گلستان ایک نامی خوشنویس اور مختلف مصوروں نے تیار کی تھی یہ تنخواہ دار اہلکار تھے۔ جن پر تین لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔

شاہ نامے، رامائن، مہابھارت، دیوانِ حافظ، لیلیٰ مجنوں، اور شیریں خسرو بھی قابل دید تھیں اور ان تصویروں میں انتہائی کمال دکھایا گیا تھا۔ قیمتی سامان میں مہاراجہ بڑودہ کا قالین بھی اپنا آپ ہی نظیر تھا۔ قالین شیشہ کے ایک چوکھٹے میں جڑا ہوا تھا جس کے تانے بانے اور رنگ میں جواہرات سے کام گیا تھا یہ بھی کئی لاکھ کا تھا کشمیر کا ایک نا تمام شال تھا جو بازار میں تین کلائے کے برابر تھا۔ اس کی قیمت تین ہزار روپے

تھی اس شال میں اس درجے حرارت تھی کہ اگر گھی کے جمے ہوئے کپّے پر رکھ دیا جائے تو چند منٹ میں گھی گھل کر پانی ہو جائے۔

آلاتِ طرب

جن باجوں کے نام سُنا کرتے تھے وہ سب نمائش میں موجود تھے خصوصاً ہندوستان کے جملہ ساز عہدِ قدیم سے دورِ حاضرہ تک ترتیب وار دکھائے گئے تھے۔ ستار میں امیر خسرو دہلوی کے بعد جو ترمیم ہوئی تھی، وہ ستار جداگانہ تھے۔ ستار کی اصل وہ جگ تارا ہے جسے ہندو فقیر سینکڑوں برس سے استعمال کر رہے ہیں اور بعض محققین اسی کو ستار کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔

سارنگی (رباب) کی ساخت میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ہندوستان کا یہ وہی باجہ ہے جس پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ "تانت باجی راگ بوجھا"۔ لکھنؤ کے ایک نواب زادے نے جو سارنگی بجانے میں فرد تھے ارشاد فرمایا کہ اگر طوائفوں کے سازندوں نے سارنگی کو بدنام نہ کر دیا ہوتا تو آج مثل ستار کے شرفاء کے ہاتھ میں بھی سارنگی نغمہ سنج ہوتی یہ آلۂ طرب عہدِ قدیم کا گراموفون ہے جس کے تاروں سے ایک ایک بول نکلتا ہے لیکن یہ تعجب ہے کہ طبلہ (تبلہ) میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ بدھ مت دور میں اجنٹا (حیدر آباد دکن) کے ایک غار میں (رقص و سرور کی ایک محفل دکھائی ہے) طبلہ کی جو تصویر دکھائی ہے وہ ہنوز قائم ہے ہند کا یہ وہ باجہ ہے جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔ ماہر فن طبلچی اس سے سات سُر نکال سکتا ہے اور طبلہ کا راز اس سیاہ گول دائرے میں ہے جو بڑے چرمی حلقے میں ہوتا ہے اور نغمات میں زیر و بم (پست و بلند) کا تعلق دوروں کے تناؤ پر ہے۔

واجد علی شاہ اودھ کو بھی طبلہ بجانے میں انتہائی کمال تھا اور آج بھی لکھنؤ میں جو طبلچی (پیشہ ور) ہیں ان کا جواب نہیں ہے صرف عشرہ محرم میں تعزیوں کے ساتھ یہ طبلچی اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون مصوّر نہیں ہے ورنہ ہر آلے کے متعلق خاص خاص نکات بیان کیے جاتے۔[1]

---

(۱) یادِ ایام (عبدالرزاق) ص ۲۵۳

باب ۵۵

جلوۂ دربارِ قیصری

ایک طنز —— ایک حکایت —— ایک تاریخ

•

ملکہ وکٹوریہ نے قیصرِ ہند کا خطاب جب اپنے لیے منظور فرمایا تو سارے ہندوستان میں غلغلۂ تہنیت برپا ہوگیا، غدر کی تباہیوں سفاکیوں اور سختیوں نے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے میں لب کشائی کی ہمت کب باقی چھوڑی تھی لیکن شاعر پردہ پردہ میں وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے جو وہ کہنا چاہتا ہے، اکبر الٰہ آبادی نے اس دربار کا مشاہدہ کیا اور اپنے تاثرات کی روداد بیان کردی شاعری کے اعتبار سے دیکھیے تو ع

زمینِ سخن آسماں ہو گئی

الفاظ کی بندش، خیالات کا تسلسل قوافی کی ندرت اور محاکات و استعارات کی افراط نے ہر شعر کو جانِ سخن بنا دیا ہے بھلا کوئی یہ کہہ سکتا تھا:

تحت میں ان کے جیبیں تھ بندھا

وہ صرف اکبر ہی تھا جس نے الفاظ کے طلسم میں عروسِ معنی کو اس طرح اسیر کیا کہ نہ کوئی انگشت نمائی کر سکا، نہ گرفت حکایت کے اعتبار سے دیکھیے، تو ایک مسلسل داستان ہے جو اپنی پوری رعنائی اور برنائی کے ساتھ موجود ہے تاریخ کے اعتبار سے دیکھیے تو اس میں غلام اور مظلوم ہندوستان کی فاتح اور ظالم برطانیہ کی پوری تاریخ محکومی و سفاکی چند

سادہ اور دل نشین الفاظ سے ادا کردی ہے۔
یہ نظم بڑی مشکل سے دستیاب ہوسکی، اس کا صلہ سوا اس کے کچھ نہیں کہ آپ پڑھ لیں۔

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے، کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور ورنگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کیمپ سے جاری
پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لیمپ سے جاری
تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

کچھ چہروں پر مُردی دیکھی
کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
دل نے جو حالت کر دی دیکھی

ڈالی میں نارنگی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی
دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم
ان کا چلنا کم کم ۔ تھم تھم
ذرّیں جھولیں نور کا عالم
میلوں تک وہ چم چم چم چم

پر لُطف تھا پہلوئے مسجد جامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

ایک کا حصّہ منّ و سلوا
ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا
میرا حصّہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا
پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا
رُخ کرزن مہاراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر
تحت میں اُن کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوجِ بخت ملاقی اِن کا
چرخِ ہفت طباقی اِن کا
محفل اُن کی ساقی ان کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے
قصہ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہور کوچہ و برزن
ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پُرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال میں چمکیں آ کے یکایک
نذریں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا اِن کا اَوج سما تک
چرخ پہ زہرہ اِن کی تھی گاہک

گو رقاصہ اوجِ فلک تھی
اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی
بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کتابیات

اس کتاب کی تالیف میں بلا مبالغہ میں نے ہزار ہا صفحات پڑھے ہیں، اور سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ تب جا کر یہ مکمل ہوئی ہے۔ میں نے جن کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ساتھ ساتھ حوالہ دے دیا ہے، لیکن ذیل میں، چند کتابوں کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ وہ کتابیں ہیں، جو اب نایاب ہیں، یا عام طور پر لوگ انکی اہمیت سے ناواقف ہیں۔ ارادہ تو یہ تھا کہ ان تمام کتابوں پر مختصر سا تبصرہ کرتا، جن کا میں نے حوالہ دیا ہے، لیکن کتاب ویسے ہی کافی ضخیم ہو گئی ہے۔ اس لیے، صرف چند کتابوں کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں، جو اپنی افادیت اور اہمیت کے باعث غیر معمولی امتیاز کی حامل ہیں:

(۱)

تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند)

یہ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کی لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جتنا تفصیلی مواد ہر موضوع پر اس کتاب میں ملتا ہے۔ کسی اور کتاب میں نہیں مل سکتا۔

اس کتاب میں ذکاء اللہ مرحوم نے بغاوت ہند کے حالات بھی بسط و تفصیل اور شرح و وضاحت کے ساتھ جمع کیے ہیں۔ کتاب انگریزی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے پھر بھی اس میں واقعات اور حقائق موجود ہیں جن سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے یا رائے قائم کر سکتا ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

(۲)

جان عالم

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم مغفور ایک بلند پایہ ناول نویس، ایک یگانہ انشا پرداز اور ایک عالی طرفہ محقق اور نقاد ہی نہیں تھے۔ بلکہ ایک مانے ہوئے مورخ بھی تھے، یہ اُن کی بدقسمتی ہے کہ اُن کے ناول چل گئے لیکن اُن کی تحقیق و تدقیق اور مہارت تاریخ کی طرف لوگ زیادہ متوجہ نہ ہوئے:

مولانا نے واجد علی شاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کئی سال تک مٹیابرج یعنی واجد علی شاہ کے زندان خانہ یعنی کلکتہ میں مقیم رہے۔ اس معزول لیکن شریف تاج دار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، پرکھا، اور کھرا پایا یہ مختصر سی کتاب ان کا طویل مقالہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں الحاق اودھ سے متعلق بعض چیزیں مل جاتی ہیں۔

(۳)

تاریخ ہندوستان (جلد نہم)

یہ منشی ذکاء اللہ کی تاریخ کا نواں حصہ ہے۔ جس میں زوال سلطنت تیموریہ کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ بہادر شاہ کا اس میں تذکرہ بہت کم ہے۔ مگر جو کچھ ہے۔ وہ معلومات افزا ہے!

منشی ذکاء اللہ اُن بزرگوں میں تھے، جو انگریزوں سے بری طرح متاثر تھے۔ اپنی ہر چیز کو قابل گرفت اور لائق تعزیر سمجھتے تھے، انگریزوں کی ہر بات ان کے نزدیک ع

دردے کہ می تواں گفتن بہ مردے می تواں کردن

کی مصداق تھی، ان کی تحریر اور لب و لہجے سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ان کے دل میں نہ بادشاہ کی وقعت ہے۔ نہ خاندان تیموریہ کی، نہ مغل سلطنت کی با ایں ہمہ قلم کی زبان ایسے واقعات بھی بیان کر جاتی ہے۔ جو بہادر شاہ کے تاریخ نگار کے لیے گنجینہ تصورات و خیالات بن جاتے ہیں۔

(۴)

تاریخ ہند (عہد انگلشیہ)

یہ بھی مولانا ذکاء اللہ کی لکھی ہوئی تاریخ ہے۔ اس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں، ذکاء اللہ کا شمار ملک کے مستند مورخین میں ہوتا ہے۔ وہ دل سے انگریزوں کے مداح اور ثنا خواں تھے، ان پر بری طرح عہد انگلشیہ کے برکات طاری تھے۔ لیکن مورخ کی ذاتی رائے الگ چیز ہے۔ اور واقعات و حقائق بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دل سے لاکھ انگریزوں کے معتقد اور نیاز مند ہوں، لیکن واقعات اور حقائق کو کیا کریں؟ انہیں جیب میں نہیں رکھ سکتے، وہ زبان قلم پر آ ہی جاتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ انگریزوں کی پیش قدمی کی پالیسی کن نتائج کی حامل تھی۔

(۵)

تاریخ اودھ

حکیم نجم الغنی صاحب رام پوری نے بڑی عرق ریزی، جگر کاوی، اور تحقیق و تدقیق سے یہ کتاب پانچ جلدوں میں لکھی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ خوب لکھی ہے۔

میرے پیش نظر جلد پنجم ہے۔ جو عہد واجد علی شاہ اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات ماقبل اور مابعد پر مشتمل ہے۔ محرکات غدر کے سلسلہ میں اس کتاب کے قابل قدر معلومات مجھے حاصل ہوئے جس کا شکر گزاری کے ساتھ اظہار اور اعتراف ضروری ہے۔

(۶)

آثار الصنادید

یہ سرسید احمد خاں کی یادگار اور نادرہ روزگار تصنیف ہے۔ سرسید نے اگر اور کچھ کام نہ کیا ہوتا، صرف

یہ کتاب لکھی ہوتی۔ تو بھی ان کا یہ کارنامہ اتنا قیمتی ثابت ہوتا، کہ ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔

میرے پیش نظر جو نسخہ ہے، وہ غدر سے ۲ سال پہلے کا ہے۔ اس کی سرورق پر جو عبارت درج ہے، وہ یہ ہے۔

"آثار الصنادید"

تاریخ پرانی اور نئی عملداری اور پرانی و نئی عمدہ

عمارتوں کی بابت قلعہ دہلی . . . . .

تصنیف

سیّد احمد خاں منصف درجہ اوّل،

مقام شاہجہاں آباد فی ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۸۵۲ء

جس کتاب پر مصنف کی مہر نہ ہو۔ وہ کتاب چوری کی ہے۔ [1]

این دیباچہ با ہتمام کار پردازان

مطبع سلطانی، در مطبع سلطانی واقع قلعہ معلی القائی

طبع گردید

فی سنہ ۱۲۷۰ھ و سنہ ۱۸۵۴ء

دیباچہ کے بعد، جہاں سے کتاب کا پہلا باب شروع ہوتا ہے، یہ لکھا ہے

"مطبوعہ مطبع احمدی واقع دہلی

باہتمام شیخ ظفر علی سنہ ۱۲۷۰ھ

اس کتاب کا شمار مستند ترین کتابوں میں ہوتا ہے، اس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دہلی پر جتنی کتابیں اس کے بعد لکھی گئیں، حتیٰ کہ بشیر الدین صاحب کی کتاب

---

[1] میرے پیش نظر جو نسخہ ہے۔ اس پر مہر نہیں ہے۔ یہ سرسید کی روح کے لیے اطلاعاً عرض ہے۔

تاریخ واقعات دارالحکومت دہلی تک سب اسے سامنے رکھ کر لکھی گئیں۔

اس کتاب سے بہت ضروری اور قیمتی حالات حاصل ہوئے۔

(۷)

چراغ دہلی

یہ مرزا حیرت دہلوی کی کتاب ہے۔ جو چھ سو صفحات کو محیط ہے۔ مرزا حیرت عجیب قسم کے آدمی تھے۔ انگریزوں سے انہیں اتنی والہانہ عقیدت تھی۔ کہ اس کا آج کل تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ عقیدت کتاب کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ، بلکہ ایک ایک حرف سے نمایاں ہے۔ غدر کی داستان اس شخص نے بیان کی ہے اسے پڑھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کے انسانیت سوز جرائم بھی اس کی نظر میں کتنے معمولی تھے۔ اور کہاں تک غدر کی معمولی حرکتیں بھی، کتنا بڑا اور ناقابل معافی جرم تھیں۔ مرزا صاحب جب تک زندہ رہے۔ اپنے عہد کے وائسرائے لارڈ کرزن کے گیت گاتے رہے۔ اور انہی کے نام پر کرزن گزٹ نکالا۔ جو اپنے اڈیٹر اسلوب بیان اور انداز تحریر کے اعتبار سے واقعی سرکاری گزٹ ہی تھا۔

واقعات بڑے بے درد اور ستم گر ہوتے ہیں ان کی شکل و صورت مسخ کی جا سکتی ہے۔ انہیں ناپید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں دلی اور غدر دہلی پر کافی مواد ہے۔

(۸)

مرحوم دہلی کالج

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (صدر انجمن ترقی اردو پاکستان نے یہ کتابچہ آج سے ۲۲، ۲۳ سال قبل تحریر فرمایا تھا۔ یہ بڑی قیمتی اور معلوماتی دستاویز ہے اس سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندو مسلم کلچر کو اپنی ہوس جوع الارض پر کس طرح قربان کیا؟ وہاں یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ نامساعد اور ناسازگار

حالات میں اردو زبان کس طرح پنپی؟ اس تربیت گاہ میں کیسے کیسے لوگ پروان چڑھے۔ اُس تہذیبی ثقافتی، اور تعلیمی ادارے نے کیسے کیسے جھکڑے کھائے، پھر بھی زندہ رہا۔ لیکن آخر کار فرنگی سامراج کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گیا۔

(۹)

تصویر کا دُوسرا رُخ

یہ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب ہے۔ جس کا پورا نام The other side of the madel ہے یہ کتاب اعتراف واحتجاج پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں مصنف نے سند اور دلیل کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ اس کے ہم قوم انگریزوں نے غدر سے پہلے اور غدر کے بعد کیسے کیسے لرزہ خیز مظالم کیے اور اس طرح مسلمانوں کو خاص طور پر ہدف ستم بنایا ہے۔

کتاب کا ترجمہ مشہور قومی کارکن شیخ حسام الدین صاحب نے کیا ہے کتاب بہت مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

(۱۰)

نصرت نامہ گورنمنٹ

یہ انقلاب دہلی کا بارھواں حصہ ہے جسے خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "دہلی کی سزا" کے نام سے شائع کیا تھا، یہ نواب غلام حسین کے قلمی مسودے سے اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ اور یہ غدر کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۸۵۸ء میں لکھی گئی۔ جو تمام تر ان کے ذاتی مشاہدات اور تاثرات کا نتیجہ تھی۔ خواجہ حسن نظامی اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب اگرچہ ایک ایسے صاحب نے لکھی ہے، جو برٹش گورنمنٹ کے پنشن خوار تھے، اور اسی وجہ سے انہوں نے برٹش کی حمایت میں مبالغہ ہی کیا ہے

اس کتاب سے معلوم ہوگا۔ بعض مخبروں نے برٹش حکام کو ان لوگوں کے باغی ہونے کی اطلاعیں دیں جن کو مصنف کتاب بھی باوجود خیر خواہ گورنمنٹ ہونے کے باغی نہیں سمجھتے تھے "

ریاست لوہارو کے نامور نواب فخر الدین خاں مرحوم پر اس کتاب کے مصنف نے دلی والوں کے خلاف مخبری کا الزام لگایا تھا۔ نواب فخر الدین خاں کے وارث نواب نصر اللہ خاں حیدر آباد دکن کے محاسب تھے اور اب پنشن پاتے ہیں۔ میں نے اس حصہ کو کتاب سے خارج کر دیا ہے۔"

خواجہ صاحب نے غدر دہلی کے بارے میں جو مواد شائع کیا ہے۔ وہ بڑا قیمتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان کی خدمات بہت وسیع اور قطعاً ناقابل فراموش ہیں۔ لیکن ان کی یہ حرکت تاریخی دیانت کے خلاف تھی۔ وہ اگر مصنف کے اس الزام یا بیان کو درست نہیں سمجھتے تھے تو حاشیہ پر اس کی تردید کر سکتے تھے مگر اس کے اہم حصہ کو خارج کر دینا ناقابل معافی جسارت ہے۔ بہرحال ہمارے سامنے وہی حصہ ہے جو خواجہ صاحب نے چھاپا ہے اصل فارسی کتاب تک اب کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ کیونکہ اب وہ ناپید ہے۔ اس کتاب میں اس کے باوجود کہ موجودہ اصطلاح میں ایک "ٹوڈی" اور سرکار پرست کی لکھی ہوئی ہے۔ نادر معلومات ملتے ہیں۔ مصنف نے اس کا نام "نصرت نامہ گورنمنٹ" رکھا تھا۔ حوالہ میں میں نے یہی نام اختیار کیا ہے۔

(۱۱)

محاصرۂ غدر دہلی کے خطوط

یہ تاریخ غدر دہلی کا تیسرا حصہ ہے۔ جسے خواجہ حسن نظامی مرحوم نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

" یہ اُن خطوط کا ترجمہ ہے۔ جو غدر دہلی ۱۸۵۷ء کے وقت انگریز افسران فوج نے مسٹر جارج کارنک بارنس کے نام بھیجے تھے۔ مسٹر بارنس۔ اس زمانہ میں دریائے ستلج کی

فوجی ریاستوں کے کمشنر تھے۔ مسٹر بارنس پر پنجاب کی ریاستوں اور پنجاب کی رعایا کو وفادار رکھنا اور پنجابی ریاستوں سے فوجوں اور سامان کی مدد حاصل کرنا اور محاصرہ دہلی کی مادی اعانت کا بوجھ تھا۔

(۱۲)

امیر الروایات

یہ مولانا امیر خاں کے روایات کا مجموعہ ہے، مولانا امیر خاں خاندان ولی اللہی اور اکابر دیوبند کے جان نثار تھے۔ انہوں نے عہد غدر کی شخصیتوں کو دیکھا تھا۔ اور اُن کے جلوے مشاہدہ کیے تھے۔ اور دوسرے بزرگوں کے احوال و واقعات سے بھی باخبر تھے۔ مولانا محمود الحسن (شیخ الہند) کے ساتھیوں میں تھے۔

(۱۳)

بہادر شاہ کا روزنامچہ

یہ غدر دہلی کی تاریخ کا نواں حصہ ہے۔ "سراج الاخبار" دہلی اور احسن الاخبار بمبئی میں جو کوٹ سرکار شائع ہوتا تھا۔ یا لال قلعہ کے حالات درج ہوتے تھے۔ انہیں خواجہ حسن نظامی مرحوم نے تاریخ وار مرتب کر کے روزنامچہ کی شکل دی۔ اور بہادر شاہ کا روزنامچہ" نام رکھ کر شائع کر دیا۔ یہ اخبارات فارسی زبان میں شائع ہوتے تھے۔ خواجہ صاحب نے سلیس زبان میں ترجمہ کر دیا۔ اور کوئی شبہ نہیں یہ بڑی کارآمد دستاویز میرے میرے لیے ثابت ہوئی۔

(۱۴)

بزم رفتگاں

یہ علامہ راشد الخیری مرحوم کی کتاب ہے۔ اس میں مولانا نے اپنے دور کی چند برگزیدہ ہستیا

کا تذکرہ کیا ہے۔ ان ہستیوں کا جن سے انہیں ملنے اور پرکھنے کا اتفاق ہوا۔

اس میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی نظر آئیں۔ جو میری کتاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے جو حالات اور جگہ نہ ملے وہ یہاں مل گئے۔

(۱۵)

حدائق الحنفیہ

یہ مولانا فقیر محمد صاحب لاہوری کی گراں پایہ تالیف ہے۔ مطبع نولکشور نے اسے چھاپا تھا۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب اہل علم کے حلقہ میں کتب حوالہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں علمائے سلف اور فقہائے اجل کا مفصل اور مستند تذکرہ ہے امام ابو حنیفہ سے لے کر مولانا احمد علی محدث تک علما ہند و بیرون ہند کے سوانح جامعیت اور تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ پہلی صدی ہجری سے لے کر ۱۳ دیں صدی ہجری تک کے اکابرین کا ذکر اس میں آگیا ہے۔

(۱۶)

داستانِ غدر

غدر کے سلسلہ میں یہ کتاب ایک ممتاز اور مستند اور قابل اعتماد دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اس کے مصنف راقم الدولہ ظہیر دہلوی ہیں، جو ذوق کے شاگرد اور بہادر شاہ ظفر کے مرید اور ماہی مراتب کے داروغہ تھے۔ خوش حال گھرانے کے فرد۔ ہر طرح کی عزت سے ممتاز اور سربلند۔

۱۸۵۷ء کا غدر ان کے سامنے ہوا۔ اس گرداب میں انہوں نے اپنی زندگی کے دن گذارے۔ دہلی سے بھاگے اور شہر شہر گھومتے ہوئے پھر دہلی واپس آئے۔ کئی بار جان سے ہاتھ دھوئے۔ مصیبتیں اٹھائیں۔ تکلیفیں سہیں۔ مگر ان کے دم خم میں فرق نہ آیا۔

ان کی جو چیز مجھے بہت زیادہ بھائی یہ ہے کہ اپنے آقا بہادر شاہ سے ان کی وفاداری غیر متزلزل

نظر آتی ہے۔ غدر کے بعد بہادر شاہ کا نام لینا جرم تھا۔ ان کی تعریف کرنا غداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا تھا
پرانے سے پرانے نمک خوار اور جان نثار دوست تک ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ اور بے تعلق
کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن ظہیر نے غدر کے بعد یہ کتاب لکھی۔ اور اس کی ایک ایک سطر سے قابل قدر عقیدت
جھلک رہی ہے۔ وہ بہادر شاہ کا دم بھرتے ہیں ان کی نیاز مندی پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی تعریف
میں رطب اللسان ہیں۔ اور اس کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ کہ انجام کیا ہوگا؟ اب نہ بہادر شاہ زندہ ہیں اور
نہ ظہیر لیکن دونوں امر ہو چکے ہیں۔ دنیا انہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔

(۱۷)

الروض الممطور فی تراجم علماء شرح الصدور

یہ کتاب ۱۳۱۰ھ میں یعنی آج سے تقریباً ستر سال پہلے آگرہ کے مفید عام پریس میں چھپی تھی۔
اس کے مولف مولانا ذوالفقار احمد صاحب سارنگ پوری ہیں۔ کتاب بڑے کام کی ہے۔ اس میں زیادہ
تر علمائے اہلحدیث اور اکابر اہلحدیث کا تذکرہ ہے۔ بظاہر میرے موضوع سے متعلق اس میں کچھ نہ ملنا
چاہیے تھا۔ لیکن کام کی کچھ چیزیں یہاں مل گئیں اور میں نے ان سے مستفید ہونے سے تامل نہیں کیا۔

(۱۸)

دلّی کی آخری بہار

یہ علامہ راشد الخیری مرحوم مغفور کی کتاب ہے۔ علامہ غدر کے سوا سال بعد پیدا ہوئے۔ سن
شعور کو پہنچے تو تربیت ان لوگوں کے دامن میں پائی۔ اور ان سے صحبت اٹھائی۔ جو غدر کی عالم آشوب تباہیوں
کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان تباہیوں کے حصہ دار رہ چکے تھے۔ اس کے دیدہ شنید کے فسانے
راشد الخیری کے کانوں میں پڑتے رہے۔ خود ان کا خاندان بھی غدر کے شعلوں سے نہ بچ سکا۔ حالانکہ خیر
خواہ سرکار تھا۔ وہ واقعات جو انہوں نے اپنے کانوں سے سنے۔ وہ اشخاص جن کی انہوں نے زیارت کی۔

اس کتاب کا موضوع ہے۔

(۱۹)

تذکرہ غوثیہ

یہ حضرت مولانا غوث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہے جسے حضرت کے خادم خاص مولانا شاہ گل حسن نے، دوسرے اخوان طریقت کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ زبان کی تصحیح، مولانا اسماعیل میرٹھی نے کی ہے۔ جو حضرت کے مرید باصفا تھے۔ اس کتاب کے سات ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حضرت کی ولادت ۱۲۱۹ھ میں ہوئی۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے غدر سے تقریباً ۴۰ سال پیشتر اور وفات ۱۲۹۷ھ میں پانی پت میں ہوئی۔ آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔ آپ کے عقیدت کیشوں میں وقت کے بڑے بڑے علماء، صلحاء، فضلاء، شعراء، ادباء شامل تھے۔ خود بھی ادب و شاعری کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ وفات سے پہلے یہ شعر زبان پر تھا۔

دیکھا وقت نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق دے شام کو

حلقے کے ارباب کمال اور اصحاب علم و فضل سے آپ کے گہرے روابط تھے جن کی چاشنی تذکرہ کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے۔

(۲۰)

وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر

یہ ایک متعصب، بد باطن، اور کور نمک شخص کی تصنیف ہے ڈاکٹر برنیر ایک فرانسیسی شخص تھا۔ شاہجہان نے ملازم رکھا۔ عالمگیر نے اس کو انعام اکرام سے مالا مال کیا۔ اسے وہ سہولتیں دیں جو اس زمانہ میں کسی غیر ملکی کو عام طور پر نہیں ملتی تھیں۔ لیکن چونکہ حد درجہ متعصب تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے عروج و

فروغ کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ اُس کی ایک ایک سطر سے یہی جذبہ ہویدا ہے۔ اس نے اپنی کتاب یا مجموعہ مکاتیب میں مسلمانوں کی کسی بات کی تعریف نہیں کی ہے۔ ہر بات میں برائی کا پہلو پیدا کیا ہے۔ عیسائیت کی تبلیغ پر زور دیا ہے۔

اس مخالفانہ کتاب میں بھی بعض کام کی چیزیں نظر آئیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۲۱)

دلّی کا سنبھالا

یہ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کی مختصر سی کتاب ہے۔

ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر

کی مصداق

دلّی کا ذکر اور خواجہ صاحب کا خامۂ بہار آفریں، ان کے قلم سے الفاظ نہیں ٹپکتے، پھول جھڑتے ہیں۔ جو کہانی بیان کرتے ہیں اس کا انداز ایسا دل میں کھب جانے والا ہوتا ہے کہ بس پڑھتے رہیئے بار بار پڑھیئے۔ ہر مرتبہ نیا لطف آئے گا۔

اس کتاب میں خواجہ صاحب نے دلّی کے چند فن کاروں کا اور چند گراں مایہ شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ جنہیں انہوں نے دیکھا، یا جن کے بارے میں دلّی کے اکابر یا اپنے بزرگوں سے سنا۔ واقعات کا جہاں تک تعلق ہے۔ اُن کے صحیح اور درست ہونے میں شبہ نہیں۔

یہ کتاب مکتبۂ جامعہ (دہلی) نے چھاپی تھی۔ اب نایاب ہے۔

(۲۲)

واقعاتِ ہند

یہ ہندوستان کی مختصر تاریخ ہے۔ جو میجر ہالرائڈ کے حکم سے سررشتہ تعلیم پنجاب نے

لکھی تھی۔ اس کا جو ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ یہ ۱۸۸۵ء کا مطبوعہ ہے۔
اس میں آریوں کے وقت سے لیکر بہادر شاہ کی جلا وطنی اور وفات تک کے حالات ہیں یہ کتاب اگرچہ سرکاری اور انگریزی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے۔ لیکن اس میں کام کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔

(۲۳)

تذکرہ اہل دہلی

سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں جو ۱۸۴۷ء میں لکھا تھا۔ کہ دہلی کے اہل کمال، مشاہیر۔ اور سربرآوردہ شخصیتوں کا اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔ یہ حصہ حذف کر دیا گیا۔ میرے پیش نظر دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن بھی کم یاب ہے اور پہلا ایڈیشن بالکل نایاب ہے۔
انجمن ترقی اردو پاکستان نے تذکرہ اہل دہلی کے نام سے پہلے ایڈیشن کا وہ حصہ جو شخصیتوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ شائع کیا ہے اس کی ترتیب و تہذیب اور حواشی قاضی احمد میاں اختر مرحوم کے حسن ذوق اور دیدہ کاری کے رہین منت ہیں

(۲۴)

حیات النذیر

یہ جناب افتخار عالم صاحب مارہروی کی تصنیف ہے۔ اور بڑے سائز کے تقریباً سات سو صفحات پر محیط ہے۔ اس میں شمس العلما مولانا نذیر احمد دہلوی کے سوانح حیات استناد اور تفصیل کے ساتھ درج کیا افسوس یہ ہے کہ اس میں غدر کے متعلق، یا بہادر شاہ کے متعلق بہت کم مواد ہے۔ کتاب کا بہت بڑا حصہ مولانا کی کتابوں پر تبصرے کیلئے وقف ہے۔ انداز بیان بہت دلچسپ اور بے ساختہ ہے متفرق اور ضمنی طور پر میرے کام کی چیزیں کچھ نہ کچھ مل گئی ہیں۔

(۲۵)

یادِ ایّام

یہ مولانا عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کی کتاب ہے۔ مولانا عبدالرزاق اپنے وقت کے مانے ہوئے مصنف، مورخ اور محقق تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنے دور کے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جنہیں انہوں نے دیکھا، جن سے وہ ملے، اس میں واجد علی شاہ بھی ہیں اور دوسرے مشاہیر قوم بھی۔

کتاب معلومات سے بھری ہوئی ہے۔ بعض کام کی باتیں ایسی ہیں۔ جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس گراں مایہ کتاب سے استفادہ کا موقعہ ملا۔

(۲۶)

بہادر شاہ ظفر

منشی امیر احمد علوی ڈپٹی کلکٹر اپنے وقت کے اچھے انشا پردازوں میں تھے۔ لیکن مورخ نہ تھے۔ اور یہ کتاب اس دعویٰ کا بہترین ثبوت ہے، یہ ساری کتاب احسن الاخبار، داستان غدر اور دو ایک اور کتابوں کے انتخابات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس کے معلومات تشنہ نامکمل اور غیر مفید ہیں، منشی صاحب نے اس موضوع کو محض سرسری طور پر ٹالا ہے۔ اور اس طرح اپنے اوپر بھی زیادتی کی ہے۔ اور اپنے ہیرو پر بھی۔ تاہم اس کتاب میں کہیں کہیں تھوڑی تھوڑی کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔

(۲۷)

تحقیقاتِ چشتی

خاصی ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب کا موضوع، لاہور کی عمارتوں اور باغات اور محلات، دیوانات کی تفصیل اور تاریخ بیان کرنا ہے۔ لیکن جو بات سرسید نے آثار الصنادید میں پیدا کر دی، وہ تحقیقاتِ چشتی

میں پیدا نہ ہوسکی پھر بھی یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ کتاب بہت اہم اور بہت قابلِ قدر ہے۔ مؤلف نے غدر کا زمانہ دیکھا ہے۔ بہادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں۔ اس میں کوئی بات غدر یا بہادر شاہ کے متعلق نہیں ملنی چاہیے تھی، اور ہے بھی نہیں۔ مگر ضمناً بعض بڑے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ خصوصاً مولوی رجب علی کے خود نوشت حالات جو مؤلف کی درخواست پر انھوں نے اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ مولوی رجب علی کا ذکر آپ اپنے موقع پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

(۲۸)

تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ

یہ خان بہادر شمس العلما مولانا ذکاء اللہ صاحب کی مفصل اور مشرح تاریخ ہے۔ ذکاء اللہ صاحب نے غدر کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ انھوں نے غدر کے سلسلے میں جو کچھ دیکھا ہے وہ زیادہ تر لکھا دیا ہے۔ وہ انگریزوں کے بہت بڑے خیر خواہ اور عقیدت مند تھے۔ اُن کی خیر خواہی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ میں اس امر پر زور دیا ہے کہ دلی کا پرانا نام شاہجہاں آباد بدل کر اس کا نام الیگزنس آباد رکھا جائے۔ آدمی ثقہ اور سنجیدہ تھے۔ رائے خواہ کچھ بھی رکھتے ہوں۔ کذب و دروغ سے ان کا دامن پاک تھا۔ لہٰذا واقعات بے کم و کاست لکھے ہیں اور ان سے بعض قائم کرنے تصویریں رنگ بھرنے میں اور واقعات کی وضاحت کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔

(۲۹)

خانمِ انگلیس در بلوائے ہندوستان

یہ ایک فرانسیسی نژاد خاتون کی سرگزشت ہے جو ایک انگریز تاجر مقیم ہندوستان کی بیوی تھی اور قومیت کے اعتبار سے انگریز بن گئی تھی۔ سرگزشت بڑی درد انگیز و الم آفریں ہے۔ یہ داستان خود اسی کے قلم نے لکھی ہے وہ نہ مورخ تھی، نہ سیاست دان، ایک عورت تھی، جو دیکھا اور سنا جو محسوس کیا بیان کر دیا۔ اس نے سچ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ سچ خواہ کسی کی حمایت میں ہو یا مخالفت میں۔ اس داستان میں ادب بے ساختگی ہے اس داستان کے جو حصے غدر سے متعلق ہیں انھیں میں نے مربوط شکل دے کر اور مختلف حصے جمع

کرکے ایک مرتب داستان کی شکل دے دی ہے۔ دوسرے واقعات اپنے اپنے عنوانات کے ماتحت درج ہیں۔
یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی۔ وہاں سے فارسی میں مذکورہ نام سے شائع ہوئی۔ اردو میں ترجمہ دارالاشاعت پنجاب نے شائع کیا۔

(۳۰)

غالب کا روزنامچہ

یہ کتاب خواجہ حسن نظامی مرحوم مغفور کی مصنفانہ شوخی اور ذہانت کا بڑا دل آویز مجموعہ ہے۔
خواجہ صاحب نے مرزا غالب کے واقعات اور خطوط سے یہ روزنامچہ مرتب کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"غالب کے خطوط میں جہاں جہاں غدر کا ذکر ضمناً آیا تھا، میں نے پوری تلاش و محنت سے اس کو الگ کر لیا اور ایسے طریقہ سے چھانٹا کہ روزنامچہ کی عبارت معلوم ہونے لگی۔ غالب کے مکتوبات میں غدر کی کیفیت ایسی دبی ہوئی پڑی تھی کہ کوئی شخص اس کی خوبی اور اہمیت کو محسوس نہ کر سکتا تھا۔ خطوں کے ذیل میں ان عبارتوں کو بے توجہی سے پڑھ لیا جاتا تھا۔ میں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اردو زبان میں غدر دہلی کی یہ لاثانی تاریخ جو موتیوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے اس طرح دبی ہوئی نہ پڑی رہے۔ اس لیے اس کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ اس تصنیف میں ایک حرف بھی میرا نہیں ہے، سب غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے۔"

خواجہ صاحب کی یہ جدت ایک خدمت بن گئی ہے۔ یہ ایک ایسی گراں بہا اور قیمتی دستاویز ہے، جس کی صحت اور پایۂ استناد سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خواجہ صاحب نے اسے غدر دہلی کے مسلمانوں کا ساتواں حصہ بنا کر شائع کیا ہے، اور اپنی دوسری کتابوں کی طرح اس کے بھی کئی ایڈیشن چھاپ چکے ہیں، جو ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اور اب تو ان افسانوں کی کتابیں کبریتِ احمر کا حکم رکھتی ہیں۔ تلاش بسیار کے باوجود، کم از کم پاکستان میں تو ان کا سراغ نہیں لگتا۔

(۳۱)

یادگار دہلی

اردو میں دہلی کے متعلق جتنی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان میں سر سید کی آثار الصنادید سے ضرور استفادہ کیا گیا ہے۔ بغیر اس کے حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر کوئی کتاب مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔

زیر گفتگو کتاب جناب سید احمد صاحب ولی اللہی کی تالیف ہے۔ سید صاحب خاندان ولی اللہی کے ایک فرد ہیں۔ غدر کے بعد دوسرے بہت سے مسلمانوں کی طرح ہوا خواہ سرکار ہو گئے تھے یا سرکاری بارہ مدح لکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ کتاب کی ایک ایک سطر میں یہ رنگ جھلک رہا ہے۔ پھر بھی کتاب بڑی گراں مایہ ہے۔ سر سید کے افادات کی تکرار کے علاوہ بھی اس میں کام کی بہت سی چیزیں ہیں۔ کوئی شبہ نہیں یہ کتاب بڑی محنت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس میں دلی کے چپے چپے کا حال ہے اور ایسی تمام سربرآوردہ شخصیتوں کا ذکر ہے جو عہد بہادر شاہ میں یا غدر کے بعد دلی میں ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ مؤلف کا نقطۂ نظر دوسری چیز ہے اور اس سے کام کی باتیں حاصل کر لینا دوسری چیز۔ میں نے اس مختصر صورت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ حوالہ دے دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۱ء کے دربار کے موقع پر لکھی گئی تھی تاکہ باہر سے آنے والے لوگ دلی اور دلی کی شخصیتوں سے ناواقف نہ رہیں۔

(۳۲)

واقعات دار الحکومت دہلی اول، دوم

دلی اور واقعات دلی کی یہ طویل و ضخیم تاریخ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند جناب بشیر الدین احمد صاحب مرحوم کلکٹر حیدرآباد دکن نے دلی کے چیف کمشنر مالکم ہیلی کی فرمائش سے مرتب کی تھی اور حق ادا کر دیا تھا تحریر کا بھی اور وفاداری کا بھی۔

یہ کتاب معلومات سے لبریز ہے۔ اگرچہ سر سید کی آثار الصنادید اور دوسری مستند کتابوں سے فاضل مرتب نے استفادہ کیا ہے کہ بغیر اس کے چارہ نہ تھا لیکن انھوں نے احوال و واقعات جمع

کیے ہیں، وہ تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بشیر الدین صاحب ان لوگوں میں سے تھے، جن کا قلم انگریزوں کے لیے مہر مادری کا منبع بن جاتا ہے۔ وہ اُن کی ہر بات میں ایک ادا، ہر طور میں ایک آن، ہر رنگ میں ایک شان دیکھتے ہیں۔ اپنی قوم، اپنے بادشاہ، اپنی تہذیب کسی چیز کا غم نہیں، اس خوشی میں کہ انگریز پنپ گئے، لیکن یہ ذہنیت بشیر الدین صاحب سے نہ شروع ہوئی تھی اور نہ ان پر ختم ہوتی ہے، اس دور میں کچھ خصوصیت ہی یہ تھی، اس سے دامن کشاں گزرنا آسان نہ تھا۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں، میں نے اوّل، دوم دو حصوں سے زیادہ فائدہ اٹھایا کہ میرے کام کی چیزیں یہیں تھیں۔ کچھ استفادہ تیسرے حصے سے بھی کیا ہے۔

(۳۳)

بزمِ آخر

اس کتاب میں لال قلعہ کی زندگی، بہادر شاہ اور ان کے والد اکبر شاہ کے عہد کے واقعات بیگمات کے اندازِ حیات پر بہت سی مفید اور کارآمد باتیں ہیں۔

اس کے مصنف منشی فیض الدین صاحب ہیں، جو بہادر شاہ کے متوسلین میں تھے۔ اس کتاب کے مستند ہونے کی تصدیق بہادر شاہ کے صاحبزادے نے کی ہے، جو بصورت تقریظ درج ذیل ہے:

تقریظ

عالی جناب معلّٰی القاب صاحب عالم و عالمیان شاہزادہ میرزا محمد سلیمان شاہ

صاحب گورگانی سرپرست خاندان تیموریہ

میں نے اس کتاب موسوم بہ بزمِ آخر کو جس میں ہمارے دو آخری بزرگوں کا طریق معاشرت لکھا ہے ملاحظہ کیا چونکہ یہ کتاب ہمارے قدیم متوسل منشی فیض الدین نے جو قلعہ میں پرورش پاکر چھوٹے سے بڑے ہوئے اور نیز صاحب عالم بہادر یعنی والد مغفور کی خدمت میں ہمیشہ حاضر رہے، لکھی ہے۔

اس لیے میں تصدیق کرتا ہوں کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے، وہ ٹھیک اور درست ہے مؤلف صاحب

کی فرمائش سے اس کتاب کو دیکھا اور نہایت دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔

دستخط خاص شاہزادہ صاحب موصوف الصدر

(مطبوعہ علیمی پریس دہلی)

(۳۴)

تذکرہ رؤسائے پنجاب اوّل، دوم

یہ بڑی مفصل، مکمل تاریخ ہے۔ پنجاب اور والیانِ ریاست اور رؤسا کی۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اور دونوں حصے بڑے سائز کے کم و بیش اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان میں اُن حضرات کے کارنامے شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں جنھوں نے غدر کے پر آشوب زمانہ میں اپنی قوم اور ملک کے ساتھ غداری کرکے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان کے لیے جان نثاری کی۔ اور ان کے لیے اپنے لوگوں کو مبتلائے مصائب و آلام کیا، پھر اسی صلہ میں بیش قرار جاگیریں، القاب اور خطابات حاصل کیے، اور جاہ و منصب کی مسند پر پہنچے۔

اس کتاب کا ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔ اس کے دو مصنف ہیں:

۱۔ Sir Lepal H Giffin ۲۔ Col Massy

اس پر نظر ثانی کا فریضہ ایک اور بزرگ H. D Craik I.C.S نے انجام دیا ہے۔

اصل کتاب کا انگریزی نام یہ ہے Chief and Families of note in the Punjab

اس کتاب کو ۱۹۱۱ء میں حکومت پنجاب نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ یہ کتاب سرکاری دستاویزات، کاغذات اور معاہدات کے پیشِ نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی صحت شک و شبہ سے بالا ہے۔

اٹھارہ سو صفحات میں کتنے رئیسوں، نوجوان سرداروں اور راجوں مہاراجوں کا تذکرہ ہوگا۔ اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، اور اعتراف خدمات میں دلائل شواہد کے ساتھ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔

میں نے بڑی سختی اور بے دردی سے انتخاب کیا ہے اور بہت زیادہ اختصار کر دیا ہے۔ اسماء و انساب

میں بھی، اور واقعات وحالات میں بھی، میں نے جو کچھ لیا ہے : مشتے نمونہ از خروارے "سمجھنا چاہیے۔ لیکن اس سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک انقلاب آزادی کی ناکامی تمام تر اخود ہندوستان کے کپوتوں کی غداری اور خود غرضی پر مبنی تھی ع "کہ با من آنچہ کرد آں آشنا کرد"

(۳۵)

سر طامس مٹکاف کی ڈائری

سر طامس مٹکاف بہادر شاہ کے دربار میں انگریزوں کی طرف سے ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل ایسٹ انڈیا کمپنی East India Co. کے ایجنٹ تھے مٹکاف صاحب کی یہ ڈائری فارسی زبان میں تھی اور غیر مطبوعہ تھی، خواجہ حسن نظامی مرحوم نے منہ مانگی قیمت دے کر اسے خریدا اور بڑے اہتمام کے ساتھ غدر دہلی کے افسانوں کا تیرھواں حصہ بنا کر شائع کیا۔

اس روزنامچے میں بہادر شاہ کا حال بہت تھوڑا ہے۔ اور دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کے حالات زیادہ ہیں۔ مٹکاف نے یہ کتاب در حقیقت اپنے اور انگریزوں کے پروپیگنڈے کے لیے لکھوائی تھی۔ اس میں ۱۸۴۹ء کے ان سب واقعات کا ذکر ہے جو اس زمانہ میں انگریزوں کو پیش آئے تھے۔ اور طرز تحریر بھی، بہادر شاہ اور ہندوستانیوں کے خلاف اس لیے ہے کہ ریذیڈنٹ کے ایما سے لکھی گئی تھی۔

(۳۶)

لال قلعہ کی ایک جھلک

خواجہ سید ناصر نذیر فراق مرحوم، خواجہ میر درد کے باقیات الصالحات تھے۔ غدر انھوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن ان لوگوں کو دیکھا، جن پر غدر کی بپتا پڑی تھی۔ چونکہ بہادر شاہ سے عقیدت، دتی سے محبت، لال قلعہ سے والہانہ عشق تھا۔ اس لیے اس سلسلہ میں بڑے بوڑھوں یا بڑی بوڑھیوں سے جو کچھ سن لیتے تھے اُسے صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرتے تھے۔ لال قلعہ کی جھلک اسی طرح ایک کامیاب اور دلچسپ کوشش ہے۔

لال قلعہ کی ایک جھلک میں جو واقعات درج ہیں۔ وہ ننھی خانم سے منقول ہیں۔ ننھی خانم بہادر شاہ

کے زنانہ محل کی بکاول احمد خانم کی بہو تھیں۔ اور سارا وقت ساس کے ساتھ قلعہ میں صرف کرتی تھیں۔
بہادر شاہ کے حضور میں بھی انھیں حاضر ہونے اور کھلانے پلانے کے سلسلہ میں رہنا پڑتا تھا۔ یہ تھی خانم
ناصر نذیر فراق کی والدہ کی سہیلی تھیں۔ لہذا بارہ دری میں خواجہ میر درد کے یہاں اکثر آیا کرتی اور "بی دلہن" کہلاتی تھیں

فقیر فراق عرض کرتا ہے کہ میں نے بی دلہن کو ۱۲۹۲ھ میں دیکھا۔ بڑھاپے کے مارے
سوکھ کر چمرخ ہو گئی تھیں۔ پھونس تھیں۔ ہم سب بھائی بہن نانی دلہن کہتے تھے۔ ان کے
منہ سے بہت سی کہانیاں اور لال قلعہ کے بہت سے حالات سنے ہیں۔ یہ میری والدہ
کو حضرت یا بیگم صاحب کہتی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر بات کرتی تھیں۔ لال قلعہ اور بہادر شاہ
کا کچھ حال بیان کرتی تھیں تو اُن کی ایک آنکھ ساون اور ایک آنکھ بھادوں بن
جاتی تھی۔ سسکیاں بھرتی جاتی تھیں اور باتیں کرتی جاتی تھیں۔ دہلی کو شاہجہان
آباد اور کبھی اجڑا دیار کہتی تھیں۔ بادشاہ کو جہاں پناہ اور حضور کے سوا اور لفظ سے
یاد نہ کرتی تھیں۔ بات کو سخن کہتی تھیں۔ بادشاہ کے ہزاروں شعر یاد تھے۔

تاریخ کئی چیزوں سے مرتب ہوتی ہے۔ اور یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اس کی حیثیت ترکیبی ہیں سب سے
زیادہ اہمیت اس طرح کی روایات کو ہوتی ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستند تاریخی کتاب تسلیم کیا جائے۔

(۳۷)

فغان دہلی

فغان دہلی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں یعنی غدر کے ۵ سال بعد شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ نظمیں
اور غزلیں درج ہیں۔ جو عہد غدر کی عالم آشوبی، تباہ کاری، شکست و ریخت، اور بربادی و ویرانی سے
متعلق ہیں۔ منشی تفضل حسین خاں نے جو غالب کے شاگرد تھے۔ یہ مجموعہ مرتب کیا تھا اور مذکورہ نام سے
"اکمل المطابع دہلی" میں طبع کرایا تھا۔ اس میں وقت کے بلند پایہ شعرا کے مرثیے درج ہیں۔
ان میں متعدد شعرا ایسے ہیں، جن کی کئی کئی غزلیں یا مسدس یا شہر آشوب درج ہیں۔
میں نے صرف چیدہ اصحاب کا کلام لیا ہے۔ وہ بھی سب کا سب نہیں منتخب۔

(۳۸)

تاریخ عجیب

یہ ایک مجاہد جلیل کی خود نوشت سوانح حیات ہے، مولانا محمد جعفر تھانیسری حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے باقیات الصالحات میں سے تھے۔ استھانہ ان کا مرکز تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں انھوں نے حصہ لیا۔ فرنگی راج کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے انھوں نے تن من کی بازی لگا دی۔ ہر اس تدبیر میں جو انگریزوں کے استیصال کا سبب بنے خطرات اور مہالک سے بے پروا ہو کر شریک ہو جاتے تھے۔ خوش حال، مالدار اور عالم آدمی تھے۔ اس تحریک پر دل و جان سے نثار تھے۔ اپنی جان کو داؤں پر لگانے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی اور ان کے رفقاء کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ سخت ترین اذیتیں دی گئیں، پہلے پھانسی کی سزا دی، پھر کالے پانی کا حکم سنایا گیا۔ لیکن پھانسی کی سزا پاکر خوش ہوئے اور کالے پانی کا نام سن کر ذرا رنجیدہ

کیا کہوں کیسی شہادت ملتے ملتے رہ گئی۔

کالے پانی گئے وہاں رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتوں اور مصیبتوں کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ جب کالے پانی پہنچے، تو صرف عربی فارسی جانتے تھے۔ انگریزی سے نابلد تھے۔ وہاں رہ کر حسب ضرورت انگریزی سیکھی۔ مطالعہ وسیع کر لیا۔ جب رہا ہوئے تو اس عزم کے ساتھ کہ ولایت جائیں گے اور ڈاکٹر ہنٹر کے ہنٹر کا جواب دیں گے جس نے Our India muslmem. لکھ کر مسلمانوں کے دل کو چرکا لگایا تھا۔

کتاب بڑی دلچسپ ہے اور بڑے لرزہ خیز احوال و حوادث پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے۔ مولانا نے سب کچھ لکھا ہے، لیکن رفقائے زنداں کے ذکر سے بالکل گریز کیا ہے۔ حالانکہ اس دور میں جو ٹی کے مسلمان اُن کے ساتھ کالے پانی میں ابتلا کی زندگی بڑے استقلال اور وقار کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ مولانا پر "انا" اور تحریک وہابیت کا جوش اس قدر نمایاں غالب تھا کہ وہ اپنے اور اپنی تحریک کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر انھوں نے کالے پانی کے دوسرے بلند مرتبت اور اعلیٰ مقام اسیروں کا ذکر کیا ہوتا تو اس کتاب کی افادیت اور اہمیت بہت زیادہ ہوتی۔ اور موجودہ صورت میں بھی یہ کتاب بڑی گراں مایہ ہے۔